جلد ۲۸
شمارہ ۱

زندگی
رامپور

رجب ۱۳۸۲ھ
جنوری ۱۹۶۳ء

مدیر :- سید احمد عروج قادری

خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

زر سالانہ :- [illegible] ششماہی :- تین روپیہ - فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے

ممالک غیر سے :- بیس شلنگ یا پوسٹل آرڈر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد عروج قادری)

قریب کی چند صدیوں میں مسلمان ملکوں کی سب سے بڑی مصیبت، ان پر مغربی طاقتوں کا غلبہ و استیلا رہا اور آج بیسویں صدی کے نصف آخر میں مسلمانوں کی دوسری بڑی مصیبت خود اسی ملت کے مغرب پرست طبقے کا غلبہ و استیلا ہے۔ یہ دوسری مصیبت دراصل پہلی ہی مصیبت کا شاخسانہ ہے کسی طاقت ور جسم پر بھی جب کوئی موذی مرض حملہ کرتا ہے تو سارے جسم کی صحت و طاقت تباہ کر دیتا ہے۔ اسی پر قیاس کر لیجیے اس صورت حال کو جب وہ کسی ناتواں جسم پر حملہ آور ہو اور عام طور پر کسی موذی اور مزمن مرض کا حملہ اسی وقت ہوتا ہے جب جسم کی قوت مدافعت کمزور پڑ جاتی ہے۔ مسلمان ممالک کے ساتھ یہی صورت پیش آئی کہ جب ان کی اندرونی قوت جواب دے گئی تو بیرونی اور اجنبی طاقتوں نے انھیں اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ لیا۔

مرض کی اگر صحیح تشخیص اور صحیح علاج ہو تو امید بندھتی ہے کہ بیماری کی جڑ اکھڑ جائے اور جسم رفتہ رفتہ پھر اپنی اصلی طاقت حاصل کرے ورنہ غلط تشخیص اور غلط علاج کے نتیجے میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ ایک مرض دب جاتا ہے اور دوسرا اس سے بھیانک مرض نمودار ہو جاتا ہے۔ افسوس ہے کہ مغربی بیماری کے علاج میں یہی دوسری صورت پیش آئی، نہ تو صحیح طور پر ان کمزوریوں کی تشخیص کی جا سکی جن کی وجہ سے بیماری حملہ آور ہوئی تھی اور نہ اس کے علاج میں مہارت کا ثبوت دیا گیا۔

قریب کی چند صدیوں کی تاریخ کا مطالعہ اور اس کا تفصیلی جائزہ ایک مخلص مسلمان کے لیے تکلیف دہ کام ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ آبنائے جبل الطارق سے آبنائے ملاکا تک اور [illegible] [illegible] اور [illegible] تک اور یورپ سے [illegible] سنکیانگ کے [illegible] تک تمام مسلمان ملکوں کے

مختلف مغربی ملکوں کے جس استعمار کا شکار رہتے چلے جا رہے ہیں اس کی تفصیل ان اٹلس کے مطالعے مشاہدے سے دیکھی گئی ہیں اور ان کے دل میں رنج و غم کے سیکڑوں تیر پیوست ہو جاتے ہیں۔ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں نے مغربی استیلا کے ایسے نقشے مرتب کر دیے ہیں جنہیں دیکھ کر بیک نظر معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کس ملک کی کب شامت آئی اور کس مغربی ملک نے کب اس پر تسلط حاصل کیا۔ دوسری طرف جب دوسری جنگ عظیم کے بعد دیکھتا ہے کہ (روسی جوئے کے نیچے دبے ہوئے مسلمان ملکوں کو چھوڑ کر) مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک مسلمان ممالک مغرب کی غلامی سے آزاد ہوتے چلے ہیں جب بھی اسے حقیقی مسرت نصیب نہیں ہوتی کیونکہ ان ممالک کا اقتدار اور در و بست جن ہاتھوں میں منتقل ہوا وہ دیکھنے میں تو آزاد ہیں لیکن فی الواقع آزاد نہیں بلکہ صرف ان کی غلامی کی نوعیت بدل گئی ہے پہلے وہ مغربی سنگینوں کے غلام تھے اور اب مغربی تہذیب و تمدن کے غلام ہیں، ان کی زبانیں آزاد ہیں لیکن دل و دماغ اسلام سے نا آشنا اور یہ نا آشنائی اتنی ترقی یافتہ ہے کہ یہ با اقتدار مغرب پرست طبقہ ہر مسلمان ملک میں احیائے اسلام کی راہ کا سب سے بڑا روڑا بنا ہوا ہے۔ یہ عملاً ہر اس تحریک کا دشمن ہے جو ملک کو اسلام کی طرف لے جانا چاہتی ہو اور ہر اس تحریک کا دوست ہے جو ملک میں مادہ پرستی اور اخلاقی انارکی پھیلا رہی ہو، اس کی دوڑ ہر بار دور سے زیادہ جس منزل کی طرف ہے وہ نیشنلزم ہے۔ وہ اسی نظریے کو اپنے تمام امراض کا علاج سمجھ رہا ہے اور یہ کچھ مسلمان ملکوں ہی پر موقوف نہیں ہے بلکہ ہر وہ قوم جو مغربی چمک دمک سے مرعوب ہے وہ اسی نظریے کو [illegible]

ان مسلمان ملکوں میں منظم و منضبط اسلامی تحریکوں کی شکست و ریخت اور اسلام پسند افراد کی مغلوبیت نے بہت سے لوگوں پر مایوسی کی کیفیت طاری کر دی ہے اور وہ یہ سوچنے لگے ہیں کہ شاید غلبۂ اسلام کی آرزو پوری نہ ہو گی۔ جہاں تک میرے جائزے کا تعلق ہے اس مایوسی کے لیے ظاہری اور سطحی بنیاد تو ضرور موجود ہے لیکن کوئی حقیقی اور قوی بنیاد موجود نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس انداز کچھ ایسا ہے کہ مغرب پرستی کی ہانڈی میں آخری ابال آچکا ہے میرے نزدیک مسلمان ملکوں میں فوجی بغاوتیں مغربی طاقتوں اور مغرب پرستوں کے ترکش کا آخری تیر ہے جو انہوں نے غلبۂ اسلام کے خلاف استعمال کیا ہے اس کے بعد پوزیشن بدلنے والی ہے۔ جن لوگوں نے اسلامی تحریکات کے [illegible] کا بغور مطالعہ کیا ہے وہ اس سے اختلاف نہ کریں گے کہ ان ملکوں میں [illegible] حکومت پر قبضہ کرنے [illegible] فوجوں نے اپنے [illegible] کیا ہے جب ان ملک میں اسلامی [illegible]

اشارات

مصر ہو یا انڈونیشیا، پاکستان ہو یا ترکیہ ہر جگہ یہی صورت پیش آئی ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ صورت حال کی اس یکسانی کا سبب کیا ہے؟ میرے نزدیک اس سوال کا جواب یہ ہے:۔ احیائے اسلام کی جدوجہد کا پھیلاؤ۔

یہ بات کسی سے مخفی نہیں ہے کہ تمام مسلمان ملکوں میں مغربی طاقتیں آج بھی ایک دوسرے انداز سے اثر انداز ہیں اور ان کی ریشہ دوانیاں مسلسل جاری ہیں، ان کے سفارتخانے اور ان کے تمام ذرائع و وسائل اس بات پر کڑی نظر رکھتے ہیں کہ کس مسلمان ملک میں کیا ہو رہا ہے اور جس چیز پر ان کی خفیہ کتاب میں سب سے نمایاں اور اہم کراس لگ رہا ہے وہ ہے احیائے اسلام کی جدوجہد۔ انھوں نے اسلامی ممالک میں اس جدوجہد کو روکنے اور اسلامی اثرات کو ختم کرنے کی تمام تدبیریں اختیار کیں اور جب دیکھ لیا کہ وہ اس کے اثرات کو پھیلنے سے روک نہیں سکتے تو انھوں نے مسلمان فوجوں کو جن میں پچانوے فی صدی ان کے تہذیبی غلام بھرے ہوئے ہیں بھڑکا دیا وہ اپنے کیمپوں سے دندناتی ہوئی نکلیں اور حکومتوں پر قابض ہو گئیں۔ یہ آخری تیر جسے وہ بچا کر رکھے ہوئے تھے سر ہو چکا ہے۔

جن لوگوں نے اسلامی ممالک کا دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے وہ بھی جانتے ہیں کہ مغرب پرست طبقے میں بھی سب سے زیادہ جو لوگ سر سے پاؤں تک مغربی تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہیں وہ ہیں مسلمان فوجوں کے سپاہی اور افسر۔ ان بیچاروں کو مغربیت کے سوا کوئی دوسری تربیت سرے سے ملی ہی نہیں ہے، وہ اسلام سے بالکل ناواقف رکھے گئے ہیں اور اس بات کی پوری کوشش کی گئی ہے کہ ان کے کیمپوں تک اسلامی تحریک کی ہوا بھی نہ پہنچے۔ یہ ان ملکوں میں مغربی تہذیب کا آخری سہارا ہیں۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں اس آخری سہارے کو میدان سیاست میں لعنت راٹ کرنے کے لیے لایا گیا ہے اس کے بعد دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو اجنبی طاقتیں پھر ان ملکوں پر اسی طرح قابض ہو جائیں جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تھیں یا اسلام مدافعت کے بجائے اقدام کی پوزیشن اختیار کرے۔ کیا ہوگا؟ اس کا فیصلہ تو لوح محفوظ میں محفوظ ہے لیکن حالات کے مطالعے سے امید بندھتی ہے کہ ان شاء اللہ دوسری ہی صورت رونما ہوگی۔

ابھی جس امید کا ذکر کیا گیا ہے اس کی بنیاد صرف حالات نہیں ہیں بلکہ اس کی اصل اساس اسلام کی ذاتی دلکشی ہے اسلام کے اصول صداقت، حقانیت اور افادیت کے لحاظ سے خود اپنی ذات میں اس قدر زبردست کشش رکھتے ہیں کہ ایک طرف وہ غیر متعصب غیر مسلموں کے دلوں میں گھر کرتے ہیں اور دوسری طرف کسی ملک کی بھی مسلمان اکثریت بحیثیت مجموعی انھیں چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوتی، اسلام کو پہلے بھی نسلی اور خاندانی مسلمانوں کے مقابلے میں نسلی اجنبی غیر مسلموں کی صفوں سے حمایتی ملتے رہے ہیں اور آج بھی مل رہے ہیں۔

افریقہ کے قبائلی لوگوں کو چھوڑیے جنھیں غیر متمدن سمجھا جاتا ہے خود ان مغربی ملکوں سے بھی جن کی تہذیب پر مسلمانوں کا ایک طبقہ جان و دل سے فدا ہے۔ اسلامی تہذیب کو اپنے فدائی مل رہے ہیں اگرچہ ابھی ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ مغربی ممالک کے کتنے ہی نیک طبع لوگ جو اپنے ماحول سے اونچے اٹھ کر تلاش حق کا جذبہ رکھتے ہیں اپنی رنگین اور آنکھوں کو خیرہ کرنے والی مغربی تہذیب کو چھوڑ کر اسلام کی سادہ اور دلوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی تہذیب اختیار کر رہے ہیں ان میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔ ان میں بہت سے افراد ایسے ہیں جو تھوڑے عرصے میں اسلام کے بارے میں اتنا صحیح اور جچا تلا علم حاصل کر لیتے اور پھر دو ٹوک انداز میں اس طرح اس کی حمایت کرتے ہیں کہ مغربی تعلیم یافتہ مسلمان ہی نہیں بہت سے علمائے دین کے مقابلے میں بھی ان کا علم اور اظہار حق قابل رشک ہو جاتا ہے۔ اسی شمارے کے حصہ تراجم میں ایک خاتون نو مسلمہ کے انگریزی مضمون کا ترجمہ دیا جا رہا ہے وہ ہماری اوپر کہی ہوئی بات کا واضح ثبوت ہے۔ اس مضمون میں مسلمان حکومتوں کے با اقتدار طبقوں کے ذہنی ساخت اور ان کے میلانات و رجحانات کا بہت ہی گہرا اور صحیح تجزیہ کیا گیا ہے اور حقیقی اسلام کی جاندار نمائندگی کی گئی ہے وہ لکھتی ہیں :-

اگر اسلام نے نئی دنیا کے ساتھ مطابقت پیدا نہ کی تو وہ ختم ہو جائے گا" یہ وہ الفاظ ہیں جو مسلمان ملکوں کا مغربی تعلیم یافتہ اور با اقتدار طبقہ مسلسل دہراتا رہتا ہے اور وہ یہ تنبیہ کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا کہ ہم لوگ گزرے ہوئے زمانے میں زندگی بسر نہیں کر سکتے، ہمیں تعلیم دی جاتی ہے کہ عہد گزشتہ کو واپس لانے کی کوشش محض خام خیالی ہے کیونکہ کوئی شخص بھی تاریخ کے میلان کو بدل نہیں سکتا، لہذا ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ بدلتی ہوئی سیکولر سوسائٹی کے مطالبات مان لیں اور اپنے اعتقادات انہیں سانچوں میں ڈھال لیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ طاقت حاصل کرنے کے لیے قرآن کی ان تشریحات و تعبیرات کو رد کر دینا چاہیے جو نسلاً بعد نسل ہوتی چلی آ رہی ہیں، اور قرآن کو آزادانہ جدید زندگی کی روشنی میں پڑھنا چاہیے —— عملی طور پر وہ تمام اصلاحات جن کی مسلمان حکومتیں حمایت کرتی ہیں اپنے دماغ میں یہی منزل مقصود رکھتی ہیں۔"

قرآن کی قدیم تشریحات و تعبیرات کو رد کرنے کا مقصد کیا ہے اسے آگے ملاحظہ کیجیے۔

"مغربی تعلیم یافتہ لیڈر کہتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ کے لیے خلافت کے خاتمے کو قبول کر لینا چاہیے اور اس امکان کو خارج از بحث سمجھنا چاہیے کہ آئندہ وہ کبھی زندہ ہو سکے گی۔ اب وہ حکومت و سیاست جس کی

بنیاد مذہب پر ہو عہد حاضر کی قابل نفرت علامت سمجھی جاتی ہے لہٰذا دنیائے جدید میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے سیکولر حکمرانی سے مصالحت کر لینی چاہیے اور اپنے آپ کو اسی کے موافق تیار کرنا چاہیے "

مذہبی حکومت کو رد کرنے اور سیکولر حکومت کو قبول کرنے کے لیے یہ طبقہ جو دلیل ارشاد فرماتا ہے وہ یہ ہے :-

"ان کا دعویٰ ہے کہ خلافت و حکومت اسلام کا کوئی حقیقی جزو نہیں ہے اس لیے کہ پیغمبر علیہ السلام کا مشن صرف تبلیغ میں محدود تھا انھوں نے کبھی بھی حکومت کی خواہش نہیں کی وہ صرف حالات تھے جنھوں نے ان کو حکومت قائم کرنے پر مجبور کر دیا "

اس دعویٰ کو رد کرنے کے لیے مغربی تہذیب کی گود میں پلی ہوئی نو مسلمہ خاتون نے جو الفاظ استعمال کیے ہیں وہ یہ ہیں :

"کوئی علمی ونکاری بددیانتی اتنی گہری نہ ڈوبی ہوگی جتنی ان لوگوں کی خیانت ڈوب چکی ہے --- اسلام ایک اسلامی جماعت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اسلامی جماعت منظم اداروں اور قیادت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی "

اس خاتون نے اپنے الفاظ میں گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشہور جملے لا اسلام الا بجماعۃ ولا جماعۃ الا بامارۃ (اسلام جماعت کے بغیر نہیں اور جماعت امارت کے بغیر نہیں) نقل کر دیے ہیں۔ یہ اسلام کا کتنا صحیح مطالعہ اور کس قدر صحت مند رجحان وار نمائندگی ہے۔ عرصہ دراز کی غلامانہ زندگی اور سیکولرزم کے استیلاء و نفوذ نے اپنا منحوس سایہ مغرب پرست اور اسلام سے ناآشنا مسلمانوں ہی پر نہیں ڈالا ہے بلکہ یہ بہت سے مخلص مسلمانوں اور علمائے دین تک دراز ہو چکا ہے ان کے نزدیک بھی اسلام کو حکمراں طاقت بنانے کی سعی ضروری نہیں ہے۔ وقت کی باطل حکومت اسلام کے جتنے اجزاء پر عمل کی اجازت دے اس پر عمل کرنا اور تقریر و تحریر کے ذریعہ اسلام کے دین حق ہونے کی تبلیغ کرتے رہنا کافی ہے اور اس طرح غیر اسلامی حکومتوں کے سائے میں بھی اعلیٰ سے اعلیٰ اسلامی زندگی بسر کی جا سکتی ہے۔ یہ ہے وہ نقطۂ نظر جو ان ملکوں میں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں اور ان ملکوں میں بھی جہاں وہ اقلیت میں ہیں احیائے اسلام کی راہ کا سب سے بڑا روڑا بنا ہوا ہے۔ لیکن شکر ہے یہ روز بروز کمزور ہو رہا ہے اور ایک نہ ایک دن اسلامی قافلوں کی گرد راہ بن جانا اس کے لیے مقدر ہے۔ یہاں ایک سوال ذہن میں ابھرتا ہے اسے بھی حل کر لینا چاہیے کیا سبب ہے کہ بیسیوں پشت کے خاندانی مسلمان اسلام کے بارے میں ناقص، نامکمل اور غلط تصور رکھتے ہیں اور مغربی تہذیب سے نکل کر آنے والے نئے نئے مسلمان اسلام کے کامل و مکمل اور متحرک و توانا حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں میرے نزدیک اس کا اصل سبب یہ ہے کہ وہ اسلام کو کتاب و سنت، سیرت محمدی اور عہد رسالت و عہد صحابہ و تابعین

کی تاریخ سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس اسلام سے متاثر ہوتے ہیں جو یہ ماخذ ان کے سامنے پیش کرتے ہیں اور یہی وہ چیز ہے جو توقع پیدا کرتی ہے کہ ان شاء اللہ اسلام پھر ایک حکمراں طاقت بن کر رہے گا اگر اللہ نے کتاب وسنت کی حفاظت کا ذمہ نہ لیا ہوتا تو کم سے کم وقت کی طاقتور مغربی تہذیب کا کوئی تعلیم یافتہ شخص اسلام قبول نہ کرتا۔

جو شخص بھی تعصب اور تقلید سے پاک ہو کر مخلصانہ طور پر دین اسلام کی حقیقت جاننا چاہے گا اسے اس دین کے اصل ماخذ تک پہنچنا ہی پڑے گا۔ اگر یورپ وامریکہ کی سعادت مند روحیں اپنے یہاں کی مستشرقین کی لکھی ہوئی "اسلامی کتابوں" سے اسلام کو سمجھنا چاہتیں تو وہ اس سے قریب ہونے کے بجائے اور دور ہو جاتیں اسی طرح اگر وہ موجودہ مسلم معاشرے سے اس کی حقیقت جاننا چاہتیں تو ان کی تشنگی کبھی دور نہ ہوتی اس لیے وہ ان دونوں سے آگے بڑھ کر کتاب وسنت کے چشمۂ حیوان تک پہنچ جاتی ہیں اور پھر اس صاف وشفاف آب حیات کے بعد انھیں کسی دوسرے پانی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ یہاں پہنچ کر مغربی تہذیب سے اکتایا ہوا جویائے حق خدا کے اتارے ہوئے ایک ایسے دین سے واقف ہوتا ہے جو اس کے جسمانی وروحانی تمام داعیات کا مکمل جواب ہے۔ دوسری طرف خاندانی لحاظ سے مشرقی اور خیالات ومعاشرت کے لحاظ سے مغربی مسلمان اسلام کو سمجھنے کے لیے بھی متعصب مستشرقین ہی کو اپنا استاد بناتا ہے اور وہ جو کچھ دیں اس کو اسلام سمجھتا ہے ___ علماء وصوفیہ کا وہ گروہ جو اچھے خلوص کے ساتھ یہ خیال قائم کیے ہوئے ہے کہ دین کو غالب اور اس کو حکمراں طاقت بنانے کی جدوجہد کا دین مکلف ہی نہیں ہے اس کا اصل سبب بھی یہی ہے کہ وہ دین اسلام کو، کتاب وسنت، سیرت محمدی اور سیرت خلفائے راشدین سے سمجھنے کی سعی نہیں کرتا۔ اگرچہ نظری طور پر وہ بھی کتاب وسنت ہی کو اصل ماخذ مانتا ہے لیکن فی الواقع وہ موجودہ صدی یا اس کے کچھ اوپر کی صدیوں کی تاریخ اسلامی پر اعتماد کرتا ہے اور اپنے عمل کے لیے وہیں سے روشنی حاصل کرتا ہے۔

دین اسلام کی دلکشی اور اس کے اصولوں کی عمدگی کا ایک اور مظہر یہ ہے کہ آج تک کہیں بھی مسلمان بحیثیت مجموعی اسے ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ ترک قوم کی تاریخ اس لحاظ سے بڑی ایمان افزا ہے۔ مصطفیٰ کمال پاشا کی تیس سالہ [illegible] مغرب پرست [illegible] اپنی قوم کو حقیقی اسلام سے برگشتہ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں [illegible]

خود قائدِ مغربیت، برسرِ اقتدار آنے کے بعد کافی دنوں زندہ رہا اور زندگی کے آخری لمحے تک اپنے غیر اسلامی موقف سے پیچھے نہ ہٹا اور اس کے بعد اس کے شاگردِ رشید عصمت انونو نے بھی عرصۂ دراز تک اس کے مشن کو کامیاب بنانے کی پر زور جد وجہد کی اور آج بھی اپنی ریشہ دوانیوں سے غافل نہیں ہے لیکن حاصل کیا نکلا؟ کیا ترک قوم کی اکثریت مغرب پرست ہوگئی؟ کیا وہاں کی اکثریت نے اسلامی انفرادیت کے خاتمے کو ہنسی خوشی قبول کرلیا؟ لاطینی رسم الخط، عربی زبان سے دشمنی، کتاب وسنت کی تعلیم پر قدغن، قانون اسلامی کا الغاء، عربی میں اذان کی ممانعت، قانوناً مغربی لباس کا لزوم، مغربی رہن سہن کی ترغیب، آخر کس چیز کو وہاں کی مسلمان اکثریت نے قبول کیا؟ یہ بات اس وقت زیرِ بحث نہیں کہ اس مغرب پرست طبقے نے خالص دنیاوی نقطۂ نظر سے بھی اپنے ملک کو کوئی حقیقی فائدہ پہنچایا یا نہیں؟ اس وقت صرف اس بات کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ تمام حکومتی ذرائع وسائل کو اس راہ میں جھونک دینے کے باوجود مغربی تہذیب، اسلامی تہذیب پر غالب نہ آسکی اور آج بھی ترکی کا دل اسلامی تہذیب اور اسلامی انفرادیت کے لیے تڑپ رہا ہے کیا یہ چیز اسلامی تہذیب کی دل کشی، افادیت اور فوقیت کی دلیل نہیں ہے؟ جاننے والے اس بات کو پہلے بھی جانتے تھے لیکن جنرل گرسل کی بغاوت، تازہ الکشن، اور ترکی کی موجودہ ناپائدار حکومت نے تمام دنیا پر یہ بات واضح کردی ہے کہ اسلام آج بھی ترکی میں زندہ ہے اور اس سے محبت کرنے والے اسے حکمراں طاقت بنانے کے لیے بے چین ہیں۔ اسلام پسندوں اور الحاد پسندوں کے درمیان کش مکش ترکی میں بھی کسی مسلمان ملک سے پیچھے نہیں ہے اور کیا عجب کہ سب سے پہلے ترکی ہی میں اسلام اقدامی پوزیشن اختیار کرلے

مسلمان ممالک کے اس مختصر تاریخی جائزے میں کیا بھارت کے لیے بھی کوئی سبق ہے؟ میرا جواب اثبات میں ہے بلکہ یہ جائزہ اسی لیے لیا گیا ہے کہ ہم سب اس سے سبق لیں۔ میرے نزدیک اس جائزے میں بھارت کی اکثریت کے لیے بھی سبق ہے اور یہاں کی مسلمان اقلیت کے لیے بھی — اکثریت کو اس سے یہ سبق لینا چاہیے کہ جب مسلمان لیڈر بھی حکومت کی تمام طاقت استعمال کرکے اپنے ملکوں سے اسلامی انفرادیت اور اسلامی تہذیب کا خاتمہ نہ کرسکے تو بھارت کے غیر مسلم لیڈروں کو اس لاحاصل کام میں وقت، طاقت اور دولت ضائع کرنا چاہیے اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی تہذیب فی الواقع اتنی جان دار، مفید اور دل کش ہے کہ کوئی [illegible] جماعتی [illegible] کوشش و جو [illegible] اسے ترک نہیں کرسکتی اس لیے برادرانِ وطن کو اسے مٹانے کی سعی کرنے کے بجائے اس کی خوبیاں دریافت [illegible]

خدا کی تلاش، خدا کی کتاب میں

(سید جلال الدین صاحب عمری)

انسان خدا سے اپنا رشتہ جوڑنا چاہتا ہے لیکن وہ نہیں جانتا کہ خدا کیا ہے اور اس کی صفات کیا ہیں؟ قرآن خدا اور انسان کے درمیان واسطہ ہے، جو انسان کو خدا تک پہنچاتا ہے۔ خدا کو ہم نے نہیں دیکھا لیکن قرآن کھول کر ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ قرآن اپنے حروف والفاظ میں خدا کی مکمل تصویر ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے۔ خدا کا تصور جس قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ آپ کو قرآن میں ملے گا دنیا کی کسی دوسری کتاب میں نہیں مل سکتا۔ خدا کی ذات وصفات سے بحث کرنے والی بیشتر کتابیں انسانی ذہن کی پیداوار ہیں۔ یہ کتابیں ان کوششوں کو ظاہر کرتی ہیں جو مختلف زمانوں میں خدا کو سمجھنے کے لیے ہوتی رہی ہیں۔ خدا کو اپنا موضوع بنانے والی کتابوں میں کچھ کتابیں وہ ہیں جن میں خود خدا نے بتایا ہے کہ وہ کیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟ خدا جو انسان کی نگاہ سے پوشیدہ ہے، ان کتابوں کے ذریعے بے نقاب ہوا ہے۔ ان کتابوں کو اصطلاح میں آسمانی کتابیں کہا جاتا ہے۔ قرآن انہی کتابوں میں سے ایک ہے جو آسمانی کتابوں میں سب سے آخری کتاب ہے۔ اس کے بعد آسمانی کتابوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ قرآن کو نازل ہوئے چودہ صدیاں گذر چکیں لیکن انسانی تاریخ اتنی قدیم ہے کہ اس کے لیے یہ واقعہ عہد جدید کا واقعہ ہے۔ قرآن سے پہلے ہر دور میں آسمانی کتابیں آتی رہیں اور انسانی غفلت کی نذر ہوتی رہیں حتی کہ ان میں سے بیشتر کے نام بھی انسان کے حافظے سے مٹ گئے۔ خدا کی طرف سے بار بار انسان کو ایک بے پایاں دولت ملتی رہی اور وہ بار بار اس کو کھوتا رہا۔ قرآن انسانیت کی اسی متاع گم گشتہ ہے جو اس کو آخری مرتبہ نصیب ہوئی اور آج سوائے قرآن کے اور کوئی آسمانی کتاب اپنی صحیح شکل میں محفوظ نہیں ہے۔ اس وقت جو کتابیں آسمانی کتابوں کے نام سے ہمارے سامنے موجود ہیں وہ اپنی اصل حالت میں باقی نہیں ہیں۔ انسانی تحریفات نے ان میں سے کسی کتاب کو خدا کی کتاب رہنے نہیں دیا۔ خدا نے جو چشمہ معانی جاری کیا اس کو انسانوں نے اپنی خواہشات سے گدلا کر دیا۔

اب صرف قرآن ہمارے ہاتھ میں ہے جو پورے وثوق کے ساتھ بتاتا ہے کہ رسولوں نے خدا کا کیا تعارف کرایا تھا اور رسولوں کے ذریعہ خدا کی جو تعلیمات انسان کو ملی ہیں قرآن ان سب کا خلاصہ اور جوہر ہے۔ آپ قرآن سے معلوم کر سکتے ہیں کہ خدا کے رسول کس لیے دنیا میں آئے تھے اور ان کا کیا پیغام تھا؟

قرآن جس ذات پر نازل ہوا اس کو حکم ہوا تم کہہ دو۔ " هٰذَا ذِكْرُ مَنْ مَّعِيَ وَذِكْرُ مَنْ قَبْلِي " الانبیاء - ۲۴ (یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو میرے ساتھ ہیں اور یہی ان لوگوں کا ذکر رہا ہے جو مجھ سے پہلے گزر چکے ہیں۔)

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (یونس ۳۷)

یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اس کو کوئی شخص گھڑ کر پیش کر دے۔ یہ خدا کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور یہ اپنے سے پہلے کی آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ یہ (اس) " الکتاب " کی تفصیل ہے (جس کا ذکر خدا کے رسول بہت پہلے سے کرتے رہے ہیں) اس میں کوئی شک ہی نہیں کہ یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

سورۂ یوسف کے آخر میں فرمایا:

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ (یوسف - ۱۱۱)

یہ خود ساختہ کلام نہیں ہے بلکہ یہ ان تعلیمات کی سراپا تصدیق ہے جو اس سے پہلے پیش کی جاتی رہی ہیں۔ اور اس میں ہر چیز کی تفصیل ہے اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔

اس مضمون میں ہم خدا کی اس کتاب سے خدا کو سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

قرآن کتابِ معرفت ہے جس سے انسان کو خدا کا صحیح شعور ملتا ہے۔ قرآن کو پڑھتے ہوئے آپ محسوس کریں گے کہ ایک بے پایاں اور لامحدود ہستی آپ کے ذہن کی محدود دنیا میں سمائی چلی جا رہی ہے۔ کائنات کی وسعتیں جس حقیقت کی متحمل نہیں ہیں، قرآن آپ کو اس قابل بناتا ہے کہ آپ اسے اٹھا سکیں۔ قرآن میں آپ وہ چیز دیکھ لیتے ہیں جس کا احاطہ اپنے سر کی آنکھوں سے کبھی نہیں کر سکتے۔ جس کلام کے سننے کی آپ میں تاب نہیں، قرآن کے الفاظ میں اس کی آواز آپ کے کان میں گونجنے لگتی ہے۔ ایک اتھاہ سمندر جس کی پہنائیاں نامعلوم ہیں قرآن کے

بیانات میں آپ اس کی سیر کرتے ہیں۔ جو راہ خطرات سے گھری ہوئی ہے قرآن اس راستے آپ کو اس طرح گزارتا ہے کہ کوئی اندیشہ اور کوئی خطرہ باقی نہیں رہتا۔ قرآن کی یہ خصوصیت اس کا سب سے بڑا معجزہ ہے کہ اس نے ایک غیر محسوس حقیقت کو ہمارے ذہن سے اس قدر قریب کر دیا ہے کہ وہ ایک محسوس واقعہ معلوم ہونے لگی ہے۔

ہر کتاب کا ایک مقصد ہوتا ہے جس کے لیے وہ لکھی جاتی ہے۔ قرآن نے بھی اپنا مقصد بیان کیا ہے اور وہ ہے "دعوت الی اللہ" یعنی انسانوں کو خدا کی طرف بلانا۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ	تم کہہ دو یہ ہے میری راہ، میں تم کو خدا کی طرف بلا رہا ہوں۔ میں اور میرے پیچھے چلنے والے بصیرت پر ہیں۔
(یوسف ۱۰۱)	

قرآن میں ایک صاحب ایمان شخص کی تقریر نقل ہوئی ہے۔ جو اس نے دربار فرعون میں کی تھی۔ اس تقریر کے چند جملے یہ ہیں :۔

وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝	اے میری قوم یہ کیا بات ہے کہ میں تم کو نجات کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور تم مجھے جہنم کی طرف بلا رہے ہو۔ تم مجھ کو اس بات کی دعوت دیتے ہو کہ میں خدا کے ساتھ کفر کروں اور اس کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کروں جس کا مجھے کوئی علم نہیں ہے اور میں تم کو خدائے عزیز و غفار کی طرف بلا رہا ہوں۔
(المومن ۴۲، ۴۱)	

خدا کا رسول "نذیر مبین" ہوتا ہے، وہ انسانوں کو ایک زبردست خطرے سے آگاہ کرنے آتا ہے وہ ان کے درمیان اعلان کرتا ہے :۔

فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (الذاریات ۔ ۵۰)	دوڑو خدا کی طرف مجھے اس نے "نذیر مبین" بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے۔

یہی "دعوت الی اللہ" ہے جسے قرآن میں کہیں "سبیل رب" اور "صراط رب" (خدا کی راہ) اور کہیں "عبادت رب" (خدا کی بندگی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

قرآن کو "احسن الحدیث" (الزمر ۲۳) کہا گیا ہے یعنی حسین ترین بیان۔ خوبصورتیا سبا انی بات جو حسن بیان

کے سب سے اونچے مقام پر ہے۔ کسی بات میں حسن اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ وہ حسن کی ترجمانی کرتی ہے جو لفظ ترجمانِ حسن ہوتا ہے وہ خود بھی حسین بن جاتا ہے۔ قرآن کائنات کے سب سے بڑے حسن کی ترجمانی کرتا ہے۔ قرآن میں آپ کو حقیقت اور صداقت کی حسین ترین تعبیر ملے گی۔ اگر آپ حسن کو الفاظ میں سمیٹ دیں تو وہ قرآن ہوگا۔

خدا اس کائنات کا نور ہے۔ یہاں جو نور اور چمک ہے، جو حسن اور جمال ہے، جو کمال اور خوبی ہے سب اسی کا پرتو ہے۔ قرآن "احسن الحدیث" اس لیے ہے کہ وہ انسانوں کو اس حسنِ حقیقی کی طرف دعوت دیتا ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دور رہنے والوں کو آواز دیتا ہے کہ دوڑ کر اس کے دامن میں پناہ لیں۔ وہ گم کردہ راہ انسانیت کو صراطِ مستقیم دکھاتا ہے۔ وہ اس نورِ حقیقی تک پہنچاتا ہے جس سے یہ کائنات روشن ہے وہ نور کی طرف راہنمائی کرتا ہے اس لیے سراپا نور ہے۔ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (النساء۔ ۱۷۵) لوگو ہم نے تمہاری طرف ایک نور اتارا ہے ایسا نور جو کھلا ہوا ہے۔)

خدا کی طرف دعوت قرآن کے نزدیک حسن و جمال سے بھری ہوئی بات ہے۔ جب انسان اس کو اپنی زبان پر لاتا ہے تو اس کا کلام سراپا حسن اور خوبی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ خدا کا داعی حقیقت میں خیر و خوبی اور حسن کا داعی ہے۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ	اس سے زیادہ اچھی بات کہنے والا اور
دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّ	کون ہوگا جس نے انسانوں کو خدا کی طرف دعوت
قَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ○	دی اور اس کے مطابق خود بھی اچھے اعمال اختیار
(حم سجدہ۔ ۳۳)	کیے اور کہا کہ میں مسلم ہوں۔

خدا کی طرف دوڑنے اور خدا کی طرف بلانے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کو خدا کی عظمت اور برتری کا مکمل شعور ہو۔ وہ اپنی اور خدا کی حیثیت سے پوری طرح واقف ہو سو وہ جانتا ہو کہ خدا کی ذات کیا ہے اور وہ کن خصوصیات کا حامل ہے؟ اس کے بغیر نہ وہ خود خدا تک پہنچ سکتا ہے اور نہ دوسروں کو خدا کی طرف بلا سکتا ہے۔ جس منزل کی راہ و رسم سے انسان واقف نہیں اس تک اس کی رسائی ممکن نہیں ہے۔

قرآن، انسان کو خدا کی صحیح معرفت عطا کرتا ہے۔ خدا کیا ہے، اس کی صفات کیا ہیں، اس کی حکمت کیا ہے اس کے قوانین کیا ہیں، وہ اپنے بندوں سے کیا چاہتا ہے؟ یہی موضوعات ہیں جن سے پورے قرآن میں بحث کی گئی

کہیں آپ اس کو اپنے اس موضوعِ خاص سے ہٹا ہوا نہیں پائیں گے۔ قرآن میں آپ کو بندگی کے اصول ملیں گے، اخلاق کی تعلیم ملے گی، تہذیب و معاشرت اور سیاست کے احکام ملیں گے۔ اسی طرح آپ قرآن میں جنت اور دوزخ کا ذکر پائیں گے۔ قوموں کے عروج و زوال کے احوال دیکھیں گے لیکن ان سب کا مقصد صرف یہ ہے کہ انسان کو خدا کا صحیح شعور عطا کیا جائے اور وہ اس کی مرضی و نامرضی سے واقف ہو جائے۔

کسی تحریر کو مکمل کرنے کے لیے مختلف علوم و فنون سے بحث کرنی پڑتی ہے لیکن یہ ساری بحثیں تحریر کے اصل موضوع سے غیر متعلق نہیں ہوتیں بلکہ اسی کے گرد گھومتی ہیں۔ اسی طرح قرآن کا موضوع خدا ہے۔ آپ اس کو صرف خدا سے بحث کرتا ہوا پائیں گے۔ وہ نئے نئے زاویوں سے اپنے موضوع کو سمجھاتا ہے۔ اور جو سوالات ابھرتے ہیں ان کے جواب دیتا ہے۔ جہاں یہ مسائل ختم ہوئے وہ پھر اپنے اصل موضوع کی طرف لوٹ آتا ہے۔ چنانچہ قرآن کا بہت بڑا حصہ خدا کی ذات و صفات کے بیان پر مشتمل ہے۔

اس موقع پر امام ابن قیمؒ کی ایک بحث کو ہم یہاں ان ہی کے الفاظ میں مختصر کر کے پیش کرتے ہیں

...... ومعلوم ان حاجتهم الى معرفة ربهم وفاطرهم فوق مراتب هذه الحاجات كلها فانه لا سعادة لهم ولا فلاح ولا صلاح ولا نعيم الا بان يعرفوه ويعتقدوه ويكون هو وحده غاية مطلوبهم والتقرب اليه قرة عيونهم ومتى فقدوا ذلك كانوا اسوأ حالا من الانعام وكانت الانعام اطيب عيشا في العاجل واسلم عاقبة في الآجل ..... واذا علمت ان ضرورة العبد الى معرفة ربه فوق كل ضرورة كانت العناية ببيانها ايسر الطرق واعدلها وابينها

...... یہ بات معلوم ہے کہ انسان ہوا اور پانی کے اتنے محتاج نہیں ہیں جتنے وہ اس بات کے محتاج ہیں کہ اپنے رب اور خالق کو پہچانیں، کیونکہ ان کے لیے سعادت، فلاح و صلاح اور (ہر طرح) کی نعمت کی راہ صرف یہ ہے کہ وہ خدا کی معرفت حاصل کریں اور اُس پر یقین رکھیں، تنہا خدا کی ذات ان کی سعی و طلب کا مقصود ہو اور خدا سے قربت ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک بن جائے۔ اس دولت کو کھونے کے بعد ان کی حالت چوپایوں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے۔ بلکہ چوپایوں کی زندگی ان سے زیادہ اچھی ہے اور ان کی آخرت بھی محفوظ ہے..... جب یہ بات واضح ہے کہ بندے کے لیے خدا کی معرفت ایک ایسی ضرورت ہے جو اس کی ہر ضرورت پر مقدم ہے تو اس کا اہتمام بھی کیا گیا ہے کہ خدا کی ذات و صفات کو زیادہ سے زیادہ آسان و واضح

...... فان الله تعالى لما بين هو
لعباده من صفة ملئكته وشانهم
وافعالهم اكثر مما ذكر لهم
من نعوت جلاله وصفات كماله
.... فان القرآن بل الكتب
المنزلة مملوءة بذكر الفوقية وعلو
الله على عرشه وانه تكلم ويتكلم
وانه موصوف بالصفات وان
له افعالا تقوم به هو بها
فاعل وانه يرى بالابصار
الى غير ذالك من نصوص آيات
الصفات واخبارها التى اذا
قيس اليها نصوص حشر هذه
الاجساد وخراب هذا العالم
واعدامه وانشاء عالم آخر
وجدت نصوص الصفات
اضعاف اضعافها حتى قيل
ان الآيات والاخبار
الدالة على علو الرب
على خلقه واستوائه
على عرشه تقارب الالوف
وقد اجمعت عليها
الرسل من اولهم الى

اور روشن طریقہ سے بیان کر دیا جائے (تاکہ بندہ آسانی
سے اپنی یہ ضرورت پوری کر سکے) .... اللہ
تعالیٰ نے بندوں سے اپنے فرشتوں کی صفت ان کے
احوال اور ان کے افعال اعمال کا تفصیل سے ذکر
کیا ہے لیکن اس نے اپنے وصف جلال اور صفات
جمال کا جتنا تذکرہ کیا ہے فرشتوں کا ذکر اس کا دسواں حصہ
بھی نہیں ہو...... قرآن بلکہ تمام آسمانی کتابیں
اس ذکر سے بھری ہوئی ہیں کہ خدا سب سے بلند و بالا
ہے اور وہ اپنے عرش کے اوپر متمکن ہے۔ اس نے
پہلے بھی گفتگو کی اور اب بھی کرتا ہے اور یہ کہ اس کی کچھ
صفات ہیں جن سے وہ متصف ہے، اس کے کچھ افعال
ہیں جو اسی کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور وہی
ان کو انجام دیتا ہے۔ اور یہ کہ وہ آنکھوں سے دیکھا
جا سکتا ہے وغیرہ بہت سے مسائل جو صفات سے متعلق
آیات و احادیث سے صریح طور پر ثابت ہوتے ہیں اگر
ان آیات و احادیث کو ان نصوص کے مقابلہ میں رکھ کر
دیکھا جائے جن میں حشر اجساد، اس عالم کی ویرانی اور
تباہی اور ایک دوسرے عالم کے وجود میں آنے کا ذکر
ہے (یعنی آخرت جیسے بنیادی مسئلہ کا ذکر) تو خدا کی صفات
سے متعلق نصوص کو تم کئی چند پاؤ گے۔ یہاں تک کہا
جاتا ہے کہ وہ آیات جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ
خدا اپنی مخلوق سے بلند ہے اور وہ عرش پر متمکن ہے
ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ یہ ایسے مسائل ہیں

اخوہم[1] — جن پر خدا کے اصل شروع سے آخر تک متعلق رہتے

قرآن جس ہستی پر نازل ہوا (صلی اللہ علیہ وسلم) اس کو سب سے پہلے خدا کی ذات و صفات کی تعلیم دی گئی کیونکہ اسی بنیاد پر آئندہ پورے دین کی تعمیر ہونے والی تھی حکم ہوا:۔

اِقْرَءْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ	پڑھ تو اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا
خَلَقَ ٥ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ	اس نے انسان کو بستہ خون سے پیدا کیا۔ پڑھ تو اور تیرا رب
عَلَقٍ ٥ اِقْرَءْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ	بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ اس نے
الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ	انسان کو تعلیم دی اس بات کی جس کو وہ نہیں
مَا لَمْ یَعْلَمْ ٥ (العلق ۵-۱)	جانتا تھا۔

یعنی خدا وہ ہے جو کائنات کا رب اور پروردگار ہے۔ کائنات اپنے بقا میں جس کی محتاج ہے۔ جو خالق جس کے بغیر وجود کہیں سے نہیں ملتا۔ جو اعلیٰ صفات اور خصوصیات رکھتا ہے جو سب سے برتر ہے جس سے بر تر کوئی نہیں۔ جو انسان کو وحی سے روشناس کرا رہا ہے، جس سے انسان از خود کبھی واقف نہیں ہو سکتا۔ اس طرح وحی کا آغاز ہی ان کلمات سے ہوا جو انسان کو خدا کا صحیح تعارف کرا رہے ہیں۔

قرآن کی جن آیات اور جن سورتوں میں خدا کی ذات و صفات سے بحث ہے ان کی خاص اہمیت ہے کیونکہ ان میں قرآن کے اصل موضوع سے براہ راست گفتگو ہوئی ہے۔

قرآن کھلتے ہی پہلی سورت جس کا آپ مطالعہ کریں گے اس میں خدا کا تعارف کرایا گیا ہے کہ خدا معبود ہے وہی سب کا ملجا و ماویٰ ہے۔ تمام حمد و ثنا اسی کے لیے ہے، وہ رب ہے اور سارے عالم کی پرورش کر رہا ہے، وہ رحمٰن و رحیم ہے اور کائنات اسی کے سہارے زندہ ہے، وہ آخرت کے دن کا مالک ہے اور انسانوں کا آخری حساب کتاب اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے بعد انسان کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ خدا کی طرف لپکے اور اپنے آپ کو اس کے سامنے ڈال دے، اسی کی طرف بڑھے اور اسی سے مدد چاہے کیونکہ یہی صراط مستقیم ہے۔ جو شخص اس راہ سے بھٹک جائے اس کو خدا کے غضب سے کوئی چیز بچا نہیں سکتی۔ دنیا اور آخرت میں اس کا ناکام ہونا یقینی ہے۔ اس طرح قرآن کے اس دیباچہ میں خدا کا تعارف بھی ہے اور اس کی طرف دعوت بھی ہے گویا قرآن کے پہلے ہی

---

[1] مختصر الصواعق المرسلة علی الجہمیة والمعطلة جلد ۱ صفحہ ۶۲، ۶۱

صفحہ میں قرآن کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے۔ اسی لیے اس سورۃ کو "ام القرآن" (قرآن کا جوہر) کہا گیا ہے[1]۔ حدیث میں کہا گیا ہے کہ سورہ فاتحہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ اس کے ایک حصہ کے بارے میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ میرا ہے اور دوسرے حصہ کے بارے میں فرماتا ہے کہ وہ میرے بندے کا ہے۔ میرا بندہ جو کچھ مانگے گا میں اس کو دوں گا۔

مَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فِی التَّوْرٰۃِ وَلَا فِی الْاِنْجِیْلِ مِثْلَ اُمِّ الْقُرْاٰنِ وَھِیَ السَّبْعُ الْمَثَانِیْ وَھِیَ مَقْسُوْمَۃٌ بَیْنِیْ وَبَیْنَ عَبْدِیْ وَلِعَبْدِیْ مَا سَاَلَ[2]

اللہ تعالیٰ نے ام القرآن جیسی سورۃ نہ توریت میں نازل کی اور نہ انجیل میں۔ یہ سات آیتیں ہیں جو بار بار دہرائی جاتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان تقسیم ہے اور میرے بندے کے لیے وہ سب کچھ ہے جو وہ مانگے۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ایک حصہ میں خدا کا تعارف ہے، اس کی عظمت اور بزرگی کا بیان ہے اور دوسرے حصے میں خدا کی طرف دعوت ہے لیکن یہ دونوں چیزیں دعا کی شکل میں انسان کی زبان پر جاری کر دی گئی ہیں تاکہ خدا کا صحیح شعور اس کے اندر زندہ رہے اور وہ بار بار اس کی طرف بڑھنے کی دعا کرتا رہے[3]۔

سورۂ اخلاص قرآن کی بہت ہی چھوٹی سورۃ ہے جو صرف پانچ جملوں پر مشتمل ہے۔ لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو قرآن کی سب سے بڑی سورۃ کہا ہے[4] اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں رحمٰن کی صفت کی

---

[1] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کی ایک روایت میں سورہ فاتحہ کے تین نام آئے ہیں "ام القرآن" (قرآن کا جوہر) "ام الکتاب" (اصل کتاب) "السبع المثانی" (سات دہرائی جانے والی آیتیں) ترمذی، کتاب التفسیر تفسیر سورۂ حجر۔ ابو داؤد، کتاب الصلوٰۃ باب فاتحۃ الکتاب۔ دارقطنی۔

[2] ترمذی، ابواب التفسیر (سورۃ الحجر) نسائی، کتاب الافتتاح تاویل قولہ عزوجل ولقد اٰتینٰک سبعًا من المثانی

[3] قرآن میں ہے ولقد اٰتینٰک سبعًا من المثانی والقرآن العظیم (ہم نے تم کو بار بار دہرائی جانے والی سات آیتیں اور قرآن عظیم عطا کیا ہے) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابی بن کعب رضی سے فرمایا کہ اس سے مراد سورۃ فاتحہ ہے۔ (بخاری، کتاب التفسیر و دیگر کتب حدیث)

[4] دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل اول سورۃ البقرۃ و آیۃ الکرسی۔

بیان کی گئی ہے[۱]

اسی طرح سورۂ بقرہ کی آیت ۲۵۵ (آیۃ الکرسی) کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی سب سے بڑی آیت کہا ہے[۲] یہ آیت خود آپ کو بتائے گی کہ وہ قرآن کی سب سے بڑی آیت کیوں ہے؟

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ	اللہ: نہیں ہے کوئی معبود مگر وہ۔ وہ زندہ
اَلْقَیُّوْمُ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ لَا	ہے اور قائم و دائم۔ اس کو نہ اونگھ آتی ہے اور نہ
نَوْمٌ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ	وہ سوتا ہے۔ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں
الْاَرْضِ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ	ہے سب اسی کا ہے۔ کون ہے جو اس کے سامنے کسی
عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ یَعْلَمُ مَا	کی سفارش کرے؟ الا یہ کہ وہ اس کی اجازت
بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ مَا خَلْفَهُمْ وَ لَا	دے۔ انسانوں کے سامنے جو کچھ ہے وہ اس کو بھی
یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ	جانتا ہے اور جو ان کی نگاہوں سے اوجھل ہے اسے
اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ	بھی جانتا ہے۔ انسان اس کے علم کے کسی بھی حصہ کا
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ لَا	احاطہ نہیں کر سکتے سوا اس کے کہ وہ اپنی مشیت سے کچھ بتا دے۔
یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا وَ هُوَ الْعَلِیُّ	اس کی کرسی (اقتدار) آسمانوں اور زمین پر وسیع
الْعَظِیْمُ	ہے ان کی نگرانی اس پر گراں نہیں ہے۔ وہ بلند و برتر
	اور صاحب عظمت ہے۔

یہ آیت قرآن کی سب سے بڑی آیت اس لیے ہے کہ خدا کی ذات و صفات کی جو تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے اس کو اس آیت نے اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ اس آیت کے بعد فرمایا۔

لَآ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَّبَیَّنَ	دین میں کوئی جبر نہیں۔ بلاشبہہ ہدایت ضلالت
الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ فَمَنْ یَّكْفُرْ	سے پوری طرح واضح ہو چکی ہے۔ پس جو شخص طاغوت

---

[۱] مسلم (کتاب فضائل القرآن) کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک صاحب امام تھے جو ہر رکعت میں قرأت ختم کرنے کے بعد سورۂ اخلاص ضرور پڑھتے۔ ان سے اس کی وجہ دریافت کی گئی تو جواب دیا "لانها صفة الرحمٰن فانا احب ان اقرأ بها" اس میں رحمٰن کی صفت بیان ہوئی ہے اس لیے اس کا پڑھنا مجھے پسند ہے۔ اس کا جواب معلوم کر کے آپ نے فرمایا کہ خدا بھی اس شخص سے محبت کرتا ہے۔ [۲] مسلم کتاب فضائل القرآن۔

بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲۵۶-۲۵۷)

کا انکار کرے اور خدا پر ایمان لائے تو اس نے ایک مضبوط رسی تھام لی۔ ایسی رسی جو ٹوٹ نہیں سکتی اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔ اللہ ان لوگوں کا ولی وکارساز ہے جو اس پر ایمان رکھتے ہیں وہ ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں پہنچاتا ہے لیکن جن لوگوں نے کفر کیا طاغوت ان کے ولی وکارساز ہیں جو ان کو نور سے (جو اس وقت ان کے سامنے قرآن کی شکل میں آرہا ہے) نکال کر تاریکیوں میں پہنچاتے ہیں یہ جہنمی ہیں جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

خدا کا جو تصور پیش کیا گیا ہے ان آیات میں اس کو دین سے تعبیر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ خدا کا یہ تصور ایک نور ہے۔ جو شخص اس نور سے محروم ہے خدا سے اس کا تعلق ٹوٹ گیا۔ شیطان اس کا ساتھی ہے اور اس کو بھٹکا رہا ہے۔ وہ اس وقت تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گا جب تک کہ جہنم میں نہ پہنچا دے۔

اس سے معلوم ہوا وہ کون سی روشنی ہے جو انسان کو قرآن سے ملتی ہے۔ انسان کے پاس وہ کیا چیز نہیں ہے جو قرآن اسے دیتا ہے۔ خدا کو پانے میں انسانی فکر نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائی ہیں۔ قرآن خدا کا ایسا تصور دیتا ہے جو انسانی لغزشوں سے پاک ہے۔ اس روشنی میں جو شخص خدا کو ڈھونڈے گا لازماً وہ خدا تک پہنچے گا اور خدا اس کو اپنے سایہ رحمت میں لے لے گا۔ اسی لیے قرآن کو نور سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کیونکہ وہ فکر و خیال کی ظلمتوں سے نکال کر انسان کو حق کی روشنی عطا کرتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاۗءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ اِلَيْهِ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ (النساء ۱۷۴-۱۷۵)

اے لوگو! تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس دلیل آچکی ہے اور ہم نے تمہارے لیے نور (ہدایت) نازل کیا ہے جو بالکل صاف اور واضح ہے۔ پس جو لوگ اللہ پر ایمان لائیں اور اس کو مضبوطی سے پکڑ لیں تو اللہ ان کو اپنی رحمت اور فضل میں داخل کرے گا اور ان کو اپنے در تک پہنچنے کے لیے سیدھی راہ دکھائے گا

قرآن نور ہے جس میں ہم خدا کے جلال و جمال کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ قرآن سے انسان کو خدا ملتا ہے جس شخص کو خدا مل جائے اس کے بھٹکنے اور گمراہ ہونے کا سوال ہی نہیں ہے۔ جس کے پاس قرآن ہے اس کے ہاتھ میں دلیل اور برہان ہے وہ دن کے اجالے میں اپنی زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔ جو اس نور سے محروم ہے، وہ ظلمتوں میں گھرا ہوا ہے۔ اس کی راہ تاریک ہے اور منزل نامعلوم۔ اَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَاَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا يَّمْشِيْ بِهٖ فِي النَّاسِ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا۔ (الانعام ۱۲۳) (ایک وہ شخص جس پر موت طاری تھی، ہم نے اس کو زندہ کیا اور اس کو (حق کی) روشنی عطا کی جس کو لیکر وہ انسانوں کے درمیان چلتا ہے کیا اس شخص کے مانند ہے جو ظلمتوں میں پڑا ہوا ہے جن سے وہ نکل نہیں سکتا؟)

قرآن کا دعویٰ ہے کہ خدا کا صحیح ترین تصور انسانوں کو اس کے رسولوں کے ذریعہ ملتا ہے۔ اس نور کا سرچشمہ خدا کے رسول ہیں کہیں اور سے یہ روشنی حاصل نہیں کی جا سکتی۔ خدا کی وہی تعریف مستند ہے جو اس کے رسولوں نے کی ہے۔ اس تعریف کے خلاف جو بھی تعریف انسانوں نے اپنے طور سے کی ہے وہ خدا پر منطبق نہیں ہوتی۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا	پاک ہے تمہارا رب، عزت اور غلبہ والا اس
يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ	وصف سے جو یہ بیان کرتے ہیں اور سلامتی ہے خدا
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (صافات ۱۸۰-۱۸۲)	کے رسولوں پر اور سب تعریف خدا ہی کے لیے ہے۔

خدا کو "ربّ العزت" کہہ کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ خدا عظیم اقتدار کا مالک ہے۔ انسان اس کی عظمت اور قدرت کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ وہ ہزار احتیاط کے ساتھ خدا کا تصور قائم کرنے کی کیوں نہ کوشش کرے لیکن خدا کی عظمت کا صحیح ادراک اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اس کے بعد فرمایا "امن و سلامتی ہے خدا کے رسولوں کے لیے" یعنی رسولوں کا تصورِ خدا ہر قسم کی لغزش سے پاک ہے۔ اسی میں نجات ہے۔ اسی سے انسان خدا تک پہنچتا ہے۔ اس ایک تصور کے علاوہ ہر تصور غلط اور باطل ہے۔ جو شخص اس سے نجات کی توقع رکھتا ہے وہ مشرق کی طرف چل کر مغرب میں پہنچنے کی امید باندھ رہا ہے۔

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ اِلَّا	پاک ہے اللہ ان کے وصف سے۔ہاں اس کی
عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝ صافات (۱۶۰-۱۵۹)	وہ تعریف صحیح ہے جو اس کے مخلص بندے کرتے ہیں

یعنی خدا کے بارے میں وہی تصور اس کے شایانِ عظمت ہے جو اس کے رسولوں نے اس سے سنکر بیان کیا ہے اور جسے خدا کے نیک بندے پورے تقوے اور ایمان داری کے ساتھ اپنے سینوں سے لگائے ہوئے ہیں۔

قرآن نے بار بار اس کی صراحت کی ہے کہ کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی ذات و صفات کا نقشہ اپنے ذہن و فکر سے مرتب کرے۔ خدا وہ ہے جس کا تعارف رسولوں نے کرایا ہے۔ انسانوں کا خود تراشیدہ خدا کائنات کا حقیقی خدا کبھی نہیں ہو سکتا خواہ وہ ہزار بار اس کو خدا کے نام ہی سے کیوں نہ یاد کریں۔

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ٥ (زخرف ۸۲)	پاک ہے آسمانوں اور زمین کا رب، عرش کا مالک ان کی وصف سازی سے۔

خدا کے رسولوں نے جن قوموں سے خطاب کیا وہ خدا کی منکر نہیں تھیں وہ خدا کو اپنا اور اس کائنات کا خالق مانتی تھیں لیکن یہ ان کا خود ساختہ اور فرضی خدا تھا۔ خدا کے بارے میں ان کی معلومات وحی و رسالت سے ماخوذ نہیں تھیں بلکہ وحی و رسالت کو وہ اپنی معلومات کے تابع دیکھنا چاہتی تھیں۔ وہ اپنے تصورِ خدا کو اس نقشہ کے مطابق ٹھیک کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں جو خدا کے رسولوں نے پیش کیا بلکہ ان کا مطالبہ تھا کہ خود خدا ان کے نقشے میں فٹ ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے جن قوموں نے رسولوں کے تصورِ خدا کو ماننے سے انکار کیا اور اپنے پندارِ علم اور زعم بصیرت میں مست رہے، ان کی آنکھیں اس وقت کھلیں جب کہ خدا کے غلط تصور کے گھناؤنے نتائج ان کے سامنے آگئے۔

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ (المومن ۸۵-۸۳)	جب ان کے پاس ان کے رسول دلائل کے ساتھ پہنچے تو یہ اپنے علم و بصیرت پر ناز کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس عذاب کا یہ مذاق اڑا رہے تھے اس عذاب نے ان کو گھیر لیا۔ جب انھوں نے ہمارے عذاب کو دیکھا تو کہنے لگے کہ اب ہم خدائے واحد پر ایمان لاتے ہیں اور ان ساری چیزوں کا انکار کرتے ہیں جن کو ہم خدا کے ساتھ شریک کرتے تھے لیکن اس وقت ایمان لانا ان کے لیے مفید نہیں تھا جب کہ وہ ہمارے عذاب کو دیکھ چکے۔ یہ اللہ کی سنت ہے جو اس سے پہلے بھی اس کے بندوں میں جاری ہو چکی ہے۔

علامہ نصیر الدین طوسی ان لوگوں کا نقطہ نظر واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ خدا کی معرفت کے لیے کسی معلم اور رہنما کی ضرورت ہے۔

هم لا ينكرون استلزام
مقدمات اثبات الصانع لنتائجها
لكن نقول هذا وحده لا
يجزى ولا يحصل به النجاة الا
اذا اتصل به تعليم لقول
النبي صلى الله عليه وسلم امرت
ان اقاتل الناس حتى يقولوا
لا اله الا الله وكثير من
الناس كانوا يقولون بالتوحيد
لكنهم لما لم ياخذوا ذالك
منه ما كان يقبل قولهم وامثال
هذا كثيرة مثل قل هو الله
احد واعلم انه لا اله الا الله
فامرهم ان القول وهو العلم
وان لم تقبلوا قوله كفرتم مع
انهم معترفون بوجود الصانع
كما حكى عنهم فى قوله عز من
قائل ولئن سالتهم من خلق
السموات والارض ليقولن الله
وفى امثاله فلو كانت العقول
كافية لقالت العرب
نحن نثبت الصانع بعقولنا
ونعرف توحيده ولا نحتاج

خالق کے اثبات کے لیے جو مقدمات ہیں وہ
ان کے نتائج سے انکار نہیں کرتے لیکن ہم کہتے ہیں
کہ تنہا خالق کی معرفت کافی نہیں ہے اور اس سے
نجات حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کے ساتھ
(پیغمبر) کی تعلیم نہ شامل ہو جائے۔ چنانچہ نبی صلی
اللہ علیہ وسلم کا قول ہے کہ مجھے لوگوں سے جہاد کا
حکم دیا گیا ہے تا آنکہ وہ لا الٰہ الا اللہ کا اقرار
نہ کرلیں۔ حالانکہ بہت سے لوگ توحید کے قائل تھے
لیکن چونکہ انھوں نے یہ توحید نبی صلی اللہ علیہ وسلم
سے اخذ نہیں کی تھی اس لیے آپ ان کے اقرارِ توحید
کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کی تصریحات اور
بہت سی ہیں۔ مثال کے طور پر قُلْ هُوَ اللّٰهُ
اَحَدٌ (کہو تم اللہ ایک ہے) وَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَا اِلٰهَ اِلَّا
اللّٰهُ (اور تم جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے)
پس آپ نے اس قول کا ان کو حکم دیا اور وہ ہے علم
توحید اور کہا کہ اگر تم نے خدا کے اس قول کو نہیں مانا تو تم
نے کفر کیا۔ باوجودیکہ وہ وجود خالق کے معترف تھے
جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس قول اور دوسرے بہت
سے اقوال میں ان کے بارے میں نقل کیا ہے کہ اگر
تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا
کیا تو وہ کہیں گے کہ خدا نے پیدا کیا۔ اگر خدا کی معرفت
کے لیے عقل کافی ہوتی تو اہل عرب پیغمبر سے کہہ سکتے تھے
کہ ہم اپنی عقل سے خدا کو ثابت کر سکتے ہیں اور توحید

فی ذالک الیک [1] کو جانتے ہیں اس لیے ہم اس معاملہ میں تمہارے محتاج نہیں ہیں۔

خدا کے بارے میں وہی تصور صحیح کیوں ہے جو رسولوں نے پیش کیا ہے؟ کیوں خدا کا ہر وہ تصور لازماً غلط ہے جو رسولوں کے دیے ہوئے تصور سے ٹکراتا ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن نے یہ دیا ہے کہ خدا کیا ہے؟ اس کی صفات کیا ہیں؟ اس کو کون سی چیزیں محبوب ہیں اور وہ کن چیزوں سے نفرت کرتا ہے؟ اس کے اقتدار کی کیا کیفیت ہے؟ کائنات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس کا ٹھیک ٹھیک علم خدا ہی کو ہے۔ انسان اپنے ذہن سے ان مسائل کو سمجھ نہیں سکتا۔ کیونکہ یہ اس کے حدود فکر سے باہر ہیں۔ انسان ان مسائل کو اسی وقت جان سکتا ہے جب کہ خدا اس کو ان کے بارے میں بتائے۔ اس لیے قرآن پہلے ہی قدم پر کہتا ہے کہ خدا کا جو بھی تصور تم قائم کرو اس کے لیے ضروری ہے کہ خدا کی طرف سے اس کی صداقت کی سند موجود ہو ورنہ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم نے اپنے طور پر کچھ صفات ڈھونڈھ رکھے ہیں جن کو خدا کی ذات پر چسپاں کر رہے ہو۔

اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ فَأْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (الصافات ۱۵۷-۱۵۶)

کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے؟ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو اپنی کتاب (جو خدا کی طرف سے تمہیں ملی ہے) اسے پیش کرو۔

اگر تمہارے پاس خدا کی کتاب نہیں ہے تو یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ محض ظن و تخمین سے خدا کی کوئی تصویر کھینچ لو اور اس کی پرستش شروع کردو۔ جس عمارت کی بنیاد علم و یقین پر نہ رکھی گئی ہو وہ اس قابل نہیں کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ نادان ہے وہ جو سیلاب سے پناہ لینے کے لیے ریت کے ٹیلہ پر کھڑا ہو جائے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْاِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَاَنْ تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَّاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ (الاعراف ۳۳)

تم کہہ دو میرے رب نے جن چیزوں کو حرام کیا ہے وہ یہ ہیں کھلی اور چھپی ہر طرح کی بے حیائی، گناہ اور معصیت، ناحق ظلم اور زیادتی، اور یہ کہ تم خدا کے ساتھ شرک کرو جس کی اللہ نے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے، اور یہ کہ تم اللہ کے بارے میں ایسی

---

[1] تلخیص المحصل۔ المطبوع مع محصل افکار المتقدمین الخ صفحہ ۲۶-۲۵

بات کہو جس کا تمہیں علم نہیں ہے۔

قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ (الانعام ۱۴۹)

تم ان سے کہو کہ کیا تمہارے پاس کوئی علم بھی ہے؟ اگر ہے تو اسے ہمارے سامنے پیش کرو تم تو محض ظن اور خیال کے پیچھے چلے جا رہے ہو اور اٹکل پچو سے کام لیتے ہو۔

خدا کے بارے میں تم کوئی بات یقین اور اعتماد کے ساتھ نہیں کہتے بلکہ ہر معاملہ میں ظن اور قیاس کا سہارا لیتے ہو۔ اس کے برعکس خدا کے رسول کو خدا کی طرف سے ہدایت ملتی ہے۔ وہ اندھیرے میں تیر نہیں چلاتا بلکہ جو کچھ کہتا ہے خدا کی دی ہوئی بصیرت کے تحت کہتا ہے۔ اس کی تعلیمات اس کے اپنے ذہنی تصورات اور عقلی قیاسات نہیں ہوتے بلکہ خدا کا کلام براہ راست اس کے دل پر نازل ہوتا ہے۔ اَللّٰهُ يَصْطَفِي مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ۔ الحج ۷۵ (اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے اپنے رسول منتخب کرتا ہے) بہت سی حقیقتیں جو تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہیں وہ اس پر کھول دی جاتی ہیں وہ ان حقیقتوں کا اس طرح مشاہدہ کرتا ہے جس طرح دن کی روشنی میں تم ٹھوس اور مادی چیزوں کو دیکھتے ہو۔

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُطَاعٍ ثَمَّ أَمِينٍ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ ۝ وَلَقَدْ رَآهُ بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ ۝ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَجِيمٍ ۝ فَأَيْنَ تَذْهَبُونَ إِنْ هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِلْعَالَمِينَ ۝ (التکویر ۱۹-۲۷)

بے شک یہ ایک بزرگ اور محترم فرشتہ کا قول ہے (جو خدا کی طرف سے پیغمبر تک پہنچا رہا ہے) وہ قوت والا ہے۔ عرش والے کے نزدیک اس کا ایک مقام ہے۔ اس کی بات سنی جاتی ہے اور وہ وہاں امین مانا جاتا ہے۔ تمہارا ساتھی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) دیوانہ نہیں ہے۔ اس نے اس کو کھلے افق پر دیکھا ہے۔ اور نہ وہ غیب کے معاملہ میں بخیل ہے اور نہ یہ شیطان کا قول ہے جس کو خدا کے دربار سے نکالا جا چکا ہے۔ پس تم کہاں چلے جا رہے ہو؟ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۝ مَا ضَلَّ
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۝ وَمَا
يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ
اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ
الْقُوٰى ۝ ذُوْ مِرَّةٍ فَاسْتَوٰى ۝
وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ۝ ثُمَّ
دَنَا فَتَدَلّٰى ۝ فَكَانَ قَابَ
قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۝ فَاَوْحٰى اِلٰى
عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى ۝ مَا كَذَبَ
الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ۝ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ
عَلٰى مَا يَرٰى ۝ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً
اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝
عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ
يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝
مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا
طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ
رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

النجم ۱۸-۱

قسم ہے ثریا کی جب وہ جھکتی ہے۔ تمہارا ساتھی
نہ تو بہکا اور نہ بے راہ ہوا۔ وہ اپنی خواہش سے
کچھ نہیں کہتا۔ یہ تو وحی ہے جو اس کی طرف بھیجی جارہی
ہے جس کی تعلیم اس کو مضبوط قوتوں والے (فرشتہ)
نے دی ہے (اور) جو زور آور ہے۔ پس وہ سیدھا
ہوا۔ اس وقت وہ بلند افق پر تھا۔ پھر وہ قریب
ہوا اور لٹک کر اتر آیا (اور اس قدر قریب ہوا)
کہ دو کمان کے برابر فرق رہ گیا، یا اس سے بھی زیادہ
قریب ہو گیا۔ پس اس نے خدا کے بندے (پیغمبر)
کی طرف وحی کی جو کچھ کرنا تھی۔ پیغمبر نے جو کچھ دیکھا
اس کے دل نے اس کی تکذیب نہیں کی۔ تو جس چیز
کو اس نے دیکھا اس کے بارے میں تم اس سے
جھگڑتے ہو۔ اس نے اس فرشتے کو ایک دوسری
مرتبہ بھی دیکھا ہے، سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جہاں
جنت ہے ہمیشگی کی جگہ، جب کہ سدرۃ المنتہیٰ پہ
چھا رہا تھا وہ جو چھا رہا تھا۔ نگاہ نہ تو بہکی اور نہ
حد سے آگے بڑھی۔ اس نے اپنے رب کی بڑی بڑی
نشانیاں دیکھیں۔

خدا کا رسول یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کے پاس براہ راست خدا کی طرف سے وحی آتی ہے اور وہ غیب کی باتیں جانتا ہے۔ جو لوگ رسول کے اس دعوے کی مخالفت کرتے ہیں ان آیات میں ان کا جواب ہے۔ اس جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حقیقت جو تم سے نہاں ہے اگر کسی دوسرے پر کھل گئی ہے تو تم کس بنیاد پر اس کی تردید کرتے ہو؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس واقعہ کا تمہیں علم نہیں ہے اس وسیع کائنات میں اس کا وجود بھی نہیں ہے حالانکہ بے شمار واقعات اور حقیقتیں تمہاری نگاہوں سے مخفی ہیں لیکن تم ان کے وجود کا انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ

وہ اپنے وجود میں تمہارے علم کے پابند نہیں ہیں۔ تم اگر ان کو مانتے ہو تو حقیقت کا اعتراف کرتے ہو لیکن تمہارے انکار سے ان کے وجود کی نفی نہیں ہو سکتی۔

خدا کا رسول بار بار جس چیز کا مشاہدہ کر رہا ہے، تمہارے نہ ماننے کی وجہ سے کیسے یقین کر لے کہ اس کا مشاہدہ غلط ہے، جن حقیقتوں کو اس کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں، جن کے بارے میں اس کا دل گواہی دے رہا ہے کہ وہ حق ہیں اور جن کے سمجھنے اور ادراک کرنے میں اس کو یقین ہے کہ اس نے دھوکا نہیں کھایا ہے۔ اگر تم ان کا ہزار بار انکار کرتے ہو تو بھی وہ ان کو جھٹلا نہیں سکتا۔ تمہاری تکذیب کے ڈر سے اس کے لیے ممکن نہیں کہ رات کو دن اور دن کو رات قرار دے۔ ایک حقیقت کو دیکھ کر وہ جس یقین تک پہونچ چکا ہے تمہارے اعتراف سے نہ تو اس یقین میں کوئی اضافہ ہونے والا ہے اور نہ تمہارے انکار سے اس میں کوئی کمی آ سکتی ہے۔

رسول اگر اپنے دعوے میں جھوٹا ہے اور اس کو خدا کی طرف سے روشنی نہیں ملی ہے تو سوال یہ ہے کہ کیا اندھیرے میں رہ کر کوئی شخص خدا کی ذات و صفات کا تعین کر سکتا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی فکر از خود خدا کو پالے؟ کیا اس کی مثال کوئی اور بھی ہے کہ خدا کی ہدایت اور راہنمائی کے بغیر کسی کو خدا کی مکمل معرفت حاصل ہو گئی ہو؟ جس شخص پر جھوٹ کا الزام لگایا جا رہا ہے کیا اس نے دعوی رسالت سے پہلے خدا کے بارے میں کسی خاص تصور کا اظہار کیا تھا؟ اگر اس کا اظہار نہیں کیا تو کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ خدا کی وحی کے بغیر وہ خود بھی خدا کو پانے سے عاجز ہے؟

وَاِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ	جب ان کو ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی
قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا	ہیں تو ان میں سے وہ لوگ جن کو ہم سے ملنے کا یقین نہیں
ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ	ہے۔ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی دوسرا قرآن
بَدِّلْهُ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْ	لاؤ یا اس کو بدل دو۔ تم ان سے کہہ دو کہ میرے اختیار
اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ	میں نہیں ہے کہ اس کو اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں
اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ اِنِّیْۤ	تو اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میرے پاس آتی ہے۔
اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ	اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے دن
یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ	کے عذاب کا خوف ہے۔ تم ان سے کہہ دو کہ اگر
مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَلَاۤ اَدْرٰىكُمْ	اللہ چاہتا تو میں یہ قرآن تمہیں پڑھ کر نہ سناتا اور

بِهٖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ (یونس ۱۶، ۱۵)

اس کے بارے میں کوئی علم دیتا۔ اس سے پہلے میں تمہارے درمیان ایک عمر گذار چکا ہوں لیکن کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

یعنی یہ مطالبہ کہ قرآن کو بدل دیا جائے اور اس کی جگہ کوئی دوسری کتاب پیش کی جائے اس بنیاد پر ہو رہا ہے کہ یہ اس شخص کا کلام ہے جس کی زبان سے یہ سنا جا رہا ہے۔ حالانکہ انسان اگر کھلی عقل سے کام لے تو صاف معلوم کر سکتا ہے کہ قرآن محمد کی تصنیف نہیں ہے۔ جب تک خدا کی طرف سے اس کا نزول نہ ہو کوئی اس کو اپنی طرف سے دنیا کے سامنے پیش نہیں کر سکتا۔ اگر خدا اس قرآن کو زمین پر نہ اتارے تو نا ممکن ہے کہ کوئی انسانی ذہن اس کی بلندی کو پالے علم و عرفان کے جو چشمے اس وقت جاری ہیں وہ خدا کے جاری کردہ ہیں اور وہ اگر نہ چاہے تو یہ خشک ہو جائیں۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (الشوریٰ ۲۴)

کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر خدا پر افترا پردازی کر رہا ہے؟ اگر اللہ چاہے تو (اے پیغمبر) تمہارے دل پر مہر لگا دے۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ باطل کو مٹا رہا ہے اور اپنے کلمات کے ذریعہ حق کو ثابت کر رہا ہے۔ وہ سینوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔

رسول کو خدا کی طرف سے وحی آتی ہے اس کا ثبوت یہ ہے کہ پوری کائنات اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ ہم خالقِ کائنات کی تلاش میں چلے تھے، ہمیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کن صفات اور خصوصیات کا حامل ہے؟ اتنے میں خدا کا رسول ہمارے سامنے آتا ہے اور خالق کائنات کا حال بیان کرتا ہے۔ یہ سنکر کائنات ہر طرف سے پکار اٹھتی ہے کہ ہاں میرا خالق وہی ہے جس کا تعارف خدا کا رسول کرا رہا ہے۔ اگر ہم رسول کے تصور کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو خدا کا جو بھی تصور ہم قائم کریں کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی تکذیب کے لیے آمادہ ہے۔

قرآن پورے وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ کائنات کا صحیح مطالعہ اور رسول کی تعلیمات دونوں ایک ہی حقیقت تک انسان کو پہنچاتے ہیں۔ خدا کا رسول خدا کا ایسا تصور نہیں دیتا جو مشاہدۂ کائنات کے خلاف ہو بلکہ کائنات کے ہر گوشے سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ کائنات پر جو بھی شخص غور کرے گا وہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ رسول کی بات، کائنات کی تخلیق اور اس کے مقصد سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ وہ الفاظ میں جس حقیقت کا اظہار کر رہے ہیں اسی حقیقت کا اظہار یہ کائنات اپنی ساخت اور وجود سے کر رہی ہے۔ اگر انسان نے کائنات کا صرف سطحی مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کی گہرائی میں اترنے کی کوشش کی ہے تو کبھی رسول کے دعوے کو جھٹلا نہیں سکتا۔

اس کو رسول کی باتیں عقل سے قریب تر معلوم ہوں گی اور وہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو گا کہ رسول خدا کا مقرر کیا ہوا شارح کائنات ہے۔

أَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوا مَا بِصَاحِبِهِم	کیا انھوں نے سوچا نہیں کہ ان کے ساتھی
مِّن جِنَّةٍ إِنْ هُوَ إِلَّا نَذِيرٌ	(پیغمبر) کو کوئی جنون نہیں ہے وہ تو خدا کی طرف
مُّبِينٌ ۝ أَوَلَمْ يَنظُرُوا فِي مَلَكُوتِ	سے کھلا کھلا ڈرانے والا ہے۔ (آخر وہ کیوں پیغمبر
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ	کو جھٹلا رہے ہیں) کیا انھوں نے آسمانوں اور
مِن شَيْءٍ وَأَنْ عَسَىٰ أَن يَكُونَ	زمین کے اقتدار اور جس چیز کو بھی اللہ نے پیدا
قَدِ اقْتَرَبَ أَجَلُهُمْ فَبِأَيِّ حَدِيثٍ	کیا ہے اس پر غور نہیں کیا؟ بہت ممکن ہے کہ ان
بَعْدَهُ يُؤْمِنُونَ ۝	کی اجل قریب آچکی ہو پس کس بات پر وہ اس
(الاعراف ۱۸۵، ۱۸۴)	کے بعد (رسول کو جھٹلانے کے بعد) ایمان لاتے ہیں

رسول، خدا کا جو تصور پیش کرتا ہے وہ واقعہ کے مطابق ہے۔ اس کے پیچھے علم اور بصیرت ہے، وہ اس صداقت پر مبنی ہے جس پر یہ کائنات قائم ہے۔ کائنات جس تصور سے ہم آہنگ ہو اس سے جو تصور بھی ٹکرائے گا لازماً حقیقت سے دور ہو گا۔

بَلْ أَتَيْنَاهُم بِالْحَقِّ وَإِنَّهُمْ	ہم ان کے پاس حق لائے ہیں اور وہ اس کو
لَكَاذِبُونَ ۝ (المومنون-۹۰)	جھٹلا رہے ہیں۔
قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَ	تم کہہ دو کہ میں اپنے موقف پر خدا کی طرف
كَذَّبْتُم بِهِ	سے دلیل اور حجت رکھتا ہوں۔ اور تم اس کی
(الانعام ۵۷)	تکذیب کرتے ہو۔
وَلَقَدْ جِئْنَاهُم بِكِتَابٍ	یہ واقعہ ہے کہ ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے
فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ هُدًى وَرَحْمَةً	ہیں جس کی تفصیل ہم نے علم کی بنیاد پر کی ہے۔ یہ
لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝	ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔

قرآن کہتا ہے کہ خدا کی جو بھی صفت ثابت کی جائے کائنات کے مطالعہ سے اس کی تصدیق ہونی چاہیے۔ اگر مشاہدہ اس کو جھٹلا رہا ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ اس خدا کی صفت نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے اور

جو اس کائنات کا خالق ہے۔ جو لوگ رسول کے تصور خدا کی مخالفت کرتے ہیں قرآن ان کو چیلنج کرتا ہے کہ تم جو تصورِ خدا پیش کرتے ہو اس کے لیے اس کائنات میں کہیں سے کوئی ثبوت فراہم کرو۔

قُلْ اَرَاَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ٥ (الاحقاف ۴)

اے پیغمبر! ان سے کہو کیا تم نے غور بھی کیا ہے کہ خدا کے سوا جن کو تم پکارتے ہو (وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں؟) مجھے بتاؤ کہ انھوں نے زمین کی کون سی چیز پیدا کی، یا ان کا آسمان میں کوئی حصہ ہو، تمہارے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب ہو یا علم و بصیرت کی کوئی نشانی ہو تو اسے پیش کرو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَا فِی الْاٰخِرَةِ (المومن ۴۳)

یقینی ہے کہ جس کی طرف تم مجھے دعوت دے رہے ہو اس کی طرف نہ دنیا میں کوئی بلاوا ہے اور نہ آخرت میں۔

جب یہ واقعہ ہے کہ رسول کے تصورِ خدا کے خلاف کائنات میں کہیں سے کوئی آواز نہیں اٹھ رہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ رسول کی مخالفت کر رہے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔ وہ حق و صداقت کا مقابلہ دلیل اور حجت سے نہیں بلکہ زورِ بیان اور مناظرہ سے کرنا چاہتے ہیں۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰهِ بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًی وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِیْرٍ ٥ (لقمان ۲۰)

لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو خدا کے بارے میں جھگڑتے ہیں جب کہ نہ ان کے پاس علم ہو نہ بصیرت اور نہ کوئی روشنی دینے والی (آسمانی) کتاب۔

ایسے لوگ خدا تک نہیں پہنچ سکتے کیونکہ خدا تک پہنچنے کی تمام راہیں انھوں نے اپنے لیے بند کر رکھی ہیں۔

قرآن اور علم جدید

(جناب وحیدالدین خاں صاحب)

اس وقت پورے عالم اسلامی میں عام طور سے تین قسم کے "تعلیم یافتہ" مسلمان پائے جاتے ہیں، ایک قسم تو وہ ہے جو سکولر نظام زندگی اور مغربی تہذیب پر ایمان لاچکی ہے۔ وہ دین اسلام کو دقیانوسی اور ناقابل عمل سمجھتی بھی ہے اور کہتی بھی ہے دوسری قسم وہ ہے جو اسے دقیانوسی کہہ کر رد کرنے کی ہمت نہیں رکھتی بلکہ تراش خراش کے بعد اسے مغربی تہذیب اور مغربی نظریات کے چوکھٹے میں فٹ کرنا چاہتی ہے۔ وقت کے فلسفیوں اور سائنس دانوں کی طرف سے جو "مسئلہ" بھی پیش ہوتا ہے وہ اسے تسلیم کرتی ہے اور ان سے کہتی ہے "بھئی اس حقیقت تک تم لوگ اب آکر اتنی تاخیر سے پہنچے قرآن تو ہمیں پونے چودہ سو سال پہلے ہی اس کی طرف رہنمائی کر چکا ہے"۔ تیسری قسم وہ ہے جو اسلامی تعلیمات کو جوں کا توں قبول کرتی ہے لیکن اس قسم میں ایسے لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے جو وقت کی زبان، اسلوب بیان اور موثر انداز میں بے کم و کاست اس طرح اسلام کو پیش کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو کہ بڑے بڑے "علمی جغادری" بھی اس کا وزن محسوس کرنے پر مجبور رہیں۔ قلت تعداد کے باوجود امیدیں ان ہی لوگوں سے وابستہ ہیں۔ یہی لوگ "مخالف اسلام تجدد پسندیوں" کا مقابلہ کریں گے اور ان شاء اللہ تعالیٰ فتحیاب ہوں گے۔

(ادارہ)

"قرآن اور علم جدید" ——— ڈاکٹر محمد رفیع الدین (ایم اے، پی ایچ ڈی) کی تصنیف ہے جو ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور سے شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا مقصد یہ ہے کہ مغرب کے جدید نظریات جو اسلام کو چیلنج کر رہے ہیں ان کا جواب مہیا کیا جائے۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب کے بعض حصے اس لحاظ سے قابل قدر ہیں۔ خاص طور پر میکڈوگل کے نظریہ جبلت پر مصنف نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بہت خوب ہے۔ مگر مجموعی طور پر اس کتاب کے بارے میں ہمارا تاثر یہ ہے کہ وہ بھی اسی کمزوری کا شکار ہو گئی ہے جس کی نشان دہی مصنف نے دوسروں کے سلسلے میں کی ہے۔ انھوں نے لکھا ہے ——
"مغرب کے گمراہ کن تصورات کا اثر اس قدر مخفی اور گہرا ہے کہ اس سے وہ لوگ بھی محفوظ نہیں جو اسلام کی مدافعت کا دم بھرتے

ہیں۔ چنانچہ وہ اسلامی تصورات کی حمایت کرنے کی کوشش میں نادانستہ طور پر غیر اسلامی تصورات سے مدد لیتے ہیں اور اس طرح سے بعض اوقات میں خود اسلام ہی کی مخالفت کر جاتے ہیں" (صفحہ ۴۴۶) زیر نظر کتاب خود بھی اسی نوعیت کی ایک مثال ہے۔

مصنف کا موقف یہ ہے کہ " چونکہ مغرب کے باطل تصورات میں حق کا امتزاج بھی ہے اور وہ اسلامی اور غیر اسلامی تصورات کے ایک مرکب کی صورت میں ہیں" اس لیے ان نظریات کی اندھی تائید یا تردید کرنے کے بجائے ان کے دونوں پہلوؤں کو الگ الگ کر کے دکھانا چاہیے۔ یہ نظریہ بظاہر بہت صحیح اور مناسب معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ سرسید اسکول کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ سرسید کا زمانہ وہ ہے جبکہ مغرب اپنے نظریات کے بارے میں ابھی ابتدائی جوش وخروش کے مرحلے میں تھا اور اس یقین کے ساتھ اپنے خیالات پیش کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ سب کا سب صحیح ہے۔ اس لیے سرسید اور ان کے ساتھیوں نے بھی کسی استثناء کے بغیر "پیروی مغربی" کا درس دیا۔ مگر اب مغرب کا حال بدل چکا ہے۔ اب وہ خود ہی اپنے نظریات پر زبردست تنقیدیں کرنے لگا ہے۔ اس لیے قدرتی طور پر ان لوگوں کا انداز بھی بدل گیا ہے جو مغرب سے مرعوب ہو کر اپنی رائے قائم کیا کرتے ہیں۔ اب وہ مغربی نظریات کے بعض پہلوؤں کی تنقید کرتے ہیں اور بعض کی تائید کرتے ہیں اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ خُذ مَا صَفَا وَدَعْ مَا کَدِرَ کے اسلامی اصول پر عمل کر رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت یہ مغربی ائمہ کی پیروی کی جدید شکل ہے۔ وہ اپنی جن چیزوں پر تنقید کر رہے ہیں ان پر یہ لوگ بھی تنقید کرتے ہیں اور جن چیزوں پر وہ ابھی تک قائم ہیں وہ ان کے یہاں بھی مسلمہ حقیقت کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ طرز فکر اپنی شکل کے اعتبار سے سرسید سکول سے مختلف ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ بات دونوں میں مشترک ہے کہ مذہب جیسا کچھ ہے وہ اس کو ٹھیک اسی شکل میں پیش نہیں کرتے بلکہ ایسے انداز میں پیش کرنا چاہتے ہیں جس سے مغربی معیار فکر پر انہیں شرمندہ نہ ہونا پڑے۔

کتاب کے شروع میں مصنف نے بتایا ہے کہ باطل خیالات کی یلغار کے مقابلے میں اسلام کو پیش کرنے کی شکل یہ ہے کہ " طاقتور علمی دلائل اور عقلی براہین کے ساتھ چوٹی کے حکماء کے نزدیک ان کی فرضی معقولیت کا پردہ چاک کر دیا جائے" مگر مصنف کا انداز ساری کتاب میں یہ ہے کہ مغربی ائمہ جن نظریات کے بارے میں مشکوک ہو چکے ہیں اور جن پر خود ان کے درمیان سخت ترین تنقیدیں ہو رہی ہیں ان کے خلاف تو زبان کھولی جائے اور جن تصورات کو ابھی ان کے یہاں "علمی مسلمات" کا درجہ حاصل ہے ان کو عین اسلامی اور قرآنی ثابت کیا جائے۔ چنانچہ ڈارونزم پر بحث کرتے ہوئے مصنف نے نفس ارتقاء کو تو ایک حقیقت کے طور پر تسلیم کر لیا ہے کیونکہ موجودہ سائنس دانوں کا عام رجحان یہی ہے۔ مگر

"سبب انقعارشکے سلسلے میں ڈارون نے جو خیالات پیش کئے ہیں ان کو وہ تسلیم نہیں کرتے کیونکہ جرمن ماہر حیات ڈریش اور فرانسیسی مفکر برگسان یہ ثابت کر چکے ہیں کہ ڈارون کا یہ نظریہ سراسر غلط ہے۔ یہ اسلام اور غیر اسلام میں مطابقت پیدا کرنے کا وہی انداز ہے جو مغلوب تہذیبیں اپنی غالب تہذیب کے مقابلے میں عموماً اختیار کیا کرتی ہیں۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ جو طرز فکر اس طرح دنیا کے سامنے آئے وہ تہذیب کے جامے میں پیوند بن کر تو رہ سکتا ہے مگر خود تہذیب کا جامہ نہیں بن سکتا۔ اس طرح کے تطبیقی بیانات سے اگر کوئی یہ امید رکھتا ہے کہ وہ دنیا کی علمی فضا کو بدل دے گا یا لوگوں کو ناحق سے پھیر کر حق کی طرف لانے میں کامیاب ہوگا تو یہ محض اس کی خوش خیالی ہے افکار میں تبدیلی کے لیے انقلابی لٹریچر کی ضرورت ہوتی ہے نہ کہ تطبیقی لٹریچر کی۔

کتاب کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ یہ نہ صرف ترتیب کے اعتبار سے پہلے ہے بلکہ یہی نظریہ ساری کتاب پر چھایا ہوا ہے۔ اس مسئلے کے علمی پہلو پر میں الگ سے ایک مضمون لکھ چکا ہوں[1] اس لیے یہاں اس پر کوئی گفتگو مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ البتہ میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اس نظریے کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں مصنف نے کس طرح اسلام کا حلیہ بگاڑ دیا ہے۔

اسلامی نقطۂ نظر سے ڈارونزم کے غلط ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وہ اسلام کے مجموعے میں اس کے بغیر فٹ نہیں ہو سکتا کہ اس کے پورے ڈھانچے کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ اس نظریے کو ماننے کی وجہ سے مصنف کو اسلام کی ایک خود ساختہ ارتقائی تعبیر کرنی پڑی ہے۔ اسلام کے جامے کو ارتقاء کی ساخت کے مطابق بنانے کے لیے انھیں پورے کپڑے کو از سر نو تراشنا پڑا ہے اس کی مثالیں ساری کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

"ارتقاء" کا تصور یہ چاہتا ہے کہ انسان بحیثیت نوع مسلسل ترقی کر رہا ہو اور زندگی کے انجام پر سب کو اعلیٰ تر مقام حاصل ہو۔ اس نظریے کے مطابق ناپسندیدہ صورت حال کو ماضی میں ہونا چاہیے نہ کہ مستقبل میں۔ اس طرح ارتقاء کے فلسفے میں جنت کی زندگی تو ثابت ہوتی ہے مگر دوزخی زندگی کی تشریح نہیں ہوتی۔ اس دشواری کو مصنف نے یہ کہہ کر حل کیا ہے کہ جہنم سزا کی جگہ نہیں بلکہ تربیت حاصل کرنے کی جگہ ہے، لکھتے ہیں:-

> بعض مخالفین مذہب کو غلط فہمی ہے کہ جزا اور سزا سے خدا فقط اپنی خوشنودی یا ناراضگی کا اظہار کرتا ہے جسے چاہتا ہے انتقام کے لیے دوزخ میں ڈال دیتا ہے ——— اور جسے چاہتا ہے خوش ہو کر جنت میں داخل کر دیتا ہے۔ لیکن حقیقت حال یہ نہیں۔ جزائے عمل باہر سے نہیں آتی

---

[1] "نظریۂ ارتقاء" مطبوعہ زندگی، ۱۹۶۱ء

بلکہ انسان کی فطرت کے قوانین سے خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ یہ قوانین خدا نے بنائے ہیں۔ لیکن ان کا مقصد انتقام نہیں بلکہ انسان کی تربیت اور ترقی ہے۔ قانون جزا کا منبع خواہ جزا کا تعلق اس دنیا سے ہو یا اگلی دنیا سے، اللہ تعالیٰ کی صفت محبت و رحمت ہے جو اس کی جملہ صفات کا مرکز ہے اور اس قانون کی غرض یہ ہے کہ انسان کی خود شعوری اپنے کمال پر پہنچے۔" (صفحہ ۴۳-۳۴۲)

جس طرح دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ مشکلوں میں پڑ کر انسان کی صلاحیتیں ابھرتی ہیں اور اس غرض کے لیے خود مومنین کے اوپر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مشقتیں ڈالی جاتی ہیں اسی طرح جہنم کی زندگی بھی انسان کو اوپر اٹھانے کا ایک پُر مشقت تربیتی عمل ہے۔ فرماتے ہیں :۔

"زندگی کی ساری تاریخ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ زندگی ہمیشہ رکاوٹوں کے خلاف جدوجہد کرنے اور ان پر فتح پانے سے ارتقا کرتی ہے۔ گناہ کی زندگی دراصل وہ زندگی ہے جو رکاوٹوں سے گھر جاتی ہے۔ ان کے ساتھ کش مکش میں گرفتار رہ جاتی ہے اور اپنی منزل مقصود کی طرف ارتقا نہیں کر سکتی۔ چونکہ انسان کی خود شعوری زود یا بدیر اپنی فطرت کے اصل تقاضوں کی طرف عود کرنے پر مجبور ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی رکاوٹیں عارضی ثابت ہوں اور جب اسے موقع ملے وہ اپنی منزل مقصود کی طرف آگے بڑھنے لگ جائے۔ لیکن بعض وقت ایسا ہوتا ہے کہ خود شعوری کو یہ موقع اس دنیا میں نصیب نہیں ہوتا۔ اس صورت میں اس کی جدوجہد اگلی دنیا میں جاری رہتی ہے۔ اسی جدوجہد کا نام دوزخ ہے۔"

(صفحہ ۳۴۴)

کراماً کاتبین جو کچھ رات دن لکھ رہے ہیں وہ فردِ جرم کی تیاری نہیں ہے بلکہ :۔

"قرآن کے نزدیک انسان کے لاشعوری نامۂ اعمال میں اس کے اعمال کا ضبط رہنا اس غرض سے ہے کہ موت کے بعد ان اعمال کو انسان اپنے ارتقا کے لیے کام میں لائے۔ یعنی حد درجہ تکلیف دہ حالات سے گزر کر غلط اعمال کی بندشوں اور رکاوٹوں سے نجات پائے اور صحیح اعمال کی قوت سے ارتقا کے بلند تر مقامات پر قدم رکھتا جائے۔ کیونکہ انسان کی خود شعوری جسم کی موت کے بعد بھی اپنی منزل مقصود کی طرف ارتقا کرتی رہتی ہے۔" (صفحہ ۲۹۹)

اسی ارتقائی تصور کی وجہ سے مصنف کو اجتماعی ملکیت کا مارکسی نظریہ بھی اسلام میں داخل کرنا پڑا ہے۔ کیونکہ سماجی ارتقا کا مزعومہ تصور انسانوں کے درمیان معاشی اونچ نیچ کو نامطلوب ابتدائی حالت قرار دیتا ہے اور اس کی منشا یہ ہے کہ

بعد کے ترقی یافتہ مراحل میں یہ حالت ختم ہو جائے اور اقتصادی مساوات کا دور دورہ ہو۔ اب چونکہ انفرادی ملکیت کے نظام میں اس طرح کی برابری قائم ہونے کا امکان نہیں ہے اور اجتماعی ملکیت کے مفروضہ نظام میں نظریاتی حیثیت سے ایسے نظام کے قائم ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے، اس لیے مصنف نے نہایت کھلے لفظوں میں اس کی تائید کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"جہاں تک افراد کی ضروریات کے جماعتی نظام یا بالفاظ دیگر اجتماعی ملکیت کے ذریعے سے اقتصادی مساوات کے قیام کا تعلق ہے حقیقت نہ صرف یہ ہے کہ اس قسم کی اقتصادی مساوات کے خلاف قرآن و حدیث میں ایک لفظ بھی موجود نہیں بلکہ قرآن اور حدیث کی تعلیم اس کی تائید کرتی ہے اور بالآخر اس کی توقع رکھتی ہے اور ایک اسلامی جماعت کے روحانی ارتقاء کے ایک خاص مقام پر یعنی ایک کامل اور نصب العینی (Ideal) اسلامی جماعت کے اندر اس کا خود بخود وجود میں آ جانا اور قائم رہنا ضروری ہے۔"

(صفحہ ۳۸۰-۳۸۱)

ں پھر زکوٰۃ اور انفرادی ملکیت سے متعلق اسلام کے دوسرے معاشی قوانین سماجی ارتقاء کے نظریے سے ٹکرا رہے ہیں یونکہ اجتماعی ملکیت کے نظام میں ان کا کوئی مقام نظر نہیں آتا اس کی توجیہ مصنف نے یہ کی ہے کہ یہ دائمی نوعیت ے قوانین نہیں ہیں بلکہ ایک ارتقاء پذیر معاشرہ کی خرابیوں کو دور کرنے کے لیے اس کے ابتدائی مرحلے میں دیے ے ہیں۔ بعد کے ترقی یافتہ مراحل میں قدرتی طور پر ان کی جگہ لینے کے لیے ان سے بہتر اصول آ جائیں گے اس لیے ں کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ مصنف کے الفاظ میں "درحقیقت جب تک ہم قرآن کے احکام کو ارتقائی طہ نظر سے نہ دیکھیں ہم انھیں ٹھیک طرح سے نہیں سمجھ سکتے۔" (۳۸۹) وہ لکھتے ہیں:-

"زکوٰۃ کی یہ معروف شکل جس میں حکومت فالتو جمع شدہ مال کا چالیسواں حصہ لیتی ہے اور باقی حصوں کا توں جمع رہتا ہے، اسلام کے اقتصادی نظام کا ایک مستقل جزو نہیں اور اسلام کا منشا ہرگز یہ نہیں کہ زکوٰۃ کی اس شکل کو ہمیشہ قائم رکھا جائے۔ بلکہ اسلام کا آخری منشا یہ ہے کہ فرد کو روحانی طور پر اس بات کے لیے تیار کیا جائے کہ وہ اپنی دولت میں دوسرے بھائیوں کو مساوی طور پر شریک کر سکے۔" (ص۳۸۰)

بری جگہ فرماتے ہیں کہ اس قسم کے تمام قوانین "عبوری" نوعیت کے ہیں اور اسی وقت تک کے لیے ہیں جب تک سانی معاشرہ ترقی کر کے اپنے سابقہ مقام سے آگے نہیں نکل جاتا۔ لکھتے ہیں:-

"اسلام پسند نہیں کرتا کہ افراد کے پاس فالتو دولت جمع رہے۔ تاہم جب تک فرد کو ... [illegible]

> یہاں تک ترقی نہیں کرتی کہ جمع شدہ دولت کی ——————— محبت پر غالب آجائے وہ اس وقت تک خود شعوری کے ارتقا کی تدریج اور تسہیل کے لیے عبوری دور کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے لیے جائداد کی بیع و شراء شفعہ مال یتیم کی حفاظت، تقسیم جائداد، قرضہ، صدقہ اور عطیہ کے قوانین نافذ کرتا ہے لیکن اسلام کی تابعداری میں بالآخر فرد کو ایک ایسی روحانی ترقی نصیب ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے پاس فالتو دولت رکھنا نہیں چاہتا" (صفحہ ۳۸۷ نیز ملاحظہ ہو صفحہ ۴۲۹)

یہاں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اگر کسی مخصوص زمانے میں سوسائٹی کا معیار اخلاق بہت زیادہ بڑھ جائے تو اس مخصوص زمانے کی حد تک صدقہ وخیرات کی ضرورت باقی نہ رہے گی۔ اگر صرف یہ بات ہوتی تو گو کہ ہمارے نزدیک یہ بالکل خیالی بات ہے مگر ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص اپنے ذہن میں ایک "یوٹوپیا" کی تعمیر کر رہا ہو تو اس کے اس دلچسپ مشغلے میں دوسرے کو دخل دینے کی کیا ضرورت۔ لیکن یہاں اس سے آگے بڑھکر اسلام کو سماجی ارتقا کے چوکھٹے میں فٹ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ سماج مسلسل ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس نظریے کے مطابق ڈیڑھ ہزار برس پہلے اسلام نے جو قوانین بنائے تھے ان کا مقصد انسانیت کو کوئی دائمی حکم دینا نہیں تھا بلکہ صرف وقت کی سماجی حالت کی اصلاح کرنا تھا۔ اس کے بعد جب سماج اپنی ترقی کے اگلے مرحلے میں پہنچ چکا ہوگا تو ان قوانین کی ضرورت بھی نہ رہے گی۔ اس وقت دوسرے زیادہ بہتر قوانین ان کی جگہ لینے کے لیے آپ سے آپ سامنے آجائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے تو حجۃ الوداع کے روز اعلان کر دیا تھا کہ اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ مگر ارتقا کے نظریہ پر ایمان لانے کی وجہ سے مصنف کے لیے ضروری ہو کہ ختم نبوت کے بعد بھی وہ دین کو ناقص سمجھیں اور اس کی تکمیل کے لیے نامعلوم مستقبل کا انتظار کریں۔ اس طرح کی اور بہت سی مثالیں کتاب میں موجود ہیں اور صرف یہ بات اسلامی حیثیت سے نظریۂ ارتقا کو غلط ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ جب کسی نظریہ کو اسلام کے ڈھانچہ میں جگہ دینے کے لیے اسلام کے اندر تراش خراش کرنی پڑے تو یہ واقعہ خود اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا کہ مزعومہ نظریہ غلط اور غیر اسلامی ہے۔

اپنے ان تصورات کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے کے لیے مصنف کو بہت سی آیات اور احادیث پر خود ساختہ معنی پہنانے پڑے ہیں اس قسم کی تمام مثالوں کو یکجا کرنے کے لیے ایک مستقل مقالے کی ضرورت ہے۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔

آدم کا قصہ جو قرآن میں مختلف مقامات پر بیان ہوا ہے اس سے یہ تصور سامنے آتا ہے کہ انسانِ اول کی

تخلیق ایک خاص مرحلے میں بیک وقت ہوئی تھی اس کے برعکس ارتقاء کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان جانوروں ہی کی ایک صنف کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس ٹکراؤ کو دور کرنے کے لیے مصنف نے کہا ہے کہ آدم و حوا کی داستان کوئی واقعہ نہیں ہے بلکہ محض بات سمجھانے کے لیے ہے۔ یہ فطرت انسانی کے حقائق ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ نے ایک ڈرامائی طرز کے ساتھ قصۂ آدم میں مختصر طور پر بیان کیا ہے۔ اس نظریہ کی تشریح میں آدھے درجن سے زیادہ صفحات سیاہ کیے گئے ہیں اور آیات کا عجیب عجیب مطلب بیان کیا ہے مثلاً وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (بقرہ ۔ ۳۵) میں مصنف کے نزدیک اس انسان کا ذکر ہے جو حیوانی دور میں تھا اور ابھی خود شعور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ عام جانوروں کی طرح محض جبلی رجحانات کے تحت زندگی گزارتا تھا۔ اسی طرح آدم و حوا کا ستر کھلنے اور اس کو چھپانے کی کوشش کرنے کے بارے میں مصنف کا خیال ہے کہ یہ انسان کا وہ مرحلہ ہے جب اسے نیک و بد کی تمیز ہوئی تھی۔ اس وقت اسے ستر پوشی کی فکر ہوئی اور اس نے پہلی بار درخت کے پتوں سے اپنا جسم ڈھانکنا شروع کیا۔

مصنف کو یاد نہیں رہا کہ آدم و حوا کو ستر ڈھانکنے کا احساس ان کی سابقہ ننگی زندگی کا اگلا ترقی یافتہ مرحلہ نہیں تھا بلکہ وہ دونوں پہلے سے ستر پوش زندگی گزارتے آرہے تھے اور ان کا ستر کھلنا دراصل ان کی ملبوس زندگی کا ایک درمیانی وقفہ تھا ـــــ آپ یقیناً ان دلائل کو دیکھ کر حیرت کریں گے۔ مگر یہ صرف ایک فرد کا معاملہ نہیں ہے بلکہ "علمی استدلال" یہی وہ جدید طریقہ ہے جس کو مغرب نے پیدا کیا ہے اور جو اس کا بہت بڑا علمی کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ مغرب کے اکثر نظریات اسی قسم کے نام نہاد استدلال کی بنیاد پر کھڑے کیے گئے ہیں جن کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ "کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا" مجھے حیرت ہے کہ ہماری قوم کے پڑھے لکھے لوگ ایسی بے سر و پا باتوں سے کس طرح متاثر ہو جاتے ہیں اور اس پر اس طرح ایمان لاتے ہیں کہ اپنے دین کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

جو لوگ نظریۂ ارتقاء کو صرف اس بنا پر اسلام کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ مغرب کے ماہرین اس کو ایک "حقیقت" تسلیم کر چکے ہیں ان کو میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ پچاس سال پہلے ان ماہرین نے کائنات کی مشینی تعبیر کے بارے میں بھی یہی موقف اختیار کیا تھا۔ اس وقت مسلمہ طور پر یہ مان لیا گیا تھا کہ کائنات کے تمام واقعات کسی مادی سبب کے تحت واقع ہوتے ہیں اور اس طرح پوری کائنات محض علت و معلول کی مسلسل زنجیر میں بندھی ہوئی ہے۔ یہ انیسویں صدی کا علمی مسلمہ تھا۔ ۱۸۷۴ء میں چھپنے والی ایک انسائیکلوپیڈیا کے الفاظ ملاحظہ ہوں

"طبیعی فلاسفہ، کیمسٹری اور فزیالوجی کے ماہرین یقین رکھتے ہیں کہ ایک سبب سے ہمیشہ یکساں نتیجہ برآمد ہوتا ہے اور ایک مثال میں اگر تصور کامیاب ہو تو ان کو اطمینان ہے کہ ہمیشہ ہی کامیابی حاصل ہوگی اس لیے

طبیعی علوم میں اب قانون تعلیل (LAW OF CAUSATION) کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں رہ گیا ہے۔ اس باب میں اختلاف صرف مابعد الطبیعاتی حلقہ میں پایا جاتا ہے "

CHAMBERS'S ENCYCLOPAEDIA (1874) P.691, V.II

مگر آئن سٹائن کے بعد سائنس کا جو دور شروع ہوا ہے اس نے قانون تعلیل کے بارے میں سائنس دانوں کے عقیدے کو متزلزل کر دیا ہے پھر ہمارے ارتقاء پسند دوستوں کا اس وقت کیا موقف ہوگا جب مغربی علماء یہ اعلان کر دیں گے کہ نظریہ ارتقاء کے تحت زندگی کے مظاہر کی توجیہ نہیں ہوتی۔

ایک غلطی

حدیث اور قرآن دونوں کو سمجھنے میں ایک غلطی عام طور پر پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ قرآن اور کتب حدیث دونوں کو لوگ عام تصنیفات کی طرح دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح دوسری کتابوں میں ایک مضمون ایک ایک جگہ بتمام و کمال بیان کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اسی طرح قرآن و حدیث میں بھی کی گئی ہوگی لیکن دراصل معاملہ یہ نہیں ہے۔ قرآن ۲۳ سال کی مدت میں مختلف مواقع پر مختلف حالات و ضروریات کے مطابق تھوڑا تھوڑا نازل ہوا ہے اسی طرح احادیث میں حضور کے وہ اقوال جمع کیے گئے ہیں جو ۲۳ سال کے طویل زمانے میں آپ نے مختلف مواقع پر مختلف حالات میں حسب ضرورت ارشاد فرمائے ہیں ان دونوں میں ایک چیز تو اسلام کی مرکزی تعلیم ہے جسے بار بار مختلف طریقوں سے دہرایا گیا ہے اور دوسری چیز اسلامی ہدایت کی تفصیلات ہیں جن کو کہیں یک جا اور کہیں جدا جدا مختلف حالتوں اور مختلف ضرورتوں کے لحاظ سے بیان کیا گیا ہے۔ صحیح نتیجہ اخذ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان سب پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالی جائے ورنہ اگر ایک ٹکڑے کو کہیں سے لے لیا گیا اور دوسرے متعلق اجزاء سے صرف نظر کر کے اس کو ایک مستقل چیز سمجھ لیا گیا تو یقیناً غلط فہمی واقع ہوگی

مریم جمیلہ
(سابق مارگریٹ مرقس)

کیا ہمیں بدلتے زمانوں کے ساتھ بدل جانا چاہیے

(انگریزی ماہنامہ وائس آف اسلام نومبر ۶۱ئہ کے ایک مضمون کا ترجمہ)

"اگر اسلام نے نئی دنیا کے ساتھ مطابقت پیدا نہ کی تو وہ ختم ہو جائے گا" یہ وہ الفاظ ہیں جو مسلمان ملکوں کا مغربی تعلیم یافتہ اور با اقتدار طبقہ مسلسل دُہراتا رہتا ہے۔ وہ یہ تنبیہ کرتے ہوئے کبھی نہیں تھکتا کہ ہم لوگ گزرے ہوئے زمانے میں زندگی بسر نہیں کر سکتے، ہمیں تعلیم دی جاتی ہے کہ عہد گزشتہ کو واپس لانے کی کوشش، محض خام خیالی ہے کیونکہ کوئی شخص بھی تاریخ کے میلان کو بدل نہیں سکتا۔ لہٰذا ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ بدلتی ہوئی سکولر سوسائٹی کے مطالبات مان لیں اور اپنے اعتقادات انہیں سانچوں میں ڈھال لیں۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ طاقت حاصل کرنے کے لیے قرآن کی ان تشریحات و تعبیرات کو رد کر دینا چاہیے جو نسلاً بعد نسل ہوتی چلی آ رہی ہیں اور قرآن کو آزادانہ جدید زندگی کی روشنی میں پڑھنا چاہیے۔

عملی طور پر وہ تمام اصلاحات جن کی مسلمان حکومتیں تائید و حمایت کرتی ہیں اپنے دماغ میں یہی منزل مقصود رکھتی ہیں۔ ان حالات میں ہمیں اس پہلو سے اچھی طرح غور و فکر کرنا چاہیے کہ مذکورہ بالا تعلیمات و خیالات کا اسلامی جماعت پر کیا اثر پڑے گا۔

چونکہ حکومت اسلامی کا نظریہ اس دنیا کے لیے جس پر خالص مفاد پرستی کی حکومت ہے، ایک عذاب کی حیثیت رکھتا رکھتا ہے اس لیے ہم سے یہ مغربی تعلیم یافتہ لیڈر کہتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ کے لیے خلافت کے خاتمے کو قبول کر لینا چاہیے اور اس امکان کو خارج از بحث سمجھنا چاہیے کہ آئندہ وہ کبھی زندہ ہو سکے گی۔ اب وہ حکومت و سیاست جس کی بنیاد مذہب پر ہو قرون وسطیٰ کی قابل نفرت علامت سمجھی جاتی ہے لہٰذا دنیائے جدید میں اپنا مقام حاصل کرنے کے لیے سکولر حکمرانی سے مصالحت کر لینی چاہیے اور اپنے آپ کو اسی کے موافق تیار کرنا چاہیے ۔۔۔ اس منزل کی طرف مارچ کرنے کے لیے مسلمان ملکوں میں کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جن میں ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کے تمام تاریخی مصائب کی وجہ خلافت تھی

ن کا دعویٰ ہے کہ خلافت و حکومت اسلام کا کوئی حقیقی جزو نہیں ہے اس لیے کہ پیغمبر علیہ السلام کا مشن صرف تبلیغ میں

رو دیتا انھوں نے کبھی بھی حکومت کی خواہش نہیں کی وہ صرف حالات تھے جنھوں نے ان کو حکومت قائم کرنے پر مجبور کر دیا
کوئی علمی و فکری بد دیانتی اتنی گہری نہ ڈوبی ہوگی جتنی ان لوگوں کی خیانت ڈوب چکی ہے — اسلام ایک
سلامی جماعت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اور اسلامی جماعت منظم اداروں اور قیادت کے بغیر سلامت نہیں رہ سکتی
خاتمۂ خلافت کے بعد دوسرا قدم شریعتِ اسلامیہ کا اخراج ہے۔ جب سے اسلامی قانون کے بارے میں مغربی تعلیم یافتہ
لیڈروں نے یہ خیال قائم کیا ہے کہ وہ غیر ترقی یافتہ ہے اور اس کا تصور عدل مغرب کے قانونی درد سے پست
ہے اس وقت سے یہ بات بھی مان لی گئی ہے کہ صرف لادینی قوانین ہی مسلمانوں کی سماجی فلاح کے ضامن ہوسکتے اور
انہیں عہدِ حاضر کے جدید معاشرے کا تکمیلی جزو بنا سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ سودخواری، شراب نوشی، قمار بازی
اور زناکاری جیسے قرآنی قوانین کی ممانعت کا نفاذ موجودہ دور میں زیادہ دنوں تک قابل قبول نہیں رہ سکتا۔
ان جرائم پر قرآن نے جو سزائیں مقرر کی ہیں انہیں غیر انسانی اور وحشیانہ کہا جاتا ہے لیکن کیا ایک برائی وقت اور مقام
کا لحاظ کیے بغیر برائی نہیں رہتی؟ کیا کسی قانون کی عمدگی کا فیصلہ صرف اس کی نرمی کی بنیاد پر کیا جائے گا؟ کیا جرائم
پیشہ طبقہ پورے معاشرے سے زیادہ ہمدردی کا مستحق ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ شریعت کے بغیر اسلامی طریق زندگی
محض کھوکھلے نظریات کا مجموعہ رہ جاتا ہے۔

اسلامی قیادت اور اسلامی قانون کو نکال کر باہر کر دینے کے بعد امت کے پارہ پارہ ہو جانے میں کوئی دشواری
نہ تھی، ایک ایسی عالمی اسلامی اخوت، جو نسل، زبان اور جغرافیہ سے بلند ہو اب قومی و وطنی برتری سے آنکھ ملانے
کے لائق نہ رہی۔ بنا بریں، مسلمانوں سے کہا جاتا ہے کہ "روح عصر" کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کے لیے امت و
ملت کے نظریے کو ترک کر کے اس کی جگہ قوم پرستی (نیشنلزم) کو قبول کر لینا چاہیے۔

نظریۂ قوم پرستی کی مقبولیت نے مختلف ملکوں کے رہنے والے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دیا
اور ایک دوسرے کا مخالف بنا دیا ہے۔ یہ نظریہ اس حد تک جا پہنچا ہے کہ ایک مشترک اسلامی ورثے پر زور دینے
کے بجائے قوم پرست لیڈر اپنے ملک کی جاہلی تہذیب پر اس طرح فخر کرنے لگے ہیں جیسے وہ ان کا زریں دور تھا
جس سے اسلام نے انہیں محروم کر دیا۔ مثال کے طور پر ترکی قوم پرست لیڈر، اپنے جد اعلیٰ عثمان کے عہد کو بیرونی
زبانوں کی غلامی کا زمانہ قرار دیتے ہیں — رضا شاہ پہلوی نے اپنے ملک کا نام فارس کے بجائے ایران رکھ دیا
اس لیے کہ فارس کسی زمانے میں آرین نسل کا وطن تھا۔ متحدہ عرب جمہوریہ (مصر) کی حکومت، قاہرہ کے پبلک مقامات
پر فرعون کے دیوتا قامت مجسمے سجا رہی ہے اور اس پر ایک عظیم عرب بادشاہ کی حیثیت سے فخر کر رہی ہے۔ قوم پرست

لیڈر حضرت عمر کو ایک عظیم انسان، اس لیے نہیں سمجھتے کہ وہ مقدس اور خدا پرست خلیفہ تھے بلکہ ان کی عظمت کے گن اس لیے گاتے ہیں کہ وہ عجمی قوموں پر عربی حکومت مسلط کرنے کے ہیرو (چمپین) تھے۔

بعض موضوعات پر یہ نئی روشنی کے لیڈر بے حد اصرار کرتے ہیں، مثلاً ان کے نزدیک اتحاد اسلامی کا نظریہ اپنی موت آپ مر چکا ہے۔ اسی بات کو ایک ترکی لیڈر اسی طرح پیش کرتا ہے: "ہم ایک ترکی اسلام وضع کرنا چاہتے ہیں جو اسی طرح ہمارا خاص اسلام ہوگا جس طرح انگلش چرچ انگلینڈ کے لیے خاص ہے۔ انگلش چرچ نہ اٹالین ہے نہ جرمن۔ اس کے باوجود کوئی شخص بھی ملامت نہیں کرتا کہ انگریز عیسائی نہ رہے۔ پھر ہم ترک ہی کیوں اپنے خاص اسلام سے محروم رہیں؟"

یہ جو مسلسل شور مچتا رہتا ہے کہ بغیر متن کے قرآن کا سرکاری ترجمہ شائع کیا جائے تو دراصل اس کے پیچھے وہی نیشنلزم کا نظریہ کام کر رہا ہوتا ہے۔ ترکی اور انڈونیشیا نے لاطینی حروف تہجی اختیار کر لیے ہیں اور انگریزی زبان کی برتری تسلیم کر لی ہے۔ نیز دیگر غیر عرب ممالک کے نظامہائے تعلیم میں عربی زبان سے غفلت برتی جا رہی ہے۔ اس طرح قرآن کی زبان تیزی سے ناقابل فہم ہوتی جا رہی ہے۔ بغیر متن کے قرآن کا سرکاری ترجمہ نہ صرف یہ کہ امت مسلمہ کی بربادی کو مکمل کر دے گا بلکہ خود قرآن کے متن میں بھی خلل انداز ہوگا۔

اسلامی دنیا کی مسلمان حکومتوں میں صنعتی انقلاب کے ذریعہ معاشی اور معیار زندگی کو اونچا کرنے کا بے حد جوش پایا جاتا ہے۔ کوئی شخص پوچھ سکتا ہے کیا یہ اسلام کے خلاف ہے؟ کیا اسلام معاشی انصاف اور انتہائی غربت کو دور کرنے کا مطالبہ نہیں کرتا؟ قرآن ترک دنیا اور رہبانیت کی مذمت کرتا ہے اور ہمیں حق دیتا ہے کہ ہم اپنی جائز کمائی ہوئی دولت سے استفادہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے کہ کائنات کی دولتوں اور نعمتوں کو انسان کی بھلائی کے لیے استعمال کیا جائے، لہٰذا اسلام مشینی ارتقاء کا دشمن نہیں ہو سکتا۔ بات ٹھیک ہے لیکن دوسری طرف اسلام سختی سے عہد حاضر کے اس نظریہ کا مخالف ہے کہ مادی استحصال اور جسمانی و مادی طاقت کا نقصان تو برداشت نہ کیا جائے اور انسانی وجود کے اخلاقی پہلو کی طرف سے مکمل غفلت برتی جائے۔

یہ بات نہیں ہے کہ سائنسی اکتشافات بطور خود نقصان دہ ہیں بلکہ زیادہ تر مادی فلسفہ حیات، صنعت و حرفت کو تخریبی مقاصد کے لیے اس طرح استعمال کرتا ہے کہ انسانیت پر مصائب کے بادل چھا جاتے ہیں اور خاندانی تعلقات اور مذہبی زندگی برباد ہو جاتی ہے ـــــ عہد جدید کے کارخانے اپنے کارندوں کو عبادت کے لیے وقت نہیں دیتے۔ رمضان کے روزوں کی اس لیے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے کہ اس سے کارخانے کی پیداوار پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس نظریہ نے اسکولوں

ہر بھی حملہ کیا ہے جہاں خالص مفاد پرستانہ مضامین پورے نظام الاوقات پر مسلط کر دیے گئے ہیں اس طرح فنی اور تجارتی درسیات کی انتہائی توقیر اور اسلامیات کی تحقیر کی جاتی ہے ۔۔۔ عہد جدید کا صنعتی انقلاب اس فلسفہ کو ترقی دے رہا ہے کہ کسی آسمانی مدد کے بغیر انسان غربت، مرض اور جہالت پر قابو پا سکتا ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ سائنس نے انسان کو اللہ سے آزاد کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غربت اور سماجی ناانصافی کے خلاف جنگ میں کوئی حکومت نہیں چاہتی کہ قرآن کے قوانین۔ زکوٰۃ۔ حرمت سود اور میراث کو نافذ کرے یا اوقاف کو موثر طریقے سے استعمال کرے۔

"مسلمان عورت کی آزادی" ان لیڈروں کے نزدیک سماجی ترقی کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اگر "آزادی" سے ان کا مقصد یہ ہو کہ عورتوں کو اس کا حق ملنا چاہیے کہ وہ تعلیم کے ذریعہ اپنی دماغی صلاحیت کو ترقی دیں اور جہاں ضروری ہو وہاں اپنی قابلیتوں سے اپنی روزی بھی حاصل کریں تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن بدقسمتی سے مساوات مرد و زن کے مرد میدان اس بات پر بھی زور دے رہے ہیں کہ مسلمان عورتوں کو مردوں کے ساتھ اختلاط اور بے حیائی کے لباس کی بھی آزادی ملنی چاہیے۔

چونکہ مسلمان عورتوں کے لیے ضروری ہے کہ مردوں کے سامنے اپنے جسم کا مظاہرہ نہ کریں اس لیے جدید فیشن کے لباس جو بالکل مخالف مقصد کے لیے تراشے گئے ہیں۔ بلاشبہ کتاب وسنت دونوں ہی سے متصادم ہیں۔ مغربی لباس کے انتخاب و اختیار کی تقریباً ہر مسلمان ملک سرکاری طور پر حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ترکی نے تو یہ مضحکہ خیز قدم اٹھایا ہے کہ اس نے مغربی لباس پہننا قانوناً لازم کر دیا ہے۔ مغربی لباس ترقی و کامیابی کی علامت بن گیا ہے۔ وطنی و قومی لباس جواب دیہاتوں کے بہت ہی غریب طبقے استعمال کرتے ہیں۔ پستی اور جہالت کی علامت قرار دے دیے گئے ہیں ۔۔۔ دشمن اسلام مغرب کے لباس اور اس کے معاشرتی عادات و خصائل اختیار کر کے اسلامی تشخص کی تمام علامات کو ختم کرنے کی کوشش فی الواقع ارتداد کے ہم معنی ہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے یہ بات اپنے اس فرمان میں صاف کر دی ہے من تشبہ بقوم فھو منھم (جو شخص کسی قوم کی مشابہت اختیار کرتا ہے اس کا شمار انہی میں ہے) اس طرح ہم لوگوں پر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ بیسویں صدی کی مادی زندگی سے اسلام کی مطابقت کیوں ناممکن ہے۔

مسلمان، عہد حاضر کے میلانات و رجحانات کا ساتھ دیکر نہیں بلکہ ان سے لڑ کر قوت و طاقت حاصل کر کے تمام ذرائع و وسائل، دنیا بھر کے مسلمانوں کے اندر غیر اسلامی قوانین کے خلاف عام بیزاری پیدا کرنے کے لیے صرف ہونے چاہییں۔ ساتھ ہی ساتھ ان تمام اسلام پسند لیڈروں کو جو کسی حکومت پر اثر انداز ہونے کے لائق ہوں، اثر ڈالنا چاہیے کہ وہ اسلامی طریق زندگی کی حوصلہ شکنی کے بجائے حوصلہ افزائی کرے۔

Accession No. 38086
Date........
DELHI-110006

مادّہ پرستانہ ثقافت کی ڈوبتی ہوئی شام

(پروفیسر پٹریم سوروکن۔ سابق چیرمین شعبۂ عمرانیات ہارورڈ یونیورسٹی۔ امریکہ)

انتشار کا آغاز

مغربی ثقافت اور سماج آج جس جگہ ہے وہ اس بات کی دکھ بھری تصویر پیش کرتا ہے کہ اس کے مدرک بالحواس (SENSATE) نظام اعلیٰ میں انتشار اور شکستگی کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس لیے دس بیس سال میں نئی فکری یا اعلیٰ تصوراتی دنیا میں خود کو ڈھالنے کے لیے اس کے مستقبل قریب کو حشر ونشر کی ایک نازک منزل سے گذرنا ہوگا اور اس کے تمام لوازم کے ساتھ گذرنا ہوگا۔ جامع اختصار سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس منزل میں حسب ذیل رجحانات کا دور دورہ ہوگا۔

(۱) بحرانی دور

محسوس پرستانہ اقدار اور زیادہ ــــ اور زیادہ اضافی اور اعتباری ہوتی جائیں گی اور پھر ہوتے ہوتے ہر قسم کی آفاقی قدر و قیمت اور اطاعت پر مجبور کرنے والی طاقت سے محروم ہو کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جائیں گی حق و باطل ــــ خطا و صواب ــــ خوب و ناخوب ــــ مثبت اور منفی قدروں کے درمیان جو حد فاصل ہے تیزی کے ساتھ مٹتی چلی جائے گی اور آخرکار رفاعی، اخلاقی، جمالیاتی اور معاشرتی مزاج کا تسلط ہو جائے گا۔

(۲) قعرِ پستی میں

بڑی تیز گامی کے ساتھ یہ ایٹمی ذروں میں بٹتی ہوئی محسوساتی قدریں خود انسان کو ساتھ لیے ہوئے اور زیادہ پست، بوالہوس، ہوسناک اور مادّیاتی ہوتی چلی جائیں گی جن میں کوئی بھی ملکوتی، پاکیزہ اور مطلق و آزاد عنصر باقی نہ رہے گا۔ وہ سماجی، ثقافتی گندی نالیوں کی آلائشوں میں اور نیچے بیٹھ جائیں گی۔ بڑی تیزی کے ساتھ وہ تعمیری سے زیادہ تخریبی ہو جائیں گی اور ان کا کل مجموعہ "خدا کی بادشاہت" کی غیر فنا پذیر اقدار کے بجائے سماجی اور ثقافتی امراض کے علمی عجائب خانہ کی نمائندگی زیادہ کر رہا ہوگا۔ پھر تیزی سے یہ ہوگا کہ یہ محسوسات پرستانہ ذہنیت مادی اور کیمیائی حیاتیاتی

نظریہ پرستانہ، عملیت پرستانہ، معاشیاتی تجزیہ و تحلیل نفسی، میکانیکی اور مادی انداز سے انسان اور اقدار کی یہ تعبیر و تشریح کرے گی کہ یہ جواہر، مثبت و منفی برقپاروں کی ایک کائنات ہے جس کے ٹھوس اور ٹھس دیوپیکر جال میں انسان نام کی خود کار مشین زیر دام آگئی ہے۔

(۳) عالمی ضمیر لاپتہ

جب اقدار ایٹمی اجزاء میں ڈھل چکی ہوں تو ہر قسم کا حقیقی، فیصلہ کن اور اطاعت پر مجبور کرنے والا سواد اعظم (Public opinion) اور آفاقی ضمیر لاپتہ اور ناپید ہو جائے گا۔ بے جھجک اور بے محابا مخالف آراء کی ایک بھیڑ اور مرعوب کن گروہوں کے نقلی ضمیر ان کی جگہ لے لیں گے۔

(۴) اقرار نامے اور معاہدے

اقرار ناموں اور معاہدوں میں اطاعت پر مجبور کرنے والی طاقت کے جو باقیات الصالحات رہ گئے ہیں وہ بھی جاتے رہیں گے مگر گزشتہ قریبی صدیوں کے دوران میں مغربی انسان نے اقرار ناموں کی جو عظیم الشان عمارت تیار کی ہے وہ ڈھے جائے گی۔ اس انہدام کے ساتھ ساتھ معاہداتی جمہوریت، معاہداتی سرمایہ داری جس میں انفرادی ملکیت بھی شامل ہے — آزاد لوگوں کا آزاد معاہداتی سماج بھی وجود کے نقشے سے صاف ہو جائے گا۔

(۵) قاہرانہ طاقت

قاہرانہ طاقت اور انسانیت بیزار دھوکے بازی کو یہ مرتبہ حاصل ہوگا کہ وہ اقدار کے بارے میں اور افراد اور جماعتوں کے باہمی تعلقات پر آخری فیصلہ کریں۔ طاقت کا نام صداقت ہوگا۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ لڑائیوں، انقلابوں، بغاوتوں، ہنگامہ و فساد اور سفاکی کا چہار جانب راج ہوگا۔ ہر جگہ اور ہر ہر چیز کے خلاف لڑائی! — انسان انسان کے مقابلے میں — طبقہ، قوم، عقیدہ اور نسل کے مقابلے میں طبقہ، قوم، عقیدہ اور نسل سر اٹھائے گی۔

(۶) آزادی کے بجائے جبر و بالادستی

اکثریت کے لیے آزادی خواب و خیال ہو جائے گی اور حکمران اقلیت کے ہاتھوں میں ایک بے لگام نفسانیت کی شکل اختیار کرے گی۔ جن حقوق کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ان کو الگ کر دیا جائے گا۔ حقوق کے دستاویزی اعلانات کو یا تو منسوخ کر دیا جائے گا یا پھر ان کو ایک بے غل و غش چہرے خوش نما پردوں کے طور پر استعمال کیا جائے گا۔

(۷) حکومتیں صبح کچھ اور شام کچھ چار سو میں، بوڑھی خرانٹ اور ظالم و سفاک ہوتی جائیں گی جن سے روز ٹوٹے [illegible] — آزادی کی حکومت اور قانون کی جگہ تشدد اور بناؤ کی جگہ بگاڑ کا تحفہ ملے گا۔ ان کی عمر

روز بروز گھٹتی جائیں گی اور وہ ڈانواں ڈول اور اپنا تختہ الٹنے جانے کے خطرے سے دوچار ہونگی۔

(۸) شوہر اور بیوی کے اتحاد ــــ والدین اور بچوں کے اتحاد کی حیثیت سے خاندان کا شیرازہ بکھرتا چلا جائے گا طلاقیں اور فسخ تعلق کی وارداتیں بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچ جائے گی کہ معاشرت کی منظوری یافتہ شادیوں اور ناجائز جنسی تعلقات کے مابین فرق و تفاوت ہی اٹھ جائے گا۔ بچے وقت سے اور پہلے ــ اور پہلے ماں باپ سے جدا ہو جائیں گے ــــ خاندان کے سماجی ثقافتی امور بگڑیں گے یہاں تک کہ خاندان مرد اور عورت کے درمیان محض ہنگامی رفاقت کا نام ہو کر رہ جائے گا اور گھر خصوصاً جنسی تعلق کی غرض سے ایک رات کا بسیرا کرنے کا ٹھکانا ہو کر رہ جائے گا۔

(۹) ہنگامی قوتوں کا نشانہ

ہماری ثقافت کا غیر معمولی حد تک محسوس پرستانہ نظام تیزی کے ساتھ ایک بے ڈول "ثقافتی غمکدہ (culturally duming plan) کی شکل اختیار کر جائے گا جس میں غیر منہضم شدہ عناصر کا ملغوبہ ٹھنس جائے گا جو ہر قسم کی وحدت اور انفرادیت سے بالکل کورا ہو گا۔ ایک ایسی منڈی میں تبدیل ہو جانے کے بعد وہ ان ہنگامی قوتوں کا صید زبوں بنکر رہ جائے گا جو اس کو با اختیار جیتے جاگتے موضوع کے بجائے بڑی حد تک ایک "تاریخی ٹکڑا" بنا ڈالیں گی۔

(۱۰) تخلیقی صلاحیتوں پر کُھملاہٹ

اس کلچر کی تخلیقی صلاحیت مرجھاتی اور کُملاتی چلی جائے گی۔ گلیلیوں اور نیوٹنوں، لبنٹزوں (LEIBNITZES) ڈاروِنوں، کانٹوں اور ہیگلوں، شکسپیروں اور ڈانٹوں، بیکوں اور بیتھوونوں، ریفائیلوں اور ریمبرانٹوں کی جگہ اوسط درجے کے مفکروں، سائنس سازوں، افسانہ بازوں، موسیقی بازوں، تماشہ کاروں کی بھیڑ لے لیگی جن میں ہر طبقہ دوسرے طبقے سے زیادہ زاری ہو گا۔ اخلاقیات کے باضابطہ تقاضوں کی جگہ پر خود پسندانہ مصالح، عصبیت، فریب کاری اور جبر کی ایسی شیطانی لیبیں بڑی تیزی کے ساتھ براجمان ہو جائیں گی۔ عظیم مسیحیت غائب ہو جائے گی اور اس کی جگہ سائنس کے اجزائے پریشاں اور فلسفہ کے ٹھیکروں کی انتہائی وحشیانہ من گھڑت تحریفات آجائیں گی جن کو فسوں کار معتقدات اور محروم آگاہی اوہام پرستی کے ایک نوخیز مواد کی آنچ پر پکا لیا گیا ہو گا۔ تعمیر پسند ٹیکنالوجی کی اختراعات کی جڑ تخریبی ایجادات کے ہاتھوں کٹ جائیگی (بطور خاص)۔

۱۔ حسن کیفیت کا نعم البدل کمیت و مقدار کی غیر معمولی جسامت قرار پائے گی۔ "بہترین کی جگہ "جسیم ترین" ــــ ناقن کی جگہ عمومی مانگ کو تسکین دینے والی اشیاء ــــ داخلی قدروں کے بجائے چمکتی دمکتی خارجی صورت ــــ عبقریت کی

جگہ جوڑ توڑ ___ تخلیقی جودت کی جگہ نقالی ___ دیرپا قدر کی جگہ کوئی سنسنی خیز ٹکڑا ___ روشن ضمیر بصیرت کی جگہ عملی کارستانیاں ابھر آئیں گی۔

ب۔ فکر کی جگہ رسمی اخبار و معلومات کی پیشکش آجائے گی ___ دانشوروں کی جگہ تیز و طرار لوگ آجائیں گے حقیقی کسوٹیوں کی جگہ جعلی کسوٹیاں ہوں گی اور عظیم سربراہوں کی جگہ شاطران عیار ہوں گے۔

ج۔ ماضی کی اعلیٰ ترین ثقافتی قدروں کو بھی پست کر دیا جائے گا۔ بیتھون اور بیک جیسے حضرات کو اشتہاری ملبنات، لذیذ گلوریوں، اناج، شراب اور دوسری ٹھوس لذتوں کی جوشیلی عبارتوں کا ضمیمہ بنایا جائے گا۔ میکلے لینگلو (MECHELANGELO) اور ریمبرانٹ (REMBRANDT) جیسے اشخاص صابن، بلیڈوں، دھلائی کی مشینوں اور وسکی کی بوتلوں کو زینت بخشیں گے۔ اخباری خبر رساں اور ریڈیو کے یاوہ گو ایک ساعت گریز پا کے لیے گوئٹوں اور شکسپیروں کو یہ اعزاز بخشیں گے کہ وہ ان کے پرچوں اور ریڈیائی بات چیت میں "ایک سطر کا اضافہ کر دیں"

(۱۱) مادی اقدار کا زوال

بڑھتے ہوئے لسانی، دماغی اور سماجی نراج محسوسات پرست ذہنیت کی روبزوال تخلیقی صلاحیت میں مادی قدروں کا بننا کم ہو جائے گا۔ یاس و بددلی کا عالم سقیم سے سقیم تر ہو جائے گا۔ اور زندگی کا مادہ پرستانہ معیار گر جائیگا۔

(۱۲) اکتاہٹ

ان ہی وجوہات سے جان و مال کی حفاظت رخصت ہو جائے گی اور ساتھ ہی طمانینت خاطر اور خوشی بھی!۔ خودکشی کی وارداتیں، دماغی امراض اور جرائم میں اضافہ ہوگا۔ آبادیوں کے زیادہ سے زیادہ بڑے طبقوں پر اکتاہٹ اور شکستہ خاطری کے بادل چھاتے چلے جائیں گے۔

(۱۳) محسوسات پرستانہ قصر حسین زمین پر ڈھیر

انسانی آبادی تیزی کے ساتھ دو انداز کی آبادیوں میں شق ہو جائے گی ___ "کھاؤ پیو اور عشق لڑاؤ کیونکہ کل ہم نہ رہیں گے" کا نعرہ لگانے والے محسوسات پرست ارباب لذتیت اور ___ اس کے نتیجہ میں تارک الدنیا بیراگی جو محسوسات پرستانہ اقدار کے بارے میں حریف اور سرد مہر ہوں گے۔ اس طرح سے محسوسات پرستانہ ثقافت اور اس کا آدمی اپنے دیوالیہ پن اور اپنے آپ خود کو ہلاک کرنے کی طرف بھٹک جائے گا۔ جب مادی رحمتیں غائب ہو جائیں گی ___ آزادیاں رخصت ہو چکی ہوں گی ___ لذتوں کی قیمت پر اذیتوں میں اضافہ ہو چکا ہوگا ___ محسوسات پرستانہ خیر و عافیت اور مسرت خواب و خیال میں ڈھل چکی ہوں گی ___ انسان کی عظمت اور قدر بے رحمانہ طور پر کچلی جا چکی ہوگی

— محسوسات پرست ثقافت کی اوج پر زوال آچکا ہوگا — اور محسوسات پرستانہ کلچر کا کبھی کا شاندار محل ریزہ ریزہ ہوکر زمین پر آرہا ہوگا — تباہی کا ہر طرف دور دورہ ہوگا — شہروں اور سلطنتوں کا وجود دکھر چ کر صاف کیا جا چکا ہوگا۔ خون انسانی پیاری زمین کو لبالب بھر چکا ہوگا — تمام محسوسات پرستانہ قدروں کے پرخچے اڑ جائیں گے۔ تمام محسوسات پرستانہ خواب گم ہو چکے ہوں گے — تو ان حالات میں مغربی آبادی مجبور ہوگی کہ گرتی ہوئی محسوسات پرست ثقافت کے کھوکھلے پن کے لیے آنکھیں کھولے اور اس کے فریب نظر سے آزاد ہو۔ نتیجہ کے طور پر وہ اس کو زیادہ عجلت کے ساتھ ترک کر دے گی اور اپنی وفاکیشی کا رخ ایک فکر ساختہ یا اعلیٰ تصوراتی اقدار کی طرف پھیرے گی۔ المیہ، اذیت اور شکنجوں میں کسے جانے سے اس کا تزکیہ ہوگا۔ اور وہ ابدی، پائیدار، آفاقی اور مطلق اقدار کے ساتھ ہوش وخرد کی طرف رجوع کرے گی۔ اقدار کا اپنی قالب ٹوٹ کر آفاقیت اور مطلق پسندی میں ڈھل جائے گا۔ محسوسات پرستانہ کلچر اور محسوسات پرستانہ نظام اعلیٰ کے مقدمہ اساسی کو ہٹا کر اسکی جگہ تیزی سے شیرازہ بند اور فکر ساز مقدمہ نظام اعلیٰ رکھ دیا جائے گا

تنقیہ

اس کایا پلٹ میں سب سے پہلے مغربی سماج کے بہترین دماغ پہل کریں گے۔ تیزی کے ساتھ اس کے بہترین ذہن ایک بار پھر سینٹ پالوں اور سینٹ آگسٹائنوں اور اونچے مذہبی واخلاقی ناموں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ عوام ان کے نقش قدم پر چل پڑیں گے۔ جب تنقیہ کا یہ آخری مرحلہ آجائے گا تو یہ بحرانی دور ختم ہو جائے گا۔

دل خوش کن خیال آرائیاں

آفات وابتلا کی آگ بھری قربان گاہ پر تزکیہ حاصل کرکے مغربی سماج کو ایک نئی عطا وبخشش حاصل ہوگی اور اس کے ساتھ اس کو ایک نئی رستخیز اور نئی تخلیقی جولانی ملے گی، یہ سماج ایک تعمیری دور میں داخل ہوکر ایک نئی مستحکم تر فکر ساز کے نظام اعلیٰ اور ایک برتر سماج میں قدم رکھے گا جس کی تعمیر پژمردہ محسوسات پرست کلچر کی جڑوں پر کہ استحکام پسند اصولوں کی صالح تر اور قوی تر بنیاد پر اٹھائی جائے گی۔ اس طرح مغربی ثقافت کے ایک نئے عہد کا افتتاح ہوگا۔

سڑک ختم ہو رہی ہے۔

اس کتاب (مطبوعہ ۱۹۳۷-۴۱ء) کی ابتدائی چار جلدوں میں میں نے امراض کی علامات کے پیش نظر جو کچھ تشخیص کی اور آئندہ خطرات کے بارے میں رائے قائم کی اس کے مطابق گزشتہ چند سالانہ دہائیوں میں حالات کا مرکزی عمل مندرجہ ذیل امور پر مشتمل رہا ہے۔

(الف) محسوسات پرست ثقافت، سماج اور انسان کا ترقی پذیر زوال اور (ب) ایک نئے فکر ساز اور اعلیٰ تصوراتی سماجی، ثقافتی نظام کے ابتدائی اجزا کی خاموش، دبی دبی نشو و نما کا ظہور۔

سائنس کے میدان میں

سائنس کی دنیا میں یہ دو طرفہ اور دوگانہ عمل جن صورتوں میں ظاہر ہوا وہ یہ ہیں:۔

ر۔ اخلاقاً غیر ذمہ دارانہ، محسوسات پرست اور مادی سائنٹفک کارناموں کی بڑھتی ہوئی تباہ کاریاں اور جوہری توانائی کی، جراثیم پھیلانے والی ایجادات اور انسان اور اس کی تمام اصلی اقدار کو تباہ کرنے والے شیطانی ذرائع ـــــ اور ـــــ

ب۔ سائنس کے اساسی نظریات کا رخ ایک اخلاقاً جواب دہ، فکر ساز اور اعلیٰ تصوراتی سمت میں تبدیل ہونا۔ اس تبدیلی نے گزشتہ دو صدیوں پچھلی سائنس کے مقابلے میں آج کی سائنس کو کم مادہ پرست، میکانیکیت پسند اور جبریت کیشانہ (DETERMINISTIC) یا یوں کہیے کہ کم محسوسات پرست پہلے ہی بنا چھوڑا ہے۔ اس جدید سائنس کے نزدیک مادہ اس کے سوا کچھ نہیں رہا کہ وہ توانائی کی ایک گتھی ہوئی شکل ہے جو مادے سے آزاد ہو کر تابکاری میں ڈھل جاتی ہے۔ مادے کے ایٹم تیس سے زیادہ غیر مادی، "ذومعنی، مخفی، پُرپیچ، پُراسرار اور حجاب در حجاب" ابتدائی عناصر ترکیبی میں پہلے ہی تحلیل کر ڈالے ہیں:۔ برقپارے اور منفی برقپارے، مثبت برقپارے اور مخالف مثبت برقپارے فوٹون اور میسون (PHOTON AND MESON) وغیرہ ـــــ یا ان لہروں کی شکل میں جو قیاسی لہریں اور ان شعوریاتی لہروں میں تبدیل ہو جاتی ہیں جن کی صورت گری ہمارا تخیل (WAVES OF PROBABILITY) دور تک کرتا چلا جاتا ہے سان لہروں کی طرح جو ذرّات نور کے پھیلاؤ سے وابستہ ہیں یہ لہریں زمان و مکان میں پھیلنے کے لیے کسی سطح اور محل کی محتاج نہیں یہ لہریں کسی رقیق، کسی ٹھوس شے حتیٰ کہ کسی گیس تک میں سے ہو کر نہیں گذرتیں۔ ذرات شعاعیہ (QUANTUM) کے میکانیکی شعبوں کے جال کے چاروں طرف اور برقپاروں کے ابتدائی نیفہ پر مادیاتی اور میکانیکی سائنس کے بنیادی تصورات مثلاً مادّہ، خارجی حقیقت (OBJECTIVE REALITY) مکان و زمان، بخت و اتفاق ـــــ اب بالکل موزوں اور قابل استعمال نہیں رہے۔ اور ہمارے حواس کی کسوٹی بڑی حد تک اس کی معنویت کو اٹھا کر پھینک دیتی ہے۔ جہاں تک جبریت اتفاق (DETERMINISTIC CASUALITY) کا تعلق ہے اس کو تو اس کے مقام سے ہٹایا بھی جا چکا اور جدید سائنس میں ہیسنبرگ کے قانون لااعتباریت (RULE OF UNCERTAINTY) ذرات نور کی ترنگ بازانہ چھلانگ اور مطلق

اتفاقات کی باہم پیوستگی کو اس کی جگہ پر رکھ دیا گیا۔ عمرانی نفسیات کے واقعات میں بخت و اتفاق سے ماورا ء "رضا کارانہ خود مختارانہ قانون " کو اس کی جگہ لے آیا گیا۔

حیاتیاتی اور عمرانیاتی سائنس

حیاتیاتی، نفسیاتی اور عمرانیاتی سائنس کی نئی نظریاتی پیش رفت میں بھی بالکل یہی کایا پلٹ ہوئی ہے "میکانکی مادیاتی اور بے بس حیاتیات، نفسیات اور عمرانیات" مگر ہنوز اپنی دھن الاپتی ہوئی قانون کے برخلاف ان ضوابط کے نئے اور معنی خیز نظریے کھل کر یہ بات ظاہر کرتے ہیں کہ حیات، نامیاتی جسم، شخصیت، ذہن و دماغ اور سماجی ثقافتی عمل کا سلسلہ دیکھ کر نہ یہ سمجھا جا سکتا ہے اور نہ سمجھنے کی بات ہے کہ یہ سب کچھ مادیاتی، میکانکی اور حیاتی حقیقتیں ہیں اور بس۔ ان نظریات کے بموجب یہ مظاہر زندگی اپنے تجربی پہلوؤں کے علاوہ کچھ ایسے اہم تر پہلو رکھتے ہیں جو عقلاً استدلالی ہیں اور مافوق الحواس اور ماورائے استدلال بھی ہیں۔ ان صورتوں اور دوسری صورتوں میں جدید ترین سائنس انیسویں صدی کی سائنس کے مقابلے میں خصوصی اہمیت کے ساتھ فکر ساز اعلیٰ تصوراتی تو کبھو کی ہو چکی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سائنس کے دم توڑتے ہوئے محسوسات پرستانہ عناصر کو ہٹا کر ان کی جگہ فکر ساختہ اعلیٰ تصوراتی عناصر رکھ دیے جائیں گے۔

فلسفہ

فلسفے کے میدان میں اس دو طرفہ عمل کا مظاہرہ مادیاتی، میکانیکی، مشیت اور دوسرے محسوسات پرستانہ فلسفوں کے بڑھتے ہوئے بنجرپن اور گراوٹ کی شکل میں ہوا ہے اور ارتقا پسندانہ، بصیرت کیشانہ "نیو تھامسٹ" (NEO-THOMIST) استحکام جویانہ، نو صوفیانہ (NEO-MYSTIC) "نو ویدانتی" اور ان دوسرے فلسفوں کی شکل میں ہوا ہے جو انکار پسندی اور اعلیٰ تصورات پسندی کی جنس سے ہیں۔

فنون لطیفہ

فنون لطیفہ کے سارے میدانوں میں بالکل اسی نہج کا دوگانہ عمل چل رہا ہے۔

مذہب

مذہب کے دائرے میں اس کا اظہار (ا) جنگ جو الحاد اور (ب) مذہب کے نشاۃ ثانیہ کی متوازی نشوونما کی شکل میں ہوا ہے۔

اخلاقیات

[illegible]

ا) کھلی ہوئی حیوانیت اور ہولناک اخلاقی بے یقینی جس کا مظاہرہ دوسری عالمی جنگ، خونیں انقلابات اور بڑھتی ہوئی جرائم کاری میں ہوا ـــ اور ـــ

ب) اخلاقی ہم پسندی، بلند ایثار کیشی، اور جنگ، خوں ریز کش مکش اور ناانصافی کو نکال باہر کرنے کے لیے منظم تحریک۔

سیاسیات

سیاسیات میں اس دوطرفہ عمل کا نتیجہ مندرجہ ذیل صورتوں میں نکلا:۔

ا۔ ہر گونہ ظالمانہ مطلق العنانیت کی تصویریں۔

ب۔ دھیرے دھیرے اندر ہی اندر ابھرتی ہوئی تحریکات جن کا مقصد اہل، ایمان دار اور اخلاقاً جواب دہ "لوگوں کی، لوگوں کے ذریعہ اور لوگوں کے لیے" حکومتوں کا قیام ہے۔

عہد آفریں کش مکش

پہلے کے تخلیقی گراب کے بڑی حد تک فرسودہ محسوسات پرستانہ نظام اور ایک نئے فکر ساختہ یا اعلیٰ تصوراتی نظام کی ابھرتی ہوئی تخلیقی قوتوں کے درمیان یہ کش مکش سماجی اور ثقافتی زندگی کے تمام ہی میدانوں میں بے پناہ شدت سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس عہد آفریں کش مکش کا آخری نتیجہ نکلنا اس پر منحصر ہے کہ آیا نوعِ انسان ایک نئی عالمی لڑائی سے بچ سکتی ہے یا نہیں؟ ـــ اگر بگڑتے ہوئے محسوسات پرست نظام کی قوتیں ایسی ایک جنگ چھیڑ دیتی ہیں اور اس وقت تک کی اپنی باقی ماندہ توانائیاں بکھیر دیتی ہیں تو یہ قوتیں نوعِ انسان کا خاتمہ کر سکتی ہیں یا بڑی حد تک اس کی تخلیقی صلاحیت کی پیش قدمی میں رکاوٹ ڈال سکتی ہیں اگر عہدِ حاضر کی یہ آسمانی آفات ٹالی جا سکیں تو ابھرتی ہوئی تخلیقی قوتیں انسانی نسل کو اس کی تاریخ کے ایک نئے شاندار عہد میں پہنچا دیں گی۔

ان متبادل صورتوں میں سے کون سی صورت واقعہ کی شکل اختیار کرتی ہے اس کا انحصار ہم میں سے ہر ہر انسان پر ہے۔

"سماجی اور ثقافتی متحرکات"

Social and cultural

Dynamics

الاسلام کراچی

تنقید و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے بھیجنے چاہیں)

فضل اللہ الصمد فی توضیح الادب المفرد تالیف العلامہ المحدث الجلیل فضل اللہ الجیلانی سابق استاذ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن۔ جلد اول صفحات ۴۳۶، ایضاً جلد دوم صفحات ۴۳۶

یہ قیمتی کتاب، مطبع السلفیہ قاہرہ (مصر) میں الحاج یوسف زنیل علی رضا کے زیر پرستی ۱۳۷۸ھ میں چھپی ہے اور انھوں نے اسے اللہ کے وقف کیا ہے" وقف اللہ تعالیٰ الحاج یوسف زنیل رحمہ اللہ" کی عبارت ایک علحدہ ٹکڑے پر چھپی ہوئی اس کتاب پر چسپاں ہے اور کوئی ہدیہ درج نہیں ہے۔

امام بخاری کی الادب المفرد کی یہ شرح تبصرہ نگار کی تعریف و تحسین سے مستغنی ہے، کتاب چھپنے سے پہلے فاضل مولف نے ہندوستان و بیرون ہند کے اساطین علم کے پاس تبصرے کے لیے بھیجا تھا چنانچہ ان کی رائیں شروع میں شائع کردی گئی ہیں، شیخ محمد بن عبداللہ الصومالی الازہری الیمانی۔ مولانا حلیم عطا شیخ الحدیث دارالعلوم ندوۃ العلماء۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی۔ علامہ عبدالعزیز میمنی۔ مولانا سید ابراہیم استاذ اللغۃ العربیۃ جامعہ عثمانیہ ——— الاستاذ المفتی عبداللطیف۔ مولانا السید محمد یوسف بنوری۔ مولانا السید سلیمان ندوی۔ مولانا السید مناظر احسن گیلانی۔ مولانا سعید احمد اکبر آبادی۔ کی رائیں ابتدا ہی میں نگاہوں کے سامنے آتی ہیں۔

ان میں بہت سے علماء وہ ہیں جو اس کتاب کی اشاعت سے پہلے ہی اپنے رب کے پاس پہنچ چکے ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے جو رائے دی تھی اس کا ترجمہ یہ ہے۔ "میرے نزدیک اس شرح کی اشاعت اہل علم کے لیے مفید ہوگی اور دنیا میں ہندوستان کے علمی درجے کو بلند کرے گی" مولانا سید مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے۔ "یہی بات یہ ہے کہ کسی متن کیلئے وہ محنت برداشت نہیں کی گئی ہے، جو اس متن (الادب المفرد) کیلئے مولف نے برداشت کی ہے اسکی محنت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جو فہرستیں انھوں نے تیار کی ہیں انکی تعداد انتیس تک پہنچتی ہے، متعدد علماء نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ الادب المفرد کی یہ شرح، بخاری کی شرح فتح الباری کی ہم رتبہ ہے۔ اور جو شخص بھی اس شرح کا مطالعہ کرے گا وہ خود محسوس کرے گا کہ ان رایوں میں کوئی مبالغہ نہیں ہے اور مولانا سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ کی یہ رائے بالکل صحیح ہے کہ اس نے عالم

اسلام میں ہندوستان کے علمی درجے کو بلند کر دیا ہے۔

انتہائی محنت اور جانکاہی کے ساتھ لکھی ہوئی اس شرح کے علاوہ مولف نے جو فہرستیں تیار کی ہیں وہ خاصے کی چیزیں ہیں لیکن افسوس کہ مطبع نے مولف کی تیار کی ہوئی بہت فہرستیں شائع کی ہیں، میرا مشورہ ہے کہ ہندوستان کے ہر عربی مدرسے کو اس قابل قدر کتاب کے نسخے حاصل کرنے کی سعی کرنی چاہیئے تاکہ کسی مدرسے کی لائبریری اس سے خالی نہ رہے۔ حاصل کرنے کی صورت کیا ہو؟ اس سلسلے میں فاضل مولف سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

مولف کو ذیل کے پتہ پر خط لکھا جا سکتا ہے۔

مولانا فضل اللہ الجیلانی۔ سن شائن اسٹورز۔ عابد روڈ۔ حیدرآباد۔ دکن۔

ہندوستانی مسلمان از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، صفحات ۱۴۴، کاغذ، کتابت و طباعت عمدہ مجلد، تین رنگ کا خوبصورت ٹائیٹل قیمت تین روپے پچاس نئے پیسے، ناشر مجلس تحقیقات و نشریات اسلام۔ لکھنؤ۔

مجلس تحقیقات نے اپنے اہتمام میں یہ تیسری کتاب شائع کی ہے، یہ کتاب مولانا علی میاں کی تقریروں کا مجموعہ ہے، ہم ذیل میں ان تقریروں کے عنوانات دے رہے ہیں۔

ہندوستان کی تہذیب و تمدن پر مسلمانوں کے اثرات۔ علمائے ہند کے علمی کارنامے۔ ہندوستان کی باکمال اسلامی شخصیتیں۔ عربی کے اثرات ہندوستانی زبانوں پر۔ ہندوستانی اسلامی تہذیب۔ ہندوستان کی قدیم علمی تحریک، اس کے مراکز اور اس کی خصوصیات۔ قدیم نظام تعلیم کی خصوصیات۔ مسلمانوں کے موجودہ علمی اور ثقافتی مرکز اور ان کی تعلیمی تحریکیں۔ ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ۔ ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مسائل و مشکلات

ان میں سے پانچ ان تقریروں کا ترجمہ ہیں جو مولانا نے عربی زبان میں آل انڈیا ریڈیو سے نشر کی تھیں اور پانچ تقریروں کا اضافہ کیا گیا جو ریڈیو پر نشر نہیں ہوئیں۔

حرف آغاز میں فاضل مصنف نے جس ضرورت کا اظہار کیا ہے اس کی اہمیت سے انکار نہیں، لیکن اس مجموعے سے وہ ضرورت پوری بھی ہوتی ہے یا نہیں، اس میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ تبصرہ نگار کا یہ خیال ہے کہ یہ مجموعہ برادران وطن کے مقابلے میں خود مسلمانوں کے لیے زیادہ کارآمد ہے، ان میں وہ تقریریں جو عربی زبان میں نشر کی گئی تھیں ظاہر ہے کہ ان کے مخاطب عربی داں مسلمان تھے۔ پانچ تقریریں جو بڑھائی گئی ہیں وہ بھی شاید برادران وطن کو سامنے رکھ کر مرتب نہیں کی گئی ہیں،

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے علم اور تقویٰ دونوں ہی کا میں قائل ہوں اور ان کی بڑی عزت وقعت میرے دل میں ہے لیکن افسوس کہ اس کتاب میں انھوں نے اپنی ذاتی رائے، ذوق اور انتخاب کو اتنا دخیل بنا دیا ہے کہ جگہ جگہ قلم وسعت نظر اور انصاف سے ہٹ ہٹ گیا ہے۔ اس کتاب میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا کہیں نام تک آنے نہیں پایا ہے۔ حالاں کہ خالص علمی لحاظ سے بھی انھوں نے اور جماعت اسلامی نے جو لٹریچر پیش کیا ہے وہ اس لائق تو ہرگز نہیں کہ اس کا ذکر تک نہ کیا جائے۔ درس گاہ جماعت اسلامی اور درسیات کا ذکر بھی شاید اس لیے آگیا ہے کہ جماعت اسلامی اتر پردیش کی دینی تعلیمی کونسل میں شریک ہے اگر وہ شریک نہ ہوتی تو اس مختصر ذکر کو بھی حذف ہی کر دیا جاتا۔ اس کے علاوہ صرف ایک بات کی طرف اور اشارہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ حضرت مولانا شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کی اولاد کی خدمت حدیث کا ذکر جس طرح کیا ہے اسے ناانصافی کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ لکھتے ہیں :-

"مگر افسوس ہے کہ اس کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔ یہ شرف زمانہ مابعد میں جناب شاہ ولی اللہ کے واسطے رکھا گیا تھا جو ان کو حاصل ہو گیا" (۹۹)

یہ ہندوستان میں خدمت حدیث کی تاریخ جاننے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ یہاں اتنی بات جان لینا چاہیے کہ زیر تبصرہ کتاب میں بلگرام کے جن مشہور محدث اور استاد میر سید مبارک کا بڑے احترام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے وہ حدیث میں شیخ عبدالحق کے صاحبزادے نورالحق کے شاگرد ہیں اور انھوں نے شیخ کے گھر میں قیام کر کے علم حدیث حاصل کیا تھا۔ بہرحال کتاب ناواقف مسلمانوں کے لیے معلومات افزا ہے۔ (ع - ق)

سچا دین
حصہ اول و دوم

مرتبہ :- جناب افضل حسین صاحب۔ ایم۔ اے۔ ال۔ ٹی

ناشر :- مکتبہ جماعت اسلامی دہلی۔

ضخامت علی الترتیب ۹۶، ۱۱۲، سائز $\frac{20 \times 30}{16}$ قیمت ۶۵، ۷۵ نئے پیسے

ہندوستان کے مسلمان جس صبر آزما دور سے گزر رہے ہیں ہو نہیں سکتا کہ اس کو ہر ایک محسوس نہ کرتا ہو، خصوصاً بچوں کی دینی تعلیم سخت تشویش کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس میں مسلمانوں کی غفلت، بے توجہی اور طریق تعلیم اور نظام کی خرابیوں کو بڑا دخل ہے۔ ایسے حالات میں، جب کہ دینی تعلیم کے تقاضے شدید سے شدید تر ہوتے جا رہے ہیں ہندوستان کے مسلمانوں، خصوصاً دینی اور اسلامی جذبات رکھنے والے مسلمانوں کا اولین فرض ہے کہ اپنی قوت و صلاحیت کا قابل لحاظ حصہ دینی تعلیم کے قیام و انتظام میں صرف کریں۔

جماعت اسلامی ہند اقامت دین کے احیاء و تجدید کے لیے جس مہم میں برسوں سے سرگرم ہے اس میں اس کی تعلیمی اسکیم بھی ایک گراں قدر دینی خدمت ہے۔ اس نے دینی تعلیم کا صرف تصور ہی نہیں پیش کیا، بلکہ اس نے تعلیم کا پورا خاکہ بنایا اور عملاً اس نے درسی کتابیں بھی تیار کیں اور ابتدائی تعلیم کی حد تک دینی اور معاشرتی علوم کا نصاب تیار کیا۔ اس نصاب کی جو کتابیں اب تک منظر عام پر آسکی ہیں وہ ملک کے اندر اور بیرون ملک بھی ہر جگہ مقبول ہوتی جا رہی ہیں۔

اسی نصاب کے سلسلے کی تازہ اور جدید پیش کش "سچا دین" ہے، جس کے فاضل مرتب جناب افضل حسین صاحب، ناظم درسگاہ جماعت اسلامی رام پور، ہیں۔ موصوف کے قلم سے بہت سی کتابیں نکل چکی ہیں۔ جو بچوں کی نفسیات، ان کی ذہنی صلاحیت اور جدید طریق تعلیم کے اصول کے تحت مرتب کی گئی ہیں اور جو اپنے طرز کی بے مثال نہیں تو کم از کم سب سے نمایاں تو بہر حال کہی جا سکتی ہیں۔

"سچا دین" ... بنیادی عقائد و عبادات وغیرہ کے مسائل، دعائیں، انبیاء، خلفاء، علماء امت اور بزرگان دین کی سیرت، جس آسان فہم زبان میں مرتب کیا گیا ہے اس کی خوبیوں کا اندازہ خود کتاب کے مقدمے کی مندرجہ ذیل عبارتوں سے کیا جا سکتا ہے۔

- زبان نہایت سادہ و سلیس اور طرز بیان عام فہم و دل نشین ہے۔
- بچوں کی نفسیات اور ان کی دلچسپیوں کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔
- ہر کتاب میں دین کا جامع اور ہمہ گیر تصور پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر پہلو سے متعلق ایک تدریج سے ضروری معلومات فراہم کی گئی ہیں۔
- جامعیت کے باوجود اختصار سے کام لیا گیا ہے اور صرف ہلکی پھلکی معلومات بہم پہنچانے پر اکتفا کیا گیا ہے مختلف فقہی مسالک کے علماء کے مشورے اور نظر ثانی کے بعد اسے شائع کیا جا رہا ہے تاکہ ہر مسلک کے طلبہ یکساں طور پر استفادہ کر سکیں۔
- جزوی اختلاف کو حتی الامکان نظر انداز کر کے بنیادی اور متفق علیہ باتیں پیش کی گئی ہیں تاکہ طلبہ کے ذہن میں انتشار نہ پیدا ہو۔
- مشرکانہ عقائد اور غیر اسلامی تصورات جو مروجہ درسی کتب اور اسکولوں کی فضا کا لازمی جز بنتے جا رہے ہیں، ان کے ضمن میں حقائق پیش کرنے کی گئی ہے تاکہ بچوں کا ذہن ان کے مضر اثرات سے محفوظ رہ سکے۔

بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لیے اب تک جو کتابیں مرتب کی گئی ہیں وہ اس لحاظ سے تو یقیناً قابل قدر ہیں کہ دینی تعلیم کی ترویج کے لیے لکھی گئی۔ لیکن فقہی اصطلاحات اور مشکل زبان کی وجہ سے وہ بچوں کے ذہن اور ان کی زبان دانی کے معیار سے اتنی اونچی ہیں کہ ان کی افادیت مجروح ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور آج جب کہ اردو زبان اور دینی تعلیم کے ذوق اور اس کی اہمیت کو، زبان اور دین کے بارے میں حکومت کے رویے نے بری طرح مجروح کر دیا ہے اس کے پیش نظر اس بات کی ضرورت ہے کہ دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کی ضرورت اور اہمیت بھی لوگوں پر واضح کی جائے اور اس کے لیے کتابیں بھی عام فہم زبان میں، دلچسپ اور جاذب نظر تیار کی جائیں۔ زیر نظر کتاب میں یہ تمام خوبیاں جمع کی گئی ہیں۔ اس کی زبان نہایت آسان اور سلیس ہے۔ بچوں کی نفسیات، ان کے ذہنی معیار اور دلچسپی کا پورا لحاظ کیا گیا ہے۔ اس کو پڑھتے ہوئے بچے بار محسوس نہ کریں گے اور جب آسانی سے مسائل کو سمجھ اور یاد کریں گے تجربہ اس کی شہادت دے گا۔ فقہی مسالک کے تردد اختلافات سے بچتے ہوئے مسائل کو اس خوبی سے سمجھایا گیا ہے کہ ہر مسلک کے بچے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ابتدائی درسی کتابوں میں یہی بہتر نظر آتا ہے۔ ہم نے اسی نقطہ نظر سے اس کا جائزہ لیا ہے اس میں کسی خاص مسلک کو تلاش کرنے میں ناکامی ہوگی۔ اس لیے اسے فقہی کتاب کی حیثیت سے نہیں، بلکہ درسی کتاب کی حیثیت سے دیکھا جائے تو نہایت مفید کتاب ثابت ہوگی۔

کتاب میں جو کمی یا خامی محسوس ہوئی مناسب ہے کہ اسے بھی عرض کر دیا جائے۔ اس ضمن میں ہمارا تاثر یہ ہے کہ کتاب کی طباعت میں جو اہتمام ہونا چاہیے تھا وہ نہیں کیا گیا۔ سب سے بڑی کمی یہ نظر آئی کہ عربی الفاظ اور حرکات کی غلطیاں اچھی خاصی ہیں۔ اور یہ بڑی خطرناک بات ہے کیونکہ کتاب میں زیادہ تر دعائیں ہیں جن کی صحت کا پورا اہتمام ہونا چاہیے تھا۔ مثلاً، صفحہ ۱۲ پر خطایای، دو جگہ ہے اور دونوں جگہ یا لکھنے سے رہ گیا۔ اسی طرح صفحہ ۹۵ پر وَحْدَکَ ثُمَّ چھپ گیا ہے اور ہونا چاہیے وَحْدَہٗ۔ اس طرح کی ڈیڑھ دو درجن غلطیاں رہ گئی ہیں۔ کاغذ بھی اتنا اچھا استعمال نہیں کیا گیا ہے جتنا اچھا کتبہ استعمال کر رہا ہے۔ طباعت بھی دیدہ زیب ہونی چاہیے۔ یہ باتیں بچوں کے ہاتھوں میں جانے والی کتابوں میں بہت زیادہ قابل لحاظ ہیں۔ امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان باتوں کا ضرور لحاظ رکھا جائے گا۔

محمد ایوب اصلاحی

گرو گرنتھ صاحب اور اسلام

از ابوالامان امرتسری۔ صفحات ۶۲۷۔
ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔

اس ضخیم کتاب پر ایک طائرانہ نظر بھی یہ بات جاننے کے لیے کافی ہے کہ اس کی تالیف و ترتیب میں بہت دیدہ ریزی سے کام لیا گیا ہے اور بڑی محنت صرف کی گئی ہے اور یہ محنت قابل قدر ہے، اس کے فاضل مولف شکریے کے مستحق ہیں۔ سکھوں کی مذہبی کتاب گرو گرنتھ صاحب پر اتنی مستند اور مفصل کوئی کتاب اردو میں موجود نہیں ہے مذاہب عالم سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ بڑے کام کی کتاب ہے اور سکھ مذہب سے متعلق اس میں بہت کچھ موجود ہے مولف عرض حال میں لکھتے ہیں :-

> یہ کتاب دو حصوں پر مشتمل ہے پہلے حصے میں گرو گرنتھ صاحب کی تاریخ اور دوسری متعلقہ باتیں درج کی گئی ہیں اور دوسرے حصے میں گرو گرنتھ صاحب کے اصل شبد پیش کر کے اس کی تعلیم کو واضح کیا گیا ہے جہاں تک گرو گرنتھ صاحب کی اپنی تعلیمات کا تعلق ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کا ہی ایک گورمکھی چربہ ہیں، گرو نانک جی نے اپنی بانی میں قرآن مجید کی مختلف آیات اور احادیث نبویہ میں بیان کردہ مضامین کو ہی پیش کیا ہے چنانچہ جو دوست اس کتاب کے دوسرے حصے کا گہری نظر سے مطالعہ کریں گے وہ ہمارے اس نظریہ سے متفق ہوں گے۔

اس کتاب کا پہلا حصہ صفحہ ۳ سے ۳۳۲ تک پھیلا ہوا ہے اور ۳۳۳ سے ۶۲۰ تک دوسرا حصہ پھیلا ہوا ہے۔
اس کتاب کا دوسرا حصہ پڑھ کر صاف پتہ معلوم و محسوس ہوتا ہے کہ گرو نانک جی کی تعلیمات پر دین اسلام کی گہری چھاپ ہے لیکن حقیقت کو جاننے کے بعد قاری کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ جو مذہب، مذہب اسلام سے اس قدر قریب تھا، اس کے ماننے والے آگے چل کر مسلمانوں کے دشمن کیوں ہو گئے، اس مذہب کی ابتدا کے عوامل کیا تھے اور پھر وہ کیا وجوہ تھے کہ فوراً ہی اس کی اصل تعلیمات میں تحریف شروع ہو گئی اور زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ اس کا رنگ ہی بالکل بدل گیا، پھر اس کتاب میں یہ بھی ایک خلا محسوس ہوتا ہے کہ گرو صاحبان کے سوانح حیات کا کوئی جزو اس میں شامل نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک ہی کتاب میں یہ سب کچھ نہیں سما سکتا تھا اس کے مولف کو ادھر بھی توجہ کرنی چاہیے، وہ سکھ مذہب سے اچھی واقفیت رکھتے ہیں اگر وہ ان سوالات پر قلم اٹھائیں تو بڑی کارآمد اور مستند کتاب تیار ہو سکتی ہے جس طرح انھوں نے گرو گرنتھ صاحب کی مستند تاریخ تیار کر دی ہے اسی طرح وہ اس مذہب کی بھی مستند تاریخ تیار کر سکتے ہیں۔

دوسرے حصے میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جنہیں یہاں نقل کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن طوالت کے خوف سے صرف دو باتیں نقل کی جا رہی ہیں، ایک بڑا سوال انسان کے سامنے یہ آتا رہتا ہے کہ بے وقوف کسے سمجھا جائے

اور عقل مند کسے سمجھا جاتا ہے، بے وقوفی اور عقل مندی کے جانچنے کا معیار کیا ہے، گرو گرنتھ صاحب میں اس اہم سوال کا بہت ہی معقول جواب ملتا ہے۔ شبد کے اصل الفاظ کو چھوڑ کر چند ترجمے درج کیے جاتے ہیں :-

صحیح معنی میں عقل مند اور دانا وہ لوگ ہیں جنہوں نے غرور اور تکبر کو ترک کر دیا ہے۔ سچائی اور شرم کے بغیر خدا تعالیٰ کے دربار میں کوئی قدر نہ ہوگی۔ یہ عقل مندی نہیں کہ انسان فضول جھگڑوں میں اپنی عقل خرچ کر دے بلکہ صحیح عقل مندی یہ ہے کہ انسان پڑھنے کے لیے اس پر غور کرے اور سوچ سمجھ کر اپنا مال خدا تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرے۔

ایک اور مقام پر ہے

وہی انسان عقل مند اور معزز ہے جسے اللہ تعالیٰ کا ہر حکم میٹھا محسوس ہوتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے۔ جو لوگ خدا تعالیٰ کے مقبول ہیں حقیقی معنوں میں وہی عقل مند اور دانا ہیں۔

دوسری بات جس میں ہمارے برادران وطن کی بہت بڑی تعداد کا ذہن الجھا ہوا ہے وہ اوتار کا فلسفہ ہے! نظریے نے ان پر قبول حق کا ایک بڑا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ گرو گرنتھ صاحب میں اس فلسفے کی تردید بھی ملتی ہے،

اے مولیٰ تو پاک ہے، پرمیشر ورائے الوریٰ ہے۔ تو کبھی بھی کسی جون کو اختیار نہیں کرتا اور تو نے اپنے امر سے ہی اس تمام عالم کائنات کو پیدا کیا ہے اور اپنے حکم سے ہی ایک دن اس کا خاتمہ کر دے گا۔ تیرا روپ انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ تیری عبادت کیوں نہ کی جائے ہر چیز میں تیرا جلوہ موجود ہے اور تیری قدرت صاف دکھائی دے رہی ہے ص ۳۸۳

ایک مقام پر ہے :-

وہ زبان جل جائے جو یہ کہتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے بھی جنم دھارن کیا تھا۔ خدا تعالیٰ پیدائش سے اور موت سے پاک ہے اور ہر جگہ موجود ہے۔ اس کو کسی انسان، حیوان، چرند، پرند کی شکل میں پیدا ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ص ۱۱۳۶

سکھوں کی مذہبی اور مقدس کتاب کے یہ خیالات، مسلمانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ سکھ بھائیوں تک اسلام کی دعوت پہنچائیں، اس کتاب کے بہت سے مندرجات تبلیغ دعوت کی تمہید بن سکتے ہیں، (ع۔ ق)

اسلامی نظم و نسق

مترجم ابو یوسف حکیم سید عبد الباقی قطاری
صفحات ۲۸۰۔ قیمت مجلد تین روپیے ۵۰ نئے پیسے
ناشر: ۔ اسلامک پبلشنگ ایجنسی ۲-۲-۱۷، اڈکمیٹ، حیدرآباد (۷)، دکن۔

یہ کتاب علامہ بدر الدین محمد ابن جماعۃ متوفی ۷۳۳ھ قاضی القضاۃ مصر و شام کے رسالہ "تحریر الاحکام فی تدبیر اہل الاسلام" کا اردو ترجمہ ہے۔ اصل کتاب کے ترجمے سے پہلے ڈاکٹر ابو النصر محمد خالدی ایم اے عثمانیہ، ڈی لٹ قاہرہ کا ایک مفصل مقدمہ ہے جو ۵۰ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ بڑی محنت اور قابلیت کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس مقدمہ میں بڑی تلاش و تحقیق سے مصنف کے حالات جمع کئے گئے ہیں، اس عہد کی مصر و شام کی تاریخ بھی سامنے لائی گئی ہے اور مصنف کی زیر تبصرہ کتاب پر بھی تفصیل سے اپنی رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔ مختصر یہ مقدمہ ایک قیمتی چیز بن گیا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ہے کہ تبصرہ نگار کو مقدمہ نگار کی تمام رایوں سے اتفاق نہیں ہے۔ مثال کے طور پر انھوں نے ابن تیمیہ کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں ان میں کئی باتوں سے اتفاق نہیں ہے، اسی طرح فاضل مقدمہ نگار نے کتاب کے آخری دو باب سے متعلق جس رائے کا اظہار کیا ہے وہ تبصرہ نگار کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ان کے خیال میں مصنف نے کتاب کے اس حصے کو ذاتی رایوں کا مجموعہ بنا دیا ہے اور وہ انتقامی جذبات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں، لیکن افسوس کہ انھوں نے ان دو الزامات میں سے کسی ایک کے لیے بھی کوئی دلیل نہیں دی ہے۔ مصنف نے ان دونوں ابواب میں بھی ٹھیک روش اختیار کی ہے جو دوسرے ابواب میں یعنی اپنی باتوں کے ثبوت میں آئمہ اربعہ کے مسالک بھی بیان کئے ہیں اور نصوص اسلامیہ سے دلائل بھی بہم پہنچائے ہیں، کہیں کہیں بغیر ثبوت جس طرح ان دو ابواب میں کچھ باتیں درج کی ہیں اسی طرح دوسرے ابواب میں بھی، پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کس بنیاد پر یہ بات لکھی گئی کہ ان ابواب کو انھوں نے ذاتی رایوں کا مجموعہ بنا دیا ہے۔ باقی رہا انتقامی جذبے سے متاثر ہونے کی بات تو یہ ایک ایسا عجیب الزام ہے جو خالدی صاحب جیسے اہل علم و تحقیق کے شایان نہیں ہے۔ فیصلہ یا شرعی مسائل کے بیان میں اگر کوئی قاضی انتقامی جذبے سے متاثر ہو جائے تو اس کی قیمت دو کوڑی بھی نہیں رہتی۔ اصل یہ ہے کہ ذمیوں کے بارے میں جو احکام ابن جماعہ نے لکھے ہیں وہ مقدمہ نگار کو پسند نہیں آئے لیکن محض ناپسندیدگی کی وجہ سے ان پر انتقامی جذبے کا الزام کیا مناسب ہے؟ اور کیا اس سے پوری کتاب کی قدر و قیمت متاثر نہیں ہوتی؟ اسلامی ریاست میں ذمیوں کا مسئلہ، اہل مغرب کے غلبہ کے بعد سے پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ انھوں نے دوسروں کو فریب دینے کے لیے انسانی عز و شرف اور مساوات کا ایک نظریہ گھڑا اور پھر اپنے اسی خود ساختہ

کی روشنی میں اسلامی شریعت کے اس مسئلے پر اعتراضات شروع کئے۔ مسلمانوں میں جو لوگ یورپ والوں سے مرعوب تھے وہ طرح طرح کی معذرتیں پیش کرنے لگے اور انھوں نے اس ضمن کے احکام کی دور از کار تاویلیں شروع کر دیں۔ ہمیں ان لوگوں سے بحث نہیں، لیکن وہ علماء جو شعور کے ساتھ اسلامی احکام کی حقانیت کے قائل ہیں۔ اور زمانے کے اذ مغرب سے ذرہ برابر بھی مرعوب نہیں ہیں، انھوں نے بھی اس مسئلے پر جو کچھ لکھا ہے اس کے کچھ اجزاء تبصرہ نگار کو برابر کھٹکتے رہے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلامی حکومت میں ذمیوں کے احترام و عزت اور ان کے وقار کا ہے، کتاب و سنت کے نصوص کو دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ جہاں تک ان کے جان و مال کی حفاظت اور ان کے پرسنل لا کا تعلق ہے اسلامی ریاست نے انھیں وہ کچھ دیا ہے جو دنیا کی کوئی حکومت اپنے مفتوحین کو نہیں دے سکتی لیکن جہاں عزت و احترام اور وقار کا سوال سامنے آتا ہے وہاں کتاب و سنت کے نصوص ہمیں وہ نہیں بتاتے جو وقت کے علماء سمجھانا چاہتے ہیں۔ شاید علمائے وقت کی تحریروں سے متاثر ہو کر یا زمانے کے رُخ کو دیکھتے ہوئے فاضل مقدمہ نگار نے کتاب کے آخری دو باب پر اپنی رائے لکھی ہے۔ تبصرہ نگار ان کے تمام اجزاء سے متفق نہیں ہے لیکن اس کی روح سے پوری طرح متفق ہے اصل میں ذمیوں کی تحقیر سے متعلق فقہ اسلامی میں جو احکام ملتے ہیں ان کے بڑے حصے کی اصل قرآن کی آیت "حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون" ہے۔ جب تک اس آیت کی کوئی معقول اور مستند تاویل نہ کی جائے ان فقہی احکام کی نفی کرنا صحیح نہ ہے ــــــ حیدرآباد کی زبان کچھ اپنے مخصوص محاورات رکھتی ہے جو ادھر شمالی ہند میں نہیں چلتے اس لئے تبصرہ نگار کو کئی جگہ جملے کچھ عجیب سے معلوم ہوئے مثال کے طور پر مقدمے میں ہے کہ "پانچ سال سے تجاوز نہیں ہوئے تھے کہ" ممکن ہے یہاں کاتب نے تجاوز کو تجاوز کر دیا ہو۔ صلا پر ہے۔ "مسلک کو درگذر کیا گیا" یہاں پر "کو" کا استعمال عجیب محسوس ہوا۔ ص ۱۶ پر "اولی الامر سے مراد اکثر لوگوں کے پاس امام اور اس کے نائبین ہیں" یہاں "پاس" کا استعمال کھٹکتا ہے۔ اکثر لوگوں کے نزدیک ہونا چاہیے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب اہل علم کے مطالعہ کے لائق ہے اور استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ چونکہ تبصرہ نگار کے پاس اصل عربی کتاب موجود نہیں اس لیے ترجمے کی صحت کے بارے میں فاضل مترجم پر اعتماد کے سوا چارہ نہیں۔

تجرید صحیح بخاری اردو

مترجمہ جناب مولانا ابو الفتح صاحب عزیزی، صفحات: ۵۰۵، کتابت، طباعت، کاغذ اوسط، قیمت آٹھ روپے، ناشران: محمد سعید اینڈ سنز تاجران کتب و ناشران، [illegible]

قرآن محل، مقابل مولوی مسافرخانہ، کراچی۔

حسب معمول محمد سعید صاحب کے قلم سے ایک پیش لفظ ہے جس میں قرآن و حدیث کی مدح و ثنا میں کچھ الفاظ ارشاد فرمائے گئے ہیں اور تجرید البخاری کا ترجمہ پیش کرنے کی سعادت کا اظہار کیا گیا ہے اور کہا گیا کہ مقصود اشاعت اردو داں طبقہ کو اس کتاب کے مضامین سے آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ فلاح دارین حاصل کر سکیں۔ پیش لفظ کو پڑھ کر یہ خوش فہمی ہوتی ہے کہ ادارہ مطبع سعیدی نے کم سے کم ترجمے کی صحت کا ضرور اہتمام کیا ہوگا اور کافی جانچ پڑتال کے بعد یہ ترجمہ عوام کے ہاتھوں میں پہنچایا گیا ہوگا لیکن ترجمے پڑھ کر یہ خوش فہمی ختم ہو جاتی ہے۔ احادیث کے متون بھی شریک اشاعت نہیں ہیں، صرف ترجمے چھاپے گئے ہیں ایسی صورت میں تو اور بھی ضروری تھا کہ پوری احتیاط برتی جائے لیکن یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ بڑے بڑے کتب خانے پوری بے احتیاطی کے ساتھ ترجمے چھاپ چھاپ کر عوام میں پھیلا رہے ہیں کاش محض تجارت کے سوا انہیں حدیث کی خدمت کا واقعی احساس ہوتا۔ اب تو حالت یہ ہو گئی ہے کہ مطبعی غلطیوں کے لیے بھی کوئی غلط نامہ نہیں چھاپا جاتا اور پڑھنے والوں کو یہ احساس دلایا جاتا ہے کہ کتاب بالکل صحیح چھپی ہے حالانکہ بے شمار مطبعی غلطیاں موجود ہوتی ہیں اور بعض تو اتنی بھونڈی ہوتی ہیں کہ عبارت کا مفہوم ہی غارت ہو جاتا ہے۔ احادیث رسول کے ساتھ یہ غفلت دیکھ کر بڑی تکلیف پہنچتی ہے۔ تبصرہ نگار یہاں چند صفحات کی غلطیوں کی نشاندہی کرتا ہے انہیں سے اندازہ ہوگا کہ ۵۰۲ صفحات کی کتاب میں ان کی تعداد کیا ہوگی۔ بعض بہت ہی مشہور اور زبان زد خاص و عام جملوں کے ترجمے بھی غلط کئے ہیں، ابتدائے وحی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اضطراب اور حضرت خدیجہ کی تسلی کے جملے کس قدر مشہور ہیں اور شاید اردو زبان کی کوئی مستند سیرت النبی ایسی نہیں ہے جس میں ان جملوں کے صحیح ترجمے موجود نہ ہوں۔ اس کتاب میں ص ۹ پر ترجمہ کیا گیا ہے ”بھوکوں کا بوجھ اٹھاتے ہیں“۔ یہ حدیث کے تَحْمِلُ الْكَلَّ کا ترجمہ ہے، مترجم نے شاید کَلّ کو کُلّ پڑھا ہے تَكْسِبُ الْمَعْدُومَ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”محتاجوں کے لیے کماتے ہیں“ اور شاہکار یہ ہے کہ تُعِينُ عَلَى نَوَائِبِ الْحَقِّ کا ترجمہ کیا گیا ہے ”[illegible] کی راہ میں مصیبتیں اٹھاتے ہیں“، عوام تو خیر عوام ہیں، عربی جاننے والے بھی اس ترجمے کی جہالت کو نہیں سمجھ سکتے اس لیے کہ متن ان کے سامنے نہیں ہے۔ ص ۱۰ میں حدیث ۲ میں المسلمون کے لفظ کا ترجمہ چھوٹ گیا ہے جس سے عبارت کا مفہوم غیر واضح ہو گیا ہے۔ ص ۱۱ حدیث ۱۱ ”اگر چاہے تو معاف کرے اور اگر چاہے تو در گزر کر دے“ یہ اگر چاہے تو در گزر کر دے وَإِنْ شَاءَ عَاقَبَهُ کا ترجمہ ہے اور [illegible] تا لبستہ اسی صفحے میں آگے شل کا لفظ نقل چھپا ہے اب یہ اردو داں عوام کا کام ہے کہ وہ شل کو [illegible]

مثل پڑھیں ہے۔ ص۸۵ حضورؐ کے ایک خواب کا ذکر ہے، صحابہ نے پوچھا "یا حضرت آپ نے اس کی کیا تعبیر فرمائی؟" فرمایا دین۔
اس جملے کی تشریح کے لیے مترجم نے قوسین میں لکھا ہے (یعنی اجتہاد دین ہے) اسے توضیح کہیں یا ابہام؟ اسی صفحہ
میں ترجمہ ہے "وہ انصاری اپنے بھائی کو حیا کی نصیحت کر رہے تھے" حالانکہ انصاری حیا کی نصیحت نہیں کر رہے
تھے، حیا سے روک رہے تھے لیکن مترجم نے حدیث کا ترجمہ نہیں سمجھا۔ اسی صفحے میں حضرت سعد کی حدیث
پر عنوان لگایا ہے "کشف اسلام" معلوم نہیں اس کا مفہوم کیا ہے؟ ص۹۳ حدیث ۲۱ "تو ایسا شخص
کہ تجھ میں سوز جاہلیت کا اثر باقی ہے" کوئی بتائے اس جملے کا کیا مطلب ہے؟ کیا اردو داں عوام سوز جاہلیت کی
اصلاح کر لیں؟ یہاں غالباً مترجم نے "ہنوز" کا لفظ لکھا ہوگا لیکن کاتب شاید مترجم سے زیادہ قابل تھا اس
اس نے اسے سوز بنا دیا۔ اسی صفحے میں ہے "صحابہ نے عرض کیا ہم میں سے تو کسی نے ظلم نہیں کیا" یہ جملہ اَیُّنَا لَمْ
کا ترجمہ ہے، آخر جہالت کی کوئی حد بھی ہے؟ اسی صفحے میں ہے (مگر) آپ کو یہ بات پسند تھی کہ آپ کا قبلہ بیت المقدس
ہو" یہ متن حدیث کا کس قدر غلط ترجمہ ہے یا کتنی بڑی مطبعی غلطی ہے لیکن ناشرین کو اس کی پروا کیوں ہو جب
"جب تک تم خود اپنے کو تکلیف میں، خدا تم کو تکلیف میں نہیں ڈالتا" اس کو تو چھوڑیئے کہ عبارت سے کیا الفاظ
غائب ہیں، یہ ترجمہ بھی متن کا صحیح ترجمہ نہیں ہے۔ ص۱۰۰ ایمان کا بیان ہو رہا ہے مترجم فرماتے ہیں (اور قیامت
میں) اس کی تلاوت پر اور اس کے رسولوں پر دل سے یقین رکھو" "اور قیامت میں اس کی تلاوت پر" کا
مفہوم کس سے پوچھا جائے؟ صرف ایک غلطی کا اور حوالہ دوں گا تاکہ مترجم کی اعلیٰ صلاحیت کا پورا اندازہ ہو
ص۱۰۹ حدیث ۴۷ "ہم نے بتایا یہ شخص جو سفید تکیہ لگائے ہوئے ہیں" یہ ترجمہ هٰذَا الرَّجُلُ الْأَبْيَضُ الْمُتَّكِئُ
کا ہے۔ مترجم کی کیسی سفید اور اعلیٰ صلاحیت ہے؟

ان چند صفحات میں مسلسل ہر صفحے میں بلکہ بعض صفحوں میں کئی غلطیاں ہیں، اب ۵۰۲ صفحات کی غلطیوں کا
شمار کون کرے مالکان مطبع سعیدی، چاہے مجھ سے کتنے ہی ناخوش ہوں، میں اس ترجمے کی اشاعت پر افسوس
اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا، اللہ ہم سب کو ہدایت بخشے ——— ۱۳۶۲ھ میں تجرید البخاری کا ایک
مع المتن ترجمہ اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور سے شائع ہوا تھا ترجمہ مولانا محمد حیات سنبھلی نے کیا تھا سرسری نظر سے معلوم
ہوتا ہے کہ اس میں غلطیاں بہت کم ہیں، اگر مالکان مطبع سعیدی اسی پر نظر ثانی کرا کے شائع کرتے تو بہتر

(اشارات کا بقیہ) کرنے میں وقت لگانا چاہیے۔ اس تاریخی جائزے کے علاوہ انھیں خود بھارت کی چودہ سالہ تاریخ بھی سبق دے رہی ہے۔ اس ملک کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس ناقابلِ حصول شے کو حاصل کرنے کی جدوجہد ترک کر دی جائے۔

بھارت میں مسلمانوں کی جو جماعت، احیائے اسلام یا اقامتِ دین کی سعی کر رہی ہے۔ یہ جائزہ اس کے حوصلے بڑھانے والا ہے۔ اگرچہ اقامتِ دین کی جدوجہد ایک فریضہ ہے اور حالات کی قطعی ناساعدت کے وقت بھی یہ ساقط نہیں ہوتا بلکہ اس کی اہمیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ کا یہ کرم ایک سنت کی طرح کا رفرما ہے کہ وہ ناساعد حالات اور مشکلات و مصائب میں اپنے سپاہیوں سے اپنی مدد کا وعدہ کر کے اور گزشتہ قوموں کے واقعات سنا کر ان کو ڈھارس دیتا اور ان کے حوصلے بڑھاتا رہا ہے، کیونکہ کمزور انسان حالات کی ساعدت اور ناساعدت دونوں سے متاثر ہوتا ہے اور اس طبعی تاثر سے اپنے کو بچا نہیں سکتا۔ مسلمان ملکوں کے حالات کا جائزہ اشارہ کر رہا ہے کہ شاید اب اللہ کی مدد دور نہیں ہے اور یہ خبر بھارت کے داعیانِ حق کے لیے یقیناً حوصلہ افزا ہے۔

اس جماعت کے علاوہ یہاں کی امتِ مسلمہ کے رہنما دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ تو وہ ہے جسے اسلامی انفرادیت، اسلامی تہذیب، احیائے اسلام اور اقامتِ دین جیسی چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے اس کے سوچنے کا انداز ٹھیک وہی ہے جس کی نمائندگی ایک ترکی کمالی لیڈر نے ان الفاظ میں کی ہے۔

> "ہم ایک ترکی اسلام وضع کرنا چاہتے ہیں جو اسی طرح ہمارا خاص اسلام ہوگا جس طرح انگلش چرچ انگلینڈ کے لیے خاص ہے۔ انگلش چرچ نہ اٹالین ہے نہ جرمن۔ اس کے باوجود کوئی شخص بھی ملامت نہیں کرتا کہ انگریز عیسائی نہ رہے، پھر ہم ترک ہی کیوں اپنے خاص اسلام سے محروم رہیں۔"

اس نقطۂ نظر کا خود ترکی میں جو نتیجہ نکل رہا ہے اس سے یہاں کے اس گروہ کو سبق لینا چاہیے —— دوسرا گروہ جس میں علمائے دین کی بھی ایک بھاری تعداد شامل ہے وہ ہے جو اسلامی انفرادیت اور اسلامی تہذیب کو زندہ دیکھنا چاہتا ہے لیکن غلط قسم کی مصلحت اندیشیوں نے اسے اکثریت کی ایک ایسی جماعت سے جوڑ رکھا ہے جو بالکل مخالف سمت میں دوڑ لگا رہی ہے اور اس طرح یہ گروہ غیر شعوری طور پر اقامتِ دین کی راہ میں ایک دیوار کی طرح حائل ہو گیا ہے۔ اس گروہ کے لیے بھی اس تاریخی جائزے میں اور خود بھارتی مسلمانوں کی تاریخ میں سبق موجود ہے۔

فکرِ اسلامی کا ترجمان اور داعی۔ برِصغیر ہند و پاک کا واحد عربی ماہنامہ

البعث الاسلامی

زیرِ ادارت

سید محمد حسنی، سعید الاعظمی ندوی، دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

نئے دور کا آغاز

"البعث الاسلامی" ربیع الاول کے شمارہ سے جو جلد ششم کا پہلا شمارہ ہوگا نئے دور میں داخل ہو رہا ہے۔ • نئی ترتیب • نیا معیار • نئے مضامین

• عالمِ عربی کے ممتاز ترین اہلِ قلم اور اہلِ فکر حضرات سے رابطہ قائم کیا گیا ہے۔

• ترتیب و طباعت کے معیار کو بلند کرنے کے لیے نئے انتظامات کیے گئے ہیں۔ ہماری خواہش اور کوشش ہے کہ تحقیقی، دعوتی، ادبی ہر لحاظ سے رسالہ اعلیٰ معیار کا حامل ہو اور اپنی دعوت اور نصب العین کو پورا کر سکے۔

سالانہ چندہ: ۵ر

پاکستان میں چندہ جمع کرنے کا پتہ ماہنامہ "فاران" کیمبل سٹریٹ کراچی

تعمیر و ترقی کی خدا پرستانہ قدروں کا علمبردار

ہفت روزہ "طلوع" بمبئی ۸

• تانگ طلی مسائل کا حل • بین الاقوامی گتھیوں کا علاج • اخلاقی اصولوں پر نئے ادب کی تخلیق • ظلم اور ناانصافی کے خلاف

صنعتی، سائنسی، اقتصادی اور سماجی موضوعات پر ——— رہنما مضامین کا حسین مجموعہ

ہفت روزہ طلوع زندگی پر صحیح روشنی ڈالتا ہوا ابھر رہا ہے۔

ہفت روزہ طلوع اردو صحافت میں نیا معیار پیش کر رہا ہے۔

ادارہ

اصغر علی عابدی
احمد نسیم مینا نگری

فی پرچہ چار آنہ ——— سالانہ ۱۲ روپیہ

دفتر ہفت روزہ طلوع ۱۲۵ — اے ریچی روڈ بمبئی ۸

قواعد و نصاب اسلامی امتحانات

سنہ ۱۹۶۲ء مطابق سنہ ۱۳۸۲ھ

شعبۂ امتحانات اسلامی لائبریری۔ اچھاور۔ بھوپال (مدھیہ پردیش)

تعارف ملک میں اس وقت جس طرز تعلیم کا نظام قائم کیا گیا ہے، اس میں مسلمان طالب علموں کا اپنے عقاید سے واقف ہونا اور اپنے دین سے وابستہ رہنا جس قدر مشکل ہو گیا ہے اس سے ہر واقف کار فکر مند ہے اور عام طور پر یہ ضرورت محسوس کی جا رہی ہے کہ آئندہ نسل کو اسلام سے وابستہ رکھنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس احساس کے تحت اسلامی لائبریری اچھاور ضلع سیہور نے طالب علموں کو دین سے ابتدائی واقفیت بہم پہنچانے اور دین سے انکی دلچسپی پیدا کرنے کیلئے امتحانات کا ایک طریقہ اختیار کیا۔ یہ طریقہ اس سال پہلی مرتبہ آزمایا گیا اور خدا کے فضل سے نتائج امید افزا رہے۔ یہ پہلا تجربہ بہت ہی محدود دائرہ میں کیا گیا لیکن نتائج نے حوصلہ بڑھایا اور خیال ہوا کہ اسکو وسیع کیا جائے اس ارادہ کے پیش نظر یہ قواعد اور نصاب مرتب کئے گئے جو اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ قواعد امتحانات اور نصاب، دونوں میں ابھی بعض اصلاح اور ترقی کی گنجائش ہے۔ لیکن چونکہ یہ کوشش ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے۔ طالب علموں نے کو بھی زیادہ دلچسپی نہیں ہوئی ہے اور کام کرنیوالوں کے ذرائع بھی محدود ہیں۔ اس لیے ان چیزوں کو بہت باقاعدہ بنانے سے زیادہ سہل رکھنے کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ملت کے ان تمام بزرگوں سے جو آئندہ نسل کی تعلیم سے دلچسپی رکھتے ہیں مفید مشوروں کی اور تمام طالب علموں اور سرپرستوں سے تعاون کی درخواست ہے۔ اللہ تعالے اس حقیر کوشش کو مفید اور بار آور بنائے اور اس کو قبول فرمائے۔ آمین!

عبدالرزاق خاں سکریٹری شعبۂ امتحانات اسلامی لائبریری۔ اچھاور۔ بھوپال

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

قواعد و نصاب سنہ ۱۹۶۲ء مطابق سنہ ۱۳۸۲ھ

مقصد: ۔ اسلام سے واقفیت پیدا کرنے کیلئے اسلامی لائبریری اچھاور بھوپال نے گذشتہ سال سے امتحانات کا سلسلہ شروع کیا۔

قواعد: ۔ امسال پانچ امتحانات تحریری پرچوں کے ذریعہ منعقد ہونگے امتحان کا فی [illegible]

داخلہ: ۔ امیدواروں کے لیے عمر، رنگ، مذہب وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ ہر جماعت کسی بھی [illegible]

فیس :۔ ہر امتحان کی فیس ایک روپیہ ہے۔ طالبات اور ابتدائی امتحان میں شرکت کرنے والوں سے نصف لی جائیگی۔ یہ فیس اپنے مرکز کے مہتمم صاحب تک وہ ۲۸ جنوری ۶۲ء تک پہنچا دینا ضروری ہے۔ وہ صاحب [illegible] تمام فیس اور فارمات عبدالرزاق خاں سکریٹری شعبۂ امتحانات اسلامی لائبریری اچپاور دھوپال کو پہنچا دینگے۔

تاریخ امتحان اور ہال ٹکٹ :۔ تاریخ امتحانات کا معینہ پروگرام امیدواروں کے پاس ہال ٹکٹ کے ساتھ مہتمم کے ذریعہ امتحانات شروع ہونے کے تین ماہ پیشتر بھیج دیا جائیگا۔ امیدواروں کو کاپیاں ادارہ کی جانب سے [illegible] قلم اور روشنائی خود اپنے ساتھ لے کر آنا ہوگا۔

امتحانات :۔ اسلامی لائبریری اچپاور کے جملہ مراکز میں امتحانات بیک وقت جون ۶۲ء کے پہلے ہفتہ میں شروع ہوں گے۔ کامیابی امتحانات کے لیے ۳۳ فیصدی نمبرات حاصل کرنا ضروری ہے۔ ۴۵ فیصدی سے کم نمبرات حاصل کرنے والے تھرڈ ڈویژن میں اور ساٹھ فیصدی سے کم نمبر پانیوالے دوسرے درجہ سیکنڈ ڈویژن میں اور ۶۰ فیصدی یا زیادہ پانے والے امیدوار پہلے درجہ کے فرسٹ ڈویژن میں کامیاب تصور کئے جائیں گے۔ ۷۵ فیصدی یا اس سے زیادہ نمبر (DISTINCTION) تصور کئے جائیں گے۔

سرٹیفکیٹس :۔ کامیاب طلبہ کو سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر سرٹیفکیٹس تقسیم کی جائیں گی۔ سینٹروں کے دیگر سرٹیفکیٹس بنام مہتمم صاحب بذریعہ رجسٹرڈ پوسٹ روانہ کر دی جائیں گی۔ اسناد کی فیس نہیں لی جائے گی۔

مراکز :۔ اسلامی لائبریری اچپاور کے امتحانات کے مراکز ہر اس مقام پر قائم کئے جا سکتے ہیں جہاں کم از کم [illegible] امتحان میں شریک ہوں۔ اور وہاں امتحان کی ضروری سہولتیں مہیا ہو سکتی ہوں اور ایسے حضرات نگرانی امتحان [illegible] کا تمام کام انجام دینے اور پوری ذمہ داری لینے کو تیار رہیں۔

مہتمم :۔ ہر مرکز ایک مہتمم کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دیگا۔ مہتمم اسلامی لائبریری اچپاور کے شعبۂ امتحانات کا نائب تصور کیا جائے گا اس کے احکام لائبریری کے احکام ہوں گے۔

[illegible] تمام امتحانات کے پرچے اردو اور ہندی میں ہوں گے، جواب بھی اردو اور ہندی میں لکھے جا سکتے ہیں [illegible] ہندی [illegible] بھی حل کر سکتے ہیں۔

[illegible] امتحان میں سب سے زیادہ نمبر پانے والے کامیاب امیدوار کو مکتبۃ الحسنات [illegible]
[illegible]
[illegible]

Jamia Millia Islamia
1 FEB 196
DELHI

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد ۲۸ شمارہ ۲ — فروری ۱۹۶۲ء

مدیر: سید احمد عروج قادری

● خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور ۔ یوپی
● زرِ سالانہ :- ۔ صدر ششماہی ۔ تین روپیہ ۔ فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد عروج قادری

زندگی ماہ نومبر ۱۹۶۱ء کے اشارات میں قرآن کی نوعیت و حیثیت، نیز اس کے امتیازات اور قدر و قیمت پر اظہار خیال مقصود تھا لیکن اس شمارے میں صرف نوعیت و حیثیت پر اظہار خیال ہو سکا تھا تازہ شمارے میں امتیازات اور قدر و قیمت پر مختصر اشارات پیش کیے جا رہے ہیں۔

(۱) قرآن کا ایک عظیم الشان امتیاز یہ ہے کہ وہ اس دنیا میں خدا کا بھیجا ہوا فرقان ہے۔ سورۂ الفرقان کی پہلی آیت یہ ہے:-

تَبَارَكَ الَّذِي نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ لِيَكُونَ لِلْعَالَمِينَ نَذِيرًا ۝

بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر فرقان نازل کیا تاکہ وہ تمام عالم کے لیے نذیر ہو۔

اس آیت میں الفرقان سے مراد قرآن ہی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں، لا نزاع ان الفرقان هو القرآن (اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ یہاں الفرقان سے مراد قرآن ہی ہے) فرقان، عربی زبان میں ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ حق و باطل کے درمیان تفریق پیدا کی جاتی ہے حق کو باطل سے الگ کیا جاتا ہے، اسی لیے بعض اہل علم نے اردو میں فرقان کا ترجمہ کسوٹی کیا ہے۔ سونا جانچنے والی کسوٹی سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں، جانچی جانے والی چیز سونا ہے یا نہیں؟ اگر سونا ہے تو خالص ہے یا نہیں؟ اگر خالص نہیں ہے تو کھوٹ کی مقدار کیا ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے یہ لفظ علم و فہم، عقل و تمیز، نور بصیرت، دلیل و حجت اور فتح و نصرت کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ ان میں سے ہر چیز حق و باطل کے درمیان فرق پیدا کرنے والی ہے اور قرآن میں ہمیں یہ تمام استعمالات ملتے ہیں۔

علم و فہم

وَإِذْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ۝ بقرہ ۶

یاد کرو ہم نے موسیٰ کو کتاب اور فرقان عطا کی تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

اس آیت میں فرقان، راجح قول کی بنا پر اس علم و فہم کو کہا گیا ہے جو توریت کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا کیا

گیا تھا اور ہر نبی کو عطا کیا جاتا ہے۔

عقل و تمیز

وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ — اور اس نے کسوٹی اتاری ہی جو حق و باطل کا فرق کھانیوالی ہے

ال عمران کی ابتدائی آیت میں قرآن اور توریت و انجیل کے ذکر کے بعد وانزل الفرقان کا ٹکڑا آیا ہے۔ ابن جریر رازی اور دوسرے محققین کے نزدیک یہاں فرقان سے مراد عقل و تمیز ہے جو اللہ نے ہر انسان کو دی ہے اور خصوصیت کے اپنے رسولوں کو عطا فرمائی تھی۔

نور بصیرت

یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (انفال ر ۴) — اے ایمان لانے والو، اگر تم خدا ترسی اختیار کروگے تو اللہ تمہارے لیے کسوٹی بہم پہنچا دیگا۔

یہاں فرقان سے مراد وہ نور بصیرت ہے جو تقوی سے پیدا ہوتا اور معاملات زندگی کے ہر نازک موڑ پر صحیح سمت کی طرف رہنمائی کرتا ہے

دلیل و حجت

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ (بقرہ ر ۲۳) — رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔

یہاں فرقان، ان دلائل و براہین اور حجج و شواہد کو کہا گیا ہے جو حق و باطل کے فرق کو واضح کرتے ہیں۔

فتح و نصرت

وَمَاۤ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا یَوْمَ الْفُرْقَانِ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ (انفال ر ۵) — اور اس چیز پر جو فرقان کے دن جب دونوں فوجوں کی مڈبھیڑ ہوئی اپنے بندے پر نازل کی تھی۔

یہاں فرقان، اس فتح و نصرت کو کہا گیا ہے جو مسلمانوں کو بدر کی لڑائی میں حاصل ہوئی تھی۔ جن حالات میں یہ فتح نصیب ہوئی اس نے چونکہ حق و باطل کے فرق کو واضح کر دیا تھا اس لیے اسے فرقان کہا گیا ـــــ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہے کہ قرآن کو فرقان کیوں کہا گیا ہے۔ اس آسمان کے نیچے کوئی دوسری چیز موجود نہیں ہے جو قرآن سے بڑھ کر حق کو باطل۔

الگ کرنے والی ہو اس لیے قرآن ہی اس لقب اور اس امتیاز کا سب سے زیادہ مستحق ہے۔ یہ حق و باطل میں فرق پیدا کرتا ہے۔ یہ ہدایت و ضلالت کو الگ الگ کرتا ہے۔ یہ غلط اور صحیح تصورات و خیالات کو ایک دوسرے سے چھانٹ کر علیحدہ کرتا ہے اور یہ حلال و حرام کے درمیان تمیز پیدا کرتا ہے، یہ ایک ایسی بے نظیر کسوٹی ہے جس کا جواب نہ اب موجود ہے اور نہ کبھی ہوگا سورۂ الفرقان کی مذکورہ بالا آیت میں لیکون للعالمین نذیرا کا ٹکڑا اس بات کی دلیل تو ہے ہی کہ رسالت محمدی تمام عالم کے لیے عام ہے اس کے علاوہ اس ٹکڑے میں ختم نبوت کی دلیل بھی چھپی ہوئی ہے امام رازی فرماتے ہیں:۔

ان لفظ العٰلمین یتناول جمیع	العالمین کے لفظ میں تمام مخلوقات داخل ہیں۔ لہذا
المخلوقات فدلت الآیۃ علی انہ	آیت میں اس بات پر دلیل ہے کہ آپ قیامت تک تمام
رسول للخلق الی یوم القیامۃ فوجب	خلقت (جن و انس) کے رسول ہیں تو اب یہ واجب
ان یکون خاتم الانبیاء و	ہوا کہ آپ نبیوں اور رسولوں کے ختم کرنے والے اور
والرسل	اس سلسلے کی آخری کڑی ہوں۔

اس عبارت میں امام رازی کا ذہن جس استدلال کی طرف گیا ہے وہ یہ ہے کہ جب سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کے بموجب قیامت تک پیدا ہونے والی تمام مخلوقات جن و انس کے رسول ہیں تو پھر اب کسی نئے نبی و رسول کے آنے کا سوال ہی کیا باقی رہا کسی نئے رسول کے آنے کی ضرورت تو اس وقت ہوتی جب آپ کی رسالت کسی مخصوص قوم یا کسی محدود وقت و زمانے کے لیے ہوتی لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ آپ تمام انسانوں اور تمام جنوں کے رسول ہیں اور قیامت تک کے لیے ہیں، کیونکہ العالمین کا لفظ تمام مخلوقات کو محیط ہے اور اس میں وقت اور زمانے کی بھی کوئی قید لگی ہوئی نہیں ہے۔

۲۔ قرآن کا بہت بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ تضاد و اختلاف سے پاک ہے۔ منافقین کو قرآن پر تدبر کی دعوت دیتے ہوئے کہا گیا ہے

افلا یتدبرون القرآن ط ولو	کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی
کان من عند غیر اللہ لوجدوا	اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی
فیہ اختلافا کثیرا ۵ (نساء آیۃ ۸۲)	پائی جاتی۔

یہ آیت قرآن کے مہتم بالشان خصوصیت و امتیاز کا اعلان کرتی ہے، اور پھر یہی امتیاز و خصوصیت اس کے کلام اللہ ہونے کی بھی ایک زبردست دلیل بن جاتی ہے، رسول خدا اور ان کے مخلص ساتھیوں کے مقابلے میں جو روش اور دعوت اسلامی کے ساتھ جو رویہ، منافقین نے اختیار کر رکھا تھا اس کی بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ انھیں حضور کی نبوت اور قرآن کے کلام اللہ ہونے کا یقین نہ تھا، وہ رسالت محمدی اور کتاب الٰہی پر ایمان کی دولت سے محروم تھے، ایک طرف ان کی بزدلی، کم ظرفی اور جان و مال کا شدید

بحث کا یہ حال تھا کہ وہ مسلمانوں کے سامنے علی الاعلان، اپنی بے ایمانی کا اظہار نہ کر سکتے تھے اور دوسری طرف انہیں یقین تھا کہ جزیرۃ العرب کے قبائل کی متحدہ طاقت ایک نہ ایک دن، دعوت اسلامی اور اس کے ساتھ اس کے مومنوں اور داعیوں کو کچل کر رکھ دے گی اس لیے انھوں نے اپنی دوستی کا ایک ہاتھ مسلمانوں کی طرف بڑھا رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ کفار و مشرکین اور یہودیوں کے ہاتھوں میں دیدیا تھا اور وہ خوش تھے کہ "میرے دونوں ہاتھ نکلے کام کے" فائدے دونوں گروہوں کے سمیٹ لیں گے اور نقصان کسی کی طرف سے نہ پہنچے گا ان کے اصل روگ پر انھیں متنبہ کرتے ہوئے کہا گیا کہ یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ یہ پُر یقین لہجہ اور شاہانہ استفہام خود بتا رہا ہے کہ یہ اگر غور کرتے اور اپنی قوت فکر استعمال کرتے تو انھیں یقین آجاتا کہ قرآن، کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا، تدبر قرآن کی طرف متوجہ کرنے کے بعد یہاں اس کے ایک ایسے امتیاز کی طرف رہنمائی کی گئی جو کسی انسان کے کلام میں نہیں پائی جا سکتی، کیا کسی انسان کے بس میں ہے کہ وہ بیس بائیس سال تک مختلف حالات و کیفیات میں، نوع بہ نوع مواضع و مواقع پر، طرح طرح کے کثیر الاطراف موضوعات پر، مختلف مضامین و معانی پر کلام کرتا رہے، خطبے دیتا رہے، تقریریں اور گفتگوئیں کرتا رہے اور پھر جب اس کی تمام تقریریں، سارے خطبات اور پوری کی پوری گفتگوئیں یکجا کی جائیں تو ان میں کسی طرح کا حقیقی تضاد، کسی قسم کی داخلی اختلاف بیانی اور کسی نوع کا تصادم نہ پایا جائے، الفاظ و معانی کی ہم آہنگی و تناسب کا یہ حال ہو کہ کسی جگہ نظر ثانی کی ضرورت پیش نہ آئے، جو لفظ جہاں اور جس جگہ استعمال کیا گیا ہو اسے وہاں سے ہٹانے کی کوئی گنجائش نہ ہو، نظم کلام اور اسلوب بیان کی چستی کا یہ عالم ہو کہ کوئی پارہ ادب، کسی مقام پر بھی فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ سطح سے نیچے نہ اترا ہو۔

جس وقت سے انسانی کلام کے مجموعے تیار کئے جا رہے ہیں کیا اس وقت سے لیکر آج تک کوئی ایسا مجموعہ دنیا پیش کر سکی ہے؟ اگر ان سوالات کا جواب نفی میں ہے اور قطعاً نفی میں ہے تو قرآن کو کسی انسان کا کلام کہنا اس آسمان کے نیچے سب سے بڑا جھوٹ ہے، سب سے بڑی دھاندلی ہے۔ لیکن زمین پر صرف ایک مجموعۂ کلام ایسا ہے جو محمد عربی صلوات اللہ علیہ کے واسطے سے ہم تک پہنچا ہے جس کے بارے میں اوپر کے سوالات کا جواب اثبات میں اور بلاشبہ اثبات میں ہے، ظاہر ہے کہ یہ مجموعۂ کلام خود محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ بھی بہرحال انسان تھے اور نوع انسانی کے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ وہ اس نوعیت کا مجموعۂ کلام پیش کر سکے۔

قرآن نے اپنے بارے میں خود جو بات کہی ہے اس پر ایک اور پہلو سے غور کیجیے۔ بات یوں بھی کہی جا سکتی تھی۔

"کیا یہ لوگ، قرآن پر غور نہیں کرتے، اگر غور کریں تو اس میں ذرہ برابر اختلاف بیانی نہ پائیں گے،،

اس طرز تعبیر کو چھوڑ کر وہ انداز کلام کیوں اختیار کیا گیا، اس کا ایک واضح سبب تو یہ ہے کہ ہماری طرز تعبیر سے صرف اتنا معلوم ہوتا کہ قرآن میں اختلاف بیانی نہیں ہے، لیکن اس میں اس بات کا اشارہ نہ ہوتا کہ یہ امتیاز انسانی کلام کو حاصل نہیں ہو سکتا

آیت قرآنی صرف امتیاز ہی کو واضح نہیں کرتی بلکہ یہ بھی دعویٰ کرتی ہے کہ یہ امتیاز صرف کلام الٰہی کا خاصہ ہے ــــ ذرا غور کرنے سے اس کا دوسرا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعویٰ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کا مدعی کوئی انسان نہیں ہو سکتا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے کبھی کوئی انسانی مجموعۂ کلام نہیں پڑھا تھا یہ بات کس بنیاد پر کہہ سکتے تھے کہ :۔

"اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف بیانی پائی جاتی"

فی الواقع یہ بات تو وہی کہہ سکتا ہے جس کا علم پوری نوع انسانی کی فطرت پر محیط ہو اور وہ یہ جانتا ہو کہ یہ امتیاز انسان کے بس سے باہر ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ دعویٰ بھی کھلا چیلنج ہے کہ اگر اس نوعیت کا انسانی مجموعۂ کلام کوئی پیش کر سکتا ہو تو پیش کر کے دکھائے۔

سورۂ محمد میں بھی منافقین کو تدبر قرآن کا حکم دیا گیا ہے۔

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا (۳/) کیا وہ قرآن میں تدبر نہیں کرتے یا دلوں پر قفل لگ رہے ہیں۔

ایک اور پہلو * اس آیت پر ایک اور پہلو سے غور کیجیے۔ سورۂ نساء اور سورۂ محمد دونوں جگہ أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ کہا گیا ہے أَفَلَا يَقْرَءُونَ الْقُرْآنَ نہیں کہا گیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ محض قراءت بلا تدبر سے قرآن کا یہ امتیاز کھل کر سامنے نہیں آتا بلکہ متعدد آیتوں میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے، تدبر کا لفظ اختیار کر کے اس اشتباہ کی جڑ کاٹ دی گئی ہے، عدم تضاد اور عدم اختلاف کی حقیقت کو پانے کے لیے تدبر ضروری ہے،

۲۔ قرآن کا ایک بڑا امتیاز یہ بھی ہے کہ اس میں کوئی شک و ریب نہیں ہے

الٓمٓ ذَٰلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ یہ وہ الکتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں

قرآن کھولتے ہی جب اس کے اس امتیاز و خصوصیت پر نظر پڑتی ہے تو قدرتی طور پر قاری کو اس کتاب سے گہری دلچسپی اور غیر معمولی عقیدت پیدا ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے علاوہ دنیا کی کوئی کتاب اتنے بڑے دعوے سے شروع نہیں ہوتی، حق کی جستجو کرنے والا، تعصبات سے پاک، انسان جیسے جیسے اس کتاب کو بغور پڑھتا جاتا ہے اس کا دل اس دعوے کی سچائی تسلیم کرتا جاتا ہے ــــ لَا رَيْبَ فِيهِ کا عموم، ہر طرح کے شک و تردد کی نفی کرتا ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ یہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی کتاب ہے۔ اس بات میں بھی کوئی تردد نہیں کہ یہ ایک ایسا کلام معجز نظام ہے جو انسان کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہے، اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس نسخہ کیمیا اثر کے مشابہ کوئی دوسرا نسخہ دنیا میں موجود نہیں اور اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ سب حقیقت نفس الامری کے مطابق ہے۔ اس میں کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے

تو ہم قرار دیا جاسکے۔ پونے چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی آج تک کوئی انسان اس میں ایسی کوئی چیز نہیں پاسکا جس سے کسی معقول بنیاد پر انکار کیا جاسکے۔ اس میں یہ نہیں کہا گیا ہے کہ کوئی انسان قرآن میں شک نہیں کرتا بلکہ یہ نہیں کہا گیا ہے کہ واقعہ نفس الامری کے لحاظ سے یہ کتاب شک و ریب سے بالاتر ہے۔ یہ اپنے دلائل و براہین کے لحاظ سے ایسی واضح ہے جیسے دوپہر کا سورج، اگر دوپہر کے وقت کوئی کہے کہ سورج میں کوئی شک نہیں ہے تو اس کے معنی یہی ہوں گے کہ حقیقت نفس الامری کے لحاظ سے اور بینائی رکھنے والوں کے لیے اس میں شک نہیں ہے ویسے دن کا اندھا اس میں شک کرے تو کر سکتا ہے۔

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم		چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

اگر دن کو چمگادڑ کی آنکھ دالا نہ دیکھے		تو اس میں آفتاب کا کیا قصور؟

اللہ تعالیٰ نے قرآن کے بارے میں لاریب فیہ اسی مفہوم کے لحاظ سے کہا ہے اور آگے چل کر اس نے جہل و نادانی اور ضد و عناد کی بنا پر شک کرنے والوں کو چیلنج کیا ہے کہ اگر تمہیں قرآن کے آسمانی کتاب ہونے میں شبہ ہے تو اس جیسی کوئی ایک ہی سورہ بنا لاؤ، آج تک اس چیلنج کا جواب نہیں دیا جاسکا اور جب تک اس کا جواب مہیا نہیں کیا جاتا لاریب فیہ کا دعویٰ بجا رہیگا

۴۔ قرآن کا ایک اہم امتیاز یہی ہے کہ قیامت تک اس کی حفاظت، اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ذمہ لے لی ہے، یہ لاریب فیہ سے آگے کی بات ہے سورۂ حجر میں کہا گیا:۔

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ		ہم نے الذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہمیں اسکے محافظ ہیں

سورۂ حٰم السجدہ ارشاد ہوا:۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ		باطل نہ اس کے سامنے سے آئے گا نہ پیچھے سے یہ خدائے

وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ۭ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (۵)		حکیم و حمید کی اتاری ہوئی کتاب ہے۔

قدر و قیمت۔ اس نوعیت و حیثیت اور ان امتیازات و خصوصیات سے بھری ہوئی کتاب کی قدر و قیمت کیا لفظ و بیان کی گرفت میں آنے کی چیز ہے؟

حاشا و کلا۔ پرندوں کے لیے ہوا کی جو قدر و قیمت ہے، مچھلیوں کے لیے پانی کی جو قدر و قیمت ہے، عام انسانوں کے لیے ہوا اور پانی کی جو قدر و قیمت ہے، وہ اس قدر و قیمت کے مقابلے میں ایک ذرے کی حقیقت بھی نہیں رکھتی جو مومن کے لیے قرآن کی ہے دنیا کی تمام قابل قدر دولتیں اور نعمتیں اس نعمت بے بہا کے سامنے ہیچ ہیں، قرآن کے ساتھ ایک دمڑی بھی انمول ہے اور قرآن کو چھوڑ کر، سونے چاندی کا ڈھیر اور جواہرات کا انبار بھی بے قیمت ہے۔ ہاں، یہ مجھ جیسے مومن کا بیان نہیں ہے بلکہ اس مومن کا بیان ہے، ایمان جس کے دل کی بشاشت اور روح کی تازگی بن چکا ہے۔ درحقیقت یہی مومن، قرآن کی قدر و قیمت جانتا

پہچانتا ہے۔ اس کی قدر وہ جانتا ہے جس کے نزدیک، روح، جسم سے اعلیٰ اور اخلاقی زندگی، مادی زندگی سے برتر ہے۔ اس کی قدر وہ پہچانتا ہے جس نے دنیا پر آخرت کو ترجیح دے رکھی ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اللہ نے فرمایا ہے۔

وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي
وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ۝ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ
إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا
مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ
وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝
(حجر ر ۶)

ہم نے تمہیں سات ایسی آیتیں دی ہیں جو بار بار دہرائی
جاتی ہیں اور تمہیں قرآن عظیم عطا کیا ہے تم اس متاع
دنیا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھو، جو ہم نے ان میں سے مختلف
قسم کے لوگوں کو دے رکھی ہے اور نہ ان کے حال پہ
اپنا دل کڑھاؤ، انہیں چھوڑ کر ایمان لانے والوں کی
طرف جھکو،

بلاشبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مقدس ساتھیوں نے اس بیش بہا نعمت کی جیسی قدر پہچانی وہ تاریخ کی بے نظیر چیز ہے۔

قلبی احساسات کے اظہار کے دو طریقے ہوتے ہیں:۔

قولی اور عملی۔ جہاں تک قولی مدح و ثنا کا تعلق ہے، ممکن ہے کہ بعد کے آنے والے مسلمان، عہد صحابہ سے بھی دو ہاتھ آگے ہوں لیکن عملاً اظہار قدر و قیمت میں وہ صحابہ کرام کے پاسنگ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے، اس عہد سعادت اور آج کے زمانے میں بنیادی اور عظیم الشان فرق یہی ہے کہ اس وقت منثور و منظوم قصیدے کم، اور عمل زیادہ تھا اور آج عمل، کم اور منثور و منظوم قصیدے زیادہ ہیں، اے کاش ہمارا عمل بھی ہمارے قول کے مطابق ہوتا ـــــ سورۂ یونس میں ارشاد ہوا:۔

لوگو، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آگئی ہے، یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لیے رہنمائی اور رحمت ہے۔ اے نبی کہو، کہ یہ اللہ کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ یہ چیز اس نے بھیجی اس پہ لوگوں کو خوشی منانی چاہیے، یہ ان سب چیزوں سے بہتر ہے جنہیں لوگ سمیٹ رہے ہیں (یونس ر ۶)

اس آیت میں قرآن کے لیے مَوْعِظَةٌ۔ شِفَاءٌ۔ هُدًى۔ رَحْمَةٌ کی چار صفتیں بیان کی گئی ہیں، اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کہا گیا ہے کہ لوگوں کے سامنے یہ بات پیش کریں کہ ان صفات کی کتاب درحقیقت اللہ کا وہ فضل ہے جس پر خوش ہونا چاہیے نہ کہ وہ حقیر دنیا، جسے وہ سمیٹ رہے ہیں، آیت کا سیاق صاف بتا رہا ہے کہ اس میں فضل و رحمت کے جو الفاظ آئے ہیں ان سے مراد قرآن ہے۔ مجاہد نے بھی اس سے قرآن ہی مراد لیا ہے ابوالشیخ اور ابن مردویہ نے حضرت انس سے مرفوع حدیث روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فضل اللہ سے یہاں قرآن مراد ہے اور اللہ کی رحمت سے یہ مراد ہے کہ اس نے مسلمانوں کو قرآن کا اہل بنایا حضرت براء اور ابوسعید خدری رضی اللہ عنہما سے بھی موقوفاً یہی مروی ہے (روح المعانی)

ہر وہ شخص جس کے دل میں ایمان کا نور ہوگا اسے اس بات کو تسلیم کرنے میں تامل نہیں ہو سکتا کہ نعمت قرآن کے مقابلے میں دنیا کی تمام نعمتیں ہیچ ہیں۔

یہ بے حسی کیوں

(وحیدالدین خاں)

جماعت اسلامی حلقہ مشرقی یوپی کے اجتماع بمقام جون پور میں پڑھا گیا ۔ ۱۲ر نومبر ۱۹۶۱

مجھ کو جب یہ حکم ملا کہ اس وقت کی مجلس میں مجھے کچھ کہنا ہے ، تو میں نے سوچنا شروع کیا کہ وہ کیا بات ہے جو مجھے آپ سے کہنی چاہیے ۔ یہ چونکہ نصیحت ، یا قرآن کے الفاظ میں تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی مجلس ہے ، اس لیے اس مناسبت سے بہت سی باتیں ذہن میں آئیں ۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک سوال نے میرے سلسلۂ خیال کو توڑ دیا ——— "تم جو باتیں سوچ رہے ہو کیا وہ سننے والوں کے لیے نئی ہیں ، کیا ان کے کان بار بار یہ آوازیں نہیں سن چکے ہیں ۔ پھر جن الفاظ نے اس سے پہلے کوئی اثر نہیں دکھایا ، وہی الفاظ ایک مرتبہ اور دہرا دینے سے کیا انقلاب آجائے گا " اس سوال کا آنا تھا کہ میرے سارے خیالات اس طرح منتشر ہو گئے جیسے یکایک ہوا کا تیز جھونکا آئے اور تنکوں اور پتوں کے ڈھیر کو اڑا لے جائے ۔

اب میں دم بخود تھا ۔ " آخر اس بے حسی کی وجہ کیا ہے " ، یہ سوال میرے سامنے گھومنے لگا ۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں نے ساری باتیں کہہ ڈالی ہیں اور اب میرے پاس آپ سے کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے ۔ میری مثال اس مقرر کی سی ہو گئی جو اپنی پوری تقریر ختم کر چکا ہو ۔ مگر ساری قوت صرف کرنے کے بعد آخر میں جب وہ حاضرین سے کہے کہ لگائیے نعرہ " انقلاب زندہ باد " تو سامنے بیٹھے ہوئے ہزاروں انسانوں میں سے کسی ایک کی زبان بھی حرکت میں نہ آئے ۔ وہ بار بار کہے کہ " لگائیے نعرہ " مگر ہر شخص اس طرح خاموش بیٹھا رہے گویا کسی کے منھ میں زبان ہی نہیں ہے ۔ عین اس وقت مجھے دور سے ایک آواز سنائی دی ۔ مجھے نظر آیا کہ امام ترمذی سے لے کر کعب بن عیاض تک انسانوں کی ایک جماعت ایک دوسرے کو پکار رہی ہے کہ آخری رسول کا یہ پیغام اس بندۂ خدا تک پہنچا دو ، کیونکہ اسی پیغام میں اس کے سوال کا جواب ہے ۔

حدثنا احمد بن منیع	امام ترمذی سے کہا احمد بن منیع نے ، ان سے کہا حسن
نا الحسن بن سوار نا اللیث بن سعد	بن سوار نے ، ان سے کہا لیث بن سعد نے ،
عن معاویۃ بن صالح عن عبد	..........، ان سے کہا معاویہ بن صالح
الرحمٰن بن جبیر بن نفیر حدثہ	نے ، ان سے کہا عبدالرحمٰن بن جبیر نے ، ان سے کہا

عَنْ اَبِیْہِ عَنْ کَعْبِ بْنِ عِیَاضٍ قَالَ سَمِعْتُ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ:۔ اِنَّ لِکُلِّ اُمَّۃٍ فِتْنَۃً وَّ فِتْنَۃُ اُمَّتِی الْمَالُ (ترمذی، ابواب الزہد)

ان کے باپ نے، ان سے بیان کیا کعب بن عیاض نے، انھوں نے کہا کہ میں نے سنا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے، آپ نے فرمایا —— ہر امت کا ایک فتنہ تھا اور میری امت کے لیے جو چیز فتنہ بنے گی وہ مال ہے

اس فقرے میں "مال" دراصل "دنیا" کا قائم مقام ہے کیونکہ دنیا کی وہ تمام چیزیں جن کو عاجلہ پسند انسان للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتا ہے وہ مال ہی کے ذریعہ حاصل ہوتی ہیں۔ مال دنیا کے ساز و سامان کی قیمت ہے۔

جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے، یہی دنیا ہر زمانے میں انسانوں کی گمراہی کا سبب رہی ہے۔ مگر بعد کے دور میں یہ فتنہ پوری شدت سے ظاہر ہونے والا تھا، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو خاص طور پر امت اسلامیہ کا فتنہ قرار دیا۔ پہلے آدمی جن لذائذ و نعم کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا وہ آج سائنسی تحقیقات کے نتیجے میں واقعہ بن کر انسان کو حاصل ہو چکی ہیں۔ یہی نہیں، پہلے دنیا کی جو رنگینیاں اور اس کے دلکش ساز و سامان صرف کسی بادشاہ کے محل میں ہوتے تھے، وہ آج خوب صورت الماریوں میں سجے ہوئے بازار کے اندر نظر آتے ہیں، وہ آج در و دیوار پر رنگین اشتہارات کی صورت میں لگے ہوئے ہیں، وہ پوری رعنائی کے ساتھ سڑکوں پر ظاہر ہو کر ہر راہ گیر کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا اس سے پہلے کبھی اتنی حسین نہیں تھی، اس لیے وہ اس سے پہلے انسان کے لیے اتنا بڑا فتنہ بھی نہیں بن سکتی تھی۔

یہاں میں ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو ابھی حال میں اخبارات میں آیا تھا۔ نئی دہلی میں ہندوستان کے صنعتی میلے میں امریکہ کی طرف سے ایک ہوائی موٹر (Aerocar) کی نمائش کی گئی ہے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ زمین پر بھی چلتی ہے اور ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوا میں بھی اڑ سکتی ہے۔ اس عجیب و غریب موٹر کو جب ایک نوجوان سادھو نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک نیا مسئلہ پیدا ہو گیا" کیا میں تیاگ اور قربانی کی زندگی کو چھوڑ کر مادی ترقیات کی دنیا میں اپنے حوصلوں کی تسکین ڈھونڈوں" سادھو نے کہا۔ گیروے کپڑے میں ملبوس اور لمبے بکھرے ہوئے بالوں والا یہ ہندوستانی نوجوان بیس منٹ تک اس امریکی موٹر کار کو دیکھتا رہا جس کو نمائش کے ذمہ داروں نے مستقبل کی کار (Car of the Future) کا نام دیا ہے۔ جب اس کے بارے میں سادھو کا تبصرہ پوچھا گیا تو اس نے گہرے تاثر کے ساتھ جواب دیا۔ "اس نے مجھے اس سوچ میں ڈال دیا ہے کہ دونوں دنیاؤں میں سے وہ کون سی دنیا ہے جس کو میں اپنے لیے زیادہ بہتر سمجھوں" (ہندوستان ٹائمس، ۲۰ نومبر ۱۹۶۱ء)

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ مادی سازوسامان نے آج کس طرح ہر شخص کو اس خطرے میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ ان کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر زندگی کی اصل حقیقت کو بھول جائے۔

اس حدیث سے میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ امت محمدیہ کے افراد میں جب کوئی کمزوری نظر آئے تو اس کے اسباب سب سے پہلے دنیا کے فتنوں میں تلاش کرنے چاہئیں۔ جب اس امت کا فتنہ دنیا ہے تو امت کی خرابیاں بھی دنیا ہی کی پیدا کی ہوئی ہوں گی۔ جب میں نے اس حیثیت سے غور کیا تو بالآخر میرا ذہن اس پر مطمئن ہو گیا کہ دنیا ہی وہ سب سے بڑا روک ہے جو حق کی آواز کو آدمی کے لیے قابل فہم اور قابل قبول بننے نہیں دیتا۔ اسلام کی بلند تر حقیقتوں کو وہی شخص پا سکتا ہے جو دنیا اور دنیا کی چیزوں سے اپنے آپ کو اوپر اٹھا چکا ہو۔ جو اس سے اوپر نہ اٹھ سکے اس کے عین سر کے اوپر حقیقت کی آواز گونج رہی ہو گی مگر اس کو گرفت کرنے کی طاقت سے وہ محروم ہو گا۔ اس کے پاس وہ کان نہیں ہوں گے جن سے وہ سنے اور وہ دل نہیں ہو گا جن سے وہ اسے سمجھے۔ آپ کی سعادت و ترقی کے تمام امکانات اس وقت تک آپ سے دور ہیں جب تک آپ کی توجہات دنیا کے اندر بکھری ہوئی ہوں۔ آپ کا مومن بننا، آپ کا داعی بننا، آپ کا مجاہد فی سبیل اللہ بننا، سب کچھ منحصر ہے اس بات پر کہ اس سے پہلے آپ "ذھد فی الدنیا" کی کیفیت اپنے اندر پیدا کر چکے ہوں جو رسول کے الفاظ میں — اول صلاح ھذہ الامۃ ہے۔ دنیا پسندی دوسرے لفظوں میں ظاہر پسندی کا نام ہے۔ اور ذُھد یہ ہے کہ ظاہری چیزوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے وہ آدمی کے سامنے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا پسندی سطحیت پیدا کرتی ہے اور ذُھد سے وہ گہری نظر حاصل ہوتی ہے جو چھپے ہوئے واقعات کو بالکل بے نقاب دیکھ لے۔ اور حقیقت سے انتہائی حد تک آشنا ہو کر بول سکے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:۔

مَا زَھِدَ عَبْدٌ فِی الدُّنْیَا اِلَّا اَنْبَتَ	جو شخص دنیا سے بے رغبت ہو جائے اللہ تعالیٰ اس کے دل
اللہُ الْحِکْمَۃَ فِیْ قَلْبِہٖ وَاَنْطَقَ بِھَا لِسَانَہٗ	میں حکمت پیدا کر دیتا ہے۔ اور اس کی زبان پر کلمات
وَبَصَّرَہٗ عَیْبَ الدُّنْیَا دَاءَھَا وَدَوَاءَھَا	حکمت جاری کر دیتا ہے۔ دنیا کے عیب اور اس کا مرض
وَاَخْرَجَہٗ سَالِمًا اِلٰی دَارِ السَّلَامِ	اور علاج اسے دکھا دیتا ہے۔ اور اس کو سلامتی کے گھر
(بیہقی فی شعب الایمان)	(جنت) تک محفوظ لے جاتا ہے۔

یہ حکمت جو زُہد کے صلے میں ملتی ہے، یہ خدا کی سب سے بڑی دین ہے جس کو قرآن میں "خیر کثیر" کہا گیا ہے۔ یعنی سب سے بڑا خزانہ۔ قرآن کے بیان سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکمت کا خزانہ اسی کو ملتا ہے جو دوسرے خزانوں سے اپنی نظر میں ہٹا لے، جو دنیا کی محبت سے اپنے دل کو خالی کر چکا ہو۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں خدا کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم دیتے

ہوئے ارشاد ہوا ہے :-

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ ۚ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا — اللہ جس کو چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے، اور جس کو حکمت دی گئی اس کو سب سے بڑا خزانہ دیدیا گیا۔

یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ "خیر کثیر" اسی کو ملتا ہے جو "خیر قلیل" سے اپنے آپ کو خالی کرلے، جو خیر قلیل میں لپٹا ہوا ہو، وہ خیر کثیر سے اپنا دامن نہیں بھر سکتا۔

میں چاہتا ہوں کہ آج کی صحبت میں اسی زھد فی الدنیا کے بارے میں کچھ عرض کروں۔ کیونکہ اپنے مطالعہ اور تجربے سے میں اس حقیقت پر مطمئن ہوچکا ہوں کہ جب تک کسی کے اندر زھد کی کیفیت پیدا نہ ہو وہ دین کی اعلیٰ حقیقتوں کا ادراک نہیں کرسکتا اور نہ اس کے اندر کبھی گہرا عمل پیدا ہوسکتا۔ جس شخص کی آخرت طلبی نے اس کو دنیا کا زاہد نہیں بنایا، اس کے درمیان اور قرآن کے درمیان ایک حجاب مستور حائل رہتا ہے۔ وہ سنتا ہے مگر نہیں سنتا، وہ سنتا ہے مگر نہیں سمجھتا۔ (بنی اسرائیل ۴۶-۴۵)

زھد فی الدنیا کے معنی ہیں دنیا سے بے رغبتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا سے دلچسپی کا تعلق ختم کرکے اس سے صرف ضرورت کا تعلق باقی رکھا جائے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو حدیث میں التجافی من دار الغرور کہا گیا ہے۔ (دھوکا دینے والی جگہ سے دور رہنا) اس دوری کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دنیا کے کاروبار سے الگ تھلگ ہوجائیں۔ زھد دراصل دنیا سے جذباتی بے تعلقی کا نام ہے نہ کہ عملی بے تعلقی کا۔ جیسا کہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا، زھد خراب کپڑے اور معمولی کھانے کا نام نہیں ہے یہ ایک کیفیت ہے جو دل کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ ظاہری شکلیں اس اندرونی کیفیت کا فطری اظہار ہیں۔ نہ کہ بجائے خود کسی ظاہری شکل کا نام زھد ہے۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص جھونپڑی میں رہتا ہو مگر اپنے خیالات و احساسات کے اعتبار سے وہ مکمل طور پر ایک دنیا پسند آدمی ہو۔ اور دوسرا شخص اپنے آپکو نیویارک کی سومنزلہ عمارتوں کے درمیان پائے مگر دنیا پسندی سے اس کا ذہن خالی ہو۔

زھد کسی مصنوعی تدبیر کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ آدمی کی ایمانی حالت کا ایک فطری اظہار ہے جب کوئی شخص اعلیٰ حقیقتوں کو پالیتا ہے تو اسفل حقیقتیں خود بخود اسکی نگاہ میں حقیر بنجاتی ہیں۔ اخروی قدروں کی اہمیت کا احساس دنیوی قدروں کو غیر اہم بنا دیتا ہے وہ اپنی ایمانی کیفیت کے بالکل لازمی نتیجے کے طور پر دنیا سے بے رغبت ہوجاتا ہے جب آپکا ذہن خدا کی باتیں سوچنے میں اتنا مصروف ہو کہ آپ دنیا کی باتیں بھولنے لگیں جب آخرت کی فکر آپ کے اوپر اسطرح چھا جائے کہ دنیا کے غم آپکو یاد نہ آئیں جب آنیوالے مستقل آرام و تکلیف کا مسئلہ آپکو اتنا فکرمند بنادے کہ عارضی آرام و تکلیف کے مسئلے آپکے لیے بے حقیقت ہوجائیں۔ جب کل کی زندگی آپکو اس طرح اپنی طرف کھینچ لے کہ آج کی زندگی کے بارے میں آپ لوگوں کو غافل نظر آنے لگیں، جب بلند تر حقائق کی طرف متوجہ ہونے کی وجہ سے آپ دنیا میں اسطرح رہنے لگیں گویا آپ دنیا میں نہیں ہیں۔ جب دنیا میں آپ کوئی آرام دیکھیں تو یہ سوچ کر رو پڑیں کہ معلوم نہیں آخرت میں کیا ہونے والا ہے اور جب کوئی تکلیف ستائے تو آپ کی

زبان سے نکلے کہ "خدایا دنیا کی معمولی تکلیف کا یہ حال ہے تو آخرت میں کیا ہوگا" جب دنیا کی لذتیں آپ کو تسکین نہ دے سکیں اور دنیا کی زحمتیں آپ کی نگاہ میں حقیر بن جائیں ـــ جب آپ کا حال یہ ہو جائے تو اسی کا نام زھد فی الدنیا ہے۔ آنحضور نے ایک بار اپنے صحابی حضرت عبداللہ بن عمر کو پکڑ کر جو نصیحت فرمائی تھی، اس کا ایک فقرہ یہ تھا:-

عُدَّ نَفْسَكَ مِنْ أَهْلِ الْقُبُوْرِ (بخاری)　　اپنے آپ کو قبر والوں میں شمار کرو

گویا اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو دنیا میں بھیجا ہے اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہاں کی نعمتوں میں غرق ہوں اور یہاں رہ کر اپنے دل کی تمنائیں پوری کریں۔ بلکہ وہ تو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں سے کون ہے جو دنیا کو اپنے حوصلوں اور تمناؤں کا مدفن بناتا ہے۔

اس تشریح سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ زھد صرف محرمات دنیا سے بچنے کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی حالت ہے جس میں آدمی کو بہت سی جائز چیزوں سے بھی اپنے آپ کو محروم کر لینا پڑتا ہے۔ بے شک جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے وہی حرام ہے اور جو کچھ اس نے حلال کیا ہے وہ سب حلال ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں کہ اس میں بال برابر کوئی رد و بدل کر سکے۔ مگر شریعت کی قانونی حدود ہمارے ارتقا کی آخری حدود نہیں ہے۔ دائرہ ایمان میں داخل ہونے کے لیے یقیناً صرف اتنا ہی کافی ہے کہ آدمی احکام کے قانونی تقاضے پورے کر دے۔ مگر ایمان کے اعلیٰ مراتب کو حاصل کرنے کا ذریعہ قانون نہیں، قربانی ہے، اگر آپ خدا کی راہ میں مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں تو آپ کو اپنی نیند، اپنا آرام، اپنی لذتیں، سب کچھ چھوڑنی پڑیں گی، ذوق اور عادت کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دینا ہوگا۔ حالانکہ یہ سب کچھ آپ کے لیے جائز ہے اور ان میں سے کوئی بھی چیز شریعت نے حرام نہیں قرار دی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسری تمام راہوں کی طرح اسلام کی راہ میں بھی ترقی صرف اسی کے لیے ہے جو قانونی تقاضوں سے بلند ہو کر کام کرنے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو یہ نہ دیکھتا ہو کہ دنیا کی چراگاہ میں اس کے لیے کیا کیا جائز ہے۔ بلکہ جس کی نگاہ اس پر لگی ہوتی ہو کہ کتنے عظیم امتحان میں اسے پیش ہونا ہے اور اس کے لیے کتنی بے پناہ تیاریوں کی ضرورت ہے۔ ایسا شخص یقیناً بہت سی ایسی چیزوں سے فائدہ اٹھانے سے محروم رہ جائے گا جو اس کے لیے شرعاً حلال تھیں۔ جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:-

لَا يَبْلُغُ الْعَبْدُ أَنْ يَكُوْنَ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ حَتّٰى يَدَعَ مَا لَا بَأْسَ بِهٖ حَذَرًا لِّمَا بِهٖ بَأْسٌ ۔ (ترمذی، ابن ماجہ)

کوئی شخص متقیوں میں شمار کیے جانے کے قابل نہیں ہو سکتا جب تک اس کا یہ حال نہ ہو جائے کہ وہ ان چیزوں کو چھوڑ دے جن میں کوئی حرج نہیں ہے ایسی چیزوں سے بچنے کی خاطر جن میں واقعتاً حرج ہے۔

اتّقا چھوڑنے،، کی دو صورتیں ہیں۔ ایک، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ ہوں۔ دوسرے، ایسی چیزوں کو چھوڑنا جو بذات خود مشتبہ نہ ہوں مگر ان کے متعلق یہ شبہ ہو کہ وہ آدمی کو غلط انجام تک پہنچا سکتی ہیں۔

پہلی صورت میں متعلقہ چیز کی حرمت کا یقین تو نہیں ہوتا مگر اس کی حلّت کے بارے میں بھی ذہن پوری طرح مطمئن نہیں ہوتا۔ اس لیے آدمی احتیاط کی بنا پر اسے ترک کر دیتا ہے۔ دوسری صورت میں متعلقہ چیز اصلا بالکل جائز ہوتی ہے مگر یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے نتائج پیدا کرے گی جو صحیح نہ ہوں۔ مثلاً دنیا کا عیش و آرام فی نفسہٖ بالکل جائز ہے۔ مگر ایک حساس مومن ان سے صرف اس لیے بچتا ہے کہ وہ ڈرتا ہے کہ اس میں پڑ کر اس کا نفس موٹا ہو جائے گا۔ اس کے درمیان اپنے آپکو پاکر وہ اور اس کے اہل خاندان غلط قسم کے احساس برتری میں مبتلا ہو جائیں گے، دنیا کی آسودہ زندگی "تہی دامنی" کا غلط احساس پیدا کرے گی اور اس طرح آخرت میں کامیابی حاصل کرنے کی فکر نفسیاتی طور پر مضمحل ہو جائے گی۔ اسی طرح مثلاً آپ کے لیے بالکل جائز ہے کہ اپنے گھر میں ریڈیو سٹ رکھیں۔ مگر جب آپ دیکھتے ہیں کہ ایک دیندار بزرگ کے یہاں ریڈیو سٹ کی موجودگی نے یہ صورت حال پیدا کر دی ہے کہ "ابا میاں" گھر کے اندر موجود ہوں تو قرآن کی قرأت اور خبروں کا پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ اور جہاں وہ گھر سے باہر نکلے فوراً صاحبزادے اور صاحبزادیاں فلمی گانے کا پروگرام کھول دیتے ہیں، حتیٰ کہ ابا میاں کا نماز کے لیے مسجد جانا گھر کے لوگوں کے لیے گانا سننے کا بہترین وقت بن جاتا ہے —— اس وقت آپ کی سمجھ میں آجاتا ہے کہ ریڈیو سٹ میں اگرچہ اصلاً کوئی "باس" نہیں۔ مگر موجودہ حالات میں اس کو اپنے یہاں رکھنے سے اس لیے پرہیز کرنا چاہیے کہ وہ آپکو ایک "باس" میں مبتلا کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

زہد فی الدنیا سے وہ انسان کیسے بنتا ہے جو ترقی کے اعلیٰ مراتب طے کر سکے، اس کے بہت سے پہلو ہیں، میں یہاں چند خاص پہلوؤں کا ذکر کروں گا۔

۱۔ زہد فی الدنیا سے جو چیزیں حاصل ہوتی ہیں ان میں پہلی چیز وہ ہے جس کو میں استغراق یا ذہنی یکسوئی کے لفظ سے تعبیر کروں گا۔ دنیا سے جتنا زیادہ آپ کا تعلق ہوگا اتنا ہی زیادہ آپ کے خیالات منتشر ہوں گے، اور یہ تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی آپ اپنے خیالات کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوں گے حقیقت ایک نہایت لطیف چیز ہے اس لیے اس کو گرفت کرنے کے لیے غیر معمولی ذہنی ارتکاز بہت ضروری ہے جس نے اپنی فکر کو مختلف سمتوں میں پھیلا رکھا ہو وہ ہرگز اعلیٰ حقائق کا ادراک نہیں کر سکتا۔ تاریخ سائنس کا عظیم ترین نام "نیوٹن" اپنے پیچھے جو عظمت رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا راز نیوٹن کا ذہنی استغراق تھا۔ وہ اپنے بچپن میں 'Wool-gatherer' کہا جاتا تھا یعنی کھویا ہوا شخص۔ لوگ اسے نیوٹن کا طبعی نقص سمجھتے تھے۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ اس کی کیفیت اس کی استغراقی صلاحیت کی وجہ سے تھی۔ وہ کسی

مسئلۂ خاص پر ذہن کو بالکل مرتکز کر کے سوچنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا تھا۔ اپنی اس خصوصیت کی وجہ سے وہ بہت جلد مسائل کی تہ تک پہنچ جاتا تھا۔ اور انتہائی پیچیدہ سوالات جن کے حل کرنے میں دوسرے لوگ مہینوں لگا دیتے تھے وہ انھیں گھنٹوں میں حل کر کے رکھ دیتا تھا۔

اگر آپ اس کے کمرے میں داخل ہوں تو آپ کے سامنے کتابوں اور کاغذات کی ایک بے ترتیب دنیا ہوگی جس میں کسی اہتمام کے بغیر ایک شخص اس طرح کھڑا یا بیٹھا ہوا نظر آئے گا جیسے وہ کوئی مجسمہ ہے جو کسی اسکیم کے بغیر اس ڈھیر میں لاکر ڈال دیا گیا ہے۔

مشہور سائنسداں اڈمنڈ ہیلی (Edmund Halley) جس کے نام پر ایک دمدار ستارہ ہیلی کامٹ (Halley Comet) کہا جاتا ہے۔ اس نے یہ دمدار ستارہ معلوم تو کر لیا تھا مگر اس کے مدار کا حساب لگانے میں وہ کوشش کے باوجود ناکام رہا۔ اس سلسلے میں مدد لینے کے لیے وہ نیوٹن کے پاس گیا۔ وہاں یہ سنکر اسے سخت حیرت ہوئی کہ لجھے ہوئے بالوں والا یہ آدمی اس کو پہلے ہی حل کر چکا ہے۔ اس نے اس کا حساب دیکھنا چاہا۔ مگر یہ نیوٹن کا کمرہ تھا۔ کوشش کے باوجود بکھرے ہوئے بے ترتیب انبار میں متعلقہ کاغذ برآمد نہ ہو سکا۔ نیوٹن نے فوراً ہی ایک سادہ کاغذ لیا اور اس انتہائی پیچیدہ ریاضیاتی سوال کو دوبارہ حل کر کے اسی وقت ہیلی کے سامنے رکھ دیا۔ ہیلی اس واقعہ سے بہت متاثر ہوا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ نیوٹن کی تصنیف (Principia) ابھی تک اس کے ڈسک کے ایک خانہ میں ردی کاغذات کی طرح بھری ہوئی رکھی ہے، تو اس نے کہا کہ ایسے قیمتی دماغ کے افکار اس طرح پڑے رہنے کے لیے نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے خرچ سے اس کو چھپوانے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح نیوٹن کی یہ کتاب پہلی بار دنیا کے سامنے آئی۔

نیوٹن صرف مادی دنیا کے کچھ حقائق جاننا چاہتا تھا، اس کے لیے اسے اس طرح مستغرق ہونا پڑا کہ وہ اپنا کھانا اپنا سونا، اپنا آرام، اپنا ذوق، اپنی عادتیں، سب بھول گیا۔ تو آپ جن غیر مادی حقائق کا تصور اپنے ذہن میں جمانا چاہتے ہیں، ان کو شدید ذہنی استغراق کے بغیر کس طرح پا سکتے ہیں۔ آسمان پر جو ستارے جگمگاتے ہوئے نظر آتے ہیں ان کی حرکت کے قوانین منضبط کرنے کے لیے نیوٹن کو افکار میں اتنا ڈوبنا پڑا گویا اس نے اپنے آپ کو دنیا سے اٹھا کر اسی خلا میں پہنچا دیا ہے جہاں یہ روشن اجسام حرکت کر رہے ہیں۔ پھر وہ حقیقتیں جو ستاروں سے بھی دور ہیں، جو ٹمٹماتی ہوئی شکل میں بھی آنکھوں کو نظر نہیں آتیں، ان کو بے پناہ ذہنی یکسوئی کے بغیر کیسے گرفت کیا جا سکتا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ اس طرح خدا کی عبادت کریں گویا کہ آپ اسے دیکھ رہے ہیں، اگر آپ چاہتے ہیں کہ قیامت اور جنت دوزخ کا تصور ہر وقت آپ کی نگاہوں کے سامنے رہے، اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ ایسے ہو جائیں کہ آپ جہاں ہوں اور جو کام بھی کر رہے ہوں۔ ہر حال میں آپ کا سینہ دوسروں کی کشش ... [illegible]

کو پھیلا دے اور آنکھوں کو اشک بار کر دے، تو یہ سب کچھ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ حدیث کے الفاظ میں "تشعب ہموم" کو ختم کر کے اپنی ساری نظریں صرف ایک نقطہ پر لگا دیں۔ ارجن کے مشہور واقعہ کی طرح آپ کو درخت اور چڑیا اور پتے اور پھل نظر نہ آئیں بلکہ صرف ایک چیز نظر آئے ــــــ "شکار کی بائیں آنکھ"

جب آپ یہ ذہنی گمشدگی اور یہ استغراق اپنے اندر پیدا کریں گے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی زندگی سے ترتیب اور باقاعدگی رخصت ہونے لگے گی، عادت اور ذوق کے تقاضے آپ کا ساتھ چھوڑنے پر مجبور ہوں گے، لذتوں اور آسائشوں کا خیال مدھم پڑ جائے گا۔ فکر کی زیادتی جسمانی تقاضوں پر غالب آنے لگے گی۔ آپ کا ہنسنا اور بولنا کم ہو جائے گا، تصوراتی دنیا کو پانے کی کوشش میں آپ مادی دنیا سے دور ہوتے ہوئے نظر آئیں گے۔ اس وقت ممکن ہے لوگ کہیں تم پاگل ہو گئے ہو۔ مگر اس سے گھبرائیے نہیں، کیونکہ یہی وہ صحیح ترین خطاب ہے۔ جو کسی بامقصد آدمی کو اہل دنیا کی طرف سے دیا جا سکتا ہے

۲۔ زھد فی الدنیا کے ذریعہ دوسری چیز جو حاصل ہوتی ہے وہ لطافت روح ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مادی دنیا میں آدمی جتنا زیادہ مشغول ہوگا۔ اس کی روح میں اسی قدر کثافت پیدا ہو گی۔ اور جتنا وہ اس سے اپنے آپ کو دور لے جائے گا اسی کے بقدر اس کی روح پاک اور خالص ہوتی چلی جائے گی۔ یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں رہبانیت کی تبلیغ کر رہا ہوں۔ رہبانیت دنیا سے اپنے آپ کو الگ کر لینے کا نام ہے حتی کہ اس مقصد سے اگر کوئی شخص خودکشی کر لے تو یہ بھی رہبانی فلسفہ کے مطابق جائز ہوگا۔ اس کے برعکس زھد یہ ہے کہ آدمی مکمل طور پر اسی دنیا میں ہو۔ مگر وہ اس سے بے رغبت ہو چکا ہو۔ وہ دنیا میں رہتے ہوئے ذہنی حیثیت سے اس سے باہر نکل جائے۔ مومن بھی یقیناً رہبان ہوتا ہے۔ مگر اس کی رہبانیت ذہنی رہبانیت ہے جبکہ دوسرے مذاہب جسمانی رہبانیت کا عقیدہ رکھتے ہیں۔

"اللہ تعالیٰ نے کسی کے سینے میں دو دل نہیں بنائے" اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے احساسات کسی ایک ہی چیز کے بارے میں شدید ہو سکتے ہیں۔ وہ دو سمتوں میں حرکت نہیں کر سکتے۔ اگر آپ دنیا اور اس کے ساز و سامان کو اہمیت دینے لگیں تو آخرت کا خیال آپ کے اندر کمزور پڑ جائے گا اور اگر آپ آخرت کی فکر میں مشغول ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کے بارے میں آپ پر غفلت طاری ہونے لگے گی جو شخص دنیوی قدروں کو اہمیت دیتا ہے، اس کا لازمی مطلب یہ ہے کہ وہ اُخروی قدروں کو پامال کر رہا ہے۔ آپ کو ایسے "خوش مذاق" ملیں گے جن کے کھانے کی پلیٹ میں مکھی پڑ جائے تو وہ اس کو کھانا پسند نہیں کریں گے۔ دوسری طرف ان کے اسلام میں کتنی ہی مکھیاں پڑی سڑ رہی ہوں گی۔ مگر اس کی عفونت کا انھیں اندازہ نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ دنیا کی طرف رغبت نے آدمی کی حسیات کو دنیا کے بارے میں تو بہت تیز کر دیا مگر اس کا دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ آخرت کے بارے میں اس کی حسیات کند ہو کر رہ گئیں۔

یہ دنیا جو آپ کے جسم کو موٹا کرتی ہے، یہ آپ کی روح کی قاتل ہے۔ اگر آپ اس کے اندر لذت ڈھونڈنے لگیں، اگر اس کے سطحی اور ظاہری ساز و سامان آپ کو اپنی طرف کھینچ لیں، تو وہ آپ سے آپ کا سب سے بڑا جوہر چھین لیں گے۔ اس کے بعد آپ کے نازک جذبات مردہ ہو جائیں گے، آپ کے اندر وہ لطیف احساسات ابھر نہیں سکتے جو اعلیٰ ترین حقائق کا ادراک کرتے ہیں، جن پر تجلیاتِ الٰہی کا نزول ہے جس کے بعد آدمی تمام حجابات سے بلند ہو کر حقیقت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ جس کے اندر دنیا سے بے رغبتی پیدا نہیں ہوئی۔ اس کے اندر گویا وہ صلاحیت ہی پیدا نہیں ہوئی جو کسی حقیقت کو سمجھے اور سے قبول کر سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسے دل میں حکمت کا "انبات" نہیں ہو سکتا۔ جس زمین میں اخذ کی صلاحیت نہ ہو وہ کیسے کسی بیج کو قبول کرے گی اور اس کے اندر ڈالا ہوا دانہ نشو و نما پا کر پورا درخت کیسے بن سکتا ہے۔ یاد رکھئے، حقیقت ایک غیر مادی چیز ہے۔ اس لیے وہ روح جو مادی آلائشوں میں پھنسی ہوئی ہو، وہ حقیقت کو بالکل بے نقاب حالت میں نہیں دیکھ سکتی۔ س کا مشاہدہ ہمیشہ دھندلا مشاہدہ ہوگا جس میں حقیقت کے بعض رخ دکھائی دیں گے اور بعض رخ نظروں سے اوجھل ہو جائیں گے۔

روح کی لطافت اور کثافت کوئی تصوف کا پراسرار مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ بالکل ایک سادہ سی حقیقت ہے جس کو ہر شخص معمولی غور و فکر سے سمجھ سکتا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ کا جو حسیاتی اور تصوراتی وجود ہے وہ کسی اور کی محبت ں اٹکا ہوا ہے یا اس نے اپنے آپ کو دوسری تمام چیزوں کی گرفت سے بالکل خالی کر دیا ہے تاکہ مالکِ حقیقی کی یاد آپ ں روح کو اپنا مسکن بنا سکے۔ گرمیوں میں اگر مسجد میں بجلی کا پنکھا چلایا جائے اور اس کی ہوا میں نماز ادا کی جائے تو ظاہر ہے کہ کوئی سے ناجائز نہیں کہہ سکتا۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ ایسی مسجدوں میں نماز کے لیے آنے والے پنکھے کے نیچے جگہ صل کرنے کے لیے مسابقت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نماز کے دوران میں اگر کرنٹ رکنے کی وجہ سے پنکھا بند ہو جائے تو سلام پھیرتے ہر شخص کی نظریں اوپر اٹھ جاتی ہیں اور نماز کے بعد پاور سپلائی کے انتظام کی خرابی وہ اہم ترین موضوع ہوتا ہے جس پر لوگ پنے جذبات اور اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ کی آرام طلبی نے آپ کی روح کو گندا کر دیا س میں گرمی اور سردی کے مسائل نے اپنے آشیانے بنائے۔ ظاہر ہے کہ ایسا آدمی وہ نماز نہیں پڑھ سکتا جو ساری لذتوں ے بڑھ کر لذیذ ہے۔ جس میں مشغول ہو کر آدمی گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتا ہے، جب ایسا محسوس ہوتا ہے گویا وہ اپنی دنیا ے نکل کر خدا کی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

ایک پڑھے لکھے اسلام پسند بزرگ ہیں جو ایک مصنف سے بے حد متاثر ہیں۔ میں نے اس مصنف کی ایک کتاب جس کا ایک بیان صریح طور پر قرآن کی تعلیمات سے ٹکراتا تھا۔ میں نے یہ حصہ ان بزرگ کو دکھایا اور اپنا تبصرہ عرض

کرنے کے بعد پوچھا کہ اس کے متعلق آپ کیا کہتے ہیں۔ یہ فرق اتنا کھلا ہوا تھا کہ مجھے یقین ہے کہ کسی بھی غیر جانبدار شخص کی اس کے بارے میں دو رائے نہیں ہو سکتی۔ مگر انھوں نے متعلقہ عبارت کو کئی بار پڑھنے کے بعد جو جواب دیا وہ یہ تھا۔ "میں اس کو بالکل ٹھیک سمجھتا ہوں، اس میں کوئی بات قرآن کے خلاف نہیں ہے۔" بخدا میں نے دیکھا کہ یہ الفاظ بولتے ہوئے ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا، صاف نظر آرہا تھا کہ ان کے اسلامی احساسات اس کو قبول کرنے سے صریح طور پر ابا کر رہے ہیں۔ مگر حق کو تسلیم کرنے میں صرف یہ چیز رکاوٹ بن گئی کہ انھوں نے ایک شخصیت کو بت بنا کر اپنے ذہن میں بٹھا لیا تھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس شخص کی کوئی بات غلط بھی ہو سکتی ہے۔ شخصیت پرستی نے ان کے ذہن کی تمام کھڑکیاں بند کر دی تھیں۔ پھر حق کی روشنی اس کے اندر گھستی تو کدھر سے گھستی۔

مجھ کو بار بار اس کا تجربہ ہوا کہ ایک شخص اپنے ذوق اور اپنی عادتوں کے معاملے میں تو نہایت حساس ہے۔ اپنے طبعی تقاضوں میں کمی کو وہ کسی حال میں برداشت نہیں کرتا۔ مگر ایسے معاملات جو خدا اور آخرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس کی دوامی زندگی کو بہتر یا بدتر بنانے والے ہیں ان میں وہ اکثر نہایت سنگین حقیقتوں کو اس طرح نظر انداز کر دیتا ہے گویا ان کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ اس کے سامنے آپ قرآن و حدیث کے صریح ارشادات پیش کیجئے۔ مگر وہ ایسے سرسری جوابات دے کر بات کو ٹال دے گا کہ آپ حیرت میں یہ سوچتے رہ جائیں گے کہ "میں دوبارہ ان کا کوئی جواب بھی دوں یا نہیں"، اس کی وجہ یہی ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دنیا سے اوپر اٹھا نہیں سکا۔ اس کے ایمان بالآخرۃ نے اس کی روح کو ابھی تک دنیا کی کثافتوں سے پاک نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی حسیات انھیں معاملات میں زیادہ کام کریں گی جہاں وہ عملاً پڑا ہوا ہے۔ مگر جس دنیا سے وہ دور ہے، جہاں اس نے ابھی تک اپنے آپ کو پہنچایا نہیں۔ اس کی حقیقتوں کو وہ کیسے گرفت کر سکتا ہے اور ان کے ذکر سے کس طرح اس کے اندر ہلچل برپا ہو سکتی ہے۔

اگر آپ چند آدمیوں کے ساتھ بیٹھے ہوں اور یکایک تار آئے کہ آپ کے اکلوتے لڑکے کا انتقال ہو گیا، تو دوسرے لوگ جیسے پہلے تھے ویسے ہی اب بھی رہیں گے مگر آپ تڑپ اٹھیں گے۔ آپ کی حالت بالکل بدل جائے گی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ جس شخص کے متعلق خبر آئی ہے اس کی خبر سننے کے لیے پہلے سے آپ کے دل کے تمام گوشے خالی تھے۔ اس لیے وہ سیدھی آپ کے دل میں گھس گئی۔ اس کے برعکس بقیہ لوگوں کے دل میں اس نے جانے کا راستہ نہیں پایا کیونکہ ان کے دل کچھ دوسرے لوگوں کی محبت سے بھرے ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جب قرآن کی "تلاوت" ہو رہی ہو، جب کلمات حکمت سنائے جا رہے ہوں، جب کوئی منادی کرنے والا ایمان کی منادی کر رہا ہو، تو اس کی آواز انھیں لوگوں کے دل سے ٹکرائے گی جنھوں نے اپنا سینہ اس کے لیے کھلا رکھا ہو۔ اور جس نے اپنے اندرون کو دوسری پرستشوں کا کوڑا خانہ بنا رکھا ہے

اس پر کوئی آواز اثر نہیں کر سکتی، وہ تو اسی وقت سنے گا جب صاعقۂ عظیم اس کے کان کے پردے پھاڑ دے۔

۳۔ زُھد کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ وہ آپ کے لوازم زندگی میں کمی کر دیتا ہے۔ ہر بامقصد آدمی فطرۃً ایک تضاد میں مبتلا کیا گیا ہے۔ ایک طرف اس کے جسم کے تقاضے ہیں جن کی فہرست کا کوئی شمار نہیں۔ اور دوسری طرف اس کا مقصد ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ ساری توجہ اسی کی طرف لگا دی جائے۔ اس تضاد کو ہم بالکلیہ ختم نہیں کر سکتے۔ ہماری بہترین عقلمندی یہ ہے کہ ہم اس میں کمی کی کوشش کریں۔ دنیا کے تمام وہ لوگ جنھوں نے کوئی بڑا کام انجام دیا ہے، وہ اپنے مشن کی تکمیل کے لیے مجبور تھے کہ اپنے لوازم حیات میں ہر ممکن حد تک کمی کریں۔ آپ کے سامنے بھی ایک عظیم مشن ——— دنیا کے سامنے حق کی گواہی دینے کا مشن، ہے۔ اس لیے اگر آپ اسے تکمیل تک پہنچانا چاہتے ہیں تو آپ کو بھی اسی اصول پر عمل کرنا ہوگا۔ البتہ اس میں اسلام کے اپنے نظریۂ زندگی کا لحاظ ضروری ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح شادی نہ کریں مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ آپ نیوٹن کی طرح سگریٹ نہ پئیں کیونکہ شادی ایک حقیقی ضرورت ہے۔ جبکہ تمباکو، انسان کی فطری ضرورتوں پر ایک مصنوعی ضرورت کا اضافہ ہے۔

لوازم حیات میں کمی کا یہ پہلو تو بالکل واضح ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقصد میں زیادہ حصہ لینے کے قابل بناتا ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ کی دیگر ضروریات کی فہرست جتنی مختصر ہوگی اسی کے بقدر آپ اپنے مقصد کے کاموں کے لیے زیادہ فارغ ہوسکیں گے خلا کا ایک مسافر راکٹ میں بیٹھ کر تین سو میل فی منٹ کی رفتار سے اڑتا ہے۔ مگر اس سفر میں جن بھاری ملبوسات اور مختلف قسم کے آلات سے وہ ملبس ہوتا ہے، ان کو اپنے جسم پر لادے ہوئے زمین پر پیدل چلنا ہو تو وہ چند میل بھی مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ کر لے جا سکے گا۔ اسی طرح اگر آپ نے اپنی زندگی کو حقیقی ضروریات کے ماسوا اور بہت سی ضرورتوں کا عادی بنا لیا ہے تو ان کو لیے ہوئے آپ زمین پر نہیں چل سکتے۔ جب تک یہ لوازم آپ کے گرد مہیا ہوں آپ متحرک نظر آئیں گے مگر جہاں یہ لوازم رخصت ہوئے آپ اسی طرح اپنے آپ کو بے بس محسوس کریں گے جیسے مغلیہ سلطنت کے آخری شہزادے پالکی کی سواری کا عادی ہونے کی وجہ سے غدر کے وقت بھاگ نہیں سکے اور ان کے دشمنوں نے محل میں گھس کر ان کے بستروں پر انھیں قتل کیا۔

مگر لوازم حیات کو مختصر کرنے کا ایک اور فائدہ ہے جو اسلامی اعتبار سے اس سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ یہ کہ اس طرح کے لوازم میں جتنی کمی ہوگی اسی کے بقدر آپ کے اندر زیادہ سوز اور اخلاص پیدا ہوگا۔ اگر آپ کو پانچ سو میل دور سے آکر یہاں تقریر کرنی ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے لئے سکنڈ کلاس میں برتھ رزرو کر کے سفر کرنا ضروری ہے تاکہ جب میں سٹیشن پر اتروں تو بالکل تازہ دم رہوں اور جلسہ گاہ پہنچ کر اپنے موضوع پر اچھی طرح بول سکوں بے شک آپ کے

لیے ایسا کرنا جائز ہے۔ کسی کو جرأت نہیں کہ اس کے خلاف فتوی دے سکے۔ بلکہ بہت سے ظاہر بینوں کو آپ کا زور خطابت اس دلیل کی معقولیت ماننے پر یہاں تک مجبور کر سکتا ہے کہ وہ آپ کے لیے مخصوص برتھ میں سفر کرنا ہی افضل سمجھنے لگیں کیونکہ اس کے بغیر اتنی شاندار تقریر وجود میں نہیں آسکتی تھی۔ مگر میں کہوں گا کہ خدا کو شاندار تقریر مطلوب نہیں ہے۔ اس کو تو آپ کے دل کے ٹکڑے درکار ہیں۔ اور وہ تقریر جس میں آپ کے دل کے ٹکڑے الفاظ بن کر نکلیں، جو دوسروں کو متاثر کرنے سے پہلے خود آپ کو رلا دے، جو تقریر نہ ہو بلکہ درد اور تڑپ کا ایک مجسم اظہار ہو۔ وہ تو اسی وقت ممکن ہے جب آپ تھرڈ کلاس کی بے آرامی گزر کر یہاں پہنچے ہوں،[1] جس میں یہاں تک اپنے آپ کو لانے میں آپ نے مشقت اٹھائی ہو، جو آپ کے لیے محض سفر نہ ہو بلکہ خدا کی طرف بڑھنے کا ایک مجاہدہ ہو۔ ایسی ہی ایک زبان سے کلمات درد نکل سکتے ہیں۔ دردمند کلام، خدا کا ایک الہام ہے جو براہ راست عالم الغیب والشہادۃ کی طرف سے آپ کے اوپر القا کیا جاتا ہے۔ اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کا الہام ایک "قول ثقیل" ہے جو کسی ایسے قلب ہی پر اتر سکتا ہے جو "وطا شدید" کے مرحلے سے گزر چکا ہو (سورۂ مزمل)

امام احمد اور امام ترمذی کی روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک بار اپنے رسول کو سونے کی عظیم ترین کان دینے کی پیش کش کی، رسول نے جواب دیا، خدایا نہیں، بلکہ مجھے اس طرح رکھئے کہ کسی روز کھاؤں اور کسی روز بھوکا رہوں۔ تاکہ جب میں کھاؤں تو آپ کا شکر ادا کروں اور جب بھوک ستائے تو آپ کے سامنے گریہ وزاری کروں۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدمی حالات کے بغیر اپنے اندر کیفیات پیدا نہیں کر سکتا۔ جو حالات سے خالی ہو جائے، یقیناً وہ کیفیات سے بھی خالی ہو جائے گا حقیقت یہ ہے کہ سختی اور مشقت کے لمحات اپنے اندر دوطرفہ فائدہ رکھتے ہیں۔ ایک طرف ان سے وہ "درد" حاصل ہوتا ہے جو دل کی زندگی ہے، جو آپ کو احساس حیات سے آشنا کرتا ہے، جو انسان کی اندرونی صلاحیتوں کو بیدار کرنے والا ہے۔ دوسری طرف مشقت کے لمحات ہی آپ کی راحت کے لمحات کو اسلامی رنگ دیتے ہیں۔ وہ آدمی کو اس قابل بناتے ہیں کہ جب وہ ایسی کوئی چیز دیکھے تو اس کا دل شکر کے جذبہ سے لبریز ہو جائے۔ جو درد سے خالی ہے وہ زندگی سے خالی ہے، اور جو زندگی سے محروم ہو وہ کیسے کوئی بات سنے گا اور کیسے کوئی بات قبول کرے گا۔

۴۔ زھد فی الدنیا کا ایک اور پہلو ہے۔ وہ یہ کہ ایسا آدمی حرام اور مشتبہ چیزوں میں پڑنے سے محفوظ ہو جاتا ہے

---

[1] جو سفر مخصوص اہتمام کے بغیر شروع کیا گیا ہو وہ لازماً "بے آرامی" کا سفر نہیں ہوتا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آسانیاں فراہم کر دے۔ ایسی آسانی خود ایک نعمت ہے کیونکہ آدمی اسکو اللہ تعالیٰ کا فضل سمجھتا ہے۔ اس کو پا کر مومن کے دل میں شکر کے جذبات ابل پڑتے ہیں ایسے مسافر کی نفسیات اس سے بالکل مختلف ہوتی ہیں جس نے پہلے سے مخصوص اہتمام کر کے آسان سفر حاصل کیا ہو۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ناجائز چیزوں کے ارتکاب سے وہی شخص بچ سکتا ہے جو جائز حدود میں بھی بچ کر چلتا ہے۔ جو تمام "جائز" چیزوں کو اپنا ضروری حق سمجھ لے، ایسے آدمی کے لیے ہر وقت خطرہ ہے کہ وہ کسی حرام کام میں پڑ جائے۔ حدیث کے الفاظ میں ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور خدا کی چراگاہ اس کے محارم ہیں جو شخص سرحد تک اپنے مویشی چراتا ہوا پہنچ جائے اس کیلئے ہر آن یہ خطرہ ہے کہ مویشی کہیں چراگاہ کے اندر نہ گھس جائیں۔ (متفق علیہ)

عورتوں کے لیے زیب و زینت بالکل جائز ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ ہر وہ گھر جس نے اس جواز کو اپنے لئے کھلا دروازہ سمجھ لیا ہے، آج اس کے یہاں باریک کپڑے اور غیر ساتر ملبوسات اسطرح استعمال ہونے لگے ہیں کہ اب لوگوں کو شاید ان کے ممنوع ہونے کا بھی احساس نہیں رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کل کے بے دین گھرانے اور اسلام پسند گھرانے میں بس اتنا ہی فرق رہ گیا ہے کہ ہمارے گھروں کی عورتیں اور لڑکیاں خاندان اور رشتہ کے لوگوں اور دوسرے متعلقین کے سامنے اپنی غیر شرعی پوشاک کا مظاہرہ کرتی ہیں اور دوسرے گھرانوں کی عورتیں اپنے اس فتنہ کو لیے ہوئے بازاروں اور سڑکوں پر نکل آئی ہیں۔

آپ کسی سے کہیں کہ سادہ زندگی گزارو اور دنیا کی نعمتوں کی حرص نہ کرو۔ وہ فوراً جواب دے گا کہ تم ان نعمتوں کو حرام کرنے والے کون ہو، جبکہ خدا نے اسے حلال ٹھہرایا ہے۔ میں تو اسے حاصل کروں گا۔ مگر آپ دیکھئے کہ ان "جائز نعمتوں" کی اسے قیمت کیا دینی پڑتی ہے۔ اپنے بچوں کو وہ کالجوں میں تعلیم دلاتا ہے۔ جو بے دینی اور آوارگی کے گڑھ ہیں۔ محض اس لیے کہ ان کا معاشی مستقبل بہتر ہو سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ بچے دینی عمل اور دینی معلومات سے بالکل بے بہرہ ہو رہے ہیں حتیٰ کہ پانچ وقت کی نماز جس کو بین العبد وبین الکفر ترک الصلوٰۃ کہا گیا ہے، اس سے بھی ان کی زندگیاں خالی ہو رہی ہیں۔ بہت سے لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ عملاً تو اپنے بچوں کو انھیں الحادخانوں میں بھیجتے ہیں مگر اسی کے ساتھ وہ انھیں نماز روزہ کی تلقین بھی کرتے رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انھوں نے قوا انفسکم واھلیکم نارا کے حکم کی تعمیل کر دی۔ مگر یہ صرف ایک دھوکا ہے۔ ایسی ہر کوشش صرف اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش ہے نہ کہ اصلاح کی کوشش۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو پانی میں دھکیل دیا جائے اور اس کے بعد کہا جائے ——
"دیکھو بھیگنا مت!"

اسی طرح سرکاری ملازمتوں میں جو لوگ ترقی کرتے ہیں یا بڑے عہدے حاصل کرتے ہیں وہ ضمیر کی قربانی دیکر ہی ان مناصب تک پہنچتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں کسی اونچی کرسی کو اپنی نشست گاہ بنانے کے لیے جو لیاقت درکار ہے اس میں سے ایک ضروری چیز یہ بھی ہے کہ دین کو آپ اپنے اندر سے کھرچ کر نکال دیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے

بادشاہوں سے تعلق رکھنے والوں کے بارے میں کہا تھا،، اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تم ان کی دنیا میں سے جتنا پاؤ گے اس سے زیادہ وہ تمہارے دین میں سے لے لیں گے،، یہ بات جدید بادشاہت کے بارہ میں بھی اسی طرح صحیح ہے جیسے وہ قدیم بادشاہت کے بارے میں صحیح تھی۔ اس فرق کے ساتھ کہ پہلے وہ دین کا زیادہ حصہ لیتے تھے اور اب وہ آپ کا کل دین لے لیتے ہیں۔

ایک بڑے تاجر نے ایک مرتبہ کہا کہ موجودہ زمانے میں بالکل جائز طریقہ پر کوئی بڑا کاروبار نہیں کیا جاسکتا جہاں آپ کی آمدنی ایک خاص حد سے آگے بڑھی، بے شمار قوانین آپ کو چاروں طرف سے گھیر لیتے ہیں۔ آپ مجبور ہوتے ہیں کہ غلط طریقہ سے کام کریں۔ ورنہ آپ کوئی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے،، اتنے بڑے کاروبار کا آپ کو مکلف کس نے کیا ہے" جواب دینے والے نے جواب دیا۔ مگر موجودہ انسان کو اس قسم کے جوابات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس نے تو یہ طے کر رکھا ہے کہ وہ اپنے امکان بھر ان تمام نعمتوں کو حاصل کرے گا جو خدا نے زمین پر پیدا کی ہیں۔ اس لیے یہ بھی ضروری ہوگیا ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کو اپنے لیے حلال کرلے جس کو خدا نے حرام ٹھیرایا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ترقی کا ہر واقعہ جو آپ کو اپنے گرد و پیش نظر آتا ہے، وہ صرف حکمتِ زہد سے محرومی کا ثبوت نہیں ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی بڑھتے بڑھتے خدا کی حرام کی ہوئی چراگاہ میں گھس گیا ہے اس کے بغیر وہ اتنی غیر معمولی فربہی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

ممکن ہے یہ باتیں سن کر آپ کہیں کہ اسلام کا مطلب اگر یہی ہے تو اسکا پانا بہت مشکل ہے۔ بیشک اسلام کا پانا بہت مشکل ہے مگر وہ خدا کی مدد سے آسان ہو سکتا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے جب روحِ دین کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے نکل جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہی میں داخل ہو،، تو ان کے شاگرد یہ سن کر بہت اچنبھے میں پڑ گئے اور کہنے لگے کہ پھر کون نجات پاسکتا ہے۔ آپ نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا —— "یہ آدمیوں سے تو نہیں ہو سکتا لیکن خدا سے سب کچھ ہو سکتا ہے،، اگر آپ اسلام کو اپنی زندگی میں شامل کرنا چاہتے ہیں، اگر آپ وہ حیاتِ طیبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں جو دنیا کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے تو اس کو پانے کی صورت یہی ہے کہ آپ اسے خدا سے مانگیں۔ دوسری تمام چیزوں کی طرح یہ سب سے قیمتی چیز بھی آپ کو خدا ہی سے ملے گی۔ کہیں اور سے آپ اسے حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یاد رکھئے خدا سے مانگنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ دعا کے کچھ مقرر الفاظ یاد کرلیں اور اسے اپنی زبان سے دہرا دیا کریں۔ ایک عیسائی عالم کے الفاظ میں:-

God is not a Cosmic bell-boy for whom we can press a button to get things.

خدا سے مانگنے کی اصل زبان وہ نہیں جو لفظوں کی صورت میں اپنے مطالبات کا اظہار کرتی ہے۔ اس سے مانگنے کی زبان آپ کا قلب ہے آپ اپنی حقیقی زندگی سے جو کچھ چاہ رہے ہیں وہی در اصل آپ اپنے رب سے مانگتے ہیں خدا آپ کے لفظوں کو نہیں دیکھتا۔ وہ خود آپ کو دیکھتا ہے۔ آپ اپنے اصل وجود میں جس چیز کے لیے بے قرار ہوں، اپنے رب سے آپ اسی چیز کے طلبگار ہیں۔ اگر ایک بچہ اپنی ماں سے روٹی مانگے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ ماں اس کے ہاتھ میں انگارہ رکھ دے۔ خدا اپنے بندوں پر اس سے زیادہ مہربان ہے۔ یہ ہرگز ممکن نہیں ہے کہ آپ خدا سے خشیت مانگیں اور وہ آپ کو قساوت دیدے، آپ خدا کی یاد مانگیں اور وہ آپ کو نسیان میں مبتلا کردے، آپ آخرت کی تڑپ مانگیں اور وہ آپ کو دنیا کی محبت میں ڈال دے، آپ کیفیت سے بھری ہوئی دینداری مانگیں اور وہ آپ کو بے روح دینداری میں پڑا رہنے دے۔ آپ حق پرستی مانگیں اور وہ آپ کو شخصیت پرستی کی تاریک کوٹھری میں بند کر دے۔ آپکی زندگی میں آپ کی مطلوب چیز کا نہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے ابھی تک اس کو مانگا ہی نہیں۔ اگر آپ کو دودھ خریدنا ہو اور آپ چھلنی لے کر بازار جائیں تو ظاہر ہے کہ پیسے خرچ کرنے کے باوجود آپ خالی ہاتھ واپس لوٹیں گے۔ اسی طرح اگر زبان سے آپ دعا کے کلمات دہرا رہے ہوں مگر آپ کی اصل ہستی کسی اور طرف متوجہ ہو تو میں کہوں گا کہ نہ آپ نے مانگا تھا اور نہ آپکو ملا۔ جو مانگے وہ کبھی محروم نہیں رہ سکتا۔ یاد رکھئے، یہ مالکِ کائنات کی غیرت کے خلاف ہے کہ وہ کسی بندے کو اس حال میں رہنے دے کہ قیامت میں جب خدا سے اس کا سامنا ہو تو وہ اپنے رب کو حسرت کی نظر سے دیکھے۔ وہ کہے کہ خدایا میں نے تجھ سے ایک چیز مانگی تھی مگر تو نے مجھے نہ دی بخدا ایسا ممکن ہے، یہ ناممکن ہے، یہ ناممکن ہے۔ کائنات کا مالک تو ہر صبح وشام اپنے سارے خزانے کے ساتھ آپ کے قریب ترین آکر آواز دیتا ہے۔ "کون ہے جو مجھ سے مانگے تاکہ میں اسے دوں"، مگر جنھیں لینا ہے وہ سو رہے ہوں تو اس میں دینے والے کا کیا قصور۔

خدا کی ذات

(مولانا سید جلال الدین عمری)

رسولوں کے تصورِ خدا کو سمجھنے کے لیے ان سوالات کو پہلے متعین کرنا ہوگا، جو خدا کے بارے میں پیدا ہوتے ہیں
یہ سوالات تین ہو سکتے ہیں :-

(۱) کیا خدا ہے؟ یعنی ہماری کائنات کا کوئی خالق ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو اس کے وجود کی حقیقت کیا ہے؟ اس سوال کو حل کیے بغیر خدا کے بارے میں غور و فکر کو ہم آگے نہیں بڑھا سکتے۔

(۲) خدا کی صفات کیا ہیں؟ انسان صفات ہی کی مدد سے اشیاء کا علم حاصل کرتا ہے، اس لیے جب تک خدا کی صفات کا ٹھیک ٹھیک تعین نہ ہو خدا کو سمجھنا ممکن نہیں۔

(۳) خدا کا عمل کیا ہے؟ کائنات کے لیے خدا ایک مؤثر عامل کی حیثیت رکھتا ہے تو یہ جاننا ضروری ہے کہ کائنات میں اس کا عمل کیا ہے؟ اور وہ کس قسم کا معاملہ کر رہا ہے؟ اگر یہ جاننے میں ہم ناکام رہے تو کائنات اور خدا کے تعلق کو نہیں سمجھ سکتے [1]

آیئے اب ہم ان سوالات پر ذرا تفصیل سے غور کریں :-

---

[1] ہمارے متکلمین نے خدا کے بارے میں ان ہی تین پہلوؤں سے بحث کی ہے۔ اشاعرہ محدثین کے مسلک کے ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ امام غزالیؒ کا تعلق اسی گروہ سے ہے۔ امام صاحب نے اپنی بہت سی کتابوں میں اشاعرہ کا مسلک بیان کیا ہے لیکن ان کی تین کتابوں میں اس موضوع پر مستقل بحثیں ہیں (۱) احیاء علوم الدین جلد اول (۲) الرسالۃ القدسیہ (۳) الاقتصاد فی الاعتقاد۔ انہی دوسری کتاب کی متعلقہ بحث انھوں نے احیاء علوم الدین میں بھی نقل کی ہے۔ احیاء علوم عام لوگوں کے لیے ہے۔ اوسط درجہ کا طبقہ الرسالۃ القدسیہ کا مخاطب ہے اور الاقتصاد فی الاعتقاد کا انداز زیادہ تر علمی ہے۔ امام غزالیؒ سے پہلے ان مسائل پر جو بحثیں ہوتی رہی ہیں، امام صاحب نے ان کو اپنی کتابوں میں سمیٹ لیا ہے اور اس کو زیادہ سے زیادہ علمی رنگ میں پیش کیا ہے۔ اشاعرہ کی نمائندگی کرنے والی بعد کی تحریروں میں اس پر بہت کم اضافہ ہوا ہے، عموماً ان ہی خیالات کو دہرا دیا گیا ہے۔

خدا کا وجود خدا ہے یا نہیں، خدا کے بارے میں غور و فکر کے سلسلے کا سب سے پہلا اور بنیادی سوال ہے۔ یہ محض کوئی فلسفیانہ سوال نہیں ہے بلکہ اس کا ہماری زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس سوال کی بنیاد پر ہماری زندگی کی تعمیر ہوتی ہے۔ اگر خدا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اتفاق سے اس دنیا میں نہیں پہنچ گئے بلکہ ہمیں کسی پیدا کرنے والے نے پیدا کیا ہے۔ ہم آپ اپنے مالک بھی نہیں ہے بلکہ اس کی ملک بن گئے جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ ہم اس کائنات میں من مانی کارروائی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم آزاد نہیں ہیں بلکہ اس کے حکم کے تابع ہیں جو ہمارا خالق ہے۔ اگر خدا نہیں ہے تو ہم اپنی زندگی کے آپ مالک ہیں۔ ہماری کسی روش کے بارے میں کوئی شخص ہم سے سوال نہیں کر سکتا۔ اس لیے دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سوال کا صحیح حل تلاش کیا جائے۔ تاکہ ہم پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اپنے لیے کوئی راہ متعین کر سکیں۔ جو شخص اس سوال سے اعراض کرتا ہے وہ اپنے لیے ایک بہت بڑا خطرہ مول لیتا ہے اگر خدا ہے اور اس نے وہ روش اختیار کی جو مخلوق کو زیب نہیں دیتی تو وہ بہت بڑا مجرم ہے عقل کہتی ہے کہ ایسے مجرم کو لازماً اس کے جرم کی سزا ملنی چاہیے۔ خدا کے رسول اسی سوال پر انسانیت کو چونکاتے ہیں۔ خدا کے وجود کا امکان اس بات کا الارم ہے کہ انسان کو خدا کے بارے میں جلد از جلد کسی فیصلہ پر پہنچنا چاہیے۔ جو شخص اس الارم کو سننے کے باوجود اپنی غفلت سے نہیں جاگتا وہ بہت بڑا نادان ہے۔ کیونکہ اس کو اپنے انجام کی فکر نہیں ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ — اے پیغمبر! ان سے کہہ دیں تو محض ڈرانیوالا ہوں

اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ رَبُّ السَّمٰوٰتِ — اللہ کے سوا کوئی دوسرا معبود نہیں ہے۔ وہ اکیلا ہے اور بڑے

وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ — غضب والا ہے وہ آسمانوں اور زمین اور جو کچھ ان کے درمیان

الْغَفَّارُ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ — ہے سب کا رب ہے وہ غالب اور مغفرت کرنے والا ہے

اَنْتُمْ عَنْهُ مُعْرِضُوْنَ ۝ — کہہ دو کہ وہ بہت بڑی خبر ہے اور تم ہو کہ اس سے اعراض کر رہے ہو۔

(ص ۶۸-۶۵)

خدا کے وجود و عدم وجود کا سوال اسی وقت ختم ہو سکتا ہے جب کہ ہم اس کائنات کو ایک فرضی اور موہوم شے قرار دے دیں لیکن اگر اس کائنات کی کوئی حقیقت ہے تو یہ سوال ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہر وقت ہم سے اپنا جواب چاہے گا۔ کائنات کو ایک امر واقعہ کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے ہم اس سوال کو کبھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جن لوگوں نے اس سوال سے بھاگنے کی کوشش کی انھوں نے اس کائنات کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ دورِ قدیم اور عہدِ جدید دونوں میں آپ کو ایسے فلسفی ملیں گے جن کے نزدیک کائنات محض وہم اور خیال کا کرشمہ ہے۔ اس کا کوئی ٹھوس اور واقعاتی وجود نہیں ہے۔ ایک سائنس داں

"اس نقطۂ نظر کے مطابق گویا صورت حال یہ ہے کہ خیالی گاڑیاں جو بظاہر فرضی مسافروں سے لدی ہوئی ہیں، غیر حقیقی دریاؤں کے تصورات کے ساختہ و پرداختہ پلوں کے ذریعہ عبور کر رہی ہیں"

جو لوگ کائنات کو محض خیال سمجھتے ہیں ان کو کم از کم خیال کے وجود سے انکار نہیں کرنا چاہیے کیونکہ کوئی تو چیز ہے جسے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارا "خیال" خیال اور حقیقت میں فرق کرتا ہے۔ اس کے نزدیک تصور کی دنیا اور واقعات کی دنیا الگ الگ وجود رکھتی ہیں۔ انسان خواب میں جو معاملہ کرتا ہے وہی معاملہ بیداری میں بسا اوقات مناسب نہیں سمجھتا۔ ذہنی دنیا اشیاء کے حدود سے آزاد ہوتی ہے لیکن ذہن سے باہر کی دنیا میں ہر چیز حدود سے گھری ہوئی ہے۔ آخر یہ فرق کہاں سے آیا؟ آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی ایک خیال ہے۔ ذہن اور خارج میں فرق و امتیاز اور اشیاء کی حدبندی بھی ہمارے خیال ہی کی پیداوار ہے لیکن جب یہاں اول و آخر خیال ہی خیال ہے تو حقیقت اور ٹھوس وجود کا خیال کہاں سے آگیا؟

ہم حقیقت کا صرف خیال ہی نہیں کرتے بلکہ ٹھوس حقیقتیں ہی ہم کو مطمئن بھی کرتی ہیں۔ خیال کے پردے پر ایسے واقعات رونما ہوتے رہتے ہیں جن کو ہم ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں لیکن خارج میں ہونے والے واقعات کے ساتھ ہمارا یہ معاملہ نہیں ہوتا بلکہ ہم ان کو ایک حقیقت کے طور پر قبول کرتے ہیں۔ بعض اوقات ایک خیال ہمارے ذہن میں اس قدر شدت اختیار کر جاتا ہے کہ ہم خارج کو اس کے خلاف دیکھنا نہیں چاہتے لیکن اس کے باوجود ہم یہ دھوکا کھانے کے لیے تیار نہیں ہوتے کہ خارج اگر ہمارے خیال کے برعکس ہے تو ہم اس کو اس کے مطابق سمجھ لیں۔ ذہنی طور پر کسی واقعہ نے ہم کو کتنا ہی متاثر کیوں نہ کیا ہو، اگر خارج میں اس کا وجود نہیں ہے تو اس تاثر کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ وہی خیال ہمیں مطمئن کرتا ہے جس کے بارے میں ہمیں یقین ہوتا ہے کہ خارج کی دنیا اس سے ہم آہنگ ہے۔ ہمارے ذہن میں ابھی یہ خیال آجائے کہ ہمارے مکان میں آگ لگ گئی ہے تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی اگر ذہن سے باہر یہ واقعہ رونما نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح ہم اپنے کسی دوست سے ملاقات کرنا چاہیں اور ذہن میں اس کے پاس پہنچ جائیں اور جو کچھ کہنا سننا ہے کہہ سن لیں تو کبھی ملاقات کا مقصد نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ خارج کی دنیا میں یہ عمل انجام دیا جائے۔ یہ کائنات محض فریب نظر ہے تو عمل کی ساری دنیا اس کے فریب ہونے کو جھٹلا رہی ہے۔ زندگی کا ہر قدم اس یقین کی بنیاد پر اٹھتا ہے کہ اس کائنات کے کچھ اصول ہیں اور وہ اپنا ایک ٹھوس وجود رکھتی ہے۔ کائنات فریب اور خیال ہے اور اعتبار کے قابل نہیں ہے تو یہ کتنی بڑی [illegible]

ہے کہ انسان کائنات کو واتفاقی کائنات مان کر کام کر رہا ہے۔ جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ انسان کے عقل و شعور پر بہت بڑا الزام لگاتے ہیں۔

انسان کا یہ احساس کہ کائنات محض خیال نہیں ہے بلکہ اس کی ایک خارجی حقیقت ہے بجائے خود اس کائنات کے حقیقت ہونے کی زبردست دلیل ہے۔ جب ہم خیال کو مانتے ہیں تو جو چیز خیال کے نزدیک ثابت ہے اس کو بھی ماننا چاہیے۔ اگر یہ سب کچھ خیال ہی ہے تو ایک ایسا خیال ہے جس کو خیال ماننے پر ہمارا ذہن تیار نہیں ہے۔ لیکن جب ہم اس کو واقعہ قرار دیتے ہیں تو ذہن پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ یہ اس بات کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ کائنات اپنا ایک واقعاتی وجود رکھتی ہے۔ حقیقت وہی ہے جس سے انسان کا ذہن پوری طرح مطمئن ہو جائے اور اس کے خلاف کوئی دوسری صورت اطمینان کی باقی نہ رہے۔

قرآن کے نزدیک کائنات ایک ٹھوس واقعہ ہے لیکن یہ واقعہ از خود وجود میں نہیں آیا بلکہ اس کے پیچھے زبردست ارادہ کام کر رہا ہے۔ یہ ایک عظیم تخلیقی منصوبہ ہے جو اپنے منصوبہ ساز کے ارادے اور فیصلہ کے تحت وجود میں آیا ہے اس پہلو سے کائنات کی ابتدا اور اصل اس کے خالق کا ارادہ ہے۔ وہ اپنے وجود سے پہلے ایک خیال تھی اور اپنے وجود کے بعد اس خیال کا ایک واقعاتی ظہور ہے۔ اس لیے خارجی حقائق کا انکار نہیں کیا جا سکتا جس طرح ہمارے اعمال کی اصل ہمارا خیال اور ارادہ ہے لیکن جب وہ عمل کی شکل اختیار کرتا ہے تو اس کا ظہور ہم خارج میں دیکھتے ہیں، ٹھیک اسی طرح کائنات کے بارے میں خدا کا ارادہ عمل میں آیا تو وہ ایک واقعہ بن کر نمودار ہوئی۔

قرآن مجید میں یہ بات کئی ایک مقامات پر کہی گئی ہے۔ یہاں ایک آیت درج کی جاتی ہے۔

بَدِيعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُولُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (البقرہ ۱۱۷)	وہ آسمانوں اور زمین کا خالق و موجد ہے اور جب وہ کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے تو اس سے کہتا ہے کہ ہو جا اور بس وہ ہو جاتی ہے

اس آیت میں دو باتیں کہی گئی ہیں ایک خدا کا ارادہ پھر اس ارادہ کے مطابق خارج میں واقعہ کا وجود۔ انسان کی تخلیق کے سلسلہ میں اس حقیقت کو اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ انسان بے وجود تھا۔ خدا نے اس کو ایک تخلیقی وجود عطا کیا۔ اَوَلَا يَذْكُرُ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ط مریم ۶۷۔ (انسان قیامت کا انکار کرتا ہے کیا اس کو یہ بات یاد نہیں کہ وہ اس سے پہلے کچھ نہیں تھا ہم نے اس کو پیدا کیا) انسان کو "بشر" کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی ظاہر اور نمایاں ہونے کے ہیں۔ یہی ظہور ہے جسے ہم ایک خاص پیکر میں دیکھتے ہیں۔ وَلَقَدْ خَلَقْنٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنٰكُمْ الاعراف ۱۱ (ہم نے تم کو پیدا کیا اور تمہیں صورت عطا کی) اَلَّذِیْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ فِیْۤ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ط الانفطار ۸ (اللہ ہی ہے جس نے تجھے پیدا کیا اور تیرا تسویہ کیا اور

جب شکل کے بعد جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا) ان آیات میں قرآن نے انسان کے لیے ایک خارجی شکل و صورت کو دعوی کیا ہے۔

انسان اشیاء کی حقیقتوں کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ ان کی صرف ظاہری شکل و صورت کو دیکھتا ہے۔ اسی سے وہ ان کا تعین کرتا اور ان کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اس کو نہیں معلوم کہ لوہے اور لکڑی کی حقیقت کیا ہے البتہ وہ ان کی ظاہری شکلوں سے واقف ہے۔ ان ہی ظاہری شکلوں کے لحاظ سے وہ اپنے لیے ان کی قدر و قیمت کا فیصلہ کرتا ہے۔ ان کے مفید پہلوؤں سے فائدہ اٹھاتا اور مضر پہلوؤں سے بچتا ہے لکڑی کو اس کی ظاہری شکل کے لحاظ سے اس قابل پایا کہ اس سے میز اور کرسی بنائی جا سکے تو اس مقصد کے لیے اس کو استعمال کرنا شروع کیا۔ لوہے کو بڑی بڑی مشینوں کے لیے مناسب پایا تو اس سے مشین بنانے لگا۔ جو جانور سواری کے قابل تھے ان سے وہ سواری کا کام لینے لگا اور جو اس مقصد کے لیے بے کار تھے اگر اُن سے غذائی فائدہ حاصل کر سکتا تھا تو ان کو اپنی غذا میں شامل کر لیا۔ سوال یہ ہے کہ ہر شئی کو ایک خاص ہیئت اور خاص شکل و صورت کہاں سے مل گئی۔ کس نے گھوڑے کو یہ شکل دی کہ تم اس کی سواری کر سکو؟ کہاں سے درختوں میں یہ خاصیت آگئی کہ وہ پھل دے سکیں یا زمین کو یہ ہیئت کس نے عطا کی کہ وہ تمہارے لیے غلہ اگا سکے؟ قرآن اس سوال کا جواب دیتا ہے کہ یہاں خدا ہے اور اس نے ہر چیز کو ایک خاص شکل اور خاص ہیئت عطا کی ہے۔ اشیاء کی یہ ظاہری صورتیں جن کی وجہ سے تمہارا ان سے خاص نوعیت کا تعلق متعین ہوتا ہے، ماننا پڑے گا کہ یہ خدا کی دی ہوئی ہیں۔ اس طرح قرآن کے نزدیک کائنات کی ہر چیز اپنے پورے ظاہری وجود کے اعتبار سے خدا کے وجود کی دلیل بن جاتی ہے۔ جو چیز جس شکل میں ہمارے سامنے ہے اسی شکل میں خدا کے وجود کی نشانی اس میں چھپی ہوئی ہے۔ اشیاء کا وجود اگر ثابت ہے تو خدا کا وجود بھی ثابت ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ
الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا
تَاْكُلُوْنَ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ
وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ
وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ
وَيُرِيْكُمْ اٰيَاتِهٖ فَاَيَّ
اٰيَاتِ اللّٰهِ

اللہ ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے پیدا کیے تاکہ ان
میں سے بعض سے تم سواری کا کام لے سکو اور ان میں سے بعض
ایسے ہیں جن کا گوشت تم کھاتے ہو۔ اور تمہارے لیے ان
چوپایوں میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ چوپایوں کے
پیدا کرنے کا ایک مقصد یہ بھی کہ تم ان پر سوار ہو کر ان حاجات
کو پہنچو جن کا ارادہ تم اپنے دلوں میں کرتے ہو۔ چوپایوں
اور کشتیوں پر تم لادے جاتے ہو۔ اللہ تعالیٰ تم کو

تُنْكِرُوْنَ ۝ (المومن، ۸۱-۷۹)

اپنی نشانیاں دکھاتا ہے پس اللہ کی کن نشانیوں کا انکار کرتے ہو؟

سورہ نحل کے شروع میں یہی بات کسی قدر وضاحت اور تفصیل کے ساتھ کہی گئی ہے

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ
تَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ خَلَقَ الْاِنْسَانَ
مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝
وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِيْهَا دِفْءٌ
وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَ
لَكُمْ فِيْهَا جَمَالٌ حِيْنَ تُرِيْحُوْنَ
وَحِيْنَ تَسْرَحُوْنَ ۔ وَتَحْمِلُ
اَثْقَالَكُمْ اِلٰى بَلَدٍ لَّمْ تَكُوْنُوْا
بٰلِغِيْهِ اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ اِنَّ
رَبَّكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَّالْخَيْلَ
وَالْبِغَالَ وَالْحَمِيْرَ لِتَرْكَبُوْهَا
وَزِيْنَةً وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝
وَعَلَى اللّٰهِ قَصْدُ السَّبِيْلِ
وَمِنْهَا جَآئِرٌ وَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ
اَجْمَعِيْنَ ۝ هُوَ الَّذِيْۤ اَنْزَلَ مِنَ
السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ
وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝
يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ
وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ
كُلِّ الثَّمَرٰتِ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ

اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور
زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اس کی ذات بلند ہے اس
شرک سے جو یہ کر رہے ہیں۔ اس نے انسان کو ایک نطفہ
سے پیدا کیا لیکن وہ اس کے بعد کھلم کھلا جھگڑنے والا نکلا
اور اس نے چوپائے پیدا کیے جن میں تمہارے لیے
گرمی حاصل کرنے کا سامان ہے اور بھی بہت سے
فائدے ہیں اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو
اور تمہارے لیے ان میں رونق اور جمال بھی ہے جبکہ
تم شام کے وقت ان کو چرا کر گھر واپس لاتے ہو اور صبح کے وقت
جبکہ تم انکو چرانے لیجاتے ہو۔ وہ تمہارے سامان اٹھا کر ایسے مقامات
تک لیجاتے ہیں جہاں تم انتہائی محنت و مشقت کے بغیر نہیں پہنچ
سکتے۔ بیشک تمہارا رب بڑا ہی مہربان اور رحم کرنیوالا ہے۔ اور گھوڑے
اور خچر اور گدھے اس نے پیدا کیے تاکہ تم ان پر سوار ہو اور وہ
تمہارے لیے زینت بھی ہیں اور وہ بہت سی ایسی چیزیں پیدا کرتا
ہے جن کو تم جانتے نہیں۔ اور اللہ ہی کے ذمہ ہے سیدھا راستہ
دکھانا اور بعض راستے ٹیڑھے بھی ہیں اور اگر وہ چاہتا تو تم سب کو
سیدھی راہ پر لے چلتا۔ خدا ہی ہے جس نے آسمانوں سے تمہارے
لیے پانی برسایا جس سے تم خود بھی پیتے ہو اور اسی پانی سے درخت
پیدا ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشیوں کو چراتے ہو۔ وہ اس پانی
کے ذریعہ تمہارے لیے کھیتی اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور اور انگور

لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○
وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ
وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمُ
مُسَخَّرَاتٌ بِاَمْرِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ
لَاٰيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ وَمَا
ذَرَاَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُخْتَلِفًا
اَلْوَانُهٗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً
لِّقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ○ وَهُوَ
الَّذِيْ سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَاْكُلُوْا
مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَّتَسْتَخْرِجُوْا
مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُوْنَهَا وَ
تَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيْهِ
وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ○ وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ
رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ
وَاَنْهٰرًا وَّسُبُلًا لَّعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ○ وَعَلٰمٰتٍ وَ
بِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ○
اَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا
يَخْلُقُ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ
وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ
لَا تُحْصُوْهَا اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ
رَّحِيْمٌ (النحل ۱۸-۳)

اور ہر قسم کے دوسرے پھل پیدا کرتا ہے بےشک اس میں ایک بڑی
نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر کرتے ہیں۔ اس نے تمہارے
لیے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور تارے
بھی اسی کے حکم سے مسخر ہیں۔ بےشک اس میں ضرور نشانیاں ہیں۔
ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔ اور اس نے زمین میں
مختلف رنگوں کی جو چیزیں تمہارے لیے پھیلا رکھی ہیں۔ اس
میں بھی البتہ نشانی ہے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت حاصل کرتے
ہیں۔ اسی کی ذات ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کیا ہے
تاکہ تم اس سے تر و تازہ گوشت کھا سکو۔ اور اس سے اپنے لیے
زیور نکالو جس کو تم پہنتے ہو۔ اور تم دیکھتے ہو کہ کشتیاں سمندر
کو پھاڑتی ہوئی چلتی ہیں یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اس کا
فضل تلاش کرو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ اور اس
نے زمین میں پہاڑ جما دیئے تاکہ زمین تمہیں لے کر
ڈھلک نہ جائے۔ اس نے نہریں جاری کی ہیں اور راستے
پیدا کیے تاکہ تم راہ پاؤ اس نے اور بھی بہت سی
نشانیاں قائم کی ہیں اور ستاروں سے
بھی وہ راہ پاتے ہیں۔ پس کیا وہ ذات جو ہر چیز
پیدا کرتی ہے اس کی مانند ہے جو کچھ نہیں پیدا
کرتا۔ تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے
اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو
تو شمار نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ اللہ
مغفرت کرنے والا اور
رحیم ہے۔

اس کائنات کا واقعہ کی شکل میں موجود ہونا قرآن کے نزدیک خدا کے وجود کی دلیل ہے۔ کیونکہ کائنات کو بطور واقعہ تسلیم کرنے کے بعد اس کی دو ہی توجیہیں ممکن ہیں۔ ایک یہ کہ کائنات از خود وجود میں آگئی دوسری یہ کہ اس کا ایک خالق ہے جس نے اسے وجود دیا ہے۔ پہلی توجیہ جس شکل میں بھی آئے اسے توجیہ کہنا دشوار ہے۔ انسان نے اپنی جہالت کو چھپانے کے لیے اس کو توجیہ کا نام دے رکھا ہے۔ خدا کے تصور کے خلاف یہ ایک حیرت انگیز جسارت ہے یہ جسارت اس کو اس لیے کرنی پڑی کہ وہ خدا کو مانے بغیر کائنات کی توجیہ کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ زندگی کے کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی اس جسارت کو صحیح نہیں سمجھتا۔ اگر خدا نہیں ہے تو کیا ہر ہستی آپ اپنی خالق ہے؟ کیا عدم سے وجود اور وجود سے بقاء و ترقی کے تمام مراحل اس نے از خود طے کیے؟ خدا کا انکار اگر اس لیے صحیح ہے کہ وہ ہماری نگاہ سے دور ہے تو یہ توجیہ عقل سے دور ہے عقل کے کھلے ہوئے تقاضوں کو رد کیے بغیر انسان اس توجیہ کو قبول نہیں کر سکتا۔

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخَالِقُوْنَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝ — کیا وہ بغیر کسی چیز کے پیدا کر دیے گئے یا وہ خود اپنے خالق ہیں؟ یا انھوں نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ خدا پر یقین نہیں رکھتے۔

اَفِي اللّٰهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ — کیا ان کو اللہ کے بارے میں شک ہے جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔

یہ کائنات از خود وجود میں نہیں آئی ہے تو ماننا پڑے گا کہ خدا نے اس کو پیدا کیا ہے۔ ہر چیز کا وجود اس کی موت و حیات اس کی قوتیں اور صلاحیتیں سب کچھ ایک خاص تناسب کے ساتھ اس کو خدا کی طرف سے ملی ہیں۔

صُنْعَ اللّٰهِ الَّذِيْ اَتْقَنَ كُلَّ شَيْءٍ۔ (النمل - ۸۸) — اللہ کی کاریگری ہے جس نے ہر چیز کو مضبوط اور محکم بنایا ہے۔

اَلَّذِيْ خَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهٗ تَقْدِيْرًا (الفرقان ۲) — خدا ہی ہے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اس کا خوب خوب اندازہ کیا۔

کائنات جن اصولوں پر قائم ہے وہ صاف بتاتے ہیں کہ اس کو ایک صاحب شعور اور با ارادہ ہستی نے پیدا کیا ہے اور اسی کے تدبیر میں اس کا نظم بھی ہے۔ یہ اصول بظاہر تین ہیں۔ پہلا اصول ہے حرکت و انقلاب۔ کائنات اپنی جگہ جمی ہوئی نہیں ہے۔ بلکہ مسلسل حرکت کر رہی ہے اور ہر آن تغیر و انقلاب سے گزر رہی ہے۔ ہماری یہ زمین، چاند، سورج، کہکشاں، ہر سیارہ غیر منقطع گردش میں لگا ہوا ہے۔ جس کا انقلاب رات اور دن کی آمد و رفت

...گی اور موت ان میں سے ہر چیز ایک انقلاب ہے جو ہر تھوڑے وقفہ کے بعد برپا ہوتا رہتا ہے۔ کائنات جامد و ساکن
...تی تو یہ انقلابات جو ہم دیکھ رہے ہیں سراسر ناپید ہوتے اور ان کی جگہ جمود و سکون نظر آتا۔

دوسرا اصول ہے انتخاب۔ اس عظیم کائنات میں جو چیز ابھر کر اوپر آتی ہے اور جو واقعہ رونما ہوتا ہے عقلی لحاظ
سے اس واقعہ کے رونما ہونے یا نہ ہونے کا برابر امکان ہے۔ لیکن جب کوئی واقعہ وجود میں آتا ہے تو وہ اس بات
کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس کے وجود کو عدم پر ترجیح دی گئی ہے اور جو واقعہ مٹ جاتا ہے وہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس
کے حق میں عدم اور فنا کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

تیسرا اصول ہے زندگی اور شعور۔ یہ کائنات بے جان اور مردہ کائنات نہیں ہے بلکہ اس میں ہم ہر طرف
زندگی اور شعور کے آثار دیکھ رہے ہیں۔ یہ شعور کسی چیز میں نمایاں اور کسی چیز میں غیر نمایاں ہے لیکن کوئی چیز شعور سے
خالی نہیں ہے۔

ان میں سے ہر اصول خدا کے وجود کا تقاضا کرتا ہے۔ خدا کے بغیر یہ اصول ظاہر ہی نہیں ہو سکتے۔ اگر خدا نہیں ہے
تو سوال یہ ہے کہ کائنات میں حرکت کیسے پیدا ہو گئی؟ جب یہاں ہر واقعہ کے وجود و عدم کا مساوی امکان ہے تو ان
میں سے کسی ایک پہلو کا انتخاب کون کرتا ہے؟ شعور اور زندگی دینے والی کوئی ذات اس کائنات میں نہیں ہے تو یہاں
زندگی کی لہر کیسے دوڑ رہی ہے؟

خدا کا انکار کرنے کے بعد ان میں سے کسی سوال کا انسان کوئی معقول جواب نہیں دے سکتا۔ لیکن اگر ہم اس
حقیقت کو تسلیم کر لیں کہ اس کائنات کا ایک باشعور اور صاحب ارادہ خالق ہے تو یہ سوالات از خود حل ہو جاتے
ہیں۔ قرآن اسی حقیقت کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ یہ کائنات خدا کی مرضی اور فیصلے کی پابند ہے
ہر انقلاب اور تغیر کے پیچھے اس کا ہاتھ ہے۔ زمین اور آسمانوں میں چھوٹا بڑا جو بھی واقعہ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم
سے ہوتا ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ	کہو اے اللہ سارے اقتدار کے مالک تو جسے چاہتا ہے
تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ	اقتدار عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اقتدار چھین
الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ	لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت عطا کرتا ہے اور جسے
تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ	چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ ساری بھلائی تیرے ہاتھ میں
بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ	ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں

شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (آل عمران)

داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اور تو زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا کرتا ہے۔

کائنات میں صرف خدا کا حکم چل رہا ہے اگر اس کا حکم نہ ہو تو یہ حرکت کرتی ہوئی کائنات اپنی جگہ ٹھہر جائے اور جن انقلابات و تغیرات کا ہم مشاہدہ کرتے ہیں وہ یکسر مٹ جائیں۔

وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (القصص ۷۰-۷۳)

وہی اللہ ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ اسی کی تعریف ہے دنیا اور آخرت دونوں میں اور اسی کی حکومت ہے۔ اور اسی کی طرف تم لوٹ کر جاؤ گے۔ ان سے کہو بتاؤ تم اگر اللہ رات کو تم پر ہمیشہ ہمیشہ قیامت کے روز تک کر دے تو وہ کون خدا ہے سوائے اللہ کے جو تمہارے پاس روشنی لائے کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے کہو بتاؤ تم اگر اللہ تم پر ہمیشہ کے لیے قیامت تک دن کر دے تو سوائے اللہ کے وہ کونسا خدا ہے جو تمہارے لیے رات لائے جس میں تم سکون حاصل کر سکو کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن مقرر کئے تا کہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو اور تا کہ تم شکر کرو۔

اسی طرح ترجیح اور انتخاب کا عمل بھی خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ یہاں کس چیز کو کب تک باقی رکھنا ہے اور کب اسے ختم کرنا ہے۔ خدا کے علاوہ کسی دوسرے کے ہاتھ میں فیصلہ کا حق نہیں ہے۔

وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ بَصِيْرٌ (المومن ۲۰)

اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کا فیصلہ نہیں کرتے ہیں۔ بیشک اللہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَيَخْتَارُ مَا

اور تیرا رب ہی ہے جو پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے اور جس چیز کو

كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ○ (القصص ۶۸)

چاہتا ہے منتخب کرتا ہے ان کے لیے انتخاب کا اختیار نہیں ہے پاک ہے اللہ کی ذات اور بلند ہے ان کے شرک سے۔

افراد کی موت وحیات، غم ومسرت، تونگری ومفلسی سب کچھ خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہاں نہ اپنے اختیار سے کوئی شخص وجود پاتا ہے اور نہ موت اس کے اختیار میں ہے۔ نہ دکھ اس کے قابو میں ہے اور نہ سکھ، نہ دولت اس کی اپنی ہے اور نہ غربت وافلاس اس کا ہے۔ ہر چیز خدا کی طرف سے ہے اور اسی کے فیصلہ کے تحت وہ ظاہر ہوتی ہے۔

وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَاَحْيَا وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى وَاَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ○ (النجم ۴۳-۴۸)

اور بیشک خدا ہی ہنساتا اور رلاتا ہے اور یقیناً وہی مارتا اور جلاتا ہے اور یقیناً اسی نے مرد اور عورت کے جوڑے پیدا کئے، اس نطفہ سے جو رحم مادر میں ٹپکایا جاتا ہے۔ اور بیشک وہی دوبارہ اٹھائے گا۔ اور بیشک وہی دولت اور تونگری عطا کرتا ہے۔

افراد کا عروج وزوال ہی نہیں قوموں کا عروج وزوال بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی فیصلہ کرتا ہے کہ کہ زمین پر کب تک کس قوم کو باقی رہنا ہے اور کب اسے ختم ہو جانا چاہیے

لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ فَاِذَا جَاءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ○

ہر امت کے فنا کا ایک وقت ہے جب اس کے فنا ہونے کا وقت آتا ہے تو اس کے افراد اس وقت سے ایک گھڑی نہ آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔

... وَيَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْاَرْضِ ءَاِلٰهٌ مَّعَ اللّٰهِ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ (النمل-۶۲)

کون ہے جو تم کو زمین میں ایک کے بعد دوسرے کو جانشین بناتا ہے۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود بھی ہے بہت کم تم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

یہی معاملہ شعور اور حیات کا ہے۔ کائنات میں شعور اور زندگی کا وجود ثابت کرتا ہے کہ کسی صاحب شعور ہستی نے اسے شعور عطا کیا ہے۔ یہ کائنات از خود وجود میں آئی ہے تو اس میں زندگی کہاں سے آگئی؟ بے جان مادہ کائنات کا خالق ہے تو کائنات کو بھی بیجان ہی ہونا چاہیے۔ یہ ناممکن ہے کہ جس کائنات میں شعور اور زندگی کے آثار نہیں تھے اس میں کسی شعور پیدا کرنے والے کے بغیر شعور پیدا ہو گیا ہو۔

اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ (یونس-۳۱)

خدا کے سوا وہ کون ہے جو کان اور آنکھوں کا مالک ہے۔

اگر خدا شعور کی قوتیں تم سے چھین لے تو کیا یہ قوتیں از خود تم کو دوبارہ مل سکتی ہیں؟ کیا اس کائنات میں کوئی ایسا سامان ہے جس سے تم اپنی چھنی ہوئی قوتوں کو حاصل کر سکو؟ اگر یہ کائنات شعور عطا کرنے سے عاجز ہے تو پھر کس دلیل کی بنیاد پر تم صاحب شعور خدا کا انکار کرتے ہو؟

قُلْ اَرَاَیْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ وَخَتَمَ عَلٰی قُلُوْبِکُمْ مَّنْ اِلٰہٌ غَیْرُ اللّٰہِ یَاْتِیْکُمْ بِہٖ اُنْظُرْ کَیْفَ نُصَرِّفُ الْاٰیٰتِ ثُمَّ ھُمْ یَصْدِفُوْنَ ۝ (الانعام ۴۶)

ان سے کہو بتاؤ تم اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے تو اللہ کے سوا وہ کون خدا ہے جو تمہیں یہ چیزیں پھر دے سکے؟ تم دیکھو کہ ہم دلیلیں کس طرح پھیر پھیر کر بیان کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ اعتراض کر رہے ہیں۔

انسان اس کائنات میں سب سے زیادہ احساس اور شعور کی قوتیں رکھتا ہے۔ یہ قوتیں آپ سے آپ اس کو نہیں ملی ہیں بلکہ خدا نے اس کو دی ہیں۔ اس کا پورا وجود، اس کے سننے اور دیکھنے کی صلاحیت ہر چیز خدا کا عطیہ ہے۔ خدا نے اس کے اندر روح پھونکی ہے تب اس نے ایک زندہ وجود کی شکل اختیار کی ہے ورنہ ممکن نہیں ہے کہ از خود اس کے اندر قوت حیات پیدا ہو جائے۔

اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَہٗ مِنْ سُلٰلَۃٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّھِیْنٍ ۝ ثُمَّ سَوّٰىہُ وَنَفَخَ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِہٖ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ۝ (سجدہ ۷-۹)

خدا نے جس چیز کو پیدا کیا بہت خوب پیدا کیا۔ اس نے انسان کی تخلیق مٹی سے شروع کی پھر اس نے اس کی نسل چلائی ایک حقیر پانی کے نچوڑ سے، پھر اس نے اس کو ٹھیک کیا اور اس میں اپنی روح پھونکی اور تمہارے لیے کان اور آنکھ اور دل عطا کیے۔ بہت کم تم شکر ادا کرتے ہو۔

قُلْ ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْشَاَکُمْ وَجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَۃَ قَلِیْلًا مَّا تَشْکُرُوْنَ ۝ (الملک ۲۳)

خدا ہی کی ذات ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور (سننے کے لیے) تمہیں کان اور (دیکھنے کے لیے) تمہیں آنکھیں عطا کیں اور (سوچنے سمجھنے کے لیے) دل دیا۔ (اس کے باوجود) بہت کم تم اس کا شکر ادا کرتے ہو۔

انسان ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز میں زندگی ہے اور یہ خدا کی پیدا کردہ ہے وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ (ہم نے ہر چیز کو پانی سے زندگی عطا کی ہے)۔

خدا۔ کائنات کی آخری علت خدا کا تصور اسی وقت مکمل ہو سکتا ہے جبکہ اس کو ازلی و ابدی مانا جائے۔ کائنات اپنی تخلیق میں ذات کی محتاج ہے یقیناً وہ اپنے وجود میں کسی دوسرے کا محتاج نہیں ہے۔ کائنات کا پیدا کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو خود کسی چیز کا محتاج نہ ہو اور کائنات کے ہر احتیاج کو رفع کرے۔ جو دوسروں کو حرکت دے اور اس پر کوئی چیز اثر انداز نہ ہو سکے۔ کائنات کے ساتھ احتیاج کا تصور وابستہ ہے تو خدا کے ساتھ بے نیازی کا تصور ہونا چاہیے۔ قرآن خدا کا اسی پہلو سے تعارف کراتا ہے۔

هُوَ الْغَنِيُّ لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (یونس ۶۸)	وہ بے نیاز ہے۔ اسی کی ہیں وہ ساری چیزیں ہیں جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں۔
يٰأَيُّهَا النَّاسُ أَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ ○ (فاطر ۱۵)	اے لوگو تم محتاج ہو خدا کے اور خدا ہر چیز سے بے نیاز اور ساری تعریفوں کا مستحق ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ ایسی کسی قوت کو خدائی کا مقام دینا جہالت اور نادانی ہے جس کے تصور کے لیے ایک دوسرے خدا کو ماننا پڑے۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ (حم السجدہ ۳۷)	اور رات اور دن اور سورج اور چاند تو اس کی نشانیوں میں سے ہیں (پھر ان کو سجدہ کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟) تم نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو بلکہ اس اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان کو پیدا کیا ہے اگر تم اسی کی عبادت کرنا چاہتے ہو۔

جو لوگ کنکر اور پتھر، لکڑی اور لوہا، زمین اور آسمان، مادہ اور روح ان میں سے کسی بھی چیز کو خدائی کا درجہ دینا چاہتے ہیں ان پر قرآن کا یہی اعتراض ہے کہ وہ خالق نہیں ہیں۔ جو چیزیں خود محتاج تخلیق ہوں اور کائنات کی تخلیق میں جن کا کوئی حصہ نہ ہو کس منطق کی بنیاد پر ان کو خدا کہا جائے؟

أَفَمَنْ يَّخْلُقُ كَمَنْ لَّا يَخْلُقُ أَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ (النحل ۱۷)	کیا وہ ذات جو ہر چیز کو پیدا کرتی ہے اور وہ جو کسی چیز کو نہیں پیدا کرتا دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؟
وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ	یہ جن لوگوں کو خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ کسی چیز کو نہیں

اللّٰہِ لَا یَخْلُقُوْنَ شَیْئًا وَّ ھُمْ یُخْلَقُوْنَ اَمْوَاتٌ غَیْرُ اَحْیَاءٍ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ (ایضاً ۲۱-۲۰)
پیدا کرنے بلکہ وہ خود پیدا کئے گئے ہیں۔ وہ مردہ ہیں، زندہ نہیں ہیں۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ وہ دوبارہ کب اٹھائے جائیں گے؟

اس لیے ماننا پڑے گا کہ خدا کائنات کی آخری علت ہے۔ ہر چیز کو وجود اس کی طرف سے ملتا ہے البتہ اس کا وجود کسی کا عطا کردہ نہیں ہے بلکہ وہ آپ سے آپ موجود ہے۔ ہم اس کے وجود کا تصور کرتے ہیں لیکن اس کی ابتدا کا تصور ہمارے لیے ممکن نہیں۔

خدا۔ ایک غیر محدود ذات خدا، کائنات کی علت ہے تو وہ غیر محدود ہے۔ اس کی ذات کا احاطہ کسی طرح ممکن نہیں۔ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِہٖ عِلْمًا طٰہٰ ۱۱۰
(وہ جانتا ہے جو کچھ ان کے حدود علم سے آگے ہے اور جو ان کے پیچھے ہے۔ اور وہ اپنے علم سے اس کا احاطہ نہیں کر سکتے) اس کی ابتدا کا نہ ہمیں علم ہے اور نہ ہم اس کی انتہا کو جانتے ہیں۔ وہ اس وقت بھی تھا جب کہ یہ کائنات نہیں تھی کَانَ اللّٰہُ وَلَمْ یَکُنْ مَّعَہٗ شَیْءٌ (خدا تھا اور اس کے ساتھ کوئی چیز نہیں تھی) اور اس وقت بھی ہوگا جبکہ کائنات کی ایک ایک چیز فنا ہو جائے گی۔ کُلُّ مَنْ عَلَیْھَا فَانٍ وَّیَبْقٰی وَجْہُ رَبِّکَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِکْرَامِ۔ الرحمٰن ۲۶، ۲۷ (زمین پر جتنی چیزیں ہیں سب فنا ہونے والی ہیں بزرگی اور عظمت والے تمہارے رب کی ذات صرف باقی رہ جائیگی) وہ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (زندہ اور قائم و دائم ہے) وہ حیاتِ بے پایاں ہے۔ اس پر کبھی عدم طاری نہیں ہوا۔ اس کا تصور زندگی کے ساتھ ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ موت سے ناآشنا ہے اس کی صفت اَلْحَیُّ الَّذِیْ لَا یَمُوْتُ (زندہ جسے کبھی موت اور فنا نہیں ہے) وہ ایسی ذات ہے جس کی ابتدا اور انتہا ہماری نگاہ سے پوشیدہ ہے۔ زمین و آسمان کی ساری قوتیں صرف کر دی جائیں تب بھی اس کی ذات و صفات کے حدود کو پانا ممکن نہیں۔ وَلَوْ اَنَّ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَجَرَۃٍ اَقْلَامٌ وَّالْبَحْرُ یَمُدُّہٗ مِنْۢ بَعْدِہٖ سَبْعَۃُ اَبْحُرٍ مَّا نَفِدَتْ کَلِمٰتُ اللّٰہِ لقمان ۲۷ (زمین میں جتنے درخت ہیں اگر ان سب کے قلم بنا دئے جائیں اور موجودہ سمندر کے ساتھ سات اور سمندر ملا دئے جائیں اور ان کو روشنائی کے لیے استعمال کیا جائے تو بھی انکے ذریعہ کلماتِ الٰہی ضبط تحریر میں پوری طرح نہیں لائے جا سکے۔ روشنائی ختم ہو جائے گی اور قلم گھس جائیں گے لیکن خدا کے کلمات ختم نہ ہوں گے)

خدا کی غیر محدودیت اس طرح ثابت ہوتی ہے کہ کائنات محدود ہے۔ اس کائنات کا ایک آغاز ہے جو چیز اپنا آغاز رکھتی ہے لازماً اس کا ایک انجام بھی ہوگا۔ ہر ابتدا کی ایک انتہا ضروری ہے۔ آپ ایک، دو، تین، چار کے عدد مسلسل لکھتے چلے جائیے کہیں نہ کہیں پہونچ کر یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ اسی طرح یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ جو چیز اپنے ایک

آغاز کے ساتھ بڑھتی ہے خواہ اس کی وسعت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، وہ پھر اپنے آغاز پر پہونچائی جا سکتی ہے۔ ایک عدد ترقی کر کے ہزار تک پہونچ سکتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہزار کو گھٹا کر پھر اسی عدد تک لایا بھی جا سکتا ہے۔ جو چیز اپنی ابتدا اور انتہا سے اس طرح گھری ہو وہ لازماً محدود ہوگی۔ خدا وہ ہے جو محدودیت کا آغاز کرتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں خدا "بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" (آسمانوں اور زمین کا خالق وموجد) ہے۔ گویا خدا کو ماننے والا ایک ایسی ہستی پر یقین رکھتا ہے جو اپنا آغاز نہیں رکھتی البتہ اس سے دوسروں کو آغاز ملتا ہے۔ جب خدا کی کوئی ابتدا ہی نہیں ہے تو اس کی انتہا بھی نہیں ہے۔ جو چیز عدد سے باہر ہے اس کو ہم اپنے حساب کے دائرہ میں نہیں لا سکتے۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے۔ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا۔ کہ خدا کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے لیکن وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِہٖ عِلْمًا طٰہٰ ۱۱۰۔ انسان کا علم خدا کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

خدا مادیت سے پاک ہے

خدا غیر محدود ہے اس لیے وہ مادی خصوصیات سے پاک ہے۔ ہر مادی وجود کچھ خاص اجزا سے مرکب ہوتا ہے اسی وجہ سے اس میں محدودیت پیدا ہوتی ہے۔ ہم تجزیہ کر کے بتا سکتے ہیں کہ انسان کا جسم کن اجزا سے ترکیب پایا ہے اور پانی میں کونسے اجزا شامل ہیں۔ اجزا کی یہ ترکیب خدا کی قدرت سے وجود میں آتی ہے۔ خدا کی قدرت نہ ہو تو نمک، لوہے اور چونے جیسی چند چیزیں انسانی پیکر میں ڈھل نہیں سکتیں۔ اگر ہم خدا کو بھی کوئی مادی وجود مانتے ہیں تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ غیر محدود نہیں ہے اور چند اجزا خاص سے مرکب ہے۔ اس بات کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم خدا کو کائنات کی حقیقی علت نہیں مانتے۔ کیونکہ ہر مادی وجود اس بات کا محتاج ہے کہ وہ جن اجزا سے ترکیب یافتہ ہے اس کو ترکیب دینے والا کوئی پایا جائے۔ اسی لیے قرآن کے نزدیک خدا کا اپنا ایک وجود ہے لیکن اس کا وجود ہر مادی وجود سے مختلف ہے۔ وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے کسی بھی چیز سے مشابہت نہیں رکھتا۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَیْنَھُمَا فَاعْبُدْہُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِہٖ ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ۝ (مریم - ۶۵)	وہ آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور ان چیزوں کا بھی جو ان کے درمیان ہیں پس تم اسی کی عبادت کرو اور اس کی عبادت پر جمے رہو کیا تم اس کا مماثل اور ہمسر کہیں دیکھتے ہو؟

سورۂ شوریٰ میں ہے۔

لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ (۱۱)	اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے اور وہ سننے اور دیکھنے والا ہے

مطلب یہ کہ خدا سننے اور دیکھنے والا ایک وجود ہے لیکن کائنات کی ہر چیز سے وہ جدا ہے۔ کوئی چیز اس جیسی نہیں ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔

قد علم بالشرع مع العقل ان اللہ تعالیٰ لیس کمثلہ شیئ لا فی ذاتہ ولا فی صفاتہ ولا فی افعالہ کما قال تعالیٰ لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ وقال تعالیٰ ھَلْ تَعْلَمُ لَہٗ سَمِیًّا وقال تعالیٰ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ وقال تعالیٰ وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ وقد علم بالعقل ان المثلین یجوز علی احدھما ما یجوز علی الآخر و یجب لہ ما یجب لہ ویمتنع علیہ ما یمتنع علیہ فلو کان المخلوق مماثلا للخالق للزما اشتراکھما فیما یجب ویجوز ویمتنع والخالق یجب وجودہ وقدمہ والمخلوق یستحیل وجوب وجودہ وقدمہ بل یجب حدوثہ وامکانہ فلو کانا متماثلین للزما اشتراکھما فی ذالک فکان کل منھما یجب وجودہ وقدمہ ویمتنع وجوب وجودہ وقدمہ ویجب

شریعت اور عقل دونوں سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز مشابہت نہیں رکھتی۔ نہ تو اس کی ذات میں اور نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے افعال و اعمال میں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "اس جیسی کوئی چیز نہیں"، اور فرمایا "کیا تمہارے علم میں اس کا کوئی ہمسر بھی ہے؟" ایک اور جگہ فرمایا "جانتے بوجھتے تم اس کے لیے ہمسر کا ہونہ ٹھہراؤ" ایک اور مقام پر فرمایا "اس کا کوئی شریک و ہمسر نہیں ہے" یہ بات عقل سے جانی جا سکتی ہے کہ دو چیزیں جب ایک دوسرے کے مماثل ہیں تو ان میں سے ایک کے بارے میں وہ ساری باتیں جائز ہوں گی جو دوسرے کے لیے جائز ہیں۔ ایک کے لیے جو ضروری ہوگا وہ دوسرے کے لیے بھی ضروری ہوگا اور جو ایک کے لیے ممتنع اور محال ہوگا وہ دوسرے کے لیے بھی محال ہوگا پس اگر مخلوق خالق سے مشابہ ہے تو لازماً ان دونوں میں اشتراک ہونا چاہیے ان ساری باتوں میں جو ضروری ہوتی ہیں یا جائز ہوتی ہیں یا محال ہوتی ہیں۔ خالق وہ ہے جس کا وجود و قدم واجب ہے (یعنی یہ اس کی ذاتی خصوصیات ہیں ان میں وہ کسی کا محتاج نہیں ہے) مخلوق کے بارے میں یہ بات محال ہے اس کا وجود ذاتی نہیں ہے اور نہ وہ قدیم ہے۔ بلکہ اس کی حادث اور ممکن ہونا ضروری ہے پس اگر دونوں کو مماثل مانا جائے تو دونوں کا اشتراک لازم آتا ہے پس خالق اور مخلوق

حدوثہ وامکانہ فیکون	واجب الوجود اور قدیم ہوں گے ساتھ ہی ان کا واجب الوجود
کل منہما واجب القدم	اور قدیم ہونا محال بھی ہوگا اور ضروری ہوگا کہ وہ حادث
واجب الحدوث واجب	اور ممکن ہوں۔ اس طرح ہر ایک کا قدم بھی واجب ہوگا اور
الوجود ولیس واجب الوجود	حدوث بھی واجب ہوگا۔ ہر ایک واجب الوجود بھی ہوں گے اور
یمتنع قدمہ او یمتنع قدمہ	واجب الوجود نہیں بھی ہوں گے ان کا قدیم ہونا محال
وھذا جمع بین	بھی ہوگا نہیں بھی ہوگا اور یہ صراحتاً نقیضوں کے درمیان
النقیضین[1]	جمع کرنا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں۔

"خدائے تعالیٰ کا کوئی مادی جسم نہیں ہوسکتا کیونکہ جسم ایک دوسرے کے مشابہ ہوتے ہیں اور قرآن کے بقول خدا کسی سے مشابہ نہیں ہے۔ اس لیے یہ بات قرآن کے صریح نص کے خلاف ہوگی کہ ہم خدا کو مادی جسم مانیں،،

اس کے بعد امام موصوف نے ایک سوال پیدا کیا ہے۔ وہ یہ کہ جس طرح انسان اور گھوڑا دونوں جسم رکھتے ہیں لیکن اپنی خصوصیات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اس طرح کیا یہ ممکن نہیں کہ خدائے تعالیٰ کا بھی کوئی جسم ہو اور اس میں وہ خصوصیات نہ ہوں جو کائنات کے دوسرے اجسام میں پائی جاتی ہیں؟ اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

والجواب من جھتین الاولیٰ	اس کا جواب دو پہلوؤں سے دیا جا سکتا ہے۔ ایک پہلو تو یہ
انا سنقیم الدلالۃ علی ان الاجسام	کہ اجسام سارے کے سارے اپنی ماہیت میں ایک دوسرے
کلھا متماثلۃ فی تمام الماھیۃ	کے مماثل ہیں۔ ہم اس مسئلہ پر آگے چل کر دلیل دیں گے۔ اگر
فلو کان تعالیٰ جسما لکان	اللہ تعالیٰ جسم ہوتا تو اس کی ذات بھی دوسرے اجسام کے
ذاتہ مثلا لسائر الاجسام و	مماثل ہوتی اور یہ بات اس نص کے خلاف ہے "لَيْسَ
ذالک یخالف لھذا النص و	كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" اس جیسی کوئی چیز نہیں ہے۔ انسان
الانسان والفرس ذات کل	اور گھوڑا ان میں سے ہر ایک کی ذات دوسرے کی ذات
واحد منھما مماثلۃ لذات الآخر	سے مماثل ہے۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ صفات اور اعراض

---

[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص۳۰

والاختلاف انما وقع في الصفات
والاعراض والذاتان اذا كانتا
متماثلتين لكان اختصاص
لكل واحدة منهما بصفاته
المخصوصة من الجائزات لا
من الواجبات لان الاشياء
المتماثلة في تمام الذات والماهية
لا يجوز اختلافهما في اللوازم
فلو كان الباري تعالى جسما
لوجب ان يكون اختصاصه
بصفاته المخصوصة من الجائزات
ولو كان كذلك لزم افتقاره
الى المدبر والمخصص وذلك
يبطل القول بكونه تعالى اله
العالم - الثاني ان بتقدير ان
يكون هو تعالى مشاركا
لسائر الاجسام في الجسمية
ومخالفها في الماهية المخصوصة
يجب وقوع الكثرة في ذات
الله تعالى لان الجسمية مشتركة
فيها بين الله وبين غيره و
خصوصية ذاته غير مشتركة فيما بين الله
تعالى وبين غيره وما به المشاركة غير ما به الممايزة
وذلك يقتضي التركب في ذاته [illegible]

میں ہے۔ دو ذات جب مماثل ہوں تو ان میں سے ہر ایک
کا اپنی مخصوص صفات کے ساتھ اختصاص (ضروری نہیں
ہے بلکہ) جائز ہے (یعنی وہ اختصاص ہو بھی سکتا ہے اور نہیں
بھی ہو سکتا) کیونکہ جو اشیاء اصل ذات اور ماہیت میں
مماثل ہیں، ان کا اپنے لوازم میں اختلاف جائز نہیں ہے۔
اگر اللہ تعالیٰ جسم ہے تو اس کا اپنی مخصوص صفات کے ساتھ
اختصاص جائز ہے (یعنی یہ اختصاص ہو بھی سکتا ہے اور نہیں
بھی) اگر یہ بات مان لی جائے تو اس سے یہ لازم آئیگا کہ
خدائے تعالیٰ کسی مدبر اور مخصص کا محتاج ہے۔ اس سے
ہمارا یہ قول باطل قرار پاتا ہے کہ خدا سارے عالم کا الٰہ ہے۔
دوسرا پہلو یہ کہ اگر یہ بات فرض کر لی جائے کہ اللہ تعالیٰ جسم
کے معاملہ میں دوسرے اجسام کے ساتھ شریک ہے اور صرف
اپنی مخصوص ماہیت میں وہ دوسروں سے مختلف ہے تو اس
سے خدا کی ذات میں کثرت واقع ہوتی ہے کیونکہ جسمیت خدا
اور غیر خدا دونوں میں مشترک ہے۔ اور اس کی ذات کی مخصوص
خصوصیات کسی دوسرے میں نہیں پائی جاتیں۔ اب یہاں
دو الگ الگ چیزیں ہیں ایک وہ جو خدا اور غیر خدا میں مشترک
ہے اور دوسری وہ جو صرف خدا کے ساتھ مخصوص ہے۔
جب خدا کی ذات میں دو مختلف چیزیں پائی گئیں تو اس کا
مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات میں ترکیب واقع ہے اور ہر وہ چیز
جو ترکیب یافتہ ہے وہ ممکن ہوتی ہے واجب نہیں ہوتی (یعنی
وہ ترکیب پا بھی سکتی ہے اور نہیں بھی پا سکتی ہے) جیسا
کہ ہم بیان کر چکے ہیں پس اس سے ثابت ہوا کہ

وکل امر ممکن أن یجب علی ما بیناه ثبت ان هذا السوال ساقط واللہ اعلم سلہ
یہ سوال ہی ساقط ہے واللہ اعلم

خدا کا حسی مشاہدہ نہیں ہوسکتا

خدائے تعالیٰ کا جب کوئی مادی وجود نہیں ہے تو وہ ہمارے مشاہدے میں بھی نہیں آسکتا ہم کسی بھی چیز کو خاص حالات ہی میں دیکھ سکتے ہیں جبکہ وہ کسی خاص جگہ میں ہو، اپنا کوئی طول و عرض رکھتی ہو اور ساتھ ہی ہماری نگاہ کے احاطہ میں بھی آسکے۔ ورنہ ہم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ فضا میں پھیلے ہوئے ذرات جو بغیر کسی آلہ کی مدد کے دیکھے نہیں جا سکتے وہ بھی اپنا ایک حسی وجود رکھتے ہیں اسی لیے وہ ہماری نگاہ کی گرفت میں آتے ہیں۔ خدا کا کوئی حسی وجود ہی نہیں ہے تو یہ ناممکن ہے کہ ہم اس کو اپنے حواس کی مدد سے پاسکیں۔ خدا کا اپنا ایک وجود ہے لیکن اس وجود کا یقین ہمیں چھوکر یا دیکھ کر نہیں ہوتا بلکہ ان بےشمار دلائل سے ہوتا ہے جو کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں ایک دو نہیں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو ہمارے مشاہدے سے باہر ہیں لیکن اس کے باوجود ہم ان کو مانتے ہیں کیونکہ ان کو ماننے کے بغیر ہم ان آثار و شواہد کی کوئی توجیہ نہیں کر سکتے جو ان کے وجود پر دلالت کرتے ہیں۔ "زندگی" ایک ایسی حقیقت ہے جس پر ہمارا یقین ہے۔ اس یقین کو کسی بھی ذریعہ سے متزلزل نہیں کیا جا سکتا حالانکہ ہم میں سے کسی نے فی نفسہ "زندگی" کا مشاہدہ نہیں کیا ہے اس یقین کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہم ہر جاندار میں زندگی اور حیات کے آثار دیکھتے ہیں۔ اس لیے زندگی کا اس وقت تک انکار نہیں کر سکتے جب تک کہ ان آثار ہی کو نہ جھٹلا دیں۔ یہی حال خدا کی ذات کا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ موجودہ حواس کے ذریعہ اس کا ادراک ناممکن ہے لیکن بےشمار دلائل اس کے وجود کی شہادت دے رہے ہیں۔ جو شخص بھی پوری سنجیدگی کے ساتھ ان دلائل کا مطالعہ کرے گا وہ کبھی خدا کا انکار نہیں کر سکتا۔

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی
الْاَلْبَابِ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا
وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ
خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا
خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا

بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے اور رات اور دن کے آنے جانے میں بہت سی نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لیے جو یاد کرتے ہیں اللہ کو کھڑے ہوئے اور بیٹھے ہوئے اور لیٹے ہوئے (ہر حالت میں) اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ہمارے رب تو نے اس کارخانہ عالم کو بے مقصد نہیں پیدا کیا۔ تیری ذات ہر نقص سے

سلہ اساس التقدیس فی علم الکلام ص ۲۸، ۲۹

عَذَابَ النَّارِ۔ (آل عمران ۱۹۱، ۱۹۰)	پاک ہے تو ہمیں جہنم کے عذاب سے بچا
اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ	کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ نے آسمان سے پانی اتارا پھر ہم
مَآءً فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا	نے اس سے مختلف رنگوں کے پھل پیدا کیے اور پہاڑوں میں
اَلْوَانُهَا وَمِنَ الْجِبَالِ جُدَدٌۢ بِيْضٌ	بھی مختلف رنگوں والے راستے ہیں بعض سفید اور بعض
وَّحُمْرٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهَا وَغَرَابِيْبُ	سرخ اور بعض انتہائی سیاہ اور اسی طرح انسانوں،
سُوْدٌ وَمِنَ النَّاسِ وَالدَّوَآبِّ	جانوروں اور چوپایوں میں بھی مختلف رنگ ہیں اسطرح ہم
وَالْاَنْعَامِ مُخْتَلِفٌ اَلْوَانُهٗ كَذٰلِكَ	نشانیاں بیان کرتے ہیں لیکن اللہ سے اس کے وہی بندے
اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا	ڈرتے ہیں جو جاننے والے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خدا
اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ غَفُوْرٌ (فاطر ۲۸، ۲۷)	غلبہ والا ہے اور ساتھ ہی وہ بخشنے والا بھی ہے۔

خدا کے رسول انسانوں کو ان دلائل کی طرف متوجہ کرتے ہیں جو خدا کے وجود کی گواہی دے رہے ہیں۔ وہ خدا کا حسی مشاہدہ کرانے نہیں آتے بلکہ وہ اس دعوی کے ساتھ انسانوں کے ساتھ آتے ہیں کہ خدا موجود ہے اس لیے کہ اسکے وجود کی شہادتیں یہاں ہمیں ملتی ہیں۔

قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِي السَّمٰوٰتِ	ان سے کہو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسے
وَالْاَرْضِ وَمَا تُغْنِي الْاٰيٰتُ وَالنُّذُرُ	غور سے دیکھو اور (واقعہ یہ ہے کہ) خدا کی نشانیاں
عَنْ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝	اور خدا کی طرف سے آنے والی تنبیہیں ان لوگوں کے
(یونس ۱۰۱)	لیے کچھ بھی مفید نہیں ہیں جو ایمان لانا نہیں چاہتے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں۔

ان الجسم والعرض	جسم اور عرض یہ دونوں چیزیں مشاہدے سے پائی جا سکتی
مدركان بالمشاهدة فاما	ہیں لیکن ایک ایسا وجود جو جسم نہیں ہے اور نہ وہ کسی جگہ
موجود ليس بجسم ولا جوهر	موجود جوہر ہے اور نہ وہ کسی جوہر کے اندر پائے جانے
متحيز ولا عرض فيه فلا	والا عرض (مثلاً رنگ) ہے تو وہ حواس کے ذریعہ نہیں پایا
يدرك بالحس ونحن ندعي	جا سکتا۔ ہم خدائے تعالیٰ کے وجود کا دعوی کرتے ہیں ساتھ
وجوده وندعي ان العالم	ہی ہمارا یہ بھی دعوی ہے کہ یہ عالم اسی کی ذات اور

موجود بذاته وبقدرته وهذا يدرك بالدليل لا بالحس[۱] — قدرت سے موجود ہے۔ ایسی ذات کو حواس سے نہیں پایا جا سکتا صرف دلیل سے معلوم کیا جا سکتا ہے

موجودہ دور کے ایک سائنس داں کے بقول :۔

"وجود باری کو دو اور دو چار کی طرح ثابت نہیں کیا جا سکتا اور نہ کسی عمل ہی سے اس کی ذات کا تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک غیر مادی وجود ہے۔ وہ ایک ایسی قوت ہے جو حکمت و دانائی، روحانیت، تخلیق اور ربوبیت کی جملہ صفات سے بدرجہ کمال آراستہ ہے۔ اگرچہ اس کے وجود کے اثبات کے لیے عام سائنسی طریق استدلال چنداں بارآور ثابت نہیں ہوتا لیکن مظاہر قدرت اور خود انسانی فطرت کی بوقلمونیاں صبح سے شام تک لاتعداد شہادتیں پیش کرتی ہیں کہ یہ کارخانہ ہست و بود الل ٹپ از خود وجود میں نہیں آ گیا۔ اس کے پیچھے کوئی کار فرما قوت امر، کوئی حکیم مدبر ضرور موجود ہے۔ یہ ساری شہادتیں بہت واضح ہیں"

خدا کا حسی مشاہدہ ممکن نہیں کیونکہ محسوسات کا دائرہ بہت تنگ ہے، خدا کی لامحدود ہستی اس دائرہ میں نہیں آ سکتی۔ خدا پر یقین کے لیے ہم اس کے حسی مشاہدہ کے قطعاً محتاج نہیں ہیں۔ آثار کائنات جو ہمارے چاروں طرف بکھرے ہوتے ہیں خدا کے وجود کی براہ راست گواہی دے رہے ہیں۔ آثار کائنات کسی کے اندر خدا کا یقین نہیں پیدا کرتے تھے تو جاننا چاہیے کہ اس کے یقین کا اس عالم میں اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

سازِ مغرب کی آواز

وسکونٹ سموئیل (Viscount Samuel) نے یکم نومبر ۱۹۶۱ء کو ہاؤس آف لارڈس میں کہا:۔

ہمارے بڑے بڑے شہروں میں جرم و بد اخلاقی کی بہتات ہے جو ہمارے دامنِ تہذیب پر اندوہناک دھبہ ہے۔ کم سن بچوں کے جرائم کے اعداد و شمار ہمارے لیے قابل غور انکشافات ہیں۔ اخبارات میں ہم ہر دن ننگ و گناہ اور سرحانہ قتل کی خبریں پڑھتے ہیں۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ جنسی انارکی، ہماری گزشتہ نسلوں کے مقابلے میں بہت عام ہو گئی ہے۔ نکاح کے رشتے مسلسل ٹوٹ رہے ہیں اور طلاقوں کی کثرت ہے۔

ہمیں اس بات پر خوف سے لرز جانا چاہیے کہ ہمارے درمیان سدوم اور عمورہ کی بدکاریاں رواج پا رہی ہیں، اگر یہ پھیل کر عام ہو گئیں تو ہمیں اسکی سزا زلزلوں اور آگ کی بارش سے بھی زیادہ سخت اور مہلک ملے گی۔ اس طرح کہ باشندگانِ ملک کی اخلاقی حس زہر آلود اور تباہ ہو جائے گی (انگریزی سے ترجمہ)

---

(۱) الاقتصاد فی الاعتقاد ص ۱۳

روزہ ــــ اسلام کا چوتھا ستون

(مولٰنا صدر الدین صاحب اصلاحی)

اسلام کی عمارت جن ستونوں پر قائم کی گئی ہے، ان میں سے ایک روزہ بھی ہے۔ روزے کا شرعی اصطلاحی نام صوم، یا صیام، ہے، جس کے لغوی معنی رکنے، کے ہیں۔ اس عمل کو صیام، اس لیے فرمایا گیا ہے کہ اس میں انسان صبح کی پو پھٹنے سے لیکر سورج کی ٹکیا غائب ہونے تک کھانے پینے اور جنسی ملاپ سے رکا رہتا ہے۔

روزے کی خاص اہمیتیں اور مصلحتیں روزے کے سلسلے میں جو احکام و ہدایات قرآن اور صاحبِ قرآن نے دی ہیں، ان پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ وہ متعدد دینی اہمیتوں اور مصلحتوں کا مالک ہے جن میں سے کچھ کی حیثیت بنیادی، اور بنیادی سے بھی آگے بڑھ کر امتیازی قسم کی ہے۔ روزے کو سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ان بنیادی اور ممتاز اہمیتوں اور مصلحتوں کو سمجھ لیا جائے۔ یہ اہمیتیں اور مصلحتیں درج ذیل ہیں:۔

(۱) روزہ، تقوی کا سرچشمہ سب سے پہلی اور سب سے نمایاں چیز تو یہ ہے کہ روزہ انسان میں خدا ترسی کی صفت اور تقوی کا جوہر پیدا کرتا ہے۔ اس بارے میں کتاب اور سنت اور عقل سب کی شہادتیں آپ کو موجود ملیں گی چنانچہ قرآن مجید نے روزے کی فرضیت کا جو اعلان کیا ہے اس میں یہ حقیقت صراحت سے مذکور ہے:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ (بقرہ ۱۸۳)

اے ایمان لانے والو تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جس طرح کہ تم سے پہلے کے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تمہارے اندر تقوی پیدا ہو سکے۔

اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:۔

اَلصَّوْمُ جُنَّةٌ

(مسلم جلد اول، باب فضل الصیام)

روزہ (دنیا میں گناہوں سے، اور آخرت میں دوزخ سے بچانے والی) ڈھال ہے۔

"روزہ گناہوں سے بچانے والی ڈھال ہے"، اس جملے کا مفہوم بعینہٖ وہی ہے جو اس بات کا ہے کہ روزہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا کرتا ہے۔ اسی سلسلہ میں آگے مزید ارشاد ہوتا ہے کہ :۔

فَاِذَا کَانَ یَوْمُ صَوْمِ اَحَدِکُمْ فَلَا یَرْفُثْ یَوْمَئِذٍ وَلَا یَسْخَبْ فَاِنْ سَابَّہٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَہٗ فَلْیَقُلْ اِنِّی صَائِمٌ اِنِّی صَائِمٌ (ایضاً)	پس جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو چاہیے کہ وہ نہ بدکلامی کرے نہ غل مچائے۔ اور اگر کوئی اس سے گالی گلوج کرنے یا لڑنے جھگڑنے پر اتر آئے تو اس سے بھی اور اپنے جی میں بھی، کہے کہ میں روزے سے ہوں، میں روزے سے ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ بدکلامی، گالی گلوج اور لڑائی جھگڑے وغیرہ بری حرکتوں سے بچنا ایک مومن کے لیے ہر حال میں ضروری ہے، لیکن جب وہ روزے سے ہو تو سلامت روی کا یہ رویہ اس کیلیے اور زیادہ ضروری ہو جاتا ہے۔ عام حالات میں اگر وہ اس طرح کی لغزشوں سے پوری طرح محفوظ نہیں رہ پاتا تو کم سے کم روزے کی حالت میں تو ان کے قریب ہرگز نہ جانا چاہیے۔ آپؐ کا یہ فرمانا دراصل اس بات کا اعلان ہے کہ روزہ، نیک روی اور خدا ترسی کی ایک مسلمہ تدبیر ہے، اور مسلمہ تدبیر بھی ایسی جس کی قوتِ تاثیر کسی نہ کسی پہلو سے، اپنی مثال آپ ہے۔

ان منصوص شہادتوں کے بعد اگرچہ کسی اور دلیل کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ لیکن دل کے مزید اطمینان کے لیے مناسب ہے کہ عقل کی نگاہوں سے بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کر لیا جائے، یعنی یہ بھی سمجھ لیا گیا کہ روزے سے تقویٰ کیوں اور کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ خود یہ تقویٰ کیا چیز ہے؟ یہ جان لینے کے بعد ہی یہ سمجھا جا سکے گا کہ روزے سے تقویٰ کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ، اللہ کی ناراضی سے بچنے کے اس گہرے احساس کا نام ہے جو آدمی کو ہر بھلے کام پر ابھارتا، اور ہر برے کام سے روکتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ تقویٰ ایک خاص قلبی کیفیت ہے، جس سے ایک خاص عملی رویہ وجود میں آتا ہے۔ یہ عملی رویہ اللہ کی اطاعت اور رضا جوئی کا رویہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دل بہرہ ور ہوتا ہے وہ ہر وقت یہ دیکھتا رہتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے ناراض نہ ہونے پائے، میں کوئی ایسی حرکت نہ کر جاؤں جس کو وہ پسند نہیں کرتا، اور کسی ایسے کام کے کر گذرنے سے رک نہ رہوں جسے وہ پسند کرتا ہے۔

اللہ کی ناراضی سے بچنے کی، اور اس کی خوشنودی حاصل کر لینے کی یہ خواہش اور کوشش، سوچیے، عملاً کب پوری ہو سکتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ یہ خواہش اور کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ انسان اپنے

آپ کو قابو میں رکھے، اور اپنے نفس کو من مانی کرنے سے روکے رہے۔ گویا تقویٰ کا مقام پا لینے کی واحد سبیل یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو لگام لگائے، اور اپنی خواہشوں میں اسے آزاد نہ چھوڑے۔ جیسا کہ قرآن مجید کی اس آیت سے صراحۃً معلوم ہوتا ہے:۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۙ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى ۝

(نازعات ۔ ۴۰-۴۱)

رہا وہ شخص جس نے اپنے دل میں یہ ڈر رکھا کہ اسے اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونا ہے اور اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا، تو یقیناً جنت ہی اس کا ٹھکانا ہوگی۔

اب روزے کو دیکھیے کہ وہ کیا چیز ہے؟ روزے کا بنیادی اور قانونی وجود تین باتوں پر منحصر ہے:۔ صبح صادق سے سورج ڈوبنے تک کچھ نہ کھایا جائے، کچھ نہ پیا جائے، جنسی خواہش پوری نہ کی جائے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ کھانے پینے اور جنسی ملاپ، نفس کے ان تین مطالبات سے بالکلیہ رکا رہا جائے۔ ان تینوں چیزوں کو نفس کے مجموعی مطالبات میں جو مقام حاصل ہے بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ انہی کے لیے مخصوص ہے۔ ایسی کسی اور خواہشِ نفس کا نام نہیں لیا جا سکتا جو اتنی ہمہ گیر، اتنی پُرزور اور اتنی بے پناہ ہو جیسی کہ یہ ہیں۔ ایک تو بجائے خود ان میں ایسی بلا کی قوت ہے کہ انسان کو آسانی سے زیر کر لیتی ہیں، دوسرے وہ صرف خواہشیں ہی نہیں ہیں، بلکہ انسان کی فطری ضرورتیں بھی ہیں، انہی پر اس کی بقائے ذات بھی موقوف ہے اور بقائے جنس بھی۔ وہ زندہ رہنے کے لیے کھانے پینے کا، اور اپنی نسل کا سلسلہ جاری رکھنے کے لیے جنسی ملاپ کا ہر حال میں ضرورت مند ہے۔ ان چیزوں کی یہ دوہری حیثیت ان کی قوت و اثر کو بھی لازماً دو آتشہ بنا دیتی ہے، اور ان کا مقابلہ مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے ـــــ روزے میں انہی تینوں سب سے زبردست خواہشوں پر قدغن ہوتی ہے۔ مسلسل ایک مہینے تک، روزانہ بارہ بارہ اور چودہ چودہ گھنٹے، انسان اپنے نفس کے ان مطالبات پر قفل ڈالے رہتا ہے۔ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے پڑے ہوتے ہیں، منہ سے آواز تک اچھی طرح نکل نہیں پاتی، ٹھنڈا پانی پاس رکھا ہوتا ہے نفس بے تاب ہو کر اسے ہونٹوں سے لگا لینا چاہتا ہے، مگر روزہ اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے اور وہ بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ یہی عالم دوسری دونوں خواہشوں کا بھی ہوتا ہے۔ اندازہ کیجیے کہ مسلسل تیس دنوں کی یہ مشق انسان میں صبر و ضبط کی کیسی کچھ قوت نہ پیدا کر دے گی؟ جو شخص اپنے نفس کی ان سب سے زیادہ مضبوط اور بے قرار خواہشوں کو بھی ایک قابلِ لحاظ وقت تک دبائے رکھنے کی مشق بہم پہنچا لیتا ہے، اس سے توقع یہی رکھی جائے گی کہ وہ اس کی دوسری خواہشوں کو اور زیادہ آسانی

اور کامیابی سے قابو میں رکھ سکے گا۔ یہ ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے جس کے اعتراف سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس حقیقت کا اعتراف دراصل اس امر کا اعتراف ہے کہ روزہ انسان کے اندر اپنے نفس کو اور اس کی ساری خواہشوں کو کنٹرول کرنے کی پوری طاقت پیدا کر دیتا ہے، ایسی طاقت جس کو پاکر وہ دین کی پیروی اور احکام الٰہی کی اطاعت میں نفس اور شیطان کی ساری مزاحمتوں سے بخوبی نمٹ سکتا ہے۔ یعنی وہ صحیح معنوں میں ایک خداترس اور متقی انسان بن جاتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے جس سے روزے تقویٰ کا غیر معمولی ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، اور جس کی طرف خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لفظوں میں کھلا ہوا اشارہ کیا ہے:۔

لَیْسَ فِی الصِّیَامِ رِیَاءٌ (فتح الباری جلد ۴) روزے میں ریا نہیں ہوا کرتی۔

کسی عبادت میں ریا کا نہ ہونا اس بات کی سب سے بڑی ضمانت ہے کہ وہ بندے کو خدا سے قریب کرنے والی ہے، اور یہ کہ ایسی عبادت سے زیادہ تقویٰ کا قابلِ اعتماد سرچشمہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ غلط نہ ہوگا اگر اسے تقویٰ کی سب سے زیادہ قوت بخش خوراک کہا جائے۔ رسولِ خدا کے ارشاد کے مطابق جب روزے کی یہ ایک مستقل صفت ہے کہ اس میں ریا نہیں ہوسکتی، تو اس کے تقویٰ کا موثر ذریعہ ہونے میں کیا کلام ہو سکتا ہے؟ اگر وہ عبادتیں انسان کو تقویٰ کی دولت سے مالا مال کر سکتی ہیں جن میں ریا کا دخل ہوتا رہتا ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ عبادت، بدرجۂ اولیٰ کر سکے گی جو اس روگ سے لازماً پاک ہی رہتی ہے۔

یہ بات کہ روزے میں ریا کیوں نہیں ہوسکتی، کوئی چھپا ہوا راز نہیں ہے، بلکہ آسانی سے سمجھ میں آجانے والی حقیقت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس کی نوعیت سرتاسر منفی ہے، یعنی وہ کچھ اعمال یا حرکات کے کرنے سے وجود میں نہیں آتی (جیسا کہ نماز اور زکوٰۃ اور حج کا حال ہے) بلکہ کچھ کاموں کے نہ کرنے سے وجود میں آتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اس طرح کی عبادت دوسروں کے نہ دیکھنے میں آسکتی ہے نہ سننے میں۔ اور جب کسی عبادت کا حال یہ ہو کہ اسے کوئی نہ دیکھ سکتا ہو نہ سن سکتا ہو تو اس میں ریا اور دکھاوے کا کوئی امکان بھی کہاں سے پیدا ہو سکتا ہے اس لیے سارے ارکانِ اسلام میں یہ امتیاز صرف ایک روزہ ہی کو حاصل ہے کہ ریاکاری کا خطرناک شیطان اس پر شب خون نہیں مار سکتا۔

بظاہر روزے کی یہی امتیازی حیثیت تھی جس کی بنا پر قرآن حکیم نے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ اگر فرمایا ہے تو صرف روزے کے حکم کے ساتھ فرمایا ہے، کسی اور عبادت کے حکم کے ساتھ ان لفظوں کا اعادہ نہیں کیا ہے، حالانکہ یہ

حقیقت اپنی جگہ مسلّم تھی کہ انسان میں نیکی کا جوہر اور تقویٰ کا نور ہر عبادت پیدا کرتی ہے مگر مقابلۃً روزہ کی یہی امتیازی حیثیت تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مخصوص اسی ایک فعلِ عبادت کو اپنا اپنے لیے فرمایا ہے اور اجر و ثواب کی میزان میں بھی اسے سب سے زیادہ باوزن عمل قرار دیا ہے۔

كُلُّ عَمَلِ ابْنِ اٰدَمَ يُضَاعَفُ الْحَسَنَةُ عَشْرُ اَمْثَالِهَا اِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِلَّا الصَّوْمَ فَاِنَّهٗ لِيْ وَاَنَا اَجْزِيْ بِهٖ يَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَطَعَامَهٗ لِاَجْلِيْ (مسلم ج اول، باب فضل الصیام)

انسان کے ہر عمل خیر کا اجر دس گنے سے لیکر سات سو گنے تک ملے گا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ لیکن روزہ اس سے مستثنیٰ ہے، کیونکہ وہ میرے لیے ہے، اور میں ہی اس کا (جتنا چاہوں گا) بدلہ دوں گا (آخر) انسان اپنی شہوت نفس اور اپنا کھانا پینا میری ہی خاطر تو روکے رہتا ہے۔

"روزہ میرے لیے ہے" یہ ارشاد دراصل اسی حقیقت کی ایک دل نواز تعبیر ہے کہ روزے میں ریا نہیں ہوا کرتی اگر روزے کا مقصد یہ ہے کہ انسان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو، جیسا کہ معلوم ہوا، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہی تقویٰ روزے کی اصل کسوٹی بھی ہے۔ روزہ کی صورت اور اس کا قانونی وجود اگر یہ ہے کہ انسان کھانے پینے اور جنسی یکجائی سے دور رہے تو اس کی حقیقت اور اس کا واقعی وجود یہ ہے کہ ان تمام باتوں سے دور رہا جائے جو اللہ تعالیٰ کو ناراض کرنے والی ہوں۔ اگر ایک شخص روزہ رکھ کر اپنی صرف انہی تین خواہشوں کو کنٹرول نہیں کرتا، بلکہ اپنی ساری خواہشوں کو احکام الٰہی کے کنٹرول میں دیدیتا ہے تو وہ حقیقی معنوں میں روزہ دار ہے۔ لیکن اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو اس کا روزہ روزہ نہیں بلکہ صرف فاقہ ہے۔ کیونکہ کھانے پینے اور جنسی خواہش سے اجتناب ہی اصل روزہ نہیں ہے، بلکہ اصل روزے کی صرف ظاہری صورت اور قانونی علامت ہے۔ اگر کوئی شخص اس ظاہری اور قانونی حد ہی تک جا کر رک رہا تو اس کا حال اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ روزے کے گھر کے چاروں طرف گھوم کر واپس چلا آیا، اس میں داخل ہی نہیں ہوا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم صاف فرماتے ہیں کہ:

كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهٗ مِنْ صِيَامِهٖ اِلَّا الظَّمَاُ (دارمی بحوالہ مشکوٰۃ)

کتنے ہی روزہ دار ایسے ہیں جن کے لیے اپنے روزے سے پیاس کے سوا اور کچھ نہیں پڑتا۔

یہ نام نہاد روزہ دار کس طرح کے لوگ ہوتے ہیں؟ اس کی وضاحت ایک دوسرا ارشاد نبوی اس طرح کرتا ہے:

مَنْ لَّمْ يَدَعْ قَوْلَ الزُّوْرِ وَالْعَمَلَ بِهٖ فَلَيْسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيْ اَنْ يَّدَعَ

جس کسی نے روزہ کی حالت میں جھوٹ بولنا اور جھوٹ پر عمل کرنا نہ چھوڑا تو جان لے کہ اللہ کو اس بات کی کوئی

طَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ (بخاری جلد اول کتاب الصوم)　　ضرورت نہیں کہ وہ شخص بس اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔

ان ارشادات سے یہ بات بالکل واضح کردی کہ نفس کے صرف ان تین مطالبات پر بندشیں لگانے کا مقصد دراصل اس کی تمام ہی خواہشوں پر قابو حاصل کرلینا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس مشق اور تربیت کے ذریعے اپنے نفس کو لگام نہ لگا سکا، اور روزہ کی حالت میں بھی اس کی شرارتیں بدستور جاری رہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے روزے کے مقصد ہی کو نہیں سمجھا، اور اگر سمجھا تو اسے اپنایا نہیں۔ اور جب اس نے روزے کے مقصد کو سمجھا یا اپنایا ہی نہیں تو کوئی شک نہیں کہ وہ روزہ رکھ کر بھی بے روزے کا رہا، اور حقیقت کے اعتبار سے اس میں اور ایک بے روزہ شخص میں کوئی فرق نہیں۔

۲- روزہ، تقوے کا لازمی ذریعہ روزے کی دوسری بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر تقویٰ کی مطلوبہ صفت پیدا کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ یعنی بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ روزہ تقویٰ پیدا کرتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر صحیح تقویٰ پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ بلاشبہ اور بہت سی چیزیں بھی ہیں جو تقویٰ کو نشوونما دیتی ہیں، مگر روزہ اس سلسلہ میں جو کام کرتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے، دوسری کوئی چیز اس کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ یہ حقیقت ہمیں مذکورہ بالا آیت کے الفاظ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کے اندر سے جھانکتی دکھائی دیتی ہے۔ محسوس کیجیے، اس آیت کا منشا اگر صرف یہ بتانا ہوتا کہ روزے مسلمانوں پر اس لیے فرض کیے گئے ہیں تاکہ ان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوسکے، تو ان لفظوں کے اضافے کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے کہ اس صورت میں ان لفظوں کا اضافہ تاریخ کے ایک واقعہ کے اظہار و بیان سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رکھتا حالانکہ ہم سب جانتے ہیں کہ قرآن حکیم تاریخ نگاری سے بہت اونچا ہے، اور وہ اس وقت تک کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولتا جب تک کہ اس سے کوئی دینی غرض وابستہ نہ ہو۔ اس لیے ان لفظوں کے بارے میں بھی اسے ایک طے شدہ حقیقت سمجھنا چاہیے کہ ان کا اضافہ یقیناً کسی نہ کسی دینی غرض اور مصلحت ہی سے کیا گیا ہے۔ یہ دینی غرض اور مصلحت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ ساتھ کے ساتھ حصول تقویٰ کے بارے میں روزے کی ناگزیر ضرورت کا بھی اظہار ہوجائے، یعنی لوگوں کو روزے کی فرضیت اور اس کی غرض وغایت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوجائے کہ تقویٰ کے مقام مطلوب تک پہنچنے کے لیے روزے بہرحال ضروری ہیں، کوئی بھی دوسری چیز اس سلسلے میں وہ کام نہیں کرسکتی جسے یہ روزے انجام دے سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو روزہ ہر آسمانی شریعت کا ستون نہ بنا رہتا۔ اگر کوئی شریعت اس سے خالی نہیں رہی تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ کے دین کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کی طرح روزے کو بھی ایک فطری مناسبت ہے اور اس

کے بغیر اس کا مربتی نظامِ عبادت کسی طرح مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ روزے تقویٰ کا مطلوبہ جوہر پیدا کرنے کے لیے کیوں ضروری ہیں، اس کے سمجھنے کے لیے ہمیں پچھلی بحث ہی کو ایک بار پھر پڑھ لینا چاہیے، جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ روزہ انسان کے اندر تقویٰ کس طرح پیدا کرتا ہے؟ یہ امر واقعی کہ روزہ انسان میں ضبطِ نفس پیدا کرنے کا بڑا موثر ذریعہ اور بہت قریب کا راستہ ہے، اور یہ حقیقت کہ روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں ریا دخیل نہیں ہو سکتی، یہ دونوں چیزیں اس بات کے سمجھانے کے لیے بہت کچھ کافی ہیں، وہ اس راز کو، اگر پوری طرح نہیں تو، ایک بڑی حد تک ضرور کھول دیتی ہیں کہ ایک عام انسان کے لیے روزے کیوں ناگزیر ہیں؟ ذہن کی باقی گرہیں ان شاء اللہ اس بحث کے پڑھنے سے کھل جائیں گی جو آگے آرہی ہے۔

۳۔ روزہ اسلامی تصورِ تقویٰ کا آئینہ

روزے کی تیسری اہمیت یہ ہے کہ وہ بعض اعتبارات سے اسلام کے اصل مزاج کا سب سے بڑا شارح ہے، اور دین کا جو تصور اس نے دیا ہے اس کے امتیازی خط و خال روزے کے آئینے میں سب سے زیادہ واضح شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ انسان کو صرف عمل ہی کا متقی نہیں بناتا، بلکہ فکر و نظر کا بھی 'متقی' بناتا ہے، وہ انسان کو صرف تقویٰ نہیں دیتا، بلکہ تقوے کا جامع اور مانع مفہوم بھی دیتا ہے۔ اس اجمال کی شرح، یا اس حقیقت کا سراغ ہمیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ملتا ہے:-

۱۔ لَا صَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ — جس نے زندگی بھر مسلسل روزے رکھے اس کا روزہ روزہ نہیں۔
(بخاری جلد اول، کتاب الصوم)

إِيَّاكُمْ وَالْوِصَالَ — تمہیں دو یا دو سے زائد دنوں کو ملا کر (بلا سحری و افطار) روزہ رکھنے سے پوری طرح دور رہنا چاہیے۔
(مسلم جلد اول، کتاب الصیام)

۲۔ ایک سفر کے دوران آپ نے دیکھا کہ لوگوں کی ایک بھیڑ اکٹھی ہے اور ایک شخص کے اوپر سایہ کر رکھا گیا ہے، دریافت فرمایا کہ کیا معاملہ ہے؟ بتایا گیا کہ "ایک روزہ دار ہے" ارشاد ہوا کہ:-

لَيْسَ مِنَ الْبِرِّ الصَّوْمُ فِي السَّفَرِ — یہ کوئی نیکی کا کام نہیں ہے کہ سفر میں (اس طرح کا) روزہ رکھا جائے (جس کی مشقتیں عام قوت برداشت سے باہر ہوں)
(بخاری جلد اول، کتاب الصوم)

۴۔ بیرون مدینہ کے رہنے والے ایک صحابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، ملاقات کی، اور واپس چلے گئے۔ سال بھر بعد دوبارہ آئے۔ اور اب جو آئے تو اس حال میں تھے کہ ان کی شکل و صورت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ انھوں نے آپ سے پوچھا کہ "اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے پہچان نہیں رہے ہیں؟" آپ نے دریافت فرمایا "تم کون ہو؟" جواب دیا "میں وہی شخص تو ہوں جو گذشتہ سال حاضرِ خدمت ہوا تھا۔" ارشاد ہوا "کس چیز نے تمہاری ہیئت بدل کر رکھ دی ہے؟ تم تو بڑی اچھی شکل و صورت کے تھے۔" انھوں نے بتایا کہ یہاں سے واپس جانے کے بعد آج تک میں نے رات کے سوا کبھی کھانا نہیں کھایا (یعنی مسلسل روزے رکھتا رہا)۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا:۔

لِمَ عَذَّبْتَ نَفْسَكَ (ابوداؤد ج اول کتاب الصیام) تم نے اپنے کو کیوں عذاب دیا؟

ان حدیثوں کے دروس تقاضوں پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ روزہ ان کی زبان سے دین داری کے ایک انقلابی تصور کا اعلان کرتا ہے، وہ زور و تحکم کہتا ہے کہ جس تقوے کو میرا مقصد قرار دیا گیا ہے، اس کا منشا نفس کشی نہیں، بلکہ صرف ضبطِ نفس ہے۔ گویا روزہ، تقوی صرف پیدا ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی ایک ایسی حقیقت بھی سمجھاتا ہے جو عام طور سے بہت کم سمجھی اور جانی جاتی ہے۔ کیونکہ تقوی، کا لفظ سنتے ہی ذہنوں کے اندر عموماً کچھ اس طرح کا تصور پھرنے لگتا ہے کہ انسان اپنے نفس کے مطالبات ٹھکرا دینے میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھتا جائے، جو شخص اپنے نفس کو جتنا ہی زیادہ مارے گا تقوی کا اتنا ہی اونچا مقام حاصل کرے گا، جیسا کہ خود قرآن نے اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فرما کر بتادیا ہے کہ خوفِ خدا (یعنی تقوی) اپنے نفس کو اس کی خواہشوں سے باز رکھے بغیر حاصل نہیں ہوتا! لیکن رسول خدا کے یہ ارشادات کہتے ہیں، اور روزہ اپنے وجود سے تلقین کرتا رہتا ہے کہ آیت کا منشا اور مطالبہ یہ ہرگز نہیں ہے، اور اسلام میں تقوی کا جو مفہوم ہے وہ اس سے بالکل مختلف چیز ہے۔ وہ جس طرزِ عمل کا انسان سے مطالبہ کرتا اور جس چیز کو بِر (نیکی) اور تقوی (خدا ترسی) ٹھیراتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کو سرکش نہ ہونے دے اور اسے من مانی کرنے سے روک کر احکام شریعت کا تابع بنائے رکھے، یہ نہیں کہ اسے اذیتیں دے دے کر بے دم بنا لے، اور اس کے جبلی مطالبات کو ختم کر کے رکھ دے۔ دوسروں کے نزدیک یہ دین داری کا چاہے کتنا ہی بلند اور مقدس تصور کیوں نہ ہو اسلام کے نزدیک قطعاً ایک ناپسندیدہ چیز ہے، وہ اسے حقیقی دین داری اور صحیح بندگی کا طریقہ نہیں کہتا، اس کے تصورِ دین کی رو سے یہ تقوی نہیں ہے، بلکہ اپنے آپ کو 'عذاب' دینا ہے۔ روزہ کا وجود اس حقیقت کی ایک مستقل یاد دہانی ہے۔

(۱) تَسَحَّرُوْا فَاِنَّ فِی السَّحُوْرِ بَرَکَةً (مسلم جلد اول، باب فضل السحور)

سحری کھالیا کرو۔ کیونکہ سحری کھانے میں ایک بڑی برکت ہے۔

(۲) لَا یَزَالُ النَّاسُ بِخَیْرٍ مَّا عَجَّلُوا الْفِطْرَ (ایضاً)

جب تک لوگ افطار کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے حالت خیر میں رہیں گے۔

(۳) لَا یَزَالُ الدِّیْنُ ظَاهِرًا مَّا عَجَّلَ النَّاسُ الْفِطْرَ (ابوداؤد جلد اول، کتاب الصیام)

دین اس وقت تک برابر غالب رہے گا جب تک کہ لوگ افطار کرنے میں عجلت سے کام لیتے رہیں گے۔

(۴) قَالَ اللّٰهُ عَزَّ وَجَلَّ اَحَبُّ عِبَادِیْ اِلَیَّ اَعْجَلُهُمْ فِطْرًا (ترمذی بحوالہ ریاض الصالحین)

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے سب سے زیادہ محبوب بندہ وہ ہے جو افطار کرنے میں سب سے زیادہ جلدی کرتا ہے۔

پچھلی حدیثوں سے جس اہم اور انقلابی حقیقت کا سراغ ملا تھا، یہ حدیثیں اس کو اور زیادہ روشنی میں لا رہی ہیں، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس کی تکمیل کر رہی ہیں۔ ان حدیثوں کی زبانی اگر روزے نے یہ بتایا تھا کہ تقوے کا منشا نفس کشی نہیں بلکہ صرف ضبطِ نفس ہے، تو ان حدیثوں کی زبانی وہ اس 'ضبطِ نفس' کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس میں 'ضبطِ رائے' اور 'ضبطِ ذوق' بھی داخل ہے۔ یعنی جس طرح اپنے نفس کو احکام الٰہی کے تابع رکھا جائے اسی طرح احکام الٰہی کی پیروی کرنے میں اپنے ذوق و رجحان اور اپنی رائے کو بھی کسی طرح کی آزادی نہ دی جائے۔ حقیقی تقوے کا اصل مقام صرف اتنی بات سے حاصل نہیں ہو جاتا کہ نفس کو احکام خدا و رسول کی مخالفت سے باز رکھا جائے، بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان احکام کی بجا آوری اور رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی رائے اپنے رجحان اور اپنے ذوق کو کسی وقت بھی کچھ بولنے کا حق نہ دیا جائے جبکہ وہ بظاہر خدا پرستی کے حق میں جاتے نظر آتے ہوں۔ انسان کو خدا کی بندگی، نفیاً اور اثباتاً، ہر حیثیت سے ٹھیک اسی شکل میں کرنی چاہیے جس کی اسے اوپر سے ہدایت ملی ہو۔ وہ جس طرح اپنے نفس کی ان خواہشوں کو دیوار پر دے مارتا ہے جو اسے احکام دین کی بجا آوری سے روک رہی ہوں، اسی طرح ان احکام کی بجا آوری کی شکلیں اور حدیں مقرر کرنے میں بھی اپنے جی کی کوئی بات نہ سنے۔ وہ اللہ کی بندگی اور تقوی کی زندگی صرف اس چیز کو سمجھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جس کام کو جس طرح، اور جس شکل میں، کرنے کو کہا ہے اسے ٹھیک اسی طرح، اور اسی شکل میں، انجام دیا جائے، اور جس بات سے جس حد تک، اور جس شکل میں، روکا ہے اس سے بس اسی حد تک، اور اسی شکل میں، رکا جائے۔ اس کا دل اس حقیقت پر مطمئن ہو کہ جس طرح فلاں کام دین کا حکم ہے اور اس کا کرنا نیکی اور تقاضائے بندگی ہے، اسی طرح یہ بھی نیکی اور تقاضائے بندگی ہی ہے کہ جذبۂ اطاعت کے تحت

بھی اس کی حدود اور مقداریں اپنی طرف سے کوئی اضافہ نہ کیا جائے۔

روزہ ضبطِ نفس کے ساتھ ضبطِ رائے، اور ضبطِ ذوق، کو بھی تقوے کے مفہوم میں جس طرح شامل بتاتا ہے، وہ کسی لمبی چوڑی توضیح کا محتاج نہیں۔ ایک طرف تو یہ بات کہ روزے کے فرض کیے جانے کی غرض وغایت تقوی کا حصول ہے، دوسری طرف یہ تنبیہ کہ سحری کھائے بغیر روزہ رکھنا ایک بڑی برکت سے محروم ہونا، اور افطار میں دیر لگانا حالتِ خیر اور غلبۂ دین کے ختم ہوجانے کی علامت ہے۔ ان دونوں باتوں کو ایک ساتھ رکھ کر دیکھیے تو صاف معلوم ہوگا کہ سحری نہ کھانا اور افطار دیر سے کرنا منشائے تقوی کے خلاف ہے۔ حالانکہ ان باتوں سے نفس کو کوئی رعایت نہیں ملتی، بلکہ اس کی سرکشی کو ختم کرنے میں کچھ اور مدد ہی ملتی ہے، اس لیے یہ باتیں بظاہر روزے کے مقصد (تقوی) کے حصول میں سازگار ہی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اللہ کا رسول فرماتا ہے کہ حقیقت اس کے خلاف ہے۔ کیوں؟ اس 'کیوں' کے جواب میں اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس طرح روزہ رکھنے میں اپنی رائے اور اپنے ذوق کو بھی دخیل بنالیا جاتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کی جو ابتدا، اور جو انتہا مقرر کردی ہے سحری نہ کھانے اور افطار میں دیر لگانے سے ان کا پورا پورا احترام باقی نہیں رہ جاتا، انہی کا روزے کی ابتداء اور انتہاء ہونا پسندِ خاطر نظر نہیں آتا، انہی کو فیصلہ کن اہمیت ملتی دکھائی نہیں دیتی، بلکہ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ روزے کی اس متعینہ مدت کو کافی نہیں سمجھا جاتا، اور اسے بڑھا دینا مقصد برآری کے لیے زیادہ موزوں اور مفید خیال کیا جاتا ہے۔ اور کوئی شک نہیں کہ یہ صاف طور پر اپنی رائے اور اپنے ذوق کو عبادت کے معاملہ میں دخیل قرار دینا ہے۔ اگر سحری نہ کھانے اور افطار دیر سے کرنے کو باعثِ محرومی اور خلافِ تقوی ٹھیرائے جانے کی وجہ اس ایک بات کے سوا اور کوئی نہیں ہے، جیسا کہ بظاہر یقیناً نہیں ہے، تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ روزہ تقوی کا صحیح مفہوم ومنشا صرف ضبطِ نفس ہی کو نہیں بتاتا، بلکہ ضبطِ رائے اور ضبطِ ذوق، کو بھی اس میں لازماً شامل قرار دیتا ہے۔ وہ حقیقی تقوے کی تعبیر یہ کرتا ہے کہ نفس کی خواہشوں کی طرح ذوق و رائے کی آزادیوں پر بھی احکام الٰہی کا پورا پورا کنٹرول ہو[1]۔

---

[1] حقیقی تقوی کا یہ تصور اور مذکورہ بالا ارشاداتِ رسول عام مذہبی ذہنوں کو بڑے عجیب معلوم ہوں گے۔ مگر یہی امتیاز دراصل دینِ حق کا وہ خاص وصف ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہی مذہبی ذہنیت

تھی جس کے پیش نظر اس طرح کے ارشادات پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں۔ یہ فرماتے وقت آپ کے سامنے پچھلی امتوں کی تاریخ تھی، تحریف ادیان کے تجربے تھے، نفس کشی اور رہبانیت کے فلسفے تھے۔ آپ کو معلوم تھا کہ اللہ کے دین کو صرف نفس کے پجاری ہی ملیامیٹ نہیں کرتے رہے ہیں، بلکہ پاک نفسوں کا غلو اور تشدد بھی اس کو نئی ہیئت اور نیا مزاج دیتے رہے ہیں، اور جس چیز اور جس عبادت میں یہ تشدد پسندی سب سے زیادہ راہ پاتی رہی ہے وہ یہی روزہ ہے۔ روزے کی عبادت کو لوگوں نے مسلسل فاقہ کشی کی شکل دیدی اور اس معصوم یقین کے ساتھ دے دی کہ فاقہ جتنا ہی زیادہ لمبا ہوگا روزے کا مقصد اتنا ہی زیادہ کامل شکل میں پورا ہوگا۔ پھر یہ طرز فکر آگے بڑھا اور نفس کشی و رہبانیت دین داری کا کمال بن گئی۔ یہ وہ پس منظر تھا جس کی موجودگی میں، اللہ کے آخری رسول ہونے کی حیثیت سے، آپ نے بطور پیغمبر ضروری سمجھا کہ لوگوں کو اچھی طرح متنبہ کردیں، اور ان خطرات سے اسلام کے اچھی طرح محفوظ رہنے کا پورا پورا سامان کر جائیں جو ہمیشہ سے دین خداوندی کو پیش آتے رہے ہیں اور اسے بدل کر کچھ سے کچھ بناتے رہے ہیں، اور اس غرض سے روزے کے نام پر نفس کشی، ترک لذات اور رہبانیت کے دل فریب تصورات کی بنیاد کا پڑنے سے مضبوطی کے ساتھ روک دیں۔ اس لیے یہ بات آپ نے اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کرادی کہ اللہ تعالیٰ نے روزے کی جو ابتداء اور انتہا مقرر کی ہے ٹھیک اسی پر قرار رکھا جائے، اور اس کی مدت میں کوئی توسیع بطور خود ہرگز نہ کی جائے۔ ورنہ تم اس خوش گمانی میں مبتلا رہو گے کہ ہمارا یہ عمل للہ وفی اللہ ہے، اس لیے اس سے ہمارا اور زیادہ بھلا ہوگا، مگر حقیقت حال کچھ دوسری ہی ہوگی۔ کیونکہ تمہارا یہ کام بظاہر نیکی و طاعت کا کام، اور نیت کے اعتبار سے للہ وفی اللہ سہی، مگر اس کے ساتھ یہ بھی تو ہوگا کہ وہ دین کے اصل مزاج اور بندگی کے حقیقی تصور کو باقی نہ رہنے دیگا۔ اور یہ ایسی عظیم محرومی ہے جس کی تلافی کسی طرح نہ ہو سکے گی۔ دین کی علمبردار امت اگر یہی نہ جانتی ہوگی کہ ٹھیک ٹھیک اس کی راہ اور منزل کیا ہے، تو وہ اپنے فریضے کو صحیح طریقے سے انجام کس طرح دے سکے گی؟ اس اہم ترین مصلحت کو اگر سامنے رکھا جائے تو نظر آئے گا کہ سحری اور افطار کا بظاہر ایک معمولی سا مسئلہ فی الواقع ایک بہت ہی عظیم مسئلہ ہے، یہ دراصل دین کے صحیح تصور کی بقا کا مسئلہ ہے۔ سحری اور افطار کی ان شرعی ہدایتوں پر عمل کرنا درحقیقت دین کے حقیقی مزاج کو محفوظ رکھنے کی ایک ناگزیر تدبیر ہے، اور انھیں پس پشت ڈال دینا اس مزاج میں بگاڑ پیدا ہوجانے کا دروازہ کھول دینا ہے۔ اس طرح دین اپنا مزاج تبدیل کر کے اگر جزوی طور پر بھی رہبانیت کی شکل اختیار کر گیا تو یہ واقعہ ہے کہ امت کے حالت خیر میں رہنے اور دین کے غالب و نافذ رہنے کا معاملہ بحال رہ جانے کا نہیں۔

روزے کی ان غیر معمولی اہمیتوں پر نظر ڈالیے تو یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہ رہ جائے گا کہ اسے اسلام کا
یہ ستون کیوں بنایا گیا ہے، اور اس کے بغیر دین کی عمارت کیوں نہیں بن سکتی؟

روزے کے بعض خاص ثمرات یہ جان لینے کے بعد کہ روزہ انسان کو تقوے کے حقیقی جوہر سے آراستہ کر دیتا ہے، فی الواقع اب کوئی اور چیز جاننے کی باقی
نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ جس شخص میں تقوی کا نور پیدا ہو گیا، اس سے وہی کچھ سرزد ہوگا جسے اللہ اور اس کا رسول
چاہتا ہے، اور یہ وہ چیز ہے جس میں دین کی ساری مطلوبہ چیزیں سمائی ہوئی ہیں۔ لیکن پھر بھی بعض صفات اور
اعمال ایسے ہیں جو روزے کے بڑے نمایاں اور اہم ثمرات کی حیثیت رکھتے ہیں، اس لیے روزے کا مقام عظمت
پوری طرح محسوس کرنے میں آسانی ہوگی اگر ان پر بھی ایک نظر ڈال لی جائے:۔

(۱) روزہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ حاکمیت کا یقین حق الیقین سے بدل دیتا ہے۔ سحر کا وقت آیا، اٹھو اور کھا پی
لو۔ افق پر صبح کی سفید دھاری دکھائی دینے لگی، کھانے پینے سے ہاتھ روک لو۔ اب شام تک، ہر طرح کی پاک
اور لذیذ نعمتیں رکھنے کے باوجود، بھوکے پیاسے رہو۔ سورج ڈوب گیا، روزہ کی حالت ختم کر دو اور کچھ نہ کچھ ضروری
کھا پی لو۔ حکم اور تعمیلِ حکم کا، آقائی اور غلامی کا، یہ ایسا غیر معمولی مظاہرہ ہے جس کی نظیر کسی دوسرے عملِ شریعت
میں مشکل ہی سے ملے گی۔ یہ صورت حال، بلاشبہ، اللہ تعالیٰ کے حاکم و فرماں روائے مطلق ہونے کو گویا آنکھوں
دیکھی حقیقت بنا دیتی ہے۔

(۲) روزہ اسلامی معاشرے میں ہمدردی اور مواسات کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے۔ وہ مال داروں کو مسلسل
ایک ماہ تک ناداری کے عملی تجربے کراتا رہتا ہے۔ وہ انہیں کم از کم تیس بار یہ محسوس کراتا ہے کہ فاقہ اور بھوک کسے
کہتے ہیں، اور ان بندگانِ خدا کے دلوں پر کیا گذرتی ہوگی جو ان کے شکار رہا کرتے ہیں؟ یہ عملی تجربہ اور یہ احساس
قدرتی طور پر ان کے اندر یہ عزم پیدا کر دیتا ہے کہ اپنے غریب اور نادار بھائیوں کو ان کے اپنے حال پر نہ چھوڑیں گے۔
اس طرح ان میں انسانی ہمدردی اور انفاق فی سبیل اللہ کا جذبہ روزے میں فزوں سے فزوں تر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے مہینے کو اسی بنا پر "شَهْرُ الْمُوَاسَاةِ" (ہمدردی کا مہینہ) فرمایا ہے (مشکوٰۃ
کتاب الصوم) اور خود آپ کا حال اس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ "نہ کسی قیدی کو قید میں باقی رکھتے، اور نہ کسی سائل
کو محروم واپس کرتے"، (اِذَا دَخَلَ شَهْرُ رَمَضَانَ اَطْلَقَ كُلَّ اَسِيْرٍ وَّاَعْطٰى كُلَّ سَائِلٍ۔ مشکوٰۃ کتاب الصوم) اور
بقول حضرت ابن عباسؓ، اگرچہ آپ سب سے بڑے فیاض انسان تھے، مگر رمضان کے مہینے میں آپ کی فیاضی

پر معمولی حد تک بڑھ جاتی تھی (کان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اجود الناس بالخیر وکان اجود ما یکون فی رمضان بخاری کتاب الصوم)

(۳) روزہ مساوات کے شعور کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیتا ہے۔ اس مہینے میں امیر اور غریب، راعی اور رعایا، خاص اور عام، غرض امت کے سارے افراد، نمایاں حد تک، ایک سی حالت میں ہوتے ہیں۔ سب کے سب غلامی کی ایک ہی سطح پر کھڑے ہوتے ہیں۔ سب کے چہروں سے ایک ہی اقتدار اعلیٰ کی محکومی کا، اور یکساں محکومی کا، اعلان ہو رہا ہوتا ہے۔ یہ صورت حال ان کے اندر سے اونچ نیچ کے خیال کو نکال باہر کرتی ہے، اور اس طرح پوری فضا پر حقیقی مساوات کا گہرا رنگ چھا جاتا ہے۔

(۴) روزہ مومن کو جہاد فی سبیل اللہ کے لیے تیار کرتا ہے۔ جہاد میں اللہ کی رضا کے لیے بھوک کی، پیاس کی، بے آرامی کی مشقتیں جھیلنی پڑتی ہیں، اپنی دولت کو خرچ کرنا پڑتا ہے، اپنی جان کو قربان کرنا ہوتا ہے۔ اتنی کڑی مہم کی جرأت وہی کر سکتا ہے جس میں صبر اور برداشت کی قوت موجود ہو اور جو یہ مشقتیں اٹھا سکتا اور یہ قربانیاں دے سکتا ہو۔ روزہ اس قوتِ صبر کے پیدا کرنے کا، اور ان مشقتوں کا خوگر بنانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی بنا پر رمضان کے مہینے کو "شَهْرُ الصَّبْرِ" یعنی صبر کا مہینہ بھی فرمایا ہے (مشکوۃ کتاب الصیام) اور روزے کو "آدھا صبر" قرار دیا ہے۔

(۵) فرض روزہ رکھنے کا جو طریقہ بتایا گیا ہے وہ ملی اجتماعیت کے احساس کو جلا دیتا ہے، اور مسلمانوں کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ تم سب ایک ہی مشن کے علم بردار ہو۔ حکم ہے کہ ایک ہی متعینہ مہینے (رمضان) میں روزہ رکھا جائے، ہدایت ہے کہ طلوعِ فجر سے ذرا دیر پہلے سحری کھائی جائے اور سورج ڈوبتے ہی افطار کر لی جائے۔ اس طرح روزہ رکھنے کی شکل یہ بن جاتی ہے کہ سارے کے سارے لوگ ایک ہی مقررہ مہینے میں ایک ساتھ روزہ رکھتے ہیں، تقریباً ایک ہی وقت میں سحری کھاتے ہیں، اور ایک ہی وقت پر افطار کرتے ہیں۔ کسی گروہ کے افراد کو ایک ہی مقصد کے حامل اور ایک ہی مہم کے سپاہی ہونے کا احساس دلانے کی یہ کیسی غیر معمولی اور کتنی لطیف تدبیر ہے کہ ان کا کھانا پینا تک بھی ٹھیک ایک ہی ساتھ ہو، ایک ہی نوعیت کا ہو، اور ایک ہی مقصد کے تحت ہو۔

حصول مقاصد کی شرطیں

ہر دوسری عبادت اور عمل کی طرح روزے کے بھی یہ مقاصد اور ثمرات اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ:۔

(۱) وہ ضروری آداب اور شرائط کے ساتھ رکھا جائے۔ دل میں اللہ تعالیٰ کی معبودیت کا اور اپنی عبودیت

کا یقین ہو، نیت میں خلوص ہو، آقائے حقیقی کی اطاعت کا جذبہ ہو، رضائے الٰہی کی طلب ہو، فلاحِ آخرت کی آرزو ہو۔ یعنی یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے لفظوں میں روزہ "ایمان اور احتساب" کے ساتھ رکھا گیا ہو۔ اگر دل اللہ کی حاکمیت اور معبودیت کے یقین سے، اور نیت اجر آخرت کی طلب سے بے بہرہ ہو تو پھر روزہ، روزہ نہیں، فاقۂ محض ہے۔ دیکھنے اور کہنے میں تو اسلام کی عمارت کا ایک ضروری رکن تعمیر ہو رہا ہوگا، مگر فی الواقع وہاں تعمیر نام کی کوئی چیز موجود نہ ہوگی۔

(۲) صرف فرض روزوں ہی پر اکتفا نہ کر لی جائے، بلکہ نفل روزے بھی رکھے جائیں تاکہ ان مقاصد کی رہ رہ کر برابر یاد دہانی ہوتی رہے جن کے لیے روزہ فرض کیا گیا ہے، اور رمضان کے بعد دوسرے مہینوں میں بھی تربیت نفس کی اس موثر عملی تدبیر کا تھوڑا بہت اعادہ ہوتا رہے۔ نفل روزے کتنے اور کن دنوں میں رکھے جائیں، اس کے لیے احادیث میں مفصل ہدایتیں موجود ہیں ہر شخص اپنی طاقت اور اپنے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب خود ہی کر سکتا ہے۔

"میری زندگی کا ایک اہم واقعہ"

ہر شخص کی زندگی کے کسی نہ کسی دور میں کوئی ایسا اہم واقعہ ضرور پیش آیا ہے جسنے اس کی زندگی کو متاثر کیا ہے اور رہنمائی کی ہے۔ ہم آپ ان واقعات کی روشنی میں اپنی زندگی کو خوشگوار اور باعث رحمت بنا سکتے ہیں۔

"رضوان" کا تیسرا خاص نمبر اسی موضوع پر ۲۵ جنوری ۶۲ء کو شائع ہو رہا ہے جسمیں ممتاز اہل علم و قلم اور دوسرے بہن بھائی شرکت کر رہے ہیں۔ سبق آموز واقعات، موثر اصلاحی تاثرات

نصیحت کی نصیحت، کہانی کی کہانی

قیمت ایک روپیہ —— سالانہ چندہ تین روپیہ پاکستان تین روپیہ پچاس پیسے،

مستقل خریداروں کو سالانہ چندہ میں دیا جائیگا۔ خلاف سے منگانے کیلئے فیس رجسٹری پچاس نئے پیسے ارسال کیجیے۔

نوٹ! پاکستانی حضرات اپنا چندہ ۵۰/۳ حسب ذیل پتہ پر روانہ فرما کر ڈاکخانہ کی پہلی رسید ہمکو ارسال کریں۔

"ادارہ نشر و اشاعت اسلامیات متصل خیر المدارس ملتان"

دفتر ماہنامہ "رضوان" ۳۷ گوئن روڈ لکھنؤ (یوپی)

تصحیح جنوری ۶۲ء کے شمارے میں تاہ پرستاز ثقافت کی ذوقی ہوئی شام کے عنوان سے جو ترجمہ چھپا ہے وہ محترم ش، ن، عثمانی کا لکھا ہوا ہے غلطی سے نام چھپنے کا

تنقید و تبصرہ

سود

مصنفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی صفحات ۳۱۵ قیمت قسم اعلیٰ ۹ر سستا اڈیشن ۴ر

ناشر: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳ ای شاہ عالم مارکیٹ ۔ لاہور

جب سے مغربی اقوام کا استیلاء ہوا ہے، دنیا طرح طرح کے فساد سے بھر گئی ہے۔ ان میں ایک بڑا فساد سود ہے یہ مالیات کے تمام شعبوں میں اس طرح نفوذ کر گیا ہے جس طرح پاگل کتے کا زہر اس شخص کی رگ و پے میں سرایت کر جاتا ہے جسے وہ کاٹ کھائے، سودی نظام ماحول پر اس طرح چھا گیا ہے کہ مغربی علوم و فنون کے فیضیاب لوگ ہی نہیں علوم دینی کے بعض حاملین بھی بینک کے سود اور بعض دوسرے اقسام ربا کے جواز کا فتویٰ دینے لگے ہیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بہت سے علمی احسانات ہیں ایک احسان یہ بھی ہے کہ انھوں نے اس مسئلے کی شرعی نوعیت اور اس کے اطراف و جوانب پر سیر حاصل بحثیں کی ہیں اور ایک لمبے عرصے سے یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کی انہیں خدمات کا مجموعہ ہے۔ ہم ذیل میں خود ان کا تحریر کردہ دیباچہ ترتیب جدید نقل کر رہے ہیں اس سے معلوم ہوگا کہ اس کتاب میں کیا ہے: ۔

> یہ کتاب میرے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو میں نے ۱۹۳۶ء سے ۱۹۶۰ء تک مختلف زمانوں میں سود کے موضوع پر لکھے ہیں۔ اس سے پہلے "سود" کے نام سے میری ایک کتاب دو جلدوں میں طبع ہوئی تھی، لیکن اس کی اشاعت ایسے حالات میں ہوئی کہ مجھے نہ اسے باقاعدہ مرتب کرنے کا موقع ملا اور نہ میں اس کی ترتیب درست کر سکا اس لیے عام ناظرین کو چاہیے اس میں کچھ کام کا مواد ملا ہو مگر وہ منتشر صورت میں ملا۔ اب میں نے اس "سود" کو دو مستقل کتابوں کی صورت میں نئے سرے سے مرتب کر دیا ہے۔ ان میں سے ایک کتاب "اسلام اور جدید معاشی نظریات" کے نام سے کچھ مدت پہلے شائع ہو چکی ہے اب یہ دوسری کتاب سود کے نام سے ان تمام مضامین پر مشتمل ہے جو اب تک میں نے اس موضوع کے متعلق لکھے ہیں۔ امید ہے کہ اس نئی صورت میں یہ کتاب ان لوگوں کے لیے زیادہ مفید ہوگی جو اس مسئلے کو سمجھنا چاہتے ہیں

اس کے آخر میں تین ضمیمے بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ ایک ضمیمہ اس مراسلت پر مشتمل ہے جو میرے اور سید یعقوب شاہ سابق آڈیٹر جنرل حکومت پاکستان کے درمیان ہوئی تھی اس میں ان لوگوں کے دلائل پوری طرح آگئے ہیں جو شخصی حاجات کے قرض اور بار آور اغراض کے قرض میں فرق کر کے حرمت سود کے حکم کو صرف پہلی قسم کے قرضوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے جواب میں جو کچھ میں نے عرض کیا ہے اس کو پڑھ کر ناظرین خود رائے قائم کر سکتے ہیں کہ ان دلائل کی بنیاد پر بار آور اغراض کے قرضوں پر سود کو حلال کرنے کی کوشش کہاں تک صحیح ہے۔

دوسرا ضمیمہ میرے اس مقالے پر مشتمل ہے جو میں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی ایک مجلس مذاکرہ میں سود کے موضوع پر پیش کیا تھا۔ اس میں اس مسئلے کے قریب قریب تمام اہم پہلوؤں پر ایک جامع بحث ناظرین کے سامنے آجائے گی۔ تیسرا ضمیمہ مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم کے دو مضامین اور میری طرف سے ان کے جواب پر مشتمل ہے۔ اس میں اگرچہ عنوان بحث یہ ہے کہ مذہب حنفی کی رو سے دارالحرب میں سود کے جواز کا جو مسئلہ بیان کیا جاتا ہے اس کی صحیح تعبیر کیا ہے لیکن اس ضمن میں اسلام کے دستوری اور بین الاقوامی قانون پر بڑی اہم بحثیں آگئی ہیں جو معاشیات کے علاوہ قانونی مسائل سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی انشاء اللہ مفید ثابت ہوں گی۔

یہ دیباچہ اس کتاب کا سب سے بہتر تعارف ہے۔ دین اسلام میں سود کی حرمت کس نوعیت کی ہے اور اس مسئلے سے متعلق ہمیں وہاں کیا روشنی ملتی ہے؟ اس سوال کو سمجھنے کے لیے اس کتاب سے بہتر کوئی دوسری کتاب موجود نہیں ہے۔ مغربی علوم و فنون کے علماء و ماہرین میں سے کوئی شخص اس سوال کو حل کرنا چاہتا ہو، یا شرعی علوم کے حاملین میں سے کوئی تسلی و تشفی حاصل کرنا چاہتا ہو ان میں سے ہر ایک کو پورے اطمینان کے ساتھ اس کتاب کے مطالعہ کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ ع۔ ق

ہفت روزہ طلوع بمبئی ایڈیٹر:۔ اصغر علی عابدی۔ بدل اشتراک:۔ سالانہ ۱۲ روپیہ ششماہی ۶ روپیہ سہ ماہی ۳ روپیہ۔ فی پرچہ ۲۵ نئے پیسے۔ مقام اشاعت:۔ دفتر ہفت روزہ طلوع ۱۲۵ اسے رین روڈ بمبئی ۳

زیر تبصرہ ہفتہ وار کی ۹ اشاعتیں نظر سے گزر چکی ہیں۔ برادرم اصغر علی عابدی کی ادارت اس بات کی ضمانت ہے کہ یہ ہفت روزہ اپنے مضامین کی سنجیدگی، تنوع اور افادیت کے لحاظ سے ممتاز ہوگا۔ مدیر طلوع ہمارے دیہات

صحافتی تجربہ رکھنے والے لوگوں کی صف اول میں بھی ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ بھارت میں قافلۂ ادب اسلامی کے بھی نمایاں راہنما ہیں۔ طلوع اپنے ظاہری گٹ اپ اور طباعت و کتابت کی عمدگی کے لحاظ سے بھی جاذب نظر ہے اور ہندوستان میں اس شان کا شاید ہی کوئی علمی و ادبی ہفت روزہ موجود ہو۔

ہر شمارے میں مفید اداریہ، ملکی حالات پر سنجیدہ تبصرے، مفید مضامین، طنز و ظرافت، منظومات، نثری ادب اور بچوں کے لیے ایک صفحہ اور اس طرح کی دوسری مفید اور دلچسپ چیزیں سامنے آتی ہیں۔ ہم اپنے اس باوقار معاصر کا استقبال کرتے ہیں اور دعا گو رہیں کہ اسے استقلال اور پائیداری نصیب ہو اور یہ اپنے صفحات کے ذریعہ تعمیر اخلاق و کردار کا فریضہ انجام دیتا رہے۔ (خ۔ ق)

قادیانی اور مسلمان از جناب عبدالرحیم اشرف۔ صفحات ۱۶۔ ناشر مکتبہ المنبر پوسٹ بکس ۱۰۱ لائل پور، پاکستان۔

یہ پمفلٹ قادیانیوں کے رد میں لکھا گیا ہے۔ ناظم مکتبہ المنبر نے دیباچے میں لکھا ہے:۔

اسی سلسلے کی ایک کڑی ہفت روزہ "المنبر" کے مدیر کا ایک مقالہ ہے جو انھوں نے ایک قادیانی ہفت روزے کی ایک اشتعال انگیز تحریر کے جواب میں لکھا تھا۔ یہ مقالہ مختصر بھی ہے اور جامع بھی اور ان چند مقالات میں سے ایک ہے جو اس دور میں المنبر کی دینی خدمات اور اظہار حق کا قابل رشک نمونہ ہیں۔"

اس پمفلٹ کی قیمت کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

اس سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے صرف ایک آنہ فی کاپی برائے اشاعت فنڈ وصول کی جاتی ہے جو آئندہ شائع ہونے والے ایسے ہی پمفلٹوں میں صرف ہوگی۔

ہر ایسی کوشش قابل قدر ہے جو امت مسلمہ کے انتشار عقائد کو ختم کرے اور صحیح عقاید پر انہیں یکجا کرے اسی لحاظ سے مکتبہ المنبر کا یہ پمفلٹ بھی قابل قدر ہے۔ ع۔ق

اصح السیر مؤلفہ مولانا حکیم ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری۔ صفحات ۵۷۶ کاغذ کتابت طباعت بہتر مجلد ڈسٹ کور کے ساتھ۔ قیمت دس روپیہ۔ ناشر: نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی

اصح السیر فی ہدی خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم سیرت کی ان چند کتابوں میں ہے جو علماء کے درمیان مستند تسلیم کی جا چکی ہیں۔ اردو زبان میں سیرت کی تین کتابیں بہت مشہور و مقبول ہیں۔ سیرت النبی۔ رحمۃ للعالمین۔ اصح السیر۔ یہ کتاب

مولانا شبلی نعمانی کی سیرت النبی کے مقابلے میں لکھی گئی تھی اور ان کی زبردست علمی شخصیت کے باوجود اصح السیر نے بھی علماء کے درمیان اپنی جگہ بنالی۔ یہ مولانا دانا پوری کی محنت اور ان کے خلوص کا ثمرہ ہے۔

سیرت النبی کی طرح اس کتاب کا مقدمہ بھی خاصا وزنی ہے اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ جگہ جگہ مؤلف کا جذبۂ جہاد عبارتوں میں چھلک پڑا ہے، ان کے اس جذبہ سے پڑھنے والا بھی متاثر ہوتا ہے اور اس کے دل میں اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جد وجہد کرنے کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔ ایک جگہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جہاد بالسیف کے کچھ نتائج کا ذکر کرکے آخر میں لکھتے ہیں :-

"غزوات کے یہ عملی نتائج ہمارے سامنے واضح ہیں، تاریخیں علی الاعلان اس کی شاہد ہیں مگر جدید عقلاء کہتے ہیں کہ مذہب کے لیے جنگ نہیں چاہیے، ملک کے لیے لڑو، روپیہ کے لیے لڑو، اپنے بنائے ہوئے قانون کو رائج اور قائم کرنے کے لیے لڑو، مگر خدا کی توحید اور خدا کا قانون رائج کرنے کے لیے نہ لڑو، نیکی کی معاونت اور بدی کی مخالفت کے لیے نہ لڑو کیونکہ یورپ کے عقلاء مذہب کے لیے جنگ کو منع کرتے ہیں" صفحہ ۲۵

آگے ایک اور مقام پر لکھتے ہیں :-

جب یہ معلوم ہوگیا کہ خدا کی مخلوق دو حصوں میں تقسیم ہے، نیک اور بد۔ تو خداوند کریم نے حکم دیا کہ نیکوں کا یہی فرض ہو کہ نیکی کو دنیا میں غالب رکھیں اور اس کی حمایت میں اپنی تمام تر قوت صرف کردیں، قرآن کریم کی صدہا آیتیں احادیث صحیحہ کا بڑا دفتر اس حکم سے بھرا پڑا ہے کہ اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جہاد فرض ہو، دنیا نے دیکھا کہ اس حکم کے بعد کس طرح توحید کا غلبہ ہوا، کس طرح شیطان مغلوب ہوا کیونکر بت پرستی فنا ہوئی کس طرح دنیا خدا کی حمد و ستائش سے بھر گئی کس طرح وہ باتیں پوری ہوئیں جس کی تمنا میں حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور تمام انبیاء کرام نے اپنی عمریں صرف کردی تھیں۔" (صفحہ ۲۷)

یورپ کے عیسائی جہاد بالسیف پر جو اعتراضات کرتے ہیں اس کے جواب میں یورپ سے مرعوب ذہن نے مدافعانہ جنگ کا جو حیلہ ایجاد کیا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

یورپ کے اس پروپیگنڈے کی وجہ سے آج مسلمانوں میں ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جو اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جہاد بالسیف کو بہت برا سمجھتی ہو۔ رسول اللہ کے غزوات کو اسلامی تاریخ پر بدنما داغ سمجھتی ہے اور اپنی ذہنیت میں وہ اسلامی خدمت اسی کو سمجھتی ہے کہ اسلامی تاریخ سے یہ داغ مٹا دیا جائے مگر آیات قرآنی کی کثرت، احادیث صحیحہ کا دفتر اس کو یہ کرنے نہیں دیتا لہذا اس نے یہ تاویل پیدا کی ہے کہ یہ سارے غزوات، مدافعت اور حفاظت

خود اختیار کئے گئے تھے ، اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے نہ تھے ۔ یہ جواب اس مذہب کی طرف سے دیا جاتا تو شاید کسی حد تک صحیح بن سکتا تھا جس میں رہبانیت کی تعلیم دی گئی ہو ۔ صفحہ ۲۹

اعلائے کلمۃ اللہ یا اقامت دین کی جد و جہد کو مسلمانوں میں دو طرح کی ذہنیتیں برداشت نہیں کرتیں۔ ایک تو وہ جو یورپ کے اعتراضات سے مرعوب اور دین اسلام سے ناواقف ہوں اور دوسری وہ جو یہ بات نہ سمجھ سکی ہوں کہ دنیا یا انسان کی اصل حیثیت کیا ہے اور اس عبادت کی حقیقت کیا ہے جس کے لیے اللہ نے جن و انس کو پیدا کیا ہے ۔۔۔ پہلی ذہنیت کے لوگ حصول دنیا میں مگن ہیں اور دوسری ذہنیت کے مخلص لوگ صرف خدا کی تسبیح و تقدیس یا اسی کی پرستش ہی کو وہ اصل مقصد سمجھتے ہیں جس کے لیے وہ دنیا میں بھیجے گئے اگر یہ بات انہیں اپنے گوشۂ خلوت میں حاصل رہے تو پھر انہیں کوئی پروا نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں ہو رہا ہے ۔ وہ خدا کے دین کو ادیان باطلہ پر غالب کرنے کی جد و جہد کا اپنے کو مکلف ہی نہیں سمجھتے ۔۔۔ شکر ہے کہ مؤلف اصح السیر سیرت محمدی کے اصل جوہر سے غافل نہیں ہیں ۔

اصح السیر میں بھی سیرت یا احکام دین سے متعلق بہت سے مباحث ایسے ہیں جن سے ہر قاری کا اتفاق ضروری نہیں ہے ۔ نور محمد کارخانۂ تجارت کتب نے اس کتاب کو دوبارہ شائع کر کے دینی خدمت انجام دی ہے اور وہ ہمارے شکریہ کا مستحق ہے ۔　　ع ۔ ق

فتنۂ انکار حدیث کا منظر و پس منظر

از مولانا افتخار احمد بلخی ۔ صفحات ۲۸۵ ۔ مضبوط ڈسٹ کور، عمدہ کتابت و طباعت ۔ قیمت سات روپیہ ۔ ناشر: مکتبہ چراغ راہ ۔ کراچی ۔

چھ سال پہلے ماہنامہ زندگی جلد ۱۵ ۔ شمارہ ۱ میں راقم الحروف نے اس کتاب کے حصۂ اول اور حصۂ دوم پر جائزہ تبصرہ کیا تھا ۔ حصۂ سوم کو سرسری انداز میں پڑھنے کے بعد میری پہلی رائے میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی ۔ فاضل مؤلف کی دیدہ ریزی کاوش اور محنت میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ اب پوری کتاب سامنے آجانے کے بعد زیادہ اطمینان کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ فتنۂ قادیانیت کو جاننے کے لیے الیاس برنی مرحوم کی کتاب " قادیانی مذہب " کو جو مقام حاصل ہے، فتنۂ انکار حدیث اور بالخصوص فتنۂ پرویزی کو جاننے کے لیے وہی بلکہ اس سے اونچا مقام افتخار احمد بلخی کی کتاب کو حاصل ہونا چاہیے ۔ میری اس رائے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی کہ اس دور کے انکار حدیث کا ڈانڈا دورِ امام شافعیؒ کے انکار حدیث سے ملانا صحیح نہیں ہے ۔

حصہ سوم کے آخر میں پس چہ باید کرد کے عنوان سے مؤلف نے اس فتنے کے استیصال کی اصل تدبیر بھی بتائی ہے اور تبصرہ نگار ان کی رائے سے متفق ہے اور وہ یہ ہے کہ از سر نو خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے ساز و برگ درست

یں اور پھر دنیا کو خلافت راشدہ جیسی حکومت کا نقشہ دکھایا جائے اگر دین حق قائم ہوجائے تو یہ سات سے کے
ے فتنے آپ اپنی موت مر جائیں گے۔ یہ سب کے سب فتنے نظام باطل کی جڑوں سے اپنی غذا حاصل کرتے
در اس شجر خبیث کے اکھڑتے ہی ان کا سوکھ جانا لازمی ہے۔ مولف اصل مرض کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لہٰذا اس کا واحد علاج یہ ہے کہ اقتدار پھر خداشناسی کے قبضے میں جائے۔"

ث و تفصیل کے بعد پھر لکھتے ہیں:۔

اس بنا پر اقامت دین۔ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ ہی وہ تنہا ضرب کلیمی ہے جس سے یہ اور دوسرے
وہ تمام منکرات دم توڑ دیں گے جو معاشرے میں اُبھرے ہوئے ہیں اور نہ صرف موجودہ سارے منکرات اپنی
موت آپ مر جائیں گے بلکہ مستقبل کے سارے امکانی فسادات و منکرات کا بھی اس سے سدباب ہوجاتا ہے۔"

ل مؤلف نے یہ بھی اچھا کیا ہے کہ بالکل آخر میں حجیت حدیث و سنت کے منقول و معقول دلائل اختصار کے
ذر جمع کر دیے ہیں تاکہ قاری کا ذہن پوری طرح مطمئن ہوجائے اور کوئی خلا باقی نہ رہے۔ (ع۔ق)

ستان المحدثین اُردو ترجمہ جناب مولانا عبدالسمیع صاحب صفحات ۲۲۶۔ کاغذ کتابت طباعت بہتر۔ مجلد ڈسٹ کور کے ساتھ قیمت پانچ روپیہ ناشر:۔ نور محمد اصح المطابع و کارخانہ
رت کتب آرام باغ کراچی۔

علامہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی بستان المحدثین، محدثین اور کتب احادیث کے تذکرے
ں مشہور کتاب ہے۔ اصل کتاب فارسی زبان میں ہے۔ اس کا ترجمہ مولانا عبدالسمیع صاحب دیوبندی نے ۱۳۲۳ھ
ں کیا تھا۔ اسی ترجمے کو بشیر محمد دہلوی کی تصحیح اور نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ فہرست مضامین
ں ہے۔ تبصرہ نگار کو اصل کتاب سے ترجمے کے مقابلے کا موقع نہیں ملا۔ ویسے توقع یہی ہے کہ ترجمہ صحیح ہوگا،
کتاب کی افادیت مسلّم ہے اس لیے اس پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ نور محمد کارخانہ تجارت کتب اس کتاب
کی اشاعت پر بھی مستحق شکریہ ہے۔ ع۔ق

ضروری اعلان

ہفت روزہ شہاب کے ہندوستانی خریدار اور ایجنٹ حضرات آئندہ شہاب کے متعلق تمام رقومات
مکتبۃ الحسنات کی بجائے ماہنامہ "زندگی" رامپور یوپی کے نام ارسال فرمایا کریں۔ منیجر ہفت روزہ "شہاب"

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد ۲۸
شمارہ ۳

رمضان ۱۳۸۱ھ
مارچ ۱۹۶۲ء

مدیر: سید احمد عروج قادری

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ: منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

• زر سالانہ: صہ۔ ششماہی: تین روپیہ۔ فی پرچہ: پچاس نئے پیسے
ممالک غیر سے: دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/C شاہ عالم مارکیٹ لاہور

احمد طالب پرنٹر و ناشر نے جماعت اسلامی ہند کی طرف سے ناظم پریس باز نصر اللہ خاں رام پور میں چھپوا کر دفتر رسالہ زندگی رامپور یوپی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

(سید احمد عروج قادری)

جب بہت سے لوگ اس کے ساتھ جا رہے تھے تو اس نے پھر کر ان سے کہا ۔ اگر کوئی میرے پاس آئے اور اپنے باپ اور ماں اور بیوی اور بچوں اور بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی دشمنی نہ کرے تو میرا شاگرد نہیں ہو سکتا ۞ جو کوئی اپنی صلیب نہ اٹھائے اور میرے پیچھے نہ آئے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا ۞ کیونکہ تم میں سے ایسا کون ہے کہ جب وہ ایک برج بنانا چاہے تو پہلے بیٹھ کر لاگت کا حساب نہ کرلے کہ آیا میرے پاس اس کے تیار کرنے کا سامان ہے یا نہیں؟ ۞ ایسا نہ ہو کہ جب نیو ڈال کر تیار نہ کر سکے تو سب دیکھنے والے یہ کہہ کر اس پر ہنسنا شروع کر دیں کہ اس شخص نے عمارت شروع تو کی مگر تکمیل نہ کر سکا ۞ یا کون ایسا بادشاہ ہے جو دوسرے بادشاہ سے لڑنے جاتا ہو اور پہلے بیٹھ کر مشورہ نہ کرلے کہ آیا میں دس ہزار سے اس کا مقابلہ کر سکتا ہوں یا نہیں جو بیس ہزار لیکر مجھ پر چڑھا آتا ہے ۞ نہیں تو جب وہ ہنوز دور ہی ہے ایلچی بھیج کر شرائط صلح کی درخواست کرے گا ۞ پس اسی طرح تم میں سے جو کوئی اپنا سب کچھ ترک نہ کرے وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا ۞ نمک اچھا تو ہے لیکن اگر نمک کا مزا جاتا رہے تو وہ کس چیز سے مزا دار کیا جائے گا ۞ نہ وہ زمین کے کام کا رہا نہ کھاد کے، لوگ اسے باہر پھینک دیتے ہیں جس کے کان سننے کے ہوں وہ سن لے ۞

(لوقا باب ۱۴ آیت ۲۵ تا ۳۵)

رشتہ داروں اور اپنی جان سے دشمنی کا مفہوم انجیل کی دوسری آیتوں سے واضح ہو گیا ہے:۔

جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں اور جو کوئی بیٹے یا بیٹی کو مجھ سے زیادہ عزیز رکھتا ہے وہ میرے لائق نہیں ۞ جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میری خاطر اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا ۞

(متی باب ۱۰)

یہ کلمات آج سے دو ہزار سال پہلے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانِ مبارک سے نکلے تھے، ان کلمات میں کوئی کلمہ ایسا

نہیں ہے جس کی تصدیق و تائید کتاب و حکمت میں موجود نہ ہو۔ یہ بعینہٖ وہ کلمات نہیں ہیں جو حضرت عیسیٰؑ نے کہے ہوں گے بلکہ یہ ان کا ترجمہ ہے اور جب یہ ترجمہ اتنا موثر ہے تو اسی سے اندازہ لگانا چاہیے کہ اصل کلمات میں کتنی تاثیر ہوگی۔ ان کلمات کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کے مخاطب حضرت عیسیٰؑ کے شاگرد نہیں بلکہ ہم خود ہیں۔ اخلاق و کردار کی تعمیر کے لیے انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیم دی ہے وہ وقت اور زمانے کی قید سے بلند ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس تعلیم کا اصل سرچشمہ ان کا اپنا علم اور ان کی اپنی ذات نہیں بلکہ وہ ایک ایسی علیم و خبیر ہستی کے پیغام کی ترجمانی ہے جو انسان کی خالق اور اس کی فطرت سے آگاہ ہے۔ انسان کی فطرت حضرت آدم کے وقت سے اس عہد تک نہیں بدلی اور نہ قیامت تک بدل سکتی ہے۔ ہم توریت و انجیل و زبور پڑھیں یا قرآن، ان میں ہم بنیادی عقائد میں کوئی فرق نہیں پاتے اور نہ ہم ان کلی اور اصولی ہدایات میں جو ان عقائد کے لازمی تقاضے ہیں کوئی اختلاف پاتے ہیں۔

آج پوری امتِ مسلمہ عقاید و خیالات اور اخلاق و کردار کے لحاظ سے جس مقام پر ہے، ہم ضرورتاً اس کا جائزہ لیتے ہی رہتے ہیں لیکن ہمیں اس سے پوری طرح چوکنا رہنا چاہیے کہ دوسروں کے جائزے کو کافی سمجھ کر ہم اپنے احتساب اور جائزے سے غافل نہ ہو جائیں۔ اپنے ذاتی احتساب کو ہمیں اولین اہمیت دینی چاہیے۔ کسی رجمنٹ کا ہر سپاہی بحیثیت فرد اپنی سپاہیانہ ذمہ داریاں ادا نہ کرے تو پوری رجمنٹ بحیثیت جماعت اپنی ذمہ داریوں کی تکمیل نہیں کر سکتی۔ جماعتی اخلاق و کردار، دراصل انفرادی اخلاق و کردار کا نتیجہ ہوتا ہے کوئی جماعت اگر من حیث الجماعۃ اپنے اخلاق و کردار میں بودی اور کمزور ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ جن افراد سے مل کر وہ مجموعہ بنا ہے وہی بودے اور کمزور ہیں۔ اس ذاتی احتساب میں امیر و مامور کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ امیر کو اپنے منصب اور ذمہ داریوں کے لحاظ سے اپنا احتساب کرنا چاہیے اور مامور کو اپنی ذمہ داریوں کے اعتبار سے اپنا جائزہ لینا چاہیے۔

انبیاء کرام کی بعثت ہمیشہ اس لیے ہوتی رہی ہے کہ باطل کو ہٹا کر اس کی جگہ حق کو قائم کریں۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس مہم کو سر کرنے کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اخلاق و کردار کے لحاظ سے انتہائی مضبوط ہوں اور وہ سب مل کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بواسطہ انبیاء مدعیانِ ایمان سے جو مطالبہ کیا ہے وہ محض اتنا نہیں ہے کہ حق کو خود قبول کر لیں اور دوسروں تک اپنی زبان سے حق کی دعوت پہنچا دیں بلکہ ان سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ بغیر کسی استثناء کے، اپنا سب کچھ اس راہ میں قربان کر دیں۔ نہ وطن کی محبت حائل ہو، نہ خونی رشتے مانع ہوں، نہ

مال و دولت رہزن بنے اور نہ خود اپنی جان حارج ہو، جب تک کوئی شخص اس سرفروشی و جاں بازی کے ساتھ حق کو قبول نہیں کرتا اور کامل سپردگی کے ساتھ نبی کی رفاقت اختیار نہیں کرتا وہ فی الواقع نبی کا ساتھی ہی نہیں، اس کا رفیق ہی نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جو کلمات اوپر نقل ہوئے ہیں ان میں سے ہر کلمے کو اپنے سامنے رکھیے اور دیکھیے کہ وہ اپنے شاگردوں اور ساتھیوں سے کن چیزوں کا مطالبہ کر رہے ہیں اور انہیں کس رنگ میں رنگا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، انھوں نے برج اور عمارت اور ایک بادشاہ سے دوسرے حملہ آور بادشاہ کی جنگ و صلح کی جو تمثیل پیش کی ہے وہ ایک طرف اخلاق و کردار کی صلابت و استحکام کا نقشہ سامنے لاتی ہے اور دوسری طرف انبیاء کرام کے مقصد بعثت کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ یہ نہ سمجھیے کہ حضرت عیسیٰ نے اپنی بعثت کا مقصد محض تمثیل اور اشارے ہی میں بیان فرمایا ہے بلکہ ہمیں اس انجیل میں بھی جسے اس کے ماننے والوں نے بدل ڈالنے کی کوشش کی ہے، مقصد بعثت کی طرف واضح نشان دہی ملتی ہے۔ ایک بار انھوں نے فرمایا:۔

> یہ نہ سمجھو کہ میں صلح کرانے آیا ہوں، صلح کرانے نہیں تلوار چلوانے آیا ہوں کیونکہ میں اس لیے آیا ہوں کہ آدمی کو اس کے باپ سے اور بیٹی کو اس کی ماں سے اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کردوں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے۔ (متی باب ۱۰)

اس واضح فرمان کی موجودگی میں حیرت ہے کہ کس طرح ان کے ماننے والوں نے ان کے مقصد بعثت کو دنیا کی نگاہوں سے چھپانے کی کوشش کی ہے اور ان کو محض محبت کا مبلغ ثابت کرنا چاہا ہے۔ بہر حال یہ الگ بحث ہے، میں یہاں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ جب تک ذہن اس سانچے میں نہ ڈھل جائے اور رفاکاری و جاں نثاری اس مقام پر نہ پہنچ جائے جس کی نشان دہی حضرت عیسیٰ کی ربانی تعلیم نے کی ہے، انبیاء کے مشن کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ اب آئیے ہم میں کا ہر شخص اس مطالبے کی روشنی میں اپنا اپنا جائزہ لے کر دیکھے کہ وہ کتنے پانی میں ہے۔ کہیں خدانخواستہ ایسا تو نہیں کہ ہم تَأْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (تم دوسرے لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو) کے مصداق بن گئے ہوں یا بنتے جا رہے ہوں۔

مجھے اس بات کا اطمینان ہے کہ آپ کو یہ خطرہ نہ گزرے گا کہ یہ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ ہے جو انھوں نے اپنے شاگردوں سے کیا تھا، ہم اس کے مخاطب کب ہیں؟ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے بھی انہیں مطالبوں کو بہ تمام و کمال دہرایا ہے۔ کتاب و سنت میں بلا شائبۂ ابہام یہ بات کہی گئی

اور شدید تاکید کے ساتھ یہ مطالبات ہم سے کیے گئے ہیں۔ انجیل کے کلمات تو محض تائید کے لیے پیش کیے گئے ہیں ورنہ ہم ان کے محتاج نہیں ہیں۔ کتاب و سنت میں نوع بہ نوع انداز سے ہمیں ان مطالبات کی اتنی تکرار ملتی ہے کہ ان سب کو یکجا کرنا آسان کام نہیں ہے۔ یہاں سورۂ احزاب، سورۂ توبہ اور سورۂ انفال کی چند آیتوں کی طرف اشارہ کرنا کافی ہے۔ سورۂ احزاب میں فرمایا گیا ہے :۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ ۔ نبی مومنوں سے خود ان کی جانوں سے زیادہ قریب اور مستحق اطاعت ہے

قرآن کے اس ایک جملے نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ماننے والوں کے تعلق کو واضح کر دیا ہے اور حضور کے کلمات نے اس جملے کی مزید تفصیل و تشریح کی ہے :۔

> میں ہر مومن سے، تمام لوگوں کے مقابلے میں، سب سے زیادہ قریب ہوں، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اگر تم چاہو تو اس کی تصدیق کے لیے اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِہِمْ کا قرآنی جملہ پڑھ لو۔ (بخاری و مسلم)

ایک دوسرے موقع پر فرمایا :۔

> تم میں کا کوئی شخص مومن نہیں ہو تا جب تک میں، اس کے نزدیک، اس کے باپ، بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔ (بخاری و مسلم)

حضرت عمرؓ کے ساتھ جو واقعہ گزرا وہ یہ ہے :۔

> عبداللہ بن ہشام سے مروی ہے کہ ہم ایک جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے بایں حال کہ وہ حضرت عمرؓ کا ہاتھ پکڑے ہوئے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا۔ یا رسول اللہ! آپ میرے نزدیک میرے نفس کو چھوڑ کر باقی تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہیں۔ آپ نے فرمایا نہیں، ابھی نقص باقی ہے۔ قسم اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم اس وقت تک کامل مومن نہیں ہو سکتے جب میں تمہارے نزدیک خود تمہارے نفس سے بھی زیادہ محبوب نہ بن جاؤں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا۔ اب خدا کی قسم آپ میرے نزدیک میری اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔ حضور نے فرمایا۔ اب اے عمرؓ (یعنی اب تمہارا ایمان مرتبۂ کمال کو پہنچ گیا)

اس کے بعد سورۂ توبہ کی آیات ۲۳ اور ۲۴ پڑھیے

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ۔ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے ۰ اے نبی کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور

> تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ کی جدوجہد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

ان دو آیتوں میں اللہ و رسول اور راہ خدا کی جدوجہد کو سب سے زیادہ عزیز و محبوب رکھنے کا مطالبہ جس تاکید و تہدید کے ساتھ کیا گیا ہے اس کے لیے کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے۔ پہلی آیت کو "تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے" پر ختم کیا گیا ہے اور دوسری آیت کو "اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا" پر تمام کیا گیا ہے، جاننے والے جانتے ہیں کہ قرآن میں کہاں اور کس جگہ کلام کو اس طرح کے جملوں پر ختم کیا جاتا ہے ـــ آگے اسی سورہ کی آیت ۱۱۱ اور ۱۱۲ کا مطالعہ کیجیے:۔

> حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے مومنوں سے ان کے نفس اور ان کے مال، جنت کے بدلے خرید لیے ہیں۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے اور مارتے اور مرتے ہیں (ان سے جنت کا وعدہ) اللہ کے ذمے ایک پختہ وعدہ ہے توریت اور انجیل اور قرآن میں، اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنے عہد کا پورا کرنے والا ہو۔ پس خوشیاں مناؤ اپنے اس سودے پر جو تم نے خدا سے چکا لیا ہے، یہی سب سے بڑی کامیابی ہے ٥ اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے، اس کی بندگی بجانے والے، اس کی تعریف کے گن گانے والے، اس کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے، اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے بدی سے روکنے والے، اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے (اس شان کے ہوتے ہیں وہ مومن جو اللہ سے خرید و فروخت کا یہ معاملہ طے کرتے ہیں) اور اے نبی ان مومنوں کو خوش خبری دے دو۔

کتاب و سنت کی ان تصریحات کو سامنے رکھ کر آپ انجیل کے کلمات کو پڑھیں تو صاف محسوس ہوگا کہ اللہ رسول کی محبت و اطاعت اور اللہ کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر دینے کا مطالبہ انجیل سے زیادہ تاکید و تہدید کے ساتھ کتاب و سنت میں موجود ہے ـــ اب رہی انجیل کی بادشاہوں والی تمثیل تو اس کا حاصل یہ ہے کہ اخلاق و کردار کے استحکام، ایثار و قربانی اور صبر و ثبات کی صفات، حق کے سپاہی میں باطل کے سپاہی کے اعتبار سے کم سے کم دوگنی ہونی چاہئیں، جبھی دس ہزار سپاہی بیس ہزار کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اب اسی حقیقت کو سورۂ انفال کی آیت ۶۵ اور ۶۶ میں دیکھیے۔

اے نبی! مومنوں کو جنگ پر ابھارو، اگر تم میں سے دس آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر سو آدمی ایسے ہوں تو منکرینِ حق میں سے ہزار آدمیوں پر غالب رہیں گے کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے ۰ اچھا اب اللہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کیا اور اسے معلوم ہوا کہ ابھی تم میں کمزوری ہے پس اگر تم میں سے سو آدمی صابر ہوں تو وہ دو سو پر اور ہزار آدمی ایسے ہوں تو دو ہزار پر اللہ کے حکم سے غالب آئیں گے، اور اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر کرنے والے ہیں ۰

یہ آیتیں بتا رہی ہیں کہ حق کو غالب کرنے کے لیے حق پرستوں اور باطل پرستوں کے درمیان ایک اور دس کی نسبت ہونی چاہیے اور اگر تربیت نہ پانے کی وجہ سے ضعف رہ گیا ہو تو کم سے کم ایک اور دو کی نسبت تو ہونی ہی چاہیے۔ آیت ۶۵ میں "کیونکہ وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھ نہیں رکھتے" کا ٹکڑا، مومن و کافر گروہوں کے درمیان اس فرق کی علت اور اس کا سبب ہے۔ مومن گروہ کو اللہ کی نصرت و حمایت اور آخرت کے لازوال اجر کا یقین ہے اور یہ ایک ایسا محکم علم و فہم اور ایسا زندہ جاندار شعور ہے جس سے کافر گروہ محروم ہے اور یہی وہ سبب ہے جو میدانِ مقابلہ میں ان دونوں گروہوں کے درمیان وہ نسبت پیدا کرتا ہے جس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ ایمان و یقین حق پرستوں کو باطل پرستوں پر اخلاقی قوت کے لحاظ سے فوقیت عطا کر دیتا ہے اور ہر شخص یہ جانتا ہے کہ میدانِ جنگ میں صرف جسمانی اور مادی طاقت ہی فیصلہ کن نہیں ہوتی۔

انہیں آیتوں سے فقہائے اسلام نے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے کہ دو باطل پرست دشمنوں کے مقابلے میں ایک حق پرست مومن کو راہِ فرار اختیار نہ کرنی چاہیے اور اگر وہ ایسا کرے گا تو سخت گنہگار اور مستوجب سزا ہو گا۔

ان وضاحتوں کے بعد بھی کیا اس بات میں کوئی تامل ہو سکتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص کو اس آئینے میں اپنی صورت دیکھنی چاہیے اور اس پہلو سے اپنا احتساب خود کرنا چاہیے، کیونکہ انسان کے اپنے قلب سے بڑھ کر کوئی بھی ٹھیک ٹھیک مطابقِ واقعہ احتساب نہیں کر سکتا۔ اِقْرَأْ كِتَابَكَ ۚ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيبًا ۰

یہ بات قیامت میں کہی جائے گی لیکن دنیا میں اس لیے بتا دی گئی کہ انسان یہیں اپنا حساب خود دے لے ورنہ وہاں کوئی تلافی ممکن نہ ہو گی۔ دوسری جگہ کہا ہے:۔

بَلِ الْإِنسَانُ عَلَىٰ نَفْسِهِ بَصِيرَةٌ ۝	بلکہ انسان خود اپنے نفس کے لیے دلیل ہے
وَلَوْ أَلْقَىٰ مَعَاذِيرَهُ ۝	چاہے وہ کتنے ہی بہانے پیش کرے۔
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ	اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر نفس کو یہ

وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ وَاتَّقُوا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝	دیکھنا چاہیے کہ اس نے کل (قیامت) کے لیے کیا چیز آگے بھیجی ہے اور اللہ سے ڈرو۔ بلاشبہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے۔

محاسبے کی اس آیت میں دو بار خدا سے ڈرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلے حکم کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا تقویٰ ہی وہ چیز ہے جو انسان کو اپنے اعمال کے احتساب پر آمادہ کرتا ہے۔ دل اگر خوف خدا سے خالی ہو تو وہ محرک ہی غائب ہو جاتا ہے جو انسان کو اپنے محاسبے پر ابھارتا ہے اور دوسرے حکم کا مقصد یہ ہے کہ عین محاسبے کے وقت بھی خوف خدا پوری طرح مستولی رہنا چاہیے ورنہ بہت ممکن ہے کہ نفس طرح طرح کے بہانے پیش کر کے کوتاہیِ عمل پر مطمئن کر دے۔ انسان کا نفس دوسروں کے احتساب میں بہت سخت اور اپنے احتساب میں بہت نرم ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑی رعایتوں کا مستحق قرار دے لیتا ہے۔ اس خطرناک فریبِ نفس سے بچنے کے لیے دوبارہ تقویٰ اللہ کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مزید رخنوں کو بند کرنے کے لیے یہ عقیدہ ذہن میں اتارا گیا ہے کہ "بلاشبہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے" یعنی اگر تم نے اپنے آپ سے بھی اپنی کوتاہیاں چھپانے کی کوشش کی تو کوئی فائدہ نہ ہو گا کیونکہ اللہ سے تم کچھ بھی نہیں چھپا سکتے۔ احتساب کی ان شرائط کے ساتھ اب ہم اپنا محاسبہ کریں۔

اللہ و رسول کی محبت و اطاعت اور راہ خدا کی جدوجہد کا ہماری زندگی میں کیا مقام ہے؟ کیا یہ جدوجہد واقعی ہماری زندگیوں میں سب سے اونچا مقام رکھتی ہے؟ کیا واقعی یہ ہمیں سب سے زیادہ عزیز ہے؟ کیا واقعی یہ ہمارے افکار و خیالات، اعمال و حرکات اور احساسات و جذبات کا محور بن گئی ہے؟ کیا واقعی ہم نے قریب ترین رشتہ داروں، حصول معاش کی سرگرمیوں اور گھر بار کی محبتوں کو اپنی زندگیوں میں ثانوی اور ضمنی حیثیت دے رکھی ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ معاملہ برعکس ہو ــــ جس طرح ہم دوسروں کے سامنے یہ حقیقت پیش کرتے ہیں کہ محض نام اور خاندان کے لحاظ سے مسلمان ہونا اللہ کی رحمتوں اور خوشنودیوں کا مستحق نہیں بنا تا بلکہ اس کے لیے عقیدۃً و عملاً ہر جہت سے کتاب و سنت کی پیروی ضروری ہے اسی طرح ہمیں اپنے آپ تک بھی یہ حقیقت پہنچانی چاہیے کہ جماعت اسلامی کی محض رکنیت کسی کو خدا کی رحمتوں اور خوشنودیوں کی سند عطا نہیں کرتی بلکہ یہ رکنیت ہم پر ذمہ داریوں کا مزید بوجھ ڈالتی ہے کیونکہ ہم شعوری ایمان کے دعویٰ ہیں۔

ممکن ہو کہ یہ سطریں رمضان المبارک کے آخری عشرے میں رفقاء کی نظروں سے گزریں۔ ان ایام میں بالخصوص اور تمام ایام میں بالعموم مجھے اور میرے تمام رفقاء کو کڑی نظروں سے اپنا احتساب کرنا چاہیے۔ اے اللہ ہمارے مالک! ہم تیرے در کے بھکاری ہیں، ہمیں حلاوتِ ایمان عطا فرما، ہمیں خیر کی توفیق دے اور ہم سب کو اقامت دین کی جدوجہد کا مخلص سپاہی بنا دے۔ آمین!

کیا تمام مذاہب سچے ہیں

(جناب وحیدالدین خاں صاحب)

ایک مسافر دہلی سٹیشن میں داخل ہوا اور "پوچھ تاچھ" کی کھڑکی پر یہ دریافت کرنے کہ میں بمبئی جانا چاہتا ہوں۔ بتائیے کہ مجھے کس ٹرین سے جانا چاہیے۔ اس کے جواب میں اگر متعلقہ شخص یہ کہے کہ تمہارے سامنے ایک درجن پلیٹ فارم پر جو ٹرینیں آتی جاتی نظر آرہی ہیں ان میں سے جس ٹرین پر بھی تم بیٹھ جاؤ گے وہ تم کو بمبئی پہنچا دے گی، تو لگلے لمحے وہ مسافر شاید کمپلینٹ بک کا مطالبہ کرے گا تاکہ محکمۂ ریلوے کو اس شخص کے پاگل ہونے کی اطلاع دے۔ مگر یہی انتہائی نامعقول بات جب مذہب کے بارے میں کہی جاتی ہے تو اس پر تحسین و آفرین کے نعرے بلند کیے جاتے ہیں اور بڑے بڑے ناشرین ان خیالات کو چھاپ کر ساری دنیا میں پھیلاتے ہیں۔ دنیا کے راستوں کا ہر مسافر جانتا ہے کہ دہلی سے بمبئی جانے والی ٹرین کوئی مخصوص ٹرین ہی ہو سکتی ہے۔ ہر وہ چلتی ہوئی سواری جس کا نام ٹرین ہو وہ آدمی کو بمبئی نہیں پہنچا دے گی۔ مگر حق کا سفر اس سے مستثنیٰ ہے۔ آدمی جس بھیڑ کے ساتھ بھی چل پڑے وہ لازماً حق کی منزل تک پہنچ جائے گا۔

جو لوگ اس قسم کا نظریہ پیش کر رہے ہیں ان کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

وحدتِ ادیان کے مبلغین

مہاتما گاندھی فرماتے ہیں:-

"میرا ہندو رجحان مجھے بتاتا ہے کہ تمام مذاہب کم یا زیادہ صداقت پر مبنی ہیں۔ مختلف مذاہب اصل مختلف راستے ہیں جو ایک ہی مرکزی نقطے کی طرف جا رہے ہیں۔"

My Religion, P. I9

سی راج گوپال آچاریہ کے نزدیک یا ایک حقیقت (**Truth**) ہے کہ تمام بڑے مذاہب ایک ہیں اور ان کے نام یا ان کے عبادتی طریقوں کا فرق کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔"

Essential Unity of All Religions, P. XCI

ڈاکٹر رادھا کرشنن تحریر فرماتے ہیں کہ ہندو ازم کے نزدیک آخری حقیقت (**Supreme Reality**) کو جاننے

اور اس کو حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ جب کہ دوسرے نظریات" یہ خیال رکھتے ہیں کہ خدا کے بارے میں بنیادی صداقت صرف انھیں کے پاس ہے" اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں :-

"اگر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا حق ہے کہ دوسرے مذاہب کا استخفاف کرکے ہم بذریعہ طاقت اپنے مذہب کو پھیلائیں تو ہم اخلاقی تضاد کے مجرم ہیں۔ کیونکہ زبردستی بے انصافی اور ظلم روحانیت اور تہذیب کی عین ضد ہیں ہندوازم اس قسم کا کوئی لگا بندھا عقیدہ (Fixed Creed) نہیں ہے۔ ایک ہندو کے نزدیک ہر مذہب سچا ہے بشرطیکہ اس کے ماننے والے سنجیدگی اور دیانت داری کے ساتھ اس کی پیروی کریں۔"

Religion and Society, P. 53

ہندوستان کے مشہور مورخ ڈاکٹر تاراچند نے اختلاف میں اتحاد (Unity in Diversity) کو ہندستان کی خصوصیت قرار دیا ہے اور دوسروں کے لیے بھی ایک بہترین اصول کے طور پر اس کو قابل تقلید بتایا ہے۔

Times of India, December 16, 1960

ڈاکٹر سی۔ پی۔ راماسوامی آئر لکھتے ہیں :-

"دنیا مذہب اور زندگی کے ہندو نقطہ نظر سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ ہندو کا فلسفۂ مذہب .... ایک تجرباتی بنیاد سے شروع ہوتا ہے اور اسی پر ختم ہوتا ہے۔ اس کا انحصار ایک خاص قسم کی روحانی زندگی یا تجربے کو قبول کرنے پر نہیں ہے۔ یہ وسیع معنوں میں روادار ہے اور اپنے سوا نقطہ نظر کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ ہر عقیدہ اور ہر نظام جو آدمی کی روح کو اوپر اٹھائے وہ صحیح مانا جائے گا۔ یہ ایک متعین اور جامد عقیدہ نہیں ہے بلکہ یکساں قسم کے روحانی خیالات اور طریقوں کا مجموعہ ہے۔ بہت سے فرقے مختلف عقیدوں کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے دائرے میں رہ سکتے ہیں۔ اس کو اس سے بحث نہیں کہ طالب حق نے اپنا سچائی تک پہنچنے کا خواب مندر کے سایہ میں دیکھا ہے یا چرچ اور مسجد کی عبادتگاہ میں"

Fundamentals of Hindu Faith and Culture, pp. 30-31

ڈاکٹر راجندر پرشاد کسی ایک مذہب کی صحت پر اصرار کرنے کو مذہبی جنون (Religious Fanaticism) قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں :-

"سچائی ایک ہے اگرچہ حکما اس کو مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔ یہ قدیم بزرگوں کے زمانے سے ہمارا اصول رہا ہے۔ ہم ہمیشہ یقین کرتے رہے ہیں کہ آخری منزل (Supreme Goal) تک مختلف راستوں سے پہنچا جا سکتا ہے اور آدمی منزل تک پہنچنے کے لیے جو راستہ بھی اختیار کرے گا اس سے وہ منزل تک پہنچ جائے گا۔ اس

لیے کسی کو بھی دوسرے سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ سب کے سب ایک ہی منتہا کی طرف سفر کر رہے ہیں اگرچہ ان کی راہیں مختلف ہیں۔ سناتن دھرم نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ سچائی تک پہنچنے کا صرف ایک ہی راستہ ہے یا یہ کہ وہی ایک صحیح راستہ ہے اور دوسرے تمام راستے غلط اور گمراہ کن ہیں۔ اس لیے اس ملک میں کبھی یہ ضروری نہیں سمجھا گیا کہ ایک شخص نے اپنے لیے جو راستہ اختیار کیا ہے اس کو وہ دوسروں پر لادنے کی کوشش کرے۔ اسی وجہ سے مختلف فرقوں اور مختلف مذہبی اعتقاد رکھنے والوں کے لیے یہ ممکن ہو سکا ہے کہ وہ اس ملک میں ساتھ ساتھ رہ سکیں اور ان کے باہمی معاملات میں کوئی اجنبیت اور فساد پیدا نہ ہو۔ اس کے برعکس بہت سے مذاہب کا ایک خاص عقیدہ یہ بھی ہے کہ سب لوگوں کے لیے سچائی تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور جو شخص بھی اس کو نہیں مانے گا یا اس پر نہیں چلے گا وہ کبھی بھی انسانیت کی اعلیٰ منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایک بدیہی نتیجہ جو فطری طور پر اس کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر میرا راستہ ہی ایک صحیح راستہ ہے اور دوسرے تمام راستے گمراہ کن ہیں تو یہ میری ذمہ داری ہو جاتی ہے کہ دوسروں کو بھی اسی راہ پر لانے کی کوشش کروں اور اس طرح دوسروں کے مذہب کو بدلنا ایک مقدس فریضہ اور متبرک عمل قرار پاتا ہے۔"

Book University Journal, July 3, 1955, pp. 19-20

یہ تصور ہندستان کا بہت پرانا تصور ہے۔ چنانچہ یہاں کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں یہ نظریہ موجود ہے۔ اشوک نے اپنے زمانے میں پتھر کے ستونوں پر جو فرامین کندہ کرا کر جابجا نصب کرائے تھے ان میں سے بارھواں فرمان یہ تھا:۔

"جو شخص اپنے مذہب کی تعظیم کرے اور جوش عقیدت میں اسے اور سب مذاہب پر فوقیت دینے کے لیے دوسرے کے مذہب کی تحقیر کرے وہ یقیناً خود اپنے مذہب کو نقصان پہنچاتا ہے۔ درحقیقت جو چیز پسندیدہ ہے وہ مذاہب کی ہم آہنگی ہے۔"

اب ذرا اس عقیدے کا تجزیہ کیجیے۔ "تمام مذاہب سچے ہیں" کا مطلب کیا ہے؟

وحدتِ ادیان پر تبصرہ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مذہب جو کچھ پیش کر رہا ہے وہ سب کا سب حقیقت ہے؟ اگر تمام مذاہب کے برحق ہونے کا مطلب یہ ہو تو یہ اتنی مہمل بات ہے جس پر کسی بھی طرح یقین نہیں کیا جا سکتا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ مختلف مذاہب کی تعلیمات میں کافی اختلاف ہے۔ مثلاً اسلام اور ہندو دھرم کو لیجیے۔ ہندو تعلیمات کے مطابق خدا یا خدائی اختیارات رکھنے والی ہستیاں بہت سی ہیں، جبکہ اسلام کے نزدیک یہ ہستی صرف ایک ہے۔ اسی طرح عبادات

اور اعمال میں دونوں مذاہب کے طریقے بالکل جدا ہیں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا اور زندگی کا آخری انجام کیا ہے۔ اس کے متعلق بھی دونوں مذاہب کے جوابات بالکل مختلف ہیں۔ اسلامی تصور کے مطابق انسانوں کے پاس خدا کا پیغام رسولوں کی معرفت بذریعہ وحی آتا ہے۔ اس کے برعکس ہندو نظریہ یہ ہے کہ جب دنیا میں بگاڑ ہوتا ہے تو خود بھگوان انسانی شکل میں اوتار[1] لیتے ہیں۔ اس طرح کے بے شمار اختلافات ہیں جو دونوں مذاہب کے فلسفہ اور عمل میں پائے جاتے ہیں۔ پھر کس قدر بے معنی بات ہوگی کہ ان میں سے ہر ایک کو صحیح مان لیا جائے۔ مذہبی وحدت کی بات کس قدر بے معنی ہے۔ ایک مثال سے اس کی مزید وضاحت ہو جائے گی۔ مہاتما گاندھی نے گائے کے متعلق لکھا ہے:۔

"گائے کی حفاظت ایک ہندو کی محبوب ترین چیز ہے۔ جو شخص گائے کے تحفظ میں یقین نہیں رکھتا۔ وہ ہرگز ہندو نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک عظیم عقیدہ ہے۔ میرے نزدیک گائے کی پوجا کے معنی ہیں معصومیت کی پوجا۔ گائے کی پوجا کمزور اور بے سہارا کی پوجا کا نام ہے۔"

My Religion, P. 154

دوسری طرف اسلام کے نزدیک گائے اس لیے ہے کہ وہ انسان کے لیے خوراک اور دوسری چیزیں فراہم کرے۔ وہ اس کو ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور اس کے گوشت کو انسان کے لیے پاک غذا بتاتا ہے۔ اگر مہاتما گاندھی کے تجزیے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہندو دھرم رحم کا مذہب ہے اور اسلام خوں خواری کا۔ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ یہ دونوں نظریے صحیح ہوں۔ کیا ایک لمحے کے لیے بھی تصور کیا جا سکتا ہے کہ ایک خدا نے یہ دو مختلف قسم کے احکام دیے ہیں۔

۲۔ پھر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ مختلف مذاہب کی تعلیمات کا مطالعہ کر کے ان کا جوہر نکالا جائے اور ایک متفقہ مذہب پیدا کیا جائے۔ یہ اور زیادہ بے معنی بات ہے۔ درحقیقت اس قسم کا خلاصہ تیار کرنا بالکل ناممکن ہے۔ ایسی صورت میں جب کہ مختلف مذاہب کے درمیان بے شمار اختلافات ہیں۔ ان کا متفقہ خلاصہ تیار کرنے کی صورت یقیناً یہی ہوگی کہ ہر مذہب کی چند ایسی باتیں جو دوسرے مذاہب سے ٹکراتی نہ ہوں لے لی جائیں اور بقیہ تمام باتوں کو چھوڑ دیا جائے۔ اس ردّ و اختیار کا فیصلہ کرنے کا کسی کو کیا حق ہے۔ وہ کون شخص ہے جو اپنے بارے میں یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس کو اس قسم کی کاٹ چھانٹ کا مجاز قرار دیا گیا ہے۔ اگر کوئی سرپھرا اس قسم کا خلاصہ تیار بھی کر ڈالے تو اس کی قیمت ایک شخص کی ذہنی اپج سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی کوشش کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ہندستان اور چین کی پالیسی میں بعض یکساں قسم کے اصول دریافت کیے جائیں اور یہ دعویٰ کر دیا جائے کہ دونوں ملک دراصل ایک

---

[1] اوتار کے معنی ہیں۔ غیر ظاہر صورت سے ظاہر صورت میں ظہور پذیر ہونا۔

قانون کی حکومت ہے۔ سادہ بیاں کی عدالتیں دونوں میں سے جس قانون کے مطابق بھی فیصلہ کر دیں وہ صحیح مانا جائے گا

بھارت رتن ڈاکٹر بھگوان داس جو رادھا کرشنن کے الفاظ میں "مختلف مذاہب کے متعلق انسائیکلو پیڈیائی معلومات رکھتے ہیں" انھوں نے ایک ہزار صفحات پر مشتمل ایک کتاب تیار کی ہے جس کا نام ہے Essential Unity of All Religions اس کتاب میں انھوں نے اسی قسم کا ایک مذہب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کا نام عالمی مذہب (Universal Religion) یا حکیمانہ مذہب (Scientific Religion) رکھا ہے (ملاحظہ ہو کتاب کا پہلا باب) مگر تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی اس قسم کی کوشش کی گئی ہے اس نے مذہب کے نام سے دنیا میں ایک نئے نظریے کا اضافہ تو ضرور کیا ہے مگر وہ مختلف مذاہب کو یکجا کرنے میں کبھی کامیاب نہ ہو سکا۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے حقیقت یہ ہے کہ مذاہب کے درمیان اختلافات اتنے زیادہ اور اتنے بنیادی ہیں کہ جو شخص بھی اس قسم کا "خلاصہ" تیار کرنے اٹھے گا وہ بہت جلد محسوس کرے گا کہ حقیقی معنوں میں مشترک اجزا کی تلاش کچھ زیادہ مفید نہیں ہے اس لیے وہ مذاہب کی اصل تعلیمات کو غلط مفہوم دے کر اپنی فہرست کو مکمل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر بھگوان داس کی مندرجہ بالا کتاب کی مثال دی جا سکتی ہے جو اس قسم کی بے شمار غلطیوں سے بھری ہوئی ہے مثلاً ایک مقام پر انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مختلف مذاہب کے درمیان "بقائے باہم" کا نظریہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے بلکہ یہی تمام مذاہب کی اصل روح ہے۔ جو لوگ مذاہب کے درمیان اس قسم کی موافقت پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان کی حیثیت ان کے نزدیک "ریفارمر" کی ہے (صفحہ ۷۰) فرماتے ہیں:۔

"تمام مذاہب یکساں قسم کی سچائیوں کی تعلیم دیتے ہیں۔ مذاہب کے داعی اس پر بالکل متفق ہیں۔ اس مسئلے پر ہمیں ان کی واضح یقین دہانی حاصل ہے۔"

Essential Unity of All Religions, P. 75

اس کے بعد مختلف مذاہب کے اقتباسات پیش کر کے اپنے دعوے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ اسلام کی تعلیم بھی ان کے نزدیک یہی ہے کہ "بنیادی باتیں تمام مذاہب میں یکساں ہیں۔ سچائی ایک عالمگیر چیز ہے۔ وہ کسی نسل یا کسی مذہب کے داعی کی اجارہ داری نہیں ہے" (صفحہ ۷۸) اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قرآن کی چار آیتیں پیش کی ہیں اور ہر ایک کا بالکل غلط مفہوم بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک آیت یہ ہے:۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا (آل عمران)

اس آیت کا مطلب انھوں نے جن الفاظ میں کیا ہے وہ یہ ہے:۔

Cling, all, to the strong rope of Love Devine—Love for each other, and of the One God ——— And do not think of separation ever. (P. 83)

یعنی سب کے سب خدائی محبت کی رسی سے چمٹ جاؤ ایسی محبت جو ایک دوسرے کے لیے ہو اور ایک خدا کے لیے ہو اور علیحدگی کی بات کبھی نہ سوچو۔ اگر آپ آیت کو اس کے اصل مقام میں رکھ کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ اس کا مفہوم اس سے بالکل مختلف ہے جس کے لیے ڈاکٹر صاحب نے اسے استعمال کیا ہے :۔

یہ سورۂ آل عمران کی آیت ہے۔ آیت کے سیاق و سباق اور صحیح روایات کے مطابق یہاں حبل اللہ سے مراد قرآن ہے۔ یہاں دراصل یہ تعلیم دی گئی ہے کہ تمام لوگ خواہ وہ کسی سابقہ کتاب الٰہی کے حامل ہوں یا اس کے بغیر ہوں، ان کو چاہیے کہ ادھر ادھر منتشر رہنے کے بجائے خدا کی اس رسی کو مضبوط پکڑ لیں جس کو خدا کا آخری رسول لے کر آیا ہے۔ مگر حبل اللہ کو محبت سے تعبیر کر کے آیت کے مفہوم کو بالکل الٹ دیا گیا۔ اب اس کا مطلب ہوگیا کہ ہر شخص اپنے طور پر جس چیز کو حق سمجھتا ہے محبت انسانی کا تقاضا ہے کہ اس کو ایسا ہی سمجھنے دیا جائے۔ ہر آدمی اپنے اپنے پسندیدہ دین پر قائم رہتے ہوئے محبت کے فرضی تاگے کے گرد جمع ہو جائے۔ قرآن کے گرد سب کو اکٹھا ہونے کی ضرورت نہیں۔

ڈاکٹر صاحب مذاہب کی انسائیکلو پیڈیا ہیں مگر حیرت ہے کہ اپنا یہ نظریہ انھوں نے قرآن کی اس سورہ سے اخذ کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کے نزدیک دین صرف اسلام ہے اور جو لوگ اس سے اختلاف کر رہے ہیں وہ خواہ کسی سابق کتاب الٰہی کے حامل کیوں نہ ہوں، وہ کفر اور بغاوت کے مجرم ہیں۔ (آل عمران، آیت ۱۸) جس میں کہا گیا ہے کہ جو شخص اسلام اختیار کرے وہی ہدایت یاب ہے (۱۹) جس میں کہا گیا ہے کہ رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کی اطاعت سے انکار کفر یعنی خدا کی وفاداری سے انکار کرنا ہے (۳۱) جس میں کہا گیا ہے کہ اسلام کے سوا کوئی دوسرا دین خدا کے یہاں مقبول نہیں ہے۔ جو شخص کوئی دوسرا دین اختیار کرے گا وہ موت کے بعد آنے والی زندگی میں ناکام و نامراد ہوگا (۸۴) جس میں کہا گیا ہے کہ وہ قومیں جن پر پہلے کوئی آسمانی کتاب نازل ہوئی تھی ان کے لیے بھی اب صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ آخری رسول پر ایمان لائیں۔ ان میں سے جو ایسا کرے گا وہی دراصل خدا کا وفادار ہے اور جو ایسا نہ کرے وہ خدا کا نافرمان ہے۔ (۱۰۹) مگر ان واضح تصریحات کے باوجود ایک بالکل مختلف بات اسلام کی طرف منسوب کردی گئی کیونکہ اس کے بغیر عالمی مذہب کی ضرورت ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔

۳۔ پھر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اور گروہ مذہب کے نام سے جو کچھ پیش کر دے اس کو حقیقت مان لیا جائے۔ مگر یہ بدترین قسم کی موقع پرستی ہوگی۔ یہ حق کو ناحق کے ساتھ گڈمڈ کر دینا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جو شخص خدا کا انکا

کرے اس کو بھی ہم صحیح مانیں اور جو شخص خدا کا اقرار کرے اس کو بھی صحیح تسلیم کریں۔ جو کہے کہ کائنات میں صرف خدا ہی کو تصرف کا اختیار ہے وہ بھی صحیح اور جو کہے کہ خدا کے سوا کچھ اور دیوی دیوتا ہیں جن کو خوش کرکے کام نکالا جاسکتا ہے وہ بھی صحیح۔ جو کہے کہ مرنے کے بعد ایک اور دنیا میں جانا ہے جہاں جنت اور دوزخ ہے وہ بھی صحیح اور جو کہے کہ مرکر انسان دوبارہ اسی دنیا میں جنم پاتا ہے وہ بھی صحیح۔ جو کہے کہ خدا کی بندگی کی ضرورت صرف عبادت گاہوں کے اندر ہے وہ بھی صحیح اور جو کہے کہ عبادت گاہ سے لے کر عدالت اور پارلیمنٹ تک ہر جگہ خدا ہی کے احکام کی پیروی ہونی چاہیے وہ بھی صحیح۔ جو کہے کہ خدا اس کائنات کا صرف محرک اول ہے وہ بھی صحیح اور جو کہے کہ خدا آج بھی ہمارا خدا ہے اور اسی کی طرف ہمیں لوٹ کر جانا ہے وہ بھی صحیح۔ جو خدا کو انسان کی عجوبہ پسندی کی تخلیق سمجھے وہ بھی صحیح، اور جو خدا کو ایک حقیقی وجود قرار دے وہ بھی صحیح۔ جو خدا کی مکمل فرماں برداری میں انسان کی کامیابی سمجھے وہ بھی صحیح اور جو خدا کی فرماں برداری کے بغیر کامیابی کی توقع رکھے وہ بھی صحیح۔

اس نظریے کے مطابق حق ناحق میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح بھی صحیح ہے اور غلط بھی صحیح مثلاً ہندستان میں سیکولر حکومت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کی قانون سازی اور اس کی تمام کارروائی مذہب یا خدائی ہدایت سے آزاد ہو کر انجام دی جائے گی۔ یہاں انسانی آرا کے تحت فیصلہ ہوگا نہ کہ خدائی حکم کے تحت۔ یہ اصول صریح طور پر مذہب کے اس اصول سے ٹکراتا ہے کہ "انسان کو اپنے تمام انفرادی اور اجتماعی معاملات میں خدا کے حکم کا پابند ہونا چاہیے۔" مگر وحدتِ حقیقت کا نظریہ ایسے کسی ٹکراؤ کو تسلیم نہیں کرتا۔ نائب صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن اس تضاد کی توجیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

> شاید لوگوں کو تعجب ہو کہ ہماری تہذیب کی جڑیں تو روحانی قدروں میں پیوست ہیں لیکن ہماری حکومت غیر مذہبی ہے۔ دراصل غیر مذہبی ہونے سے مراد لا مذہبیت یا دہریت یا مادی راحت کو اہم سمجھنا نہیں بلکہ اس بات کا اعلان کرنا اور اس پر زور دینا ہے کہ روحانی قدریں عالمگیر ہیں اور ان کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے ہو سکتے ہیں۔"
>
> (قومی تہذیب کا مسئلہ، صفحہ ب)

اس مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کس طرح یہ نظریہ نہ صرف یہ کہ مذاہب کے باہمی اختلافات کو غیر اہم قرار دیتا ہے بلکہ اس کو ماننے کے بعد خدا پرستی اور الحاد میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔

اس انتہائی نامعقول بات کو رواج دینے کی کوشش جو لوگ کر رہے ہیں ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والے اگر اپنی اپنی صداقت پر اصرار کریں تو ان میں باہم کش مکش ہوگی اور انسان ایک دوسرے سے لڑنے

لگے گا۔ اس لیے حکمت عملی کا تقاضا ہے کہ ہر مذہب کو صحیح مان لیا جائے۔

مگر کسی ایک مذہب کی صداقت پر اصرار کو صرف اس بنا پر غلط نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے دوسرے مذہب والوں سے کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اولاً، تاریخ میں اس قسم کے جتنے جھگڑے ملتے ہیں ان میں بیشتر وہ ہیں جن کی ذمہ داری مذہب پر نہیں بلکہ مذہب کے ماننے والوں پہ ہے کسی نظریے کے ماننے والے جو عمل کریں اس کو لازمی طور پر اصل نظریے کی طرف منسوب نہیں کیا جاسکتا۔ اگر مہاتما گاندھی چورا چوری کے واقعہ کو ستیا گرہ کی روح کے خلاف قرار دینے میں حق بجانب تھے، اگر پولس اور سرکاری عملے کی بدعنوانی کے لیے قانون کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا تو یقیناً ہمیں ماننا ہوگا کہ اہل مذاہب کی غلطی کو مذہب کی طرف منسوب کرنا صحیح نہیں ہے۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آج معاملات کے اوپر سے مذہب کی گرفت بہت ڈھیلی ہو چکی ہے۔ مگر اس کے باوجود انسان کے درمیان باہمی لڑائیوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ آج ہم کو تیسری عالمی جنگ کا خطرہ درپیش ہے۔ جو اگر چھڑی تو وہ تاریخ کا ہولناک ترین فساد ہوگا۔ حالانکہ اس جنگ کے اسباب پیدا کرنے میں مذہب کا بالکل کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ پھر باہمی فسادات کا رشتہ مذہب سے جوڑنا کس طرح صحیح ہو سکتا ہے۔

اس کے علاوہ محض اختلاف اور کشمکش کا پیدا ہونا کسی نظریے کو جانچنے کا کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر صداقت اس قسم کی کشمکش پیدا کرتی ہے۔ اس سے بچنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کو معیار قرار دیا جائے تو محکوم ملکوں کی جد و جہد آزادی کو غلط قرار دینا پڑے گا۔ کیونکہ اس سے حکمراں طبقہ اور محکوم طبقہ کے درمیان کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اس نظریے کے مطابق تمام مزدور تحریکیں غلط ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے سرمایہ و محنت کے بے شمار جھگڑے پیدا ہو گئے ہیں۔ اسی طرح بہت سے نظریات جن کی صداقت پر آپ یقین رکھتے ہیں ان کو خیرباد کہنا پڑے گا۔ کیونکہ ان کی وجہ سے آپ کو ان لوگوں سے اختلاف کرنا پڑتا ہے جو آپ کے نظریے کو صحیح تسلیم نہیں کرتے۔

مذہب کا شخصی تصوّر

تمام مذاہب کو یکساں قرار دینے کا اتنا غلط نظریہ آخر پیدا کس طرح ہوا جب ہم اس سوال پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ دراصل مذہب کے بارے میں غلط طرز فکر کا نتیجہ ہے۔ یہ ان ذہنوں کی پیداوار ہے جو الہام کو نہیں مانتے اور مذہب کو صرف یہ حیثیت دیتے ہیں کہ وہ حقیقت کی تلاش میں انسانی کوششوں کا مظہر ہے۔ اگر آپ خدائی الہام کو مذہب کا ماخذ قرار دیں تو ظاہر ہے کہ حقیقت صرف وہ ہوگی جو الہام کے ذریعہ معلوم ہوئی ہو۔ اس کے باہر کسی مذہبی حقیقت کا وجود ممکن نہیں ہے۔ لیکن اگر مذہب صرف انسان کی تلاش و جستجو کا نام ہے تو ایسی صورت میں یقیناً اس کا کوئی متعین معیار نہیں ہو سکتا۔ ایسی صورت میں قدرتی طور پر ہر شخص کی طلب الگ الگ ہوگی۔ اس لیے ہر شخص کا

مذہب بھی دوسرے سے مختلف ہونا چاہیے۔ وحدتِ ادیان کے نظریے کی اصل فلسفیانہ بنیاد یہی ہے۔ اس کے سوا جو دلائل دیے جاتے ہیں، وہ محض ضمنی حیثیت رکھتے ہیں اور دیگر مصالح کے تحت وقتی طور پر وجود میں آئے ہیں۔

اس تصور کے مطابق مذہب ایک شخصی وجدان ہے۔ آدمی اپنی تمنا اور اپنی ریاضتوں کے ذریعہ حقیقتِ عالم سے اپنا تعلق جوڑتا ہے اور اس کا ادراک حاصل کرتا ہے۔ اسی کا نام مذہب ہے۔ جی آر ایس میڈ (Mead) لکھتے ہیں:

"سچائی کا آفتاب ایک ہے اور اس کی کرنیں تمام انسانوں کے دلوں اور دماغوں پر پڑتی ہیں۔ خدا کا اپنے بندوں کے ساتھ جو پدرانہ تعلق ہے اس کی بنا پر ہم کو اس کا یقین کرنا پڑے گا۔"

Good Reading, P. 129

ہوورڈ ڈی۔ ولیمس لکھتے ہیں۔

"مذہب آخری حقیقت کو معلوم کرنے کے لیے ایک عالمگیر، مختلف النوع اور کبھی نہ ختم ہونے والی جستجو ہے۔ اس جستجو میں کامیاب ہونے کے لیے اس ہمدردانہ آزادیِ رائے کی ضرورت ہے کہ بہت لوگ کوشش کرتے ہیں مگر چند لوگ پاتے ہیں۔"　　(حوالہ مذکورہ بالا)

ڈاکٹر رادھا کرشنن لکھتے ہیں:۔

"مذہب ایک وارداتِ قلب ہے جس سے انسان کی کایا پلٹ جاتی ہے۔ یہ خدا کے بارے میں کوئی علمی نظریہ نہیں بلکہ ایک روحانی شعور ہے۔ عقائد و اعمال، رسوم و عبادات، یہ سب چیزیں معرفتِ نفس اور عرفانِ الٰہی کے تابع ہیں۔ جب کوئی شخص اپنی روح کو عالمِ ظاہر سے ہٹا کر باطن پر مرکوز کرتا ہے اور یکسوئی کے ساتھ سرگرمِ طلب ہوتا ہے تو اس پر یکایک ایک انوکھی، پاک، حیرت انگیز واردات گزرتی ہے جو اندر ہی اندر لگتی رہتی ہے اور اس کی ہستی پر چھا جاتی ہے، اس کی ہستی بن جاتی ہے۔"

قومی تہذیب کا مسئلہ، ب

ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ حقیقت کا کوئی ایک تصور نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر آدمی جو کچھ کہہ دے اسی کو حقیقت مان لینا پڑے گا جس تصور کو جانچنے کے لیے کوئی متعین معیار نہ ہو بلکہ آدمی کا اپنا ذاتی وجدان ہی اس کا ماخذ ہو، ایسے تصور کے متعلق کسی شخص کو صحیح یا غلط کہنے کا کیا حق ہے۔ جب ہر آدمی الگ الگ حقیقت کی دریافت کرتا ہے تو ہر شخص کے نزدیک حقیقت کا تصور بھی الگ الگ ہونا چاہیے۔ مہاتما گاندھی فرماتے ہیں:۔

"یہ میرا تجربہ ہے کہ اپنے نقطۂ نظر سے میں ہمیشہ حق پر ہوتا ہوں اور اپنے دیانت دار ناقد کے نقطۂ نظر سے اکثر ناحق پر"

میں جانتا ہوں کہ ہم دونوں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح ہیں .... سات اندھے آدمی جنھوں نے ہاتھی کے متعلق سات مختلف بیانات دیے تھے، ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے نقطۂ نظر سے صحیح تھا اور دوسرے کے نقطۂ نظر سے غلط .... میں اس تعددِ صداقت (Manyness of Reality) کے اصول کو بہت پسند کرتا ہوں۔ یہی وہ اصول ہے جس نے مجھے سکھایا ہے کہ میں مسلمان کو اس کے اپنے نظریے کے مطابق دیکھوں اور عیسائی کے بارے میں اس کے اپنے نظریے کے تحت فیصلہ کروں۔"

My Religion, pp. 20-21

مذہب کے مندرجہ بالا تصور میں نہ صرف یہ کہ نبوت کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے بلکہ وہ "ختم نبوت" کو بھی تسلیم نہیں کرتا کیونکہ مذہب جب حقیقت کو دریافت کرنے کے لیے انسان کی جدوجہد ہے تو دوسری انسانی کوششوں کی طرح مذہب کو بھی ہمیشہ ارتقاء پذیر ہونا چاہیے۔ اس تصور میں دورِ سابق کے کسی پیشوا کی دائمی رہنمائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مہاتما گاندھی مذہب میں رواداری (Tolerance) کی اہمیت بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"اگر ہم پوری سچائی کو پالیں تو ہم محض متلاشی حق نہیں رہیں گے بلکہ خدا کے ساتھ ایک خدا کی حیثیت اختیار کرلیں گے۔ کیونکہ سچائی ہی خدا ہے۔ مگر صرف متلاشی ہونے کی صورت میں ہم اپنی تلاش جاری رکھیں گے اور اس بات کو ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ ہم ابھی ناقص ہیں۔ اور جبکہ ہم خود ناقص ہوں، ایسی صورت میں ہم جس مذہب کو اختیار کیے ہوئے ہوں گے وہ بھی ناقص ہوگا۔ ہم نے ابھی مذہب کو اس کی مکمل صورت میں نہیں پایا ہوگا جس طرح ہم نے ابھی خدا کو نہیں پایا ہوگا۔ اس طرح نامکمل ہونے کی وجہ سے ہمارا مذہب ہمیشہ ارتقاء کے عمل سے گزرتا رہے گا اور اس کی بار بار تعبیریں ہوں گی۔ صرف اسی طرح کے عمل ارتقاء کے ذریعہ یہ ممکن ہے کہ سچائی اور خدا کے بارے میں انسان ترقی کر سکے۔ اور اگر انسان کے بنائے ہوئے تمام عقیدے نامکمل ہیں تو ایک دوسرے میں تقابل کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ تمام عقیدے سچائی کا انکشاف کرتے ہیں۔ مگر تمام کے تمام نامکمل ہیں اور سب میں غلطیاں ہو سکتی ہیں۔"

My Religion, P. 20 (1955)

مشہور مغربی مورخ آرنلڈ ٹائن بی کا خیال ہے کہ "انسانی تاریخ میں یہ تصور نسبتاً دیر میں آیا ہے کہ بعض مذاہب بہتر ہیں اور ان کو تمام بنی نوع انسان کے لیے ہونا چاہیے۔ یہ تصور ابتدائی سماج میں نہیں پایا جاتا .... اعلیٰ روحانی نقطۂ نظر کے مطابق اس طرح کے مذاہب یقیناً ناقص تھے۔ مگر وہ ایک منفی اہمیت ضرور رکھتے ہیں۔ وہ مختلف مذاہب کے درمیان "جیو اور جینے دو" (Live and Let Live) کے ذہن کی پرورش کرتے ہیں" وہ [illegible]

"یہ انسانی تاریخ کی ایک ستم ظریفی ہے کہ علمی روشنی جس نے مذہب میں ایک خدا اور انسانی اخوت کا تصور پیدا کیا اسی کے ساتھ وہ تعصب اور جبر بھی لایا ہے"........... جہاں کہیں اور جب کبھی اعلیٰ مذہب (Higher Religion) کی تبلیغ کی گئی ہے تعصب اور جبر کے ہیبتناک واقعات ضرور وجود میں آئے ہیں........... رواداری (Toleration) کا صحیح مطلب یہ ہے کہ تمام مذاہب کے بارے میں یہ تسلیم کیا جائے کہ وہ مشترک روحانی منزل کی تلاش ہیں۔ اگرچہ ان جستجوؤں میں بعض زیادہ ترقی یافتہ ہوسکتے ہیں یا دوسرے کے مقابلے میں ان کی تلاش زیادہ صحیح لائنوں پر ہوسکتی ہے۔ مگر ایک "صحیح" مذہب کا کسی "غلط" مذہب پر جبر کرنا، بذات خود ایک اصطلاحی تضاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ صحیح مذہب جب ظلم و جبر کرنے لگتا ہے تو وہ خود اپنے کو غلط پوزیشن میں ڈال دیتا ہے اور اپنے دعوے کی خود ہی تردید کردیتا ہے"

A Study of History (Abridgment) P. 300

کلچر کا تاریخی تصور

مذہب کے متعلق جب یہ تصور ہو تو مذہب کی بنیاد پر جتنے افعال پیدا ہوتے ہیں وہ بھی ظاہر ہے کہ اسی رنگ میں دیکھے جائیں گے۔ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تہذیب کو کوئی حقیقی چیز نہ سمجھا جائے بلکہ انسانی ذہن کی پیداوار قرار دیا جائے۔ ڈاکٹر رادھاکرشنن اپنی کتاب "مذہب اور سماج" کے آخر میں لکھتے ہیں:

"تہذیب کوئی جامد یا خارج سے عائد کردہ چیز نہیں ہوتی۔ وہ عوام کا خواب ہے، وہ انسانی زندگی کی ایک تخیلاتی تعبیر ہے، وہ اسرار حیات کا ایک شعور ہے"

Religion and Society, P. 244

اس تصور کے مطابق تہذیب اور کلچر کو کسی دائمی معیار پر جانچنے یا ان کا پابند بنائے رکھنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ ہمارے مصلحین کو یہ بالکل ایک مناسب بات معلوم ہوتی ہے کہ ملک میں مختلف تہذیبوں کو ختم کرکے ایک قومی تہذیب کو رائج کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ جس تہذیب کی بنیاد محض شخصی تجربوں پر ہو اُس میں انفرادیت پر اس قدر زور دینا بے معنی ہے۔ اس تصور کے مطابق "مشترک تعلیمی نظام" تمام فرقوں کی بہت بڑی ضرورت ہے۔ کیونکہ وہ "غیر حقیقی اختلافات" کو ختم کرکے "حقیقی یگانگت" پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔ ایک ہندستانی عالم سیاسیات اڈی اسروانھم (Eddy Asirvatham) لکھتے ہیں:-

"........ قومی تعلیم اگر اس کو صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے تو وہ یکساں اخلاقی معیار، صحیح اور غلط کا یکساں تصور، بیشتر معاملات میں تصورات کی یگانگت اور مختلف افراد کے درمیان سماجی اتحاد پیدا کرنے کی ضرورت

کو بخوبی پورا کرسکتی ہے۔ ہندوستانی قومیت کو اگر ایک مضبوط پودے کی شکل میں ترقی دینا ہے تو تصورات اور معیار کی یکسانی پیدا کردینا ضروری ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلم کلچر نے اس حد تک ایک دوسرے پر اثر ڈالا ہے کہ آج کا ہندوستانی اور پاکستانی اسلام عرب یا دوسرے قریبی مسلم ملکوں کا اسلام نہیں ہے۔ اس لیے ہمارے درمیان جو تہذیبی اختلافات ہیں ان کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا نہیں چاہیے۔ اور اگر دو بڑے گروہوں (ہندو اور مسلم) کے درمیان ایک مناسب سمجھوتہ ہوجائے تو اس قسم کے بیشتر اختلافات پس پشت چلے جائیں گے۔ تعلیم کا ایک قومی نظام وحدت کی سب سے بڑی ضرورت ہے"

Political Theory, P, 568

یہ ذہن کسی قوم کے کلچر کو اس قوم کی تاریخ میں دیکھتا ہے نہ کہ کسی دائمی اور ابدی نظریات کی روشنی میں۔ اس کے نزدیک کوئی مذہبی گروہ جو طور طریقہ اختیار کرلے وہی اس کا مستند کلچر ہے خواہ وہ مذہب کی اصل تعلیمات کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ ڈاکٹر سید عابد حسین لکھتے ہیں :-

"جذبات اور مصلحتوں کو چھوڑ کر معروضی علمی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کے دھارے جہاں سے وہ مذہب کے سرچشموں سے نکلتے ہیں ایک دوسرے سے الگ دکھائی دیتے ہیں .....
...... البتہ جب دونوں دھاروں کو زمانے کی ہوائیں ہندوستان کی سرزمین پر ایک دوسرے کے قریب لے آئیں تو تاریخ اور جغرافیے کی متحدہ قوتیں ان کو ملا کر ایک عظیم الشان دریا بنانے کی کوشش میں مصروف ہوگئیں"

قومی تہذیب کا مسئلہ صفحہ ۳۰۰ (۱۹۵۵ء)

انڈین یونین کے وزیر ثقافت جناب ہمایوں کبیر صاحب نے دسمبر ۱۹۵۸ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تقسیم اسناد کے موقع پر خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا :-

"اسلامی کلچر نے، جس کی بنیاد قرآن میں درج چند سادہ اور ابدی صداقتوں پر تھی، جلد ہی دنیا کی تمام معروف تہذیبوں سے (مختلف) عناصر لے کر اپنے اندر سمو لیے۔ یونانی فلسفہ اسلامی فکر کا ایسا لاینفک جزو بن گیا کہ ارسطو کے نظریات پر اعتراض کرنا بدعت اور الحاد خیال کیا جانے لگا۔ ایران کے نظریات و اعمال بھی اسلامی زاویۂ نظر کی ساخت و بافت میں شامل کرلیے گئے۔ یہودی، عیسائی اور رومی قانون اور نظریہ تخلیق مسلم قوم کے (تہذیبی) ورثہ کا جزو بن گئے۔ ہندوستان نے بھی بہت سے میدانوں میں مسلم فکر کی آبیاری میں حصہ لیا .... اسلام کے ہندوستان آنے سے قبل ہی اپنشد کی تعلیمات نے صوفی فکر کی نشوونما میں مدد دی تھی۔ مسلم آرٹ اور سہر چین کے مالامال اور رفت کلچر

سے رابطہ رکھنے کی وجہ سے مالا مال ہوگئے۔ اسلام نے وسطی ایشیا کے سادہ مزاج اور توانا ترکوں کے رسوم و روایات اور قصے کہانیوں سے بھی استفادہ کیا۔ جس وقت کہ اسلام ہندوستان آیا، وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ویسا ہی مرکب اور متنوع تھا جیسی کہ وہ مالا مال ہندوستانی تہذیب جس سے اس کو سابقہ پڑا۔"

آگے چند سطروں کے بعد لکھتے ہیں:-

"فکری امتزاج کے لیے زیادہ شعوری کوشش فیضی اور ابوالفضل اور ان کے بعد شاہجہاں کے دور حکومت میں دارا شکوہ کے ہاتھوں ہوئی۔ میں نے اکثر محسوس کیا ہے کہ ہندو فلسفہ حیات کی طاقت اور اس کا استحکام آریائی اور غیر آریائی نقطہ ہائے نظر کے مکمل امتزاج و تحلیل کا نتیجہ ہے۔ انسانی ذکاوت کا یہ اعلیٰ ترین فعل ہے کہ سیاہ فام اور غالباً قدیم قبائلی دیوتا کرشن کو سفید فام دیوتا رُدر یا شیو کا ہم پایہ بنا کر ہندو دیوتاؤں کے زمرے میں شامل کر لیا گیا۔ وہ بے پناہ تخیل جس نے اس امتزاج کو ترقی دی اس نے امتزاج و تحلیل کو اس حد تک مکمل کر دیا کہ آج دراوڑ، آریائی اور ان دوسرے سلسلوں میں باہم فرق و امتیاز تقریباً ناممکن ہے جو مل جل کر ہندو نقطہ نظر کی تشکیل کرتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی بدقسمتی تھی کہ ہندو اور مسلم نقطہ ہائے نظر کے درمیان فکری امتزاج کی ایسی ہی کوششیں تشنۂ تکمیل رہیں۔"

مذہب کے اس تصور سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بہت سے لوگ وحدتِ ادیان کا نعرہ کیوں اٹھاتے ہیں یا کس بنا پر مشترکہ تہذیب پیدا کرنے کی کوشش کو حق بجانب سمجھتے ہیں۔ مگر اسلام کے نزدیک چونکہ مذہب کا یہ تصور صحیح نہیں ہے، اس لیے وحدتِ ادیان یا وحدتِ تہذیب کا نظریہ بھی اس کے لیے قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مذہب کسی شخص کی قلبی واردات کا نام نہیں ہے اور نہ وہ حقیقت کی تلاش کے سلسلے میں انسانی کوششوں کا مظہر ہے بلکہ وہ منزل من اللہ دین کا نظریہ رکھتا ہے[1]۔ اس کے نزدیک مذہب مکمل طور پر خدا کا حکم ہے جو خود خدا کی طرف سے آیا ہے۔

اس حد تک تمام صحیح مذاہب ایک ہیں۔ دوسرے لفظوں میں تاریخی اعتبار سے وہ تمام مذاہب یکساں حیثیت رکھتے ہیں جو خدا کی طرف سے بھیجے گئے ہیں۔ مگر اب سے چودہ سو برس پہلے خدا کا آخری رسول آیا۔ اس نے ایک مکمل شریعت پیش

---

[1] جدید فلسفہ نے مذہب کے الہامی تصور پر سخت تنقید کی ہے۔ ان میں سے بعض لوگ جو مذہب جیسی ایک چیز کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں وہ بھی مذہب کا تصور الہام کے بغیر کرتے ہیں۔ ہکسلے نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے مذہب بغیر الہام (Religion without Revelation) اس میں اس نے بڑی شدت سے اس نقطہ نظر کی حمایت کی ہے، اور وحی و الہام کے تصور کو رد کیا ہے۔ مگر یہاں میں اس بحث کو نہیں چھیڑ رہا ہوں۔ ان شاء اللہ ایک الگ مضمون میں ان دلائل کا جائزہ لینے کی کوشش کروں گا۔

ی اور اعلان کیا کہ پچھلی تمام شریعتیں اللہ تعالیٰ نے منسوخ قرار دے دی ہیں اور آئندہ قیامت تک کے لیے صرف اسی کی لائی ہوئی شریعت انسان کے لیے صحیح لائحہ عمل ہوگی۔ اس طرح اب جو صورت حال ہے وہ یہ کہ زمین کے اوپر خدا کا صحیح اور مستند دین ہونے کی حیثیت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ جو شخص خدا کی مرضی معلوم کرنا چاہیے یا خدا کے احکام پر چلنا چاہتا ہو اس کو لازمی طور پر اسلام اختیار کرنا ہوگا۔ دوسرے کسی طریقے کی پیروی میں وہ خدا کی رضا حاصل نہیں کرسکتا۔ اس سلسلے میں قرآن کے بعض حوالے میں اوپر نقل کرچکا ہوں۔ یہاں مزید وضاحت کے لیے دو حدیثیں درج کر رہا ہوں:-

أُرسِلتُ إلى الخَلقِ كافّةً وخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ (مسلم)	میں تمام بنی نوع انسان کی طرف بھیجا گیا ہوں اور مجھ پر رسولوں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔
وَالَّذِي نَفسُ مُحَمَّدٍ بِيَدِهِ لَا يَسمَعُ بِي أَحَدٌ مِن هَذِهِ الأُمَّةِ يَهُودِيٌّ وَلَا نَصرَانِيٌّ ثُمَّ يَمُوتُ وَلَم يُؤمِن بِالَّذِي أُرسِلتُ بِهِ إِلَّا كَانَ مِن أَصحَابِ النَّارِ	اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد کی جان ہے جو بھی میرا پیغام سنے گا خواہ وہ یہودی ہو یا نصرانی اگر وہ میری لائی ہوئی چیز پر ایمان لائے بغیر مر جائے تو یقیناً وہ دوزخ میں جائے گا۔

اس حدیث کے مطابق نجات کی صورت یہ نہیں ہے کہ آدمی کسی بھی مذہب کی پیروی کرلے بلکہ نجات کے لیے ضروری ہے کہ آخری رسول کا اتباع کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس تصور مذہب میں وحدت ادیان کی قطعاً گنجائش نہیں ہے۔ جس دین کا دعویٰ کھلے لفظوں میں یہ ہو کہ کامیابی کا راستہ صرف وہ ہے وہ اپنے دعوے کے خلاف آخر یہ بات کس طرح مان لے گا کہ کامیابی حاصل کرنے کے دوسرے راستے بھی ہوسکتے ہیں۔

خدا ایک ہے

(مولانا سید جلال الدین عمری)

ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی یہ عظیم اور حیرت انگیز کائنات از خود وجود میں نہیں آئی ہے بلکہ اس کو خدا نے پیدا کیا ہے تو قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ایک ہے۔ اس کی ساری تعلیمات اسی دعوے کے گرد گھومتی ہیں۔ اگر کوئی شخص خدا کے وجود کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو ایک نہیں مانتا تو قرآن کے نزدیک اس کا خدا کو ماننا اور نہ ماننا برابر ہے۔ وہ کہتا ہے جس طرح خدا کے انکار کے بعد کائنات ہمارے لیے ایک معمہ بن جاتی ہے اسی طرح بہت سے خداؤں کو ماننے سے کائنات کے بارے میں پیدا ہونے والے مسائل کا کوئی صحیح حل ہمیں نہیں ملتا۔ اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے خدا کے وجود کو تسلیم نہ کرنا جس قدر لغو اور مہمل ہے قرآن کے نزدیک اسی قدر یہ بات بھی لغو اور مہمل ہے کہ اس کے کئی خدا مانے جائیں۔ کائنات کے بارے میں ابھرنے والا ہر سوال عقل کی روشنی میں حل ہو جاتا ہے جب ہم خدا کو ایک مانتے ہیں اور ایک سے زیادہ خداؤں کو ماننے کے بعد ہماری کوئی منطق کائنات کے کسی بھی مسئلہ کو حل نہیں کر سکتی۔ پہلے آپ قرآن کے دعوے کو اسی کی زبان میں سنیے:-

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (سورۂ اخلاص)	کہو کہ اللہ ایک ہے۔
اَللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ	اللہ ایک ہے سوائے اس کے کوئی معبود نہیں۔
(البقرہ - ۲۵۵)	وہ زندہ ہے اور کائنات کو تھامے ہوئے ہے
وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ	اور تمہارا معبود صرف ایک معبود ہے اس کے
الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ (البقرہ ۱۶۳)	سوا کوئی دوسرا معبود نہیں۔ وہ بڑا مہربان اور رحیم ہے
هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ (الزمر ۴)	وہ اللہ جو ایک ہے اور جو سب پر غلبہ رکھتا ہے۔

قرآن کا یہ دعویٰ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ اپنے ساتھ دلیل بھی رکھتا ہے۔ خدا ہے تو اس کا ایک ہونا طے شدہ اور یقینی ہے۔ اس کے اثبات کے لیے سوائے اس کے اور کسی دلیل کی ضرورت نہیں کہ وہ موجود ہے۔ اس کا وجود خود اس

خدا ایک ہے

بات کے ماننے کے لیے کافی ہے کہ وہ ایک ہے کسی بھی وجود کا تصور آپ کم سے کم ایک کے عدد میں کر سکتے ہیں۔ ایک سے نیچے وجود کا درجہ ختم ہو جاتا ہے اور عدم وجود کی سرحد شروع ہو جاتی ہے۔ اس لیے خدا کو ایک مانے بغیر اس کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ جو لوگ بہت سے خداؤں کو مانتے ہیں قرآن ان سے کہتا ہے کہ خدا کا ایک ہونا تمہارے اور ہمارے درمیان تسلیم شدہ ہے۔ اب اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ اس ایک خدا کے ساتھ بہت سے خدا اور بھی ہیں تو ان کا نشان دیتے بتاؤ وہ کون سی دلیل ہے جس کی بنا پر تم نے بہت سے خدا مان رکھے ہیں؟

قُلْ أَرُونِيَ الَّذِينَ أَلْحَقْتُم بِهِ شُرَكَاءَ كَلَّا بَلْ هُوَ اللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ (السبا ۔ ۲۷)

ان سے کہو جن شریکوں کو تم نے خدا کے ساتھ ملا رکھا ہے (ذرا) انہیں مجھے بھی تو دکھاؤ (کہ وہ کہاں ہیں؟) ہرگز نہیں (خدا کا کوئی شریک نہیں ہے) بلکہ وہی ایک خدا ہے عزیز و حکیم۔

ءَإِلَٰهٌ مَّعَ اللَّهِ قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ۝ (النمل ۶۴)

کیا اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ بھی ہے؟ ان سے کہو تم اپنی دلیل تو پیش کرو، اگر تم واقعی اپنے دعوے میں سچے ہو۔

أَمِ اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ (الانبیاء ۔ ۲۴)

کیا انھوں نے خدا کے سوا دوسرے معبود بھی بنا رکھے ہیں؟ ان سے کہو کہ تم اپنی دلیل تو لاؤ۔

قرآن نے جو مثالی کردار ہمارے سامنے پیش کیے ہیں ان میں ایک کردار وہ ہے جس کو اس نے "اصحاب کہف" کا نام دیا ہے۔ اصحاب کہف فرماتے ہیں:-

هَٰؤُلَاءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً لَّوْلَا يَأْتُونَ عَلَيْهِم بِسُلْطَانٍ بَيِّنٍ فَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ كَذِبًا ۝ (الکہف ۔ ۱۵)

یہ ہماری قوم جس نے خدا کے سوا دوسرے معبود گھڑ رکھے ہیں آخر وہ اس پر کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتی؟ اس سے بڑا ظالم اور کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹی تہمت باندھے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے:-

أَئِنَّكُمْ لَتَشْهَدُونَ أَنَّ مَعَ اللَّهِ آلِهَةً أُخْرَىٰ قُل لَّا أَشْهَدُ قُلْ إِنَّمَا هُوَ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ وَإِنَّنِي بَرِيءٌ مِّمَّا

(ان سے پوچھو) کیا تم اس بات کی گواہی دیتے ہو کہ اللہ کے ساتھ کچھ اور بھی الٰہ ہیں۔ تم کہو کہ میں اس کی گواہی نہیں دیتا۔ ان سے کہو کہ وہ صرف اکیلا معبود ہے

تُشْرِكُوْنَ ۝ (الانعام - ۱۹) اور بے شک میں تمہارے شرک سے بری ہوں۔

مطلب یہ کہ میں خدا کو ایک مانتا ہوں اور خدائی میں کسی دوسرے کے شریک ہونے کی تردید کرتا ہوں لیکن اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ خدا ایک نہیں ہے بلکہ بہت سے خدا ہیں تو بتاؤ اس کی دلیل کیا ہے؟ بغیر دلیل کے تمہارا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ ہے اور میں اس جھوٹ میں تمہارے ساتھ شریک نہیں ہو سکتا۔

کئی خداؤں کے ماننے کی تین وجہیں ہو سکتی ہیں پہلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ خدا کو ایک ماننے سے کائنات کی تخلیق کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کائنات کو عدم سے وجود میں لانے کے لیے بہت سے خداؤں کی ضرورت ہے تو ماننا پڑے گا کہ واقعۃً خدا ایک نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ نظمِ کائنات کئی خداؤں کا تقاضا کرتا ہے۔ مشاہدۂ کائنات اگر یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کے چلانے کے لیے ایک خدا کافی نہیں ہے تو ہمیں خداؤں کی اتنی تعداد ماننی چاہیے جتنی کہ نظمِ کائنات کے لیے ضروری ہے۔ تیسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انسان کی نفسیات ایک خدا سے مطمئن نہیں ہیں۔ انسان کے باطن میں خدا کی طلب اور احتیاج موجود ہے۔ یہ باطنی طلب خدا کے وجود کی زبردست دلیل ہے۔ ایک خدا سے اگر یہ طلب پوری نہیں ہوتی ہے تو انسان اس کو پورا کرنے کے لیے کئی خداؤں کے ماننے پر مجبور ہوگا۔

آئیے اب ہم ان تینوں وجہوں پر تفصیل سے غور کریں۔

یہ کائنات کیسے وجود میں آئی؟ اس کا نہ ہم نے مشاہدہ کیا ہے اور نہ ہمارے پاس کوئی تاریخی ریکارڈ ہے جو اس کے وجود کے قطعی اسباب بیان کر سکے۔ بلکہ ایک واقعہ ہمارے سامنے موجود ہے جس کے اسباب ہمیں معلوم کرنے ہیں۔ عقل کا صریح تقاضا ہے کہ جو واقعہ اپنے ظہور کے لیے جن اسباب کا اور جتنے اسباب کا محتاج معلوم ہو ان ہی اسباب کو اور اتنے ہی اسباب کو اس واقعہ کی علت قرار دیا جائے۔ جس واقعہ کو وجود میں آنے کے لیے صرف پانچ چیزوں کی ضرورت محسوس ہوتی ہو، بے عقلی ہوگی اگر ہم دس چیزوں کو اس کے وجود کا سبب مانیں۔ فلسفہ اور سائنس دونوں کے نزدیک یہ مانی ہوئی حقیقت ہے کہ کم سے کم مفروضات سے جس واقعہ کی توجیہ ممکن ہے اس کے لیے زیادہ مفروضات کا قائم کرنا لغو اور مہمل ہے۔ ایک مثال لیجیے۔ آپ کسی کمرے میں داخل ہوتے ہیں وہاں آپ کو ایک میز اور کرسی رکھی ہوئی نظر آتی ہے۔ آپ کے ذہن میں فوراً سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ میز اور کرسی یہاں کیسے پہنچ گئی؟ اس سوال کو حل کرنے کے لیے آپ فرض کرتے ہیں کہ کسی انسان نے میز اور کرسی کو یہاں رکھا ہوگا اس سے آپ کا سوال حل ہو جاتا ہے کیونکہ انسان صاحبِ شعور ہے اور اس کے ایک فرد میں اتنی قوت بھی ہے کہ وہ یہ عمل انجام دے سکے جب ایک

انسان کو تسلیم کرنے کے بعد یہ سوال حل ہوجاتا ہے تو اس کے لیے دس انسانوں کا فرض کرنا بے معنی ہوگا۔

ٹھیک اسی طرح خدا کو ایک ماننے کے بعد کائنات کی تخلیق کا مسئلہ حل ہوجاتا ہے۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ تخلیق میں بہت سے خداؤں کو شریک کرنا عقل و بصیرت کی محرومی کی دلیل ہے۔ قرآن کا مطالبہ ہے کہ تم خدا کو ایک مانو اور پھر دیکھو کہ کائنات کی کس کس چیز کے پیدا کرنے سے وہ عاجز ہے؟ اگر خدائے واحد ہر چیز پیدا کرسکتا ہے تو دعوئ شرک کی اس کائنات میں عقلاً کوئی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ بار بار وہ یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کائنات کی وہ کون سی ضرورت ہے جس کے لیے تم ایک خدا کے بجائے بہت سے خداؤں کو مان رہے ہو؟ خدائے واحد کے تصور کے بعد وہ کون سی گتھیاں ہیں جو حل ہونے سے رہ جاتی ہیں جن کے حل کے لیے تم مزید خداؤں کو اپنے ذہن و فکر پر مسلط کر رہے ہو؟ تمہارے خود ساختہ خدا تخلیق کا وہ کون سا کام انجام دے رہے ہیں جو خدائے واحد انجام نہیں دیتا؟ اس کائنات میں وہ کون سے دلائل ہیں جو خدائے واحد کے ساتھ اور خداؤں کی بھی نشان دہی کر رہے ہیں؟ آسمان، زمین، چاند، سورج اور دوسرے بے شمار سیارے، ان میں سے کون اس بات کا محتاج ہے کہ تنہا خدا کو ان کا خالق نہ مانا جائے اور مزید خداؤں کو اس کے ساتھ شامل کیا جائے۔

قل ارایتم ما تدعون من دون الله اروني ماذا خلقوا من الارض ام لهم شرك في السموات ائتوني بكتاب من قبل هذا او اثرة من علم ان كنتم صادقين (الاحقاف-۴)

اے پیغمبر ان سے کہو کیا تم نے غور کیا کہ جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو (وہ صحیح بھی ہیں یا نہیں؟) بتاؤ کہ انھوں نے زمین کی کون سی چیز پیدا کی؟ یا آسمان میں ان کا کون سا حصہ ہے؟ تمہارے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب ہو یا علم و بصیرت کی کوئی نشانی ہو تو اس کو پیش کرو، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

قل ارایتم شركاءكم الذين تدعون من دون الله اروني ماذا خلقوا من الارض ام لهم شرك في السموات ام اتيناهم كتابا فهم على بينت منه بل ان يعد الظلمون بعضهم

اے پیغمبر! ان سے پوچھو کیا تم نے اپنے شرکاء کے بارے میں غور کیا جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو؟ مجھے بتاؤ کہ انھوں نے زمین میں کون سی چیز پیدا کی یا ان کا آسمانوں میں کوئی حصہ ہے؟ کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے کہ اس سے ان کو اپنے خیال پر کوئی دلیل مل گئی ہے؟ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ظالم ایک دوسرے کو

بَعْضًا اِلَّا غُرُوْرًا ۝ (فاطر ۴۰)
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ
تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِى الْاَرْضِ رَوَاسِىَ
اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ وَبَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ
دَآبَّةٍ وَّاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً
فَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍ كَرِيْمٍ هٰذَا خَلْقُ
اللّٰهِ فَاَرُوْنِىْ مَاذَا خَلَقَ الَّذِيْنَ مِنْ
دُوْنِهٖ بَلِ الظّٰلِمُوْنَ فِىْ ضَلٰلٍ
مُّبِيْنٍ ۝ (لقمٰن ۱۱-۱۰)

سے جو وعدہ کرتے ہیں وہ محض دھوکا ہے
اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر کسی ستون کے
جس کو تم دیکھ سکو اور زمین میں اس نے بھاری پہاڑ گاڑ
دیے تاکہ وہ تم کو لے کر ڈھلک نہ جائے۔ اور اس میں
ہر قسم کے جان دار پھیلائے اور ہم نے آسمان سے پانی اتارا
اور زمین میں ہر قسم کی عمدہ چیزیں پیدا کیں۔ یہ خدا کی
تخلیق ہے۔ مجھے بتاؤ کہ خدا کے سوا (جو معبود تم نے
بنا رکھے ہیں) انھوں نے کیا پیدا کیا۔ بلکہ صحیح بات یہ ہے
کہ ظالم کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

کائنات کی ساخت تردید کر رہی ہے کہ اس کے کئی خالق ہیں۔ کائنات ایک وحدت ہے اس کو آپ الگ الگ حصوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ جس طرح ایک جال کی مختلف کڑیاں باہم پیوست ہوتی ہیں اس طرح قانونِ کشش نے کائنات کے مختلف حصوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دیا ہے یہ حقیقت سائنس کی دنیا میں تسلیم کی جا چکی ہے کہ بعید ترین سیارے بھی قانونِ کشش سے آزاد نہیں ہیں۔ کائنات میں پھیلا ہوا سیاراتی نظام انتہائی مربوط ہے۔ ہر سیارے کا دوسرے سیارے سے بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک کُل ہے جس کے کسی بھی جزء کو دوسرے سے جدا کر دیا جائے تو سارا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس تخلیق کے پیچھے کوئی ایک ذہن موجود نہیں ہے تو کائنات میں وہ وحدت نہ ہوتی جو ہم دیکھ رہے ہیں بلکہ یہاں مختلف و متضاد اجزا ہوتے جن کے درمیان ربط و علاقہ ناپید ہوتا۔

کائنات کا ایک وحدت کی شکل میں موجود ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا بھی ایک ہے۔ کیونکہ کسی ایک واقعہ کی ایک ہی علت ہو سکتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ واقعہ ایک ہو اور علتیں کئی ایک جمع ہو جائیں۔

علامہ ابن رشد نے اس سلسلے میں بڑی اچھی بحث کی ہے۔ یہ بحث بہت لمبی ہے ہم اسے یہاں اختصار کے ساتھ نقل کرتے ہیں:-

انہ من المعلوم بنفسہ انہ اذا
کان ملکان کل واحد منہما فعلہ
فعل صاحبہ فانہ لیس یمکن ان

یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ اگر دو بادشاہ ہوں
اور ہر بادشاہ وہی کام کرے جو دوسرا کرتا ہے تو
ممکن نہیں کہ ان دونوں کی تدبیر سے شہر ایک رہے۔

يكون عن تدبيرهما مدينة
واحدة لأنه ليس يكون عن فاعلين
من نوع واحد فعل واحد فيجب
ضرورة إن فعلا معا أن تفسد
المدينة الواحدة إلا أن يكون
أحدهما يفعل ويبقى الآخر عطلا
وذالك منتف في صفة الآلهة
فإنه متى اجتمع فعلان من نوع
واحد على محل واحد فسد المحل
ضرورة ...... إنه يلزم في الآلهة
المختلفة الأفعال التي لا يكون
بعضها مطيعا لبعض أن لا يكون
عنها موجود واحد ولما كان العالم
واحدا وجب أن لا يكون موجودا
عن آلهة متفننة الأفعال ....
...... أن العلماء يعلمون من
إيجاد العالم وكون أجزائه بعضها
من أجل بعض بمنزلة الجسد
الواحد أكثر مما يعلم الجمهور
من ذالك .... والأشبه
أن لو كان اثنين أن يكون العالم اثنين فأما
العالم واحد فالفاعل واحد فإن الفعل
الواحد إنما يوجد عن واحد [1]

کیونکہ ایک ہی نوعیت کے دو کام کرنے والوں سے ایک
فعل وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لیے یہ واضح بات ہے
کہ اگر دونوں عمل کریں تو شہر بگڑ جائے گا سوا اس کے کہ ان
میں سے ایک عمل کرے اور دوسرا معطل رہے۔ اور
یہ بات خداؤں کی صفتِ خدائی کے منافی ہے۔ پس
اس لیے جب بھی ایک جگہ میں ایک ہی نوعیت کے عمل
جمع ہو جائیں گے تو لازماً جگہ میں فساد رونما ہوگا۔۔
.... ایسے خدا جن کے عمل مختلف ہیں (کیونکہ
ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ عمل کر رہا ہے) اور جو ایک
دوسرے کے مطیع اور تابع نہیں ہیں تو ان سب سے
ایک چیز وجود میں نہیں آسکتی۔ (عمل مختلف ہیں تو وجود
میں آنے والی چیزیں بھی مختلف ہونی چاہییں) لیکن جب
عالم ایک ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ وہ ایسے کئی خداؤں
سے وجود میں نہیں آیا ہے جن میں سے ہر ایک کا عمل
اپنی جگہ منضبط اور محکم ہے .... عالم کے
ایجاد کے بارے میں اور اس حقیقت کے بارے میں کہ
اجزاء عالم ایک جسم کی طرح باہم ملے ہوئے ہیں اہل علم
عوام سے زیادہ واقف ہیں۔ صحیح بات یہ ہے کہ اگر خدا
دو ہوتے تو عالم بھی دو ہوتے لیکن جب عالم ایک
ہے تو خدا بھی ایک ہے کیونکہ ایک عمل ایک ہی سے صادر
ہو سکتا ہے۔

[1] فلسفہ ابن رشد (الکشف من مناہج الادلۃ فی عقائد الملۃ) صفحہ ۵۲-۵۰

اب آئیے، نظم کائنات پر غور کریں۔ کائنات پر صرف ایک خدا کی حکومت ہے یا بہت سے خدا اس کو چلا رہے ہیں؟ اس سوال کا تخلیق کائنات کے سوال سے بہت گہرا تعلق ہے۔ اگر آپ ان دونوں سوالات کو ملا کر ایک ساتھ غور کریں تو دعویٰ شرک آپ کو انتہائی لغو اور خلاف عقل معلوم ہوگا۔ کائنات کا خالق ایک ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اقتدار بہت سے خداؤں کے ہاتھ میں چلا جائے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ کائنات کے اندر اسی ذات کی حکومت ہونی چاہیے جو ذات اس کی خالق ہے۔ جو شخص اس کے ساتھ کسی دوسرے کو حاکم بتاتا ہے وہ ایسی بے دلیل بات کہتا ہے جسے عقل کبھی باور نہیں کر سکتی۔ قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ اس عظیم کائنات کے ایک ایک ذرہ کا تنہا خدا مالک ہے کیونکہ کائنات کی تخلیق میں کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ عقل سے اس قدر قریب ہے کہ اس کی تردید عقل کے واضح مسلمات کی تردید ہے۔

قُلِ ادْعُوا الَّذِينَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُونِ اللَّهِ لَا يَمْلِكُونَ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ وَمَا لَهُمْ فِيهِمَا مِنْ شِرْكٍ وَمَا لَهُ مِنْهُمْ مِنْ ظَهِيرٍ ○ (السبا ۲۲)

ان سے کہو، بلاؤ تم خدا کے سوا ان لوگوں کو جن کے بارے میں تمہارا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کے شریک ہیں۔ وہ نہ تو آسمان میں کسی ایک ذرے کے مالک ہیں اور نہ زمین میں اور نہ آسمانوں اور زمین (کے بنانے) میں ان کا کوئی حصہ ہے اور نہ ان میں سے کوئی خدا کا معاون و مددگار رہے۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ قُلِ اللَّهُ قُلْ أَفَاتَّخَذْتُمْ مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ لَا يَمْلِكُونَ لِأَنْفُسِهِمْ نَفْعًا وَلَا ضَرًّا قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ أَمْ هَلْ تَسْتَوِي الظُّلُمَاتُ وَالنُّورُ أَمْ جَعَلُوا لِلَّهِ شُرَكَاءَ خَلَقُوا كَخَلْقِهِ فَتَشَابَهَ الْخَلْقُ عَلَيْهِمْ قُلِ اللَّهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ وَهُوَ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ○ (الرعد ۱۶)

ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین کا رب کون ہے؟ انہیں بتا دو کہ اللہ ان کا رب ہے۔ ان سے کہو تو پھر کیا تم نے خدا کے سوا دوسروں کو اپنا کارساز بنا رکھا ہے جو اپنے لیے بھی نہ تو نفع کے مالک ہیں اور نہ نقصان کے۔ تم ان سے پوچھو کیا اندھا اور آنکھوں والا دونوں ایک ہو سکتے ہیں یا تاریکیاں اور روشنی برابر ہیں؟ کیا انھوں نے خدا کے لیے شرکا ٹھہرا رکھے ہیں کہ ان شرکا نے بھی خدا کی طرح چیزوں کو پیدا کیا ہے اور اسی تخلیق کی وجہ سے خدائی کا معاملہ ان پر مشتبہ ہو گیا ہے؟ تم ان سے کہو صرف خدا ہی ہر چیز کا خالق ہے اور وہ اکیلا اور سب پر غالب ہے۔

مالک ہے

قرآن، تخلیق اور اقتدار دونوں کو لازم و ملزوم سمجھتا ہے جو خالق ہے وہی اقتدار کا مالک بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ پیدا کرنے والا کوئی ہو اور حکومت کسی دوسرے کی قائم ہو جائے۔ کائنات میں حکم اسی کا چلنا چاہیے جو اس کا خالق ہو۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف ۵۴)

بے شک تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا۔ پھر وہ عرش پر متمکن ہوا وہ رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے۔ رات دن کو تیزی سے اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اسی کے حکم سے مسخر ہیں سن لو پیدا اسی نے کیا ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔ بڑی بابرکت ہے اللہ کی ذات جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔

انسان کا یہ ایک فطری احساس ہے کہ جس چیز کے حاصل کرنے اور کمانے میں تنہا اس کی قوتیں صرف ہوئی ہوں اس کا مالک بھی اسی کو ہونا چاہیے۔ پیدا کرنے میں اس کے ساتھ کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے تو اس میں اس کا حق بھی نہیں ہے۔ اسی احساس کی بنا پر انسان اپنے کسی محکوم اور غلام کو اپنی کمائی ہوئی دولت میں شریک نہیں تصور کرتا۔ قرآن سوال کرتا ہے کہ انسان اپنے اس احساس کے خلاف شرک کی غیر فطری اور غیر معقول بات خدا کی طرف کیوں منسوب کرتا ہے؟ اپنے غلاموں کے ساتھ اس کا معاملہ جس احساس کے تحت ہوتا ہے خدا کے بارے میں وہ اپنے اس احساس پر پردہ کیوں ڈال دیتا ہے؟ حالانکہ غلام اور آقا کا فرق بنیادی اور حقیقی فرق نہیں ہے۔ دونوں اپنے جذبات و احساسات، شکل و صورت اور بہت سی قوتوں اور صلاحیتوں کے لحاظ سے ایک حیثیت اور ایک درجے کے ہیں کسی آقا نے غلام کو پیدا نہیں کیا بلکہ دونوں کی موت و حیات خدا کے ہاتھ میں ہے، نہ حاکم اپنی قوت و طاقت سے حاکم بنا ہے اور نہ محکوم اپنی مرضی سے محکوم ہے بلکہ خدا کی حکمت و مصلحت نے ایک کو حاکم اور دوسرے کو محکوم بنایا ہے لیکن اس کے باوجود انسان اپنے کسی غلام کو اپنے برابر کا درجہ دینے کے لیے تیار نہیں ہے تو خدا کی مخلوقات کا درجہ خدا کے برابر کیسے ہو سکتا ہے اور وہ اس کے اقتدار میں کیسے شریک ہو سکتے ہیں؟

ضَرَبَ لَكُمْ مَّثَلًا مِّنْ اَنْفُسِكُمْ هَلْ لَّكُمْ مِّنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ شُرَكَاءَ

اللہ تعالیٰ تمہارے لیے تم ہی میں سے ایک مثال دیتا ہے۔ جن غلاموں کے تم مالک ہو، کیا وہ اس روزی میں تمہارے شریک ہیں جو ہم نے تمہیں دیا ہے کہ تم

فِیْ مَا رَزَقْنٰکُمْ فَاَنْتُمْ فِیْہِ سَوَآءٌ تَخَافُوْنَھُمْ کَخِیْفَتِکُمْ اَنْفُسَکُمْ کَذٰلِکَ نُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝ (الروم ۲۸)

اور وہ اس میں برابر ہو گئے ہیں تم ان سے ایسے ہی ڈرتے ہو جیسے کہ خود اپنے آپ سے ڈرتے ہو؟ اس طرح ہم آیتوں کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں سمجھنے والوں کے لیے۔

خالقِ کائنات ہی کا حاکمِ کائنات ہونا خالص عقلی استدلال ہے۔ اب آپ نظمِ کائنات پر غور کیجیے۔ کائنات کا نظم جس انداز سے چل رہا ہے کیا یہ اس بات کی طرف راہنمائی کر رہا ہے کہ یہاں ایک خدا کی حکومت ہے یا اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کائنات میں متعدد خداؤں کا اقتدار نافذ ہے؟

قرآن کا دعویٰ ہے کہ نظمِ کائنات میں کوئی خدا کا شریک نہیں ہے یہاں اسی کا اور صرف اسی کا حکم چل رہا ہے اس کی مرضی کے خلاف نہ تو کوئی واقعہ وجود میں آسکتا ہے اور نہ کوئی پتہ حرکت کر سکتا ہے۔ سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔

تَبٰرَکَ الَّذِیْ بِیَدِہِ الْمُلْکُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (الملک ۱)

بڑی بابرکت ہے وہ ذات جس کے ہاتھ میں سارا اقتدار ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

وَھُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِیْدُ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ۝ (البروج ۱۴-۱۶)

اور وہ بخشنے والا اور محبت کرنے والا ہے، عرش والا اور بزرگ ہے وہ جو چاہتا ہے کر گزرتا ہے

وَاللّٰہُ یَحْکُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُکْمِہٖ (الرعد ۴۱)

اور اللہ ہر چیز کا فیصلہ کرتا ہے، اس کے حکم کا پیچھا کرنے والا کوئی نہیں ہے

لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ ۝ (الانبیاء ۲۳)

وہ جو کچھ کرتا ہے اس کے بارے میں اس سے سوال کرنے والا کوئی نہیں؛ اللہ وہ اپنے کاموں کے بارے میں پوچھے جائیں گے۔

ان آیتوں میں یہ دعویٰ بھی ہے کہ نظمِ کائنات تنہا خدا کے ہاتھ میں ہے، ساتھ ہی اس دعوے کی دلیل بھی ہے۔ کائنات کا نظم چند متعین اصول کے تابع ہے۔ کبھی ان اصول کی کہیں سے مخالفت نہیں ہوتی۔ جس واقعہ کے وجود میں آنے کا جو ضابطہ متعین ہے۔ اس کے تحت لازماً وہ واقعہ وجود میں آتا ہے۔ ہر انقلاب کی ایک راہ ہے اسی راہ سے وہ انقلاب آتا ہے کوئی طاقت اس راہ کو بدل کر کسی دوسری راہ سے انقلاب نہیں لاسکتی۔ کائنات میں صرف ایک قانون کا پایا جانا اور کہیں سے اس کی مخالفت کا نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت ایک ہی خدا کی ہے یہاں اگر کئی خدا ہوتے تو قانون ایک نہ ہوتا بلکہ جتنے خدا ہیں اتنے ہی قانون موجود ہوتے۔

• حضرت ابراہیمؑ نے وقت کے ایک با اقتدار شخص کو خدائے واحد کی بندگی کی دعوت دی، وہ اقتدار کے نشہ میں

مست تھا اس نے کہا خدا کہاں ہے اقتدار تو میرے ہاتھ میں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ
خدا کی خدائی کا ثبوت یہ ہے کہ موت وحیات اس کے قبضے میں ہے۔ اگر خدائی کا تم دعویٰ کرتے ہو تو خدا جسے مارنا چاہے
تم اسے جلا دو، یا وہ جسے زندہ رکھنا چاہے تم اسے مار دو۔ اس نے کہا یہ کام تمہارا خدا ہی نہیں کرتا بلکہ میں بھی جسے
چاہوں زندہ رکھوں اور جس سے چاہوں زندگی چھین لوں۔ حضرت ابراہیمؑ کے استدلال کا جب اس نے اس طرح مذاق
اڑانا چاہا تو آپ نے خدا کی قدرت اور حکمت کا ایسا ثبوت پیش کیا جس کو وہ کسی دلیل سے کاٹ نہیں سکتا تھا۔ آپ نے
فرمایا:۔ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ (پس اللہ سورج کو مشرق سے
نکالتا ہے اگر تمہارے پاس بھی اقتدار ہے تو تم اس کو مغرب سے نکال کر دکھا دو) حضرت ابراہیمؑ کی یہ دلیل ایسی تھی کہ جس
کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ قرآن کہتا ہے:۔ فَبُهِتَ الَّذِیْ كَفَرَ ۔ البقرہ۔ ۲۵۸ (پس کافر
مبہوت ہو کر رہ گیا۔)

حضرت ابراہیمؑ کے اس استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم یہاں ایک خدا کی حکومت دیکھ رہے ہیں۔ اگر کوئی اور
خدا بھی ہے تو اس حکومت کی مخالفت ہی سے اس کا ثبوت مل سکتا ہے۔ خدائے واحد کی کہیں سے مخالفت نہیں ہو رہی
ہے تو بہت سے خداؤں کا دعویٰ آپ سے آپ ساقط ہو جاتا ہے۔

جو واقعہ ہمارے مشاہدے سے باہر ہو رہا ہے اس کا علم ہم کو آثار و شواہد سے ہو سکتا ہے۔ آثار و شواہد
سے اس کا ثبوت نہ ملے تو ہم اس کے بارے میں کبھی یقین نہیں کر سکتے۔ اس لیے کائنات میں خدا کے اقتدار کے ساتھ کسی
دوسرے کے اقتدار کو ہم اسی وقت مان سکتے ہیں جب کہ یہاں اس کے آثار موجود ہوں اور خدا کی حکومت کے ساتھ دوسروں
کی حکومت کا بھی ثبوت مل رہا ہو۔

فرض کیجیے آپ کو کسی ایسے ملک میں پہنچا دیا جاتا ہے جس کے حاکم کا آپ کو علم نہیں ہے۔ آپ ملک کے مختلف
معاملات کا جائزہ لیتے ہیں آپ کو پتہ چلتا ہے کہ ملکی حکومت کے خلاف کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔ حکومت کے
کسی فرمان کی کہیں سے کوئی مخالفت نہیں ہو رہی ہے۔ حکومت کے فیصلے کسی کی رائے اور مشورے کے پابند نہیں ہیں بلکہ وہی
ہوتا ہے جو حکومت چاہتی ہے واضح بات ہے کہ آپ اس سے یہی سمجھیں گے کہ ملک کا ایک ہی بااقتدار حاکم ہے۔ اور
تمام معاملات اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اگر آپ کے اس یقین کے خلاف کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ اس ملک کا ایک ہی حاکم
نہیں ہے بلکہ بہت سے حاکم ہیں تو آپ فوراً یہی سوال کریں گے کہ اگر بہت سے حاکم ہیں تو یہاں ان کے اقتدار اور
حکومت کے آثار کیوں نہیں نظر آتے؟

ٹھیک اسی بنیاد پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کائنات میں ایک قانون کا نافذ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا ایک ہے۔ یہاں صرف ایک ارادہ پورا ہوتے ہم دیکھ رہے ہیں۔ اگر کئی ارادے پورے ہوتے تو ہم سمجھتے کہ خدا ایک نہیں ہے بلکہ بہت سے خدا ہیں۔ کیونکہ مشترک اقتدار کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں ہمیشہ ایک ہی مرضی نہیں چلتی بلکہ کبھی ایک مرضی نافذ ہوتی ہے اور کبھی دوسری مرضی غالب آتی ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ اگر یہاں بہت سے خدا ہوتے تو اس کا ثبوت ہمیں تصادم اور ٹکراؤ کی شکل میں ملنا چاہیے تھا۔ ایک خدا کی مرضی دوسرے خدا کی مرضی سے ٹکراتی۔ ایک خدا جو کام کرنا چاہتا دوسرا اس کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا۔ کیونکہ ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ کائنات پر صاحبِ ارادہ اور با اختیار خداؤں کی حکومت ہو اور ان کے درمیان اختلاف اور تصادم نہ پایا جائے۔ خدا وہ ہے جس کی مرضی اس کائنات میں پوری ہو اور اگر اس کی مرضی پوری نہیں ہوتی ہے تو یہ اس کے خدا ہونے کی نفی ہے۔ کائنات کے بہت سے خدا ہیں تو ان کے مختلف و متضاد ارادے بیک وقت یہاں پورے ہونا چاہیے تھے جس کا نتیجہ لازماً بگاڑ اور فساد کی شکل میں رونما ہوتا لیکن یہاں صورت حال یہ نہیں ہے۔ کائنات میں ہر طرف اتفاق اور ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یہاں تصادم اور ٹکراؤ کا نہ ہونا قرآن کے نزدیک صریح طور پر خدا کے ایک ہونے کی دلیل ہے۔

لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا فَسُبْحَانَ اللَّهِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُونَ ○ (الانبیاء ۲۲)

اگر زمین و آسمان میں بجائے ایک اللہ کے بہت سے خدا ہوتے تو ان میں لازماً بگاڑ ہوتا۔ پس یہ جو کچھ بیان کرتے ہیں اللہ عرش کا مالک اس سے پاک ہے۔

مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِنْ وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ إِذًا لَذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ سُبْحَانَ اللَّهِ عَمَّا يَصِفُونَ ○ عَالِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَتَعَالَىٰ عَمَّا يُشْرِكُونَ ○ (المومنون ۹۱،۹۲)

خدا کی نہ تو کوئی اولاد ہے اور نہ کوئی دوسرا خدا یہاں موجود ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر خدا اپنی مخلوق کے ساتھ ایک الگ دنیا قائم کر لیتا اور وہ ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ اللہ ان کے بیان سے پاک ہے۔ وہ ہر چھپے اور کھلے کا جاننے والا ہے۔ (اگر کوئی خدا ہوتا تو اس کا علم ہوتا) پس اللہ ان کے شرک سے بلند ہے۔

قُلْ لَوْ كَانَ مَعَهُ آلِهَةٌ كَمَا يَقُولُونَ إِذًا لَابْتَغَوْا إِلَىٰ ذِي الْعَرْشِ سَبِيلًا

ان سے کہو اگر اللہ کے ساتھ اور بھی خدا ہوتے جیسا کہ یہ کہتے ہیں تو وہ عرش والے پر غالب آنے کی کوشش کرتے

سُبْحٰنَهٗ وَ تَعٰلٰى عَمَّا يَقُوْلُوْنَ	پاک اور بلند ہے وہ ان کی باتوں سے بہت بلند۔
عُلُوًّا كَبِيْرًا ۔ تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ	ساتوں آسمان اور وہ ساری مخلوقات جو ان میں ہیں سب
السَّبْعُ وَ مَنْ فِيْهِنَّ وَاِنْ مِّنْ	اس کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس
شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ	کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو لیکن تم ان کی
لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ اِنَّهٗ كَانَ	تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ بے شک وہ بردبار اور مغفرت
حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۝ (بنی اسرائیل ۴۴-۴۲)	کرنے والا ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل کی جو آیات اوپر نقل ہوئی ہیں ان کے آخر میں یہ بات کہی گئی ہے کہ آسمانوں اور زمین کی ہر چیز جب خدا کی تسبیح کر رہی ہے اور اس کی بڑائی اور بزرگی کا اعتراف کر رہی ہے تو کوئی دوسرا خدا کہاں سے آگیا؟ کائنات توحید کا اعلان کر رہی ہے اور تم شرک کا دعویٰ کر رہے ہو۔ کائنات جس حقیقت کو تسلیم کر رہی ہے کیا اس کے خلاف بھی کوئی دعویٰ ثابت ہو سکتا ہے؟

اس حقیقت کے بیان کے ساتھ یہ بھی کہہ دیا کہ شرک کی جو بات یہ کہتے ہیں خدا اس سے بہت بلند ہے" سورۂ مومنون میں فرمایا "خدا ان کے شرک سے بلند ہے" یہی بات سورۂ انبیاء کی آیت میں "ربُّ العرش" (عرش کا مالک) کہہ کر واضح کی گئی ہے۔ ان فقروں میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ انسان شرک سے اسی وقت بچ سکتا ہے جب کہ وہ خدا کا انتہائی بلند تصور رکھتا ہو۔ یہ عظیم کائنات جس عظیم تصورِ خدا کا تقاضا کرتی ہے اگر وہ تصور ہمارے پاس نہیں ہے تو کائنات کے نظم و تخلیق کا مسئلہ ہزاروں خداؤں سے بھی حل نہیں ہو سکتا۔ قرآن کا تجزیہ یہ ہے کہ جو لوگ اس کائنات میں بے شمار خداؤں کی خدائی تسلیم کرتے ہیں ان کے ذہن میں خدا کا انتہائی پست اور گھٹیا تصور ہوتا ہے۔ جب اس گھٹیا تصور کے ذریعہ کائنات کے مسائل حل نہیں ہوتے تو بجائے اس کے کہ وہ خدا کے بارے میں بلند تر تصور قائم کریں مزید خداؤں کو اس کے ساتھ شامل کر لیتے ہیں۔ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝ (الزمر ۶۷) (انھوں نے اللہ کی قدر نہیں کی جیسا کہ اس کی قدر کرنے کا حق ہے اور ساری زمین قیامت کے روز اس کے قبضہ میں ہوگی اور آسمان (کاغذ کی طرح) لپٹے ہوئے اس کے دہنے ہاتھ میں ہوں گے۔ وہ پاک ہے اور بلند، اس شرک سے جو یہ کر رہے ہیں۔)

"زمین اور آسمان میں کئی خدا ہوتے تو ان میں بگاڑ پایا جاتا" قرآن کی اس دلیل کے بارے میں ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ اس میں اس امکان کو نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ کائنات کے متعدد خدا ہوں اور وہ باہم اتفاق کے ساتھ اس کا نظم چلا رہے

ہوں۔ اگر یہ امکان موجود ہے تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کائنات میں تصادم اور ٹکراؤ کا نہ ہونا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ یہاں صرف ایک خدا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خدا بہت سے ہوں اور ان کے اتحاد و ہم آہنگی نے کائنات کو فساد اور خلفشار سے بچا رکھا ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات میں ایک سے زیادہ خداؤں کا کہیں سے ثبوت نہیں مل پاتا، اس لیے یہ محض مفروضہ ہے کہ ہم ایک سے زائد خدا مان لیں۔ جس نظریہ کا کوئی واقعاتی ثبوت نہ ہو، عقل کے نزدیک اس کا کوئی وزن نہیں ہے۔ آپ کوئی بھی ایسا دعویٰ نہیں کر سکتے جس میں عقلی طور پر اس کا مخالف امکان نہ پایا جاتا ہو۔ آپ جن چیزوں کو بدیہی حقیقتیں کہتے ہیں، ان کے مخالف پہلو کا بھی عقل تصور کر سکتی ہے۔ دو اور دو چار ہوتے ہیں لیکن عقل یہ فرض کر سکتی ہے کہ دو اور دو بجائے چار کے پانچ ہو جائیں۔ اس طرح کے امکانات عقلی کو آپ تجربات کی بنیاد پر رد کر دیتے ہیں۔ ہر تجربہ اور ہر مسلمہ کے خلاف فرضی امکانات موجود ہوتے ہیں لیکن عقل کی یہ خاصیت ہے کہ وہ اسی امکان کو قبول کرتی ہے جن کی تجربات سے تائید ہوتی ہے اور جن امکانات کا تجربات ساتھ نہ دیں عقل ان کو لغو سمجھ کر نظر انداز کر جاتی ہے۔ اس پہلو سے دیکھیے تو یہ امکان قابل رد ہے کہ کائنات کے کئی خدا ہوں اور وہ باہم اتفاق سے کام کر رہے ہوں۔ کیونکہ تجربہ یہ ہے کہ ایک ملک میں دو با اختیار حاکم نہیں رہ سکتے۔ یا تو وہ ملک تقسیم ہو جائے گا یا اس میں جنگ اور کشمکش موجود ہوگی۔

امام ابن الہمامؒ نے اس مسئلہ پر بڑی اچھی اور عمدہ بحث کی ہے، فرماتے ہیں:۔

والعلوم العادية كالعلم	علوم عادیہ (تجربی علوم) جیسے یہ بات کہ جس پہاڑ
حال الغيبة عن جبل عهدناه	کو ہم نے پتھر کی شکل میں دیکھا ہے، ہمارے وہاں سے
حجرا انه حجر الآن داخلة في العلم	غائب ہونے کی حالت میں بھی وہ پتھر ہی رہے گا (سونے
المأخوذ فيه عدم احتمال	میں نہیں تبدیل ہو جائے گا) ایسے علم ہی کی تعریف میں آتے ہیں
النقيض ولذا اجيب عن ايراد	جس میں کہ نقیض اور خلاف کا امکان نہیں ہوتا۔
خروجه لاحتماله النقيض مع	جو لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ علوم عادیہ میں نقیض کا
انه علم بان الاحتمال فيه	احتمال ہے اس لیے ان کو علم نہیں شمار کرنا چاہیے
بمعنى انه لو فرض العقل خلافه	ان کا جواب یہ ہے کہ احتمال کے معنی صرف یہ ہیں کہ اگر عقل
لم يكن فرض محال وذلك	اس کے خلاف فرض کرے تو یہ فرض محال نہ ہوگا لیکن ہمارے

لا يوجب عدم الجزم المطابق
بان الواقع الآن خلاف ذالك
الممكن فرضه فاثبتوا فيه
ثبوت الجزم والمطابقة والموجب
يعني العادة القاضية التي لم يوجد قط
خرمها وذالك هو معنى العلم القطعي
بان الواقع كذا ....
.... فيحصل لنا العلم
القطعي بان الواقع الفساد على
تقدير تعدد الآلهة لان العادة
المستمرة التي لم يعهد قط اختلافها
في ملكين مقتدرين في مدينة
واحدة عدم الاقامة على موافقة
كل للآخر في كل جليل و
حقير بل تابى نفس كل
وتطلب الانفراد بالمملكة
والقهر فكيف بالالهين و
الاله يوصف باقصى غايات
التكبر كيف لا تطلب نفسه
الانفراد بالملك والعلو على الآخر
كما اخبر الله سبحانه بقوله
ولعلا بعضهم على بعض هذا
اذا تومل لا تكاد النفس تخطر

یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واقعہ ہے اس پر بھی ہم یقین نہ
رکھیں اور یہ نہ سمجھیں کہ واقعہ کے خلاف جو امکان ہمارا ذہن
فرض کر رہا ہے حقیقت اس کے برعکس ہے پس اس طرح
انھوں نے علم تجربی میں یقین واقعہ کی مطابقت اور موجب
کا اثبات کیا ہے۔ موجب سے مراد ایسا قطعی تجربہ ہے
جو کبھی نہ ٹوٹے اسی کا نام علم قطعی ہے۔ کہ واقعہ یہی ہے
اور اس کے خلاف کوئی بات صحیح نہیں ہے۔ پس اس بنیاد
پر ہمیں علم قطعی حاصل ہے کہ کائنات میں متعدد خدا ہوں
تو فساد کا ہونا ضروری ہے کیونکہ مسلسل تجربہ جس
کے خلاف کبھی نہیں دیکھا گیا، یہ ہے کہ دو باختیار
بادشاہوں کی ایک ہی شہر میں حکومت ہو تو وہ ہر چھوٹے
بڑے معاملہ میں کبھی موافقت نہیں کرتے۔ ان میں سے
کسی ایک کا نفس بھی اس طرح کی موافقت کے لیے آمادہ
نہیں ہوتا۔ بلکہ انکار کرتا ہے اور اس کی یہ خواہش ہوتی
ہے کہ سلطنت و اقتدار صرف اسی کا رہے۔ تو ہم اس طرح
کی مصالحت کا تصور خداؤں کے بارے میں کیسے کر سکتے
ہیں کیونکہ خدا کی صفت ہی یہ ہے کہ اس کے اندر انتہائی کبر
اور انانیت جس کا تصور کیا جا سکتا ہے، موجود ہوتا ہے۔
اس لیے خدا سلطنت اور اقتدار میں اپنے لیے انفرادیت
کا طالب کیسے نہ ہوگا؟ اور کیسے وہ دوسرے سے
اقتدار چھیننے کی کوشش نہیں کرے گا؟ جیسا کہ خدا تعالیٰ نے
اپنے اس قول میں فرمایا ہے۔ اگر کئی خدا ہوتے تو ہر ایک
دوسرے پر چڑھ دوڑتے۔ مسئلہ پر اگر اس پہلو سے غور کیا

نقیضہ فضلا عن اخطار فرضہ مع الجزم بان الواقع ھو الآخر وعلی ھذا التقدیر ھو علم قطعی له

جاتی تو جو بات کہی گئی ہے اس کے خلاف کوئی بات ذہن میں کھٹک ہی نہیں سکتی۔ چہ جائیکہ اس طرح کا مفروضہ آئے لاحق ہو جب کہ انسان کو یقین ہے کہ واقعہ اس مفروضہ کے خلاف ہے، اس لحاظ سے علم تجربی بھی علم قطعی ہے۔

اب ہمیں اس سوال پر غور کرنا ہے کہ انسان کی نفسیات شرک کا تقاضا کرتی ہیں یا توحید کا؟ وہ اپنے لیے ایک خدا چاہتا ہے یا کئی خداؤں کو پسند کرتا ہے۔

خدا کائنات کا حاکم ہے اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنے لیے ایک ہی حاکم کو پسند کرتا ہے۔ اس کے نزدیک غلامی کی بدترین قسم یہ ہے کہ وہ کئی خداؤں کی خدائی میں گھرا ہے اور اس کی غلامی میں کسی ایک کا نہیں بلکہ بہت سے آقاؤں کا حصہ ہو۔ جو شخص اپنے لیے کئی خداؤں کو منتخب کرتا ہے وہ اپنی فطرت سے جنگ کرتا ہے۔ وہ ایک ایسی راہ پر چل رہا ہے جس میں اس کا ضمیر اور اس کی نفسیات اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيهِ شُرَكَاءُ مُتَشَاكِسُونَ وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ هَلْ يَسْتَوِيَانِ مَثَلًا ۚ الْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ (الزمر - ۲۹)

اللہ تعالیٰ نے ایک شخص کی مثال دی جس کے مالک بہت سے جھگڑالو شریک ہیں اور ایک وہ شخص ہے جو صرف ایک شخص کے لیے خاص ہو گیا ہے کیا ان دونوں کی مثال ایک ہو سکتی ہے۔ سب تعریف خدا کے لیے ہے لیکن ان میں سے بیشتر جانتے نہیں ہیں۔

زلزلہ اور بھونچال آتا ہے تو زمین ان خزانوں کو اگل دیتی ہے جن کو وہ اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے تھی۔ اسی طرح انسان کی حقیقی نفسیات ابھر کر سامنے آتی ہیں جب وہ کسی مصیبت میں گھر جاتا ہے اور تمام امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ ایک شخص راستہ چل رہا ہو اور پیچھے سے اچانک اس کی پیٹھ میں چھرا گھونپ دیا جائے تو اس حالت میں اس کی زبان سے جو الفاظ بے ساختہ نکلیں گے وہ اس کے جذبات کی صحیح ترجمان ہوں گے۔ اسی طرح کے حالات میں انسان پر جتنے مصنوعی پردے پڑے ہوتے ہیں وہ تار تار ہو جاتے ہیں اور اس کی اصل شخصیت نمایاں ہو جاتی ہے۔ جس چیز کی جڑیں زمین میں زیادہ گہری نہ ہوں ہوا کا ایک جھونکا اس کو اکھاڑ پھینکتا ہے اور بتا دیتا ہے کہ زمین سے اس کا تعلق محض سطحی تھا۔

له المسایرۃ المطبوع مع شرح المسامرۃ ص۱۹۴-۱۹۵

مصیبتیں اور پریشانیاں انسان سے توحید کا اعتراف کراتی ہیں۔ انسان کی نفسیات یہ ہے کہ وہ اپنی مشکلات میں دس سہارے نہیں ڈھونڈھتا بلکہ صرف ایک ایسا سہارا چاہتا ہے جو اس کو مشکلات سے نجات دے سکے۔ اگر اس کے ہزار خدا ہوں تو مایوسی اور ناامیدی میں وہ ان سب سے امیدیں وابستہ نہیں کرتا بلکہ صرف ایک خدا کو پکارتا ہے اور اسی سے آس لگاتا ہے۔ انسان کی یہ نفسیات توحید کی زبردست دلیل ہیں۔ انسان کی کشتی جب بھنور میں پھنس جاتی ہے اور وہ ہر طرف سے مایوس ہو کر خدائے واحد کی طرف مدد کا ہاتھ پھیلاتا ہے تو اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ سکون اور اطمینان کی حالت میں اس کا بہت سے خداؤں کو ماننا جھوٹ اور فریب ہے۔ شرک اس کی فطرت نہیں ہے بلکہ ایک غیر فطری بات ہے جو اس کے ساتھ چپک گئی ہے۔

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰى إِذَا كُنْتُمْ فِي الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِمْ بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوْا بِهَا جَاءَتْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَّجَاءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ أُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ أَنْجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ فَلَمَّا أَنْجٰهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ۔

(یونس - ۲۳-۲۲)

وہ خدا ہی ہے جو تم کو خشکی اور تری میں چلاتا ہے۔ یہاں تک کہ (ایسے موقع بھی آتے ہیں) جب کہ تم کشتیوں میں ہوتے ہو اور وہ خوش گوار ہوا کی مدد سے لوگوں کو لے چلتی رہتی ہیں اور لوگ ان کی اس حالت سے خوش ہوتے ہیں تو یکایک آندھی چلنے لگتی ہے اور ان کو ہر طرف سے سمندر کی موجیں گھیر لیتی ہیں اور وہ یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اب وہ طوفان میں گھر گئے تو ایسے وقت میں وہ اپنے دین کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اس سے دعائیں مانگنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہم کو اس سے نجات دی تو ہم تیرے شکر گزار بندے بنے رہیں گے۔ جب وہ ان کو اس حالت سے نجات دیتا ہے تو وہ زمین میں ناحق بغاوت کرنے لگتے ہیں۔

فَإِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ فَلَمَّا نَجّٰهُمْ إِلَى الْبَرِّ إِذَا هُمْ يُشْرِكُوْنَ ۝ (العنکبوت ۶۵)

جب وہ کشتیوں میں سوار ہوتے ہیں تو وہ دین کو خدا کے لیے خالص کرتے ہوئے اس کو پکارتے ہیں۔ جب وہ ان کو بچا کر خشکی تک پہنچا دیتا ہے تو وہ اس کے ساتھ شرک کرنے لگتے ہیں۔

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝ (الانعام ۴۱-۴۲)

اے پیغمبر! ان سے کہو بتاؤ اگر تم پر خدا کا عذاب آئے یا قیامت ٹوٹ پڑے تو کیا اس وقت خدا کے علاوہ اپنے دوسرے معبودوں کو بھی آواز دیتے ہو؟ اگر تم اپنے ان معبودوں کے ماننے میں سچے ہو (تو تمہیں ان ہی کو بلانا چاہیے) لیکن تم صرف خدا کو بلاتے ہو اور جس مصیبت میں تم اسے بلاتے ہو وہ اگر چاہتا ہے تو اسے رفع کرتا ہے۔ اس وقت تم اپنے شرک کو بھول جاتے ہو۔

کائنات کی تخلیق، اس کا نظم اور انسان کی نفسیات صاف بتا رہے ہیں کہ شرک ایک بے دلیل دعویٰ ہے۔ اس کائنات میں خدا کے کسی شریک وسہیم کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ جو لوگ کئی خداؤں کو مانتے ہیں وہ صرف ان کے ذہنوں میں پیدا ہوتے اور فنا ہوتے رہتے ہیں وہ ایسے نام ہیں جن کے وجود کا کہیں کوئی نشان نہیں ہے۔ اِنْ هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى ۝ النجم ۲۳ - (یہ تو چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء نے اپنی طرف سے رکھ چھوڑے ہیں۔ اللہ نے ان پر کوئی دلیل نہیں اتاری ہے یہ لوگ اپنے خیال اور اپنے نفسوں کی خواہشات کے پیچھے چل رہے ہیں اور حال یہ ہے کہ ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے ہدایت آچکی ہے)

اَلَآ اِنَّ لِلّٰهِ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَتَّبِعُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُرَكَآءَ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (یونس ۶۶)

سن لو! جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے وہ سب کا سب خدا ہی کے لیے ہے، جو لوگ خدا کے سوا دوسرے شرکا کو پکارتے ہیں وہ ان شرکا کی اتباع نہیں کرتے (کیونکہ ان کا کہیں وجود نہیں ہے) وہ محض اپنے ظن وگمان کے پیچھے چل رہے ہیں اور اٹکل پچو سے کام لیتے ہیں۔

جو شخص ان دلائل پر سنجیدگی سے غور کرے گا وہ قرآن کے ہم زبان ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو گا۔

وَمَنْ يَّدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ

جو شخص اللہ کے ساتھ کسی دوسرے خدا کو پکارتا

لَا بُرْهَانَ لَهُ بِهِ فَإِنَّمَا حِسَابُهُ عِنْدَ رَبِّهِ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُونَ
(المومنون ۱۱۷)

ہے، وہ اپنی اس حرکت پر کوئی دلیل نہیں رکھتا۔ اس کا حساب بس اس کے رب کے پاس ہے، واقعہ یہ ہے کہ کافر کبھی کامیاب نہیں ہوں گے۔

توحید کو عقل و استدلال کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے اور شرک کے پیچھے کوئی دلیل نہیں ہے۔ توحید ایک علمی صداقت ہے اور شرک کو انسان کے وہم نے وجود بخشا ہے۔ انسان نے اپنے اور اس کائنات کے بارے میں جتنے نظریات قائم کیے ہیں ان میں صرف توحید ہی ایک سچا اور معقول نظریہ ہے۔ اس کے علاوہ جتنے نظریات ہیں وہ سب باطل اور بے دلیل ہیں۔ کائنات پر یہ حقیقت لکھی ہوئی ہے کہ خدا ہے اور وہ ایک ہے۔ انسان آنکھیں کھول کر اس حقیقت کو ہر وقت پڑھ سکتا ہے لیکن جس کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی ہو اس کو آفتاب سے زیادہ واضح حقیقت بھی نظر نہیں آسکتی۔

اعلان ملکیت ماہنامہ "زندگی" رام پور

ودیگر تفصیلات (فارم IV) رول نمبر ۸

(۱) مقام اشاعت:۔ دفتر زندگی رام پور (یوپی)

(۲) مدت اشاعت: ماہانہ

(۳ و ۴) طابع و ناشر:۔ احمد حسن

وطنیت:۔ ہندوستان

پتہ:۔ بازار کلاں۔ رام پور (یوپی)

(۵) اڈیٹر:۔ سید احمد عروج قادری

وطنیت:۔ ہندوستان

پتہ:۔ مرکز جماعت اسلامی (ہند) رام پور (یوپی)

(۶) مالک کا نام و پتہ:۔ جماعت اسلامی (ہند) رام پور (یوپی)

میں تصدیق کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے بہترین علم و یقین کے مطابق صحیح ہیں۔

احمد حسن

اسلام کا تصوّرِ ریاست — جماعت اسلامی کے لٹریچر میں

جناب رفیع اللہ عنایتی، ایم۔ اے علیگ، ٹمپلو

ابوالاعلیٰ مودودی کا نام کون سا ایسا پڑھا لکھا مسلمان ہے جو نہیں جانتا وہ ہندوستان میں رہتا ہو، یا پاکستان میں، یا مصر، عرب، ترکی وغیرہ میں۔ جس سلجھے ہوئے طریقے سے انھوں نے اسلامی مسائل کو لیا ہے وہ انہی کا حصّہ ہے۔ مولانا نے مغربی اور اشتراکی فلسفوں کے مقابلے میں اسلام کو پیش کیا ہے اور ان دو طرز ہائے زندگی کا مقابلہ جس خوبصورتی سے کیا ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ مولانا کی نظر اشتراکیت اور مغربی تہذیب کے نظاموں پر بڑی گہری ہے۔ انھوں نے بڑی ذہانت سے کام لیا ہے۔ بعض علماء نے ان کو فتنہ پرداز کہا ہے اور جماعت اسلامی کو اسلام میں ایک نئے فرقے سے تعبیر کیا ہے، یہ ان کی کم نظری ہے۔ مولانا نے اس کی وضاحت اس طرح کی ہے:۔

"اب میں مختصراً آپ کو بتاؤں گا کہ ہم کس غرض کے لیے اٹھے ہیں۔ ہم ان سب لوگوں کو، جو اسلام کو اپنا دین سمجھتے ہیں، دعوت دیتے ہیں کہ وہ دین کو واقعی اپنا دین بنائیں، اس کو انفرادی طور پر اپنی زندگیوں میں اور اجتماعی طور پر اپنے گھروں، اپنے خاندان میں، اپنی سوسائٹی میں، اپنی تعلیم گاہوں میں، اپنے ادب اور صحافت میں اپنے کاروبار اور معاشی معاملات میں، اپنی انجمنوں اور قومی اداروں میں اور بحیثیت مجموعی اپنی قومی پالیسی میں عملاً قائم کریں اور اپنے قول اور عمل سے دنیا کے سامنے اس کی سچی گواہی دیں، ہم ان سے کہتے ہیں کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے اقامت دین اور شہادت حق تمہاری زندگی کا اصل مقصد ہے۔

اگر تمہارا دل گواہی دے کہ ہماری دعوت، عقیدہ، نصب العین، نظام جماعت، طریق کار سب کچھ خالص اسلامی ہے اور ہم وہی کرنے اٹھے ہیں جو قرآن اور حدیث کی رو سے امت مسلمہ کا اصل کام ہے تو ہمارے ساتھ آ جائیے۔"

"اس طرح جو لوگ ہمارے نظام جماعت میں شامل ہوتے ہیں ان کے لیے ہمارے پاس صرف یہ کام ہے کہ وہ قول اور عمل سے اسلام کی شہادت دیں اور نظام دین کو مکمل طور پر قائم کرنے کے لیے اجتماعی جدوجہد کریں۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ اول تو ایک ایک شخص اسلام کا زندہ گواہ ہو، پھر ان افراد سے ایک ایسی منظم

سوسائٹی نشو و نما پائے جس کے اندر اسلام اپنی اصل اسپرٹ میں کام کرتا ہوا دیکھا جا سکتا ہو، اور بالآخر یہ سوسائٹی اپنی جد و جہد سے نظام باطل کے غلبہ کو مٹا کر وہ نظام حق قائم کرے جو دنیا میں اسلام کی مکمل نمائندگی کرنے والا ہو۔"

(شہادت حق)

اس سے ان کی تحریک کا مقصد ظاہر ہو جاتا ہے۔ یہ اتنا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ تھوڑی سی سمجھ بوجھ رکھنے والے کے ذہن میں بھی آ جاتا ہے۔ اس میں کوئی بات ایسی نہیں ہے کہ علماء میں سے کوئی اس کی مخالفت کر سکے۔ اس مختصر تمہید کے بعد اب میں جماعت اسلامی کے لٹریچر سے اسلام کا تصور ریاست پیش کرتا ہوں :۔

"اسلام کے تصور ریاست کی بنیاد توحید، رسالت اور خلافت پر ہے۔ باقی ساری چیزیں انہی سے متعلق ہیں۔ یہ ریاست اپنی بنیادی حیثیت کے لحاظ سے ہی اسلامی ریاست اشتراکی اور جمہوری ریاستوں سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ایک اصولی حکومت ہے۔ سب سے پہلی خصوصیت جو اسلامی حکومت کو تمام دوسری حکومتوں سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ قومیت کا عنصر اس میں قطعی ناپید ہے۔ وہ خالص ایک اصولی حکومت ہے جسے انگریزی میں اس کو (IDEALOGICAL STATE) کہوں گا۔ یہ اصولی حکومت وہ چیز ہے جس سے دنیا ہمیشہ ناآشنا رہی ہے اور آج تک ناآشنا ہے۔"

اسلام محض ایک عقیدہ نہیں ہے، نہ وہ محض چند اعمال اور رسموں کا مجموعہ ہے بلکہ وہ انسان کے لیے ایک مفصل اسکیم ہے اس میں عقائد، عبادات اور عملی زندگی کے اصول و قواعد الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ سب مل کر ایک ناقابل تقسیم مجموعہ بناتے ہیں جس کے اجزا کا باہمی ربط بالکل ویسا ہی ہے جیسا ایک زندہ جسم کے اعضا میں ہوتا ہے۔ اس پورے نظام میں قلب (یعنی عقیدہ) بہت اہمیت رکھتا ہے۔

(اسلام اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول)

اسلامی حکومت کی پوری عمارت خدا کی حاکمیت (   ) پر قائم ہے۔ حکم دینے اور قانون بنانے (LEGISLATION) کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ یہ اقتدار ناقابل تقسیم ہے۔ وہ الٰہ ہے، وہ لاشریک ہے۔ رحیم، رب اور عادل ہے۔ وہ واحد ہے۔ حاکمیت اور فرماں روائی کی جتنی قسمیں ہیں سب اسی مقتدر اعلیٰ کی ذات میں مرکوز ہیں۔ بندگی، اطاعت، پرستش جو کچھ بھی ہے سب اللہ کے لیے ہے۔ خدائے واحد ہی کائنات کا سلطان مطلق ہے۔ پروردگار، مربی اور حاجت روا ہے۔ وہی کفیل، خبر گیر، مختار کار اور معتمد علیہ ہے۔ انسان کو اس کا اطاعت شعار وفادار رہنا چاہیے۔ یہی

اطاعت وہ قدرتی بنیاد ہے جس پر اسلامی معاشرے کی اجتماعی زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے اور تمام متفرق افراد اور گروہوں کو ایک ملت کی صورت بخشتی ہے۔

حاجت روائی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی، امداد و اعانت، خبرگیری و حفاظت اور استجابت دعوات جن کو تم نے معمولی کام سمجھ رکھا ہے، دراصل یہ معمولی کام نہیں بلکہ ان کا سررشتہ پورے نظام کائنات کی تخلیقی اور انتظامی قوتوں سے جا ملتا ہے۔ (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں)

مولانا ایک دوسرے مقام پر بڑی اچھی ترجمانی کرتے ہیں۔

"اسلام کا تصور ان دونوں سے مختلف ہے۔ اسلام کی نگاہ میں انسان خدائے واحد کا بندہ ہے اس کا خالق، اس کا رازق، اس کا مالک، اس کا حاکم صرف خداوند عالم ہے۔ خدا نے اس زمین پر اس کو اپنے خلیفہ کی حیثیت سے مامور کیا ہے۔ یہاں کچھ اختیارات اس کو عطا کیے ہیں۔ کچھ ذمہ داریاں اور خدمتیں اس کے سپرد کی ہیں۔ اپنی مملکت اور اپنی رعیت کے ایک حصہ پر اس کو کچھ اقتدار دیا ہے۔ اس کا کام یہاں اپنے مالک کے مقصد کو پورا کرنا ہے۔ اپنی ذمہ داریوں کو سمجھنا اور ادا کرنا ہے۔ آقا کی سپرد کی ہوئی خدمتوں کو انجام دینا ہے، اپنے اختیارات کو اور اپنی قوتوں کو حاکم اصلی کے قانون اور اس کی رضا کے مطابق استعمال کرنا ہے۔" (اسلامی عبادات پر ایک تحقیقی نظر)

اسلامی ریاست لادینی (SECULAR STATE) سے بالکل مختلف ہے۔

"اس نظریہ کی بنیاد پر جو عمارت اٹھتی ہے وہ اپنی جڑ سے لیکر چھوٹی سے چھوٹی شاخوں تک ہر چیز میں دنیوی حکومت ( ) سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی ترکیب، اس کا مزاج، اس کی فطرت کوئی چیز بھی ان سے نہیں ملتی۔ اس کو بنانے اور چلانے کے لیے ایک خاص قسم کی ذہنیت، خاص طرز کی سیرت، اور خاص نوعیت کے کردار کی ضرورت ہے۔" (اسلام اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ اول)

یہ ہے ابوالاعلیٰ کی نظر میں توحید کا مسئلہ جو حکومت الٰہیہ یا اسلامی ریاست کا سنگ بنیاد ہے۔

"توحید کے معنی یہ ہیں کہ خدا اس دنیا کا اور اس کے سب رہنے والوں کا خالق ہے، پروردگار اور مالک ہے، حکومت اور فرماں روائی اسی کی ہے۔ وہی حکم دینے اور منع کرنے کا حق رکھتا ہے اور بندگی اور اطاعت بلاشرکت غیرے اس کے لیے ہیں۔" (اسلام کا سیاسی نظام)

خدا کا قانون بندوں تک رسول کے ذریعہ پہنچا۔ اس واسطہ کو "رسالت" کہتے ہیں۔ "خدا کا قانون جس ذریعہ

سے بندے تک پہنچتا ہے اس کا نام "رسالت" ہے۔ اس ذریعہ سے ہمیں دو چیزیں ملتی ہیں۔ ایک "کتاب" جس میں خود خدا نے اپنا قانون بیان کیا ہے۔ دوسرے کتاب کی مستند تشریح جو رسول نے خدا کا نمائندہ ہونے کی حیثیت سے اپنے قول وعمل کے ذریعہ پیش کی۔ خدا کی کتاب میں وہ تمام اصول بیان کر دیے گئے ہیں جن پر انسانی زندگی کا نظام قائم ہونا چاہیے۔ (اسلام کا سیاسی نظام)

انسان خدا کی اس سرزمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دنیا میں انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ زمین پر خدا کا نائب ہے یعنی اس کے ملک میں اس کے دیے ہوئے اختیارات استعمال کرتا ہے۔

"اسلامی نظریہ سیاسی کسی ایک شخص یا خاندان یا طبقہ کو خلیفہ قرار نہیں دیتا بلکہ اس پوری سوسائٹی کو خلافت کا منصب دیتا ہے جو توحید و رسالت کے بنیادی اصول کو تسلیم کر کے نیابت کی شرطیں پوری کرنے پر آمادہ ہوں۔ یہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی خلافت کی حامل ہے۔ (اسلام کا سیاسی نظام)

مولانا نے روح اور مادہ کے فرق کو بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تمام راہبانہ تصورات کی نفی ہو جاتی ہے اور اسلام کی سچی تعلیم ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ "انسانی روح کو خدا نے زمین پر خلیفہ مقرر کیا ہے کچھ اختیارات کچھ فرائض اور کچھ ذمہ داریاں اس کے سپرد کی ہیں اور انہیں ادا کرنے کے لیے ایک بہترین اور موزوں ترین ساخت کا جسم اسے عطا کیا ہے۔ جسم روح کا قید خانہ نہیں بلکہ اس کا کارخانہ ہے۔ اور اس روح کے لیے کوئی ترقی اگر ممکن ہے تو اس طرح ممکن ہے کہ وہ اس کارخانہ کے آلات اور طاقتوں کو استعمال کر کے اپنی قابلیتوں کا اظہار کرے۔ یہاں فطرت کے تقاضوں سے تمدن، معاشرت، معیشت، سیاست اور دوسرے شعبہائے زندگی اس کے لیے وجود میں آئے ہیں۔ یہاں اگر کوئی روحانی ترقی ممکن ہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ وہ اس کے اندر کام کر کے اپنی قابلیت کا ثبوت دے یہ اس کے لیے ایک امتحان گاہ ہے۔

"اس طرح اسلام زندگی کے راہبانہ تصور کو رد کر دیتا ہے اور انسان کے لیے روحانی ترقی کا راستہ دنیا کے باہر سے نہیں بلکہ اس کے اندر سے نکالتا ہے۔ روح کی نشوونما اور بالیدگی اور فلاح و کامرانی کی اصل جگہ اس کے نزدیک کارگاہ حیات کے عین منجدھار میں واقع ہے نہ کہ اس کے کنارے پر۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے انسان اپنے پورے کارنامۂ حیات کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اس کا فرض یہ ہے کہ زمین میں جو اختیارات اور ذرائع اسے دیے گئے ہیں انہیں خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرے جو قابلیت اور طاقتیں اسے بخشی گئی ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ خدا کی رضا حاصل کرنے میں صرف کرے۔ اس خدمت کو انسان جس قدر زیادہ احساس

ذمہ داری، فرض شناسی، اطاعت و فرماں برداری اور مالک کی رضا جوئی کے ساتھ انجام دے گا۔ اسی قدر زیادہ وہ خدا کے قریب ہوگا اور خدا کا قرب ہی اسلام کی نگاہ میں روحانی ترقی ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دین دار اور دنیا دار دونوں کا دائرۂ عمل یکساں ہی ہے۔" (اسلام کا روحانی نظام)

اسلام کے روحانی نظام کی چار منزلیں ہیں۔ ایمان۔ اطاعت۔ تقویٰ اور احسان۔ "ایمان یعنی آدمی کے دل و دماغ میں اس خیال کا بس جانا کہ خدا ہی اس کا مالک، حاکم اور معبود ہے۔ خدا ہی کی رضا اس کی تمام کوششوں کا مقصود ہے، اور خدا ہی کا حکم اس کی زندگی کا قانون ہے۔ یہ خیال جس قدر پختہ اور راسخ ہوگا، اتنی زیادہ مکمل اسلامی ذہنیت بنے گی اور اسی قدر زیادہ ثابت قدمی کے ساتھ انسان روحانی ترقی کی راہ پر چل سکے گا۔"

(اسلام کا روحانی نظام)

ایمان کے بعد اطاعت کا مقام آتا ہے۔ "آدمی کا بالفعل اپنی خود مختاری سے دست بردار ہو جانا اور عملاً خدا کی بندگی اختیار کرلینا جسے وہ عقیدتاً اپنا خدا تسلیم کرچکا ہے، اسی اطاعت کا نام قرآن کی اصطلاح میں اسلام ہے۔" اطاعت کے بعد تقویٰ کی منزل آتی ہے۔ "تیسری منزل تقویٰ کی ہے جسے ہم عام فہم زبان میں فرض شناسی اور احساس ذمہ داری سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ تقویٰ یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی کے ہر پہلو میں یہ سمجھتے ہوئے کام کرے کہ اسے اپنے افکار، اقوال اور افعال کا خدا کو حساب دینا ہے۔" تقویٰ کے بعد احسان کا نمبر آتا ہے۔ "آخری اور سب سے اونچی منزل احسان کی ہے۔ احسان کے معنی یہ ہیں کہ بندے کی مرضی خدا کی مرضی کے ساتھ متحد ہو جائے، خدا جن برائیوں کو اپنی زمین میں دیکھنا نہیں چاہتا بندہ خود ہی ان سے نہ بچے بلکہ انہیں دنیا سے مٹا دینے کے لیے اپنی ساری قوتیں اور اپنے تمام ذرائع صرف کردے"		(اسلام کا روحانی نظام)

اسلام کے روحانی نظام کے ساتھ ہی ساتھ اس کے معاشرتی، اقتصادی اور اخلاقی نظام بھی ہیں جو روحانی نظام کے تابع ہیں۔ روحانی نظام اصل ہے اور باقی نظام اس کی فرع۔ اسلام معاشرتی برابری اور مساوات کا دعوے دار ہے۔ اسلام کے معاشرتی نظام کا سنگ بنیاد یہ نظریہ ہے کہ دنیا کے سب انسان ایک نسل سے ہیں، خدا نے سب سے پہلے ایک انسانی جوڑا پیدا کیا تھا، پھر اس جوڑے سے وہ سارے لوگ پیدا ہوئے، جو دنیا میں آباد ہیں۔ " انسان اور انسان کے درمیان اصلی فرق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو وہ نسل، رنگ، وطن اور زبان کا نہیں بلکہ خیالات اور اصول کا ہو سکتا ہے" (اسلام کا معاشرتی نظام)

مولانا نے اسلام کے اقتصادی نظام کو جس طرح بیان کیا ہے وہ اس کی صحیح ترجمانی ہے۔ قرآن کا سچا اور

صحیح اقتصادی نظام اصل میں یہی ہے۔ "کسبِ رزق کے مساویانہ حقوق"۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے زمین اور اس کی سب چیزیں خدا نے نوعِ انسانی کے لیے بنائی ہیں۔ اس لیے انسان کا یہ پیدائشی حق ہے کہ زمین سے اپنا رزق حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس حق میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔

غیر ملکیتی حقوق۔ قدرت نے جن نعمتوں کو تیار کرنے یا کارآمد بنانے میں کسی کی محنت و قابلیت کا کوئی دخل نہ ہو وہ سب انسانوں کے لیے مباح عام ہیں۔ ہر شخص کو حق ہے کہ اپنی ضرورت بھر ان سے فائدہ اٹھائے۔

"قانونِ استفادہ۔ خدا نے جو چیزیں انسان کے فائدے کے لیے بنائی ہیں۔ انہیں بیکار بیکار ڈال رکھنا صحیح نہیں ہے۔

حقِ ملکیت کی اساس۔ جو شخص براہِ راست قدرت کے خزانہ میں سے کوئی چیز لے اور اپنی قابلیت اور محنت سے ان کو کارآمد بنائے وہ اس چیز کا مالک ہے۔

"احترامِ حقوقِ ملکیت۔ جائز شرعی طریقوں سے جو مالکانہ حقوق کسی کو دنیا میں حاصل ہوں وہ بہرحال احترام کے مستحق ہیں۔

"کھلی مساویانہ مسابقت۔ خدا نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں مساوات ملحوظ نہیں رکھی ہے، بلکہ اپنی حکمت کی بنا پر بعض انسانوں کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ اسلام جس مساوات کا قائل ہے وہ رزق میں مساوات نہیں بلکہ حصولِ رزق کی جدوجہد کے مواقع میں مساوات ہے۔

"تصادم کے بجائے تعاون۔ اسلام صرف اتنا ہی نہیں چاہتا کہ اجتماعی زندگی میں یہ معاشی دوڑ کھلی اور بے لاگ ہو۔ بلکہ یہ بھی چاہتا ہے کہ اس میدان میں دوڑنے والے ایک دوسرے کے لیے بے رحم اور بے درد نہ ہوں۔ ہمدرد اور مددگار رہیں۔

"فرد اور معاشرہ میں توازن۔ فرد اور جماعت کے درمیان اسلام ایسا توازن قائم کرنا چاہتا ہے جس میں فرد کی شخصیت اور اس کی آزادی بھی برقرار رہے اور اجتماعی مفاد کے لیے اس کی آزادی نقصان دہ بھی نہ ہو بلکہ لازمی طور پر مفید ہو۔

"شخصی سرمایہ پر معاشرہ کا حق۔ جائز اور معقول اخراجات سے جو دولت آدمی کے پاس بچے اسے وہ جمع بھی کر سکتا ہے اور مزید دولت پیدا کرنے میں بھی لگا سکتا ہے۔ مگر ان دونوں حقوق پر پابندیاں ہیں جمع کرنے کی صورت میں حساب سے زائد دولت پر ڈھائی فی صد سالانہ زکوٰۃ دینی ہوگی۔

"قانونِ وراثت کا عمل۔ پھر جو دولت ان جائز حدود کے اندر فراہم ہوا اس کو بھی اسلام زیادہ دیر تک

سمٹا نہیں رہنے دیتا بلکہ اپنے قانون وراثت کے ذریعہ سے ہر پشت کے بعد دوسری پشت میں اسے پھیلا دیتا ہے اسلام ایسا قانون بناتا ہے کہ جو دولت ایک شخص نے اپنی زندگی میں فراہم کی ہو وہ اس کے مرتے ہی اس کے قریبی عزیزوں میں بانٹ دی جائے۔ (اسلام کا اقتصادی نظام)

دنیا کے جتنے بھی دستور ہیں ان کا ایک حقوق و فرائض کا نظام ہوتا ہے۔ اسلام کا بھی ایک (SYSTEM OF RIGT) ہے اشتراکی اور جمہوری ریاستوں میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک کو (CITIZENS) کہتے ہیں اور دوسرے کو (ALIEN) اسلام کی نظر میں ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو دین اسلام کو پورے طریقے پر مانتے ہیں اور وہ اسلام کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی اور سیاسی احکام کے پابند ہیں۔ اس گروہ کو مسلمان یا شہری کہتے ہیں۔ مسلمانوں کو سارے سیاسی، سماجی، اقتصادی اور معاشرتی حقوق نصیب ہوتے ہیں یعنی وہ حکومت کے عہدوں پر معمور ہو سکتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوتی۔ وہ ارکان دین کی پابندی کرتے ہیں اور دین کی نظر میں سب مساوی حیثیت رکھتے ہیں ان کو ذاتی اور سماجی ملکیت اسلامی تعلیمات کے تحت نصیب ہوتی ہے پھر سماجی حیثیت سے سب برابر ہوتے ہیں۔ رنگ و نسل کا کوئی فرق نہیں ہوتا غرض وہ سارے حقوق ان کو نصیب ہوتے ہیں جن کو اسلام نے منظور کیا ہے۔ اور پھر وہ ساری پابندیاں ان پر عائد ہوتی ہیں جن کا مطالبہ قرآن ان سے کرتا ہے۔ مسلمانوں کے علاوہ دوسری قسم ذمیوں کی ہے۔ ذمی وہ لوگ ہیں جو عقائد کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں لیکن اسلامی ریاست کی حدود میں رہتے ہیں۔ اسلام نے ذمی کی جان کی حفاظت کی ذمہ داری لی ہے۔ تعزیرات کا قانون مسلمان اور ذمی کے لیے یکساں ہے۔ اسلامی ریاست ذمی کی عزت کا تحفظ کرتی ہے۔ جہاں تک کہ ذمیوں کے شخصی معاملات کا تعلق ہے وہ ان کی اپنی ملت کے قانون (PERSONAL LAW) کے مطابق طے کیے جائیں گے۔ ذمیوں کی عبادت گاہیں بھی محفوظ رہیں گی اور ان سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔ جزیہ اور خراج کے معاملہ میں ذمیوں پر تشدد جائز نہیں ہے۔ بلکہ ممنوع ہے۔ جزیہ اور خراج کے معاملہ طرح ذمی تاجروں کے اموال تجارت پر بھی ٹیکس لیا جائے گا۔ وہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ رہیں گے۔ لیکن ذمی رئیس حکومت یا رکن شوریٰ بن سکتے ہیں اور ان مناصب کے انتخاب میں رائے دہندگی حیثیت سے شریک ہو سکتے ہیں۔ جہاں تک تہذیبی خود مختیاری کا سوال ہے، ان کے لیے ایک الگ نمائندہ مجلس یا اسمبلی بنا دی جائے گی تاکہ وہ اپنی اجتماعی ضروریات اس کے ذریعہ پوری کریں۔ ان کو رائے اور فکر کی آزادی نصیب ہوگی تحریر و تقریر میں پورے طور پر آزاد ہوں گے۔ تعلیم میں بھی مساوات کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

چند مخصوص مناصب کے سوا وہ تمام ملازمتوں میں داخل ہونے کے حقدار ہوں گے اور اس معاملہ میں ان کے ساتھ کسی قسم کا تعصب نہ برتا جائے گا۔ صنعت وحرفت، تجارت، زراعت اور دوسرے تمام پیشوں کے دروازے بھی ذمیوں پر کھلے ہوں گے۔ یہ ہیں وہ حقوق جو اسلام مسلمانوں اور ذمیوں کو دیتا ہے۔ مولانا نے ان کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے جس سے کسی کو کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ اسلامی تعلیمات کی سچی ترجمانی ملتی ہے۔

یہ حقوق اسلام ذمیوں کو دیتا ہے۔ جہاں تک کہ اسلامی ریاست میں شہریوں کے حقوق وفرائض کا تعلق ہے اس کو مختصراً ہم نے اوپر بیان کیا ہے لیکن اس کی تفصیل درکار ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی شہریت کے حقوق فرائض کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ اسلامی ریاست کی بنیاد چونکہ اسلام پر ہوتی ہے اس وجہ سے ریاست کا مکمل شہری صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو اسلام کو اپنے دین کی حیثیت سے مانے، یعنی وہ توحید اور رسالت کا اقرار کرے، اسلامی طریق پر نماز پڑھے، اسلام کے بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرے، اسلام کے مقرر کیے ہوئے قبلہ کو اپنا قبلہ قرار دے، نکاح، طلاق اور حرام وحلال میں اسلامی ضابطوں کی پابندی کرے۔ الغرض بحیثیت مجموعی جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے وہ ایک مسلم ہو۔" (شہریت کے حقوق وفرائض)

اسلامی ریاست میں رہنے والے ہر شہری کی جان ومال اور ناموس کی حفاظت ہوگی۔ اس کی ملک ذاتی بالکل محفوظ ہوگی۔ ہر شخص کو شخصی آزادی (PERSONAL LIBERTY) نصیب ہوگی۔ وہ عقیدہ اور مذہب ومسلک میں آزاد ہوگا۔ اسلامی ریاست کا ہر شہری قانون کی نظر میں مساوی ہوگا۔ ہر شہری کو معاشرتی مساوات نصیب ہوگی۔ اور خون، نسب، رنگ اور پیشہ وغیرہ کی بنا پر کوئی فرق ملحوظ نہیں رکھا جائے گا۔ اسلامی ریاست ہر حاجتمند کی کفیل ہوگی۔ وہ ناقابل ادا قرضوں کو ادا کرے گی۔ اس میں بے لاگ اور بے معاوضہ انصاف ہوگا۔ ریاست لوگوں پر طاقت سے زیادہ بار نہ ڈالے گی۔ اس میں اطاعت الٰہی کے خلاف لوگوں کو کوئی حکم نہ دیا جائے گا۔ ہر شہری کو درخواست فریاد اور اعتراض کا حق ہوگا۔ ان حقوق کے ساتھ ہر شہری پر کچھ پابندیاں بھی عائد ہوتی ہیں۔ شہری پر سب سے بڑی ذمہ داری سمع وطاعت کی ہوتی ہے۔ دوسرا فرض خیرخواہی کا ہے۔ تیسرا فرض کارکنان حکومت کے ساتھ تعاون کا ہے۔ چوتھا فرض جو ہر شہری پر عائد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی حیثیت واطاعت کے مطابق ریاست کی ترقی اور اس کی حفاظت کے لیے مالی قربانی کرتا رہے۔ ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ ریاست کے تحفظ کے لیے جانی قربانی دے۔ یہ ہیں وہ فرائض جو اسلامی ریاست کے ہر شہری کو ادا کرنے ہوتے ہیں۔

حقوق و فرائض کے نظام (SYSTEM of Right) کے علاوہ اسلام کا ایک فقہی نظام بھی ہے قانون کی قسموں کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ ہماری اخلاقی تعلیم و تربیت میں شامل ہوتا ہے اور اس کے مطابق ہم اپنے افراد کی سیرت و کردار ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا ایک دوسرا مجموعہ ہمارے معاشرتی نظام میں داخل ہوتا ہے، اور اسی کے لحاظ سے ہم اپنی معاشرت میں مختلف قسم کے انسانی تعلقات کو منضبط کرتے ہیں، ان کا ایک تیسرا مجموعہ ہمارے معاشی نظام میں جگہ پاتا ہے اور اس کی روشنی میں ہم دولت اور اس کی پیدائش اور اس کی تقسیم اور اس کے تبادلے اور اس پر لوگوں کے حقوق کا ضابطہ بناتے ہیں۔"

اسلامی قانون کے اہم شعبے، دستوری قانون (constitutional law) انتظامی قانون (Administrative law) اجتماعی قانون (Public law) شخصی قانون (Private law) اور بین الاقوامی قانون (INTERNATIONAL LAW) ہیں۔ دستوری قانون کے بارے میں لکھتے ہیں:

"شریعت نے اس کے تمام ضروری اصول مقرر کر دیے ہیں۔ ریاست کا اساسی نظریہ کیا ہے؟ اس کے قیام کا مقصد کیا ہے؟ کون لوگ اس کے شہری ہو سکتے ہیں؟ ان کے حقوق اور واجبات کیا ہیں؟ کس بنیاد پر کس کو حقوق شہریت ملتے اور کس بنیاد پر وہ سلب ہو سکتے ہیں؟ اسلامی ریاست میں غیر مسلم شہریوں (ذمیوں) کے حقوق و واجبات کیا ہیں؟ ریاست کے قانون اور اختیارات کا ماخذ کیا ہے؟ حکومت کا انتظام کن اصولوں پر چلایا جائے گا؟ انتظامی اختیارات کس کے سپرد کیے جائیں گے؟ اس کا تقرر کون کرے گا، کس کے سامنے وہ جواب دہ ہوگا، کن حدود کے اندر وہ کام کرے گا؟ قانون سازی کے اختیارات کس کو کس حد تک حاصل ہوں گے؟ عدالت کے حقوق و فرائض کیا ہوں گے؟ دستوری قانون کے ان تمام بنیادی مسائل کا واضح جواب شریعت نے ہم کو دے دیا ہے۔" (اسلامی قانون)

انتظامی قانون کے بارے میں لکھتے ہیں: "اس کے بھی تمام بنیادی اصول شریعت نے واضح کر دیے ہیں ایک اسلامی ریاست اپنی آمدنی کے لیے کس قسم کے ذرائع اختیار کر سکتی ہے اور کس قسم کے ذرائع اختیار نہیں کر سکتی حکومت کے واصلات میں کس قسم کے تصرفات درست ہیں اور کس قسم کے نادرست؟ فوج، پولس، عدالت اور نظم و نسق کے مختلف شعبوں میں حکومت کا رویہ کیا ہونا چاہیے، باشندوں کی اخلاقی اور مادی فلاح کے لیے حکومت پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟ کون سی بھلائیاں ہیں اور کون سی برائیاں ہیں جنھیں روکنا اور دبانا اس کے فرائض میں سے ہے؟ باشندگان ملک کے معاملات میں حکومت کس حد تک دخل انداز ہونے کی مجاز ہے۔" (اسلامی قانون)

اجتماعی قانون اور شخصی قانون کے بارے میں بھی شریعت نے وسیع پیمانہ پر تفصیلی احکام اور اصول بتائے

ہوا قانون جاری رہ سکتا ہے نہ آئندہ کے لیے کوئی ایسا قانون بنایا جاسکتا ہے اور نہ حکومت کوئی ایسا حکم
دے سکتی ہے جو قرآن وسنت کے خلاف ہو۔ قانون کی نگاہ میں سب لوگ یکساں ہیں۔ اس میں تمام اجتماعی امور مشورے
سے انجام پاتے ہیں۔ اس میں ذمہ داری کے مناصب عورتوں کے سپرد نہیں کیے جاسکتے۔ اس کا مقصد وجود معروف
کو قائم کرنا اور منکر کو مٹانا ہے۔ اس میں لوگوں کو جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی ضمانت دی جائے گی۔ شخصی
آزادی کی حفاظت کا حق۔ رائے اور مسلک کی آزادی کا حق۔ اسٹیٹ اپنی حدود میں کسی شہری کو زندگی کی بنیادی
ضروریات سے محروم نہ رہنے دے۔" (اسلامی ریاست ۔ بنیادی حقوق)

یہ ہے ابوالاعلیٰ کا اسلامی ریاست کا تصور جس کو وہ اپنی ساری تحریروں میں بڑی وضاحت اور خوبی کے ساتھ
بیان کرتے ہیں۔ کچھ علماء نے مودودی صاحب کی ذات اور ان کی تحریک پر سخت حملے کیے ہیں۔ مرقعہ مودودیت حصہ دوم
میں مولانا مودودی پر جو اعتراضات کیے گئے وہ بڑے دلچسپ ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ حالات کی نزاکت کا اہل جماعت کو قطعاً احساس نہیں ہے یا اگر ہے تو آنکھیں رکھنے
کے باوجود وہ بالکل بے تعلق بنے ہوئے ہیں یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اصول کو چھوڑ کر ایسے لٹریچر کو جنم دیا ہے جو
اہل اسلام کی تمام جماعتوں میں ہنگامہ آرا رہے۔"

"جماعت اسلامی جس لٹریچر کی تبلیغ میں سرگرداں ہے چند رسائل کو مستثنیٰ کر کے باقی سارا لٹریچر گویا نسلی اسلام
اور سلف صالحین پر نقد و تبصرہ کی پوٹ ہی ہے اور انہیں اپنے زعم میں ان ساڑھے تیرہ سو سال کے اندر روشنی
کی کرن کہیں دکھائی نہیں دیتی۔"

"آپ علم تصوف کو جانتے نہیں۔ اس کوچہ سے واقف نہیں کسی شیخ کامل کی آپ کو صحبت نہیں اور اس پر
لطف یہ ہے کہ آپ کو نفس نے اس دھوکہ میں مبتلا کر دیا ہے کہ بیعت واجازت ایک لغو چیز ہے حقیقت یہ ہے کہ جناب
نے فن تصوف پر جتنی بھی خامہ فرسائی فرمائی ہے وہ ابجد خوان فن تصوف کے واسطے ایک مضحکہ سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتی۔"

"جناب مولانا مودودی صاحب کا نشتر تنقیص بغیر عمل جراحی و آپریشن صحابہ کبار سے لیکر اس وقت تک
کسی بڑے سے بڑے شخص کو نہیں چھوڑتا۔" مرقعہ مودودیت حصہ دوم۔

یہ ہیں وہ علمی اعتراضات جو مولانا مودودی اور ان کی تحریک پر لگائے گئے ہیں۔ خود اعتراضات کو پڑھکر
ہنسی آتی ہے۔ مولانا نے ان کا جواب بڑی خوبی کے ساتھ دیا ہے اس کو پڑھکر ان کی وسعت نظر کا پتہ چلتا ہے

لکھتے ہیں، ہماری یہ تحریک کسی شخصیت کے بل پر نہیں اٹھی ہے جس کے لیے کسی خاص منصب کا دعویٰ کیا گیا ہو، جس کی کرامتوں اور تقدس کی داستانوں کا اشتہار دیا جاتا ہو، جس کی ذاتی عقیدت پر جماعت کی بنیاد رکھی گئی ہو اور جس کی طرف لوگوں کو دعوت دی جاتی ہو۔ دعووں اور خوابوں اور کشف و کرامات اور شخصی تقدس کے تذکروں سے ہماری تحریک بالکل پاک ہے۔ یہاں دعوت کسی شخص یا اشخاص کی طرف نہیں ہے بلکہ اس مقصد کی طرف ہے جو قرآن کی رو سے ہر مسلمان کا مقصدِ زندگی ہے اور ان اصولوں کی طرف ہے جن کے مجموعے کا نام اسلام ہے جو لوگ بھی اس مقصد کے لیے ان اصولوں پر ہمارے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیں وہ مساوی حیثیت سے ہماری جماعت کے رکن بنتے ہیں۔

عجیب بات یہ ہے کہ جن لوگوں کے دامن خود غلطیوں سے آلودہ ہیں جن کی وجہ سے فرقہ بندی کا فتنہ رونما ہوتا ہے جن کے ہاں خوابوں اور کشفوں اور کرامتوں کے چرچے ہیں۔ جن کے ہاں سارا کام کسی "حضرت" کی شخصی عقیدت کے بل پر چل رہا ہے جن کے یہاں کسی شخصیت کے لیے کسی مخصوص منصب کا دعویٰ کیا جاتا ہے، جن کے ہاں فروعی مسائل پر جھگڑے اور مناظرے ہوتے ہیں اور اجتہادی مسالک پر دھڑے بندیاں کی جاتی ہیں وہی ہم کو الزام دینے میں پیش پیش ہیں۔ (شہادتِ حق)

مولانا کا جواب حق بجانب ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان میں کسی شخصی واسطے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ شیخ صاحب یا "پیر" صاحب کے تعویذ گنڈے اور ان کے کشف و کرامات کسی کی تقدیر تھوڑی بدل سکتے ہیں نہ ان کو خدا کے قانون میں دخل ہے۔ موت زندگی اور رزق سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کسی شخصیت کو نمونہ بنایا جا سکتا ہے تو وہ نبی کریم کی ذاتِ گرامی ہے۔

موجودہ دنیا میں جبکہ سرمایہ دارانہ اور اشتراکی نظام کام کر رہے ہیں اسلام کا نام لینا تمسخر آمیز بات سمجھی جاتی ہے۔ ان حالات میں موجودہ ذہنوں کے سامنے اسلام کا پیش کرنا بڑی جرأت کا کام ہے۔ بڑے علم اور تجربہ کی ضرورت ہے اور جبکہ اسلامی طرزِ زندگی کی بنیادوں پر کوئی ریاست بھی قائم نہ ہو۔ جبکہ دنیا اسلام کو ایک فرسودہ نظام سمجھتی ہو ابوالاعلیٰ نے اس کام کو بڑی خوبی کے ساتھ انجام دیا ہے۔ ان کی نظر اور مطالعہ اشتراکیت اور سرمایہ داری کا گہرا ہے

ضروری اعلان ہفت روزہ شہاب (لاہور) کے ہندوستانی خریدار اور ایجنٹ حضرات آئندہ شہاب سے متعلق تمام رقومات مکتبہ الحسنات کے بجائے ماہنامہ زندگی رامپور یوپی کے پتہ پر ارسال فرمایا کریں اور اس کی رسید منیجر شہاب کو بھیجا کریں۔ منیجر ہفت روزہ شہاب

وہ ان کے عیوب اور خوبیوں کو کماحقہ جانتے ہیں، مولانا نے اسلام سے مقابلہ بڑی محنت اور ذہانت سے کیا ہے۔ اگر کسی طریقے سے اسلام کو موجودہ زمانے میں پیش کیا جاسکتا ہے تو اسی طرح کیا جاسکتا ہے۔

اسلام کا پیغام کوئی نیا نہیں ہے۔ ابتدائے آفرینش سے دنیا میں پیغمبر آتے رہے جنھوں نے ایک ہی پیغام دیا۔ قرآن میں ساری پچھلی سچائیوں کو یک جا کر دیا ہے۔ یہ پیغمبر دنیا میں ہر گوشے میں آتے رہے۔ ان کا اصلی کام انسانی تہذیب کی درستی رہا ہے۔ اخلاق کو درست کرنے کا ہے اور ہمیشہ دین حق کی تعلیم دی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس ساری کائنات کی ہر چیز ایک نظام میں جکڑی ہوئی ہے اور اس میں ایک شعور وادراک کی قوت کارفرما ہے۔ اس پوری مشین کو بنانے والی ایک قوت ہے۔ یہی خدا ہے۔ اس کی رحمت، ربوبیت کی قوتیں اپنا کام برابر کررہی ہیں یہ قوت واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ فطرت کے سارے مظاہر پکار پکار کر اس کی کبریائی کا اعلان کررہے ہیں۔ ذرہ تک اس کے حکم کے بغیر اپنی جگہ سے جنبش نہیں کرسکتا انسان اس دنیا میں بھی اپنے اعمال کے لیے جواب دہ ہے اور جب دوسری دنیا آئے گی تو اس میں بھی یہ خدا کے سامنے جواب دہ ہوگا۔ اس پوری کائنات میں خیر وشر کا نظام کام کررہا ہے۔ اچھے اعمال کا بدلہ اچھا ہے اور برے کا برا۔ جو جیسا کرے گا اس کو ویسا پھل ملے گا۔ اسلام کا سارا نظام خیر کا داعی ہے۔ وہ سارے معاشرے کے لیے خیر کا نظام ہے۔ اس پوری کائنات کا ایک اللہ ہے اس نے پوری کائنات بنائی ہے۔ اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی کہے کہ ایک دریا کے کنارے ایک درخت کھڑا تھا وہ خود بخود زمین پر گرا، اس کے تختے بنے پھر کشتی بنی اور یہ کشتی بغیر کسی ملاح کی مدد کے دریا میں چلنے لگی۔ کوئی بھی اس بات کا یقین نہیں کرے گا۔ جب اس بات کا کسی کو یقین نہیں آسکتا تو پھر اس بات پر کس کو یقین آسکتا ہے کہ یہ پوری کائنات خود بخود بن گئی اور اس کا کوئی خالق نہیں ہے۔ یقیناً اس کا ایک خالق ہے جو علیم وخبیر ہے۔

انسان اس سرزمین پر خدا کا نائب اور خلیفہ ہے۔ ان انسانوں میں جو اپنی سیرت اور کیرکٹر کے اعتبار سے سب میں اعلیٰ واشرف تھے ان کو اپنا رسول بنایا اور ان پر اپنی شریعت نازل کی۔ یہی اصلی دین ہے۔ ان رسولوں نے خدا اور کائنات اور انسان اور انسان کے رشتہ کو بتایا۔ اپنی سیرت اور کردار کے اعلیٰ نمونے عام انسانوں کے سامنے پیش کیے۔ وہ ایک مستقل ہدایت تھے، مستقل روشنی تھے۔ یہ کردار آج بھی قابل اتباع ہیں۔ انسان اور خدا کے درمیان جو واسطہ رہا ہے اس کو رسالت کہتے ہیں۔ انسان اس سرزمین پر خدا کا خلیفہ ہے۔ سارے وہ انسان جو خدا کے دین پر ایمان رکھتے ہیں وہ خلیفہ ہیں اس میں رنگ ونسل کی کوئی تفریق نہیں۔ پورا کا پورا

شرہ خلافت کا مستحق ہے۔ اسلام کسی تنگ اور محدود قومیت کا قائل نہیں وہ آفاقی قومیت یا برادری کا
ائل ہے۔ وہ ایک تہذیب کا داعی ہے جو دنیا کی ساری تہذیبوں کے مقابلے میں اعلیٰ وارفع ہے اور اس کا
نظام سراسر خیر ہے۔ خدا خود رحیم ہے اور ساری ملت کی اساس بھی رحمت اور عدالت پر ہے۔ ہر معاشرہ ایک
نظام عدل کی وجہ سے باقی رہتا ہے۔ اس کی حیات کا ضامن نظام عدل ہوتا ہے۔ انسان اپنے طور پر سارے
اعمال کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔ اسلام کے نظام ریاست یا معاشرے کا انتظام ایک امیر کے ہاتھوں چلتا ہے۔
اس کی ایک مجلس شوریٰ ہونی چاہیے۔ امیر کا انتخاب جمہور کی رایوں سے عمل میں آتا ہے وہ سیرت کے اعتبار سے اتنا
اعلیٰ ہوتا ہے کہ خود امیدوار نہیں بنتا بلکہ لوگ اس کو خود انتخاب کرتے ہیں۔ یہ طریقہ اتنا اچھا ہے کہ دنیا کا رائج الوقت
کوئی طریقہ اس قدر اچھا نہیں ہے۔ پھر مشاورتی کمیٹی کے ممبر بھی بڑے ارفع ہونے چاہیں۔ عدلیہ کے لوگ قرآن
کے احکام کے تحت عمل کریں گے لیکن قانون بنانے کا کسی کو حق نہیں ہے۔ وہ صرف خدا کو حاصل ہے قرآن
خدا کا دستور ہے جو پوری انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے ایک مستقل دستور ہے۔ سیاسی، سماجی، اخلاقی
اور اقتصادی زندگی کے لیے آخری حل ہے۔ جو قوانین بھی سماج کے لیے بنیں گے ان کا سرچشمہ قرآن ہی ہوگا۔ قانون
کی نظر میں سب مساوی ہیں۔ ہر فرد اخلاقی اعتبار سے بلند کردار رکھتا ہے۔ اشتراکی فلسفہ کے تحت اخلاقی نظام سماج
کے اثر سے پیدا ہوتا ہے۔ مادی زندگی اخلاقیات کو جنم دیتی ہے۔ انسانوں کے آپس کے تعلقات سے اخلاقی
نظام وجود میں آتا ہے لیکن اسلام کا اخلاقی نظام قرآن کی سچی اور حقیقی تعلیمات میں ملتا ہے۔ یہ ابدی ہے
رہتی دنیا تک باقی رہے گا اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوگی۔ سیاسی نظام بنتے اور بگڑتے رہیں گے لیکن یہ قدریں
ہمیشہ باقی رہیں گی اس لیے کہ ان کو خدائے علیم و بصیر نے مرتب کیا ہے جو ابد تک کی ہونے والی باتوں کا علم
رکھتا ہے۔

اسلام سرمایہ دارانہ نظام اور اشتراکی نظام سے علیحدہ اپنی ایک راہ نکالتا ہے۔ سرمایہ دارانہ سماج
میں دولت اور وسائل دولت مٹھی بھر سرمایہ داروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ باقی سب لوگ اور جماعتیں ان کے
زیر نگیں ہوتی ہیں شخصی ملکیت کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ دولت کا ارتکاز تھوڑے سے ہاتھوں میں ہوتا
ہے۔ استحصال (   ) کا عمل برابر کارفرما رہتا ہے۔ جہاں تک کہ اشتراکی نظام کا تعلق ہے
اس کی رو سے اقتصادی مساوات ہوتی ہے۔ دولت اور وسائل دولت سب ریاست کے ہاتھ میں ہوتے
ہیں شخصی ملکیت ختم ہو جاتی ہے۔ اسلام کی راہ ایک متوسط راہ ہے۔ وہ شخصی ملکیت کا حق لوگوں کے لیے ایک

فطری حق قرار دیتا ہے اور ارتکاز دولت کو روکتا ہے۔ زکوٰۃ و میراث کے نظام کے ذریعہ دولت ایک شخص یا ایک خاندان میں کبھی جمع نہیں رہ سکتی۔ وہ ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کے قریبی رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح زکوٰۃ کے نظام کے تحت دولت کا ([illegible]) برابر جاری رہتا ہے۔ اسلام کا یہ نظام دوسرے نظاموں پر افضلیت رکھتا ہے اور اگر موجودہ دنیا اس کو تسلیم کرلے تو پھر ساری مشکلات دور ہوسکتی ہیں۔ یہ بینکنگ سسٹم کی مخالفت کرتا ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ نے اس کو جس طرح پر پیش کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے
ہم مسعود عالم ندوی کی رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ "خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نے سوسائٹی کی نوعیت کا جو نقشہ بنایا ہے اگر ٹھیک ٹھیک قائم ہو جائے تو ایک ایسا اجتماعی نظام پیدا ہوگا جس میں نہ تو بڑے بڑے کروڑپتی ہوں گے، نہ مفلس و محتاج طبقے، بلکہ ایک طرح کی درمیانی حالت ہوگی۔ ایسے افراد ضرور ہوں گے، جو اپنی انفرادی جدوجہد سے زیادہ دولت پیدا کرسکیں گے لیکن جو فرد جتنا زیادہ کمائے گا اتنا ہی زیادہ خرچ کرنے پر مجبور ہوگا۔ گویا افراد کی کمائی سے صرف افراد کی مالی حالت نہیں اچھی ہوگی، بلکہ جماعت بحیثیت جماعت بھی خوش حال ہوگی۔ لائق اور محنتی افراد صرف اپنے لیے نہیں کمائیں گے، بلکہ پوری جماعت کے لیے، سرمایہ داری نظام کی طرح یہ نہیں ہوسکتا کہ ایک کی زندگی دوسرے کے لیے موت اور ایک طبقے کی کمائی دوسرے کے لیے تباہی اور خانماں بربادی کا پیغام بن جائے۔ زکوٰۃ کی فرضیت اور انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید سے دولت افراد میں بٹتی جائے گی۔ قانون وراثت سے دولت چند افراد میں محصور نہ رہ سکے گی، سود کی حرمت سے غریبوں کا خون چوسا جائے گا اور پھر اجارہ اور احتکار کی حرمت کے ساتھ یہ بھی نہیں ہوسکتا کہ قیمت کی افزائش کے خیال سے سرمایہ دار غلہ کو روکے رکھیں اور غریب سسک سسک کر جان دے رہے ہوں۔

"مختصر یہ کہ اسلام ایسا معاشی نظام پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جہاں شخصی ملکیت بالکل تباہ نہ ہو اور سرمایہ دار بھی پیدا نہ ہوسکے، وہ معیشت میں انفرادیت اور اجتماعیت دونوں کی خوبیاں جمع کرنا چاہتا ہے، وہ احتکار و اکتناز کی حرمت کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ تمام افراد معیشت میں یکساں نہیں ہوسکتے۔ عدم یکسانی قدرتی ہے صلاحیتوں کے اختلاف سے محنت و معیشت کے اثرات بھی مختلف ہوں گے۔ اس کے خلاف اشتراکیت انفرادی ملکیت کو یک لخت ختم کردینا اور جبری نظام کے ذریعہ اپنے خیال میں دولت کی مساویانہ اور منصفانہ تقسیم کرنا چاہتی ہے وہ ذرائع پیداوار کو یکسر حکومت کے قبضہ میں رکھ کر مزدوروں کو اپنا غلام بنانا چاہتی ہے۔ اشتراکی نظام میں افراد کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ نظام آمریت خواہ فاشیت کے رنگ میں ہو یا اشتراکیت کے روپ میں

رسائل ومسائل

ترجمۂ قرآن بلامتن کی اشاعت کا مسئلہ

سوال

محمد مارماڈیوک پکتھال کے انگریزی ترجمۂ قرآن کو کسی امریکن فرم نے بغیر متن کے شائع کیا ہے۔ اسی کی دیکھا دیکھی یا از خود بعض ہندوستانی مسلمان بھی بلامتن قرآن مجید کا ترجمہ شائع کر رہے ہیں ——
براہِ کرم آپ از روئے شریعت واضح فرمائیں کہ ایسا کرنا کہاں تک صحیح ہے۔

جواب

اگرچہ جناب مستفسر کو یہ بات معلوم ہے کہ اس طرح کے مسائل کا جو جواب 'رسائل ومسائل' میں دیا جاتا ہے اس کی حیثیت فتوے کی نہیں ہوتی، اس کے باوجود میں اس کی صراحت مناسب سمجھتا ہوں کہ مسئولہ مسئلہ میں میرے جواب کی حیثیت محض ایک انفرادی رائے کی ہے۔

یہ بات معلوم ہے کہ ترجمۂ قرآن بلامتن کی اشاعت کا مسئلہ خالص اجتہادی مسئلہ ہے۔ قرآن مجید اور احادیث نبوی دونوں اس کے جواز وعدم جواز سے ساکت ہیں۔ اگر ان دونوں میں کسی ایک پہلو کی وضاحت ہوتی تو یہ مسئلہ سوال سے پہلے ہی حل ہوتا۔ اس کے علاوہ جہاں تک میرا مطالعہ ہے جلیل القدر فقہائے امت کی کتابیں بھی اس بحث سے خالی ہیں۔ اب اس کے سوا کیا چارہ ہے کہ اس مسئلے پر ایک اصولی نظر ڈال کر جواب حاصل کیا جائے۔

اصولاً یہ بات مسلم ہے کہ قرآن کی ہدایات وتعلیمات، اوامر ونواہی اور احکام وقوانین کی واقفیت خود مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے اور انہیں غیر مسلموں تک پہنچانا بھی امت مسلمہ کا فریضہ ہے۔ اس بات کو تسلیم کرنے کے بعد دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمام دنیا کے وہ مسلمان جو عربی زبان سے نابلد ہیں مضامین قرآن سے کس طرح واقفیت حاصل کریں؟ اس کی تین صورتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ (۱) تمام مسلمانوں پر عربی زبان کی تحصیل لازم قرار دی جائے۔ (۲) ان کے لیے صرف الفاظ قرآن کی تلاوت کافی سمجھی جائے اور اس کے احکام ہر ملک کی اپنی زبان میں قرآن سے الگ فقہی یا غیر فقہی کتابوں کے ذریعہ بتائے اور پڑھائے جائیں۔ (۳) قرآن کا ہر ملک کی زبان میں

حامل المتن ترجمہ کیا جائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو تشریح و تفسیر کر دی جائے تاکہ قرآن تلاوت کرنے والا غیر عربی داں مسلمان الفاظ قرآن کے ساتھ ہی اس کے معنی و مطلب سے بھی ایک حد تک واقف ہو جائے۔

پہلی صورت کے لزوم و وجوب کے لیے کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔ دوسری صورت میں غیر عربی داں مسلمان قرآن کے معنی و مطلب سے محروم رہ جاتے اور قرآن سے ان کے گہرے ربط و تعلق میں کمی پیدا ہو جاتی اس لیے علمائے امت نے تیسری ہی صورت اختیار فرمائی۔ اب اس زمانے میں تو قرآن کے حامل المتن ترجمے کے عدم جواز کے بارے میں کسی مسلمان کو شاید کوئی شک بھی نہیں گزرتا لیکن کم سے کم ہندوستان میں جب قرآن کا سب سے پہلا ترجمہ فارسی زبان میں کیا گیا تو اس وقت اس کے خلاف عوام و خواص نے سخت احتجاج کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سبھی غیر مخلص اور شریر نہ ہوں گے بلکہ بہت سے لوگوں نے اخلاص کے ساتھ اور متوقع خطرات کے پیش نظر ہی اس کی مخالفت کی ہوگی لیکن اس مخالفت کے پیچھے نہ عقلی دلیل تھی نہ نقلی اور متوقع خطرات بھی قابل اعتنا نہ تھے اس لیے وہ ترجمہ مقبول ہوا اور آئندہ بہت سے تراجم کا سنگ میل ثابت ہوا۔ دوسرا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ دنیا کے غیر عربی داں غیر مسلموں میں کس طرح قرآن سے دلچسپی پیدا کی جائے جو دین اسلام کا سب سے اعلیٰ ماخذ ہے۔

مسلمانوں کے تعلق سے اوپر جو تین صورتیں پیش کی گئی ہیں ان میں سے دو پہلی صورتیں یہاں اور زیادہ نامناسب ہیں۔ پہلی صورت یوں صحیح نہیں کہ جب مسلمانوں پر عربی کی تعلیم واجب قرار نہیں دی جا سکتی تو غیر مسلموں پر بدرجہ اولیٰ واجب نہ ہوگی۔ دوسری صورت یوں فٹ نہیں کہ حصول اجر و برکت کے لیے الفاظ قرآن کی تلاوت غیر مسلموں کے لیے بے معنی ہے۔ تیسری صورت یعنی متن کے ساتھ ترجمہ قرآن کی اشاعت البتہ قابل غور ہے۔ جہاں تک میں نے غور کیا ہے غیر مسلموں کے لیے ترجمے کے ساتھ متن قرآن کی اشاعت ضروری نہیں معلوم ہوتی۔ یہ رائے میں نے متعدد وجوہ سے قائم کی ہے۔

(۱) مروجہ حامل المتن تراجم قرآن کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جن لوگوں نے سب سے پہلے حامل المتن ترجمہ قرآن شائع کیا ان کے سامنے اصلاً صرف وہ مسلمان تھے جو تلاوت قرآن تو کرتے تھے لیکن یہ بالکل نہیں جانتے تھے کہ اس کتاب میں کیا کہا گیا ہے۔ وہ قرآن کے معنی و مطلب سے ناآشنا ہوتے تھے اور صرف حصول اجر و برکت کے لیے تلاوت کرتے تھے۔ انہیں اس کتاب الٰہی سے آشنا کرنے کے لیے آیات قرآنی کے بین السطور میں ترجمے شائع کیے گئے تاکہ ایک طرف وہ تلاوت قرآن کے عظیم اجر و برکت سے مستفید ہوں اور دوسری طرف قرآن کے معانی و مطالب [illegible]

غرض یہ بھی تھی کہ عربی زبان سیکھنے والے طلبہ الفاظ قرآن کے لفظی ترجمے پڑھ کر عربی کی استعداد بھی بڑھائیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت شاہ رفیع الدین رحمہما اللہ کے تقریباً لفظی ترجمے پڑھ کر کچھ اسی طرح کا تاثر ذہن میں قائم ہوتا ہے اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اصلاً غیر مسلموں کو سامنے رکھ کر حامل المتن ترجمے شائع نہیں کیے تھے کیونکہ جو لوگ الفاظ قرآن پڑھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے ان کے لیے متن قرآن کا کوئی فائدہ نہ تھا، اگر کسی درجے میں بھی ایسے لوگ سامنے ہوتے جو قرآن پڑھنا نہیں جانتے تو بین السطور ترجمے کی کوئی تک سمجھ میں نہیں آتی۔ اس لیے غیر مسلموں کو قرآن سے آشنا کرنے کے لیے اس صورت پر اصرار کرنا جو قرآن خواں مسلمانوں کے لیے اختیار کی گئی تھی مناسب نہیں معلوم ہوتا۔

(۲) جس طرح حامل المتن تراجم قرآن کے عدم جواز پر کوئی شرعی دلیل موجود نہیں ہے اسی طرح بلا متن ترجمۂ قرآن کی اشاعت کو ناجائز کہنے کے لیے کوئی دلیل شرعی موجود نہیں ہے۔

(۳) ترجمہ کے ساتھ پورا متن قرآن غیر مسلموں کے ہاتھوں میں دینا، احترام قرآن کے پہلو سے بھی نامناسب ہے بلکہ ایک حدیث سے مستنبط ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کے ہاتھ قرآن فروخت کرنا جائز نہیں ہے۔ ممکن ہے یہ بات بہتوں کو عجیب معلوم ہو اس لیے میں وہ حدیث نقل کرتا ہوں:۔

عَنِ ابْنِ عُمَرَ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ	حضرت عبداللہ بن عمر سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ
وَسَلَّمَ نَہٰی اَنْ یُّسَافَرَ بِالْقُرْاٰنِ اِلٰی	علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے کہ قرآن ساتھ لیکر دشمن
اَرْضِ الْعَدُوِّ مَخَافَۃَ اَنْ یَّنَالَہُ	کے ملک میں سفر کیا جائے اس خوف سے کہ کہیں دشمن
الْعَدُوُّ (متفق علیہ)	اسے چھین نہ لے۔

محدثین نے تصریح کی ہے کہ اس ممانعت کی علت قرآن کی بے حرمتی کا خوف ہے۔ اگر یہ خوف نہ ہو تو دشمن ملک میں بھی قرآن ساتھ لیکر سفر کیا جا سکتا ہے۔ اسی حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا ہے کہ غیر مسلموں کے ہاتھ قرآن نہ فروخت کیا جائے چنانچہ اس حدیث کے تحت حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں:۔

واستدل بہ علی منع بیع المصحف	اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ کافر سے
من الکافر لوجود المعنی المذکور	قرآن کی فروخت ممنوع ہے کیونکہ یہاں بھی مذکورہ علت
فیہ وھو التمکن من الاستھانۃ بہ	موجود ہے اس صورت میں بھی کافر کو بے حرمتی کرنے پر
ولا خلاف فی تحریم ذالک وانما	قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اس بیع و فروخت کے حرام
وقع الاختلاف ھل یصح لو وقع ویؤمر	ہونے میں اختلاف نہیں ہے۔ ہاں اس بات میں اختلاف ہے

باذالة ملكه عنه ام لا — کہ اگر ایسا ہو تو بیع واقع ہوگی یا نہیں اور قرآن سے کافر کی ملکیت دور کرنے کا حکم دیا جائے گا یا نہیں؟
(ج ۶ ص۲۲)

اس فقہی حکم کی موجودگی میں غیر مسلموں کے لیے ترجمہ کے ساتھ پورا متن قرآن شائع کرنا کس طرح مناسب قرار دیا جائے گا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ غیر مسلموں کو قرآن دیا جا سکتا ہے اور دلیل میں اس فرمان نبوی کو پیش کرتے ہیں جو آپ نے ہرقل کو بھیجا تھا کیونکہ اس میں قرآن کی آیت بھی درج تھی۔ شاید ایسے لوگوں کی نگاہوں سے مذکورہ بالا احادیث اوجھل ہو جاتی ہیں اور وہ اس فرق کو بھی محسوس نہیں کرتے جو پورے قرآن اور کسی خط میں دو ایک آیتوں کے حوالہ میں ہے۔ فقہائے امت نے اس فرق کو محسوس کیا ہے۔ علامہ نووی لکھتے ہیں:۔

واتفق العلماء على انه يجوز	اور علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ غیر مسلموں کو ایسا
ان يكتب اليهم كتاب فيه اية	خط لکھنا جائز ہے جس میں قرآن کی ایک یا چند آیتیں
او ايات والحجة فيه كتاب النبي	درج ہوں اور اس کی دلیل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ
صلى الله عليه وسلم الى هرقل (شرح مسلم)	فرمان ہے جو آپ نے ہرقل کو بھیجا تھا۔

اس کے علاوہ عام طور پر کسی غیر مسلم کو قرآن دینے اور سفارتی سطح پر کسی غیر مسلم حکومت کو قرآن یا قرآن کی بعض آیتیں بھیجنے میں بڑا فرق ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جس فرمان سے استدلال کیا جاتا ہے اس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ ہرقل نے اس کی بڑی عزت کی تھی اور بڑے اعزاز کے ساتھ حضور کا وہ فرمان بہت دنوں تک اس کے خزانے میں محفوظ رہا۔

اس بحث کے بعد اب میں ان لوگوں کے خیالات کا بھی جائزہ لینا چاہتا ہوں جو غیر مسلموں کے لیے بھی صرف ترجمے کی اشاعت کو ناجائز کہتے ہیں اس سلسلے میں سب سے بڑی جو دلیل دی جاتی ہے وہ یہ اندیشہ ہے کہ اگر بلا متن ترجمے رائج ہو گئے تو دیگر کتب سماوی کی طرح قرآن کا متن بھی نعوذ باللہ دنیا سے غائب ہو جائے گا اور صرف تراجم باقی رہ جائیں گے۔ قرآن کے بارے میں یہ اندیشہ میرے نزدیک وہم سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ اس اندیشے میں پہلی بات تو یہ نظر انداز ہو گئی ہے کہ صرف انگریزی یا صرف ہندی کے ترجمے اصلاً غیر مسلموں تک قرآن کی تعلیمات پہنچانے کے لیے شائع کیے جاتے ہیں اس لیے مسلمانوں کے درمیان صرف تراجم کے رائج ہونے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ دوسری بات جو پہلی بات سے زیادہ عجیب ہے وہ یہ کہ اس معاملہ میں قرآن اور دیگر کتب سماوی کو ایک قرار دے لیا گیا ہے حالانکہ تمام انسان مل کر بھی قرآن کو دنیا سے غائب کرنا چاہیں تو ہرگز قادر نہیں ہو سکتے۔ اللہ تعالیٰ نے نہ صرف یہ کہ قرآن کو قیامت تک دنیا میں باقی رکھنے

بلکہ امت مسلمہ میں سے ایک ایسے گروہ کو باقی رکھنے کی ذمہ داری لی ہے جو خود قرآن پر عمل کرتا رہے گا، دنیا کو اس کی طرف دعوت دیتا رہے گا اور تمام معنوی تحریفات کو باطل کرتا رہے گا۔

پریس کی اس ترقی کے زمانے میں متن قرآن دنیا بھر میں کروروں کی تعداد میں شائع ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا، لاکھوں سینوں میں قرآن محفوظ ہے اور محفوظ رہے گا۔ اس کے علاوہ دیگر سائنسی ذرائع و وسائل ایسے پیدا ہو گئے ہیں جو متن قرآن کی حفاظت کے لیے بھی استعمال کیے جا رہے ہیں اور کیے جائیں گے۔ یہاں اس بات کی طرف صرف اشارہ مقصود ہے حفاظت قرآن کے تمام ذرائع و وسائل کی تفصیل مقصود نہیں ہے۔

دوسری دلیل جو دی جاتی ہے وہ یہ اندیشہ ہے کہ اگر متن سامنے نہ ہو تو تحریف معنوی کی بڑی گنجائش پیدا ہو جائیگی، یہ عجیب اندیشہ ہے جو فہم سے بالاتر ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا متن کی موجودگی میں تحریف معنوی نہیں کی جا سکتی اور کیا متن کے ساتھ ساتھ تحریف کی مثالیں آج بھی موجود نہیں ہیں؟ اس کے علاوہ متن کی موجودگی میں غلط ترجموں کی گرفت تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو عربی سے بھی واقف ہوں اور اس زبان سے بھی جس میں ترجمہ کیا گیا ہے اور یہاں ترجمہ بلا متن کی اشاعت ان لوگوں کے لیے ہے جو عربی سے تو کیا واقف ہوں گے قرآن پڑھ بھی نہیں سکتے۔ ایسے لوگوں کے لیے متن کی موجودگی تحریف معنوی سے رکاوٹ کس طرح بن جائیگی؟ اس سے بچنے کی صورت یہ نہیں ہے کہ متن بھی لازماً شائع کیا جائے بلکہ یہ ہے کہ خدا کا خوف رکھنے والے لوگ پوری احتیاط اور جانچ پڑتال کے بعد تراجم شائع کریں۔

ایک اندیشہ یہ ہے کہ صرف ترجمہ کی اشاعت سے الفاظ قرآن سے بے توجہی پیدا ہوگی اور اسکی اہمیت کم ہو جائیگی یہ اندیشہ بھی صحیح نہیں ہے جہاں تک غیر مسلموں کا تعلق ہے امید یہ ہے کہ وہ ترجمہ پڑھ کر اصل قرآن کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کی اہمیت ان کے دلوں میں قائم ہوگی۔ آج ان کے دل اسکی اہمیت سے اس لیے خالی ہیں کہ وہ نہیں جانتے کہ قرآن میں کیا ہے، جب انہیں معلوم ہوگا کہ اس کتاب میں ایسے حقائق بھرے ہوئے ہیں جن کی انسان کو سب سے زیادہ ضرورت ہے تو فطری طور پر وہ قرآن کی عظمت و اہمیت کے قائل ہو جائیں گے۔ باقی رہے وہ مسلمان جو قرآن پڑھنا نہیں جانتے تو انہیں بھی ترجمہ پڑھ کر قرآن کی طرف توجہ ہوگی اور اس کے الفاظ سیکھنے اور پڑھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ محض کسی ایسی کتاب سے جس میں قرآن کا متن بھی ہو اور ترجمہ بھی، الفاظ قرآن کی اہمیت پیدا نہیں ہوتی۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ان اندیشوں میں سے کوئی اندیشہ ایسا نہیں ہے جو ترجمہ بلا متن کی عدم اشاعت کے لیے دلیل بن سکے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر میرے نزدیک خصوصیت کے ساتھ غیر مسلموں کی ضرورت و طلب کے پیش نظر ترجمہ بلا متن شائع کرنے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

مدیر زندگی

تنقید و تبصرہ

امام احمد بن حنبل مترجمہ علامہ عمر فاروق ایم اے۔ صفحات ۵۰۶ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ قیمت ۹ روپیے۔ ناشر:۔ اسلامی پبلشنگ کمپنی اندرون لوہاری دروازہ، لاہور، پاکستان۔

بڑے سائز کی یہ ضخیم کتاب ابوزہرہ پروفیسر آف اسلامک لا، قاہرہ یونیورسٹی مصر کی تصنیف ہے جس کا ترجمہ عمر فاروق صاحب ایم اے نے کیا ہے۔ "حیات احمد بن حنبل" کے نام سے اس کا ترجمہ پہلے بھی شائع ہو چکا ہے لیکن ناشر نے عرض ناشر میں یہ لکھا ہے کہ وہ پوری کتاب کا ترجمہ نہیں ہے بلکہ مترجم نے اصل کتاب میں بہت سی عبارتیں چھوڑ دی ہیں چنانچہ ناشر نے متروک عبارتوں کی ایک مختصر فہرست بھی دی ہے۔ چونکہ وہ ترجمہ ناقص تھا اور کچھ کوتاہیاں بھی تھیں اس لیے اسلامی پبلشنگ کمپنی نے اس کا یہ مکمل ترجمہ شائع کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ناشر نے پوری کتاب کا ترجمہ شائع کر کے ایک مفید دینی و علمی خدمت انجام دی ہے۔ پروفیسر ابوزہرہ نے ائمۂ اربعہ اور دیگر رجال علم و دین پر جو کتابیں لکھی ہیں وہ جدید اسلوب تصنیف، جامعیت، مباحث و نتائج مباحث کے لحاظ سے وقت کی بہترین کتابیں کہی جا سکتی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب بھی ان کے اسی سلسلۂ تصانیف کی ایک کڑی ہے اس کتاب سے امام موصوف کی زندگی کے ہر گوشے پر روشنی پڑتی ہے خصوصیت سے ان کی فقہ پر پروفیسر ابوزہرہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ بہت ہی قابل قدر اور معلومات افزا ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے اس جلیل القدر امام کی پاکیزہ زندگی کا مشہور واقعہ "مسئلہ خلق قرآن" بھی پوری تفصیل کے ساتھ اس میں موجود ہے۔ اس کو پڑھ کر ہر منصف مزاج یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر امام موصوف اس "بدعت" کے خلاف عزیمت کی چٹان نہ بن جاتے تو فروع ہی میں نہیں، اصول دین میں فتنوں کا دروازہ کھل جاتا اور ایسی چیزیں بھی عقائد میں داخل ہو جاتیں جن سے تابعین تک کا عہد نا آشنا تھا۔ اس پوری بحث کو پڑھ کر یہ سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ معتزلہ جو کچھ کہہ رہے تھے وہ ہر لحاظ سے غلط تو نہ تھا پھر امام موصوف کی اس کے مقابلے میں ایسی شدت کس طرح صحیح تھی؟ اس سوال کا جواب بھی اسی بحث میں موجود ہے۔ ایک شخص واثق باللہ کے دربار میں حاضر کیا گیا۔ اس عقیدے کی وجہ سے اس پر بلا نازل ہو چکی تھی [illegible] ابن ابی دؤاد [illegible] اس وقت [illegible]

مباحثے میں کہا :-

ایک ایسی بات کی جانب، جس کی طرف نہ آں حضرت نے دعوت دی، نہ حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ اور نہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے۔ آپ، لوگوں کو کیوں بلاتے ہیں؟ یہ بات دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو حضرات اس عقیدے سے واقف تھے یا واقف نہ تھے۔ اگر آپ یہ کہیں کہ وہ واقف تھے اور خاموش رہے تو پھر مجھے اور آپ کو بھی اس سے سکوت اختیار کرنا چاہیے اور اگر آپ یہ کہیں کہ وہ ناواقف تھے اور آپ نے اسے معلوم کیا ہے تو اے لئیم بن لئیم کیا یہ بات ماننے کی ہے کہ ایک بات سے رسول اللہ اور خلفاء راشدین تو ناواقف رہے ہوں اور تم اس سے ناقف ہوگئے۔

جب واثق نے یہ بات سنی تو اپنی مجلس سے اچھل پڑا اور بار بار ان کلمات کو دہرانے لگا۔ (ص۱۱۳)

یہ واقعہ اس سوال کا مکمل جواب ہے کہ امام احمد نے مسئلۂ خلق قرآن کے مقابلے میں شدت کیوں اختیار کی تھی۔ میرے نزدیک اس مسئلہ کی نوعیت وہی ہے جو تصوف کے مسئلۂ وحدۃ الوجود کی ہے۔ اس کی بعض تعبیرات صحیح بھی ہیں لیکن اگر کوئی شخص اگر وہ اسے توحید و شرک کا مابہ الامتیاز قرار دینے لگے تو اس کی بات بالکل رد کرنے کے لائق ہوگی اور اس بدعت کا سخت مقابلہ کیا جائے گا۔ مسئلۂ خلق قرآن کا ایک عبرت ناک پہلو یہ ہے جسے مسلمانوں کی حکومتیں اور ان کا برسر اقتدار گروہ یاد رکھتا تو مسلمان بہت سے فتنوں سے محفوظ رہتے اور وہ عبرت ناک پہلو یہ ہے کہ کسی ایسے عقیدہ و عمل کو جو عہد رسالت اور عہد صحابہ و تابعین میں موجود نہ ہو طاقت کے زور سے نافذ کرنا بدترین قسم کی حماقت ہے۔ ایسے لوگ اسلامی تاریخ میں رسوائی اور ذلت کے سوا کچھ حاصل نہیں کرتے۔

اس کتاب کے شروع میں مولانا ابوالکلام کے تذکرے سے کچھ عبارتیں "تعارف" کے عنوان سے شائع کی گئی ہیں۔ عرض ناشر میں اس کا حوالہ ضرور ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ اس کی پروف ریڈنگ بالکل نہیں کی گئی ہے اور کہنا چاہیے کہ پورا تعارف مسخ ہو کر رہ گیا ہے ـــــ اصل کتاب کے ترجمے کی عبارت بس ترجمہ ہی معلوم ہوتی ہے اور اس میں تذکیر و تانیث کی بدترین غلطیاں موجود ہیں۔ حیرت ہے کہ مترجم ایسے الفاظ کو بھی مؤنث لکھتے ہیں جس کے مؤنث ہونے کا گمان بھی کسی کو نہیں ہوتا۔ مثلاً لفظ کلام کو وہ مؤنث استعمال کرتے ہیں اسی طرح لفظ ترجح کو بھی مونث استعمال کیا گیا ہے

"زیادہ کلام موجب فتنہ ہوتی ہے اور انسان کو اتنی کلام ہی بس کرتی ہے جس سے حاجت روائی ہوسکے۔ صفحہ ۲۵۵"

اس عبارت کے بارے میں انسان آخر کس رائے کا اظہار کرے؟ اگر ترجمہ صحیح کیا گیا ہے تو بعض باتیں پروفیسر ابو زہرہ کی بھی عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ حضرت عمر نے فاطمہ بنت قیس کی حدیث کو قبول نہیں کیا تھا لیکن امام احمد نے اس کو اپنا مسلک بنایا

اس کی توجیہ کرتے ہوئے ابوزہرہ لکھتے ہیں:۔

"یہاں امام احمدؒ کے سامنے قرآن کی دو تفسیریں موجود تھیں ایک حضرت عمرؓ کی کہ مبتوتہ کے لیے نفقہ ہے اور دوسری تفسیر آں حضرتؐ کی لہٰذا امام احمدؒ نے اس حضرتؐ کی تفسیر کو اختیار کیا جیسا کہ ان کا مسلک تھا۔"

میں اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ پروفیسر ابوزہرہ نے ایسی لغو بات لکھی ہوگی لیکن اگر انھوں نے لکھی ہے تو بالکل غلط ہے پروفیسر ابوزہرہ سمجھ نہ سکے کہ ان کی اس بات کی زد کہاں کہاں پڑتی ہے۔ فاطمہ بنت قیس کی حدیث ہرگز کسی آیت کی تفسیر نہیں ہے کیونکہ اس کو تفسیر نبوی مان لینے کے بعد کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اس سے انحراف کرے۔۔۔ بحیثیت مجموعی کتاب بہت ہی قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ (ع۔ق)

(بقیہ صفحہ ۵) انسانی ترقی کے لیے مدرجہ مملکت اسلام معیار معیشت کے تفاوت اور افراد کی آزادی کو تسلیم کرتا ہے اسلامی مملکت میں کاشتکاروں اور مزدوروں پر ناروا پابندیاں نہیں عائد کی جائیں۔ وہ مدارج معیشت کی مساوات قائم کرنا نہیں چاہتا لیکن حق معیشت کی مساوات ضرور قائم کرتا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ سب یکساں مالدار ہوں، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہر ایک کے لیے سامانِ معیشت کا انتظام ہو اور ہر ایک کو معاشی اور معاشرتی حیثیت سے ترقی کے مواقع حاصل رہیں۔" (اشتراکیت اور اسلام)

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائیگی

(۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ غیر فروخت شدہ رسائل واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا البتہ ۵۰ یا زائد رسائل کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی دیا جائے گا۔

(۴) رسائل کی روانگی کا صرف ہمارے ذمہ ہوگا اور رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمہ ہوگا۔

(۵) رقم پیشگی آنی چاہیے یا رسائل بذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی میں مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر زندگی رامپور (یوپی)

اسلامی تعلیمات کا مرقع

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیرِ ادارت

مولانا امین احسن اصلاحی

نئے سال سے نئی آب و تاب کے ساتھ

دورِ جدید کا آغاز کر رہا ہے

۲۶×۲۰/۸ کے ۶۰ صفحات — سالانہ چندہ چھ روپے

— فی پرچہ دس آنے —

بھارت میں ترسیلِ زر کا پتہ :- ماہنامہ الفرقان - کچہری روڈ لکھنؤ

منیجر ماہنامہ میثاق ... لاہور

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد ۲۸
شمارہ ۴

شوال و ذیقعدہ ۱۳۸۱ھ
اپریل ۱۹۶۲ء

مدیر :- سید احمد عروج قادری

● خط و کتابت ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور ۔ یوپی

● زر سالانہ :- صہ ر شش ماہی :- تین روپیہ ۔ فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے

● ممالک غیر سے :- دس شلنگ انٹرنیشنل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں ۔

منیجر ہفت روزہ شہاب ۷/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

محمد حسن طابع و ناشر نے جماعت اسلامی ہند کی طرف سے ناظمی پریس با اہتمام نصر اللہ خاں میں چھپوا کر دفتر رسالہ زندگی رامپور یوپی سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

سید احمد عروج قادری

ظنِ غالب کے طور پر یہ بات پہلے سے معلوم تھی کہ اس تیسرے الکشن میں بھی کانگریس ہی برسراقتدار آجائے گی اس کی وجہ یہ ہے کہ اب تک کوئی ایسی شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آئی جو پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں سے زمام اقتدار چھین سکے۔ نتائج نے اس گمان کو صحیح ثابت کر دکھایا۔ بھارت کے راج سنگھاسن پر کانگرس پھر براجمان ہو گئی۔ البتہ یہ بات کانگرس کے سوچنے کی ہے کہ اس کے تختِ حکومت کے پائے اب بھی اتنے ہی مضبوط ہیں جتنے پہلے تھے، یا وہ بوسیدہ ہو کر ہلنے لگے ہیں، نتائج کی روشنی میں تو یہی دکھائی دیتا ہے کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ چکے ہیں اور صرف پنڈت جی کا سہارا اسے گرنے سے بچائے ہوئے ہے۔ اس کے وجوہ واسباب کیا ہیں؟ اس کا بھی صحیح جائزہ وہی لوگ لے سکتے ہیں جو اس پارٹی کے اندر اور باہر سے آگاہ ہیں۔ ہم اگرچہ اس پارٹی کے "اندرون وبیرون" سے پوری طرح باخبر نہیں، لیکن رہتا اسی ملک میں ہوں جس پر کانگرس حکومت کر رہی ہے چودہ سال سے اس کی حکومت کا مزا چکھتے ہوئے اور حالات کا مطالعہ کرتے ہوئے میرے ذہن نے اس کی نامقبولیت اور بوسیدگی کے دو سبب تشخیص کیے ہیں۔ پہلا سبب یہ کہ کانگرس اس ملک کو جس راستے پر لے جانا چاہتی ہے وہ باشندگان ملک کے اجتماعی ضمیر سے مناسبت نہیں رکھتا اور دوسرا یہ کہ وہ اپنے طویل عہدِ حکومت میں بھی اس ملک کی اقلیتوں اور بالخصوص مسلمانوں کو مطمئن نہیں کر سکی۔ بلکہ ان کا عدمِ اطمینان روز بروز ترقی پذیر ہے۔ اس تیسرے الکشن نے نظریاتی کش مکش اور عدمِ اطمینان کو بالکل نمایاں کر دیا ہے۔

اگر اچانک کوئی حادثہ پیش نہ آگیا تو پانچ سال تک کانگرس پھر حکمراں رہیگی۔ یہ پانچ سال اس پارٹی کے لیے فیصلہ کن ہوں گے، اس میں وہ اپنے رویے کو درست کر کے ازسرِنو تازہ دم بھی ہو سکتی ہے اور نشۂ غفلت میں مست ہو کر قریب المرگ بھی ہو سکتی ہے۔ ملک کا بھلا اسی میں ہے کہ وہ مدہوش نہ ہو اور اپنے رویے پر ایمان دارانہ نظرثانی کر کے اپنی کمزوری کے اسباب کو ختم کرنے کی کوشش کرے۔

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے انھوں نے اس الکشن میں بھی حصہ لیا اور شاید پہلے کے مقابلے میں زیادہ جوش اور سرگرمی سے حصہ لیا لیکن حاصل کیا نکلا؟ کیا ان کے مسائل میں سے کوئی مسئلہ بھی حل ہوا؟ کیا ان کی پوزیشن میں کوئی فرق واقع ہوا؟ یہ تو دور کی باتیں ہیں۔ کیا اسمبلیوں اور مرکزی پارلیمنٹ میں ان کی تعداد پہلے کے مقابلے میں کچھ بڑھی؟

ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت اپنے مسائل کو جس زاویۂ نظر سے دیکھنے کی عادی ہے، جب تک اس میں تبدیلی نہ ہو ان کی پوزیشن میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی۔ مسلمانوں کو مختلف حلقوں سے جو بات عرصۂ دراز سے سمجھائی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ ان کے لیے علیحدہ سے کوئی سیاسی تنظیم مفید ہونے کے بجائے سخت مضر ہوگی۔ ان کی انتہائی سعادت و فلاح تو اس میں ہے کہ وہ کانگریس کے خیمہ بردار بنے رہیں ورنہ کم سے کم درجہ یہ ہے کہ وہ بھارت کی کسی غیر فرقہ وارانہ پارٹی (یعنی جس کے دروازے مسلمان، سکھ اور عیسائی کے لیے بھی کھلے ہوئے ہوں) کے ساتھ مل کر کام کریں۔ مسلمانوں کو یہ مشورہ اگر صرف اکثریت کی طرف سے دیا جا رہا ہوتا تو حیرت کی کوئی بات نہ تھی کیونکہ اکثریت کو یہ مشورہ دینا ہی چاہیے لیکن حیرت اور افسوس اس پر ہے کہ خود مسلمانوں کے اکثر قائد و رہنما انہیں یہی بات سمجھاتے چلے آ رہے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ بھارت کے مسلمان سیاسی حیثیت سے انتہائی پراگندہ اور منتشر زندگی بسر کر رہے ہیں اور اس وسیع ملک میں ان کا کوئی وزن باقی نہیں رہا ہے۔ پانچ کروڑ تعداد رکھنے والی قوم کی یہ بے وزنی اور بے وقعتی ایک تاریخی المیہ سے کم نہیں ہے

ملت اسلامیہ کی جو اصل حیثیت ہے اس کے لحاظ سے بھی اور عقلی اعتبار سے بھی یہ مشورہ اول یوم سے غلط تھا اور غلط ہے لیکن اب تو ۱۴ سال کے تجربے نے بھی اس مشورے کی غلطی واضح کر دی ہے۔ کاش اب بھی رہبران قوم کی آنکھیں کھلتیں اور وہ اپنے مشورے پر نظر ثانی کی زحمت گوارا کرتے۔ یہ جو کچھ عرض کیا گیا اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ میں تقسیم سے پہلے جیسی کسی ایسی سیاسی تنظیم کا قائل ہوں جو اکثریت سے کش مکش کرنے والی ہو اور نہ اس کا مدعا یہ ہے کہ مسلمان رہنما جان بوجھ کر غلط مشورہ دے رہے ہیں بے شک کچھ ایسے لوگ بھی ہو سکتے ہیں جن کے سامنے ذاتی مفاد کے سوا اور کوئی چیز نہ ہو لیکن ان میں بہت سے ایسے ہیں جو مخلصانہ طور پر مسلمانوں کی بھلائی اسی میں دیکھتے ہیں اور ملت اسلامیہ کا تحفظ ہی ان کے مشورے اور عمل کا محرک ہے۔ ہمارا مدعا صرف اتنا ہے کہ اس پر کافی مدت تک عمل کیا جا چکا اب انہیں از سر نو اس پر غور کرنا چاہیے

اوپر کی گفتگو تو انتخابات اور دوٹوں کی سیاست کے لحاظ سے تھی لیکن جہاں تک خالص اسلامی سیاست کا تعلق ہے تو جماعت اسلامی ہند بیس بائیس سال سے امت مسلمہ کو جو حقیقت سمجھا رہی ہے وہ یہ ہے۔

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو — تو کجا بہرِ تماشا می روی

(اس کے بعد صفحہ ۳۴۹ پر ملاحظہ فرمائیے)

بعثتِ محمدی کا مقصد

سید احمد عروج قادری

(۱۳ مارچ ۱۹۶۲ء کو اجتماع حلقہ رامپور کی ایک نشست میں پڑھا گیا)

کسی جماعت میں نصب العین کو وہی اہمیت حاصل ہوتی ہے جو کسی دائرے میں مرکز و محور کی ہوتی ہے۔ نصب العین ہی افرادِ جماعت کو متحد الخیال، یکجا اور صف بند رکھتا ہے اور اس جماعت کا پروگرام اور اس کی تمام سعی و جہد اسی کے گرد گھومتی ہے۔ جماعت اسلامی ہند نے اپنے لیے جو نصب العین اختیار کیا ہے اس میں اس جماعت کے کسی فرد کی پسند ناپسند کا دخل نہیں ہے بلکہ اسے اس بات پر یقین حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کرام کو اور آخر میں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی نصب العین، اسی مشن اور اسی مقصد کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اب قیامت تک کے لیے ان کی نیابت میں امتِ محمدی کا یہی مقصدِ وجود ہے۔ اس طرح جماعت اسلامی ہند کے نصب العین کا رشتہ، آپ سے آپ بعثتِ محمدی کے مقصد سے جڑ جاتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ بعثتِ محمدی کا مقصد کیا تھا؟ اس سوال کا جواب، کتاب اللہ میں بھی موجود ہے، احادیثِ رسول میں بھی پایا جاتا ہے اور اسلامی تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ میں اس مقالے میں صرف ایک حدیث پیش کروں گا، لیکن اس سے پہلے کہ وہ حدیث پیش کی جائے، اسے اچھی طرح سمجھنے کے لیے چند نکات پر غور کر لینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) اللہ تعالیٰ، انسان کا خالق ہے اور یہ اس کی مخلوق، وہ اس کا معبود ہے اور یہ اس کا عبد، مخلوقیت اور عبدیت انسان کی اصل حقیقت ہے، لیکن سلطان کائنات نے اپنی اس مخلوق کو دنیا میں کیوں بھیجا ہے اور اپنی ناپیدا کنار سلطنت کے ایک بہت ہی چھوٹے ٹکڑے — زمین — میں اس کی کیا حیثیت مقرر کی ہے؟ اس سوال کا صحیح جواب، زندگی کا رویہ متعین کرنے اور راہ راست پانے کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم کی ابتدا ہی میں انسان کی تخلیق اور اس کی حیثیت کے بارے میں واضح رہنمائی کی گئی ہے اور وحی الٰہی نے ایک ایسی بات بتا دی ہے جسے انسان بطور خود کسی ذریعہ سے نہ جان سکتا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ دنیا میں انسان کی حیثیت یہ ہے کہ وہ اللہ رب العٰلمین کا خلیفہ ہے۔ عبدیت اس کی

حقیقت اور نیابت الٰہی اس کی حیثیت ہے۔ اللہ کے بھیجے ہوئے دین و شریعت کی تنفیذ اور دنیا کی اصلاح اس کی ڈیوٹی ہے۔ انفرادی و اجتماعی زندگی میں احکام الٰہی کی اطاعت و بندگی اس کا فریضہ ہے۔ یہی وہ جامع و سیع اور ہمہ گیر فریضۂ حیات ہے جس کے لیے جن و انس کی تخلیق ہوئی ہے۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ٥ (اور میں نے جن و انس کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے) یہ بات مسلّم ہے کہ قرآن میں کسی نوع کا کوئی تضاد یا اختلاف بیانی موجود نہیں ہے اس لیے اس آیت میں عبادت کا کوئی ایسا محدود مفہوم لینا جو انسان کی حیثیت نیابت الٰہی سے متصادم ہو صحیح نہیں ہے۔ انسان اپنی اصل حقیقت کے لحاظ سے خدا کی پرستش پر مامور ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس چیز میں وہ خدا کا نائب نہیں ہو سکتا، اسے نیابت تو اس چیز میں ملی ہے جو اصلاً خدا کا کام اور تنہا اسی کا حق ہے لیکن اس نے انسان کی آزمائش کے لیے اس کام میں اسے اپنا نائب اور خلیفہ مقرر کیا ہے یہ کام کیا ہے؟ دنیا میں اللہ کی تشریعی حکومت قائم کرنا یا دوسرے لفظوں میں اقامت دین، اسلامی حکومت کو خلافت اسی وجہ سے کہتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی حیثیت اس کے سوا کچھ نہیں ہوتی کہ وہ نیابۃً اللہ کے احکام اس کی سلطنت میں نافذ کرتی ہے۔ جن لوگوں نے اس آیت میں عبادت کا مفہوم صرف پرستش میں محدود کر دیا ہے انھوں نے سخت دھوکا کھایا ہے۔ یہاں عبادت کا لفظ اللہ کی اطاعت کاملہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے جس میں پرستش بھی داخل ہے۔ غلامانہ اطاعت، لفظ عبادت کا جوہری اور مرکزی معنی ہے۔ اس کے دوسرے تمام معانی اسی اصل معنی کے گرد گھومتے ہیں، بلکہ فقہی اصطلاح کے "عبادات" میں نصوص شرع کی اطاعت "معاملات" سے بھی زیادہ سخت ہے کیونکہ عبادات کی سرحد میں قیاس و اجتہاد کو داخلے کی اجازت نہیں ہے۔

اگر کوئی سوال کرے کہ جب لفظ عبادت کا جوہری معنی اطاعت ہے تو اس آیت میں یہی لفظ کیوں نہ اختیار کیا گیا ― لِيَعْبُدُوْنِ کے بجائے لِيُطِيْعُوْنِ کہا جا سکتا تھا۔ اس کا اجمالی اور مختصر جواب یہ ہے کہ عبادت صرف اطاعت کو نہیں بلکہ اس غلامانہ اطاعت کو کہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے اور اس تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اس میں مغلوبیت، مقہوریت، سرافگندگی، افتادگی اور پامالی و پستی کا مفہوم داخل ہے اور اسی مفہوم کی بنا پر محض پرستش یعنی کسی کے سامنے سجدہ ریز ہونے اور مراسم عبودیت ادا کرنے کو بھی عبادت کہتے ہیں۔ جب جن و انس کی تخلیق کا مقصد صرف خدا کی غلامانہ اطاعت ہے تو اس کے لیے وہی لفظ استعمال کرنا مناسب تھا جو خدا کے لیے مخصوص ہے۔ غلامانہ اطاعت صرف خدا کا حق ہے اور وہ اپنے بندوں سے اسی طرح کی اطاعت کا مطالبہ بھی کرتا ہے۔ اب اگر اللہ کا کوئی باغی بندہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں سے اپنی ایسی ہی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے یا انہیں اس پر مجبور کرتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ ان سے اپنی عبادت کرا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے جواب میں فرمایا تھا:۔

وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (شعراء ر۲)

اور یہ نعمت ہے جس کا تو مجھ پر احسان رکھتا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنا لیا ہے

اور خود فرعون نے گھمنڈ میں کہا تھا۔ وَقَوْمُهُمَا لَنَا عَابِدُوْنَ۔ اور موسیٰ و ہارون کی قوم ہماری غلام ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں اللہ نے صرف اپنی بندگی و اطاعت کا مطالبہ کیا ہے وہاں عبادت کا لفظ استعمال فرمایا ہے اور جہاں اپنی اطاعت کے ماتحت دوسروں کی اطاعت کا بھی حکم دیا ہے وہاں عبادت کے بجائے اطاعت کا لفظ استعمال کیا ہے مثلاً

اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے حاکموں کی

اور یہی وجہ ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے بھٹکے ہوئے انسانوں کو خدا کی فرماں برداری کی طرف بلانے کے لیے عبادت کا لفظ اختیار کیا ہے اور اپنی فرماں برداری کی طرف دعوت دینے کے لیے اطاعت کا لفظ اختیار کیا ہے۔ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے فرمایا تھا:۔

اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَاتَّقُوْهُ وَاَطِيْعُوْنِ

اللہ کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ میں عبادت کا لفظ کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ سورۂ حج میں فرمایا گیا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ

اے مومنو! رکوع کرو، سجدہ کرو اور اپنے رب کی عبادت کرو۔

رکوع اور سجدہ کے بعد عبادت کا حکم صاف بتا رہا ہے کہ پرستش کے بعد زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی اطاعت کرنے کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ آیت زیر بحث وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ میں عبادت کو اصطلاح فقہاء کے "عبادات" میں محصور کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس ذہن کے لوگوں نے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے مقصد کو بھی محدود کر دیا ہے۔ ان کا خیال یہ ہے کہ انبیاءؑ اس لیے بھیجے گئے تھے کہ لوگوں کو بتوں کی پرستش سے ہٹائیں، ملک میں رائج نظام باطل کو بدلنے کا کام یا تو سرے سے ان کے سپرد ہی نہ ہوتا تھا یا اگر ہوتا تھا تو اس کی حیثیت محض ضمنی اور ثانوی تھی۔ ایسے لوگ قرآن سے ذخیرۂ احادیث سے اسوۂ رسول سے اور سیرتِ صحابہ سے یا تو اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں یا پھر عجیب و غریب تاویلات سے پورے ذخیرے کو اپنے نظریے کے گرد گھمانے کی سعی کرتے ہیں۔

(۲) یہ بات اپنی جگہ مسلّم ہے کہ ہر نبی کی امت کا مقصدِ زیست، فریضۂ حیات اور نصب العین وہی ہوتا ہے جو خود اس نبی کا رہا ہے۔ نبی کی وفات کے بعد ان پر ایمان لانے والے لوگ اس بات کے ذمہ دار ہوتے ہیں کہ وہ اس مشن کو جاری رکھیں جس

کے لیے اللہ نے اپنا رسول مبعوث کیا تھا۔ قرآن کریم نے انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کے مقاصد اور ان کے فرائض متعدد مقامات میں الگ الگ بیان کیے ہیں اور متنوع تعبیرات اختیار کی ہیں اور پھر ان سب کو سمیٹنے کے لیے اس نے دو اصطلاحیں استعمال کی ہیں :- اقامتِ دین اور اظہارِ دین، یعنی دینِ حق کو قائم کرنا اور اسے تمام ادیانِ باطلہ پر غالب کرنا۔ سورۂ شوریٰ میں اقامتِ دین کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے وہاں سیدنا محمد رسول اللہ کے ساتھ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے نام لیکر اللہ نے بتایا ہے کہ ہم نے ان سب کی طرف جو وحی بھیجی ہے اور انہیں جو وصیت کی ہے وہ یہ ہے کہ "دین کو قائم کرو اور اس میں اختلاف نہ ڈالو"۔ توبہ، فتح اور صف کی سورتوں میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقصدِ بعثت کو اظہارِ دین کی جامع اصطلاح میں واضح کیا گیا ہے۔ یہ اقامتِ دین ہی کی دوسری جامع تعبیر ہے ان آیتوں میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت اور دینِ حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ دینِ حق کو دوسرے تمام ادیان پر غالب کر دیا جائے۔

(۳) حضورؐ کا مقصدِ بعثت معلوم ہو جانے کے بعد یہ بات آپ سے آپ طے ہو جاتی ہے کہ امتِ مسلمہ کا مقصدِ وجود اور نصب العین بھی اقامتِ دین کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔

ان چند نکات کی طرف مختصر اشارے کے بعد اب وہ حدیث پڑھنی چاہیے جسے پیش کرنا اس مقالے کی اصل غرض ہے:-

عَنْ عَطَاءِ بْنِ يَسَارٍ قَالَ لَقِيْتُ عَبْدَ اللّٰهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا قُلْتُ اَخْبِرْنِيْ عَنْ صِفَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي التَّوْرَاةِ قَالَ اَجَلْ وَاللّٰهِ اِنَّهٗ لَمَوْصُوْفٌ فِي التَّوْرَاةِ بِبَعْضِ صِفَتِهٖ فِي الْقُرْاٰنِ۔ يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا قَالَ فِي التَّوْرَاةِ يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا وَّحِرْزًا لِّلْاُمِّيِّيْنَ اَنْتَ عَبْدِيْ وَرَسُوْلِيْ سَمَّيْتُكَ الْمُتَوَكِّلَ

عطاء بن یسار کہتے ہیں کہ میں نے عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے ملاقات کی اور ان سے کہا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صفت بتائیے جو توریت میں ہو۔ انھوں نے کہا ہاں، بخدا توراۃ میں بھی آپ کی بعض وہ صفات آئی ہیں جو قرآن میں ہیں۔ اے نبی! ہم نے تم کو گواہ اور خوش خبری سنانے والا اور ڈرانے والا اور امیوں کا ملجا و ماویٰ بنا کر بھیجا ہے تم میرے بندے اور رسول ہو۔ میں نے تمہارا نام متوکل (اللہ پر بھروسا رکھنے والا) رکھا ہے وہ درشت خو اور سنگدل نہ ہوں گے اور بازاروں میں شور نہ مچائیں گے اور نہ برائی کو برائی سے دور کریں گے، بلکہ معاف کر دیں گے

لَیْسَ بِفَظٍّ وَّ لَا غَلِیْظٍ وَّلَا سَخَّابٍ فِی	اور لوگوں کے قصور بخشیں گے' اللہ اس وقت تک ان کی
الْاَسْوَاقِ وَلَا یَدْفَعُ السَّیِّئَۃَ بِالسَّیِّئَۃِ وَ	روح قبض نہ کریگا جب تک ان کے ذریعہ کج دین کو سیدھا
لٰکِنْ یَعْفُوْ وَیَغْفِرُ وَلَنْ یَقْبِضَہٗ حَتّٰی یُقِیْمَ	نہ کریگا اس طرح کہ لوگ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہنے لگیں
بِہِ الْمِلَّۃَ الْعَوْجَاءَ بِاَنْ یَّقُوْلُوْا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ	پس وہ اس دین مستقیم کے ذریعہ بہت سی اندھی آنکھوں'
فَیَفْتَحُ بِہَا اَعْیُنًا عُمْیًا وَّاٰذَانًا صُمًّا وَّقُلُوْبًا غُلْفًا	بہرے کانوں اور بند دلوں کو کھولے گا۔

یہ حدیث امام بخاری ؒ نے اپنی صحیح میں دو جگہ روایت کی ہے۔ کتاب البیوع اور کتاب التفسیر میں۔ میں نے اوپر کتاب البیوع کی حدیث کے الفاظ نقل کیے ہیں۔ صحیح بخاری کے علاوہ یہ حدیث انھوں نے الادب المفرد (باب الانبساط الی الناس) میں بھی روایت کی ہے۔ امام احمدؒ اور امام طبرانی ؒ نے بھی عبداللہ بن عمروؓ سے روایت کی ہے۔ امام دارمیؒ نے حضرت کعبؓ اور عبداللہ بن سلامؓ سے یہ حدیث روایت کی ہے:۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ نے توریت کے حوالہ سے مختصراً جو باتیں بیان کی ہیں وہ سفر یسعیاہ میں مفصلاً موجود ہیں۔ یہاں اس کی تمام عبارتوں کو نقل کرنا موجب طوالت ہے' میں چند اقتباسات پیش کرتا ہوں:۔

"دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا ہوں' میرا برگزیدہ' جس سے میرا جی راضی ہے میں نے اپنی روح اس پر رکھی' وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا' وہ نہ چلائے گا اور نہ اپنی صدا بلند کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے اس وقت تک اس کا زوال نہ ہوگا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے اور بحری ممالک اس کی شریعت کی راہ تکیں۔ ...... میں خداوند تجھے صداقت کے لیے بلایا' میں ہی تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور میں تجھ کو لوگوں کے لیے عہد اور قوموں کے لیے نور بناؤں گا کہ تو اندھوں کی آنکھیں کھولے اور بند ہوؤں کو قید سے نکالے اور ان کو جو اندھیرے میں بیٹھے ہیں قید خانہ سے چھڑائے .... اے بحری ممالک اور اس کے باشندو! تم زمین پر سرتاسر اس کی ستائش کرو۔ بیابان اور اس کی بستیاں' قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔ سلع کے بسنے والے ایک گیت گائیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے للکاریں گے وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے اور بحری ممالک میں اس کی ثنا خوانی کریں گے' خداوند ایک بہادر کی مانند نکلے گا' وہ جنگی مرد کی مانند اپنی غیرت کو اکسائے گا' وہ چلائے گا' ہاں وہ جنگ کے لیے بلائے گا اور اپنے دشمنوں پر غالب ہوگا اور اندھوں کو اس راہ سے کہ جسے وہ نہیں جانتے لے جاؤں گا میں انہیں ان رستوں پر جن سے وہ آگاہ نہیں لے چلوں گا .... وہ شریعت کو بزرگی دے گا اور عزت بخشے گا (باب ۴۲)

(اس کے بعد صفحہ ۶۳ پر ملاحظہ فرمایئے)

خدا کی صفات

مولینا سید جلال الدین عمری

خدا کی ذات کا شعور ہمیں اس کی صفات سے ہوتا ہے۔ خدا کا مجرد تصور ممکن نہیں البتہ اس کی صفات کی مدد سے ہم اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ خدا کی ذات کا ہم اس کی صفات سے الگ کوئی تصور نہیں رکھتے۔ جب بھی ہم اس کا تصور کرتے ہیں تو کچھ صفات ہمارے سامنے ہوتی ہیں۔ خدا کی ذات ہمارے ذہن کی دسترس سے بہت دور ہے لیکن اگر ہم خدا کو اس کی صفات کی روشنی میں سمجھنا چاہیں تو وہ ہم سے بہت قریب ہو جاتا ہے اور ہم اس کو بولتا ہوا، محبت کرتا ہوا، ہماری طرف دیکھتا ہوا اور ہماری باتیں سنتا ہوا پاتے ہیں۔ اس کی صفات کی وجہ سے ہم اس کے خوف سے کانپتے ہیں اور اس کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں۔ اس طرح اصلاً ہم کو خدا کی صفات کا شعور ملتا ہے لیکن صفات کا شعور ہمارے اندر خدا کی ذات اور اس کے وجود کا یقین پیدا کرتا ہے۔ کیونکہ صفات کسی وجود ہی میں پائے جائیں گے۔ محبت، نفرت، علم، ارادہ، قوت کسی بھی صفت کا اپنا کوئی مستقل وجود نہیں ہے بلکہ ہر صفت کسی نہ کسی وجود کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے۔

فلسفہ کی دنیا میں یہ بحث بہت پہلے سے چل رہی ہے کہ وجود کیا صرف صفات کا مجموعہ ہے یا صفات کے علاوہ بھی اس کی کوئی ہستی ہے؟ لیکن اتنی بات طے ہے کہ ہر وجود اپنی ایک صورت رکھتا ہے۔ جب ہم اس کو دیکھنا چاہتے ہیں تو ہماری نظر اس کی اسی صورت پر پڑتی ہے۔ صورت کے بغیر نہ ہم اس کو دیکھ سکتے ہیں اور نہ اس میں اور دوسرے وجود میں فرق کر سکتے ہیں۔ انسان، حیوان، درخت اور پہاڑ کا جو فرق ہم کرتے ہیں وہ صفات ہی کی بنا پر ہے۔ صفات کو اگر مٹا دیا جائے تو یہ فرق بھی مٹ جائے گا۔ اشیاء کے درمیان فرق و امتیاز ہمارا ایک ذہنی عمل ہے۔ اور ذہن صفات ہی کے ذریعہ اشیاء کا تصور اور ان کے درمیان فرق و امتیاز کرتا ہے۔ آپ خارج کی دنیا سے ہٹ کر کسی چیز کو ذہن میں لائیے تو بھی لازماً اس کا کوئی نہ کوئی رنگ ہوگا، طول و عرض ہوگا، اور شکل و صورت ہوگی۔ اگر آپ ان خصوصیات کے بغیر کسی چیز کا تصور کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔

آپ ایک ایسے انسان کا فرضی نقشہ الفاظ میں کھینچ تو سکتے ہیں جو ہر صفت سے خالی ہو لیکن نہ تو واقعات کی دنیا میں اس کا کوئی وجود ہوگا اور نہ آپ ذہنی طور پر اس کا تصور کر سکیں گے۔ جب بھی وہ پایا جائے گا اپنے اندر چند صفات ضرور لیے ہوئے ہوگا۔

خدا کی صفات کا جس قدر صحیح اور واضح علم ہمیں حاصل ہوگا اسی قدر صحت اور وضاحت کے ساتھ ہم خدا کی ذات کا تصور کر سکیں گے اور خدا اور مخلوق کا فرق و امتیاز ہمیں معلوم ہوگا۔ خدا کی صفات کو سمجھنے میں ہم نے ٹھوکر کھائی تو خدا کی اصل حقیقت ہم پر کھل نہیں سکتی۔ اور نہ ہم خدا کی عظمت اور بلندی کا صحیح احساس کر سکتے ہیں۔ اس لیے خدا کے بارے میں ہمارا مطالعہ ناقص اور ادھورا رہے گا جب تک ہم اس کی صفات پر غور و فکر مکمل نہ کر لیں۔

خدا کی صفات کیا ہیں

خدا اس کائنات کا خالق ہے اگر اس حقیقت پر ہمارا یقین ہے تو محض یہ یقین خدا کی بہت سی صفات کا ہمارے اندر یقین پیدا کرتا ہے۔ خدا کو خالق ماننے کے بعد ہم یہ ماننے پر مجبور ہیں کہ وہ قوت اور طاقت رکھتا ہے کیونکہ قوت کے بغیر تخلیق کا تصور بے معنی ہے۔ اسی طرح تخلیق کے لیے شعور اور ارادہ ضروری ہے اس لیے تسلیم کرنا پڑے گا کہ خدا شعور اور ارادہ سے متصف ہے۔ ماننا پڑے گا کہ خدا کو اپنی مخلوق سے محبت ہے کیونکہ محبت کے بغیر وہ اپنی مخلوق پر مسلسل احسان نہیں کر سکتا۔ تخلیق کا عمل، علم اور حکمت چاہتا ہے کیونکہ علم و حکمت کے بغیر تخلیق میں حُسن و خوبی نہیں پیدا ہو سکتی۔ اس لیے خدا خالق ہے تو یقیناً وہ علیم اور حکیم بھی ہے۔ یہ ان صفات میں سے چند ہیں جو خدا کو خالق ماننے کے نتیجے میں ابھر کر سامنے آتی ہیں اور ان میں سے ہر صفت دوسرے بے شمار صفات کا تقاضا کرتی ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:۔

اذا عرف انہ الخالق فمن المعلوم	جب یہ معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ خالق ہے تو
بالضرورۃ ان الخالق لا یکون	ظاہر بات ہو کہ خالق لازماً قدرت بھی رکھتا ہوگا بلکہ
الا قادرًا بل کل فعل یفعلہ فاعل	ہر وہ فعل جس کو کوئی شخص انجام دیتا ہے اس کو قوت
لا یکون الا بقوۃ وقدرۃ	اور قدرت ہی سے انجام دیا جا سکتا ہے ......
والخلق اعظم الافعال فانہ لا یقدر	اور تخلیق تو سب سے بڑا فعل ہے کیونکہ اس پر سوائے
علیہ الا اللہ فالقدرۃ علیہ	خدا کے اور کوئی قادر نہیں ہے۔ اس لیے تخلیق کی
اعظم من کل قدرۃ ولیس	قدرت سب سے بڑی قدرت ہے۔ مخلوق کی قدرت

لها نظير من قدر المخلوقين
.... ان الخلق يستلزم الارادة
فان فعل الشيء على صفة مخصوصة
ومقدار مخصوص دون ما هو
خلاف ذالك لا يكون الا بارادة
تخصص هذا عن ذالك والارادة
تستلزم العلم فلا يريد المريد
الا ما شعر به وتصور في نفسه
والارادة بدون الشعور ممتنعة
وايضا فنفس الخلق، خلق الانسان
هو فعل لهذا الانسان الذي هو
من عجائب المخلوقات وفيه من
الاحكام والاتقان ما تبهر به
العقول والفعل المحكم المتقن
لا يكون الا من عالم بما فعل
وهذا معلوم بالضرورة - فالخلق
يدل على العلم من هذا الوجه
ومن هذا الوجه .... ثم اذا
ثبت انه قادر عالم فذالك يستلزم
كونه حيا وكذالك الارادة تستلزم
الحياة والحي اذا لم يكن
سميعا بصيرا متكلما كان متصفا
بضد ذالك من العمى والصمم والخرس

ہیں اس کی کوئی مثال موجود نہیں ہے ....
یہ ایک حقیقت ہے کہ تخلیق کے لیے ارادہ ضروری
ہے کیونکہ کسی کام کو مخصوص صفت اور مخصوص مقدار
میں انجام دینا اور اس کی مخالف صورت میں انجام
نہ دینا ارادہ کے بغیر ممکن نہیں، جو اس خاص حالت
کو اس کی مخالف حالت پر ترجیح دے۔ ارادہ کے
لیے علم ضروری ہے کیونکہ کوئی بھی شخص ارادہ اسی
چیز کا کرتا ہے جس کو وہ محسوس کرتا ہے اور اپنے
اندرون میں اس کا تصور کرتا ہے۔ اس لیے شعور کے بغیر
ارادہ ممکن نہیں۔ نیز نفس تخلیق، خاص طور پر انسان کی تخلیق
جو کہ ایک عجیب تر مخلوق ہے جس کے اندر ایسا احکام اور
مضبوطی پائی جاتی ہے کہ عقل مبہوت رہ جاتی ہے،
بغیر علم کے ممکن نہیں کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ کوئی
محکم اور مضبوط عمل ایسے صاحب علم ہی سے انجام پا سکتا
ہے جو اپنے کام کو جانتا ہو۔ پس اس طرح تخلیق کا عمل
ارادہ اور احکام دونوں پہلوؤں سے علم پر دلالت
کرتا ہے .... پھر جب یہ بات ثابت ہوگئی
کہ خدائے تعالیٰ قادر ہے اور عالم ہے تو اس سے
لازم آتا ہے کہ وہ زندہ ہو۔ اسی طرح ارادہ بھی حیات کو
چاہتا ہے۔ اگر وہ زندہ ہے اور سمیع و بصیر اور متکلم نہیں
ہے تو لازماً اندھا، بہرا اور گونگا ہوگا۔ خدا کے بارے
میں یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ
وہ سننے اور دیکھنے اور بولنے کی طاقت رکھتا ہے۔ ارادہ

وهذا ممتنع فی حق الرب تعالیٰ فیجب ان یتصف بکونه سمیعا بصیرا متکلما وارادة اما ان تکون لغایة حکیمة او لا فان لم تکن لغایة حکیمة کانت سفها وهو منزه عن ذالك فیجب ان یکون حکیما وهو اما ان یقصد نفع الخلق والاحسان الیهم او یقصد مجرد ضررهم وتعذیبهم او لا یقصد واحدا منهما بل یرید ما یرید سواء کان کذا او کذا والثانی شریر ظالم ینزه الرب عنه والثالث سفیه عابث فتعین انه تعالیٰ رحیم کما انه حکیم[1]

یا تو کسی انتہائی حکمت کے تحت ہوگا یا اس کے پیچھے کوئی حکمت نہ ہوگی اور اگر وہ حکمت سے خالی ہو تو یہ بے وقوفی ہے اور خدا اس سے پاک ہے اس لیے ضروری ہے کہ خدا حکیم ہو۔ وہ مخلوق کے لیے نفع اور ان پر احسان کا ارادہ کرے گا یا اس کا ارادہ ان کو نقصان پہنچانے اور سزا دینے کا ہوگا یا ان میں سے کوئی بھی ارادہ نہ ہو بلکہ جو ارادہ چاہے کرے گا خواہ نفع کا ہو یا نقصان کا۔ دوسری صورت میں وہ شریر اور ظالم قرار دیا جائے گا جس سے خدا کی ذات پاک ہے تیسری صورت میں وہ لاغی اور بے وقوف ہوگا (نعوذ باللہ) اس سے ثابت ہوا کہ صرف پہلی صورت صحیح ہے یعنی یہ کہ وہ رحیم ہے جیسا کہ وہ حکیم ہے۔

مسلمان متکلمین نے لکھا ہے کہ صفات دو قسم کی ہیں۔ کچھ صفات تو ازلی و ابدی ہیں، جن کے بغیر خدا کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا اور کچھ صفات وہ ہیں جن کا علم ہمیں خدا کے افعال سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر خدا کا رازق و خالق ہونا۔ عزت دینے والا اور ذلت دینے والا ہونا ان صفات کا تعلق خدا کے افعال سے ہے اور جب تک ان افعال کا ظہور نہ ہو انسان کو ان کا علم نہیں ہو سکتا۔ خدا کی ازلی و ابدی صفات متکلمین کے نزدیک سات ہیں۔ قدرت، علم، حیات، ارادہ، سمع و بصر اور کلام۔ جب سے خدا ہے، یہ صفات بھی اس کے اندر موجود ہیں ان صفات کے بغیر خدا کا وجود ایک فرضی وجود ہوگا۔ یا وہ ایسا ناقص خدا ہوگا، جس میں خالق کائنات بننے کی صلاحیت نہ ہوگی اور وہ عام انسانی عقل کے لیے قابل قبول نہ ہوگا۔[2]

متکلمین نے جن صفات کا ذکر کیا ہے، قرآن و حدیث میں ان سے بہت زیادہ صفات کا ذکر ہے اور اس طرح ذکر ہے گویا وہ خدا کی لازمی صفات ہیں متکلمین کہتے ہیں کہ ان سات صفات کو ہم "نقل" کا سہارا لیے

---

[1] مجموعۃ تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ صفحہ ۲۸۷، ۲۸۵

[2] الاقتصاد فی الاعتقاد ص۳۵ بعض متکلمین کے نزدیک ازلی و ابدی صفات، سات سے زیادہ ہیں، ملاحظہ ہو شرح مقاصد جلد ۲ ص ۸۲-۹۷ متکلمین کے نزدیک اس امر میں بھی اختلاف ہے کہ ان تمام صفات کا علم عقل کے ذریعہ ہوتا ہے یا ان کو جاننے کے لیے وحی کی ضرورت ہے۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل "شرح العقیدۃ الاصفہانیہ" ص۳۷ میں دیکھی جا سکتی ہے۔

بغیر عقل سے ثابت کر سکتے ہیں، کیونکہ خدا ہے تو لازماً اس کو ان صفات سے متصف ماننا پڑے گا۔ اس لیے یہ سات صفات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کو تسلیم کیے بغیر خدا کی مزید صفات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا اور ان کو مان لینے کے بعد خدا کو ان تمام صفات سے متصف مانا جا سکتا ہے جن کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے۔ امام ابن تیمیہ کو متکلمین کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ فرماتے ہیں:۔

ولا ريب ان ما اثبته هؤلاء الصفاتية[1] من صفات الله تعالى ثابت بالشرع مع العقل وهو متفق عليه بين سلف الامة وخلفها وانما خصوا هذه الصفات بالذكر دون غيرها لانها هي التي دل العقل عليها عندهم كما نبه عليه المصنف ولكن لا يلزم من عدم الدليل المعين عدم المدلول فلا يلزم نفي ما سوى هذه الصفات ومع قد اثبت صفات اخرى وايضا فان الرازي ونحوه ممن لم يثبت السمع طريقا الى اثبات الصفات ولا نزاع بينهم انه طريق صحيح لكن يفرقون بين ما اثبتوه

اس میں شک نہیں کہ قائلین صفات نے اللہ تعالیٰ کی جن صفات کو ثابت کیا ہے وہ شریعت اور عقل سے ثابت ہیں اور ان پر امت کے سلف اور خلف دونوں کا اتفاق ہے لیکن وہ اس لیے ان ہی چند صفات کا ذکر کرتے ہیں اور دوسری صفات کا ذکر نہیں کرتے۔ کہ ان کے نزدیک عقل ان ہی صفات پر دلالت کرتی ہے جیسا کہ مصنف[1] نے اشارہ کیا ہے لیکن معین دلیل کے نہ ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ واقعتاً مدلول کا وجود بھی نہیں ہے۔ اس لیے یہ صحیح نہ ہوگا کہ ہم ان مخصوص صفات کے علاوہ دوسری صفات کی نفی کر دیں جب کہ "سمع" (قرآن و حدیث) سے دوسری صفات ثابت ہیں۔ نیز امام رازی اور ان کے ہم خیال لوگوں کے نزدیک "سمع" سے صفات ثابت نہیں کی جا سکتیں (اس لیے اس نقطۂ نظر کے مطابق عقل ہی سے صفات کا اثبات ہو سکتا ہے) ان کے درمیان

---

[1] اس سے مراد محمد بن محمود بن محمد بن عباد العجلی ہیں، جو عام طور پر شمس الدین الاصفہانی کہے جاتے ہیں۔ یہ ۶۱۶ھ میں اصفہان میں پیدا ہوئے اور ۶۸۸ھ میں وفات پائی اور بمقام قرافہ دفن ہوئے۔ یہ صاحب تصانیف اور اپنے وقت کے بہت قابل انسان تھے۔ عقائد پر ان کا ایک مختصر سا رسالہ ہے جو [illegible] ایک صفحہ میں لکھا جا سکتا ہے۔ امام ابن تیمیہ نے بڑے سائز کے [illegible] صفحات میں اس کی شرح کی ہے۔ اس شرح کو عقائد پر خالص اسلامی رنگ میں بحث کرنے والی سب سے [illegible] اور قابل اعتماد کتاب سمجھنا چاہیے۔ [illegible]

وبين ما توقفوا في ثبوته بان العقل دل على ما اثبتناه ولم يدل على ما توقفنا فيه ثم فيما لم يثبتوه طريقان منهم من نفاه ومنهم من توقف فيه فلم يحكم فيه باثبات ولا نفي وهذه طريقة محققيهم كالرازي والآمدي وغيرهما بل ومن الناس من يثبت صفات اخرى بالعقل فالذي اتفق عليه سلف الامة وائمتها ان يوصف الله بما وصف به نفسه وبما وصفه به رسوله من غير تحريف ولا تعطيل ومن غير تكييف ولا تمثيل [1]

میں کوئی اختلاف نہیں ہو کہ سمع ایک صحیح طریقہ ہو لیکن جن صفات کو انھوں نے ثابت کیا ہے اور جن کے ثبوت کے بارے میں توقف کیا ہے، ان دونوں کے درمیان وہ فرق کرتے ہیں کہ جن صفات کو ہم ثابت کرتے ہیں عقل اُن پر دلالت کرتی ہے اور جن صفات کے بارے میں ہم توقف کرتے ہیں عقل ان پر دلالت نہیں کرتی۔ جو صفات ان کے نزدیک ثابت نہیں ہیں ان کے بارے میں ان کے دو نقطۂ نظر ہیں بعض نے سرے سے ان کی نفی کر دی ہے اور بعض نے توقف اختیار کیا ہے نہ تو اثبات کا فیصلہ کیا ہے اور نہ نفی کا اور یہی ان کے محققین مثلاً امام رازی اور علامہ آمدی وغیرہ کا طریقہ ہے بلکہ جن صفات کا یہ متکلمین ذکر کرتے ہیں ان کے علاوہ بھی بہت سی دوسری صفات کو بعض لوگوں نے عقل سے ثابت کیا ہے۔ وہ بات جس پر امت کے اسلاف اور ائمہ نے اتفاق کیا ہے یہ ہے کہ اللہ کو ان صفات سے متصف مانا جائے جن سے خود اس نے اپنے آپ کو متصف کیا ہے یا اس کے رسول نے جن صفات کا اس کو حامل بتایا ہے بغیر کسی تحریف و تعطیل (خدا کو صفات سے معطل قرار دینا) کے اور بغیر اس کے کہ ان کی کیفیت متعین کی جائے یا ان کی تمثیل بیان کی جائے۔

آگے چل کر فرماتے ہیں:-

وليس لقائل ان يقول انما

کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان صفات کی تخصیص

[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ صفحہ ۴

خصصت هذہ الصفات بالذکر لان السمع موقوف علیها دون غیرها فان الامر لیس کذلک لان التصدیق بالسمعیات لیس موقوفا علی اثبات السمع والبصر ونحو ذالک[1]	اس لیے کی گئی ہے کہ "سمع" (قرآن وحدیث کی تصریحات کا سمجھنا اور ماننا) صرف ان ہی پر موقوف ہو کسی دوسری صفت پر موقوف نہیں ہو کیونکہ واقعہ یہ نہیں ہے سمعیات کی تصدیق سمع وبصر وغیرہ کے اثبات پر موقوف نہیں ہے۔

بحث کے خاتمہ پر فرماتے ہیں:۔

وانما المقصود هنا التنبیه علی ان ما یجب اثباته لله تعالی من الصفات لیس مقصورا علی ما ذکرہ هؤلاء مع اثباتهم بعض صفات بالعقل وبعضها بالسمع[2]	یہاں صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے جن صفات کا ثابت کرنا ضروری ہو وہ وہی چند صفات نہیں ہیں جن کا متکلمین نے ذکر کیا ہے اور جن میں سے بعض کو وہ عقل سے اور بعض کو "سمع" (نقل) سے ثابت کرتے ہیں۔

امام غزالیؒ نے متکلمین کی عام راہ سے کسی قدر ہٹ کر صفات کے مسئلہ کو سلجھانے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ صلا

[2] ایضاً صفحہ ۱۲ اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی صفات کیا ہیں؟ اور جو صفات ہیں وہ عین ذات ہیں یا غیر ذات؟ پھر ان میں سلبی و اضافی صفات کیا ہیں اور ثبوتی صفات کیا ہیں؟ فلاسفہ اور معتزلہ کے نزدیک صفات عین ذات ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ اگر صفات کو خدا کی ذات سے الگ مانا جائے اور ان کو ازلی قرار دیا جائے تو گویا صرف خدا کی ذات ازلی یا باصطلاح فلسفہ "قدیم" نہیں رہی بلکہ کچھ اور چیزیں بھی قدیم ہوئیں اس سے تعدد قدما لازم آتا ہے۔ حالانکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ قدیم صرف خدا کی ذات ہو۔ اور اگر صفات کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ قدیم نہیں ہیں بلکہ بعد میں خدا کے اندر پیدا ہوئی ہیں تو فلسفہ کی اصطلاح میں خدا "محل حوادث" ہوتا ہے یعنی اس پر واقعات حالات اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں جس طرح مخلوق پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ یہ اگر مان لیا جائے تو خدا "قدیم" نہیں رہتا۔ اشاعرہ متکلمین ان اعتراضات کو تسلیم نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک صفات زائد از ذات اور ازلی ہیں اور وہ مذکورہ بالا صفات کو ثبوتی صفات مانتے ہیں۔ اس بحث کو طے کرنے کے لیے عقلی دلائل کی ضرورت تھی لیکن متکلمین نے قدرت، علم، حیات اور ارادہ کو عقلی دلائل سے ثابت کیا ہے اور سمع و بصر اور کلام کے اثبات کے لیے نقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔ حالانکہ ان صفات کو بھی عقل کی روشنی میں ثابت کیا جا سکتا ہے امام ابن تیمیہ نے اس کتاب میں جہاں ان صفات پر بحث کی ہے وہاں اس کی تفصیل دیکھی جائے۔ امام غزالی اور بعض دوسرے متکلمین نے ان صفات پر عقلی رنگ میں بحث کرتے ہوئے نقل سے بھی مدد لی ہے۔ (ملاحظہ ہو الاقتصاد فی الاعتقاد)

"اللہ تعالیٰ کے اسماء (صفات) چار قسم کے ہیں۔ (۱) بعض اسماء حسنٰی کی صرف "ذات" پر دلالت کرتے ہیں۔ جیسے اسم "موجود" یہ خدا کی ذات پر ازلی وابدی طور پر صادق آتا ہے۔ خدا ازل سے موجود ہے اور ابد تک موجود رہے گا۔ (۲) بعض اسمائے خدا کی "ذات" پر دلالت کرتے ہیں ساتھ ہی ساتھ کچھ چیزوں کی نفی بھی کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر خدا "قدیم" ہے یہ اسم ظاہر کرتا ہے کہ خدا عدم سے وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ وہ ازل سے موجود ہے۔ یا خدا کا ایک اسم "باقی" ہے۔ اس اسم کا مطلب یہ ہے کہ خدا ایک ایسا وجود ہے جسے کبھی عدم لاحق نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح خدا کا ایک اسم "واحد" ہے جو خدا کی ذات سے شرک کی نفی کرتا ہے۔ یہی حال "غنی" کا ہے۔ جو بتاتا ہے کہ خدا بے نیاز ہے اور کسی معاملہ میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک ازلی وابدی صفت ہے۔ جب خدا سے صفتِ احتیاج سلب کر لی گئی ہے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خدا کی ذات سے یہ صفت الگ رہے گی۔ (۳) اسماء کی تیسری قسم وہ ہے جن سے خدا کی "ذات" کے لیے کوئی معنی زائد ثابت ہوتا ہے اس میں خدا کے حسب ذیل اسماء آتے ہیں۔

الحی (زندہ) القادر (قدرت والا) المتکلم (بولنے والا) المرید (ارادہ کرنے والا) السمیع (سننے والا) البصیر (دیکھنے والا) العالم (جاننے والا)

ان ہی اسماء میں وہ اسماء بھی شامل ہیں جو کسی پہلو سے مذکورہ بالا اسماء سے تعلق رکھتے ہیں جیسے "آمر" "ناہی" "خبیر" وغیرہ۔ (۴) چوتھی قسم ان اسماء کی ہے جو خدا کی ذات پر اس طرح دلالت کرتے ہیں کہ ان سے خدا کا کوئی عمل نمایاں ہوتا ہے۔ جیسے خدا "رازق" ہے "خالق" ہے "عزت دینے والا" اور "ذلت دینے والا" ہے وغیرہ۔ اس چوتھی قسم کے اسماء کے بارے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ خدا پر ازل سے صادق آتے ہیں ورنہ ماننا پڑے گا کہ خدا پر تغیر و انقلاب آتا ہے لیکن بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ یہ اسماء ازلی نہیں ہیں "خلق" بعد کی چیز ہے تو ہم اسم "خالق" کو ازلی کیسے مان لیں۔

اس بحث کے بعد امام صاحب فرماتے ہیں:۔

والکشف للغطاء عن ھذا	حقیقت سے پردہ اٹھ جاتا ہے جب ہم اس پہلو پر
ان السیف فی الغمد یسمی	غور کرتے ہیں کہ تلوار نیام میں بھی "صارم" (کاٹنے والی)
صارما وعند حصول القطع	کہی جاتی ہے اور اس وقت بھی اسے "صارم" ہی کہا جائیگا
بہ وفی تلک الحالۃ علی الاقتران	جب کہ اس سے کاٹنے کا عمل ہو رہا ہو۔ اس دوسری حالت
یسمی صارما وھما بمعنیین	میں اسے "صارم" اس لیے کہا جاتا ہے کہ تلوار سے کٹنے کا

مختلفين فهو في الغمد صارم
بالقوة وعند حصول القطع
صارم بالفعل وكذلك
الماء في الكوز يسمى مرويا
وعند الشراب يسمى مرويا
وهما اطلاقان مختلفان فمعنى
تسمية السيف في الغمد صارما
ان الصفة التي يحصل بها القطع
في الحال لا لقصور في ذات
السيف وحدته واستعداده
بل لامر آخر وراء ذاته فبالمعنى
الذي يسمى السيف في الغمد
صارما يصدق اسم الخالق
على الله تعالى في الازل فان
الخلق اذا جرى بالفعل لم يكن
لتجدد امر في الذات لم يكن بل كل ما
تشترط لتحقيق الفعل موجود في الازل
وبالمعنى الذي يطلق حالة مباشرة القطع
للسيف اسم الصارم لا يصدق في الازل
فهذا حظ المعنى فقد ظهر ان من قال انه لا
يصدق في الازل هذا الاسم فهو محق و
اراد به المعنى الثاني ومن قال يصدق في الازل
فهو محق واراد به المعنى الاول فاذا كشف الغطاء

عمل بھی شامل ہے۔ اس طرح تلوار کو دو مختلف معنوں میں
"صارم" کہا جاتا ہے تلوار نیام میں بالقوۃ "صارم" ہے اور
کاٹتے وقت بالفعل۔ اسی طرح پانی جو صراحی میں ہے اس
کو ہم سیراب کرنے والی چیز کہیں گے اور جس وقت اسے پیا جائے
اس وقت بھی اس کے لیے یہی لفظ بولا جائے گا اور یہ دو
مختلف قسم کے اطلاق ہیں۔ تلوار جب نیام میں ہے اس
وقت اسے "صارم" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خصوصیت
جس کی بنا پر کاٹنے کا عمل اس سے اس وقت ہونا چاہیے
وہ اگر نہیں ہو رہا ہے تو وہ اس کی ذات یا اس کی حدت و
استعداد میں کمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس کا سبب دوسرا
ہے جس کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس معنی
میں اللہ تعالیٰ پر خالق کا اطلاق ازل ہی سے ہو سکتا ہے
کیونکہ تخلیق کا عمل جب وجود میں آیا تو اس کی وجہ سے اس
کی ذات میں کوئی ایسی نئی بات نہیں ہوئی جو پہلے نہیں تھی
بلکہ واقعہ یہ ہے کہ فعل کو وجود میں لانے کے لیے جو کچھ شرائط
ہیں وہ سب ازل میں موجود ہیں۔ البتہ جس معنی میں ہم
تلوار کو اس کے کاٹنے کے وقت صارم کا لفظ بولتے ہیں
اس معنی کے لحاظ سے ازل میں خالق کا لفظ صادق نہیں آتا۔
یہ ہے اس بحث کی روح۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جو لوگ یہ کہتے
ہیں کہ خالق کا اطلاق خدا پر ازل میں نہیں ہوتا وہ صحیح کہتے
ہیں کیونکہ انھوں نے دوسرا معنی مراد لیا ہے اور جن لوگوں
کا خیال ہے کہ خالق کا اطلاق ازل ہی سے ہو سکتا ہے وہ بھی
صحیح کہتے ہیں کیونکہ وہ پہلا معنی مراد لیتے ہیں جب اس طرح

علیٰ ھذا الوجہ ارتفع الخلاف[1] حقیقت کھل گئی تو اختلاف بھی باقی نہیں رہا۔

واقعہ یہ ہے کہ متکلمین نے جو بحثیں پیدا کی ہیں ان سے حقیقت کھلنے کے بجائے اور زیادہ الجھ جاتی ہے۔ امام غزالیؒ کی تقریر میں ان پرانی بحثوں کا کسی قدر حل موجود ہے لیکن اس سے مسئلہ صاف نہیں ہوا ہے۔ ہمیں غور و فکر کا وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے جو بالکل فطری اور ہر طرح کی مصنوعیت سے پاک ہو اور جس میں کسی غیر ضروری بحث کی آمیزش نہ ہو[2]۔

بحث کے دو پہلو خدا کی کیا صفات ہیں اور وہ کیا خصوصیات رکھتا ہے۔ اس سوال پر انسان نے ہمیشہ دو پہلوؤں سے غور کیا ہے؟ ایک پہلو یہ کہ کائنات کے خالق کے اندر کن صفات کا پایا جانا ضروری ہے؟ اور یہ وسیع کائنات کس قسم کے خدا کا تقاضا کرتی ہے؟ دوسرا پہلو یہ کہ انسان "اپنے" خدا کو کن صفات سے متصف دیکھنا چاہتا ہے؟ خدا کا مسئلہ انسان کے لیے خالص کائناتی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ اس کا جذباتی و نفسیاتی مسئلہ بھی ہے۔ جو تصورِ خدا پہلے سوال کا جواب نہ دے وہ خدا اور کائنات کے تعلق کو بتا نہیں سکتا۔ اور جو تصور دوسرے سوال کو حل نہ کرے اس میں انسان کا مقصود اور منتہا بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

قرآن نے خدا کا تعارف ان ہی دو پہلوؤں سے کرایا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ خدا اور کائنات کے درمیان کیا تعلق

---

[1] الاقتصاد فی الاعتقاد ص ۶۵-۶۶

[2] امام غزالیؒ نے جس ڈھنگ پر اس بحث کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے علامہ ابن رشد کو اس سے اختلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ خدا کی صفات کے بارے میں بالقوۃ اور بالفعل کی بحث قرآن و حدیث کے مزاج سے مناسبت نہیں رکھتی۔ انھوں نے قرآن و حدیث کے نقطۂ نظر کو ان الفاظ میں واضح کیا ہے کہ خدا عالم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ "انہ عالم بالشیٔ قبل ان یکون علی انہ سیکون وعالم بالشیٔ اذا کان علی انہ قد کان وعالم بما قد تلف انہ تلف فی وقت تلفہ وھذا ھو الذی تقتضیہ اصول الشرع" الکشف من مناہج الادلہ ص ۵۲ یعنی کسی چیز کے وجود میں آنے سے پہلے خدا کے عالم ہونے کا یہ معنی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ چیز وجود میں آئے گی اور جب وہ وجود میں آجاتی ہے تو اس وقت اس کے عالم ہونے کا یہ معنی ہے کہ وہ جانتا ہے کہ وہ چیز وجود میں آگئی ہے۔ جو چیز تلف ہوئی اس کی مناسبت سے اس کے عالم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس وقت تلف ہوئی خدا اس وقت جانتا ہے کہ وہ تلف ہو چکی۔ خدا کی صفات کے بارے میں اصول شریعت اسی تشریح کا تقاضا کرتے ہیں۔)

ہمارے خیال میں ابن رشد نے کتاب و سنت کی روح سے قریب تر بات کہی ہے لیکن یہ بحث جس حد تک علمی ہے اس میں غور و فکر کی طالب ہے ابن رشد نے اس حد تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ممکن ہے ابن رشد نے کسی دوسرے مقام پر یہ بحث اور زیادہ علمی انداز میں کی ہو جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

ہر اور انسان خدا سے اپنا رشتہ کیسے جوڑ سکتا ہے؟ قرآن کا خدا، کائنات کا خالق ہے، مدبر و منتظم ہے اور سارا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ ساتھ ہی وہ انسان کا ہمدرد ہے، محسن ہے، حامی و ناصر ہے اور اس کا ملجا و ماویٰ ہے۔

قُلْ مَنْ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۔ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ○ (المومنون ۸۹،۸۸)

تم ان سے پوچھو اگر تم جانتے ہو تو بتاؤ کہ وہ کون ہے جس کے ہاتھ میں ہر چیز کا اقتدار ہے اور وہی پناہ دیتا ہو اس کے مقابلہ میں کوئی کسی کو پناہ نہیں دے سکتا؟ وہ ضرور کہیں گے کہ یہ طاقت و اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے۔ ان سے کہو کہ پھر تم کہاں بہکے جاتے ہو۔

آئیے اب ہم ان دونوں پہلوؤں پر الگ الگ غور کریں۔

قرآن خدا کی صفات کو کائنات سے ثابت کرتا ہے۔ کائنات کی ہر چیز اپنے وجود سے کچھ خصوصیات اور صفات کا مظاہرہ کرتی ہے یہ صفات اور خصوصیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ خدا بھی ان سے متصف ہے۔ ایک تحریر جو آپ کے سامنے ہے اسے دیکھ کر آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ اس کا لکھنے والا کن صلاحیتوں کا مالک ہے، وہ کن علوم سے واقف ہے اور اس کو اپنی بات پیش کرنے کا کتنا سلیقہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہ کائنات بتاتی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والی ہستی کن صفات کی حامل ہے اور وہ کیا صلاحیتیں اور قوتیں اپنے اندر رکھتی ہے۔ آپ کسی جاہل انسان سے یہ توقع نہیں رکھتے کہ وہ کوئی کامیاب تحریر لکھے گا بالکل اسی طرح عقل کہتی ہے کہ جو صفت خالق کائنات میں نہیں ہے وہ اپنی مخلوق میں بھی پیدا نہیں کر سکتا۔

قرآن خدا کی ایک ایک صفت کو اسی فطری اور واضح اصول کے تحت انسان کے ذہن نشین کراتا ہے۔ خدا نے کائنات کی ہر چیز پیدا کی ہے۔ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ الانعام ۱۰۲۔ تخلیق میں کسی دوسرے کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ وَرَبُّكَ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَيَخْتَارُ مَا كَانَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ (تیرا رب جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جن لوگوں کو یہ خدا کا ہمسر اور شریک سمجھتے ہیں ان کو کوئی اختیار نہیں ہے) اس لیے قرآن کہتا ہے کہ خدا ہی کو خالق ماننا چاہیے۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ الانعام ۱۰۲ (یہ ہے اللہ تمہارا رب سوائے اس کے کوئی معبود نہیں، وہ ہر چیز کا خالق ہے پس تم اسی کی عبادت کرو) رزق خدا کی طرف سے ملتا ہے قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلِ اللّٰهُ السبا ۲۴۔ (تم ان سے پوچھو وہ کون ہے جو تم کو آسمانوں اور زمین سے رزق دیتا ہے کہو اللہ) اس لیے رازق صرف خدا کی ذات ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ الذاریات

(بلاشبہ اللہ ہی ہے جو رزق دینے والا، قوت والا اور مضبوط ہے) اسی طرح جو قوت وطاقت، جو علم و حکمت اور جو خوبی اور کمال اس کائنات میں موجود ہے ماننا پڑیگا کہ خدا کے اندر بھی وہ ساری خوبیاں ہیں۔ قرآن کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات میں جو صفات پائی جاتی ہیں اگر خدا کے اندر وہ صفات نہیں ہیں تو کائنات میں وہ کیسے پیدا ہوگئیں۔ علت جن اثرات سے خالی ہے معلول میں وہ اثرات کہاں سے آگئے۔

وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّۃً اَوَ	وہ کہتے ہیں ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے؟
لَمْ یَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ الَّذِیْ خَلَقَھُمْ ھُوَ	کیا وہ نہیں جانتے کہ جس اللہ نے ان کو پیدا کیا اس
اَشَدُّ مِنْھُمْ قُوَّۃً (حم سجدۃ ۱۵)	کی قوت وطاقت ان کی قوت سے بھی زیادہ ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :-

کُلُّ مَا فِی الْمَخْلُوْقَاتِ مِنْ قُوَّۃٍ	مخلوقات میں جو قوت اور طاقت پائی جاتی ہے
وَشِدَّۃٍ تَدُلُّ عَلٰی اَنَّ اللّٰہَ اَقْوٰی	وہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ خدا ان سے زیادہ
وَاَشَدُّ وما فیھا من علم یدل علی	قوی اور طاقتور ہے اور مخلوقات میں جو علم ہے وہ بتاتا ہے
ان اللہ اعلم وما فیھا من علم وحیٰوۃ	کہ اللہ ان سے زیادہ جاننے والا ہے اسی طرح مخلوقات
یدل علی ان اللہ اولیٰ بالعلم	میں جو علم اور حیات ہے ظاہر کرتا ہے کہ خدا بدرجہ اولیٰ
والحیٰوۃ[1]	علم اور حیات سے متصف ہے۔

اب انسان کی نفسیات کے پہلو سے غور کیجیے۔ انسان جن وجوہ سے خدا کو مانتا ہے ان میں ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کا محتاج ہے۔ انسان اپنے لیے ایک مضبوط سہارا چاہتا ہے اور اس کائنات میں سوائے خدا کے کوئی ایسی ذات نہیں ہے جس پر وہ اعتماد کر سکے۔ دنیا کے جتنے ممکن سہارے ہیں وہ سب اسے دھوکا دے جاتے ہیں۔ وہ اپنی قوت و توانائی پر بھروسہ نہیں کر سکتا کیونکہ بیماری کا ایک ہی حملہ اس کو بے بس کر دیتا ہے۔ اس کی زندگی ناقابل اعتبار ہے اس لیے کہ زندگی کے جو لمحات آج اسے حاصل ہیں یقین نہیں کہ کل وہ باقی رہیں گے۔ مال و دولت پر وہ تکیہ نہیں کر سکتا کیونکہ جس طرح دوسروں سے چھین کر دولت اس کے ہاتھ میں آئی ہے اسی طرح اس کے ہاتھ سے بھی چھن سکتی ہے۔ وہ اپنے خویش و اقارب کی مدد پر یقین نہیں رکھ سکتا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ بہت سے معاملات میں وہ بھی اسی کی طرح عاجز ہیں۔ اس لیے انسان کی نفسیات میں خدا کی طلب موجود ہے۔ وہ فطری طور پر اس کو ہر مصیبت میں اپنا سہارا تصور کرتا ہے اور اس کے دامن میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ خدا کے اندر بعض ایسی لازوال اور بے پایاں خوبیاں ہوں جو کائنات کی کسی بھی چیز

[1] مجموعہ تفسیر شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ صفحہ ۲

میں نہیں ہیں۔ انسان جن چیزوں پر اعتماد کر سکتا ہے وہ سب فانی ہیں۔ اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کا خدا غیر فانی ہو جس کی زندگی لامحدود اور ابدی ہو اور جس کے بارے میں وہ کبھی یہ سوچ نہ سکے کہ اس کا سہارا ختم ہو گیا ہے۔ قرآن انسان کی اس نفسیاتی طلب کے جواب میں کہتا ہے کہ ہاں تمہارا خدا ایسا ہی ہے۔ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ الفرقان ۵۸ (تم بھروسہ کرو اس خدا پر جو زندہ ہے اور جو کبھی مرنے والا نہیں ہے) انسان چاہتا ہے کہ خدا اس کی پناہ گاہ ہو کہیں اسے پناہ نہ ملے تو اس کے دامن میں پناہ ملے۔ وہ بے بس ہو کر خدا کی طرف ہاتھ پھیلائے تو اس کی مدد کے لیے وہ موجود ہو۔ انسان کی اس فطری مانگ کے جواب میں قرآن بتاتا ہے کہ خدا یقیناً تمہارا پناہ دہندہ ہے۔ اَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ النمل ۶۲ (جب کوئی مجبور و بے قرار انسان اس کو پکارتا ہے تو خدا کے سوا کون ہے جو اس کی پکار کو سنتا ہے اور اس کی تکلیف کو دور کرتا ہے) انسان چاہتا ہے کہ خدا اس سے قریب ہو اس کی پکار کا جواب دے اور اس کی دعائیں سنے۔ قرآن خدا کی طرف سے اعلان کرتا ہے وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ البقرہ ۱۸۶ (اور جب تم سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو انہیں بتا دو کہ میں ان سے قریب ہوں جب پکارنے والا مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی پکار کا جواب دیتا ہوں) انسان چاہتا ہے کہ خدا اپنے دوستوں سے محبت کرے اور جو اس کے نافرمان ہیں ان کو اس کی محبت میں حصہ نہ ہو۔ قرآن خدا کی صفت یہ بیان کرتا ہے۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَىٰ لَهُمْ محمد ۱۱ (یہ اس وجہ سے ہے کہ اللہ ان لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان رکھتے ہیں اور کافروں کا کوئی سرپرست نہیں ہے) اسی طرح انسان کی خواہش ہے کہ خدا کے اندر ایک دو نہیں وہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود ہوں جن سے وہ واقف ہے اور وہ ان تمام نقائص سے پاک ہو جو اس کے نزدیک کسی کے شرف کو داغ دار بنانے والے ہیں۔ انسان چاہتا ہے کہ خدا عظمت و بزرگی کے سب سے اونچے مقام پر ہو، وہ اتنا بلند و برتر ہو کہ وہ اس کے جلال و جمال کا تصور کرنا چاہے تو تھک جائے پھر بھی اس کی عظمت کو پا نہ سکے۔ انسان کے ان فطری احساسات کی تسکین ہو جاتی ہے جب قرآن خدا کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (آسمانوں اور زمین میں اس کے لیے سب سے اونچی مثال ہے) وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ الجاثیہ ۳۷۔ (آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیے ہے ساری بڑائی اور وہ غالب اور حکمت والا ہے)

کائنات کا مطالعہ اور اپنی بے بسی کا احساس یہ دو چیزیں ہیں جو انسان پر خدا کی صفات کو کھولتی ہیں ان

کا مطالعہ کائنات جتنا وسیع اور گہرا ہوگا اتنا ہی زیادہ خدا کی صفات کا شعور بھی اس کو حاصل ہوگا۔ اسی طرح انسان کے اندر اگر اپنی بے بسی کا احساس بڑھا ہوا ہے تو ہر نعمت اور ہر مصیبت میں خدا کی خدائی اور اس کی قدرت کے راز اس پر کھلیں گے۔ قرآن میں خدا کے بہت سے اسماء صفات بیان ہوئے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہدیا گیا ہے

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَاءُ الْحُسْنٰى (بنی اسرائیل ۱۱۰)

کہدو کہ تم اس کو اللہ کے لفظ سے پکارو یا رحمٰن کے لفظ سے یاد کرو، جس نام سے بھی تم یاد کرو سب اسماء حسنیٰ اسی کے لیے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کے اسماء حسنیٰ کسی خاص تعداد میں محدود نہیں ہیں بلکہ قیامت تک اس بات کا امکان موجود ہے کہ انسان پر خدا کے حسن و جمال کے نئے نئے پہلو اجاگر ہوں اور وہ ان کے ذریعہ خدا کو یاد کر سکے اس کی تائید رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعا سے ہوتی ہے۔

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ عَبْدُكَ وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ اَسْاَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِّنْ خَلْقِكَ اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِيْ عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَنُوْرَ صَدْرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَذَهَابَ هَمِّيْ وَغَمِّيْ[1]

اے اللہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں تیرا غلام ہوں اور تیرے غلام اور تیری باندی کی اولاد ہوں۔ میری پیشانی تیرے قبضہ میں ہے۔ مجھ پر تیرا ہر حکم جاری ہو سکتا ہے میرے بارے میں تو جو بھی فیصلہ کرے وہ سراسر عدل و انصاف ہوگا خدایا میں تجھ سے مانگتا ہوں تیرے ہر اس نام کے ذریعہ جس سے تو نے اپنی ذات کو موسوم کیا ہے یا جسے تو نے اپنی کتاب میں نازل کیا ہے یا جسے تو نے اپنے بندوں میں کسی بندے کو سکھایا ہے یا یہ کہ وہ تیرے علم غیب میں موجود ہے کہ تو قرآن کو میرے دل کی بہار اور میرے سینہ کا نور بنا دے۔ میرا حزن و ملال اس سے دور ہو اور میرا فکر و غم اس سے چھٹ جائے۔

---

[1] آپ نے فرمایا انسان کو تکلیف یا صدمہ پہنچے اور وہ یہ دعا پڑھے تو اللہ اس کی تکلیف کو دور فرمائے گا اور اس کے غم کو خوشی سے بدل دیگا۔ اس حدیث کو صاحب مشکوٰۃ نے صرف رزین کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ (باب الدعوات فی الاوقات ص ۲۰۲) لیکن علامہ محمد بن مرتضیٰ یمانی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث مسند احمد اور صحیح ابو عوانہ میں موجود ہے۔ ہیثمی کی مجمع الزوائد میں مسند احمد کے ساتھ ابو یعلیٰ اور بزار کے حوالے بھی ملتے ہیں تفصیل کے لیے دیکھیے "ایثار الحق علی الخلق" ص ۱۷۱

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ خدا کے اسماء وہی نہیں ہیں جو خدا کی کتاب میں بیان ہوئے ہیں یا جن سے خدا نے اپنی ذات کو موسوم کیا ہے۔ بلکہ بہت سے اسماء وہ ہیں جن تک ہماری رسائی ہو ہی نہیں سکتی اور وہ ہمارے لیے علم غیب ہیں ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو خدا کے نئے اسماء کا علم ہو سکتا ہے۔ وہ خدا کی ان صفات سے واقف ہو سکتا ہے جن سے دوسرے ناآشنا ہیں۔

اس بحث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سائنس اور نفسیات کے مطالعہ سے انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو جائے گی۔ خدا کی ذات و صفات کا شعور اس شخص کو نصیب ہوتا ہے جس کے اندر خدا کو پانے اور اس کی صفات کو سمجھنے کی سچی تڑپ ہو اور وہ کائنات کو اس نقطۂ نظر سے دیکھے کہ وہ خدا کی تخلیق ہے۔ ایسا شخص کائنات کے ذرہ ذرہ میں خدا کی نئی نئی صفات کا جلوہ دیکھے گا۔ وہ ٹھنڈی ہوا میں سانس لے یا راستہ چلتے ہوئے ٹھوکر کھائے، خدا کی قدرت کا ایک نیا احساس اس کے اندر جاگ اٹھے گا۔ وہ کائنات کے سیدھے سادے مشاہدہ اور روزمرہ کے واقعات سے اس حقیقت تک پہنچ جائے گا جس تک کوئی ایسا شخص کبھی نہیں پہنچ سکتا جو خدا سے بے نیاز ہو کر کائنات کی وسعتوں میں کھویا ہوا ہو۔ اس پر کائنات کے نئے نئے گوشے کھلتے چلے جائیں گے لیکن پھر بھی وہ خدا کے شعور سے محروم ہی رہے گا۔ وَكَأَيِّنْ مِنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ٥ یوسف ۱۰۵۔ (آسمانوں اور زمین میں کتنی ہی نشانیاں ہیں جن پر سے یہ گزرتے تھے لیکن اعراض کرتے ہوئے اور منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ (باقی)

متاعِ حسن

دنیا کا سامان زیست قرآن مجید کی رو سے دو قسم کا ہے۔ ایک وہ سر و سامان ہے جو خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کو فتنے میں ڈالنے کے لیے دیا جاتا ہے اور جس سے دھوکا کھا کر ایسے لوگ اپنے آپ کو دنیا پرستی و خدا فراموشی میں اور زیادہ گم کر دیتے ہیں، یہ بظاہر تو نعمت ہے مگر بباطن خدا کی پھٹکار اور اس کے عذاب کا پیش خیمہ ہے۔ قرآن مجید اس کو متاعِ غرور کے الفاظ سے یاد کرتا ہے دوسرا وہ سر و سامان ہے جس سے انسان خوش حال اور قوی بازو ہو کر اپنے خدا کا اور زیادہ شکر گزار بنتا ہے، خدا اور اس کے بندوں کے اور خود اپنے نفس کے حقوق زیادہ اچھی طرح ادا کرتا ہے، خدا کے دیے ہوئے وسائل سے طاقت پاکر دنیا میں خیر و صلاح کی ترقی اور شر و فساد کے استیصال کے لیے زیادہ کارگر کوشش کرنے لگتا ہے یہ قرآن کی زبان میں متاعِ حسن ہے یعنی ایسا اچھا سامان زندگی جو محض عیش دنیا ہی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ نتیجہ میں عیشِ آخرت کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

توحید —— قرآن کی روشنی میں

(مولانا محمد سلیمان فرخ آبادی)

حمد وثنا، تعریف اور شکر کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

- اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (الفاتحہ) سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو رب ہے تمام جہانوں کا اور رحمٰن و رحیم ہے۔
- وَهُوَ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ لَهُ الْحَمْدُ الآیۃ (القصص) اور وہ اللہ ہے صرف وہی الٰہ (برحق) ہے حمد اسی کے لیے ہے۔
- قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۝ (العنکبوت ع ۶) کہدو تمام حمد اللہ ہی کے لیے ہے لیکن اکثر لوگ عقل سے کام نہیں لیتے
- قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝ (لقمٰن ع ۳) کہدو تمام حمد اللہ کے لیے ہے لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔
- فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝ (الجاثیہ ع ۴) پس حمد اللہ ہی کے لیے ہے جو آسمانوں، زمین اور تمام جہانوں کا رب ہے —

حمد کے معنی تعریف کے آتے ہیں تعریف کمال اور نعمت پر کی جاتی ہے اور ہر قسم کے کمالات، خوبیوں اور قدرتوں کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور ہر قسم کے احسانات کرنے والا اور ہر قسم کی نعمتوں سے نوازنے والا بھی صرف وہی ہے لہٰذا حمد وثنا اور تعریف توصیف کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے —— حمد کے معنی شکر کے بھی آتے ہیں، شکر کمال پر نہیں صرف احسان اور نوازشوں پر کیا جاتا ہے اور نوازشیں ساری کی ساری اللہ ہی کی جانب سے ہیں نعمتیں تمام کی تمام وہی بخشتا ہے لہٰذا سارے شکر کا مستحق بھی وہی ہے —— تعریف تو صرف زبان سے ہوتی ہے اور شکر، قلب و روح، دل و دماغ، اعضاء جوارح اور زبان سب سے کیا جاتا ہے۔ لہٰذا حمد (جس کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے) کی جامعیت ملاحظہ فرمائیے۔

- ہر قسم کے تمام کمالات پر حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ کمالات کا صرف وہی مالک ہے۔
- ہر قسم کے تمام احسانات اور نعمتوں پر حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ احسانات صرف اسی کے ہیں اور نعمتیں صرف اسی نے دی ہیں وہی دیتا ہے اور وہی دے سکتا ہے۔

• دل وجان اور قلب و روح سے حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر شکر ادا ہو ہی نہیں سکتا۔
• زبان سے حمد کا مستحق بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

غور فرمایئے قرآن کے مختلف مقامات کی پانچ آیات اوپر نقل ہوئی ہیں اور پانچوں میں اَلْحَمْد کا لفظ موجود ہے۔ تین میں توصیفاً بھی یکسانی ہے بقیہ دو میں معنًی یہی لفظ موجود ہے کہ لَہُ الْحَمْد اور لِلّٰہِ الْحَمْد کا وہی مفہوم ہے جو اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کا ہے یعنی حمد کا استحقاق اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اور ہر قسم کی حمد کا مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

حمد اللہ تعالیٰ ہی کے لیے مخصوص ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ کائنات میں جمادات، نباتات اور حیوانات ہیں۔ فرشتے جن اور انسان ہیں۔ سماوی اور ارضی مخلوق ہے۔ ذرہ سے لیکر پہاڑ تک، قطرہ سے لیکر دریا اور سمندر تک، چیونٹی سے لے کر ہاتھی اور سیمرغ تک، ماہی سے لیکر ماہتاب اور آفتاب تک، ابلیس سے لیکر بن مانس تک نہ معلوم کیا کیا مخلوقات موجود ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ایسی نہیں جو ہر قسم کے کمالات کی مالک ہو یا تمام قسم کی نعمتوں سے نوازنے والی ہو، پھر بھلا کوئی کس طرح حمد، تعریف اور شکر کا مستحق ہو سکتا ہے۔ ہر قسم کے کمالات تو در کنار تمام قسم کی نعمتوں سے نوازنا تو کجا بعض کمالات کا بھی کوئی مالک نہیں بعض نعمتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی نہیں نواز سکتا۔ لہٰذا تعریف وشکر کا اللہ کے علاوہ کوئی مستحق نہیں ہو سکتا۔

(۲) اللہ تعالیٰ تنہا مستحق عبادت ہے، اس کا کوئی شریک اور ہمسر نہیں

الف • فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ (بقرہ ع ۳) پس نہ ٹھہراؤ اللہ کے لیے مدمقابل (شرکاء) حالانکہ تم جانتے ہو۔

• شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۙ وَالْمَلٰٓىٕكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآىٕمًۢا بِالْقِسْطِؕ (آل عمران ع ۲) اور فرشتوں نے گواہی دی اور اہل علم نے بھی گواہی دی، انصاف پر قائم رہتے ہوئے۔

• فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْۤا اَنَّمَاۤ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ (ھود ع ۲)
پس اگر وہ تمہاری دعوت قبول نہ کریں تو جان لو کہ (یہ) اللہ کے علم سے نازل کیا گیا ہے اور اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے۔

علم خواہ حقیقت کا علم ہو، تجربے سے حاصل کیا گیا ہو، مشاہدہ اس کا ذریعہ بنا ہو، یا عقل سلیم نے اس کی طرف رہنمائی کی ہو، غرض کہ علم اگر علم ہے تو وہ انسان کو اس حقیقت کی طرف ضرور پہنچائے گا کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں ہے اور اس کا

کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔

ب • قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ○ (بقرہ ع ۱۶)

بولے ہم بندگی کریں گے آپ کے خدا کی آپ کے باپ دادا ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ اور اسحٰقؑ کے معبود، الٰہ واحد کی اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

• وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖۤ اِنِّیْ لَكُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ○ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ ؕ (ھود ع ۳)

اور البتہ یقیناً ہم نے نوح کو اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجا (پس نوح نے کہا) میں تمہارے لیے کھلا ڈرانے والا ہوں یہ کہ اللہ کے علاوہ کسی کی بندگی نہ کرو۔

وَاِلٰی عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ (ھود ع ۵)

اور قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو نبی بنایا (تو ہود نے کہا) اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو (کیونکہ) اس کے علاوہ تمہارے لیے کوئی الٰہ نہیں ہے۔

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ (ھود ع ۶)

اور قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو نبی بنایا (تو صالح نے کہا) اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو (کیونکہ) تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے۔

وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاهُمْ شُعَیْبًا ؕ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ (ھود ع ۸)

اور اہل مدین کی طرف ان کے بھائی شعیب کو نبی بنا کر بھیجا تو شعیب نے کہا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو (کیونکہ) تمہارے لیے کوئی دوسرا الٰہ ہے ہی نہیں

ہر ملک، ہر قوم اور ہر زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے ہادی اور نبی بھیجے جو دنیا کے برگزیدہ ترین اور صالح ترین انسان بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کے حامل تھے۔ بے غرض و بے لوث تھے، جن کو علم حقیقت حاصل تھا، ان سب نے متفقہ طور پر اس بات کی شہادت دی اور اسی حقیقت کی طرف دنیا کو دعوت دی کہ اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں اور نہ اس کا کوئی سہیم و شریک ہے انبیاء علیہم السلام کی یہ شہادت دنیا کے مستند ترین ریکارڈ سے ثابت ہے۔

وَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ○ (بقرہ ع ۱۹)

اور تمہارا معبود الٰہ واحد ہے اس کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے وہ الرحمٰن اور الرحیم ہے

اللہ تعالیٰ اس کائنات کی بقا اور نشوونما کی تمام ضروریات محض اپنے رحم و کرم کی بنا پر پوری فرما رہا ہے کسی کا کوئی مطالبہ

درتقاضا اس پر نہ تھا اور نہ ہو سکتا ہے ــــ اس کا رحیم و کریم ہونا اور اپنے رحم و کرم ہی سے کائنات کو وجود بخشنے کے ساتھ کائنات کی بقا اور نشو و نما کے لیے اپنی بے حد و حساب نعمتوں سے نوازنا اور نوازتے رہنا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ الٰہ ہے اور صرف وہی الٰہ برحق ہے۔ وہ تنہا مستحق عبادت ہے اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔

۵۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (بقرہ ع ۳۴) — اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں صرف وہی معبود ہے جو الحی اور القیوم ہے۔

اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ (آل عمران ع ۱) — اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں صرف وہی معبود ہے جو الحی اور القیوم ہے

اللہ کے سوا کوئی ایسا نہیں جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ جو از خود زندہ اور موجود ہو جو حیات کا منبع اور مخزن ہو، جو قائم بالذات ہو اور جو کائنات کو اپنی بے حد و حساب قدرت، بے پایاں اقتدار اور اٹل فطری و طبعی قوانین کے ذریعہ تھامے ہوئے ہو لہٰذا اللہ ہی تنہا مستحق عبادت ہے اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔

۶۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (آل عمران ع ۲) — کوئی معبود نہیں سوائے اس کے (اور وہ) العزیز اور الحکیم ہے۔

اللہ تعالیٰ عزیز ہے کائنات کی ہر چیز پر اسے غلبہ حاصل ہے۔ نظام شمسی اس کی مٹھی میں ہے کہکشاں سے وابستہ تمام نظام اس کی قدرت کا ادنیٰ کرشمہ ہے غرضیکہ کائنات اس کے آگے مغلوب ہے اور اس کو ہر چیز پر اقتدار حاصل ہے۔ اس کلی اور ہمہ گیر غلبۂ اقتدار کے علاوہ اس کی حکمت و دانائی بھی کائنات کے ہر ذرے سے عیاں ہے۔ ہر ذرہ بے شمار حکمتوں اور دانائیوں سے معمور ہے۔ ہر چیز میں بے شمار حکمتیں پوشیدہ ہیں۔ یوں سمجھیے کہ پوری کائنات از اول تا آخر عقل و دانائی، حکمت و تدبر کا مجسمہ ہے۔ یہ غلبۂ اقتدار اس العزیز کے علاوہ کسی اور کو حاصل ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ یہ حکمت و دانائی اس الحکیم کے سوا اور کسی سے نہ صادر ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے لہٰذا عبادت و بندگی اور اطاعت و فرماں برداری کا تنہا وہی مستحق ہے اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں اور نہ ہو سکتا ہے۔

۷۔ وَقَالَ الْمَسِیْحُ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اعْبُدُوا اللّٰہَ رَبِّیْ وَرَبَّکُمْ اِنَّہٗ مَنْ یُّشْرِکْ بِاللّٰہِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ وَمَاْوٰہُ النَّارُ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (مائدہ ع ۱۰) — اور مسیحؑ نے کہا اے بنی اسرائیل اللہ کی بندگی کرو جو میرا اور تمہارا رب ہے۔ یقیناً جس نے اللہ کے ساتھ شریک ٹھہرایا پس یقیناً اللہ نے اس پر جنت حرام کی اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

ظلم، وَضعُ الشیءِ فی غیرِ محلّہٖ (کسی چیز کو اس کے محل کے بجائے کسی اور جگہ فٹ کرنے کی احمقانہ کوشش) کو کہتے ہیں ظلم، تصرف الشیءِ فی غیر ملکہٖ (کسی دوسرے کی ملک میں بغیر اجازت نا روا اور غاصبانہ تصرف) کو کہتے ہیں ظلم کے معنی حقوق تلفی کے آتے ہیں۔ کسی کی فطرت، طبیعت اور مرضی کے خلاف کام لینے کا نام ظلم ہے۔ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ آدمی اپنے خالق، مالک اور حاکم کی عبادت و اطاعت کے بجائے کسی اور کی بندگی کرنے لگے اور اس طرح اس کا حق تلف کرے۔ اس سے بڑھ کر آخر اور کیا ظلم ہو سکتا ہے کہ انسان اپنے ازلی و ابدی آقا و مولیٰ کی مرضی کے برعکس کسی زندہ، مردہ انسان کسی فرشتہ یا جن وغیرہ کی مرضی کی فکر میں رہے۔ شجر و حجر، دریا، پہاڑ اور ہوائے نفس کا گرویدہ ہو۔ ملک، قوم، نسل و نسب دنیوی عروج و اقتدار وغیرہ کے بتوں کے آگے سر تسلیم خم کرے —— درحقیقت اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ نہیں ہے۔ کسی دوسرے کو خدا تسلیم کرنا سب سے بڑا ظلم ہے۔ مبنی بر انصاف بات یہی ہے کہ اللہ تنہا مستحقِ عبادت ہے اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔

ز• قُلْ اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ مَا لَا یَمْلِکُ لَکُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا (المائدہ ۱۰۶)

کہدو، کیا تم اللہ کے علاوہ اس کو پوجتے ہو جو تمہارے نفع و نقصان کا اختیار بھی نہیں رکھتا۔

اس کائنات میں کیا نہیں ہے؟ زمین و آسمان کی اس دنیا میں سب کچھ ہے۔ آفتاب و مہتاب سے لیکر جنگل کی جڑی بوٹیوں اور سمندر کی تہہ میں بیٹھے ہوئے ریت کے ذرّات تک ہزارہا اشیاء ہیں جو انسانوں کے لیے نفع رساں ہیں اور انسان ان سے جلب منفعت کرتا ہے۔ دہاڑتے شیروں، پھنپھناتے سانپوں اور چنگھاڑتے ہاتھیوں سے لیکر زہریلے کیڑے مکوڑوں تک سے انسان کو نقصان پہنچ جاتا ہے اور انسان ان سے دفعِ مضرت پر مجبور رہے۔ غرضکہ کائنات ایک طرف مفید ہی مفید ہے تو دوسرے لحاظ سے انسان آفات ارضی و سماوی میں گھرا اور پھنسا ہوا ہے —— لیکن آسمان، زمین، عالم حیوانات، عالم نباتات، عالمِ جمادات، انسانی دنیا، جنوں کا عالم، فرشتوں کا جہان وغیرہ تمام دنیاؤں اور سارے عالموں اور سب ہی جہانوں پر ایک نگاہ ڈال جائیے آپ کو کوئی ایک چیز بھی حقیقی معنوں میں نافع یا ضار نظر نہ آئے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی شے نافع یا ضار ہے ہی نہیں لہذا تنہا اللہ ہی مستحقِ عبادت ہے اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں۔

ح• ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبُّکُمْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ فَاعْبُدُوْہُ (الانعام ۱۰۳)

یہ اللہ ہی تمہارا رب اس کے علاوہ اور کوئی الٰہ نہیں ہے ہر چیز کا خالق پس اسی کی بندگی کرو۔

مادہ ہمیشہ سے ہے بے جان اور بے شعور مادہ، کائنات اور انسان اسی مادہ کی گوناگوں ترقی یافتہ شکلوں کے مجموعہ کا نام ہے ہمیں نہیں معلوم اور نہ اس کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ ہے کہ مادہ کہاں سے آگیا ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ مادہ ہے اور تھا

دریہ کائنات اسی بے شعور اور بے جان مادہ کی کرشمہ سازیاں ہیں اور بس۔ غور فرمایئے اس سے زیادہ غیر معقول کوئی اور قیاس ہو سکتا ہے؟ کہ بے شعور مادہ سے دانائیوں اور حکمتوں سے لبریز کائنات از خود وجود پذیر ہو گئی۔

ایک اور خیال ہے کہ یہ کائنات از خود تو وجود پذیر نہیں ہو گئی بلکہ اس کو ایک سے زائد خداؤں اور دیوتاؤں نے وجود بخشا ہے مگر کائنات کا بے نظیر سسٹم اور جسم انسانی کی بے مثال مشنری زبانِ حال سے اس خیال کی تردید کر رہی ہے۔ لہٰذا قرآنی نظریہ ہی درست اور صحیح ہے کہ ایک ایسی ہستی جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی جو ہر قسم کے کمالات کی مالک اور تمام خوبیوں کی ذاتی طور پر حامل ہے اور جو ہر قسم کے عیب، نقص، کمی اور کوتاہی سے پاک ہے اس نے کائنات کو وجود بخشا ہے اور جو خالق ہے وہی مالک ہے اور وہی حاکم ہے لہٰذا وہی تنہا عبادت کا مستحق ہے اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔

ط • قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ○ (اعراف ۱۲۶)

کہا کیا میں تمہارے لیے اللہ کے علاوہ الٰہ تلاش کروں حالانکہ اس نے تم کو تمام جہانوں پر فضیلت عطا فرمائی۔

کائنات میں طرح طرح کی مخلوق ہے رنگ برنگ کی اشیاء ہیں گوناگوں اور نوع بنوع چیزیں ہیں مگر ان میں انسان اشرف ہے۔ اسے کائنات پر تفوق اور فضیلت حاصل ہے یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی اور اس کی حکمت کا تقاضا تھا کہ انسان کو سب پر شرف عطا فرمایا اور انسانوں میں بھی اہل حق کو، علمبردارانِ دین حق کو، اقامت دین اور امامت و رہنمائی کے منصب پر فائزین کو سب پر فضیلت سے نوازا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ ہی تنہا مستحق عبادت ہے اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں۔

ی • لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ (اعراف ۱۵۸)

اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں جو زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے

انسان نے کائنات پر بظاہر فتح حاصل کر لی ہے اس نے خلائی کائنات میں نفوذ کی طرف قدم بڑھایا ہے، ہواؤں پر اس کا قبضہ ہو چکا ہے سمندروں پر اس کا تسلط قائم ہو چکا ہے ریڈیائی لہریں اس کی مٹھی میں ہیں مدت ہوئی، بھاپ پر قبضہ کر کے اس نے زمین کی چھاتی پر مونگ دلنا شروع کر دی ہے غرضکہ تسخیر کائنات میں روز افزوں ترقی ہے مگر ان کی بے بسی کا عالم یہ ہے کہ اپنی موت و زندگی پر بھی اسے اختیار نہیں ہے اور نہ اس کا امکان ہے کہ وہ کبھی اپنی موت و زیست پر قدرت حاصل کر سکے گا حیات و موت خالق کائنات کے ہاتھ میں ہے اس کے علاوہ سب اپنی موت و حیات میں اس کے آگے سرنگوں ہیں اور سرنگوں ہونے پر مجبور ہیں بے بس ہیں لہٰذا وہی تنہا الٰہ ہے اور مستحق عبادت اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔

ک • لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ

زمین و آسمان میں اگر چند خدا ہوتے "اللہ کے

لَفَسَدَتَا ج (الانبیاء ۲۲) علاوہ تو ان دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔

ربہ، مشاہدہ اور عقل تینوں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ ساجھے کی ہنڈیا چوراہے پر پھوٹتی ہے لیکن کائنات اٹل قانون پر مبنی ہے، مضبوط و مستحکم اصول پر قائم و دائم ہے، بڑی باقاعدگی اور حیرت انگیز ڈسپلن میں جکڑی ہوئی جاری ساری ہے اور پھر یہ ممکن بھی تو نہیں ہے کہ دو ہستیاں برابر کے اختیارات کی مالک ہوں اور یہ کیسے ممکن ہے کہ دو ہستیاں کلی اختیارات رکھتی ہوں۔ یہ عقلی استحالہ اور کائنات کا استحکام منہ سے بول رہا ہے کہ اللہ ہی تنہا خالق، مالک اور حاکم ہے لہذا صرف وہی مستحق عبادت ہے اور اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔

ل • قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ (اخلاص) کہو وہ اللہ ایک ہے۔ اللہ بے نیاز ہے اور باہمہ ہے

اللہ کے سب محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں ہے پوری کائنات اور تاریخ کا ہر ورق اور عقل و مشاہدہ کا پورا ریکارڈ گواہ ہے کہ وہ مختار کل ہے اسے کسی کی احتیاج نہیں ہے کائنات کا ذرہ ذرہ اور انسان کا رونگٹا رونگٹا اپنی پیدائش اپنی بقا اور نشو و نما میں اس کا محتاج ہے اور محتاج رہے گا لہذا وہ تنہا مستحق عبادت ہے اور اس کا کوئی سہیم و شریک نہیں ہے۔

اشارات کا بقیہ

امت مسلمہ اپنی حقیقت سے، اپنی حیثیت سے اور اس امانت کے حسن و جمال سے بے خبر ہو گئی ہے جو اللہ نے اس کے سپرد کی ہے، اس نے اپنے ہمہ گیر دین کو محدود قسم کا مذہب، اور اپنے آپ کو دنیا کی دوسری قوموں جیسی ایک قوم بنا لیا ہے، وہ اپنے مسائل کو اسی زاویۂ نظر سے دیکھنے کی عادی بن چکی ہے جس سے دوسری قومیں اپنے مسائل دیکھتی ہیں، اس کے سوچنے کا ڈھنگ بھی وہی ہے جو دوسروں کا ہے وہ اپنا فریضۂ حیات اس طرح بھول چکی ہے کہ یاد دلانے پر بھی اسے یاد نہیں آتا۔ جماعت اسلامی کہتی ہے کہ اسلام ناقص قسم کا مذہب نہیں، مکمل دین ہے، مسلمان، دوسری قوموں جیسی کوئی قوم نہیں، اصولی جماعت ہیں، خود ایک مستقل پارٹی ہیں، مسلمانوں کا زاویۂ نظر وہ نہیں ہو سکتا جو دوسروں کا ہے۔ اقامتِ دین ہمارا فریضۂ حیات بھی ہے اور اسی کی جدوجہد ہمارے تحفظ کی بھی ضامن ہے۔ جب تک ملت اسلامیہ کا زاویۂ نظر اسلامی نہ ہو جائے، جب تک وہ مسلم مومن ذہن سے اپنے مسائل نہ سوچے اور جب تک وہ اپنا فریضۂ حیات ادا نہ کرے، بھارت میں وہ عزت کا مقام نہیں پا سکتی اور نہ نصرت الٰہی کی مستحق ہو سکتی ہے۔ جماعت، بیس سال سے اپنا یہ نقطۂ نظر پیش کر رہی ہے اور ان شاء اللہ آئندہ بھی کرتی رہے گی کیونکہ وہ اسی نقطۂ نظر کو صحیح ترین نقطۂ نظر سمجھتی ہے۔

خانہ داری اور رہبانیت

جناب سلطان مبین صاحب، ایم اے (سنسکرت)

دنیا میں ایک مخصوص طرز فکر کی وجہ سے رہبانیت وجود پذیر ہوئی ہے۔ میرے ناقص اندازہ کی رو سے متاخر ہوتے بھی بانی وہ شخص ہے جس نے رہبانیت کو ایک باقاعدہ نظام فکر کی صورت میں پیش کیا ہے۔ ہندوستان میں جین مذہب کے بانی مہاتما مہابیر نے اصول رہبانیت کو مکمل طور پر نبھانے کی کوشش کی۔ مہاتما بدھ اصولاً رہبانیت پر ایمان رکھتے تھے مگر احکام کے استنباط میں وہ رہبانیت کی سختیوں کے خلاف تھے۔ آپ نے رہبانیت کے سخت شکنجہ کو کچھ ڈھیلا کرنے کی کوشش فرمائی۔ یونانی فلسفہ پر بھی رہبانیت کا سایہ پڑ چکا تھا۔ مسیحیت اپنی عمر کی ابتدائی کئی صدیوں تک رہبانیت کا صید زبوں بنی رہی اور آج بھی، بودھ، جین اور مسیحی بزرگ رہبانیت کی سنۃ جاہلیہ پر بڑی سختی و پابندی کے ساتھ عامل ہیں۔ رہبانیت کا اصل الاصول یہ ہے کہ دنیا آلام گاہ، برائیوں کا سرچشمہ اور دام فریب ہے۔ جو شخص دنیا سے کنارہ کش ہو کر زندگی نہیں گزارتا ہے جو گوشہ نشین نہیں ہوتا بلکہ بالفعل دوڑ دھوپ اور زندگی کی جدوجہد کرتا ہے وہ آلام و مصائب کے اضافے کا سبب بنتا ہے برائیوں کا بڑھاتا رہتا ہے اور خود دام فریب میں پھنس کر دوسروں کو پھنساتا ہے۔ عورت سب سے بڑا پھندا ہے جو انسانوں کو بری طرح پھانس لیتا ہے۔ اس طرح شادی کرنا خود کو ہلاکتوں میں ڈالنا ہے اور چونکہ رہبانی عقیدہ کے مطابق زندگی ایک عذاب ہے، ایک برائی ہے اور دوسری برائی کا آلۂ کار ہے۔ اس لیے زندگی کا دوسری زندگی کو پیدا کرنا بدترین گناہ ہے۔ انسان اولاد پیدا کر کے ایک عذاب ایک برائی اور ایک برائی کے آلہ کار کو پیدا کر دیتا ہے اور اس طرح سے برائیوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے پس اولاد پیدا کرنا ایک متعدی، سدابہار، دن دونا رات چوگنا بڑھنے والا گناہ ہے۔ اس طرح شادی کرنا اور اولاد پیدا کرنا اکبرالکبائر ہے۔ چونکہ زندگی برائی کی ایک سوت ہے اس لیے اس سوت کو سکھا دینا بڑی نیکی ہے، اس لیے سخت ریاضتیں کرنا اور اپنے جسم کو اذیتوں میں مبتلا رکھنا باعث ثواب ہے۔ لذیذ کھانوں اور ذائقہ دار غذاؤں سے طبیعت کو فرحت ملتی ہے اور جسم کو قوت ملتی ہے اس لیے لذیذ اور مقوی کھانوں سے پرہیز کرنا چاہیے۔ گوشت، دودھ، مچھلی، گھی اور چربی کا استعمال ترک کر دینا چاہیے۔ زندگی چونکہ ایک برائی ہے اس لیے اگر کوئی شخص اس برائی کو ختم کر لینے کے لیے خودکشی کرتا ہے تو کوئی قابل گرفت بات نہیں، بلکہ یہ ایک نیک فعل ہے اور خودکشی کرنے والا برائی کو مٹانے کی

وجہ سے نجات کا زیادہ مستحق ہے۔ فی الجملہ راہبین عالم کا اس پر اجماع ہو کہ شادی کرنا، توالد و تناسل، عمدہ کھانے، دودھ گوشت و مچھلی کھانا گناہ ہیں اور خودکشی کرنا ایک نیک و ثواب بخش فعل ہے۔ بالخصوص ہندی راہبین دنیا سے کنارہ کشی کرکے کسی پانی کے کنارے جھونپڑی بنا کر رہتے تھے۔ یہ بزرگ انسانوں سے الگ تھلگ رہتے تھے اور آبادیوں سے گھبراتے تھے محنت کشوں اور خانہ داروں کو یہ لوگ اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ رہبانیت کا عقیدہ ان کو انسانوں سے نفرت کا سبق دیتا تھا۔ ان کے آشرم اور جھونپڑوں میں سایہ اور پانی کی تلاش میں چرند و پرند آتے تھے۔ اور یہ پرندے اور جانوران کے ہمسایہ بن جاتے تھے۔ یہ راہب رشی منی ان جانوروں سے محبت کرنے لگ جاتے تھے اور یہ مرنجان مرنج بزرگ درختوں، پودوں کی ٹہنیوں اور پتیوں کے توڑنے میں تکلیف محسوس کرتے تھے۔ کلی، تازہ پھولوں اور پھلوں کو چننے سے ان کے دلوں کو صدمہ پہنچتا تھا۔ اگر کوئی شکاری آشرم کے ہرن و مور کو پکڑ لیتا تو ان کے دل تڑپ جاتے تھے۔ شدہ شدہ ان رشیوں کی شریعت میں شکار، درختوں کی پتیوں، ٹہنیوں، پھلوں اور پھولوں کا چننا حرام ہو گیا۔ آج بھی عوام اس طرح کے راہبوں سے گہری عقیدت رکھتے ہیں پھر دو ہزار سال قبل کے عوام کا کیا کہنا۔ عوام راہبین کے اس طرز عمل سے متاثر ہوئے اور یہ ایک مثالی سنت ہو گئی کہ سبزہ، درخت کو کاٹنا چھانٹنا، پتی، کلی، پھول اور پھل کو چننا، دانہ اناج کو کوٹنا، پیسنا اور بھوننا، مچھلیں، پرندوں اور جانوروں کا شکار کرنا، پکڑنا اور ذبح کرنا گناہ ہو اور چونکہ گوشت جانور کے ذبح کے بعد ہی مل سکتا ہے اس لیے گوشت خوری ایک فعل قبیح ہے اور اس خوشنما عقیدے کی گرفت ہندی باشندوں پر اتنی شدید تھی اور ہے کہ ہندوستان نے اسلام کی جملہ سچائیوں اور مسلمانوں کی بے مثل پاکبازیوں کو کالعدم قرار دیا کیوں کہ اسلام قربانیوں کا قائل ہے اور مسلمانوں کے صلحا، اولیا و اتقیا سبھی گوشت خور تھے اور ہیں۔ ہندو علماء اور راہبین نے عوام کو مسلمانوں سے بدگمان کرانے اور انہیں اسلام سے بدکلنے کے لیے اس شوشے کو خوب دل کھول کر نمایاں کیا۔ قومی شاعر کبیر بڑے زور سے فرماتے تھے:۔

بکری پاتی کھات ہے تاکی کھینچے کھال　　جو نر بکری کھات تاکی کون حوال
دن کو روزہ رکھت ہیں رات ہنت ہیں گائے　　یہ ہتیا، یہ بندگی کیوں راضی ہو خدائے

مغل بادشاہ اکبر بھی گوشت خوری پر حکم امتناعی صادر فرماتے تھے۔ جب عوام نے راہبوں کے اس حسین ترین صداقت کو تسلیم کر لیا کہ سبزہ و درخت کو کاٹنا چھانٹنا، پھل و پھول کا چننا، اناج کو کوٹنا پیسنا اور بھوننا، اور پرندوں جانوروں اور مچھلیوں کا شکار کرنا اور پالنا گناہ ہے تو لازماً گھسیاروں، لکڑہاروں، بڑھئیوں، حلوائیوں، کاشتکاروں، کوٹنے پیسنے اور بھوننے والوں، تیلیوں، بہیلیوں، بوچڑوں اور چماروں کو گنہگار یا جرائم پیشہ تسلیم کرنا پڑا۔ دانہ، سبزہ، سانپ اور

ساتھ سے ہمدردی رکھنے والے راہبوں اور شرفا کی پیہم تذلیل و توہین نے ان مزدوروں اور کاشتکاروں کو چھوت بنا کر دم لیا۔ بھلا جو جنگلوں اور جانوروں میں رہتا ہوا اور نعمتوں میں پلا ہو وہ انسانوں کی قدر کیا کرے گا؟

نکاح، تولید، مقوی اغذیہ کی حرمت کے بعد اور خودکشی کے استحسان کے بعد ہندی رہبانیت کے نزدیک نباتات اور حیوانات کا احترام لازمی ہے پس خانہ داری، کاشتکاری اور دستکاری، نجاری، آہنگری، ماہی گیری وغیرہ گناہ کے کام ہیں اور چونکہ محنت و مزدوری کرنا براہ راست دنیا کی جدوجہد میں حصہ لینا ہے اور اناج و دانہ کوٹنا، پیسنا بھوننا اور کیڑے مکوڑوں کی وجہ سے پانی لانا اور ابالنا سراسر گناہ ہے اس لیے محنت و مزدوری نہیں کرنی چاہیے۔ البتہ (جین سادھوؤں اور بودھ بھکشوؤں اور برہمنوں کی طرح) پکا پکایا کھانا مانگ کر پیٹ بھرلے اور دوسروں سے البلا کر پانی پی لے، یا پسا پسایا آٹا، دلی دلائی دال، کٹا کٹا یا چاول حاصل کر کے نوکر اور کہار سے چوکا برتن کروالے، آٹا گندھوالے، آگ جلوائے، روٹی پکوائے۔ ہاں جب روٹی توے پر جلنے جائے تب اس کو سنبھالے اور کھچڑی اور ترکاری کو نوکر سے پکوا تا پکواتا نمک ڈال کر اپنالے۔ آپ دنگ رہ جائیں گے کہ یہاں کے بزرگ کتنے چالاک اور شاطر ہیں اور مزدور کتنے بیوقوف اور ناسمجھ شریف خدمتگار ہے۔ برہمن شودر سے خدمت لیتا ہے اور پورے اذعان و یقین سے خدمت لیتا ہے کہ خدمت کرنا گناہ ہے تاکہ شریف برہمن کو کبھی بھول کر خدمتگار اور شودر کا ممنون و مشکور نہ ہونا پڑے۔ شودر بھی خدمت کر کر کے گناہوں کی گٹھری باندھتا رہتا ہے۔ بھلا ایسے خدمتگار کو یہ احساس کب پیدا ہوگا کہ وہ بھی تمدن کی تعمیر کا حصہ دار ہے یہ ہے فریب دہی اور احسان فراموشی کی انتہا۔ ایک حسین ترین عقیدہ کی رو سے بھیک مانگنا پاکیزہ ترین عمل ہو جاتا ہے اور محنت مزدوری گناہ

رہبانیت شاید ایک مرض ہے جو قوموں کو زوال کے وقت ہو جاتا ہے۔ جب وہ تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر لیتی ہیں اور جب ان کی جوانیاں ڈھلنے لگتی ہیں اور کمزوریاں گھر کر لیتی ہیں۔ حوصلے پست ہو جاتے ہیں تو وہ خود ہی رہبانیت کا کلمہ پڑھ کر میدان چھوڑ کر ہٹ جاتی ہیں اور خانقاہوں اور حجروں میں پیری کے دن کاٹتی ہیں۔ آرین جب سرزمین ہند میں اترے تو ان میں زندگی کی طاقت تھی انھوں نے اپنے زور بازو سے یہاں کے دراوڑوں کو جیت لیا۔ ہرچند کہ یہ مشرک تھے اور ان کا مذہب آتشیں قربانیوں کا مذہب تھا مگر نہ جانے کس ذات گرامی کے اثر سے ان میں کچھ تندرست عقاید ابھرے اور پھر وہ ایسے نیچے بیٹھے کہ ان کا ابھرنا اب ذرا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ ہندو علما ان موتیوں کو ڈھونڈھ نکالنے سے قاصر ہیں کیونکہ ان کے پاس کوئی ایسا معیار نہیں ہے جس سے وہ موتی کو پوت سے ممتاز کر سکیں نہ ان کو غواصی اور صیرفی کی ضرورت ہے۔ ضرورت ان کو ہے جو خود کو رسالت کا امین کہتے ہیں۔ خیر آرین ایک جیتی جاگتی قوم تھی اس کا نقطہ نظر رہبانی نہ تھا بلکہ اگر یوں کہیں

کہ وہ ٹھیٹ دنیادار تھے تو بے جا نہ ہوگا۔ ویدوں کی دعائیں بالعموم اولاد، دولت، بیوی، خدمتگار اور مویشیوں کی یافت کے لیے کی گئی ہیں۔ آخرت کی سرخروئی کے لیے شاذ ہی کوئی دعا کی گئی ہو۔ بات یوں بھی ہے کہ ویدوں میں آخرت کا تصور بہت کچھ دھندلا ہے۔ مگر ہم بعد کے سوتر (متن) اور رزمیہ ادب میں جنت و جہنم کے عقیدہ کو بہت ہی روشن اور چمک دار پاتے ہیں اسی طرح ویدوں میں جنگ کے مقتولین کی شہادت و کامرانی کا ہلکا سا اشارہ ملتا ہے۔ مگر بعد کے رزمیہ ادب میں جنگ کے مقتولین کے لیے جنت و شہادت کی بشارتیں بھری پڑی ہیں جنگوں کے تقدس کا عقیدہ ہندو انڈیا کا ایک رواں دواں عقیدہ ہے مقتول جنگ کو قطعی جنت کی بشارت تھی ہمارے مورخوں نے اس عقیدے کو چھپانے کی بڑی کامیاب کوشش کی۔ وہ بالعموم کہتے ہیں کہ مسلمان شوقِ شہادت میں لڑتا تھا اور ہندوؤں کے پاس اس طرح کا کوئی عقیدہ نہیں تھا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندو بھی جنت و دوزخ کا عقیدہ قطعی طور پر رکھتا تھا وہ بھی جانتا تھا کہ لڑائی سے بھاگنے والا دوزخ میں جاتا ہے اور جنگ میں مرمٹنے والا جنت میں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ ہندو تشکیک کا شکار تھا اور مسلمان یقین و اعتماد سے بھرپور — مگر تھے دونوں شہادت کے شوقین۔ جب کوئی قوم جنگ کو دروازۂ جنت کہتی ہو بھلا وہ خانہ داری سے کیونکر گریزاں ہو سکتی ہے بلکہ ہر ہندی آرین کے لیے بچہ پیدا کرنا لازمی تھا۔ لاولد کے لیے جنت کا دروازہ وا نہیں ہوتا تھا۔ پھر اولاد ایک سے زائد چاہیے ایک لڑکے کو لڑکا کہنا غلط ہے۔ آرین کثرت اولاد پر فخر کرتے تھے اسی لیے پورانوں میں سو سو ہزار ہزار، ساٹھ ساٹھ ہزار اور لاکھ لاکھ لڑکوں کا ذکر ملتا ہے۔ لڑکی کی شادی کرنے والے کے لیے کئی پشتوں کی خوش خبری دی گئی ہے۔ پھر ایسی قوم بھلا راہبوں کی طرح نکاح کو گناہ کس طرح مان سکتی تھی؟ پھر ایسی قوم جو خانہ داری کو جنت کا وسیلہ سمجھتی ہو۔ جنگ میں مرجانے کو شہادت سمجھتی ہو وہ خودکشی کی مرتکب کیونکر ہو سکتی ہے؟ پھر جو قوم جنگ کو ایک مقابس فریضہ جانتی ہو وہ تیر اندازی و شہسواری کی مشق نہ کرتی ہو، ناممکن ہے۔ بغیر شکار کھیلے اور شکار کے پیچھے گھوڑا دوڑائے بھلا پرانے زمانے کا آدمی کیونکر شہسوار ہو سکتا تھا۔ اسی لیے تو پوران ہندو راجاؤں کے شکار کے واقعات سے پر ہیں اور شکار کرنے والا گوشت نہ کھائے یہ بھی عجیب بات ہے۔ ہندو فقہ کی کتابوں میں ماکول وغیر ماکول حیوانات کی بڑی بحثیں ہیں۔ خوفِ طوالت سے ہم ان کو یہاں کم ہی نقل کر پائیں گے۔

راہبین کے طرزِ فکر و عمل نے جب ایک طرف خانہ داری، نکاح، اولاد، جنگ اور گوشت خوری کو گناہ بتانا شروع کیا، دوسری طرف ملحد فلسفیوں نے خدا اور بہشت و دوزخ کے مقابلہ میں کرم اور تناسخ کا حریفانہ عقیدہ بڑے شد و مد سے پیش کرنا شروع کیا۔ پھر کیا تھا۔ ہندو متکلمین ان ملحد فلسفیوں سے مرعوب ہو گئے۔ انھوں نے ملحدوں کے عقیدے کو قبول کر لیا اور زمانہ دانی سے خدا اور بہشت و دوزخ کے عقیدے کے ساتھ اس کے حریف عقیدہ کرم اور تناسخ کو جمع کر لیا۔ مگر راہبوں کے اس عقیدے کو کہ جنگ اور گوشت خوری برے کام ہیں، آسانی سے قبول نہیں کیا گیا۔ ہندو متکلمین نے بڑے عالمانہ انداز میں جنگ اور

وشت خوری کی معقولیت پر دلائل فراہم کیے۔ مہابھارت میں گوشت خوری کے حق میں ایک پورا باب اتنا خوبصورت ہے کہ وہ ہندو
نین کے زورِ طبع اور ذہانت و بصیرت کا شاہد گویا ہے۔ ہرچند کہ ہندو متکلمین نے گوشت خوری کی طرف سے بڑی معقول مدافعت
ں۔ مگر بودھ اور جین مذاہب کی مقبولیت اور رواج نیز عقیدۂ اہنسا کی ظاہری خوشنمائی کے سبب سے عوام کے جذبات گوشت خوری
ے خلاف ہوگئے۔ مجبوراً ہندو علماء کو بھی گوشت خوروں کے خلاف منہ کھولنا پڑا۔ گوشت خوری کی مذمت کے بغیر ہندو مفکرین
عوام پر اثر ڈالنا ناممکن ہوگیا۔ اسی لیے ہم ہندو ادب میں گوشت خوری کی وکالت اور مخالفت دونوں پاتے ہیں۔ مہاتما بدھ
رہبانیت کی تعلیمات کی اشاعت کی وجہ سے ہندو عوام کو جنگ کے تقدس میں گاہے بگاہے شبہ ہو جاتا تھا۔ ہندو مفکرین کو اس
بھی کبھی کبھی جواب دینا پڑتا تھا۔ گیتا کی ابتدا ہی اسی رہبانی، بودھی یا جینی شبد — "جنگ ایک گناہ آلود فعل ہے" سے
ی گئی ہے اور گیتا کے ابواب میں جنگ کے جواز کے لیے ہر معقول و غیر معقول دلیل بیان کی گئی ہے۔

قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ آرین لوگ ہندوستان میں اترتے وقت گلہ بان تھے۔ مگر وہ یہاں جم جانے کے بعد زراعت
پیشہ ہوگئے۔ گلہ بانوں کی زندگی گوشت پوست اور دودھ پر ہوتی ہے اور وہ خانہ بدوش ہوتے ہیں۔ مگر کاشتکاروں کی
ندگی سبزی و غلہ پر بسر ہوتی ہے اور وہ ایک جگہ پر زمین گیر ہو جاتے ہیں۔ جین و بودھ نظریہ کے مقبول ہو جانے کے بعد
کھیتوں کی جتائی، آبپاشی، نرائی اور کٹائی بھی قابل گرفت و اعتراض دکھائی پڑنے لگیں۔ کھیت جوتنے میں ہزارہا کیڑے مکوڑے
ور کینچوے کٹتے مرتے ہیں۔ آبپاشی میں تالابوں کو سکھا دینے سے اور پانی کو کھیت میں چلا دینے سے تالابوں اور کھیتوں میں بےشمار
مچھلیوں اور کیڑوں کی موت ہوتی ہے۔ پانی کے مکینوں کو یوں تکلیف دینا اور مارنا مہاتما مہابیر اور بدھ کی نظروں میں صریح گناہ تھا۔
جو بھکشو جان کر جانداروں سمیت سبزہ یا مٹی کو سینچے یا سینچوائے اسے کفارہ (گناہ کبیرہ) ہے۔ — ونے پٹک: بھکشو پرتی موکش: نرانا
گناہ سے خالی نہ تھا۔ "سبزہ و درخت کے گرانے میں کفارہ ہے"۔ (ایضاً) کیونکہ نرانے میں ہرے بھرے گھاس پات کو اکھاڑنا پڑتا
ا۔ البتہ فصل کاٹنے میں کوئی گناہ نظر نہیں آتا تھا۔ کیونکہ کٹائی کے وقت فصل سوکھ جاتی ہے اور پودے مر جاتے ہیں۔ غرضیکہ کھیتی
ڑی گلہ بانی سے بڑھ چڑھ کر گناہ آلود ثابت ہوئی اور پھر برہمنوں اور بدھ کی نظریں بڑی باریک تھیں۔ انھوں نے پہلی ہی نظر میں
فیصلہ کر لیا تھا کہ عامل اور عمل کے معاون و محرک کم و بیش ایک ہی حکم رکھتے ہیں۔ نیکی کرنے والا، نیکی میں مدد کرنے والا اور نیک بات
سکھانے والا یقیناً ثواب کے مستحق ہیں۔ آدمی کی گردن پر چھری چلانے والا، ہاتھ پاؤں پکڑنے والا اور ادھر ادھر دیکھنے تاکنے والا
دوست یہ تینوں قتل کے مجرم ہیں۔ تالہ توڑنے والا، اندر گھسنے والا، باہر کی آہٹ پر نظر رکھنے والا اور سامان لاد لاد کر لے جانے والا
مکان کا پورا گروہ چور سمجھا جاتا ہے۔ جب نگاہ اتنی تیز ہو اور جانوروں، کیڑوں مکوڑوں اور سبزہ جات کو آدمی سے بلند درجہ مل چکا
تو کھیتی کو لازماً ایک معصیت سے زیادہ اور کچھ نہ ہونا چاہیے۔ پھر کیا تھا؟ پاکبازوں نے فیصلہ کیا کہ راہبین و سنیاسیوں کو کھیتی کا

ج کھانا ہی نہ چاہیے۔ بزرگوں کی اس روش سے مالداروں نے بھی مزدوروں سے ہل جتوانا، فصل کٹوانا اور پانی دلوانا
ع کردیا۔ آخر سکت رہتے ہوئے وہ کیوں گناہ کا کام کریں۔ یہاں پھر گناہ کا کام شودروں کو کرنا پڑا اور شرفاء نے
وسا خود کواتنے ہی پر مطمئن کر لیا کہ ہم اپنے ہاتھوں سے تو گناہ کا کام نہیں کرتے ہیں۔ یہاں پہنچ کر یہ بات خود بخود صاف
جاتی ہے کہ ہمارے ملک میں شرافت کے معیار فی الحقیقۃ تمام تر جین، بودھ اور برہمن مذہب کے اصولوں اور بنیادوں پر قائم
، مذہبوں کی تاثیر قوموں کی زندگی میں بڑی دور رس ہوتی ہے ۔ (اسلام کا کلمہ قبول کر لینے کے بعد ہمارا معیار شرافت وہی
ہلانہ ہے۔ اصل میں ایک مذہب سے پورے طور پر نکل کر دوسرے مذہب میں پورے طور پر داخل ہونا بڑے اونچے کردار والے
فراد ہی کے لیے ممکن ہوتا ہے)۔

فی الجملہ دو طرز فکر تھے۔ ایک راہبانہ اور دوسرا خانہ دارانہ۔ ایک فلسفہ کے غلو کا نتیجہ تھا اور دوسرا فکر صالح یا وحی
ف کا۔ ایک کے علمبردار مہابیر و گوتم تھے تو دوسرے کی مدافعت برہمن کرتے تھے۔ ایک گھر میں رہنے کو حرام مانتا تھا، دوسرا
ھر کی ضرورت کا قائل تھا۔ ایک تجرد محض کا معتقد تھا، دوسرا اولاد کو جنت کی کنجی سمجھتا تھا۔ ایک ترک لذت پر سختی سے
عامل تھا تو دوسرا دودھ، گھی اور گوشت سے گریز نہیں کرتا تھا۔ بعد کے برہمن فقہا نے دونوں طرز فکر اور رجحانوں کے فرق
: تیاز اور تباین و تضاد کو نظر انداز کر دیا اور وہ جینیوں اور بودھوں کے تجرد و رہبانیت سے مرعوب ہو گئے اس لیے انھوں نے
دونوں نقطۂ نظر کو ایک ہی انسان کی زندگی میں نبھانے کی کوشش کی۔ ایک ہی انسان کو کبھی خانہ دار (گرستھ) رہنے کو کہا گیا
اور کبھی گھر بار چھوڑ کر جنگل چل دینے (بان پرستھ جنگل کو روانگی) کو بچپن و عنفوان شباب میں تجرد و ترک لذات کا مفید مشورہ
دے کر سخت پیری کے عالم میں رہبانیت کے سخت ترین قواعد کی پیروی کی سفارش کی گئی۔

مردہ کی وجہ سے میت کے گھر والے حکماً ناپاک ہو جاتے ہیں اور یہ نجاست ہفتہ عشرہ تک قائم و جاری رہتی
ہے اور اس پر ستم یہ ہے کہ میت کی خبر سن کر دور کے رشتہ دار و قرابت دار بھی ناپاک ہو جاتے ہیں۔ ہندو فقہ کے احکام اور
بھوت پریت کی وجہ سے ہندو عوام میت سے ڈرتے اور بدکتے تھے اس عالم میں بوڑھا سنیاسی جنگلوں میں کس طرح بال بچوں
سے دور بے کسی کے عالم میں سسک سسک کر جان دیتا ہوگا۔ بیمار ہو جانے پر اس کی مصیبت دوچند ہو جاتی ہوگی
سنیاسی کو اکیلا اور تنہا رہنے کی ہدایت تھی۔ نہ وہ دوا کا استعمال کر سکتا تھا نہ کسی دوسرے سے مدد لے سکتا تھا (منو سمرتی
۶، ۴۴-۴۹) آخر کسی بان پرستھ یا سنیاسی کو ان باتوں کی اجازت کیسے ہو سکتی تھی؟ ایک خانہ دار گھر میں رہ کر یہی تو
کرتا ہے۔ وہ بہت سے لوگوں کے ساتھ رہتا ہے۔ بیماری میں دوا دارو کر سکتا تھا۔ دوسروں سے مدد لیتا ہے سنیاسی
کو بہر حال گرہستھ سے ممتاز ہو کر کوئی مثالی کردار ادا ہی کرنا چاہیے۔ ان بے کس بے یار و مددگار بوڑھوں اور بیماروں کی

تکلیف دیکھ کر پتھر بھی پگھل جاتا ہے۔ ان تکلیفوں سے نجات کی صورت بس خودکشی ہی تھی اسی لیے چاروناچار ہندو فقہاء نے آگ اور پانی میں خودکشی کرنے کی عام اجازت دے دی۔ ہندو اساطیر خودکشی کے سانحوں سے پُر ہیں۔ شری رام چندر جی اور ان کے تینوں بھائیوں نے دریائے سرجو میں ڈوب کر خودکشی کی۔ ارجن وغیرہ پانچوں بھائیوں نے ہمالیہ پہاڑ کے برف میں خودکشی کا ارتکاب کیا۔ غرض مثالی کرداروں کی خودکشی کی بات ہندو اساطیر کا ایک اسلوب ہے۔ مثالی کردار کو جنگ میں دوسروں کو مارنا ہوتا ہے۔ اس کو جنگ میں شہید بنا کر کس طرح شکست سے دوچار کر سکتے ہیں بستر پر مرنا معیوب بات ہے بس خودکشی کی شہادت ہی ایک وصف ہے جس سے ان کرداروں کو متصف کیا جا سکتا ہے۔ پھر خودکشی کے اس رجحان نے ایک اور موڑ لیا۔ بودھ اور ہندو اساطیر میں ہم یہ بھی پاتے ہیں کہ مثالی کردار اپنے جسم کو شیرنی کی غذا بنا کر پیش کرتا ہے۔ اپنے جسم کے پارچے کاٹ کاٹ کر باز کو چارہ دیتا ہے۔ اسی کے ساتھ ستی کے رجحان کو شامل کر لیں۔ خودکشی کے رجحان اور موضوع کہانیوں نے انسانی زندگی کا کتنا استخفاف کیا ہوگا ہم اندازہ و قیاس نہیں کر سکتے۔ رہبانیت منش بزرگ اور اہنسا پرمو دھرمۃ کہنے والے حضرات نے کھٹمل اور جوؤں کے ساتھ ہمدردی کرتے کرتے پورے ملک کو انسانیت کے استخفاف و تذلیل کے دروازہ تک پہنچا دیا۔ ان اساطیر و روایات نے اور اس رجحان نے ہمارے عوام کا ذہن ایسا بنا دیا ہے کہ وہ چوری، ڈاکہ، رشوت، مزدوروں سے زنا، قتل پر کسی غم و غصہ کا اظہار نہیں کرتے۔ البتہ ہرن، نیل گاؤ، مچھلی اور چڑیوں کے شکار اور گائے کے ذبیحہ پر انسانی خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے۔

اور ایسا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ گرہستھوں کا عین عالم پیری میں سنیاس لینا صرف کتاب و داستان کی زینت و رنگ آمیزی ہو۔ بھلا بیٹے اور پوتے (بیٹے کے بیٹا ہو جانے ہی پر سنیاس لینے کی اجازت تھی) اور خاندان کے لوگ اور رشتہ دار پچاس اور پچھتر برس کے باپ اور دادا کو کس طرح جنگل میں جانوروں کی طرح مرنے کے لیے چھوڑ دیتے ہوں گے؟ اور پھر بان پرستھ اور سنیاس کا رجحان رہبانی اثرات ہیں اور ان باتوں کا اثر قدیم ہندو ادب (وید، برہمن، سوتر ادب) میں بڑی حد تک ناپید ہیں اور بدھ و مہابیر کے بعد ہندو ادب (پورانوں، مہابھارت، سمرتیوں) میں سنیاس و بان پرستھ کی ہدایتیں تفصیلاً موجود ہیں اور یہ متاخر سلسلۂ ادب خطرناک حد تک موضوع ہے اور ان سے براہ راست تاریخی استشہاد کرنا صحیح نہیں۔ ان میں محض سماج کے احساسات اور مزاج کے عکس کو دیکھنا ہی صحیح ہے۔ بہرحال سنیاس و جنگل کی روانگی کے واقعات شاذونادر واقع ہوتے تھے۔ پھر مرعوب و متاثر فقہاء نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا کہ انھوں نے انسانی زندگی کو چار خانوں میں تقسیم کر دیا بلکہ انھوں نے رہبانیت کے رکھ رکھاؤ میں مہابیر اور بدھ کی وجہ سے "گنہگاروں" کا جو ایک طبقہ نمایاں تر ہوتا جا رہا تھا اس کو "شودر" کا نام دے کر تمام الزام اپنی گردن پہ رکھتے ہوئے انسانیت کو چار خانوں میں تقسیم کر دیا۔ اچھوتوں کو پیدا کرنے کی پوری ذمہ داری مہابیر

رہا تھا بدھ پرہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ ہندو فقہار نے نظریہ رہبانیت کو قبول کر لینے کے بعد ذات پات کی لعنت کا داغ وشی اپنے ماتھے پر لگا لیا۔ ع تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

نکاح اور تجردِ مطلق

قارئین برہم چریہ (تجرد) سنیاس (ترک وطن) کی باتیں تو ہر ہندو کی زبان سے سنتے ہوں گے اس لیے اس کے حوالے کو نقل کرنا تحصیل حاصل سمجھ کر اولاد جنت کی کنجی ہے کے حوالے کو نقل کر رہا ہوں۔ لاولدی اور لڑکے کی لاولدی آبا و اجداد کے لیے عذاب کا سبب بن جاتی تھی۔ اولاد ہی کی نذر و نیاز کی وجہ سے اجداد کو جنت میں مستقل جگہ مل جاتی تھی۔ خاندان کے بے چراغ ہو جانے پر اجداد کو جہنم میں جانا پڑتا تھا۔ ایک سنیاسی نے اپنے آبا و اجداد کو غار میں لٹکتا ہوا دیکھ کر اپنی سب نیکیوں کی پیش کش کی۔ مگر انھوں نے کہا ہمارے پاس بے شمار ریاضتوں کا ثواب ہے مگر ہم لوگ بے اولادی کی پاداش میں دوزخ میں گرنے ہی والے ہیں۔ اگر ہمارا بے اولاد لڑکا شادی کر کے صاحب اولاد ہو کر خاندان کو آگے چلائے تو ہم لوگ اس عذاب سے بچ سکتے ہیں۔ چنانچہ اجداد نے فرمایا:۔

۱۲۔ آپ بوڑھے برہمچاری ہیں جو ہم کو بچانا چاہتے ہیں۔ بزرگ برہمن! ہماری سزا تپ و ریاضت سے دفع نہیں ہو سکتی۔ (۱۳) لائق مقرر! ہمارے پاس ریاضت کا ثواب ہے مگر ہم بے اولادی کے سبب سے ناپاک دوزخ میں گر رہے ہیں ۔ (۱۴) برہما نے فرمایا ہے کہ اولاد عظیم ترین نیکی ہے۔ عزیز! ہم لٹکتے ہوئے بے ہوش ہو رہے ہیں۔ (۱۵) دنیا میں مشہور اور باہمت شخص آپ کو چونکہ ہم نہیں جانتے ہیں۔ آپ یقیناً بزرگ اور خوش قسمت ہیں۔ (۱۶) جو از رہ ہمدردی ہم غمزدوں اور دکھیوں پر ترس کھا رہے ہیں۔ سنیے ہم کون ہیں ہم لوگ مشہور ریاضت کرنے والے یایا بر رشی لوگ ہیں۔ (۱۷) منی! اولاد کے خاتمہ کی وجہ سے ہم لوگ یہاں عالم بالا سے گرائے گئے ہیں ہماری سخت ریاضتیں بیکار ہو گئیں کیونکہ ہمارے لیے کوئی رشتہ نہیں رہا۔ (۱۸) آج ہمارا ایک رشتہ رہ گیا ہے لیکن وہ ہم بدنصیبوں کا بدنصیب رشتہ ہے جو محض تپ کرتا ہے۔ (۱۹) وہ مہاتما بڑا مرتاض، زاہد، پرہیزگار، بزرگ، زندۂ جاوید، ویدوں اور ویدانگوں کا عالم "جرت کارو" نام سے مشہور ہے۔ (۲۰) تپ کی لالچ سے اس کے باعث ہم اس تکلیف میں مبتلا ہوئے ہیں۔ اس کے نہ بیوی ہے نہ بچہ اور نہ کوئی رشتہ دار ہے۔ (۲۱) اسی سبب سے ہم لوگ بے کسی اور بے ہوشی کے عالم میں گڈھے میں لٹک رہے ہیں۔ اگر آپ اس کو دیکھیں تو ہم پر نوازش فرماتے ہوئے اس سے کہہ دیں۔ (۲۲) کہ تیرے غریب باپ دادا اوندھے منہ گڈھے میں لٹک رہے ہیں۔ عورتوں سے شادیاں کر اور بال بچے پیدا کر۔ (۲۳) اے تپسوی! آپ جس برن گھاس کے ڈنٹھل سے ہم لوگوں کو لٹکا ہوا دیکھ رہے ہیں وہی ایک دھاگہ (رشتہ) ہمارے خاندان میں رہ گیا ہے۔ (۲۴) برہمن! اس گھاس کی جن جڑوں کو تم دیکھ رہے ہو وہی ہمارے خاندان کو بڑھانے والے پود ہیں۔ (۲۵) عزیز! زمانہ نے ہمارے ان دھاگوں (رشتوں) کو کھا ڈالا ہے۔ برہمن! جو تم آدھی کھائی ہوئی جڑ دیکھ رہے ہو —

(۲۶) جس کے سہارے ہم لوگ گڑھے میں لٹک رہے ہیں وہ وہی تپ کرنے والا تنہا (بیٹا) ہے۔ اور (گھاس کی جڑ کو کاٹ کاٹ کر کھانے والے) جس چوہے کو آپ دیکھ رہے ہیں وہ زمانہ ہے۔ (۲۷) یہ زمانہ دھیرے دھیرے تپ کرنے والے، غیر روشن ضمیر نافہم جرت کارو کو کاٹ رہا ہے۔ (۲۸) بزرگ! ہم جڑ کٹے ہوئے، گرے ہوئے اور بیہوش لوگوں کو اس کی تپسیا بچا نہیں سکتی۔ (۲۹) گنہگاروں کی طرح سے نیچے لٹکتے ہوئے ہم کو دیکھیے سبھی رشتہ داروں کے ساتھ ہمارے گر جانے پر۔ (۳۰) وقت آنے پر مرکر وہ بھی دوزخ میں جائےگا تپ، یگیہ اور دوسری سب نیکیاں اولاد کے برابر نہیں ہوتیں۔ مہابھارت: ۱: ۱۲ — ۳۰ دیگر

(۲۹) لاولد آدمی کے یگیہ، دان، پرہیزگاری یہ جملہ نیکیاں پاکیزہ نہیں کہی جاتیں۔ (۳۰) اے پاک تبسم والی! میں یہ سب جان کر دکھیا ہوں کہ لاولد ہوکر میں عالم بالا کو نہ پہنچ سکوں گا۔ یہ فکر کی بات ہے۔ مہابھارت: ۱: ۱۱۹: ۲۹ - ۳۰

یہ تو لڑکے کی افضلیت ہوئی اب لڑکی کی برتری دیکھیں۔ ہرچند کہ برہمن گرنتھوں میں لڑکے کو آسمانی نور اور لڑکی کو "قابل رحم" کہا گیا ہے مگر لڑکی کی پیدائش بھی ایک رحمت سے کم نہ تھی "لڑکی کو زیور کپڑا پہنا کر بیاہ دیوے یہ برہم بیاہ ہے۔ اس لڑکی سے پیدا ہوا فرزند (ماں باپ) دونوں طرف کی بارہ بارہ اگلی پچھلی پشتوں کو پاک کرتا ہے۔ یگیہ کے اختتام پر کاہن کو زیور کپڑا پہنا کر لڑکی دے دے یہ دیو بیاہ ہے (اس لڑکی سے پیدا ہوا فرزند دادا، نانا) دونوں طرف کی دس دس اگلی پچھلی پیڑھیوں کو پاک کرتا ہے " تم دونوں مل کر مذہبی زندگی گزارو" اس طرح بیاہ دیوے یہ پرجاپتی بیاہ ہے۔ (اس لڑکی سے پیدا ہوا فرزند دادا اور نانا) دونوں طرف کی آٹھ آٹھ اگلی پچھلی پیڑھیوں کو پاک کرتا ہے۔ ایک جوڑی گائے بیل دے کر جو بیاہ کرے وہ رشی بیاہ ہے (اس لڑکی سے پیدا ہوا فرزند دادا، نانا) دونوں طرف کی سات سات اگلی پچھلی پیڑھیوں کو پاک کرتا ہے۔ آشولاین گرہ سوتر: ۱: ۶ دیگر

(۳۷) برہم بیاہ کا نیکوکار فرزند دس دس اگلی پچھلی پیڑھیوں کو اور خود اکیسویں کو گناہ سے نجات دلاتا ہے۔ (۳۸) دیو بیاہ کا فرزند سات سات اگلی پچھلی پیڑھیوں کو، اور پرجاپتی بیاہ کا فرزند چھ چھ پشتوں کو اور رشی بیاہ کا فرزند تین تین پشتوں کو (گناہ سے نجات دلاتا ہے[۱]) منوسمرتی: ۳: ۳۷: ۳۸

دادا اور نانا کے ساتھ ساتھ دادی اور نانی باپ کے ساتھ ماں کی بخشائش بھی ہو جاتی تھی کیونکہ "رسم نکاح" سے بیوی شوہر کا جزو بن جاتی ہے۔ شوہر کی نجات پر لازماً بیوی کی نجات ہو جاتی ہے۔ ان حوالوں سے نکاح کی ضرورت و وجوب ثابت ہوتا ہے۔ مگر اس کے باوجود بھی سادھو، سنیاسی اور بہت حضرات تجرد محض کے حامل ہوتے ہوئے بھی تعدیں و نجات کے زیادہ مستحق سمجھے جاتے ہیں۔ یہ کھلا ہوا تضاد ہے۔

---

[۱] مقابلہ کریں "انسان مرجاتا ہے تو اس کے عمل منقطع ہو جاتے ہیں۔ ہاں تین باقی رہتے ہیں ...... ۳۔ ولد صالح جو دعا کرتا رہتا ہے" مسلم۔ حدیث نمبر: جس نے دو لڑکیوں کی پرورش و پرداخت کی وہ اور میں (محمد صلعم) جنت میں ہم درجہ ہوں گے۔ مسلم

تلخیص و تأثر:۔

کائنات بول رہی ہے

(جناب وحید الدین خاں صاحب)

کیرلہ کے عیسائی مشن نے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس کا نام ہے :۔

Nature and Science Speak about GOD

اخباری سائز کی اس ۲۸ صفحے کی کتاب میں کائنات کے متعلق سائنسی دریافتوں کے حوالے سے یہ واضح کیا گیا ہے کہ خدا کا وجود ایک حقیقت ہے اور اسے کسی طرح جھٹلایا نہیں جا سکتا۔ "بچھو بھڑ اور اسی طرح کے بہت سے دوسرے پانی اور خشکی کے جاندار ہیں جو ڈنک مار کر دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں یا شکار کو قابو میں لاتے ہیں۔ ان کے ڈنک کی نوک پر ایک نہایت چھوٹا سوراخ ہوتا ہے جس کے ذریعہ وہ ایک قسم کا زہر اپنے دشمن کے جسم میں داخل کر دیتے ہیں۔ یہ سوراخ اگر ڈنک کے بالکل سرے پر ہوتا تو ڈنک چبھتے وقت سوراخ بند ہو جاتا۔ اس کے علاوہ خود چبھونے میں ڈنک زیادہ اچھی طرح کام نہ کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈنک کی نوک کا سوراخ ہمیشہ ذرا سا ترچھا ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ڈاکٹر کی سرنج (Syringe) میں ہوتا ہے۔" یہ ایک بہت چھوٹی سی مثال ہے۔ اسی طرح جس چیز کو دیکھیے اس کے اندر ایک نہایت ذہین نقشہ سازی نظر آئے گی۔ کائنات کوڑا کرکٹ کا ایک بے ترتیب انبار نہیں ہے بلکہ اس کے اندر زبردست مقصدیت اور نظم پایا جاتا ہے۔ کیا ایک شعوری منصوبہ بندی کے بغیر ایسا ہو سکتا ہے۔

دیمک اپنے قد کے مقابلے میں ہزار گنا بڑا مکان بناتے ہیں۔ اگر ہم اپنی جسامت کی نسبت سے اتنا بڑا مکان بنائیں تو ہم کو ایک میل سے بھی زیادہ اونچی تعمیر کرنی پڑے گی۔ دیمک لکڑی میں رہ سکتے ہیں یا زمین کے اندر اپنے مکانات تراشتے ہیں ان کی زندگی کے مطالعہ سے بے شمار حیرت انگیز واقعات سامنے آتے ہیں۔ صرف ایک مثال لیجیے۔ دیمک لکڑی کو کھاتے ہیں پتھر کے بعد لکڑی تمام معلوم چیزوں میں سب سے زیادہ عسیر الہضم ہے مگر دیمک کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں وہ اس مقصد کے لیے مخصوص جبڑے رکھتے ہیں جو آرے کا کام دینے کے ساتھ ساتھ پیسنے کا کام بھی کرتے ہیں۔ تاہم لکڑی خواہ کتنی ہی مہین پیس ڈالی جائے وہ بہرحال لکڑی ہی رہے گی اور پیٹ میں جا کر غذا کی ضرورت پوری کرنے کے بجائے صرف بدہضمی پیدا کرے گی۔ پھر کیا

چیز ہے جو دیمک کی مدد کرتی ہے۔ اس کام کے لیے دیمک کی آنتوں میں نہایت چھوٹے چھوٹے خوردبینی کیڑے موجود رہتے ہیں۔ یہ کیڑے نگلی ہوئی لکڑی پر مخصوص عمل کرکے اس کے اندر ایسی تبدیلیاں پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ ہضم ہو کر جزو بدن ہو سکے۔ یہ حیرت انگیز انتظام کون کرتا ہے۔

مرغی کے انڈے پر غور کیجیے۔ ہر ایک انڈے میں سات ایسی مختلف خصوصیات پائی جاتی ہیں جو اتنی اہم ہیں کہ ان میں سے ایک بھی اگر نہ ہو تو انڈا ' انڈا نہ رہے گا ——— چونے کا خول' خول کے اندر مسامات جو ہوا کو گزرنے کا راستہ دیتے ہیں' پتلی جھلی جو استر کی طرح چاروں طرف ہوتی ہے' زردی اور سفیدی جو خول کے اندر بچے کی غذا ہیں' بچے کا جرثومہ' تار جو جرثومے کو صحیح رُخ پر باقی رکھتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک چیز کو انڈے سے الگ کر دیجیے اور انڈا کبھی بھی چوزے کی پرورش گاہ نہیں بن سکے گا۔ کیا یہ سات مختلف چیزیں محض اتفاق سے یکجا ہو گئی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ "اتفاق" ان سات مختلف چیزوں کی موجودگی کی تشریح نہیں کر سکتا جو ٹھیک اور بالکل صحیح حالت میں پائی جا رہی ہیں۔ اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہو کہ اتفاق سے صرف یہی چیزیں کیوں اکٹھا ہوئیں۔ کیوں نہ درخت کی پتی' کوئی لکڑی' پتھر کا ایک ٹکڑا اور اس طرح کی ہزاروں چیزیں جن کا موجود ہونا ممکن تھا خول کے اندر آ گئیں جن میں سے کوئی ایک چیز بھی اگر وہاں ہوتی تو وہ سارے انڈے کو برباد کر دیتی۔ سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب مرغی کا بچہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ انڈے سے باہر نکلے۔ اس وقت اس کی چونچ پر ایک چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آ جاتا ہے۔ سینگ اپنا کام پورا کر کے بچہ کی پیدائش کے چند دن بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

خود اپنے وجود پر غور کیجیے۔ انسان کو جو جسم حاصل ہے وہ کس قدر حیرت انگیز ہے۔ دماغ کو دیکھیے۔ ایک ایسا ٹیلی فون اکسچینج جو ہر آن زمین کے تمام مردوں' عورتوں اور بچوں سے تعلق جوڑے ہوئے ہو' ان سے پیغامات وصول کرتا ہو اور ان کے نام پیغام بھیجتا ہو' اگر آپ ایک ایسے ٹیلی فون اکسچینج کا تصور کر سکیں تو آپ دماغ کے ناقابل یقین حد تک پیچیدہ نظام کا صرف ایک ہلکا سا اندازہ کر سکتے ہیں۔

آپ کے بھیجے کے اندر تقریباً ایک ہزار ملین عصبی خلئے (Nerve Cells) ہیں۔ ہر خانے سے بہت باریک تار نکل کر تمام جسم کے اندر پھیلے ہوئے ہیں جن کو عصبی ریشے (Nerve Fibres) کہتے ہیں۔ ان پتلے ریشوں پر خبر وصول کرنے اور حکم بھیجنے کا ایک نظام تقریباً ستر میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑتا رہتا ہے۔

دل کو دیکھیے۔ اس کا اوسط قد چار انچ لمبا اور ڈھائی انچ چوڑا ہوتا ہے۔ اس کا وزن آٹھ اونس سے زیادہ نہیں ہوتا مگر انسانی جسم کا یہ چھوٹا سا پمپ رات دن مسلسل چلتا رہتا ہے۔ اس کی حرکت روزانہ ایک لاکھ بار چلتی ہے اور وہ ہر

تیرہ سکنڈ میں تقریباً ایک گیلن خون سارے جسم میں بھیج دیتا ہے۔ ایک سال میں دل جتنا خون پمپ کرتا ہے وہ اتنا ہوتا ہے جو ایک ایسی ٹرین کو پوری طرح بھر سکے جو ۵۰ بڑے بڑے تیل کے ویگن لیے ہوئے ہو۔ دل کی اس حیرت انگیز کارکردگی کو حاصل کرنے کے لیے عجیب و غریب ہنرمندی کے ساتھ اس کو موزوں ترین بنایا گیا ہے

کائنات میں اس طرح کی بے شمار چیزیں ہیں جن کی صرف فہرست بنانے کے لیے ایک پوری لائبریری کی ضرورت ہوگی جب کہ انسان کا علم کائنات کے موجود حقائق کی نسبت سے کچھ بھی نہیں ہے۔ جو کچھ ہم نے دیکھا ہے اس سے کہیں زیادہ وہ چیز جس کو دیکھنا ابھی باقی ہے۔

یہ حیرت انگیز کاریگری، یہ مکمل منصوبہ بندی، یہ اعلیٰ ترین ذہانت کیا محض اتفاق (Chance) سے وقوع میں آگئی ہے۔ بے شک بعض اوقات محض اتفاق سے بھی کوئی واقعہ ظاہر ہو جاتا ہے۔ مثلاً ہوا کا ایک جھونکا کبھی سرخ گلاب کے زیرہ (Pollen) کو اڑا کر سفید گلاب پر ڈال دیتا ہے جس کے نتیجے میں زرد رنگ کا پھول کھلتا ہے۔ مگر اس قسم کا اتفاق محض جزوی اور خفیف تبدیلیاں پیدا کر سکتا ہے۔ وہ صرف اس مخصوص رنگ کے گلاب کی توجیہ کرتا ہے نہ کہ گلاب کے پورے وجود کا سبب ہے۔ اتفاق ہرگز اس کی توجیہ نہیں کر سکتا کہ ایک مخصوص قسم کا نظام اس قدر تسلسل کے ساتھ کیوں جاری ہے۔ وہ ہم کو نہیں بتاتا کہ ہماری دنیا میں باقاعدگی اور تنظیم کیوں پائی جاتی ہے۔ "اتفاق" کا عمل کبھی بھی یکساں طور پر نہیں ہو سکتا۔ اتفاق کے لیے ممکن نہیں ہے کہ جو کچھ آج ہوا اسی کو کل بھی وجود میں لائے۔ پھر کیوں تمام چیزیں ہمیشہ یکسانیت کے ساتھ ایک ہی شکل میں ظاہر ہو رہی ہیں۔ ان میں نظم اور باقاعدگی کیوں پائی جاتی ہے۔

کچھ دھات کے ٹکڑے ہوا میں اچھالے جائیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ وہ ڈھلے ہوئے حروف کی شکل میں زمین پر گریں اور گرتے ہی ایک بامعنی عبارت کی شکل میں صفحہ کاغذ پر اکٹھا ہو جائیں۔ اگر ایسا محض اتفاق سے نہیں ہو سکتا تو یہ کیوں فرض کر لیا گیا ہے کہ اتنی بڑی دنیا اتنی حیرت انگیز خصوصیات کے ساتھ محض اتفاق سے وجود میں آگئی ہے۔ ایک نظریہ جس کو کسی تجربہ گاہ میں ثابت نہیں کیا جا سکتا اس کو علمی طور پر منوانے کی کیا دلیل ہے۔

دوسری توجیہ جس پر مادہ پرست علماء انحصار کرتے ہیں وہ قانونِ قدرت (Nature) ہے۔ "مرغی کے انڈوں سے بچے کیوں ۲۱ روز میں نکلتے ہیں اور شتر مرغ کے انڈوں سے ۴۵ روز میں" اس طرح کے بے شمار سوالات ہیں جن کا جواب مادی علماء کے نزدیک یہ ہے کہ "یہ ایک قانونِ فطرت ہے" بظاہر یہ ایک توجیہ ہے مگر درحقیقت یہ جواب صرف ایک واقعہ کو بیان کرتا ہے۔ قانونِ فطرت کا لفظ بول کر ہم صرف کائنات کے نظم اور اس کی کارکردگی کا اعتراف کرتے ہیں۔ یہ لفظ اس کی توجیہ نہیں کرتا کہ یہ نظم اور کارکردگی کیوں قائم ہے۔ یہ لفظ صرف یہ بتاتا ہے کہ چیزیں

یشہ ایک متعین اصول کے تحت وجود میں آتی ہیں اور ہمیشہ اسی طرح وجود میں آئیں گی۔ اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ جو کچھ
رہا ہے، وہ کیوں ہو رہا ہے۔ وہ واقعہ کا سبب نہیں بتاتا بلکہ صرف واقعہ کی تصویر پیش کرتا ہے۔

اگر آپ کسی ڈاکٹر سے پوچھیں کہ خون سرخ کیوں ہوتا ہے۔ تو وہ جواب دے گا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ خون میں
یت چھوٹے چھوٹے سرخ اجزا رہوتے ہیں (ایک انچ کے سات ہزارویں حصے کے برابر) جن کو سرخ ذرات کہا جاتا ہے۔

"درست، مگر یہ ذرات سرخ کیوں ہوتے ہیں؟"

"ان ذرات میں ایک خاص مادہ ہوتا ہے جس کا نام ہیموگلوبن (Haemoglobin) ہے۔ یہ مادہ جب
پھیپھڑے میں آکسیجن جذب کرتا ہے تو گہرا سرخ ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، مگر ہیموگلوبن کے حامل سرخ ذرات آخر کہاں سے آئے"

"وہ آپ کی تلی میں بن کر تیار ہوتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب! جو کچھ آپ نے فرمایا، وہ بہت عجیب ہے، مگر مجھے بتائیے کہ ایسا کیوں ہے کہ خون، سرخ ذرات،
اور دوسری ہزاروں چیزیں اس طرح ایک کُل کے اندر باہم مربوط ہیں، وہ اس قدر صحت کے ساتھ یکجا ہو کر کیسے عمل
رتی ہیں کہ میں سانس لیتا ہوں، میں دوڑتا ہوں، میں بولتا ہوں، میں زندہ ہوں۔"

"یہ قدرت کا قانون ہے۔"

"وہ کیا چیز ہے جس کو آپ قانونِ قدرت کہتے ہیں۔"

"اس سے میری مراد طبیعی اور کیمیاوی طاقتوں کا اندھا عمل ہے۔"

"مگر کیا وجہ ہے کہ یہ اندھی طاقتیں ہمیشہ ایسی سمت میں عمل کرتی ہیں جو انھیں ایک متعین انجام کی طرف لے جائے۔ کیسے
پنی سرگرمیوں کو اس طرح منظم کرتی ہیں کہ ایک چڑیا اڑنے کے قابل ہو سکے، ایک مچھلی تیر سکے اور ایک انسان اپنی مخصوص
ہلیتوں کے ساتھ وجود میں آئے۔"

"میرے دوست! مجھ سے یہ نہ پوچھو، سائنس داں صرف یہ بتا سکتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیا ہے۔ اس کے پاس
وال کا جواب نہیں ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کیوں ہو رہا ہے۔"

"یہ سوال وجواب موجودہ سائنس کی حقیقت واضح کر رہا ہے۔ بے شک سائنس نے ہم کو بہت سی نئی باتیں بتائی ہیں
س نے جو کچھ بتایا ہے وہ صرف کچھ ہونے والے واقعات ہیں۔ یہ واقعات کیوں کر ہو رہے ہیں اس کا جواب سائنس کے
ا نہیں ہے۔ ایک مکھی کے نازک اعضا کس طرح کام کرتے ہیں، بے شک سائنس نے اس سلسلے میں ہم کو بہت کچھ بتایا ہے

وہ کون ذہن ہے جس نے سوچا کہ مکھی کو ان نازک اعضاء کی ضرورت ہے اور اس کو کمال کاریگری کے ساتھ ایسے اعضا
ہم کیے۔ کائنات کے نظم اور اس کی موزونیت کی تشریح کرنے کے لیے اور یہ بتانے کے لیے کہ مختلف قسم کی بے شمار اندھی
تیں ایک مخصوص انجام کی طرف اپنے عمل کیوں کرتی ہیں —— ہم کو ان طاقتوں کی موجودگی کے سوا کسی چیز کی ضرورت ہے
ے بچھے ہوئے بستر کی تشریح محض اس طرح نہیں ہو سکتی کہ آپ چادر، تکیہ اور پلنگ کے نام لے لیں۔ ایک محل، نام ہے
ٹھوس اینٹیں اور دوسری چیزیں اپنے صحیح ترین مقام پر نصب ہونے کا۔ انسانی جسم کے کسی چھوٹے سے چھوٹے عضو کے
وجود میں آنے کے لیے ضروری ہے کہ کروروں ایٹم ایک منفرد اور مخصوص ترتیب کے ساتھ یک جا ہوں، اندھی طاقتیں ہرگز
اس طرح کی مقصدیت کا اظہار نہیں کر سکتیں، وہ واقعات کے اندر معنویت اور ہم آہنگی پیدا نہیں کر سکتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ فطرت کا قانون کائنات کا ایک واقعہ ہے، وہ کائنات کی توجیہ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا واقعہ
ہے جو خود اپنے وجود کے لیے ایک توجیہ کا طالب ہے۔ اس موقع پر مصنف کے الفاظ نقل کرنے کے قابل ہیں۔ وہ لکھتا ہے

Nature does not explain, she is herself in need of an explanation.

یعنی قانون قدرت کائنات کی تشریح نہیں کرتا۔ وہ خود اس کا طالب ہے کہ اس کی تشریح کی جائے۔

کسی چیز میں معنویت کا ہونا اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ اس کے پیچھے کوئی ذہن کام کر رہا ہے۔

زندگی کا جرثومہ جو ایک مرد کے جسم میں پرورش پاتا ہے وہ جسم کے دوسرے خلیوں (Cells) کے بالکل مشابہ
ہوتا ہے مگر اس میں دوسرے خلیوں سے بالکل مختلف خصوصیت ہوتی ہے۔ اس کے اندر یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ عورت کے
ایک خلیہ سے ہم آہنگ ہو کر مکمل طور پر ایک نیا انسان وجود میں لا سکے۔ یہ کس طرح ممکن ہوتا ہے کہ دو خلیے جن میں سے ہر ایک دو
بالکل مختلف جسموں میں پرورش پاتے ہیں وہ اس قدر حیرت انگیز طور پر باہم مل کر عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ کیا ایک تخلیقی
ذہن کی کارفرمائی تسلیم کیے بغیر اس کی تشریح کی جا سکتی ہے۔

کائنات میں ایک تخلیقی ذہن کو محض ایک بے بنیاد روایت کو ماننا نہیں ہے۔ دراصل بہت سے
ناگزیر نتائج ہم کو اس عقیدہ تک پہنچاتے ہیں بے شمار علمی حقیقتیں ہم کو مجبور کرتی ہیں کہ ہم کائنات کے پیچھے ایک ذہن کی
کارفرمائی تسلیم کریں۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ریڈیو کی آواز ہم کو یہ ماننے پر مجبور کرتی ہے کہ ہم کچھ لہروں کی موجودگی تسلیم کریں
حالانکہ ہم ان لہروں کو بالکل نہیں دیکھتے۔ گلاس میں شکر ڈالیں تو تھوڑی دیر میں وہ اس طرح گھل مل جائے گی کہ آنکھوں کو دکھائی
نہیں دے گی۔ مگر زبان سے چکھ کر آپ پانی میں شکر کی موجودگی کو معلوم کر سکتے ہیں۔ اسی طرح خدا آنکھوں کو نظر نہیں آتا مگر

ہم اپنے گرد و پیش کی دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمارا وجدان پکار اٹھتا ہے کہ بے شک یہاں ایک خدا ہے۔ اس کے بغیر موجودہ کائنات وجود میں نہیں آسکتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کے اضافے نے انسان کو خدا سے دور نہیں کیا بلکہ اور اس کے قریب کیا ہے۔ خدا کے وجود پر شک کرنا محض اپنی جہالت کا اعلان کرنا ہے۔ پاسچر کا قول کس قدر صحیح ہے جس کو مصنف نے کتاب کے صفحۂ اول پر درج کیا ہے :-

A smattering of science turns people away from God ——— Much of it brings them back to Him.

معمولی علم آدمی کو خدا سے دور کرتا ہے، زیادہ علم اس کو خدا سے قریب کرنے والا ہے۔

گاہے گاہے باز خواں

(ایک اقتباس)

آج مسلمانوں کے اخباروں اور رسالوں میں، مسلمانوں کے جلسوں اور انجمنوں میں، مسلمان پڑھے لکھے طبقوں میں آپ آخر کس چیز کی پکار سنتے ہیں؟ بس یہی نا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہمیں جگہیں ملیں، غیر الٰہی نظام حکومت کو چلانے کے لیے جس قدر پرزے درکار ہیں ان میں سے کم از کم اتنے پرزے ہم پر مشتمل ہوں، شریعت ساز مجلسوں کی نشستوں میں کم از کم اتنا تناسب ہمارا ہو...... اسی کی چیخ پکار ہے، اسی کا نام اسلامی مفاد ہے، اسی محور پر مسلمانوں کی قومی سیاست گھوم رہی ہے، یہی گروہ عملاً اس وقت مسلم قوم کی بھی کنٹرول کر رہا ہے...... غور کا مقام ہے کہ اگر اسلام ایک تحریک کی حیثیت سے زندہ ہوتا تو اس کا نقطۂ نظر یہی ہوتا؟ کیا کوئی اجتماعی اصلاح کی تحریک اور کوئی ایسی سیاسی جماعت جو خود اپنے اصول پر دنیا میں حکومت قائم کرنے کا داعیہ رکھتی ہو کسی دوسرے اصول کی حکومت میں اپنے پیروؤں کو کل پرزے بننے کی اجازت دیتی ہے؟ کیا کبھی آپ نے سنا ہے کہ اشتراکیوں نے بینک آف انگلینڈ کے نظام میں اشتراکی مفاد کی حفاظت کا سوال اٹھایا ہو؟ ...... مگر یہاں آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ ...... اس کے بعد تعجب نہ کیجیے اگر ایک اخلاقی و اجتماعی مسلک کی حیثیت سے اسلام کے دعوائے حکمرانی کو سن کر دنیا مذاق اڑانے لگے۔

نجویٰ اور کنویسنگ

سوال

مجلس شوریٰ کے حالیہ اجلاس میں الیکشن کا مسئلہ زیر بحث لایا گیا ہے' ملک میں بھی اب عام انتخابات ہونے ہی والے ہیں' اس لیے قدرتی طور پر الیکشن کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر جاننے کی خواہش اور ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں آپ سے سب سے پہلے ایک مسئلہ کی بابت وضاحت چاہتا ہوں' یعنی کنویسنگ کی بابت۔ یہ تو ساری دنیا جانتی ہے کہ آج کل کے انتخابات میں کنویسنگ کو ایک لازمی جزو کی حیثیت حاصل ہے۔ براہ کرم واضح فرمائیں کہ اسلامی انتخابات میں اس کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ اگر نہیں تو کیوں؟ اس سلسلے میں خود کنویسنگ کے مفہوم کی بھی وضاحت فرما دیں۔ کیا کنویسنگ اور نجویٰ ایک ہی چیز ہیں یا ان میں کوئی فرق ہے؟

جواب

چونکہ سوالات کا تعلق موجودہ الکشن سے نہیں اس لیے الکشن ختم ہونے کے بعد بھی جواب دیا جا رہا ہے' آپ کے خط میں دو متعین سوالات ہیں' ایک یہ کہ اسلامی انتخابات میں کنویسنگ کی اجازت ہوگی یا نہیں اور دوسرا یہ کہ کنویسنگ اور نجویٰ دونوں ایک ہی ہیں یا دونوں میں فرق ہے۔ میں اس وقت اسلامی انتخابات کے دیگر مباحث سے صرف نظر کرتے ہوئے انہیں دو متعین سوالات کے جوابات عرض کرتا ہوں۔

ان دونوں سوالات کے جواب کے لیے نجویٰ اور کنویسنگ کا مفہوم واضح ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد جوابات بآسانی معلوم ہو جائیں گے۔ لغت اور قرآن کے استعمالات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ نجویٰ کی لغوی و اصطلاحی حقیقت میں رازداری' پردہ داری' علیحدگی و انفرادا ور سرگوشی کا مفہوم داخل ہے۔ میں پہلے لغت کی چند تصریحات پیش کرتا ہوں۔ عربی کے بہت مشہور لغت قاموس میں ہے:

نجاہ نجوی : سارہ والنجوی : السر کالنجی والمسارۃ وان اسم و مصدر

اس عبارت کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس سے نجویٰ کیا۔ یعنی رازدارانہ بات کی اور نجویٰ لفظ نجی کی طرح راز کے معنی میں آتا

ہے اور نجویٰ و نجی رازدارانہ بات کرنے والوں کو بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ اسم بھی ہے اور مصدر بھی —— لفظ نجویٰ کے تحت لسان العرب میں بھی یہی تشریح ملتی ہے۔ مفردات امام راغب میں ہے:۔

ناجیتہ ای ساررتہ۔ النجوی اصلہ	میں نے اس سے مناجاۃ کی یعنی پوشیدگی میں بات
المصدر وقد یوصف بالنجوی فیقال	کی نجویٰ اصلاً مصدر ہے لیکن کبھی صفت بھی بنتا ہے
ھو نجوی وھم نجوی	جیسے کہا جاتا ہے وہ نجویٰ ہے اور وہ نجویٰ ہیں

حدیث کے مشہور لغت مجمع بحار الانوار میں ہے:۔

ومنہ حدیث علی دعاہ صلی اللہ	یہ لفظ حضرت علی کی اس حدیث میں بھی ملتا ہے
علیہ وسلم یوم الطائف وانتجاہ فقال	ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ طائف کے دن
الناس لقد طال نجواہ فقال	بلایا اور رازدارانہ بات چیت کی۔ لوگ کہنے لگے کہ آپ کی
ما انتجیتہ ولکن اللہ انتجاہ	سرگوشی طویل ہو گئی۔ حضورؐ نے فرمایا میں نے ان سے سرگوشی
ای امرنی ان اناجیہ	نہیں کی بلکہ اللہ نے کی یعنی اللہ نے مجھے حکم دیا کہ میں ان سے سرگوشی کروں۔

بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ کسی بات کا ایک شخص یا ایک جماعت تک محدود اور خاص ہونا نجویٰ ہے، عام از یں کہ اس میں سرگوشی اور رازداری پائی جاتی ہو یا نہیں لیکن یہ قول جمہور اہل لغت اور قرآن کے استعمالات کے خلاف ہے —— لغت کی ان تصریحات کے بعد اب قرآن کی چند آیتیں دیکھیے، سورۂ توبہ میں منافقین کا حال بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:۔

أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ	کیا وہ علم نہیں رکھتے کہ اللہ ان کے دلوں کے بھید
وَنَجْوَاهُمْ وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّامُ	بھی جانتا ہے اور ان کی خفیہ سرگوشیاں بھی، اور بلاشبہ اللہ
الْغُيُوبِ (۷۸)	تمام چھپی ہوئی چیزوں کا جاننے والا ہے

اس آیت میں سِر اور نجویٰ میں لطیف فرق کیا گیا ہے۔ سِر ان کے دل میں چھپے ہوئے ایسے راز کو کہا گیا ہے جسے انھوں نے کسی پر ظاہر نہیں کیا اور نجویٰ سے مراد ان کے وہ رازدارانہ مشورے اور مکارانہ سازشیں ہیں جو وہ اسلام، نبی اکرم اور مخلص مسلمانوں کے خلاف کیا کرتے تھے۔ سِر اور نجویٰ دونوں میں پردہ داری اور اخفا ہے اسی لیے آیت کو اللہ کے علم غیب پر ختم کیا گیا ہے۔ نجویٰ میں سرگوشی و اخفا کا جو مفہوم ہے اسی کو مؤکد کرنے کے لیے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:۔

فَتَنَازَعُوا أَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ	وہ اپنے معاملہ میں آپس میں جھگڑنے لگے اور انھوں نے چھپ کر

اَسَرُّوا النَّجْوٰی — مشورہ کیا۔

ٹھیک یہی صیغہ سورۂ انبیاء میں بھی استعمال ہوا ہے۔

وَاَسَرُّوا النَّجْوَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا هَلْ هٰذَا اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ اَفَتَاْتُوْنَ السِّحْرَ وَاَنْتُمْ تُبْصِرُوْنَ (۳)

چھپا کر مشورہ کیا ظالموں نے، یہ تو تمہاری طرح ایک آدمی ہے، پھر کیوں پھنستے ہو اس کے جادو میں آنکھوں دیکھے۔

یہ پوشیدہ مشورہ کیا تھا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے خلاف، رائے عامہ کو خراب کرنے کی سازش!

ان آیتوں سے بھی یہ واضح ہوا کہ لفظِ نجویٰ کے معنی میں پوشیدگی اور رازداری پائی جاتی ہے — اب انگریزی کے لفظ کنویس (Canvass) کے معنی دیکھیے۔ عبدالحق کی انگریزی اردو لغت اور ویبسٹر کی ڈکشنری میں درج ذیل معانی ملتے ہیں:۔

(۱) بحث و مباحثہ کرنا۔ (۲) ووٹ یا رائے طلب کرنا۔ (۳) کسی مقام کے خیالات و عادات کا پتہ لگانا۔ (۴) لوگوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرنا۔ (۵) کسی شخص کے پاس ووٹ مانگنے جانا یا ووٹ کے لیے کسی ضلع کا دورہ کرنا۔

اس انگریزی لفظ کے اصل مفہوم میں رازداری، پردہ داری اور سرگوشی داخل نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ نجویٰ اور کنویسنگ لغوی اور اصطلاحی ہر دو لحاظ سے الگ الگ معنی رکھتے ہیں اور دونوں ایک نہیں ہیں لیکن ایسا بہت ہے کہ لغت اور اصطلاح کی دنیا میں ایک لفظ کی حقیقت کچھ اور ہوتی ہے اور عمل کی دنیا میں کچھ اور۔ مثلاً پروپیگنڈہ کے معنی لغت میں تبلیغ کے ہیں، لیکن اب سیاسی عمل کے میدان میں یہ لفظ جھوٹ اور بے جا تشہیر کا مترادف ہو گیا ہے۔ یہی حال کنویسنگ کے لفظ کا ہے۔ آج کنویسنگ نام ہے جھوٹے پروپیگنڈے سے رائے عامہ کو دھوکا دینے کا، نسلی، خاندانی، علاقائی، طبقہ داری اور صوبائی بنیادوں پر ووٹ مانگ کر باشندگانِ ملک میں تفرقہ ڈالنے کا، طرح طرح کی جاہلانہ عصبیتوں کے ابھارنے کا، مختلف طبقوں اور گروہوں کو ایک دوسرے سے نبرد آزما کرنے کا، گلی گلی گالی گلوج اور دنگا فساد پھیلانے کا، مخالف امیدوار کے عیوب بیان کر کے برسرِ عام رسوا کرنے کا، غرض نشر و اشاعت کے تمام ذرائع و وسائل استعمال کر کے اپنی اپنی پارٹیوں اور امیدواروں کے فضائل و محامد اور مخالف پارٹیوں کے معائب و مثالب پھیلانے کا نام کنویسنگ ہے۔ یہ صورتیں غلط ہیں، پھر بھی ان میں سے کسی پر نجویٰ کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ہاں مروجہ کنویسنگ کی ایک صورت یعنی مخالف پارٹی یا امیدوار کے خلاف سازش اور در پردہ جوڑ توڑ پر ممنوع و مذموم نجویٰ کا اطلاق صحیح ہے لیکن یہ اطلاق اس لیے صحیح ہے کہ اس صورت میں نجویٰ کی حقیقت پائی جاتی ہے۔ کنویسنگ یا الکشن سے اس کا کوئی خاص تعلق نہیں ہے۔ یہ حقیقت جہاں بھی پائی جائے گی اس پر نجویٰ کا اطلاق آئے گا۔ میں نے ممنوع و مذموم نجویٰ کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ ہر نجویٰ ممنوع و مذموم نہیں ہوتا۔ آپ کے سوال سے بھی

معلوم ہوتا ہے اور میں ذاتی طور پر بھی جانتا ہوں کہ ہمارے حلقے میں نجویٰ کا لفظ صرف برے معنی میں مستعمل ہو گیا ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ محض اختصار سے جائز اور ناجائز، محمود اور مذموم دونوں طرح کے نجویٰ کی چند تصریحات قرآن و حدیث سے پیش کی جائیں۔ سورۂ نساء میں کہا گیا ہے:-

لَا خَيْرَ فِي كَثِيرٍ مِّن نَّجْوَاهُمْ إِلَّا	کوئی خیر نہیں لوگوں کے اکثر خفیہ مشوروں اور سرگوشیوں
مَنْ أَمَرَ بِصَدَقَةٍ أَوْ مَعْرُوفٍ	میں، ہاں اگر پوشیدہ طور پر صدقہ کی تلقین کرے یا کسی نیک
أَوْ إِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَمَن يَفْعَلْ	کام کے لیے، لوگوں کے معاملات کی اصلاح کرنے کے لیے
ذَٰلِكَ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ فَسَوْفَ	کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی
نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا ○ (۱۱۴)	کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ ایک مسلمان نے چوری کی اور جب اس کا بھانڈا پھوٹ گیا تو چور اور اس کے خاندان نے زیرپردہ سازش کی کہ اس کا اتہام ایک یہودی پر رکھ دیا جائے اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے مقدمہ اپنے موافق فیصلہ کرا لیا جائے اس پس منظر میں آیت کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ اس آیت نے صرف یہی نہیں کہ جائز و ناجائز اور محمود و مذموم نجویٰ کو الگ کر دیا ہے بلکہ اللہ کی خوشنودی کے لیے صدقہ، امر بالمعروف اور اصلاح بین الناس کے معاملات میں نجویٰ پر اجر عظیم کی بشارت بھی سنائی ہے۔ ان معاملات میں نجویٰ کی ضرورت کیوں اور کب ہوتی ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، کیونکہ آیت کی پوری تفسیر مقصود نہیں ہے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ اس آیت نے نجویٰ کی دو قسموں کو بڑی وضاحت سے علیحدہ کر دیا ہے۔

نجویٰ، تناجی اور مناجات پر سب سے زیادہ سورۂ مجادلہ میں گفتگو کی گئی ہے۔ یہاں تمام آیتوں کو نقل کرنا موجب طوالت ہے۔ خلاصہ ان آیتوں کا بھی یہی ہے کہ اثم، عدوان اور معصیتِ رسول سے آلودہ نجویٰ شیطانی فعل ہے اور بر و تقویٰ سے مملو نجویٰ کی اجازت ہے۔ ان آیتوں میں ایک آیت کی وضاحت ضروری ہے، کہا گیا ہے:-

إِنَّمَا النَّجْوَىٰ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ	بے شک نجویٰ شیطان کی طرف سے ہے تاکہ وہ
الَّذِينَ آمَنُوا وَلَيْسَ بِضَارِّهِمْ شَيْئًا	مومنوں کو غمگین کرے اور وہ اللہ کے اذن کے بغیر انہیں
إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ	کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا اور اللہ ہی پر مومنوں کو بھروسہ
الْمُؤْمِنُونَ ○ (۱۰)	کرنا چاہیے

اگر اس آیت کے سیاق و سباق سے غفلت ہو جائے تو ایسا سمجھا جا سکتا ہے کہ اس آیت میں مطلقاً نجویٰ کو شیطانی فعل

پایا گیا ہو۔ اس اشتباہ کو دور کرنے کے لیے مفسرین نے اپنی تفسیروں میں تصریح کی ہو کہ یہاں النجویٰ پر ال عہد کا ہے یعنی اُس نجویٰ کی مذمت کی گئی ہے اسی کو اس میں شیطانی فعل کہا گیا ہے خود اس آیت میں شیطانی نجویٰ کی جو علت بیان کی گئی ہے، وہ مذموم نجویٰ کی تعیین کر رہی ہو۔ میں یہاں صرف امام رازی کی تصریح نقل کرتا ہوں:۔

انما النجویٰ من الشیطان: الالف
واللام فی لفظ النجویٰ لا یمکن ان
یکون للاستغراق لان فی النجویٰ
ما یکون من اللہ وللہ بل المراد منہ
المعہود السابق وھو النجویٰ بالاثم والعدوان

لفظ النجویٰ میں الف لام ناممکن ہو کہ استغراق کے
لیے لیا جائے اس لیے کہ نجویٰ کی ایک قسم وہ ہو جو اللہ کی
طرف سے ہوتی ہو اور اللہ کے لیے ہوتی ہے بلکہ اس سے
مراد وہ نجویٰ ہو جس کی مذمت اوپر گزری یعنی گناہ اور
سرکشی والا نجویٰ۔

بعض احادیث میں، دو مسلمانوں کو اس بات سے روکا گیا ہے کہ تیسرے مسلمان کی موجودگی میں الگ ہو کر سرگوشی کریں، لیکن وہیں اس ممانعت کی علت بھی بیان کر دی گئی ہے اور وہ یہ کہ اس تیسرے مسلمان کو اس سے تکلیف پہنچے گی اور اسے یہ حرکت بری معلوم ہوگی، اس علت کی عدم موجودگی میں یہ ممانعت بھی باقی نہ رہے گی، بلکہ بہت سے مواقع پر جائز یا محمود دو امور معاملات میں نجویٰ لازم ہوتا ہے وہاں اگر نجویٰ نہ کیا جائے تو مملکتی اور جماعتی، مصالح مفاسد سے بدل جائیں، مثلاً کسی حکومت کے جنگی و دفاعی معاملات، یا کسی جماعت کی مجلس شوریٰ کے اجتماعات، ظاہر ہے کہ اگر ایسے مواقع پر باتیں اور مشورے چند افراد کے درمیان رازدارانہ نہ ہوں تو سخت انتشار پھیل جائے۔

خدا اور بندے کے درمیان جو نجویٰ اور مناجات ہوتی ہے اس کے محمود ہونے میں کیا شبہہ ہو سکتا ہو کہ خدا ہی کا حکم ہو:۔ اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْیَۃً (پکارو اپنے رب کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے) کوہ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے مخاطبت کا جو شرف بخشا تھا اس کی بنا پر ان کا ایک لقب نجیّ اللہ بھی ہے یعنی خدا سے سرگوشی کرنے والے ـــــ قیامت میں اللہ تعالیٰ بندۂ مومن سے جو نجویٰ کرے گا اس کا ذکر حدیث میں آیا ہو اُس حدیث کو حدیث النجویٰ کہتے ہیں:۔

اِنَّ رَجُلًا سَاَلَ ابْنَ عُمَرَ کَیْفَ سَمِعْتَ
رَسُوْلَ اللہِ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی
النَّجْوٰی قَالَ یَدْنُوْا اَحَدُکُمْ مِنْ رَبِّہٖ
حَتّٰی یَضَعَ کَنَفَہٗ عَلَیْہِ فَیَقُوْلُ اَعَمِلْتَ

ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے پوچھا
آپ نے نجویٰ کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے کیا سنا ہو۔ فرمایا تم میں کوئی اپنے رب سے قریب ہوگا
یہاں تک کہ وہ اپنی رحمت سے اسے ڈھک لے گا پھر فرمائے گا

كَذَا وَكَذَا؟ فَيَقُوْلُ نَعَمْ وَيَقُوْلُ أَعَمِلْتَ كَذَا وَكَذَا؟ فَيَقُوْلُ نَعَمْ فَيُقَرِّرُهُ ثُمَّ يَقُوْلُ إِنِّيْ سَتَرْتُ عَلَيْكَ فِي الدُّنْيَا وَأَنَا أَغْفِرُهَا لَكَ الْيَوْمَ (متفق علیہ)

کیا تونے ایسا کیا اور ایسا کیا۔ بندہ کہے گا۔ ہاں پھر فرمائے گا تونے ایسا کیا، ایسا کیا۔ بندہ کہے گا۔ ہاں وہ سب کا اقرار کرے گا۔ تب اللہ فرمائے گا میں نے دنیا میں تیرے ان جرائم کی پردہ پوشی کی تھی اور آج میں انہیں معاف کرتا ہوں۔

ان تمام تفصیلات سے معلوم ہوا کہ نجویٰ صرف برے معنی میں مستعمل نہیں ہے بلکہ اچھے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ سرگوشی، بجائے خود بری چیز نہیں ہے، بلکہ اس میں کہی جانے والی بات اور مقصد اسے خیر یا شر بناتا ہے۔

نجویٰ اور کنویسنگ کی اس وضاحت کے بعد آپ کے پہلے سوال کا جواب بھی آسان ہو گیا ہے۔ جہاں تک مروجہ کنویسنگ کے طوفان بے تمیزی کا تعلق ہے، اسلامی انتخابات تو بڑی چیز ہیں، غیر اسلامی انتخابات میں بھی کم سے کم نظری طور پر اسے صحیح نہیں سمجھا جاتا۔ باقی رہی وہ کنویسنگ جس میں آزاد امیدوار یا کسی پارٹی کا امیدوار لوگوں کے گھر جا کر یا حلقۂ انتخاب میں دورہ کر کے ووٹ مانگتا ہے تو اسلامی انتخابات میں اس کی اجازت بھی نہ ہوگی کیونکہ اسلامی اصول انتخاب میں امیدواری سسٹم ہی صحیح نہیں ہے۔

(مدیر)

خدا ہے

عقلی اور سائنٹفک استدلال، عام فہم اور سلجھا ہوا انداز بیان، وجود باری پر مختصر مگر فیصلہ کن کتاب مولانا سید حامد علی کے قلم سے۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ صفحات ۴۸ قیمت مع محصول ڈاک ۳۲ نئے پیسے۔ کمیشن ۴ یا زائد پر ۲۵ فی صد۔ ۵۰ یا زائد پر ۳۰ فی صد۔ ۱۰۰ یا زائد پر ۳۳ فی صد۔ سالانہ چندہ ساڑھے تین روپے۔ آخر اپریل ۱۹۶۲ء تک ادارہ کو وصول ہونے پر رعایتی چندہ تین روپیہ

ناظم ادارہ شہادت حق۔ زکاتی محلہ۔ بریلی (یوپی)

رُوداد اجلاس مجلس شوریٰ

منعقدہ ۴ دسمبر ۱۹۶۱ء تا ۸ دسمبر ۱۹۶۱ء

مجلس شوریٰ کا اجلاس مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں حسب اعلان ۴ دسمبر ۱۹۶۱ء کو ۹ بجے صبح سے زیر صدارت مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی شروع ہوا۔ مندرجہ ذیل ارکان شوریٰ اجلاس کی جملہ کارروائیوں میں شریک رہے کے سی عبداللہ صاحب، جناب شمس پیرزادہ صاحب، جناب انعام الرحمٰن، جناب مسلم صاحب، جناب وحیدالدین خاں صاحب۔ جناب انیس الدین صاحب، جناب عبدالحی صاحب، جناب افضل حسین صاحب، مولانا سید حامد علی صاحب، جناب سید حامد حسین صاحب، مولانا نظام الدین صاحب گاڑیوں کے اوقات میں اختلال کی وجہ سے ۴ کی صبح کی بجائے شام کو دہلی پہنچ سکے۔ اس لیے پہلے دن کے بعد کی بقیہ تمام نشستوں میں شریک رہے۔ مولانا محمد عزیز صاحب، مولانا صدرالدین صاحب اور جناب یوسف صدیقی صاحب اپنی خانگی مجبوریوں کے باعث اور قیم جماعت اپنی علالت کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہو سکے۔

الیکشن کے سلسلے میں کمیٹی کی رپورٹ پر غور مجلس شوریٰ نے اپنے اجلاس منعقدہ ۱۵ جولائی میں ایک کمیٹی اس غرض کے لیے مقرر کی تھی کہ وہ الکشن کے مختلف پہلوؤں پر غور کر کے یہ بتلائے کہ اقامت دین کے مقصد کے لیے الیکشن کی راہ کس حد تک کن صورتوں میں اور کن شرائط کے ساتھ اختیار کی جا سکتی ہے اور موجودہ حالات میں جماعت کو اس سلسلہ میں کیا موقف اختیار کرنا چاہیے چنانچہ یہ اجلاس خاص طور سے اس کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں اس مسئلے کو طے کرنے کے لیے طلب کیا گیا تھا۔

سب سے پہلے رپورٹ پڑھ کر سنائی گئی اور طے کیا گیا کہ اس پر گفتگو سے پہلے مناسب ہوگا کہ ارکان شوریٰ اسے دوبارہ اپنے طور سے پڑھ لیں نیز اس مسئلے سے متعلق کمیٹی کے سوال نامہ کے جو جوابات حضرات علماء کرام اور جماعت کے علماء ارباب فکر کی طرف سے موصول ہوئے ہیں ان کا بھی جس حد تک مطالعہ کر سکتے ہیں کر لیں۔ اس مقصد کے لیے مناسب سمجھا گیا کہ اس وقت اس مسئلہ کو چھوڑ کر ایجنڈے کے دیگر دفعات پر غور کر لیا جائے اور اس رات کی نشست بھی اس مقصد کے لیے ملتوی کر دی جائے۔

دوسرے دن کی نشست میں رپورٹ پر باقاعدہ غور وفکر شروع ہوا جس کا سلسلہ کئی نشستوں تک جاری رہا ان نشستوں میں مسئلہ کے مختلف پہلوؤں پر غور کرکے بعد ان کے بارے میں فیصلے کیے گئے جن کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

۱۔ اگر کوئی شخص غیر الٰہی نظام حکومت کے تحت صرف اس غرض کے لیے الیکشن لڑتا اور اسمبلی میں جاتا ہے کہ ایک غیر الٰہی نظام حکومت کو چلایا جائے تو یہ عقیدہ توحید کے خلاف اور ناجائز ہے البتہ انسان کے اقتدار اعلیٰ کے بجائے خدا کے اقتدار اعلیٰ کے نظریے کے مطابق دستور کو بدلنے کے لیے الیکشن میں حصہ لیا جا سکتا ہے بشرطیکہ

۱۔ ملک کے حالات ایسے ہوں کہ محض رائے عامہ کا کسی نظام کے لیے ہموار ہو جانا عملاً اس نظام کے قائم ہونے کے لیے کافی ہو سکتا ہے۔

۲۔ رائے عامہ کو اس حد تک ہموار کر لیا گیا ہو کہ الیکشن میں حصہ لے کر بالفعل دستور میں تبدیلی کرا لینے کی توقع ہو۔

۳۔ مذکورہ بالا غرض کے لیے چونکہ دوسری ضروری شرط پوری نہیں ہوتی ہے اس لیے موجودہ حالات میں اس غرض کے لیے جماعت کے الکشن میں عملاً حصہ لینے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔

۳۔ شوریٰ نے اس سوال پر بھی غور کیا کہ اگر کوئی شخص کسی غیر الٰہی نظام حکومت کے الیکشن میں صرف اس غرض سے حصہ لیتا ہے کہ اس کے پیش نظر اسلام اور مسلمانوں کا منفی اور مثبت مفاد ہو تو کیا یہ جائز ہوگا یا ناجائز؟ شوریٰ نے کثرت رائے سے فیصلہ کیا کہ اس کی کچھ صورتیں جائز ہو سکتی ہیں لیکن چونکہ اسی کے ساتھ اس نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ اس غرض کے لیے جماعت کو ۱۹۶۲ء کے الیکشن میں عملاً حصہ لینا نہیں ہے اس لیے اس کی متعین صورتوں پر تفصیل کے ساتھ غور نہیں کیا گیا اور اسی بنا پر اس سوال پر بھی غور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی کہ اس غرض کے لیے جماعت کے حصہ لینے کی ضروری شرطیں کیا ہو سکتی ہیں اور اسے آئندہ کے لیے اٹھا رکھا گیا جن وجوہ سے شوریٰ نے جماعت کے الیکشن میں عملاً حصہ نہ لینے کا فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ رائے عامہ کو مطلوبہ حد تک ہموار نہیں کیا جا سکا ہے۔

۲۔ جماعت اور اس کی دعوت سے ملک کا بہت محدود طبقہ متعارف ہو سکا ہے۔ بہت بڑی تعداد یا تو متعارف نہیں ہے یا غلط فہمیوں کا شکار ہے اس لیے اس بات کا اندیشہ ہے کہ الیکشن میں حصہ لینے سے جماعت کی دعوت و مقصد کے بارے میں مزید غلط فہمیاں پیدا ہو جائیں گی اور ان سے ہمارے اصل مقصد کو غیر معمولی نقصان پہنچے گا۔

۳۔ بحالات موجودہ ہمارے وسائل و ذرائع اور افرادی قوت اس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

۴۔ اس نقطہ نظر سے نہ متوسلین جماعت کا ذہن تیار کیا گیا ہے اور نہ اس پہلو سے ان کی تربیت کی گئی ہے۔

۴۔ مجلس نے الیکشن کے ضمن میں مسلمانوں کے رویے کے بارے میں بھی غور کیا اور اس سلسلہ میں مجلس شوریٰ اس نتیجہ پر پہنچی کہ

ا۔ مسلمانوں کے لیے ایک اہم اور مقدم کام یہ ہے کہ وہ اپنے دیگر مسائل کی طرح الکشن کے مسئلے میں بھی کتاب و سنت کی روشنی میں اپنا بنیادی موقف طے کرنے کے لیے کسی اجتماعی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

۲۔ بحیثیت مسلمان جب ان کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا معبود اور حاکم علی الاطلاق ہے اور اس کا بھیجا ہوا دین ہی صحیح نظام زندگی ہے تو انھیں اسی کے مطابق اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے اور تمام بندگان خدا کو اس کی طرف دعوت دینے کی کوشش کرنی چاہیے اور الیکشن میں کسی طرح حصہ لینا بھی اسی مقصد کے تحت اختیار کرنا چاہیے کہ اسے مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ بنایا جا سکتا ہو نہ کہ اس لیے کہ کسی غیر الٰہی نظام کا آلۂ کار بننا ہے۔

مجلس میں یہ سوال بھی زیر گفتگو آیا کہ الیکشن کے موقع پر حصہ لینے والی پارٹیاں اور رائے دہندگان بالعموم کچھ ایسے طریقے بھی اختیار کرتے ہیں جو اخلاقی نقطۂ نظر سے سخت معیوب اور ملک و معاشرے کے وسیع مفاد کے لیے سخت مضر ہیں، مثلاً فرقہ وارانہ اور طبقاتی صوبائی اور لسانی عصبیتوں کو برانگیختہ کرنا ووٹ حاصل کرنے کے لیے تفہیم و استدلال سے کام لینے کی بجائے دھن، دھونس دھاندلی سے کام لینا جھوٹ، افترا پردازی، تہمت، دشنام طرازی اور فریب دہی سے کام لینا وغیرہ اس لیے ضرورت سمجھی گئی کہ رفقاء کو اس طرف توجہ دلائی جائے کہ وہ اپنے اپنے دائرے میں جس حد تک بھی لوگوں کو ان باتوں سے روک سکتے ہیں روکنے کی کوشش کریں۔

حلقۂ متفقین کے ضوابط

گزشتہ شوریٰ منعقدہ جولائی ١٩٦٠ء میں یہ طے کیا گیا تھا کہ متفقین کا حلقہ قائم کیا جائے اور اس کے لیے ضروری ضابطے بنائے جائیں چنانچہ ذیل کے ضوابط طے کیے گئے

ا۔ جو شخص جماعت کے عقیدہ اور نصب العین کو صحیح تسلیم کرتا ہو اور ان کے عملی تقاضوں کو پورا کرنے پر بھی آمادہ ہو لیکن کسی وجہ سے وہ نظم جماعت میں شریک نہ ہو سکے، وہ متفق کہا جائے گا۔

۲۔ جہاں دو یا دو سے زیادہ متفقین ہوں اور وہاں کوئی جماعت نہ ہو، وہاں حلقۂ متفقین قائم کیا جا سکتا ہے لیکن بڑے شہروں میں مقامی امیر اگر شہر کے کسی محلہ میں حلقۂ متفقین قائم کرنے کی ضرورت سمجھے تو کر سکتا ہے۔

۳۔ حلقۂ متفقین کا ایک ناظم ہوگا جس کا انتخاب ممبران حلقہ کثرت رائے کی بنا پر کریں گے اور اس کی امیر حلقہ جماعت اسلامی منظوری دے گا۔

۴۔ حلقۂ متفقین کا ایک بیت المال ہوگا جس میں ممبران حلقہ اپنی زکوٰۃ اور عشر کی رقمیں داخل کریں گے۔

۵۔ بیت المال کے لیے ایک خازن ہوگا جس کا انتخاب ممبران حلقہ کریں گے اور اس کی منظوری امیر حلقہ جماعت اسلامی دے گا۔

۶۔ ناظم حلقہ ممبران کے مشورے سے بیت المال کی آمدنی طے شدہ مصارف میں صرف کرنے کا مجاز ہوگا۔

۷۔ حلقہ کی اپنی الگ رسید ہوگی جس پر "حلقہ متفقین" درج ہوگا۔ (رسیدوں کی فراہمی اگر اُمرائے حلقہ کریں تو بہتر
ہوگا۔ اس کے لیے جماعت کے بیت المال کی رسیدیں بھی حلقہ متفقین کی مُہر کے ساتھ دی جاسکتی ہیں۔

۸۔ جس جگہ حلقہ متفقین قائم ہوا اور وہاں کوئی منفرد رکن موجود ہو تو وہ امیر حلقہ کی اجازت سے اپنی زکوٰۃ، عشر یا
مانت کی رقم حلقہ متفقین کے بیت المال میں جمع کرسکتا ہے۔

۹۔ جہاں منفرد رکن ہو حلقہ متفقین کا ناظم وہی ہوگا لیکن امیر حلقہ مخصوص حالات میں کسی اور کی نظامت کی
ظوری دے سکتا ہے۔

نوٹ: ایسے اداروں کا قیام تحریک کے مقصد کے لیے گوناگوں وجوہ سے مفید ہوسکتا ہے، اس لیے رفقاءِ جماعت
کو ان کے قیام اور قائم ہوجانے کے بعد ان کی صحیح تربیت اور رہنمائی کی طرف خصوصی توجہ مبذول کرنی چاہیے۔

ادارہ ادب اسلامی

ایک تجویز یہ سامنے آئی کہ ادارہ ادب اسلامی کو جماعت اسلامی میں پھر سے ضم کردیا جائے اور
آئندہ جماعت کے نظم کے تحت ایک شعبہ کی حیثیت سے اسلامی ادب کی تنظیم کام کرتی رہے۔
اس تجویز پر غور کرتے وقت مجلس شوریٰ منعقدہ ذی قعدہ سنہ کے فیصلہ کا لحاظ کرایا جس میں کہا گیا تھا کہ جماعت کا رویہ
دارہ اسلامی کے سلسلہ میں ہمدردانہ رہے گا جس کے سلسلہ میں رفقاء جماعت کو مناسب فہمائش کردی جائے گی۔ چنانچہ تجویز
یرِ غور سے تو اتفاق نہیں کیا گیا البتہ یہ طے کیا گیا کہ مذکورہ بالا فیصلہ کے تحت رفقاء جماعت کو مرکز سے سرکلر بھیج کر توجہ
لائی جائے کہ وہ ادارے کے کاموں میں دلچسپی لیں اور ادیبوں سے ربط رکھنے اور ان کی اصلاح و تربیت کی کوشش کریں۔

جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ

مجلس شوریٰ منعقدہ اپریل ۱۹۶۰ء میں ایک عربی دارالعلوم کے قیام کی تجویز زیر غور آئی تھی جس کے متعلق
طے کیا گیا تھا کہ درسگاہ کی پوری اسکیم مع تفصیلات امیر حلقہ مشرقی یوپی اور مجوزہ سے معلوم
کی جائے۔ چنانچہ یہ اسکیم اب شوریٰ کے سامنے رکھی گئی اور طے کیا گیا کہ جماعت کی طرف سے جامعۃ الرشاد اعظم گڈھ کو
م کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی البتہ کچھ لوگ اپنے طور سے ایسی درسگاہ قائم کرنا چاہیں تو ان کو مرکز سے اجازت طلب کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔
بلپور ریلیف ورک۔ جبل پور اور ساگر کے ریلیف کے کاموں کی رپورٹ زیر غور آئی اور حسابات بھی پیش کیے گئے۔ تفصیلات
سابات سے متعلق بعض ارکان شوریٰ نے کچھ مشورے بھی دیے۔

کارکنان جماعت کے سلسلے کے بعض مسائل زیر غور آئے جن پر فیصلے کیے گئے۔ دعا کے بعد اجتماع ختم ہوا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ محمد یوسف ۱۵ر فروری سنہ ۶۲ء

تنقید و تبصرہ

خدا کا انکار کیوں از مولانا سید حامد علی، صفحات ۸۴، کتابت، طباعت، کاغذ عمدہ۔ قیمت ۳۰ نئے پیسے۔
ملنے کا پتہ:۔ دفتر ادارہ "شہادت حق" زکاتی محلہ۔ بریلی، یوپی

مولانا سید حامد علی صاحب کی زیر سرپرستی، بریلی میں "ادارہ شہادت حق" (وقف) قائم ہوا ہے، اس ادارے نے اسی نام کا ایک ماہنامہ شائع کرنے کی اسکیم ہے۔ یہ ماہنامہ متعدد و متنوع مضامین کا حامل نہ ہوگا بلکہ ہر ماہ کسی ایک موضوع پر ایک پمفلٹ خریداروں کو ملے گا۔ زیر تبصرہ پمفلٹ بھی اسی ماہنامہ کا پہلا نمبر ہے لیکن ماہنامہ "شہادت حق" کا ڈیکلریشن ابھی نہیں ملا ہے اس لیے ٹائٹل پر رسالہ کا نام درج نہیں کیا گیا ہے۔

اس کتاب کے پیش لفظ میں فاضل مصنف نے لکھا ہے۔

"کتاب کا موضوع خشک اور دقیق ہے اور مذہب، فلسفہ، سائنس اور منطق، سب سے اس کا تعلق ہے۔ تاہم پوری کوشش کی گئی ہے کہ کتاب علمی اعتبار سے اطمینان بخش ہونے کے ساتھ، عام فہم اور دلچسپ ہو اور علمی اصطلاحات اور حوالوں سے بوجھل نہ ہونے پائے۔"

پیش لفظ میں جو کچھ کہا گیا ہے، کتاب فی الواقع اس کا عملی مظاہرہ ہے۔ اس کتاب کا حاصل یہ ہے کہ انکارِ خدا کی کوئی علمی بنیاد موجود نہیں ہے۔ منکرین خدا زیادہ سے زیادہ جو بات کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمیں وجود خدا کا علم نہیں ہے یعنی "ہمارے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں ہے جس کی بنا پر ہم خدا کے ہونے کا یقین کرلیں" لیکن تماشا یہ ہے کہ وہ اپنی عملی زندگی اور اپنے انکار سے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کے پاس خدا کے نہ ہونے کی کوئی دلیل موجود ہے۔ وہ عدم علم کو عدم وجود کی دلیل بنا لیتے ہیں جو بالکل بچکانہ بات ہے۔ عقل و فہم کے ساتھ جس ذہن کو انصاف چھو بھی گیا ہے وہ اپنے نہ جاننے کو کسی چیز کے نہ ہونے کی دلیل نہیں بنا سکتا۔ لیکن خدا، آخرت، ملائکہ، جنت و جہنم اور وحیِ الٰہی کے منکرین اپنے نہ جاننے کو ان چیزوں کے نہ ہونے کی دلیل سمجھتے ہی نہیں، دوسروں کو سمجھانے کی بھی کوشش کرتے ہیں اور اس کے باوجود ان کا شمار عقلاء میں کیا جاتا ہے حالانکہ جہلاء بھی ایسے جہل کا مظاہرہ نہیں کرتے جس چیز کو ہم نہیں جانتے، اس کے ہونے اور نہ ہونے کا یکساں امکان

موجود ہو۔ اب اگر ایسے دلائل مل جائیں جن سے اس چیز کے "ہونے" کا علم حاصل ہوتا ہو تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہمیں اسے تسلیم کر لینا چاہیے، ہاں اگر اس چیز کے "ہونے" کی کوئی دلیل موجود نہ ہو تو بے شک اس کے ماننے کا مطالبہ صحیح نہیں ہے۔ بہر حال منکرین خدا انکار خدا کے سلسلے میں جو کچھ کہتے ہیں فاضل مصنف نے ان کی ہر بات وضاحت سے پیش کی اور پھر دلیلوں اور مثالوں سے اسے رد کیا ہے۔ عمدہ کتابت و طباعت کے ساتھ یہ کتاب تیس نئے پیسے میں بہت ارزاں ہے۔ ہم امید کرتے ہیں کہ لوگ ہاتھوں ہاتھ اس کتاب کو لیں گے اور اس سے استفادہ کریں گے۔ (ع' ق)

حدیث اقبال

طیب عثمانی ندوی۔ صفحات ۱۶۰ مجلد گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ منیجر دار الکتاب۔ نیا گدام۔ گیا۔ بہار

طیب عثمانی ندوی ادارۂ ادب اسلامی ہند کے جانے پہچانے ادیب ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب ان کے متعدد مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب کالج کے طلبہ اور ملت کے نوجوانوں کو کلام اقبال سے آشنا کرنے کے لیے مرتب کی گئی ہے۔ مصنف لکھتے ہیں:۔

> اس کتاب میں اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ کالج کے طلبہ اور ملت کے نوجوانوں کے سامنے اقبال کا کلام و پیام صحیح معنوں میں آجائے اور وہ اقبال کے "سوز جگر" اس کے "عشق" اور اس کے "نور" اور "نظر" سے واقف ہو جائیں۔

اس کتاب پر ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے پیش لفظ لکھا ہے اس میں وہ رقم طراز ہیں:۔

> طیب عثمانی صاحب نے اپنی اس تصنیف میں فکر اقبال کا تجزیہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کا یہ طریق کار درست اور لائق تحسین ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے کلام اور پیام کو اسلامی تعلیم کی روشنی ہی میں سمجھا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے دانتے کی شاعری کو مسیحی مذہب کے جانے بغیر سمجھا نہیں جا سکتا۔

اس مجموعے میں دو اہم مضامین "اقبال کی شخصیت کے تخلیقی عناصر" اور "انسان کامل اقبال کی نگاہ میں" مولانا ابوالحسن علی ندوی کے دو عربی مقالوں کا اردو عکس ہے جو انھوں نے قاہرہ یونیورسٹی میں یوم اقبال کے موقع پر پڑھے تھے۔ اس کی نشان دہی مصنف نے اپنے دیباچے میں کی ہے۔ طیب عثمانی صاحب کا انداز تحریر دلکش اور مدلل ہے اور مقالات میں ادبیت بھی پائی جاتی ہے۔ بعض جگہ الفاظ کا استعمال تبصرہ نگار کو عجیب محسوس ہوا۔ صفحہ ۲۰ پر مصنف نے لکھا ہے:۔

"امیر خسرو کا دیوان بھی چھوٹا ستھرا اور اسی طرح ہم آمیز تھا" اس عبارت میں "ستھرا" کا لفظ کھٹک پیدا کرتا ہے

میرے خیال میں ستھرائی اور ستھراؤ میں وہی فرق ہے جو صفائی اور صفایا میں ہے۔ طیب صاحب کو چونکہ اقبال سے
بہت عقیدت ہے اس لیے کہیں کہیں تعریف میں مبالغے کا رنگ بھی آ گیا ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کتاب طلبہ کے لیے بالخصوص مفید ہے اور انھیں کلام اقبال کے امتیاز اور اس کے حسن و جمال سے
آشنا کرتی ہے۔

اسلام بیسویں صدی میں | مؤلفہ و مرتبہ ایم محی الدین لکھنوی بی' اے' ایل' ایل بی۔ صفحات ۲۷۴۔ کاغذ طباعت
کتابت اوسط، قیمت مجلد مع گرد پوش' چار روپے پچاس نئے پیسے۔ ناشر ادارہ
اوراق زریں ۵۴ ریلوے روڈ' لاہور۔

اس کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ حرف آخر کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ یہ ۱۸۵ سے ۲۷۴ تک پھیلا ہوا
مؤلف نے مسائل حاضرہ پر چند سوالات مرتب کر کے علماء کو بھیجے تھے۔ مولانا محمد تقی امینی پرنسپل دار العلوم معینیہ اجمیر شریف
اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے جو جوابات دیے تھے اسے حرف آخر کے عنوان سے اس کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے
اور واقعہ یہ ہے کہ یہی ضمیمہ اس کتاب کا سب سے زیادہ کار آمد حصہ ہے۔

نوجوان مؤلف نے خود جو کچھ لکھا ہے وہ بحیثیت مجموعی ان کے اسلامی ذہن کی غمازی کرتا ہے لیکن اس کے باوجود انھوں
نے متعدد آیات قرآنی کی جو تاویل کی ہے وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا ذہن ابھی صاف نہیں ہو سکا ہے۔ تماشا یہ ہے کہ وہ
آیات قرآنی کی غلط تاویلات پر برہمی کا اظہار کرتے ہیں اور خود آیات کی ایسی غلط تاویل کرتے ہیں کہ عقل و نقل تو الگ ہیں عربی
بھی اس کا ساتھ نہیں دیتی۔

مغربی تہذیب کی قہرمانی سے مرعوب لوگ چاہے جس قدر بھی زور لگائیں یہ بات کوئی منصف مزاج تسلیم نہیں کر سکتا
کہ قرآن سمجھنے کے لیے عربی الفاظ کے معانی' عربی زبان کے محاورات و اسالیب سے بھی آزاد اور بے نیاز ہو جانا ضروری ہے۔ مؤلف
ایل ایل بی ہیں۔ کیا وہ اس بات کو صحیح سمجھتے ہیں کہ قانون کی اس کتاب کو جو انگریزی زبان میں مرتب کی گئی ہے کوئی شخص انگریزی
زبان کے لغات سے آزاد ہو کر سمجھنے کی کوشش کرے اور اس سلسلے میں ان لوگوں کے اقوال کو بھی رد کر دے جو انگریزی زبان کے ماہر
اور قانون کے استاذ ہیں۔ اسلامی ذہن رکھنے کے باوجود مؤلف کا قرآن کے ساتھ یہ سلوک سخت افسوسناک ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں
کہ اللہ مؤلف کو اس خطرناک روش سے بچائے اور قرآن فہمی کے صحیح ذرائع و وسائل کی طرف ان کی رہنمائی فرمائے۔

اس کتاب میں ایک عجیب چیز آورد ہے اور وہ ہے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم و مغفور کا خط۔ تبصرہ نگار کو اس کے

جعلی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ پتہ نہیں، یہ جعل مولانا مودودی کی دشمنی میں بنایا گیا ہے یا دشمنی میں۔ مؤلف اس خط کو شائع کرنے سے پہلے تحقیق کر لیتے تو اچھا تھا۔ انھوں نے اپنے دوست پر جن سے یہ خط حاصل ہوا ہے غلط اعتماد کیا۔ ہاں اس سنسنی خیزی سے ممکن ہے کہ کتاب کی فروخت پر اچھا پڑے۔　　(ع۔ ق)

مسلمانوں کے سیاسی افکار

پروفیسر رشید احمد، صفحات ۲۳۴۔ قیمت 5.75 پتہ:- ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور۔

ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور کی یہ ایک قابل قدر اور لائق مطالعہ پیش کش ہے۔ کتاب تیرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں قرآن کے نظریہ مملکت سے بحث کی گئی ہے۔ یہ بحث جو ۲۵ صفحات پر ختم ہوئی ہے قرآن کے سیاسی نظریات کا سادہ انداز میں اچھا تعارف کراتی ہے۔ ہمارے لیے خوشی کی بات ہے کہ مصنف اس ادارے کے مخصوص اجتہادی فکر سے متاثر نہیں ہیں۔ قرآن تمام مسلم مفکرین کے خیالات کا ماخذ رہا ہے۔ اس لیے یہ بحث کتاب کے لیے ایک بہترین مقدمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

مصنف کی اس بحث میں استدلال کی بعض خامیاں بھی نظر آتی ہیں جن کی طرف یہاں توجہ دلائی جا رہی ہے۔

خلافت کے فرائض میں سے ایک فرض قیام امن ہے۔ امن کی اہمیت کے سلسلے میں مصنف نے حضرت ابراہیمؑ کی یہ دعا نقل کی ہے:- رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (خداوندا اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے اور اس کے باشندوں کو میوہ جات کے ذریعہ روزی دے) صفحہ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا مطلب معروف معنی میں قیام امن نہیں ہے بلکہ آں جناب یہ چاہ رہے تھے کہ کوہ جہاں کہ خدا کا گھر ہے مذہبی تقدس حاصل ہو چنانچہ آپ کے زمانہ ہی سے اس کو ایک مقدس شہر مانا جاتا ہے اور کسی بھی حالت میں حدود حرم میں قتل و خوں ریزی کو صحیح نہیں سمجھا گیا حتیٰ کہ قاتل بھی اگر حرم میں پناہ لے تو اسکو پناہ حاصل ہو جاتی ہے۔

جہاد کا وجوب اس وقت تک مسلمانوں پر ہے جب تک کہ فتنہ بیخ و بن سے ختم نہ ہو جائے۔ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ (ان کافروں سے جنگ جاری رکھو حتیٰ کہ فتنہ و فساد برائے نام بھی باقی بھی باقی نہ رہے اور دین خالصۃً اللہ ہی کے لیے ہو جائے) صفحہ

یہاں مصنف نے لفظ فتنہ کو اردو کے فتنہ و فساد کے ہم معنی سمجھا ہے۔ حالانکہ قرآن نے فتنہ کا لفظ اس حالت کے لیے استعمال کیا ہے جبکہ باطل کی چیرہ دستی اور ظلم کی وجہ سے حق کا اختیار کرنا دشوار ہو رہا ہو، اور اللہ کے بندے محض اپنی حق گوئی کے جرم میں شدید سے شدید تر امتحان اور آزمائش سے گزر رہے ہوں۔ ایسی حالت میں جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے تاکہ قبول حق کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ رہے اور بندوں کے دین کو جو شخص اختیار کرنا چاہے بآسانی اختیار کر سکے۔

مصنف نے لکھا ہے کہ قرآن نے "اس امر کی البتہ وضاحت کردی ہے کہ اگر مال سارق کے قبضہ سے ضائع ہو جائے تو اس سے تاوان نہیں لیا جائے گا کیونکہ ہاتھ کا کاٹا جانا ہی چوری اور مال کے ضائع کر دینے کی سزا ہے اگر مسروقہ مال اس کے قبضے میں ہو تو البتہ اس سے لے لیا جائے گا۔" ص۲۹

معلوم نہیں مصنف کو قرآن کی کس آیت میں یہ وضاحت ملی ہے؟ اگر وہ اس کا حوالہ دیتے تو علمی دنیا کے لیے ایک زبردست انکشاف ہوتا۔

شوریٰ کے سلسلے میں بحث کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ "مشیروں پر قول معروف (عمدہ مشورہ، صائب رائے) ضروری قرار دیا گیا اور دوسروں پر اس مشورہ کے بعد جو فیصلہ نافذ کیا جائے اس پر عمل کرنا واجب کر دیا گیا ہے اسی چیز کو طاعۃ و قول معروف کے ذریعہ ظاہر کیا گیا ہے۔" ص۱۷

مصنف کی رائے میں مذکورہ حقیقت کی طرف "قرآن کریم نے نہایت لطیف اشارہ کیا ہے" حالانکہ ان فقروں کا سیاق و سباق ہی دوسرا ہے، شوریٰ کے حکم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ قول معروف اور طاعت امر ایک عام حکم ہے۔ قول معروف کا ترجمہ عمدہ مشورہ اور صائب رائے کرنا خواہ مخواہ کا تکلف ہے۔

مصنف اسی بحث میں مزید فرماتے ہیں کہ "شوریٰ کے سلسلے میں اس امر کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ خلیفہ کو لازمی طور پر اکثریت کی بات ماننا ضروری نہیں ہے بلکہ اسے اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو مختلف رایوں میں سے کسی ایک کو قبول کر لے خواہ اس کے حامیوں کی تعداد کتنی ہی کیوں نہ ہو یا اگر وہ مناسب سمجھے تو کوئی رائے متعین کر لے۔ اکثریت کی رائے کی لازمی طور پر پابندی نہ کرنے کا حکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان الفاظ میں دیا گیا ہے:- وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللهِ (اگر آپ اکثریت ہی کی بات کو مانیں گے تو وہ لوگ آپ کو اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے) ایک اور جگہ فرمایا ہے:- قُلْ لَا يَسْتَوِي الْخَبِيثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ أَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيثِ (فرما دیجیے کہ نیک و بد مساوی نہیں ہوتے خواہ آپ کو بدوں کی کثرت تعداد متحیر کر دے۔" ص۱۹

یہ پوری عبارت "استدلال" کا ایک نادر شاہکار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف ایک بات کہنا چاہ رہے تھے اس کے لیے انہیں قرآن سے دلیل کی ضرورت تھی لیکن انھوں نے دیکھا کہ قرآن ان کے خیال کا ساتھ نہیں دے رہا ہے تو زبردستی ان کی دو آیتوں سے اپنا مدعا نکال کر قارئین کے سامنے رکھ دیا۔ خواہ وہ آیتیں اپنے سیاق و سباق اور معنی کے لحاظ سے ان کے مدعا کی تردید ہی کیوں نہ کر رہی ہوں۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت اگر حق کا ساتھ نہیں دیتی ہے تو وہ غلطی کر رہی ہے، باطل

اس لیے نہ تو قابلِ قبول ہو سکتا ہو کہ اس کے پرستاروں کی تعداد زیادہ ہے اور نہ حق اس لیے چھوڑا جا سکتا ہے کہ اس کے حامی و ناصر بہت کم ہیں۔ گندگی گندگی ہی رہے گی۔ اس کے ڈھیر میں اضافہ ہونے کی وجہ سے وہ خوشبو نہیں دینے لگے گی۔ کہاں یہ بحث اور کہاں یہ دعویٰ کہ حاکم اپنے مشیروں سے مشورے کے بعد ان کی اکثریت کے مشورے کا پابند نہیں ہے۔ آپ کو اپنا دعویٰ ثابت ہی کرنا ہے تو کوئی معقول دلیل دیجیے خواہ مخواہ قرآن کی آیات کو غلط معنی نہ پہنائیے۔

صفحہ ۵۲-۵۱ پر مصنف نے زکوٰۃ کے سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ غلط قسم کا اجتہاد ہے۔ زکوٰۃ کی شرح اور مال کی کم از کم مقدار جس پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس کا تعین اسلامی حکومت کے ذمہ نہیں ہے بلکہ شریعت اس کا تعین کر چکی ہے۔

قرآن کے نظریہ مملکت سے بحث کے بعد مصنف نے بارہ مسلمان مفکرین کے سیاسی نظریات بہت ہی سلیقہ اور عمدگی کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ ہر مفکر کے خیالات کے پیش کرنے سے پہلے اس کے مختصر حالات اور اس کے دور کا اجمالی جائزہ بھی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب بہت سا قیمتی مواد چند صفحات میں ہمارے سامنے لے آتی ہے۔

کتاب میں جن بارہ مفکرین کے سیاسی نظریات سے بحث کی گئی ہے ان میں فارابی، ماوردی، نظام الملک طوسی، غزالی، ابن تیمیہ، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ اور علامہ اقبال جیسے چوٹی کے مفکرین بھی شامل ہیں اور رکیبا دس، ابن الطقطقی، جمال الدین افغانی اور سرسید ایسے اوسط درجے کے اہل علم بھی۔

مصنف نے فارابی، ابن خلدون، شاہ ولی اللہ اور علامہ اقبال پر بڑی محنت سے معلومات جمع کی ہیں البتہ بعض دوسرے مفکرین کا مطالعہ زیادہ توجہ اور محنت سے نہیں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر امام ابن تیمیہ کے سیاسی خیالات بیشتر ان کی ایک چھوٹی سی کتاب السیاستہ الشرعیہ سے لیے گئے ہیں حالانکہ امام موصوف نے اپنی بعض دوسری کتابوں میں بھی سیاسی موضوعات سے بحث کی ہے۔ جن کا خود مصنف نے ذکر کیا ہے۔ علاوہ ازیں امام ابن قیمؒ کی تصانیف میں بھی ان کے خیالات تفصیل سے ملتے ہیں لیکن مصنف نے ان سے مدد نہیں لی ہے۔

کسی علمی کتاب کا یہ بہت بڑا نقص ہے کہ اس کے ماخذ کی نشان دہی نہ کی جائے۔ یہ نقص اس کتاب میں موجود ہے قاری اگر معلوم کرنا چاہے کہ مصنف نے اپنی معلومات کہاں سے لی ہیں تو اسے زحمت ہوگی۔

کتاب کا دوسرا نقص یہ ہے کہ اس میں تنقید کا حصہ کم ہے۔ مصنف نے مسلمان مفکرین کے بہت سے خیالات بغیر کسی تنقید کے نقل کر دیے ہیں۔ غلط خیالات پر مختصر تنقید بھی شامل ہوتی تو کتاب کا وزن بڑھ جاتا۔ خاص طور پر جو خیالات اسلامی تعلیمات کے خلاف تھے ان کی تردید ضروری تھی لیکن یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ مصنف نے سرسید وغیرہ کے

مع [illegible] افکار اس انداز میں پیش کیے ہیں گویا کہ وہ تائید کے مستحق ہیں۔

ان چھوٹی بڑی خامیوں کے باوجود غالباً اردو میں اس موضوع پر پہلی کتاب ہے، جو لوگ اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ (جلال الدین)

نمبر انسانیت نمبر

صفحات ۱۱۲۔ کاغذ، کتابت، طباعت اوسط۔ قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ:۔ دفتر پندرہ روزہ "برادری" سعادت گنج۔ لکھنؤ۔

یہ نمبر پندرہ روزہ برادری لکھنؤ کی خصوصی پیشکش بابت ماہ جنوری ۱۹۶۲ء ہے۔ اسلامیات کے مدیر جناب عبدالحفیظ صدیقی سیاسیات کے جناب مظہر سبحان گورکھپوری اور ادبیات کے جناب ابوالمجاہد زاہد ہیں۔ یہ نمبر قدیم و جدید مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ نمبر قاری کے ذہن میں اسلام اور خدا کا کوئی محدود، جامد اور بے جان خیال پیدا نہیں کرتا بلکہ وسیع، متحرک اور جاندار تصور پیدا کرتا ہے یہ بات جس مجموعۂ مضامین کو حاصل ہو وہ یقیناً قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔ اس نمبر میں علامہ سید سلیمان، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالحسن علی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، سید قطب اور استاذ مصطفیٰ سباعی جیسے اساطین علم و فضل کے افادات جمع کیے گئے ہیں اور جناب نیاز فتحپوری کے قلم سے "خدا کا صحیح و صالح تصور" پیش کیا گیا ہے۔ غالباً یہ مضمون ان کے اس دور کا ہے، جب ان کا علم اور ان کی صلاحیتیں اسلام کی صحیح نمائندگی کے لیے وقف تھیں۔ اس مضمون میں خدا کا صحیح اور صالح تصور پیش کرکے آخر میں انھوں نے لکھا ہے:۔

"کاش۔ داعی اسلام کا بتلایا ہوا یہ پیغام دنیا سمجھ سکے اور افتراق و انتشار، تعصب، عداوت، جہل، نفرت اور قتل و غارتگری کا وہ جوالا مکھی ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو جائے جس کے ہلاکت آفریں شعلوں نے دنیا کو ہمیشہ ہی برباد کیا ہے، اور جس کے شعلے کہیں کہیں آج بھی دنیا کی آبادیوں کو ویرانوں سے بدل رہے ہیں اور جس کے بطن میں بربادی کے اور ہزاروں شعلے بھڑک رہے ہیں۔ اگر اس حقیقت تک دنیا کی رسائی ہو جائے اور خدائے واحد کے اس صحیح ترین تصور کو دنیا کا ذہن قبول کر لے تو ہلاکت و بربادی کی ساری جد و جہد ختم ہو جائے اور دنیا امن و سکون کی جنت بن جائے۔"

کاش نیاز فتحپوری داعیِ اسلام کے بتلائے ہوئے اس پیغام سے خود انحراف نہ کرتے اور کاش وہ پھر اس مقام پر واپس آ جائیں جہاں سے منحرف ہو کر معلوم نہیں کہاں کہاں بھٹکتے پھر رہے ہیں ——— شعراء کی لائق مطالعہ نظمیں اور غزلیں بھی اس نمبر کی زینت ہیں۔

ہدایۃ القرآن

محمد عثمان کاشف الہاشمی۔ صفحات ۱۲۸۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ ہدیہ دو روپیہ علاوہ محصول ڈاک
ناشر: مکتبہ "شہاب" دیوبند۔ یوپی۔

مکتبہ شہاب دیوبند نے ہدایۃ القرآن کے نام سے ایک آسان تفسیر شائع کرنے کی اسکیم بنائی ہے۔ اس کے تحت ابھی کا پہلا [illegible]

اس میں عمّ یتساءلون سے سورۃ اذا الشمس کورت تک کی تفسیر آگئی ہے۔ مولانا محمد عثمان کاشف الہاشمی نے ابتدا میں لکھا ہے:

"قرآن حکیم کے مطالب و مقاصد کی ایسی مختصر اور آسان تفسیر کہ صرف سادہ اردو زبان کی مدد سے ہر شخص بات سمجھ لے"

اس تفسیر کا منہاج یہ ہے کہ پہلے پوری سورۃ ہوتی ہے اس کے بعد اس کے تمام مفرد الفاظ الگ الگ درج کر کے، سامنے ان کا اردو ترجمہ دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ سورہ کہاں نازل ہوئی اس میں کتنی آیتیں ہیں اور کتنے رکوع ہیں پھر اس سورۃ میں جتنی باتیں ہوتی ہیں نمبر وار ان کی طرف مختصر اشارہ ہوتا ہے اس کے بعد آخر میں ایک ایک آیت کو لیکر اس کی تفسیر و تشریح ہوتی ہے۔

زبان آسان اور رواں ہے جسے کم پڑھے لکھے لوگ بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر قرآن کے ترجمہ و تفسیر میں صحت کا خیال رکھا جائے تو پھر جس قدر بھی قرآن کی تفسیر مختلف انداز اور متنوع اسلوب میں شائع ہوگی ان شاء اللہ تعالیٰ فائدے سے خالی نہ ہوگی۔ تبصرہ نگار پوری کتاب نہیں پڑھ سکا ہے، سرسری طور پر جتنے حصے بھی مطالعہ میں آئے ان میں کوئی غلطی نظر نہ آئی۔ بھول چوک تو انسان کا خاصہ ہے لیکن توقع ہے کہ اس میں کوئی فاحش غلطی نہ ہوگی۔ جو حصہ مطالعہ میں آیا اس میں اردو کا ایک محاورہ البتہ اجنبی معلوم ہوا۔ صفحہ ۶ کے شروع ہی میں ہے "آخر یوں بھی پار نہ بسا" پار نہ بسنا اردو کا کون سا محاورہ ہے؟ ہو سکتا ہے کہ کہیں مخصوص خطے میں بولا جاتا ہو ایسے موقع پر قوسین میں یا حاشیے میں اس کا مفہوم لکھ دینا چاہیے۔ توقع ہے کہ فاضل مولف ہر لحاظ سے اسے مفید اور صحیح بنانے کی کوشش کریں گے۔ (ع۔ق)

(بقیہ "بعثتِ محمدی کا مقصد" صفحہ ۸ سے آگے)

حضرت عبداللہ نے تورات کے حوالے سے جو کچھ پیش کیا ہے وہ سب کا سب کچھ اضافے کے ساتھ یسعیاہ نبی کی بشارت میں موجود ہے۔ سفر یسعیاہ کے باب ۴۱ میں بھی نبی آخری کی بشارت موجود ہے اس میں ایک جگہ کہا گیا ہے۔

کس نے اس راست باز کو پورب کی طرف سے برپا کیا اور اپنے پاؤں کے پاس بلایا اور امتوں کو اس کے آگے کر دیا اور اسے بادشاہوں پر مسلط کیا۔ کس نے انہیں (کافروں) کی خاک کی مانند اس کی تلوار کے، اور اڑتی بھوسی کی مانند اس کی کمان کے حوالہ کیا۔

اب اگر کوئی شخص تورات کے ان بیانات کو قرآن کی آیات میں تلاش کرے تو وہ دونوں میں پوری مطابقت پائے گا۔ اگر پوری تفصیل سے اس مطابقت کو نمایاں کیا جائے تو اس کے لئے کئی صفحات درکار ہوں گے۔

حضرت ابن کثیر نے بھی یہ حدیث سورۃ احزاب کی آیت يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ شَاهِدًا کے تحت نقل کی ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے وہب ابن منبہ کی بھی ایک طویل روایت نقل کی ہے۔ میں اس روایت کے کچھ حصوں کا ترجمہ یہاں درج کرتا ہوں۔

میں امیوں میں ایک امی کو مبعوث کروں گا، وہ سخت دل اور درشت خو نہ ہو گا، وہ بیہودہ گوئی سے دور رہو گا۔ میں اس کے ذریعہ اندھی آنکھوں کو بینا، بہرے کانوں کو شنوا اور بند دلوں کو کشادہ کروں گا۔ میں اسے تمام اچھے امور کے لیے درست اور تمام اخلاق کریمانہ سے آراستہ کروں گا۔ حق اس کی شریعت، عدل اس کی سیرت، ہدایت اس کی پیشوا، اسلام اس کا دین، احمد اس کا نام ہو گا۔ ضلالت و گمراہی کے بعد اس کے ذریعہ میں لوگوں کو ہدایت دوں گا، میں اس کے ذریعہ متفرق امتوں کے درمیان اتحاد پیدا کروں گا اور انسانوں کے عظیم گروہ کو ہلاکت سے نجات بخشوں گا۔ میں اس کی امت کو بہترین امت بناؤں گا۔ وہ لوگ موحد، مومن، مخلص اور ہمارے رسولوں کی تصدیق کرنے والے ہوں گے۔ وہ کھڑے ہو کر اور بیٹھ کر ہماری نماز ادا کریں گے، صف بند ہو کر اللہ کے رستے میں جنگ کریں گے اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وہ ہزاروں کی تعداد میں اپنے گھروں سے نکل پڑے ہوں گے وہ رات کے راہب اور دن کے شیر ہوں گے، وہ لوگ اپنے رسول کے بعد حق کی طرف رہنمائی کریں گے اور حق ہی کے ساتھ عدل و انصاف کریں گے جو ان کی مدد کرے گا میں اسے عزت دوں گا، میں انھیں ان کے نبی کا وارث اور داعی الی الحق بناؤں گا، وہ نیکی کا حکم دیں گے، برائی سے روکیں گے، نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے اور اپنے عہد کو پورا کریں گے، میں خیر کی ہیں نے ان کے اول گروہ سے ابتدا کی ہو گی ان کے آخری گروہ کے ذریعہ میں اسے تمام کر دوں گا، یہ میرا فضل ہے جس کو چاہوں دوں اور میں بڑے فضل والا ہوں۔

حضرت عبداللہ بن عمرو کی حدیث سے مندرجہ ذیل باتیں بوضاحت معلوم ہوتی ہیں

(۱) تورات کے حوالے سے انھوں نے جو صفات بیان کی ہیں وہ قرآن میں بھی موجود ہیں۔ (۲) سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد اقامت دین تھا۔ (۳) آپ کی بعثت سے سیکڑوں سال پہلے تورات میں یہ پیشین گوئی موجود تھی کہ جب تک دین قائم نہ ہو جائے آپ کی وفات نہ ہو گی۔

اس طرح یہ حدیث سورۂ شوریٰ اور سورۂ توبہ وغیرہا کی آیتوں کی بہترین شرح بن جاتی ہے۔

یہ تفصیل ہمارے اس یقین میں اضافہ کرتی ہے کہ جماعت اسلامی ہند نے اپنے لیے جو نصب العین اختیار کیا ہے اس میں ہم نے کوئی غلطی نہیں کی ہے بلکہ یہی نصب العین فی الواقع پوری امت مسلمہ کا نصب العین ہے جس سے وہ غفلت برت رہی ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ بند دلوں کو کھولے ہمیں خلوص عطا کرے۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے ہمیں سرگرم عمل کرے اور ہماری سعی و جہد کو قبول فرمائے۔ آمین!

JAMIA LIBRARY
Jamia Millia Islamia

جلد: ۲۸
شمارہ: ۵

زندگی
رامپور

مئی ۶۲ء
ذی الحجہ ۱۳۸۱ھ

مدیر:- سید احمد عروج قادری

• خط و کتابت و ارسالِ زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یو۔پی
• زرِ سالانہ:- چھ روپے ۔ ششماہی:- تین روپے ۔ فی پرچہ:- پچاس نئے پیسے
• ممالکِ غیر سے:- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں۔
منیجر "ہفت روزہ شہاب" C/11 شاہ عالم مارکیٹ لاہور

المالک:- جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر:- سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر:- احمد حسن۔ مطبع:- ناظم پریس رامپور
مقام اشاعت:- دفتر زندگی دکانی رامپور یو پی

اشارات

(سید احمد عروج قادری)

اس دفعہ اشارات کے صفحات میں ایک خالص اصولی بحث پیش کی جا رہی ہے، اس کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی اس کا جواب آگے کی سطریں دیں گی۔ ویسے اس کی ضرورت یوں بھی ہے کہ تمام اہل علم مسلمانوں کو بالعموم اور ان لوگوں کو بالخصوص جو اقامت دین کا نصب العین اختیار کرکے متحرک ہیں، شریعت کے اصول پر گہری نظر رکھنی چاہیے۔ توقع ہے کہ ہمارے رفقا خصوصیت کے ساتھ اس بحث پر غور فرمائیں گے۔

"وہ شرک تو ہے مگر منصوص نہیں ہے" "تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اجتہادی شرک ہے" ایک سنجیدہ مجلس میں ایک سنجیدہ گفتگو کے یہ دو جملے ہیں جو میرے کانوں نے سنے۔ ان دو جملوں سے اندازہ ہوا کہ اجتہادی یا مجتہد فیہ مسائل اور منصوص و غیر منصوص احکام کے مفہوم و معنی اور اس کی تفصیلات خاصے پڑھے لکھے لوگوں کے ذہنوں سے بھی اوجھل ہیں۔ ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس کی یاد دہانی کی جائے، کیونکہ شرک یا اس کے کسی نمایاں مظہر کی اہمیت اگر کسی مسلمان کے ذہن میں کم ہو جائے تو پھر وہ ایک خطرناک صورت حال سے دوچار ہو جاتا ہے۔ میں اس وقت ذیل کے نکات کی مختصر تشریح کروں گا۔

(۱) کن مسائل کو مجتہد فیہ یا اجتہادی مسائل کہتے ہیں۔ (۲) کون سے مسائل منصوص کہے جاتے ہیں اور کون سے غیر منصوص۔ (۳) شرک اور مظاہر شرک کا شمار کن مسائل میں ہے۔

خود لفظ اجتہاد کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں کھلا اشارہ موجود ہے کہ کون سے مسائل اجتہادی ہو سکتے ہیں۔ لغت میں اجتہاد کہتے ہیں کسی پرمشقت کام میں اپنی پوری طاقت صرف کرنے کو، اور اصطلاح فقہاء میں اجتہاد نام ہے اس کا کہ کوئی فقیہ شرعی حکم جاننے کے لیے اپنی پوری صلاحیت اور علمی طاقت صرف کر دے۔

یہ لغوی و اصطلاحی معنی بتا رہا ہے کہ وہ احکام و مسائل جو پوری وضاحت سے قرآن اور احادیث میں موجود ہیں انہیں اجتہادی یا مجتہد فیہ مسائل نہیں کہا جا سکتا۔ اجتہادی مسائل تو وہی ہو سکتے ہیں جو شریعت میں واضح نہ ہوں اور مجتہد اپنی محنت سے وہاں تک رسائی حاصل کرے چنانچہ اصول کی تمام کتابیں اس پر متفق ہیں کہ :-

"مجتہد فیہ اس شرعی حکم کو کہتے ہیں جس میں کوئی قطعی دلیل موجود نہ ہو"

اس سے معلوم ہوا کہ دین کے قطعیات و مسلمات میں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے اور ایسے کسی مسئلے کو اجتہادی قرار دینا صحیح نہیں، اجتہاد کا تعلق ان شرعی احکام سے ہوتا ہے جو ظنی ہوتے ہیں اور ان میں اثبات و نفی دونوں سے ہر ایک کا احتمال موجود ہوتا ہے۔

اصول فقہ میں اسے ایک اور پہلو سے واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ فقہاء کہتے ہیں کہ اجتہادی مسائل وہ ہوتے ہیں کہ اگر مجتہد سے ان میں غلطی بھی ہو جائے تو وہ مستحق اجر ہوتا ہے یا کم سے کم درجے میں یہ کہ گناہ گار نہیں ہوتا ظاہر ہے کہ یہ بات انہیں مسائل میں ہو سکتی ہے جن میں اثبات یا نفی کا پہلو واضح نہ ہو، اگر وضاحت کے باوجود کسی وجہ سے کوئی اہل علم غلطی کرے گا تو گناہ گار ہو گا کیونکہ جہاں کسی مسئلے میں شریعت نے وضاحت کر دی اس کا اجتہادی یا مجتہد فیہ ہونا ختم ہوا اب اگر کوئی شخص وہ پہلو اختیار کرے جو شرعی وضاحت کے خلاف ہے تو قابل معافی قرار نہیں دیا جا سکتا

یہ بات دو مثالوں سے واضح ہو گی، ایک کا تعلق عقیدے سے ہے اور دوسری کا فقہی مسئلے سے

(۱) مثلاً عذاب قبر کا مسئلہ ہے۔ کتاب و سنت میں اس کے لیے اتنے واضح دلائل موجود ہیں کہ اس کا اثبات ایک ثابت شدہ اور اہل حق کے درمیان مسلمہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسے اجتہادی قرار دے کر اس کی نفی کرے تو وہ بدعتی اور گنہ گار ہو گا۔

(۲) مسائل زکوٰۃ میں چاندی کے نصاب اور مقدار زکوٰۃ کا مسئلہ ہے۔ احادیث اور اجماع امت نے بوضاحت اس کی تعیین کر دی ہے۔ اب اگر کوئی شخص اسے اجتہادی قرار دے کر اس تعیین کی نفی کرے اور بزعم خود دینا نصاب اور نئی مقدار زکوٰۃ متعین کرے تو وہ بدعتی اور گنہ گار ہو گا۔

ان دو مثالوں سے واضح ہوا کہ جب وہ مسائل بھی اجتہادی قرار نہیں دیے جا سکتے جن کی قطعیت اس درجے پر نہیں پہنچی کہ انکار کو کفر قرار دیا جائے تو پھر ایسے مسائل کو اجتہادی قرار دینا اور زیادہ غلط ہو گا جن کی قطعیت اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ ان کا انکار کفر ہے۔ مثلاً اگر کوئی مسلمان، عذاب و ثواب آخرت کو اجتہادی قرار دے کر اس کا انکار کرے تو اسے مجتہد نہیں، مرتد اور گمراہ زندیق قرار دیا جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص نصاب زکوٰۃ کو کہے کہ اجتہادی ہے

دے کر اس کی فرضیت کا انکار کرے تو اس کے کفر میں کوئی شبہہ نہ ہوگا۔

یہ تو ایسے مسائل کی مختصر توضیح تھی جنہیں اجتہادی کہنا صحیح نہیں ہے۔ اب میں چاہتا ہوں کہ دو ایسی مثالیں بھی پیش کر دوں جن سے اجتہادی مسائل کا ایک تصور ذہن میں آجائے۔ عموماً ایسا ہوتا ہے کہ نفی و اثبات کے دونوں کنارے واضح اور غیر اجتہادی ہوتے ہیں اور درمیان کی بعض صورتیں غیر واضح ہونے کی وجہ سے مجتہد فیہ بن جاتی ہیں۔

پہلی مثال سائۂ دین اس بات پر متفق ہیں کہ عادل اور ثقہ شخص کی روایت بھی قبول کی جائے گی اور گواہی بھی۔ اسی طرح وہ اس پر بھی متفق ہیں کہ فاسق کی نہ روایت قبول کی جائے گی اور نہ شہادت۔ اثبات و نفی کے دونوں طرف واضح ہیں۔ اب درمیان کی ایک صورت مجہول الحال کی ہے یعنی ایسا شخص جس کے بارے میں نہ یہ معلوم ہے کہ وہ عادل ہے اور نہ یہ معلوم ہے کہ وہ فاسق ہے۔ ایسے شخص کے بارے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہو گیا بعض نے کہا کہ اس کی روایت قبول کی جائے گی اور بعض نے کہا کہ قبول نہیں کی جائے گی لہٰذا یہ صورت مجتہد فیہ بن گئی۔

دوسری مثال جس شخص نے پانی نہ ملنے کی وجہ سے تیمم کیا ہو اور اس کے بعد نماز پڑھنے سے پہلے پانی پائے تو تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اسے وضو کر کے نماز پڑھنی چاہیے اب تیمم کے ساتھ نماز صحیح نہ ہوگی۔ اسی طرح اگر یہ صورت پیش آئے کہ وہ تیمم سے نماز ادا کرلے اور اس نماز کا وقت بھی نکل جائے اس کے بعد پانی ملے تو تمام فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اس کی نماز صحیح ہوگئی اور اسے اعادہ نہیں کرنا پڑے گا اب درمیان کی ایک ایسی صورت پیش آتی ہے کہ وہ متفق نہیں رہتے۔ مثلاً کسی شخص نے تیمم کر کے ظہر کی نماز پڑھی لیکن اس سے پہلے کہ ظہر کا وقت ختم ہو اسے پانی مل گیا اب چونکہ مسئلہ پوری طرح واضح نہ رہا اس لیے ان کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا بعضوں نے کہا کہ نماز کو دُہرانا پڑے گا اور بعضوں نے کہا کہ دُہرانا نہ پڑے گا۔ لہٰذا یہ صورت اجتہادی بن گئی۔

اب اس نکتے پر غور کیجیے کہ کون سے مسائل منصوص ہوتے ہیں اور کون سے غیر منصوص۔ اس سلسلے میں عام طور سے جو بات ذہنوں میں بیٹھی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جو احکام قرآن یا حدیث کی عبارت میں صراحۃً موجود ہیں وہ منصوص ہیں اور جو عبارت میں صراحۃً موجود نہیں وہ غیر منصوص ہیں۔ حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو کتاب و سنت کے مسائل و احکام بہت محدود ہو کر رہ جاتے۔ فقہائے امت نے قرآن و حدیث اور عام انسانی کلام کے الفاظ سے استدلال کو چار بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔

عبارۃ النص - اشارۃ النص - دلالۃ النص - اقتضاء النص - ان چاروں دلالتوں یا استدلالات سے جو احکام نکلتے ہیں وہ سب منصوص ہوتے ہیں۔ میں ذیل میں ہر ایک کی مختصر توضیح کرتا ہوں۔

عبارۃ النص اس دلالت کا مفہوم یہ ہے کہ قرآن یا حدیث کے نفس الفاظ کی جو دلالت ان کے معانی پر ہو رہی ہے وہ عبارۃ النص سے ثابت ہے، اس کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک صورت میں وہ حکم ان الفاظ کا مقصود اصلی بھی ہوتا ہے یعنی متکلم نے وہ الفاظ اسی حکم کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیے ہیں، دوسری صورت میں وہ حکم ان الفاظ کا مقصود اصلی تو نہیں ہوتا لیکن ان الفاظ سے صراحۃً نکل رہا ہوتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں جو احکام ثابت ہوتے ہیں وہ عبارۃ النص ہی سے ثابت شدہ تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس کی مثال جو اصول فقہ کی ہر چھوٹی بڑی کتاب میں ملتی ہے۔ قرآن کی یہ آیت ہے وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا (اور اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام) ان الفاظ سے دو حکم نکل رہے ہیں ایک یہ کہ بیع اور ربا دونوں ایک نہیں ہیں جیسا کہ کفار سمجھتے ہیں بلکہ دونوں میں فرق ہے دوسرا یہ کہ بیع حلال ہے اور سود حرام ہے۔ پہلا حکم مقصود اصلی بھی ہے کیونکہ اللہ نے یہ آیت ان کفار کے جواب میں نازل فرمائی ہے جو بیع و ربا کی یکسانی کے قائل تھے اور مقصود دونوں میں فرق ثابت کرنا ہے۔ دوسرا حکم اس آیت کے نازل کرنے کا اصل مقصود تو نہیں ہے لیکن نفس لفظ اور اس کے معنی سے یہ بھی نکل رہا ہے کہ بیع حلال ہے اور ربا حرام ہے۔ معلوم ہوا کہ بیع و ربا کے درمیان تفرقہ اور بیع کی حلت، ربا کی حرمت دونوں حکم عبارۃ النص سے ثابت ہیں۔

اشارۃ النص اس دلالت سے جو حکم ثابت ہوتا ہے وہ لفظ کا مقصود نہیں ہوتا لیکن اس کا اشارہ اس میں ضرور موجود ہوتا ہے اور اگر کوئی دلیل مانع موجود نہ ہو تو اس دلالت سے ثابت شدہ حکم بھی عبارۃ النص ہی کی طرح واجب العمل ہوتا ہے۔ قرآن سے اس کی دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(۱) وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ — بچے کی دودھ پلانے والی ماؤں کا کھانا پینا اور ان کا لباس اس کے باپ کے ذمے ہے

اس آیت سے اشارۃً چند احکام نکل رہے ہیں۔ (۱) بچے کا انتساب باپ کی طرف ہوگا، ماں کی طرف نہیں۔ مثال کے طور پر اگر باپ قبیلۂ قریش سے تعلق رکھتا ہے اور ماں کسی دوسرے قبیلے سے تو بچہ قریشی سمجھا جائے گا اور وہ قریشیوں کا کفو ہوگا۔ (۲) بچے کی کفالت صرف باپ کے ذمے ہوگی اس کے اخراجات برداشت کرنے میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہ ہوگا۔ (۳) عند الضرورۃ باپ کو اپنے بیٹے کے مال میں بلا اذن تصرف کا حق ہوگا۔

یہ اشارہ وَعَلَی الْمَوْلُوْدِ لَہٗ کے لام میں پوشیدہ ہے کیونکہ لام اختصاص کے لیے ہے یعنی باپ کو اپنے بچے پر جو خصوصی حق حاصل ہے وہ کسی کو نہیں ہے، اسی اختصاص سے وہ احکام ثابت ہوتے ہیں جن کا ذکر اوپر گزرا اس آیت کے عبارۃ النص سے جو حکم ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ دودھ پلانے والی ماؤں کا خرچ باپ کے ذمے ہوگا۔ اس طرح یہ آیت عبارۃ النص اور اشارۃ النص دونوں کی مثال بن جاتی ہے۔

(۲) لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِيْنَ الَّذِيْنَ أُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ (الحشر)

ان محتاج مہاجروں کے لیے جو اپنے گھروں اور اموال سے نکال دیے گئے ہیں۔

اس آیت سے اشارۃً جو حکم ثابت ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ مہاجرین اپنے جو اموال مکہ میں چھوڑ آئے تھے اور جن پر کفار نے قبضہ کر لیا تھا وہ ان کی ملکیت سے نکل گئے تھے اور کفار ان اموال کے مالک ہو گئے تھے، یہ اشارہ لفظ فقراء میں پوشیدہ ہے۔ اگر وہ مکہ میں چھوڑے ہوئے اموال کے مالک ہوتے تو انہیں فقیر نہ کہا جاتا اس سے معلوم ہوا کہ اگر کفار دارالاسلام سے کسی مسلمان کا مال لے بھاگیں اور دارالحرب میں داخل ہو جائیں تو وہ ان اموال کے مالک ہو جائیں گے ۔۔۔ اس آیت کے عبارۃ النص سے جو حکم ثابت ہوتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ مالِ فئے میں ان فقراء مہاجرین کا بھی حق ہے جو اپنے وطن اور مال سے نکال دیے گئے ہیں، اس طرح یہ آیت بھی عبارۃ النص اور اشارۃ النص دونوں کی مثال ہے کیونکہ جہاں کہیں اشارۃ النص کی دلالت موجود ہوگی وہاں عبارۃ النص کی دلالت ضرور موجود ہوگی۔ اشارۃ النص فی الواقع عبارۃ النص کا ایک التزامی نتیجہ اور ثمرہ ہوتا ہے اور اسی دلالت التزامی کی وجہ سے اشارۃ النص سے ثابت شدہ احکام بھی منصوص اور واجب العمل تسلیم کیے گئے ہیں۔

عبارۃ النص اور اشارۃ النص کے فرق کو واضح کرنے کے لیے فقہاء نے ایک محسوس مثال دی ہے اگر کوئی خاص شخص کسی سے ملنے آ رہا ہو اور وہ اس کی طرف اپنی نگاہیں اٹھا کر دیکھے اور گوشہ ہائے چشم سے اس کے داہنے بائیں بھی کچھ لوگ نظر آئیں تو اس مثال میں وہ شخصِ خاص عبارۃ النص کا قائم مقام اور دوسرے لوگ اشارۃ النص کے قائم مقام ہوں گے۔ کیونکہ نگاہیں اٹھا کر دیکھنے کا مقصود وہ شخص خاص ہے اور دوسرے لوگ بلا قصد التزامی طور پر نظر آ گئے ہیں۔

دلالۃ النص دلالۃ النص سے استدلال کا مفہوم یہ ہے کہ کسی لفظ کا لغوی معنی سمجھتے ہی وہ حکم جو اس منطوق (بولے ہوئے) لفظ سے نکل رہا ہے کسی مسکوت عنہ (جس سے خاموشی اختیار کی گئی ہو) کے لیے بھی ثابت ہو جائے کیونکہ اس منطوق حکم کی علت سمجھنے کے لیے کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں پڑتی بلکہ لغوی معنی جانتے ہی وہ علت سمجھ میں

آجاتی ہو۔ بعض صورتوں میں مسکوت عنہ اس حکم میں منطوق سے بھی اعلیٰ درجہ رکھتا ہے۔ مثلاً قرآن کی یہ آیت ۔

وَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا　　　ماں باپ کو اف نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکو۔

اس آیت میں اف کہنے اور جھڑکنے کی حرمت لفظاً منطوق ہے لیکن اسی سے ماں باپ کو مارنے کی حرمت بھی نکلتی ہے جو مسکوت عنہ ہے بلکہ مارنے کی حرمت اف کہنے کی حرمت سے بڑھی ہوئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ "اف نہ کہو اور نہ جھڑکو" کے الفاظ سنتے ہی اس کی یہ علت سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس سے ان کو تکلیف پہنچے گی ظاہر ہے کہ جب اف کہنے سے تکلیف پہنچے گی تو مارنے سے بدرجہ اولیٰ پہنچے گی اس لیے اس کی حرمت اف کہنے کی حرمت سے بھی شدید ہوگی ۔ اب اگر کوئی شخص ماں باپ کو مارنے کی حرمت کو غیر منصوص کہے تو اس کا یہ قول ناواقفیت پر مبنی سمجھا جائے گا ۔

اقتضاء النص اس استدلال کا مطلب یہ ہے کہ لفظ کسی ایسے مسکوت عنہ پر دلالت کرتا ہے کہ اس کلام کا صدق یا اس کی صحت اس پر موقوف ہوتی ہے یعنی اگر مسکوت عنہ پر اس لفظ کی دلالت تسلیم نہ کی جائے تو کلام جھوٹ قرار پائے یا غلط ہو جائے۔ مثلاً کفارۂ ظہار کے سلسلے میں فرمایا گیا ہے :۔

فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ　　　ظہار کا کفارہ ادا کرنے والا ایک غلام آزاد کرے

اس حکم میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ وہ غلام اس آزاد کرنے والے کا مملوک ہو یا نہ ہو لیکن عدم ذکر کے باوجود یہ لفظ اس غلام کے مملوک ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس کے بغیر یہ کلام صحیح باقی نہ رہے گا۔ ظاہر ہے کہ کسی دوسرے کے غلام کو آزاد کرنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ یہ آیت جس بات پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ کفارہ ادا کرنے والا ایک ایسا غلام آزاد کرے جو اس کا مملوک ہو ـــــ صدق کلام کے لیے اصول کی کتابوں میں ایک حدیث مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا ہے :۔

رُفِعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَاءُ وَالنِّسْيَانُ　　　میری امت سے غلطی اور بھول مرفوع ہیں

اس حدیث میں اگر کوئی ایسا لفظ مقدر نہ مانا جائے جو مذکور نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ امت محمدی نہ کبھی کوئی غلطی کرے گی اور نہ کسی چیز کو بھولے گی۔ یہ بات واقع کے مطابق نہیں ہے لہذا اس کلام کا صدق موقوف ہے اس بات پر کہ یہاں "حکم" کا لفظ مقدر مانا جائے اب پوری بات یہ ہوئی کہ آخرت میں اللہ نے امت محمدی سے خطا و نسیان کا حکم اٹھا لیا ہے یعنی خطا و نسیان پر اس کی گرفت نہ ہوگی ـــــ آیت قرآنی اور حدیث نبوی دونوں کا اقتضا ہے کہ مسکوت عنہ پر ان کے الفاظ کی دلالت تسلیم کی جائے اسی کو اقتضاء النص کی دلالت کہتے ہیں۔ اب اگر کوئی شخص دعویٰ کرے کہ غلام آزاد کرنے کے لیے یہ منصوص نہیں ہے کہ وہ آزاد کرنے والے کا مملوک ہو یا یہ کہے کہ آخرت میں خطا و نسیان پر عدم مؤاخذہ

صوص نہیں ہے تو اس کا یہ دعویٰ اور یہ قول غلط ہو گا۔ معلوم ہوا کہ ان چار دلالتوں میں سے کسی ایک دلالت سے بھی اگر کوئی حکم قرآن یا
یث سے نہیں نکلتا تو اسے غیر منصوص کہا جائے گا اور اگر کسی ایک دلالت سے بھی کوئی حکم نکل رہا ہے تو وہ منصوص
وگا۔ یہ تمام تفصیلات اس لیے پیش کی گئی ہیں کہ کتاب وسنت کے منصوصات کو عبارۃ النص میں محدود کرنا صحیح نہیں
ہے۔ ہمیں تمام استدلالات پر نظر رکھنی چاہیے۔

اب تیسرے نکتے پر غور کیجیے۔ اوپر جو کچھ پیش کیا گیا ہے وہ اسی نکتے پر غور کرنے کی تمہید تھی۔ سوال یہ ہے کہ
رک اور مظاہر شرک کا شمار کن مسائل میں ہے؟

اوپر کی تفصیلات کو جس شخص نے بھی غور سے پڑھا ہو گا اس کے لیے اس سوال کا جواب مشکل نہیں ہے۔ توحید کا اثبات
ر شرک کی نفی، دین اسلام کے تمام قطعیات و واضحات میں سب سے زیادہ قطعی اور سب سے زیادہ واضح ہے اور
کتاب وسنت کے سیکڑوں نصوص میں یہ نفی واثبات ملتا ہے اس لیے ان دونوں سے زیادہ کوئی دوسری چیز منصوص
ی نہیں ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ "وہ چیز شرک تو ہے لیکن منصوص نہیں" ایک ایسی بات ہے جس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا
ہے کہ کہنے والے نے عالم استغراق میں کہہ دیا ہو گا۔ اسی طرح دوسرے کہنے والے کا یہ کہنا "تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اجتہادی
شرک ہے" اس اصطلاح سے ناواقفیت کا ثبوت ہے۔ پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اجتہاد کا تعلق ظنیات سے ہے قطعیات
سے نہیں، جو حکم شرعی مسلمات میں داخل ہو وہاں اجتہاد کی گنجائش نہیں ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ اصلاً شرک کا تعلق
نسان کے عقیدہ وخیال سے ہوتا ہے، اس کا حقیقی محل قلب و ذہن ہے۔ خارج میں شرک کے صرف مظاہر پائے جاتے
یں کیونکہ مختصر طور پر شرک کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی ذات، اس کی خصوصی صفات اور مخصوص حقوق میں کسی شے کو
س کا شریک مان لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ کسی کو اللہ کی ذات یا خصوصی صفات یا مخصوص حقوق
یں شریک مانتا ہو تو وہ مشرک ہو گا چاہے اپنی زندگی میں کبھی اس نے اس کے سامنے سجدہ نہ کیا ہو اور مراسم عبودیت
یں سے کوئی رسم ادا نہ کی ہو، وہ شخص یا گروہ مشرکوں کا امام تسلیم کیا جائے گا جو اپنے آپ کو مستحق عبادت سمجھے،
خود کسی کی عبادت نہ کرے اور دوسروں سے اپنی عبادت کرالے، خود کسی کے سامنے نہ جھکے اور دوسروں کو اپنے
سامنے جھکائے۔ اس سے بھی آگے کی صورت یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنالے، اپنے سوا کسی کو
مستحق اطاعت نہ سمجھے اور نفس امارہ کے احکام پر بے چون وچرا عمل کرتا رہے تو وہ مشرک ہو گا، حالانکہ اپنے سامنے
نہ کوئی رکوع کرتا ہے اور نہ سجدہ۔

(باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیے)

مسلمان اور اسلامی نظام اجتماعی

(جناب مولانا صدر الدین اصلاحی)

جتماعی زندگی کے خوفناک نتیجے

اجتماعیت، اسلام کو کچھ ایسی ہی مطلوب ہے جیسا کہ پانی مچھلی کو مطلوب ہوا کرتا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی صاحبِ نظر
قف نہ ہوگا۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہے؟ آخر اسلام نے اجتماعیت کو ایسی غیر معمولی اہمیت کس وجہ سے دے رکھی
وہ اپنے پیرؤوں سے اجتماعی زندگی بسر کرانے پر اس قدر مصر کیوں ہے؟ وہ ایک منضبط سیاسی نظام کے قیام کو ضروری
ں ٹھہراتا ہے؟ وہ اس نظام کے سربراہ کی اطاعت کو اللہ و رسول کی اطاعت، اور اس کی نافرمانی کو اللہ و رسول کی نافرمانی
ں قرار دیتا ہے؟ وہ "الجماعۃ" سے بالشت بھر بھی علیحدگی اختیار کر لینے والے کی گردن سے اپنا حلقہ کیوں نکال لیتا، اور
اتحاد میں شگاف ڈالنے والے پر سے اپنی امان کیوں اٹھا لیتا ہے؟ وہ بیعتِ خلافت سے محروم مرجانے والے کی موت
جاہلیت کی موت' کیوں کہتا ہے؟ ــــــ اس غور و فکر اور اس تحقیق کی ضرورت بالکل کھلی ہوئی ہے۔ اس طرح کے مسائل
ام انسانی ذہن صرف 'کیا ہے' کے جواب پر کبھی مطمئن نہیں ہو جایا کرتا۔ اسے اطمینان اسی وقت ہوا کرتا ہے جب وہ
بسان لے کہ 'ایسا کیوں ہے'؟ اس لیے یہ حقیقت اپنی جگہ واضح اور روشن سہی، مگر ذہنوں میں اپنا صحیح مقام پانے کے لیے
بات کا شدید مطالبہ کرتی ہے کہ اس کے اسباب و مصالح بھی سامنے آجائیں۔

اس سلسلے میں اتنی بات تو بالکل صاف اور قطعی سمجھنی چاہیے کہ اجتماعیت، اسلام کی غرض و غایت پوری کرنے میں کوئی بڑا ہی خاص حصہ لیتی اور
و ایمان کے مفادات کی کوئی اہم ترین خدمت انجام دیتی ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اسے اتنی غیر معمولی اہمیت ہرگز
یا۔ اس لیے سوچنا اور معلوم کرنے کی بات دراصل صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کی غرض و غایت پوری کرنے میں کس
ح حصہ لیتی ہے، اور دین و ایمان کے مفادات کی کیا خدمت انجام دیتی ہے؟ اس تحقیق کے لیے جب ہم اسلامی ماخذ
ف رجوع کرتے ہیں، جیسا کہ لازماً کرنا ہی چاہیے تو ہمیں اس سوال کا یہ جواب ملتا ہے:۔

عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ ... جماعت سے چمٹے رہو، کیونکہ بھیڑیا اسی بکری کو

الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَۃَ (ابوداؤد)

کھا پاتا ہے جو دور نکل جاتی ہے۔

اَلشَّیْطَانُ ذِئْبُ الْاِنْسَانِ کَذِئْبِ الْغَنَمِ یَاْخُذُ الشَّاذَّۃَ وَالْقَاصِیَۃَ وَالنَّاحِیَۃَ (مسند احمد بحوالہ مشکوۃ)

شیطان انسان کا بھیڑیا ہے، جس طرح کہ بکریوں کے لیے (یہ معروف) بھیڑیا ہوا کرتا ہے۔ یہ بھیڑیا انہی بکریوں کو پکڑتا ہے جو الگ جا بھاگتی، یا دور نکل جاتی، یا کسی طرف علیحدہ ہو رہتی ہیں۔

عَلَیْکُمْ بِالْجَمَاعَۃِ وَاِیَّاکُمْ وَالْفُرْقَۃَ فَاِنَّ الشَّیْطَانَ مَعَ الْوَاحِدِ وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ (ترمذی، جلد دوم کتاب الفتن)

"الجماعۃ" کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو، اور پھوٹ کے قریب بھی نہ پھٹکو۔ کیونکہ شیطان اکیلے شخص کے ساتھ ہوتا ہے، جب کہ دو سے بہت دور ہوتا ہے۔

یعنی اجتماعی شیرازے سے اپنے کو وابستہ رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ ایمانی زندگی کی ٹھیک ٹھیک حفاظت اسی طرح ہو سکتی ہے۔ اگر یہ اجتماعیت موجود نہ ہو تو مسلمان کے دین و ایمان کی خیر نہیں رہ جاتی۔ کیونکہ اس شکل میں وہ گویا شیطان کی کمین گاہ میں ہوتا ہے، جہاں وہ اسے بڑی آسانی سے مار لے سکتا ہے۔ جب کہ ملّی اجتماعیت ایسی آہنی پناہ گاہ ہے جس کے اندر گھس آنا اور گھس کر کسی صاحبِ ایمان کو شکار کر لینا اس کے لیے آسان نہیں رہا کرتا۔

یہ جواب جو ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے ہمیں ملتا ہے، اگرچہ مجمل ہے، مگر سوالِ زیرِ بحث کے حل کے لیے بالکل کافی ہے۔ کیونکہ اس کا یہ اجمال ایسا نہیں ہے جس کی تفصیل خود ایک مسئلہ بن جاتی ہو، بلکہ ایسا اجمال ہے جس کی وضاحت کے لیے دین کا پورا فلسفہ، شریعت کا پورا نظام اور ملت کی پوری تاریخ موجود ہے۔ اس فلسفے، اس نظام اور اس تاریخ کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہو گا کہ اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کا نہ ہونا مسلمان کے دین و ایمان کو ایک دو نہیں، تین تین جہتوں سے شدید ترین خطرات میں ڈال دیتا ہے:-

۱۔ ماحول کی باطل نوازی

سب سے پہلی بات تو یہ کہ اسلامی اجتماعیت سے محروم ماحول غلط افکار، اعمال اور اقدار کے لیے نسبتہً زیادہ سازگار، اور صالح افکار، اعمال اور اقدار کے حق میں بہت کچھ ناسازگار ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ممکن حدود کے اندر بھی تقویٰ اور دینداری کی راہ چلنا آسان نہیں رہ جاتا۔ یہ ایک بہت ہی واضح حقیقت ہے، جس کے سلسلے میں نہ کسی شرح کی ضرورت ہے نہ کسی دلیل کی۔ معمولی غور و فکر سے بھی یہ بات سمجھ لی جا سکتی ہے کہ جہاں اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت موجود نہ ہو گی وہاں اسلام کے مطلوبہ افکار و اعمال اور اخلاق و اقدار کے لیے فضا سازگار نہ رہ جائے گی۔ اسلامی اجتماعیت کا مطلب آخر ہے کیا؟ یہی تو نہ کہ ایک ایسا متحد و منظم معاشرہ

قائم ہو جس کی شیرازہ بندی اللہ کی رسی سے ہوئی ہو جس کی سب سے نمایاں خصوصیت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو جس کا فرد فرد خود ہی بھلا بننے کو کافی نہ سمجھتا ہو بلکہ دوسروں کو بھی بھلا بنانے کی کوشش کرتے رہنا اپنا دینی فریضہ سمجھتا ہو، جس کی عام فضا گمراہیوں اور برائیوں کے محرکات سے پاک ہو، جس میں خدا ترسی ہی عزت کا معیار ہو اور نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنا اور ایک دوسرے کی مدد کرنا ہی جس کا خاص امتیاز ہو۔ واضح بات ہے کہ ایسے معاشرے میں ایک صاحب احساس مسلمان کے لیے نیک بننا آسان اور برا بننا مشکل ہوگا۔ کہنا چاہیے کہ اس کے لیے مسلمان بن کر رہنا ہموار زمین پر چلنے کے ہم معنی ہوگا حتیٰ کہ جس کسی کی ایمانی اور اخلاقی حس تیسرے درجے کی ہوگی، وہ بھی برائیوں سے فی الجملہ محفوظ ہی رہے گا۔ کیونکہ یہ ماحول اسے برابر نیکیوں کی طرف مائل کرتا اور برائیوں سے نفرت دلاتا رہے گا۔ جس کا نتیجہ فطری طور پر یہی ہوگا کہ اس کے فکر و عمل پر خدا ترسی اور خیر پسندی کا ذوق غالب رہے گا ــــ اس کے بالمقابل اسلامی اجتماعیت کی ناموجودگی کا مطلب ہے ایک ایسا ماحول جہاں مسلمان تو ہوں گر ان کا کوئی معاشرہ نہ ہو، اور اگر معاشرہ ہو بھی تو ایسا ہو جس کا نہ کوئی شیرازہ ہو نہ کوئی اجتماعی نظم ہو، اور اگر شیرازہ اور اجتماعی نظم بھی ہو تو وہ قرآنی اور اسلامی نہ ہو۔ کوئی شک نہیں کہ یہ ماحول صحیح معنوں میں معروف پسند اور منکر بیزار ہرگز نہ ہوگا، یہاں اسلامی قدروں کی بالادستی قائم نہ ہوگی، یہاں ہر طرف باطل پسندی کے محرکات پھیلے ہوں گے۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر ایک عام مسلمان کے لیے نیک بننا بہت مشکل اور برا بننا بہت آسان ہوگا، یہاں اس کے لیے مسلمان بنکر رہنا کسی ہموار زمین پر چلنا نہیں بلکہ گویا کھڑی پہاڑی پر چڑھنا ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہی نکل سکتا ہے کہ مسلمان بحیثیت مجموعی خدا ترسی اور خیر پسندی کے ذوق سے دور ہوتے رہیں گے۔

۲۔ اتباعِ دین کا لازمی نقص

دوسری بات یہ کہ ایسے ماحول اور معاشرے میں مسلمان عملی طور پر ایک خاص حد تک تو اسلام سے لازماً بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ حقیقت بھی کسی ایسے شخص کی نگاہوں سے چھپی نہیں رہ سکتی جو یہ جانتا ہو کہ اسلام کیا ہے، اور مسلمان اس زمین پر کس لیے بھیجا گیا ہے؟ دین کے پورے نظام پر ایک نظر دوڑا جائیے صاف دکھائی دے گا کہ اسلامی اجتماعیت کے موجود نہ ہونے کی شکل میں مسلمان عملاً ذیل کے متعدد پہلوؤں سے اسلام سے بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے:۔

(ا) سب سے اہم چیز تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق پوری طرح ادا نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ اس کی بندگی کے کتنے ہی اہم ترین مطالبات کو پورا کرنے کی پوزیشن ہی میں نہیں ہوتا۔ اس کے دین کی شہادت اور اقامت سے زیادہ بڑا اور اہم فریضہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ تو وہ فریضہ ہے جو مسلمان کے وجود کی کل غایت ہے۔ اسی طرح جہاد فی سبیل اللہ سے زیادہ محبوب عمل اللہ کی نگاہ میں اور کیا ہوگا، جسے حدیث میں صراحۃً "سب سے افضل عمل" فرمایا گیا ہے اور جس کا اشتیاق

سے خالی رہنے والے سینے کو نفاق کا مریض قرار دیا گیا ہے۔ اجتماعی زندگی سے محروم رہ کر کیا ان فرائض سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی شکل بھی ممکن ہے؟ ظاہر ہے کہ نہیں، اور بالکل نہیں۔ اچھا ان امور کو بھی چھوڑ دیجئے، اور اُن احکام دین کو لیجیے جن کے "عبادت" اور "حقوق اللہ" ہونے میں الفاظ کی حد تک بھی دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ یہ نماز، یہ زکوٰۃ اور یہ حج بھی اجتماعیت کے بغیر اس معیاری شکل میں ادا نہیں ہو سکتے جس شکل میں اللہ و رسول ان کو ادا ہوتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان ساری حقیقتوں کے ہوتے ہوئے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت تو موجود نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کے حقوق تلف ہونے سے بچ جائیں؟

(ب) یہی حشر بندوں کے حقوق کا بھی ہوتا ہے۔ کسی دکھیارے کی مدد، کسی بے کس کی خبر گیری، کسی مظلوم کی فریاد رسی، کسی مریض کی عیادت، کسی جنازے کی شرکت، غرض عام طور سے ایک مسلمان پر دوسرے بندگان خدا کے جو حقوق ہوتے ہیں، اجتماعی زندگی کے بغیر ان کے ادا ہو سکنے کے پورے مواقع کسی طرح باقی نہ رہ جائیں گے، اور اس کی زندگی اس اجتماعیت سے جتنی ہی زیادہ دور ہوگی اتنے ہی یہ مواقع بھی کم ہو رہیں گے۔ یہاں تک کہ اگر یہ دوری کامل علیحدگی اور تنہائی کی حد کو پہنچی ہوئی ہو تو یہ مواقع سرے سے ناپید ہو جائیں گے۔

(ج) اخلاقیات کا حال بھی کچھ مختلف نہیں رہتا۔ دین میں اچھے اخلاق کی جو اہمیت ہے وہ کچھ ڈھکی چھپی نہیں۔ ایک طرح سے گویا وہی حاصل دین ہیں۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا ہے کہ "مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے تاکہ میں محاسن اخلاق کی تکمیل کر دوں"۔ (بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ، موطا) لیکن اتنی اہم چیز بھی غیر اجتماعی زندگی میں اپنے ظہور کے لیے ترستی رہ جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جہاں یہ غیر اجتماعی زندگی اپنی آخری شکل یعنی تنہائی کا رنگ اختیار کر لیتی ہے وہاں راست بازی، امانت داری، پاک دامنی، حیا، وفائے عہد، رحم، شفقت، خیر خواہی، ایثار، صبر، تحمل، سنجیدگی، نرم خوئی، خوش گفتاری اور فراخ دلی جیسے بے شمار انسانی فضائل، اسلامی اخلاق اور ایمانی اوصاف عملاً مجرد تصورات بن کر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ ان چیزوں کا تعلق تمام تر انسانوں کے باہمی روابط اور معاملات سے ہوتا ہے۔ معروف معنوں میں "اخلاق" کہتے ہی اس رویّے کو ہیں جو ایک انسان دوسرے انسان کے، یا ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی ایسے مقام پر جا رہتا ہو جہاں اس کا کسی اور شخص سے سابقہ ہی نہ پیش آتا ہو تو وہاں وہ آخر کس طرح ان دینی ہدایات پر عمل کر سکے گا؟ اسی طرح جہاں کوئی منظم معاشرہ اور اس کا کل اجتماعی نظم ہی موجود نہ ہو وہاں کون سی چیز ہوگی جو مسلمان اسلام کی اجتماعی یا بین الاقوامی اخلاقیات کا مظاہرہ کرا سکے گی؟

(د) جہاں تک مسلمان کی عام تمدنی اور سماجی زندگی کا تعلق ہے، اس پر تو اس صورت حال کا بڑا ہی گہرا اور غیر

مخالفانہ اثر پڑتا ہے، کیونکہ ایسی حالت میں اس زندگی کے مختلف شعبوں سے اسلام تو رخصت ہو ہی رہتا ہے، ساتھ کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ وہاں اسلام کی جگہ کفر آموجود ہوتا ہے۔ یہ ایک جانی بوجھی بلکہ آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ ظاہر بات ہے کہ مسلمان اگر کسی غار میں جا کر گوشہ نشین نہیں ہوگیا ہے، بلکہ انہی بستیوں اور آبادیوں میں رہتا سہتا ہے، تو اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت کے موجود نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لازماً ایک غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزار رہا ہے، اور کسی غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمان کی زندگی، کم از کم بڑے اجتماعی معاملات میں تو یقیناً غیر اسلامی خطوط ہی پر بسر ہو رہی ہے بلکہ یہ کہنا بھی خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ اس کے 'شخصی قوانین' (پرسنل لاز) کی حرمت بھی اس طرح برقرار رہ جانے والی نہیں۔

اتنے سارے پہلوؤں سے، اور اس حد تک، اسلام سے عملی بے تعلقی کوئی معمولی بات نہیں ہو سکتی، نہ اس صورت حال کی تعبیر کے لیے "ایک خاص حد تک اسلام سے بے تعلقی" اور "اتباعِ دین کے بھاری نقص" کے لفظوں کو آپ سخت الفاظ کہہ سکتے ہیں۔ شارع علیہ السلام نے عورتوں کو "نَاقِصَاتُ دِیْنٍ" (ناقص اور ادھورے دین والیاں) فرمایا ہے، اور وجہ اس کی یہ فرمائی ہے کہ "جب اسے حیض آتا ہے تو نہ نماز پڑھ سکتی ہے نہ روزے رکھ سکتی ہے۔" (اِذَا حَاضَتْ لَمْ تُصَلِّ وَلَمْ تَصُمْ..... فَذٰلِكَ نُقْصَانُ دِیْنِهَا۔ بخاری، کتاب الحیض) غور کیجیے، اگر ہر ماہ چند روز کی یہ حالت، کہ عورت نماز نہیں پڑھ سکتی اور روزے نہیں رکھ سکتی، اس کے 'دین کے ناقص' ہونے کی دلیل ہے تو پوری پوری زندگیوں کی یہ حالت، کہ مسلمان اسلام کے اتنے اہم اور گوناگوں قسم کے احکام پر بالکل عمل نہیں کر سکتے، ان کے دین کا کیا درجہ ٹھیرائے گی؟ خصوصاً اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ عورت کی مذکورہ حالت اس کی ایک طبعی، پیدائشی اور بالکلیہ جبری حالت ہے، جسے پیش نہ آنے دینا، یا پیش آجانے کے بعد اپنی کوششوں سے ختم کر دینا اس کے اختیار سے قطعی باہر ہے، اور اسی وجہ سے اس کے سلسلے میں اس پر کسی طرح کی کوئی ذمہ داری آتی ہی نہیں ۔۔۔۔ جب کہ اجتماعی زندگی سے الگ یا محروم رہنے والے مسلمانوں کی یہ حالت طبعی اور پیدائشی تو کیا ہوگی، اس طرح کی جبری بھی ہرگز نہیں ہوتی۔ بلکہ بسا اوقات تو اس کے پیدا کرنے یا باقی رکھنے کے وہ خود ہی ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ایسی شکل میں کیا یہ ممکن ہے کہ اس حالت کی موجودگی میں ان کے دین کو 'ناقص' نہ کہا جائے؟ اور کیا یہ کوئی غلط بات ہوگی کہ انھیں ان احکامِ دین کی حد تک، جن پر وہ غیر اجتماعی اور غیر منظم زندگی بسر کرنے کے باعث عمل نہیں کر سکتے، 'دین سے بے تعلق' قرار دیا جائے؟ انصاف تو فیصلہ دینے پر مصر ہے کہ ان کے دین کو 'ناقص' ہی نہیں بلکہ 'ناقص تر' قرار دیا جائے، اور انھیں "ایک خاص حد تک دین سے بے تعلق" ہی نہیں بلکہ اکثر حالات میں قابلِ مؤاخذہ بھی سمجھا جائے۔

۳- دینی حس کا پیہم زوال

غیر اجتماعی زندگی میں تیسری آفت یہ آتی ہے کہ دینی حس اور ایمانی حمیت پر باطل مسلسل چوٹیں لگاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسے بے جان کر کے رکھ دیتا ہے۔ باطل کو یہ بھرپور موقع اس اقتدار کی بدولت مل جاتا ہے جو اسے اسلامی اجتماعیت سے محروم مسلمانوں پر حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ابھی عرض کیا جا چکا اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت اور اجتماعی نظم کے موجود نہ ہونے کے لازمی معنی بالعموم یہی ہوتے ہیں کہ مسلمان کی زندگی ایک غیر اسلامی نظام کے تحت بسر ہو رہی ہے، یعنی ایک ایسے نظام کے تحت جس میں زندگی کا عام اجتماعی کاروبار کافرانہ بنیادوں پر چلتا ہو، جس میں اقتدار اعلیٰ کا مالک اور اصل قانون ساز اللہ تعالیٰ کے بجائے کوئی اور ہو، جس میں انسانی خلافت کا تصور بنیادی طور پر ایک غیر آئینی تصور ہو، جس میں اخلاق کی اجتماعی قدریں کتاب الٰہی اور سنت رسول سے نہیں بلکہ کسی اور ہی سرچشمے سے اخذ کی گئی ہوں، جس میں وسیع تر اجتماعی معاملات کے اندر اسلام کو مسلمانوں کی رہنمائی کرنے کا کوئی حق نہ ہو، جس میں "معروفات اور منکرات" کے تعین میں شریعت کا فیصلہ کوئی آخری فیصلہ نہ ہو، اور اسلام کے کتنے ہی معروف منکر اور منکر معروف بنا دیئے گئے ہوں، جس میں انسانی اور بین الاقوامی تعلقات کی بنیادیں عدل و انصاف اور تعاون علی البر کے اسلامی اصولوں کے بجائے کسی قوم، کسی نسل، کسی وطن، کسی طبقے، یا کسی "ازم" کے مادی مفادات پر اٹھائی گئی ہوں، جس میں عدالتیں شرعی قوانین ہی کے مطابق فیصلے کرنے کی مطلق پابند نہ ہوں، حتیٰ کہ جس میں مسلمان اپنے انفرادی معاملات میں بھی اسلامی احکام و ضوابط پر عمل کرنے میں پوری طرح آزاد نہ ہوں ——— اندازہ لگائیے کہ ایسے نظام اور ماحول میں ایک مسلمان کی نفسیات کا حال کیا ہوگا؟ ابتداء میں کیا رہے گا، اور آگے چل کر کیا ہو جائے گا؟ کوئی شک نہیں کہ اس صورت حال کو دیکھتے ہی اس کی ایمانی خودی تڑپ اٹھے گی، اس کا دم گھٹنے لگے گا وہ اپنے کو غلاظت کے گڑھے میں دھنسا ہوا پائے گا، مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بڑے سے بڑا نفاست پسند بھی اگر کسی گندی اور بدبودار کوٹھری میں بند ہو کر رہ جائے تو بس ایک محدود مدت ہی تک اس پر ناگواری، بے چینی اور کرب کی کیفیت طاری رہے گی، پھر وقت جوں جوں گزرتا جائے گا اس کی یہ ناگواری اور بے چینی بھی ہلکی پڑتی جائے گی، یہاں تک کہ ایک وقت آئے گا جب اس کی قوت شامہ وہاں کی عفونت سے مانوس ہو رہے گی اور اب وہ صرف نظریے کی حد تک اس گندگی اور عفونت کو گھن کھانے کی چیز کہے گا، عملی طور پر اس سے کوئی گھن نہ کھائے گا۔ انسانی نفسیات کا جس شخص نے بھی تھوڑا بہت مطالعہ کیا ہوگا وہ بالیقین اسی نتیجے پر پہنچا ہوگا۔ کہنا چاہیے کہ یہ بات علم النفس کے مسلمات میں سے ہے۔ ظاہر ہے کہ دین کے معاملے میں یہ نفسیاتی اصول بدل نہ جائے گا۔ آپ چاہیں تو لاکھوں کے گروہ میں سے کچھ افراد کو مستثنیٰ کر دیں، لیکن تجربے اور مشاہدے کی گواہی بتاتی ہے کہ ننانوے فی صد سے بھی بڑی اکثریت پر قطعاً اسی اصول کا اطلاق ہوگا، یعنی ہوگا یہ کہ جس وقت ملت اپنی اجتماعیت کھو کر باس کے بند دریچے

کر کے کسی غیر اسلامی نظام کو اپنے اوپر مسلط کرلے گی اس وقت تو اہلِ ایمان کو ایسا معلوم ہوگا جیسے بستر انگاروں کا الاؤ بن گئے ہیں۔ جیسے ان کے آگے، پیچھے، دائیں، بائیں ہر طرف آبلے ڈال دینے والی گیس کے بم پر بم پھٹ رہے ہیں۔ اس صورتِ حال سے گھبرا کر وہ دور نکل بھاگنے کے لیے چاروں طرف اپنی پریشان نگاہیں دوڑائیں گے، جوشِ اضطراب میں ہاتھ پاؤں بھی ہلائیں گے۔ مگر ظاہر ہے کہ جو نظام اور جو اقتدار زندگی کے اجتماعی دروبست پر قابض ہوچکا ہوگا، وہ اس ذہنی بغاوت سے متاثر ہو کر اپنا قبضہ اٹھا لینے سے رہا۔ وہ تو پوری مضبوطی اور عزم کے ساتھ بدستور اپنا سکہ چلاتا رہے گا اور ملت کے مسلمان ہونے کے باوجود اس پر ان اقدار، ان مصالح، ان افکار، ان نظریات اور ان احکام و قوانین کے تحت حکومت کرتا رہے گا جن کا کہ اس کی نامسلمان فطرت اور اس کی سیاسی مصلحت تقاضا کرے گی۔ آخر کار آنکھیں آہستہ آہستہ اس صورتِ حال کی عادی ہونے لگیں گی، جذبات کی بے قراری اور ذہنی بغاوت پر تھکاوٹ اور پھر افسردگی طاری ہونے لگے گی، اضطراب، احساسِ غم کی سطح پر آجائے گا، اور بغاوت کی آگ حسرت کی راکھ میں تبدیل ہوجائے گی۔ پھر یہ دور بھی ختم ہوگا، اور اب دینی حمیت سے دل خالی ہونے شروع ہوں گے۔ غیر اسلام سے طبیعتیں مانوس ہونے لگیں گی۔ ذہنی اور جذباتی لڑائی صلح اور رواداری سے بدلنے لگے گی، اور غیر اسلام سے مسلمان کی کوئی عملی مخالفت باقی نہ رہ جائے گی۔ ہوتے ہوتے چوتھا اور آخری دور آجائے گا، جب وہ غیر اسلام 'خوب' بن جائے گا جو کبھی انتہائی ناخوب تھا۔ مسلمان اس نظام اور اقتدار کو، جو اس کے دین کو دیس نکالا دے چکا ہے یا کم سے کم یہ کہ جس نے اسے خانہ قید کر رکھا ہے، سلامیاں دے گا۔ اس کی بارگاہ میں عزت کا طالب ہوگا۔ اس کی چاکری میں فخر محسوس کرے گا۔ اس کی خیمہ برداری کا 'حق' حاصل کرنے کے لیے دوڑ پڑے گا۔ وہ 'مسلمان' ہوگا، مگر غیر اسلامی نظام کے خلاف زبان سے کوئی اظہارِ ناگواری نہ کرے گا۔ انسان اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے، اس کے احکام و مرضیات کے تحت ہی اس دنیا کا نظم چلانے کا ذمہ دار ہے، وہی اس کا مقتدرِ اعلیٰ اور اصل قانون ساز ہے، اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے، دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح اسی نظام کی پیروی پر موقوف ہے ـــــ یہ اور اسی طرح کے دوسرے بہت سے اونچے حقائق 'مذہبی' اجتماعات میں زیبِ داستان کے طور پر بیان ہوتے رہیں گے، مگر دنیا کے وسیع عملی میدان میں ملت اپنی زندگی کی گاڑی اس 'ازم' کی پٹری پر رواں دواں چلاتی رہے گی جسے ملک کے غیر اسلامی نظام اور کافر اقتدار نے اپنا 'دین' بنا رکھا ہوگا۔ ملت کی موجودہ حالت اسی حقیقت کا زندہ ثبوت بنی ہوئی ہمارے سامنے موجود ہی ہے، جس کے ہوتے ہوئے کسی نظری اور منطقی دلیل کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ واقعات کی اس واضح ترین گواہی کو ہوش کے کانوں سے سنیے اور

تے لگاتے اس پر کبھی سکتے کی، بلکہ موت تک کی حالت طاری کر دیا کرتا ہے۔

اسلامی اجتماعیت سے محروم زندگی جس مسلمان کے دین و ایمان پر ایسے سخت حملے کرتی اور انھیں ایسے عظیم خطرات میں ڈال دیتی ہے۔ سوچیے بھلا وہ کب تک اور کس حد تک سچا مسلمان باقی رہ سکتا ہے؟ اس لیے ماننا پڑے گا کہ شیطان کی ہزار کوششوں پر اس کی یہ ایک کوشش بھاری ہے کہ مسلمان کو اجتماعی زندگی سے محروم کر دے۔ ایک ایک مسلمان کو گروہ الگ الگ شکار کرنا چاہے گا تو اسے اتنے ہی گڑھے کھودنے پڑیں گے جتنے کہ مسلمان ہوں گے لیکن اگر وہ انتشار اور غیر جماعتی زندگی کا گڑھا کھود لیتا ہے تو یہ اکیلا ایک ہی گڑھا ان کی بھاری اکثریت کے لیے کافی ہو جائے گا۔ اس لیے اگر 'جماعت' سے الگ یا محروم رہنے والوں کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے 'شیطان کا بے بس اور آسان شکار' فرمایا ہے تو یہ ایک ایسی تعبیر ہے جس سے بہتر تعبیر اس صورتِ حال کی اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔

اجتماعی زندگی کے بیش بہا ثمرات

غیر اجتماعی زندگی تو دین و ایمان کے لیے ایسے شدید خطرات پیدا کر دیتی اور مسلمان کو شیطان کا صیدِ زبوں بنا دیتی ہے، مگر اجتماعی زندگی ان کے لیے کیا ثابت ہوتی ہے، یہ جاننے کے لیے ہادیِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنیے:۔

يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ (ترمذی، جلد دوم) اللہ کا ہاتھ 'جماعت' پر ہوتا ہے۔

یعنی اجتماعی زندگی ہی وہ زندگی ہے جس میں مسلمان اللہ کی نوازشوں اور نصرتوں کے فی الواقع سزاوار بنتے ہیں۔

اگر یہاں بھی، یہ سوال کیا جائے کہ ایسا کیوں ہے؟ تو اب یہ ایک غیر ضروری سوال ہو گا۔ کیونکہ غیر اجتماعی زندگی کے عملی نتائج اگر وہ سب کچھ ہیں، جن کا حال ہم ابھی جان چکے ہیں، تو اس کا مطلب واضح طور پر یہی ہے کہ اجتماعی زندگی کے ثمرات ٹھیک انھی کی ضد ہوں گے۔ اسلام کی مطلوبہ اجتماعیت سے جو معاشرہ بے بہرہ ہوتا ہے وہ اگر غلط افکار و اعمال کو پروان چڑھاتا اور صالح افکار و اعمال پر خزاں کی کیفیت طاری کر دیا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں مسلمان کے لیے بر و تقویٰ کی راہ دشوار سے دشوار تر ہوتی جاتی ہے، تو وہ معاشرہ، جو اس اجتماعیت سے بہرہ ور ہو گا، قطعاً ایک مختلف صورتِ حال کو وجود میں لائے گا، صالح افکار و اعمال کو پروان چڑھائے گا، باطل افکار و اعمال کو پنپنے سے روکے گا، نیک روی کی ترغیبیں دیتا رہے گا، جس کے نتیجے میں لوگوں کے قدم آپ سے آپ نیکی اور خدا ترسی کی طرف اٹھتے رہیں گے۔ اسی طرح اگر اس معاشرے میں مسلمان اپنے دین کی ناقص پیروی ہی کے لیے مجبور رہتا ہے تو اس میں اسے ایسی کسی کوفت بھری مجبوری سے کوئی سابقہ پیش نہ آئے گا۔ علیٰ ہذا القیاس اگر اس کے اندر دینی حس اور ایمانی حمیت پر مسلسل ہتھوڑے چل رہے ہوتے ہیں تو اس کے اندر دینی ایمان کو ایسی کسی جان لیوا آفت کا سامنا بالکل نہ کرنا پڑے گا۔

مختصر یہ کہ اجتماعی زندگی وہ زندگی ہوتی ہے جس کے اندر مسلمان اپنے مولیٰ کی طاعت و بندگی کا ٹھیک ٹھیک حق ادا کر سکتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے چاہتا بھی صرف یہی ہے کہ اس کی طاعت و بندگی کا حق ادا کیا جائے۔ یہی اس کا مطالبہ ہے، اور اسی میں اس کی رضا ہے۔ اس طرح حقیقت واقعی یہ قرار پائی کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا پورا ہونا صحیح جماعتی زندگی پر موقوف ہے۔ پھر یہ جماعتی زندگی، اور صرف یہ جماعتی زندگی ہی، اسے محبوب کیوں نہ ہوگی؟ اور جو زندگی اسے محبوب ہوگی، بدیہی بات ہے کہ اس کی رحمتوں، نوازشوں اور نصرتوں کا رخ بھی اسی کی طرف ہوگا۔ معلوم ہوا کہ صحیح اجتماعی زندگی ہی میں دین و ایمان کو پوری پوری نشوونما ملتی، اور مسلمانوں کی دنیوی و اخروی فلاح محفوظ رہتی ہے۔ سوچیے، کتنے بیش قیمت ہیں اجتماعی زندگی کے یہ ثمرات! اور کتنی ضروری ہے اسلام اور اہل اسلام کے لیے یہ اجتماعی زندگی!!

گوشہ نشین بزرگوں کا مسئلہ

اس موقع پر واقعات کی بعض شہادتیں ذہن میں ایک الجھن پیدا کر سکتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ اسے بھی دور کر لیا جائے۔

'الجھن' یہ ہو سکتی ہے کہ کتنے ہی بزرگانِ دین ہیں، جن کی زندگیاں اس بات کی تائید نہیں کرتیں۔ اس کے بخلاف وہ اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ جماعتی زندگی سے بالکل کٹ کر بھی بندگی اور خدا پرستی کا اونچے سے اونچا مقام حاصل کیا جا سکتا ہے کیونکہ ان بزرگوں نے ایسی ہی زندگی گزار دی، لیکن اس کے باوجود شیطان ان کی طرف رخ کرنے کی بھی جرأت نہ کر سکا، چہ جائیکہ انھیں شکار کر لیتا۔

اس الجھن کا جواب یہ ہے کہ دنیا میں شاید ہی کوئی کلیہ ایسا ہوگا جس میں استثناء نہ ہو۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں بات کا یہ نتیجہ نکلا کرتا ہے، تو اس کا مطلب عموماً یہ نہیں ہوا کرتا کہ کبھی اس کے سوا کوئی نتیجہ نکل ہی نہیں سکتا، بلکہ ایسا صرف غالب صورت حال کے پیش نظر کہا جاتا ہے، اور کہنے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ عام طور سے ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ جہاں واقعات اس امر کی شہادت دینے کو تیار ہیں کہ بعض افراد جماعتی زندگی چھوڑ کر بھی بڑے خدا ترس اور عابد و زاہد گذرے ہیں، وہاں وہ اس حقیقت کی بھی منادی کرتے ہیں کہ ان 'بعض' افراد کے مقابلے میں 'لاکھوں' افراد ایسے ہوئے ہیں جو اس جماعتی زندگی سے محروم ہو کر اپنے دین کو ضروری حد میں بھی محفوظ نہ رکھ سکے، اور خدا کے مقابلے میں شیطان سے زیادہ قریب ہو رہے۔ اب مجموعی حیثیت سے دیکھیے کہ نفع اور نقصان کا میزانیہ کیا رہا؟ اور جماعتی زندگی کا وجود اور عدم وجود، دونوں مسئلہ کے حق میں اپنی اپنی جگہ کیا ثابت ہوئے؟

جہاں تک دین کے احکام اور ہدایات کا تعلق ہے وہ عام انسانیت، عام حالات، اور عام حقائق کو پیش نظر رکھ کر دیے گئے ہیں، نہ کہ مخصوص حالات اور مستثنیٰ افراد کو سامنے رکھ کر۔ اس لیے اجتماعی زندگی بسر کرنے کا جو حکم اس نے دیا ہے،

عام انسانوں کے پیش نظر ہی دیا ہے، اور اس سلسلے میں اس نے جو کچھ فرمایا ہے وہ عام صورت حال کو سامنے رکھ کر ہی فرمایا ہے۔ اور ظاہر بات ہے کہ جب اس نے ایک بات فرمادی ہے تو اب وہ عوام اور خواص سبھی کے لیے واجب التعلیم ہو چکی ہے، کیونکہ شریعت کے احکام بلا تفریق سبھی کے لیے ہوتے ہیں، اور کوئی فرد بھی، چاہے وہ کیسے ہی مخصوص رجحانات یا قوتوں کا مالک کیوں نہ ہو، ان کی پیروی کی ذمہ داریوں سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

پھر یہ اعتراض یا شبہہ اصلاً بھی غلط ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جماعتی زندگی سے کٹ کر بھی لوگوں نے خدا پرستی کے اونچے اونچے مقامات حاصل کیے ہیں لیکن یہ بات جماعتی زندگی کی اہمیت اور افادیت کے خلاف کوئی دلیل نہیں بن سکتی۔ کیونکہ اس سے یہ کسی طرح ثابت نہیں ہوتا کہ یہ لوگ خدا پرستی کے جن اونچے مقامات پر پہنچے تھے، اجتماعی زندگی کے اندر رہ کر وہ ان سے بھی اونچے مقامات پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ اس کے بخلاف امر حق یہ ہے کہ اگر صحیح اجتماعی زندگی کی اعانتیں اور برکتیں بھی ان بزرگوں کے شامل حال رہی ہوتیں تو وہ اسلامیت کے اور زیادہ بلند مقاموں پر فائز ہو گئے ہوتے۔ تنہائی کے گوشوں میں وہ زیادہ سے زیادہ فرشتوں کے درجے تک پہنچ سکے ہوں گے لیکن اسلامی اجتماعیت کے ہنگاموں میں رہ کر وہ ابوبکرؓ و عمرؓ ہو گئے ہوتے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی سے دور رہ کر ایک شخص چاہے جو کچھ بھی بن جائے، لیکن معیاری طور پر وہ انسان نہیں بن سکتا جس کے سر پر اللہ تعالیٰ نے اپنی خلافت کا تاج رکھ کر اس دنیا میں بھیجا تھا، اور جسے فرشتوں کا بھی مسجود بنایا تھا۔

اسلام کا مفہوم

اسلام کے معنی میں جس طرح خدا کی کامل اطاعت کا مفہوم شامل ہے اسی طرح امن اور صلح و سلامتی بھی اس کا لازمی جزو ہے۔ وجہ بالکل کھلی ہوئی ہے افراد انسانی کے اندر اغراض اور خواہشوں کا اختلاف بلکہ تصادم ایک مسلّم حقیقت ہے اور اغراض کا یہی تصادم وہ شے ہے جو برابر انسانی معاشرے اور مختلف اقوام کو لڑائی، جھگڑے، فساد اور بدامنی کی آگ میں دھکیلتی رہتی ہے، اس کا صرف ایک ہی کامیاب علاج ہے اور وہ یہ کہ اغراض کا تصادم ہی روک دیا جائے بلکہ اسے تعاون سے بدل دیا جائے۔ اس تریاق کی فراہمی کسی مدبر، کسی سیاستداں، کسی فلسفی، کسی ماہر اجتماعیات، کسی ادارے، کسی جمعیۃ اقوام اور کسی ادارۂ اقوام متحدہ کے بس میں نہیں اس کی صورت صرف ایک ہی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ اپنے آپ کو کسی واقعی نہ کہ فرضی اقتدار اعلیٰ کے احکام و مرضیات کے سپرد کر دیا جائے ظاہر ہے کہ یہ حقیقت پروردگار عالم اور آقائے کائنات کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے؟ اگر ایسا ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا کے سارے انسان اپنی تمام خودغرضیوں اور انفرادی و قومی خواہشوں کو کنارے رکھ دیں اور اپنے آقا کی غیر مشروط غلامی اختیار کر لیں۔

خدا کی صفات

(۲)

(مولانا سید جلال الدین عمری)

پچھلی بحث سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ آئیے یہاں اس سوال پر غور کیا جائے۔

ایک سوال قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کا صحیح اور مکمل تعارف کراتا ہے۔ اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ قرآن میں خدا کی صفات کا واضح تعین ہو، تاکہ انسان خدا کی طرف کوئی نامناسب صفت منسوب نہ کرسکے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان کو خدا کی نئی نئی صفات کا علم ہوسکتا ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ قرآن نے خدا کی صفات کا واضح اور متعین تصور نہیں دیا ہے اور اس بات کی گنجائش ہے کہ انسان اپنی عقل سے کچھ صفات کا اضافہ کرسکے۔ کیا یہ خیال قرآن کے مقصدِ نزول کے خلاف نہیں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن میں خدائے تعالیٰ کی جن صفات کا ذکر ہے وہ خدا کے بارے میں غور و فکر کا عنوان ہیں۔ انسان کائنات پر جس قدر غور کرے گا اسی قدر خدا کی صفات کے نئے نئے پہلو اس کے سامنے آتے جائیں گے لیکن کوئی بھی نیا پہلو ایسا ہو نہیں سکتا جو قرآن کے بتائے ہوئے صفاتِ الٰہی میں شامل نہ ہو جائے۔ قرآن نے بھی خدا کی ایک ایک صفت کے مختلف پہلو نمایاں کیے ہیں۔ مثال کے طور پر خدا کو صاحبِ علم کہا گیا ہے۔ اس کا ایک پہلو یہ ہے کہ یَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ۔ مومن: ۱۹ (وہ نگاہوں کی خیانت اور سینوں میں چھپی ہوئی باتوں کو جانتا ہے) اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خدا کو مستقبل کے پردے میں چھپے ہوئے واقعات کا علم ہے۔ إِنَّ اللَّهَ عِنْدَهُ عِلْمُ السَّاعَةِ وَيُنَزِّلُ الْغَيْثَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْأَرْحَامِ وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ مَاذَا تَكْسِبُ غَدًا وَمَا تَدْرِي نَفْسٌ بِأَيِّ أَرْضٍ تَمُوتُ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ۔ لقمان: ۳۴ (اللہ ہی کے پاس ہے قیامت کا علم، وہ بارش کو نازل کرتا ہے، کوئی نہیں جانتا کہ بارش کب آئے گی۔ وہ جانتا ہے جو رحموں میں ہوتا ہے، کسی نفس کو نہیں معلوم کہ وہ کل کیا کمائے گا، اور کوئی نہیں جانتا کہ اس کی موت کب آئے گی۔ (لیکن) بلاشبہ اللہ علم والا اور باخبر ہے) خدا کے صاحبِ علم ہونے کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ماضی کا کوئی واقعہ اس کے ذہن سے غائب نہیں ہوتا وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا۔ مریم ۶۴ (تیرا رب بھولنے والا نہیں ہے۔) اس کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ کس وقت کس کام میں خیر ہے اور کون سا کام نقصان دہ ہے اس کو وہ جانتا ہے۔ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَ

اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ البقرہ: ۲۱۶ (اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے) اس طرح کے اور بھی بہت سے پہلو ہو سکتے ہیں قرآن نے خدا کے علم کے ان مختلف پہلوؤں کو ابھارنے کے لیے خدا کے کئی ایک اسماء کا ذکر کیا ہے وہ کبھی اس کو "عالم" کہتا ہے، کبھی "علیم" کہتا ہے، کبھی "علام الغیوب" (غیب کی چیزوں کا جاننے والا) کہتا ہے۔ کبھی "خبیر" (باخبر) کہتا ہے، اور کبھی لطیف (باریک بیں) کہتا ہے۔ حالانکہ ان تمام اسماء کا تعلق خدا کے علم ہی سے ہے لیکن چونکہ ان میں سے ہر اسم خدا کی صفتِ علم کے ایک خاص رخ کو واضح کرتا ہے اس لیے ان سب کو الگ الگ اسماءِ الٰہی مانا جاتا ہے۔

ٹھیک اسی طرح قرآن میں خدا کو حکیم اور قوی کہا گیا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی شخص پر خدا کی حکمت اور قوت کا کوئی ایسا پہلو واضح ہو جو اس سے پہلے لوگوں کے ذہن میں نہیں تھا۔ اس لحاظ سے اس کو خدا کا ایک نیا اسم دریافت ہوا۔ ہر دور اور ہر زمانہ میں اس کا امکان ہے کہ جو شخص خدا کے بارے میں غور و فکر کرے اس پر خدا کی صفات کے ایسے گوشے کھل جائیں جو دوسروں پر نہیں کھلے تھے۔ اس امکان کو ختم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اب تک خدا کے بارے میں جو کچھ سوچا جا چکا ہے اس سے آگے غور و فکر کو ہم بے معنی اور لاحاصل سمجھتے ہیں۔ حالانکہ خدا کی ذات و صفات کا احاطہ ممکن نہیں، وہ ایک بے پایاں سمندر ہے جس کی ابتدا اور انتہا کو کوئی پا نہیں سکتا[1]

---

[1] یہاں ایک حدیث کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کا اوپر کے سوال سے گہرا تعلق ہے۔

بخاری اور مسلم کی روایت ہے اور الفاظ مسلم کے ہیں: اِنَّ لِلّٰہِ تِسْعَۃً وَّتِسْعِیْنَ اِسْمًا اِلَّا وَاحِدًا مَنْ اَحْصَاھَا دَخَلَ الْجَنَّۃَ (کتاب الذکر والدعاء، باب اسماء اللہ تعالیٰ وفضل من احصاہا) خدائے تعالیٰ کے ۹۹ نام ہیں۔ ایک کم سو۔ جو شخص ان ناموں کو یاد کر لے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ ترمذی کی ایک روایت میں ان ناموں کی تفصیل بھی ہے۔ اس حدیث کا مفہوم متعین کرنے میں محدثین کو بڑی زحمت پیش آئی ہے کیونکہ خود قرآن میں جن اسماءِ الٰہی کا ذکر ہے وہ ننانوے سے زیادہ ہیں اور اگر اس کے ساتھ ان اسماء کو بھی شامل کر لیا جائے جو صحیح حدیثوں سے ثابت ہیں تو یہ تعداد بہت بڑھ جاتی ہے۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ معلومات علامہ مرتضیٰ یمانی نے اکٹھا کی ہیں (ملاحظہ ہو، ایثار الحق علی الخلق صفحہ ۱۷۷-۱۶۹) انھوں نے ترمذی کی روایت کو جس میں اسماءِ الٰہی کی تفصیل ہے رد کر دیا ہے کیونکہ یہ سنداً کمزور ہے لیکن اس سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ مجملاً اتنی بات صحیح حدیثوں سے ثابت ہے کہ خدائے تعالیٰ کے ننانوے اسماء ہیں اور خود علامہ موصوف کو اعتراف ہے کہ قرآن و حدیث میں اسماءِ الٰہی اس تعداد سے زیادہ مذکور ہیں۔ ہمارا ذہن اس طرح کام کرتا ہے کہ شاید خدا کے ننانوے اسماء اس کی بے شمار صفات کے ننانوے عنوانات ہوں۔ اور پھر ہر عنوان کے تحت بہت سی صفات آتی ہوں۔ اگر اس پہلو سے جائزہ لیا جائے تو اس بات کا امکان ہے کہ قرآن و حدیث میں جن اسماءِ الٰہی کا ذکر ہے ان کو ننانوے اسماءِ خاص یا ننانوے عنوانات کے تحت لایا جا سکے۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو خدا کی کوئی نئی صفت تو نہیں معلوم ہوتی، البتہ جن صفات کو وہ جانتا ہے ان کے درمیان ایک خاص معنوی ربط تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو خدا کی عظمت و بزرگی کے اظہار و اعتراف کے لیے موزوں ترین تعبیر مل جاتی ہے۔ اس کی مثالیں حدیث میں بہت سی ملتی ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مواقع پر تعریف فرمائی ہے۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

ایک شخص نے اپنی نماز میں دعا کی۔ دعا کے الفاظ یہ تھے :۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ بِاَنَّ لَکَ	اے اللہ! میں تجھ سے مانگ رہا ہوں کیونکہ حمد
الْحَمْدُ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ الْحَنَّانُ	تیرے ہی لیے ہے۔ تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔ تو بڑا
الْمَنَّانُ بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ	مہربان اور بڑا محسن ہے۔ تو آسمان اور زمین کا خالق
وَالْاَرْضِ یَا ذَا الْجَلَالِ	ہے۔ اے وہ ذات جس کے لیے بزرگی اور عظمت ہے
وَالْاِکْرَامِ یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ	اے وہ ذات جو زندہ و پائندہ اور قائم و دائم ہے
اَسْاَلُکَ	میں تجھ سے مانگ رہا ہوں

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ سنے تو فرمایا :۔

دَعَا اللّٰہَ بِاسْمِہِ الْاَعْظَمِ	اس نے خدا کا اسم اعظم لے کر اس سے دعا کی ہے
الَّذِیْ اِذَا دُعِیَ بِہٖ	اس نام کے ساتھ جب خدا کو بلایا جاتا ہے تو وہ ضرور
اَجَابَ وَاِذَا سُئِلَ بِہٖ	جواب دیتا ہے اور اس کے ذریعہ جب اس سے مانگا جاتا ہے
اَعْطٰی لہ	تو ضرور دیتا ہے۔

قرآن نے خدا کی جو صفات بیان کی ہیں وہ خدا کے بارے میں مزید غور و فکر کے لیے حدود ہیں۔ ان حدود سے جو شخص آگے نکلنے کی کوشش کرے گا وہ غلط راہ پر پڑ جائے گا۔ البتہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے فکر و تدبر کا میدان بہت وسیع ہے۔ قرآن میں خدا کو سمیع و بصیر — سننے اور دیکھنے والا — کہا گیا ہے۔ ہر دور میں انسان خدا کی ان صفات کے نئے نئے گوشے تلاش کر سکتا ہے۔ البتہ یہ بات خدا کے انکار کے ہم معنی ہوگی کہ خدا کو سمع و بصر کی قوتوں سے خالی مان لیا جائے یا اس کو انسان کے مقام پر کھڑا کر دیا جائے۔ قرآن میں صراحت ہے کہ خدا کو اس کے تمام اسمائے حسنیٰ کے ساتھ یاد کیا جا سکتا ہے۔ البتہ خدا کے مقدس ناموں کو بگاڑنا اور ان میں تحریف کرنا ان لوگوں کی روش ہے جن کے سینے خدا کے

ؔ مشکوٰۃ، کتاب اسماء اللہ تعالیٰ، باب اسم اللہ الاعظم ... [illegible]

صفت سے خالی ہیں۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ	اور اللہ ہی کے لیے ہیں تمام اچھے نام۔ تم اس کو
بِهَا وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ	اچھے ناموں ہی سے پکارو اور ان لوگوں کو چھوڑ دو جو اس کے
اَسْمَآئِهٖ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا	ناموں میں الحاد سے کام لیتے ہیں۔ ان کو ان کے اعمال کا
يَعْمَلُوْنَ ۝ (الاعراف ۱۸۰)	بدلہ دیا جائے گا۔

اس آیت میں جس عمل سے روکا گیا ہے وہ ہے "الحاد فی الاسماء"۔ الحاد کے معنی ہیں پھیر دینا۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی کسی صفت ہی کا انکار کر دیا جائے۔ جو صفت خاص اس کی ہے اور جس کے بغیر خدا کا تصور ممکن نہیں ہوتا اس کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اس کی دوسری صورت یہ ہے کہ خدا کی کسی صفت میں دوسروں کو شریک کیا جائے اور ایک خدا کو دس خداؤں میں تقسیم کر دیا جائے۔ پہلی صورت کفر ہے اور دوسری صورت شرک۔ اور یہ دونوں ہی صورتیں قرآن کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم ہیں۔

خدا کی صفات کا احاطہ ممکن نہیں انسان کائنات کے مطالعہ اور اپنے باطن کے احساسات کی مدد سے خدا کی صفات کا احاطہ نہیں کر سکتا بلکہ اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ خدا کی کسی ایک ہی صفت کی وسعت اور گہرائی کو پالے۔ کائنات کے بارے میں انسان کی معلومات خواہ کتنی ہی بڑھ کیوں نہ جائیں وہ اس کی وسعتوں کو ناپ نہیں سکتا۔ کائنات ایک سمندر ہے جس کے ایک ننھے سے جزیرے پر ہم آباد ہیں۔ اس جزیرے پر کھڑے ہو کر ہم کچھ دور تک سطحِ سمندر کا مشاہدہ کر رہے ہیں لیکن اس کے کنارے ہماری نگاہوں سے بہت دور ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس کی وسعت کیا ہے اور وہ کتنا گہرا ہے اور اس کے سینے میں کس قسم کی چیزیں چھپی ہوئی ہیں۔ کائنات کے بارے میں چند حقیری معلومات کو لے کر خالق کائنات کی صفات کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔ وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ (الانعام: ۵۹) (اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا۔)

اسی کے ساتھ قرآن ایک اور حقیقت کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے۔ وہ یہ کہ کائنات جامد نہیں ہے بلکہ یہ ہر آن تغیر و انقلاب سے گزر رہی ہے اور اس میں مسلسل تخریب و تعمیر ہو رہی ہے۔ انسان کائنات کے بارے میں تمام معلومات کو سمیٹنا چاہے تو سمیٹ نہیں سکتا۔ جو کائنات اس وقت ہے، تخلیق و فنا کا عمل ایک وقفہ کے بعد اس کو ختم کر کے ایک دوسری کائنات پیدا کر دیتا ہے۔ خدا کی صفت یہی نہیں ہے کہ وہ موجودات میں سے "ہر چیز کا خالق ہے" بلکہ "يَزِيْدُ فِى الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ" فاطر: ۱ (وہ تخلیق میں جو چاہتا ہے اضافہ کرتا ہے۔ سورہ نحل میں فرمایا: "وَيَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝"۔

وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے جن کو تم نہیں جانتے۔ قرآن میں خدا کو "رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ" (ہر چیز کا رب) کہا گیا ہے۔ قرآن کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی ہے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۝ (تعریف ساری کی ساری اللہ کے لیے ہے جو رب العالمین ہے) "رب" وہ ہے جو تربیت اور نشو ونما دے۔ خدا ہر چیز کا رب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کو ترقی دے رہا ہے۔ اور اس کو مخالف قوتوں سے محفوظ رکھے ہوئے ہے۔ وہ اس کو اس طرح آگے کی طرف لیے جا رہا ہے کہ کوئی دوسری چیز اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن رہی ہے۔ کائنات کی ساخت اس نوعیت کی ہے کہ یہاں جب کوئی چیز عمل کرتی ہے تو اپنی اندرونی قوت کا مسلسل اخراج کرتی ہے۔ اس کو زندہ اور متحرک رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے اندر نئی توانائی پیدا کی جاتی رہے ورنہ وہ اپنی قوت حیات کھو دے گی اور فنا ہو جائے گی۔ اس کائنات کو ہم حرکت اور عمل میں اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ اس کا رب اس کے اندر زندگی اور حرارت پیدا کر رہا ہے۔ رَبُّكُمْ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ فَطَرَهُنَّ الانبیاء ۵۶ (تمہارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور جس نے ان کو پیدا کیا) یعنی وہ زمین و آسمان کا صرف خالق ہی نہیں ہے بلکہ ان کی تربیت اور نشو ونما بھی اس طرح کر رہا ہے کہ وہ اپنی جگہ پر قائم ہیں۔

ایک ایسی کائنات جس میں مسلسل تخلیق و فنا کا عمل ہو رہا ہے اور جس کی تربیت اور نشو ونما جاری ہے۔ اس کے بارے میں انسان کا مطالعہ کبھی بھی ختم نہیں ہو سکتا۔ وہ ایک چیز کو پائے گا نہیں کہ دس چیزیں اس سے چھوٹ جائیں گی۔

خدا کی صفات کے شعور کا دوسرا ذریعہ خود انسان کی نفسیات ہیں لیکن اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ہر شخص اپنے جذبات و احساسات کے لحاظ سے ایک پورا عالم ہے۔ محبت اور نفرت، غصہ اور خوشی، ہمدردی اور بے رحمی یہ انسان کی ایسی باطنی کیفیات ہیں جن کو نہ تو کسی تحریر میں قلمبند کیا جا سکتا ہے اور نہ تقریر کے ذریعہ ان کیفیات کا پوری طرح اظہار ہو سکتا ہے۔ ایک مصیبت زدہ شخص کو دیکھ کر کسی انسان کی آنکھ سے آنسو نکل پڑتے ہیں اور وہ اس کے ہاتھ میں چند پیسے رکھ دیتا ہے تو ہم اس کو ہمدردی کا نام دیتے ہیں لیکن اس واقعہ کے نتیجے میں ان چند پیسوں کے دینے والے پر کیا کیفیات گذریں اور ان کے لینے والے نے کن احساسات کے ساتھ لیا اس کو آپ کسی ڈکشنری میں نہیں پا سکتے۔ البتہ ڈکشنری کی تصریحات سے زیادہ واضح طور پر اس کو وہ دونوں افراد محسوس کر رہے ہیں جن پر یہ واقعہ گذرا ہے۔ اسی طرح جب انسان خدا کے دربار میں اپنے ہاتھ پھیلاتا ہے اور اس کا دل گواہی دیتا ہے کہ ہاں اب تمہاری دعا سن لی گئی اور تمہارے ہاتھ مرادوں سے بھر گئے تو یہ ایک ایسی کیفیت ہے جسے نہ تو کوئی آنکھ دیکھ سکتی ہے اور نہ اسے سمجھایا جا سکتا ہے۔ لیکن جس

شخص نے اس کیفیت کو محسوس کیا ہے اس کے لیے آنکھ سے دیکھی ہوئی چیز سے زیادہ یہ یقینی چیز ہے۔ آپ خدا کے رحم وکرم کے بارے میں جو احساسات رکھتے ہیں حقیقت اسی میں محدود نہیں ہے بلکہ خدا کی رحمت ہر شخص کے لیے ویسی ہے جیسے وہ خود محسوس کر رہا ہے۔ آپ کے احساسات میں نہ تو کوئی دوسرا شریک ہے اور نہ دوسرے کے احساسات میں آپ کا کوئی حصہ ہے۔

کائنات اور انسان کی نفسیات کا مطالعہ بتاتا ہے کہ خدا کی صفات کا احاطہ ممکن نہیں۔ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا طٰہٰ ۱۱۰ (وہ اپنے علم کے ذریعہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے) جو شخص اپنے علم و فکر کے بارے میں دھوکہ میں نہیں ہے اور اپنی حقیقت سے آگاہ ہے وہ جب بھی خدا کے بارے میں غور و فکر کرے گا اس کو خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان میں اپنی بے بسی کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ آپ نے سجدہ میں سر رکھ کر فرمایا:-

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ	اے اللہ میں تیری رضا کے واسطے سے تیرے غصے
سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ	اور تیرے عفو و درگذر کے واسطے سے تیری سزا سے پناہ
عُقُوبَتِكَ وَأَعُوذُ بِكَ مِنْكَ لَا	مانگتا ہوں اور خود تجھ سے تیری پناہ چاہتا ہوں۔ میں تیری
أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا	حمد و ثنا پوری طرح کر نہیں سکتا۔ خدایا تو ویسا ہی ہے
أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ [1]	جیسا کہ خود تو نے اپنے بارے میں کہا ہے۔

خدا اور مخلوق کی صفات کا فرق؟

قرآن میں خدائے تعالیٰ کی بہت سی صفات بیان ہوئی ہیں ان صفات پر اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی نہ کسی درجہ میں انسان اور کائنات کے اندر موجود ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا خالق ہے، قادر ہے، عالم ہے، سمیع و بصیر ہے، رازق ہے، مددگار ہے، زندہ ہے اور شعور اور ارادہ رکھتا ہے۔ وغیرہ۔ ان صفات کی جھلک ہم انسان کی ذات اور کائنات میں دیکھتے ہیں۔ یہاں بھی ہمیں زندگی اور ارادہ ملتا ہے، علم اور قدرت اور سننے اور دیکھنے کی قوتیں ملتی ہیں۔ یہاں ہمدردی اور تعاون کا مظاہرہ بھی ہوتا ہے۔ تو کیا خدا کی صفات کی یہی حقیقت ہے کہ جس پیمانہ پر ہم ان کا مشاہدہ اپنی ذات اور اپنی ذات سے باہر کر رہے ہیں وہ خدا کے اندر اعلیٰ پیمانہ پر موجود ہیں؟

تاریخ میں بہت سے انسانوں کے ذہن میں یہ سوال پیدا۔ جس چیز میں بھی انھوں نے کچھ غیر معمولی قوتوں کا مشاہدہ کیا اس کو خدا بنا لیا یا جن افراد نے اپنے اندر دوسروں سے زیادہ قوت دیکھی وہ خدا بن بیٹھے اور جسے کمزور پایا اسے اپنی بندگی کی دعوت دینے لگے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ فَلَا تَدْعُوا مَعَ اللّٰهِ أَحَدًا الجن ۱۸

[1] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب مایقال فی الرکوع والسجود

(پس تم خدا کے سوا کسی کو نہ پکارو۔) کیونکہ کسی مخلوق میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ خدا بن جائے۔ ان کا مخلوق ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کے تابع ہیں اور خدائی کے حق سے محروم ہیں۔ اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا مریم: ۹۲، ۹۳ (آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب کی سب رحمٰن کے پاس غلام بن کر آنے والی ہیں ان کو اس نے شمار کر لیا ہے اور اچھی طرح گن رکھا ہے) فرعون نے اپنے اقتدار کو خدائی کے ہم معنی سمجھا اور اعلان کیا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى (تمہارا سب سے بڑا رب تو میں ہوں) قرآن کہتا ہے کہ فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى۔ النازعات ۲۵، ۲۴ (اللہ نے اس کو اس طرح پکڑا کہ دنیا اور آخرت میں عبرت کا سامان بن گیا) فرشتے اور جن کم از کم مذہب کی دنیا میں غیر معمولی قوتوں کے مالک سمجھے گئے ہیں۔ قرآن بھی ان کے وجود کو مانتا ہے اور ان کی بڑھی ہوئی قوتوں کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کے وجود وہ اس کے نزدیک خدا نہیں ہیں۔ فرشتوں کے بارے میں کہا: وَمَنْ يَّقُلْ مِنْهُمْ اِنِّیْٓ اِلٰهٌ مِّنْ دُوْنِهٖ فَذٰلِكَ نَجْزِيْهِ جَهَنَّمَ كَذٰلِكَ نَجْزِی الظّٰلِمِيْنَ ۝ الانبیاء: ۲۹ (ان میں سے جو یہ کہے کہ خدا کے بجائے میں الٰہ ہوں تو ہم اس کی اس بات پر جہنم کی سزا دیں گے۔ ہم ظالموں کو ایسی ہی سزا دیتے ہیں) جنوں کے متعلق کہا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ۝ (بلاشبہ جن خوب جانتے ہیں کہ ان کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے) پیغمبروں کو ان کی اخلاقی و روحانی خصوصیات کی وجہ سے انسانوں کے درمیان ہمیشہ ایک خاص مقام حاصل رہا ہے لیکن ان کی اس خصوصیت اور بلندی کو بعض اوقات الوہیت کے ہم معنی سمجھ لیا گیا۔ قرآن جگہ جگہ اس کی تردید کی ہے۔ ایک جگہ فرمایا:۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّیْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ آل عمران ۷۹، ۸۰ (یہ ممکن نہیں ہو سکتا کہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اپنی طرف سے کتاب، قوتِ اقتدار اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ تم بجائے خدا کے میرے بندے بن جاؤ، بلکہ وہ جو کچھ کہے گا یہ ہے کہ تم خدا پرست بن جاؤ جب کہ تم خدا کی کتاب دوسروں کو سکھاتے اور خود پڑھتے ہو۔ اور نہ وہ تم کو اس بات کا حکم دے گا کہ تم فرشتوں اور نبیوں کو اپنا رب بنا لو، کیا وہ تم کو کفر کا حکم دے گا جب کہ تم مسلمان ہو چکے ہو۔)

انسان خدا کی مخلوق کو کیوں خدا سمجھنے لگتا ہے؟ جو چیزیں خدا کی پیدا کردہ ہیں اور جو خدا کی مدد اور سہارے کے

بغیر ایک لمحے کے لیے زندہ نہیں رہ سکتیں انسان ان کے بارے میں کیوں غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ وہ خدا ہیں؟

اس سوال کا جواب آپ کو آسانی سے مل جائے گا اگر آپ ایک خاص پہلو سے اس پر غور کریں۔

آپ جو بھی کام کرتے ہیں اس میں اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو منتقل کرتے ہیں۔ آپ کی تصنیف کردہ کتاب اس بات کا زندہ ثبوت ہے کہ آپ مصنف ہیں، کیونکہ آپ نے اپنی قوتِ تصنیف کو کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اسی طرح ایک انجینیر جب کوئی عمارت تیار کرتا ہے تو اپنی عمارت سازی کی صلاحیت کو عمارت کی شکل میں ظاہر کرتا ہے۔ وہ اپنی اس صلاحیت کو جو ایک غیر مادی چیز ہے مادی اور ٹھوس وجود عطا کرتا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح تعبیر یہ ہوگی کہ اس کی عمارت، سازی کی صلاحیت نے عمارت کا روپ دھار لیا ہے۔ اس بے جان عمارت میں اگر روح پھونک دی جائے تو وہ ان ہی خصوصیات کا مظاہرہ کرے گی جن کا مظاہرہ انجینیر بحیثیت انجینیر اپنے عمل سے کر رہا ہے۔ عمارت بول نہیں سکتی اگر اس کو قوتِ گویائی حاصل ہوتی تو وہ اپنی زبان سے انجینیر ہونے کا اعلان کرتی۔ فرض کیجیے، عمارت اس حقیقت کو بھول جاتی ہے کہ اس کا وجود اپنا نہیں ہے بلکہ وہ عمارت سازی کی قوتِ تخلیق کی نمائندہ ہے اور اس میں جو قوتیں ہیں وہ اس کی ذاتی نہیں ہیں بلکہ عمارت سازی کی قوتوں کی محض نمائندگی کرتی ہیں تو وہ بذاتِ خود انجینیر ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہے اور عمارت کے اس دعوے کو وہ لوگ بڑی آسانی سے قبول بھی کر لیں گے جو عمارت ساز سے واقف نہیں ہیں کیونکہ ان کے سامنے ایک ایسی عمارت ہے جس سے عمارت سازی کی خصوصیات ظاہر ہو رہی ہیں۔

یہی حال اس کائنات کا ہے۔ خدا جو خصوصیات اپنے اندر رکھتا ہے وہ اس کائنات میں نمایاں ہیں۔ یہاں وجود، علم، حکمت، قوت اور اقتدار جو کچھ ہے وہ حقیقت میں خدا کی مختلف خصوصیات ہیں جو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوئی ہیں۔ یہاں محبت اور ہمدردی ہے تو وہ خدا کی محبت اور ہمدردی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہاں علم اور حکمت ہے تو وہ خدا کے علم و حکمت کی ترجمان ہے۔ یہاں شعور اور حیات ہے تو وہ خدا کے شعور اور حیات سے نکلا ہے۔ یہاں قوت اور توانائی ہے تو وہ خدا کی قوت و توانائی کا ایک حصہ ہے۔ غرض یہ کہ یہاں جو صفات اور خصوصیات ہم دیکھ رہے ہیں وہ خدا کی صفات اور خصوصیات سے ماخوذ ہیں[1]۔ لیکن جو چیز ماخوذ ہے اس کو

---

[1] اس موضوع پر احادیث میں بکثرت اشارے موجود ہیں۔ ہم یہاں صرف دو حدیثیں پیش کرتے ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:- الرَّحِمُ شُجْنَةٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَقَالَ اللّٰہُ تَعَالیٰ مَنْ وَّصَلَكِ وَصَلْتُہٗ وَمَنْ قَطَعَكِ قَطَعْتُہٗ۔ بخاری، کتاب الآداب، باب من وصل وصلہ اللہ۔ شُجْنَةٌ کے معنی ہیں درخت کی شاخ کے ... [illegible]

اصل قرار دینا بے وقوفی کی دلیل ہے۔ کسی اقتدار کے نمائندے کو اقتدار کا اصل مالک وہی شخص کہہ سکتا ہے جس کی عقل ماری گئی ہو یا جو عمداً دوسروں کو دھوکا دینا چاہتا ہو۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ عظمت اور بڑائی صرف خدا کے لیے ہے۔ کیونکہ یہاں جس چیز میں بھی کوئی عظمت پائی جاتی ہے وہ اس کی عظمت نہیں خدا کی عظمت ہے۔ اور اسی کی عظمت کی ترجمانی کر رہی ہے۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَاءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۔ الجاثیہ: ۳۷ (اسی کے لیے ہے ساری بڑائی آسمانوں اور زمین میں، اور وہ غالب اور حکمت والا ہے) خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی زبان مبارک سے خدا کا یہ قول نقل کرتے ہیں۔ اَلْكِبْرِيَاءُ رِدَائِيْ وَالْعَظَمَةُ اِزَارِيْ فَمَنْ نَازَعَنِيْ وَاحِدًا مِّنْهُمَا اَدْخَلْتُهُ فِي النَّارِ[1] (بڑائی میری چادر ہے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶) حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ "رحم" (رشتہ اور قرابت داری) رحمن سے نکلی ہوئی جڑ ہے اور یہیں سے وہ پھیلی ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے "رحم" جو شخص تجھے جوڑے گا میں اسے اپنے سے جوڑوں گا اور جو تجھے کاٹے گا میں اس کو اپنے سے کاٹوں گا۔ مطلب یہ کہ جو شخص رشتہ کا پاس ولحاظ رکھے اس کا خدا سے رشتہ جڑے گا اور جو اس کا احترام نہ کرے خدا سے اس کا رشتہ کٹ جائے گا۔ یہی حدیث ان الفاظ میں بھی آئی ہے۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اَنَا الرَّحْمٰنُ وَهِيَ الرَّحِمُ شَقَقْتُ لَهَا اِسْمًا مِنْ اِسْمِيْ مَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهُ۔ ابوداؤد کتاب الزکوٰۃ، باب فی صلۃ الرحم (اللہ تعالیٰ فرماتا ہے "میں رحمن ہوں اور وہ رحم ہے۔ میں نے اس کا نام اپنے نام سے نکالا ہے جو شخص اس کو ملائے گا میں اس کو ملاؤں گا اور جو شخص اس کو کاٹ دے گا میں بھی اس کو کاٹ دوں گا)۔ دوسری حدیث ہے۔ جَعَلَ اللّٰهُ الرَّحْمَةَ فِيْ مِائَةِ جُزْءٍ فَاَمْسَكَ عِنْدَهٗ تِسْعَةً وَتِسْعِيْنَ جُزْءًا فَمِنْ ذٰلِكَ الْجُزْءِ يَتَرَاحَمُ الْخَلْقُ حَتّٰى يَرْفَعَ الْفَرَسُ حَافِرَهَا عَنْ وَلَدِهَا خَشْيَةَ اَنْ تُصِيْبَهٗ۔ بخاری کتاب الادب باب رحمۃ الولد وتقبیلہ الخ مسلم کتاب التوبہ باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانہا تغلب غضبہ (اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کیے، ننانوے ۹۹ حصے اپنے پاس رکھ لیے اور ایک حصہ زمین پر نازل کیا۔ اس ایک حصے کا یہ اثر ہے کہ مخلوق آپس میں رحمت والفت سے پیش آتی ہے یہاں تک کہ گھوڑا اس ڈر سے کہ اس کے بچے کو کوئی تکلیف نہ پہنچ جائے اپنا پیر اس پر نہیں رکھتا۔)

ان دو حدیثوں میں بتایا گیا ہے کہ قرابت اور رشتہ داری اور رحمت والفت کا سرچشمہ خدا کی صفات ہیں۔ ان دو صفتوں پر دوسری تمام صفات کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

[1] مشکوٰۃ، باب الغضب والکبر بحوالہ مسلم

اور عظمت میرا تہبند۔ پس جو کوئی ان میں سے کسی ایک کو بھی مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا میں اس کو جہنم میں پھینک دوں گا۔)

یہاں ہمیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ کائنات کی ایک حد ہے اور اس کی وسعت کی ایک انتہا ہے لیکن خدا کی ہر صفت بے پایاں اور غیر محدود ہے۔ اس لیے خدا کی خصوصیات اور صفات کائنات میں اسی حد تک نمایاں ہیں جس حد تک اس میں وسعت اور صلاحیت ہے۔ ہر تخلیق اپنے ظرف کے لحاظ سے خالق کی خصوصیات کو جذب کر سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح یہ محدود کائنات خدا کی غیر محدود قوتوں کی پوری طرح حامل نہیں ہے۔ اس میں خدا کی قوت اور قدرت ایک محدود پیمانہ پر ظاہر ہوئی ہے۔

علاوہ ازیں ہمارے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جس سے ہم خدا کی کسی صفت کی آخری حد کو پالیں اور اس کی وسعتوں کو سمجھ لیں۔ کیونکہ حقیقتیں ہمارے لیے اضافی ہیں۔ ایک چیز کی مدد سے ہم دوسری چیز کو سمجھتے ہیں موم کی نرمی سے ہمیں پتھر کی سختی کا تصور حاصل ہوتا ہے۔ اسی طرح پتھر، لوہے اور لکڑی تینوں میں سختی ہے لیکن ان تینوں کی سختی میں فرق ہم اضافت کے ذریعہ کرتے ہیں لیکن کوئی بھی اضافت خدا کی صفات کا مکمل تصور ہمیں نہیں دے سکتی۔ کائنات میں خدا کی جو خصوصیات نمایاں ہیں ان کے ذریعہ ہم خدا کی حقیقی خصوصیات کا اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔ ایسا کوئی عددی اصول نہیں ہے جو ہمیں بتا سکے کہ خدا اپنی مخلوق سے اس درجہ بلند ہے اور اس کی امتیازی حیثیت یہاں ختم ہوتی ہے۔ قرآن کہتا ہے وجود اس کائنات کا بھی ہے اور خدا بھی وجود رکھتا ہے لیکن كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ إِلَّا وَجْهَهُ قصص: ۸۸ (کائنات کی ہر چیز فنا ہونے والی ہے اور خدا کی ہستی ہمیشہ باقی رہے گی۔)

انسان اور جن قدرت اور طاقت رکھتے ہیں لیکن یہ ایسی طاقت ہے جسے کمزوری اور بے بسی نے گھیر رکھا ہے۔ يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا ۚ لَا تَنْفُذُونَ إِلَّا بِسُلْطَانٍ الرحمٰن: ۳۳ (اے گروہ جن و انس اگر تم زمین و آسمان کے کناروں سے نکل کر بھاگ سکتے ہو تو بھاگ جاؤ، لیکن تم خدا کے حکم کے بغیر کہیں بھاگ نہیں سکتے۔

خدا بھی قوی اور صاحب اقتدار ہے لیکن اس کا اقتدار عجز اور کمزوری سے ناآشنا ہے۔ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعْجِزَهُ مِنْ شَيْءٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ فاطر: ۴۴ (اللہ ایسا نہیں ہے کہ آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی چیز اس کو عاجز کر دے۔) یہاں ہر کام کے لیے انسان کو محنت و مشقت کرنی پڑتی ہے اور جتنی اس کی محنت ہوتی ہے اتنا ہی اس کو ملتا بھی ہے۔ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ (انسان کے لیے وہی ہے جس کی اس نے کوشش کی)

لیکن خدا کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ إِنَّمَا أَمْرُهُ إِذَا أَرَادَ شَيْئًا أَنْ يَقُولَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ۝
یٰس: ۸۲ (جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو اس کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے) انسان علم اور آگہی کا
دعویٰ رکھتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ علم سے زیادہ جہل اس کے حصے میں آیا ہے اور وہ اپنی نادانی کی وجہ سے بڑے
سے بڑے ظلم اور زیادتی کا ارتکاب کر گزرتا ہے۔ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا ۝ الاحزاب: ۷۲ (اس میں شک
نہیں کہ انسان بڑا ہی ظالم اور نادان واقع ہوا ہے) لیکن خدا کے علم سے زمین اور آسمان کی ذرہ برابر کوئی چیز غائب
نہیں ہوتی۔ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ وَلَا أَصْغَرَ
مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْبَرَ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ ۝ یونس: ۶۱ (تمہارے رب سے ذرہ برابر کوئی چیز غائب نہیں
ہے نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور ہر چیز خواہ وہ ذرہ سے بھی چھوٹی ہو یا بڑی ایک کھلی ہوئی کتاب میں درج ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ حقائق کے سمجھنے کا ہمارے پاس جو ذریعہ ہے اس سے خدا کی صفات کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا
ہم وہ الفاظ نہیں رکھتے جن سے خدا کی خدائی کی حد بندی کی جا سکے۔ کائنات کی کسی بھی بڑی سے بڑی قوت اور طاقت کے ذریعہ خدا کی
قوت اور اقتدار کا اندازہ کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں۔ کیونکہ کسی بھی چیز کی اضافت اس فرق کو بیان نہیں کر سکتی جو اس
کے اور خدا کے درمیان موجود ہے۔ جو لوگ خدا اور مخلوق کے اس فرق کو مٹاتے ہیں وہ قرآن کے نزدیک شرک کا
ارتکاب کرتے ہیں۔ وہ ایک محدود حقیقت کو ایک غیر محدود حقیقت کے درجے میں رکھ رہے ہیں۔ آج وہ اپنے
اس جرم کو محسوس کریں یا نہ کریں لیکن کل وہ خدا کے سامنے اعتراف کرنے پر مجبور ہوں گے تَاللَّهِ إِنْ كُنَّا لَفِي ضَلَالٍ
مُبِينٍ ۝ إِذْ نُسَوِّيكُمْ بِرَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ وَمَا أَضَلَّنَا إِلَّا الْمُجْرِمُونَ ۝ الشعراء: ۹۹-۹۷ (قسم خدا
کی ہم کھلی گمراہی میں تھے جب کہ ہم (اے معبودانِ باطل) تم کو اس خدا کے برابر کر رہے تھے جو سارے جہانوں کا پروردگار
ہے ہم کو تو ان مجرموں نے راہ راست سے بھٹکایا ہے۔)

قرآن نے انسان کو خدا کی صفات کا تصور ان صفات کے ذریعہ دیا ہے جن سے وہ واقف ہے کیونکہ اس
کے بغیر وہ خدا کی صفات کو سمجھ نہیں سکتا لیکن ساتھ ہی اس نے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ یہ محض تقریب فہم
کے لیے ہے۔ یہ ایک تمثیل ہے جس سے حقیقت کو ذہن سے قریب کیا گیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا:- وَمَا أَمْرُنَا إِلَّا
وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍ بِالْبَصَرِ ۝ القمر: ۵۰ (ہمارا کام تو بس ایک اشارہ ہوتا ہے جیسے کوئی پلک جھپکے) قیامت ایک
بہت بڑا واقعہ ہے جو اس کائنات میں پیش آنے والا ہے۔ یہ واقعہ خدا کی قدرت سے کس طرح پیش آئے گا اس کو ظاہر کرنے
کے لیے یہی تعبیر اختیار کی گئی ہے وَمَا أَمْرُ السَّاعَةِ إِلَّا كَلَمْحِ الْبَصَرِ أَوْ هُوَ أَقْرَبُ النحل: ۷۷ (قیامت تو اس

طرح واقع ہو گی جیسے کوئی پلک جھپکے یا اس سے بھی بہت پہلے) انتہائی قدرت اور طاقت کے اظہار کے لیے انسان جس تعبیر سے آشنا ہے خدا کے حق میں اس تعبیر کے استعمال کے بعد کہہ دیا گیا کہ یہ بھی بطور تمثیل ہے۔ خدا کی قدرت اور اس کے اقتدار کو انسان جن الفاظ میں بیان کر سکتا ہے حقیقت اس سے بھی بہت آگے ہے جیسے انسان کبھی پا نہیں سکتا وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا (اور وہ اپنے علم کے ذریعہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتے)

خیر و شر کی حقیقت

کائنات میں حسن اور قبح دونوں نمایاں ہیں۔ اچھائی اور برائی ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ عدل کے ساتھ ظلم ہے، سچائی کے ساتھ جھوٹ ہے اور نیکی کے ساتھ بدی پائی جاتی ہے لیکن خدا کمال سے متصف ہے۔ اس کی طرف کسی قسم کے نقص کا انتساب صحیح نہیں ہے۔ اس کو صرف اسماء حسنیٰ سے یاد کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس کا کوئی برا نام نہیں ہے۔

قُلِ ادْعُوا اللَّهَ أَوِ ادْعُوا الرَّحْمَٰنَ　　تم اس کو اللہ کہو یا رحمٰن جس نام سے بھی تم پکارو
أَيًّا مَّا تَدْعُوا فَلَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ (بنی اسرائیل ۱۱۰)　　سارے اسماء حسنیٰ اسی کے لیے ہیں۔

خدا کو ہم اس کی کسی مخلوق پر قیاس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ مخلوق اپنے اندر کمال کے ساتھ نقص بھی لیے ہوئے ہے اور خدا ان تمام نقائص سے پاک ہے جو کسی بھی مخلوق میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے لیے ایک اونچی مثال چاہیے جو کائنات میں کہیں نہیں ہے۔ کوئی عظمت اس کی عظمت کو بیان نہیں کر سکتی۔ کسی رفعت اور بلندی سے اس کی بلندی کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

وَلَهُ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ　　اور اسی کے لیے آسمانوں اور زمین میں سب سے
وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (الروم ۲۷)　　اونچی مثال ہے اور وہ غالب اور حکمت والا ہے

دوسری جگہ فرمایا :-

وَلِلَّهِ الْمَثَلُ الْأَعْلَىٰ وَهُوَ الْعَزِيزُ　　اور اللہ ہی کے لیے اونچی مثال ہے اور وہ غالب
الْحَكِيمُ (النحل ۶۰)　　اور حکمت والا ہے

کائنات میں جو خیر و خوبی ہے اور جو حسن و جمال ہے وہ خالقِ کائنات کے خیر و خوبی اور حسن و جمال پر دلالت کرتا ہے لیکن یہاں جو نقص ہے ہم اس کو خدا کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ آپ کے اندر جو پاکیزہ اوصاف پائے جاتے ہیں وہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ خدا بھی یہ اوصاف رکھتا ہے لیکن اگر آپ کے اندر برے اوصاف پائے جاتے ہیں تو یہ آپ کی ذات تک محدود ہیں، خدا ان سے پاک ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں :-

ان اللہ سبحانہ لا یجوز ان یدخل	خدائے تعالیٰ اور کسی بھی دوسری چیز کو "قیاس شمول"
ھو وغیرہ تحت قیاس الشمول الذی	کے تحت لانا صحیح نہیں ہے کیونکہ اس قیاس میں افراد
تستوی افرادہ ولا تحت قیاس التمثیل	مساوی ہوتے ہیں۔ نہ تو خدا کو "قیاس تمثیل" کے ذریعہ
الذی یستوی فیہ حکم الاصل و	سمجھا جا سکتا ہے جس میں کہ فرع اور اصل کا حکم ایک
الفرع فان اللہ تعالیٰ لیس کمثلہ شیء	ہوتا ہے۔ کیونکہ کوئی بھی چیز اس کی مانند نہیں ہے۔ نہ تو
لا فی نفسہ المقدسۃ المذکورۃ باسمائہ ولا	اس کی ذات میں جس کا ذکر اس کے اسماء کے ذریعہ ہوا
فی صفاتہ ولا فی افعالہ ولکن یسلک	ہے اور نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے افعال میں۔
فی شانہ قیاس الاولیٰ کما قال	اس طرح کے قیاسات سے ہٹ کر خدا کے بارے میں
تعالیٰ وَلِلّٰہِ الْمَثَلُ الْاَعْلٰی فانہ من	قیاس اولیٰ سے کام لیا جائے گا جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا
المعلوم ان کل کمال ونعت ممدوح	ارشاد ہے کہ اللہ کے لیے سب سے اونچی مثال ہے کیونکہ
لنفسہ لا نقص فیہ یکون لبعض الموجودات	یہ بات معلوم ہے کہ ہر کمال یا اچھی صفت جس میں کوئی
المخلوقۃ المحدثۃ فالرب الخالق الصمد	نقص نہ ہو اگر کسی چیز میں پایا جاتا ہے جو کہ حادث اور
القیوم القدیم الواجب الوجود	مخلوق ہے تو خدائے تعالیٰ جو خالق و بے نیاز ہے، کائنات
بنفسہ ھو اولیٰ بہ وکل نقص و	جس کی ذات سے قائم ہے، جو قدیم اور واجب ہے،
عیب یجب ان ینزہ عنہ بعض	بدرجہ اولیٰ وہ کمال اس میں موجود ہوگا۔ اور ہر نقص اور
المخلوقات المحدثۃ الممکنۃ فالرب	ہر عیب جس سے کہ کسی بھی مخلوق کو پاک ہونا چاہیے جو کہ
الخالق القدوس السلام القدیم	حادث و ممکن ہے، بدرجہ اولیٰ خدا اس سے پاک ہے کیونکہ وہ
الواجب الوجود بنفسہ ھو اولیٰ بان ینزہ عنہ[1]	خالق، بے عیب، سلامتی والا، قدیم اور واجب الوجود ہے

خدا کی صفات کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے ایک دوسرے مقام پر امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں کہ جن صفات میں صرف مدح اور خیر کا پہلو نکلتا ہے قرآن، خدا کے لیے مطلقاً ان کا استعمال کرتا ہے لیکن جن صفات میں خیر اور شر دونوں پہلو موجود ہیں خدا کے حق میں وہ ان ہی پہلوؤں کا استعمال کرتا ہے جن سے خیر کا اظہار ہوتا ہے۔

الاسماء الحسنیٰ المعروفۃ ھی التی	معروف اسماء حسنیٰ وہی ہیں جن سے کہ اللہ تعالیٰ کو

---

[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیۃ ص [illegible]

یلیق باللہ بہا وھی التی جاءت فی الکتاب والسنۃ وھی التی تقتضی نفسہا المدح والثناء والعلم والقدرۃ والرحمۃ ونحو ذالک ھی فی نفسہا صفات مدح والاسماء الدالۃ علیہا اسماء مدح واما الکلام والارادۃ فلما کان جنسہ ینقسم الی محمود کالصدق والعدل والی مذموم کالظلم والکذب واللہ تعالیٰ لا یوصف الا بالمحمود دون المذموم جاء ما یوصف بہ من الکلام والارادۃ فی اسماء تخص المحمود کاسمہ الحکیم والرحیم والصادق والمومن والشہید والرؤف والحلیم والفتاح ونحو ذالک مما یتضمن معنی الکلام[1]	یاد کیا جاتا ہے جن کا ذکر کتاب وسنت میں ہے۔ یہ وہ اسماء ہیں جو فی نفسہٖ مدح وثنا کا تقاضا کرتے ہیں، علم، قدرت اور رحمت وغیرہ بذات خود تعریف کی صفات ہیں اور جو اسماء ان صفات پر دلالت کرتے ہیں وہ اسماء مدح ہیں اس کے برعکس کلام اور ارادہ پسندیدہ و ناپسندیدہ دونوں ہو سکتے ہیں مثلاً سچائی اور انصاف یا ظلم اور جھوٹ۔ اللہ تعالیٰ صرف اچھی صفات ہی سے متصف کیا جا سکتا ہے اس لیے قرآن وحدیث میں جب کبھی کلام اور ارادہ کو خدا کے حق میں استعمال کیا گیا ہے تو ایسے اسماء کی شکل میں جن میں مدح کا پہلو پایا جاتا ہے جیسے حکیم، رحیم، صادق، مومن، شہید، رؤف، حلیم، فتاح وغیرہ۔ یہ وہ اسماء ہیں جن میں کلام اور ارادہ کے معنی پائے جاتے ہیں۔

اس دنیا میں موت بھی ہے اور زندگی بھی، صحت بھی ہے اور بیماری بھی، خوشی بھی ہے اور غم بھی لیکن قرآن کہتا ہے کہ آپ جن مصیبتوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوتے ہیں وہ آپ کے کسی نہ کسی نقص کا نتیجہ ہیں اور اگر آپ کو خوشی اور راحت نصیب ہوتی ہے تو یہ خدا کا فضل ہے۔ اس کی نعمت اور احسان ہے جو آپ کو ملا ہے۔

مَا اَصَابَکَ مِنْ حَسَنَۃٍ فَمِنَ اللّٰہِ وَمَا اَصَابَکَ مِنْ سَیِّئَۃٍ فَمِنْ نَّفْسِکَ (النساء - ۷۹)	جو بھی بھلائی تمہیں ملتی ہے وہ خدا کی طرف سے ملتی ہے اور جو برائی تمہیں پہنچتی ہے تو وہ تمہاری ذات کی طرف سے پہنچتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ فرماتے ہیں:۔

وَاِذَا مَرِضْتُ فَھُوَ یَشْفِیْنِ (الشعراء - ۸۰) اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو شفا وہ دیتا ہے۔

خدا کو بلند و برتر تسلیم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اسے تمام نقائص سے پاک مانا جائے اس کے بغیر خدا کے بارے میں بلندی کا تصور مکمل نہیں ہوتا۔ خدا کا ہر نقص سے پاک ہونا اور اس کے اندر تمام صفات کمال کا موجود ہونا لازم و ملزوم

---
[1] شرح العقیدۃ الاصفہانیہ ص۲۲

ہے۔ قرآن میں حکم ہے :-

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى ۝ (الاعلیٰ-۱)　　پاکی بیان کرو اپنے رب کی جو سب سے بلند ہے۔

اس آیت میں دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ خدا کی تسبیح کی جائے، دوسرے یہ کہ خدا سب سے بلند و برتر ہے۔ جو شخص اپنی زبان سے سبحان اللہ کہے اس کے اندر یہ احساس ابھرنا چاہیے کہ خدا ہر نقص سے پاک ہے۔ لغزش اور کوتاہی اس سے ہو نہیں سکتی۔ اس کا ہر عمل خیر ہی خیر ہے، اس میں کسی غلطی اور کسی خامی کی نشان دہی نہیں کی جا سکتی۔ جس شخص کے اندر یہ احساس ابھرے گا وہ خود بخود پکار اٹھے گا کہ خدا سب سے بلند ہے، عظمت اور رفعت اسی کے لیے ہے۔ اس کے بارے میں نقص اور پستی کا تصور صحیح نہیں ہے۔

خدا نقائص سے کیوں پاک ہے؟

ہم اس حقیقت کو تسلیم کر چکے ہیں کہ کائنات میں خدا کی صفات اور خصوصیات منتقل ہوئی ہیں۔ اس لیے آپ کہیں گے کہ کائنات میں جو عیوب اور نقائص ہیں ان کو بھی خدا ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے۔ یہ بات صحیح نہ ہوگی کہ ہم خدا کو صرف خیر کا سرچشمہ مانیں اور برائیوں سے یکسر اسے پاک قرار دیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کائنات محدود ہے اس لیے ایک خاص حد ہی کے اندر خدا کی صفات کا اس میں ظہور ہوا ہے۔ یہاں کسی بھی چیز کو جو قوتیں اور صلاحیتیں ملی ہیں وہ محدود ہیں۔ حد سے زیادہ اور غیر محدود کوئی قوت اسے نہیں ملی ہے۔ یہی محدودیت اس کے نقص کا سبب ہے۔ خدا کی ذات چونکہ محدودیت سے ناآشنا ہے اس لیے وہ نقص سے پاک ہے۔ پانی تالاب اور گڑھے میں گدلا ہو جاتا ہے لیکن یہی پانی دریا اور سمندر میں گدلا نہیں ہوتا اور صاف و شفاف رہتا ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال کے ذریعہ واضح کیا جا سکتا ہے۔ خدا صاحب علم ہے انسان کو اس کے علم کا تھوڑا سا حصہ ملا ہے۔ وہ کچھ چیزوں کو جانتا ہے تو بہت سی چیزوں کو نہیں جانتا۔ لیکن انسان کے اس جہل کی وجہ خدا کے علم کا نقص نہیں ہے بلکہ خود انسان کا نقص ہے۔ وہ اپنی صلاحیت اور قوتِ استعداد کے لحاظ سے علم کے ایک خاص حصہ ہی کا حامل ہو سکتا ہے۔ اسی مثال پر آپ پوری کائنات کو قیاس کر سکتے ہیں۔ یہاں کی ہر چیز میں خیر ہے لیکن یہ خیر خاص دائرے میں ہے۔ اس دائرے سے باہر وہ ختم ہو جاتا ہے۔ کسی ڈیم سے اتنی ہی بجلی پیدا ہو سکتی ہے جتنی اس میں طاقت ہے، اس سے زیادہ بجلی وہ پیدا نہیں کر سکتا۔ گویا کائنات کی اصل حالت خیر کی حالت ہے۔ شر ایک سلبی صفت ہے جو خیر کے نہ ہونے کا نام ہے۔

یہاں ایک سوال ابھرتا ہے۔ وہ یہ کہ شر کا سبب اگر محدودیت ہے تو محدودیت بھی خدا ہی کی پیدا کردہ ہے

کائنات کی حدیں توڑ دی جاتیں اور وہ لامحدود ہوتی تو شر سے خالی ہوتی اس لیے خدا کی طرف شر نہ بھی منسوب کیا جائے تو کیا اس پر محدودیت کے پیدا کرنے کا الزام نہیں آتا ؟

یہ سوال ختم ہو جاتا ہے اگر آپ اس پر اس پہلو سے غور کریں کہ کائنات میں بلاشبہ محدودیت ہے لیکن اس محدودیت کے پیچھے خدا کی زبردست حکمت اور مصلحت کام کر رہی ہے۔ یہ حکمت بے پایاں اور لامحدود ہے جس کو کوئی بھی شخص پوری طرح پا نہیں سکتا۔ کائنات کی محدودیت کو خدا کی لامحدود حکمت کے ساتھ اگر ملا دیا جائے تو یہ محدودیت ختم ہو جائے گی اور وہ ایک لامحدود حقیقت میں تبدیل ہو جائے گی۔ کائنات کی محدودیت میں نقص اس لیے نظر آ رہا ہے کہ خود ہماری نگاہ محدود ہے اور ہمارے سامنے خدا کی وسیع تر حکمتیں نہیں ہیں۔ اگر ان حکمتوں کی روشنی میں ہم کائنات کا مطالعہ کر سکیں تو وہ سراسر خیر معلوم ہوگی۔

قرآن میں یہ بات بار بار کہی گئی ہے کہ خدا کی ہر صفت بے پایاں ہے۔ اس کے پاس جو کچھ ہے وہ غیر محدود ہے لیکن کائنات جس شکل میں اس وقت موجود ہے اس کو اسی شکل میں باقی رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ خدا اپنے نہ ختم ہونے والے خزانوں سے ہر چیز کو ایک خاص مقدار میں نازل کرے۔ ورنہ کائنات کا موجودہ نقشہ بدل جائے گا۔ نقشہ ہی نہیں بدلے گا بلکہ اس کے ساتھ وہ مقصد بھی ختم ہو جائے گا جس کے لیے یہ کائنات بنی ہے۔ کیونکہ اس مقصد سے یہی نقشہ مناسبت رکھتا ہے، کوئی دوسرا نقشہ اس سے ہم آہنگ نہیں ہے۔

وَإِنْ مِّنْ شَيْءٍ إِلَّا عِندَنَا خَزَائِنُهُ	کوئی بھی چیز ایسی نہیں ہے جس کے خزانے
وَمَا نُنَزِّلُهُ إِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُومٍ	ہمارے پاس نہ ہوں لیکن ہم اس کو ایک خاص
(الحجر: ۲۱)	مقدار میں اتارتے ہیں۔

خدا "خلاق" ہے۔ اس کی قوت تخلیق کی کوئی انتہا نہیں لیکن یہ کائنات ایک خاص حد ہی کے اندر تخلیق کو برداشت کر سکتی ہے۔ اس سے زیادہ کی وہ متحمل نہیں ہو سکتی ورنہ نظم کائنات درہم برہم ہو جائے گا۔ اسی لیے خدا کی صفت تخلیق کا ظہور ایک محدود پیمانے پر ہوا ہے اور کوئی بھی مخلوق یہاں حد سے بڑھی ہوئی نہیں ہے۔

إِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنَاهُ بِقَدَرٍ۔ (القمر: ۴۹) ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے کے مطابق پیدا کیا ہے۔

مال و دولت کو دنیا خیر سمجھتی ہے۔ خدا کے پاس اس کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ اگر چاہے تو ہر شخص کو شہنشاہ وقت بنا سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کے سر میں تکبر اور گھمنڈ کی ہوا بھر جائے اور فتنہ و فساد پھوٹ پڑے — خدا کائنات کو اس سے بچانا چاہتا ہے اس لیے اس نے یہاں امارت و افلاس میں ایک خاص تناسب رکھا ہے۔ وَلَوْ بَسَطَ اللَّهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهِ لَبَغَوْا فِي الْأَرْضِ وَلَٰكِن يُنَزِّلُ بِقَدَرٍ

مَا یَشَاءُ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ○ الشوریٰ: ۲۷ (اور اگر اللہ تعالیٰ رزق کو پھیلا دے تو وہ زمین میں بغاوت کر بیٹھیں گے اس لیے اللہ ایک اندازے کے مطابق جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔ یقیناً وہ اپنے بندوں کی خبر رکھتا ہے اور ان کو دیکھتا ہے)

ایک قوم اگر بلندی پر پہنچ رہی ہے تو آپ کے نزدیک وہ خیر کو پا رہی ہے۔ دوسری قوم پستی میں چلی جاتی ہے تو آپ کہیں گے کہ شر اس کے حصے میں آیا ہے۔ لیکن جس خدا کے ہاتھ میں عروج و زوال اور عزت و ذلت کا فیصلہ ہے، وہ کبھی شر سے آلودہ نہیں ہوتا۔ اس سے خیر ہی کا صدور ہوتا ہے۔ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ آل عمران: ۲۶ (تم کہو، اے اللہ! سلطنت کے مالک، تو جسے چاہتا ہے سلطنت عطا کرتا ہے اور جس سے چاہتا ہے سلطنت چھین لیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے ساری بھلائی تیرے ہاتھ میں ہے تو ہر چیز پر قادر ہے۔)

بہت سے اعمال جنھیں ہماری محدود نگاہ غلط سمجھتی ہے وہ اپنے وسیع تر تقاضوں کے تحت صحیح ہوتے ہیں بلکہ بظاہر وہ جس قدر نا روا اور غیر مستحسن معلوم ہوتے ہیں واقعہ کے لحاظ سے وہ اسی قدر ضروری اور پسندیدہ قرار پاتے ہیں۔ فرد اگر قتل کا ارتکاب کرتا ہے تو یہ جرم ہے لیکن یہی جرم قابل تعریف سمجھا جاتا ہے جب کہ اس کا نفاذ کسی عدالت سے ہوتا ہے۔ یہ فرق اس لیے ہے کہ فرد کی نگاہ محدود ہے وہ صرف اپنے مفاد کو دیکھتا ہے لیکن عدالت کی نظر وسیع ہوتی ہے اس کے سامنے پورے سماج کا فائدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح خدا کے بہت سے اعمال جو ہماری کم نگاہی سے غلط یا خلاف مصلحت ہوتے ہیں اس کی وسیع تر مصلحتیں ان کے صحیح ہونے کا فیصلہ کرتی ہیں۔ چنانچہ اگر وہ کسی ایک فرد کو نہیں بلکہ پوری قوم کو بھی ہلاک کر دے تو سزاوار حمد ہوگا۔ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَقِيْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ الانعام: ۴۵ (پھر جن لوگوں نے ظلم کیا ان کی جڑ کاٹ دی گئی۔ اور (ہر طرف سے) کہا گیا کہ سب تعریف اللہ کے لیے ہے جو تمام عالموں کا رب ہے) وہ جو بھی فیصلہ کرتا ہے حق و صداقت اور عدل و انصاف پر مبنی ہوتا ہے۔ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ○ حم السجدہ ۴۶ (اور تیرا رب بندوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا)

اس پہلو سے آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ خیر و شر ہماری نسبت سے ہے خدا کی نسبت سے خیر ہی خیر ہے۔ اس کے کاموں میں شر کسی بھی پہلو سے داخل نہیں ہوتا۔ لَهُ الْحَمْدُ فِي الْاُوْلٰى وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ

الیہ ترجعون ○ القصص: ۷۰ (اسی کے لیے ہے حمد ابتدا میں بھی اور انتہا میں بھی اسی کے ہاتھ میں فیصلہ کا اختیار ہے اور اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔)

خدا کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں یہ حقیقت اور زیادہ واضح الفاظ میں موجود ہے۔ رات کی تنہائیوں میں آپ جو دعائیں کرتے تھے ان میں سے ایک دعا کے بعض الفاظ یہ ہیں:۔

وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ وَالشَّرُّ	اور بھلائی ساری کی ساری تیرے ہاتھ میں ہے اور
لَيْسَ إِلَيْكَ أَنَا بِكَ وَإِلَيْكَ	برائی تو وہ تیری طرف نہیں جاتی میرا وجود تجھ سے ہے اور
تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ ۔	تیری ہی طرف مجھے جانا ہے تو بڑا بابرکت اور بلندی و
(مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب صلوٰۃ النبی و دعائہ باللیل)	عظمت والا ہے

جو بھی شخص اشیاء کے نقص اور محدودیت پر غور کرے گا وہ بے اختیار پکار اٹھے گا کہ خدایا تو ہر عیب سے پاک ہے، ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے۔ شر ہماری ذات میں ہے اور تو سرچشمۂ خیر ہے تجھ سے محض خیر ہی وجود میں آسکتا ہے۔

شرائطِ ایجنسی

(۱) ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

(۲) رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ غیر فروخت شدہ رسائل واپس نہیں لیے جائیں گے۔

(۳) کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا البتہ ۵۰ یا زائد رسائل کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی دیا جائے گا۔

(۴) رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری، وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

(۵) رقم پیشگی آنی چاہیے یا رسائل بذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ وی پی میں مصارف زیادہ ہوں گے۔

منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

اجتماعِ اَضداد کی چند مثالیں

(جناب سلطان مبین صاحب ایم اے سنسکرت)

فاضل مقالہ نگار نے ہندستان کی قدیم مذہبی کتابوں کے مستند حوالوں سے انسانی زندگی کے اہم مسائل میں ان کی اختلاف بیانی اور اجتماع اضداد کی متعدد مثالیں جمع کی ہیں، اس سلسلے میں انھوں نے اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ شرک چونکہ بے بنیاد اور من گھڑت چیز ہے اس لیے زمانے کے حالات اور عوام میں کسی چیز کی مقبولیت و نامقبولیت کی بنیاد پر ائمہ شرک نے بہت سی چیزوں کو مذہب میں داخل یا اس سے خارج کیا ہے، اور اس طرح ان کی مرتب کردہ کتابیں متضاد بیانات سے بھری ہوئی ہیں گزشتہ شمارے میں خانہ داری اور رہبانیت نیز نکاح اور تجرد وطلاق کی مثالیں گزر چکی ہیں اسی سلسلے کی چند مثالیں اس شمارے میں دی جا رہی ہیں۔ (ادارہ)

گوشت خوری اور ترک گوشت

اندو آرین گوشت خوری سے پرہیز کرتے تھے۔ یگیہ کے موقع پر بالعموم دیوتاؤں کے لیے گوشت و چربی اور سوم بطور طعام و شراب پیش کیے جاتے تھے۔ دیوتاؤں کی معیت میں پروہت و صاحب یگیہ شوربہ اور شراب پیتے تھے، مگر رہبانیت کے اثرات کی وجہ سے متاخرین برہمنوں نے گوشت سے توبہ کر لینے ہی میں مصلحت دیکھا۔ متقدمین گوشت خوری کے اندر علم و اقبال کی سربلندی دیکھتے ہیں اور ماکول و غیر ماکول اللحم کی تشریح کرتے ہیں۔

عل (۱۳) جو چاہتا ہے کہ میرا لڑکا گورا، ایک وید کا عالم اور پوری عمر تک جینے والا ہو تو شیر برنج پکوا کر گھی ملا کر شوہر اور بیوی کھائیں۔ ایسا لڑکا پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ (۱۴) اور جو چاہتا ہے کہ میرا لڑکا زرد اور دو ویدوں کا عالم اور پوری عمر تک جینے والا ہو تو دہی چاول پکا کر گھی ملا کر شوہر و بیوی کھائیں، ایسا لڑکا پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ (۱۵) اور جو چاہتا ہے کہ میرا لڑکا سیاہ فام اور سرخ

ہم تینوں ویدوں کا عالم پوری عمر تک جینے والا ہو تو وہ سادہ چاول پکوا کر گھی مل شوہر و بیوی کھائیں۔ ایسا لڑکا پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ (۱۶) اور جو چاہتا ہے کہ میری لڑکی فاضلہ اور پوری عمر جینے والی ہو تو تل اور چاول پکوا کر گھی ملا کر شوہر و بیوی کھائیں ایسا لڑکا پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

(۱۷) اور جو چاہتا ہے میرا لڑکا علامہ مجلسوں میں جانے کے قابل شیریں کلام اور سب ویدوں کا عالم پوری عمر کا جینے والا ہو تو وہ پلاؤ پکوا کر گھی ملا کر شوہر اور بیوی کھاویں۔ ایسا لڑکا پیدا کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ بدھیا یا سانڈ بیل کے گوشت سے (پکا ہوا پلاؤ) شت پتھ برہمن: ۱۴: ۹: ۴: ۱۴-۱۷ یا برہد آرنیک اپنی شد ۶: ۴: ۱۳: ۱۴ دیگر (۷) (کھیر، پوری، برا وغیرہ سبھی اناجوں اور میٹھا، تیتا اور کھٹا وغیرہ سبھی مزوں کے کھانوں سے۔ چھٹے مہینے بچہ کا چٹاون کرے) گویائی کا خواستگار کبار دوانج (پرندہ) کے گوشت سے (چٹاون کرے)۔ (۸) اناج کا خواستگار تیتر کے گوشت سے۔ (۹) تیز رفتاری کا خواستگار مچھلی کے گوشت سے (۱۰) درازی عمر کا خواستگار پارل کے گوشت سے۔ (۱۱) برہم تیج کا خواستگار آڑی کے گوشت سے۔ (۱۲) سب کا خواستگار (باری باری) سب کے گوشت سے۔ پارسکر گرہ سوتر: ۱: ۱۹: ۷ — ۱۲ دیگر

۲۔ پانچ ناخن والے پانچ ہی جانور برہمن، کشتری اور ویش کے لیے ماکول ہیں۔ مہابھارت: شانتی: ۱۴۱: ۷۰ دیگر

جب تم نقد کی سند مانتے ہو تو غیر ماکول کھانے کا خیال ترک کر دو۔ ساہی، گینڈا، گوہ، کچھوا اور خرگوش پانچ ناخن والے جانوروں میں ماکول کہے گئے ہیں اور اونٹ کے علاوہ ایک طرف دانت والے جانور ماکول کہے گئے ہیں۔ منوسمرتی: ۵: ۱۸ دیگر

(۳۷) راگھو! پانچ ناخن والے پانچ جانور برہمن اور کشتری کے لیے ماکول ہیں۔ ساہی، گوہ، خرگوش اور پانچواں کچھوا۔ (۳۸) رشی لوگ میرے (بالی نام والے بندر) چمڑے اور ہڈی کو نہیں چھوتے ہیں۔ میرا (بندر) کا گوشت غیر ماکول ہے۔ ایسا پانچ ناخن والا میں کیوں مارا گیا۔ بالمیکی رامائن: کشکندھا: ۱۷: ۳۷، ۳۸ دیگر۔ بغیر ستہنہ کی مچھلیاں برہمنوں کے لیے غیر ماکول ہیں۔ کچھوا کے علاوہ دوسرے مینڈک وغیرہ چار پیر کے آبی جاندار۔ مہابھارت: شانتی: ۳۶: ۲۲ دیگر پڑھنا اور راہو (خداوندی کی نذر اور (اجداد کی نیاز میں مستعمل ہیں۔ راجیو سنہ تنڈا اور سنہ دار مچھلیاں بھی نذر و نیاز میں قابل استعمال ہیں۔ منو: ۵/۱۶

دیگر ڈاڑھ والے گوشت خور چوپائے اور گوشت خور پرندے اور پھر دونوں طرف دانت والی اور چار ڈاڑھ والے سبھی جانور غیر ماکول ہیں۔ مہابھارت: شانتی: ۳۶: ۲۴

دیگر سبھی گوشت خور اور گاؤں میں رہنے والے پرندے، فیرا کول اور ایک سم والے جانوروں اور ٹٹہری کو چھوڑ دینا چاہیے۔ منوسمرتی: ۵ : ۱۱ ــــ اور بعد میں جب جینیوں، بودھوں نے اہنسا کا راگ الاپا تو گوشت خوری کی مخالفت کرنے لگے (۲۸) پرجاپتی نے اس سب کو جانداروں کی خوراک بنایا ہے۔ جامد و متحرک سبھی جانداروں کی خوراک ہیں۔ (۲۹) غیر متحرک چیزیں متحرک جانوروں کی خوراک ہیں۔ بغیر انیاب والے مویشی انیاب (نوک دار دانت) والے درندوں کی خوراک ہیں۔ (۳۰) کھانے کے قابل جانوروں کو روز بروز کھاتا ہوا آکل گنہگار نہیں ہوتا۔ کیونکہ آکل و ماکول جانوروں کو خدا وند ہی نے پیدا کیا ہے۔ (۳۱) یگیہ میں گوشت خوری ملکوتی طریقہ ہے اور اس کے سوا دوسرا طریقہ شیطانی ہے۔ (۳۲) خود پیدا کیے ہوئے یا تحفے میں ملے ہوئے گوشت کو دیوتاؤں اور پتروں کی نذر و نیاز گذار کر گوشت کھانے میں گناہ نہیں۔ منوسمرتی: ۵ : ۲۸-۳۲۔ دیگر ۱۴ لوگ کاشتکاری کو پاک و صاف سمجھتے ہیں۔ وہاں بھی بڑی ہنسا ہے۔ ہل جوتتا ہوا آدمی پھال سے زمین میں رہنے والے بہتیرے جانداروں اور دیگر جانداروں کو قتل کرتا ہے اس کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ (۱۵) برہمن اناج کے دانے جن کو لوگ دھان وغیرہ کہتے ہیں یہ سب جاندار ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ (۱۶) لوگ کاٹ چھانٹ کر جانوروں کو مارتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ برہمن اسی طرح لوگ درختوں اور پودوں کو کاٹتے چھانٹتے ہیں۔

(۱۷) برہمن! درختوں، پھلوں اور پانیوں میں بہت سے جاندار ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ (۱۸) برہمن! گوشت خور جانداروں سے دنیا بھری ہوئی ہے۔ مچھلیاں مچھلیوں کو نگل جاتی ہیں۔ اس بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ (۱۹) بزرگ برہمن! جاندار جانوروں پر زندگی گزارتے ہیں جاندار ایک دوسرے کی خوراک ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ (۲۰) زمین پر بستے والے جانداروں کو آدمی چلتا ہوا دونوں پاؤں سے کچلتا رہتا ہے۔ برہمن! آپ کا کیا خیال ہے؟ (۲۱) دانستہ نادانستہ آدمی سوتے بیٹھتے بے شمار جانداروں کو مارتا رہتا ہے۔ وہاں آپ کا کیا خیال ہے؟ یہ زمین و آسمان جانداروں سے لبریز ہیں، آدمی نادانستہ ان کو مارتا رہتا ہے۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ (۲۳) پرانے زمانے میں خبط الحواس لوگوں نے اہنسا کی بات چھیڑی تھی۔ دنیا میں کون جانداروں کو قتل نہیں کرتا۔ برہمن! (۲۴) برہمن! اہنسا پر جٹے رہنے والے پرہیزگار بھی ہنسا کرتے ہیں۔ کوشش کرنے سے ہنسا کم تر ہو سکتی ہے۔ (۲۸) بزرگ برہمن! دنیا میں بہت سی نیکی آمیز بدیاں جیسی الٹی باتیں دکھائی پڑتی ہیں۔ اس بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ (۲۹) نیکی اور بدی کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے جو اپنے کام میں مشغول

[illegible] ۲۰۸ : ۲۸-۲۹

(۳) جان بچانے کے لیے اور نکاح کے وقت دروغ بیانی کرنی چاہیے اس جگہ جھوٹ سچ بن جاتا ہے اور سچ جھوٹ کی طرح گناہ کا موجب ہوتا ہے۔

(۴) جس صداقت سے عوام کا فائدہ ہو وہ صداقت نیکی ہے اور اس کا برعکس بدی ہے۔ دھرم کی اس باریکی پر غور کریں۔

مہابھارت: بن پرب: ۲۰۹: ۳، ۴

مگر ہنسا کا سیلاب اتنا اونچا اٹھا کہ اس نے خطرے کا نشان چھوڑ دیا تو مجبوراً برہمنوں نے بھی گوشت خوری سے توبہ کر کے کہا!

منوسمرتی (۴۸) جانداروں کی ہنسا کے بغیر گوشت کہیں نہیں ملتا اور نہ جانوروں کا ذبح جنت کا موجب ہے اس لیے گوشت چھوڑ دیے

(۴۹) گوشت کی پیدائش اور جانداروں کے بند و کشت کو دیکھ کر جملہ گوشتوں کے کھانے سے برگشتہ ہو جائے

(۵۰) شیطان کی طرح جو بے قاعدہ گوشت نہیں کھاتا وہ دنیا میں عزت پاتا ہے اور بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔

۵۱۔ رائے دینے والا، حکم دینے والا، ذبح کرنے والا، خریدنے والا، پکانے والا، لگانے والا، کھانے والا سب کے سب قاتل ہیں

۵۲۔ دیوتاؤں اور اجداد کو نہ چڑھا کر جو دوسرے کے گوشت سے اپنا جسم موٹا کرنا چاہتا ہے اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا گنہگار نہیں

۵۳۔ سال بسال سو برس تک جو اشومیدھ یگیہ کرے اور دوسرا جو گوشت نہیں کھاتا ان دونوں کا ثواب برابر ہے

منوسمرتی: ۵: ۴۸۔۵۳

مہابھارت (۲۴) گوشت بھوسہ لکڑی اور پتھر سے پیدا نہیں ہوتا۔ جاندار کے مارنے سے گوشت ملتا ہے اس لیے گوشت کھانے میں گناہ ہے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۱۵: ۲۴

(۵۷) جو لوگ باری باری ایک ایک ماہ یا ایک ایک (سفید) پاکھ گوشت چھوڑ دیتے ہیں۔ ان ہنسا نہ کرنے والے کو برہم لوک ملتا ہے۔ ۱۱۵: ۵۷

(۲۵) دیوتا سوا ہا اور سودھا کی امرت کھاتے ہیں اور سچائی اور سیدھے پن کو پسند کرتے ہیں۔ گوشت خور تو راکشس ہیں وہ جھوٹ اور کجی کو پسند کرتے ہیں۔ 〃 〃 ۲۵

(۳۸) لانے والا، رائے دینے والا، ذبح کرنے والا، بیچنے والا، خریدنے والا، پکانے والا، کھانے والا سبھی گوشت خور ہیں 〃 〃 ۳۸

(۵۳) جو پورے سو سال تک تپ کرے اور جو دوسرا گوشت نہیں کھاتا میرے نزدیک برابر ہیں۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۱۵: ۵۳

(۱۴) جو شخص ماہ بماہ سو سال تک اشومیدھ یگیہ کرتا ہے اور دوسرا جو گوشت نہیں کھاتا میرے نزدیک دونوں برابر ہیں۔

مہابھارت: انوشاسن: ۱۱۵: ۱۴

بعد کی اس مرعوب ذہنیت کو چھوڑ دیں تو ہندو گوشت خوری یہود گوشت خوری کے متوازی ہے (دیکھیے۔ استثنا: ۱۴: ۷۔۲۰) حرمت و حلت کے یہ حوالے تضاد کی یاد دلاتے ہیں۔

خودکشی کی حرمت و استحسان نکاح و گوشت خوری کی ضرورت و حرمت کے بعد خود زندگی کے بارے میں ال

لیجیے۔ رہبانیت کہتی ہے کہ دنیا آلام گاہ ہے۔ لازماً اپنا جسم اپنی زندگی بھی ایک سکندر ہوس والم ہے۔ اس کمند کو توڑ ڈالنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ یونانی حکماء اور مسیحی راہب بھی خودکشی کو شہادت کا درجہ دیتے تھے خصی ہونا۔ انکھ پھوڑ لینا اسی فکر رہبانی کی معمولی کرشمہ سازی ہے۔ مگر دنیادار تو جسم و زندگی کو بساغنیمت جانتا ہے۔ دنیادار کے لیے بھی زندگی جسم بہرحال قابل قدر جوہر ہیں۔ ایک مسلمان کے لیے جسم آخرت کا کھیت جتنے والا ٹریکٹر ہے جو اس کو امانتہً ملا ہے۔ اس کو اس جسمانی موٹر کے کسی پرزہ کو نقصان پہنچانے کا حق نہیں پہنچتا۔ نہ اس کو اس بات کی اجازت ہے کہ وہ اس موٹر کو ہر سڑک پر دوڑاتے نہ وہ مجاز ہے کہ اس موٹر پر نجاستوں کا بوجھ لاد کر موٹر کی صلاحیت و استعداد کو ضائع کرے نہ اسے حق پہنچتا ہے کہ وہ پوری گاڑی کو کسی غار میں گرا کر چکنا چور کر دے۔ بس دنیادار اور مسلمان دونوں زندگی کو محترم مانتے ہیں اور خودکشی کو جرم و حرام سمجھتے ہیں۔ اور پھر خودکشی کی حرمت جہاد زندگی میں ثابت قدمی بخشتی ہے اور خودکشی کی حلت انسانوں کو فرار کا راستہ بتاتی ہے۔ خودکشی کے معاملہ میں ہندو متکلمین کبھی کبھی راہب بن جاتے ہیں اور دنیادار کبھی اس کو حلال و نجات بخش بتاتے ہیں اور کبھی حرام و موجب سزا۔ ھذا ھو اجتماع الضدین

حلت کے حوالہ جات چل چل کر مرنا۔ بیٹھے بیٹھے مرنا۔ ڈوب کر مرنا اور جل کر مرنا یہ چار قسم کی خودکشی موت کے خواستگاروں کے لیے ہے ٥ نیا کپڑا (کفن) اوڑھ کر اس کو کش کی رسی سے باندھ کر ہاتھ منہ دھو کر خودکشی کا عہد کرکے گاؤں کو چھوڑ دے اور کوئی پسندیدہ نیکی کرے اگر "چل چل کر مرنا" چاہتا ہے تو اتر جانب روانہ ہو جائے ٥ موت تک فاقہ کشی کرے۔ چپ چاپ ہو کر خودکشی کی نیت کرکے اپنی جان گنوا دے ٥ اس طرح وہ پاکوں کی پاک دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ اگر "بیٹھے بیٹھے مرنا" چاہتا ہے تو اسی طرح سے پاک ترین جگہ فاقہ کرتا ہوا لیٹ جائے ٥ بشنو کو یاد کرتا ہوا اپنی جان دے۔ اس طرح جسم چھوڑنے سے سورگ میں رونق افروز ہوتا ہے ٥ اگر "آگ میں گھسنا" چاہتا ہے تو اسی پاک طریقے سے تیرتھ میں یا ندی کے کنارے لکڑی کا ڈھیر لگا کر ٥ دیوتاؤں کا طواف و سجدہ کرکے پاک و صاف ہو کر نارائن کو یاد کرتا ہوا اور برہمنوں کو سلام کرکے آگ میں گھس جائے۔ وہ پاکبازوں کے عالم کو پا لیتا ہے ٥ اگر وہ پانی میں ڈوبنا چاہتا ہے تو اسی طریقے سے پاک و مشہور گھاٹ میں نیکیوں کو یاد کرتا ہوا اس طرح جان دینے سے عالم بالا کو پا لیتا ہے۔ صحیفہ اتری

منو شاستر: ۵/۴۵: ص ۲۳ مطبوعہ گیتا پریس گورکھپور

دیگر: ۴۸ پرہیزگاری کے بارہ سال گذار دینے کے بعد جو شخص فاقہ کرکے خودکشی کرتا ہے وہ سورگ کو جاتا ہے۔ ۴۹۔ پرہیزگاری کے بارہ سال گذار دینے کے بعد جو شخص سمندر میں ڈوب کر خودکشی کرتا ہے وہ [illegible] کی معیت کو پا لیتا ہے۔ ۵۰ [illegible] کرنے والا اپنے کو قابو میں رکھ کر [illegible] سے

دونوں پیروں کو توڑ کر خودکشی کرتا ہے تو وہ دیوتاؤں کے ساتھ مسرور ہوتا ہے۔ ۵۲۔ پرہیزگاری کے بارہ[12] سال گزار دینے کے بعد جو شخص روشن کردہ آگ میں خودکشی کرتا ہے وہ خداوند اگنی کی معیت کو پالیتا ہے۔ ۵۴۔ پرہیزگاری کے بارہ سال گذار دینے کے بعد جو شخص کندھے پر آگ پیدا کرنے والی دونوں لکڑیوں کو باندھ کر بغیر مڑے ہوئے آگے بڑھتا جاتا ہے۔ ۵۵۔ اور بہادروں کی طرح چلتا کھڑا ہوتا اور بیٹھتا ہے وہ شہادت کا درجہ پاتا ہے۔ اور وہ خداوند اِندر کی معیت پالیتا ہے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۲: ۴۸-۵۵-۴۸-۵۵

دیگر: (۱) جو شخص بڑے بڑے کبائر سے آلودہ ہو یا بڑی بڑی لاعلاج بیماریوں میں مبتلا ہو۔ (۲) عقلمند آدمی اپنی موت کا وقت آجانے پر یا برہم لوک یا جنت کو جیتنے کے ارادے سے۔ (۳) جلتی ہوئی آگ میں داخل ہوجائے اور رفاقہ کشی کرے۔ سب لوگوں کو ایسا کرنے کا اختیار ہے مگر دوسرے کاموں کا (اختیار نہیں ہے) (۴) سبھی ورن اور ذات کے مرد و عورت کو ہمیشہ ایسا کرنے کا اختیار ہے۔ دوسرے کاموں کا نہیں۔ پوران: بحوالہ شرح ملی تا تھی ملی رگھونلش: ۸: ۴۹

حرمت کے حوالے معلوم ہوتا ہے کہ پیری اور بیماری کی تکلیف سے بچنے کے لیے سنیاسوں نے خودکشی کے ان چار (ہمالیہ میں، تیرتھ میں، پانی میں اور آگ میں جان دینے) طریقوں کو تجویز کرلیا تھا۔ ہاں اگر لالچ و غصہ سے جان دیتا ہے تو وہ دوزخ کا مستحق ہے۔

"لالچ، غصہ اور رعونت سے جو خودکشی کرتا ہے وہ ابدی جہنم میں خودکشی کی وجہ سے جاتا ہے۔" مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۵۔ ص۲۳۸ مطبوعہ گیتا پریس گورکھپور۔

"وہ عالم بغیر سورج کے ہیں اور تاریکیوں سے گھرے ہوئے ہیں اس میں وہ لوگ جاتے ہیں جو خودکش ہوتے ہیں۔" یجروید ۴۰: ۳

جنگ و ترک جنگ رہبانیت ایک منفی طرز عمل ہے۔ یہ کچھ کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کے سامنے نہ کرنے اور فرار کا راستہ ہی ہے۔ یہاں کرنے میں گناہ ہے، نہ کرنے میں نیکی ہے۔ چنانچہ زندگی گناہ کا دھاگہ ہے۔ اس کو توڑ دینا ہی ثواب ہے پس انسانی زندگی کی حفاظت کے لیے زندگیوں کے قربان ہونے کا تصور ہی رہبانیت کے لیے ناقابل برداشت ہے۔ رہبانیت خودکشی تو کرسکتی ہے مگر جنگ کی اجازت نہیں دے سکتی۔ رہبانیت کے پیغام جنگ کی حرمت کے شدت سے قائل ہیں۔ وہ جنگ کے مناظر اور فوج کے جماؤ کو دیکھنے کو بھی ناجائز سمجھتے ہیں۔

(۴۸) جو کوئی بھکشوؤں کی کسی کام کے بغیر فوج کے جماؤ کو دیکھنے جائے تو (کفارہ والا گناہ ہے۔)

(۴۹) اگر اس بھکشو کو فوج میں جانے کا کوئی کام ہو تو اسے دو تین رات فوج میں رہنا چاہیے۔ اس سے زیادہ رہے تو

اسے (کفارہ والا) گناہ ہے۔

(۵۰) دو تین رات فوج میں رہتے ہوئے بھی اگر بھکشو میدان جنگ تو اعد صف بندی کو دیکھنے جائے تو اسے (کفارہ والا) گناہ ہے۔

اوپر ہم کہہ آئے ہیں کہ ہندو مذہب کے اولیں پیشیر و فعال اور عمل پسند تھے۔ جنگ کو وہ فعل حرام نہیں سمجھتے تھے، بلکہ اس کے تقدس کے قائل تھے۔ ویدک آرین شہیدوں اور غازیوں کی بزرگی اور ان کے جنتی ہونے کے معتقد تھے۔

(اے میت!) جو بہادر جنگوں میں لڑتے ہیں اور جو شہید ہو جاتے ہیں اور جو (پروہتوں کو) ہزاروں کا ندرانہ دیتے ہیں تو بھی انہی کے پاس پہنچ جائے۔ رگ: ۱۰: ۱۵۴: ۳

اس کے علاوہ مہابھارت میں جہاد اور شہادت کے بڑے مفصل بیان پائے جاتے ہیں۔ جن کو اگرچہ براہ راست نبوت کی آواز تو نہیں کہہ سکتے مگر ان کو صدائے نبوت کی بازگشت تو کہا ہی جا سکتا ہے۔ پھر یاد رکھیے کہ راہب لوگ شیرنی اور رباز کے لیے خود کو ہاتھ پاؤں باندھ کر تو پیش کر سکتے ہیں مگر انسانیت کی حفاظت کے لیے وہ تلوار سونت کر مقابلہ و مدافعہ کرنے کے لیے میدان میں نہیں آ سکتے۔ وہ خودکشی کی جھوٹی شہادت کے ذریعہ تو جنت میں جانے کے مشتاق نظر پڑتے ہیں مگر تلواروں کی چھاؤں سے گذر کر حقیقی شہادت کی راہ سے جنت میں جانے کی ہمت نہیں رکھتے۔

آنے والے حوالے کے سمجھنے کے لیے اتنی تمہید ضروری ہے کہ ویدوں کا معیاری پوجا کا طریقہ یگیہ تھا۔ یگیہ آتشیں قربانی کا دوسرا نام ہی ہے۔ یگیہ کی سرزمین کوئی متعین حرم و چہار دیواری نہیں ہے۔ یجمان (صاحب نذر) کی سہولت کے مطابق پروہت کے مشورہ سے یہ جگہ متعین کی جاتی ہے۔ بانس گاڑ گاڑ کر جگہ گھیری جاتی ہوگی اور پھر اندر کئی کھمبے گاڑے جاتے تھے۔ بیچ میں قربان گاہ ہوتی تھی جس پر کش گھاس بچھائی جاتی تھی اور اس پر یگیہ کے ظروف، تیار کھانے اور سوم وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔ قربان گاہ کے پورب، پچھم اور دکھن تین گڑھے بنائے جاتے تھے اس میں آگ روشن رہتی ہے۔ پچھم کی آگ پر نذر کے کھانے پکائے جاتے تھے۔ پورب کی آگ میں دیوتاؤں کے لیے آتشیں نذر گذاری جاتی تھی۔ دکھن کی آگ میں اجداد (پتر) کے لیے نذر گذاری جاتی تھی۔ صاحب نذر (یجمان) ہرن کا کالا چرملا اوڑھتا تھا چمچے کے ذریعہ گھی وغیرہ آگ میں تھوڑا تھوڑا گراتے تھے۔ کھانے کے پنڈ بنا کر آگ میں چھوڑتے تھے گھی چربی سب ہی آگ میں ڈالے جاتے تھے۔ لکڑیوں سے آگ روشن کی جاتی تھی۔ یگیہ کرانے کی فیس نہایت معقول ہوتی تھی جو پروہتوں کو ملتی تھی اور یہ فیس دکشنا (ندرانہ) کہلاتی تھی۔ نذر گذارنے کے لیے جو "پرد" تیار رہتے تھے وہ پرد دشن اور بعض دوسرے طعام "چرو" کہلاتے تھے۔ یگیہ کی انجام دہی کمی پروہتوں سے ہوتی تھی۔ یہ سب پروہت اور یجمان نذر کو کھاتے تھے۔ یگیہ ہی ہندوؤں کا اول و آخر معیاری پوجا کا طریقہ ہے۔

ذیل میں جو حوالہ سپرد قلم کیا جا رہا ہے اس میں جنگ کو ایک یگیہ بتایا گیا ہے۔ جنگ کے اسلحہ جات و آلات کو یگیہ کے اسباب و لوازمات سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مصنف مہابھارت کا مقصد اس تشبیہ سے یہ ہے کہ جس طرح یگیہ ایک مقدس طریق بندگی ہے۔ اسی طرح جنگ بھی ایک مقدس فعل ہے۔ بلکہ یگیہ میں پروہتوں اور یجمان کو تو دیوتاؤں کی معیت میسر ہوتی ہے۔ مگر مقتولین جنگ کو خداوندوں کی سرمدی معیت مل جاتی ہے۔

(الف) جو شخص ہتھیار اٹھا کر بے دردی کے ساتھ حملہ کرتا ہے وہ پاکیزہ ہستی جنگ کے ذریعہ ایک بڑا یگیہ کرتا ہے۔ (ب) ہاتھی کی زرہ ہی ہرن کا کالا چمڑا ہے۔ اس کی کمان ہی داتون ہے۔ رتھ قربان گاہ ہے۔ جھنڈا ستون ہے اور لگام کش گھاس ہے۔ (ج) اس کی حمیت، غصہ اور رجز ہی تینوں آگ ہیں۔ کوڑا ہی چمچہ ہے اور کوچوان ہی پروہت ہے۔ (د) اس کے اسلحہ ہی یگیہ کے ظروف و اسباب ہیں۔ تیر ہی آگ روشن کرنے والی لکڑیاں ہیں۔ (ہ) انسانی شخص کے اعضاء سے نکلنے والے خون اور پسینہ شہد ہیں۔ (و) آدمیوں کے سر کلیچے ہیں اور خون گھی کی نذر ہے۔ (ز) ترکش نذر کا کھانا ہے۔ چربیوں کا سیل ہی چربی ہے۔ (ح) گدھ، گیدڑ وغیرہ مردہ خور کھانے والے برہمن ہیں ——— مردہ آدمی، ہاتھی اور گھوڑے ہی ان کے مطعوم و مشروب ہیں۔ (ط) مقتول بہادروں کے کپڑے، گہنا اور زیور، زر و جواہر یگیہ کے نذرانہ (دکشنا) ہیں۔ (ی) دیوی! فیل سوار جو بالمقابل جنگ میں مقتول ہوتا ہے وہ برہم لوک کو پاتا ہے۔ (ک) جنگ میں جو شہسوار یا رتھ سوار مقتول ہوتا ہے وہ "اندر لوک" میں اعزاز پاتا ہے۔ (ل) مقتول جنت میں اعزاز پاتا ہے اور قاتل (غازی) یہاں عزت پاتا ہے۔ یہ دونوں قاتل و مقتول سکھ پاتے ہیں (م) اس لیے لڑائی میں آ کر نڈر ہو کر حملہ کرنا چاہیے۔ (ن) جس طرح ہزاروں ندیاں سمندر میں مل جاتی ہیں۔ اسی طرح سب (مقتول) برہم میں مل جاتے ہیں۔ مہابھارت: انوشاسن: ۱۴۵ : ۴ ، صفحہ ۲۳۸

ان ابواب الجنۃ تحت ظلال السیوف (حدیث) "جنگ کے دروازے تلواروں کے نیچے ہیں" کی یہ ہندیانہ تشریح ہے بیچاری گم کردہ راہ ہندو جنتا کو جب تناسخ کے چکر میں ڈال دیا گیا تو لازماً ان کو جنت و جہنم کے معاملے میں شبہ ہو گیا۔ پھر یہ بشارتیں ان کو اپیل نہ کر سکیں۔ تناسخ کے چکر کے علاوہ بودھی "اہنسا بڑا دھرم ہے" کے خوشنما عقیدے نے بھی ہندو سورماؤں کے ہاتھ اور پاؤں میں رعشہ پیدا کر دیا۔ جنگ گناہ ہے اس خطرے سے سب ہی مہابھارت ارجن اور یدھشٹھر بھی جنگ سے باز رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہندو متکلمین کو اس کا جواب دینا پڑا چنانچہ "(۶) جس طرح نرائی کرنے والا شخص نرائی کیے جانے والے کھیت، فصل اور گیہاں کی ہنسا کرتا ہے مگر تو بھی فصل کا نقصان نہیں ہوتا۔ (۷) اسی طرح ہتھیار چلانے والا متعدد مارے جانے کے لائق [illegible]

مگر انسانوں کی بقا سے اس (ہنسا و قتل) کی تلافی ہو جاتی ہے۔ مہابھارت: شانتی: ۹۷، ۹، ۷

(ا)۔ اگر بے قصور شخص اپنی جان کی حفاظت کے لیے پہلے کبھی حملہ کرنے والے یا حملہ آور دشمن کو جارحانہ یا مدافعانہ طور پر مارتا ہے تو وہ گنہگار نہیں ہوتا۔ (ب) چور سے ڈرا ہوا شخص اگر اس کی مدافعت میں حملہ کرتا ہے (چور کو) قتل کر دیتا ہے وہ گنہگار نہیں ہوتا۔ (ج) گاؤں کے لیے مالک کا حق نمک ادا کرنے کے لیے غریب پر ترس کھا کر اگر (کوئی) باندھتا اور قتل کرتا ہے تو وہ گناہوں سے نجات پاتا ہے۔ مہابھارت، انوشاسن ۱۴۵:۴۹ ص ۲۲۹ مطبوعہ گیتا پریس، گورکھپور

من قتل دون مالہ فہو شہید و من قتل دون اہلہ فہو شہید کی متوازی ہدایت کے بعد گناہِ کبیرہ "الفرار یوم الزحف" کی ہندو تشریح دیکھ لیں۔ یقیناً بغیر اس پہلو کے عزیمت ماند پڑ چکی ہے۔

(۲) تم ایسے ذلیل لوگوں کو پیدا نہ کرنا جو لوگ رن میں ساتھیوں کو چھوڑ کر خود جان بچا کر (بھاگ) جاتے ہیں ۲۱۔ اندر کے تابع دیوتا ان لوگوں کو تکلیف دیتے ہیں جو اپنے ساتھیوں کی جان گنوا کر اپنی جان بچانا چاہتے ہیں۔ ۲۲۔ جو کشتری ایسے ہیں ان کو لکڑی اور پتھر سے مار ڈالنا چاہیے۔ یا ان کو آگ میں زندہ جلا دینا چاہیے، یا جانوروں کی طرح ان کا گلا گھونٹ دینا چاہیے۔ مہابھارت: شانتی: ۹۷: ۲۰۔ ۲۲

دیگر (۲۵) لڑائی سے پیٹھ دکھانے والوں کے لیے یہ دوزخ حاضر ہیں ابدی بدنامی ہے اور مسلسل سزا ہے۔ (۲۶) ان کو دیکھ کر قربانی و ایثار کا خیال کرتے ہوئے دشمنوں پر فتح حاصل کرو (لڑائی سے بھاگ کر بدنامی اور دوزخ کے لائق و سزاوار نہ بنو۔ مہابھارت: شانتی: ۹۸: ۲۵، ۲۶

نیچے کی سطریں جنگ کے تقدس میں مزید اضافہ کریں گی: "اللہ کے راستے کے زخم سے قیامت کے دن خون بہتا ہوگا، رنگ خون کا ہوگا، مہک مشک کی۔" حدیث کی برہمنی ترجمانی سن لیں۔

۱۳۔ لڑائی ہونے پر اس کے جسم سے لڑائی میں جو خون بہتا ہے اس خون کے ساتھ وہ (سپاہی) سب گناہوں سے خلاصی پاتا ہے۔ ۱۴۔ کشتری جنگ میں جو تکلیف جھیلتا ہے وہ وہ اس کے لیے تپ ہو جاتا ہے۔ ایسا نیوں نے بتایا ہے۔ مہابھارت شانتی: ۹۷: ۱۳، ۱۴

ان مثالوں کی بنا پر یہ بات بڑے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ برہمنی مذہب میں لڑائی کو "جہاد" کا درجہ حاصل ہے مگر مہابھارت کا [illegible] اس لیے مطلق جنگ مطلق گناہ ہے کی شہادتیں بھی ملتی ہیں جن سے [illegible]

۷۶۔ یہ مشتہر اسلحہ فروش، اسلحہ ساز اور تیر و کمان بنانے والے دوزخ میں جائیں گے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۲۳: ۷۷۔ اسلحہ فروش کا طعام پاخانہ ہے۔ منو: ۴: ۲۲۰ مردوں کے لیے جو کھانا پکتا ہے اس میں تیر اور کمان بنانے والے شریک نہیں ہو سکتے۔ منو: ۳: ۱۶۰

اوپر پہلے یہ مذکور ہو چکا ہے کہ گوشت خور، گوشت فروش، گوشت پز، گوشت بردار، گوشت خریدار سبھی گنہگار ہیں کیونکہ یہ سب گناہ کے کام میں معاون ہیں۔ لڑکے لڑکیاں باپ دادا کے لیے جنت کی سیڑھیاں ہیں۔ باپ دادا نے بیٹوں اور پوتوں کو لڑکیوں اور پوتیوں کو پالا پوسا ہے ان کو سکھایا پڑھایا ہے۔ ہر ماں و باپ اپنی محبت کی گہرائیوں میں یہی تمنا رکھتے ہیں کہ ہماری اولاد بدکار و بدمعاش نہ ہو۔ پس لازماً ماں باپ کو اپنی پرورده و تربیت داده اولاد کی نیکیوں کا کچھ نہ کچھ حصہ ملنا ہی چاہیے۔ اگر شاذ و نادر کوئی ناعاقبت اندیش باپ اپنے لڑکے کو چور و بدمعاش بنانا چاہتا ہے تو یقیناً وہ اپنی اس چاہت اور ارادہ کی دوہری اور تہری سزا پانے کا مستحق ہے پس رہبانیت پسند بزرگوں کو فلاسفر رہبانیت ــــ مانی ــــ کے التزام کی ہمنوائی ذرا سوچ بچار کر کرنی چاہیے۔ اگر اولاد پیدا کرنا نیکی ہو سکتا ہے تو بدی بھی ہو سکتا ہے۔ پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ مہاتما بدھ جانداروں کی موت کے خطرے سے پانی بھرنے کو منع فرماتے تھے۔ کیونکہ پانی بھرنا خواہ مخواہ ہنسا پر مشتمل ہے۔ پس بودھوں اور برہمنوں کو یہ اصول تسلیم ہے کہ نیکیاں اور بدیاں صرف اپنے ہی اندر نیکی اور بدی نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے اسباب و علل پر بھی نیکی و بدی کا حکم لگتا ہے۔ نیکی یا بدی کرنے والے تنہا جزا و سزا کے مستحق نہیں ہیں بلکہ ان کے محرک اور رہنمائی کرنے والے بھی نیکوکار و بدکار گردانے جاتے ہیں۔ پر پوتے کی وجہ سے پردادا ثواب پاتا ہے۔ گوشت پیش کرنے والا میزبان گوشت خوری کے گناہ کا حصہ دار ہے پس جب جنگ جنت کا دروازہ ہے تو تیر و کمان، تلوار و نیزہ بنانے والا گنہگار رہا؟ آخر کیا وجہ ہے مسبب کو نیکی کہا جائے اور سبب کو بدی کہیں۔ کم از کم میں یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ برہمن دیوتا نے کشتری آقا کی خوشنودی کے لیے یہ بات فرما دی کہ جنگ کا فعل بہشت کا موجب ہے اور بے کس اسلحہ ساز شودر کی اسلحہ سازی کو گناہ بتایا۔ اصل بات یہ ہے کہ برہمنوں نے اہنسا کی رہبانی تعبیر کو قبول کر لیا اور اس تعبیر نے بڑی حد تک برہمن افکار پر غلبہ حاصل کر لیا اور برہمنوں نے بہت بڑے علاقے پر اس تعبیر کا قبضہ کرا دیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اہنسا کی رہبانی تعبیر کا اکثر احکام پر عمل درآمد ہو گیا۔ نیز کشتریوں کے لیے جنگ جنت کا دروازہ بنی رہی کیونکہ راجگان کو اس عقیدہ سے بے دخل کرنا محال تھا۔ مگر شودروں کی بے دخلی بدرجہا آسان تھی ان پر حکم نافذ ہو سکتا تھا۔ بہر صورت جنگ کو دروازۂ بہشت کہنا خانہ دارانہ نظریہ اور اسلحہ ساز کو دوزخی بتانا رہبانی عقیدہ ہے۔ برہمنوں نے دونوں کو یکجا کر کے ضدین کو جمع کر دیا

لے مقابلہ کریں، اللہ تعالیٰ ایک تیر کے سبب سے تین شخص کو جنت میں داخل کرے گا۔ ۱۔ تیر ساز۔ ۲۔ تیر انداز۔ ۳۔ تیر پہنچانے والا۔ (مشکوٰۃ ابو داؤد)

تلخیص و تاثر :-

ایک جغرافی نظریہ

جناب وحید الدین خاں صاحب

پچھلے سال کے دوران میں کچھ ایسے نئے واقعات معلوم ہوئے ہیں جن سے ایک حیرتناک سائنسی نظریے کو مزید تقویت ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے براعظم کسی زمانے میں ایک ہی بڑی زمین کے حصے تھے۔ اس کے بعد وہ ٹوٹ کر زمین کی سطح پر اِدھر اُدھر پھیل گئے۔ مثال کے طور پر افریقہ کسی وقت قطب جنوبی سے متصل تھا اور امریکہ کا ایک حصہ تھا۔ شمالی امریکہ اب بھی بحر الکاہل میں مغرب کی طرف بڑھ رہا ہے اور ممکن ہے کبھی وہ ایشیا سے جا ملے۔

براعظموں کے انتشار کا نظریہ (Theory of Drifting Continents) پہلی بار باقاعدہ طور پر ۱۹۱۵ء میں ایک جرمن ماہر ارضیات الفرڈ ویجنر (Alfred Wegener) نے پیش کیا۔ اس وقت تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس نظریے کی موافقت میں جتنے دلائل ہیں اتنے ہی اس کی مخالفت میں بھی ہیں۔ مگر اب بین الاقوامی جغرافیائی سال (International Geophysical Year) کے دوران معلوم شدہ حقائق کے تجزیے نے اس نظریے کے حق میں نئے دلائل فراہم کیے ہیں۔

ویجنر نے براعظموں اور بڑے جزیروں کو تودہ ہائے برف (Icebergs) سے تشبیہ دی تھی جو ایک گرم سمندر پر تیر رہے ہوں۔ اس بات کے ثبوت میں کہ وہ کسی زمانے میں ملے ہوئے تھے، اس نے یہ دلیل دی کہ براعظموں کو اگر قریب کیا جائے تو وہ سب کے سب Jigsaw Puzzle[1] کی طرح آپس میں جڑ جاتے ہیں۔ جنوبی امریکہ کا مشرقی ساحل افریقہ کے مغربی ساحل سے مل رہا ہے۔ اسی طرح یورپ کا ساحل شمالی امریکہ کے مطابق ہے۔

---

[1] یہ تعلیمی کھیل کی ایک قسم ہے جس میں کسی چیز کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنا پڑتا ہے۔ اور جب تمام ٹکڑے صحیح طور پر جڑ جاتے ہیں تو متعلقہ چیز کی پوری شکل بن جاتی ہے۔
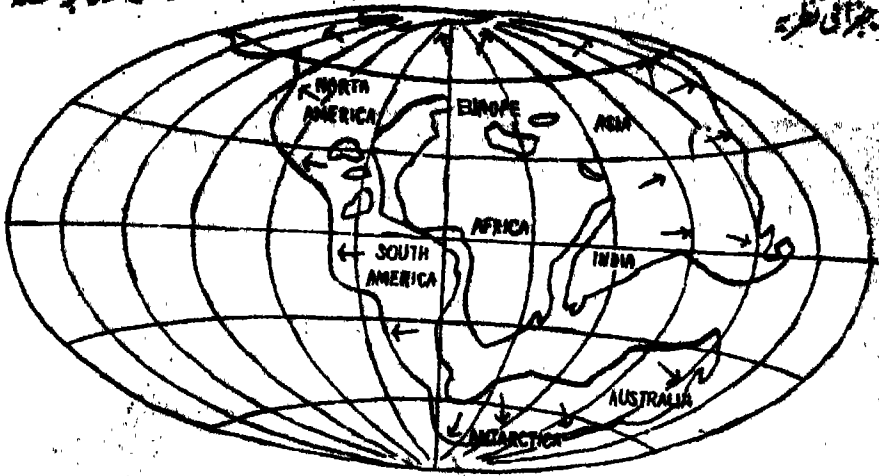
زمین کے پھیلنے کے عمل کے دوران میں مختلف براعظم کس طرح وجود میں آئے' اس کا ایک تصور آپ ماضی کے اس قیاسی نقشے میں کر سکتے ہیں۔ ملاحظہ ہو شمالی امریکہ' یورپ سے اور جنوبی امریکہ' افریقہ سے کس طرح جڑے ہوئے ہیں۔ اسی طرح دوسرے حصے بھی۔

وسیع سمندروں کے دونوں طرف جو پہاڑی سلسلے ہیں' ان کا ارضیاتی سال اور ان کی چٹانی ساخت ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ وہ دونوں طرف اس طرح نظر آتے ہیں گویا انھیں توڑ کر دور دور بکھرا کر دیا گیا ہے۔ یہ بات برازیل کے ساحلی پہاڑ اور مغربی افریقہ کے بارے میں بالکل درست ہے۔ اسی طرح شمالی امریکہ کے پہاڑ (Appalachian) کے بارے میں بھی یہ بات صحیح ہے جس کی قدیم چٹانیں بے ترتیبی کے ساتھ نو واسکوشیا (Nova Scotia) کے سرے پر ختم ہو جاتی ہیں اور پھر نیوفاؤنڈلینڈ' گرین لینڈ' مشرقی آئرلینڈ اور سکاٹ لینڈ کے پہاڑ گریمپین (Grampian) میں دوبارہ ظاہر ہوتی ہیں۔

اسی طرح جانوروں کی دنیا میں بھی اس کے ثبوت ملتے ہیں کہ براعظم ٹوٹ کر پھیلے ہیں۔ مثلاً امریکی چوہا (Guinea Pig) جنوبی امریکہ کا ایک چوپایا کترنے جانور جس کو Chinchilla کہتے ہیں بعض مخصوص قسم کے خشکی کے گھونگھے جو لکڑی میں زندہ رہتے ہیں' ایک قسم کی چھپکلی جو دیمک کے گھروندے میں انڈے دیتی ہے ـــــ یہ سب پیدائشی طور پر صرف جنوبی امریکہ اور افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔

جنوبی امریکہ کی تمام مچھلیاں اور دریائی جانور افریقہ میں اپنے قریبی رشتہ دار رکھتے ہیں۔......

اگر دونوں براعظم کسی زمانے میں ملے ہوئے نہیں تھے تو ایک سمندر کے دو مختلف ساحلوں [illegible] حیرت انگیز

مشابہت کی توجیہ کیا ہو سکتی ہے۔

پودوں کی دنیا میں بھی ایسی شہادتیں ملتی ہیں جن کی وجہ سے علم نباتات کے ماہرین وگینر کے نظریے کی تائید کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ پروفیسر رونالڈ گڈ (Ronald Good) اپنی کتاب موسومہ Geography of the Flowering Plants میں لکھتے ہیں:-

"نباتات کے ماہرین کا تقریباً متفقہ نظریہ ہے کہ مختلف پودے جو زمین کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں ان کی توجیہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ ہم یہ فرض کریں کہ زمین کے ٹکڑے ماضی میں کبھی باہم ملے ہوئے تھے"

متعدد پودے جو کسی سمندر کے ایک ساحل پر پائے جاتے ہیں۔ ان کی متحجر شکلیں (Fossils) دوسری سمت سمندر کے دوسرے کنارے ہزاروں میل دور ملتی ہیں۔ اگر یہ دونوں کنارے کبھی باہم ملے ہوئے نہیں تھے تو اس یکسانیت کی وجہ کیا ہے

مگر سائنسی لحاظ سے اس نظریے کی سب سے زیادہ قطعی دلیل حجری کشش (Fossil Magnetism) ہے جو حال میں دریافت ہوئی ہے۔ موجودہ چٹانوں کے ابتدائی اجزاء یا تو پگھلے ہوئے لاوے تھے یا پانی میں ملی ہوئی گاد (Watery Sediments) کی شکل میں تھے جن میں مقناطیسی آکسائڈ لوہے کے نہایت چھوٹے خوردبینی ذرے حرکت کر رہے تھے۔ چٹانوں کے سخت ہونے سے پہلے یہ تمام ذرے پرکار کی نوک کی طرح شمالی رخ میں صف بستہ ہو گئے۔

طبقات الارض کے ماہرین ارضیاتی کیلنڈر پر نہایت صحت کے ساتھ چٹانوں کا زمانہ متعین کر سکتے ہیں۔ اور پتھر کے ذرات کے رخ کو دیکھ کر یہ بالکل ممکن ہے کہ چٹان کا وہ عرض البلد اور طول البلد متعین کیا جا سکے جہاں وہ ابتداءً میں موجود تھی .... اس مطالعہ سے سائنس دانوں نے حیرت انگیز حقائق دریافت کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ زمین کے موجودہ ٹکڑے ماضی میں ان مقامات پر نہیں تھے جہاں وہ آج نظر آتے ہیں۔ بلکہ ٹھیک ان مقامات پر تھے جہاں بر اعظموں کے انتشار (Drifting Continents) کا نظریہ بتاتا ہے

امپریل کالج لندن میں فزکس کے پروفیسر پی ایم ایس بلیکٹ (Blacket) نے کہا ہے:-

"ہندوستانی پتھر کی پیمائش یقینی طور پر بتاتی ہے کہ ستر ملین سال پہلے ہندوستان خط استوا کے جنوب [illegible] ... دکن کی چٹانوں کا مشاہدہ ثابت کرتا ہے کہ اوقیانوس بر اعظم [illegible]

ٹوٹ کر نکلا ہے"

براعظموں کے انتقال مکانی کی وجہ کیا ہے۔ برسوں تک زمین پر ایسی کوئی قوت دریافت نہیں ہوئی جو اتنی طاقتور ہو جو خشکی کے اتنے بڑے بڑے ٹکڑوں کو متحرک کر سکے۔ اب ایک طاقت کا علم ہوا ہے جس کو کنوکشن کرنٹ (Convection Current) کہا جاتا ہے[1] یہ ایک حرارتی لہر ہے جو مادے کے پاس سے گزرتی ہے تو اسے متحرک کر دیتی ہے۔ یہ لہریں زمین کے مرکز سے ریڈیو ایکٹویٹی کے ذریعہ اٹھتی ہیں اور زمین کی اوپری پرت کے نیچے دو ہزار میل لمبی چپاتی تہہ میں گھومتی ہیں۔ دائرہ نما چکر کر کے وہ پھر مرکز زمین میں واپس جاتی ہیں۔ یہ گویا ایک بہت بڑا پہیہ ہے جو ہمارے نیچے گھوم رہا ہے اور جس کے سبب سے زمین کی اوپری تہہ متاثر ہوتی ہے —— اگر یہی واحد سبب نہیں تو یہ ان مختلف اسباب میں سے ایک سبب ضرور ہے جس نے قدیم ترین زمانے میں زمین کی اوپری سطح کو پھاڑ کر اس کو سمندر کے اردگرد پھیلا دیا

بین الاقوامی جیوفزیکل سال کے دوران میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ مختلف موضوعات سے متعلق ہیں اور ان کے مکمل مطالعہ میں ابھی بہت سال لگیں گے، تاہم یہ مان لیا گیا ہے کہ یہ معلومات بلا اختلاف ویجنر کے نظریے کی تائید کرتی ہیں۔

(ریڈرز ڈائجسٹ، جون ۱۹۶۱ء)

یہ ایک عجیب بات ہے کہ سائنس نے زمین کے متعلق جس حقیقت کو بیسویں صدی میں دریافت کیا ہے قرآن نے ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس کی خبر دے دی تھی۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس کے اشارات موجود ہیں مثلاً سورۂ نازعات میں ارشاد ہوا ہے کہ زمین پر ایک وقت ایسا گزرا ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو پھاڑ کر پھیلا دیا۔ اس عمل کے دوران میں اس کے اندر سے پانی نکلا اور روئیدگی پیدا ہوئی۔

وَالْأَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا — اور اس کے بعد زمین کو پھیلایا اور اس میں سے

أَخْرَجَ مِنْهَا مَاءَهَا وَمَرْعٰهَا — اس کا پانی اور اس کا چارہ نکالا۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے "دحو" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ دحو کے معنی کسی مجتمع چیز کو پھیلانے اور بکھیر دینے کے ہیں۔ چنانچہ عربی میں کہا جاتا ہے دحا المطر الحصیٰ عن وجه الارض (بارش زمین پر سے کنکریوں کو

---

[1] پانی یا کسی رقیق چیز کو گرم کیا جائے تو حرارت کے سبب سے نیچے کے گرم حصے پھیل کر اوپر کی طرف اٹھنے لگتے ہیں اور اوپر کے سرد حصے نیچے جانے لگتے ہیں۔ اس طرح ایک چکر قائم ہو جاتا ہے۔ اسی کو Convection کہا جاتا ہے۔

تقریباً یہی مفہوم انگریزی لفظ Drift کا بھی ہے جو اس نظریے کی تعبیر کے لیے موجودہ زمانے میں اختیار کیا گیا ہے۔ قدیم ترین ماضی اور حال میں یہ یکسانیت حیرت انگیز ہے۔

قرآن ایک ایسے زمانے میں اترا جب عالم فطرت کے بارے میں انسان کی معلومات بہت محدود تھیں۔ پانچ سو برس تک یورپ کے علماء کا یہ حال تھا کہ وہ زمین کو ساکن اور چپٹا تصور کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ سورج اور تمام ستارے زمین کے گرد گھوم رہے ہیں۔ مگر قرآن نے اس سے بہت پہلے کائنات کی بہت سی ایسی حقیقتوں کی طرف اشارہ کر دیا تھا جو بہت بعد کو طویل تحقیق کے بعد انسان کے علم میں آنے والی تھیں۔ دنیا میں کوئی بھی انسانی تصنیف ایسی موجود نہیں ہے جو اتنے قدیم زمانے میں مرتب ہوئی ہو اور بعد کی معلومات نے اس کی غلطیاں واضح نہ کر دی ہوں۔ روئے زمین پر صرف یہی ایک ایسی کتاب ہے جو اتنی لمبی مدت سے اب تک اپنی صحت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ یہ قرآن کی اتنی حیرت انگیز خصوصیت ہے کہ اگر آدمی غور کرے تو صرف یہی ایک بات یہ یقین کرنے کے لیے کافی ہے کہ یہ خدا کی کتاب ہے۔ کوئی انسان ایسی کتاب مرتب نہیں کر سکتا۔ اگر یہ نظریہ صحیح ہے تو یہ قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کا ایک کھلا ہوا ثبوت ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس کتاب کا مصنف ایک ایسی بلند تر ہستی ہے جو زمین کی تاریخ اور اس کی ساخت سے اس وقت سے واقف ہے جب کہ انسان ان کے بارے میں کوئی علم نہیں رکھتا تھا۔

اس سلسلے میں مزید میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ قرآن کے ان بیانات کی روشنی میں ہمارے مفسرین قدیم سے اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے رہے ہیں۔ مثلاً تفسیر کبیر کا ایک فقرہ حسب ذیل ہے :-

دحی الارض ای بسطها وذالك لانها كانت اولا كالكرة المجتمعة ثم ان الله تعالى مدها وبسطها۔	دحوارض کا مطلب زمین کو پھیلانا ہے۔ یہ اس لیے فرمایا کہ زمین ابتداً ملی ہوئی شکل میں تھی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس کو مختلف براعظموں کی صورت میں پھیلا دیا

اس میں ہمارے لیے یہ نصیحت ہے کہ ایسے ذہن جو قرآن کا علم رکھتے ہوں، اگر وہ واقعاتِ عالم کی تحقیق کریں تو کتنی آسانی سے وہ صحیح نتیجے تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایک شخص جس کے پاس روشنی ہو وہ اس شخص کے مقابلے میں زیادہ جلد اور صحت کے ساتھ اپنا سفر طے کر سکے گا جو اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے منزل تک پہنچا ہے۔

بچّوں کے جرائم

بنارس یکم اپریل ۷۶ء —— اتر پردیش کے بچوں کے قانون کی اسکیم کے تحت بچوں کے جرائم کے سلسلے میں یہاں دو روزہ سمینار جمعرات کو ختم ہوا سمینار میں حکومت کو یہ صلاح دی گئی کہ بچوں کے جرائم ختم کرنے کے سلسلے میں مذکورہ قانون کی تمام دفعات کا نفاذ کیا جائے اور ضلع میں بچوں کی خصوصی عدالتیں قائم کی جائیں جس میں ججوں کی امداد کے لیے ایک ماہر نفسیات اور سماجی کارکنوں پر مشتمل ایک جیوری ہو —— سمینار نے مطالبہ کیا ہے کہ ریفارمیشن افسران کا تقرر کیا جائے اور بچوں کے اصلاحی پروگرام سے متعلقہ ادارے قائم کیے جائیں —— سمینار نے ایک قرارداد کے ذریعہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ بچوں کے قانون کے صحیح نفاذ کے لیے محکمہ پولس میں بچوں کی امدادی پولیس کا ایک خصوصی شعبہ قائم کیا جائے —— سمینار نے مطالبہ کیا ہے کہ جن جن اضلاع میں بچوں کے قانون کا نفاذ ہے وہاں اس بات کا جائزہ لیا جائے کہ بچوں میں جرائم کس حد تک پھیلے ہوئے ہیں اور ان کے تدارک کے لیے مالی امداد کا انتظام کیا جائے۔

(ایک خبر)

بچوں کے جرائم کا مسئلہ اس پیمانے پر کہ اس کے لیے مخصوص قانون بنا کر نافذ کیا جائے اور اس مصیبت کے ازالے کی تدابیر پر غور کرنے کے لیے سمینار منعقد کیے جائیں، بھارت کا بہت پرانا مسئلہ نہیں ہے، نیا مسئلہ ہے لیکن جس تہذیب کی تقلید نے یہ مسئلہ پیدا کیا ہے اس کے لیے یہ بہت پرانا ہو چکا ہے، امریکہ جو اپنی دولت کی فراوانی، اپنے نظام حکومت کے استحکام اور اپنے تمدن و تہذیب کی درخشانی میں دنیا کا انتہائی ترقی یافتہ ملک سمجھا جاتا ہے وہاں یہ مسئلہ ایک ناسور بن چکا ہے۔ بھارت اور اس سے زیادہ اس کے پڑوسی ملک میں ٹیڈی بوائز اور ٹیڈی گرلز کی لعنت اور بچوں میں جرائم کے بڑھتے ہوئے رجحانات تشویش انگیز بنتے جا رہے ہیں لیکن خود ٹیڈی بوائز اور ٹیڈی گرلز کی اصطلاح بتا رہی ہے کہ بھارت اور پاکستان کی پیداوار نہیں ہے بلکہ یہ یورپ اور امریکہ سے درآمد کی گئی ہے۔ بنارس کے سمینار نے جو مطالبات کیے ہیں اور جو صلاح حکومت کو دی ہے اس کو پڑھ کر احساس ہوا کہ بھارت کے سوچنے والے ذہن اس مصیبت سے

نمٹنے کے لیے جس ڈھنگ پر سوچ رہے ہیں وہ بھی محض تقلیدی ہے۔ یورپ اور امریکہ جن تدابیر پر سالہاسال عمل کر کے ناکام ہو چکے ہیں، اب بھارت میں اس کی ابتدا کی جا رہی ہے۔ ہمارے معالجین یا تو بیماری کی اصل جڑ تک پہنچ نہیں پاتے یا صحیح علاج اختیار کرنے اور اس پر سرگرمی سے عمل کرنے کی ہمت نہیں رکھتے۔ سمینار کے ہر مطالبے پر الگ الگ اگر تنقید شروع کی جائے تو بات لمبی ہو جائے گی اس لیے طول بیان سے بچنے کے لیے میں پہلے اس اصل سبب کا ذکر کرتا ہوں جس سے بچوں کے جرائم کا مسئلہ بھی پیدا ہوا ہے۔ میرے نزدیک اس کا اصل سبب یہ ہے کہ ہمارے نیتاؤں نے یورپ اور امریکہ کی تقلید میں بھارت کی ترقی اور ریاست کے استحکام کے لیے عملاً خالص مادی نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے اس لیے اس نقطۂ نظر اور اس نظریۂ زندگی نے جو اخلاقی برائیاں یورپ اور امریکہ میں پیدا کی ہیں وہ یہاں بھی لازماً پیدا ہو کر رہیں گی اور یہ کوئی مفروضہ نہیں ہے بلکہ پیدا ہو چکی ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اس نقطۂ نظر نے ان ممالک کو مادی ارتقاء کی جس منزل پر پہنچا دیا ہے، بھارت بھی وہاں پہنچ سکتا ہے۔ اب اگر بھارت کا واقعی مقصود یہی ہے تو پھر اخلاقی برائیوں پر واویلا بھی محض رسمی ہے اور انہیں دور کرنے کی تدابیر بھی صرف دکھاوا ہیں۔ اصل سبب کا ذکر کرنے کے بعد خاص اس مسئلے پر بھی اپنے خیالات مختصراً واضح کرنا چاہتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ:

• بچوں میں جرائم کے رجحانات کیوں بڑھ رہے ہیں؟

میرے نزدیک اس کیوں کا جواب یہ ہے:-

• بچوں میں جرائم کے رجحانات اس لیے بڑھ رہے ہیں کہ ان کے بڑوں میں جرائم بے حد بڑھ گئے ہیں

ہم میں سے ہر صاحب علم جانتا ہے کہ ہر بچہ کم و بیش اپنی ماں کے پیٹ سے دو چیزیں ساتھ لاتا ہے تجسس اور نقالی۔ اگر اللہ تعالیٰ ان میں یہ دو چیزیں ودیعت نہ رکھتا تو علم و فن کی ترقی تو الگ رہی شاید وہ بولنا بھی نہ سیکھ سکتے۔ یہی دو چیزیں انہیں سب کچھ سکھاتی ہیں۔ وہ پہلے بے سوچے سمجھے بڑوں کے اقوال و افعال کی نقالی کرتے ہیں ہر بات کو جاننے کے تجسس میں رہتے ہیں اور جیسے جیسے ان کی عمریں بڑھتی جاتی ہیں وہ اقوال و افعال بھی سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر یہ بات صحیح ہے تو اسے بھی صحیح ماننا پڑے گا کہ بچوں میں اس وقت تک جرائم کے رجحانات بڑھ نہیں سکتے جب تک ان کے بڑوں میں جرائم موجود نہ ہوں۔ وہ جس طرح اچھی باتیں اپنے بڑوں سے سیکھتے ہیں اسی طرح بری باتیں بھی اپنے بڑوں ہی سے سیکھتے ہیں بلکہ بری باتیں سیکھنے میں وہ زیادہ تیز اس لیے نظر آتے ہیں کہ نفس اور شیطان کی دو مخالف خیر طاقتیں انہیں اغوا کرنے کے لیے موجود اور سرگرم ہوتی ہیں۔ گھر میں بڑوں کا رہنا سہنا، آپس کے تعلقات اور معاملات بچوں کو بنانے یا بگاڑنے میں مؤثر ترین کردار کی حیثیت رکھتے ہیں (باقی صفحہ پر ملاحظہ ہو)

رسائل و مسائل

کرایہ پر چلنے والے سامان میں زکوٰۃ نہیں ہے

سوال

"مسئلہ یہ ہے کہ بعض رفقاء کے پاس مکانات اور سائیکلیں ہیں جن سے وہ کرایہ حاصل کرتے ہیں فقہی نکتۂ نظر سے اس پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی مگر بعض رفقاء کا کہنا ہے کہ یہ بھی مالیت اور سرمایہ ہیں اس لیے ان پر بھی زکوٰۃ ہونی چاہیے اور یہ بھی تجارتی مال کی ہی سبیل سے ہیں۔" توقع ہے کہ آپ اس مسئلے میں پوری وضاحت فرمائیں گے، تفصیلی جواب مطلوب ہے اور اس میں آپ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے اسوہ کی بھی وضاحت فرما دیں

جواب

اس مسئلے میں بعض رفقاء کو جو الجھن پیش آ رہی ہے اس کا حاصل یہ ہے :- ۱ چونکہ مکانات اور سائیکلیں بھی سرمایہ اور مال ہیں اس لیے ان پر بھی زکوٰۃ واجب ہونی چاہیے۔ ۲ چونکہ کرایہ کا کاروبار تجارت ہی ہے اس لیے بھی ان کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ یہ دونوں باتیں اگر صاف ہو جائیں تو انشاء اللہ الجھن دور ہو جائے گی۔ میں ہر ایک کی توضیح کرتا ہوں

(۱) یہ بالکل ٹھیک ہے کہ مکانات اور سائیکلیں بھی سرمایہ و مال ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا شریعت اسلامیہ نے ہر قسم کے مال پر زکوٰۃ واجب کی ہے؟ اس کا جواب نفی میں ہے شریعت نے ہر مال پر زکوٰۃ واجب نہیں کی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے زکوٰۃ کے بارے میں جو فرمان تحریر کرایا تھا، اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عامل بحرین کو زکوٰۃ وصول کرنے کے لیے جو فرمان دیا تھا نیز دوسری احادیث جو اس سلسلے میں آئی ہیں ان سب سے پوری صحت کے ساتھ بلا اختلاف جن اموال پر زکوٰۃ فرض ہے ان کی فہرست ذیل میں درج ہے :-

معدن سے نکلنے والی اشیاء میں :- (۱) چاندی (۲) سونا۔ جانوروں میں :- (۱) اونٹ (۲) بھیڑ بکری۔ (۳) گائے بھینس۔ حبوب یعنی غلوں میں :- (۱) گیہوں (۲) جو۔ پھلوں میں :- (۱) تمر (چھوارے) (۲) زبیب (خشک انگور)

یہ وہ اموال ہیں جن پر ان شرائط و حدود کے ساتھ جو شریعت نے مقرر کی ہیں تمام ائمہ کے نزدیک زکوٰۃ فرض ہے کیونکہ صحیح احادیث میں ان کی صراحت موجود ہے۔ اس اتفاق کے بعد جانوروں کی بعض جنس اور حبوب و ثمار (غلہ اور پھل) کی تفصیلات میں ائمہ مجتہدین کے درمیان کچھ اختلافات ہیں چونکہ ان سب کو یہاں پیش کرنا مطلوب نہیں ہے اس لیے انہیں

نظر انداز کرتا ہوں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ ہر قسم کے مال پر کسی کے نزدیک بھی زکوٰۃ فرض نہیں ہے بلکہ فرضیت زکوٰۃ کے لیے مذکورہ بالا اصناف میں سے کسی صنف میں اس کا داخل ہونا ضروری ہے۔ آج معادن سے سونے اور چاندی سے بھی زیادہ قیمتی چیزیں نکل رہی ہیں لیکن ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ لاکھوں روپیہ کے سچے موتی اور جواہرات کسی کے پاس موجود ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ ہر حلال جانور پر بھی زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص ہرنوں کے ریوڑ کے ریوڑ پال لے تو ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ اسی طرح زمین سے ہر اگنے والی چیز پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے۔ مثلاً گھاس پات اور نرکل اور بانس پر وجوب زکوٰۃ کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مکانات اور سائیکلیں ان اموال میں داخل نہیں ہیں جن پر شریعت نے زکوٰۃ فرض کی ہے اس لیے مال یا سرمایہ ہونے کے باوجود ان پر زکوٰۃ واجب نہیں۔

(۲) مذکورہ بالا اموال کے علاوہ جو اموال ہیں ان پر زکوٰۃ اس وقت واجب ہوتی ہے جب ان سے تجارت مقصود ہو۔ قاضی ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے:۔

واتفقوا علیٰ ان لا زکوٰۃ	اور فقہاء کا اتفاق ہے کہ ان عروض (سونے چاندی
فی العروض التی لم یقصد بھا	اور دیگر اموال زکوٰۃ کے علاوہ سامان) میں زکوٰۃ نہیں
التجارۃ۔	ہے جن سے تجارت مقصود نہ ہو

زکوٰۃ کی اس نوع میں کسی مال کی تخصیص نہیں ہے۔ ہر وہ سامان جس کی خرید و فروخت شرعاً جائز ہے مال تجارت بن سکتا ہے اور شریعت کی مقرر کردہ شرائط کے ماتحت اس سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی۔ اب یہاں تجارت کا مفہوم سمجھ لینا چاہیے۔ زکوٰۃ کے مسئلے میں تجارت کا لفظ خرید و فروخت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ مطلقاً کاروبار کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا۔ ہماری اردو زبان میں کاروبار کا لفظ تجارت سے عام ہے۔ ہم اگر کسی چیز کی خرید و فروخت شروع کریں تو اسے بھی کاروبار کہتے ہیں اور اگر مکانات خرید کر صرف انہیں کرایے پر چلائیں تو اسے بھی کاروبار کہتے ہیں لیکن فقہی اصطلاح میں اس کاروبار کو تجارت نہیں کہیں گے اور ان مکانات پر تجارتی مال ہونا صادق نہیں آئے گا۔ کاروبار کے لیے عربی میں صحیح لفظ معاملہ ہے۔ معاملات میں تجارت، زراعت، صنعت اور اسی طرح کی تمام چیزیں شامل ہیں۔ جس حدیث کی بنا پر سامان تجارت میں زکوٰۃ واجب ہوتی ہے اس میں بیع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے

عن سمرۃ بن جندب ان رسول	سمرہ بن جندب سے مروی ہے کہ رسول اللہ
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یامرنا ان	صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں حکم دیتے تھے کہ ہم اس سامان
نخرج الزکوٰۃ من الذی نعد للبیع	کی زکوٰۃ نکالیں جسے ہم بیع و فروخت کے لیے مہیا کرتے تھے

یہ حدیث بتاتی ہے کہ جب تک کسی سامان میں بیع و فروخت کا کاروبار نہ کیا جائے اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ مکانات اور سائیکلوں کو کرایہ پر چلانا تجارت نہیں ہے۔ اس معاملے کے لیے فقہی اصطلاح اجارہ ہے تجارت نہیں اجارے اور تجارت میں بنیادی فرق یہ ہے کہ تجارت میں اشیاء کا لین دین ہوتا ہے خریدار اس چیز کا مالک ہوجاتا ہے جسے اس نے خریدا اور بائع اس چیز یا اس رقم کا مالک ہوتا ہے جس کے عوض اس نے اپنی کوئی چیز بیچی ہے اجارے میں کرایہ پر کوئی شے حاصل کرنے والا اس شے کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اس سے صرف وہ منفعت حاصل کرتا ہے جس کے لیے اس نے اجرت دی ہے، وہ شے جوں کی توں آجر (کرایہ پر کوئی شے دینے والا) کی ملکیت ہی میں رہتی ہے اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مسئلہ زیر غور میں سائکلیں کرایہ پر چلانے کو تجارت یا تجارتی مال کی سبیل سے سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ لہٰذا اس حیثیت سے بھی ان پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوگی۔ امید ہے کہ اس توضیح سے ہمارے بعض رفقاء کی الجھن دور ہوجائے گی۔

بقیہ صفحہ ۵۳) رکھتے ہیں اور دوسرا بڑا موثر گھر سے باہر کا پورا ماحول ہوتا ہے۔ یہ دونوں موثر ایک دوسرے سے مل کر بناؤ یا بگاڑ کی تکمیل کرتے ہیں، ان دونوں میں سے کسی ایک کا اچھا ہونا اچھی تربیت کی تکمیل کے لیے کافی نہیں ہے۔ ہم میں سے کتنے ہی لوگوں کا تجربہ ہوگا کہ ماں باپ خود اچھے بن کر بھی اپنے بچوں کو اچھا بنانے سے عاجز ہو رہے ہیں اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ گھر سے باہر کا ماحول سازگار نہیں ہے۔ یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ بچوں کے جرائم ختم کرنے کی صرف ایک تدبیر ہے اور وہ یہ کہ :-

گھر بھی اچھے اخلاق کا نمونہ ہو اور باہر کا ماحول بھی اچھائیوں کو پروان چڑھانے کے لیے سازگار ہو۔

جب تک یہ صورت پیدا نہ ہوگی کوئی تدبیر پورے طور پر کامیاب نہیں ہوسکتی جزوی طور پر کچھ فائدہ نظر آئے گا لیکن کچھ دنوں کے بعد کہنا پڑے گا :-

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

ادارہ

تنقید و تبصرہ

ماہنامہ "ادیب" علی گڈھ، عبد السّلام نمبر اس نمبر کے مرتب جناب کبیر احمد جائسی (مدیر معاون ادیب) ایک ہونہار نوجوان ہیں، جن سے علم و فن کی بہت سی توقعات وابستہ ہیں، اس نمبر میں انھوں نے متعدد اہم موضوعات پر اظہار خیال کیا ہے، اسے پڑھ کر مجموعی طور پر ان کی صلاحیت کا ایک اچھا اندازہ ہوتا ہے۔ اگرچہ اس میں ایسی باتیں بھی ملتی ہیں جو خاص طور پر دینی علوم و فنون میں ان کی قلت مطالعہ کی غماز ہیں لیکن ان کی نشان دہی میں ضروری نہیں سمجھتا جیسے جیسے ان کا علم اور مطالعہ بڑھتا جائے گا وہ خود ان خامیوں کو محسوس کر لیں گے۔ خاص طور پر مولانا عبد السلام ندوی مرحوم و مغفور کے "مذہبی افکار" کے عنوان سے جو کچھ پیش کیا گیا ہے یہاں ان میں سے چند باتوں پر تبصرہ نگار اپنے خیالات پیش کر رہا ہے ——— جناب مرتب نے مولانا مرحوم کی ایک غیر مطبوعہ کتاب سے حدیث نبوی کے بارے میں ان کے افکار پیش کیے ہیں، ان افکار پر قابل اعتماد تنقید کے لیے ضروری ہے کہ ناقد کے سامنے وہ پوری کتاب ہو محض اقتباسات پر تنقید قابل اعتماد نہیں ہو سکتی لیکن مرتب نے کافی اقتباسات دیے ہیں اور ان سے نتائج بھی اخذ کیے ہیں اس لیے ان پر انہیں کی روشنی میں اظہارِ خیال کی گنجائش موجود ہے۔ تبصرہ نگار جو کچھ لکھ رہا ہے وہ محض اشارات ہیں۔ ہر موضوع پر مفصل اظہار خیال کا یہ موقع نہیں —

(۱) معتزلہ اور انکار حدیث کے باب میں مرحوم کا یہ لکھنا کہ "عام طور سے مشہور ہے کہ فرقۂ معتزلہ نے سب سے پہلے حدیث کا انکار کیا تھا" عجیب محسوس ہوا کیونکہ عام طور سے جو بات مشہور ہے وہ یہ ہے کہ سب سے پہلے فرقۂ معتزلہ نے بعض احادیث نبوی کا انکار کیا تھا اور یہ بات اس لیے صحیح ہے کہ خوارج کا وجود معتزلہ سے پہلے ہے۔ اہل علم یہ بھی جانتے ہیں کہ خوارج کا انکارِ حدیث، معتزلہ کے انکار سے زیادہ شدید ہے۔ نیز یہ بات بھی اہل علم کو معلوم ہے کہ خوارج ہوں یا معتزلہ ان میں سے کسی فرقے نے بھی مطلقاً حجیت حدیث کا انکار نہیں کیا ہے بلکہ صرف ان احادیث کا انکار یا تاویل کی ہے جو ان کے مسلک کے خلاف پڑتی ہیں۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ معتزلہ کی مختلف شاخیں ہیں جو

باتیں ان سب کے نزدیک مسلمہ اور مشترک ہیں ان میں شاید کسی محقق نے بھی انکار حدیث کے مسئلے کا ذکر نہیں کیا ہے اس لیے کوئی جاننے والا یہ بات کس طرح کہہ سکتا ہے کہ معتزلہ کی تمام شاخیں حدیث کا انکار کرتی تھیں۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ مولانا کا یہ اظہار کہ معتزلہ کے تمام فرقے منکر حدیث نہ تھے کوئی علمی اکتشاف نہیں ہے۔ باقی رہا موجودہ دور کے منکرین حدیث کا دعویٰ تو ان کے دعاوی کا کیا کہنا، یہ تو ان میں سے ایک حقیر دعویٰ ہے۔

(۲) معتزلہ کو اسلام کا ایک اہم جاندار اور ممتاز فرقہ قرار دینے سے مولانا مرحوم کا مقصد کیا تھا یہ بات واضح نہیں ہے ویسے ان الفاظ کے جو لغوی معنی ہیں اس کے لحاظ سے صرف معتزلہ نہیں بلکہ خوارج اور شیعہ بھی اسلام کے اہم جاندار اور ممتاز فرقے ہیں۔ جار اللہ زمخشری معتزلی کی تفسیر کشاف اہل السنۃ والجماعۃ کے درمیان بھی کتب تفاسیر میں ایک اونچا مقام رکھتی ہے اور آیات کی تفسیر میں مستند ہے۔ یہ بات بھی سب کو معلوم ہے کہ جمہور علماء کے نزدیک، فرقہ معتزلہ بحیثیت مجموعی ہرگز کافر اور گردن زدنی نہیں ہے بلکہ تمام اشاعرہ کے بارے میں بھی یہ کہنا کہ وہ معتزلہ کو کافر کہتے تھے، محل نظر ہے۔ اس تفصیل سے بھی یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ معتزلہ کو ممتاز فرقہ کہنا مولانا مرحوم کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔

(۳) حدیث کیا ہے؟ اس باب کے جو اقتباسات دیے گئے ہیں اور مرتب نے خود جو کچھ لکھا ہے وہ بہت مبہم اور گنجلک ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جالسی صاحب نے اس باب پر اظہار خیال کے لیے کوئی تیاری نہیں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ "حضرت زید بن ثابت کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر گفتگو حدیث نہ تھی صرف آپ ہی کا خیال نہیں بلکہ پورے قبیلہ قریش کا یہی خیال تھا۔"

اس عبارت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مرتب حضرت زید بن ثابت کو قبیلۂ قریش کا ایک فرد سمجھ رہے ہیں ورنہ دونوں جملے بے ربط ہو جاتے ہیں۔ حضرت زید بن ثابت قریشی نہ تھے، انصار کے قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ آگے چل کر انھوں نے لکھا ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضورؐ کی ہر گفتگو لکھ لیا کرتے تھے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے، بلکہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص لکھا کرتے تھے خود مولانا مرحوم نے حضرت زید بن ثابت کے قول اور حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی کتابت حدیث اور اس پر اعتراض کے واقعے سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ صحیح نہیں ہے لیکن اس پر گفتگو موجب طوالت ہے۔

(۴) محدثین نے حدیث کی جو تعریفیں کی ہیں ان پر مولانا مرحوم کا اعتراض سمجھ میں نہیں آیا جو اقتباسات دیے گئے ہیں ان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا یہ سمجھتے تھے کہ محدثین نے حضورؐ کے افعال و احوال کو بھی حدیث کہہ دیا

حالانکہ عہدِ رسالت میں حدیث صرف قولِ رسول کو کہتے تھے' اگر واقعی اعتراض یہی ہے تو مولانا مرحوم جیسے ذہین آدمی سے اس کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی بھلی بات ہے کہ حدیث لغت میں قول اور کلام کو کہتے ہیں اس لیے محدثین حضور کے فعل کو حدیث کیسے کہہ سکتے تھے۔ مثال کے طور پر کیا انھوں نے حضور کی نماز کو' روزے کو اور حج کو حدیث کہا ہے؟ محدثین کی تعریفِ حدیث کا مقصد یہ نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے بلکہ مقصد صرف اتنا ہے کہ جن سلاسل اسناد کے ذریعہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال کے علاوہ آپ کے افعال و احوال ہم تک منتقل ہوئے ہیں ان پر بھی حدیث کا اطلاق ہوگا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضور کی وفات کے بعد آپ کے اقوال و افعال و احوال جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ اس کا صرف یہی ذریعہ ہو سکتا ہے کہ حضور کے سننے والے اور دیکھنے والے دوسروں سے بیان کریں اور پھر یہ سلسلہ آگے بڑھے۔ محدثین کی تعریف کا مقصد یہ ہے کہ اس سلسلۂ اسناد کے ذریعہ حضور کا کوئی فعل یا حال معلوم ہو تو اس پر بھی حدیث کا اطلاق ہوگا مثلاً ایک تابعی کہتے ہیں کہ مجھ سے فلاں صحابی نے بیان کیا کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ کو نماز میں کندھوں تک دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے دیکھا' سوال یہ ہے کہ اس بیان کو اصطلاحاً کیا کہا جائے؟ محدثین کا جواب یہ ہے کہ اسے بھی حدیث کہا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ اس ذریعہ علم یا سلسلۂ بیان کو حدیث کہہ رہے ہیں نہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ اٹھانے کو۔ معلوم نہیں' مولانا مرحوم ان احادیث کو کیا کہتے تھے جن میں حضور کے افعال و احوال کا بیان ہے۔ محدثین نے "حدیث" کی جو تعریفیں کی ہیں اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کے اور فقہا کے نزدیک "حدیث" اور "سنت" کی تعریفیں ایک ہیں۔ چنانچہ اصول فقہ کی کتابوں میں حدیث کے بجائے سنت ہی کا لفظ اختیار کیا گیا ہے اور اس کی وہی تعریف کی گئی ہے جو محدثین کے یہاں حدیث کی ہے اور سنت کا اطلاق حضور کے فعل پر عہدِ رسالت میں بھی ثابت ہے۔

(۵) آج تک کسی شخص نے بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بلا استثنا تمام اقوال یا تمام افعال کو دینی اور شرعی کہہ کر امت کے لیے واجب العمل قرار نہیں دیا ہے۔ اصول شرع کی کتابوں میں سنت نبوی کی تقسیم' اس کے متعلقات اور واجب العمل ہونے اور نہ ہونے کے لحاظ سے ان پر مفصل مباحث موجود ہیں۔ یہ بھی سب کے نزدیک مسلّم ہے کہ حضور نے بعض باتیں مزاح و تفریح میں بھی فرمائی ہیں لیکن یہ بات آج تک کسی صاحب علم نے نہیں کہی کہ اس کا "مذہب اور اخلاق" سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ حضور کے مزاح کے بہت سے نمونے احادیث میں مروی ہیں۔ مثلاً ایک بچے نے ایک پرندہ پالا وہ اتفاق سے مرگیا تو آپ نے اس سے فرمایا "اے ابو عمیر! نغیر (پرندہ) نے یہ کیا کیا کہ مرگیا؟" یہ بالکل ایک مزاحی اور تفریحی جملہ ہے۔ دیکھا؟ اخلاق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے؟ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ بچوں سے تفریح و مزاح کی باتیں کرنا

ثقاہت و سنجیدگی اور ورع و تقوی کے خلاف نہیں ہے اور کیا اس نقطہ نظر کا انسان کی اخلاقی زندگی پر کوئی ا
مرتب نہیں ہوتا؟ ــــــ اسی طرح حدیث ام زرع اور حدیث خرافہ عرب کے مشہور قصوں کی صدائے بازگشت
ان میں بیان کی ہوئی باتوں سے دینی مسائل اخذ نہیں کیے جائیں گے لیکن کیا ان قصوں کا حضور کی زبان مبارک
ادا کیا جانا کوئی اہمیت نہیں رکھتا؟ کیا اس سے ثابت نہیں ہوتا کہ اس طرح کے قصوں کی حکایت اور ان کو اپنی زبا
دہرانا جائز ہے اور یہ کہ ایسی حکایتیں بیان کرنا ثقاہت اور ورع و تقوی کے خلاف نہیں ہے

(۶) ظہور مہدی کی احادیث پر تنقید کرتے ہوئے مرحوم نے "اہل بیت رسول اللہ" کا جو نقشہ پیش کیا
میرا خیال ہے کہ اسے محمود عباسی کے پاس بھیج دینا چاہیئے وہی اہل بیت کی اس قدر افزائی کی کما حقہ قدر کر سکے

(۷) فتنۂ دجال اور نزول عیسیٰ علیہ السلام کی احادیث کو موضوع قرار دینا میرے نزدیک مرحوم کی بہ
بڑی لغزش ہے اللہ انہیں معاف فرمائے۔ یہ احادیث اتنی اعلیٰ درجے کی سندوں سے مروی ہیں اور راویوں کی تعدا
کثیر ہے کہ بہت ہی کم دوسری احادیث ان کا مقابلہ کر سکتی ہیں، اگر ان احادیث کو بھی موضوع قرار دیا جا سکتا ہ
اس کے معنی یہ ہیں کہ حدیث کو جانچنے میں سند کی صحت اور راویوں کی کثرت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ دوسری بات
ہوتی ہے وہ یہ کہ کسی مسئلے یا عقیدے پر علمائے امت کا اجماع بھی کوئی وزن نہیں رکھتا۔ غور فرمائیے کہ ان دو
کے بعد دین میں حجیت حدیث کا کیا درجہ باقی رہتا ہے۔ پھر تو صورت حال یہ بنتی ہے کہ عوام کو نہ سہی کم سے کم
عالم دین کو اس کی آزادی حاصل ہو جاتی ہے کہ جس حدیث کو وہ ناپسند کرے یا جو حدیث اس کی سمجھ میں
اسے موضوع کہہ کر رد کر دے۔ میرا خیال ہے کہ مرحوم نے اس کے دور رس نتائج کا کوئی اندازہ نہیں کیا تھا
جذب میں انھوں نے ان احادیث کو موضوع لکھ دیا ہے ــــ اگر یہ اجتہاد ہے تو معلوم نہیں موجودہ دور کے
کا تصور کیا ہے اور ان کے تجدد کو اجتہاد کیوں تسلیم نہیں کیا جا سکتا؟ ــــ کسی محدث اور عالم کے ذوق سلیم
کی صحت و عدم صحت کے لیے معیار مان لیا جائے تو کتنی حدیثیں متفقہ طور پر صحیح باقی رہیں گی؟ اس کے
عجیب بات ہوگی کہ جن احادیث کو تیرہ سو برس میں اساطین علم حدیث کے ذوق سلیم نے رد نہیں کیا ا
عالم دین کا ذوق سلیم رد کر رہا ہے۔ کیا مرحوم کا ذوق سلیم گزشتہ تمام محدثین کے ذوق سلیم سے بڑھا ہ

(۸) کیا حدیث دینی حجت ہے؟ اس باب میں مرحوم نے حدیث کے حجت شرعی ہونے کا جو معنی بیا
وہ تبصرہ نگار کی سمجھ میں نہیں آیا سا ان کے نزدیک حدیث کے حجت شرعی ہونے کے معنی یہ ہیں کہ [illegible]
معاملات میں بطور ثبوت و حجت پیش کیا جائے۔ اس بیان سے مولانا کا مقصد کیا تھا یہ [illegible]

اور فقہاء کی اصطلاح کے مطابق "معاملات" عبادات و اخلاق میں داخل نہیں ہیں بلکہ یہ سب علیحدہ اقسام ہیں۔ تو کیا مرحوم کا مقصد یہ ہے کہ احادیث صرف مقدرات و معاملات میں حجت ہیں، عبادات و اخلاق میں حجت نہیں ہیں اور اگر یہ مطلب نہیں ہے تو پھر حجیت حدیث کو صرف مقدرات و معاملات کے ساتھ خاص کرنے کی وجہ کیا ہے ؟

(۹) خلافِ عقل ہونے کا صحیح مفہوم کیا ہے ؟ آیا یہ کہ کسی بات کے بارے میں عقل، دلیل کی بنیاد پر اس کے غلط ہونے کا فیصلہ کرے یا یہ کہ کوئی بات عقل کی گرفت میں نہ آئے، ظاہر ہے کہ اس کا پہلا ہی مفہوم صحیح ہے اور دوسرا غلط ہے لیکن مولانا مرحوم نے کہیں تو پہلے مفہوم کو سامنے رکھ کر بات کہی ہے اور کہیں دوسرے مفہوم کے لحاظ سے بلکہ اس سے بھی الگ ہو کر کسی چیز کو خلافِ عقل قرار دیا ہے۔ مثلاً انھوں نے معراج اور واقعات قیامت وغیرہ سے متعلق احادیث کو برقرار رکھنے کا مشورہ دیا ہے اور انہیں علوم نبوت کا جز کہا ہے لیکن یہ باتیں چونکہ اس زمانے کے بہت سے "ذوی العقول" کی سمجھ میں نہیں آتیں، اس لیے مولانا نے فرمایا ہے کہ "علوم نبوت کا یہ سلسلہ سائنس اور کیمسٹری کی گرفت سے بالاتر ہے۔" اور دوسری جگہ تخلیق آدم کے سلسلے کی اس حدیث کو کہ آدم کی تخلیق کے وقت ان کا قد ساٹھ گز کا تھا خلافِ عقل قرار دیا ہے۔ پوچھنے والا پوچھ سکتا ہے کہ یہ کیوں خلافِ عقل ہے ؟ یہ بات بھی نہیں کہ عقل کسی دلیل کی بنا پر اسے غلط قرار دیتی ہو اور یہ بات بھی نہیں کہ یہ عقل کی گرفت سے بلند ہو تو پھر اسے خلافِ عقل کہنا کس مفہوم کے لحاظ سے صحیح ہوگا ؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ مولانا اس حدیث کا مطلب یہ سمجھتے ہوں کہ جب آدم علیہ السلام ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے تو ان کا قد ساٹھ گز تھا۔ اگر کوئی شخص کہے کہ پانچ فٹ قد رکھنے والی عورت کے بطن سے ساٹھ گز کا بچہ پیدا ہوا تو یہ بات خلافِ عقل ہوگی لیکن اگر کوئی شخص کہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا کالبد ساٹھ گز کا بنایا تھا تو آخر یہ خبر خلافِ عقل کس عقل سے کہی جا سکتی ہے۔

اظہار خیال کے لیے ابھی کئی چیزیں باقی ہیں لیکن اب تبصرے کے لیے اوراق میں گنجائش نہیں ہے۔ تمام باتوں پر مفصل اظہار خیال کے لیے ایک کتاب کی وسعت درکار ہے۔ آخر میں اتنا اور عرض کر دینا ضروری ہے کہ حدیث کے بارے میں مولانا مرحوم کے ان افکار و خیالات کو شائع کر کے جالندھری صاحب نے ان کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ میں اسے ان کی جذباتی عقیدت کا ثمرہ سمجھتا ہوں۔ یہ دور جب گزر جائے گا تو وہ خود اس کی اشاعت کو ایک غلطی تسلیم کریں گے۔

(ج۔ ق)

کتاب انقلاب

ضخامت ۱۲۸ صفحات۔
ملنے کا پتہ:۔ آزاد بک ڈپو سرگودھا۔ مغربی پاکستان

اسعد گیلانی صاحب کے دس ہلکے پھلکے مضامین کا مجموعہ "کتاب انقلاب" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ یہ مضامین دلنشیں انداز میں اسلام کی دعوت اور اس کے مختلف تقاضوں سے بحث کرتے ہیں۔ جا بجا لکھنے والے کا خلوص اور درد نمایاں ہے۔ ان مضامین کے مطالعہ سے انسان کے اسلامی جذبات میں تحریک پیدا ہوتی ہے اور جوش عمل بڑھتا ہے۔ اسعد گیلانی صاحب کا انداز تحریر دلکش اور اثر انگیز ہے لیکن کتاب میں بعض ایسے فقرے بھی موجود ہیں جو کسی ادیب کے قلم سے نہیں نکلنے چاہییں کہ اس طرح کے فقرے ذوق ادب پر بار رہیں۔

چند مثالیں

"اسے اس نظام کے وجود نے ہی منافعوں اور فائدوں اور مناصب و مرتبوں سے معمور کیا ہوتا ہے۔"

"اس نے اپنی عام امداد کے ساتھ ان چھوہاروں کے لیے خاص طور پر اپنے آرام کے اوقات کو قربان کر کے رات بھر محنت کی ہوتی ہے۔"

"کاروباری آدمی اپنے کاروبار میں اخلاص عمل ثابت ہوتا ہے۔"

"حضور اور آپ کے صحابہ نے جو نمونہ پیش کیا وہ تاریخ کے کسی دور کی کسی تحریک کے کارکنوں اور لیڈروں کے لیے بھی بہترین نمونہ ہے۔"

ایک جگہ یہ آیت نقل کی گئی ہے لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔ آیت کا ترجمہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔ "خبردار! ایسی تجارت نہ کرو کہ خدا کو بھول جاؤ۔"

یہ ترجمہ صحیح نہیں ہے۔ صحیح ترجمہ یہ ہے۔ "تجارت اور خرید و فروخت ان کو اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔"

(ج۔ ح)

سنت قرآن حکیم کی روشنی میں

مرتبہ مولانا عبدالغفار حسن صاحب۔ قیمت:۔ ۲۵ نئے پیسے۔ ناشر: شعبۂ نشر و اشاعت جامعہ تعلیمات اسلامیہ۔ ۵ جناح کالونی لائل پور۔ مغربی پاکستان

حدیث کے علم اور اس کی خدمت میں مولانا عبدالغفار حسن صاحب پاکستان کی ایک معروف شخصیت ہیں۔ انہوں نے ۱۹۵۵ء میں ایک مقالہ تحریر کیا تھا جو پہلے رسالہ ترجمان القرآن میں شائع ہوا اس کے بعد رسالہ مقام رسالت کراچی میں چھپا۔ اسی مقالے کو اب ضروری حذف و اضافہ کے ساتھ زیر تبصرہ کتابچہ کی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس مقالے میں قرآنی آیات سے ثابت کیا گیا ہے کہ اسلامی شریعت کا دوسرا ماخذ سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ جو لوگ کسی تعصب کے بغیر اس مسئلہ کو سمجھنا چاہتے ہوں ان کے لیے اس کا مطالعہ مفید ہوگا۔ بھارت سے اس پمفلٹ کو منگوانے والے حضرات صرف ایک کارڈ لکھ کر منگوا سکتے ہیں۔

(ح۔ ق)

(بقیہ اشارات) غیر اللہ کے لیے رکوع اور سجدہ اور اس طرح کے دیگر مظاہر شرک کو شریعت اسلامیہ نے دو وجوہ سے شرک قرار دیا ہے ایک وجہ تو یہ ہے کہ عموماً عملی شرک کے پیچھے عقیدے کا شرک بھی موجود ہوتا ہے، اس طرح جڑ اس سے پھوٹی ہوئی شاخیں، پتیاں اور پھول پھل مل کر ایک پورا شجرِ خبیث تیار ہو جاتا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ یہ چاہتا ہے کہ اس کے موحد و مومن بندے صورۃً اور عملاً بھی ان مظاہر کے قریب نہ پھٹکیں ورنہ اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ عملی شرک انہیں عقیدے کے شرک میں مبتلا کر دے۔ شرک چونکہ ایک ایسا ظلمِ عظیم اور ایک ایسی معصیتِ کبریٰ ہے جسے اللہ کبھی معاف نہ کرے گا اس لیے شریعت اسلامیہ نے اس کے تمام رخنوں کو بند کر دیا ہے۔

جس شرک کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے وہ کسی خاص بت، کسی خاص شے، کسی خاص شخص یا اشخاص کے کسی خاص مجموعے کے ساتھ محدود و مخصوص نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ لات، ہبل، عزیٰ، ود، سواع، نسر اور اسی طرح کے چند خاص بتوں کو جن کا ذکر قرآن میں ہے، خدا کے مخصوص حقوق میں شریک ماننا تو منصوص شرک ہوا اور دنیا کے ان ہزاروں بتوں کو جن کا ذکر قرآن میں نہیں ہے شریک ماننا غیر منصوص اور اجتہادی شرک بن جائے۔ یا ایسا نہیں ہے کہ مشرکین عرب نے اپنے جن سرداروں کو حقِ تشریع دے دیا تھا یا یہودیوں نے اپنے جن احبار و رہبان کو قانونِ الٰہی کے علی الرغم قانون ساز مان لیا تھا ان کا ارباب من دون اللہ ہونا تو منصوص ہوا اور یہی حق آج انسانوں کے کسی گروہ کو دے دیا جائے تو اس کا ارباب من دون اللہ ہونا غیر منصوص اور اجتہادی بن جائے۔ پہلے تو یہ تھا کہ کسی ملک یا کسی قوم کا ایک خاندان یا چند افراد معبود ہوتے تھے اور پورا ملک اور پوری قوم ان کی عبادت گزار اور آج اس دورِ ارتقاء میں شرک نے بھی مدارجِ ارتقاء طے کر لیے ہیں اور ماشاء اللہ جمہور کی خدائی کا دور آ گیا ہے، اب ہر ملک کا ہر فرد ایک چھوٹا خدا بن گیا ہے یا بنا دیا گیا ہے۔ تو کیا اس ارتقائی شرک کو غیر منصوص اور اجتہادی سمجھنا صحیح ہو گا؟

جو حال شرک کا ہے وہی اعمال شرک اور مظاہر شرک کا بھی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ قرآن اور احادیث میں تمام مظاہر شرک کا ذکر عبارۃ النص میں موجود ہو، ایسا عملاً ممکن نہ تھا، پہلے معلوم ہو چکا کہ منصوصات صرف عبارۃ النص میں محدود نہیں ہیں۔ اشارۃ النص، دلالۃ النص اور اقتضاء النص سے جن مظاہر شرک کی حرمت ثابت ہے وہ سب منصوص ہیں۔ ایک مثال سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ مظاہر شرک میں سب سے بڑا مظہر کسی غیر حق کے سامنے سجدہ کرنا ہے اور اس کی ممانعت کے لیے جو آیت آئی ہے وہ یہ ہے:۔

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝	اور اس کی نشانیوں میں رات، دن، سورج اور چاند ہیں، نہ سورج کو سجدہ کرو اور نہ چاند کو اور اللہ کو سجدہ کرو جس نے ان سب کو پیدا کیا اگر تم صرف اس کی عبادت کرتے ہو۔

شاید پورے قرآن میں غیر اللہ کو سجدہ کرنے کی ممانعت صریح الفاظ میں اسی جگہ موجود ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ صرف سورج اور چاند کو سجدہ کرنے کی ممانعت قرآن میں منصوص ہے اور باقی اشیاء کو سجدہ کرنے کی ممانعت اس میں منصوص نہیں ہے تو کیا اس کا یہ قول صحیح ہوگا؟ کھلی بات ہے کہ بالکل غلط ہوگا! دوسرے نصوص کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ صرف اس آیت کے لحاظ سے بھی اصولاً ہر غیر اللہ کے لیے سجدے کی ممانعت منصوص ہے۔ شجر و حجر سے لے کر انبیاء و اولیاء تک کو سجدہ کرنے کی ممانعت کے لیے یہ آیت نص قطعی ہے۔

حاکمیت جمہور کے عقیدۂ و نظریہ کی بنیاد پر دنیا میں جو اسمبلیاں اور پارلیمنٹیں کام کر رہی ہیں ان کی حیثیت و نوعیت اس کے سوا اور کیا ہے کہ لوگوں نے اپنے اس عقیدہ پر عمل کرنے کے لیے انتخابات کا ایک نظام وضع کر لیا ہے، چند عمارتیں بنالی ہیں اور وہاں بیٹھ کر پورے ملک کے لیے وہ جو قانون چاہتے ہیں بناتے ہیں اور یہ پارلیمنٹیں اپنے بنائے ہوئے قوانین کے لیے خود آخری سند کا درجہ رکھتی ہیں۔ اگر یہ شرک کا منصوص مظہر نہیں ہیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ دنیا بھر کے بے شمار مندر آخر کس دلیل کی بنیاد پر شرک کے منصوص مظاہر قرار پائیں گے۔ غیر تسلی بخش تاویلیں کر کے تو لات و منات اور ان کے استھانوں سے متعلق شرک کی بھی نفی کی گئی ہے اور آج بھی کی جا سکتی ہے لیکن عقل و نقل نے کبھی ان تاویلوں کو قبول نہیں کیا ہے۔ لات و منات کی جگہ جو بت بھی رکھ دیئے جائیں اور ان کے جو استھان بھی بنالیے جائیں نص قطعی انہیں شرک ہی قرار دیتی ہے۔ آج لات و منات کے مقام پر قوم و وطن کو رکھ دیا گیا ہے اور ان کے استھانوں کی جگہ پر اسمبلیاں اور پارلیمنٹیں تعمیر کر لی گئی ہیں تو کیا اس کی وجہ سے شرک کی حقیقت بدل جائے گی؟

یہ جو کچھ لکھا گیا ہے اس کی غرض یہ ہے کہ شرک جیسے خطرناک مسئلے میں ہمیں چوکنا رہنا چاہیے۔ شرک کے مقابلے میں نرم رویہ اختیار کر کے اپنے وجود، اپنے مفاد اور ملت اسلامیہ ہندیہ کے وجود و مفاد کا تحفظ تو مشکوک ہے لیکن اخروی مفاد کی تباہی یقینی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو آخرت کی تباہی سے بچائے۔ آمین!

زندگی

جلد :- ۲۸
شمارہ :- ۶

محرم الحرام ۱۳۸۲ھ
جون ۱۹۶۲ء

(مدیر :- سید احمد عروج قادری)

• خط و کتابت اور رسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور یوپی
• زر سالانہ : چھ روپے - ششماہی :- تین روپے - فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے
• ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پاکستانی اصحاب حسب ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/c شاہ عالم مارکیٹ لاہور
[illegible]

اشارات

(سید احمد عروج قادری)

استاذ نے کلاس میں اپنے ایک شاگرد سے کہا:- جاؤ مدرسے کے گھڑوں یا نل سے ایک گلاس پانی لاؤ۔ شاگرد اپنی جگہ سے اٹھا اس نے ہر اس گھڑے کو دیکھا جس میں پانی ہو سکتا تھا لیکن کسی میں پانی موجود نہ تھا پھر اس نے نل سے پانی لینا چاہا لیکن وہ بھی خشک تھا، استاذ کے پاس واپس آیا اور عرض کی، کسی گھڑے میں پانی موجود نہیں ہے اور نل بھی خشک ہے "شاباش، کوئی حرج نہیں بیٹھ جاؤ" یہ تھا استاذ کا جواب ــــــ افسر اعلیٰ نے اپنے ماتحت افسر کو ایک مہم پر بھیجتے ہوئے حکم دیا:- جاؤ، اس مہم کو سر کرو اور مجرم کو زندہ یا مردہ میرے سامنے حاضر کرو۔ چھوٹی سی پولیس فورس نے گھنے جنگل میں بڑی مشقت اٹھا کر ڈاکوؤں کی کمین گاہ کو گھیر لیا، ڈاکوؤں کے سردار نے گولیاں برسانی شروع کر دیں، ادھر سے بھی جواب میں گولیاں برسنے لگیں اس مقابلے میں ایک گولی پولیس کے جواں سال افسر کا دل چیرتی ہوئی پشت سے باہر نکل گئی، ڈاکو فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے اور ماتحت افسر کی لاش افسر اعلیٰ کے سامنے حاضر کی گئی، وہ لاش سے لپٹ گیا، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور پھر وہ لاش پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ دفن کر دی گئی اور حکومت نے اس افسر کی بیوی بچوں کے لیے وظیفے مقرر کر دیے یہ دو مثالیں، نادر مثالیں نہیں ہیں، بلکہ اس طرح کی بیسیوں مثالیں روزانہ ہماری نگاہوں سے گزرتی رہتی ہیں۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ شاگرد کو ایک گلاس پانی لانے کا حکم دیا گیا تھا مگر وہ پانی نہ لا سکا۔ ماتحت افسر پر مہم کو سر کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی لیکن وہ مہم سر نہ کر سکا، بلکہ خود اپنی جان گنوا بیٹھا۔ اس کے باوجود استاذ کی طرف سے شاباش، اور حکومت کی طرف سے اعزاز و اکرام کے کیا معنی؟ بظاہر تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دو میں کسی نے اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی لیکن کیا فی الواقع بات یہی ہے؟ ذرا سا تامل واضح کر دیتا ہے کہ ان دونوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی تھی اور وہ دونوں جس بات کے مکلف گردانے گئے تھے اس سے عہدہ برآ ہو چکے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو نہ شاگرد کو شاباش ملتی اور نہ افسر کو اعزاز و اکرام نصیب ہوتا اس کی وجہ یہ ہے کہ [illegible]

حقیقت پوشیدہ ہوتی ہے کہ مامور پر ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مخلصانہ جدوجہد کافی ہے، اس جدوجہد کے نتیجے میں وہ حکم بالفعل وجود میں آجائے جب بھی اور نہ آئے جب بھی ہر دو حال میں مامور اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہوجاتا ہے۔ پہلی مثال میں کون یہ کہہ سکتا ہے کہ شاگرد کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ گھڑوں میں اور نل میں پانی موجود پائے اور موجود نہ ہو تو پانی پیدا کرکے گلاس بھر لائے۔ دوسری مثال میں کس شخص کے ذہن میں یہ بات آسکتی ہے کہ ماتحت افسر کی ذمہ داری یہ تھی کہ مجرم سے کسی حال میں شکست نہ کھائے اور اس کی گولی سے مرنے نہ پائے۔ عام حالات میں ہم جب کسی سے پانی مانگتے ہیں تو یہی کہتے ہیں کہ پانی لاؤ، یہ نہیں کہتے کہ پانی لانے کی جدوجہد کرو لیکن اس کے باوجود ہمارا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مخاطب نے اگر پانی لانے کی کوشش کی اور کسی مانع کی وجہ سے نہ لا سکا تو وہ اپنی ذمہ داری پوری کرے گا اور کم سے کم ہماری ملامت یا سزا کا مستحق نہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں جن چیزوں کا مکلف گردانا ہے اور جو احکام دیے ہیں ان کا حال بھی یہی ہے۔ کسی حکم پر عمل کرنے کے لیے ہمیں جو کچھ کرنا چاہیے اور جو کچھ ہم کرسکتے ہیں وہ سب ہم نے کرلیا تو ہماری ذمہ داری ختم ہوگئی اس کے بعد وہ کام کسی ایسے مانع کی وجہ سے نہ ہوسکا جسے ہم دور نہ کرسکتے تھے تو ہم سزا کے نہیں، جزا کے، وزر کے نہیں، اجر کے مستحق ہوں گے۔ مثال کے طور پر دیکھیے کہ ایک مسلمان پر حج فرض ہوگیا، اس فرض کی ادائگی کے لیے اسے کیا کرنا چاہیے اور وہ کیا کرسکتا ہے۔ بس یہی کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے تمام انتظامات درست کرے اور گھر سے بیت اللہ کا قصد کرکے چل پڑے۔ ایک شخص نے یہ سب کچھ کرلیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ مکہ معظمہ پہنچے اس کی روح پرواز کرگئی، ظاہر ہے کہ وہ حج نہ کرسکا لیکن کیا وہ اپنی ذمہ داری سے بھی عہدہ برآ نہ ہوا؟ وہ خدا کے عتاب کا مستحق ہوگا یا نوازش کا؟ اسلامی شریعت ہمیں بتاتی ہے کہ اس نے اپنی ذمہ داری پوری کرلی اور حج کا اجر اسے مل گیا بلکہ بعض حدیثوں سے تو معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص بعض حیثیتوں سے ان لوگوں سے بھی زیادہ فائدے میں رہتا ہے جو بالفعل حج کرکے اپنے گھر واپس آتے ہیں۔ اللہ و رسول کی طرف ہجرت کے مسئلے میں قرآن کی تصریح یہ ہے:۔

وَمَنْ يَّخْرُجْ مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا	اور جو شخص نکلتا ہے اپنے گھر سے، اللہ و رسول کی
اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ	طرف ہجرت کا ارادہ سے، پھر (راستے میں) اسے موت
فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ (النساء:۱۰۰)	آجاتی ہے تو اس کا اجر اللہ کے یہاں ثابت ہوگیا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ ایک صحابی مکہ سے ہجرت کرکے مدینہ جانے کے لیے اپنے گھر سے نکلے لیکن ابھی تھوڑی

ہی دور گئے تھے کہ مقام تنعیم میں ان کا انتقال ہو گیا جب مدینہ اس کی خبر پہنچی تو صحابہ نے کہا کاش وہ مدینہ پہنچ کر مرتے تو انہیں پورا اجر ملتا اس کے بعد مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی اور اس نے واضح کر دیا کہ انہیں پورا اجر مل گیا پورا اجر ملنے کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ انھوں نے اپنی ذمہ داری پوری کر لی تھی ـــــ آیت اگرچہ ہجرت کے سلسلے میں نازل ہوئی ہے لیکن علماء نے تصریح کی ہے کہ اس کا حکم، سفر حج، طلب علم اور تمام اعمال خیر میں عام ہے۔ اس آیت نے جو مہتم بالشان اصول ہمیں دیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ و رسول کے کسی حکم پر عمل کرنے کی مخلصانہ نیت اور اس کے لیے جد و جہد ذمہ داری کے اس بوجھ کو ہٹا دیتی ہے جو اس حکم نے انسان کے سر پر رکھا تھا۔ مانع کی وجہ سے بالفعل اس حکم کی عدم تکمیل کے باوجود وہ خدا کے سامنے سرخ رُو اور اس اجر کا مستحق ہو جاتا ہے جو اس حکم پر عمل کر گزرنے والوں کے لیے مہیا کیا گیا ہے۔

بات واضح ہو چکی ہے لیکن اقامتِ دین کے نصب العین سے اس کا گہرا تعلق ہے اس لیے اس کی مزید توضیح مقصود ہے۔ حج اور ہجرت کی گزشتہ مثالوں میں ان اعمال کی تکمیل سے مانع موت ہوئی ہے۔ موت ایک ایسی چیز ہے جس پر انسان کی عدم قدرت بالکل واضح ہے۔ شبہہ ہو سکتا ہے کہ شاید کسی دوسرے مانع کا یہ حکم نہ ہو اور جو اصول بیان کیا گیا ہے اس سے یہ شبہہ دور ہو جانا چاہیے لیکن احکام شرع میں ایسی منصوص مثالیں بھی موجود ہیں جو اس شبہے کو بالکل ختم کر دیتی ہیں۔ مثلاً قتال فی سبیل اللہ کو دین میں جو اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، امام وقت کی طرف سے اگر نفیرِ عام ہو جائے تو ہر بالغ اور تندرست مسلمان پر جہاد میں شرکت واجب ہو جاتی ہے۔ اس صورت حال میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تندرست ہیں اور جہاد میں شرکت کر سکتے ہیں، وہ دل کے پورے ولولے کے ساتھ شریک بھی ہونا چاہتے ہیں لیکن شرکت کے لیے سامان کی ضرورت ہے اور سامان ان کے پاس نہیں ہے۔ وہ دوڑ دھوپ کرتے ہیں کہ خود اس کا انتظام کر لیں لیکن وہ اپنے مال میں اس کی کوئی گنجائش نہیں پاتے۔ وہ دوڑے ہوئے امام کے پاس جاتے ہیں کہ بیت المال سے ان کی مدد کی جائے لیکن بیت المال بھی خالی ہے۔ وہ اب کیا کریں، بے بس ہو کر روتے ہوئے اپنے گھروں کو واپس جاتے ہیں اور غزوے میں شریک نہیں ہوتے۔ ایسے افراد کا کیا حکم ہے؟ شرکتِ جہاد کی ذمہ داری ان سے ساقط ہوئی یا نہیں؟ اس غزوے کے اجر میں وہ شریک ہوئے یا نہیں؟ کتاب و سنت دونوں میں اس کی تصریح موجود ہے کہ ان کی مخلصانہ نیت اور سعی و کوشش نے نہ صرف یہ کہ شرکت جہاد کی ذمہ داری ختم کی بلکہ انہیں اجر میں بھی حصہ دار بنا دیا۔ سورۂ توبہ کی آیت (۹۲) پڑھیے۔ اس میں یہی نقشہ کھینچا گیا ہے جہاد پر گزرتا ہے آیت نے ایسے لوگوں کو الزام سے بری قرار دیا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خوش خبری سنائی ہے کہ وہ جہاد کے اجر میں

شریک ہوئے بلکہ حضورؐ کے الفاظ تو یہ ہیں کہ مدینہ میں قیام کے باوجود وہ سفر جہاد کے ہر مرحلے میں مجاہدین کے ساتھ رہے۔ معلوم ہوا کہ مخلصانہ نیت اور کوشش کے بعد موت سے کم درجے کا مانع بھی انسان کے سر سے ذمہ داری کا بوجھ ہٹا دیتا اور اسے اجر کا مستحق بنا دیتا ہے۔

اوپر جن اعمال کی مثالیں دی گئی ہیں ان کا تعلق مکلف و مامور انسان کی اپنی ذات سے ہے اب ان احکام کی بھی دو ایک مثالیں دیکھ لینی چاہییں جن کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایسی ذمہ داریوں میں یہ بات اور واضح ہے کہ ان کا مقصد جد و جہد اور سعی و کوشش کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہاں مامور کی ذمہ داری سر سے یہ ہوتی ہی نہیں کہ وہ اس حکم کو وجود میں لے آئے بلکہ صرف یہ ہوتی ہے کہ اسے وجود میں لانے کی سعی کرے اس کی واضح مثال اللہ کا یہ حکم ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا (التحریم)　　اے مومنو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔

یہ آیت دونوں قسم کے احکام کی جامع ہے۔ ایک کا تعلق انسان کی اپنی ذات سے ہے اور ایک کا تعلق دوسروں سے ہے۔ ہم یہاں اب دوسری قسم کے احکام پر غور کر رہے ہیں۔ یہ آیت ہر مسلمان کو اس بات کا بھی مکلف قرار دیتی ہے کہ وہ اپنی بیوی اور اپنی اولاد کو بھی جہنم کی آگ سے بچائے۔ سوچیے اس تکلیف اور اس ذمہ داری کا مطلب کیا ہو سکتا ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ اللہ نے ہر مسلمان کو ذمہ دار قرار دیا ہے کہ وہ اپنی بیوی، اولاد اور دوسرے گھر والوں کے دلوں میں ہدایت کا نور ڈال دے۔ نہیں خدا کا فرماں بردار بنا دے اور بہ ہر حال انہیں خدا کی نافرمانیوں سے روک دے۔ ظاہر ہے کہ یہ مطلب نہیں لیا جا سکتا۔ کیونکہ یہ ذمہ داری تو اللہ نے اپنے رسولوں پر بھی نہیں ڈالی، عام مسلمانوں کو وہ اس کا مکلف کیسے قرار دے سکتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا اور ان کی بیوی دونوں ہی خدا کی نافرمانی پر اڑے رہے اور عذاب الٰہی میں غرق ہوئے۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیوی بغاوت پر جمی رہی اور خدا کے عذاب میں گرفتار ہوئی۔

جب یہ مطلب نہیں ہو سکتا تو پھر اس ذمہ داری کا مقصد کیا ہے؟ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنی بیوی بچوں اور دوسرے گھر والوں کی اصلاح کے لیے سعی و جہد ضروری ہے وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اپنی وسعت کے اندر ان کی اچھی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرے، نیکی پر انھیں ابھارتا رہے اور بدی کے انجام سے ڈراتا رہے، ترغیب و ترہیب کی ہر ممکن صورت اختیار کرے، اگر اس نے یہ کر لیا تو اس کی ذمہ داری پوری

ہوگئی۔ عین ممکن ہے کہ اس تمام جدوجہد کے باوجود بیوی اور بچے اصلاح پذیر نہ ہوں لیکن ان کو ہدایت یافتہ بنا دینا ان کے ذمہ نہ تھا اس لیے اس سلسلے میں ان سے باز پرس نہ ہوگی، جب بعض بیویاں اور بعض بیٹے انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیم و تربیت قبول کرنے سے محروم ہو سکتے ہیں تو ہمارا اور آپ کا کیا سوال ہے۔ اس بحث سے معلوم ہوا کہ اپنے اہل بیت کو جہنم سے بچانے کا مطلب سعی و کوشش ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں کوئی دوسرا مطلب سرے سے لیا ہی نہیں جا سکتا۔ تفسیر روح المعانی میں ایک روایت کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ جب یہ آیت اتری تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کی، یا رسول اللہ! ہم پر اہل و عیال کو آگ سے بچانے کی ذمہ داری ڈالنے کا مطلب کیا ہے؟ آپ نے فرمایا، تم انہیں ان چیزوں سے منع کرو جن سے اللہ نے تمہیں منع کیا ہے اور انہیں ان چیزوں کا حکم دو جن کا تمہیں اللہ نے حکم دیا ہے تو اس طرح یہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف انہیں آگ سے بچانے کا سبب بن جائے گا۔ اس روایت نے تمام ایسی ذمہ داریوں کا مطلب واضح کر دیا ہے جن کا تعلق دوسرے لوگوں سے ہوتا ہے۔ میں اس طرح کے احکام کی ایک اور مثال پیش کرتا ہوں:

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ — اور اگر مومنوں کے دو گروہ آپس میں مقاتلہ کریں

اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا (الحجرات) — تو دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔

اصلاح ذات البین، بہت بڑی نیکی ہے اور کتاب و سنت میں اس کی تاکید و ترغیب بکثرت موجود ہے۔ اس حکم کا تعلق بھی دوسروں کے ساتھ ہے۔ یہاں بھی کہا گیا ہے: "صلح کرا دو" اور مطلب یہ ہے کہ مصالحت پیدا کرنے کی کوشش کرو کیونکہ بالفعل دونوں گروہوں کے درمیان مصالحت کرا دینا، کسی دوسرے انسان کے بس میں نہیں، اس کی قدرت میں جو کچھ ہے وہ کوشش ہے، دونوں گروہوں کو صلح کی توفیق دینا اور انہیں مصالحت پر آمادہ کر دینا صرف خدا کی قدرت میں ہے۔ اوپر قرآن کا جو ٹکڑا نقل کیا گیا ہے اس کے بعد جو ٹکڑے آ رہے ہیں وہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا کی ذمہ داری کا مطلب محض کوشش ہے ۔۔۔ ٹھیک یہی حال سورۂ شوریٰ کی آیت اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ کا بھی ہے۔ اقامت دین کا حکم انبیاء کرام اور ان کے ماننے والوں کو ایسی قوم، ایسے ملک اور ایسے ماحول میں دیا گیا تھا جب کہ قوم کی غالب اکثریت خدا کی باغی اور دین حق سے منحرف تھی بلکہ پورا ملک اور اس کا ماحول خدا کا دشمن تھا، اس لیے کسی ایسی قوم میں اس کی ذمہ داری ڈالنے کا مطلب یہی ہے کہ اسے برپا کرنے کی جدوجہد کی جائے۔ شرک پر توحید کا غلبہ، باطل پر حق کا استیلا اور مشرکین پر موحدین کی بالادستی اسی وقت ممکن ہے جب موانع راہ دور کر دیے گئے ہوں، اس کے بعد پورے دین کو عملاً قائم کرنے کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ان مثالوں اور اس بحث سے جو بات شفاف آئینے کی طرح چمک اٹھتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں کسی فرد یا گروہ پر صرف جد و جہد کی ذمہ داری ڈالنی ہوتی ہے وہاں بھی قرآن میں صیغہ وہی استعمال کیا جاتا ہے جو کسی شے کو بروئے کار لانے کی ذمہ داری ڈالنے کے لیے استعمال ہوتا ہے، اور یہ صرف قرآن ہی کی زبان نہیں ہے دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ایسا ہی کیا جاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اوامر و احکام اور مطالبات کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے۔ ذرا سے غور کے بعد اس کی دو وجہیں سمجھ میں آتی ہیں۔ پہلی وجہ نفسیاتی ہے۔ "صلح کرا دو" اور "صلح کرانے کی کوشش کرو" کے صیغوں میں تاثیر اور تاکید کے لحاظ سے بہت فرق واقع ہو جاتا ہے۔ پہلا جملہ سن کر ایک طرف تو مامور اس خوشی سے جھوم اٹھتا ہے کہ مالک اور حاکم کی نظر میں وہ ایک معتمد و معتبر وجود ہے اور دوسری طرف وہ یہ حکم سن کر اس طرح جد و جہد کرتا ہے جیسے صلح کو وجود میں لے آنے کا اسے ذمہ دار بنایا گیا ہو۔ دوسری وجہ کا تعلق زبان کے ایجاز و اختصار سے ہے۔ جس چیز کو عقل عام بلا شک و ریب خود سمجھ لے اس کو ذکر کر کے کلام کو طویل کرنا بلاغتِ کلام کے خلاف ہے۔ "صلح کرا دو" سے بھی وہی بات سمجھی جاتی ہے جو "صلح کرانے کی کوشش کرو" سے سمجھی جاتی اس لیے پہلے مختصر جملے کو چھوڑ کر دوسرے طویل جملے کو اختیار کرنا نامناسب ہے —— اب فرض کیجیے کہ کوئی شخص یہ اعتراض کرتا ہے کہ اللہ نے ان احکام میں انسان پر ایسی ذمہ داری ڈالی ہے جو اس کے بس میں نہیں ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ ان احکام میں ذمہ داری جو کچھ ڈالی گئی ہے وہ صرف کوشش کی ہے نہ کہ ان چیزوں کو بالفعل عالمِ وجود میں لے آنے کی —— اس جواب پر اگر معترض کہے کہ قرآن میں یہ کہاں ہے کہ "آگ سے بچانے کی کوشش کرو" "اصلاح کی جد و جہد کرو" اور "اقامت دین کے لیے سعی کرو" تو اس کے جواب میں نرمی سے کہا جائے گا کہ آپ اعتراض کے موڈ سے ہٹ کر تنہائی میں خود اس مسئلے میں غور کریں اس لیے کہ آپ کا یہ اعتراض عقل عام سے بھی علیحدہ ہے اور اوامر و احکام کی زبان سے ناواقفیت کی بھی دلیل ہے۔

ممکن ہے اوپر کی سطور پڑھنے والے لوگ یہ محسوس کریں کہ جس مسئلے کی توضیح کی گئی ہے وہ تو خود واضح ہے یہ تو بات تو پہلے سے معلوم ہے کہ جن اوامر کی تعمیل کا تعلق مامور کی اپنی ذات سے ہے ان میں مخلصانہ کوشش کے باوجود اگر وہ ان کی تکمیل کسی ایسے مانع کی وجہ سے نہ کر سکے جس کو دور کرنا اس کی قدرت میں نہیں تو اس کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے اسی طرح جن اوامر کی تعمیل کا تعلق دوسروں سے ہوتا ہے اس میں اصل ذمہ داری کوشش

ہی ہوتی ہے اس حکم کو بروئے کار لانے آنا مامور کی ذمہ داری سے خارج ہوتا ہے لیکن بہت سی واضح باتیں ایسی ہیں جو بعض افراد کے لحاظ سے غیر واضح ہو جاتی ہیں۔ اس مسئلے کی توضیح کا سبب یہ ہے کہ مجھ سے ایک رفیق نے کہا: "بعض لوگ ہمارے نصب العین پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ بھارت میں دین اسلام کو عملاً برپا کرنے کی ذمہ داری قبول کرنا، یا اسے نصب العین بنانا اس لیے صحیح نہیں ہے کہ یہاں کی غالب اکثریت غیر مسلم ہے اس لیے عملاً اس دین کو یہاں برپا نہیں کیا جا سکتا۔ میں نے جواب میں عرض کیا کہ نصب العین تو وہ منزل ہے جہاں ہمیں پہنچنا ہے لیکن اس منزل تک پہنچنے کے لیے بیسیوں مرحلے طے کرنے ہیں، ابھی تو ہم جدوجہد کے مرحلے میں ہیں، عملاً اسے برپا کرنے کے ذمہ دار تو ہم اس وقت ہوں گے جب موانع دور ہو جائیں اور یہاں کی اکثریت اس نظام کو قبول کرے۔ یہی اس کی فطری ترتیب ہے اور یہی ہمارے دستور کا مفہوم ہے۔ میرے رفیق نے کہا: مگر وہ کہتے ہیں کہ آپ نے دستور میں "اقامت دین" لکھا ہے "اقامت دین کی جدوجہد" درج نہیں کیا ہے۔

یہ ہے وہ سبب جس نے مجھے اس مسئلے کی توضیح پر آمادہ کیا۔ دستور کی عبارت پر اعتراض کرنے والے بزرگ نے اعتراض کے موڈ میں یہ بھی نہ سوچا کہ کسی چیز کی جدوجہد اور سعی و کوشش، نصب العین نہیں ہوا کرتی کیونکہ یہ تو کسی چیز کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، خود مقصد نہیں ہے، نصب العین کوئی مقصد ہوتا ہے نہ کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ۔ اور یہ بات ہر صاحب عقل جانتا ہے کہ کسی مقصد کے حصول کے لیے اولین ذمہ داری جو عائد ہوتی ہے وہ اسے حاصل کرنے کی کوشش ہی ہوتی ہے۔ ہندوستان کا کوئی مسلمان، اگر کعبہ کی زیارت اور اس کے طواف کو اپنا نصب العین بنائے تو اس پر اولین ذمہ داری یہی عائد ہوگی کہ وہاں پہنچنے کے ساز و برگ درست کرے سفر کی زحمتیں برداشت کرے۔ بیسیوں مرحلے طے کرے تب کہیں جا کر وہ کعبہ کی زیارت سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر سکتا اور اس کے طواف سے اپنے دل کو سکون پہنچا سکتا ہے۔

اوپر کی بحث میں لکھا جا چکا ہے کہ انبیاء سابقین کی طرح دنیا کے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی تبعیت میں امت مسلمہ کو حکم دیا گیا کہ "دین قائم کرو" لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا کہ انہیں فی الفور عملی طور پر اسے نافذ کرنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہو بلکہ اولیں ذمہ داری جو ان پر ڈالی گئی تھی وہ پورے دین کو قائم کرنے کی سعی تھی۔ یہ بات عقل سے بھی ثابت ہے، تاریخ سے بھی ثابت ہے اور خود اس سورہ سے بھی ثابت ہے جس میں یہ حکم دیا گیا ہے۔ سورہ شوریٰ میں اقیموا الدین کا حکم دے کر آگے چند آیتوں کے بعد اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے سعی و کوشش اور جدوجہد کے چند اولیں بنیادی نکات کی بھی تعلیم دی گئی ہے (آیت ۳۵ تا ۴۳)

کائنات میں خدا کا عمل

(سید جلال الدین عمری)

"اس میں شک نہیں کہ کائنات اپنے آغاز میں ایک خالق کی محتاج ہے لیکن اسے ایسے کسی خالق کی ضرورت نہیں جو اس سے مسلسل تعلق رکھتا ہو۔ کائنات واقعہ کے طور پر ایک مرتبہ جب وجود میں آچکی تو آگے بڑھنے کی قوتیں بھی اس میں خود بخود پیدا ہوگئیں اس لیے وہ اپنے خالق کی مدد کے بغیر اپنا کام انجام دے رہی ہے۔"

یہ فلاسفہ کے ایک گروہ کا خیال ہے۔ خدا کو خالقِ کائنات کی حیثیت سے ماننے میں اسے کوئی تامل نہیں ہے۔ البتہ وہ اس خیال سے انکار کرتا ہے کہ کائنات وجود میں آنے کے بعد بھی خدا کی محتاج ہے عقل جہاں کوئی مادی سبب ڈھونڈنے میں ناکام ہوتی ہے۔ وہاں تو فلسفیوں کا یہ گروہ خدا کو ماننے کے لیے تیار ہے لیکن اگر مادی توجیہ و تاویل کا کوئی کمزور سہارا بھی اس کے ہاتھ آجاتا ہے تو سمجھتا ہے کہ اب خدا کی ضرورت نہیں رہی۔ کائنات کے آغاز کا مسئلہ مادیت کی بنیاد پر حل نہیں ہوتا اس لیے وہ مانتا ہے کہ خدا اس کا خالق ہے جس نے اسے وجود دیا۔ لیکن کائنات میں اسباب کا سلسلہ چل رہا ہے اس لیے یہ اسباب ہی اس کے نزدیک اصل کارفرما قوت ہیں۔ ان ہی کے نتیجے میں یہاں واقعات رونما ہوتے اور مٹتے ہیں۔ چیزیں ابھرتی اور فنا ہوتی ہیں۔ اس گروہ کی رائے میں جب کسی واقعہ کا ایک محسوس اور ٹھوس سبب ہم دیکھ رہے ہیں تو کسی غیر محسوس اور غیر مادی قوت کو اس کا سبب ماننے کی کوئی حاجت نہیں۔ پانی سے اگر بجلی پیدا ہوتی ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم خدا کو بجلی کا خالق تسلیم کریں۔

ان فلسفیوں نے خدا کو ماننے کے باوجود خدا اور کائنات کے تعلق کو سمجھنے میں ٹھوکر کھائی ہے۔ ان کا اقرارِ خدا بھی انکارِ خدا سے مختلف نہیں ہے۔ ایک مرحلے میں وہ جس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں دوسرے مرحلے میں اسی کی تردید بھی کر جاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا اس کائنات کے لیے صرف علتِ اولیٰ ہی نہیں ہے بلکہ کائنات سے اس کا مسلسل اور غیر منقطع تعلق ہے۔ خدا اور کائنات کے تعلق کی نوعیت وہ نہیں ہے جو کارخانہ اور انجینئر یا مصنف

اور اس کی کتاب کے تعلق کی ہوتی ہے۔ کارخانہ وجود میں آگیا اور چلنے لگا تو وہ انجینیر سے بے نیاز ہے۔ کتاب اپنے مصنف سے اسی وقت تک تعلق رکھتی ہے جب تک کہ وہ اس کے ذہن میں ہے۔ جس وقت وہ ذہن سے نکل کر تحریر میں آگئی تو مصنف کی محتاج نہیں رہی۔ لیکن کائنات خدا سے پوری طرح جڑی ہوئی ہے۔ خدا سے الگ ہو کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس کا باقی رہنا ممکن نہیں۔ جس طرح وہ خدا کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی اسی طرح خدا کے بغیر باقی بھی نہیں رہ سکتی۔ کائنات اپنی جگہ اس لیے قائم ہے کہ اس کا خدا اسے تھامے ہوئے ہے۔ اگر خدا اپنا ہاتھ اٹھالے تو وہ فوراً ختم ہو جائے گی۔ کائنات اپنی بقا کے لیے خدا کی اس سے زیادہ محتاج ہے جتنی گرتی ہوئی دیوار کسی سہارے کی محتاج ہوتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ	بے شک اللہ آسمانوں اور زمین کو کسی طرف ڈھلک
وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَا	جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ اپنی جگہ ڈھلک
اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ	جائیں تو سوائے خدا کے کوئی ان کو روک نہیں سکتا۔
اِنَّهٗ كَانَ حَلِيْمًا غَفُوْرًا ○ (فاطر: ۴۱)	یقیناً اللہ بردبار اور غفور ہے۔

کائنات میں تناسب اور ہم آہنگی اس لیے ہے کہ اس کے خالق کے ہاتھ میں "میزان" ہے اور وہ خاص توازن کے ساتھ ہر چیز کو اپنے دائرے میں مسلسل گھما رہا ہے۔ سورج، چاند اور زمین جیسے عظیم سیارے از خود فضا میں گھوم نہیں رہے ہیں بلکہ خدا کی قدرت ان کو گردش دے رہی ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ○	سورج اور چاند کے لیے ایک حساب مقرر ہے
وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ○ وَ	اور پودے اور درخت اس کے سامنے سجدہ کر رہے
السَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ○	ہیں۔ آسمان کو اس نے بلند کیا ہے اور میزان قائم
(الرحمٰن: ۵ - ۷)	کی ہے۔

زمین سورج کے گرد چکر کاٹتی ہے تو ہمارے اوقات رات اور دن میں تبدیل ہوتے ہیں۔ اس تبدیلی سے ہمیں یہ موقع ملتا ہے کہ وقفہ وقفہ سے ہم سعی و محنت بھی کریں اور آرام بھی پائیں اور یہ دونوں ہی چیزیں ہمارے لیے ضروری ہیں۔ کیونکہ ہم نہ تو مسلسل محنت کر سکتے ہیں اور نہ محنت کے بغیر اپنی ضروریات حاصل کر سکتے ہیں۔ کیا رات اور دن کا یہ حیرت انگیز نظام از خود قائم ہے؟ نہیں! بلکہ رات آتی ہے تو خدا کی قدرت سے آتی ہے اور دن نکلتا ہے تو خدا کی قدرت سے نکلتا ہے۔ وہ اگر اس نظام کو بدلنا چاہے تو سیارے اپنی جگہ سے حرکت نہ

کریں اور رات اور دن کا فرق مٹ جائے۔

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ الَّيْلَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِضِيَآءٍ اَفَلَا تَسْمَعُوْنَ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَيْكُمُ النَّهَارَ سَرْمَدًا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِلَيْلٍ تَسْكُنُوْنَ فِيْهِ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ وَمِنْ رَّحْمَتِهٖ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ (القصص ۷۳-۷۱)

ان سے کہو بتاؤ تم اگر اللہ رات کو تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قیامت کے دن تک طاری کر دے تو کون خدا ہے سوائے اللہ کی ذات کے جو تمہارے پاس روشنی لائے کیا تم سنتے نہیں ہو؟ ان سے کہو بتاؤ تم اگر اللہ تم پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قیامت تک دن کیے رہے تو سوائے اللہ کی ذات کے وہ کون سا خدا ہے جو تمہارے لیے رات لائے جس میں تم سکون حاصل کر سکو۔ کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یہ اسی کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن مقرر کیے تاکہ تم رات میں سکون حاصل کرو اور دن میں اس کا فضل تلاش کرو اور تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

قرآن کہتا ہے کہ "خدا زمین و آسمان کا نور ہے" (النور: ۳۵) یہاں جو حسن و جمال ہے اور جو رونق اور دل کشی ہے اسی کی وجہ سے ہے۔ خدا نہ ہو تو یہاں وہ شانِ حسن کبھی نہیں پیدا ہو سکتی جو اس وقت موجود ہے۔

یہی حقیقتیں ہیں جو خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر دعا بن کر جاری ہو گئی ہیں۔

اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ قَيِّمُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ وَلَكَ الْحَمْدُ اَنْتَ مَلِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَنْ فِيْهِنَّ [1]

خدایا سب تعریف تیرے لیے ہے۔ تو نگراں ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو ان میں ہیں۔ خدایا سب تعریف تیرے لیے ہے تو نور ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان تمام چیزوں کا جو ان میں ہیں۔ خدایا سب تعریف تیرے لیے ہے تو بادشاہ ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان ساری چیزوں کا جو ان میں ہیں۔

---

[1] یہ ایک لمبی دعا ہے جس کے ابتدائی کلمات یہاں نقل کیے گئے ہیں۔ پوری حدیث کے لیے ملاحظہ ہو۔ بخاری، کتاب التہجد، باب التہجد باللیل۔ یہی روایت کچھ تقدیم و تاخیر اور بعض الفاظ کی تبدیلی کے ساتھ مسلم میں بھی موجود ہے۔ دیکھیے کتاب الصلوٰۃ باب صلوٰۃ النبی و دعاءہ باللیل۔

اسی بات کو آپؐ نے ان الفاظ میں بھی ظاہر فرمایا ہے:۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَنَامُ وَلَا يَنْبَغِي	بے شک اللہ سوتا نہیں ہے اور سونا نہ تو اس
لَهُ أَنْ يَنَامَ يَخْفِضُ الْقِسْطَ وَيَرْفَعُهُ	کے شایانِ شان ہے وہی عدل کی ترازو کو کبھی نیچے کرتا
يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ عَمَلِ	ہے اور کبھی اوپر کرتا ہے۔ اس کے سامنے رات کا عمل
النَّهَارِ وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ عَمَلِ	دن کے عمل سے پہلے اور دن کا عمل رات کے عمل سے
اللَّيْلِ[1]	پہلے پیش کیا جاتا ہے۔

کائنات صرف خالقِ اول کی محتاج ہے تو تخلیق کا عمل بھی صرف ایک ہی مرتبہ ہونا چاہیے تھا حالانکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ یہاں مسلسل تخلیق ہو رہی ہے۔ ایک چیز فنا ہوتی ہے تو دوسری چیز اس کی جگہ لینے موجود ہوتی ہے۔ کائنات اپنا جو سرمایۂ حیات کھوتی ہے عملِ تخلیق دوبارہ اس کو وہ سرمایہ فراہم کر دیتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کائنات سے اس کے خالق کا رشتہ اس کے آغاز ہی میں تھا تو تخلیق کا یہ عمل اس وقت کون انجام دے رہا ہے؟ اس کے جواب میں آپ ہوا، پانی، لوہا، پتھر اور ایسی ہی بے شمار چیزوں کا نام لیں گے جو آپ کے نزدیک تخلیق کا سبب ہیں لیکن یہ جواب اس سوال کو ختم نہیں کرتا، بلکہ ایک دوسرے سوال کو پیدا کرتا ہے۔ وہ یہ کہ جن چیزوں کو آپ سببِ تخلیق کہتے ہیں ان میں تخلیق کی قوت کہاں سے آگئی؟ اس سوال کا جواب، جس سے عقل مطمئن ہو جائے قرآن کے پاس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تخلیق کا عمل خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی ہر چیز کا خالق ہے۔ کائنات کا خالقِ اول بھی وہی ہے جب کہ اس کے وجود کا کوئی سبب نہیں تھا اور اس وقت بھی ہر چیز کو وہی پیدا کر رہا ہے جب کہ یہ کائنات اسباب سے بھری ہوئی ہے۔ اسباب خالق نہیں ہیں بلکہ خدا خالق ہے۔ کسی واقعہ میں فی نفسہٖ یہ طاقت نہیں کہ وہ دوسرے واقعہ کو وجود دے بلکہ خدا جب اس واقعہ کو دوسرے واقعہ کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے تو وہ ذریعہ بن جاتا ہے۔ قرآن مجید میں بارہا اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ کائنات اب بھی اپنے خالق کی محتاج ہے۔ اگر خدا کی خالقیت کا یہ ظہور نہ ہو تو کوئی بھی چیز وجود میں نہیں آ سکتی۔ ایک جگہ فرمایا:۔

خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ ثُمَّ	خدا نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا پھر اس سے
جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَأَنْزَلَ لَكُمْ	اس کا جوڑا بنایا۔ اس نے تمہارے لیے چوپایوں میں سے
مِنَ الْأَنْعَامِ ثَمَانِيَةَ أَزْوَاجٍ	آٹھ جوڑے اتارے۔ وہ تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں
يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ خَلْقًا	میں ایک بعد دیگرے تخلیق کے مختلف مراحل سے گزارتا ہے۔

[1] مسلم، کتاب الایمان۔ باب معنی قول اللہ عزوجل: "ولقد راٰہ نزلۃ اخریٰ"

مِنْ بَعْدِ خَلْقٍ فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ○ (زمر: ۶)

تین تاریک پردوں کے بیچ میں ۔ وہی ہے اللہ تمہارا رب، سلطنت اسی کی ہے ۔ سوائے اس کے کوئی معبود نہیں پس تم کہاں پھیرے جاتے ہو؟

مطلب یہ کہ انسان ہو یا کوئی بھی ذی حیات مخلوق، اس کو زمین پر پہلی مرتبہ وجود دینے والا بھی خدا ہی ہے اور اس کے بعد بھی جو جاندار وجود میں آتا ہے خدا ہی کی قدرت سے وجود میں آتا ہے ۔ ایسا نہیں ہے کہ خدا نے کسی وجود کی ابتدا تو کی ہو اور پھر از خود اس کا سلسلہ چل پڑا ہو بلکہ سلسلۂ وجود کی ہر کڑی کے ساتھ خدا کا عملِ تخلیق جاری ہے ۔ کائنات میں ہر طرف رشتۂ زوجیت پھیلا ہوا ہے اور اسی رشتے کے نتیجے میں انسان اور حیوان پیدا ہوتے ہیں لیکن اس رشتے میں یہ حیرت انگیز تاثیر اور قوت آپ سے آپ نہیں آگئی بلکہ وہ خدا کی پیدا کردہ ہے ۔ ایک انسانی پیکر کو عدم سے وجود میں آنے کے لیے بہت سے انقلابات سے گزرنا پڑتا ہے اور پھر وجود میں آنے کے بعد وہ مختلف مراحل طے کرتا ہے ۔ یہ سارے انقلابات و مراحل خدا کے علم اور قدرت سے طے ہوتے ہیں ۔ وہ ان تبدیلیوں کو نہ لانا چاہے تو کسی ظاہری سبب یا علت میں یہ طاقت نہیں کہ ان تبدیلیوں کو لا سکے ۔

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا ؕ وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖۤ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ (فاطر: ۱۱)

اللہ نے تم کو مٹی سے اور پھر نطفے سے پیدا کیا پھر اس نے تم کو جوڑوں کی شکل میں بنایا اس کے علم کے بغیر نہ تو کسی مادہ کے پیٹ میں حمل قرار پاتا ہے اور نہ وہ جنتی ہے اور نہ کسی بڑے عمر والے کی عمر زیادہ ہوتی ہے اور نہ اس کی عمر میں کمی ہوتی ہے الا یہ کہ وہ ایک کتاب میں درج ہے ۔ یقیناً ایسا کرنا اللہ کے لیے آسان ہے ۔

انسان ایک ایسے عمل کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے جس کا اس کی تخلیق سے بظاہر کوئی تعلق نہیں ہے ۔ قرآن سوال کرتا ہے کہ نطفے کا ایک قطرہ جس میں تم زندگی کے بے شمار جراثیم دیکھتے ہو اور جو تمہارے نزدیک انسان کی تخلیق کا سبب ہیں ۔ بتاؤ یہ جراثیم اس میں کہاں سے آگئے ؟ نطفے میں یہ قوت کہاں سے پیدا ہوگئی کہ ہوش و حواس رکھنے والا انسان اس سے وجود میں آسکے ؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا مادیت کی دنیا میں کوئی جواب نہیں ہے ۔

دانے کو مٹی میں ڈالنے کے بعد انسان سمجھتا ہے کہ لازماً اس سے پودا نکلے گا ۔ لیکن وہ یہ نہیں سوچتا کہ زمین

میں یہ تاثیر کہاں سے آگئی کہ وہ ایک ننھے سے دانے کو تنا ور درخت کی شکل دے ؟ اگر خدا زمین سے قوتِ نمو سلب کرلے تو جو سرسبزی وشادابی ہم دیکھتے ہیں کیا وہ نظر آسکتی ہے ؟ زمین کی قوتِ نمو اگر خدا کی عطا کردہ ہے تو وہ جس وقت چاہے اور جس دانے کو چاہے اس قوت سے محروم کرسکتا ہے ۔ زمین دانے کو پودے کی شکل دیتی ہے تو ضروری نہیں کہ ہمیشہ دانے کے ساتھ اس کا عمل یہی ہو جب تک کہ اس کے پیچھے خدا کی قدرت اور فیصلہ نہ کام کررہا ہو ۔

سمندر کے بخارات بادل کی شکل میں اوپر پہنچتے ہیں اور وہاں سے برسنے لگتے ہیں ۔ وہ کون ہے جو پانی کو بھاپ بناکر اوپرلے جاتا اور بارش کی شکل میں زمین پر برساتا ہے ؟ کیا یہ عمل از خود ان اسباب کے نتیجے میں ہوتا ہے جو یہاں موجود ہیں ؟ کیا خدا کی قدرت اور مشیت کے بغیر سمندر سے بخارات پیدا ہوسکتے ہیں اور پھر بارش بن کر برس سکتے ہیں ؟ اگر ایسا نہیں ہے تو کیا سمندر یہ اعلان نہیں کررہا ہے کہ اس پر حکومت خدا کی ہے ؟ کیا بارش یہ نہیں ثابت کرتی کہ وہ خود سے نہیں برستی بلکہ خدا اس کو برساتا ہے ۔ اسی طرح سمندر کا پانی کھاری ہے لیکن یہی پانی بخارات میں تبدیل ہوتا ہے تو میٹھا اور لذیذ بن جاتا ہے ۔ یہ خدا کا مقرر کردہ نظام ہے وہ اس نظام کو جب چاہے بدل سکتا ہے ۔

آگ جلانے کے لیے ہم لکڑی کا استعمال کرتے ہیں ۔ لکڑی سے آگ کیسے پیدا ہوتی ہے ۔ یہ ایک راز ہے جسے ہم مادی اسباب کی روشنی میں حل نہیں کرسکتے ۔ لکڑی سے آگ کے شعلے ایک مرتبہ نکل پڑے تو کیا ہمیشہ اس سے یہی عمل صادر ہونا چاہیے ؟ قرآن کا دعویٰ ہے کہ جب تک خدا نہ چاہے لکڑی آگ نہیں پیدا کرسکتی[۱] ۔

جس طرح کائنات کے آغاز کا مسئلہ خالق کو مانے بغیر حل نہیں ہوتا اسی طرح کائنات کے بقا وثبات کا مسئلہ بھی اس وقت تک حل نہیں ہوتا جب تک کہ ہم یہ نہ مان لیں کہ کائنات اب بھی اپنے خالق کی محتاج ہے ۔ یہاں کا ہر چھوٹا بڑا واقعہ ایک نیا واقعہ ہے جب بھی وہ وجود میں آتا ہے خدا کی قدرت سے وجود میں آتا ہے ۔ کائنات میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہورہا ہے سب خدا ہی کی طرف سے ہے ۔ وجود اور عمل دونوں خدا کے قبضے میں ہیں ۔ کوئی چیز اس کی مرضی اور فیصلے کے بغیر نہ تو وجود میں آسکتی ہے اور نہ اپنا کام انجام دے سکتی ہے ۔

اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ۔　　سن لو تخلیق اور اقتدار دونوں اسی کے ہاتھ میں ہیں ۔

اس چھوٹے سے فقرے میں جو بات کہی گئی ہے اس کو کائنات اور خدا کے تعلق کے بارے میں قرآن

---

[۱] یہ تقریر سورۂ واقعہ آیت ۳، تا ۵ سے ماخوذ ہے ۔

کی تعلیمات کا خلاصہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی تفصیل قرآن کے دوسرے مقامات پر موجود ہے:۔

اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا شَفِیْعٍ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ یُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ ..... (السجدہ: ۴-۵)

اللہ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان پائی جانے والی ساری چیزوں کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر وہ اپنے عرش پر جاگزیں ہوا۔ اس کے سوا تمہارا کوئی ولی کارساز اور سفارشی نہیں ہے تو کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؟ وہ آسمان سے زمین تک اپنے امر واقتدار کی تدبیر کرتا ہے۔

یہی بات سورۂ حدید کی ابتدائی آیتوں میں اور زیادہ وضاحت کے ساتھ کہی گئی ہے:۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَهُوَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (الحدید: ۱-۶)

آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں اور وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ آسمانوں اور زمین کا اقتدار اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہی زندہ کرتا اور مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ وہی ہے اول و آخر اور ظاہر و باطن ہیں اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ اسی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا پھر وہ عرش پر جاگزیں ہوا۔ جو کچھ زمین میں داخل ہوتا ہے اور جو اس سے نکلتا ہے، جو کچھ آسمان سے اترتا ہے اور جو آسمان میں چڑھتا ہے وہ اس کو جانتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی سلطنت اسی کی ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام معاملات لوٹائے جاتے ہیں۔ وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ سینے میں چھپی ہوئی باتوں کو بھی جانتا ہے۔

کیا کائنات میں جبر ہے؟ ان آیات میں قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حکومت واقتدار خدا کے

ہاتھ میں ہے۔ اول و آخر ظاہر و باطن ہر طرف اسی کی فرماں روائی ہے۔ کوئی اس کی حکومت میں شریک نہیں ہے۔ سارے معاملات وہ طے کرتا ہے اور ہر جگہ اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس کی مرضی اور فیصلے کے خلاف دم مارنے کی کسی میں طاقت نہیں ہے۔ کیا اس کے معنی یہ ہیں کہ کائنات میں جبر ہے؟ کیا یہ کائنات خدا کے ارادے کے علاوہ ہر دوسرے ارادے سے خالی ہے؟ کیا ہم ارادہ و عمل کی قوت سے محروم ہیں؟ کیا ہم مشین کے بے جان پرزوں کی طرح خدا کی مشیت کی تکمیل میں لگے ہوئے ہیں؟ اس سوال کے جواب میں اگر مطلقاً ہاں کہہ دیا جائے تو یہ قرآن کے منشا کے خلاف ہوگا۔ قرآن سے خدا کا جو تصور ملتا ہے وہ جبر محض کی طرف ہماری راہنمائی نہیں کرتا بلکہ وہ کائنات میں ارادہ و اختیار کو ثابت کرتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ارادہ و اختیار کسی چیز میں کم ہے اور کسی چیز میں زیادہ۔ لیکن کوئی بھی چیز ارادہ و اختیار سے خالی نہیں ہے۔ قرآن کائنات میں اختیار کا دعویٰ کرتا ہے۔ اس کے اس دعوی پر ہمیں حیرت ہو سکتی ہے کیونکہ ہم کائنات میں فی الجملہ جبر کی حکمرانی دیکھتے ہیں۔ آپ کہیں گے یہ عظیم ترین سیارے کسی غیر مرئی قوت کے پوری طرح تابع ہیں۔ کیونکہ جس قانون میں وہ بندھے ہوئے ہیں اس سے ذرہ برابر آزادی انہیں نصیب نہیں ہے، تو پھر آزادی کیسی؟ قرآن اس کا جواب دیتا ہے کہ یہ تمہاری نظر کا فریب ہے۔ یہاں اگر جبر ہے تو وہ اختیاری جبر ہے، اضطراری جبر نہیں ہے۔ زمین و آسمان کی تخلیق کے سلسلے میں قرآن کہتا ہے:-

فَقَالَ لَهَا وَلِلْأَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا أَوْ	خدا نے آسمان اور زمین سے کہا آؤ تم دونوں
كَرْهًا قَالَتَا أَتَيْنَا طَائِعِينَ فَقَضَاهُنَّ	خوشی سے یا ناخوشی سے تو ان دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے
سَبْعَ سَمَاوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ وَأَوْحَىٰ	آتے ہیں تو اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنائے
فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَاءَ	اور ہر آسمان میں اس کے مناسب حکم جاری کیا، ہم نے
الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَحِفْظًا ذَٰلِكَ	آسمان دنیا کو چراغوں سے زینت عطا کی اور اس کو ہر طرح سے
تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ٥ (حم السجدہ: ۱۲،۱۱)	محفوظ کر دیا۔ یہ زبردست علم و خبر رکھنے والی ہستی کا اندازہ ہے

جبر کا فلسفہ خالص مادی فلسفہ ہے جو اختیار کی بالکلیہ نفی کرتا ہے۔ یہ فلسفہ خدا کے تصور سے کسی طرح میل

لہ ان آیات کا عام طور پر جو مفہوم بیان کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے اور ساری کائنات اس کے حکم کے تابع ہے۔ مجھے فی نفسہٖ اس مفہوم سے اختلاف نہیں ہے لیکن الفاظ کسی بلند تر حقیقت کی طرف اشارہ کر رہے ہوں تو ہمیں اس کے قبول کرنے میں تامل نہیں ہونا چاہیے۔

نہیں کہا تا۔ جبر کا فلسفہ بتاتا ہے کہ واقعات آپ سے آپ ظاہر ہو رہے ہیں۔ کوئی ارادہ اور شعور ان کے پیچھے نہیں ہے۔ پہاڑ سے چٹان لڑھکتی ہے تو ان چیزوں کو پیس دیتی ہے جو اس کی راہ میں آتی ہیں اس میں نہ تو چٹان کا کوئی ارادہ ہوتا ہے اور نہ جو چیزیں پستی ہیں اپنی مرضی سے پستی ہیں۔ اسی طرح واقعات کا ایک سلسلہ ہے جو از خود وجود میں آ رہا ہے۔ یہ کسی کے ارادے اور فیصلے کا پابند نہیں ہے۔ اس فلسفے کو اگر آپ صحیح مانتے ہیں تو خدا کی بہت سی صفات کی نفی ہوتی ہے کیونکہ ہم ان صفات کا تصور نہیں کر سکتے جب تک کہ خدا کی مخلوق کو ارادہ و عمل میں آزاد نہ مان لیں۔ قرآن کہتا ہے کہ خدا غفور و رحیم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان گناہ کرنے کی آزادی رکھتا ہے اور وہ واقعتہً گناہ کرتا بھی ہے۔ اگر انسان سے آزادی چھین لی جائے تو گناہ و ثواب کا تصور ہی بے معنی ہے۔ خدا اس وقت معاف کرتا ہے جب کہ انسان غلطی کرتا ہے۔ اگر انسان کے اندر غلطی کی استطاعت ہی نہیں ہے تو خدا کی مغفرت کا بھی ظہور نہیں ہو سکتا۔[1]

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا	میرے ان بندوں سے کہہ دو جنھوں نے اپنے نفسوں پر
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ	زیادتی کی ہے کہ وہ اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں گے
اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا	اللہ سارے گناہوں کو معاف کرتا ہے۔ بے شک وہ غفور
اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ (الزمر ۵۳)	رحیم ہے۔

اس آیت میں ان بندوں کو معافی کی خوشخبری دی جا رہی ہے جنھوں نے "اپنے نفسوں پر زیادتی کی ہے"۔

---

[1] غالباً اسی حقیقت کی طرف مسلم کی یہ حدیث ہماری راہنمائی کرتی ہے :-

وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ لَمْ تُذْنِبُوْا	قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان
لَذَهَبَ اللّٰهُ بِكُمْ وَلَجَاءَ بِقَوْمٍ	ہے اگر تم بالکل گناہ ہی نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر دے
يُذْنِبُوْنَ فَيَسْتَغْفِرُوْنَ فَيَغْفِرُ	گا اور تمہاری جگہ ایسے انسانوں کو لائے گا جو گناہ کریں گے
لَهُمْ ۔	اور اس سے معافی چاہیں گے اور وہ ان کو معاف کرے
(کتاب التوبہ، باب سقوط الذنوب بالاستغفار)	گا۔

مطلب یہ کہ خدا اپنی مغفرت کا مظاہرہ چاہتا ہے۔ اگر اس کا مقصد یہ ہوتا کہ یہاں اس کی نافرمانی نہ ہو تو وہ ایسا کرتا کہ بجائے انسان کے فرشتوں [illegible] اس لیے انسان کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کا خدا غفور رحیم ہے [illegible] معاف کرنے کے لیے ہر گنجائش رکھی ہے۔

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ خدا انسان کو جن حدود کا پابند دیکھنا چاہتا ہے وہ ان کا جبراً پابند نہیں کر دیا گیا ہے بلکہ انسان ان حدود کو توڑنے کی آزادی رکھتا ہے اور بسا اوقات اس کا ارتکاب بھی کر گزرتا ہے۔ اگر وہ اپنے جرم کو محسوس کرے اور خدا سے معافی چاہے تو خدا اس کو اپنے دامن مغفرت میں لینے کے لیے ہر وقت تیار ہے۔

قرآن سے خدا کا جو تصورِ صفات ملتا ہے وہ بتاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں پر غصہ کرتا ہے اور محبت کرتا ہے وہ دعاؤں کو سنتا اور حاجتیں پوری کرتا ہے۔ اس طرح کے صفات کی حیثیت الفاظ بے معنیٰ کی ہو جاتی ہے اگر ہم اس حقیقت کو تسلیم نہ کریں کہ انسان کے اندر ارادہ و عمل کی آزادی موجود ہے۔ وہ ایسے کام بھی کرتا ہے جو خدا کی خوشی کا سبب بنتے ہیں اور ایسے اعمال کا بھی مرتکب ہوتا ہے جو خدا کو ناپسند ہیں۔

یہ بحث پہلے گزر چکی ہے کہ کائنات میں خدا کی صفات کا ظہور ہوا ہے۔ خدا اپنے اندر جو اوصاف رکھتا ہے وہ اس کی مخلوق میں نمایاں ہیں۔ یہ اصول بتاتا ہے کہ کائنات میں ارادہ و عمل کی آزادی ہے کیونکہ اس کا پیدا کرنے والا خدا ارادہ و اختیار کا مالک ہے۔ اگر آپ خدا کو ارادہ و اختیار سے متصف مانتے ہیں اور کائنات میں اس کے وجود سے انکار کرتے ہیں تو آپ خدا کے لیے ایک ایسی صفت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں جس کا مظاہرہ اس کی مخلوق میں کہیں نہیں ہوا ہے۔ گویا ہم خدا کو صاحب شعور کہتے ہیں اور خود شعور کا کہیں وجود نہیں ہے۔

انسان کی آزادی کے کیا معنیٰ؟

خدا نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے تو اس کے اندر آزادی ہونی چاہیے یہ ایسی سادہ سی بات ہے جسے عقل آسانی سے قبول کر لیتی ہے لیکن آپ سمجھنا چاہیں گے کہ انسان ارادہ و عمل میں آزاد ہے تو کیا وہ خدا کی مرضی کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے؟ اگر نہیں کر سکتا بلکہ وہی ہوتا ہے جو خدا چاہتا ہے تو اس کی آزادی کے کیا معنی؟

یہ سوال بہت اہم ہے۔ قرآن کے مطالعے سے اس کا جو جواب ملتا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کا ارادہ کلی ارادہ ہے اور انسان جزئی ارادہ رکھتا ہے۔ ارادۂ کلی سے کائنات کی کوئی بھی شے آزاد نہیں ہے۔ خود انسان پوری طرح اس کا پابند ہے۔ انسان کے چاروں طرف خدا کے ارادۂ کلی کی حکومت ہے اور انسان اسی ارادۂ کلی کے اندر اپنے جزئی ارادے کو استعمال کر رہا ہے۔ البتہ ہم اس کی تفصیلی کیفیت سمجھ نہیں سکتے۔ کیونکہ ہم اپنے ارادۂ جزئی کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن اس ارادۂ کلی کا احاطہ نہیں کر سکتے جس کی حکومت ہر ذرے پر قائم ہے۔

کیا ہم ارادۂ کلی کی بندش سے کسی بھی نوعیت کی آزادی کا تصور کر سکتے ہیں؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے پورے وجود پر ارادۂ کلی کا قبضہ ہو اور ہم اپنی مرضی سے کوئی کام انجام دے سکیں؟ یقیناً یہ ممکن ہے ارادۂ کلی

ارادہ جزئی کے پورا ہونے میں مانع نہیں ہے۔ جزء کل کے تابع رہ کر اپنا عمل کر سکتا ہے۔ انسان اپنے ارادہ وعمل میں محدودیت رکھتا ہے اس لیے وہ وسیع اور لامحدود اختیار نہیں چاہتا بلکہ اس کے لیے محدود آزادی کافی ہے اور یہ اس کو حاصل ہے۔ انسان کا ارادہ کلی کا تابع ہے لیکن اس سے اس کا اختیار سلب نہیں ہوا ہے۔ ارادہ کلی کا پابند ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی مرضی پوری کر رہا ہے۔ اس حقیقت کو ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں۔ زمین ہمیں اپنے ساتھ لیے ہوئے سورج کے گرد گردش کر رہی ہے اور اسی زمین پر ہم بھی اپنی ایک رفتار رکھتے ہیں۔ زمین کی گردش سے ہماری یہ رفتار ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ ایک ہی وقت میں زمین کی گردش اور ہماری رفتار دونوں جاری ہیں اور ان میں کوئی رکاوٹ یا تصادم نہیں ہے۔ اسی وجہ سے جو لوگ جبر کی آڑ لے کر اپنی بے راہ روی پر پردہ ڈالنا چاہتے ہیں قرآن ان کو جاہل محض سمجھتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے جرم کو چھپانے کے لیے خدا کی مشیت کی ایسی توجیہ کرتے ہیں جس کی سند خود اس کی اتاری ہوئی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ	جن لوگوں نے خدا کے ساتھ دوسروں کو شریک کر رکھا
شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا	ہے وہ کہتے ہیں کہ اگر اللہ چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے اور نہ ہمارے
وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ شَيْءٍ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ	باپ دادا، اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اسی طرح ان سے
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ حَتَّىٰ ذَاقُوا	پہلے کے لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا یہاں تک کہ بالآخر انہوں
بَأْسَنَا قُلْ هَلْ عِنْدَكُمْ مِنْ عِلْمٍ	نے ہمارے عذاب کا مزا چکھ لیا۔ ان سے کہو کیا تمہارے
فَتُخْرِجُوهُ لَنَا إِنْ تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ	پاس خدا کی طرف سے کوئی علم ہے جس کو تم ہمارے سامنے
وَإِنْ أَنْتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ○	پیش کر سکو۔ تم تو محض گمان کے پیچھے چلے جا رہے ہو اور
(الانعام: ۱۴۹)	محض اٹکل سے کام لے رہے ہو۔

قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ انسان اپنے اعمال کا خود ہی ذمہ دار ہے۔ کیونکہ وہ مجبور محض نہیں ہے۔ اس کو فکر و عمل کی جو قوتیں ملی ہیں ان کو وہ اپنی آزاد مرضی سے کام میں لا سکتا ہے۔ وہ ہدایت پانا چاہے تو اس پر ہدایت کی راہیں بند نہیں ہیں۔ ان پر چل کر وہ انسانیت کی بلند سے بلند منزل تک پہنچ سکتا ہے۔ اس کے لیے حق بھی اتنا ہی واضح ہے جتنا باطل واضح ہے۔ اگر وہ راستے سے بھٹکتا ہے تو خدا کی مشیت اس کو گمراہی اور ضلالت کی طرف نہیں لے جاتی بلکہ وہ خود ہدایت پانا نہیں چاہتا۔ اس کے سامنے کامیابی کے امکانات ہوتے ہیں لیکن وہ جانتے بوجھتے ان کو دعوت دیتا ہے یہ اس کا اپنا قصور ہے جس کا الزام وہ خدا پر نہیں لگا سکتا۔ کیونکہ خدا

اس کے بارے میں اعلان کر چکا ہے۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا　　ہم نے اس کو سیدھی راہ دکھا دی ہے۔ اب
وَإِمَّا كَفُورًا ۝ (الدھر: ۳)　　چاہے وہ خدا کا شکر گزار بنے یا اس کا نافرمان کافر

انسان خدا سے بے نیاز نہیں ہے

انسان کو اپنے فکر و عمل میں آزاد ماننے کے بعد شاید آپ کہیں گے کہ انسان آزاد ہے تو یقیناً وہ خدا کا محتاج نہیں ہے کیونکہ آزادی اور احتیاج دونوں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ احتیاج کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ آزادی کو چھین لیتا ہے اور پابند بنا دیتا ہے اور آزادی کا وجود احتیاج کی نفی کرتا ہے اس لیے انسان کی آزادی کے معنی یہ ہیں کہ اس کو اپنے ارادوں کی تکمیل میں خدا کی ضرورت نہیں ہے۔

انسان کی آزادی کا یہ تصور صحیح نہیں ہے۔ انسان کی آزادی خدا سے اس کے احتیاج کی نفی نہیں کرتی۔ وہ اپنی آزادی کے باوجود خدا سے قطعاً بے نیاز نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں دو چیزیں ہیں، انسان کا ارادہ اور پھر اس ارادے کے نتائج۔ انسان اختیار جس چیز پر پاتا ہے وہ صرف اس کا اپنا ارادہ ہے۔ نتائج اس کے اختیار میں بالکل نہیں ہے۔ بلکہ وہ پوری طرح خدا کے ہاتھ میں ہیں۔ خدا کی قدرت کے بغیر اس کے کسی بھی ارادے کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا۔ اس لیے انسان کی آزادی خدا سے اس کو بے نیاز نہیں بناتی بلکہ قدم قدم پر اس کو خدا کا محتاج ثابت کرتی ہے۔ اس کو تفصیل سے سمجھنے کے لیے اس طرح غور کرنا پڑے گا کہ کائنات میں خدا کا قانون عام ہے۔ انسان صاف طور پر دیکھتا ہے کہ خدا کے قانون سے کوئی بھی چیز آزاد نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود اس کی موت و حیات، بچپن، جوانی اور بوڑھاپا، تندرستی اور بیماری سب کچھ خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع ہے۔ یہ قوانین اس کی مرضی سے نہ تو بنے ہیں اور نہ یہ اس کی مرضی سے بدل سکتے ہیں۔ یہ صورت حال اس کے مکمل احتیاج کی دلیل ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی واقعہ ہے کہ انسان آزادی کا زبردست شعور رکھتا ہے۔ وہ کسی بھی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اپنے اندر اختیار پاتا ہے۔ اس کا یہ شعور اتنا قوی ہے کہ وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی شعور اس کے تمام اعمال کی بنیاد ہے وہ اپنے شعورِ آزادی کے تحت جب کوئی قدم اٹھاتا ہے تو اس کا ایک متعین نتیجہ سامنے آتا ہے۔ وہ اصولِ صحت کی خلاف ورزی کرتا ہے اور بیمار ہو جاتا ہے۔ دوا کھاتا ہے اور بیماری سے نجات پاتا ہے۔ اس لحاظ سے وہ ایک آزاد فرد ہے۔ کیونکہ اصول صحت کو اس نے اپنی مرضی سے توڑا تھا اور دوا کے استعمال کرنے یا نہ کرنے میں اس کو اختیار حاصل تھا۔ لیکن جب وہ اس پہلو سے سوچتا ہے کہ اس کا بیمار پڑنا، دوا کھانا اور اچھا ہونا یہ قوانین

میں بندھا ہوا ہے جو اس کی مرضی اور اختیار میں نہیں ہیں تو وہ اپنے آپ کو آزاد نہیں پاتا۔ انسان کو ایک باشعور ہستی مان کر آپ غور کریں گے تو یقیناً وہ آزاد ہے لیکن جب آپ یہ دیکھیں گے کہ اس کے شعور کے نتائج ان قوانین کے تحت نکلتے ہیں جو یہاں کام کر رہے ہیں اور انسان ان قوانین سے ہٹ کر کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتا تو وہ ایک بے اختیار وجود ہے۔ اس کا ہر عمل خدا کی قدرت کا محتاج ہے۔ خدا کی قدرت اس کا ساتھ نہ دے تو اس کا شعورِ آزادی ایک لاحاصل شے ہے۔ قرآن انسان کو آزاد اور ذمہ دار وجود اس لیے مانتا ہے کہ وہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے خدا کے بنائے ہوئے قوانین اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ وہ جنت کی طرف بڑھنا چاہے یا جہنم میں گرنا چاہے اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ وہ بھلائی اور برائی میں سے جس کو چاہے اپنی آزاد مرضی سے اختیار کر سکتا ہے

اِنَّ سَعْيَكُمْ لَشَتّٰى ۝ فَاَمَّا مَنْ	یقیناً تمہاری کوششیں مختلف ڈھنگ پر ہوری
اَعْطٰى وَاتَّقٰى وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۝	ہیں۔ تو جس شخص نے خدا کی راہ میں اپنا مال دیا اور اس کا
فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۝ وَاَمَّا مَنْ	تقویٰ اختیار کیا اور بھلائی کی تصدیق کی تو ہم اس کی
بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى وَكَذَّبَ	راہ آسان کر دیں گے آسان انجام کے لیے لیکن جو بخیل ہو کر
بِالْحُسْنٰى فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۝	اور خدا سے بے پروا ہو اور بھلائی کو جھٹلائے تو ہم اس
(اللیل: ۱۰-۴)	کی راہ آسان کریں گے مشکل انجام کے لیے۔

کیا خدا کائنات کا محتاج ہے؟ اوپر کی بحث ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتی ہے کہ کائنات خدا کی محتاج ہے۔ خدا کی قدرت سے کائنات وجود میں آئی ہے اور خدا ہی کی توجہ سے وہ باقی ہے لیکن یہ بحث ہمارے سامنے ایک سوال کھڑا کرتی ہے وہ یہ کہ کائنات سے خدا کا تعلق کیا خدا کے احتیاج کی دلیل نہیں ہے؟ ہم دو طرح کے تعلقات کا تصور کر سکتے ہیں خالص جذباتی و نفسیاتی تعلقات اور رسمی اور قانونی تعلقات۔ لیکن یہ دونوں قسم کے تعلقات احتیاج کو ظاہر کرتے ہیں۔ بچہ اپنے وجود اور پرورش میں ماں باپ کا محتاج ہے تو ماں باپ اپنے خاص قسم کے جذبات کی تسکین کے لیے بچے کے محتاج ہیں۔ محکوم اپنا پیٹ بھرنے کے لیے حاکم کو چاہتا ہے تو حاکم اپنی حکومت قائم رکھنے کے لیے محکوم کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ کائنات سے خدا کے تعلق کی نوعیت خواہ جذباتی ہو یا قانونی، اس سے خود اس کا احتیاج ثابت ہوتا ہے حالانکہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ خدا غنی ہے وہ ہر ضرورت سے بے نیاز ہے۔ وہ خود ہر چیز کی علت ہے کوئی چیز اس کی علت نہیں ہے۔

یہ بحث خدا کی بے نیازی کا مفہوم نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی بے نیازی کے دو پہلو ہیں جن کو ہم "غنائے ذاتی" اور "غنائے صفاتی" کہہ سکتے ہیں۔ غنائے ذاتی کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ذات میں کوئی نقص یا کمی نہیں ہے۔ خدا فی نفسہٖ وہ ہر پہلو سے مکمل اور ہر لحاظ سے بے نیاز ہے۔ اس کی ذات ہر حاجت سے بلند اور ہر کمزوری سے نا آشنا ہے۔ کائنات کے وجود میں آنے سے پہلے بھی غنی تھا اور کائنات کے وجود میں آنے کے بعد بھی وہ غنی ہے۔ نہ تو کائنات کے وجود سے اس کی بے نیازی میں کوئی فرق آسکتا ہے اور نہ کائنات کے زوال اور فنا سے اس کی بے نیازی نیاز مندی میں تبدیل ہو سکتی ہے۔

خدا کے غنا کا دوسرا پہلو وہ ہے جسے ہم نے "غنائے صفاتی" کا نام دیا ہے۔ یعنی وہ اپنی صفات کے لحاظ سے بھی بے نیاز ہے۔ کائنات سے خدا کا تعلق یہ ہے کہ یہاں اس کی بہت سی صفات کا ظہور ہوا ہے لیکن ان تمام صفات میں اس کی شانِ بے نیازی کام کرتی ہے۔ کائنات سے خدا کا تعلق اس کے احتیاج کی دلیل نہیں ہے کیونکہ اسی تعلق سے احتیاج ثابت ہوتا ہے جس سے کسی نقص یا کمی کو دور کیا جائے۔ ہم جن تعلقات سے واقف ہیں ان کی نوعیت یہ ہے کہ وہ ہماری کسی سماجی یا نفسیاتی کمزوری کے نتیجے میں وجود میں آتے ہیں۔ لیکن کائنات سے خدا کے تعلق کی نوعیت یہ نہیں ہے ہم یہاں خدا کی تخلیق کو دیکھتے ہیں حالانکہ وہ اس کا محتاج نہیں ہے۔ یہاں اس کے رحم و کرم کی بارش ہو رہی ہے جب کہ وہ رحم و کرم کا پابند نہیں ہے۔ کائنات سے خدا کا تعلق احتیاج کا تعلق نہیں ہے بلکہ فیض و احسان کا تعلق ہے۔ وہ کائنات پر مسلسل اپنا احسان کر رہا ہے۔ خدا کے بے پایاں جود و احسان ہی کے نتیجے میں یہ کائنات باقی ہے۔
قرآن کہتا ہے کہ اس کائنات پر ایک رحیم اور مہربان خدا کی حکومت ہے۔ جس جذبے کے ساتھ خدا نے اس کائنات کو وجود دیا اور جس جذبے کے ساتھ وہ اپنے عرشِ اقتدار پر جلوہ فگن ہے وہ جذبۂ رحمت ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ	اللہ وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو اور
وَمَا بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ	ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں چھ دن میں
اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ اَلرَّحْمٰنُ	پیدا کیا پھر وہ عرش پر جاگزیں ہوا۔ وہ رحمٰن ہے پس تم
فَسْئَلْ بِهٖ خَبِیْرًا (الفرقان: ۵۹)	پوچھو اس کے بارے میں کسی خبر رکھنے والے سے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ خدا جب اپنی مخلوق کو پیدا کر چکا تو اس نے ایک تحریر لکھی۔ یہ تحریر اس کے پاس عرش کے اوپر رکھی ہوئی ہے کہ

"میری رحمت، میرے غضب پر چھائی ہوئی ہے"[1]

[1] مسلم، کتاب التوبۃ، باب سعۃ رحمۃ اللہ تعالیٰ وانہا تغلب غضبہ

خدا کی بے پایاں رحمت جو اس کائنات پر ہو رہی ہے وہ اس کی بے نیازی کے خلاف نہیں ہے۔ کیونکہ بے نیازی کسی اعلیٰ صفت کی نفی نہیں کرتی بلکہ بے نیازی کا ظہور بعض اعلیٰ صفات ہی کے ذریعہ ہوتا ہے۔ بے نیازی یہ نہیں ہے کہ کوئی آپ کے سامنے ہاتھ پھیلائے تو آپ اس کی طرف رخ نہ کریں بلکہ بے نیازی یہ ہے کہ وہ جو کچھ مانگے وہ دیں اور اس سے کوئی غرض وابستہ نہ رکھیں۔ کائنات خدا کی محتاج ہے اور وہ اس پر اپنا احسان کر رہا ہے جب کہ خدا کی خدائی کے لیے اس کائنات کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

انسان کے عمل سے خدا کی بے نیازی

خدا کی بے نیازی کو ہم نمایاں طور پر انسان کے معاملہ میں دیکھتے ہیں۔ خدا کے احسانات سے برے اور بھلے سب ہی فائدہ اٹھا رہے ہیں اور وہ اس فرق کے بغیر اپنا احسان جاری رکھے ہوئے ہے کہ کون اس کا شکر ادا کرتا ہے اور کون ناسپاسی کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ انسان کی اطاعت و فرماں برداری سے نہ تو اس کا کوئی فائدہ ہے اور نہ اس کے کفر و نافرمانی سے اس کا کوئی نقصان۔ خدا کی شان بے نیازی میں ذرہ برابر فرق نہیں آسکتا، خواہ انسان اس کی اطاعت کی روش اختیار کرے یا اس کا نافرمان ہو جائے۔ اسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کی طرف سے ان الفاظ میں بیان کیا ہے

"اے میرے بندو! میں نے اپنے اوپر ظلم کو حرام قرار دے رکھا ہے لہذا تم بھی ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔ اے میرے بندو! تم سب کے سب بے راہ ہو سوائے اس شخص کے جس کو میں راہ دکھاؤں پس تم مجھ سے ہدایت طلب کرو میں تمہیں ہدایت دوں گا۔ اے میرے بندو تم سب کے سب بھوکے ہو الا یہ کہ میں کسی کو کھانا دوں پس تم مجھ سے کھانا مانگو میں تمہیں کھلاؤں گا۔ اے میرے بندو! تم سب کے سب برہنہ تن ہو سوائے اس شخص کے جس کو میں کپڑے دوں لہذا تم مجھ سے لباس مانگو میں تمہیں پہناؤں گا۔ اے میرے بندو! تم شب و روز گناہ کرتے رہتے ہو اور میں تمہارے گناہوں کو معاف کرتا رہتا ہوں پس تم مجھ سے مغفرت چاہو میں تمہیں معاف کروں گا۔ اے میرے بندو! تم کبھی مجھے نقصان پہنچانے کی پوزیشن میں نہیں ہو سکتے کہ مجھے نقصان پہنچا سکو۔ اے میرے بندو! اگر از اول تا آخر تمام جن و انس اس شخص کی طرح ہو جائیں جو ان میں سب سے زیادہ متقی ہے تو اس سے میرے اقتدار میں کچھ بھی اضافہ نہیں ہو سکتا اسی طرح از اول تا آخر تمام جن و انس اپنے میں سب سے زیادہ فاجر شخص کی طرح ہو جائیں تو اس سے میرے اقتدار میں کچھ بھی کمی نہیں آسکتی۔ اے میرے بندو! اگر انسان اور جن سارے کے سارے کسی میدان میں جمع ہوں اور مجھ سے سوال کریں اور ہر شخص جو مانگے وہ میں اسے دیتا جاؤں تو اس سے

میرے خزانوں میں اتنی ہی کمی واقع ہو سکتی ہے جتنی کمی کہ سمندر میں سوئی کے ڈبو کر نکالنے سے ہوتی ہے۔ اے میرے بندو! یہ تمہارے اعمال ہیں (میں ان کا محتاج نہیں ہوں) جن کو میں نے تمہارے لیے شمار کر رکھا ہے پھر ان کے مطابق تمہیں پورا پورا بدلہ دیتا ہوں۔ جو شخص ان اعمال میں بھلائی دیکھے تو خدا کی حمد کرے اور جس کو ان میں بھلائی نظر نہ آئے تو اپنے نفس ہی کو ملامت کرے (کیونکہ یہ اسی کی کوتاہی ہے)[1]

تصورِ جزا و سزا اور خدا کی بے نیازی

یہاں آپ سوال کریں گے کہ خدا انسان کے اعمال سے بے نیاز ہے تو قرآن جزا و سزا کا تصور کیوں پیش کرتا ہے؟ کیا یہ اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ اسے ہمارے اعمال سے دلچسپی ہے؟ خدا کا ہمارے اعمال سے خوش یا ناخوش ہونا کیا یہ ثابت نہیں کرتا کہ وہ ان سے متاثر ہوتا ہے؟

اس سوال کے جواب کے لیے آپ کو ایک خاص پہلو سے غور کرنا پڑے گا۔ خدا صاحب شعور ہے۔ اس کی بے نیازی بے حسی کے معنی میں نہیں ہے بے نیازی اس کا ایک شعوری عمل ہے اسی وجہ سے وہ خدا کی ایک اعلیٰ صفت سمجھی جاتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بڑے سے بڑے واقعہ کو اس لیے اہمیت نہیں دے رہا ہے کہ وہ اس کا احساس ہی نہیں رکھتا تو یہ قابل تعریف بات نہیں ہے۔ قابلِ تعریف بات تو یہ ہے کہ پورے علم اور آگہی کے باوجود اس کو اہمیت نہ دی جائے۔ خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ انسان اس کے سامنے سر جھکاتا ہے یا بغاوت اور نافرمانی کرتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کو اس بات کا شعور بھی نہیں ہے کہ کون اس کی مرضی پوری کر رہا ہے اور کون اس کی مخالفت میں لگا ہوا ہے۔ اگر ہم خدا کی بے نیازی کے یہ معنی لیتے ہیں کہ خدا کو اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے کہ اس کو گالی دی جاتی ہے یا اس کی تعریف کی جاتی ہے تو گویا خدا پر بے حسی کا الزام لگاتے ہیں حالانکہ خدا لطیف ترین احساسات کا مالک ہے جتنی پاکیزہ صفات ہو سکتی ہیں ان سب سے وہ متصف ہے[2]۔ خدا، انسان کے صحیح رویے سے خوش ہوتا ہے اور غلط

---

[1] مسلم، کتاب البر والصلۃ والادب، باب تحریم الظلم۔

[2] اس حقیقت کی طرف احادیث میں اشارے موجود ہیں۔ ایک حدیث میں آپ نے فرمایا:۔

مَا مِنْ اَحَدٍ اَغْيَرُ مِنَ اللّٰهِ مِنْ اَجْلِ	اللہ سے زیادہ کوئی غیرت مند نہیں ہے اسی وجہ
ذٰلِكَ حَرَّمَ الْفَوَاحِشَ وَ مَا	سے اس نے بے حیائی کے تمام کاموں کو حرام قرار دیا کسی بھی
اَحَدٌ اَحَبُّ اِلَيْهِ الْمَدْحُ	شخص کو اپنی تعریف اتنی پسند نہیں ہے جتنی کہ خدا کو

روئیے سے اس کو اذیت پہنچتی ہے۔ یہ اس کے صاحب شعور ہونے کا لازمی تقاضا ہے اور اس کی بے نیازی یہ ہے کہ وہ انسان کا قطعاً محتاج نہیں ہے۔ انسان کا کوئی بھی عمل اس کی حیثیت اور مرتبہ و مقام پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ	اگر تم کفر کرتے ہو تو خدا کو اس کی کوئی پروا نہیں کیونکہ
عَنْكُمْ وَلَا یَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ	خدا تم سے بے نیاز ہے (لیکن) وہ اپنے بندوں کے لیے کفر کی
وَاِنْ تَشْكُرُوْا یَرْضَهُ لَكُمْ	روش کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کی روش اختیار کرتے
(الزمر: ۷)	ہو تو اس روش کو خدا تمہارے لیے پسند کرتا ہے۔
اِنْ تَكْفُرُوْا وَمَنْ فِی الْاَرْضِ	اگر تم اور زمین کے سارے انسان کفر کرتے ہیں تو
جَمِیْعًا فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝	خدا کو اس کی پروا نہیں کیونکہ وہ تم سے بے نیاز ہے اور
(ابراہیم: ۸)	بذات خود سزاوار حمد اور قابل ستائش ہے۔

خدا نے اپنی مخلوق کو شعور اور ارادے کے تحت پیدا کیا ہے تو ماننا پڑے گا کہ وہ اس سے محبت رکھتا ہے۔ کیونکہ شعور اور ارادے کے پیچھے خواہش اور محبت ہوتی ہے۔ آپ جو کام کرتے ہیں اگر تجزیہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ آپ کو اس سے محبت ہے۔ اسی وجہ سے آپ اپنے کام کو بے نتیجہ دیکھنا پسند نہیں کرتے کیونکہ اس سے آپ کی محبت کو صدمہ پہنچتا ہے۔ ایک مصنف اپنی تحریر کو قدر کی نگاہ سے اس لیے دیکھتا ہے کہ اس میں اس کے جذبات نسبت شامل ہوتے ہیں۔ بچہ مٹی کا گھروندا بناتا ہے اگر آپ اسے ٹھوکر لگا کر توڑ دیں تو وہ چیخ اٹھے گا کیونکہ اس کی ایک محبوب چیز کو آپ نے برباد کر دیا۔ اسی طرح خدا کو بھی اپنی مخلوق سے محبت ہے۔ کیونکہ اس کے ارادے نے مخلوق کو وجود دیا ہے۔ انسان خدا کی مرضی کے خلاف کام کرتا ہے تو خدا کی محبت غضب میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ انسان کے ساتھ خدا کا تعلق محبت اور رحمت کا تعلق ہے لیکن انسان اپنی غلط روش سے اس کی محبت کو صدمہ پہنچاتا ہے احادیث میں انسان کے ساتھ خدا کی محبت اور نفرت کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک حدیث ہے:۔

بقیہ حاشیہ) مِنَ اللّٰهِ۔ تعریف پسند ہے۔ اسی لیے اس نے خود ہی اپنی تعریف کی ہے۔ (بخاری، کتاب النکاح، باب الغیرۃ۔ مسلم کتاب التوبۃ)

اسی سلسلے کی ایک اور روایت ہے: "اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰى یَغَارُ وَغَیْرَةُ اللّٰهِ اَنْ یَّاْتِیَ الْمُؤْمِنُ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ" (حوالہ سابق) اللہ تعالیٰ کو غیرت آتی ہے کہ مومن ان اعمال کا ارتکاب کرے جن کو اس نے حرام کر رکھا ہے۔

لَيْسَ اَحَدٌ اَصْبَرَ عَلٰى اَذًى سَمِعَهُ مِنَ اللّٰهِ اِنَّهُمْ لَيَدْعُوْنَ لَهُ وَلَدًا وَاِنَّهُ يُعَافِيْهِمْ وَ يَرْزُقُهُمْ [1]

کسی تکلیف دہ بات کو سن کر خدا سے زیادہ صبر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس کے بندے اس کے لیے اولاد ثابت کرتے ہیں اور وہ ان کو معاف کر رہا ہے اور رزق دے رہا ہے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی طرف سے روایت کرتے ہیں:-

يُؤْذِيْنِىْ ابْنُ اٰدَمَ يَسُبُّ الدَّهْرَ وَاَنَا الدَّهْرُ اُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ [2]

ابن آدم مجھے اذیت پہنچاتا ہے وہ زمانے کو برا بھلا کہتا ہے حالانکہ زمانہ میں ہوں میرے ہاتھ میں شب و روز کی گردش ہے۔

ایک اور حدیث میں خدائے تعالیٰ فرماتا ہے کہ:-

لَلّٰهُ اَفْرَحُ بِتَوْبَةِ عَبْدِهٖ مِنْ اَحَدِكُمْ يَجِدُ ضَالَّتَهٗ وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَىَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ اِلَىَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ اِلَيْهِ بَاعًا وَاِذَا اَقْبَلَ اِلَىَّ اَقْبَلْتُ اِلَيْهِ اُهَرْوِلُ [3]

اللہ تعالیٰ اپنے بندے کی توبہ سے اس سے زیادہ خوش ہوتا ہے جتنا کہ تم میں کا کوئی شخص اس وقت خوش ہوتا ہے جب کہ اس کی سواری کسی چٹیل میدان میں گم ہو جائے اور وہ پھر اس کو پالے۔ جو شخص مجھ سے ایک بالشت بھر قریب ہو میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں اور جو مجھ سے ایک ہاتھ قریب ہو میں اس سے ایک گز قریب ہوتا ہوں جو میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر پہنچتا ہوں۔

یہ حدیثیں بتاتی ہیں کہ شرک اور کفر سے خدا کو تکلیف ہوتی ہے لیکن وہ صبر کر رہا ہے اور وہ انسانوں پر اپنا احسان جاری رکھے ہوئے ہے۔ خدا ہر واقعہ کا سبب ہے لیکن جب انسان خدا کو سبب نہیں مانتا اور زمانے کو واقعات کا سبب قرار دیتا ہے تو خدا اس سے اذیت محسوس کرتا ہے۔ انسان جب اپنی بدعملیوں سے توبہ کرتا ہے اور خدا کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو خدا بے انتہا خوش ہوتا ہے اور آگے بڑھ کر اسے اپنی رحمت میں لیتا ہے۔

شعور محبت اور نفرت کا سرچشمہ ہے کسی واقعہ کی اچھائی یا برائی کو محسوس کرنے کا نام محبت یا نفرت ہے جزا و سزا خدا کی محبت اور نفرت کا ایک عملی ظہور ہے۔ اگر ہم مانتے ہیں کہ خدا صاحب شعور ہے اور وہ انسانوں سے محبت اور نفرت کا تعلق رکھتا ہے تو جزا و سزا کے تصور کو قبول کرنے میں ہمیں کوئی رکاوٹ نہیں ہونی چاہیے۔ خدا کی محبت بے فائدہ ہے اگر اس کے نتیجے میں انعامات کی بارش نہ ہو، اسی طرح اس کی نفرت اس کے عذاب کا سبب نہ بنے تو اس نفرت سے انسان کا کوئی نقصان نہیں۔ پھر کیوں وہ خدا سے ڈرے اور اس کی محبت کی تمنا کرے۔

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب الصبر والاذیٰ [2] مسلم، کتاب الالفاظ من الادب وغیرہا۔ [3] مسلم، کتاب التوبہ۔

انسانی جبلتوں کا مطالعہ

(جناب محمد فاروق خاں صاحب)

انسان کے اندر مختلف میلانات اور داعیات پائے جاتے ہیں انھیں داعیات کو انسانی زندگی میں محرکات حیات (Motive) کی حیثیت حاصل ہے۔ انسانی جبلتوں کا مطالعہ اور ان کی تہذیب و تحسین زندگی کی ایک اہم ضرورت ہے۔ علم النفس ایک پرانا علم ہے۔ اس پر قدیم زمانے سے لوگ غور و فکر کرتے آرہے ہیں لیکن انسانی نفسیات کے مطالعہ کا کام ابھی تک اپنے ابتدائی مرحلے سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ انسان کے فطری میلانات کا نہ تو ابھی تک صحیح طور پر شمار کیا جا سکا ہے اور نہ ان کی کوئی مکمل تنظیم ہو سکی ہے۔ انسانی جبلتوں میں ترفع ہوتا ہے۔ ان کے اندر گہرائی اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ اس کا تجربہ انسان کو ہوا ہے۔ لیکن ابھی تک جبلتوں کے ارتفاعی امکانات کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکا ہے۔

غذا کی جستجو اور جنسی خواہش دو ایسی جبلتیں ہیں جن سے ایک وحشی سے لے کر آج کے ترقی یافتہ دور کے لوگ تک سبھی واقف ہیں۔ ان دونوں جبلتوں سے مل کر کام کرنے والی دوسری مماثل جبلتیں بھی انسان کے اندر پائی جاتی ہیں۔ جن کا انسان کو علم ہوا ہے۔ درحقیقت انسانی زندگی میں جبلتوں کا اظہار ہمیشہ مرکب طور پر ہوتا ہے۔ حرکت حیات میں ایسا نہیں ہے کہ انسانی جبلتیں الگ الگ اپنا کام کرتی ہوں بلکہ وہ ہمیشہ ایک دوسرے سے وابستہ ہو کر ہی اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ تہذیب یافتہ معاشرے میں جہاں فکر و نظر کی کارفرمائی ہوتی ہے، اظہار جبلت میں ہمیشہ بلندی، لطافت، توازن اور ہم آہنگی پائی جائے گی۔ انسانی جبلتیں وہاں ہمارے فطری مطالبات کی تسکین لطف و انبساط اور اطمینان کا سبب بنتی ہیں۔ اس طرح جبلتوں سے زندگی کی ایسی بیش قیمت قدریں وجود میں آتی ہیں جن سے غیر تہذیب یافتہ ذہن آشنا نہیں ہوتا۔ تہذیب کی ترقی جبلتوں کو ختم نہیں کر دیتی بلکہ مہذب دنیا میں جبلتیں اعلیٰ اخلاق و کردار اور افادیت کے وسیع تصور کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہیں۔

انسانی رجحانات اور داعیات کو کسی ایک مرکزی احساس سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے یا نہیں یہ ایک اہم

در بنیادی سوال ہے۔ انسانی خواہشات کو جب تک کسی ایک حقیقی داعیے سے ہم آہنگ نہ کیا جائے اور انسان جب تک اپنے مختلف خیالات و تصورات کو ایک خیال اور ایک تصور کی شکل دینے میں کامیابی حاصل نہ کرلے صحیح معنوں میں نہ تو وہ ذہنی تلون و انتشار سے کبھی نجات پا سکتا ہے اور نہ اس کے اندر فکر و نظر کی کوئی گہرائی پیدا ہو سکتی ہے جن لوگوں نے ڈی۔ ایچ۔ لارنس کے ناولوں کو پڑھا ہے انھیں اس کا اندازہ ہوگا کہ لارنس کا اپنا ایک نظریہ اور فلسفہ ہے۔ اس کے ناول درحقیقت اس کے فلسفے کے ترجمان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عریانیت کے باوجود اس کے یہاں آفاقیت پائی جاتی ہے۔ لارنس دنیا کی ہر چیز کو جنس کے آئینے میں دیکھتا ہے۔ جنس کو اس نے آفاقیت بخشی ہے۔ لارنس کی کی طرح فرائیڈ نے بھی جنس کو ایسی وسعت دی ہے کہ جنس اور زندگی میں کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ فرائیڈ کے نزدیک جنس ہی زندگی کی صحیح تعبیر ہے۔ وہ Libido کو جنسی خواہش کو حرکت و عمل کا سرچشمہ جانتا ہے حتیٰ کہ شعر و ادب کو بھی وہ جنس ہی کے آئینے میں دیکھتا ہے اور اسے جنس کی ارتقائی شکل (Sublimation) قرار دیتا ہے۔

فرائیڈ کے مقابلہ میں ایک نظریہ مارکس کا ہے۔ مارکس انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت معاشی جبلی نظام کو دیتا ہے۔ اس کے نزدیک معاش کے علاوہ جو کچھ ہے خواہ تہذیب و تمدن ہو یا کلچر و اخلاق سب کی حیثیت محض اوپری ڈھانچے کی ہے زندگی میں اصل اور بنیادی حیثیت معاش کو حاصل ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کا معاشی نقطہ نظر ہو یا جنسی نظریہ دونوں حقائق کے بالکل سطحی مطالعے کا نتیجہ ہیں اس میں شبہہ نہیں کہ ہمارے تمدن کا عائلی نظام جبلت جنس سے وابستہ ہے اور پھر مختلف خاندانوں سے انسانی سماج اور معاشرے کی تشکیل ہوئی ہے۔ اسی طرح اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کے معاشی نظام کا اصل تعلق جبلت غذا سے ہے۔ لیکن پھر بھی انسانی زندگی کو صرف جنس یا معاش کے آئینے میں دیکھنا صحیح نہیں ہے۔ انسانی زندگی میں مختلف جبلتیں کارفرما ہیں۔ تہذیب و تمدن کے ارتقا سے جبلتیں پیچیدہ اور مرکب (Complex) صورتیں اختیار کرلیتی ہیں اور پھر ان کا اظہار مرکب انداز میں ہونے لگتا ہے۔ خود فرائیڈ کے شاگردوں میں لونگ اور ایڈلر بنیادی محرکات حیات میں جنس (Sex) کے علاوہ دوسرے محرکات کو بھی تسلیم کرتے ہیں۔ مثال میں ہم یہاں ایک خاص جبلت کو پیش کرتے ہیں۔ جس کا علم ہمیں انسانی جبلتوں کے مطالعہ سے ہوتا ہے۔ انسانی جبلتوں میں ایک اہم جبلت جمال پسندی (Aesthetic Instinct) کی جبلت بھی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آرٹ (صناعی) اور فنون لطیفہ ہماری جمال پسندی ہی کے مرہون منت ہیں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ آرٹ کی تخلیق میں دوسری جبلتوں کا

بھی حصہ ہوتا ہے لیکن دوسری جبلتیں محض ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ جبلتوں کے مطالعے کے سلسلے میں بالعموم لوگ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ انسان محض گوشت و پوست کا کوئی ڈھانچہ نہیں ہے بلکہ اس کا اپنا ایک روحانی وجود بھی ہے اس کا اپنا کوئی ذاتی ذوق بھی ہے۔ جبلتوں کی کارفرمائی میں اس کے روحانی وجود کا بھی حصہ ہوتا ہے زندگی کے اس پہلو کو نظر انداز کرنے کے سبب عام طور پر لوگ غلط انداز میں انسان کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور اپنے مطالعے سے جو غلط نتیجہ وہ اخذ کرتے ہیں اس سے خود بھی گمراہ ہوتے ہیں اور دنیا کو بھی گمراہ کرتے ہیں۔ انسان کے شخصی وجود اور اس کی انفرادیت کا اصل تعلق اس کے اپنے روحانی وجود سے ہے۔ روحِ انسانی اپنے کامل اظہار کے لیے مختلف اسالیب کی تشکیل کرتی ہے اپنے خارجی اظہار کے لیے وہ نئی راہوں اور رستوں کی جویا ہوتی ہے اور اس سلسلے میں وہ مادی اسباب و وسائل کو بھی اپنے کام میں لاتی ہے انسانی کلچر اور اس کی نشوونما درحقیقت اسی کی جلوہ گری ہوتی ہے

مارکس ہو یا فرائیڈ دونوں نے حیوانی عناصر کو انسانی تہذیب و کلچر کی بنیاد قرار دیا ہے۔ ان کے مادہ پرست متبعین زندگی کی مادی توجیہ کو دوسری توجیہات پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک زندگی کی اساسی قدریں مادی ہیں۔ وہ زندگی میں مادیت کی کارفرمائیوں کے سوا کسی دوسری چیز کی جھلک نہیں دیکھتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنس اور معاش سے انسانی اعمال و افعال کی پوری تشریح نہیں ہوتی۔ انسان صرف پیٹ اور جنسی میلان ہی نہیں رکھتا۔ اسے دل و دماغ بھی ملے ہیں۔ اس کی کچھ ایسی ضرورتیں بھی ہیں جو بھوک اور جنس سے بالاتر ہیں زندگی کی اہم اور قیمتی قدریں وہی ہیں جن سے ہمارے دل و دماغ کو تشفی حاصل ہوتی ہو اور جن سے ہماری روح تسکین پاتی ہو۔

خارجی زندگی کی بوقلموں حرکات و سکنات کے پیچھے ایک عالمگیر اصول کی کارفرمائی ہے۔ ضرورت ہے کہ انسان اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔ اصول کی یہی آفاقیت ہے جس کے ذریعے انسان اپنی اندرونی زندگی میں توازن حاصل کر سکتا ہے اور اسی کے ذریعہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ہم آہنگی پیدا کر سکتا ہے جن لوگوں کو زندگی کی محض سطحی واقعیت سے دلچسپی ہے وہ نہ تو زندگی کے اعلیٰ مفہوم سے کبھی آشنا ہو سکتے ہیں اور نہ انھیں زندگی اور اس کی آفاقی ہم آہنگی، اس کے غیر محدود امکانات اور اس کے دائمی اثرات کی کوئی خبر ہو سکتی ہے۔

انسان جتنا کچھ ہے خارج میں اس کا بہت ہی تھوڑا حصہ ظاہر ہو پاتا ہے۔ خارجی زندگی کے ساتھ انسان کی ایک اندرونی زندگی بھی ہے۔ خارجی زندگی بھی درحقیقت اس کی اندرونی ہی کی رہینِ منت ہے۔ اپنی اندرونی

زندگی کی تعمیر و تکمیل ہی انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ زندگی کی تعمیر و تکمیل کی اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ انسان ایک ایسی بلند ترین قسم کی وحدت تک رسائی حاصل کرلے۔ جہاں خوشگوار آفاقی ہم آہنگی اور کامل اتفاق پایا جاتا ہو۔ جہاں ذہن انسانی اپنے سارے اوصاف کو کام میں لا سکتا ہو۔ جہاں انسانی دل و دماغ کے سارے کوائف کا اظہار ممکن ہو سکتا ہو۔

تہذیب نا آشنا ذہن صرف جذبات و احساسات کی موجودگی کو کافی جانتا ہے۔ وہ جذبات کی ماہیت اور ان کے اسباب کو نہیں سمجھتا اور نہ انہیں سمجھنے کی اسے کوئی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ نہ اسے جذبات انسانی کی اصل غرض و غایت سے کوئی سروکار ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف ایک تہذیب یافتہ ذہن ہمیشہ ان چیزوں کا جویا ہوتا ہے جو رفعتوں کی حامل ہوتی ہیں۔ زندگی کی سطحی واقفیت سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی حیات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جزئی حسن سے زیادہ کُل شے کے تصور میں اسے طمانینت حاصل ہوتی ہے۔ وہ کائنات کے بکھرے ہوئے اوراق کو اکٹھا دیکھنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ اس مرکز کو پالینا چاہتی ہے۔ جس کے گرد کائنات کی ساری اشیاء حرکت کر رہی ہیں۔ حقائق کے لامحدود امکانات کو اپنے فکر و احساس کے اندر سمو لینے کا آرزومند ہوتا ہے۔ وہ سرِ زندگی تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

کائنات اور کائنات کے اندر جو کچھ ہے انسان سے اس کا رشتہ جبلتوں کے واسطے سے ہی قائم ہوتا ہے انسانی جبلتوں کا راز آفاقیت میں ہے۔ کائنات میں کارفرما عالمگیر اصول کے شعور سے ہی انسان کو مکمل آسودگی حاصل ہو سکتی ہے۔ فکر و نظر اور احساسات و جذبات کی تکمیل میں زندگی کے ارتقاء کا سارا راز پوشیدہ ہے۔

قرآن انسانوں کے درمیان ایک ایسی کتاب ہے جس میں ہماری زندگی سے متعلق ایسے اشارات اور تصریحات ملتی ہیں جن کے ذریعہ زندگی کے مسائل کو سمجھنا ہمارے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ قرآن نے انسانی جبلتوں کو حقیقت کی علامت قرار دیا ہے۔ اس طرح وہ محسوس طور پر انسان کو اس حقیقت سے ہم کنار کرتا ہے جو محسوسات سے ماورا اور تغیرات سے بالاتر ہے جس تک رسائی حاصل کر کے انسان اپنی وسعتوں میں کائنات اور وجود و حیات کی لامتناہی گنجائشوں کو سمو لیتا ہے۔ اس کی متلاشی روح اس مرکزِ حیات کو پالیتی ہے جس کے گرد کائنات کی ساری اشیاء گردش کر رہی ہیں۔ اسے ابدی حسن تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے جس کی کارفرمائیوں سے کائنات کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے اس کی نگاہ ایک ایسی بلند ترین قسم کی وحدت سے آشنا ہو جاتی ہے جس میں تمام جھگڑے فنا ہو جاتے ہیں۔ جہاں خارجی دنیا کے پھیلے ہوئے مناظر جذبات انسانی کا خیر مقدم کرتے

نظر آتے ہیں۔

قرآن انسانی جبلتوں کو رفعت، وسعت اور لطافت عطا کرتا ہے۔ انھیں حقیقتوں کا مظہر قرار دے کر انسان کو زندگی کے اعلیٰ مفہوم سے آگاہ کرتا ہے تفصیل کا موقع نہیں۔ ہم مثال میں صرف جبلت جنس کو لیتے ہیں جسے فرائیڈ اور لارنس نے زندگی کا حاصل سمجھا ہے۔ اس میں شبہہ نہیں کہ جنسی تقاضا ایک نہایت قوی تقاضا ہے جو انسان کے اندر رکھا گیا ہے۔ لیکن انسان کے اندر دوسرے ایسے قوی اور لطیف جذبات اور احساسات بھی پائے جاتے ہیں جنھیں جنس کے آئینے میں دیکھنے کے بجائے خود جنس کی حیثیت کا تعین ان کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ قرآن اس سلسلے میں ہمیں اس طرز پر سوچنے کی دعوت دیتا ہے کہ ہم اس حقیقت کو مانتے ہوئے جبلت جنس پر غور کریں کہ یہاں کی ہر چیز بجائے خود حقیقت نہیں ہے بلکہ وہ صرف حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ جبلتوں کے محض سطحی مطالعے پر اکتفا نہ کرے بلکہ وہ اس حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرے جو ہماری جبلتوں کے پیچھے کارفرما ہے۔

فرائیڈ اور مارکس کو کسی ایسے عالمگیر اصول کی تلاش تھی جسے زندگی کی نیرنگیوں میں کارفرما وحدت کی حیثیت حاصل ہو جس کے ذریعے انسانی زندگی کی سائنٹفک توجیہ کی جا سکتی ہو۔ مارکس اور اینگلس معاش کو بنیادی محرک قرار دیتے ہیں اور فرائیڈ کے یہاں بنیادی اہمیت جنس کو حاصل ہے۔ مارکس اور فرائیڈ دونوں نے ایک ایسی بنیاد فراہم کرنے کی کوشش کی جسے انسانی زندگی میں بنیادی حیثیت حاصل ہو۔ اپنی کوششوں کے نتیجے میں انھوں نے ایک نظام فکر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس میں شبہہ نہیں کہ زندگی کو ایک نظام فکر و عمل کی ضرورت ہے لیکن مارکس اور فرائیڈ کے یہاں زندگی کا جو نقطۂ نظر ملتا ہے وہ ایک مادی نقطۂ نظر ہے۔ دونوں میں سے کسی کی نگاہ بھی مادیت سے بلند نہیں ہو سکی۔ جس کی وجہ سے ان کے فکر میں حقیقی معنوں میں کوئی گہرائی اور آفاقیت نہیں پیدا ہو سکی۔

———— انھوں نے مسئلے کا ایک حل دنیا کے سامنے ضرور رکھا لیکن بصیرت کی روشنی میں ان کا پیش کیا ہوا حل بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایسا اصول جسے آفاقیت کا درجہ حاصل ہو جس کے آئینے میں انسان کے محرکات و سکنات کو دیکھا جا سکے، مادیت کے اندر ممکن ہی نہیں ہے۔ مادیت سے زندگی کی توجیہ نہیں ہوتی۔ بھوک اور جنسی خواہش انسانی زندگی کی آخری سچائی ہرگز نہیں ہیں۔ یا اور اس طرح کے دوسرے داعیات ہمیں ایک بڑی حقیقت کا علم بخشتے ہیں ان کے ذریعے ایک عظیم، بالاتر اور مہربان ہستی سے ہمارا رشتہ قائم ہوتا ہے۔ اس عظیم و بالاتر ہستی سے جو ہماری مادی دنیا کی پشت پر ہے۔ وہی اس دنیا کا خالق اور مالک ہے۔

ہمارے جسم اور ہماری روح دونوں کا خدا ہے ۔ ہر شے سے اسی کے اوصاف وکمالات کا اثبات واظہار ہوتا ہے اسی کی ہستی ہے جو تمام مراتب وجود کو محیط ہے ۔ ہر شے کے وجود و بقا کا رشتہ اسی کی ذات سے ہے سا انسان اگر قرآن کی روشنی میں کائنات اور حیات انسانی کا مطالعہ کرے تو اسے اس ہستی تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے ۔ اس پر یہ حقیقت کھل سکتی ہے کہ انسان کو جو کچھ بھی حاصل ہے وہ اس کے فیض و عطا کے سوا اور کچھ نہیں ہے ۔

وَمَا بِكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ

تمہارے پاس جو کچھ نعمت ہے سب خدا ہی کی جانب سے ہے

اور خدا کی نعمتوں کا حال یہ ہے :۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ۔ (۱۶ : ۱۸)

اور اگر تم خدا کی نعمتوں کا شمار کرنے لگو تو ان کا شمار نہیں کر سکتے ۔

ہمیں اس زندگی میں جو نعمتیں حاصل ہیں وہ خاص طور پر اس پہلو سے ہمارے لیے نعمت ہیں کہ ان کے ذریعے ہمیں خدا کے منعم و محسن ہونے کا علم حاصل ہوتا ہے ۔ کائنات میں جو اصول و قوانین بھی کارفرما ہیں ان سے ہمیں خدا کے اسماء و صفات کی معرفت حاصل ہوتی ہے ۔ اس طرح کائنات کی ہر شے ہمارے لیے خدا کی ایک نشانی ہے جس کے ذریعے ہم تخلیق کائنات کی غرض و غایت اور خدا کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں ۔ چنانچہ کائنات کی تخلیق اور انسانی دنیا میں پائے جانے والے زبان و رنگ کے اختلاف تک کو قرآن خدا کی نشانیوں میں شمار کرتا ہے ۔

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافُ اَلْسِنَتِكُمْ وَاَلْوَانِكُمْ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّلْعٰلِمِيْنَ ۝ (۲۲ : ۳۰)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری بولیوں اور رنگتوں کا الگ الگ ہونا اس میں دانشمندوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں

اسی بنا پر انسان کے طلب استراحت اور تلاش معاش کو بھی خدا اپنی نشانیوں میں شمار کرتا ہے

وَمِنْ اٰيٰتِهٖ مَنَامُكُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَابْتِغَآؤُكُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّسْمَعُوْنَ ۝ (۲۲ : ۳۰)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے تمہارا رات اور دن میں سونا اور لیٹنا اور تمہارا اس کے فضل (رزق) کو تلاش کرنا ۔ ان میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں جو یقین کی سماعت سے سنتے ہیں ۔

ٹھیک اسی طرح جبلت جنس کو بھی خدا نے اپنی نشانی قرار دے کر اسے غیر مادی حقائق کا آئینہ قرار دیا ہے اور اسے معنویت عطا کی ہے ۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖٓ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ	اور یہ اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہارے
مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْٓا	لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں تاکہ تم ان کے پاس سکون
اِلَیْهَا وَجَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ	حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا
رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ	کردی۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے بہت سی نشانیاں
یَّتَفَكَّرُوْنَ ۝ (۲۱:۳۰)	ہیں جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

جس طرح خدا کے عطا کردہ رزق سے اس کے رزّاق ہونے کا، کائنات کی تخلیق اور اس میں عظیم حکمتوں کی کارفرمائی سے اس کے خالق اور حکیم و دانا ہونے کا ہمیں علم حاصل ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح معاشرتی اور ازدواجی زندگی میں رحمت و مودّت کی کارفرمائیوں اور نیرنگیوں سے ہمیں خدا کی رحمت و محبت کی پہچان حاصل ہوتی ہے۔ اٹالوی ادیب مسٹر البرٹو نے کتنا صحیح کہا ہے: "جنس کو انسانی زندگی سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جنس انسانی قدروں اور بعض ایسی چیزوں کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہوتی ہے جو جنسی نہیں ہوتیں۔" انسان ذی شعور ہستی ہے۔ وہ ایک محسوس وجود رکھتا ہے۔ اس کے وجود کی تکمیل ایک دوسرے نفس سے مل کر ہوتی ہے۔ روح کسی روح کی رفاقت کی جویا ہوتی ہے۔ قانون رفاقت ایک عالمگیر قانون ہے۔ انسان کی فطرت میں ایک ایسے سکون کی طلب رکھ دی گئی ہے جو ایک نفس کو دوسرے ایسے نفس کے پاس ملتا ہے جو اس کے ساتھ فطری مناسبت اور مطابقت رکھتا ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ دونوں کے درمیان محبت و ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہوں۔ دونوں میں حد درجہ قربت ہو عورت و مرد کا رشتہ کوئی ایسا رشتہ نہیں جو محض اس لیے وجود میں آیا ہو کہ دونوں ایک دوسرے سے مل کر اپنی جنسی خواہش پوری کر سکیں بلکہ نفسیاتی اور روحانی اعتبار سے بھی دونوں کو ایک ایسے شریک حیات کی ضرورت تھی جس کے ذریعے انھیں اپنی زندگی میں انس و محبت اور رفاقت کا سہارا حاصل ہو اور انھیں کسی تنہائی کا احساس ستا نہ سکے اور ان کی زندگیوں میں کوئی خلا باقی نہ رہے۔ خدا نے انسان کے اس فطری مطالبے کو پورا کرنے کے لیے کس درجہ اہتمام فرمایا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ اس کی حکمت نے اس غرض کی تکمیل کے لیے انسان کو جوڑے کے ساتھ پیدا کیا۔ انسان کے لیے تسکین و راحت کا یہ سامان قرآن کے نزدیک خدا کی ایک عظیم نشانی ہے۔ خدا کی نشانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر انسان اپنی بصیرت سے کام لے تو وہ اس کے ذریعے زندگی کی بلند ترین حقیقتوں تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اگر خدا کی بخشی ہوئی ایسی نعمتوں سے بھی جن میں صاف طور پر معنویت اور مقصدیت پائی جاتی ہے کسی کو کوئی معنوی اور اخلاقی رہنمائی حاصل نہ ہو سکی تو صحیح معنوں میں وہ ان نعمتوں سے مستفید نہیں ہو سکا۔

قرآن میں ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے :۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ○ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ الْمٰهِدُوْنَ ○ وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ○ فَفِرُّوْا اِلَى اللّٰهِ ۭ اِنِّىْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ○ ۵۰ (۵۱:۴۷)

اور ہم نے آسمان کو اپنی قدرت سے بنایا اور ہم وسیع القدرت ہیں۔ اور ہم نے زمین کو (بطور) فرش بنایا ہم کیسے اچھے بچھانے والے ہیں۔ اور ہم نے ہر چیز کو جوڑے جوڑے کے ساتھ پیدا کیا تاکہ تمہیں یاد دہانی ہو پس تم خدا کی طرف دوڑ پڑو۔ میں تمہیں صریح طور پر متنبہ کرنے والا ہوں۔

نہ صرف آسمان کی تخلیق میں اور نہ صرف زمین کے فرش بنا کر بچھائے جانے میں بلکہ ہر چیز کے جوڑے جوڑے پیدا کیے جانے میں بھی انسان کے لیے بڑی رہنمائی پائی جاتی ہے۔ جس طرح ہر چیز اپنے جوڑے کے بغیر ناقص اور نامکمل ہے خود انسان کا اپنا ظاہری وجود جس طرح اپنے جوڑے کے بغیر ناقص رہ جاتا ہے اسی طرح اس کا معنوی وجود بھی کسی ایسے جوڑے کا متقاضی ہے جس سے وابستہ ہو کر اس کے معنوی وجود کی تکمیل ہو سکے اور وہ بقائے دوام کا مستحق قرار پا سکے۔ ایک خدا ہی کی ایسی ذات ہے جس سے وابستہ ہو کر اس کے معنوی وجود کی تکمیل ہو سکتی ہے۔ اسی لیے فرمایا "خدا کی جانب (والہانہ) دوڑ پڑو" (وہی تنہا تمہاری طلب کا جواب ہے)۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ زندگی کا معنوی پہلو ہی زندگی کے ظواہر کی بھی تشریح و توضیح کر سکتا ہے اور انھیں معنویت و مقصدیت کی دولت سے نواز سکتا ہے۔

جنس کو آفاقیت عطا کرنے کے باوجود فرائیڈ کے حصے میں جو کچھ آیا ہے وہ سر تا سر مجاز ہے۔ حقیقت تک اس کی رسائی نہیں ہو سکی۔ وہ نہیں سمجھ سکا کہ ارتفاع جبلت (Sublimation) کی ایک اور بھی شکل ہے یعنی جبلت کا مجاز سے حقیقت کی طرف منتقل ہونا۔ تہذیب کی ترقی کے ساتھ انسانی جبلتیں اپنے اظہار کے لیے نئی وسعتیں اور راہیں تلاش کرتی رہتی ہیں۔ ایسی راہیں جو زیادہ مہذب، زیادہ وقیع اور زیادہ صحت مند ہوں۔ پھر انسان کی دلچسپیاں صرف مادی اشیاء تک محدود نہیں رہتیں بلکہ اس کے اشتیاق و طلب کا محور و مرکز ایک ایسی غیر مرئی ہستی بن جاتی ہے جو اس کارخانۂ عالم میں افادہ و فیضان کا سر چشمہ ہے۔

ہمارے نفس کا مقصود و منتہیٰ نہ معاش ہے نہ جنس اور نہ کوئی دوسری مادی شے بلکہ ایک نفس مطلق ہی ہمارے نفس کا مقصود و منتہیٰ ہو سکتا ہے جو تمام ہی حقیقتوں کا اصل سر چشمہ ہے۔ اپنے سے کمتر شے کو زندگی کی اصل غرض قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ انسان کو پیٹ بھرنے کے لیے روٹی چاہیے اس لیے کہ اس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔

معاش اور جنس اور دوسری مادی حقیقتوں سے بہت بلند ہے۔ ایک معبود کی تلاش اس کی فطرت میں داخل ہے۔ ذوق عبودیت و فدائیت انسان کی ایک بنیادی اور قوی ترجبلت ہے۔ اس ذوق کی تسکین ممکن ہی نہیں جب تک انسان خدا کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں ایک مطلوب اور محبوب کی حیثیت سے نہ پالے۔ کاش انسان اپنے خدا کو پہچانتا اور دنیا میں پائی جانے والی چیزوں کو حقیقت کی نگاہ سے دیکھتا۔ کاش وہ ہر چیز کو صرف افادی نقطۂ نظر سے دیکھنے کے بجائے اشیاء کے دوسرے معنی خیز نقوش کا بھی مشاہدہ کرسکتا۔ جو ہمیں زندگی کی بیش قیمت حقیقتوں کا علم و احساس بخشتے ہیں۔ اور اس خدا سے ہمارا رشتہ قائم کرتے ہیں جس پر ایمان لائے بغیر نہ تو ہمارا کوئی مسئلہ حل ہوسکتا ہے اور نہ ہم اپنی زندگی کا کوئی مفہوم و منشا متعین کرنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔

بقیہ اشارات) فرمایا گیا:-

فَلِذٰلِكَ فَادْعُ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ — پس تم اسی کی طرف دعوت دو اور جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ — ہے اس پر جم جاؤ اور ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

یہاں مقصد اقامتِ دین کے حصول کے لیے تین اولین بنیادی ہدایات دی گئی ہیں۔ پہلی ہدایت یہ ہے کہ لوگوں کو دین حق کی طرف دعوت دیجئے اور دوسرا ارشاد یہ ہے کہ تم خود دین حق پہ جمے رہو اور تیسرا حکم یہ ہے کہ منکرین حق کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔ حق کی دعوت۔ استقامت اور باطل سے بیزاری و نفرت، تحریک اقامت دین کی جدوجہد کے یہ تین اہم ترین نکات ہیں۔ کیونکہ ان تین باتوں کے بغیر دین کو عملاً برپا کرنے کا خیال، سودائے خام کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ قرآن میں بھی اقامت دین کو مقصد قرار دے کر اس کے حصول کی تدبیریں بتائی گئی ہیں۔ اقامت دین کی کوشش کو مقصد قرار نہیں دیا گیا کیونکہ کوشش حصول مقصد کی تدبیر اور ذریعہ ہوتی ہے خود مقصد نہیں ہوتی۔

یہ تمام توضیحات، ہمارے لیے ایک اور پہلو سے سبق آموز ہیں۔ ہم فریضۂ اقامت دین کے جس مرحلے سے گزر رہے ہیں وہ جدوجہد کا مرحلہ ہے ابھی عملاً اسے برپا کرنے کا مرحلہ دور ہے۔ ہمیں اس جدوجہد سے اکتانا نہ چاہیے اور نہ اکتا کر غلط سلط طریقے اختیار کرنے چاہییں کیونکہ ہمارا جدوجہد کرتے ہوئے مرجانا ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ اگر ہم اسے عملاً برپا نہ کرسکے جب بھی انشاء اللہ ہمارا شمار اسی گروہ میں ہوگا جو عملاً اسے برپا کردے گا۔

رہبانیت کے شاخسانے

جناب سلطان مبین صاحب ایم اے (سنسکرت)

خانہ داری اور ترک خانہ

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ رہبانی عقیدے کے مطابق ہل جوتنا، پانی بھرنا، چکی پینا، زمین کھودنا وغیرہ گناہ ٹھہرائے گئے۔

(۱۰) جو بھکشو زمین کھودے یا کھدوائے اس کو (کفارہ والا) گناہ ہے۔ ۱۱۔ درخت و پودوں کے گرانے میں (کفارہ والا) گناہ ہے۔ ۲۰۔ جو بھکشو جان کر جان دار والے پانی سے پودا یا مٹی کو سینچے یا سنچوائے اسے (کفارہ والا) گناہ ہے۔ بنے پٹک: بھکشو پرتی موکش: (کفارے والے گناہ) پرائشچت

پس مزدوری کرنا، کھیتی کرنا ایک گناہ کا فعل تھا۔ کتنی حیرت کا مقام ہے اس خوبصورت عقیدے کی وجہ سے بھیک مانگنے کا کام ایک نہایت پاکیزہ اور مقدس کام ٹھہرا۔ مگر محنت و مزدوری ایک ذلیل کام۔ بنیادی طور پر یہ طرز فکر ہندو مذہب کے منافی تھا۔ ہندو مذہب اپنی فطرت سے خانہ دار واقع ہوا ہے۔ مگر ان راہبوں کے اثر و غلبہ سے ہندو متکلمین بھی خانہ داری کو ایک گناہ کا عمل سمجھتے تھے چنانچہ "خانہ دار کے چولھا، چکی، سل، اوکھلی، جھاڑو، پانی کے برتن یہ پانچ مذبح ہیں جن کے استعمال سے خانہ دار گناہگار ہوتا رہتا ہے۔ منوسمرتی: ۳: ۶۸۔ اس طرح سے صریحی طور پر خانہ دار کو گنہگار اور بھکشو و برہم چاری کو نکوکار گردانا جاتا تھا۔ تو بھی عزت نفس اور خودداری اہل مذہب عقیدے سے بغاوت کرتی تھی۔ برہمن گرو کبھی رہبانیت کے گن گاتا اور کبھی خانہ داری کا قصیدہ پڑھتا تھا۔

۸۹۔ وید و سمرتی کی رو سے خانہ داران تینوں (برہم چاری) بان پرستھ (بادیہ نشین) سنیاسی (تارک الدنیا) سے افضل ہے۔ کیونکہ یہ خانہ داران تینوں کی پرورش کرتا ہے۔ ۹۰ جس طرح دریا اور ندی سمندر میں پہنچ کر ہی ٹھکانا پاتے ہیں۔ اسی طرح سب آشرم والے خانہ دار کے یہاں آکر ٹھکانا پاتے ہیں۔ منوسمرتی: ۶: ۸۹، ۹۰۔

دیگر خانہ دار کے لیے دوسرے کسی آشرم کی ضرورت نہیں ہے جس طرح سبھی جاندار ماں کے سہارے زندہ رہتے ہیں، اسی طرح سبھی آشرم خانہ دار کے سہارے زندہ رہتے ہیں۔ ... جہ جھل ساز، رقاص، مارز نہنگ، چوہ سپاہی، عالم

دستکار، طبیب ۰ زادراہ ختم کردینے والے دور دراز کے مسافر اور دوسرے بہت سے لوگ خانہ داری ہی کی طرف رجوع کرتے ہیں ۰ چوہے، بلی، کتے، سور، طوطی، کبوتر، کیکڑے، کرم خور حیوان ۰ جنگلی انسان، پرندے اور حیوان اور اسی طرح دوسرے ساکن و متحرک ۰ صدہا ہزارہا گھر، کھیت اور بھٹوں میں رہنے والے سبھی جانور خانہ دار کی کمائی کھاتے ہیں

مہابھارت: انوشاسن : ۶۰ صفحہ ۲۰۳

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رہبانیت جب کبھی خانہ داری کے گناہوں کو نمایاں کرتی تو ہندو متکلمین فوراً پرزور تردید کرتے کہ خانہ دار کے لیے کسی دوسرے آشرم کی ضرورت نہیں ہے۔ تمام دنیا خانہ داری ہی کی وجہ سے جیتی اور کھاتی ہے۔ مگر شدہ شدہ رہبانیت کی بدعت نے خانہ داری کی سنت کو دبوچ کر نگل لیا اور ایک مدت کے بعد جب رہبانیت نے عوام سے اعتماد اور سند پالیا تب ہندو متکلمین کے لیے یہی راستہ رہ گیا کہ جب بال سفید ہونے لگیں اور بڑھاپے کا ایلچی سمن دے جائے تو کسی گرو کے ہاتھ پر سے تاب سے توبہ کرے۔ فی الجملہ برہمنوں نے اپنی ہار مان کر آدھی زندگی کو سنیاس اور رہبانیت کے حوالے کر دیا۔ یہاں بھی برہمنوں نے خانہ داری اور سنیاس کے بنیادی فرق کو بھلا دیا اور زندگی کی وحدت پر ضارین کا قبضہ کرا کر فریقین کو حصہ دے دے کر صلح پر آمادہ کرا لیا۔

زراعت کی حلت وحرمت

جب زندگی اور ترک زندگی میں شہادت اور خودکشی میں، خانہ داری اور رہبانیت میں زور آزمائیاں چل رہی ہوں تو کاشتکاری اور دستکاری کے حلقے بھی ان اثرات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لازماً ان پر بھی حکم لگائے جائیں گے۔ ان کو کبھی حرام اور کبھی حلال کہا جائے گا۔ ویدوں میں مویشیوں کی دولت کے بار بار کے تذکرے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ آرین شروع میں گلہ بان تھے۔ مگر اس کشت زار ہند میں آنے پر وہ یقیناً زراعت کرنے و کرانے لگے تھے ویدوں کے بعض نغموں میں فصل کی افزونی کی دعائیں بھی ہیں۔ چونکہ آرین شرک کے صید زبوں تھے۔ ہندوستان میں آنے کے بعد ان کو توہم پرستی کا بھی شکار ہونا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے یہ سمجھنا شروع کر دیا کہ ہل اور پھال بھی خداوند ہیں۔ زمین کو پہلے ہی سے دیوی اور ماں مانتے ہیں۔ اب زمین کا شنہ (سیتا۔ सीता) کو بھی انھوں نے خداوند ماننا شروع کر دیا۔ جب کھیت اور ہل خداوند مانے جاتے ہوں تو پھر کاشتکاری کے تقدس اور پاکیزگی میں کس کو شبہ ہو سکتا تھا۔

ذیل کے نغمے میں انہیں خداوندوں کو مخاطب کیا گیا ہے اور ان سے فصل کی افزونی کی دعا کی گئی ہے کھیت کی جتائی کے وقت کی ایک ایک رچا (منتر) سے ہون کرے یا جاپ کرے۔ آشولاین گرہ سوتر: ۲ : ۱۰ : ۴

۱۔ [illegible] خداوند کشت۔ زار کے ذریعے ـــ دوسد [illegible] کا طرح ـــ رتھ [illegible] ۔ وہ ہم کو [illegible] دکھنت [illegible] گاؤ اسپ

اور معیشت بخشتا ہے۔ ۲۔ خداوند کشت زار! ہم کو شیریں نعمت۔ اسی طرح بخش۔ جس طرح گائے شیریں دودھ اور گھی کو۔ خداونداں ہم پر رحم فرمائیں۔ ۳۔ خداوندان فلک و آب ہری بھری فصل (بخشیں) ہمارے لیے فضا مہربان (شہد بار) ہو۔ خداوند کشت زار ہمارے لیے شہد بخش ہو۔ ہم لوگ خاکساری سے اس (خداوند) کی فرماں برداری کریں۔ ۴۔ بیل مبارک ہوں۔ طواہا مبارک ہو۔ ہل برکت جوتے، رسیاں برکت سے بندھی رہیں۔ کوڑا برکت سے ہانکے۔ (۵) دونوں خداوند شونا سیر۔ جو آسمان میں شیر بناتے ہیں خوش ہوں۔ دونوں اسی (دودھ) سے ان ترانہ کو سیراب کریں۔ ۶۔ خوش بخت سیتا (زمین کاشتہ) ہمارے قریب رہے۔ ہم آپ کی بندگی کرتے ہیں۔ کیونکہ آپ ہم کو خوش نصیب بناتی ہیں اور کیونکہ آپ ہم کو نعمت (پھل پھول) بخشتی ہیں۔ ۷۔ اندر سیتا کو سیراب کرے۔ پوشا اس کی رکھوالی کرے۔ یہ سیتا ہم کو آیندہ آیندہ سالوں میں مالا مال اور آسودہ کریں۔ ۸۔ ہمارے لیے پھال برکت کے لیے زمین کو جوتیں۔ طواہے برکت کے لیے بیلوں کے پیچھے پیچھے چلیں۔ ابر باراں برکت کے لیے آب شیریں بوسے خداوندان شونا سیر برکت کے لیے ہم کو دولت دیں۔ (رگ: ۴: ۵۷: ۱—۸)

سیتا یگیہ اور سرزمین یگیہ کا جوتنا

وید و برہمنوں کے مابعد جو ادب سوتروں "متون" کی شکل میں تیار ہوا اس میں سیتا یگیہ کا تذکرہ ملتا ہے (دیکھیے پارسکر گرہ سوتر) اس یگیہ میں زمین کاشتہ کے لیے نذر چڑھائی جاتی تھی اور سیتا نام کی خداوند (دیوی) خود ویدوں کے عہد میں موجود تھی۔ کشت زار کی پوجا کی تقریب اب بھی شریف ہندو کسان کرتے ہیں۔ اس طرح کاشتکاری کا تقدس شعوری طور پر دیر تک قائم رہا۔ اور پھر یہ تصور بھی کہ۔۔ ہل کے لوہے کے پھال سے جو زمین جوتی جاتی ہے اس کے قریب شیطان نہیں پھٹکتا اور اس میں سیتا (زمین کاشتہ) شنا سیر کی معیت کی وجہ سے تقدس بھر جاتا ہے۔ کام کرتا ہوا نظر پڑتا ہے۔ چنانچہ یگیہ سے پہلے مجوزہ زمین کو ہل سے جوت دیا جاتا تھا ایسے تذکرے پرانوں میں ملتے ہیں۔ اب بھی کھیت میں مکان بنانے کو یا کھنڈر میں جتنے، بونے اور فصل کاٹنے کے بعد تعمیر کو مسعود خیال کیا جاتا ہے۔ یہ سب رجحان کاشتکاری کے تقدس پر دلالت کرتے ہیں۔ مگر۔۔۔ زمین نہیں کھودنا چاہیے۔ تنکا نہیں اکھاڑنا چاہیے۔ پانی نہیں بھرنا چاہیے کی جینی و بودھی تعلیمات نے کاشتکاری کے تمام تقدس کو ملیامیٹ کر دیا۔ ان بزرگوں کی رہبانیت نے جس کردار کو پیش کرنا چاہا تھا اس کا کچھ اندازہ مہاتما بدھ کے ایک مکالمہ کے اقتباس سے ہوگا۔

۱۔ ابتدائی اخلاق: ۱۔ گوتم بدھ۔۔ "مہاراج بھکشو بیجوں اور جانداروں کے قتل کرنے سے اعراض کرتا ہے"۔
۲۔ گوتم بدھ۔۔۔ مہاراج بھکشو کچے اناج سے اعراض کرتا ہے۔

۲۔ درمیانی اخلاق :۔ گوتم بدھ —— مہاراج! یعنی عوام میری تعریف اس طرح کرتے ہیں — جس طرح کتنے شرمن اور برہمن (خانہ داروں کے ذریعہ) عقیدت سے دیے گئے کھانے کو کھا کر اس طرح کے سبھی بیجوں اور سبھی جانداروں کی بربادی میں لگے رہتے ہیں۔ مثلاً بن رو (جو جڑوں سے اگتے ہیں) گرہ رو (جو گانٹھوں سے اگتے ہیں جیسے گنا) پھل بیج اور پانچواں سبزہ رو (اگنا پودا) اس طرح سمن گوتم (شرمن گوتم) بیجوں اور جانداروں کا قتل نہیں کرتا۔" دیگھ نکا : ۱ : ۲ —— یہ حوالے براہ راست رہبانیت کے پیغامبروں کے ارشاد ہیں۔ ان تعلیمات کا اثر ہند و متکلمین پر پڑا ہرچند کہ ویدوں اور گرہ سوتروں نے کاشتکاری کے تقدس کی بات بتائی تھی مگر ہند و متکلمین نے اس عقیدے کی کوئی وکالت نہیں کی۔ اسلئے متاخرین نے ویدوں کی تعلیمات کو پس پشت ڈال کر کاشتکاری کو گناہ کہنا شروع کر دیا چنانچہ ۸۳۔ برہمن یا کشتری اگر اضطرار میں ویش کے پیشے سے زندگی گذارتا ہے تو وہ کوشش کرکے مجبوری[1] اور ہنسا کے کام۔ کاشتکاری —— کو ترک کر دے۔ ۸۴۔ حالانکہ عوام کاشتکاری کو بھلا کام سمجھتے ہیں۔ مگر اس کو بڑے لوگ معیوب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ لوہے کے پھال والا ہل زمین[2] اور زمین میں رہنے والے کیڑوں مکوڑوں کو قتل کرتا ہے۔ منوسمرتی : ۱۰ : ۸۳ : ۸۴

دیگر بان پرستھی (تارک خانہ صحرانورد) ہل سے جوت کر پیدا ہونے والے اناج کو —— اگر کوئی دے بھی تو نہ کھائے۔ اور گاؤں کے پھلوں اور جڑوں (والی ترکاری وغیرہ) کو اضطرار میں بھی نہ کھائے۔ منوسمرتی : ۶ : ۱۶

پس ایک طرف تو کاشتکاری اتنی پاکیزہ خدمت ہے کہ اس کے لیے رشیوں نے (ویدنے) دعائیں مانگی ہیں اور دوسری سمرتیوں نے (فقہا نے) کھیتی کو معاصی بتایا۔ ہٰذا ہو التضاد۔ میرے اپنے اندازے کے اعتبار سے متضاد رجحان کی بحث قریب قریب ختم ہوگئی۔ تکملا و تتمہ کے طور پر رہبانیت کی برکات کا ذکر کر دینا یہاں مناسب ہے ممکن ہے آئندہ توفیق ہو یا نہ ہو۔

تتمہ رہبانیت کے سایہ میں جب سیاست، زراعت کو شلیع قرار دے دیا گیا تو مزدوری، دستکاری، گلہ بانی گوشت فروشی، ماہی گیری کی خیر منانے کی جرأت کس میں تھی۔ راہبوں کی تعبیر نے معیشت کے سبھی شعبوں کو قابل اعتراض بنا ڈالا تھا۔ اگر کوئی پیشہ مختار و مجاز تھا تو وہ تجارت کا پیشہ تھا۔ اور چونکہ تاجر حضرات ان راہبوں کی جھولیوں کو بھرنے کی سکت رکھتے تھے اس لیے ان کو راہبوں نے بڑی محبت و شفقت کی نظر سے دیکھا اور ان بزرگوں نے مہاجنوں کے

---

[1] غالباً مجبوری یا پرش و قحط کے سبب سے زراعت دوسروں کی دست نگر ہے۔
[2] زمین کھودنا بھی گناہ ہے۔ مقابلہ کیجیے جو بھکشو زمین کھودے اور کھدوائے اس کو کفارہ دینا چاہیے۔

لیے بڑی رعائتیں اور رخصتیں تراش تراش کر بخشیں۔ شاید انہیں بزرگوں نے سود و قمار کی بندشوں کو مہاجنوں کے لیے کھول دیا۔ گاو بانی کی نیکی اور رخصت بھی شاید اسی طبقے کے مفاد میں بخشی گئی جب کہ بھیڑ او ربکریوں کے گلہ بانوں اور گڈریوں کو صراحتہً گنہگار بتایا گیا ہے۔

جرائم پیشہ لوگ بادشاہ، تیلی اور قصائی گنہگار ہیں۔ تیلی دس قصاب کے برابر گنہگار ہے۔ کلال (شراب ساز) دس تیلی کے برابر ہے۔ زانیہ (کسبی) دس کلالوں کے برابر ہے اور راجہ دس کسبیوں کے برابر گنہگار ہے۔ جو قصاب دس ہزار قصائی خانے چلاتا ہے راجہ اسی قصائی کی طرح ہے۔ اس لیے راجہ کی خیرات لینا بڑا خطرناک ہے۔ منوسمرتی: ۴: ۸۵، ۸۶ وایضاً مہابھارت: انوشاسن: ۱۲۵: ۹ دیگر

۲۱۰ ..... بڑھئی کا اناج ..... ۲۱۲ ..... شکاری کا اناج ..... ۴: ۲۱۴ ..... جُلاہے کا اناج ..... ۲۱۵ .....

لوہار، ماہی گیر، بہروپیا، سُنار، بانس پھوڑ اور اسلحہ فروش کا اناج ..... ۲۱۶ ..... دھوبی اور رنگریز کا اناج ۲۱۸

..... چمار کا اناج نیک نامی کو ختم کر دیتا ہے ..... ۲۲۱ ..... ان لوگوں کا اناج نہیں کھانا چاہیے۔ منوسمرتی: ۴: ۲۱۰

—۲۲۱۔ دیگر! برہمن، گڈریا اور شکاری دوزخ میں جاتے ہیں۔ وشناؤ میں آگ ڈالنے والے لوگ بھی وہیں (دوزخ) جاتے ہیں۔ وشنو پران: ۲: ۶: ۲۵۔ دیگر راجہ! برہمن تلوں کو کولھو میں نہ پلوائے۔ جو برہمن لالچ میں پڑ کر تل کو پلواتا ہے وہ رورو دوزخ میں جاتا ہے۔ سوم گنے کے خاندان سے پیدا ہوا ہے اور برہمن سوم کے خاندان سے پیدا ہوا ہے اس لیے برہمن گنے کو کولھو میں نہ پیلے۔ مہابھارت: انوشاسن: ۹۲: صفحہ ۳۴۴ مطبوعہ گیتا پریس گورکھپور

تیلی اس لیے گنہگار تھا کہ وہ سرسوں اور تل کے انڈوں اور بچوں کو کولھو میں پیس ڈالتا ہے۔ بوچڑ اس لیے گنہگار تھا کہ وہ جانوروں کو ذبح کرتا تھا۔ شکاری جانوروں کے شکار کے سبب سے اور ماہی گیر مچھلیوں کی ہتیا کی وجہ سے گنہگار تھا۔ بڑھئی درختوں کو کاٹ ڈالتا تھا اور بانس پھوڑ بانسوں کو قتل کرتا تھا۔ غرض ان تمدن کے خدمتگاروں کی خدمت کو سراہنا تو دُور رہا ان کے کاروبار اور دستکاری کو گناہ بتایا گیا اور جب یہ جرائم پیشہ ہوگئے اور ان کی کمائی سراسر حرام کی کمائی ہوگئی تو بھلا مقدس لوگ ان کو کس طرح چھو سکتے تھے؟ ان کا کھانا کس طرح کھا سکتے تھے؟ مہاتما مہابیر و مہاتما بدھ نے اپنی دانست میں یہ بہت بڑی سچائی پیش کی تھی کہ دانہ بیج پودوں، درختوں کیڑوں مکوڑوں کا احترام کیا جائے۔ مگر ان کو یہ احساس نہ ہو کہ کیڑوں مکوڑوں حیوانات دانہ و سبزہ اور درخت کے احترام کے نباہ سے لازماً ہم کو انسانیت کے ہاتھ سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ کاشتکار، دستکار، لوہار، تیلی، ماہی گیر، چرم کار اور گوشت فروشوں کو — جو تمدن کے مفید اجزا ہیں گنہگار کہنا ہوگا۔ ان کو ذلیل کرنا ہوگا۔ البتہ مفت خوروں اور بھکشوں کو پاکباز کہنا ہوگا۔ اونچا درجہ دینا ہوگا۔ ہندوستانی

اس تعبیر کو اس نسخہ کو ایک دو ہزار سال سے اپنا کر آزما کر شودروں اور اچھوتوں کی لعنت پیدا کی ہے۔ رہبانیت نباتات مع حیوانات کیساتھ ہمدردی کا سودا لے کر اٹھی تھی۔ مگر اس نے آدمیت کی تذلیل کا وہ بدنما داغ چھوڑا ہے جس کو عہد سائنس کی ایسڈیں دھونے میں کامیاب ہوتی معلوم نہیں ہو رہی ہیں۔ اس ناسور کے اندمال پر کروڑوں روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ مگر روئی کے پھاہوں سے یہ زخم بھر نہ سکے گا۔ اس داغ و زخم کو دور و بہتر کرنے کے لیے روایات کو بدلنے کی ضرورت ہے اور ہندوستان بحالت موجودہ اس تبدیلی کے لیے تیار نہیں ہے یعنی رہبانیت کا پیدا کردہ چھوا چھوت۔ اونچ نیچ۔ کا ناسور بہرحال ابھی صدیوں مندمل نہ ہوگا۔ دراصل وحی الٰہی سے بے نیازی کے سبب سے ایسے تباہ کن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

شرک نے دانہ، سبزہ اور درختوں کو خداوند مانا تھا۔ رہبانی الحاد نے بیج، سبزہ اور درخت کی زندگی کو محترم ٹھہرایا۔ غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ شرک کے "ہمہ خدا است" کے رجحان میں رہبانیت کی اہنسا کا راز مضمر ہے اور جب ان سراپا رحم ملحد بزرگوں نے مزدوروں، دستکاروں اور غریبوں پر لگاتار معاصی کے الزام لگائے تو جاہل انسانوں نے خاموشی سے سب کو سنا برداشت کیا۔ اور مشرک برہمنوں نے محنت کش مزدور طبقے پر "شودر" اور اچھوت کا فتویٰ صادر کر دیا اور تختۂ مشق ناز بنایا۔ گو شرک و الحاد باہم کتنے مختلف ہیں مگر ہندوستان میں انھوں نے ایسا گٹھ جوڑ کر کام کیا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے متمم و مکمل نظر آتے ہیں اور صاف صاف سمجھ میں آ جاتا ہے کہ "الکفر ملۃ واحدۃ" بات دراصل یوں بھی ہے کہ شرک اور الحاد دونوں میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ انسانوں کی سربلندی کی بات سوچ سکیں۔ اگر کہیں سے ان میں صلاح و فلاح کی بات در آئی بھی ہو جاتی ہے تو اس پر عمل کرنے اور کرانے کی جرأت بھی ان میں مفقود ہوتی ہے۔ مہاتما بدھ اگرچہ انسانی وحدت کی بات سے واقف ہو چکے تھے مگر خود وہ نسلی تعصب سے اوپر نہ اٹھ سکے۔ (دیکھیے نکائے : ۱ : ۳ : (۳) نہ انھوں نے یہ ضروری سمجھا کہ محنت کشوں سے ہمدردی کی جائے۔ بلکہ آں جناب کی تعلیمات تمام تر ان غریبوں کے خلاف پڑی۔ اس کے برخلاف توحید رحمت ہے وہ جہاں گئی اس نے انسانوں کو خانوں میں منقسم نہیں کیا۔ اس نے پراگندہ انسانوں کو ایک ہی سطح پر جمع کیا۔ اہنسا کی سرزمین ہند۔ جہاں غریب انسانوں کو کیڑے مکوڑے کے برابر بنا دیا گیا تھا۔ پر جب توحید کا سایہ پڑا تو یک ہزار سالہ فلاکت زدہ انسانوں کی گلو خلاصی ہوئی اور شاید انھوں نے پہلی بار یہ سمجھا کہ ہم بھی انسان ہیں۔ اور ان مصیبت زدوں اور جفاکش انسانوں کے ذہین طبقوں نے خود کو خدا کی غلامی میں دے دیا اور اس طرح سے انھوں نے اپنے کو دنیاوی اور اخروی ذلت سے بچا لیا۔ مگر جب رحمت کے ان خادموں نے — جن کو ہندو چین اور افریقہ میں کام کرنے کی زمین و موقع تفویض ہوا تھا اپنے منصب سے اعراض و روگردانی کیا تو ان کو ذلت میں ڈال دیا گیا۔ خیر ہمارے کہنے کی بات یہاں یہ ہے کہ سیدنا

عیسیٰ علیہ السلام و سیدنا محمد صلعم کا پیغام جزوی وکلی طور پر رحمت ہے۔اس نے ہند میں آکر ظلم کے نرغے میں گھری ہوئی انسانیت کی اعانت کی۔ظالم اپنے کو ظالم کہہ کیسے سکتا ہے؟ اس نے بھی اپنے لقمۂ تر کو چھوڑنا گوارا نہیں کیا۔چنانچہ اس ظالم طبقے نے ان مظلوموں کی مزاج پرسی اور ہمدردی کا راگ چھیڑا۔چنانچہ زیردستوں نے باہم صلح و مشورہ کرکے رحمت کے پیغام رسانوں کی توڑ کے لیے ـــــ زیردستوں کو کچھ وثیقہ دینا شروع کر دیا ہے۔ ہر چند کہ یہاں کی کثیر آبادی میں نبوت و رسالت کے خدمتگار بہت کم ہیں اور حقیقی معنوں میں یہ ـــــ اچھوت ـــــ بھی ہیں مگر نبوت کے پیغام میں اتنی تاثیر ہوتی ہے کہ وہ ظالموں کو مظلوموں کے آگے جھکنے اور ان کو رشوت دینے پر مجبور کر سکتا ہے۔ یہ اسلام و مسیحیت کی فتح کی نشانی ہے کہ ان کے ورود مسعود کی وجہ سے ـــــ ہندو اچھوتوں ـــــ کو وثیقے مل رہے ہیں۔ مسلم و مسیحی لوگ بھی دراصل اکثریت کے اندر اچھوت ہی ہیں۔ مگر ان کو وظیفہ نہیں ملتا ہے۔ اس پر ان کو ناخوش و ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ شرف کیا کم ہے کہ یہ لوگ دوسروں کا بھلا تو کر رہے ہیں "خیر الناس من ینفع الناس" ذرا اندازہ کریں جن کا سایہ اتنا رحمت خیز ہو ان کی معیت کتنی برکات پر مشتمل ہوگی! ہندو اچھوتوں کو بھی سوچنا چاہیے کہ آخر جن کی وجہ سے ہم کو وظیفہ مل رہا ہے، یا جن کے مقابلہ و عناد میں حاکم رشوتیں دینے کے لیے مجبور ہو سکتا ہے۔ آخر وہ کیسے پاک لوگ ہیں ان کا سایہ پڑ جانے سے مظلوموں کی بھاگ کھل جاتی ہے۔ ان کے لیے وظیفوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ تو پھر کیوں نہ ان پاک لوگوں کی جماعت میں شامل ہو کر ابدی پاکی حاصل کی جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ توحید جہاں پہنچتی ہے اپنے ساتھ خیر و برکت لے کر پہنچتی ہے۔

شرائطِ ایجنسی

۱۔ ایجنسی کم سے کم ۵ رسائل پر دی جائے گی۔

۲۔ رسائل حسب ضرورت طلب کیے جائیں۔ غیر فروخت شدہ رسائل واپس نہیں لیے جائیں گے۔

۳۔ کمیشن ۲۵ فی صدی دیا جائے گا البتہ ۵ یا زائد رسائل کی خریداری پر کمیشن ۳۳ فی صدی دیا جائے گا۔

۴۔ رسائل کی روانگی کا صرفہ ہمارے ذمے ہوگا اور رجسٹری اور وی پی کا خرچ ایجنٹ صاحبان کے ذمے ہوگا۔

۵۔ رقم پیشگی آنی چاہیے یا رسائل ذریعہ وی پی روانہ کرنے کی اجازت دی جائے۔

مینیجر ماہنامہ "زندگی" رامپور۔ یوپی

برتھ کنٹرول ہندستان میں

جناب وحیدالدین خاں صاحب

ایک تربیت یافتہ نرس مسز سینگر (Mrs. Sanger) نے ۱۹۱۴ء میں نیویارک میں بالکل غیر قانونی طور پر ایک برتھ کنٹرول کلنک کھولا اور اس طرح اس چیز کی تبلیغ شروع کی جس نے آج امریکی زندگی کو بداخلاقی اور عیاشی بنا دیا ہے جو درحقیقت کسی قوم کی تباہی کا اعلان ہے۔ ڈاکٹر ڈبلیو۔ اے۔ اسٹائل (مانٹریل) نے کہا ہے — "اگر امریکہ میں برتھ کنٹرول اسی طرح جاری رہا تو آئندہ ڈیڑھ سو سال میں امریکا اپنا تفوق ختم کر دیگا"

اس کے بعد ہی مسز سینگر ہندستان آئی۔ اس سفر کا مقصد ہندستان کو برتھ کنٹرول سے روشناس کرنا تھا ۱۰ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو پونا میں ڈھائی ہزار ہندو عورتیں کانفرنس میں شریک ہوئیں جنھوں نے اس تحریک کو ایک "گناہ" قرار دیا۔ اور اس کی سخت مخالفت کی۔ اسی طرح مدراس میں ایک ہزار افراد نے جمع ہوکر اس کے خلاف احتجاج کیا۔ اس میٹنگ میں امپیریل لیجسلیٹیو اسمبلی کے ایک ممبر مسٹر ایس ستیا مورتی نے کہا تھا "بچوں کی تعداد محدود کرنے کے لیے برتھ کنٹرول رائج کرنا خدا کے قانون کے خلاف ہے۔ یہ کفر کا کلمہ (Blasphemy) ہے"

مگر پچیس سال پہلے جس ملک نے اتنی شدت سے برتھ کنٹرول کی مخالفت کی تھی اب وہی ملک نہایت تیزی سے اسے قبول کر رہا ہے۔ ہماری پلاننگ کمیٹی مکمل طور پر برتھ کنٹرول کی حامی ہے اور اس مقصد کے لیے بہت بڑے پیمانے پر پبلک کا روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ اس صورت حال نے ان لوگوں کو سخت تشویش میں ڈال دیا ہے جو مسئلے کی حقیقت سمجھتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اسی وقت اس کو صاف کر لیا جائے ورنہ چند سال بعد ہمارے محبوب ملک کو اس کے کھٹے پھل کھانے پڑیں گے جب کہ تاریخ کا بدترین عفریت اپنے پنجے میں ہم کو پکڑ چکا ہوگا۔ اس وقت ہمارے ملک کا حال یہ ہوگا کہ عورتیں اس سے زیادہ شوہر کریں گی جتنے ان کے بچے ہوں گے۔ اس وقت ہماری مائیں اور بہنیں ایسے پست طریقے اختیار کر رہی ہوں گی جن کو اس سے پہلے قحبہ خانے کی عورتوں نے بھی استعمال نہ کیا ہوگا۔

برتھ کنٹرول نام ہے بالقصد ایسے طریقے اختیار کرنے کا جن سے بچوں کی پیدائش رک جائے۔ اس غرض کے

لیے جن ذریعوں کو اختیار کیا جاتا ہے وہ دوائیں اور آلات ہیں۔ اس کا مقصد آدمی کو بچوں کی پرورش کے بوجھ سے سبک دوش کر کے آزادانہ طور پر اپنے شوق سے لطف اندوز ہونے کا موقع دینا ہے۔ اسی لیے بعض لوگوں نے اس کو نجاست پھیلانے کا ایک منظم عمل (Planned Pollution) کہا ہے۔

قدیم زمانے سے شادی کو ایک مقدس عمل کی حیثیت حاصل تھی۔ یونانی اس کو (Matrimony) کہتے تھے جس کا مطلب ہے "مادرانہ ذمہ داری"۔ ماں کا درجہ اسی لیے بہت بڑا سمجھا جاتا تھا کہ وہ نسل انسانی کے بقا کی عظیم ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھاتی ہے۔ ایک شادی شدہ جوڑا سماج کو زندہ رکھنے کے لیے مشترکہ عمل کرتے ہیں۔ اب آلات، آپریشن یا دواؤں کے ذریعہ پیدائش کو روکنا درحقیقت نکاح کے مقصد کو بالقصد ختم کرنا ہے۔ برتھ کنٹرول کے بعد شادی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں رہتا کہ آدمی اپنی خواہش پوری کرلے۔ یہ شادی کو ایک قسم کی جائز قحبہ گری (Legalised state of Prostitution) بنا کر رکھ دیتا ہے۔ نیویارک کا ایک ممتاز ڈاکٹر (Dr. Victor C. Pederson) برتھ کنٹرول کے متعلق کہتا ہے — "یہ شادی نہیں بلکہ زناکاری ہے۔ یہ قحبہ گری کا ایک نیا دور ہے جو ہماری ماؤں اور بہنوں کو سکھاتا ہے کہ وہ عشق کریں اور بے خوف وخطر اپنی خواہشات پوری کریں۔ برتھ کنٹرول کے اس طریقے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو کسی نہ کسی شکل میں قحبہ خانوں کے اندر موجود نہ ہو۔"

برتھ کنٹرول اور طلاق میں بہت قریبی رشتہ ہے جو خاندانی نظام کو درہم برہم کرنے والا ہے۔ بچے، شوہر اور بیوی کے درمیان ایک فطری زنجیر ہیں، وہ دونوں کو ایک دوسرے سے باندھتے ہیں۔ ایک مشترک دلچسپی کے لیے ایک دوسرے کا ساتھ دینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ مگر برتھ کنٹرول اس زنجیر کو توڑ دیتا ہے۔ وہ مرد اور عورت کے درمیان جنسی تعلق کے سوا اور کوئی وجہ کشش باقی نہیں رہنے دیتا اور ظاہر ہے کہ یہ کشش ہمیشہ ایک ہی وجود تک نافع ہو کر نہیں رہ سکتی۔ موجودہ زمانے کی بے پردہ زندگی میں بار بار ایسے مواقع آئیں گے جب کہ آدمی اپنی جنسی تسکین کے لیے کسی اور وجود کے اندر زیادہ کشش محسوس کرے گا اور اس کو پانے کے لیے سابقہ تعلق کو بے تکلف توڑ دے گا۔

شکاگو کے چھ ججوں نے مشترکہ طور پر اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ خاندان کے افراد میں اضافہ طلاق کو روکتا ہے۔ ایک جج کے الفاظ نقل کرنے کے قابل ہیں:-

Every little youngster born to a couple is an added assurance that their marriage will never be dissolved in a divorce Court.

(ہر بچہ جو کسی جوڑے کے یہاں پیدا ہوتا ہے وہ اس بات کی ضمانت ہے کہ ان کا ازدواجی تعلق طلاق دینے والی عدالت کے سامنے بحث کا موضوع نہیں بنے گا۔)

وہ کیا مقصد ہے جس کو سرکاری پلاننگ کمیٹی اس برے ذریعہ سے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس کا مقصد آبادی کے اضافے کو روکنا ہے تاکہ یہاں کھانے کے لیے زیادہ منھ نہ ہوں، پہننے کے لیے زیادہ جسم نہ ہوں، اور زیادہ لڑکے نہ ہوں جن کو تعلیم دینا پڑے۔ مسٹر چسٹرٹن (G. K. Chesterton) نے کہا ہے کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی کے دس لڑکے ہوں اور آٹھ ٹوپی ہو، وہ فیصلہ کرے کہ دو لڑکوں کے سر کاٹ دیے جائیں۔ جو لوگ برتھ کنٹرول کو معاشی مسئلے کا حل بتاتے ہیں، اس کے بجائے کیوں نہ زراعت کے لیے ہزار برس پرانے مروجہ طریقوں کو چھوڑ کر زیادہ بہتر طریقے اختیار کیے جائیں، ملک کو زیادہ صنعتی بنایا جائے، زمین کے معدنی ذخیرے نکالے جائیں۔ پانی کی قوت کو استعمال کیا جائے۔ یہ اصلاح کا صحیح اور معقول طریقہ ہے۔ غیر فطری طریقہ اختیار کرنا صرف خدا کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

یہ ہندستان جو گاندھی جی کا ہندستان کہا جاتا ہے۔ وہ گاندھی جی کے خیالات سے کس قدر مختلف ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ گاندھی جی لکھتے ہیں:-

"برتھ کنٹرول کی ضرورت کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ مگر اس کا صحیح طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے آپ پر کنٹرول کیا جائے جس کو برہم چریہ کہا جاتا ہے۔ ڈاکٹر حضرات انسانیت کے شکریہ کے مستحق ہوں گے اگر وہ برتھ کنٹرول کے مصنوعی طریقے دریافت کرنے کے بجائے سلف کنٹرول کا طریقہ لوگوں کو بتائیں۔ ازدواجی رشتہ محض تسکین نفس کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ وہ نسل انسانی کی پرورش کے لیے ہے۔ برتھ کنٹرول کے مصنوعی طریقے مرد اور عورت کو بے خوف بنا دیتے ہیں۔ نیز مصنوعی طریقے ضعیف العقلی اور عصبی کمزوری پیدا کریں گے۔ یہ علاج اصل مرض سے بھی زیادہ برا ثابت ہوگا۔ فطرت اپنے قوانین کی خلاف ورزی کا پورا انتقام لے گی۔ اخلاقی نتائج، اخلاقی بندش ہی سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ دوسرے قسم کی بندشیں اس اصل مقصد ہی کو ختم کر دیتی ہیں جس کے لیے انھیں شروع کیا گیا تھا۔"

موجودہ زمانے کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ یہ بھی ہے کہ بہت سے تصورات جو دلیل کے میدان میں اپنا غلط ہونا ثابت کر چکے ہیں مگر اس کے باوجود انھیں اس طرح پھیلایا جا رہا ہے گویا وہ عین حق ہیں۔ ان کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ انھی میں برتھ کنٹرول کا نظریہ بھی ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو اس کے پیچھے سطحی خواہشات اور پست جذبات کے سوا اور کوئی چیز نظر نہ آئے گی۔ مگر اس کے باوجود اس کو اس طرح قطعیت کے ساتھ اختیار کر لیا گیا ہے گویا یہ کوئی ثابت شدہ چیز ہے۔ وہ ہمارے تمام مسائل کا بہترین حل ہے، جرائم کا خاتمہ، خوش حالی، تعلیم و تہذیب اور بہتر مستقبل کے عنوان سے ہم جو کچھ چاہتے ہیں، ان سب کا راز اس میں چھپا ہوا ہے کہ ہر خاندان نسل کشی اور قتل اولاد کا ایک منظم ہسپتال بن جائے۔

[illegible]

ایمان۔ عمل۔ جزائے عمل

(از افادات شیخ عبدالحق محدث دہلوی)

جن چیزوں پر یقین اور عقیدہ ضروری ہے ان میں سے ایک جزائے عمل ہے۔ عمل، نیک ہو یا بد، انسان جو کچھ بھی کرتا ہے دنیا اور آخرت میں اس کا بدلہ پاتا ہے، ہاں دنیا میں عمل کا بدلہ پانا لازم نہیں ہے۔ کیونکہ یہ دار العمل ہے، دار الجزاء نہیں ہے۔ اصلاً جزا و سزا کی جگہ آخرت ہے، وہاں حقائق اعمال کا ظہور اور اسرار و مخفیات کا انکشاف قطعی اور حتمی ہے۔ دنیا اصلاً آزمائش کی جگہ اور فتنہ و بلا کا محل ہے۔

دنیا کے مصائب و مکروہات ظالموں اور بدکرداروں کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں، بلکہ خدا کے راست اور نیک بندے بھی ان میں مبتلا کیے جاتے ہیں۔ صالح افراد کے مصائب و آلام میں، خدا کا لطف و کرم پوشیدہ ہوتا ہے ——— دنیا میں صادقان راہ اور مقبولان بارگاہ کی بہترین جزا یہ ہے کہ انہیں مزید عمل کی توفیق دی جاتی، طلب رضائے الٰہی کی پیاس میں اضافہ کیا جاتا اور ان کے اعمال میں صدق و یقین کے نور کو نمایاں کیا جاتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجاہدے کی قوت زیادہ، سعی و طلب کی ہمہ قوی اور شوق و محبت کی آگ تیز ہو جاتی ہے، اس راہ کے مسافروں اور کارگزاروں کے احوال و اعمال کا تجربہ و مشاہدہ اس بات پر گواہ ہے کہ کثرتِ کار اور قوت مجاہدہ، مزید اعمال کی توفیق کو بہت ہی بلند مقام پر پہنچا دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، یہ دیکھا جاتا ہے کہ جس شخص پر دو رکعت نماز اور تھوڑی سی تلاوتِ قرآن بھی گراں گزرتی تھی وہی شخص جب اپنے آپ کو اس کا عادی بنا لیتا ہے تو یہ شوق اتنی بڑھ جاتی ہے کہ ہزار رکعتیں اور ایک ختم قرآن بھی اس کے لیے آسان ہو جاتا ہے۔ یہ سب در اصل، دنیا میں، صدق نیت کا نتیجہ اور عمل خیر کی جزا ہے، اور یہ دنیوی جزا در حقیقت جزائے آخرت کی تکمیل کی تیاری ہے۔ اس لیے کہ آخرت میں اجر بانداز عمل ملے گا، جزائے عمل پر ایمان لانا اور آخرت کے بارے میں اپنا اعتقاد کو درست کرنا چاہیے، اور مخبر صادق صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے وعدہ و وعید کی جو خبر دی ہے اسے صحیح، درست اور یقینی جاننا چاہیے۔

ضعف ایمان و یقین کا علاج

اگر کسی کا ہیکل ایمان سست اور نور یقین، ضعیف ہوگیا ہو تو اس سے کہو کہ ان چیزوں پر عمل کرے جن پر وہ ایمان لایا ہے، اس لیے کہ کثرت عمل، اس کے ہیکل ایمان کو چست اور نور یقین کو قوی کر دے گی، اس لیے کہ ایمان و عمل کے انوار ایک دوسرے کو لازم ہیں اور ایک کا عکس دوسرے پر پڑتا ہے، ایمان، عمل سے قوت حاصل کرتا ہے اور عمل، ایمان سے، یہ دونوں ایک دوسرے کے مددگار و معاون ہیں۔ عمل کرنے کو، ایمان و یقین کی قوت پر موقوف نہ رکھنا چاہیے بلکہ جس قدر بھی ایمان حاصل ہو اور جیسا کچھ بھی ہو، چاہے تقلیدی ہی کیوں نہ ہو، عمل میں سعی کرنی چاہیے۔ عمل سے، دل میں نورانیت پیدا ہوگی جس سے ایمان قوت حاصل کرے گا اور پھر ایمان کی قوت، عمل میں قوت پیدا کر دے گی اور پھر موت تک یہی سلسلہ جاری رہے گا۔

ایک گمراہ کن خیال کی تردید

اوپر جو حقیقت بیان ہوئی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص یہ کہتا ہے کہ جب یقین، حاصل اور ایمان درست ہوگیا اور محبت الٰہی کی ڈوری ہاتھ میں آگئی، تو اب عمل کی کوئی ضرورت نہیں "تکلیف عمل ختم ہوگئی" اب اگر کوئی عمل ہوگا بھی تو وہ معرفت الٰہی میں تفکر ہوگا جو باطن کا عمل ہے، جسم اور جوارح کے اعمال کی کوئی ضرورت نہیں، تو ایسا شخص بے دین ہے، اس کا خیال، حقیقت نفس الامری، تجربہ اور نصِ قرآن، سب کے خلاف ہے، اس نے الحاد و بے دینی کی راہ اختیار کرلی ہے۔ اہلِ طریقت کے نزدیک، یہ بات مسلّم ہے کہ جس قدر محبت میں اضافہ ہوگا، اتباع میں بھی اضافہ ہوگا اور جس قدر ایمان، کامل تر ہوگا، عمل بھی قوی تر ہوگا۔

ایک دن، سید الطائفہ جنید بغدادی قدس سرہٗ کے پاس ایک شخص "معرفت" کی ایسی گفتگو کرنے لگا جس سے اتباع و عمل کو ترک کرنے کی طرف اشارہ ہو رہا تھا، یہ گفتگو سن کر حضرت جنید نے فرمایا۔ میرے نزدیک یہ بات چوری اور زنا سے بھی بدتر ہے۔ ہرگز کسی عارف کے لیے جائز نہیں کہ وہ ترکِ عمل کرے —— غور سے سوچو تو کہ ایمان اور محبت الٰہی میں انبیاء صلوات اللہ و سلامہ علیہم کے احوال سے بلند تر احوال کس شخص کے ہوسکتے ہیں، اس کے باوجود انھوں نے طاعت و عبادت میں، بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جو خدا کے سب سے زیادہ مقرب بندے ہیں نماز شب میں اتنی دیر کھڑے رہے کہ پائے مبارک پر ورم آگیا، جب آپ کا یہ حال تھا تو دوسروں کے بارے میں اور کیا کہا جائے، نیز یہ بات بھی معلوم ہے کہ انبیاء کے افعال و اعمال تشریع کے لیے ہوتے تھے تاکہ وہ دوسروں کو اپنا عمل دکھائیں اور انھیں سکھائیں، جب تشریع اس لیے ہے کہ دوسرے دیکھیں اور اتباع

کریں تو پھر ترکِ عمل کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے اگر لوگ ایمان لانے کے بعد اتباع و عمل چھوڑ دیں تو تشریع بے کار ہو جاتی ہے لہذا معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں عمل کرنا لازم ہے ——— اس پہلو سے بھی ترکِ عمل کی بات غلط ہے کہ ایمان، عمل ہی سے کمال حاصل کرتا ہے اور مراتب کمال کی کوئی نہایت نہیں ہے، آخر وہ کون سا مرتبہ اور درجہ ہے جہاں پہنچ کر یہ مدعی ترکِ عمل کرے گا، بہرحال ترکِ عمل کی بات، ملحد و بے دین لوگ کہتے ہیں، ان کی باتوں پر کان نہ دھرنا چاہیے۔ نعوذ باللہ من الکفر والالحاد

ایمان و عمل کا باہمی ربط

یہ بات صحیح ہے کہ حقیقت ایمان اور اس کے اصل وجود میں عمل معتبر نہیں ہے بے عملی کے باوجود نفس ایمان کا وجود ہوتا ہے اور رہ سکتا ہے لیکن ناقص ہوتا ہے، ایمان کا کمال، عمل پر موقوف ہے ضعف و قوت اور کمال و نقصان کے لحاظ سے ایمان و یقین کے درجات بہت ہیں، ایمان کے نتائج و ثمرات، دلوں کی قوت و نورانیت کے مطابق ظاہر ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی دل آفتاب کی طرح روشن و تاباں ہوتا ہے، کوئی ماہتاب کی طرح، کوئی ستارے کی طرح، اور کوئی شمع کی طرح۔ ایمان و یقین کے تفاوت کو اسی پر قیاس کرنا چاہیے یہ بات بہت واضح ہے اس لیے مزید تشریح کی ضرورت نہیں، خلاصہ یہ ہے کہ تصدیقات قلبی میں قوت و ضعف اور کمال و نقصان کے لحاظ سے تفاوت ثابت ہوا اور یہ بات بھی ثابت ہے کہ ایمان میں قوت و کمال عمل سے پیدا ہوتا ہے اور ضعف و نقصان ترکِ عمل سے، دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو بوؤگے وہ کاٹوگے ——— اصل چیز ایمان ہے اس کی فکر کرنی چاہیے۔ اگر یہ سلامت رہے تو پھر کسی چیز کا غم نہیں

کارکن کار بگذر از گفتار　　　کاندریں رہ، کار دارد کار

ایمان کیا ہے؟

جانتے ہو ایمان کیا ہے؟ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر سچے دل سے اعتقاد اور بلاشک و شبہ اس کلمۂ ایمان کے ہر دو جزو کے ساتھ گرویدگی اگرچہ پہلا جزو عظیم تر اور بزرگ تر ہے لیکن دوسرے جزو کی اہمیت اس پہلو سے بہت زیادہ ہے کہ اس کے بغیر پہلا جزو معتبر نہیں اگر کوئی شخص سو سال تک لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ کہتا رہے پھر بھی بحکم شرع وہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک ایک بار مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہ کہہ لے۔ یعنی اللہ فرماتا ہے کہ میں تو تمہارا الٰہ اور پروردگار ہوں ہی مجھ پر ایمان لانے میں تمہیں کیا تامل ہو سکتا ہے۔ ہاں میں جسے اپنی رسالت کے لیے منتخب کروں اس پر ایمان لاؤ اور اس کے گرویدہ بنو۔ کیونکہ تمہاری بندگی کا امتحان اسی میں ہے۔ اگر تم میرے رسول پر ایمان نہیں لاتے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے دعوئ عبودیت میں سچے نہیں ہو۔ اس حقیقت کو قصۂ آدم میں سمجھنا چاہیے۔ اللہ نے

مترجمہ: ش۔ ن۔ عثمانی

روس کے مسلم علاقوں میں سوویت سامراج

(از ڈاکٹر جارج اے وان اسٹاکبرگ)

ایشیائی، افریقی اور لاطینی امریکہ کے دیشوں میں سوویت پروپگنڈہ اپنے اس تجربے کو خاص شد و مد سے پیش کرتا ہے جو ریاستہائے متحدہ سوویت روس نے سوویت تعمیر اور قومیت کے مسئلے کو حل کرنے کے ذیل میں حاصل کیا ہے۔ اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے پندرھویں اجلاس میں ایک تقریر کرتے ہوئے سوویت وفد کے سربراہ مسٹر خروشچیف نے سوویت تجربات کی افادیت کا یقینی ثبوت دینے کے لیے اعداد و شمار کی تفصیلات بڑے شرح و بسط کے ساتھ حوالے میں دیں۔ انھوں نے کہا:۔

"ہمیں فخر ہے کہ روس کے سابق علاقوں کے تجربے نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ مشرق کے ممالک کے لیے اس بات کا امکان ہے کہ وہ پسماندگی، غریبی، بیماری اور جہالت کا خاتمہ کر ڈالیں اور ایک نسل کی مدت میں خود کو ان ممالک کا ہم پلہ بنا کر دکھا دیں جو معاشی طور پر آگے نکلے ہوئے ہیں۔"[1]

پہلی سوویت کانفرنس جو افریشیائی قوموں کی شیرازہ بندی کرنے کے لیے تازہ ہی یو ایس ایس آر کی راجدھانی اشقان آباد میں ۱۰ تا ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو منعقد ہوئی تھی اس کے منتظمین نے بھی اسی سوویت تجربے پر زور دیا تھا۔ اس قسم کے پروپگنڈہ کا مقصد یہی نہ تھا کہ اقوام متحدہ میں مسٹر خروشچیف نے سوویت تجربے کے متعلق جو رائے ظاہر کی تھی اس کو تقویت پہنچائی جائے بلکہ اس کا مطمح نظر یہ بھی تھا کہ مغرب کے اخبارات میں مختلف ہو نو وار دان گنت مضامین کے ذریعہ روس کے بارے میں شہنشاہیت اور نوآبادیاتی سامراج کے جو الزامات لگائے جا رہے تھے ان کا بھرپور تدارک کیا جا سکے۔

---

[1] پراودا، ۲۴ ستمبر ۱۹۶۱ء صفحہ ۲

[2] نیو یارک ٹائمز ۲۲ ستمبر ۱۹۶۱ء — این۔ وائی ہیرلڈ ٹریبون۔ نیو یارک ۲۴، ۲۵ ستمبر ۱۹۶۱ء — ماسکو ریڈیو منعقدہ ۲۶ ستمبر

اسٹالن آباد کانفرنس میں تو سوویت رہنماؤں نے یہاں تک کیا کہ شمالی کاکیشیا کے عوام کے نمائندے رسول غمزتوف شاعر کو اس کانفرنس کی عدالت میں بھیجا اور اس کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس علاقے کے لوگوں کے کارہائے نمایاں اور پرمسرت زندگی کی حمایت میں بولے۔ اس نے ان تیرہ بختیوں اور مصائب کا کوئی ذکر تک نہ کیا جن کو شمالی کاکیشیا سے وہاں کی پوری آبادی کی جلاوطنی نے جنم دیا تھا۔

اسٹالن آباد کی اس کانفرنس میں وسطی ایشیا اور قازقستان کے مسلمانوں کی روحانی تنظیم کے سربراہ مفتی ضیاءالدین بابا خانوف نے شرکت کی تھی جن کو کانفرنس کی کرسی صدارت کے لیے چنا گیا۔ کانفرنس میں انہوں نے جو تقریر کی[1] وہ ان طریقوں کی ایک عمدہ مثال تھی جن کو سوویت کمیٹی افریشیائی عوام کی جتھہ بندی کے لیے اس وقت برتتی ہے جب ان ممالک کے عوام مسلمان کے لیے پروپیگنڈہ پھیلایا جاتا ہے تاکہ اس طرح سوویت مسلم رہنماؤں کی عملی سرگرمیوں کو پوری پوری طرح اشتراکی پروپیگنڈے کے مفادات سے متحی کردیا جائے۔ سوویت پروپیگنڈہ اپنے اس تجربے پر سمٹ آنا چاہتا ہے جو اس نے غالب مسلم آبادی والے وسطی ایشیا میں سوشلزم کی تعمیر کرتے ہوئے حاصل کیا ہے۔ اس تجربے پر لمبی چوڑی گنگناتی کتابوں اور مقالوں میں کی گئی ہے جو بالکل متصل ملنے میں سوویت روس میں شائع کیے گئے ہیں[2] اکیڈمی آف سائنسز سوویت روس کے ایشیائی عوام کے ادارے کے ڈاکٹر بی۔ جی غفوروف کا مقالہ ایک ایسے ہی ڈھب کی تصنیف ہے[3]

یہ کہتے ہوئے کہ "تمام دنیا اس تجربے سے اکتساب فیض کر رہی ہے جو سوویت روس نے اپنی قومیت کی پالیسی کے ذیل میں حاصل کیا ہے" غفوروف کا خیال ہے کہ وسطی ایشیا میں اشتراکیت کی تعمیر کی کامیابیوں نے پورے پورے مفہوم میں بین الاقوامی اہمیت حاصل کرلی ہے اور یہ کہ لینن پالیسی کی کامیابیاں سیکڑوں سرمایہ دار ممالک اور ان

---

[1] کمیونسٹ تازکستان۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۰ء ــــ بلیٹن میونخ نمبر (۱) ۱۹۶۱ء صفحہ ۲۳

[2] استوریا ازبکستان ایس ایس آر (ازبک سوویت روس کی ایک تاریخ) تاشقند جلد ۲ ۱۹۵۶ء

استوریا ترکمانوسکوئی ایس۔ ایس۔ آر (ترکمان ایس ایس آر کی تاریخ) عاشق آباد جلد ۲ ۱۹۵۷ء

استوریا قازقسکوئی ایس ایس آر (قازق ایس ایس آر کی تاریخ) الماآتا۔ جلد ۲ ۱۹۵۷ء

"اشتراکیت کے عہد میں وسطی ایشیا اور قازقستان کی تاریخ کے لیے تیار شدہ روئیداد اجلاس مشترکہ" الماآتا ۱۹۵۷ء

"سوویت مشرق کے عوام کی معاشی نابرابری کا خاتمہ اور اشتراکی صنعت کا قیام۔ قازق ایس ایس آر کا تجربہ" ماسکو ۱۹۵۸ء

[3] "PROBLEMY VOSTOKOVEDENIYA" نمبر ۵ ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۹

ممالک میں جواب تو آبادیات کے درجے سے نکل گئے ہیں لاکھوں کروڑوں افراد کو متاثر کر رہی ہیں[1]

سوویت روس کی سپریم سوویت کے ایک سالانہ اجلاس میں مسٹر خروشچیف نے ۱۹۵۶ء میں یہ یقین دلایا تھا کہ

"سرمایہ دار حریف یہ تو سوچتے ہیں کہ کمیونسٹ کچھ ایسے نت نئے مصنوعی طریقے کھوجنے میں منہمک ہیں جو ممالک کو فرداً فرداً اشتراکیت کی منزل تک پہنچا سکیں لیکن سوشلزم کی تعمیر کا جو عظیم تجربہ سوویت یونین، چین اور دوسرے دیشوں کے پاس موجود ہے اس کو زیب طاق نسیان کر دیا جاتا ہے[2]"

فی الواقع سوشلزم تعمیر کرنے کا یہ عظیم تجربہ — کمیونزم کے خطرات کی یہ وارننگ — نہ صرف اشتراکیت کے حریفوں کو بلکہ ان افریشیائی ممالک کو بھی زیب طاق نسیاں ہی کرنا چاہیے جنہوں نے قومی آزادی، قومی معاشیات اور قومی کلچر کے نشو و نما کی مہم پر سفر شروع کیا ہے۔

(ا)
سوویت تجربہ

مسلمانوں سمیت تمام سوویت یونین کی قومیں سیاسی، معاشی اور ثقافتی دائروں میں تعمیر اشتراکیت کے سوویت تجربے کا موضوع اور محل رہی ہیں۔ دوسرے نتیجے یورپ کی مشرقی اور جنوب مشرقی جمہوریتوں کی قوموں میں ملتے ہیں۔ ان دیشوں کی کمیونسٹ حکومتوں نے اس سوویت تجربہ کو مثالی نمونے کے طور پر لیا ہے۔ کمیونسٹ چین بھی سوشلسٹ کمیونزم کی تعمیر کے لیے خود اپنے تجربے کا پرچار افریشیائی قوموں میں کیے جا رہا ہے۔ یہ تجربے عوامی کمیونوں کی بناوٹ کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ خود اپنی قومیت کے مسئلے کو حل کرنے میں اس کا اپنا تجربہ جس بہترین صورت میں سامنے آیا ہے وہ تبت پر قاہرانہ قبضہ ہے۔ خود چین میں قومی اقلیتوں کے کلچر کی پامالی ہے۔ جس میں مشرقی ترکستان اور چین کے دیگر صوبوں کی مسلمان قومیں بھی شامل ہیں۔　(باقی آئندہ)

---

[1] ایضاً صفحہ ۱۰۹۔

[2] "ایک اٹل امن اور پرامن بقائے باہم کے لیے" از این۔ ایس۔ خروشچیف۔ ماسکو ۱۹۵۹ء۔ صفحہ ۲۳

کیا خدا کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حقوق برابر ہیں؟

کیا روشنی اور تاریکیاں برابر ہیں؟ نہیں۔ کیا چلچلاتی ہوئی دھوپ اور سایے برابر ہیں؟ نہیں۔ کیا بینا اور نابینا برابر ہیں؟ نہیں۔ کیا علم رکھنے والے اور نہ رکھنے والے برابر ہیں؟ نہیں! کیا مجرم اور غیر مجرم برابر ہیں؟ نہیں! کیا انسان اور جانور برابر ہیں؟ نہیں!

اور

کیا توحید اور شرک برابر ہے؟ ہاں! کیا مشرک اور موحد برابر ہیں؟ ہاں! کیا خدا کو ماننے والے اور خدا کے منکر برابر ہیں؟ ہاں! کیا خدا کے فرماں بردار اور نافرمان برابر ہیں؟ ہاں! ——— اب انہیں سوالات سے ملتے جلتے چند دوسرے سوالات پر غور کیجیے۔

کیا ملک کے غداروں اور وفاداروں کے حقوق برابر ہیں؟ نہیں! کیا ریاست کے باغیوں اور فرماں برداروں کے حقوق یکساں ہیں؟ نہیں! کیا ڈاکوؤں اور پرامن شہریوں کے حقوق برابر ہیں؟ نہیں!

اور

کیا مذہب کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کے حقوق برابر ہیں؟ ہاں! کیا خدا کا اقرار کرنے والوں اور انکار کرنے والوں کے حقوق یکساں ہیں؟ ہاں! کیا خدا کے باغیوں اور فرماں برداروں کے حقوق برابر ہیں؟ ہاں!

جن سوالات کے جوابات اثبات میں دیے گئے ہیں انہیں سنتے ہی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اچانک روشنی غائب ہو گئی ہو اور گھپ اندھیرا چھا گیا ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ جب تک عقل کی روشنی بجھ نہ جائے اخیر کے سوالوں کا جواب اثبات میں دینا ممکن نہیں ہے لیکن یہ سوال و جواب فرضی نہیں ہے۔ آج دنیا کی بڑی بڑی حکومتیں سیکولرزم کے نظریے پر چل رہی ہیں، اس کے ماننے والے اور چلانے والے کم سے کم نظری طور پر ان سوالات کے یہی جواب دے رہے ہیں۔ اقوام متحدہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے اس کی ایک خبر پڑھیے۔

"۱۰ اپریل، متحدہ اقوام نے کل رات ایک رپورٹ کو منظور کیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ خدا کے ماننے والے [illegible]

اور خدا کے منکروں کے حقوق یکساں ہیں، اور کسی ایسے ملک میں آزادیِ ضمیر ممکن نہیں جہاں ایک مذہب کے ماننے والوں کو دوسرے مذہب کے ماننے والوں پر فوقیت دی جاتی ہے۔"

اگر پڑھنے والوں کا ذہن یہ سوال کرے کہ یہ تو پہلے سے طے شدہ بات ہے اسے پھر منظور کرنے کے کیا معنی؟ تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ یہ دنیا کی ملحد اقلیتوں پر نوازش و کرم کی بارش ہے جو رپورٹ منظور کی گئی ہے وہ اس بحث کا خلاصہ ہے جو متحدہ اقوام کے حقوقِ انسانی کے کمیشن میں اقلیتوں کے خلاف امتیاز برتنے کو روکنے کے مسئلے پر ہوئی تھی اس رپورٹ میں یہ بات بھی کہی گئی ہے:۔

"مذہب اپنے ماننے والوں کے لیے مقدس ہوتا ہے لیکن جو لوگ مذہب کو نہیں مانتے ان کو بھی اپنے عقائد پر قائم رہنے کا پورا حق ہے اور ان کے خلاف امتیاز نہ ہونا چاہیے کیونکہ ان کے لیے اپنے اعتقادات کچھ کم مقدس نہیں۔"

خدا بے زاری، آخرت فراموشی اور دنیا پرستی میں شاید ابھی کوئی کسر رہ گئی تھی جسے اس رپورٹ کے ذریعہ مکمل کرنے کی کوشش کی گئی ہے یا دنیا میں مذہب کو ماننے والی اکثریتوں کے درمیان ملحد اقلیتوں کو بڑے بڑے کلیدی مناصب پر قبضہ کرنے میں شاید کوئی دشواری پیش آ رہی تھی جسے اس دستاویز کے ذریعہ دور کرنا مقصود و مطلوب ہے۔

یہ بات دنیا والوں کی سمجھ میں نہ جانے کب آئے گی کہ یہ دنیا جس کے حقوق کے لیے وہ رپورٹیں تیار کر رہے ہیں، خدا کی مملکت ہے، وہی اس کا مالک اور حقیقی فرماں روا ہے، اس مملکت میں اس کے باغیوں اور فرماں برداروں، غداروں اور وفاداروں کے حقوق یکساں نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں جس طرح متحدہ اقوام کے کسی ملک میں اس ملک کے ثابت شدہ غداروں اور وفاداروں، پُرامن شہریوں اور فسادی ڈاکوؤں کے حقوق برابر نہیں ہیں بلکہ غداروں اور ڈاکوؤں کی جگہ یا تو جیل ہے یا پھانسی کا تختہ۔

راشٹرپتی کی طرف سے اعزازات دیے جانے کی تقریب

نئی دہلی ۔ ۲۰ اپریل ۶۲ء

جن لوگوں کو اس سال پدم وبھوشن اور پدم شری کے اعزازات عطا کیے جانے کا اعلان ہوا تھا ان کو آج بعد دوپہر صدر جمہوریہ نے اعزازات سے نوازا۔ یہ تقریب راشٹرپتی بھون کے دربار ہال میں منعقد ہوئی۔ اس کے بعد [illegible] کی جانب سے ایک استقبالیہ دیا گیا۔ انعام حاصل کرنے والوں میں اردو کے مشہور شاعر مرزا جعفر علی خاں اثر

اور شری نیاز محمد خاں نیاز کو پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا۔ نیز سنگیت کے ماہر شری بڑے غلام علی خاں کو بھی پدم بھوشن کا اعزاز عطا ہوا۔"

کہا جاتا ہے کہ شعر اور موسیقی کا قریبی تعلق ہے۔ ان تینوں کو ایک ہی اعزاز شاید اسی مناسبت سے عطا کیا گیا ہوگا، یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ موسیقی کے مدبھرے لحن میں شری بڑے غلام علی خاں نے جناب اثر لکھنوی اور جناب نیاز فتحپوری کو مبارکباد دی ہوگی اور شعر کی کسی مترنم بحر میں ان دونوں نے سنگیت کے ماہر کو تہنیت پیش کی ہوگی لیکن اس کا پتہ نہ چلا کہ خوشی زیادہ کس کو حاصل ہوئی۔ سنگیت کے ماہر کو شعراء کا ہم پلہ قرار دیے جانے پر یا ان شاعروں کو گویوں کا ہم رتبہ بنائے جانے پر

حلفِ وفاداری

لوک سبھا کے ایک سوشلسٹ ممبر نے آئین کی وفاداری کا حلف لینے سے پہلے اس پر تنقید شروع کردی۔ سافران کے روکنے کے باوجود نہ رکے اور اپنی تنقید ختم کرنے کے بعد وفاداری کا حلف اٹھایا ـــــ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ حلف وفاداری کا مطلب دستور پر ایمان لانا نہیں ہے لیکن دوسرے ہی لحہ میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس کا مطلب کیا ہے؟ سوشلسٹ ممبر نے جرأت کا اظہار کرکے برو قت تنقید کر ڈالی اور کتنے ہی ممبر ایسے ہوں گے جنھوں نے اپنے دلوں میں دستور کو نادرست سمجھتے ہوئے بھی حلف وفاداری اٹھایا ہوگا اب صورت یہ بنی کہ ایک شخص دستور کو صحیح نہیں سمجھتا اس کے باوجود اس کی وفاداری کا حلف اٹھاتا ہے اس کے معنی کیا ہوں گے؟ یا تو یہ فعل لغو و بے معنی ہے یا "منافقانہ" ہے۔

کئی سو برسوں کی غلامی

بحث پر جو تقریر ہوئی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ ہم کو:۔

"کئی سو برسوں کی غلامی سے نجات ملی ہے۔"

ایک عرصہ گزر جانے کے بعد بھی نہ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرف سے اس کی تردید ہوئی ہے اور نہ کسی دوسرے بڑے کانگریسی نیتا کی طرف سے۔ ہاں بحث کے اس جملے پر ایک لکھنوی معاصر نے "عجیب و غریب" کے عنوان سے اداریہ لکھا ہے اور بڑے تعجب کا اظہار کیا ہے کہ یہ مسلم لیگ کا نعرہ کانگرس کی صفوں میں کس راستے سے آگیا؟ اور آخر میں فرمایا ہے کہ "یہ واضح رہے کہ آج اس نظریے کی قدر دانی جن سنگھ کے ہاتھوں کو مضبوط بنائے گی اور کانگرس کی جڑ کمزور کرے گی۔"

راقم الحروف کو جو بات عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ جب کانگرس کا کوئی ہندو لیڈر اس طرح کی بات کہتا ہے تو اس کی تردید صرف مسلمان قوم پرستوں کی طرف سے ہوتی ہے، پنڈت جی تک اس کی تردید نہیں فرماتے اور اگر کوئی مسلمان لیڈر اس طرح کی بات کہتا ہے تو مسلمان قوم پرست بھی چیخ اٹھتے ہیں اور کانگریس کے ہندو لیڈر بھی تلملا جاتے ہیں ایسا کیوں ہے؟

اس راز کی پردہ کشائی لکھنوی معاصر ہی کرسکتا ہے۔

روئداد مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند

مجلس شوریٰ کا سالانہ اجلاس ۱۵ اپریل کو صبح ۹ بجے سے شروع ہونے والا تھا لیکن گاڑیوں کے تاخیر سے پہنچنے کی وجہ سے اس وقت کورم کے بقدر ارکان حاضر نہ ہوسکے اس لیے اس کی باقاعدہ نشست سہ پہر میں ۲ بجے شروع ہوئی۔ مولانا ابواللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے اجلاس کی صدارت فرمائی۔

حسب ذیل ارکان شوریٰ نے اجلاس کی جملہ نشستوں میں شرکت فرمائی۔

جناب کے سی عبداللہ صاحب، جناب محمد یوسف صدیقی صاحب، جناب مولانا محمد عزیر صاحب، جناب عبدالحی صاحب، جناب وحیدالدین خاں صاحب، جناب انیس الدین صاحب، جناب افضل حسین صاحب، مولانا نظام الدین صاحب، جناب سید حامد حسین صاحب اور محمد یوسف قیم جماعت

مولانا صدرالدین صاحب، جناب محمد مسلم صاحب اور جناب انعام الرحمٰن صاحب تاخیر سے پہنچے تھے اس لیے پہلے دن کی نشست کے سوا بقیہ تمام نشستوں میں شریک رہے۔ مولانا سید حامد علی صاحب خانگی عذر کی وجہ سے اور مولانا شمس پیرزادہ صاحب حج بیت اللہ کو تشریف لے جانے کی وجہ سے شریک اجلاس نہ ہوسکے۔

یہ اجلاس شوریٰ کا معمولی سالانہ اجلاس تھا اس لیے گزشتہ شوریٰ کی خواندگی کے بعد اس میں حسب معمول سالانہ رپورٹ اور مرکزی حسابات آڈیٹر کی رپورٹ کے ساتھ پیش ہوئے۔

رپورٹ میں قیم جماعت نے یہ ظاہر کیا تھا کہ متعدد حلقوں سے بروقت مکمل رپورٹیں نہیں مل سکی تھیں اس لیے مرکز کی رپورٹ بھی بعض پہلوؤں سے ناقص رہ گئی ہے چنانچہ ارکان شوریٰ نے توجہ دلائی کہ امرائے حلقہ جات کو بروقت اپنی رپورٹیں بھیجنے پر خاص طور سے توجہ کرنے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح صورت حال ٹھیک طور سے سامنے آسکے اور اس سے اور صحیح نتائج نکالے جاسکیں [illegible] کا تدارک کیا جاسکے۔ رپورٹ کے اندراجات پر کچھ دیر گفتگو اور تبادلۂ خیالات

ہو تا کہ کام میں مزید ارتقار پیدا ہو سکے ۔

مرکزی بیت المال کے حسابات آڈیٹر کی رپورٹ میں بھی درست قرار دیے گئے تھے ۔ البتہ آڈیٹر نے بعض مرکزی شعبوں کے حسابات میں کچھ معمولی حسابی فروگزاشتوں کی نشان دہی کی تھی جن کی اصلاح کر دی گئی ۔

اجلاس میں شوریٰ یا جماعت کے ارکان کی طرف سے کچھ تجویزیں پیش ہوئیں جن پر غور رہا ۔ ایک تجویز میں فسادات پر اظہار تشویش کرتے ہوئے ان کے تدارک کے سلسلے میں کچھ تدابیر پیش کی گئی تھیں اور اس تجویز پر گفتگو کرتے وقت ارکان شوریٰ نے بھی ملک کی فرقہ وارانہ صورت حال اور خصوصیت کے ساتھ مالدہ کے واقعات پر اظہار تشویش کیا لیکن تدابیر کے ضمن میں عام تاثر یہی تھا کہ فسادات کی روک تھام اور ملک کی فضا کو خوشگوار بنانے کے سلسلے میں ہمارا اب تک جو طریق کار رہا ہے اور اس غرض کے لیے جو تدابیر ضروری سمجھی جاتی رہی ہیں انہیں کو زیادہ اہمیت اور توجہ کے ساتھ زیر عمل لانے کی ضرورت ہے اور مناسب یہ ہے کہ امراء کے اجتماع کے موقع پر ان کو اس کی طرف زیادہ توجہ کرنے کی ہدایت کی جائے ۔

ایک تجویز خدمت خلق کے سلسلے میں پیش ہوئی کہ اس میں زیادہ باقاعدگی پیدا کرنے کے لیے ایک علیحدہ شعبہ قائم کیا جائے اس پر گفتگو کے وقت خدمت خلق کے کام کی اہمیت و ضرورت کو پوری شدت سے محسوس کیا گیا لیکن شوریٰ کا عام تاثر یہی تھا کہ جماعت کی پالیسی اور پروگرام کو ٹھیک طور سے زیر عمل لانے کی کوشش کی جائے تو تجویز کا منشا بخوبی پورا ہو سکتا ہے اور اس کی طرف بھی امراء کو متوجہ کیا جائے ۔

ایک رکن جماعت کی یہ تجویز بھی زیر بحث آئی کہ جماعت کی طرف سے ایک ہفتہ وار انگریزی اخبار جاری کیا جائے اس کی ضرورت پر تو تقریباً سب ہی ارکان متفق تھے ۔ جماعت کے وسائل و ذرائع اور موجودہ مالی حالت کے پیش نظر اس کا فیصلہ کرنے میں شوریٰ مجبور تھی چنانچہ اس کو آئندہ کے لیے اٹھا رکھا گیا ۔

جناب فضل حسین صاحب ناظم درسگاہ جماعت اسلامی رامپور کی اس تجویز پر بھی غور رہا کہ درس گاہ کے مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کے موجودہ ڈھانچے میں جزوی تبدیلی کر کے اس کو زیادہ مفید بنایا جائے چنانچہ اس غرض کے لیے مندرجہ ذیل ارکان پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی

۱۔ جناب فضل حسین صاحب (داعی) ۲۔ مولانا عروج قادری صاحب ۳۔ جناب عبدالحی صاحب ۴۔ جناب راؤ شمشاد علی خاں صاحب

تجاویز کے بعد کچھ انتظامی امور کے بارے میں امیر جماعت نے ارکان شوریٰ کے مشورے حاصل کیے ۔

آخر میں مرکزی بجٹ بابت محرم الحرام تا ذی الحجہ ۸۶ھ زیر غور آیا اور اللہ پر توکل و اعتماد کرتے ہوئے اسے منظور کیا گیا بجٹ کی متوقع آمدنی چالیس ہزار روپیہ ۴۰۰۰۰/- اور متوقع خرچ بہتر ہزار ایک سو روپیہ ۷۲۱۰۰/- ہے اس طرح خسارہ بتیس ہزار ایک سو روپیہ ۳۲۱۰۰/- ہے جسے رفقاء جماعت کی اعانتوں اور قرض سے پورا کیا جائے گا

۱۹ اپریل کو دعا پر اجتماع ختم ہوا ۔

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝

محمد یوسف قیم جماعت اسلامی

تنقید و تبصرہ

اسلام اور ضبطِ ولادت سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ صفحات ۲۰۸۔ کاغذ کتابت طباعت بہتر مجلد خوبصورت گرد پوش کے ساتھ۔ قیمت تین روپیہ۔ ناشر اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۱ سی شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

اس کتاب کا ساتواں اڈیشن زیر تبصرہ ہے۔ سنہ ۱۹۴۳ء میں جب اس کتاب کا پہلا اڈیشن نکلا تھا تو اس وقت بھی اس موضوع پر اسلامی ادب میں اس سے بہتر کتاب موجود نہ تھی اور اب سنہ ۱۹۶۲ء میں جب اس کا ساتواں اڈیشن نظر ثانی اور اضافے کے ساتھ شائع ہوا ہے تو اس وقت بھی اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب موجود نہیں ہے۔ اس اڈیشن میں دو ضمیمے ہیں، پہلا ضمیمہ "اسلام اور خاندانی منصوبہ بندی" کے عنوان سے مصنف کا ایک مقالہ ہے اور دوسرا ضمیمہ "تحریک ضبطِ ولادت کا علمی جائزہ" کے عنوان سے پروفیسر خورشید احمد صاحب کا قیمتی مقالہ ہے۔ اس دوسرے مقالے نے اس وقت تک کے جدید معلومات کو اکٹھا کر دیا ہے۔

اس مختصر سی کتاب نے برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ کی حقیقت اعداد و شمار اور جدید ترین معلومات کی روشنی میں اس طرح کھول دی ہے کہ اوسط درجے کا ذہن بھی پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ اس کتاب نے اس راز سے بھی پردہ اٹھا دیا ہے کہ اس تحریک کی بنیاد معاشی نہیں ہے بلکہ تمدنی، معاشرتی اور سیاسی ہے۔ یورپ نے پہلے یہ تحریک جنسی انارکی کو تسکین دینے کے لیے چلائی تھی اور اب اپنی سیاسی برتری کو قائم رکھنے کے لیے اس کی پشت پر کام کر رہا ہے۔ اس کے ذریعہ اسلامی نقطۂ نظر کی بھی واضح اور تشفی بخش نمائندگی کی گئی ہے۔

مختصر ہونے کے باوجود اپنی جامعیت کے لحاظ سے یہ کتاب [illegible] کتابوں پر بھاری ہے۔

قول فیصل [illegible] مولانا عبدالقادری۔ صفحات [illegible]۔ کتابت طباعت کاغذ عمدہ۔ ناشر [illegible] [illegible] لاہور

جناب ماہر القادری مدیر ماہنامہ "فاران" کراچی ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے تو شہرت رکھتے ہی ہیں لیکن ادھر ان کے قلم نے دین حق کی تبلیغ اور اس کے دفاع میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ بھی اہل علم و نظر کے حلقوں میں خاصی وقعت رکھتی ہیں اللہ تعالیٰ انہیں اس کی جزا عطا فرمائے۔

موصوف نے اپنے قابل قدر ماہنامہ کی دو اشاعتوں میں "فتنہ پرویزی" کی نقاب کشائی اور حدیث نبوی کے دفاع میں جو مضامین لکھے تھے، وہ اسلوب بیان، زور استدلال اور لکھنے والے کے قلبی تاثر و سوز کے لحاظ سے قیمتی اور موثر تھے۔ انہیں مضامین کو مدرسہ اسلامیہ گل برگ کے شعبۂ نشر و اشاعت نے پمفلٹ کی شکل میں شائع کیا ہے کہنے کو تو فتنہ پرویزی انکار حدیث کا فتنہ ہے لیکن آج سے بہت پہلے یہ بات واضح ہو گئی تھی کہ اس پردے میں قرآن کی بدترین معنوی تحریف پوشیدہ ہے کئی سال پہلے راقم الحروف نے انکار حدیث کا فتنہ اپنے نظر پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ غلام احمد پرویز کے فتنے کو انکار حدیث کا فتنہ سمجھنا غلط ہے۔ یہ حضرات اس منزل سے بہت آگے بڑھ چکے ہیں اب یہ چیز اتنی واضح ہو چکی ہے کہ اس فتنے سے واقفیت رکھنے والا ہر صاحب قلم جانتا ہے کہ یہ محض انکار حدیث نہیں ہے بلکہ پورے دین اسلام کا انکار ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ حکومت پاکستان اس فتنے کو پوری چھوٹ دے رہی ہے اور اس کے زیر سایہ یہ شجر خبیث پھول پھل رہا ہے۔ حق و عدل کے ہاتھوں میں اس وقت حکومت نہیں ہے لیکن یہ خود ایک عظیم طاقت ہے اور امید ہے کہ اس لڑائی میں حق ہی کامیاب ہوگا۔

یہ قیمتی پمفلٹ پڑھنے کے لائق ہے اور بھارت سے ہر شخص ایک کارڈ لکھ کر مفت منگا سکتا ہے۔

آئینۂ تثلیث

مولانا کوثر نیازی مدیر شہاب لاہور صفحات ۲۰۸، کاغذ کتابت طباعت اوسط۔ قیمت ایک روپیہ۔ ناشر: مکتبہ شہاب، شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور

بعض غمناک واقعات ایسے ہوتے ہیں جن پر بار بار اظہار افسوس کے باوجود زبان تھکتی ہے نہ قلم رکتا ہے ایسا ہی ایک واقعہ یہ ہے کہ جس ملک کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اس ملک کے سربراہ اسلامی دین کی راہ میں بھاری پتھر کی طرح حائل ہو گئے ہیں اور یہ بات مزید افسوسناک ہے کہ وہ اس ملک کو نقصان پہنچانے اور اسے کمزور کرنے کا ذریعہ بن گئے ہیں، وہ ملک طرح طرح کے نظری و عملی فتنوں کی آماجگاہ بنا ہوا ہے اور سارے فتنے وہاں کی مسلمان حکومت کے زیر سایہ پروان چڑھ رہے ہیں مستقبل کے مورخ کے لیے یہ بات کتنی حیرتناک ہوگی کہ جب ہر جگہ سے عیسائیت کے پاؤں اکھڑ رہے تھے تو پاکستان میں اسے پاؤں جمانے کا موقع دیا جا رہا تھا۔

اخبار پڑھنے والے جانتے ہیں کہ وہاں پادریوں کا مذہب فروغ پا رہا ہے۔ موجودہ مسیحیت سے واقف ہر صاحب علم جانتا ہے کہ یہ فروغ اس مذہب کی ذاتی خوبیوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ جس طرح وہاں، دھن، دولت، مال اور دنیوی مفاد کے سبز باغ دکھا کر افراد اور جماعتیں عوام مسلمان کے ووٹ خریدتی رہتی ہیں اسی طرح انہیں ذرائع سے پادری، جاہل، مفلس اور دین حق سے بے بہرہ دیہاتی مسلم عوام سے ان کا مذہب خریدتے ہیں، اس صورت حال کے نمٹنے کے لیے سب سے کارآمد اور اہم عنصر حکومت ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں حکومت کے سوا اور کوئی نہیں روک سکتا۔ لیکن اس کے باوجود وہاں کے علماء کی ذمہ داریاں ختم نہیں ہوتیں، ورنہ دین اسلام سے محبت رکھنے والے مسلمان سب کچھ حکومت کے سر ڈال کر اطمینان کی نیند سونے کا حق رکھتے ہیں۔ علماء کی ذمہ داری یہ ہے کہ ایک طرف وہ ناخواندہ عوام تک اسلام کی آواز پہنچائیں اور دوسری طرف وہ موجودہ عیسائیت کی حقیقت عوام پر کھول دیں جن مسلمانوں کو اللہ تعالٰی نے مال و دولت سے نواز رکھا ہے ان کی ذمہ داری یہ ہے کہ محض افلاس کی وجہ سے اپنے دینی بھائیوں کو پادریوں کے حوالے نہ ہونے دیں۔

مولانا کوثر نیازی نے اس کتاب کے ذریعہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی ایک کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب پانچ ابواب میں تقسیم ہے اور ہر باب میں متعدد ذیلی عنوانات ہیں۔ قدیم و جدید علماء اسلام نے جو کچھ لکھا ہے اسے اختصار کے ساتھ ایک نئی ترتیب دی گئی ہے اور اس کتاب کو پڑھ کر اجمالی طور پر مسیحیت سے واقفیت حاصل ہو جاتی ہے۔ تبلیغ و اشاعت ہی کی غرض سے ۲۰۰ صفحات کی مجلد کتاب کی قیمت صرف ایک روپیہ رکھی گئی ہے اور شکر ہے کہ پاکستان میں یہ کتاب مقبول ہو رہی ہے۔ ہمارے سامنے پہلا اڈیشن ہے اس کا دوسرا اڈیشن بھی چھپ چکا ہے۔

اسلام اور عدل و احسان از محمد حنیف ندوی [illegible]۔ صفحات ۲۹۱۔ کاغذ، کتابت، طباعت بہتر۔ قیمت مجلد مع گرد پوش چھ روپے آٹھ آنے۔ ناشر: ادارہ ثقافت اسلامیہ کلب روڈ لاہور

اس کتاب کے مولف ادارہ ثقافت اسلامیہ دونوں ہی اہل علم کے حلقے میں معروف ہیں۔ مولف مشہور ادیب ہیں اور ان کی تحریر ان کی ادبیت سے محروم نہیں رہی ہے۔ متعدد مقالات پر مشتمل اور مختصر پیرا گراف [illegible] یہ کتاب [illegible] اور دلچسپ انداز بیان میں مرتب کی گئی ہے مگر یہ کتاب [illegible]
[illegible]

ہوتا لیکن مشکل یہ تھی کہ پھر ادارہ ثقافت اسلامیہ سے اس کی اشاعت ممکن نہ ہوتی۔ اب یہ کتاب ... کا ایک آمیزہ بن کر رہ گئی ہے۔ اکثر حصہ پڑھنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ ادارے کے مخصوص خیالات کی ایک فہرست مولانا مظہر الدین احمد جعفری ندوی کو دے دی گئی تھی اور انھوں نے زبردستی انھیں اس کتاب میں ٹھونسنے کی کوشش کی ہے اور اس کوشش میں بعض مقامات پر وہ کتاب و سنت پر ظلم کرنے سے بھی نہیں چوکے ہیں۔ آگے میں اس کی مثال پیش کر رہا ہوں۔ اس طرح کے مخصوص خیالات کی فہرست درج ذیل ہے:-

۱۔ جہاد محض مدافعت کے طور پر جائز ہے اقدامی جہاد کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔

۲۔ اسلام میں قتل مرتد بلکہ اس کے لیے کسی دنیاوی سزا کا حکم موجود نہیں ہے۔

۳۔ عورتوں اور مردوں کے درمیان کلی مساوات ہے اور دونوں کے حقوق بالکل یکساں ہیں۔

۴۔ تعدد ازدواج پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔

۵۔ مردوں کے حق طلاق پر پابندی عائد ہونی چاہیے

جہاں تک پہلے مسئلے کا تعلق ہے اس تبصرے میں اس پر مختصر بحث کی گنجائش بھی نہیں ہے اس لیے کہ مؤلف نے جن آیات سے استدلال کیا ہے ان پر جب تک تفصیل سے بحث نہ کی جائے مسئلہ واضح ہونے کے بجائے اور مشتبہ ہو سکتا ہے یہاں صرف اتنا اشارہ کرنا ضروری ہے کہ اگر اسلام میں اقدامی جہاد کی اجازت نہ ہوتی تو دین اسلام جزیرۃ العرب ہی میں سمٹ کر رہ جاتا اور دنیا کے نقشے پر اس حکومت کا وجود بھی نہ ہوتا جس کی مدد ... ادارۂ ثقافت اسلامیہ ان خیالات کی اشاعت کر رہا ہے۔ باقی چار مسائل کی مدلل تردید بھی اس مختصر تبصرے میں ناممکن ہے۔ میں صرف اتنا کروں گا کہ فاضل مؤلف کی عبارتوں کی نشان دہی کر دوں اور ان کی دلیل کا مختصر تجزیہ پیش کر دوں۔ مرتدین اور منافقین کے بارے میں لکھتے ہیں:-

"اس نے مرتدین کے ساتھ وہ سلوک کیا جو میدان جنگ سے بھاگنے والے سپاہی کے ساتھ کیا جاتا ہے، نہ منافقین کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو جاسوسوں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے اس لیے دونوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا ان کے لیے کوئی دنیاوی سزا تجویز نہیں کی۔ صفحہ ۲۳۹

قرآن مجید میں کئی مقام پر مرتدین کا ذکر آیا ہے جہاں ان کے ننگ انسانیت حرکات کا ... کیا گیا وہاں یہ بھی بتا دیا گیا کہ آخرت میں ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا ... باقی دنیا میں ان کا فعل شنیع ... ہرگز ... نہیں ... اسی طرح معاف کر دیا ...

قابو یافتہ دشمنوں کو معاف کرنے کی تمہیں ہدایت کی گئی ہے ۔

اس دعوے کے ثبوت میں مؤلف نے سورۂ بقرہ کی آیت ۱۰۹ پیش کی ہے ۔ اس آیت کو پڑھیے اور مصنف کے دعوے کو دیکھیے تو آپ کو حیرت ہوگی ۔ اس آیت کا مرتدین کے مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ اس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ بہتیرے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں ایمان لانے کے بعد پھر کافر بنا ڈالیں ان کے اس رویے سے تم مشتعل نہ ہو جاؤ انہیں معاف کرو ان سے درگزر کرو اور صبر کے ساتھ دیکھتے رہو کہ اللہ ان اہل کتاب کے بارے میں کیا فیصلہ کرتا ہے ۔ اس آیت کا تعلق بالکلیہ ان اہل کتاب سے ہے جو مسلمانوں کو مرتد بنانے کی خواہش رکھتے تھے لیکن مؤلف نے اسے مرتدین سے متعلق کر دیا ہے اور معافی و درگزر کے حکم کو بھی مرتدین کے ساتھ جوڑ دیا ہے ۔ کیا رئیس احمد جعفری صاحب کے قلم سے یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے ۔ انھوں نے ثبوت میں دوسری آیت سورۂ بقرہ کی آیت ۲۱۷ پیش کی ہے ۔ اس آیت میں اصلاً ان کے اخروی انجام کو بیان کیا گیا ہے ۔ قتل کی سزا کا ذکر اس میں نہیں ہے لیکن کیا محض عدم ذکر سے یہ بات ثابت ہو جائے گی کہ اسلام نے ان کے لیے کوئی دنیاوی سزا تجویز نہیں کی ہے ۔ کیا اسلامی احکام کا ماخذ صرف قرآن ہے ؟ خدا کا شکر ہے کہ رئیس احمد صاحب منکر حدیث نہیں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ پوری کتاب میں انھوں نے قرآن کی آیات کے ساتھ احادیث سے بھی استدلال کیا ہے ۔ اس مسئلے میں جس حدیث سے انھوں نے استدلال کیا ہے اس کا ذکر آگے رہا ہے ۔

مؤلف نے ثبوت میں قرآن کی تیسری آیت سورۂ مائدہ کی آیت ۵۴ پیش کی ہے ۔ اس آیت میں مرتدین کے نہ اخروی انجام کا ذکر ہے اور نہ دنیوی سزا کا ۔ ان دو آیتوں سے زیادہ سے زیادہ جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ کہ ان میں مرتدین کی دنیاوی سزا کا ذکر نہیں ہے ۔

گویا حاصل یہ نکلا کہ مؤلف کی پیش کی ہوئی پہلی آیت کا مرتدین سے کوئی تعلق نہیں ہے ۔ ایک آیت میں ان کی اخروی سزا کا صراحتاً ذکر ہے اور تیسری آیت میں نہ اخروی سزا کا ذکر ہے اور نہ دنیوی سزا کا ۔ مؤلف نے پہلی آیت میں جو معنوی تحریف کی ہے اس کا ذکر گزر چکا اب حدیث سے استدلال ملاحظہ فرمایئے ۔ مؤلف لکھتے ہیں :-

> مرتدین کے سلسلے میں حدیث ذیل خاص طور پر قابل توجہ ہے ۔ حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ طفیل بن عمرو دوسی اپنے ساتھیوں کے ساتھ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا ۔ یا رسول اللہ قبیلہ دوس نے نافرمانی کی اور ماننے سے انکار کیا (مرتد ہو گئے) آپ ان کے لیے بددعا فرمایئے ۔ بعض نے عرض کیا قبیلہ دوس ہلاک ہو گیا ۔ آپ نے فرمایا [illegible]

میں داخل کر دے "۔ صفحہ ۲۴۶

مؤلف نے بخاری کے باب فضل الجہاد کا حوالہ دیا ہے۔ اس حدیث میں مؤلف نے دو جگہ تحریف کی ہے ایک تو "وہ مرتد ہو گئے" کی عبارت اور دوسری جگہ اس ترجمے میں کہ "اور انہیں پھر سے حلقۂ اسلام میں داخل کر دے" حضور کی دعا میں صرف دو ٹکڑے ہیں اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْسًا وَاتِ بِھِمْ "اور انہیں پھر سے حلقۂ اسلام میں داخل کر دے" وَاتِ بِھِمْ کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کی داد قوم بنی اسرائیل کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔ مؤلف نے جس باب کا حوالہ دیا ہے وہ بھی غلط ہے اور یہ غلطی چالاکی سے کی گئی ہے کیونکہ اس باب کا ذکر اگر کر دیا جاتا جس میں امام بخاری نے یہ حدیث روایت کی ہے تو ساری عمارت ہی منہدم ہو جاتی۔ امام بخاریؒ نے مذکورہ بالا حدیث پر جو ترجمۂ باب لکھا ہے وہ یہ ہے:۔ باب الدعاءِ للمشرکین بالھدیٰ لیتالّفھم۔ اس ترجمے سے یہ بات واضح ہو رہی تھی کہ قبیلہ دوس کے لیے جس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی ہے اس وقت تک وہ اسلام لایا ہی نہ تھا بلکہ مشرک تھا۔ تاریخ کی کوئی کمزور سے کمزور روایت بھی ایسی موجود نہیں ہے جس سے معلوم ہوتا ہو کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قبیلہ دوس ایمان لا کر مرتد ہو گیا ہو اور پھر ایمان لایا ہو۔ یہ اس محترم قبیلے پر ایک ذلیل اور ناپاک اتہام ہے۔ کیسے معلوم تھا کہ مولانا رئیس احمد جعفری دنیا کے چند ٹکوں کے لیے اس حد تک گر سکتے ہیں۔ کیا مؤلف ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے دوسرے ارکان اس دنیا میں ہمیشہ کے لیے آ بسے ہیں؟ ———— عورتوں اور مردوں کی مساوات کے بارے میں مؤلف رقم طراز ہیں:۔

"اس کے برعکس اسلام نے عورت کو بالکل مساوی حیثیت دی ہے اس میں اور مرد میں کوئی فرق نہیں دونوں حقوق میں بالکل یکساں ہیں، مرد کو عورت پر فوقیت ہے نہ عورت کو مرد پر"۔ صفحہ ۲۸۵

اس کے بعد مؤلف نے عورتوں کے کچھ حقوق کی مثالیں دی ہیں ان میں ایک یہ ہے:۔ "وہ حکومت کر سکتی ہے" [illegible] مثال کو ختم کرتے ہوئے قلم یوں توڑ دیا گیا ہے: "اس پر کوئی پابندی نہیں، کسی طرح کی قدغن نہیں"۔ مؤلف نے متعدد آیتیں پیش کی ہیں لیکن ان میں کوئی ایک آیت بھی ایسی نہیں ہے جو کلی مساوات کے اس ظنطنے اور رہیے کا ساتھ دے جو مؤلف نے اختیار کیا ہے۔ بہت سارے معاملات میں مردوں اور عورتوں کے حقوق یکساں ہیں اس کا کوئی منکر نہیں۔ چاہیے تو ایسی آیت پیش کرنی چاہیے جو کلی مساوات ثابت کرتی ہو جس سے معلوم ہوتا ہو کہ عورتیں بھی مردوں کی [illegible] ہو سکتی ہیں، سپہ سالار ہو سکتی ہیں، امیر المومنین اور خلیفۃ المسلمین ہو سکتی ہیں، خاندان کی نگران [illegible] ایسی کوئی ایک دلیل بھی مؤلف نے پیش نہیں کی بلکہ مؤلف نے صرف یہ کیا کہ ایک آیت کا ایک ٹکڑا [illegible]

حذف کر دیا۔ سورہ بقرہ میں ہے :- وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ اس میں وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ کا ٹکڑا مؤلف نے حذف کر دیا اور پہلے ٹکڑے سے دونوں کے حقوق کی یکسانیت ثابت کر دی۔ واقعہ یہ ہے دنیا پرستی انسان سے سب کچھ کرا سکتی ہے ——— تعدد ازدواج کے سلسلے میں عدل کی قید جو قرآن نے لگائی ہے اس پر مؤلف لکھتے ہیں :-

"میرا خیال ہے کہ اس آیت کی روشنی میں اسلامی حکومت کو یہ حق ہے کہ دوسری شادی کی اجازت اس وقت دے جب اسے اطمینان ہو جائے کہ عدل کا پورا پورا امکان ہے" صفحہ ۳۱۲

مؤلف اور ادارۂ ثقافت کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کی پیاری حکومت ان کے خیال سے بھی دو چار ہاتھ آگے جا چکی ہے

پانچویں بات مردوں کے حق طلاق پر مؤلف تحریر فرماتے ہیں :-

"طلاق کا معاملہ صرف زبانی جمع خرچ پر اسلام نے مبنی نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس کے لیے گواہی بھی ضروری قرار دی ہے" صفحہ ۳۱۴

اس دعوے کی دلیل میں مؤلف نے سورۂ طلاق کی آیت ۲ کا ایک ٹکڑا پیش کیا ہے جس میں وَأَشْهِدُوا ذَوَيْ عَدْلٍ مِنْكُمْ (اپنے میں سے دو عادل آدمیوں کو گواہ بنا لو) کا جملہ موجود ہے اور یہ مؤلف کے لیے کافی ہے چاہے اس گواہی کا تعلق طلاق سے ہو یا نہ ہو، مؤلف نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ جملہ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ کے بعد آ رہا ہے۔ طلاق پہلے واقع ہو چکی ہے، عدت ختم ہونے کا زمانہ قریب ہے اس موقع پر اللہ تعالیٰ یہ حکم دے رہا ہے کہ اب عورت کو دستور کے مطابق روک لو یعنی رجوع کر لو یا دستور کے مطابق انہیں اپنے گھر سے رخصت کر دو، رجوع کرتے وقت یا گھر سے رخصت کرتے وقت اپنے میں سے دو ثقہ افراد کو گواہ بنا لو تو بہتر ہے تاکہ آئندہ کوئی نزاع نہ پیدا ہو۔ اس گواہی کا تعلق شوہر کے رجوع کرنے یا بیوی کو رخصت کرنے سے ہے نہ کہ طلاق سے لیکن ادارۂ ثقافت اسلامیہ کے رفیقوں کو ان باتوں پر غور کرنے کی کیا ضرورت؟ بہرحال مؤلف کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کی حکومت نے اب طلاق کے حق پر بھی پابندی عائد کر دی ہے۔

یہ کتاب عدل و احسان کے موضوع پر لکھی گئی ہے لیکن بہت سے مسائل میں خود اسلام پر ظلم روا رکھا گیا ہے اور ان اسلامی احکام کے ساتھ عدل و احسان کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی ہے۔

ان غلطیوں کے علاوہ اس کتاب میں اور بھی غلط چیزیں موجود ہیں لیکن سب کی نشان دہی کا یہ موقع نہیں ہے صرف دو باتوں کی طرف اشارہ کر کے تبصرہ ختم کیا جاتا ہے۔

سورۂ مائدہ میں پہلا یُرْجُونَ ایام اللہ کا جو ٹکڑا آیا ہے اس سلسلے میں مؤلف لکھتے ہیں :-

: "ایام اللہ یعنی روز خداوندی' اور جو لوگ روز خداوندی یعنی روز قیامت پر یقین نہیں رکھتے وہ
کون ہیں؟ صفحہ ۲۶

افسوس کہ مؤلف کو ایام اللہ کی اصطلاح بھی نہیں معلوم۔ ایام اللہ قیامت کو نہیں کہتے۔

مؤلف نے کافر و مشرک میں یہ فرق کیا ہے کہ ان کے نزدیک کافر وہ لوگ ہیں جنھوں نے آسمانی صحیفہ کو مسخ کر دیا ہے جیسے یہود و نصاریٰ اور مشرک وہ لوگ ہیں جنھوں نے خدا کو چھوڑ کر خدا کے بنائے ہوئے مظاہر و مناظر کی پرستش شروع کر دی جیسے مشرکین مکہ' ایک جگہ لکھتے ہیں:-

"مشرکوں کے مقابلے میں اہل کتاب کو اللہ تعالیٰ ترجیح دیتا ہے اس لیے کہ کافروں کی گمراہی مشرکوں سے بہرحال کم ہے" صفحہ ۲۲۷

کافر و مشرک کا یہ فرق شاید مؤلف کے اپنے ذہن کی اُپج ہے یا ادارۂ ثقافت کے کسی اور شخص کے ذہن کی۔ لغت عرب اور کتاب و سنت سبھی اس فرق سے ناواقف ہیں۔ اہل کتاب کو ترجیح دینے کی وجہ وہ نہیں ہے جو مؤلف نے لکھی ہے۔ تفصیلی تنقید کی گنجائش نہیں ہے۔ (ع - ق)

بقیہ تراجم

ملائکہ سے کہا تم مجھے پوجتے ہو' میری تسبیح و تقدیس میں رطب اللسان ہو' کیونکہ میں تمہارا رب ہوں اور میرا یہی حق ہے کہ مجھے پوجا جائے اور میری تسبیح و تقدیس کی جائے' تمہاری بندگی کا اصل امتحان اسی میں ہے کہ میں مٹی سے ایک پتلہ بناتا ہوں' اس میں اپنی روح پھونکتا ہوں' اسے تم پر فوقیت عطا کرتا ہوں اور تمہیں حکم دیتا ہوں کہ اس کے آگے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ اس امتحان سے معلوم ہوگا کہ بندہ کون ہے اور بندگی کیا ہے (اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دینا ہی ایمان ہے۔

(کتاب المکاتیب والرسائل کے سلسلے کے چند اقتباسات)

جلد: ۲۹
شمارہ: ۱

صفر ۱۳۸۲ھ
جولائی ۱۹۶۲ء

زندگی

مدیر: سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی
● زر سالانہ:۔ صہ۔ ششماہی:۔ تین روپیہ۔ فی پرچہ:۔ پچاس نئے پیسے
ممالک غیر سے:۔ دس شلنگ انٹرنیشنل پوسٹل آرڈر

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: محمد حسن۔ مطبع: ناظم پریس بازار نصر اللہ خاں رامپور۔ مقام اشاعت:
دفتر زندگی، کاتھوا، رامپور، یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

الٰہ آباد ہائی کورٹ کے فاضل جج مسٹر دھون نے مئی ۱۹۶۲ء کے پہلے ہفتے میں پردہ کے خلاف ایک فیصلہ دیا ہے، موصوف اس سے پہلے جنوری ۱۹۶۲ء میں تعدد ازدواج کے خلاف بھی فیصلہ دے چکے ہیں، پردہ کے خلاف انھوں نے جو فیصلہ دیا ہے، اس کی نوعیت یہ تھی کہ بستی کے ایک مسلمان حسن رضا خاں کے صحن کی طرف ان کے ایک ہندو پڑوسی بستی نے روشن دان کھول لیا جس سے ان کے گھر کی پردہ نشین خواتین کی بے پردگی ہونے لگی، انھوں نے اس کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کیا اور درخواست کی کہ روشن دان بند کرنے کا حکم دیا جائے عدالت ماتحت نے دعویٰ خارج کر دیا، اس کے بعد انھوں نے سول جج بستی کے یہاں اپیل کی، سول جج نے اپیل منظور کرتے ہوئے ان کے حق میں فیصلہ دیا، اس کے خلاف مدعا علیہ نے ہائی کورٹ میں اپیل کی، مسٹر جسٹس دھون نے اسے منظور کرتے ہوئے فیصلہ مدعا علیہ کے حق میں دیا۔ ہم پہلے اس فیصلہ کی اہم باتیں معاصر قومی آواز لکھنؤ کے حوالے سے ذیل میں نقل کرتے ہیں:۔

مسٹر جسٹس نے سول جج کے فیصلے کو نہ مانتے ہوئے اس رولنگ کا ذکر کیا جس کا مدعیان نے اپنی درخواست میں حوالہ دیا تھا جس کی رو سے مسلمان خواتین کے پردے میں اگر کوئی خلل پڑتا ہے تو اس کے لیے انھیں عدالت سے رجوع کرنے کا حق ہے، مسٹر دھون نے کہا:

"گوکل پرشاد بنام رادھے کے مقدمہ کا فیصلہ ۷۵ سال قبل کیا گیا تھا جبکہ سماجی حالات مختلف تھے اس وقت مسلمانوں میں پردے کا عام رواج تھا اور اسلامی تہذیب کے زیر اثر بہت سے ہندو خاندانوں میں بھی پردہ کیا جاتا تھا، اس زمانہ کی حکومت کی پالیسی ہمارے سماجی مسائل سے الگ رہنے کی تھی اور وہ سماجی روایات میں خواہ وہ اچھے ہوں یا برے دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔"

انھوں نے کہا: "آج ہندوؤں نے پردہ تقریباً بالکل ہی ترک کر دیا ہے اور مسلمانوں میں پردے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے۔ اس رواج کو مصر، ترکی، ازبکستان، تاجکستان، انڈونیشیا اور حتیٰ کہ پاکستان و دیگر اسلامی ممالک میں (علاوہ ان کے جو سماجی طور پر بہت پس ماندہ ہیں) اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔"

انھوں نے کہا: "خواتین کی علیحدگی ہمارے سماجی فلسفے کے خلاف ہے جس پر ہمارے دستور کی بنیاد ہے۔ دفعہ ۱۵ میں ماسوا دیگر باتوں کے یہ بھی ہے کہ حکومت جنسی بنیاد پر شہریوں میں فرق نہیں کرے گی۔ دفعہ ۳۹ میں حکومت سے کہا گیا ہے کہ وہ ایسا قانون وضع کرے جس کے ذریعہ شہریوں کو جن میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں، مساوی حقوق ملیں اور مرد اور عورت دونوں کے لیے ایک کام کے لیے ایک ہی تنخواہ ہوتی ہے۔ یہ بنیادی اصول ہیں جن میں کسی ایسے رواج کی وجہ سے جس میں عورت (مرد کو نہیں) کو علیحدہ رکھنے کی ترغیب ہو رد و بدل نہیں کیا جا سکتا۔" مسٹر جسٹس دھون نے کہا: "اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاست سیاسی مصلحتوں کی بنا پر بہت سے موجودہ سماجی رواج میں دخل اندازی نہیں کرتی اور لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ خواتین کو پردے سے باہر لائیں جیسا پیٹر اعظم نے کیا تھا لیکن کسی رواج کو ریاست کے لیے برداشت کر لینا ایک علیحدہ بات ہے اور یہ بات اس سے بالکل ہی مختلف ہوگی کہ اس بنیاد پر دعوے کرنے والوں کی وجہ سے دوسرے شہریوں کے حقوق پر پابندی عائد کرے۔ مجھے اس بات میں سخت شبہ ہے کہ ریاست اپنے شہریوں کو اس بات کے لیے مجبور کر سکتی ہے کہ وہ ان لوگوں کے احساسات کا لحاظ رکھتے ہوئے جو اپنی خواتین کو علیحدہ رکھنا چاہتے ہیں، اپنے مکانات کی بناوٹ میں ترمیم کریں۔"

مسٹر جسٹس دھون نے کہا: کہ علیحدگی کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم کی بنیاد قدرتی شرم و حیا اور انسانی اخلاقیات پر ہوتی ہے۔ عدالتیں ایسے شخص کی امداد کریں گی جس کے عام احساسات کو کسی کی دخل اندازی سے ٹھیس پہنچی ہو۔ انھوں نے کہا کہ دوسری قسم کی علیحدگی طبعی نہیں ہوتی بلکہ اس کی بنیاد خاص قسم کے احساسات ہوتی ہے جس کی حوصلہ افزائی دستور نہیں کرتا لیکن قانون اسے برداشت کرتا ہے اور سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کس حد تک ریاست پردہ کرانے والے شخص کو مطمئن کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق کے خلاف کر سکتی ہے۔ انھوں نے کہا۔ اس لیے میں احترام کے ساتھ کہوں گا کہ کچھ پرانے فیصلوں میں جن میں پردے کا لحاظ رکھتے ہوئے کسی حق کو منوایا گیا ہے نظرثانی کی ضرورت ہے کیونکہ وہ بہت پرانے ہیں اور موجودہ دور میں پردے کی اہمیت ختم ہو گئی ہے۔

قومی آواز
۶۲-۱-۱۰

ان مفصل باتوں میں چند بنیادی نکات کی تلخیص یہ ہے :-

۱۔ مدعیان نے جو درخواست پیش کی ہے وہ ۵۰۰ سال قبل کی ہے، اس وقت صرف مسلمانوں ہی میں پردے کا عام رواج نہ تھا، بلکہ اسلامی تہذیب کے زیر اثر بہت سے ہندو خاندانوں میں بھی پردہ کیا جاتا تھا۔ ۲۔ اس زمانے کی حکومت کی پالیسی ہمارے سماجی مسائل میں الگ رہنے کی تھی وہ سماجی روایات میں خواہ اچھے ہوں یا برے دخل اندازی نہیں کرتی تھی۔ ۳۔ آج نہ صرف ہندوؤں نے پردہ ترک کر دیا ہے بلکہ مسلمانوں میں بھی پردے کا رواج کم ہوتا جا رہا ہے! ور اس رواج کو مصر، ترکی حتیٰ کہ پاکستان میں بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ۴۔ خواتین کی علیحدگی ہمارے سماجی فلسفے کے خلاف ہے جس پر ہمارے دستور کی بنیاد ہے۔ ۵۔ ریاست سیاسی مصلحتوں کی بنا پر بہت سے موجودہ سماجی رواج میں دخل اندازی نہیں کرتی اور لوگوں کو مجبور نہیں کر سکتی کہ وہ خواتین کو پردے سے باہر لائیں جیسا پیٹر اعظم نے کیا تھا۔ ۶۔ علیحدگی کی دو قسمیں ہیں۔ پردے کی علیحدگی طبعی نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد خاص قسم کے احساسات پر ہے جس کی حوصلہ افزائی دستور نہیں کرتا۔

فاضل جج کا یہ فیصلہ اس پہلو سے افسوسناک ہے کہ اس میں مقدمہ کی اصل نوعیت کا لحاظ نہیں پایا جاتا اگر مسٹر جسٹس اس پر توجہ مبذول کرتے تو شاید فیصلہ یہ نہ ہوتا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دعوے میں پردہ نشین خواتین اور بے پردگی کا ذکر دیکھتے ہی ان کا ذہن اس کے خلاف کام کرنے لگا اور وہ مقدمے کی اصل نوعیت پر نظر نہ ڈال سکے۔ مقدمے کی نوعیت پر نظر ڈالتے ہی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ معاملہ دراصل اس پردے سے متعلق نہیں ہے جس کے خلاف انھوں نے فیصلہ دیا ہے بلکہ اس کا حقیقی تعلق گھر کی خلوت (Privacy) سے ہے۔ کوئی ایسا خاندان بھی جس کی خواتین پردہ نہیں کرتیں اس بات کو برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اجنبی شخص اس کے گھر میں روشن دان یا جھروکا کھول لے اور گھر کی تمام تنہائی و خلوت کو ختم کر کے رکھ دے۔ پرائیویسی کا تحفظ انسان کا ایک ایسا حق ہے جس میں خلل اندازی کو دنیا کی کوئی مہذب حکومت جائز نہیں رکھتی، اس دور میں بھی جب انسان کو حیوان کی سطح پر اتار لایا گیا ہے، گھریلو زندگی کی آزادی کا احترام کیا جاتا ہے، اگر ایسا نہ ہو تو انسان فی الواقع عملی طور پر جنگل کے جانوروں جیسی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اس عمومی پہلو کے لحاظ سے جس کا تعلق کسی خاص فرقے سے نہیں ہے۔ یہ فیصلہ افسوسناک ہے لیکن بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ ایک خصوصی پہلو کے اعتبار سے جس کا تعلق مسلمانوں کے مذہب اور اسلامی تہذیب سے ہے۔ یہ فیصلہ تشویشناک بھی ہے۔ فاضل جج نے

پردے کے خلاف جو دلیلیں دی ہیں اور دستورِ ہند کی بعض دفعات کی جو تشریح و تعبیر پیش کی ہے اس نے مسلمانوں کے پرسنل لا ہی کو نہیں، ان کے پورے ملی وجود اور مذہبی و تہذیبی انفرادیت کو خطرے میں ڈال دیا ہے پہلے تو بعض فرقہ پرست ہندو تنظیموں کے عزائم اور ان کے لیڈروں کے علانیہ بیانات کے باوجود، مسلمان دستورِ ہند کی دہائی دے کر اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اب جب کہ ایک عدالتِ عالیہ کی طرف سے پردے کے خلاف خود دستور ہی کی ایک نہیں دو دو دفعات پیش کی گئی ہیں، مسلمانوں کا یہ سہارا بھی ختم ہوتا نظر آ رہا ہے۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں، جب تک اظہارِ خیال کی آزادی موجود ہے، ہمیں اسلامی اقدارِ حیات کی تفہیم و تبلیغ سے باز نہ آنا چاہیے اسی نقطۂ نظر کے تحت میں چاہتا ہوں کہ فاضل جج کے پیش کردہ نکات کا ایک اجمالی تجزیہ پیش کروں

پہلے نکتے میں فاضل جج نے یہ بات کہی ہے کہ آج سے ۷۵ سال پہلے مسلمانوں میں پردے کا عام رواج تھا بلکہ اسلامی تہذیب کے زیرِ اثر بہت سے ہندو خاندانوں میں بھی پردہ کیا جاتا تھا۔ ان کی اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت ہندوؤں میں پردہ محض اسلامی تہذیب کے زیرِ اثر مروج ہو گیا تھا، اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ فطرتِ انسانی کے عین مطابق اسلام کی طاقتور تہذیب نے ہندوستان کو بہت کچھ دیا ہے لیکن مجھے یہ بات ماننے میں تامل ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے پردے کا رواج بالکل نہ ہو اور بعد کو محض اسلامی تہذیب کے زیرِ اثر مروج ہو گیا ہو۔ اس تامل کے دو سبب ہیں۔ پہلا سبب تو یہ ہے کہ انسانی شرم و حیا اور عفت و عصمت کا پردے سے گہرا تعلق ہے اور قدیم ہندوستان کی خواتین اس خصوص میں اپنی شاندار تاریخ رکھتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ان کے اندر پردے کا رواج بالکل نہ ہو۔ حیا و عفت اور حمیت و غیرت اگر انسان کی فطری و طبعی اقدار میں داخل ہیں اور یقیناً داخل ہیں تو یہ باور کرنا بہت مشکل ہے کہ قدیم ہندوستان پردہ نشین خواتین کے وجود سے خالی رہا ہو۔ ان اقدار کا پردے سے گہرا تعلق کیوں ہے؟ افسوس کہ اس مختصر تجزیے میں اس پر بحث کی گنجائش نہیں ہے۔ تامل کا دوسرا سبب یہ ہے کہ بچپن سے یہ بات کانوں میں پڑی ہوئی ہے کہ قدیم ہندوستان میں شریف و مہذب خاندانوں میں سخت پردے کا رواج تھا۔ دینی تعلیم حاصل کرنے کے سبب جب اپنے گھر کی خواتین کو تو میں دیکھتا کہ وہ خود اپنے گاؤں میں دن کے وقت ڈولی اور کہار کے بغیر باہر نہیں نکلتیں تو مجھے تعجب ہوتا تھا کیونکہ ضرورتاً عورتوں کا ضرورتاً باہر نکلنا شریعت نے ممنوع قرار نہیں دیا ہے۔ جب میں نے اس تعجب کا اظہار اپنے بزرگوں سے کیا تو انھوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ سخت پردہ ہندوستان کا اثر ہے۔ اس کے علاوہ

کچھ لوگوں نے مجھے بتایا کہ برادران ہند کی قدیم مذہبی کتابوں میں پردے کا ذکر موجود ہے۔ میں خود چونکہ براہ راست ان کتابوں کا علم نہیں رکھتا اس لیے تفصیل سے اس موضوع پر اظہار خیال سے معذور ہوں۔ جو لوگ واقفیت رکھتے ہوں انہیں اس موضوع پر لکھنا چاہیے۔ میں یہاں ہندی کے مشہور مذہبی ماہنامہ کلیان کے عورت نمبر کے چند حوالوں[1] پر اکتفا کرتا ہوں پردہ کے موضوع پر بحث کرتے ہوئے یوگراج سوامی شری مادھوانند مہاراج لکھتے ہیں:۔

"بھارتی عورت کے مسائل میں پردہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں مختلف خیالات پائے جاتے ہیں۔ پردہ کے مخالف حضرات، پردہ کو قرون وسطیٰ کی رسم بتا کر یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ پردہ آج کے دور میں غیر ضروری ہے، اس کے برخلاف جو لوگ پردے کے حامی ہیں ان کا خیال یہ ہے کہ پردہ کا رواج نہایت قدیم زمانے سے پایا جاتا ہے، ان کے نزدیک پردہ کی قدامت خود اس کی افادیت کی ایک واضح دلیل ہے۔ اگر خالص تحقیقی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ پردے کا رواج نہایت قدیم زمانے سے ہے۔ پردے کا ترجمان لفظ 'اُوگُنٹھن' سنسکرت کے نہایت قدیم گرنتھوں میں پایا جاتا ہے، رامائن میں۔ دشرتھ کے شرادھ (ایک ہندو رسم) کے وقت، سیتا اپنے خسر کا سایہ نظر آنے پر گھونگھٹ کر لیتی ہیں۔ سنسکرت کے ناٹکوں میں عورتوں کے آوگُنٹھن وتی (پردہ نشین) ہونے کا بار بار ذکر ملتا ہے، لہٰذا پردہ کی رسم قدیم ہے، اسے قرون وسطیٰ یا دَور حاضر کی پیداوار سمجھنا فریب محض ہے ...... آنجہانی لالہ لاجپت رائے نے امریکہ جانے کے لیے پردہ کے بارے میں مجھ سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا ان کا خیال تھا کہ بھارتی سماج میں پردہ غیر ضروری ہے اور اسے اختیار کرنا ایک قدیم رسم کی پابندی کے سوا اور کچھ نہیں ہے لیکن امریکہ سے لوٹنے کے بعد جب وہ مجھ سے ملے تو ان کے خیالات بنیادی طور پر بدل چکے تھے اب وہ پردے کے کٹر حامی بن گئے تھے، امریکی سماج میں جہاں پردے کا کوئی اہتمام نہیں ہے، عورت، مرد کا آزادانہ اختلاط اور اس کے اخلاق سوز نتائج دیکھ کر وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ بھارتی سماج کو اگر ان برائیوں سے دور رکھنا ہے تو پردہ کو اس حد تک باقی رکھنا چاہیے جس حد تک کہ ضرورت اس کے باقی رکھنے کی متقاضی ہے۔ خلاصہ یہ کہ پردے کے اختیار کرنے میں اعتدال کو ملحوظ رکھنا چاہیے، جس درجہ میں وہ عورت کی صحت اور امور خانہ داری کے انجام دہی میں مانع ہے وہ لائق ترک اور غلط ہے مگر جس درجے میں وہ عورت کی صحت حلقۂ نسواں کے درمیان ایک قابل احترام مقام

---

[1] یہ تمام حوالے محترم زین محمد فاروق خان صاحب نے عنایت کیے ہیں

ناصفحہ [illegible]

ہے وہ اعتبار کرنے کے لائق، قابلِ تحسین اور ایک عملی چیز ہے بھارتی آدرش کے لحاظ سے عورت کا دائرہ جدا اور مرد کے دائرے سے مختلف ہے اسی آئیڈیل کے اپنانے میں بھارتی تہذیب کی ترقی کا انحصار ہے۔

ماہنامہ کلیان، عورت نمبر

ہندو قانون شاستر کے مطابق ایک کے علاوہ دوسرے کا خیال اور تصور بھی عورت اور مرد دونوں کے لیے زنا کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے تو ہندو تہذیب میں زنا کی آٹھ قسمیں بتا کر انھیں حرام قرار دیا گیا ہے۔

عورت سے تعلق رکھنے والی باتوں کا سننا۔ ایسی باتوں کا زبان سے ادا کرنا۔ عورتوں کے ساتھ کھیلنا۔ اُن کی طرف دیکھنا۔ راز دارانہ انداز میں بات چیت کرنا۔ اُن کی خواہش کرنا۔ اُس مقصد کے حصول کے لیے کوشش کرنا۔ اور مباشرت کرنا

دیدک تعلیم ہے کہ:-

"عورتوں کو مردوں کی مجلس میں بیٹھنا ٹھیک نہیں ہے"

وید کہتا ہے:

"سادھوی ناری! تم نیچے دیکھا کرو، اوپر نہ دیکھو، پیروں کو باہم ملائے رکھو، لباس اس طرح پہنو جس سے تمہارے ہونٹ اور کمر کے نیچے کے حصے پر کسی کی نگاہ نہ پڑے"

(کلیان۔ عورت نمبر)

شری مادھوانند مہاراج کے خیالات اس لائق ہیں کہ ان پر ذرا تفصیل سے لکھا جائے لیکن طوالت کے خوف سے ترک کرتا ہوں۔ ان حوالوں سے بہر حال چند باتیں معلوم ہوتی ہیں:-

(۱) مسلمانوں کی آمد سے پہلے بھی ہندوستان میں پردے کا رواج تھا۔ (۲) مردوں کی مجلسوں سے عورتوں کی علیحدگی مطلوب تھی اور دونوں صنفوں کا اختلاط ناپسندیدہ تھا۔ (۳) ایسا گھونگھٹ مروج تھا جو سر سے لیکر سینے تک جسم کو ڈھانک لیتا تھا۔

ان حوالوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر دستور کی پیش کردہ دفعات کا مطلب وہی ہے جو فاضل جج نے پیش کیا ہے تو یہ صرف مسلمانوں ہی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ہندوؤں کی مذہبی کتابوں کے خلاف بھی ہیں۔

دوسرے نکتے پر جو بات انھوں نے لکھی ہے وہ بھی ۵۰ سال پہلے کی ایک عدالتی رولنگ کے پس منظر میں لکھی ہے اس لیے اس کا مطلب یہ ہوا کہ انگریزوں کی حکومت، ہندوستان کے مختلف فرقوں کے سماجی اقدار [illegible]

مداخلت نہیں کرتی تھی خواہ وہ اقدار اچھے ہوں یا برے۔ وہ غیر ملکی تھے اس لیے انہیں ہماری اچھائی اور برائی سے نہ بحث تھی نہ دلچسپی اسی لیے انھوں نے پردے کے رواج کو ایک برا رواج سمجھتے ہوئے بھی باقی رکھا لیکن اب حکومت ان کے ہاتھوں سے نکل کر ہمارے ہاتھوں میں آگئی ہے اس لیے ہماری ملکی حکومت کو چاہیے کہ اس برے رواج کی حوصلہ افزائی نہ کرے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اچھا اور برے ہونے کا فیصلہ کون کرے گا، کیا حکومت کو پارلیمنٹ کی محض عددی اکثریت کے بل پر یہ فیصلہ کرنا چاہیے؟ اگر ایسا ہو تو پھر مختلف فرقوں کو دستور میں دی ہوئی مذہبی و تہذیبی آزادی کا مفہوم کیا ہوگا؟ کیا ان دفعات کو "لفظ بے معنی" سمجھ لیا جائے؟

تیسرے نکتے میں کہا گیا ہے کہ مصر و ترکی حتیٰ کہ پاکستان میں بھی پردے کے رواج کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور اس بات کو فاضل جج نے پردے کے خلاف، دلیل کے طور پر استعمال کیا ہے' یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان ممالک میں کون لوگ اس رواج کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے؟ کیا وہاں کے علمائے دین؟ کیا وہاں کے صوفیا و مشائخ؟ کیا وہاں کے مسلمان عوام؟ نہیں بلکہ تھوڑی تعداد رکھنے والا 'مغرب سے مرعوب وہ طبقہ اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا جس کے ہاتھوں میں اس وقت ان ملکوں کی حکومت ہے' ان ملکوں میں اسلامی اقدار کے خلاف قوانین محض ڈنڈے کے زور سے بنائے اور نافذ کیے جا رہے ہیں تو کیا کسی بھی انصاف پسند انسان کے لیے ایسے جبری قوانین کو اسلامی اقدار کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کرنا صحیح ہو سکتا ہے؟ حیرت ہے کہ ایک عدالت عالیہ کے فاضل جج کے قلم سے یہ بات پردے کے خلاف بطور نظیر و دلیل استعمال ہوئی ہے پہلے نکتے میں خود فاضل جج تسلیم کر چکے ہیں کہ پردہ اسلامی تہذیب کی قدر ہے اور شاید وہ یہ جانتے ہوں گے کہ اسلام انسان کا بنایا ہوا دین نہیں ہے۔ اللہ کا مقرر کردہ اور پسندیدہ دین ہے اور اس دین کی مستقل اقدار انسانی ذہن کی ساختہ پرداختہ نہیں ہیں۔ اس لیے یہ اقدار خود مسلمانوں کے اختیار سے بھی بالاتر ہیں۔ بالفرض کسی مسلمان ملک کی اکثریت بھی پردے کے خلاف رائے دے تو اس کی یہ رائے ہرگز دلیل نہیں بن سکتی بلکہ وہ دیوار پر مار دینے کے لائق ہوگی چہ جائیکہ کسی مسلمان ملک کی مغرب پرست اقلیت کی رائے یا اس کا طرزِ عمل ——— اسلام کی نظر میں ان رائے اور طرزِ عمل کی پرِ کاہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔

دینی نقطۂ نظر سے الگ ہٹ کر بھی پوچھا جا سکتا ہے کہ اس مغربی جمہوریت کے تحت بھی جس کا نقارہ پوری دنیا میں پیٹا جا رہا ہے کیا یہ بات درست ہے کہ محض طاقت کے بل پر دینی قدروں کے خلاف ایک فیصلہ نافذ کر دیا جائے اور پھر وہی فیصلہ دوسرے ملکوں میں نظیر و دلیل کے طور پر استعمال بھی کیا جانے لگے؟ یہ بات مزید

(باقی صفحہ)

خدا کا حق

(محمد یوسف اصلاحی)

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ قَالَ كُنْتُ رِدْفَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَيْسَ بَيْنِي وَبَيْنَهُ إِلَّا مُؤْخِرَةُ الرَّحْلِ فَقَالَ يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ! فَقُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قُلْتُ لبيك يا رسول الله وَسَعْدَيْكَ قَالَ هَلْ تَدْرِي مَا حَقُّ اللّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ عَلَى الْعِبَادِ قَالَ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ فَإِنَّ حَقَّ اللّٰهِ عَلَى الْعِبَادِ أَنْ يَعْبُدُوهُ وَلَا يُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ثُمَّ سَارَ سَاعَةً ثُمَّ قَالَ يَا مُعَاذَ بْنَ جَبَلٍ قُلْتُ لَبَّيْكَ يَا رَسُولَ اللّٰهِ وَسَعْدَيْكَ قَالَ هَلْ تَدْرِي مَا حَقُّ الْعِبَادِ عَلَى اللّٰهِ إِذَا فَعَلُوا ذٰلِكَ قُلْتُ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَعْلَمُ قَالَ أَنْ لَا يُعَذِّبَهُمْ (بخاری، مسلم)

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں، کہ ایک دفعہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے سواری پر بیٹھا ہوا (آپ کے ساتھ جا رہا تھا) میرے اور آپ کے درمیان بس کجاوے کی سہارے والی لکڑی کا فاصلہ تھا، (چلتے ہوئے) آپ نے مجھے پکارا معاذ! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! دل و جان سے حاضر ہوں، ارشاد فرمائیے، آپ خاموش رہے، کچھ دیر چلنے کے بعد آپ نے پھر مجھے پکارا، معاذ! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے تعمیل کے لیے دل و جان سے حاضر ہوں، (آپ پھر خاموش رہے) کچھ ہی دیر چلے کہ آپ نے پھر مجھے پکارا معاذ! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ دل و جان سے حاضر ہوں فرمائیے فرمایا جانتے ہو اللہ کا اپنے بندوں پر کیا حق ہے؟ میں نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی زیادہ واقف ہیں، ارشاد فرمایا بندوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ وہ تنہا اسی کی عبادت کریں اور ذرا بھی اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، اس کے بعد تھوڑی دیر اور چلے اور پھر مجھے آواز دی معاذ! میں نے عرض کیا یا رسول اللہ ارشاد فرمائیے دل و جان سے خدمت کے لیے حاضر ہوں فرمایا جانتے ہو بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے ــــــ جب وہ یہ حق ادا کریں

——— میں نے عرض کیا، اللہ اور اللہ کے رسول ہی خوب جانتے ہیں، فرمایا تنہا اللہ کی عبادت کرنے والے بندوں کا اللہ پر یہ حق ہے کہ وہ انھیں عذاب نہ دے،

(بخاری، مسلم)

توحید کی تعلیم کا یہ ایک انوکھا اور موثر ترین انداز تعلیم ہے اس تعلیم سے تین باتوں پر روشنی پڑتی ہے توحید کی اہمیت، توحید کا مفہوم توحید کا اجر۔

توحید کی اہمیت

توحید ایک اہم ترین حقیقت ہے، اور دین کی ساری عمارت اسی بنیاد پر تعمیر ہوتی ہے حدیث میں اس اہمیت کو محسوس کرنے کے لئے تین وجوہ پائے جاتے ہیں۔

۱۔ انداز بیان بالکل برابر میں بیٹھے ہوئے ساتھی کو آپ دو بار پکارتے ہیں اور خاموش ہو ہو جاتے ہیں، تیسری بار بھی براہ راست اظہار مدعا کی بجائے خود حضرت معاذ سے سوال فرماتے ہیں، تب تیسری بار میں آپ اپنا مطلب واضح فرماتے ہیں اور نہایت فطری اور موثر انداز میں حقیقت کا اظہار کرتے ہیں، اس اندازِ تعلیم کا مطلب یہ ہے کہ حضرت معاذ سراپا توجہ اور سراپا گوش ہو کر پوری یکسوئی اور کامل انہماک کے ساتھ رسول کے فرمان کو سنیں، کیوں کہ یہ دین کی ایک اہم ترین بنیاد کی تعلیم ہے اور یہی پاکیزہ ساتھی رسول کی تعلیم کو آنے والوں کی طرف منتقل کرنے کیلئے واسطہ ہیں،

۲۔ عقل اور فطرت سے اپیل۔ آپ نے توحید کو اللہ کا اپنے بندوں پر حق بتایا، حق کی ادائیگی عقل، فطرت، اور انسانیت کا ناقابل انکار تقاضہ ہے تعلیم کا ایک انتہائی فطری اور اپیل کرنے والا انداز ہے، کہ انسان کی عقل، فطرت اور جوہر انسانیت کو خطاب کیا جائے، عقل شرافت اور انسانیت جیسے بے بہا جوہروں سے آراستہ انسان کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی کا حق ادا نہ کرے کسی محسن کا احسان بھلا دے، اور ناشکرا بن جائے، اس طرز خطاب میں انسان کے جذبۂ شکر اور جذبہ احسان مندی کو بہترین پیرایہ میں ابھارا گیا ہے، توحید محسن حقیقی کا ایک حق ہے، اور اس حق کو ادا نہ کرنے والا، درحقیقت، عقل، شرافت انسانیت جیسے انمول جوہروں سے عاری ہے، اور وہ عقل، انسانیت اور شرافت ہر ایک کی عدالت میں سخت ترین مجرم ہے، جس کی سزا یہ ہے کہ ایسا انسان ہمیشہ کے لئے

اللہ کی رحمتوں سے محروم کر دیا جائے، اور عذاب الیم کے شعلے اسے ہمیشہ گھیرے رہیں،

۳۔ عذاب سے نجات توحید کی اہمیت کی اس سے بڑی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ عذاب سے بچنے کا ذریعہ ہے، عقلمند انسان کی تگ و دو کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ اپنے جسم و جان کو عذاب سے بچا لے، اور عذاب سے بچنے کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس حق کو ادا کیا جائے!

توحید کا مفہوم

تنہا اللہ کی عبادت کرنا اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا توحید کا جامع ترین بیان ہے۔
عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان کو اپنی عاجزی، احتیاج، تذلل اور بے چارگی کا پورا پورا شعور ہو، اور اسے بہ یقین حاصل ہو کہ وہ ہر ہر لمحہ اللہ کی رحمتوں کا محتاج ہے، اس یقین اور شعور کے ساتھ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے، اور اس کا کامل بندہ بنکر رہے، ——— اسی کی پرستش کرے، اسی سے دعا مانگے، اسی سے مدد چاہے، اسی کی اطاعت کرے اور زندگی کے ہر معاملہ میں اسی کے حکم کے آگے گردن جھکائے، اپنی محبتوں اور عقیدتوں کا مرکز اسی کو بنائے، خوشی اور غم میں، مصیبت اور راحت میں، ناداری اور خوشحالی میں، صحت اور بیماری میں، غرض زندگی کے نشیب و فراز میں صرف خدا ہی کو پکارے، اسی کا حکم مانے اسی کی طرف لپکے، اسی کا قرب تلاش کرے، اسی کی رضا کو مقدم رکھے، اور زندگی کے کسی موڑ پر ذرا بھی کسی کو خدا کا شریک نہ ٹھہرائے، نہ اس کی ذات و صفات میں نہ قدرت و اختیار میں، نہ اس کے حکم و قانون میں، اللہ کی زمین پر اللہ ہی کا شکر گزار بندہ بنکر رہے، اور اسی کی مرضی پوری کرنے کے لئے پوری زندگی تج دے۔

توحید کا اجر

دنیا میں اللہ کے عذاب سے بچنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ہدایت نصیب ہو اور اس پر اللہ کی رحمتیں ہوں، آخرت میں عذاب سے نجات کے معنی یہ ہیں کہ اسے جہنم کی آگ سے بچایا جائے اور دائمی سکون کا ٹھکانہ جنت ——— اسے عطا کیا جائے ——— جہاں ہمیشہ کے لئے اسے اپنے مولا کی خوشنودی، نظر کرم

حاصل ہو اور ہمیشہ اس پر رحمتوں کی بارش ہو، ظاہر ہے کسی انسان کا منتہائے مقصود اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس دنیا میں ہدایت کی راہ پر گامزن رہے رحمت خداوندی کا مستحق بنے اور آخرت میں اسے رب کی رضا حاصل ہو۔ اس منتہائے مقصود کو حاصل کرنے کا ذریعہ یہ ہے کہ انسان صرف اللہ کی عبادت کرے اور کسی کو اس کا ساجھی نہ بنائے، ایک اور حدیث میں اس مفہوم کو ایک دوسرے انداز میں اس طرح بیان کیا گیا ہے،

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا مِنْ عَبْدٍ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ثُمَّ مَاتَ عَلٰی ذٰلِکَ اِلَّا دَخَلَ الْجَنَّۃَ

(مسلم ج ۱)

ابو ذر رضی اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو بندہ بھی (سچے دل سے) لا الٰہ الا اللہ کہے اور پھر اسی پر اسے موت آجائے، وہ یقیناً جنت میں جائے گا۔

اس حدیث میں لا الٰہ الا اللہ کے اقرار کا اجر جنت کو قرار دیا گیا ہے، اور ظاہر ہے کہ اس اقرار سے وہی اقرار مراد ہے، جو محض رسمی نہ ہو بلکہ پختہ یقین اور قلبی تصدیق کے ساتھ ہو جو علم و عمل، سیرت و کردار سلوک و معاملات، فکر و خیال سب کی دنیا بدل دے اور انسان ہر پہلو سے اس اقرار کا نمونہ ہو اور زندگی کے کسی گوشے میں بھی اس پر شرک کا بدنما دھبہ نہ ہو، سچے ایمان اور حقیقی اقرار کا یہ ایک لازمی تقاضہ ہے، جس کو ہر جگہ بیان کرنا ضروری نہیں اور جہاں آپ نے جن ایمانی تقاضوں کی وضاحت ضروری سمجھی ہے۔ وہاں وضاحت بھی فرمائی ہے، چنانچہ صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے۔ ابو ایوبؓ فرماتے ہیں ایک بار میں ایک سفر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ ایک بدوی نے سامنے آکر حضور کے ناقہ کی لگام پکڑ لی اور یہ کہنے لگا اے اللہ کے رسول مجھے وہ بات بتا دیجئے جو مجھے جنت سے قریب اور دوزخ سے دور کر دے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم ٹھہر گئے رفقا پر آپ نے ایک نظر ڈالی، اور فرمایا سنتے ہو اللہ نے اس بندہ کو کیسی بہترین توفیق عطا فرمائی ہے۔ اور آپ نے اس بدوی سے کہا کیا پوچھتے ہو ذرا اپنی بات پھر تو کہو، بدوی نے پھر اپنی بات دہرائی۔ مجھے وہ بات بتا دیجئے جو مجھے جنت سے قریب کر دے اور دوزخ سے دور کر دے، آپ نے ارشاد فرمایا صرف اللہ کی بندگی کرتے رہو، اور کسی چیز کو اس کا شریک نہ بناؤ نماز قایم کرتے رہو، زکوٰۃ ادا کرتے رہو اور صلہ رحمی کرو۔ یہ ارشاد فرما کر آپ نے بدوی سے فرمایا اچھا اب ہماری ناقہ چھوڑ دو۔ جب وہ اعرابی

چلا گیا تو آپ نے فرمایا اگر یہ ان احکام پر مضبوطی کے ساتھ کاربند رہا۔ تو یقیناً جنت میں جائے گا۔

بدوی نے جس خواہش کا اظہار فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس سے زیادہ پاکیزہ خواہش اور آرزو کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی اور متوجہ کرنا چاہا کہ بدوی کیسی پاکیزہ خواہش کا اظہار کر رہا ہے کیا کسی باشعور انسان کی خواہش اس کے سوا بھی کچھ ہو سکتی ہے۔ اور پھر آپ نے سننے کے باوجود بدوی کی زبان سے دوبارہ سوال سننا چاہا اور صحابہ کرام کو بھی سنانا چاہا کہ دنیا کے مکر و فریب سے ناآشنا مخلص بندہ کتنی فطری اور کتنی پاکیزہ تمنا کا اظہار کر رہا ہے جب دوبارہ اس نے اپنے الفاظ دہرائے تو آپ نے توحید کی تعلیم دی اور پھر اس کے ضروری تقاضے بتلائے۔ اور پھر یہ حتمی بیان ارشاد فرمایا کہ اگر بدوی مضبوطی سے اس اقرار اور اس کے تقاضوں پر جما رہا تو یقیناً جنت میں جائے گا۔

انسان کی آخری خواہش اور انتہائی کامیابی اس کے سوا اور کیا ہے کہ وہ آخرت میں ابدی جنت کا مستحق ہو جائے اور عذاب الٰہی سے بچ جائے۔ اور اس انتہائی کامیابی کا صرف ایک ہی ذریعہ ہے کہ اللہ کی توحید پہ ایمان لایا جائے۔ اللہ کی ذات و صفات پر پختہ یقین کیا جائے۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اور پوری زندگی اسی اقرار و ایمان کا نمونہ ہو، بلاشبہ ایسے ایمان کا بہترین انعام مولا کی رضا اور ہمیشہ کی جنت ہے۔

ایک سال کی جبری بندش کے بعد

تحریک اسلامی کا خادم

ماہنامہ "چراغ راہ" کراچی

یکم جولائی سنہ ۱۹۶۲ء

سے اعلاء کلمۃ الحق کے لیے اپنی پہلی اشاعت

"آزادی نمبر" پیش کر رہا ہے

صفحات [illegible] قیمت: [illegible] روپے ——— منیجر چراغ راہ کراچی ۵

ابنِ آدم کی معراج

(مولانا سید جلال الدین عمری)

انسان خدا کا غلام ہے لیکن اس کو آزاد پیدا کیا گیا ہے۔ کیوں کہ خدا چاہتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے اس کی غلامی میں آجائے مگر ہم دیکھ رہے ہیں کہ ایسا ہو نہیں رہا ہے۔ خدا کی دی ہوئی آزادی نے انسان کو خدا کا نافرمان بنا دیا ہے۔ انسان کی دنیا میں ہر طرف خدا سے بغاوت چھوٹ پڑی ہے اور کہیں خدا کی مرضی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ خدا کی حکومت میں خدا سے بغاوت سراسر ظلم اور نا انصافی ہے لیکن انسان اس ظلم کا مسلسل ارتکاب کر رہا ہے۔ انسان کے لئے صحیح روش خدا کی اطاعت ہے۔ لیکن اطاعت کو وہ بوجھ خیال کرتا ہے۔ انسان خدا کے غلام کی طرح سوچنے کے لئے ہرگز تیار نہیں ہے کیوں کہ اس کے ذہن میں خدائی کا سودا سمایا ہوا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ وہ ساری دنیا کا آقا ہے اور نہیں ہے تو اس کو آقا ہونا چاہیئے۔ وہ اس طرح اپنی سعی و جہد میں لگا ہوا ہے۔ گویا اپنی زندگی کا آپ مالک ہے وہ اپنے جیسے انسانوں سے جن مسائل پر گفتگو کرتا ہے، جن کاموں میں دلچسپی لیتا ہے اور جن مقاصد کے لئے دوڑ دھوپ کرتا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خدا کی غلامی سے نکل چکا ہے اور اس وقت تک اطمینان سے بیٹھنا نہیں چاہتا جب تک کہ خدائی کے مقام پر پہونچ نہ جائے۔ وہ صبح کو اپنے بستر سے اٹھتا ہے تو اس فیصلہ کے ساتھ اٹھتا ہے کہ اس کا کوئی خدا نہیں ہے جو اس سے اس کے شام تک ہونے والے اعمال کا حساب لے اور پھر رات کو وہ اس بے نیازی کے ساتھ دوبارہ اپنے بستر پر چلا جاتا ہے کہ گویا دن بھر اس نے جو کچھ کیا ٹھیک کیا۔ اس کو کبھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس کی جان خدا کی مٹھی میں ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس کو اپنے دربار میں کھینچ کر حاضر کر سکتا ہے۔ پھر اس وقت وہ اپنے اعمال کا کیا جواب دے گا؟ انسان خوش ہے کہ اس کے پاؤں میں غلامی کی زنجیر نہیں ہے حالانکہ اس پر ہر آن خدا کا قبضہ ہے۔ انسان انتہائی بے بس اور کمزور ہے اس کے اندر یہ تاب نہیں کہ زمین و آسمان والے

خدا سے ٹکر لے لیکن اس طرح وہ اپنی روش میں مست ہے گویا وہ خدا کی گرفت سے آزاد ہے۔ کیا انسان اس حقیقت کو بھول چکا ہے کہ خدا سے بغاوت کبھی کامیاب نہیں ہوئی اور جو خدا کے مقابلہ میں آتا ہے پیس دیا جاتا ہے؟

اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰىٓ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝ اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰىٓ اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا ضُحًى وَّهُمْ يَلْعَبُوْنَ ۝ اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ فَلَا يَاْمَنُ مَكْرَ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

(الاعراف ۹۹: ۹۷)

پس کیا بستیوں والوں کو اس کا خوف نہیں رہا کہ ان پر ہمارا عذاب راتوں رات آجائے جب کہ وہ سوتے ہوں یا بے ڈر ہیں بستیوں والے اس سے کہ ان پر ہمارا عذاب دن میں آجائے جب کہ وہ کھیل کود میں ہوں۔ تو کیا وہ اللہ کی چال سے بے خوف ہو چکے ہیں۔ اور اللہ کی چال سے تو وہی بے خوف ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہیں۔

کائنات کی ایک ایک چیز جس خدا کے فرمان کے تابع ہے انسان اسی کے خلاف کھڑا ہوا ہے۔ درخت کے پتے جس کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتے انسان اسی کی مرضی کے علی الرغم کام کر رہا ہے۔ پہاڑ جس کے خوف سے اپنی جگہ جمے ہوئے ہیں انسان کا سینہ اسی کے خوف سے خالی ہے۔ پرندے جس کی حمد و ثنا میں مصروف ہیں انسان اسی کی یاد سے غافل ہے۔ جس کے اشارے سے سمندر کی طغیانی رک جاتی اور جنگل کی سرسراہٹ ختم ہو جاتی ہے انسان اسی کے حکم کو ٹھکرا رہا ہے۔ یہ کس قدر حیرت انگیز جسارت ہے کہ زمین و آسمان پر جس خدا کی حکومت ہے انسان اسی کی غلامی میں رہنا نہیں چاہتا! نادان انسان تو کہاں خدا سے بھاگ سکتا ہے جب کہ تیرا سایہ بھی تیرا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں ہے۔ تو خدا سے بغاوت کر رہا ہے لیکن تیرا سایہ خدا کے سامنے سجدہ ریز ہے اور تجھے اس کا احساس تک نہیں۔

وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّظِلٰلُهُمْ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝

اور اللہ ہی کو سجدہ کرتی ہیں۔ وہ ساری چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں آمادگی اور خوشی سے اور جبر سے اور صبح و شام ان کے سائے (بھی خدا

(یہ اسی کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں) (الرعد : ۱۵)

انسان کے چاروں طرف مالک کائنات کی فرمانروائی کا اعلان ہو رہا ہے ۔ کائنات کے ہر گوشہ اور ہر سمت سے آواز آتی ہے کہ انسان اپنی آزادی سے دست کش ہو جائے اور خدا کی غلامی میں چلا آئے کیوں کہ یہ کائنات انسان کی نہیں خدا کی ہے ۔ کائنات کی کسی بھی چیز پر انسان مالکانہ حق نہیں رکھتا حتیٰ کہ انسان جس ہوا میں سانس لیتا ہے ۔ غذا کا جو لقمہ پیٹ میں اتارتا ہے ، پانی کے جس گھونٹ سے اپنی پیاس بجھاتا ہے ان میں سے ایک چیز کا بھی وہ مالک نہیں ہے بلکہ خدا ہی ان کا خالق و مالک ہے ۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ خدا کی اس کائنات میں خدا ہی کی مرضی پوری ہونی چاہیے انسان اس میں اپنی مرضی سے تصرف کا کوئی حق نہیں رکھتا لیکن وہ کائنات کو اس طرح کام میں لا رہا ہے گویا خدا اس کائنات کا مالک نہیں ہے بلکہ وہ خود ہی اس کا مالک ہے ۔

انسان ایک ایسے ماحول میں گھرا ہوا ہے جو خدا کی غلامی میں مصروف ہے لیکن باغی انسان اپنے ماحول سے جنگ کر رہا ہے ہوا میں اڑنے والے پرندے ، زمین پر رینگنے والے جانور ، پھول اور پودے دریا اور پہاڑ ، چاند اور سورج ، ہوا اور پانی ہر چیز خدا کی اطاعت میں لگی ہوئی ہے ۔ اس کائنات میں کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں انسان آزادی کی سانس لے سکے ۔ اگر وہ خدا کی غلامی میں رہنا نہیں چاہتا تو اسے یہ کائنات چھوڑ دینی چاہیئے اور کوئی ایسا مقام تلاش کرنا چاہیے جو خدا کی حکومت سے آزاد ہو ۔

انسان شاید بھول رہا ہے کہ کائنات خدا کے امر و اقتدار کے تابع ہے ۔ بغاوت کی روش اس کی فطرت سے میل نہیں کھاتی ۔ انسان خدا سے بغاوت کرتا ہے تو کائنات کی ایک ایک چیز اس کو نفرت اور حقارت سے دیکھتی اور اس کو مجرم سمجھتی ہے ۔ کائنات خدا سے باغی انسان کو اپنی گود میں رکھنا نہیں چاہتی لیکن خدا کا حکم ہے کہ وہ انسان کی خدمت کرے اس لئے وہ اس کو برداشت کر رہی ہے ۔ خدا اگر انسان کو اس کی بغاوت کے نتیجہ میں صفحہ زمین سے مٹا دے تو کائنات خوش ہوگی کہ اس کے سینہ سے جرم و معصیت کا بوجھ اتر گیا ۔

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَاءُ وَ الْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ (دخان : ۲۹)

پس نہیں روئے ان پر آسمان اور زمین اور نہ ان کو ڈھیل دی گئی ۔

اس کائنات میں انسان کی صحیح ترین حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا کا غلام ہے اس لئے اس کو ...

ہونا چاہیے۔ اس کے علاوہ یہاں اس کی کوئی دوسری حیثیت ہو ہی نہیں سکتی۔ خدا نے انسان کو آزادی اسی لیے دی ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ مراتب تک پہنچ سکے اور اس کی ترقی کسی ایک حد پر رک نہ جائے۔ اس آزادی کے استعمال کے لیے اس نے حدود و آداب مقرر کر دیے ہیں تاکہ وہ بھٹک نہ جائے۔ انسان اپنی نادانی سے ان حدود میں اپنے لیے حرج اور تنگی محسوس کرتا ہے۔ حالاں کہ یہ اس کی ترقی کا زینہ ہیں۔ ان حدود کی پابندی سے اس کی شخصیت اسی طرح ابھرتی اور نشو و نما پاتی ہے جس طرح زمین سے چھٹا ہوا درخت ابھرتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ اس سے اس کی خوبیاں نکھرتی اور جلا پاتی ہیں۔ اس کے عزایم اور حوصلے بلند ہوتے ہیں۔ اس پر ترقی کی راہیں کھلتی ہیں اور وہ کمال کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ ان حدود کے ذریعہ خدا انسان کو عذاب میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا لیکن انسان ان کو عذاب سے کم نہیں سمجھتا۔

مَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ وَّلٰكِنْ يُّرِيدُ لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ (المائدہ: ۶)

اللہ تعالیٰ تم پر تنگی کرنا نہیں چاہتا بلکہ وہ چاہتا ہے کہ تم کو پاک کرے اور اپنی نعمت کو تم پر مکمل کر دے۔ تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔

خدا کی غلامی انسان کی کامیابی کی ضمانت ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک جائے خدا کی غلامی سے انسان کا وقار بلند ہوتا ہے، اس کے اندر عظمت اور بلندی پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی غلامی انسان کی معراج ہے اور خدا سے بغاوت اس کو بلندی سے پستی میں پھینک دیتی ہے۔ جس طرح کائنات کی ہر چیز اپنا ایک مقصد رکھتی ہے اگر وہ اس مقصد کو پورا کرتی ہے تو کامیاب ہے ورنہ ناکام، ٹھیک اسی طرح انسان خدا کی غلامی کے لیے پیدا کیا گیا ہے اگر وہ اس مقصد سے پھر جاتے تو اس کی کامیابی کی کوئی صورت نہیں۔ خدا کی غلامی سے انکار کے بعد انسان کی اصل حیثیت بدل جاتی ہے اور کسی چیز کی حیثیت کا بدل جانا اس کی موت ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں اللہ کو سجدہ کرتی ہیں اور سورج اور چاند اور تارے اور پہاڑ اور بہت سے انسان بھی اس کو سجدہ

وَكَثِيرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ وَمَن يُهِنِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِن مُّكْرِمٍ إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ ۝ (الحج : ۱۸)

کرتے ہیں۔ اور بہت سے انسان ایسے ہیں جن پر خدا کا عذاب ثابت ہو چکا ہے اور (واقعہ یہ ہے کہ) جس کو اللہ پستی میں ڈال دے اسے کوئی عزت دینے والا نہیں ہے۔ اور بلاشبہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے!

انسان صرف ایک خدا کا غلام ہے اسے غلامی کی ہر زنجیر کاٹ دینی چاہیے اور صرف خدا کی اطاعت کرنی چاہیے لیکن افسوس کہ انسان غلامی کے بے شمار طوق خوشی سے پہن لیتا ہے اور اپنے خدا کو بھول جاتا ہے۔ انسان غلامی پر مجبور ہے۔ وہ خدا کی غلامی سے نکل کر بھی آزاد نہیں ہوتا۔ یا تو وہ اپنے نفس کی غلامی میں چلا جاتا ہے اور خواہشات اس کی معبود بن جاتی ہیں یا پنے جیسے دوسرے انسانوں کے سامنے سر جھکا دیتا ہے اگر اس سے بھی اس کو نجات مل جائے تو بے جان مادی اسباب کی پرستش شروع کر دیتا ہے۔ لیکن یہ تینوں ہی صورتیں اس کے لئے سراسر ناجائز ہیں۔

انسان اپنے بارے میں کسی بھی فیصلہ کا حق نہیں رکھتا کیوں کہ وہ خود سراور آزاد نہیں ہے۔ وہ اس زمین پر اپنی مرضی سے نہیں آیا ہے بلکہ خدا نے اس کو اپنی مرضی سے پیدا کیا ہے۔ اس کی ذات کے اندر اور باہر جو کچھ ہے سب خدا کا ہے۔ جس زبان سے وہ بولتا ہے، جن آنکھوں سے وہ دیکھتا ہے، جن کانوں سے وہ سنتا ہے، جن ہاتھوں سے وہ حرکت کرتا ہے اور جن پیروں سے وہ چلتا ہے ان میں سے کسی بھی چیز کا وہ مالک نہیں ہے بلکہ ہر چیز خدا نے اس کو دی ہے پھر کیسے اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ آزادی کا دعویٰ کرے؟ یہ نہیں ہو سکتا کہ انسان کا خالق و مالک خدا ہو۔ ساری نعمتیں اس کو خدا کی طرف سے مل رہی ہوں اور پھر انسان آپ اپنی مرضی کا مالک بن جائے۔ انسان پر اسی ذات کا حکم چلنا چاہیے جس نے اس کو پیدا کیا ہے اور جس کی نعمتوں میں وہ جی رہا ہے۔ غلام کے لئے معقول روش یہی ہو سکتی ہے کہ وہ آقا کا حکم مانے اور اس کی اطاعت کرے۔ کوئی دوسری روش اس کے لئے قطعاً صحیح نہیں ہو سکتی۔ آپ جس غلام پر اپنا روپیہ پیسہ صرف کریں۔ جس کے کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے کا انتظام کریں اس کے لئے اسی بات کو صحیح سمجھیں گے کہ وہ آپ کی اور صرف آپ کی تابع داری کرے۔ اگر وہ آپ کے حکم سے سرتابی کرتا ہے اور دوسرے کے

خود مختاری کا دعویٰ کرتا ہے تو کبھی آپ اس کے رویہ کی تائید نہیں کریں گے۔ اسی سے آپ سوچ سکتے ہیں کہ خدا کی نافرمانی انسان کے لئے کیسے جائز ہو سکتی ہے؛ جب کہ اس نے انسان کو وہ سب کچھ دیا جس کا وہ محتاج ہے۔ اس کی تمام حقیقی ضرورتوں کی تکمیل کی اور اس کو اس قابل بنایا کہ وہ اپنی آزاد مرضی سے زمین پر چل پھر سکے۔ انسان اپنی ذات کا مالک نہیں ہے اس لئے اس کو اپنی ذات پر تصرف کا کوئی حق نہیں ہے اگر وہ خدا کے بجائے اپنے نفس کو معبود سمجھتا ہے تو اتنے بڑے ظلم کا ارتکاب کرتا ہے جسے دنیا کی کسی بھی عدالت کو معاف نہیں کرنا چاہیئے لیکن جب ہر طرف ظلم ہو رہا ہے تو انصاف کون کرے؟

وَاٰتٰىكُمْ مِّنْ كُلِّ مَا سَاَلْتُمُوْهُ — اور اس نے تم کو وہ سب کچھ دیا جو تم نے مانگا

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا — اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ ۝ — نہیں کر سکتے۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان بڑا ہی

(ابراہیم: ۳۴) — ظالم اور ناشکرا ہے۔

اس دنیا میں کچھ انسان ایسے ہیں جو خدائی کے دعویدار ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کو یہ مقام حاصل نہیں ہے لیکن ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو افراد خدا بنے بیٹھے ہیں ان سے قرب کا مقام ان کو مل جائے تاکہ اگر وہ خدائی کی دولت سے محروم ہیں تو کم از کم فرمانرواؤں کی غلامی سے محروم نہ رہیں لیکن شاید وہ یہ نہیں سوچتے کہ ہر جھوٹا خدا ان کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ان کی قوتیں اور صلاحیتیں خود ان کے اپنے کام نہیں آتیں بلکہ ان کے خدا کے کام آتی ہیں۔ وہ زندگی بھر ان جھوٹے خداؤں کی غلامی کرتے ہیں لیکن جب سانس کی آمد و رفت کا سلسلہ رک جائے گا۔ اور زندگی ختم ہوگی تو ان کو معلوم ہوگا کہ وہ خالی ہاتھ ہیں اور ان کی غلامی کا صلہ ان کو کچھ نہیں ملا ہے۔

بہت سے لوگ اپنے لئے تو خدائی کے دعویٰ کو صحیح نہیں سمجھتے لیکن دوسروں کے دعویٰ خدائی کو ماننے میں انہیں کوئی تامل نہیں ہوتا اور نہ ان کی غلامی میں کوئی قباحت نہیں محسوس کرتے حالاں کہ جس طرح ان کے لئے خدائی کا دعویٰ سراسر غلط اور ناجائز ہے اسی طرح کسی دوسرے انسان کے دعویٰ خدائی کو قبول کرنا بھی سراسر غلط اور ناجائز ہے۔ کیوں کہ جس طرح وہ خدائے حقیقی کے غلام ہیں اسی طرح ہر انسان اسی کا غلام ہے خدائی کا جھوٹا دعویٰ اس کو خدائی کے مقام پر نہیں پہنچا دیتا۔ دولت و ثروت اور عہدہ و منصب سے کوئی شخص خدا نہیں بن جاتا اگر خدائی اتنی ہی سستی چیز ہے تو ہر فاسق و فاجر خدائی کا حقدار ہو سکتا ہے۔

موجودہ دور نے رئیسوں اور بادشاہوں کے خلاف تو بغاوت کر دی لیکن قوم و نسل اور ملک و وطن کو خدائی کے مقام پر بٹھا دیا اور بادشاہوں اور رئیسوں کی پرستش کے بجائے قوم و ملک کی پرستش ہونے لگی۔ حالانکہ صاف بات ہے کہ اگر فرد کے لئے خدا بننا ناجائز تھا تو جماعت کے لئے کیسے جائز ہوا۔ گویا کوئی غلط فعل پوری قوم کے ہاتھوں انجام پائے تو اس کی حقیقت بدل جاتی ہے۔ کیا چوری اور قتل و غارت صرف فرد کے لئے جرم ہے اور اگر کوئی جماعت چوروں کے گروہ میں تبدیل ہو جائے اور قتل و غارت گری کرنے لگے تو یہ اس کے لئے کار ثواب ہوگا۔؟

افسوس کہ انسان خدا کی غلامی سے نکل کر بڑی آسانی سے اپنے جیسے انسانوں کی غلامی میں چلا جاتا ہے اگر انسان خدا بن سکتا ہے تو بجائے دوسروں کو خدا بنانے کے خود اس کو خدائی کا دعویٰ کرنا چاہیے اور اگر اس کے اندر خدا بننے کی صلاحیت نہیں ہے تو معلوم ہونا چاہیے کہ کسی بھی بڑے سے بڑے انسان کے اندر خدا بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس زمین پر انسان کو جو کچھ بھی ملا ہے وہ خدا کا عطیہ ہے کوئی بھی چیز اس کی اپنی اور ذاتی نہیں ہے۔ ہر چیز خدا نے اس کو دی ہے اور خدا اس کو چھین بھی سکتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ خدا کی اس کائنات میں خدا کے سوا کسی کو خدائی کا مقام دینا قطعاً باطل اور ناجائز ہے یہاں صرف ایک خدا کی غلامی حق اور جائز ہے۔ وہی اس قابل ہے کہ انسان اس کے لئے جئے اور مرے اور اس کو اپنا معبود و فرمانروا تسلیم کرے۔

اَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ھُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْعَلِیُّ الْکَبِیْرُ ۝ (الحج: ۶۲)	یقیناً اللہ ہی کی ذات حق ہے اور اس کے سوا جس کو یہ پکارتے ہیں وہ سراسر باطل ہے اور اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے بڑا ہے۔

خدا کی غلامی سے نکلنے کے بعد انسان تیسری روش یہ اختیار کرتا ہے کہ بے شمار چاند اور سورج مظاہر قدرت کو خدا بنا لیتا ہے۔ حالانکہ انسان خدا کے سامنے سر جھکائے یا نہ جھکائے لیکن دنیا کی ہر چیز اس کے سامنے سر جھکائے ہوئے ہے۔ انسان اس کائنات میں اپنی اصل حیثیت کھو چکا ہے لیکن انسان کے سوا ہر چیز اپنی اصل حیثیت پر قائم ہے۔ وہ پوری طرح خدا کی غلامی میں لگی ہوئی ہے۔ انسان اس کی حیثیت کو کبھی بدل نہیں سکتا۔ وہ جس چیز کو بھی خدا سمجھ کر سجدہ کرنا چاہتا ہے تو وہ پہلے ہی [illegible] ہے۔

کے مقام سے نکال کر خدائی کے مقام پر نہ پہونچاؤ۔ یہ میری اور تمہاری دونوں کی غلط حیثیت ہوگی۔ نہ میں خدا ہوں اور نہ تم میرے غلام۔ اس کائنات پر جس خدا کی حکومت ہے اسی کو خدائی کا حق حاصل ہے۔

أَلَّا يَسْجُدُوا لِلَّهِ الَّذِي يُخْرِجُ	کیوں نہیں سجدہ کرتے وہ اس اللہ کو جو آسمان
الْخَبْءَ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ	اور زمین میں چھپی ہوئی چیز کو بھی نکال لاتا ہے
يَعْلَمُ مَا تُخْفُونَ وَمَا تُعْلِنُونَ ۝	اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور جو کچھ ظاہر کرتے ہو
اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ رَبُّ الْعَرْشِ	اس کو وہ جانتا ہے۔ وہ اللہ ہے اس کے سوا
الْعَظِيمِ ۝ (النمل: ۲۶-۲۵)	کوئی معبود نہیں۔ وہ عرش عظیم کا رب ہے

آج کا ذہن اس میں شک نہیں، مظاہر پرست نہیں ہے لیکن وہ مادہ اور اس کی قوت سے اس قدر مرعوب ہے کہ اس کو کسی محسوس خدائی پیکر کی ضرورت نہیں رہی۔ مادہ اس کے نزدیک اس کائنات کا خالق ہے اور اسی کے زور سے یہ کائنات چل رہی ہے۔ حالانکہ جو مادہ خود اپنے وجود میں خدا کا محتاج ہے دوسرے کو وجود کیا دے سکتا ہے۔ جس کے اندر خود جینے کی صلاحیت نہیں وہ دوسرے کو زندگی کیا دے سکتا ہے۔ جو خود حرکت نہیں کر سکتا وہ دوسرے کو حرکت کیا دے سکتا ہے؟ انسان کی یہ کتنی بڑی بدنصیبی ہے کہ خود تو زندگی اور شعور کی دولت رکھتا ہے اور بے شعور و بے حیات مادہ کو خدا بنا کر پوجنے لگتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ خدا سے محروم ہونے کے بعد انسان کو کوئی چیز پستی سے نہیں بچا سکتی۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ	جنھیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو وہ بھی تمہاری
اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ	ہی طرح بندے ہیں پس تم ان کو پکارو۔ اگر
فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ	تم ان کے بارے میں اپنے دعوے میں سچے ہو تو
أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا أَمْ	ان کو تمہاری پکار کا جواب دینا چاہیے۔
لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا	ذرا بتاؤ، کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلیں
أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ	یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے وہ پکڑیں یا ان کی
بِهَا أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ	آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھیں؟ یا ان کے
بِهَا (الاعراف: ۱۹۵-۱۹۴)	کان ہیں جن سے وہ سنیں

[illegible] میں خدا کے بارے میں یہ بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کا کوئی [illegible] نہیں ہے

اور وہ بغیر کسی غرض و غایت کے چل رہی ہے لیکن اس غلط بات کو ماننے پر ہم مجبور ہیں اگر مادے کو اس کائنات کا خالق مان لیں کیونکہ مقصد متعین کرنا کسی باشعور ہستی کا کام ہے اور جب مادہ شعور ہی سے خالی ہے تو وہ مقصد متعین نہیں کر سکتا۔ مادہ کا عمل غیر ارادی ہوتا ہے۔ اور اس عمل کے نتیجے میں جو بھی واقعہ وجود میں آتا ہے وہ مادہ کے قصد و ارادہ کے بغیر وجود میں آتا ہے۔ مادہ ایک بے شعور طاقت ہے۔ وہ شعورِ ذات سے بھی محروم ہے تو کسی دوسری چیز کا احساس کیا کر سکتا ہے؟ مادہ کائنات کا خالق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کو کسی قصد و ارادہ کے تحت نہیں پیدا کیا گیا ہے بلکہ وہ آپ سے آپ وجود میں آگئی ہے۔ یہ ایسا انوکھا کارخانہ ہے جس کا کوئی مقصد نہیں ہے بلکہ وہ بغیر کسی مقصد کے اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ خدا کے انکار کے بعد — جیسا کہ قرآن مجید کہتا ہے — کائنات اپنی معنویت کھو دیتی ہے اور اس کا کوئی مقصد نہیں رہ جاتا۔ خدا نہیں ہے تو ہر چیز بے مقصد اور باطل ہے کیونکہ وہ سرچشمہ ہی نہیں ہے جس سے کسی چیز میں مقصدیت پیدا ہوتی ہے۔ خدا کا منکر قرآن کے نزدیک کائنات میں حق کے وجود کا منکر ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْأَرْضَ	ہم نے آسمان اور زمین کو اور ان ساری
وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذَٰلِكَ ظَنُّ	چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں بے مقصد
الَّذِينَ كَفَرُوا فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ	نہیں پیدا کیا ہے۔ یہ ان لوگوں کا خیال ہے
كَفَرُوا مِنَ النَّارِ ۝	جو خدا کے منکر ہیں۔ پس تباہی ہے خدا کا
(ص: ۲۷)	انکار کرنے والوں کے لیے کہ وہ جہنم میں جائیں گے

اگر آپ اس مہمل بات کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ کائنات مقصدیت سے خالی ہے تو وہ کون مقصد ہے جس کے لئے یہ مصروفِ عمل ہے؟ اس سوال کا ایک ہی جواب ممکن ہے وہ یہ کہ کائنات کو جس خدا نے پیدا کیا اس کی غلامی اس کا مقصد ہے کیوں کہ مخلوق کا مقصد خالق کی غلامی کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ جواب عین قرآن کا جواب ہے۔ وہ اس کے ثبوت میں پوری کائنات کو پیش کرتا ہے کہ دیکھو کائنات اپنے خالق کے احکام کی کس طرح پابند ہے۔ اس کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے اسی پر لگی ہوئی ہے۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اسی کے قوانین میں بندھا ہوا ہے۔ کوئی واقعہ اس کی مرضی کے خلاف نہیں ہوتا۔

وَلَهُ مَن فِي السَّمَاوَاتِ وَ	آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں
الْأَرْضِ كُلٌّ لَّهُ قَانِتُونَ ۝ (الروم: ۲۶)	سب اسی کی ہیں سب چیزیں اس کے حکم کے تابع ہیں

جب کائنات خدا کے حکم کے تابع ہے اور اس کی غلامی سے منہ نہیں موڑتی تو انسان کو بھی خدا کا غلام ہونا چاہئے کیوں کہ وہ کائنات کا ایک جزء ہے۔ اور جزء کا عمل کل کے عمل سے مختلف نہیں ہو سکتا۔ ورنہ وہ اس کل کا جزء ہی نہیں قرار پائے گا۔ انسان کائنات کے ایک جزء کی حیثیت سے رہنا چاہتا ہے تو کائنات جس طرح خدا کے سامنے جھکی ہوئی ہے اسی طرح اس کو بھی خدا کے سامنے جھک جانا چاہیے۔ اگر انسان اس کے لئے تیار نہیں ہے تو وہ جو بھی روش اختیار کرے گا وہ کائنات کی روش سے ہم آہنگ نہ ہوگی اور وہ کائنات میں اس کے ایک جزء کی حیثیت سے عمل نہ کر سکے گا۔

أَفَغَيْرَ دِينِ اللَّهِ يَبْغُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ○ (آل عمران: ۸۳)	کیا اللہ کے دین کے سوا یہ کوئی دوسرا دین ڈھونڈتے ہیں حالاں کہ اس کے سامنے جھک چکی ہیں وہ ساری چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں خوشی سے یا جبراً اور اسی کی طرف یہ سب لوٹائے جائیں گے۔

انسان کی زندگی میں آزادی ہے اس کو کسی خاص طریقہ کا پابند نہیں بنایا گیا ہے بلکہ جو طریقہ مطلوب ہے اس کے خلاف عمل کی اس کے اندر قوت ہے۔ لیکن یہ آزادی انسان کو ایک محدود دائرہ میں حاصل ہے اس محدود دائرہ سے باہر کائنات میں پھیلے ہوئے قوانین اس کی ذات پر حکومت کرتے ہیں اس کا وجود اجزاء کائنات سے ترکیب پاتا ہے۔ کائنات کی گردش اس کو بچپن سے جوانی اور جوانی سے بوڑھاپے تک کے مختلف مراحل سے گزارتی ہے۔ اس کی موت و حیات اسباب کائنات کے ساتھ وابستہ ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان کی آزاد زندگی کو اس اقتدار اعلیٰ کے تابع ہونا چاہیے جو پوری کائنات پر قائم ہے اس سے کائنات میں انسان کی صحیح ترین حیثیت متعین ہوتی ہے اور وہ ایک عظیم کل کا بہترین جزء قرار پاتا ہے۔ انسان آزادی کو چھوڑ دے اور خدا کا غلام بن جائے تو وہ کائنات کا ایک ایسا جزء ہے جو اپنے کل سے پوری طرح جڑا ہوا ہے لیکن اگر وہ خدا کی غلامی سے انکار کرتا ہے تو اس نظام کائنات سے کٹ جاتا ہے اور جو چیز نظام کائنات سے کٹ جائے وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتی کیوں کہ یہاں بقا اور کامیابی اسی چیز کے لئے ہے جس کی رفتار کائنات کی رفتار سے مل کر بالکل ایک ہو جائے۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا	اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی دوسرا

فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (آل عمران: ۸۵)

دین چاہے تو وہ اس سے ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں خسارہ اٹھانے والوں میں ہوگا

انسان کو زندگی کے جس حصہ میں آزادی ملی ہے اس کو وہ اپنی بدعملیوں سے ناپاک کر رہا ہے لیکن اس کو اس کا احساس تک نہیں آج اگر اس کی شکل و صورت مسخ ہو جائے تو اس پر موت کی اداسی چھا جائے لیکن اس کی سیرت مسلسل مسخ ہو رہی ہے اور اس کی زندگی سے انسانیت کا جوہر ختم ہو رہا ہے لیکن اس کو کوئی غم نہیں ہے ہم اس واقعہ سے کیسے انکار کریں کہ انسان اپنا صحیح مقام چھوڑ چکا ہے اور انتہائی بھیانک انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ خدا سے بغاوت نے اس کو منزل سے بھٹکا دیا ہے اور وہ حقیقت سے بہت دور جا پڑا ہے۔ وہ ایک گم کردہ راہ مسافر ہے جس کے سامنے موت اور تباہی کے سوا کچھ نہیں معصیت کی وجہ سے اس کی زندگی فتنہ و فساد سے بھر گئی ہے اور وہ سکون اور چین سے محروم ہو لیکن اس کے باوجود جس کائنات میں وہ رہتا ہے وہ فتنہ و فساد اور ظلم و زیادتی سے محفوظ ہے کہیں کسی قسم کی اونچ نیچ اور بے انصافی کا شائبہ تک نہیں ہے جدھر دیکھئے عدل و انصاف اور حیرت انگیز اعتدال پایا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات خدا کی بندگی میں لگی ہوئی ہے یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اگر انسان خدا کا غلام بن جائے تو اس کو بھی امن و سکون کی دولت نصیب ہوگی اس کی زندگی سے بھی فتنہ و فساد ختم ہوگا۔ اس کی دنیا سے بھی بلندی و پستی کے تمام جھوٹے معیارات ختم ہوں گے اور ہر طرف ایک بے مثال توازن قائم ہوگا۔ جس دن ایسا ہوگا خدا کی زمین خدا کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور فرشتے اس کو مبارک باد کہیں گے کہ اس نے اس حق کو پالیا ہے جس پر یہ زمین و آسمان قائم ہیں اور حق کا پانا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○

جناب محمد فاروق خاں صاحب

ہمارے بعض ہندو بھائی گوشت خوری کی سخت مخالفت کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک گوشت کھانا یا مچھلی کا شکار کرنا رحم و انصاف کے قطعاً منافی ہے۔ وہ کہتے ہیں حیوانات، پرندے اور مچھلیاں جان رکھتی ہیں انھیں اپنی غذا بنانا بے زبانوں پر کھلا ہوا ظلم ہے۔ جانوروں کو ذبح کرنا اور ان کا گوشت اپنے استعمال میں لانا جذبۂ ہمدردی اور انسانیت کے خلاف ہے۔ انسان کو اپنی غذا گیہوں، چاول وغیرہ اناجوں اور پھل ترکاریوں تک محدود رکھنی چاہیئے۔

گوشت خوری کے بارے میں اوپر جس نقطۂ نظر کا ذکر میں نے کیا ہے، اسے کسی غور و فکر کا نتیجہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس طرح کا نقطۂ نظر اپنے اندر فکر و نظر اور تجربہ کی کوئی گہرائی نہیں رکھتا۔ یہ ایک ایسا نقطۂ نظر ہے جو صرف ان ذہنوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکتا ہے جو سوچنے اور غور کرنے کے عادی نہیں ہوتے۔

غذائی اور اقتصادی نقطۂ نظر سے گوشت کا مقام

اگر رحم و انصاف کا یہ نقطۂ نظر تسلیم کر لیا جائے جس کی بنا پر گوشت خوری کو خلافِ انسانیت قرار دیا جاتا ہے تو دنیا میں انسان کا جینا مشکل ہو جائے۔ کسی ملک کے باشندوں کی غذا عموماً اس ملک کی آب و ہوا اور پیداوار پر منحصر ہوتی ہے۔ دنیا میں کثیر انسانوں کی زندگی کا دار و مدار گوشت پر ہے۔ جانور تقریباً سبھی ملکوں میں پالے جاتے ہیں۔ ایسے ممالک جہاں کھیتی نہیں ہو سکتی اور جہاں گھاس کے بڑے بڑے میدان پائے جاتے ہیں وہاں لوگ بھیڑ بکری اور دوسرے جانور گوشت کے لئے پالتے ہیں۔ گوشت کی تجارت بھی کی جاتی ہے دنیا میں سب سے زیادہ گوشت جنوبی امریکہ میں تیار کیا جاتا ہے۔ وہاں سے دوسرے ملکوں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ممالک متحدہ امریکہ اور یورپ کا نمبر ہے۔ یورپ میں اس کے لئے ڈنمارک، آئیلنڈ اور بلجیم مشہور مقامات ہیں۔ اٹلی، جرمنی، امریکہ، اسپین، فرانس، ہالینڈ اور بلجیم وغیرہ میں زیادہ

گوشت رکھا جاتا ہے۔ گوشت کے کارخانوں میں گوشت بجلی کے ذریعہ کافی وقت تک تازہ رکھا جاتا ہے گوشت کے علاوہ جانور بھی ایک ملک سے دوسرے ملک کو بھیجتے ہیں تاکہ ان سے تازہ گوشت حاصل کیا جا سکے؛

گوشت کی طرح دنیا کے تمام ملکوں میں مچھلی بھی کھائی جاتی ہے۔ ایسے ملکوں میں جو سمندر کے کنارے واقع ہیں یا جن میں دریا جھیل وغیرہ زیادہ ہیں بآسانی مچھلیاں حاصل ہو جاتی ہیں۔ سمندر کی مچھلیاں ایک مرتبہ میں لاکھوں انڈے تک دیتی ہیں۔ مچھلیاں اتھلے سمندروں میں ساحلوں پر اور دریاؤں کے موہانوں پر زیادہ ملتی ہیں۔ اتھلے سمندروں میں مچھلیوں کو کھانے کے لئے کافی چارہ مل جاتا ہے۔ اسی وجہ سے شمالی مغربی یورپ شمالی امریکہ اور شمالی مشرقی ایشیا میں مچھلیاں زیادہ پکڑی جاتی ہیں۔ گوشت کی طرح مچھلیوں کی بھی تجارت کی جاتی ہے۔ مچھلیوں کے شکار کے لیے برطانیہ ممالک متحدہ امریکہ، ناروے، جرمنی، کناڈا اور جاپان وغیرہ ممالک بہت مشہور ہیں۔ جاپان میں جتنی مچھلیاں ملتی ہیں اتنی دنیا میں کسی ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ جاپان میں کھیتی بھی کم ہوتی ہے۔ مچھلی جاپانیوں کی خاص خوراک ہے۔

چین اور جاپان میں مچھلیاں پکڑنے کا کام پرانے زمانے سے چلا آرہا ہے۔ وہاں بہت سے لوگوں کا پیشہ ہی مچھلیاں پکڑنا ہے۔ انگلینڈ میں بھی کافی مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ اور وہاں سے یورپ کے مختلف ملکوں کو بھیجی جاتی ہیں؛

گرین لینڈ اور شمالی امریکہ کے ساحلوں پر بسنے والی قوم اسکیمو کی غذا کا مسئلہ قدرت نے مچھلیوں ہی کے ذریعہ حل کیا ہے۔ اسکیمو کے یہاں نہ باغات ہیں نہ کھیت اور مویشی۔ یہ لوگ سمندر کے کنارے رہتے ہیں۔ سیل، وہیل اور والراس مچھلیوں پر ان کی زندگی کا دارومدار ہے۔

وہیل (Whale) ایک بہت بڑی بحری مچھلی ہے ایک ایک وہیل سے ٹنوں چربی نکلتی ہے یہ مچھلیاں دراصل دریائی جانور ہیں کھانا، کپڑا، ٹوپی، گرمیوں میں رہنے کے لئے خیمے اور دوسری بہت سی ضروریات زندگی اسکیمو انھیں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں تیل کی جگہ سیل کی چربی لیمپ میں جلاتے ہیں۔ اسی پر سیل گوشت پکاتے ہیں۔ اس کی گرمی بہت سخت ہوتی ہے۔ ان کے یہاں ایک طرح کا بارہ سنگھا بھی پایا جاتا ہے اسکیمو تیر کمان سے اس کا شکار کرتے ہیں۔

جانوروں کے ذریعہ انسان گوشت کے علاوہ کھال اور چربی وغیرہ بھی حاصل کرتا ہے۔ پالتو

کا کاڈ لیور آئل (Cod Liver oil) ایک مچھلی کی چربی ہے۔ گوشت اور چربی کی طرح ریشم کے حصول کے لیے بھی ریشم کے کیڑوں کو موت کی تکلیف دینی پڑتی ہے۔ ریشم کے کیڑے کی زندگی کی تین حالتیں ہوتی ہیں۔ انڈے سے جب کیڑا نکلتا ہے تو اسے لارڈا ( ) کہتے ہیں۔ لاروا اپنی پوری نمو پر آنے کے بعد اپنے گرد ریشم کے تاگے بنا کر لپیٹ لیتا ہے۔ اس پوری ساخت کو ریشم کا کویا (Silk cocoon) کہتے ہیں۔ اس کے بعد کیڑے کی نیم جان کی سی حالت ہو جاتی ہے۔ جسے پیوپا (Pupa) کہتے ہیں کیڑا اسی حالت میں عرصہ تک پڑا رہتا ہے۔ اس کے بعد جب باہر نکلتا ہے تو تتلی جیسی اس کی شکل ہوتی ہے اس کو (Moth) کہتے ہیں۔ ریشم حاصل کرنے کے لئے کوئے کو ہی گرم پانی میں ابال کر کیڑے کو مار ڈالتے ہیں۔ تب اس ریشم کو کاٹ کر ریشمی سوت تیار کرتے ہیں۔

جانوروں کو ذبح کرنا یا ان کا شکار کرنا اگر ممنوع قرار دیدیا جائے تو بے کار اور ناکارہ مویشی اور نیل گائے اور ہرن وغیرہ جنگلی جانور کسی بھی ملک کے لئے اور خاص طور پر زراعتی ملکوں کے لئے ایک مسئلہ بن جائیں گے۔ آسٹریلیا میں خرگوش باہر سے لے جاکر چھوڑا گیا تھا۔ لیکن بعد میں وہاں خرگوشوں کی اتنی کثرت ہوگئی کہ وہ کھیتوں کے لئے مصیبت بن گئے۔ خود ہندوستان میں آج اتنی کثیر تعداد میں بے کار مویشی اور آوارہ گائیں موجود ہیں کہ ان کی وجہ سے ملک کو کروڑوں روپیوں کا نقصان پہنچتا ہے۔ اچھے بیلوں کی طرح اچھی گایوں کی بھی کمی ہوتی جا رہی ہے۔ بعض سادہ لوح قسم کے لوگ کہتے ہیں کہ اگر گائے ہندوستان میں ذبح نہ کی جائے تو یہاں پہلے کی طرح دودھ کی نہریں جاری ہو سکتی ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ دودھ کی کمی میں اصل دخل اچھی نسل کی گایوں کی کمی اور ان کی داشت اور پرورش کے مناسب انتظام نہ ہونے کو ہے امریکہ وغیرہ میں ناکارہ اور بے کار گائیں ذبح ہو جاتی ہیں لیکن دودھ کی مقدار میں کمی کے بجائے وہاں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ اگر انسان گوشت اور مچھلی وغیرہ کھانا چھوڑ دے تو اس کا اس کی معاشیات پر بہت برا اثر پڑے گا۔ نہ صرف یہ کہ اس طرح انسان خدا کی ایک بہت بڑی نعمت سے محروم ہو جائے گا۔ بلکہ وہ چند در چند مصیبتوں میں مبتلا ہو جائے گا۔

انسانی احساس اور تاریخ کا فیصلہ

اوپر کی تفصیل سے یہ بات کھلکر سامنے آجاتی ہے کہ انسانی آبادی کا کثیر حصہ گوشت خوری کو ایک جائز کام سمجھتا ہے

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ انسان گوشت کو غذا کے طور پر ہمیشہ سے استعمال کرتا آ رہا ہے ویدک زمانہ میں ہندوستان کے لوگ گوشت کھاتے تھے۔ تیر کمان سے جانوروں کا شکار کرنے کا رواج تھا رام چندر جی سے سیتا جی کا ہرن کے شکار کا مطالبہ کرنا اور ان کا ہرن کے شکار کے لئے باہر نکلنا تلسی داس کے بیان سے ثابت ہے۔ اس کے علاوہ راجہ دسرتھ کا ہرن سمجھ کر سرون کمار کو تیر مارنا بغیر کسی اختلاف کے روایتوں سے ثابت ہے۔

بہرحال انسانی احساس کا فیصلہ ہمیشہ گوشت خوری کے حق میں رہا ہے کچھ تھوڑے لوگ اگر اس کے خلاف رائے رکھتے ہیں تو اس کا اس فیصلہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بعض لوگوں نے اپنی ایک خاص طبیعت بنالی ہے جو سراسر مصنوعی ہے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ مچھلی گوشت اور انڈا بھی ایک شریف آدمی کی غذا ہو سکتے ہیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ انسان کی سب سے پہلی غذا گوشت اور خون ہی ہے۔ رحم مادر میں ماں کے گوشت و خون سے ہی اس کی پرورش ہوتی ہے۔ انڈے میں بچے پہلے زردی سے ہی پلتے اور بڑھتے ہیں۔ پودا پہلے بیج ہی کے اندر موجود غذائی مادہ کو کھا کر بڑھتا ہے۔

بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ شیر اور باز وغیرہ کے لئے تو گوشت کھانا روا ہے اس لیے کہ خدا نے انھیں اس طرح کے دانت اور پنجے وغیرہ دیئے ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ شکاری حیوان ہیں۔ لیکن انسان کو خدا نے درندوں کی طرح پنجے اور دانت نہیں دیئے اس لیے گوشت خوری انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔ اس طرح کی باتیں کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ خدا نے اگر انسان کو چیرنے پھاڑنے والے دانت اور پنجے نہیں دیئے ہیں تو اس کے بدلے اسے عقل اور سوجھ بوجھ عطا فرمائی ہے جس کے ذریعہ وہ اپنے استعمال کے لئے اچھے سے اچھا ہتھیار بنا سکتا ہے۔ خدا نے اگر جانوروں کو سردی سے بچنے کے لیے موٹی کھال دی ہے اور اس پر گھنے بال پیدا کئے ہیں تو انسانوں کو اس نے عقل دی ہے جس سے کام لے کر وہ اپنے لئے عمدہ سے عمدہ شال اور کمبل تیار کر سکتا ہے۔ اونی لباس پہنکر سردی سے اپنے کو بچا سکتا ہے۔ جانوروں کے جسم پر ان کے اون اور بالوں کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نتیجہ نکالنے لگ جائے کہ انسان کو اونی کپڑے استعمال نہیں کرنے چاہئیں۔ یہ اون اور بال اگر انسان کے لیے ہوتے تو قدرت خود انسان کے جسم کو اس سے آراستہ رکھتی ظاہر ہے کہ اس طرح کا خیال حد درجہ مضحکہ خیز ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلام نے بعض جانوروں کو کیوں حرام قرار دیا ہے

مثلاً خنزیر کو شدت کے ساتھ قرآن نے حرام ٹھہرایا ہے۔ دراصل خنزیر اور اس طرح کے جانوروں کو اسلام نے اخلاقی نقطۂ نظر سے حرام قرار دیا ہے۔ غذا کا بھی انسان کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے۔ خنزیر کا گوشت ہمارے اندر بے حیائی پیدا کرتا ہے۔ اس کے استعمال سے آدمی کا اخلاق حد درجہ پست ہو جاتا ہے۔ خنزیر ایک بے حیا جانور ہے۔ اس کی بے حیائی کا مقابلہ شاید ہی کوئی دوسرا جانور کر سکے۔ مادہ خنزیر کے گرد بہت سے خنزیر جمع ہو کر باری باری اس کے ساتھ جفتی کرتے ہیں یہ بے حیائی اور بے غیرتی کی انتہا ہے۔ جو شاید ہی کسی دوسرے جانور میں پائی جاتی ہو۔

درندوں کے گوشت کی حرمت میں بھی حرمت کی اصل وجہ طبی نہیں بلکہ اخلاقی ہے۔ ان کا گوشت ہمارے اندر درندگی اور قساوت پیدا کرنے والا ہے۔ خونخواری اور درندگی ظاہر ہے انسانیت کی ضد ہے۔

رحم و انصاف کی بات

جو لوگ جانوروں کے ذبح کرنے کو بے رحمی قرار دیتے ہیں ان کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ وہ جانوروں اور انسان کو ایک سطح پر رکھ کر سوچتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جس طرح انسان جان رکھتا ہے اسی طرح دیگر حیوانات اور مچھلیاں بھی جان رکھتی ہیں۔ انھیں ذبح کر کے اپنی غذائی ضرورت پوری کرنی یہ انسان کی بے انصافی ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ اس عالم کے پیدا کرنے سے اصل مقصود جانوروں کو پیدا کرنا نہیں ہے۔ اس عالم کا مقصود انسان ہے انسان اس کارخانۂ عالم میں امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ اگر انسان کو اس کائنات سے جدا کر دیا جائے تو یہ دنیا بالکل بے نور ہو کر رہ جائے گی۔ اس کائنات کی ساری دلربائی اور محبوبیت یہاں کا سارا ساز و سامان انسان کے بغیر بے معنی ہے۔ ایک انسان ہی کا وجود ہے جس کے سبب کائنات کی ہر شے میں معنویت اور مقصدیت کی روح دوڑ رہی ہے۔ انسان کا اپنا وجود خدا کے تعلق سے بامعنی و بامقصد قرار پاتا ہے دنیا کی ساری چیزیں انسان کے لئے پیدا کی گئی ہیں چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے:

خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا — خدا نے زمین کی ساری چیزیں تمہارے لئے پیدا کی ہیں!

الم تروا ان اللہ سخر لکم ما فی السماوات وما فی الارض (کیا تم نے دیکھا نہیں کہ) کائنات کی چیزیں تمہارے لئے مسخر کی ہیں اسے مسخر فرمایا گیا ہے۔ ساری کائنات خدا نے انسان کے

لئے پیدا کی ہے۔ انسان کو عقل اور سوجھ بوجھ اس لئے دی گئی ہے کہ وہ اپنی عقل اور تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے کام میں لائے خدا کی کسی نعمت کو حرام قرار دینا خود ایک بہت بڑا ظلم ہے جس کی طرف لوگوں کا دھیان نہیں جاتا۔ گوشت خوری کی مخالفت خدا کی ایک بہت بڑی نعمت کا انکار ہے۔ خدا نے انسانوں کے فائدے کے لئے اگر جانور پیدا کیے ہیں تو وہ ان سے پورا فائدہ اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ ان سے وہ بار برداری کا کام لے سکتا ہے۔ انھیں اپنی سواری کے کام میں لا سکتا ہے ان کے چمڑے سے بھی فائدہ اٹھا سکتا ہے جانوروں کا گوشت اگر غذا ہے اور یقیناً غذا ہے۔ تو پھر انھیں غذا کے طور پر استعمال کرنا بھی انسان کے لئے بالکل جائز ہونا چاہیئے۔

رہا یہ سوال کہ ذبح کے وقت جانور کو تکلیف ہوتی ہے اسے گوارا کرنا بے رحمی کی بات ہے۔ خدا کی رحمت سے یہ بالکل بعید ہے کہ وہ انسان کو ایذا رسانی کا حکم دے۔ رحمت کا یہ تصور ایک خود ساختہ تصور ہے جس کو حقیقت سے کوئی لگاؤ نہیں۔ ایسی تکلیف جس کے پیچھے کسی عظیم حکمت و مصلحت کی کارفرمائی ہو، ہرگز رحم و انصاف کے منافی نہیں۔ بچہ کے پھوڑے پر نشتر لگانے کی وجہ سے جراح پر بے رحمی و قساوت قلبی کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ نشتر سے بچہ کو تکلیف یقیناً ہوتی ہے لیکن اسے بے رحمی پر محمول کرنا نادانی ہے۔

اس کائنات میں عظیم مصلحتوں کے تحت زندگی کے ساتھ موت کا قانون بھی نافذ ہے۔ یہاں صحت کے ساتھ بیماری اور آرام کے ساتھ تکلیف کا اصول بھی کارفرما ہے۔ انسان دنیا میں مشقت میں ڈالا گیا ہے۔ یہ انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری بھی تھا۔ اگر انسانی حیات خدا کی بے پایاں رحمت کا اظہار ہے تو موت میں بھی اس رحمت کی کارفرمائی ہے۔ موت سے حقیقی حیات کا دروازہ کھلتا ہے۔ جانوروں کو ذبح کرنے کی اجازت دیکر خدا نے انسانوں پر اپنی خاص عنایت کا اظہار فرمایا ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ خدا کو اپنی مخلوق پر ہر تصرف کا حق حاصل ہے۔ تعجب ہے اگر جانور اپنے کھونٹے پر بیماری وغیرہ سے مر جائے تو کوئی یہ نہیں کہتا کہ خدا کا معاملہ اپنی مخلوق کے ساتھ بے رحمی کا ہے کہ اس نے مخلوقات کو موت کی تکلیف سے نجات نہیں بخشی۔ لیکن اگر یہی تکلیف جانور کو ایک واضح مقصد یعنی گوشت کے حصول کے لئے دی جائے۔ تو اسے قابل اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ حالاں کہ ذبح کر دینے سے جان کے نکلنے میں عام حالت کے مقابلہ میں کہیں زیادہ آسانی ہوتی ہے۔

جو لوگ موت اور موت کی مصیبت کو قابل اعتراض خیال کرتے ہیں۔ ان کا اعتراض در اصل یہ ہوتا ہے کہ مخلوقات کو ایسی دنیا میں کیوں پیدا کیا گیا جہاں زندگی کے ساتھ موت سے بھی سابقہ پیش آتا ہے۔ اس دنیا میں کسی کے لامحدود مدت تک جیتے رہنے کے امکانات نہیں پائے جاتے سورج جو ہمارے لے سرچشمۂ حیات ثابت ہو رہا ہے۔ ہر لمحہ اس کی ۴۲ لاکھ ٹن دھاتیں فنا ہو کر توانائی کی شکل میں تبدیل ہو رہی ہیں۔ جس کے سبب ایک عرصہ کے بعد ہی سہی ایک ایسا مرحلہ آئے گا کہ سورج موت کے گھاٹ اتر جائے گا۔ اس کی ساری حرارت اور توانائی ختم ہو چکی ہوگی۔ قمر بے نور ہو جائے گا۔ نظام شمسی درہم برہم ہو چکا ہوگا۔ انسانی جسم کی طاقت کو بحال رکھنے کی لاکھ کوششیں ہوں لیکن اس ضعیف وجود میں دائمی مدت تک جینے کے امکانات نہیں پائے جاتے۔

اس فانی دنیا میں موت سے گریز اور دائمی حیات کا مطالبہ کائنات کے بنیادی مقاصد سے بے خبری کا نتیجہ ہے البتہ اس ناپائیدار کائنات کی تخلیق کی حقیقی غرض و غایت کوئی وقتی اور ہنگامی نوعیت کی چیز نہیں ہے۔

یہ خدا کی رحمت کاملہ کا اظہار ہے۔ بشرطیکہ انسان اپنی بصیرت کی نگاہ سے کام لے۔ انسانی زندگی ایک ایسی ترقی یافتہ دنیا کی متقاضی ہے جہاں صرف حیات کے قانون کی کارفرمائی ہو جہاں حیات کے ساتھ موت کا قانون نافذ نہ ہو۔ انسان کو اس زندگی کے بعد ایک ایسی ترقی یافتہ دنیا میں بسایا جائیگا جہاں وہ دائمی حیات کا مالک ہوگا۔ لیکن موجودہ دنیا میں تو موت ایک ایسا لازمی مرحلہ ہے جس سے بہر حال ہر ایک شخص کو گزرنا ہے۔ انسان کے علاوہ دوسری مخلوقات تو انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ انھیں انسان کی زندگی کی بدولت ہی زندگی ملی ہے۔ جب انسان کی موت کو بے رحمی پر محمول نہیں کر سکتے تو دوسری مخلوقات کی موت کو بے رحمی و بے انصافی کا نتیجہ قرار دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِمَا كَسَبُوا مَا تَرَكَ عَلٰى ظَهْرِهَا مِنْ دَابَّةٍ	اور اگر اللہ لوگوں کے اعمال کے سبب ان کا مواخذہ کرنے لگ جائے تو وہ کسی جاندار کو زمین پر نہ رہنے دے۔

جناب میں بھی انسان کی فضیلت بیان کی جا رہی ہے۔ کہ جب انسان ہی نہیں رہے گا تو دوسرے

حیوانات زمین پر کس کے لئے باقی رکھے جائیں گے۔

موت خدا کی عظیم نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ دوسری تمام چیزوں کی طرح سب کی زندگیاں بھی خدا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ وہ جب چاہے کسی کی بھی زندگی چھین سکتا ہے۔

کائنات، کائناتی اشیاء اور کائنات میں ہونے والے واقعات کی اصل حیثیت یہ ہے کہ وہ خدا کی نشانیاں ہیں۔ کائنات اور اس کی تمام چیزوں سے اہل نظر کو جو اصل فائدہ پہنچتا ہے وہ مادی نہیں اخلاقی فائدہ ہے۔ موت میں ہمارے لئے بے شمار اخلاقی فوائد ہیں۔ دنیا میں جتنے ... مضرت رساں جانور کیڑے اور جراثیم پائے جاتے ہیں ان میں ہمارے لئے بیش از بیش عبرت کا سامان موجود ہے۔

اگر دنیا میں مصائب اور تکالیف کا وجود نہ ہوتا تو ہم عذاب الٰہی اور خدا کے قہر و غضب کا کوئی تصور نہ کر سکتے۔ دنیا کے سانپ بچھو، تکلیف دہ سردی اور لو آگ کی لپٹیں اور سرخ انگارے ہمیں خدا کے عذاب کی یاد دلاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح خوشگوار فضا، حسین مناظر، دنیا میں پائی جانے والی انواع و اقسام کی نعمتیں خوش ذائقہ پھل اور خوش رنگ و مشکبار پھول ہمیں خدا کی رحمت اس کی نظر عنایت اور اس کے ان انعامات کی یاد دلاتے ہیں جن کا وعدہ اس نے اپنے وفادار بندوں سے کیا ہے

دنیا میں خدا کی جو عظیم حکمتیں کارفرما ہیں ان کا احاطہ ممکن نہیں۔ قرآن اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں اس سے متعلق جو اشارے ملتے ہیں ہمارے اطمینان کے لئے وہ بہت کافی ہیں جب کسی عمل کے پیچھے کسی حکمت و دانائی کی کارفرمائی ہو تو اسے خلاف عدل و انصاف اور رحمت و شفقت کے منافی سمجھنا نا سمجھی کی بات ہے۔

انسان کی موجودہ زندگی ایک امتحانی دور ہے۔ انسان کے اندر قہر و غضب کا جذبہ بھی رکھا گیا ہے اور رقت و نرمی، دلسوزی و ہمدردی کا جذبہ بھی۔ دونوں قسم کے جذبات سے مقصود انسان کا امتحان ہے۔ انسان خواہ غم و غصہ کی حالت میں ہو یا ایسی حالت میں ہو کہ اس پر رقت و ہمدردی کا جذبہ طاری ہو اسے ہر حال میں خدا کی اطاعت کرنی ہے۔ خدا کی معبودیت کا تقاضا ہے کہ اس کی اطاعت و بندگی کے احساس کو اپنے دوسرے تمام احساسات پر غالب رکھا جائے۔ اپنے جانوروں کو خدا کی خاطر جو نثار کر دیا گیا

اس کا اشارہ ہو تو اپنے بیٹے کے گلے پر چھری چلا دینی بھی اپنی بندگی کا عین تقاضا ہے۔ بلکہ ضرورت متقاضی ہو تو خود اپنی جان بھی خدا کی راہ میں قربان کر دینی عین ایمان و محبت ہے جس سے شفقت و رحمت کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ جس سے انسان سعادتمندی کے درجے تک پہنچتا ہے۔

گوشت خوری کو جائز قرار دینے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اسلام انسانوں کو بے رحمی کی تعلیم دینے آیا ہے۔ اسلام خدا کی مرضی کا دوسرا نام ہے۔ خدا سے زیادہ شفقت و محبت کی تعلیم کون دے سکتا ہے۔ خدا کے رسول کی تعلیم تو یہ ہے کہ جو شخص خود پیٹ بھر کر کھائے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا رہ جائے تو اس کے پاس ایمان ہی نہیں ہے؟ آپؐ سے سوال کیا گیا کہ اسلام کیا ہے؟ فرمایا "پاکیزہ گفتار اور (بھوکے لوگوں کو) کھانا کھلانا"۔ پوچھا گیا افضل ایمان (یعنی معیاری قسم کا) کون سا ہے۔ ارشاد ہوا جس کے ساتھ پسندیدہ اخلاق بھی موجود ہو۔ آپ کا ارشاد ہے کہ زمین میں بسنے والوں پر رحم کرو تو آسمان پر رہنے والا خدا تم پر رحم کریگا۔

لطف و احسان کی تعلیم صرف انسانی دنیا تک محدود نہیں رکھی گئی بلکہ جانوروں تک کے بارے میں ہم سے شفقت و مروت کا مطالبہ کیا گیا ہے:۔

حضرت عبداللہ ابن عمر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک عورت کو ایک بلی کے سبب عذاب دیا گیا اس نے بلی کو باندھ رکھا تھا اسے کھانے کے لیے کچھ نہیں دیتی تھی اور نہ اس کو چھوڑتی تھی وہ بلی بھوکی پیاسی مر گئی۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک بدکار عورت کی مغفرت ایک کتے کی وجہ سے ہوئی۔ اس نے دیکھا کہ وہ ہانپ رہا ہے، اور پیاس کی وجہ سے قریب المرگ ہے۔ اس عورت نے اپنا موزہ ڈال کر پانی بھرا اور اس کو پلایا۔ اس کے سبب خدا نے اسے بخش دیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول ہمیں جانوروں کی وجہ سے بھی اجر ملے گا۔ فرمایا ہر ایک جاندار کی وجہ سے اجر دیا جائے گا۔

حضرت شداد ابن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ جب تم قتل کرو تو اچھے طریقے پر اور جب ذبح کرو تو سہل طریقہ پر۔ اپنی چھری وغیرہ کی دھار کو تیز کر لو اور ذبیحہ کو تکلیف نہ دو۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلعم نے حیوان کو قتل کرنے میں زیادہ وقت صرف کرنے سے منع فرمایا ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ جو شخص کسی ذی روح کو نشانہ مشق بنائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر لعنت کی ہے۔

حضرت جابرؓ کا بیان ہے کہ حضور صلعم نے چہرے پر مارنے اور داغ لگانے سے منع فرمایا ہے۔

جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ اسلام کی کوئی تعلیم ایسی نہیں ہے جو اعتدال سے ہٹی ہوئی ہو۔ اسلام نے بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا تو ساتھ ہی ان سرکشوں کے لیے سزا کا حکم بھی دیا جو پاکیزہ تعلیم و تلقین کی کوئی پرواہ نہیں کرتے اور زمین میں فتنہ و فساد کی بنا ڈالتے ہیں۔ خدا نے حکم دیا ہے کہ انسان اپنے جان و مال کی حفاظت کرے لیکن اگر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے جان و مال کی قربانی کی ضرورت پیش آجائے تو اس سے بھی دریغ نہ کرے۔

جانوروں کے ساتھ بہتر سلوک کا حکم دیا گیا ہے لیکن انسان کا یہ حق بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ جانوروں کو بہتر طریقے پر اپنے کام میں لائے۔ اس لیے کہ تالاب کی مچھلیاں ہوں یا جانور اور پرندے ہوں۔ سب انسان کی خدمت کے لیے ہیں۔ یہ انسان کی سرکشی ہوگی کہ وہ خدا کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے خدا کی اس تنظیم پر جو اس نے اپنی نعمتوں کے سلسلے میں قائم رکھی ہے۔ اعتراض کرنے لگ جائے۔ خدا کے حکموں کی پیروی کے بجائے اپنی خواہشات کو اپنا معبود بنالے۔ خدا کو چھوڑ کر درختوں اور جانوروں وغیرہ پر اپنی عقیدتیں نثار کرنے لگ جائے۔ اس طرح کی ذہنیت کے ساتھ انسان کبھی بھی حقیقت تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ جانوروں کو ذبح کرنے کا خدا نے ہمیں حکم دیا ہے۔ اس حکم کے پیچھے خدا کی عظیم حکمتیں و مصلحتیں کارفرما ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں۔ ذبح کے عمل سے روحانی فائدے بھی انسان حاصل کرسکتا ہے اسی لیے اس موقع پر خدا کا نام لینا بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔ قربانی تمام قدیم مذاہب میں تقرب الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ قربانی کا منشا اپنے نفس کو خدا کے حوالے کرنا ہے۔ یہ خارج میں تسلیم و اطاعت کے جذبے کا کامیاب اظہار ہے۔ جو خدا کو نہایت محبوب ہے۔ یہ روح کی تہذیب و تربیت کا کامیاب ذریعہ ہے۔ نماز اگر خدا کے اطاعت گزار بندے کی زندگی کی سچی تصویر ہے تو قربانی خدا کی راہ میں اس کی موت ہے۔ ایسی موت جو خدا کی راہ میں آئے اپنے اندر ہزار زندگیوں کا سامان لیے ہوتی ہے۔ قربانی کمال درجہ خضوع اور اطاعت کا اظہار ہے۔ یہ عمل اگرچہ انسان کے ہاتھوں سے ظہور میں آتا ہے لیکن دراصل یہ فعل انسان کے اپنے دل کا ہوتا ہے۔

ہندو مذہب کا نقطۂ نظر

شکار کرنا اور گوشت کھانا ہندو روایات میں بھی داخل ہے۔ آج بھی ہندوؤں کی کثیر تعداد گوشت اور مچھلی کو اپنے لیے خدا کی عطا کردہ ایک نعمت تصور کرتی ہے۔ گوشت خوری ہندو دھرم کے خلاف نہیں۔ یہاں منوسمرتی کے چند اشلوکوں کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے جن سے گوشت خوری کی تائید ہوتی ہے۔

۱۔ کھانے کے لائق جانوروں کو کھانے سے کھانے والوں کو کوئی گناہ نہیں ہوتا اس لیے کہ کھانے کے لائق جانوروں کو اور کھانے والوں کو برہماجی (خدا) نے ہی پیدا کیا ہے۔ (۵ : ۳۰)

۲۔ راجہ کا فرض ہے کہ بہت سی قسم کی قربانیاں کرے۔ (۷ : ۸۰)

۳۔ شری برہماجی نے اپنے آپ قربانی کے لیے جانوروں کو پیدا کیا ہے اس لیے قربانی میں جو قتل ہوتا ہے وہ قتل نہیں کہلاتا۔ (۵ : ۳۹)

۴۔ جو ہنسا (قتل) اس دنیا میں وید کے حکم کے مطابق ہے اسے ہنسا (قتل) نہ سمجھنا چاہیے کیونکہ وید ہی سے دھرم نکلا ہے۔ (۵ : ۴۴)

منوسمرتی کی رو سے بلاوجہ گوشت سے پرہیز کرنے والا شخص گنہگار ہے۔ چنانچہ چوتھے ادھیائے (باب) کا ۳۵ واں منتر ہے۔

شاستر کی رو سے جو گوشت پاک ہو اسے جو آدمی نہیں کھاتا وہ پرلوک (آخرت) میں اکیس جنم تک پشو (جانور) رہتا ہے۔

رگ وید میں بھی گوشت خوری موجود ہے۔ رگ وید کے عہد میں قربانیوں کا بہت رواج تھا۔ گھوڑے کی قربانی بہت اعلیٰ سمجھی جاتی تھی لیکن گھوڑے کے علاوہ دوسرے جانوروں کی قربانی بھی ہوتی تھی بھینس اور بکری کے علاوہ گائے کی قربانی بھی مروج تھی۔ قربانی کا گوشت بہت متبرک سمجھا جاتا تھا۔

مہابھارت میں ہے کہ "راجہ برانچھ نے جگ میں فربہ گائے کو ذبح کیا۔ مہابھارت میں یہ بھی ہے کہ" دیلانتی راجہ ہر دفعہ دو ہزار گائے ذبح کرتا تھا۔ منوسمرتی میں ہے کہ" جب برہمن کا بیٹا کاشی سے بدیا (علم) حاصل کر کے آئے تو اس کا باپ اس کے استقبال کے لیے جائے اور گائے ذبح کر کے اس کی گرما گرم کھال بیٹے کے بدن پر رکھے ستیہ پوران میں لکھا ہے کہ" کوتک کے سات بیٹوں نے گائے ذبح کی اور کھائی۔ (باقی آئندہ)

نیص و تاثر

ارتقاء کا نظریہ

جناب وحیدالدین خاں صاحب

خدا اس کائنات کی ایک ایسی ناگزیر ضرورت ہے جس سے وہ لوگ بھی خالی نہیں ہو سکتے جو خدا کے منکر
۔ نظریہ ارتقاء دراصل حقیقی خدا کا ایک بدل ہے جو بے خدا مفکرین نے اپنے لیے فراہم کیا ہے۔ مگر بعض مرعوب
ہوں کی یہ سادگی حیرت انگیز ہے کہ وہ علمائے ارتقاء کو مشورہ دے رہے ہیں کہ تم اپنے مخصوص نظریے کے
ساتھ خدا کو بھی مان لو۔ اس طرح وہ تمام مشکلات خود بخود ختم ہو جائیں گی جو نظریہ ارتقاء سے متعلق سوالات
حل کرنے کے سلسلے میں عرصے سے تم کو پریشان کیے ہوئے ہیں۔ اسی کی ایک مثال جناب احسان اللہ خاں صاحب
م۔ ایس سی) کا وہ مضمون ہے جو اسلامک تھاٹ (دسمبر ۱۹۶) میں بعنوان عضویاتی ارتقاء ——
(Organic Evolution) شائع ہوا ہے۔

موجودہ سائنس علم کے متعدد میدانوں میں اپنی تحقیقات کی بنا پر اس حیثیت میں ہے کہ وہ قطعیت کے
ثابت کر سکے کہ انسانی جسم کے قدیم اجزاء جو حاصل ہوئے ہیں وہ چھ لاکھ سال قبل کے ہیں۔ اس وقت سے
تک کی انسانی تاریخ مدوّن حالت میں موجود ہے۔ یہ تاریخ معروف معنوں میں کاغذ پر لکھی ہوئی نہیں ہے
زمین کی تہوں میں ثبت ہے جس کو محققین بخوبی پڑھ سکتے ہیں۔ تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ موجودہ انسانی
یب قدیم وحشی مرحلے سے آہستہ آہستہ ترقی کر کے موجودہ مقام تک پہنچی ہے۔ دورِ وحشت میں انسان تقریباً
تھا۔ وہ پتھر کے اوزار سے شکار کرتا اور قابل خوراک جڑیں کھود کر کھاتا تھا اور انھیں کے ذریعہ اپنے دشمنوں
مقابلے میں حفاظت کرتا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے مہذب بننا شروع کیا اور جنگل کا جاندار اس قابل
۔ وہ زمین کا مالک بنے اور جدید دنیا کی تعمیر کر سکے۔

اسی طرح جسمانی حیثیت سے بھی انسان اپنی ایک سادہ حالت کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ سادہ حیوانات کے
میں تبدیلیوں نے پیچیدہ حیوانات اور مختلف انواع کی شکل اختیار کی۔ طبقات الارض کی کتاب جس طرح بتاتی ہے

ہے کہ انسان پہلے وحشی تھا اور بعد کو آہستہ آہستہ مہذب انسان بنا۔ اسی طرح جب ہم اس کتاب کے اوراق الٹتے ہیں تو اس کے ابتدائی صفحات پر ہم کو سادہ جسم رکھنے والے حیوانات کے نقش ملتے ہیں۔ پھر جوں جوں ہم اگلے صفحات کی طرف بڑھتے ہیں۔ پیچیدہ حیوانات کا سراغ ملنا شروع ہوتا ہے۔ یہ سلسلہ بڑھتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ہم موجودہ انسان جیسا جسم رکھنے والے جانداروں تک پہنچ جاتے ہیں۔

یہی ارتقاء کا تصور ہے جس کی صداقت پر موجودہ زمانے کے سائنس داں متفق ہو چکے ہیں۔ مگر ایک پیچیدگی ایسی ہے جو اب تک حل نہیں ہوئی۔ "مشاہدہ" بتاتا ہے کہ تبدیلی (**Mutation**) وہ واحد طریقہ ہے جس سے کوئی ذی حیات وجود میں آتا ہے مگر یہ تبدیلی خود کیسے وقوع میں آتی ہے۔ اس کا جواب آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ تجربہ گاہ میں طویل ترین مدت تک بہترین ساز و سامان کے ساتھ کی جانے والی کوششیں یہ ماننے پر مجبور کرتی ہیں کہ ہماری مادی دنیا کے اندر کوئی ایسی معلوم تدبیر نہیں ہے جس سے یہ تبدیلی اس حد تک لائی جا سکے کہ ایک نئی نوع وجود میں آجائے۔ ایک طرف یہ حال ہے کہ ارتقاء کا تصور تمام علمی شعبوں پر بالکل چھاتا جا رہا ہے اور ہر وہ مسئلہ جس کو سمجھنے کے لیے خدا کی ضرورت تھی، اس کی جگہ بے تکلف ارتقاء کا ایک خوبصورت بت بنا کر رکھ دیا گیا ہے اور دوسری طرف عضویاتی ارتقاء کا نظریہ، جس سے دیگر تمام ارتقائی تصورات اخذ کیے گئے ہیں۔ اس کے خلا کو پُر کرنے میں سائنس دانوں کو اس قدر ناکامی ہوئی ہے کہ اب وہ یہ کہنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ اس تصور کو ہم صرف اس لیے مانتے ہیں کہ اس کا کوئی بدل ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں سر آرتھر کیتھ (**Keith**) کا ایک قول نقل کرنا کافی ہے۔ اس نے ۱۹۵۳ء میں کہا تھا:۔

> **Evolution is unproved and unprovable. We believe it only because the only alternative is special creation, and that is unthinkable.**

یعنی ارتقاء ایک غیر ثابت شدہ نظریہ ہے اور وہ ثابت بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ہم اس پر صرف اس لیے یقین کرتے ہیں کہ اس کا واحد بدل تخلیق کا نظریہ ہے جو سائنسی طور پر بالکل ناقابل فہم ہے۔

گویا سائنس داں ارتقاء کے نظریے کو صرف اس لیے مانتے ہیں کہ اگر وہ اسے چھوڑ دیں تو لازمی طور پر انھیں خدا کے تصور پر ایمان لانا پڑے گا۔

یہی وہ مقام ہے جہاں ہمارے سائنس دانوں کے وفادار معتقدین ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اسلامک تھاٹ

کے مضمون نگار ارتقاپسندوں کی ناکامی کا ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں:۔

"زیادہ قابل قیاس بات یہ ہے کہ کوئی فطری طاقت یا خدا کا ہاتھ اس موقع پر کام کرتا ہے اور (سابق حیوانی جسم میں تبدیلیاں پیدا کرکے) ایک نئی نوع وجود میں لاتا ہے۔ یہ نئی نوع ایک مخصوص تخلیق ہوتی ہے نہ کہ محض ماحول یا ارتقائی عمل کا نتیجہ۔ ماحول وغیرہ کا عمل صرف یہ کام کرتا ہے کہ وہ نئی نوع کو مزید درست (Modify) کرتا ہے اور جس مخصوص ماحول میں کوئی نوع رہتی ہے اس کے لیے اس کو سازگار بناتا ہے" صفحہ ۴۶

اس تجویز کا مطلب یہ ہے کہ ایک خالص الحادی نظریہ، جو دلیل سے اپنی واقعیت ثابت نہ کر سکا، وہ خدا کو بھی اپنی فہرست میں شامل کرلے تاکہ اس کا الحادی فلسفہ صحیح ثابت ہو جائے۔ یہ بھی سادگی کا کمال ہے، وہ مادہ پرست علماء جنھوں نے خدا ہی سے بچنے کے لیے ارتقاء کا نظریہ گھڑا ہے، ان سے آپ فرما رہے ہیں کہ خدا کو مان لو تاکہ زندگی کے بارے میں تمہاری الحادی توجیہ مکمل ہو سکے۔ دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کو مان لو تاکہ تم کائنات کا بے خدا ہونا ثابت کر سکو۔

اب یہ سوال تھا کہ خدا بھی اس کے لیے راضی ہے یا نہیں کہ وہ ارتقاء کے فلسفے کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کر لے۔ اس کا جواب مضمون نگار کے نزدیک اثبات میں ہے۔ وہ اس پر حیرت کرتے ہیں کہ "بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان ابھی تک ارتقاء پر یقین نہیں رکھتے اور کہتے ہیں کہ آدم مکمل شکل میں پہلی بار پیدا کیے گئے تھے حالانکہ قرآن نے آدم کی پیدائش کا جو طریقہ (Process) بتایا ہے وہ ارتقاء ہی کے مختلف مراحل (Stages) ہیں جن سے گزر کر انسان اپنی موجودہ شکل تک پہنچا ہے" صفحہ ۴۷

گویا ارتقاء کا نظریہ علم الحیات کے جدید علماء کی ایجاد نہیں بلکہ وہ اس سے پہلے قرآن میں بیان ہو چکا ہے۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں انھوں نے چار آیتیں پیش کی ہیں جس میں سے پہلی آیت حسب ذیل ہے:۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ	اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ
خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ	میں کھنکھناتے سڑے ہوئے گارے سے ایک بشر
مَّسْنُوْنٍ ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ	بنانے والا ہوں پھر جب میں اس کو ٹھیک کر لوں اور
فِيْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ	اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے
(حجر ۲۸-۲۹)	سجدے میں گر پڑنا۔

اس آیت میں ان کے نزدیک ارتقا کے ان مختلف مراحل کا ذکر ہے جن سے آدمی گزر کر آخری انسانی درجہ (Human Stage) تک پہنچا ہے، حالانکہ آیت کا اس نظریے سے کوئی تعلق نہیں ــ ارتقا کا مطلب یہ ہے کہ ذی حیات ہونے کے بعد انسان کو مختلف مراحل طے کرنے پڑے ہیں۔ اس کے بعد ہی اس نے آخری انسانی جسم حاصل کیا ہے۔ جب کہ آیت میں جن مراحل کا ذکر ہے وہ دراصل وہ مراحل ہیں جو جان پتلے کو مکمل کرنے کے سلسلے میں پیش آئے۔ پتلا تیار ہونے کے بعد جب اس میں جان ڈالی گئی تو وہ ابتدا ہی کامل انسان تھا اور اس قابل تھا کہ فرشتے اس کے آگے سجدے میں گر پڑیں۔

دوسری آیت یہ ہے :-

قلنا اهبطوا منها جميعًا ج	ہم نے کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر
فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ	جب تم کو میری طرف سے ہدایت پہنچے تو جو شخص
هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا	میری ہدایت کا اتباع کرے گا اس کے لیے نہ کوئی
هُمْ يَحْزَنُوْنَ ٥ (بقرہ: ۳۸)	خوف ہے نہ کوئی غم۔

اس آیت سے انھوں نے یہ مطلب نکالا ہے کہ "آدم نہ تو کوئی پیغمبر ہیں نہ وہ ایک متعین شخص ہیں بلکہ وہ قدیم وحشی دور کے سماج کی نمائندگی کرتے ہیں۔" آیت میں "اِهْبِطُوْا" اور "جَمِيْعًا" کا لفظ ان کے نزدیک ظاہر کر رہا ہے کہ جن لوگوں کے ساتھ "ہبوط" کا مذکورہ واقعہ پیش آیا وہ دو سے زیادہ تھے اور ھدیٰ کا فقرہ بتاتا ہے کہ پیغمبر جو ان کی رہنمائی کرنے والے ہیں وہ بعد کو اس وقت آئیں گے جب یہ لوگ ارتقاء کر کے مکمل انسان بن چکے ہوں گے۔ مگر یہ تمام کی تمام بالکل بے بنیاد قیاس آرائی ہے۔

۱۔ قرآن میں دوسرے مقام پر "اهبطا" کا لفظ آیا ہے جو صریح طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ ہبوط کا واقعہ جن انسانوں کے ساتھ پیش آیا وہ بہت سے نہیں بلکہ صرف دو تھے۔ (طٰہٰ - ۱۲۳)[1]

۲۔ آدم کا پیغمبر ہونا امت کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ قرآن میں رسول کی حیثیت سے ان کے "اصطفاء" اور

---

[1] ۱۔ الخطاب لآدم وحواء لقوله تعالیٰ (قلنا اهبطا منها جميعًا) والقصة واحدة، وجمع الضمير لتنزيلهما منزلة البشر كلهم۔ (روح المعانی جلد اول، صفحہ ۲۳۶)

۲۔ خطاب لآدم وحواء والمراد هما وذريتهما لانهما لما كانا اصل الانس ومتشعبهم جعلا كانهم الانس كلهم والدليل عليه قوله (قال اهبطا منها جميعا) کشاف، جلد اول، صفحہ ۴۹

جنتاء" کا ذکر ہے۔ (آل عمران۔ ۳۳، طٰہٰ۔ ۱۲۲) حدیث میں ہے:۔

عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ قَالَ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الْاَنْبِیَاءِ کَانَ اَوَّلَ قَالَ اٰدَمُ قُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَنَبِیٌّ کَانَ قَالَ نَعَمْ نَبِیٌّ مُکَلَّمٌ (احمد)	حضرت ابو ذر کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا نبیوں میں سب سے پہلے کون تھے۔ آپ نے فرمایا۔ آدم۔ میں نے کہا یا رسول اللہ کیا وہ نبی تھے۔ جواب دیا۔ ہاں وہ نبی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان سے کلام کیا تھا۔ (یعنی ان پر صحیفہ نازل ہوا تھا۔)

۳۔ قرآن میں ہر جگہ "آدم" کا ذکر ایک فرد واحد کی حیثیت سے آیا ہے۔ کہیں بھی کوئی ایسا لفظ نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ آدم کسی متعین شخصی وجود کا نام نہیں بلکہ ایک حیوانی گروہ کا علامتی نام ہے۔ بے شک بعض مقامات پر جمع کے صیغے سے آدم وحوا کو خطاب کیا گیا ہے۔ مگر ایسا اس لیے ہے کہ آدم کو مخاطب کر کے ان کی آئندہ آنے والی پوری نسل کو پیغام دینا مقصود ہے۔ جیسے قرآن میں بعض مرتبہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ (یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ) اس طرح کی آیات میں جمع کا صیغہ اسی لیے ہے کہ رسول کو پوری امت کا قائم مقام تصور کر کے ہدایات دی گئی ہیں۔ اسی طرح آدم کو اپنی پوری نسل کا نمائندہ قرار دے کر ساری انسانیت کو خطاب کیا گیا ہے۔

تیسری آیت یہ ہے:۔

فَاَکَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی طٰہٰ۔ ۱۲۱	پس دونوں نے (ممنوعہ درخت سے) کھا لیا اس کے بعد ان کی شرمگاہیں ان پر کھل گئیں اور وہ درخت کے پتے اپنے اوپر چپکانے لگے اور آدم نے نافرمانی کی اور بہک گیا

اس آیت میں ان کے نزدیک انسان کے ابتدائی گروہ کا ذکر ہے "جس کے افراد شروع میں ننگے رہتے تھے اور اس کے بعد دوسرے مرحلے میں جب ان کا ذہن ترقی کر گیا، اس وقت انھوں نے سیکھا کہ کس طرح وہ پتے اور کھال سے اپنے جسم کی حفاظت کریں" (صفحہ ۸۴) حالانکہ آیت کے الفاظ صاف طور پر بتا رہے ہیں کہ آدم وحوا کا ننگا ہونا ابتدا سے ننگا ہونا نہیں تھا بلکہ یہ ان کے پہلے سے چھپے ہوئے ستر کا کھل جانا تھا۔ جب انھوں نے

پتّوں سے اپنے جسم کو چھپانا شروع کیا تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ برہنہ زندگی گزارتے رہنے کے بعد اب ان کی زندگی میں پوشش کا نیا ترقی یافتہ مرحلہ آیا ہے۔ بلکہ یہ سابقہ پوشش کی زندگی کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش تھی جس سے وہ "عصیان" میں مبتلا ہو جانے کی وجہ سے درمیان میں محروم کر دیے گئے تھے۔

اس آیت کی تشریح میں مضمون نگار نے دوسری غلطی یہ کی ہے کہ پتّوں سے ڈھانکنے کے عمل کا مقصد حفاظت جسم (to protect their bodies) قرار دیا ہے۔ کیونکہ نظریۂ ارتقاء کا تقاضا یہی تھا، مگر افسوس کہ قرآن کے الفاظ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ قرآن کے بیان کے مطابق اس عمل کا مقصد "شرمگاہ" کو چھپانا تھا نہ کہ جسم کی حفاظت کرنا۔

اب آخری آیت ملاحظہ ہو

وَقُلْنَا اهْبِطُوا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ	اور ہم نے کہا تم سب اترو، تم ایک دوسرے
عَدُوٌّ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ	کے دشمن ہوگے اور تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا
وَمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ (بقرہ: ۳۶)	ہے اور نفع اٹھانا ہے ایک مدت تک

یہ آیت موصوف کے نزدیک اس بات کا ثبوت ہے کہ "آدم" بندر (ape) کے جنین میں مخصوص تبدیلی کے ذریعہ پیدا ہوئے۔ وہ جنگل میں پھل حاصل کرنے کے لیے بندروں سے مقابلہ کرتے تھے، چھوٹے جانداروں کو کھاتے تھے۔ پھر بعد کو میدانی علاقے میں آئے جہاں بندر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ نتیجۃً آدم کو نشوونما اور ارتقاء کا زیادہ بہتر موقع ملا کیونکہ جنگل کے مقابلے میں میدان ان کے لیے زیادہ موزوں تھا۔"

غور کرنے کے باوجود میں سمجھ نہ سکا کہ یہ سارے نکات اس آیت میں کہاں سے نکل آئے۔ آیت کے وہ کون سے الفاظ ہیں جو یہ بتاتے ہیں کہ آدم بندر کے پیٹ سے برآمد ہوئے، بندروں کے ساتھ حصول غذا کے لیے انھیں کشمکش کرنی پڑتی تھی، اس کے بعد حالات انھیں جنگل سے میدان کی طرف لے گئے اور نئے ماحول میں ترقی کرتے کرتے بالآخر وہ "انسان" بن گئے۔ پھر اس استدلال کے مطابق یہ آیت آدم کی اس زندگی سے متعلق ہے جو "انسان" بننے سے پہلے انھیں حاصل تھی۔ مگر جس رکوع میں یہ فقرہ آیا ہے اس پورے رکوع کو پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ صورت حال بالکل الٹی ہے۔ یہ آیات بتاتی ہیں کہ آدم "خلیفہ" کی حیثیت سے پیدا کیے گئے، انھیں "اسماء" کا علم دیا گیا۔ ملائکہ نے ان کو "سجدہ" کیا۔ انھیں اس "جنت" میں ٹھہرایا گیا جو انسان کی آخری اعلیٰ قیام گاہ ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے بعد شیطان نے انھیں بہکا کر ان سے ایک غلطی کرا دی اور اس کے بعد وہ واقعہ پیش

آیا ہے کا محولہ بالا آیت میں ذکر ہے :-

قرآن سے نظریۂ ارتقاء ثابت کرنے کے لیے اوپر جس استدلال کا نمونہ آپ نے دیکھا، یہ محض قرآن تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ استدلال کی یہی وہ نادر قسم ہے جس نے سارے طبیعیاتی ریکارڈ کو ارتقاء کی دلیل بنا دیا ہے اور اس کو قیاسی مفروضہ کے مقام سے اٹھا کر سائنٹفک واقعہ کا درجہ دے دیا ہے۔ اس نام نہاد سائنسی استدلال کی بنیاد تمام تر صرف اس واقعہ پر ہے کہ طبقات الارض کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین کی نچلی تہیں اپنے اندر کم تر درجے کے حیوانات کا نشان لیے ہوئے ہیں اور اوپر کی تہوں میں اعلیٰ حیوانات کے نشان ملتے ہیں۔ یہ ترتیب دیکھ کر قیاس کر لیا گیا کہ ان میں سے ہر اگلا جاندار، پچھلے جاندار سے بطریق تناسل برآمد ہوا ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے کسی میوزیم میں سواریوں کی تاریخ بتانے کے لیے چھکڑا، گھوڑا گاڑی، موٹر، ہوائی جہاز، راکٹ ایک کے بعد ایک رکھ دیے گئے ہوں۔ ان کو دیکھ کر کوئی شخص یہ نظریہ قائم کرے کہ ان میں سے ہر اگلی سواری اپنے سے پہلے والی سواری کے بطن سے اسی طرح پیدا ہوتی ہے جیسا ایک عورت کے پیٹ سے دوسری اور دوسری کے پیٹ سے تیسری پیدا ہوتی رہتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عضویاتی ارتقاء کا یہ نظریہ احمقانہ قسم کی قیاس آرائی ہے۔ مگر جو لوگ خدا کا تصور نہیں رکھتے اور نظر آنے والی چیزوں ہی کی روشنی میں اس دنیا کی توجیہ کرنا چاہتے ہیں، وہ یہی کر سکتے تھے کہ ایک معمولی ڈھانچے کے آگے جب وہ اس سے بہتر ایک ڈھانچہ دیکھیں تو پہلے ڈھانچے کو اپنے بعد کا خالق سمجھ لیں۔ لیکن اس سے زیادہ مجھے ان لوگوں پر حیرت ہے جو خدا کو مانتے ہیں۔ ارتقاء کے بے بنیاد قیاس کے ساتھ خدا کو جوڑنے کے بجائے آپ یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ ہر نوع الگ الگ خلق کی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے ابتدائی نوع کے بارے میں آپ مانتے ہیں کہ وہ پہلی بار خلق کی گئی تھی۔ جو حقیقت ایک بار آپ کی سمجھ میں آجاتی ہے وہی دوسری بار کیوں سمجھ میں نہیں آتی۔

مضمون نگار: کنھیا لال مصر پربھاکر
مترجم: کوثر یزدانی

آزاد بھارت میں

فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہوتے ہیں؟

کنھیا لال مصر پربھاکر ہندی کے مشہور ادیب و مصنف ہیں اور اس لحاظ سے قابل قدر ہیں کہ وہ بھارت میں ہندو فرقہ واریت کا وجود تسلیم کرتے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے، انہیں لوٹنے اور قتل کرنے کو ناپسند کرتے ہیں رامپور کے مقامی ہندی ہفت روزہ پردیپ میں ان کے مضمون "آزاد بھارت میں فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہوتے ہیں؟" کا نصف اول شائع ہوا ہے جس کا ترجمہ اس لیے پیش کیا جا رہا ہے کہ قارئین کے سامنے ان فسادات کے بارے میں غیر مسلموں کا غیر جارحانہ نقطۂ نظر بھی آ جائے۔ انھوں نے بھارت کے مسلمانوں اور جماعت اسلامی جیسے اداروں کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ قومی یکجہتی اور فرقہ واریت کے بارے میں حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر اختیار نہیں کیا گیا، اگر انصاف کے ساتھ وہ اپنے نقطۂ نظر پر غور کریں تو امید ہے کہ اپنی رائے بدل دیں گے۔ مترجم

ڈاکٹری اصول کے مطابق جسم کے اندر کا فاسد مادہ امراض اور پھوڑے پھنسی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح قوم کے جسم کا فاسد مادہ فرقہ وارانہ فسادات کی شکل میں ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ اس کے ازالہ کے لیے مستعد انتظامیہ اور اس کی روک تھام کے لیے عوام کی تربیت ضروری ہے لیکن فرقہ واریت کا سر کچلنے کے لیے انتظامیہ نہایت ناکارہ ہے اور عوام کی تربیت کے معاملے میں حکومت دیوالیہ۔ میں کافی غور و فکر کے بعد ہی یہ بات کہہ رہا ہوں۔

جبل پور میں ایک لڑکی کی دو غنڈوں نے عصمت دری کی۔ لڑکی ہندو تھی، غنڈے مسلمان۔ یہ اتفاق محض تھا لیکن ہندو فرقہ واریت نے اسے اپنا رنگ دے دیا اور مدھیہ پردیش کے سات شہروں میں فسادات پھوٹ پڑے ان فسادات میں مسلمان لوٹے گئے، مکانات نذر آتش کیے گئے اور وہ سب کچھ کیا گیا جو ماضی میں وحشی کیا کرتے تھے۔ ان فسادات کی شدت کو سمجھنے کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ ساگر میں ہندی کے چند مشہور ادیب جناب بخشی

کا مکان جلا دیا گیا اور ان کی ہندی لائبریری جل کر راکھ ہو گئی۔ سوال یہ ہے کہ سات شہروں میں فسادات کرانا کوئی معمولی حادثہ نہیں لیکن اس جرم میں کتنوں کو سزا ملی ؟ اس کا جواب فرقہ واریت کے کھلنے میں انتظامیہ کی ہمدردی کا نقشہ ہی ہمیں دے گا۔

اور فسادات کے ازالے کے لیے عوام کی تربیت ؟ توبہ توبہ، عوام کی تربیت کا سب سے پہلا اور مناسب ترین مقام ہے —— ابتدائی تعلیم مگر گزشتہ ۲۰ سالوں میں اس کے ساتھ جو معاملہ ہوا ہے وہ قطعی طور پر جرم ہے۔ ملک کے والدین تڑپتے رہے ہیں کہ اپنے بچوں کو کہاں پڑھائیں ؟ میونسپلٹیاں اور پرائیوٹ اسکول تو قتل گاہیں ہیں اور عیسائی مشنریوں کے کنونٹ اول تو ہر جگہ ہیں نہیں اور جہاں ہیں بھی وہاں بعض کی رسائی نہیں اور بعض کو پسند نہیں اس صورت حال سے فائدہ اٹھایا فرقہ واریت نے اور اتر پردیش میں دوسرے پنجسالہ پلان کے دوران اپنے ششو مندروں (جن سنگھ کے زیر انتظام درس گاہیں) کی تعداد تین سے پچیس کر لی۔ ان مندروں کی فضا خالص فرقہ وارانہ ہے۔ اس طرح ہندو فرقہ واریت کو نہ کچلا جا رہا ہے اور نہ اس کے روک تھام کی کوشش ہو رہی ہے وہ گھاس کی جڑوں کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی جا رہی ہے ——

اور مسلم فرقہ واریت ؟ وہ ہندو فرقہ واریت سے بہتر پوزیشن میں ہے اور مضبوط پوزیشن میں ہے — ۱۹۴۶ء – ۱۹۴۷ء میں فسادات نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ کیا اور مسلم لیگ نے علیحدگی پسندی کے اس جذبے کو خوب بھڑکایا۔ بھارت آزاد ہوا تو تقریباً چار ساڑھے کروڑ مسلمان یہاں باقی رہ گئے لیکن ہندوستان میں رہ کر بھی مسلمان ہی رہے۔ ہندوستانی سماج کے ساتھ ان میں قومی و ذہنی یک جہتی نہیں پیدا ہوئی [1] جماعت اسلامی جیسے اداروں نے اس یک جہتی کو ناممکن بنانے کی سر توڑ کوشش کی ہے —— مسلمانوں میں فرقہ واریت کا زہر گھول دیا ہے [2] —— یہ کس کا قصور ہے ؟ یہ قصور بھارت کی حکومت کا ہے اور نہ ہندوؤں کا ہے۔ میں چودہ سالہ غائر

---

[1] یہاں بھارت کے مسلمانوں سے متعلق جو بات کہی گئی ہے وہ صاف نہیں ہے، معلوم نہیں مضمون نگار کے نزدیک "ہندوستانی سماج" اور "قومی و ذہنی یک جہتی" سے کیا مراد ہے ؟ مضمون کی ساخت اور انداز کلام سے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ بھارت کے مسلمان اپنی تہذیبی انفرادیت ختم کر کے سیال مادہ بن جاتے اور پھر انہیں بآسانی ہندو تہذیب کے سانچے میں ڈھال لیا جاتا۔ اگر مطلب یہی ہے تو جن سنگھ کے نقطۂ نظر اور فاضل مضمون نگار کے نقطۂ نظر میں صرف جارحیت و عدم جارحیت کا فرق رہ جاتا ہے

[2] جماعت اسلامی اور اس جیسے دوسرے مسلمان اداروں کے بارے میں جو بات انھوں نے کہی ہے اس کا تعلق بھی دراصل "ہندوستانی سماج" اور "قومی یک جہتی" سے ہے۔ معلوم نہیں مضمون نگار کے نزدیک (باقی اگلے پر ملاحظہ فرمائیے)

مطالعہ کے بعد ہی ایسا کہہ رہا ہوں۔

مسلمان دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں، ایک انگریزی جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور دوسرا غیر انگریزی داں مذہبی تعلیم یافتہ طبقہ۔ انگریزی داں طبقہ جناح کے جھنڈے کے نیچے چلا گیا لیکن عوام اور مذہبی رجحان رکھنے والے مسلمان اپنے مولاناؤں کے زیر اثر رہے۔ افسوس ہے کہ کانگریس نے جناح سے ٹکر لینے کے لیے اس طبقہ کے پاس براہ راست پہنچنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور وہ شہر کے خواندہ مسلمانوں کی لیگیت سے مرعوب ہوگئی۔ لیکن مسلم عوام جناح کی سنی سنائی باتوں ہی کو جانتے تھے ان کا اصل رشتہ تو اپنے دینی رہنماؤں سے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد بھی یہ عوام بھارت میں رہے جب تک کہ خوف و ہراس میں انہیں مبتلا کر کے چھوڑ بھاگنے پر مجبور نہ کیا گیا۔ اگر تقسیم کے بعد ملک میں فرقہ وارانہ ہنگامے نہ ہوتے تو یہ عوام ذہنی طور پر ہندوستانی معاشرے میں گھل مل جاتے ـــــ ان کی باگ ڈور مولاناؤں کے ہاتھ میں تھی ـــــ مذہب اور عقیدت کے دھاگہ میں وہ ان سے بندھے تھے لیکن تقسیم کے بعد کی حکومت ان مولاناؤں کو مناسب مقام دینے میں چوک گئی ان مولاناؤں کے نمائندہ تھے مولانا حسین احمد مدنی۔ لیکن نہرو سرکار مولانا آزاد ہی کو پاکر سب کچھ سمجھنے لگی۔ مولانا آزاد کی شخصیت عظیم تھی لیکن ان کا تعلق قرآن شریف سے تھا، مسلمانوں سے نہیں۔ حد ہوگئی اس وقت جب قومی خطابات کا آغاز ہوا اور حضرت مدنی کو پدم بھوشن نمبر ۲ دینے کا اعلان کیا گیا اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کو بھارت رتن جبکہ بھارت کی آزادی میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کا نام صفر کے برابر تھا اور مولانا مدنی تاریخی شخصیت تھے حضرت نے طنز بھرے خط کے ساتھ اس کو واپس کر دیا لیکن اس واقعہ نے مسلم طاقت کے اصلی سرچشمہ سے حکومتی طبقہ کو محروم کر دیا۔ اس کے بعد اردو کے بارے میں جس طرح پروپیگنڈہ کیا گیا اس سے اور دیگر متعدد باتوں سے مسلمان سیال زہن کر جا بجا پھیل گیا۔

دستور میں چھوت چھات کی قانونی طور پر مذمت کی گئی اور اسے عملاً ختم کرنے یا اس کی ہمت شکنی کرنے کے لیے ریاستوں نے قانون بنائے۔ چھوت چھات بڑی حد تک ختم ہوئی اور ہمارے ہریجن بھائی ان مقامات تک

بقیہ حاشیہ صفحہ ۴۴) فرقہ واریت کی تعریف کیا ہے؟ اگر اسلامی تہذیب کے بقا و ارتقاء کی جدوجہد کا نام ان کے نزدیک فرقہ واریت ہے تو یہ اس کی بے حد غلط تعریف ہے اور فاضل مضمون نگار غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اس ملک میں ہندو مسلم کشمکش کا بہت بڑا سبب فرقہ واریت کا یہی غلط تصور ہے۔ جماعت اسلامی ہند ایک اصولی اور وسیع النظر جماعت ہے اس کو حقیقی فرقہ واریت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ میں فاضل مضمون نگار سے عرض کروں گا کہ وہ جماعت اسلامی کے لٹریچر اور اس کی جدوجہد کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کریں۔ (مدیر)

جا پہنچے جہاں پہلے جھانک بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ عمدہ بات تھی لیکن اس کا ایک بدترین رخ بھی تھا کہ مسلمانوں نے دیکھا کہ جہاں پہلے اچھوت اور مسلمان دونوں نہ جا سکتے تھے وہاں اب اچھوت تو جانے لگے ہیں لیکن وہ اب بھی اچھوت ہیں۔

مسلمانوں کی علیحدگی پسندی پالیسی کی مذمت کرنے والے ہم ہندوؤں نے معلوم ہوتا ہے کبھی اس پہلو پر سوچا نہیں، یا اسے لائق اعتناء نہ سمجھا ہی نہیں انتخابات میں ہندو فرقہ پرور جماعتوں نے علی الاعلان تقریریں کیں کہ ہمارے ہاتھ میں حکومت آئی تو ہم مسلمانوں کو فوج اور کلیدی جگہوں پر نہیں رکھیں گے اور انہیں دوسرے نمبر کا شہری بن کر رہنا پڑے گا۔ راشٹریہ سوئم سیوک سنگھ کے لیڈر شری گروگولکر عام جلسوں میں کہتے رہتے ہیں:

"مسلمان بھارت ماتا پر حملہ کرنے ودیش سے آئے تھے۔ حملہ آور بھارت ماتا کے پتر نہیں ہو سکتے، یہاں وفاداری کا ثبوت دیں تو یہاں رہ سکتے ہیں۔" ان تمام باتوں نے اور ہندو مسلم لیڈروں کے کارناموں نے نیز ہندو قوم کی معاشرتی پستی نے مسلمانوں میں علیحدگی پسندی کے جذبات پیدا کر دیے اور انہیں مستحکم ہونے دیا اور آج وہ منظم مسلم طبقہ کی شکل میں بھارت میں کھڑا ہے۔ ابھی تک یہ سوال تھا کہ یہ طبقہ کانگریس میں نہیں فٹ ہو رہا ہے تو کس سیاسی پارٹی میں جائے گا لیکن اس سال جو نئے حالات پیدا ہوئے ہیں انھوں نے مسلمانوں کو پھر ایک اسٹیج پر لا کھڑا کیا ہے ـــــ مسلم لیگ کا اسٹیج، بھارت کے مسلمان منظم ہو کر اس اسٹیج پر جائیں گے۔ اگر ملکی قیادت نے کسی خاص غور و فکر سے کام نہ لیا۔ واضح رہے کہ یہ خطرناک بات ہوگی اور آگے چل کر اس کے نتائج بھیانک ہوں گے

اس طرح ہندو فرقہ واریت اور مسلم فرقہ واریت ایک دوسرے سے ہراساں ہیں، خوف زدہ ہیں، ہوشیار ہیں اور دونوں کا خوف و ہراس کی حالت میں ایک دوسرے سے چوکنا رہنا ہی ان فسادات کی بنیاد ہے بس اتنا کہ ہندو اور مسلم دونوں کی فرقہ وارانہ قیادتیں اس صورت حال کو فروغ دینے ہی میں اپنا فائدہ سمجھتی ہیں لہذا قومی قیادت کی ذمہ داری ہے کہ وہ مضبوط پنجے اور بیدار دماغ سے اس مسئلہ کو حل کرے کہ آزاد بھارت میں فرقہ وارانہ فسادات کیوں ہوتے ہیں اور وہ جان رکھے کہ ہوتے نہیں بلکہ کرائے جاتے ہیں

روس کے مسلم علاقوں میں سوویت سامراج

(قسط ۲)

(ترجمہ:۔ش۔ن عثمانی)

—(۲)—

سوویت روس کے مسلمان۔ایک تاریخی منظر

مردم شماری کے مطابق روس میں لگ بھگ ڈھائی کروڑ مسلمان موجود ہیں[1]۔امریکن ماہر اصول عمرانیات فرینک لوریمر دو کروڑ دس لاکھ کی تعداد بتاتا ہے[2]۔یہی تعداد "LA DOCUMENTATION FRANCAISE"[3] اور فرانسیسی محقق ونسنٹ مونٹیل کی انتہائی قیمتی تصنیف میں نقل ہوئی ہے[4]۔۱۹۵۹ء میں ریاستہائے متحدہ سوویت روس کے مسلمان ۲۰۸۹۲۷۰۰۰ کی کل آبادی کا بارھواں حصہ تھے۔پاکستان اور انڈونیشیا کے بعد روس دنیا کی تیسری سب سے بڑی مسلم آبادی ہے[5]۔سوویت روس کی یہ مسلمان قومیں ان قوموں کی نسل سے ہیں جنہوں نے تاریخ کے مختلف مرحلوں میں اسلام قبول کیا۔ان میں سے بہت سی قوموں کی اپنی ریاستیں تھیں جو ایک دوسرے کے ساتھ یا غیر ملکی مسلم حکومتوں کے ساتھ مشترک عقیدے، مشترک روایات اور کلچر کے بندھن میں جکڑی ہوئی تھیں۔ان میں قدیم ترین مسلم ریاستیں ترکستان اور کاکیشیا میں واقع تھیں۔عربی فتوحات کے نتیجے میں ساتویں صدی کے آخری حصے

---

[1] ریاستہائے متحدہ سوویت روس کی مردم شماری ۱۹۵۹ء کے اعداد و شمار کی بنیاد پر۔

[2] "سوویت یونین کی آبادی" از فرینک لوریمر۔جنیوا ۱۹۴۶ء

[4] ونسنٹ مونٹیل:۔(سوویت روس میں عیسائیت اور اسلام)
"ESSAI-SUR L'ISLAM EN USSR" پیرس ۱۹۵۷ء

[3] LA DOCUMENTATION FRANCAISE, DIRECTION DE LA DOCUMENTATION. "LES MUSULMANS DANS LE MONDE"
نمبر ۲۴۱۲ [illegible] اگست ۱۹۵۸ء صفحات ۵۰-۴۲

[5] ونسنٹ مونٹیل کی [illegible] کتاب LES MUSULMANS SOVIETIQUES [illegible] ۱۹۵۷ء

سے اسلام ان علاقوں میں پھیلنے لگا۔ چنگیز خاں کی مغلیہ سلطنت کے سقوط کے بعد تیرھویں صدی میں موجودہ روس کی سرحدوں پر جو خود مختار مسلمان ریاستیں تھیں۔ ریاست تیمورہ اور تیمور ید وف ترکستان میں اور کیچک قدیم روس کے جنوب میں ترکی النسل جرگہ (Golden Horde) کا مقبوضہ علاقہ ۔ مسلم کلچر کی توسیع و اشاعت اور مرکزیت کے اہم مستقر تھے۔ تیمورہ اور تیمور ید وف کی سلطنت اور کیچک جرگے کے خوانین راج کے سقوط کے بعد نئی مسلم ریاستیں بخارا، خیفہ اور کوکند کے خوانین کی ریاستیں ترکستان میں ۔۔۔ وولگا کے علاقے میں قازان کا خوانین راج، کریمیا کے جزیرہ نما میں کریمیائی حکومت، مشرقی سائبیریا میں سائبیریائی حکومت اور شمالی کاکیشیا اور کاکیشیا پار کے علاقوں میں ان گنت خوانین راج قائم ہو گئے تھے ۔

سولھویں صدی نے ان مسلمان ریاستوں کی قیمت پر روس کی توسیع سلطنت کا آغاز دیکھا جو انیسویں صدی میں ترکستان اور شمالی کاکیشیا کی فتوحات پر پایہ تکمیل کو پہنچا۔ کوہستانی لوگوں کو متحد کر کے "شمالی امامت" قائم کی گئی۔ (جس کا مرکز داغستان تھا) ۔ آذربائیجان کے مسلم خوانین کی ریاستیں شماخا، کوبا، باکو، غنشہ، کاماباغ اور کاکیشیا پار کے علاقے نوخا کا بھی الحاق کر لیا گیا ۔ عہد قبل از انقلاب کے قریب قدیم سلطنت روس میں صرف دو مسلم ریاستیں بخارا اور خیفہ کے خوانین راج باقی رہ گئے تھے ۔ زار روس کے زیر سایہ باجگذار حکومتوں کی شکل میں یہ ریاستیں کسی قدر آزادی کا لطف اٹھا رہی تھیں ۔ فروری اور خصوصاً اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلابات کے بعد قدیم سلطنت روس کی مسلمان قوموں نے خود اختیاری نو آبادیاں یا آزاد مسلم جمہوریتیں بنانا شروع کیں ۔ ۱۹۱۷ء کے آخر میں یوفا میں ایدل اُرل کی ترکی و تاتاری جمہوریہ کا اعلان ہوا ۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں ترکستان کراتی کی قومی حکومت نے کوکند میں حق خود ارادیت کا اعلان کیا ۔ قدیم کراتی کے مگاس کے میدان (موجودہ قازق سوویت روس) میں ایلاش اوردہ کی قومی حکومت نے (جو ترکی روایاتی ہیرو خان ایلاش کے نام پر موسوم ہوئی) قازقستان کی خود ارادیت کا اعلان کیا ۔ بخارا اور خیفہ نے بھی اپنی خود مختاری کی آواز بلند کی ۔ کریمیا کے تاتاروں نے نومبر ۱۹۱۷ء میں آزاد کریمیائی حکومت قائم کر لی ۔ مئی ۱۹۱۸ء میں شمالی کاکیشیا کی جمہوریہ کی خود مختاری کا اعلان ہوا ۔ اس علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی تھی اس جمہوریہ میں شمالی آسیشیا (OSSETIA) بھی شامل تھی ۔ جس کی ایک تہائی آبادی مسلمان تھی ۔ ۱۹۱۸ء میں مسلم آزاد آذربائیجانی جمہوریہ کاکیشیا پار کے علاقے میں قائم ہوئی آذربائیجان، اخاژیان اور جارجیا کے اضافی علاقے آزاد جارجیا کی جمہوریہ میں جانے جن کا قیام اسی سال عمل میں آیا تھا ۔ سائبیریا کی مسلمان قومیں تاتاری اور بخاری سوویت روس کی [illegible]

شامل تھے۔ وہ تعداد میں اتنے کم تھے اور واضح قومی سرحدوں کے فقدان کی بنا پر اس قابل نہ تھے کہ اپنی اپنی آزاد ریاستیں بنا سکتے۔ سوویت راج کے پہلے سال میں سوویت ریاستی فیڈریشن اور نو ساختہ مسلم ریاستوں میں دونوں جگہ عمال حکومت مسلمانوں کے ساتھ چاپلوسی کا طرز اختیار کیے ہوئے تھے۔ سوویت اقدام کی ایک مثال ۱۹۱۷ء کی "مشرق اور روس کے جملہ مسلمانوں کے نام ایک اپیل" تھی جس پر لینن اور اسٹالن کے دستخط ثبت تھے۔ اس اپیل میں قدیم سلطنت روس کے مسلمانوں سے آزادی عقیدے، رسم ورواج، قومی وثقافتی اداروں کی بقا واحترام کا وعدہ کیا گیا تھا۔ روس کے مسلمانوں کی ہمدردی حاصل کرنے کی غرض سے عوامی نگرانوں کی کاؤنسل نے دسمبر ۱۹۱۷ء میں یہ حکم نکالا کہ پیٹروگریڈ کے "صحیفہ عثمانی" کو کرائی کی مسلم کانگریس کے حوالے کر دیا جائے۔ دوسرا اقدام مسائل قومیت کی نگرانیہ کا وہ اعلان تھا جس کے ذریعہ قازان کے سمیکی مینار کی تاریخی یادگار مسلم محنت کشوں کو استعمال کے لیے دیدی گئی۔ البتہ جیسے جیسے کمیونسٹ روس میں اپنے اقتدار کے پاؤں جماتے چلے گئے، مسلمانوں کے سلسلے میں ان کی پالیسی بدلتی گئی۔ خوشامد کی پالیسی کو جارحانہ پالیسی میں تبدیل کیا گیا۔ قدیم سلطنت روس کی سرحدوں پر نو زائیدہ مسلم ریاستوں کو ماسکو کی کمیونسٹ حکومت گوارا کرنے کے لیے ذرا بھی تیار نہ تھی۔ اور ان کو اپنے اندر ملا لینے کے لیے اس نے فوجی طاقت کا استعمال کیا۔

(۳)
مسلم ریاستوں پر روس کا قبضہ

کمیونسٹ اور محنت کش پارٹیوں کے نمائندوں کی ۱۹۱۷ء والی ماسکو کانفرنس نے غیر سرمایہ دارانہ خطوط پر غیر ترقی یافتہ ممالک کی ترقی کے لیے مندرجہ ذیل بنیادی شرائط منظور کیں۔

۱۔ محنت کش عوام کے لیے محنت کش طبقہ کی سربراہی — جس کا مرکزی نقطہ مارکس اور لینن کی پارٹی ہوگی۔
۲۔ کسی نہ کسی شکل میں پرولتاری انقلاب کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کا کام
۳۔ کسی نہ کسی شکل میں پرولتاری ڈکٹیٹرشپ کا قیام
۴۔ نجی سرمایہ دارانہ ملکیت کا خاتمہ — اور بنیادی ذرائع پیداوار کے لیے عوامی ملکیت کا نفاذ
۵۔ زراعت کو دھیرے دھیرے اشتراکی قالب میں ڈھالنا[1]

۶ دسمبر ۱۹۶۰ء کو سوویت پریس نے "کمیونسٹ اور محنت کش پارٹیوں کی کانفرنس نمائندگان کا اعلانیہ" شائع کیا جو کمیونسٹ پارٹیوں کے سربراہوں کی کانفرنس بابتہ نومبر ۱۹۶۰ء منعقدہ ماسکو کی ایما دفعات اس کانفرنس

[1] کمیونسٹ اور محنت کش پارٹیوں کی کانفرنس نمائندگان کی دستاویزات۔ منقح۔ ماسکو : ۱۹۵۷ء

نے ۱۹۶۰ء کے اعلانیہ کے ان اصولوں کی توثیق کی جو سرمایہ داری سے اشتراکیت کی طرف بڑھنے والے مختلف ملکوں کی عبوری صورتوں سے تعلق رکھتے تھے[1] اعلانیہ نے اس بات پر بھی زور دیا کہ "عوام کو یقین ہے کہ برسوں پرانی پسماندگی کو ختم کرنے اور اپنی زندگی کے حالات کو سدھارنے کا بہترین طریقہ غیر سرمایہ دارانہ ارتقاء کی راہ کو اپنانا ہے"[2] یہ غیر سرمایہ دارانہ ارتقاء کی راہ کیا ہے؟ دوسری کومنتانگ کانفرنس میں لینن نے اس کی تشکیل کی تھی اس نے اس مفروضہ کو رد کر دیا تھا کہ جن پسماندہ قوموں کو اب آزاد کرایا جارہا ہے ان کی قومی تنظیم کے لیے ارتقاء کا سرمایہ دارانہ مرحلہ ناگزیر طور پر ضروری ہے۔

"اگر فاتح پرولتاری انقلابی طبقہ" لینن نے اصرار کیا۔ ان لوگوں میں منظم پروپیگنڈہ کرے اور سوویت حکومت اپنے مکمل وسائل کے ساتھ ان کی کمک پر آجائے تو یہ پیش خیالی ٹھیک نہیں کہ پسماندہ قوموں کے واسطے ارتقاء کا ایک سرمایہ دارانہ مرحلہ ناگزیر طور پر ضروری ہے" لینن نے کہا کہ "سربراہ دلیشوں کے پرولتاری طبقے کی مدد سے پسماندہ ممالک کے لیے یہ ممکن ہے کہ سوویت ڈھانچے میں آملیں اور ارتقاء کے سرمایہ دارانہ مرحلے سے بچتے ہوئے ارتقاء کے قطعی مراحل سے گذر کر اشتراکیت تک پہنچ جائیں"[2]

خروشچیف نے ۲۵ ویں پارٹی کانگریس کے سامنے پیش کردہ اپنی رپورٹ میں لینن کی اس تھیوری کا ذکر کیا اور اس غیر سرمایہ دارانہ ارتقاء کی راہ کے نمونے کے طور پر مسلم ریاستوں یعنی سوویت جمہوریتوں میں سوویت تعمیر کی تاریخ کو حوالے میں پیش کیا[3]

ممالک فرداً فرداً ارتقاء کی اس غیر سرمایہ دارانہ راہ پر کس طرح آئیں گے جس کی سفارش لینن نے کی ہے؟ اور جن پانچ نکات کی سفارش کی گئی ہے ان میں کا دوسرا نکتہ "کسی نہ کسی شکل میں پرولتاری انقلاب برپا کرنے کا کام" ہے۔ سنہ ۱۹۶۰ء کے اعلانیہ نے ممکن الحصول مختلف صورتوں کی وضاحت کر دی ہے۔ اشتراکی انقلاب برپا کرنے کے بظاہر دو طریقے ہیں :۔

پرامن ذرائع اور غیر امن پسندانہ ذرائع[4]

---

[1] پراودا، ۶ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء صفحہ ۳

[2] وی۔ آئی۔ لینن کی کتاب "SOCHINENIYA" تیسرا ایڈیشن جلد نمبر ۳۰ صفحہ ۱۱۷

—— "PROBLEMYCOSTOKOVEDENIYA" نمبر (۲) — ۱۹۶۰ — صفحہ ۲۵

[3] ایضاً

[4] پراودا ۔ ۶ دسمبر سنہ ۱۹۶۰ء

فروری اور اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلابات کے بعد قدیم سلطنت روس کے اندر آزاد مسلم ریاستیں یہ نہیں چاہتی تھیں کہ لینن کی سجھائی ہوئی راہ — غیر سرمایہ دارانہ ارتقار کی راہ پر چل نکلیں۔ چنانچہ سوویت حکومت نے ان کو اس راہ پر زبردستی لانے کے لیے غیر امن پسندانہ راستہ اختیار کر کے دباؤ کا استعمال کیا۔ سرخ فوجوں نے مسلم جمہوریتوں کی حکومت کو زیر کیا۔ فروری ۱۹۱۸ء میں سرخ فوج کی ٹکڑیوں نے کوکند پر ہاتھ صاف کیا اور ترکستان کی قومی حکومت کا شیرازہ بکھیر دیا۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں ایالاش اوردہ کی قومی قازق حکومت کا بھی یہی حشر ہوا۔ ۱۹۱۹ء میں شمالی کاکیشیا کا بھی۔ ۱۹۲۰ء میں سرخ فوجوں کے دستوں نے بخارا اور خیوہ کے خوانین راج بھی قبضہ لیے۔ اور آذربائیجان کی جمہوریہ بھی چھین لی گئی۔ ۱۹۲۰ء میں یوکرین پر قبضے نے کریمیا کی جمہوریہ کا چراغ گل کر دیا۔ یوفا کی قومی اسمبلی جس نے ایدل اُرل کی آزادی کا نعرہ لگا دیا تھا سرخ فوج کے ذریعہ اپریل ۱۹۱۸ء کے لگ بھگ اس کا بھی شیرازہ بکھیر دیا گیا تھا آخر آخر سوویت جبر نے ۱۹۲۴ء میں ترکستان کی پہلی مسلم عوامی جمہوریہ بخارا اور خوارزم کا قصہ پاک کر دیا — یہ علاقائی الحاق ارتقار کی غیر سرمایہ دارانہ راہ اور کمیونسٹ حکومت تک پہنچنے کے لیے قدیم سلطنت روس کی مسلم قوموں کی عبوری منزل کے پہلے مرحلے کی نمائندگی کرتے تھے مسلمانوں اور سوویت روس کی دیگر قوموں کے لیے نام نہاد اشتراکی انقلاب کی راہ پُرخار شروع ہوئی۔ ان سب کو اس تجربے سے گذرنا پڑا جس کے لیے سوویت حکومت افریشیائی ممالک سے بڑی دردمندی کے ساتھ سفارش کرتی ہے۔ (باقی آئندہ)

بقیہ صفحہ ۵۹) ایک صاحب نے فرمایا کہ ان کے یہاں چٹکی نکالنے کا طریقہ ہے یعنی روزانہ کھانا پکاتے وقت تھوڑا سا آٹا یا چاول وغیرہ فی سبیل اللہ نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض تاجر حضرات کے یہاں صندوقچیاں رکھی ہوئی ہیں جن میں وہ روزانہ کچھ رقم فی سبیل اللہ ڈالتے رہتے ہیں اسی طرح کی کچھ اور تدابیر بھی سامنے آئیں جن کے پیش نظر امراء کو ہدایت کی گئی کہ ان میں سے جو ہمارے عمومی مزاج کے مطابق اور قابل عمل ہوں ان کو اختیار کیا جا سکتا ہے۔

ملک کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ آخر میں تمام امرائے حلقہ جات نے پوری تفصیل کے ساتھ اپنے اپنے حلقوں کی سیاسی اخلاقی سماجی مذہبی اور معاشی صورتِ حال کو دعوتی نقطۂ نظر سے پیش کیا۔ نیز ملک کی موجودہ صورتِ حال کا بھی دعوتی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا گیا اگرچہ ملک کے سیاسی انتشار، اخلاقی بگاڑ اور معاشی بحران پر امرائے حلقہ جات نے تشویش کا اظہار کیا لیکن دعوتی نقطۂ نظر سے بحمد اللہ نہ صرف یہ کہ کسی طرح کی مایوسی کا کوئی اظہار نہیں ہوا بلکہ اس کے برخلاف ان کے عزائم اور حوصلوں میں بلندی اور مزید پختگی پیدا ہوئی اور زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ دعوتی سرگرمیوں کو انجام دینے کے جذبے کے ساتھ اللہ سے دعا کرتے ہوئے اجتماع بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔ اَللّٰھُمَّ تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ

محمد یوسف قیم جماعت اسلامی ہند۔ ۷ رمئی ۱۹۸۲ء

رُوداد اجتماع اُمرائے حلقہ جات منعقدہ اپریل ۱۹۶۲ء

مجلس شوریٰ کے اجلاس کے اختتام کے بعد مرکز جماعت اسلامی ہند دہلی میں مولانا ابواللیث صاحب اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند کے زیر صدارت جماعت کے تنظیمی حلقوں کے امراء کا اجتماع ۲۰ اپریل کی صبح سے شروع ہوا اور ۲۴ اپریل کی شب میں قبل نماز عشاء بخیر و خوبی اختتام کو پہنچا۔ مندرجہ ذیل اُمرائے حلقہ نے اجتماع میں شرکت فرمائی۔

۱۔ جناب عبدالفتاح صاحب امیر حلقہ مغربی بنگال و آسام ۲۔ جناب انیس الدین صاحب، امیر حلقہ جنوبی بہار ۳۔ جناب حسنین سید صاحب، امیر حلقہ شمالی بہار ۴۔ جناب مولانا حبیب اللہ صاحب امیر حلقہ مشرقی یو، پی ۵۔ مولانا عبدالغفار ندوی صاحب امیر حلقہ لکھنؤ ۶۔ جناب مولانا سلیمان قاسمی صاحب امیر حلقہ رام پور ۷۔ جناب ماسٹر جعفر علی صاحب امیر حلقہ الہ آباد ۸۔ جناب محمد شفیع صاحب مونس امیر حلقہ دہلی ۹۔ جناب انعام الرحمٰن خاں صاحب امیر حلقہ بھوپال ۱۰۔ جناب مولانا مظہر الحق صاحب امیر حلقہ راجستھان ۱۱۔ جناب محمود احمد خاں صاحب امیر حلقہ اورنگ آباد ۱۲۔ جناب رشید عثمانی صاحب قائم مقام امیر حلقہ بمبئی ۱۳۔ جناب عبدالرزاق لطیفی صاحب امیر حلقہ حیدرآباد ۱۴۔ جناب سراج الحسن صاحب امیر حلقہ میسور ۱۵۔ جناب عبدالعزیز صاحب امیر حلقہ آندھرا ۱۶۔ جناب مولانا شیخ عبداللہ صاحب امیر حلقہ مدراس ۱۷۔ جناب مولانا کے سی عبداللہ صاحب امیر حلقہ کیرلا

مذکورہ امرائے حلقہ جات کے علاوہ سید حامد حسین صاحب معاون قیم جماعت اور محمد یوسف قیم جماعت بھی شریک اجتماع رہے۔

افتتاح

اجتماع کا افتتاح امیر جماعت کی تقریر سے ہوا۔ مولانائے محترم نے تمام امراء کی شرکت پر اظہار مسرت کرتے ہوئے اجتماع کی افادیت پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا کہ جماعت کی پالیسی اور پروگرام کو زیر عمل لانے کا بہت کچھ انحصار آپ حضرات کی جدوجہد پر ہے اس لئے ان باتوں کی ضرورت

محسوس ہوتی ہے کہ آپ حضرات سال میں کم از کم ایک بار مرکز میں اکٹھا ہوں تاکہ ضروری باتوں کی افہام و تفہیم کے علاوہ حالات و مسائل پر تبادلۂ خیالات اور ایک دوسرے کی معلومات سے فائدہ اٹھایا جاسکے۔ چنانچہ اسی ضرورت کے پیش نظر بہت پہلے طے کیا گیا تھا کہ سال میں ایک بار امراء کا اجتماع ہوا کرے گا اور اس کے مطابق اجتماعات ہوتے رہے ہیں لیکن موانع کی وجہ سے گذشتہ سال یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ بہرحال اسی ضرورت کے تحت یہ اجتماع طلب کیا گیا ہے جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس اجتماع کے لیے کوئی لگا بندھا پروگرام نہ ہو اور ضروری مسائل پر ہم آزادانہ گفتگو و تبادلۂ خیال کریں، لیکن وقت کو زیادہ کارآمد بنانے کے لئے ضروری مسائل کی تعیین کرا لینا مناسب ہوگا اس لیے ایک غیر رسمی ایجنڈا اس اجتماع کے لئے بھی بنا لیا جائے۔

چنانچہ امیر جماعت کی افتتاحی تقریر کے بعد امراء کے مشورے سے ایجنڈا ترتیب دیا گیا۔

تذکیر ایجنڈے کے مطابق اجتماع کا آغاز درس و تذکیر سے ہوا، اور روزانہ کی صباحی نشستوں کی ابتدا بھی تذکیر سے ہوتی رہی جو مناسب موثر اور مفید ثابت ہوئی۔ امیر جماعت کے علاوہ مولانا شیخ عبداللہ صاحب، مولانا عبدالغفار صاحب، مولانا حبیب اللہ صاحب اور مولانا سلیمان قاسمی صاحب نے باری باری سے تذکیری درس دیا۔

مسائل پر گفتگو و تبادلہ خیال سے قبل یہ ضروری سمجھا گیا کہ ملک کے مختلف تنظیمی حلقوں میں جماعت کی موجودہ [پالیسی] کے مطابق جو کام انجام دیئے جا رہے ہیں ان سے مجموعی طور پر تمام امراء حلقہ جات واقف ہو جائیں چنانچہ مرکز کی سالانہ رپورٹ پڑھ کر سنائی گئی۔ رپورٹ کی خواندگی کے بعد امیر جماعت نے امراء کو توجہ دلائی کہ ان کی [رپورٹ]یں مرکز بروقت اور صحیح شکل میں آنی چاہئیں کیونکہ اس میں کوتاہی کی بنا پر سالانہ رپورٹ بھی جتنی مکمل ہونی چاہیے [ن]ہیں ہو سکی ہے اور اس کی بنا پر کام میں اور بھی طرح طرح کی کمزوریاں و دشواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا [کہ کوت]اہی میں اگر کچھ دخل تساہل کو ہو تو اسے دور کر لینا چاہیے لیکن اگر کچھ دقتیں حائل ہوں تو ان کے تدارک کی تدبیر [ہونی] چاہیے۔ چنانچہ اس ضمن میں رپورٹ کا نقشہ زیر بحث آیا اور امراء کے مشورے سے اس کا ایک نیا نقشہ تیار [کیا گیا اور ام]راء کو یہ اختیار دیا گیا کہ وہ حسب سہولت اسے اختیار کر سکتے ہیں یا اب تک جو معمول تھا اس کے مطابق اپنی رپورٹیں [بھیج]ا سکتے ہیں۔ اسی ضمن میں امراء کی یہ شکایت بھی زیر گفتگو آئی کہ کچھ مقامی امراء اپنی رپورٹیں وقت پر امیر حلقہ کو [نہیں بھیج]تے، چنانچہ امراء کو اس صورت حال کی اصلاح اور اس کے لئے مناسب تدابیر اختیار کرنے کی طرف توجہ [دلائی گئی کہ] یہ ان کی براہ راست ذمہ داری ہے۔

اس گفتگو کے بعد امراء حلقہ کو توضیح طلب امور کے بارے میں سوالات کا موقع دیا گیا سوالات کے جوابات امیر جماعت دیتے رہے یہ سوالات دعوتی و تنظیمی امور سے بھی متعلق تھے اور ملی و ملکی مسائل کے بارے میں بھی۔

ایک سوال اس بارے میں تھا کہ بعض اوقات دعوت میں کچھ ایسے مضامین شائع ہوتے ہیں جن سے یہ شبہ ہونے لگتا ہے کہ کیا مسلمانوں کے قومی مسائل کے بارے میں جماعت کے نقطہ نظر میں کچھ تبدیلی واقع ہوگئی ہے۔ نیز الیکشن اور کنونشن کے تعلق سے جو باتیں کہی جا رہی ہیں ان سے بھی اس شبہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے اس کے جواب میں امیر جماعت نے پہلے یہ بات واضح کی کہ دعوت بلاشبہ جماعت کا آرگن ہے اور اس کے ذمہ داروں کی بہرحال یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ جماعت ہی کے نقطہ نظر کی ترجمانی کریں لیکن ان سے بھی کبھی کبھی بھول چوک ہو سکتی ہے۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ ابھی اس کو اسٹاف بھی بقدر ضرورت فراہم نہیں ہو سکا ہے اور کچھ ایسے لوگوں سے بھی کام لینا پڑ رہا ہے جن کا جماعتی فکر پوری طرح پختہ نہیں ہے اس لئے اگر اس میں کبھی کوئی ایسی بات نظر آئے جس سے کھٹک پیدا ہو سکتی ہو تو اسے بھول چوک ہی کا نتیجہ قرار دینا چاہیے۔ جب کہ جماعت کے افکار و نظریات اور اس کی پالیسی اور پروگرام وغیرہ ساری چیزیں پوری طرح واضح اور معلوم بھی ہیں اور اب تو اس پہلے سے شکایت کی کچھ زیادہ گنجائش بھی نہیں ہے کیوں کہ ادارہ کے لوگ اس کے بارے میں اب پہلے سے زیادہ احتیاط سے کام لے رہے ہیں اس کے بعد امیر جماعت نے تفصیل سے بتایا کہ جماعت کی اصل دعوت کی رو سے مسلمانوں کے ملی مسائل سے ہم غیر متعلق نہیں رہ سکتے بلکہ خود اس کا تقاضہ ہے کہ ہم ان سے دلچسپی لیں اور اس لحاظ سے ہماری موجودہ اور گذشتہ پالیسی میں کوئی فرق نہیں ہے البتہ یہ دلچسپی قومی بنیاد پر نہ ہوگی اور اس سے ہمیشہ کی طرح اب بھی ہمیں اپنا دامن محفوظ رکھنا ہے۔

اس ضمن میں آپ نے الیکشن اور کنونشن کے سلسلہ میں بھی جماعت کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ ہمارا موقف ایک اصولی موقف ہے جس کا قوم پرستی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا کے تفصیلی اظہار خیال کے بعد سوال کرنے والے صاحب نے اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔

ایک اور سوال گذشتہ مسلم کنونشن کے موقع پر جماعت کے رویہ کے بارے میں تھا جن کا مدعا بظاہر یہ تھا۔ کہ جماعت نے خود کنونشن طلب کرنے کی بجائے دوسروں پر چھوڑ کر اور جس شکل میں کنونشن منعقد ہونے جا رہا تھا اس کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے سلسلہ میں خاموشی اختیار کر کے غلطی کا ارتکاب کیا ہے اس کے جواب میں امیر جماعت نے تفصیل سے واضح کیا کہ کیا صورت کس طرح پیش آئی اور جماعت نے جو رویہ اختیار کیا وہ کن وجوہ پر مبنی تھا جس کا

سائل نے اظہار اطمینان کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے درحقیقت یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ دوسروں کو جو کنونشن کے ضمن میں جماعت کے رویہ کو زیر بحث لاتے ہیں مطمئن کرسکیں۔

ایک صاحب نے یہ خیال ظاہر کیا کہ الیکشن کے مسئلے پر شوریٰ نے غور وخوض کے بعد جو بات طے کی ہے وہ یہی ہے کہ ۶۲ء کے الیکشن میں جماعت عملاً کوئی حصہ نہیں لے گی لیکن الیکشن سے پہلے اس مسئلہ کو شوریٰ میں زیر بحث لانے اور اس کے متعلق سوالنامہ کی اشاعت وغیرہ سے بہت سے لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ جماعت الیکشن میں حصہ لینے جارہی ہے یہاں تک کہ بعض اخبارات نے اس کی بنا پر یہاں تک لکھ دیا کہ جماعت الیکشن میں حصہ لینے کا فیصلہ کرچکی ہے اور اسی بنا پر لوگوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پھیلیں۔

امیر محترم نے اس سلسلہ میں فرمایا کہ جہاں تک اخبارات کے رویہ کا تعلق ہے وہ افسوسناک ہونے کے باوجود چنداں لائق تعجب نہیں ہے اور نہ اس کی کوئی خاص اہمیت ہے کیوں کہ کچھ اخبارات نے اس سے پہلے کے الیکشن کے موقع پر بھی نہ صرف الیکشن میں جماعت کے حصہ لینے کی خبر شائع کی تھی بلکہ اس کی طرف سے کھڑے ہونے والے فرضی امیدواروں کی تعداد تک بھی لکھ دی تھی جو بہرحال ان کی نہایت غلط اور بے بنیاد قیاس آرائی ثابت ہوئی۔ رہا فی نفسہ اس موقع پر اس مسئلہ کو چھیڑنے کا سوال تو ہمیں بہرحال اس کی ضرورت محسوس ہوئی کہ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں ہم اپنے الیکشن کے متعلق رویہ پر تفصیل کے ساتھ غور کرکے کوئی فیصلہ کریں تاکہ ہمارا ذہن پوری طرح اس کے بارے میں یکسو ہوسکے اور اس غرض کے لئے اس کے سوا چارہ نہیں تھا کہ ہم سوالنامہ کے ذریعہ الیکشن کے بارے میں رفقا اور اہل علم کے خیالات معلوم کریں اور ہرچند یہ پہلے ہی تقریباً طے شدہ تھا کہ ۶۲ء کے الیکشن میں ہمیں کوئی حصہ نہیں لینا ہے، لیکن اس سے پہلے اس بارے میں اپنے نقطۂ نظر کو پوری طرح یکسو کر لینے کی بہرحال ضرورت تھی اس لیے یہ مسئلہ شوریٰ میں زیر غور آیا۔

خدمتِ خلق

جماعت کی موجودہ پالیسی میں خدمت خلق اور رحمت ومواسات کے کاموں کو خصوصی اہمیت دی گئی ہے تاکہ داعیان حق محض رضائے الٰہی کی خاطر بندگان خدا کی خدمت کرتے رہیں اسی اہمیت کے پیش نظر امیر جماعت نے شرکاء اجتماع کو یاد دلایا کہ خدمت خلق کے پروگراموں پر پہلے کی بہ نسبت زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اور اس سلسلہ کی اجتماعی مساعی کے لیے رفقاء جماعت کے اندر صحیح جذبات کو مسلسل ابھارا جائے نیز خدمت خلق کے کاموں کو انجام دینے میں باضابطگی اور نظم پیدا کرنے کی غرض سے چند متعین صورتوں کی نشاندہی بھی کردی جائے تاکہ اپنے اپنے علاقوں کے حالات کے پیش نظر جن کاموں کو وہ اپنے ہاتھ میں لے

سکتے ہوں ان کے ضمن میں کوششیں عمل میں لائیں۔

چنانچہ امراء حلقہ جات کے مشورے سے طے کیا گیا کہ حسب ذیل ملی جلی صورتیں حسب حالات اختیار کی جانی چاہئیں البتہ جماعت کے تمام کاموں میں توازن و اعتدال کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اس فہرست میں جو باتیں زیادہ اہمیت رکھتی ہیں مثلاً یتیموں، بیواؤں اور محتاجوں کی امداد ان کو مقدم رکھنا چاہیئے۔

خدمت خلق کے سلسلہ میں درج ذیل کام انجام دیئے جا سکتے ہیں۔

۱۔ طبی امداد ۔ مثلاً فرسٹ ایڈ کا اہتمام۔ مختلف امراض اور زچگی وغیرہ کے کیمپوں میں دواؤں اور انجکشن کی فراہمی، ڈسپنسری و ہسپتال کا قیام و گشتی شفاخانہ، میٹرنٹی ہوم (زچگی خانہ) وبائی امراض کے تدارک کے سلسلہ میں کوشش معالج کی فراہمی وغیرہ۔

۲۔ تعلیمی امداد ۔ غریب اور مستحق طلبہ کی فیس کی ادائیگی۔ کتابوں و اسٹیشنری کا وغیرہ کی فراہمی، قیام طعام کا انتظام۔

۳۔ قرضہ فنڈ ۔ بستی میں ایک فنڈ قایم کیا جائے جس سے ضرورت مندوں کو بلا سود قرض دینے کا اہتمام ہو

۴۔ کمیٹی امداد باہمی ۔ باہم ایک دوسرے کی معاشی امداد کے لیے ایک کمیٹی قایم کی جائے جس کے کچھ ضوابط بنائے جائیں۔ ہر ممبر ماہانہ ایک متعینہ رقم ادا کرتا رہے اور کبھی کبھی ہنگامی طور پر بھی کچھ رقم داخل کر دیا کرے اس کی تمام رقوم اسی کے نام محفوظ رہیں گی۔

۵۔ بیج گودام ۔ ضرورت مند کسانوں کو بوقت ضرورت بلا سود کے بیج کی فراہمی۔ تاکہ وہ سودی قرض سے بچ سکیں اور ان کی یہ اہم ضرورت بسہولت پوری ہو سکے اس کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ فصل کے موقع پر کسان حضرات اس مقصد کے لیے کچھ غلہ گودام میں داخل کر دیں اور اس کا کوئی ایسا نظم بنا دیا جائے جس کے تحت حسب ضرورت و حسب گنجائش مستحق ضرورت مندوں کو بیج فراہم کر دیا جائے اگر بیج گودام میں عشر کا غلہ بھی جمع ہو تو عشر کے مصارف میں خرچ کیا جائے۔

۶۔ امداد برائے شادی ۔ غریب اور یتیم لڑکیوں نیز بیوگان کی شادی میں معاشی و دیگر ممکنہ تعاون کیا جائے

۷۔ تجہیز و تکفین ۔ غریب و لاوارث میتوں کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا جائے۔

۸۔ روزگار ۔ بے روزگاروں کو روزگار سے لگانے کا اہتمام کیا جائے اس کے لیے [illegible] قایم کیا جا سکتا ہے۔ [illegible]

۹۔ **رفاہ عام کے کام** ۔ مثلاً کنوؤں اور سڑکوں کی تعمیر سینیٹیشن (صفائی وغیرہ) کا اہتمام

۱۰۔ **امداد مظلومین** ۔ حکام یا دیگر ظالم افراد کسی پر ظلم و زیادتی کریں تو مظلوم کی مدد کرنا اور پریشانیوں سے بچانے کی تدابیر اختیار کرنا۔

۱۱۔ **خدمت مسافرین وحجاج** ۔ مسافروں کی خدمت اور ان کی امداد ممکنہ ذرائع سے انجام دینا نیز حجاج کی خدمت اور ان کے موانع و مشکلات کو دور کرانے کا اہتمام کرنا

۱۲۔ **یتیموں ۔ بیواؤں اور محتاجوں کی امداد** ۔ غذا، لباس، مکان علاج اور تعلیم وغیرہ کے سلسلہ میں ان کی ممکنہ امداد کرنا۔

۱۳۔ **نرسنگ ہوم کے قیام کی کوشش کرنا** ۔

۱۴۔ **تقسیم فطرہ** ۔ فطرہ کی تقسیم کا صحیح نظم قایم کرنا اور اسے مستحقین تک پہنچانے کا اہتمام کرنا۔

۱۵۔ **حادثات** ۔ ارضی وسماوی آفات یا دیگر آفات کے وقت مصیبت زدگان کی امداد کا انتظام۔

ذرائع ووسائل :۔ عشر، زکوٰۃ، چرم قربانی ودیگر اعانتیں وغیرہ۔

خدمت خلق کے پروگرام پر گفتگو کے وقت یہ بات بھی سامنے لائی گئی کہ وہ محض رضاء الٰہی کے لیے بلا تفریق مذہب وملت انجام دی جانی چاہیے اور عشر و زکوٰۃ کے مصارف کا لحاظ کرتے ہوئے غیر مسلموں کی خدمت کے لئے الگ سے اعانت کی رقمیں صرف کی جانی چاہئیں۔

امیر جماعت نے تعلیمی امداد کے سلسلہ میں یہ بھی فرمایا کہ خدمت خلق کے دیگر مقدم اور ضروری مصارف کے بعد جہاں کہیں تعلیمی امداد میں خرچ کرنے کی گنجائش نکل رہی ہو تو زیادہ بہتر ہوگا کہ اسے ان رفقاء کے بچوں کو مرکزی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرانے پر صرف کیا جائے جو اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے فی الحال اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے ؛

فسادات اور ان کا علاج

ملک میں تقسیم ہند کے بعد سے جو فرقہ وارانہ اور لسانی فسادات وقتاً فوقتاً ہوتے رہے ہیں ان پر تمام امرار حلقہ جات نے پوری سنجیدگی سے غور و فکر کیا۔ نیز صورت حال پر اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ فسادات کے اسباب کا جائزہ لیا گیا اور تاریخی تہذیبی سیاسی اور تعلیمی اسباب پر بھی گفتگو ہوئی۔ دوران گفتگو حسب ذیل تدابیر بھی سامنے آئیں

۱۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے خیر پسند، سنجیدہ و با اثر افراد سے روابط پیدا کرکے فساد کے محرکات کو دور کرنے میں ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

۲۔ ملک کی سیاسی، سماجی پارٹیوں کے ذمہ داروں سے رابطہ قایم کیا جائے اور ان کو ان کی ذمہ داریوں کی طرف توجہ دلائی جائے۔ نیز فسادات کے اسباب دور کرنے کے سلسلے میں تعاون کی راہیں تلاش کی جائیں۔

۳۔ حکومت کے ذمہ داروں اور ایڈمنسٹریشن کو بروقت متوجہ کیا جاتا رہے۔ یہ توجہ مرکزی اور صوبائی دونوں سطح پر ہو۔

۴۔ عوام الناس کے اخلاقی سدھار کی طرف خصوصی توجہ دی جائے۔

۵۔ خدمت خلق کے کاموں کے ذریعہ مختلف طبقات میں خیر سگالی کے جذبات پیدا کیے جائیں۔

۶۔ ملک کی تہذیبی اقلیتوں کے درمیان یگانگت اور یکجہتی پیدا کرنے کے لیے سمپوزیم منعقد کیے جائیں۔ اور یکجہتی کی حقیقی بنیادیں لوگوں کے سامنے لائی جائیں۔

۷۔ حتی الامکان ملک بھر کے پولیس سے رابطہ قایم کرکے فسادات کے محرکات کو دور کرنے اور فسادات کے موقع پر ان کی روک تھام کے لیے ان کا تعاون حاصل کیا جائے۔

آخر میں امیر جماعت نے امرار حلقہ جات کو اس طرف توجہ دلائی کہ فسادات کے تدارک اور ملک کی فضا کو خوشگوار بنانے کے سلسلے میں جماعت نے بہت پہلے کافی غور و خوض کیا ہے اور اس سلسلہ میں وقتاً فوقتاً ہدایات دی جاتی رہی ہیں جو ہمارے لٹریچر میں پھیلی ہوئی ہیں اس مقصد کے لیے ان کا بھی خاص طور سے مطالعہ کرلیا جائے۔

منطقہ وار اجتماعات ۔ اپنی دعوت اور سرگرمیوں سے ملک کو مسلسل روشناس کرتے رہنے اور اپنی کوششوں کا جائزہ لے کر ان کو زیادہ منظم اور نتیجہ خیز کرنے کی غرض سے ملک کے مختلف منطقوں اور حلقوں میں اجتماعات منعقد کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا اور امرار حلقہ جات کے مشوروں کی روشنی میں یہ طے کیا گیا کہ :-

۱۔ منطقہ مشرقی ہند (جس میں حلقہ ہائے شمالی بہار، جنوبی بہار اور مغربی بنگال و آسام شامل ہیں) اور

۲۔ منطقہ شمالی ہند (جس میں حلقہ ہائے مشرقی یوپی، لکھنؤ۔ الہ آباد اور رامپور شامل ہیں)، ان کے اجتماعات علی الترتیب بھاگل پور اور کانپور میں منعقد کیے جائیں گے جن کی متوقع تاریخ علی الترتیب ۱۲ تا ۱۴ نومبر اور ۹ تا ۱۱ نومبر ۱۹۶۲ء طے ہوئیں۔

حلقہ وار اجتماعات ۔ بعض منطقوں میں چونکہ منطقہ واری اجتماعات اس سال منعقد کرنے کا ارادہ نہیں ہے

اس لیے حسب ذیل حلقوں کے حلقہ واری اجتماعات اور ان کی متوقع تواریخ بھی طے کر دی گئیں جو حسب ذیل ہیں۔

نام حلقہ	حلقہ کے اجتماع کی متوقع تاریخیں
۱۔ حلقہ دہلی	۲۸ و ۲۹ ر اکتوبر ۶۲ء
۲۔ حلقہ آندھرا	۱۸ ر تا ۲۰ ر نومبر ۶۲ء
۳۔ حلقہ حیدرآباد	۲۴ ر تا ۲۶ ر نومبر ۶۲ء
۴۔ حلقہ اورنگ آباد	۳۰ ر نومبر و یکم و ۲ ر دسمبر ۶۲ء
۵۔ حلقہ بھوپال	دسمبر ۶۲ء میں پہلے ہفتہ کے بعد یا مارچ ۶۳ء میں
۶۔ حلقہ مدارس	جنوری ۶۳ء

(نوٹ :۔ حلقہ میسور میں جنوری ۶۳ء میں سرکلس کے اجتماعات متوقع ہیں)

حلقہ جات کے دورے ۔ امراء حلقہ جات نے تنظیمی حلقوں کے چند اہم مقامات پر مرکزی رفقاء کے سالانہ دورے کی ضرورت وافادیت پر بھی اظہار خیال کیا چنانچہ امراء حلقہ جات کو ہدایت کردی گئی کہ وہ اپنی ضرورتوں سے مرکز کو مطلع کر دیں جس کے پیش نظر حسب سہولت وضرورت حلقوں میں دوروں کا پروگرام بنایا جاسکے گا۔

علاقائی دارالاشاعتوں کی توسیع واستحکام مختلف تنظیمی حلقوں کے زیر نگرانی والتزام جو دارالاشاعتیں قائم ہیں ان کی توسیع واستحکام نیز ان کے ذریعہ قرآن وحدیث اور اسلامی لٹریچر کو زیادہ تیزی کے ساتھ علاقائی زبان میں منتقل کرنے کی عملی تدابیر پر غور وخوض کیا گیا اور امراء حلقہ جات کو ہدایت کی گئی کہ وہ اس طرف خصوصی توجہ دیں اس لیے کہ نہ صرف یہ کہ غیر مسلموں میں دعوتی کام کرنے کا یہ نہایت موثر وضروری ذریعہ ہے بلکہ موجودہ حالات کے پیش نظر مسلمانوں میں بھی علاقائی زبانوں میں دعوتی کام انجام دینے کی ضرورت بیش از بیش بڑھتی جا رہی ہے۔ گفتگو کے دوران یہ تاثر سامنے آیا کہ جماعتی حلقوں کے علاوہ خیر پسند حضرات سے بھی تعاون کی درخواست کی جاسکتی ہے تاکہ علاقائی دارالاشاعتوں سے نہ صرف جماعتی لٹریچر بلکہ عام اسلامی لٹریچر بھی زیادہ سے زیادہ اور جلد از جلد شائع کیا جاسکے۔

بیت المال کا استحکام ۔ محسوس کیا گیا کہ متعدد وجوہ سے رفقاء جماعت کی مالی حالت دن بدن متاثر ہوتی جارہی ہے جس کا اثر مقامی حلقہ وار اور مرکزی بیت المالوں پر پڑ رہا ہے۔ اس لیے بیت المالوں کے استحکام کے لیے تدابیر پر بھی غور کیا گیا۔ امراء حلقہ جات کی جانب سے چند عملی تدابیر سامنے لائی گئیں۔ مثلاً

(بقیہ اشارات) کی ڈکٹیٹر شپ سے بھی فزوں تر ہوگی اس لیے میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر کس بنیاد پر ان مسلم ممالک کے حکومتی طرز عمل کو پردے کے خلاف بطور نظیر استعمال کیا گیا ہے۔

چوتھے نکتے میں جو بات فاضل جج کے قلم سے نکلی ہے وہ بہت قابلِ غور ہے۔ دستور کے متعلق اب تک مسلمان لیڈر اور بالخصوص ان کے سیکولرسٹ لیڈر عام مسلمانوں کو سمجھاتے رہے ہیں کہ دستور کی بنیاد کسی مخصوص سماجی فلسفے پر نہیں ہے اس کی اصل بنیاد سیکولرزم پر ہے جو باشندگان ملک کے مذہب، ان کی تہذیب اور سماجی اقدار کے بارے میں غیر جانب دار ہوتا ہے لیکن عدالت عالیہ کے ایک فاضل جج کا ارشاد ہے:-

"خواتین کی علیحدگی ہمارے سماجی فلسفے کے خلاف ہے جس پر ہمارے دستور کی بنیاد ہے"

اس عبارت سے معلوم ہوا کہ دستور کی بنیاد کسی خاص سماجی فلسفے پر رکھی گئی ہے۔ "ہمارے سماجی فلسفے" میں "ہمارے" کا لفظ معلوم نہیں کس کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ مسلمان اس سے خارج ہیں کیونکہ خواتین کی اجنبی مردوں سے علیحدگی مسلمانوں کے سماجی فلسفے کے خلاف نہیں بلکہ عین مطابق ہے۔ اب ہمارے سماجی فلسفے سے مراد یا تو مغرب کا سماجی فلسفہ ہو سکتا ہے جسے پسند کر لیا گیا ہے یا پھر اس ملک کی اکثریت کا۔ تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی دستور کی بنیاد سیکولرزم پر نہیں بلکہ کسی مخصوص سماجی فلسفے پر رکھی گئی ہے؟ یا یہ کہ سیکولرزم خود کوئی مخصوص سماجی فلسفہ ہے جسے فاضل جج نے ہمارے سماجی فلسفے سے تعبیر کیا ہے؟

پانچویں نکتے میں چوتھے نکتے کی صفائی پیش کی گئی ہے۔ چوتھے نکتے سے یہ بات نکل رہی تھی کہ جب دستور کی بنیاد ہمارے سماجی فلسفے پر ہے اور یہ خواتین کا پردہ اس کے خلاف ہے تو پھر دستور کے تحت اس پردے کے خلاف کوئی قانون کیوں نہیں بنایا جاتا اس کا جواب فاضل جج نے یہ دیا ہے کہ ریاست، سیاسی مصلحتوں کی وجہ سے ابھی ایسا نہیں کر رہی ہے گھبرانے کی بات نہیں ہے جیسے ہی یہ سیاسی مصلحتیں روپوش ہوں گی قانون بھی بن جائے گا۔ افسوس یہ ہے کہ ریاست اپنے اندر وہ جرأت نہیں رکھتی جو سپریم اعظم میں تھی۔

چھٹے نکتے میں علیحدگی کی جو دو قسمیں کی گئی ہیں وہ واضح نہیں ہیں، نیز یہ کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ اپنی طرف سے اس طرح کی تقسیمیں کرے اور غریب پردے کو جس قسم میں چاہے داخل کر دے، ہم تو یہ جانتے ہیں کہ عورتوں کی اجنبی مردوں سے علیحدگی ہمیشہ سے طبعی و فطری شرم و حیا اور انسانی اخلاقیات ہی کی قسم میں داخل رہی ہے۔

اس مختصر تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ عدالتی فیصلہ کتنے دور رس نتائج کا حامل ہے۔ سپریم کورٹ کی ایک کسر باقی رہ گئی ہے، دیکھیے وہ کب تک پوری ہوتی ہے۔ فَہَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ

فہرست مندرجات ماہنامہ ”زندگی“

از جولائی ۶۱ء تا جون ۶۲ء

اشارات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	مولانا ابواللیث صاحب مدیر اصلاحی	فرقہ پرستی کے ازالے کے لیے حکومت جو کچھ کر رہی ہے اس پر تبصرہ اور اس سلسلے میں مفید مشورہ	۲۷	۴	اکتوبر ۶۱ء
۲	سید احمد قادری	رسالت محمدی کا ثبوت	۲۷	۱	جولائی ۶۱ء
		آل انڈیا مسلم کنونشن دہلی کے خطبہ صدارت پر تبصرہ	"	۲	اگست ۶۱ء
		مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کی قراردادوں پر تبصرہ	"	۳	ستمبر ۶۱ء
		قرآن کی تعریف قرآن میں (۱)	"	۵	نومبر ۶۱ء
		قومی اتحاد اور جذباتی یک جہتی — اکثریت کا مطالبہ اور اس کا جواب	"	۶	دسمبر ۶۱ء
		مسلمان ملکوں کی غلامی و آزادی کا مختصر تاریخی جائزہ اور ان ملکوں میں احیائے اسلام کے مستقبل پر اظہار خیال	۲۸	۱	جنوری ۶۲ء
		قرآن کی تعریف قرآن میں (۲)	۲۸	۲	فروری ۶۲ء
		خود اپنا جائزہ اور احتساب	۲۸	۳	مارچ ۶۲ء
		الکشن میں کانگرس کی فتح پر اظہار خیال	"	۴	اپریل ۶۲ء
		شرک اور مظاہر شرک کی شرعی زعیت	"	۵	مئی ۶۲ء
		نصب العین کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ	"	۶	جون ۶۲ء

ارشادات رسول

نمبر شمار	شارح	مضمون احادیث	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	غیظ و غضب	۲۷	۲	اگست ۶۱ء

مقالات

نمبر شمار	لکھنے والے	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	جناب ابو محمد امام الدین رام نگری	نظریہ اوتار اور عقیدۂ رسالت قسط (۹)	۲۷	۱	جولائی سنہ ۶۱ء
	"	" (۱۰)	۲۷	۲	اگست سنہ ۶۱ء
	"	" (۱۱)	"	۳	ستمبر سنہ ۶۱ء
	"	" (۱۲)	"	۴	اکتوبر سنہ ۶۱ء
	"	" (۱۳)	"	۵	نومبر سنہ ۶۱ء
	"	" (۱۴) ختم شد	"	۶	دسمبر سنہ ۶۱ء
۲	سید احمد قادری	دعاہم قرار دادیں	۲۷	۴	اکتوبر سنہ ۶۱ء
	"	بعثتِ محمدی کا مقصد	۲۸	۴	اپریل سنہ ۶۲ء
۳	جناب اکرام الدین احمد صاحب	جذباتی یک جہتی	۲۷	۶	دسمبر سنہ ۶۰ء
۴	مولانا جلال الدین عمری	قرآن ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر میں	۲۷	۲	اگست سنہ ۶۱ء
	"	رسول کی پہچان	"	۴	اکتوبر سنہ ۶۱ء
	"	خدا کی تلاش خدا کی کتاب میں	۲۸	۱	جنوری سنہ ۶۲ء
	"	خدا کی ذات	"	۲	فروری سنہ ۶۲ء
		خدا ایک ہے	"	۳	مارچ سنہ ۶۲ء
		خدا کی صفات (۱)	"	۴	اپریل سنہ ۶۲ء
		" (۲)	"	۵	مئی سنہ ۶۲ء
		کائنات میں خدا کا عمل	"	۶	جون سنہ ۶۲ء
۵	جناب رفیع اللہ عنایتی ایم اے	اسلام کا تصور ریاست	۲۸	۳	مارچ سنہ ۶۲ء
۶	جناب سلطان مبین صاحب ایم اے	فطرت شرک (۲) پہلی قسط جون سنہ ۶۱ء میں شائع ہوئی تھی	۲۷	۲	اگست سنہ ۶۱ء

نمبر شمار	مضمون نگار	عنوانات	جلد	شمارہ
۶	جناب سلطان مبین صاحب ایم اے	خانہ داری اور رہبانیت	۲۸	۳
		اجتماع اضداد کی چند مثالیں	〃	۵
		رہبانیت کے شاخسانے	〃	۶
۷	مولانا سلیمان قاسمی	توحید قرآن کی روشنی میں۔	۲۸	۴
۸	مولانا صدر الدین اصلاحی	روزہ	۲۸	۲
	〃	مسلمان اور اسلامی نظام اجتماعی	〃	۵
۹	علمائے پاکستان	مسلم فیملی لاز آرڈی نَنس	۲۷	۱
۱۰	جناب محمد فاروق خاں صاحب	قرآن کی حیرت انگیز جامعیت	۲۷	۳
	〃	انسانی جبلتوں کی تحسین و تہذیب	〃	۶
	〃	انسانی جبلتوں کا مطالعہ	۲۸	۶
۱۱	جناب وحید الدین خاں صاحب	کوئی سننے والا ہے جو سنے	۲۷	۳
	〃	چند باتیں	〃	۴
	〃	حقیقت کی دریافت میں انسان کی ناکامی	۲۷	۵
	〃	قرآن اور علم جدید	۲۸	۱
	〃	یہ بے حسی کیوں	〃	۲
	〃	کیا تمام مذاہب سچے ہیں	〃	۳

تراجم واقتباسات

نمبر شمار	مترجم و مقتبس	عنوانات	جلد	شمارہ
۱	جناب ریاض الدین احمد صاحب	سات اسباب معہد نیویارک اکاڈمی آف سائنس کے معتمد [illegible]	۲۷	[illegible]
۲	شمس [illegible] عثمانی	ذہنی سکون (انگریزی سے ترجمہ)	۲۷	[illegible]

- 1 AUG 1962

ربیع الاول ۸۲ھ
اگست ۶۲ء

ماہنامہ زندگی رامپور

جلد: ۲۹
شمارہ: ۲

مدیر: سید احمد قادری

• خط و کتابت ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی
• زر سالانہ: ۔ صہ ۔ ششماہی: تین روپیہ ۔ فی پرچہ: پچاس نئے پیسے
• ممالک غیر سے: دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیج کر رسیدیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/ج شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک: جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر: سید احمد عروج قادری۔ پرنٹر پبلشر: احمد حسن۔ مطبع: ناظم پریس
مقام اشاعت: دفتر زندگی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

سید احمد قادری

اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت الی الحق کی راہ، پھولوں کی سیج کبھی نہیں رہی، یہ ہمیشہ کانٹوں سے بھری رہی ہے۔ اس راہ کے مسافروں کے مبارک قدم، صرف کانٹوں ہی سے چھلنی نہیں ہوئے ہیں بلکہ بسا اوقات، انہیں تلوار کی دھار پر بھی چلنا پڑا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی رضا یا اس کی رضامندیوں اور خوشنودیوں کا مظہر ــــ جنت ــــ بڑی گراں قیمت نعمت ہے۔ یہ وہ نعمت ہے جو مکارہ سے ڈھکی ہوئی ہے، اس پر ایذا رسانی کانٹوں کی تہ در تہ چادریں پڑی ہوئی ہیں اور جب تک انگلیوں کو زخمی اور پورے جسم کو لہولہان کر کے، ایک ایک چادر اٹھا کر پھینک نہ دی جائے۔ یہ باغِ نعمت، نہ جنت نظر بن سکتا اور نہ فردوس گوش ہو سکتا ہے۔ بلکہ کبھی کبھی یہ کانٹے برچھیوں کی انی، تیروں کے پھل اور تلواروں کی دھار بن جاتے ہیں اور اس دولتِ لازوال کے طلب گاروں کو خاک و خون پر لٹا دیتے ہیں، ان کے دل و جگر کو برما دیتے اور ان کے حلقوم کو تراش کر رکھ دیتے ہیں۔ اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوت الی الحق کی جدوجہد کا مقصود دراصل اسی نعمت کا حصول ہے۔

تمسخر، مضحکے، پھبتیاں، تحریفے، قہقہے، دھمکیاں، یہ وہ تحفے ہیں جو منکرینِ حق نے ہمیشہ داعیانِ حق کے سامنے پیش کیے ہیں، حق و باطل کی کش مکش کا کوئی دور نہ اس سے خالی رہا ہے، نہ رہ سکتا ہے۔ اللہ کے مقدس سولوں کو مجنون (پاگل) کہنا تو دنیا پرستوں کی طرف سے ایک ایسا لقب ہے جو ان سب کا طرۂ امتیاز بن گیا ہے حضرت نوح علیہ السلام وہ پہلے داعیِ حق ہیں جن کی دعوت اور کارِ دعوت کی تفصیل ہمیں ملتی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ ان کی منکرِ حق، قوم اس وقت بھی ان کی ہنسی اڑانے سے باز نہ آئی جب خدا کا عذاب، تیغِ بے نیام کی طرح اس کے سروں پر لٹک رہا تھا:۔

نوح کشتی بنا رہے تھے اور ان کی قوم کے سردار جب بھی ان کے پاس سے گزرتے تو ان کا مذاق اڑاتے تھے، انھوں نے کہا اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں (ہود ر۴)

اللہ کے رسول جرمِ بغاوت کی پاداش میں جس عذاب کا ڈراوا سناتے ہیں، وہ مجرموں کی آنکھوں سے مخفی ہوتا ہے اور ان کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ عذاب الٰہی کی وعید کو غلط سمجھتے اور مضحکہ انگیز انداز میں خود اس کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں:۔

آخر کار ان لوگوں نے کہا اے نوح تم نے ہم سے جھگڑا کیا اور بہت کر لیا اب تو بس وہ عذاب لے آؤ جس کی تم ہمیں دھمکی دیتے ہو، اگر سچے ہو۔ (ہود ر۳)

تمسخر کے ساتھ ساتھ ان کی دھمکیاں بھی جاری رہتی ہیں:۔

وہ بولے، اے نوح اگر تو (کارِ دعوت سے) باز نہ آیا تو ضرور سنگسار کر دیا جائے گا (شعراء ر۶)

حضرت ہود سے ان کی قوم کے سرداروں نے کہا:۔

ہم تو تمہیں بے وقوف سمجھتے ہیں اور ہمیں گمان ہے کہ تم جھوٹے ہو۔ (اعراف ر۹)

انھوں نے عذاب الٰہی کا مطالبہ ان الفاظ میں کیا:۔

کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ ہم اکیلے خدا کی عبادت کریں اور انھیں چھوڑ دیں جن کی عبادت ہمارے باپ دادا کرتے آئے ہیں، اچھا تو لے آ وہ عذاب جس کی تو ہمیں دھمکی دیتا ہے اگر تو سچا ہے۔ (اعراف ر۹)

حضرت لوط کو ان کی قوم نے جو جواب دیا تھا وہ یہ تھا:۔

نکالو ان لوگوں کو اپنی بستی سے، یہ بڑے پاکباز بنتے ہیں۔ (اعراف ر۱۰)

حضرت شعیب کو دھمکی دی گئی۔

اس کی قوم کے سرداروں نے جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں مبتلا تھے اس سے کہا، اے شعیب، ہم تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں، اپنی بستی سے نکال دیں گے ورنہ تم لوگوں کو ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔

تقریباً یہی دھمکی، جن سنگھ اور ہندو مہا سبھا، ہندستان کے مسلمانوں کو دے رہی ہے ——— قوم فرعون نے اپنے بادشاہ کو حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی طرف سے جن الفاظ میں چوکنا کیا تھا وہ یہ تھے:۔

فرعون سے اس کی قوم کے سرداروں نے کہا کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دے گا کہ ملک میں فساد

پیداکیں اور وہ تیری اور تیرے معبودوں کی بندگی چھوڑ بیٹھے۔ (اعراف ۱۵)

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مقابلے کے بعد فرعون کے ساحر ایمان لے آئے تو اس نے فوراً کہا :-

اب یقیناً میں تمہارے ہاتھ اور دوسری طرف کے پاؤں کٹوا دوں گا اور تمہیں کھجور کے تنے پر سولی دوں گا (طٰہٰ)

فرعون نے بنی اسرائیل کا تعاقب کرنے کے لیے اپنی قوم کو جن الفاظ میں ابھارا وہ یہ تھے :-

یہ لوگ ایک چھوٹی سی جماعت ہیں اور بلاشبہ ان کے دل ہماری طرف سے غصے میں بھرے ہوئے ہیں اور ہم سب کے سب ان کی طرف سے خطرے میں مبتلا ہیں۔ (شعراء ۴)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کے باپ نے یہ دھمکی دی :-

اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے روگرداں ہو گیا ہے؟ اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا جا ایک لمبے عرصے کے لیے تو میرے پاس سے دور ہو جا۔ (مریم ۳)

ان کی قوم نے محض لفظی دھمکی پر اکتفا نہ کی بلکہ عملاً انہیں آگ کے الاؤ میں پھینک دیا۔

اس کی قوم کے لوگوں نے کہا اگر تم کچھ کرنا چاہتے ہو تو اسے جلا دو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ ہم نے کہا اے آگ تو ابراہیم کے لیے ٹھنڈک اور سلامتی ہو جا۔ (انبیاء ۵)

بعض مقامات پر منکرین حق کی روش کا ایک عمومی ذکر ان الفاظ میں آیا ہے :-

مجرم مومنوں پر ہنسا کرتے تھے اور جب ان کے پاس سے گزرتے تو ایک دوسرے کو آنکھ مارتے اور جب اپنے گھر واپس جاتے تو باتیں بناتے جاتے اور جب مسلمانوں کو دیکھتے تو کہتے کہ یہ لوگ بہک گئے ہیں (التطفیف)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی قوم نے جو کچھ کیا اس پر ابھی چودہ برس سے کچھ کم زمانہ گزرا ہے اور اس کا ہر جزو ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یہاں نہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا استقصاء مقصود ہے اور نہ ان تمام مصائب و آلام کی تفصیل مطلوب ہے جو ان کی قوموں نے انہیں پہنچائے بلکہ صرف اس کی تذکیر مدنظر ہے کہ دعوت الی الحق جن مراحل سے گزرتی ہے یہ ان کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے۔

یہ بھی دیکھ لینا چاہیے کہ وہ کیا باتیں تھیں، وہ کیا جد و جہد تھی، وہ کیا حرکت عمل تھی اور وہ کیا جرم تھا جس کی پاداش میں داعیان حق کے ساتھ یہ سب کچھ کیا جاتا رہا اور کیا جا رہا ہے۔ حضرت نوح نے اللہ کی طرف سے اپنی قوم کو جو دعوت دی تھی وہ یہ تھی :-

"اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔"

انھوں نے ساڑھے نو سو برس تک جس عظیم اور جانکاہ جدوجہد میں زندگی بسر کی اس کا نقشہ یہ تھا:۔

نوح نے کہا اے میرے پروردگار میں اپنی قوم کو رات اور دن (حق کی طرف) بلاتا رہا لیکن وہ لوگ میری پکار سے دور ہی بھاگتے رہے اور میں نے جب کبھی انہیں دعوت دی تاکہ تو انہیں بخش دے تو وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے لگے، اپنے آپ کو کپڑوں سے ڈھانکنے لگے، اپنی روش پر اصرار اور سخت گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے لگے۔ پھر میں نے مجمع میں انہیں برملا پکارا۔ پھر میں نے انہیں علانیہ اور خفیہ دعوت پہنچائی۔ میں نے کہا اپنے رب سے مغفرت طلب کرو وہ بڑا بخشنے والا ہے، وہ تمہارے لیے موسلادھار پانی برسائے گا۔ تمہارے اموال و اولاد میں اضافہ کرے گا اور تمہیں گھنے باغ اور نہریں عطا کرے گا۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ کی عظمت و جلال کا یقین نہیں کرتے جس نے تمہیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ سے گزار کر دنیا میں پیدا کیا۔ (سورۂ نوح)

حضرت شعیب نے اپنی قوم کو وہی دعوت دی جو حضرت نوح نے دی تھی اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے جن جرائم پر اپنی قوم کو ٹوکا اور جن خرابیوں سے انہیں روکا ان میں کی چند یہ تھیں:۔

اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا اس نے کہا اے برادران قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی صاف رہنمائی آ گئی ہے لہٰذا وزن اور پیمانے پورے کرو، لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور زمین میں فساد برپا نہ کرو جبکہ اس کی اصلاح ہو چکی ہے، اس میں تمہاری بھلائی ہے اگر تم واقعی مومن ہو اور ہر راستے پر رہزن بن کر نہ بیٹھ جاؤ کہ لوگوں کو خوف زدہ کرنے اور ایمان لانے والوں کو خدا کے راستے سے روکنے لگو اور سیدھی راہ کو ٹیڑھا کرنے کے درپے ہو جاؤ۔ (اعراف ۱۱)

یہ بہت سی دوسری آیتوں کی طرح یہ بات واضح کرتی ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد صرف یہ نہ تھا کہ وہ اپنی قوم کو توحید کی دعوت دیں اور ایمان لانے والوں کو اللہ کے انعام کی بشارت اور منکرین حق کو اس عذاب کی وعید سنائیں بلکہ وہ معاشرے کی کامل اصلاح اور سماج میں ہمہ گیر انقلاب برپا کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ انسان کے پاس صرف دو چیزیں ہیں۔ روح و بدن اور مال و متاع۔ جس طرح انسان کی روح و بدن کو صرف حکمت پر چلنا [illegible] اسی طرح ان کے کاروبار اور نظام اقتصادیات و مالیات کو بھی صرف

قانون الٰہی کا پابند بنا دینا چاہتے تھے حضرت شعیب کی دعوت کے جواب میں بانداز طنز و تضحیک ان کی قوم نے جو بات کہی تھی وہ یہ تھی :۔

اے شعیب کیا تیری نماز تجھے یہ سکھاتی ہے کہ ہم ان سارے معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی پرستش ہمارے باپ دادا کرتے تھے یا یہ کہ ہم کو اپنے مال میں اپنے منشا کے مطابق تصرف کرنے کا اختیار نہ ہو بس تو ہی تو ایک عالی ظرف اور راست باز آدمی رہ گیا ہے　(ہود ۸)

اس جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کے مخاطبین نے ان کی دعوت کے دونوں اجزاء کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ حضرت لوط نے جس بدکاری سے اپنی قوم کو روکا وہ یہ تھی :۔

اور لوط کو ہم نے پیغمبر بنا کر بھیجا پھر یاد کرو جب اس نے اپنی قوم سے کہا، کیا تم ایسے بے حیا ہو گئے ہو کہ وہ فحش کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دنیا میں کسی نے نہیں کیا، تم عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے اپنی خواہش پوری کرتے ہو حقیقت یہ ہے کہ تم بالکل ہی حد سے گزر جانے والے لوگ ہو۔　(اعراف ۱۰)

حضرت موسیٰ فرعون کے پاس اس مقصد سے بھیجے گئے تھے کہ وہ اپنے دل و دماغ اور اعضاء و جوارح کو برے عقائد و خیالات اور برے اعمال و افعال سے پاک اور خشیت الٰہی سے اپنی زندگی معمور کرے اللہ نے حضرت موسیٰ سے کہا :۔

فرعون کے پاس جا وہ سرکش ہو گیا ہے، اس سے کہہ کیا تو سنورنا چاہتا ہے۔ میں تجھے تیرے رب کی طرف رہنمائی کروں تو تیرے دل میں خدا کا خوف پیدا ہو۔　(النازعات)

سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم آپ کے اعلیٰ اخلاق و کردار کی معترف تھی اور اس بات کا بھی اعتراف کرتی تھی کہ آپ اچھے اخلاق کا حکم دیتے اور برے اخلاق سے روکتے ہیں آپ ایک ایسی دعوت پیش کرتے تھے جو اس کی فلاح دارین کی ضامن تھی۔

یہ ہے وہ جدوجہد اور یہ ہے وہ جرم جس کے بدلے میں داعیان حق کی قومیں اپنے ہی خواہوں کی دشمن بن جاتی تھیں اور آج بھی بن جاتی ہیں۔

اوپر جو کچھ لکھا گیا اس کے بعد یہ بات جاننے کی خواہش آپ سے آپ پیدا ہوتی ہے کہ ایسے تکلیف دہ ماحول اور ایسے سخت حالات میں داعیان حق کی روش کیا رہی ؟ کیا حالات سے گھبرا کر انھوں نے دعوت ؟

کچھ سستی دکھائی ؟ کیا وہ دھمکیوں سے ڈر کر اپنے موقف سے کچھ پیچھے ہٹ گئے ؟ داعیانِ حق کی تاریخ کا یہ بھی ایک بڑا اہم اور وسیع باب ہے۔

حضرت نوح کی ایک تقریر یہ ملاحظہ کیجیے:۔

ان کو نوح کا قصہ سناؤ، اس وقت کا قصہ جب اس نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ اے برادران قوم اگر میرا تمہارے درمیان رہنا اور اللہ کی آیات سنا سنا کر تمہیں غفلت سے بیدار کرنا تمہارے لیے ناقابل برداشت ہو گیا ہے تو میرا بھروسہ اللہ پر ہے تم اپنے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک متفقہ فیصلہ کر لو اور جو منصوبہ تمہارے پیش نظر ہو اس کو خوب سوچ لو تاکہ اس کا کوئی پہلو تمہاری نگاہ سے پوشیدہ نہ رہے پھر میرے خلاف اس کو عمل میں لے آؤ اور مجھے ہرگز مہلت نہ دو۔ (یونس ۸)

خدا کی طاقت وحفاظت پر کتنا جاندار توکل، اپنے موقف کی حقانیت کا کیسا زندہ یقین اور دعوت حق کی راہ میں سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا کس قدر بے پناہ جذبہ ہے اس جوابی تقریر میں ایک موقع پر حضرت ہود نے اپنی طاقت ور اور سرکش قوم کو یہ جواب دیا تھا:۔

میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے خدائی میں شریک ٹھیرا رکھا ہے میں اس سے بیزار ہوں، تم سب کے سب مل کر میرے خلاف اپنی کرنی میں کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے ذرا مہلت نہ دو، میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا بھی رب ہے اور تمہارا رب بھی، کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ (ہود ۵)

انبیاء کرام کے درمیان سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ منکرین حق کی دھمکیوں کا جواب براہ راست خود خدائے قادر و توانا نے دیا ہے:۔

اور یہ لوگ اس بات پر تلے ہوئے ہیں کہ تمہارے قدم اس زمین سے اکھاڑ دیں اور تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں لیکن اگر یہ ایسا کریں گے تو تمہارے بعد یہ خود یہاں کچھ زیادہ دیر نہ ٹھیر سکیں گے۔ (بنی اسرائیل ۸)

مدینہ میں مکہ کے واقعہ کو ان الفاظ میں یاد دلایا ہے:۔

وہ وقت بھی یاد کرنے کے قابل ہے جبکہ منکرین حق تیرے خلاف تدبیریں سوچ رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں وہ اپنی چالیں چل رہے تھے اور اللہ اپنی چال چل رہا تھا اور اللہ کی چال سب سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ (انفال ۴)

انبیاء کرام کی شان تو بہت اونچی ہے ان کے ماننے والوں نے بھی منکرینِ حق کے چیلنج اور ان کے لاؤ لشکر کے مقابلے میں صبر و ثبات اور استقامت کا ثبوت دیا ہے:۔

> اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے خدا پرستوں نے جنگ کی اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے دل شکستہ نہیں ہوئے، انھوں نے کمزوری نہیں دکھائی وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے، ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے (آل عمران ر۱۵)

حضور نبی کریم (فداہ ابی و امی) کے صحابہ نے غزوۂ احد میں سیکڑوں زخم کھانے کے بعد تخویف اور دہشت انگیزی کے موقع پر جو کچھ کہا وہ یہ ہے۔

> اور وہ جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انھوں نے جواب دیا کہ ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے (آل عمران ر۱۸)

غزوۂ احزاب میں جبکہ عربی قبائل کی متحدہ طاقت نے مدینہ کی چھوٹی سی بستی کو گھیر لیا تھا صحابہ نے کیا کہا؟

> اور جب مسلمانوں نے دشمن کی فوجوں کو دیکھا تو کہا یہ تو وہ چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ و رسول سچے ہیں اور اس بات نے ان کے ایمان اور اطاعت میں اضافہ کر دیا۔ (احزاب ر۳)

داعیانِ حق کی یہ روشن تاریخ کیسی روح پرور کتنی ایمان افروز اور کس قدر تسلی بخش ہے، اس کے ہوتے ہوئے کیا کسی بھی داعی حق گروہ کے لیے مایوسی بزدلی اور دہشت زدگی کی ذرہ برابر کوئی گنجائش موجود ہے؟

لوک سبھا میں وزیر داخلہ شری لال بہادر شاستری نے جماعت اسلامی ہند پر غلط الزامات لگا کر جو دھمکی دی ہے اور ممبروں نے جو قہقہے لگائے ہیں طنزیہ جملے کسے ہیں انہیں اپنے سامنے رکھیے اور پھر ان قہقہوں اور دھمکیوں پر نظر دوڑائیے جن کا محض مختصر ذکر اوپر گزرا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس دھمکی اور ان قہقہوں کو ان سابقہ قہقہوں اور دھمکیوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ جب حقیقت یہ ہے تو کارِ دعوت میں سستی یا کسی طبعی بے دلی اور دہشت زدگی کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں تو حضرت نوح کی طرح دن کو اور رات کو، صبح کو اور شام کو، جلوت میں اور خلوت میں، علانیہ اور خفیہ ہر طرح اور ہر حال میں بندگیٔ رب کی دعوت دینی ہے۔ وہ ہنستے ہیں تو ہنسیں نہیں سنتے نہ سنیں، دھمکیاں دیتے ہیں دیں ہمیں اپنا کام کیے جانا ہے دنیا کی ہر چیز سے بے پروا اور ہر ستائش سے مستغنی ہو کر۔

امامتِ صالحہ کی اہمیت

(سید احمد قادری)

عَنْ قَيْسِ بْنِ اَبِی حَازِمٍ قَالَ دَخَلَ اَبُوْبَكْرٍ عَلٰی اِمْرَاَةٍ مِنْ اَحْمَسَ يُقَالُ لَهَا زَيْنَبُ فَرَاٰهَا لَا تَكَلَّمُ فَقَالَ مَا لَهَا لَا تَكَلَّمُ قَالُوْا حَجَّتْ مُصْمِتَةً فَقَالَ لَهَا تَكَلَّمِیْ فَاِنَّ هٰذَا لَا يَحِلُّ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الْجَاهِلِيَّةِ فَتَكَلَّمَتْ فَقَالَتْ مَنْ اَنْتَ قَالَ امْرُؤٌ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ قَالَتْ اَیُّ الْمُهَاجِرِيْنَ قَالَ مِنْ قُرَيْشٍ قَالَتْ مِنْ اَیِّ قُرَيْشٍ اَنْتَ قَالَ اِنَّكِ لَسَئُوْلٌ اَنَا اَبُوْبَكْرٍ قَالَتْ مَا بَقَاؤُنَا عَلٰی هٰذَا الْاَمْرِ الصَّالِحِ الَّذِیْ جَاءَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْدَ الْجَاهِلِيَّةِ قَالَ بَقَاؤُكُمْ عَلَيْهِ مَا اسْتَقَامَتْ بِكُمْ اَئِمَّتُكُمْ قَالَتْ مَا الْاَئِمَّةُ قَالَ اَمَا كَانَ لِقَوْمِكِ رُءُوْسٌ وَاَشْرَافٌ يَاْمُرُوْنَهُمْ فَيُطِيْعُوْنَهُمْ قَالَتْ بَلٰی قَالَ فَهُمْ اُولٰٓئِكِ عَلَی النَّاسِ۔ (بخاری ج ۱ باب ایام الجاہلیۃ)

(ترجمہ) قیس ابن ابی حازم کہتے ہیں کہ حضرت ابوبکر قبیلۂ احمس کی ایک عورت کے پاس آئے ان کا نام زینب تھا، انھوں نے دیکھا کہ بولتی نہیں ہیں۔ پوچھا یہ کیوں باتیں نہیں کرتیں، لوگوں نے کہا۔ انھوں نے یہ نذر مانی ہے کہ حج ختم ہونے سے پہلے کسی سے باتیں نہ کریں گی، آپ نے زینب سے کہا۔ باتیں کرو اس لیے کہ چپ کا حج جائز نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کا عمل ہے سنکر زینب نے گفتگو شروع کی۔ پوچھا آپ کون ہیں؟ کہا میں مہاجرین کا ایک فرد ہوں۔ پوچھا مہاجرین کے کس قبیلہ سے تعلق ہے؟ کہا قریش۔ پوچھا، قریش کی کس شاخ سے تعلق ہے۔ آپ نے فرمایا تم تو بہت سوال کرنے والی عورت ہو۔ میں ابوبکر ہوں۔ تب انھوں نے پوچھا کہ جاہلیت کے بعد یہ جو صالح دین اللہ نے ہمیں عطا کیا ہے، ہم کب تک اس پر قائم رہیں گے آپ نے جواب میں فرمایا تم اس دین پر اس وقت تک قائم رہو گے جب تک تمہارے ائمہ خود اس دین پر قائم رہیں گے اور تمہیں قائم رکھیں گے۔ انھوں نے پوچھا ائمہ کا مطلب کیا ہے۔ آپ نے کہا۔ کیا تمہارے قبیلے میں سردار اور ایسے ذی اثر لوگ نہیں ہیں جو اپنے قبیلے کے لوگوں کو حکم دیتے ہیں تو وہ لوگ ان کی اطاعت کرتے

ہیں۔ کہا ہاں ایسے لوگ تو ہیں۔ فرمایا اسی طرح سمجھ لو کہ ائمہ وہ سردار اور حاکم ہیں جو حکم دیتے ہیں اور لوگ ان کی اطاعت کرتے ہیں۔

زینب بنت المہاجر کی یہ حدیث محمد بن سعد نے بھی طبقات میں ان کے بھتیجے عبداللہ بن جابر احمسی کے واسطے سے روایت کی ہے اس حدیث سے کئی باتیں معلوم ہوتی ہیں

صدیق اکبر کا اسوہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنی وسیع ذمہ داریاں، براہ راست جس جانفشانی سے پوری کرتے تھے اس کا ایک اندازہ اس سے معلوم ہوتا ہے حدیث کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب یہ واقعہ ہوا اس وقت وہ امیر الحج بھی تھے اور امیر المومنین بھی۔ شرکاء حج چاہے وہ جس درجے کے بھی ہوں وہ ان سب کی نگرانی کر رہے تھے، دریافت حال کے لیے وہ ایک ایسی عورت کے پاس تشریف لے گئے جو دیہات کی رہنے والی تھیں اور ان سے پہلے کا کوئی تعارف نہ تھا۔ قیاس یہ ہے کہ آپ نے ان سے خیریت پوچھی ہوگی اور جب جواب نہ ملا ہوگا تو لوگوں سے دریافت کیا ہوگا کہ یہ بولتی کیوں نہیں؟ اگر وہ دریافت حال نہ کرتے تو شاید وہ غلط قسم کی نذر کے ساتھ اپنا حج پورا کرتیں اور حج مبرور سے محروم رہتیں۔

عبادت میں اطاعت زمانۂ جاہلیت میں لوگوں نے عبادات کے اندر بھی اپنی خواہش نفس سے طرح طرح کی چیزیں گھٹا بڑھا دی تھیں، ان کا نفس اور شیطان جس چیز کے بارے میں انہیں سمجھا دیتا تھا کہ اس سے خدا کا تقرب حاصل ہوتا ہے وہ اسے بلا تامل اختیار کر لیتے تھے وہ خدا کی بھیجی ہوئی شریعت اور ہدایت کو گم کر چکے تھے اور ان کے پاس کوئی ایسا ذریعہ باقی نہ تھا جس سے معلوم کرتے کہ خدا کی عبادت اس کی مرضی کے مطابق کس طرح کی جائے۔ انھوں نے محض ترک کلام کو بھی ایک عبادت اور ذریعۂ تقرب قرار دے لیا تھا، وہ ترک کلام کی نذر کے ساتھ اعتکاف بھی کرتے تھے اور حج بھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرح تقرب زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ یہی بات تھی جسے حضرت ابوبکر نے یوں فرمایا کہ "یہ جاہلیت کا عمل ہے" یہ الفاظ شریعت کے اس اہم اصول کی طرف رہنمائی کرتے ہیں کہ اللہ کی عبادت (پرستش) میں بھی اس کی اطاعت ضروری ہے، وہی پرستش قبول ہو سکتی ہے جو اللہ و رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کی جائے، اللہ کی پرستش میں بھی انسان آزاد نہیں ہے کہ جس طرح اس کا جی چاہے اسے پوجے۔

غلط نذر کا حکم اگر کوئی شخص ایسی نذر مان لے جو از روئے شریعت غلط ہو تو ایسی نذر کو پورا کرنا لازم نہیں ہے۔ فتح الباری میں ابن قدامہ کی المغنی کے حوالے سے لکھا ہے کہ بطور عبادت

محض ترک کلام شریعت اسلامیہ میں صحیح نہیں ہے اگر کوئی ایسی نذر مان لے تو اس کو پورا کرنا لازم نہیں ہے۔ غلط قسم کی نذر یا غلط قسم کی قسم کا مفصل فقہی حکم بیان کرنا یہاں مقصود نہیں ہے اس کے لیے فقہ کی کتابیں دیکھنی چاہییں۔

صدیق اکبر کا تواضع اس واقعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ خلیفۃ المسلمین جب تشریف لے گئے تو ان کے ساتھ کوئی لاؤ لشکر اور کوئی ایسا امتیاز نہ تھا جس سے پتہ چلتا کہ یہ حکومت اسلامیہ کے صدر ہیں، بلکہ صدیق اکبر کے تواضع کا یہ عالم تھا کہ خاتون کے سوال پر انھوں نے کوشش کی کہ اپنا نام بھی ظاہر نہ کریں۔

امامتِ صالحہ کی اہمیت اس حدیث سے جو سب سے اہم بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ امامت صالحہ یا خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی اور اس کی صلاح و فلاح میں وہ حیثیت حاصل ہے جو پورے جسم میں ریڑھ کی ہڈی کو یا انسانی بدن میں قلب کو حاصل ہوتی ہے۔ عرب خاتون کے سوال میں "الامر الصالح" کا جو لفظ آیا ہے اس کی تشریح میں حافظ ابن حجر نے ذیل کے الفاظ لکھے ہیں:۔

ای دین الاسلام وما اشتمل علیہ من العدل واجتماع الکلمۃ ونصر المظلوم ووضع کل شیء فی محلہ (فتح ۔ ج ۷)	یعنی امر صالح سے مراد ہے دین اسلام اور یہ دین عدل و انصاف، وحدت کلمہ، مظلوم کی مدد اور ہر شے کو اپنے مقام و محل پر رکھنے کی جن خوبیوں پر مشتمل ہے وہ سب اس سے مراد ہیں۔

اس کے معنی یہ ہوئے کہ خاتون نے جو بات پوچھی تھی وہ یہ تھی کہ جاہلیت کے کفر و شرک، انتشار کلمہ اور ہر طرح کے ظلم و جور کے بعد اللہ نے ہمیں جو دین حق عطا فرمایا ہے اور جو عدل و انصاف، وحدتِ کلمہ، مظلوم کی مدد اور زندگی کے تمام معاملات میں حسن ترتیب کی خوبیوں پر مشتمل ہے، ہم ایک ایسے مکمل دین پر کب تک قائم رہیں گے اور اس پر قائم رہنے کی صورت کیا ہوگی؟ یہ سوال عربی خاتون کی ذہانت اور دین اسلام سے ان کی محبت کی دلیل ہے۔ صدیق اکبر نے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ یہ ہے کہ جب تک حکومت ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں رہے گی جو خود اسلام کے احکام و قوانین پر عمل پیرا ہوں گے اور ساتھ ہی ساتھ اپنے ماتحت بندگان خدا کو ان پر چلاتے رہیں گے تم اس مکمل دین پر قائم رہو گے، تمہارا کلمہ ایک ہوگا، تم ایک جماعت بنے رہو گے، تمہارے معاشرے میں ہر طرف عدل و انصاف کا راج ہوگا

اور تمہاری زندگی کی کل سیدھی رہے گی۔ یہ حکومت اسلامیہ، یہ امامت صالحہ، یہ خلافت راشدہ، تمہارے اس مکمل دین پر قائم رہنے کا واحد ذریعہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام الناس کا دین وہی ہوتا ہے جو ان کے ملوک و امرا کا دین ہے، وہ زندگی کے معاملات میں انہیں کی پیروی کرتے ہیں۔ حضرت ابو بکر کے جواب کی تشریح میں حافظ ابن حجر نے لکھا ہے :۔

ای لان الناس علی دین ملوکھم فمن حاد من الائمۃ عن الحال مال و امال	یہ اس لیے کہ لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہوتے ہیں تو ائمہ و حکام میں سے جو بھی حق کی راہ سے ہٹے گا وہ خود باطل کی طرف مائل ہوگا اور دوسروں کو بھی مائل کرے گا۔
(فتح الباری ج ۷)	

جو لوگ غلط فہمی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام پر عمل کرنے کے لیے حکومت کی ضرورت نہیں یا حکومت مطلوب نہیں انہیں اس سوال و جواب پر غور کرنا چاہیے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے جواب کی صرف عقل و نقل ہی تصدیق نہیں کرتے بلکہ ہماری پوری تاریخ اس کی سچائی پر گواہ ہے۔ باقی رہے وہ لوگ جو بزعم خود عبقری وقت ہونے کی وجہ سے اسلامی حکومت کو شے مطلوب نہیں سمجھتے یا جو لوگ حکومت باطلہ کی کاسہ لیسی اور اپنے ذاتی مفاد کی بنا پر ایسی بات کہتے ہیں وہ خارج از بحث ہیں۔

علمی و ادبی ماہنامہ

سیارہ

نعیم صدیقی کی ادارت میں

اگست کو

افق صحافت پر نمودار ہو رہا ہے

دفتر
۶۔ بی
ذیلدار پارک
اچھرہ
لاہور

اسلام کا حاصل

(مولانا سید جلال الدین عمری)

(۱۴ر جون ۱۹۶۲ء کو اسلامک یوتھ آرگنائزیشن کی ایک تربیتی نشست میں پڑھا گیا)

"ایمان" اور "استقامت" یہ دو لفظ اسلام کا حاصل ہیں۔ اسلام جو آپ کی پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے ان دو لفظوں میں سمٹ کر آگیا ہے۔ ایمان کا تعلق عقیدہ سے ہے اور استقامت کا تعلق عمل سے۔ عقیدہ اور عمل کو ملانے کے بعد آپ کے دین کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ اب آپ کو اپنے دین کے سلسلے میں کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ ہماری جد و جہد کا مقصد خدا کی رضا اور آخرت کی کامیابی ہے۔ قرآن نے صراحت کی ہے کہ یہ چیز صرف ایمان و استقامت ہی سے مل سکتی ہے۔ آنے والے ہولناک دن کے خوف سے وہی شخص محفوظ ہوگا اور اسی کو خدا کے فرشتے جنت کی خوش خبری دیں گے جس کو اس دنیا میں ایمان و استقامت کی زندگی نصیب ہوگی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ	یقیناً جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے
اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا	پھر اس پر جم گئے تو ان پر فرشتے اتریں گے کہ تم
تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ	نہ خوف کھاؤ اور نہ غم کرو اور تمہارے لیے خوش خبری
الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ نَحْنُ	ہے جنت کی جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا ہم تمہارے
اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی	دوست ہیں دنیا کی زندگی میں اور آخرت میں اور
الْاٰخِرَةِ وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ	تمہارے لیے جنت میں وہ سب کچھ ہے جو تمہارا جی
وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ۝ نُزُلًا مِّنْ	چاہے اور جو کچھ تم مانگو وہ تم کو (یہاں) ملے گا۔
غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ ۝ (حم السجدہ: ۲۲-۳۰)	یہ مہمانی ہے غفور و رحیم خدا کی طرف سے۔

حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ نے اپنے اور ہمارے اور ساری دنیا کے محسن محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا حضورؐ اسلام کے بارے میں مجھے ایک ایسی بات بتا دیجیے کہ آپ کے بعد پھر کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ رہے۔ آپ نے فرمایا:

قُلْ اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ (مسلم، نسائی، احمد)　　کہو کہ میں خدا پر ایمان لایا اور پھر اس پر جم جاؤ۔

آج کی صحبت میں مجھے آپ کے سامنے ان ہی دو لفظوں (ایمان و استقامت) کی تشریح کرنی ہے۔ خدا میری اور آپ کی مدد فرمائے۔

ایمان

ایمان خدا پرستی کی اساس ہے۔ اسی سے مومن اور کافر کے درمیان فرق کیا جاتا ہے۔ انسان اس زندگی میں دو ہی طریقے اختیار کرسکتا ہے یا تو وہ خدا پرست ہوگا یا شیطان کے پیچھے چلے گا۔ ہر وہ راہ جو خدا کی بتائی ہوئی راہ سے ٹکراتی ہے شیطان کی راہ ہے اور یہ واقعہ ہے کہ شیطان کی راہ پر چلنے والا کبھی خدا تک پہنچ نہیں سکتا۔ اسلام آپ کے اندر خدا پرستی پیدا کرنا چاہتا ہے اور خدا پرستی کا آغاز ایمان سے ہوتا ہے۔ انسان اگر اپنے ایمان میں سچا اور مخلص ہے تو اس کی روح بندگی کے جذبات سے سرشار ہوتی ہے اور اس کی پوری زندگی پر خدا پرستی چھا جاتی ہے۔ طاغوت سے اس کا رشتہ کٹ جاتا ہے اور وہ خدا سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے۔

فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ　　پس جو شخص طاغوت کا انکار کر دے اور اللہ
يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ　　پر ایمان لے آئے تو اس نے ایک مضبوط رسی تھام لی
الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا (البقرہ ۲۵۶)　　جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے۔

خدا پر ایمان کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے خود کو پوری طرح خدا کے حوالے کر دیا ہے۔ آپ نے خدا کی غلامی میں اپنے آپ کو اس طرح دے دیا ہے کہ اب آپ پر کسی دوسرے کی حکومت قائم نہیں ہوسکتی۔ آپ دنیا میں صرف خدا کی غلامی کے لیے جی رہے ہیں اس کے علاوہ آپ کی زندگی کا اور کوئی مقصد نہیں ہے۔ ایمان کے ذریعہ آپ اس بات کا عہد کرتے ہیں کہ آپ خدا کے غلام اور اس کے حکم کے تابع ہیں۔ آپ ٹھیک اس طرح زندگی بسر کریں گے جس طرح ایک وفادار غلام زندگی بسر کرتا ہے۔ آپ اس طرف قدم بڑھائیں گے جس طرف خدا آپ کو قدم بڑھانے کا حکم دے اور آپ کے قدم اس طرف بڑھنے سے رک جائیں گے جس طرف بڑھتے ہوئے خدا آپ کو دیکھنا نہیں چاہتا آپ کا جو کام انجام پائے گا خدا کی عین ہدایت کے مطابق انجام پائے گا۔ صرف خدا کا فیصلہ آپ کے لیے فیصلہ ہوگا کسی دوسرے کا فیصلہ آپ کے سر کو نہ جھکائے گا۔

بندگی کا یہ عہد آپ سے آپ کا سب کچھ چھین لیتا ہے۔ اگر آپ اس عہد میں سچے ہیں تو کوئی چیز آپ کی اپنی نہیں رہتی بلکہ خدا کی ہو جاتی ہے۔ اس عہد کے بعد آپ کا ذہن وفکر آپ کا نہیں بلکہ خدا کا ہوگا۔ آپ اسی کے لیے سوچیں گے

اور اسی کی رضا کے لیے فکرمند ہوں گے۔ آپ کو خدا کی یاد کے سوا اور کوئی یاد نہ ستائے گی۔ آپ کے جذبات خدا کے لیے وقف ہوں گے۔ آپ کی خوشی اور غم کا محرک صرف خدا کی ذات ہوگی۔ آپ خدا کی محبت میں جئیں گے اور خدا کی محبت ہی میں اپنی جان بھی دیں گے۔ خدا کا حکم ہوگا تو آپ اپنے جانی دشمن کو سینے سے لگانے کے لیے تیار ہوں گے اور اگر خدا کی مرضی نہ ہو تو اپنی اولاد کو بھی اپنے سے جدا کرنے میں آپکو تامل نہ ہوگا۔ آپ کے تمام اوقات پر خدا کا قبضہ ہوگا۔ آپ ہر اس مصروفیت سے دامن کش ہوں گے جو آپ کو خدا سے دور کر دے۔ یہی صبح و شام جن کی رنگینیاں میں دوسرے کھوئے ہوئے ہیں آپ کے لیے خدا کی رضا جوئی کا ذریعہ ہوں گے۔ خدا کی خوشنودی آپ کا مقصود و مطلوب ہوگی اور آپ کی ہر جد و جہد کے پیچھے صرف یہ جذبہ کام کر رہا ہوگا کہ آپ خدا سے قریب ہو جائیں۔ آپ جس حال میں بھی ہوں گے سراپا بندگی کی تصویر ہوں گے۔ آپ کی روح اس طلب میں ڈوبی ہوگی کہ خدا آپ سے خوش ہو جائے۔ آپ کی بہترین تمنا یہ ہوگی کہ کل خدا سے آپ کا سامنا ہو تو اس کے سچے غلام کی حیثیت سے سامنا ہو۔ آپ اپنا سب کچھ لٹا چکنے کے بعد کانپتے ہوئے ہونٹوں سے بے تابانہ عرض کریں گے مولیٰ! جو کچھ تھا غلام نے حاضر کر دیا ہے اب تو قبول فرما!

إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ　　یقیناً میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی
وَمَمَاتِي لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ　　اور میری موت اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے

بعض اوقات انسان سوچتا ہے کہ اس کو ایمان کی دولت حاصل ہے لیکن اس کے باوجود اس کی زندگی خدا پرستی سے خالی ہوتی ہے۔ وہ اقرار کرتا ہے کہ خدا اس کا مالک اور آقا ہے لیکن خدا کی غلامی کے لیے اس کے اندر کوئی بے چینی اور تڑپ نہیں پائی جاتی۔ وہ خدا پر ایمان کا دعوی کرتا ہے لیکن خدا کے لیے قربانی اس کو ناگوار گزرتی ہے۔ وہ خدا سے محبت کا اظہار کرتا ہے لیکن دنیا کی محبت اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوتی ہے۔ وہ بار بار خدا کا نام لیتا ہے لیکن اس کے اعمال پر خدا کی حکومت قائم نہیں ہوتی۔ یہ ایک کھلا ہوا تضاد ہے۔ دنیا کی محبت اور خدا کی محبت کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتی۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ انسان کا سینہ خوفِ خدا سے کانپ رہا ہو اور اسے دوسروں کا خوف بھی کھائے جا رہا ہو۔ انسان کا خدا پر ایمان بھی ہو اور اس کا دل قربانی کے جذبے سے خالی بھی ہو۔ ایمان تو وہ چیز ہے جو باپ کے ہاتھ سے بیٹے کے حلق پر چھری چلا دیتا ہے اور بیٹے کو باپ کے خلاف کھڑا کر دیتا ہے جو جسم و جان کے رشتے سے زیادہ انسان سے خدا کے رشتہ کو مضبوط کرتا ہے جو مال و دولت کی محبت کو نکال کر خدا کی محبت کو دل کی گہرائیوں میں اتارتا ہے۔ جو انسان کو اس قابل

بناتا ہے کہ وہ خدا کو خوش کرنے کے لیے گھر بار اور قوم و وطن کی بندشوں کو توڑ دے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ
فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا
لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ
مِنْ دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا
بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ
أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ
(الممتحنہ)

تمہارے لیے اچھا نمونہ ہے ابراہیم اور اس کے
ساتھیوں میں جب کہ انھوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم
بری ہیں تم سے اور تمہارے معبودوں سے جن کی تم
خدا کے سوا پرستش کرتے ہو۔ ہم تمہاری چال چلن کے
منکر ہیں ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے
دشمنی اور عداوت ظاہر ہو چکی ہے۔ یہاں تک کہ تم اللہ
واحد پر ایمان لاؤ۔

ایمان انسان کو خدا کا وفادار اور غیر خدا کا باغی بناتا ہے۔ ایمان کی حقیقت جب کسی پر کھل جاتی ہے تو اس کے دل پر باطل کا قبضہ نہیں رہتا اور وہ پوری طرح خدا کی غلامی میں چلا آتا ہے۔ جھوٹ سے انسان اسی وقت دھوکا کھاتا ہے جب کہ وہ سچائی سے ناواقف ہوتا ہے۔ اگر سچائی بے نقاب ہو چکی ہے تو جھوٹ کا اثر ختم ہو جانا چاہیے جھوٹ کی اگر حکومت ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ سچائی ابھی نگاہوں سے روپوش ہے جس شخص کو یقین حاصل ہو کہ وہ خدا کا غلام ہے اور خدا کی غلامی کے سوا کوئی دوسری روش اس کے لیے صحیح نہیں ہے وہ کیسے خدا سے بغاوت کر سکتا ہے؟ اس کائنات میں سب سے بڑا واقعہ جو پیش آنے والا ہے وہ یہ ہے کہ انسان خدا کے عذاب یا ثواب سے دوچار ہونے والا ہے۔ خدا کے عذاب سے زیادہ خوفناک چیز اور کوئی نہیں ہے جس سے بچنے کی انسان فکر کرے اور خدا کے ثواب سے بڑی نعمت اور کوئی نہیں ہے کہ انسان اس کی طلب کرے جو شخص خدا کے عذاب سے بچنا چاہتا ہو اور خدا کی رحمتوں کا امیدوار ہو وہ کبھی خدا سے غافل نہیں ہو سکتا۔ یہ ناممکن ہے کہ ایمان کے ساتھ غفلت کی زندگی جمع ہو جائے۔ ایمان تو وہ چیز ہے جس سے مردہ دل زندگی پاتے ہیں یہ ممکن نہیں کہ انسان کے دل میں ایمان ہو اور وہ غفلت کی نیند سوتا رہے۔ ایمان محض ایک نظریہ نہیں جو ذہن میں پیدا ہوتا اور ذہن ہی میں دفن ہو جاتا ہے بلکہ یہ ایک انقلابی فکر ہے جو انسان کو سراسر بدل دیتا ہے جو انسان کو دنیا کے ہر اقتدار سے نکال کر ایک اکیلے خدا کے اقتدار میں پہنچا دیتا ہے۔

یہاں اس حقیقت کو نہ بھولیے کہ ایمان اپنے ثمرات اسی وقت پیدا کر سکتا ہے جب کہ وہ شعوری ایمان ہو۔ روایتی ایمان سے کبھی اعلیٰ نتائج ظاہر نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ اپنا کچھ وقت اس سوال کے حل کرنے میں صرف

کرنا نہیں چاہتے کہ کیا واقعۃً خدا ہے یا نہیں؟ اور اگر ہے تو وہ کیا چاہتا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ روایتی ایمان پر قانع ہیں اور اس کو شعوری اور حقیقی ایمان میں بدلنے کے لیے فکرمند نہیں ہیں اس لیے آپ کو ان بہترین ثمرات کی بھی توقع نہیں رکھنی چاہیے جو صرف شعوری ایمان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ روایتی ایمان وراثۃ کے طور پر ملتا ہے اور شعوری ایمان زندگی میں انقلاب بن کر داخل ہوتا ہے اگر آپ صرف روایتی ایمان کے حامل ہیں تو آپ کے اندر ایمانی انقلاب کبھی نہیں آسکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایمان ویقین کی جڑیں آپ کے دل میں اتر چکی ہوں اور آپ کے افکار و اعمال پر اس کی حکومت قائم ہو چکی ہو۔

یقیناً یہ اللہ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے کہ اس نے ہم کو ایسا خاندان اور ماحول عطا کیا جو خدا اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہے۔ اگر اس ماحول کے بجائے کسی دوسرے ماحول میں ہم پیدا کیے گئے ہوتے تو نہیں معلوم آج ہم خدا کا نام بھی لیتے یا نہ لیتے لیکن ایمان ایسی چیز نہیں جو ماحول کے زیر اثر اختیار کی جاتی ہے بلکہ ایمان ذہن وفکر کے فیصلہ کا نام ہے۔ یہ وراثت میں ملنے والا ساز و سامان نہیں بلکہ آپ کی اپنی کمائی ہوئی دولت ہے۔ بلاشبہ اصطلاحی معنی میں کسی ایسے شخص کو ہم کافر نہیں کہہ سکتے جو خدا اور اس کے رسول کا اقرار کرتا ہو۔ خواہ یہ اقرار اپنے گھر اور ماحول کی پیروی ہی میں کیوں نہ ہو۔ جو انسان دین کی بنیادی باتوں کو مانتا ہے وہ مومن ہے۔ کسی کو قطعاً یہ حق حاصل نہیں ہے کہ اس کو ایمان کے دائرہ سے خارج کر دے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ ایمان وہ ایمان نہیں جو انسان کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ وہ یقین نہیں جس سے کفر و شرک کے پردے چاک ہوتے ہیں۔ یہ ایمان اس روح سے خالی ہے جو کسی انسان میں داخل ہوتا ہے تو اس کو ایک نیا وجود عطا کرتا ہے۔ حق کی آواز پر لبیک کہنے کا نتیجہ لازماً یہ نکلنا چاہیے کہ انسان کو ایمانی زندگی نصیب ہو۔ اگر ایمانی زندگی نصیب نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حق کی آواز اس کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں اور اگر پہنچی تو اس کو اس نے قبول کیا نہیں۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِیْبُوْا	اے ایمان والو اللہ اور اس کے رسول کی
لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا	پکار پر لبیک کہو جب کہ رسول تمہیں اس چیز کی طرف
یُحْیِیْكُمْ (الانفال: ۲۴)	بلائے جو تمہیں زندگی بخشنے والی ہے۔

ہر انقلاب دلیل اور برہان کی روشنی میں آتا ہے۔ بے دلیل دعویٰ کبھی کسی انسان کو بدل نہیں سکتا۔ اس سے وقتی جوش و خروش تو پیدا ہو سکتا ہے لیکن وہ طاقت حاصل نہیں ہو سکتی جو انسان کو مسلسل سرگرم عمل رکھتی ہے بے دلیل دعویٰ انسان کے اندر بزدلی پیدا کرتا ہے لیکن جس دعوے کے پیچھے دلیل ہو وہ انسان کو جرأتمند اور باحوصلہ بنا دیتا ہے

آپ کسی ایسے مقصد کے لیے قربانی نہیں دے سکتے جس کا حق ہونا آپ کے نزدیک ثابت نہ ہو لیکن اگر آپ نے کسی مقصد کو حق سمجھ کر قبول کیا ہے تو قربانی کی راہ آپ کے لیے آسان ہو جائے گی۔ اس کے لیے آپ اپنا سب کچھ لٹا سکیں گے اس کی خاطر آپ کی دنیا آپ سے چھن جائے تو بھی آپ کو غم نہ ہوگا۔ آپ کو یہ پریشانی نہیں ستائے گی کہ آپ کا مستقبل کیا ہوا اور آپ کے بچوں کا مستقبل کیا ہو؟ آپ اس فکر سے بے نیاز ہوں گے کہ آپ کی قربانیوں کا کوئی صلہ آپ کو مل رہا ہے یا نہیں؟ جس مقصد کو آپ نے حق سمجھ کر پورے شعور کے ساتھ قبول کیا ہے وہ ہمیشہ آپ کی نگاہوں کے سامنے ہوگا اس سے آپ کے سینے میں حرارت پیدا ہوگی اور آپ کے عزائم کو مسلسل تحریک ملتی رہے گی۔ اس کے ہوتے ہوئے آپ غفلت اور بے حسی کی شکایت نہ کریں گے۔ آپ کسی بھی چیز کی محبت میں اس مقصد کو بھولنے والے نہ ہوں گے۔

یہی حال خدا پر ایمان کا ہے۔ اگر آپ نے خدا کے تصور کو پورے شعور کے ساتھ اپنے ذہن میں جگہ دی ہے تو ممکن نہیں کہ آپ کے فکر و عمل کی دنیا میں جمود پایا جائے اور آپ کے اندر کوئی ہلچل اور اضطراب نہ ہو۔ اگر یہ ناممکن ہے کہ آگ ہو اور اس کی گرمی نہ محسوس کی جائے تو یقین مانیئے کہ اس سے زیادہ یہ بات ناممکن ہے کہ ایمان کی حرارت موجود ہو اور انسان کا دل سرد خانہ بنا رہے۔ قرآن نے پیغمبروں کی تاریخ بیان کی ہے۔ یہ تاریخ بتاتی ہے کہ خدا کے پیغمبر اندھی تقلید نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے موقف پر علیٰ وجہ البصیرت جمے ہوئے تھے۔ وہ جو کچھ کہتے دلیل کی روشنی میں کہتے ان کے ہر دعوے کے پیچھے استدلال کی قوت ہوتی۔ ہر پیغمبر اِنِّیْ عَلٰی بَیِّنَۃٍ مِّنْ رَّبِّیْ کے اعلان کے ساتھ اپنی قوم کے سامنے آتا یہی دلیل و برہان کی قوت تھی جس کی وجہ سے پیغمبروں کی تاریخ مسلسل جد و جہد کی تاریخ، قربانی اور ایثار کی تاریخ اور عزم و حوصلہ کی تاریخ بن گئی۔

ایمان کا لذت شناس ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان خدا کو مان کر پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ اس کی روح اس احساس سے لازوال مسرت محسوس کرے کہ اس کا رب خدا ہے۔ اس کی نظر صرف خدا پر جمی رہے خدا کے علاوہ کسی اور چیز میں اس کے لیے کوئی کشش نہ ہو۔ خدا کا دین اس کا محبوب دین بن جائے اور خدا کے رسول کو وہ اپنا سچا اور حقیقی قائد تصور کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ فرماتے ہیں:-

ذَاقَ طَعْمَ الْاِیْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّ بِالْاِسْلَامِ دِیْنًا وَّ بِمُحَمَّدٍ

اس شخص نے ایمان کا مزا چکھ لیا جو راضی ہو گیا اس بات سے کہ اللہ اس کا رب ہے، اسلام اس کا

رَسُوْلاً (مسلم) دین ہے اور محمد اس کے ہادی اور خدا کے رسول ہیں

رضا کا یہ اعلیٰ مقام روایتی ایمان کے ذریعہ کبھی نہیں حاصل ہو سکتا۔ اس کے لیے اندھا یقین کافی نہیں ہے بلکہ ایسا ایمان چاہیے جو عقل و بصیرت کی روشنی میں حاصل کیا گیا ہو اور جس کو پورے شعور کے ساتھ دل و دماغ میں جگہ دی گئی ہو۔

ایمان خدا کی غلامی کا نام ہے اور خدا کی غلامی ایک اونچا منصب ہے جو کسی کو آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ خدا اپنی غلامی کے لیے صرف اس شخص کو قبول کرتا ہے جو دل و جان سے اس کے لیے وقف ہو جانا چاہتا ہو۔ آپ اپنا بہترین وقت، اپنا قیمتی سرمایہ، اپنی عمدہ صلاحیتیں خدا کے حوالے کرنے کے لیے تیار رہیں تو خدا بھی آپ کو اپنی غلامی میں لینے کے لیے تیار ہے۔ آپ اپنا سب کچھ خدا کی راہ میں صرف کر دیجیے تو آپ کو عبدیت کا مقام بلند حاصل ہو گا۔ اگر آپ اس مکمل حوالگی کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور خدا کی غلامی کو اپنی زندگی میں ایک ذیلی حیثیت دینا چاہتے ہیں تو خدا کو ایسی ناقص غلامی منظور نہیں ہے۔ بہت سے کاروباری اپنا ایک حقیقی کاروبار رکھتے ہیں جس پر وہ اپنی اصل قوت صرف کرتے ہیں اور ایک ان کا ضمنی کاروبار ہوتا ہے جس کو وہ اپنے فاضل اوقات میں انجام دیتے ہیں لیکن آپ خدا کی بندگی کو ضمنی طور پر اختیار نہیں کر سکتے۔ خدا کی غلامی تو آپ کا مقصود و مطلوب ہے اس کے لیے آپ کو اپنی پوری زندگی کا سودا کرنا پڑے گا۔ اگر آپ خدا کے غلام بننا چاہتے ہیں اور اپنے اس ارادے میں مخلص ہیں تو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کی غلامی میں دے دیجیے۔ جو شخص کسی ایک آقا کا غلام بن چکا ہو اس کے لیے یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی دوسرے کی غلامی کو پسند کرے۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ آپ غیر کی غلامی میں لگے ہوئے ہوں اور بیکار اوقات میں خدا کا نام لے کر اس کی غلامی کی سند حاصل کر لیں۔ خدا بے حد غیور ہے وہ شرک کو گوارا نہیں کرتا۔ جو شخص اس کی غلامی کے ساتھ دوسرے کی غلامی کا پیوند لگائے وہ ایسی غلامی سے بے نیاز ہے وہ اپنی غلامی میں صرف اس شخص کو لیتا ہے جو غلامی کے ہر بندھن کو توڑ کر تنہا اس کی غلامی قبول کرلے۔ خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم خدا کا یہ قول نقل کرتے ہیں:۔

انا اغنی الشرکاء عن الشرک
من عمل عملا اشرک فیہ معی غیری
ترکتہ وشرکہ وانا منہ بری ھو
للذی عملہ (مسلم)

میں حصہ داروں میں سب سے بے نیاز حصہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کام کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرتا ہے تو میں اس کو اور اس کے حصہ کو چھوڑ دیتا ہوں اور میں اس سے الگ ہوں اس کا سارا عمل اسی کے لیے ہے جس

اگر کوئی شخص خدا کی بندگی میں اس طرح آتا ہے کہ اپنے لیے کچھ باقی رکھتا ہے تو صحیح معنی میں وہ ابھی خدا کی

بندگی میں داخل نہیں ہوا۔ جب تک انسان اپنی ہر چیز سے دست کش نہ ہو جائے خدا کا بندہ نہیں بن سکتا۔ خدا کا مطالبہ ہم سے جزوی غلامی کا نہیں بلکہ کلی غلامی کا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ (البقرہ ۲۰۸)

اے ایمان والو تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے پیچھے نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے

ایمان آپ سے سچی وفاداری چاہتا ہے۔ ایمان آپ سے مسلسل قربانی چاہتا ہے، ایمان آپ سے پر عزم جد وجہد چاہتا ہے۔ ایمان آپ سے پر خلوص محبت چاہتا ہے۔ ایمان چاہتا ہے کہ آپ اس کے لیے اپنا خون دل نچوڑ کر رکھ دیں۔ ایمان چاہتا ہے کہ آپ پوری طرح خدا کے لیے وقف ہو جائیں اور خدا کی رضا کے لیے اپنے آپ کو بیچ دیں۔ جو شخص اس طرح بک جانے کے لیے تیار نہیں ہے تو اس کا ایمان وہ ایمان نہیں جس کے نتیجہ میں خدا کی رحمتیں نازل ہوتی ہیں اور اس کے انعامات کی بارش ہوتی ہے۔

استقامت

خدا پر ایمان ایک زبردست انقلاب ہے جو آپ کے فکر و عمل کی دنیا میں نمودار ہوتا ہے اور آپ کو یکسر بدل کر رکھ دیتا ہے۔ یہ انقلاب کسی وقتی جوش کا نام نہیں ہے بلکہ یہ صحیح معنی میں آپ کے اندر پیدا ہوتا ہے تو آخر وقت تک باقی رہتا ہے۔ ایمان کی زندگی حق پر ثابت قدمی کی زندگی ہے۔ اگر آپ پورے شعور کے ساتھ ایمان لائے ہیں تو آپ کو استقامت نصیب ہوگی۔ آپ کو ایسی روح ملے گی جس کے عزائم کو دنیا کی کوئی بھی قوت شکست نہیں دے سکتی۔ آپ حق پر ہر حال میں جمے رہیں گے۔ کوئی بڑے سے بڑا خوف اور کوئی بڑی سے بڑی لالچ آپ کو حق کی راہ سے نہ ہٹا سکے گی۔

خدا کو اگر آپ مانتے ہیں تو اس کا مطالبہ ہے کہ آپ اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز سمجھیں۔ آپ کی زندگی آپ کی سب سے قیمتی متاع ہے آپ کے اندر یہ عزم ہونا چاہیے کہ اس قیمتی متاع کو خدا کے نام پر قربان کر دیں۔ انسان دنیا کے اندر راحت اور آرام کا طالب ہے آپ کے اندر یہ حوصلہ ہونا چاہیے کہ خدا کے لیے اپنی ہر راحت کو چھوڑ دیں۔ مال و دولت جس کو کوئی شخص کھونا نہیں چاہتا آپ کا یہ فیصلہ ہونا چاہیے کہ اس میں آپ کا دامن نہیں الجھے گا۔ زندگی کی تمنا، مال کی محبت اور آرام کی طلب آپ کو قربانی سے روکتی ہے لیکن یہ واقعہ

ہے کہ ایمان کے درجات مسلسل قربانی ہی سے طے ہوتے ہیں۔ یہاں پاتا وہ شخص نہیں جو اپنے لیے کچھ باقی رکھتا ہے بلکہ وہ شخص پاتا ہے جو اپنا سب کچھ لٹا دے اور خالی ہاتھ ہو جائے۔ مبارک ہے وہ جو خدا کی محبت میں ہر دوسری محبت کو بھول جائے اور خدا کی رضا کے لیے ہر اس چیز سے ہاتھ اٹھا لے جو خدا کی ناخوشی کا سبب بنے

خدائے تعالیٰ نے آپ کو اس طرح نہیں پیدا کیا ہے کہ ایمان کی راہ آپ کے لیے بالکل آسان کر دی گئی ہو بلکہ آپ کے نفس کے اندر اس راہ سے بغاوت اور سرکشی کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ آپ کو ایمان کی زندگی اس وقت نصیب ہوگی جب کہ آپ نفس کی اس بغاوت کو کچلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ایمان جس قسم کی زندگی چاہتا ہے وہ راحت اور آسائش کے ساتھ حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیے سخت ریاضت اور شدید کشمکش کی ضرورت ہے۔ آپ کے نفس کی سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ وہ آزاد رہے اور اس کو اپنی خواہشات کے پورا کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو لیکن ایمان آپ کو بے قید زندگی گزارنے کی اجازت نہیں دیتا وہ آپ کو خدا کی مرضیات کا پابند بناتا ہے۔ یہ دنیا جو آپ کے چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے اس میں بڑی کشش اور جاذبیت ہے۔ آپ کا نفس چاہتا ہے کہ ہر قیمت پر آپ اس کو حاصل کریں خواہ اس کے لیے آپ کو اپنا ایمان ہی کیوں نہ بیچنا پڑے اگر آپ کے نزدیک ایمان قیمتی ہے تو اس لذیذ اور پرکشش دنیا کو چھوڑنا پڑے گا جو یقیناً ایک مشکل کام ہے لیکن آپ خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں تو لازماً یہ مشکل کام آپ کو انجام دینا پڑے گا۔

استقامت کے بغیر آپ دعوت دین کا وہ بارِ عظیم اٹھا نہیں سکتے جو خدا کی طرف سے آپ پر ڈالا گیا ہے۔ اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کو اپنے نفس پر پوری طرح قابو حاصل ہو۔ آپ کے عزم میں اتنی پختگی ہو کہ نفس کی خواہشات آپ کو اپنی طرف کھینچ رہی ہوں اور آپ ان کو ٹھکرا کر حق سے چمٹے رہیں۔ آپ کو اپنے ایمان سے اتنی محبت ہو کہ دنیا اس کو کسی قیمت پر خرید نہ سکے۔ اس کے بغیر آپ کی زبان پر تو بار بار دین کا نام آتا رہے گا لیکن دین کا کام آپ کر نہیں سکیں گے۔

خدا کی راہ میں یہ استقامت وقتی طور پر مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کو زندگی کی آخری سانس تک باقی رہنا چاہیے۔ وقتی جوش و خروش تو دنیا کا ہر گھٹیا مقصد پیدا کر سکتا ہے لیکن ایمان آپ کے اندر ٹھوس اور پائیدار انقلاب چاہتا ہے وہ کسی خاص وقت میں یا کسی خاص معاملہ میں آپ سے قربانی کا طالب نہیں ہے بلکہ ہر حال میں اور ہر معاملہ میں آپ سے قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وقتی جوش اور جذبے کے تحت بڑی سے بڑی قربانی آسان ہے لیکن کسی بھی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو ہمیشہ کے لیے اپنی زندگی سے خارج کر دینا آسان نہیں ہے ایسا بہت دیکھا گیا ہے کہ ایک

شخص کسی ہنگامی فضا سے متاثر ہو کر حیرت انگیز ایثار اور قربانی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پاتا کہ اس کا یہ جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ جس کو نہ اپنے مال کی پرواتھی اور نہ اپنی جان کی وہ ہر وقت اپنی جان و مال کے لیے فکرمند رہنے لگتا ہے۔ جو سینہ جذبات ایمانی سے سرشار تھا وہ اپنی حرارت کھو بیٹھتا ہے۔ جو سپاہی دین کی محبت میں رات بھر جاگ سکتا تھا اب اس کے اوقات اتنے گھر جاتے ہیں کہ وہ اسی دین کی خاطر ایک گھنٹہ نہیں نکال سکتا۔ جو شخص اپنی انتہائی مصروفیت میں خدا سے غافل نہیں ہوتا تھا وہ لمحات فرصت میں بھی خدا کو کم ہی یاد کرتا ہے۔ جو شخص تنگی میں دین کے تقاضوں سے غافل نہیں تھا وہ وسعت کے باوجود ان تقاضوں کو فراموش کر جاتا ہے۔ جو شخص دین کی فکر میں اپنی راحت اور زمین کو بھول جاتا تھا وہ اپنے معمولات تک میں کوئی تبدیلی کرنا نہیں چاہتا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ قربانیاں وقتی جوش و خروش اور کسی دوسرے محرک کا نتیجہ تھیں لیکن وہ اس کو ایمان کی محبت کا ثمرہ سمجھ رہا تھا۔ ایمان جب صحیح معنی میں دل میں اتر جاتا ہے تو ہر قدم پر ذوقِ شہادت بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ ایمان کی لذت صبح و شام کی گردش کے ساتھ کم نہیں ہوتی بلکہ ہر آنے والا دن اس میں اور اضافہ کرتا ہے — یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے۔

دین کی طرف بلانا آپ کا فرض ہے۔ اس فرض سے آپ اسی وقت سبکدوش ہو سکتے ہیں جب کہ آپ اپنی پوری قوت صرف کر دیں اور اپنے آپ کو اس میں کھپا دیں۔ ایمان کی زندگی رہبانیت کی زندگی نہیں ہے کہ آپ کسی گوشے میں بیٹھ کر خدا کی یاد میں مست ہو جائیں اور اپنے باطن کی کیفیات میں اس طرح گم رہیں کہ آپ کو باہر کی دنیا کی خبر بھی نہ ہو۔ ایمان کی زندگی اس واقعہ کا نام ہے کہ آپ دل و جان سے خدا کی غلامی میں لگ جائیں اور اس کی راہ میں مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔ اگر آپ اپنی باطنی کیفیات میں اس طرح کھو گئے کہ خدا کے دین کی بھی آپ کو فکر نہ ہوئی تو گویا آپ نے ان کیفیات کی پرستش شروع کر دی۔ آپ خدا کے غلام نہیں رہے بلکہ اپنی کیفیات کے غلام بن گئے۔

خدا پر ایمان ایک بہت بڑا انقلابی پیام ہے۔ جب آپ ایمان لاتے ہیں تو اس انقلاب کے داعی بن جاتے ہیں۔ خدا انسانوں کے اندر جس قسم کی تبدیلی لانا چاہتا ہے آپ اس تبدیلی کا واسطہ ہیں۔ کلمۂ حق جن انسانوں تک نہیں پہنچ سکا ہے آپ کا کام ہے کہ آپ ان تک اسے پہنچا دیں۔ خدا کی جو مخلوق غفلت کی نیند سو رہی ہے آپ کا فرض ہے کہ اسے جگائیں اور جن حقیقتوں سے وہ بے خبر ہے آپ کی ذمہ داری ہے کہ ان حقیقتوں سے اسے باخبر کریں۔ ایمان کا دعویٰ کر کے آپ نے کچھ چیزیں کو پایا ہے اور کچھ چیزوں کو کھویا ہے۔ یہ پانا اور کھونا آپ کا

شعوری اور ارادی عمل ہے۔ آپ نے جو کچھ پایا وہ آپ کے ارادے کے بغیر آپ کو نہیں مل گیا ہے اور آپ نے جو کچھ کھویا ہے غفلت اور بے شعوری میں نہیں کھویا ہے۔ یہ دنیا جس کی تمنائیں بے شمار انسان اپنے رات اور دن کاٹ رہے ہیں اس دنیا کو آپ نے وبے وجہ نہیں چھوڑا ہے بلکہ خدا کی رضا کی طلب میں چھوڑا ہے۔ آپ نے اپنے نفس کی خواہشات کو بے مقصد نہیں کچلا ہے بلکہ خدا کی محبت میں کچلا ہے سو آپ نے اپنے اور اپنے خاندان کے مفاد کو بے سبب نقصان نہیں پہنچایا ہے بلکہ خدا کی طلب میں نقصان پہنچایا ہے۔ اگر آپ اپنے اس اقدام کو حق سمجھتے ہیں تو حق کا تقاضا ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچایا جائے۔ آپ کے اندر اس بات کی بے پناہ تڑپ ہونی چاہیے کہ جو عمل آپ کی ذات کے اندر ہو چکا ہے وہ دوسروں کے اندر بھی ہو۔ آپ جن چیزوں سے محروم ہو چکے ہیں ساری دنیا ان سے محروم ہو جائے اور آپ کو جو دولت ملی ہے وہ ہر ایک کے حصہ میں آجائے۔ یہ بات ایمان کی غیرت کے منافی ہے کہ آپ کے کانوں میں خدا سے بغاوت کی آواز گونج رہی ہو اور آپ کے اندر اسے مٹانے کے لیے کوئی اضطراب اور بے چینی نہ ہو۔

دعوت کا یہ کام جو ایمان لانے کے بعد آپ پر عائد ہو چکا ہے زبردست استقامت چاہتا ہے۔ خدا پر ایمان کوئی معمولی اقدام نہیں ہے اس اقدام کے ذریعہ آپ نے ساری شیطانی قوتوں کو چیلنج کیا ہے' آپ نے حق کا نام لے کر باطل کو جنگ کی دعوت دی ہے اس لیے یقین ہے کہ باطل اپنی تمام قوتوں کے ساتھ آپ کو کچلنے کے لیے میدان میں آئے گا آپ کو سخت سے سخت مصائب سے گزرنا پڑے گا اور ہر ہر طریقہ سے آپ کا امتحان لیا جائے گا کیونکہ یہ باطل کے مزاج کے خلاف ہے کہ حق کو وہ پھلنے پھولنے کے مواقع فراہم کرے۔ اگر آج بھی آپ اپنے خدا پرست ہونے کا صحیح معنی میں اعلان کر دیں تو اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں کہ باطل آپ کو اپنے گھر سے بے گھر بنا دے گا' وہ آپ کو اپنے بستر پر چین کی نیند سونے نہیں دے گا۔ خدا کی یہ وسیع زمین آپ کے لیے تنگ کر دی جائے گی اور آپ کے دوست بھی آپ کے دشمن کی صف میں جا کھڑے ہوں گے۔ ایسے ہی نازک موقع کے لیے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک صحابی حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو نصیحت فرمائی تھی۔ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَإِنْ قُتِلْتَ أَوْ حُرِّقْتَ (احمد) آپ کے اندر یہ عزم ہونا چاہیے کہ خواہ آپ کا سر تن سے جدا کر دیا جائے یا آپ کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا جائے آپ خدا کی غلامی سے انحراف نہیں کریں گے۔

استقامت کی راہ بڑی ہی کٹھن راہ ہے۔ اس میں بڑے بڑے ارباب عزیمت کے قدم لغزش کھا جاتے ہیں۔ انسان پر جب ہر طرف سے مصیبتیں آپڑتی ہیں اور خدا کے فیصلہ کے تحت اس کو آزمایا جاتا ہے تو وہ گھبرا اٹھتا

ہے۔ وہ حق کو چھوڑنا نہیں چاہتا لیکن قربانی کے جذبات اس کے اندر سرد پڑ جاتے ہیں وہ آزمائشوں کے بغیر خدا کی جنت میں پہنچنا چاہتا ہے حالانکہ خدا کا قانون ہے کہ وہ آزمائے بغیر کسی کو اس نعمت بھرے گھر میں داخل نہیں کرتا۔ انسان کا تعلق جب حق سے کمزور پڑ جاتا ہے تو اس کے سوچنے کا انداز بدل جاتا ہے اور اس کی نفسیات میں تبدیلی آجاتی ہے وہ طبعی طور پر گو زندہ ہوتا ہے لیکن اس کی جذباتی موت واقع ہو چکی ہوتی ہے وہ اب یہ نہیں دیکھتا کہ حق کا اس سے کیا مطالبہ ہے بلکہ یہ دیکھنے لگتا ہے کہ دوسرے کیا کر رہے ہیں۔ اس کو اگر آپ اس کی ذمہ داریاں یاد دلائیں تو وہ ان ذمہ داریوں کا انکار نہیں کرے گا بلکہ وہ آپ کی زندگی کا جائزہ لینے لگے گا تاکہ بتا سکے کہ آپ بھی اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہیں اور آپ اس کو نصیحت کرتے ہوئے خود کو بھول رہے ہیں۔ اگر آپ اس سے کہیں کہ حق تم سے تمہاری جان و مال کی قربانی چاہتا ہے تو وہ یہ نہیں کہے گا کہ اس کو جان و مال حق سے زیادہ محبوب ہیں بلکہ اس کا جواب یہ ہوگا کہ فلاں صاحب بھی تو سو رہے ہیں آپ ان کو کیوں نہیں جگاتے اگر وہ اپنے کاروبار میں مست ہیں تو میں نے ہی کون سا جرم کیا اگر اپنا وقت نہ نکال سکا۔ ایسا شخص حق سے تعلق رکھے گا بھی تو اپنے لیے عزیمت کی راہ پسند کرے گا۔ اس کی زندگی میں اس کی اپنی ذات کا فائدہ مقدم ہوگا اور حق کا فائدہ پیچھے ہو جائے گا اس کی پستی اس حد کو پہنچ سکتی ہے کہ اس کی زبان حق کے اظہار سے عاجز ہوگی۔ وہ جب دیکھے گا کہ حق کی صحیح ترجمانی اس کو آزمائشوں میں ڈال رہی ہے اور باطل اپنے غصہ کا اظہار کر رہا ہے تو وہ ایسی راہیں تلاش کرے گا کہ جو حق کو باطل سے قریب کر دیں۔ وہ قدم قدم پر باطل کو یقین دلانے کی فکر کرے گا کہ وہ اس کا ساتھی ہے۔ وہ باطل کو اکھاڑ پھینکنا نہیں چاہتا بلکہ اس کے سایہ میں جینے کا آرزومند ہے حکمتیں اور مصلحتیں اس کی آواز کو کمزور کر دیں گی۔ وہ حق پر چلتے چلتے تھک سا جائے گا۔ اس کے قدم لڑکھڑانے لگیں گے اور اس کے عزائم کمزور پڑ جائیں گے۔ اس نے جن حوصلوں اور ارادوں کے ساتھ اپنے سفر کا آغاز کیا تھا وہ سارے حوصلے اور ارادے پست ہو جائیں گے۔ وہ سکون و راحت کا جویا اور آرام کا طالب ہوگا۔ وہ اپنی منزل کی دوری اور راہ کی خوفناکی سے گھبرا اٹھے گا۔ اب آپ اس کی زبان سے کلمات عزیمت کے بجائے حالات کی ناسازگاری کا شکوہ سنیں گے، وہ بعض اوقات کھل کر اپنی کمزوریوں کا اعتراف بھی کرے گا، اس کو بار بار مالی مشکلات اور خانگی پریشانیوں کا احساس ستائے گا وہ اپنی کمزوریوں کی ایک لمبی فہرست سامنے رکھنے کے بعد یہ کہہ کر خوش اور مطمئن ہو جائے گا کہ ان حالات میں دین کی خدمت جو کچھ ہو رہی ہے وہ بھی بہت ہے۔

لیکن یاد رکھیے کہ خدا کی راہ میں ہونے والی آزمائشوں سے گھبرا کر جو شخص اپنے قدم پیچھے ہٹاتا ہے وہ اپنے

دعویٔ ایمان کی توہین کرتا ہے ۔ اس نے اپنے عمل سے اس چیز کی تکذیب کی ہے جس کی تصدیق اپنے قول سے کر چکا ہے ۔ اس نے وہ ناپاک روش اختیار کی ہے جس سے اس کے پاک عقیدہ کی رسوائی ہوتی ہے ۔ اس نے حق کے مقابلہ میں دنیا کو ترجیح دے کر اس بات کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ حق کی قدر و قیمت اس کے پاس یہ نہیں ہے کہ اس کے لیے دنیا قربان کی جا سکے ۔ اس کے نزدیک حق محبوب نہیں رہا بلکہ دنیا محبوب بن گئی حق اتباع کے قابل نہیں رہا بلکہ دنیا قابل اتباع بن گئی ۔ اس نے ایمان کے ذریعہ اس بات کا اظہار کیا تھا کہ زندگی اس کی نہیں بلکہ خدا کی ہے اب حق کو چھوڑ کر وہ یہ ظاہر کر رہا ہے کہ زندگی وہ متاع ہے جس کو وہ خدا کے ہاتھ بھی بیچنا نہیں چاہتا ۔ خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذؓ کو نصیحت کی تھی ۔ یہی نصیحت میرے اور آپ کے لیے بھی ہے ۔

اِیَّاكَ وَالْفِرَارَ مِنَ الزَّحْفِ وَ اِنْ هَلَكَ النَّاسُ (احمد)

میدان جہاد سے نہ بھاگو خواہ سب لوگ ہلاک ہی کیوں نہ ہو جائیں ۔

اگر حق کی گواہی دینے والے ایک ایک کر کے ختم ہو رہے ہیں ، اگر خدا کا نام لینے والے میدان چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں اگر آپ کے چاروں طرف خدا کی محبت پر دنیا کی محبت غالب آچکی ہے ، اگر سارے انسان اپنی دنیا بنانے کی فکر میں ہیں ، اگر لوگوں کو ان کی خواہشات حق سے روک رہی ہیں ، اگر بڑے بڑے مدعیان علم و تقویٰ خدا کے دین کے لیے اپنی راحت اور آرام کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو یقین جانیے کہ یہ آپ کی بہت بڑی خوش قسمتی ہے کہ حق کے لیے سر کٹانے کی سعادت آپ کو مل جائے ۔ خدا کی طرف سے ہونے والے امتحانات آپ کے لیے ترقی کے مواقع فراہم کرتے ہیں ان امتحانات میں کامیاب ہو کر آپ خدا کو خوش کر سکتے ہیں ۔ یہ ارتقاء کے زینے ہیں جو اس لیے فراہم کیے گئے ہیں کہ آپ ان کے ذریعہ خدا کی رضا کے بلند ترین مقام تک پہنچ سکیں جب ایسا ہو کہ آپ کو آزمائش کے سخت ترین مراحل سے گزارا جائے ، جب آپ کو آگ کے شعلوں کے درمیان گزرنا پڑے اور جب قید خانوں کی تاریک کوٹھریاں آپ کا انتظار کرنے لگیں تو سمجھ لیجیے کہ یہی آپ کی کامیابی کا وقت ہے ۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا خدا آپ کی طرف متوجہ ہے اور اس نے اپنی بے پایاں نوازشات کے لیے آپ کو منتخب کیا ہے ۔ حق وہ سب سے قیمتی متاع ہے جو انسان کو ملتی ہے اس کے لیے اگر جان بھی دینی پڑے تو یہ معمولی قربانی ہوگی اگر آپ حق کو اس لیے چھوڑتے ہیں کہ حق کی راہ اجنبیت کی راہ ہے اور کوئی آپ کا ساتھ دینے والا نہیں ہے تو آپ نے حق کی قدر نہیں پہچانی ۔ اسی طرح اگر آپ حق کی اطاعت اس وجہ سے قبول کرتے ہیں کہ آپ کا ماحول حق پرست ہے یا باطل آپ کا قدر شناس نہیں ہے تو یہ حق کی اتباع نہیں بلکہ ماحول کی اتباع ہے ۔ خوب یاد رکھیے کہ خدا

کی عدالت میں یہ بہت بڑا جرم ہے کہ حق کی راہ میں آپ اپنا بڑھایا ہوا قدم واپس لیں۔ جب خدا کا دین آپ سے آپ کی زندگی چاہ رہا ہو اور جب آپ کو یہ موقع ملا ہو کہ اپنی عزیز ترین متاع کو دے کر خدا کے لطف و کرم کے مستحق ہو جائیں تو یہ آپ کے ایمان کے منافی ہے کہ آپ اس موقع کو کھو دیں۔ آپ کی کامیابی اسی میں ہے کہ حق کی راہ میں اپنی ساری پونجی لٹا دیں اور دامن جھاڑ کر خدا کے حضور پہنچ جائیں کیونکہ اس طرح کل آپ کے حصہ میں وہ دولت آنے والی ہے جس سے بہت سے انسان محروم ہوں گے اور آپ کی کامیابی کو دیکھ کر حسرت کے ساتھ کہیں گے کاش کہ ہم نے بھی اپنے خدا کو خوش کیا ہوتا۔ کاش کہ ہماری دنیا ہم سے چھین لی جاتی۔ کاش کہ ہماری آخرت برباد ہوتی۔

محترم ساتھیو! یہ دور جس سے ہم گزر رہے ہیں حق کے لیے انتہائی ناساز گار ہے۔ اس دور میں خدا کا نام لینا اپنے آپ کو مصیبتوں کا ہدف بنانا ہے۔ حالات اشارہ کر رہے ہیں کہ وہ وقت بھی آنے والا ہے جب کہ کلمۂ حق کہنے پر زبان گدی سے کھینچ لی جائے۔ خدا کی راہ پر چلنا انگاروں پر چلنے سے زیادہ مشکل ہو جائے۔ اور دین کی حمایت میں جو ہاتھ اٹھے قلم کر دیا جائے۔ ان حالات میں ہم نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے۔ اس دعوے کے ساتھ ہم سخت امتحان میں ڈال دیے گئے ہیں۔ ہمارے ایک طرف خدا کی جنت ہے۔ غم و حزن سے پاک زندگی ہے اور وہ سب کچھ ہے جسے نہ تو کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سنا اور نہ کسی بشر نے اس کا تصور کیا۔ دوسری طرف دنیا کا عیش و آرام ہے، بے قید زندگی ہے اور حلال و حرام کے فرق کے بغیر ترقی کے مواقع اور امکانات ہیں۔ ان دونوں میں سے کسی ایک چیز کو ہمیں اختیار کرنا ہے۔ کیونکہ یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ حاصل نہیں ہو سکتیں۔ دنیا میں جو شخص گرفتار ہو گا یقیناً آخرت اس کے حصہ میں نہیں آئے گی اور جو اپنے لیے آخرت چاہے گا لازماً اس کی دنیا کو نقصان پہنچے گا۔ خدا کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف کہہ دیا ہے۔

مَنْ اَحَبَّ دُنْیَاہُ اَضَرَّ بِاٰخِرَتِہٖ	جو شخص اپنی دنیا سے محبت کرے گا وہ اپنی
وَمَنْ اَحَبَّ اٰخِرَتَہٗ اَضَرَّ بِدُنْیَاہُ	آخرت کو نقصان پہنچائے گا اور جو اپنی آخرت سے
فَاٰثِرُوْا مَا یَبْقٰی عَلٰی مَا	محبت کرے گا وہ اپنی دنیا کو نقصان پہنچائے گا
یَفْنٰی	تو تم باقی رہنے والی (آخرت) کو فنا ہونے والی
(احمد، بیہقی)	(دنیا) پر ترجیح دو۔

یہ حدیث ہمیں حکم دیتی ہے کہ ہم دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دیں کیونکہ دنیا فانی ہے اور آخرت باقی رہنے والی ہے۔ اگر اس حکم کو ہم مانتے ہیں اور آخرت کے فائدے کے لیے دنیا کا نقصان برداشت کرنے کو تیار ہیں

تو دین کی خدمت کر سکتے ہیں ورنہ نہیں کر سکتے۔

خدا کا دین بے حد مظلوم ہے۔ وہ آپ کی نصرت چاہتا ہے۔ وہ آپ کی ابھرتی ہوئی صلاحیتیں چاہتا ہے۔ وہ آپ کا بہترین وقت اور مال چاہتا ہے۔ وہ آپ کی نیند، آپ کی راحت اور آپ کا سکون چاہتا ہے۔ وہ دن بڑا مبارک دن ہوگا جب کہ ہم دین کے اس مطالبہ کو پورا کرنے کا فیصلہ کریں گے۔ وقت بڑی تیزی سے گزر رہا ہے اور موت ہر شخص کے پیچھے لگی ہوئی ہے نہیں معلوم کل جو سورج طلوع ہونے والا ہے وہ ہم میں سے کس کو سننے کے لیے اور کس کو سنانے کے لیے باقی رکھے۔ خوش نصیب ہے وہ جو اپنے آج کو کل کے انتظار میں برباد نہ کرے اور اس سے پہلے کہ موت اس سے فیصلہ کا حق چھین لے دین کی حمایت کے لیے کھڑا ہو جائے۔

جذبۂ رحم اور گوشت خوری

قسط (۲)

(جناب محمد فاروق خاں صاحب)

گوشت خوری کی لغت کا معنی مطلب

غذا، مکان اور لباس یہ انسانی زندگی کی خاص ضروریات ہیں۔ ان میں سب سے ضروری غذا ہے۔ غذا کے بغیر انسان زندہ ہی نہیں رہ سکتا۔ غذا کے ذریعہ ہمارا جسم پرورش پاتا ہے اس کی قوت برقرار رہتی ہے۔ ہمارے جسم کے اندر خدا نے یہ صلاحیت رکھ دی ہے کہ وہ غذا کے ذریعہ اپنے مخلوط جاندار مادہ (Complex living matter) بنا سکے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں غذا میں مخلوط عضوی مادہ (Complex organic substance) جسے کاربوہائیڈریٹ، چربی اور پروٹین اور وٹامنس مل سکیں۔ حیوانات اور انسان کی غذاؤں کے مقابلہ میں نباتات کی غذا نہایت سادہ ہوتی ہے۔ ان کی غذا محض غیر عضوی مادہ تک محدود رہے درختوں اور پودوں کی غذا میں خاص طور پر کچھ سادے معدنی مادے رہتے ہیں۔ نباتات انھیں سادے مادوں کے ذریعہ اپنے مخلوط جاندار مادے بنا لیتے ہیں لیکن حیوانوں اور انسانوں میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ نباتات کی طرح خود ہی سادہ مادے کے ذریعہ اپنے مخلوط عضوی مادے بنا سکیں۔

ہماری غذا میں مندرجہ ذیل چیزوں کا رہنا نہایت ضروری ہے۔

۱۔ پروٹین (Protein) ۲۔ چربی (Fat) ۳۔ کاربوہائیڈریٹ Carbohydrates) ۴۔ معدنی نمک (Mineral salts) ۵۔ پانی

چربی اور کاربوہائیڈریٹ میں صرف کاربن، ہائیڈروجن اور آکسیجن ہوتے ہیں۔ پروٹین میں ہائیڈروجن آکسیجن اور گندھک کے اجزا ہوتے ہیں۔ جسم کے اجزا کو بنانے اور مضبوط کرنے کا اصل کام پروٹین کا ہے۔

چربی اور کاربوہائیڈریٹ کی خاص اہمیت ہے یہ زیادہ مقدار میں جانوروں کے ذریعہ حاصل کیے جاتے ہیں۔ گوشت میں پروٹین کی خاص مقدار پائی جاتی ہے۔ انڈے کی زردی درحقیقت پروٹین ہی ہے۔ دودھ گھی، بادام اور دوسرے میوے اور تیل وغیرہ چربی والی چیزیں ہیں۔ کاربوہائیڈریٹ کی کئی قسمیں ہیں جن میں شکر اور اسٹارچ (starch) خاص ہیں۔ گیہوں اور جو میں اسٹارچ کافی مقدار میں ہوتا ہے۔ چاول اور آلو میں خاص طور سے اسٹارچ پایا جاتا ہے۔ شکر، پھلوں کھجور اور گنے وغیرہ کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ معدنی چیزیں ہر ایک سبزی میں پائی جاتی ہیں جو جسم کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے کافی ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ الگ سے بھی لوگ نمک استعمال میں لاتے ہیں۔ وٹامن بھی صحت کے لیے نہایت ضروری ہے۔ وٹامن کے نہ رہنے پر صحت خراب ہو جاتی ہے۔ وٹامن کی کئی قسمیں ہیں۔ وٹامن پھلوں، ہری سبزیوں اور دودھ وغیرہ میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ بادام، اخروٹ وغیرہ میووں میں اور دودھ میں پروٹین، چربی اور کاربوہائیڈریٹ کی مناسب مقدار پائی جاتی ہے لیکن اس کے باوجود انسان کو جس حیوانی پروٹین کی ضرورت ہے اسے کسی نباتاتی پروٹین سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔ سائنٹفک نقطۂ نظر سے معتدل آب و ہوا میں آدمی کی غذا میں گوشت کا مناسب جز رہنا ضروری ہے۔

پانی اور ہوا کی طرح خدا نے ہماری غذائی ضرورت کے لیے غذا کی فراہمی کا انتظام بھی نہایت وسیع پیمانہ پر کیا ہے۔ ہماری غذا کا بیشتر حصہ نباتات سے وابستہ ہے جو غذا ہم جانوروں کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً دودھ، دہی گھی اور گوشت وغیرہ وہ بھی ہمیں نباتات ہی کی بدولت حاصل ہوتی ہے اس لیے کہ اکثر جانور اپنی غذا نباتات ہی کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ وہ گھاس، اناج اور پتیاں وغیرہ کھا کر ہمارے لیے غذا فراہم کرتے ہیں۔ جو لوگ گوشت خوری کے مخالف ہیں ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان اپنی غذائی ضرورت کے لیے صرف نباتات کی دنیا پر قانع رہے۔ جسم کو جن ضروری چیزوں یا جس طاقتور خوراک کی ضرورت ہے اسے صرف نباتات کے ذریعہ حاصل کرے۔ ان کے نزدیک یہ تو جائز ہے کہ انسان زمین سے اپنی خوراک نباتات کے واسطے سے حاصل کرے لیکن اس کے لیے حیوانات کو واسطہ بنانا ان کے نزدیک بے رحمی ہے۔ یہاں وہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ حیوانات کے مقابلہ میں نباتات کہیں زیادہ رحم کے مستحق ہیں بلکہ نباتات تو چلنے پھرنے سے بھی مجبور ہیں۔

ہندوستان کے ایک مشہور ہندو سائنس داں جگدیش چندر بوس نے سائنٹفک طور پر ثابت کیا ہے کہ پیڑ پودے

احساس وشعور رکھتے ہیں۔ انہیں دکھ سکھ کا احساس ہوتا ہے۔ بعض پودے تو بہت حساس ہوتے ہیں انھیں علم النباتات میں (Sanstine plant) کہتے ہیں۔ یہ پودے نمایاں طور پر (Sense) رکھتے ہیں لاجونتی ڈراسیر (Drosere) وغیرہ اس کی واضح مثال ہیں۔

رحم وانصاف کا وہ نقطۂ نظر جسے گوشت خوری کے مخالفین پیش کرتے ہیں ناقابلِ عمل ہے۔ اس نقطہ نظر کو قابلِ قبول بنانے کے لیے انسان کو اپنی زندگی کی قربانی پیش کرنی ہوگی۔ رحم وانصاف کے اس خود ساختہ نقطۂ نظر کو قبول کرنے کے بعد انسان کا حق تصرف دنیا کی کسی چیز پر باقی نہیں رہتا۔

پیڑ پودوں سے ہم صرف پھل، میوے اور ترکاریاں وغیرہ حاصل نہیں کرتے۔ ان کی لکڑیاں بھی ہمارے کام آتی ہیں۔ ان کی پتیاں غذا کے مصرف میں بھی آتی ہیں۔ نباتات سے ہم تیل بھی حاصل کرتے ہیں۔ انگریزی دوا میں جتنے الکولائیڈ (Alkoloid) آتے ہیں سب درختوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ کونین ایک الکولائیڈ ہے جو سنکونا پیڑ کی چھال سے نکالی جاتی ہے۔ ڈیجیٹیاکس نامی گلوکوسائیڈ (Glucoside) ڈیجیٹیلس کے پیڑ سے نکلتا ہے۔ یہ گلوکوسائیڈ دل کی بیماریوں میں دیا جاتا ہے۔ عطر اور خوشبودار تیل تیار کرنے میں گلاب، چنبیلی، بیلا، جوہی وغیرہ بہت سے پھولوں کو استعمال کرتے ہیں۔ خس کا عطر بہت خوشبودار ہوتا ہے۔ خس ایک درخت کی جڑ ہے۔ کافور (Camphor) بھی ایک درخت ہی سے نکالا جاتا ہے یہ درخت فارموسا اور جاپان میں پایا جاتا ہے۔ شکر، چائے، قہوہ اور کوکو (Cocoa) بھی ہم نباتات ہی کی دنیا سے حاصل کرتے ہیں۔ سن اور جوٹ پودے کے ریشے سے نکلتا ہے۔ ربر جس سے ٹائر، ٹیوب وغیرہ انواع واقسام کی چیزیں تیار ہوتی ہیں ایک پیڑ کے دودھ سے بنایا جاتا ہے۔ ساگودانہ ایک پیڑ کے تنے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ گوشت خوری کی مخالفت سے نباتات کی دنیا پر بھی ہمارا حق تصرف باقی نہیں رہتا۔

کائنات کے واضح اشارا گوشت خوری کے حق میں کائناتی (Cosmological) دلائل بے شمار ہیں۔ دنیا میں خدا نے کتنے پیڑ پودے، کیڑے اور جراثیم ایسے پیدا کیے ہیں جن کی زندگی کا انحصار دوسرے پیڑ پودوں اور حیوانوں پر ہے۔ خدا نے کائنات میں غذا کا مسئلہ خواہ وہ مسئلہ نباتات کی غذا کا ہو یا حیوانات کی غذا کا کچھ اس طرح سے حل کیا ہے کہ ایک کی غذا کا دارومدار دوسرے پر ہے۔ ایک کی زندگی دوسرے پر منحصر ہے۔ بلی، چوہے، پکڑتی ہے۔ شیر، بکری، گائے

اور ہرن وغیرہ جانوروں پر حملہ کرتا ہے۔ مکڑی مکھی کا اور بڑی مچھلیاں چھوٹی مچھلیوں کا شکار کرتی ہیں۔
بہت سے ایسے چھوٹے جاندار اور جراثیم ہیں جو انسانوں جانوروں اور نباتات کے جسم کے اندر رہ کر اپنی زندگی گزارتے ہیں اسے ان کا میزبان یا ہوسٹ (Host) کہتے ہیں۔ پیراسائٹ کئی طرح کے ہوتے ہیں ان کی ایک قسم وہ ہے جسے فیکلٹیٹو (Facultalwe) کہتے ہیں۔ یہ اپنی منشا کے مطابق کبھی تو آزادانہ زندگی گزارتے ہیں اور کبھی اپنی زندگی ہوسٹ پر موقوف رکھتے ہیں۔ دوسرے اوبلیگیٹ (Obligateparasites) ہیں جو ہوسٹ کے کچھ دنوں تک یا پوری مدت تک پورے طور سے محتاج رہتے ہیں۔ تیسرے انٹرمیٹنٹ (Intermittent parasites) ہیں۔ جو ہوسٹ پر ایک بار پہنچ کر کافی غذا لے کر اسے چھوڑ دیتے ہیں اور پھر جب غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو دوبارہ ہوسٹ پر پہنچتے ہیں۔
جو پیراسائیٹ بدن کے اندر رہتے ہیں انھیں Internal parsites) اور جو بدن کے باہر رہتے ہیں انھیں (External parasites) کہتے ہیں۔ پیراسائیٹ اپنے ہوسٹ کی نسیج (Tissue) سے غذا اکٹھا کرتے ہیں۔ پیراسائیٹ کے اثرات طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ عام طور پر پیراسائیٹ اپنے ہوسٹ کو ان کی نسیجوں سے غذا چرا کر ان کے اعضا اور نسیج کو چوٹ پہنچاتے یا ان کے اندر زہریلے مادے پیدا کر کے نقصان پہنچاتے ہیں۔

بہت سے پیراسائیٹ کے جراثیم انسانوں اور جانوروں میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا کرتے ہیں۔ ان کی پیدائش کا عمل بہت تیزی سے مساموں کی تقسیم (Cellaivision) کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اس لیے اگر چند مسام ایک بار بھی کسی انسان یا جانور کے جسم میں داخل ہو جائیں تو یہ نہایت تیزی کے ساتھ لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں منقسم ہو جاتے ہیں اور جسم میں زہریلے مادے پیدا کر کے نقصان پہنچاتے ہیں۔ ہر مرض کے جراثیم مختلف ہوتے ہیں۔ ہیضہ، دق، وغیرہ بیماریاں جراثیم ہی کے ذریعہ ہوتی ہیں۔
جانوروں میں جراثیم سے پھیلنے والے امراض (Bacterialdiseases) کے علاوہ نیمیٹوڈ نسل کے کیڑوں کے ذریعہ پیدا ہونے والے امراض (Diseases caused by nematodes) ہیں جن میں ہک ورم (Hook worm) اور فیل پا (Elaphantiasis) خاص ہیں۔
پیڑوں کو جانوروں (Bores) دیمک اور گھن (Weenil) وغیرہ کیڑوں کے علاوہ نباتاتی جراثیم والے امراض (Bacterial diseases) سے بھی نقصان پہنچتا ہے

اس کے علاوہ بہت سے پھپھوندی (سماروغ) کے ذریعہ پھیلنے والے امراض (Fungus diseases) پودوں کو لگتے ہیں سمٹس (Smuts) پھپھوندی کا حملہ گیہوں، جو، رائی، جئی اور چاول وغیرہ پر ہوتا ہے ان میں پیدائش کے لیے اسپور (Spore) پیدا ہوتے ہیں، جو سیاہ پوڈر کی شکل کے ہوتے ہیں۔ اس کا حملہ پھول یا بیج پر ہوتا ہے۔ اس مرض میں گیہوں کا رنگ کالا پڑ جاتا ہے۔

رسٹ (Rust) پھپھوندیاں بھی طفیلی (Parasite) ہیں ان کے اسپور بالعموم سرخ دھبوں کی شکل میں دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے علاوہ پھپھوندی کے امراض کی بہت سی قسمیں ہیں جن کی تفصیل طوالت کے خوف سے نظر انداز کی جاتی ہے۔

نباتاتی جراثیم (Bacteria) بہت چھوٹے ایک مسام (Cell) والے جاندار ہیں۔ یہ صرف خوردبین سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ جراثیم ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی بھی ایسا مقام نہیں ہے جہاں یہ موجود نہ ہوں ان کے اندر کلوروفل (Chlorophill) نامی مادہ نہیں ہوتا جس کی وجہ سے یہ اپنی غذا خود نہیں بنا سکتے اس لیے یا تو انھیں پیراسائیٹ ہونا پڑتا ہے یا سوپروفائیٹ۔

ایسا بھی ہوتا ہے کہ پیراسائیٹ اور ہوسٹ بلکہ ایک دوسرے سے برابر فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جیسے چنے کی جڑوں میں ایک قسم کے جراثیم رہتے ہیں جو ہوا سے نائٹروجن لے کر پیڑ کو دیتے ہیں اور خود پیڑ سے اپنی غذا حاصل کرتے ہیں۔ یہ طریقہ معاشرت (Symbiosis) کہلاتا ہے۔ ایسے پودوں کو معاشی پودے (Symbiotics) کہتے ہیں۔

نباتات میں پیراسائیٹ کی واضح مثال جس سے خاص وعام بھی واقف ہیں۔ باندہ اور امر بیل کی ہے۔ باندہ اور امر بیل جس پیڑ پر ہوتے ہیں انھیں سے اپنی خوراک حاصل کرتے ہیں۔ ایسے پیراسائیٹ جو پوری خوراک اپنے میزبان سے لیتے ہیں۔ ہرے نہیں رہتے جیسے امر بیل ایسے پیراسائیٹ ٹوٹل پیراسائیٹ (Total - parasites) کہلاتے ہیں۔ اور جو نصف خوراک یا کم خوراک اپنے میزبان سے لیتے ہیں۔ باقی خوراک تیار کرتے ہیں وہ کچھ ہرے رہتے ہیں جیسے باندہ۔ ایسے پیراسائیٹ (Semiparasite) کہلاتے ہیں

اوپر طفیلی جراثیم کیڑوں اور پودوں وغیرہ کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ خدا نے کس طرح پیڑ پودوں اور جانداروں میں ایسے بے شمار پیراسائیٹ پیدا کیے ہیں جن کی زندگی کا انحصار اپنے میزبانوں پر ہے۔ یہ نظم خود خدا کا قائم کیا ہوا ہے۔ اگر رحم و انصاف کا وہ تصور تسلیم کر لیا جائے جو

جو گوشت خوری کے مخالفین ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں تو نظام قدرت پر سخت اعتراض پیدا ہوتا ہے اور ساتھ ہی ہمارے لیے یہ مشکل بھی پیش آتی ہے کہ پھر ہم نہ تو پیڑ پودوں اور جانوروں سے کوئی فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور نہ اپنے فائدے کے پیش نظر مضرت رساں کیڑے مکوڑوں اور جراثیم کو مار سکتے ہیں۔
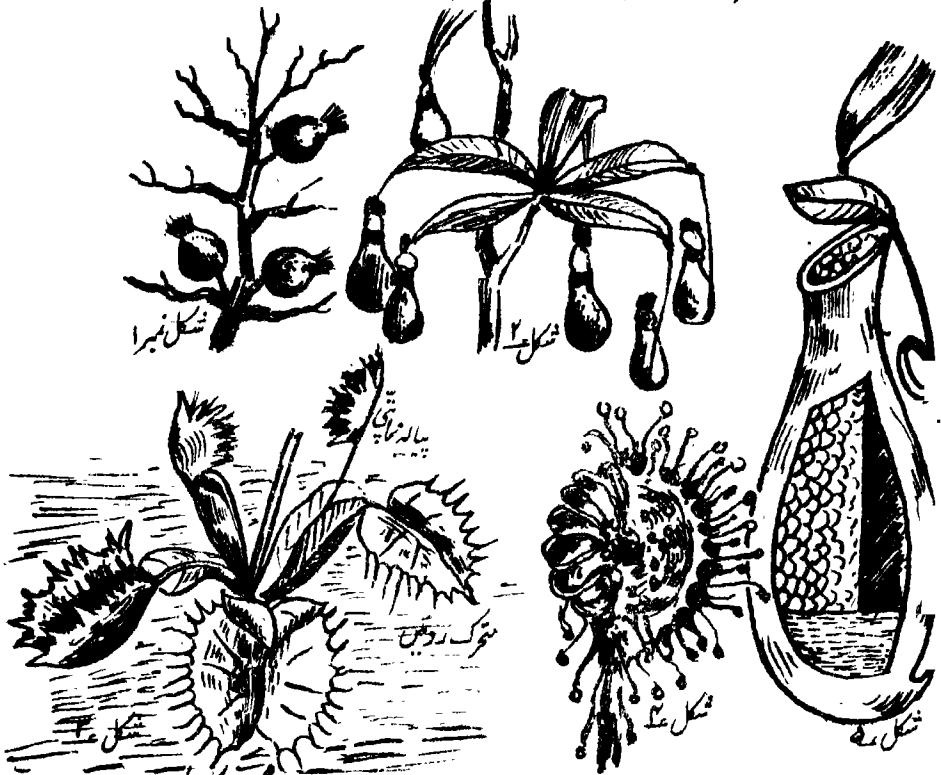
۱۔ یوٹریکلریا۔ ۲۔ پنیتھیز۔ ۳۔ وینس فلائی ٹریپ۔ ۴۔ ڈراسیرا۔ ۵۔ پنیتھیز کا وہ حصہ جو گھڑے کی شکل کا ہوتا ہے

عالم نباتات میں گوشت خوری کا حکم خدا کی جانب سے

دنیا میں کچھ ایسے پودے بھی پائے جاتے ہیں جو گوشت خور۔ Carnivorous plants) ہیں جن کی گوشت خوری کا جرم کسی کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے۔ مثلاً یوٹری کلیریا (Utricularia) دیکھیے شکل نمبر۱) یہ شمالی امریکہ، جنوبی افریقہ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور کچھ دوسرے ملکوں میں پایا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں بھی تالابوں میں کہیں کہیں دکھائی دیتا ہے۔ یوٹری کلیریا اکثر ساکت پانی میں اگتا ہے۔ صرف پھول والا ڈنٹھل پانی کے اوپر نکلا رہتا ہے۔ پتیاں پتلی موٹی سوئی کی شکل کی ہوتی ہیں تنے، پتوں اور جڑوں کی تقسیم واضح طور پر نمایاں نہیں ہوتی۔ پتیوں کے درمیان ان کے جوڑ میں ہرے رنگ کے غبارے کی شکل کے پھولے ہوئے حصے (Bladders) ہوتے ہیں۔ یہ بلیڈر پانی سے

بھرے ہوتے ہیں۔ بلیڈر کے اندر دباؤ بہت کم رہتا ہے۔ منہ کے پاس ایک چھوٹا سوراخ ہوتا ہے اس سوراخ پر ایک والو (Value) لگا ہوتا ہے جو صرف اندر کی طرف کھلتا ہے۔ (Value) پر باریک باریک بال ہوتے ہیں جو باہر نکلے رہتے ہیں۔ یہ بال حد درجہ حساس (Sensetive) ہوتے ہیں۔ ان میں ہماری جلد کی طرح قوت لامسہ موجود ہوتی ہے جیسے کوئی کیڑا پانی میں تیرتے ہوئے بلیڈ کے قریب پہنچ کر (Value) کے بالوں میں چھوتا ہے۔ والو Valve تیزی کے ساتھ اندر کی طرف کھل جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے پانی کی رَو کے ساتھ کیڑا بلیڈر کے اندر پہنچ جاتا ہے۔ ——————— ۔کیڑے کے اندر پہنچتے ہی والو (Value) اکثر بلیڈر کے منہ کو بند کر دیتا ہے۔ بلیڈر کی اندرونی دیواروں سے ایک قسم کا عرق نکلتا ہے جس سے کیڑے کا گوشت گھل جاتا ہے۔ اسے بلیڈر کی اندرونی دیواروں کے روئیں جذب کر لیتے ہیں۔ کیڑے کا جو حصہ ہضم نہیں ہوتا وہ بلیڈر کے پانی میں پڑا رہ جاتا ہے۔

ایک دوسرا گوشت خور پودا نپتھیز (Nepenthes) دیکھیے شکل نمبر ۲ جو آسٹریلیا، بورنیو اور سیلون میں پایا جاتا ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا پودا ہے جس کی شاخیں اوپر کی طرف اٹھی رہتی ہیں۔ شاخوں میں موٹی چکنی اور لمبی پتیاں پائی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ان پتیوں کی لمبائی تین فیٹ سے بھی زیادہ دیکھی گئی ہے۔ ہر ایک پتی کا سرا پتلا ہو کر بالکل تاگے کی طرح ہو جاتا ہے یہ تاگا عام طور پر کسی دوسرے پیڑ یا کسی دوسری چیز کے چاروں طرف لپٹ جاتا ہے تاگے سے لٹکا ہوا ایک گھڑے کی شکل کا حصہ ہوتا ہے دیکھیے شکل نمبر ۵۔ گھڑے کے منہ پر ایک ڈھکن ہوتا ہے۔ گھڑے کا منہ ہمیشہ اوپر کی طرف رہتا ہے۔ منہ کے پاس سے ایک میٹھا رس نکل کر اس کے چاروں طرف لگا رہتا ہے۔ اس کے لالچ میں کیڑے مکوڑے گھڑے کے منہ کے پاس آتے ہیں۔ گھڑے کے منہ سے اندر کی طرف کی سطح بہت چکنی اور پھسلنے والی ہوتی ہے جیسے ہی کوئی کیڑا گھڑے کے منہ تک پہنچتا ہے وہ پھسل کر گھڑے کے اندر گر جاتا ہے۔ گھڑے کے اندر ایک رقیق مادہ بھرا رہتا ہے۔ اس رقیق مادہ میں ڈوب کر کیڑا مر جاتا ہے اور پھر اس رقیق مادہ کے ذریعہ پودا کیڑے کو ہضم کر لیتا ہے۔

اس سے ملتے جلتے صراحی دار پودے (Picher plant) کی کچھ قسمیں ملایا میں پائی جاتی ہیں۔ کھاسی کی پہاڑیوں پر بھی یہ پودے ملتے ہیں۔ اس پودے کی پوری پتی یا اس کا ایک حصہ مڑ کر گول صراحی

کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ منہ پر ایک ڈھکن لگا رہتا ہے جو والو (Valve) کا کام دیتا ہے۔ صراحی کی اندرونی دیواروں سے ایک ہضم کرنے والا عرق نکلتا ہے جسے (Pepsin) کہتے ہیں۔ یہ عرق پروٹین (Protein) کے ہضم کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے جیسے ہی کوئی کیڑا ڈھکن پر بیٹھتا ہے ڈھکن اندر کی طرف کھل جاتا ہے۔ اس کے کھلتے ہی کیڑا صراحی کے اندر گر جاتا ہے۔ جہاں اس کا جسم تحلیل ہو کر پودے کی خوراک بن جاتا ہے۔ صرف غیر تحلیل شدہ حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ ڈھکن کھول کر دیکھنے سے صراحی کے پیندے میں کیڑوں کے بہت سے ڈھانچے ملتے ہیں۔

گوشت خور پودوں میں ایک پودا وینس فلائی ٹریپ (Venus fly trap) ہے۔ شکل نمبر ۳

یہ پودا امریکہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ یہ نمی کی جگہوں پر اُگتا ہے۔ اس کی پتی بیچ لمبائی سے دو حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔ دونوں حصے والو (Valve) کی طرح اندر مڑ کر بند ہو سکتے ہیں۔ بیچ کی موٹی رگ (Midrib) قبضہ کا کام دیتی ہے۔ ہر نصف حصے کی اوپری سطح پر تین لمبے بال ہوتے ہیں۔ یہ بال یوٹریکلیریا کے بالوں کی طرح بہت ہی حساس ہوتے ہیں جب کسی کیڑے یا مکھی سے پتی کا کوئی بال مَس ہوتا ہے تو پتی فوراً بند ہو جاتی ہے اور کیڑا اندر قید ہو جاتا ہے۔ پتی کی اوپری سطح پر لال رنگ کی بہت سی چھوٹی چھوٹی گھنڈیاں ہوتی ہیں ان سے ایک رقیق شئے نکلتی ہے جو کیڑوں اور مکھیوں کے گوشت کو تحلیل کر دیتی ہے پھر پتی کے روئیں بطور غذا کے اسے جذب کر لیتے ہیں۔ کیڑوں کے ہضم ہو جانے کے بعد پتی کے دونوں حصے پھر کھل جاتے ہیں

گوشت خور پودوں میں ایک پودا (Drosera) ہے۔ (شکل نمبر ۴)

یہ پودا چٹگاؤں اور پوربی بنگال کے جنگلوں میں بہت پایا جاتا ہے۔ ہمالیہ اور نیلگری کی پہاڑیوں اور کہیں کہیں میدانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ یہ پودا دنیا کے تقریباً تمام ہی حصوں میں اُگتا ہے۔ یہ پودا تقریباً تین یا تین فیٹ سے زیادہ اونچا ہوتا ہے۔ اس کے تنے پتلے ہوتے ہیں۔ اس پر پتیوں کے گچھے ہوتے ہیں۔ پتیوں کے کناروں سے بہت سے لمبی شکل کے حصے نکلے رہتے ہیں۔ یہ نکلے ہوئے حصے ٹینٹکل (Tentacles) کہلاتے ہیں۔ ٹینٹکل چھوٹے بڑے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے ٹینٹکل پتی کے بیچ میں ہوتے ہیں لمبے ٹینٹکل پتی کے کنارے کی طرف ہوتے ہیں جیسا کہ شکل سے ظاہر ہے۔ ہر ایک (Tentacles) میں ایک چھوٹا ڈنٹھل ہوتا ہے اس ڈنٹھل کے سرے پر ایک پھولی ہوئی گھنڈی ہوتی ہے اس گھنڈی میں سے ایک قسم کا گاڑھا رس نکلتا ہے۔ رس گھنڈی کے چاروں طرف پھیلا رہتا ہے۔ یہ رس دور سے شبنم کے قطروں کی طرح چمکتا ہوا نظر آتا ہے۔

اڑتے ہوئے کیڑے اس کی چمک سے کھنچ کر گھنڈی کے قریب آجاتے ہیں۔ وہ گھنڈی پر بیٹھتے ہی رس میں چپک کر رہ جاتے ہیں۔ کیڑا جتنا ہی اپنے کو چھڑانے کی کوشش کرتا ہے اور زیادہ رس اس سے چپک جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی پتی کے بیچ کا حصہ دب کر پیالے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ (Tentacle) مڑ کر کیڑے کو اس پیالے میں ڈال کر دیتا ہے۔ دوسرے (Tentacle) بھی ساتھ ہی مڑ کر اپنی گھنڈیوں کے ذریعہ کیڑے کو پیالے میں بند کر دیتے ہیں۔ کیڑا پیالے میں قید ہو جاتا ہے۔ اب (Tentacle) سے ایک طرح کا رس نکلتا ہے جو کیڑے کے ہضم کے لائق حصے کو تحلیل کر دیتا ہے اس کے بعد (Tentacal) غذا کے طور پر اسے جذب کر لیتے ہیں۔ جذب کرنے کے بعد (Tentacal) پہلے کی طرح سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دوسرے شکار کا انتظار کرنے لگتے ہیں۔ کیڑے کا جو حصہ ہضم ہونے سے رہ جاتا ہے وہ پتی سے جھڑ کر نیچے گر جاتا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ خدا نے خود بہت سے پودوں کی غذا اپنی جانب سے گوشت قرار دی ہے۔ گوشت خوری پر الزام رکھنے والے نہیں جانتے کہ ان کا یہ اعتراض براہ راست خدا تک پہنچتا ہے۔ ان کا یہ اعتراض اس قانون قدرت پر ہے جس کے تحت خود انھیں زندگی حاصل ہوئی ہے۔

گوشت پر شیر، بھیڑیا، باز اور بیڑ پودوں تک کا حق تو پہنچتا ہو لیکن انسان کا حق نہ پہنچے یہ ایک ایسی بات ہے جو کسی طرح فہم میں آنے کی نہیں ہے۔ جب خدا نے اپنی عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کے تحت جانداروں کے شکار کو جائز قرار دیا ہے جس کی بہت سی مثالیں اوپر پیش کی جا چکی ہیں تو گوشت خوری کو مطلق خلاف رحم و انصاف قرار دینا ہمارے لیے سخت حیرتناک بات ہے۔

اوپر یہ بات آچکی ہے کہ انسان ہی کے فائدے کے لیے پوری کائنات وجود میں لائی گئی ہے اس لیے انسان کو خدا کی بخشی ہوئی نعمتوں کو اپنے کام میں لانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ وہ اپنے کو ہر طرح کی مضرت سے بچائے رکھنے کی تدابیر اختیار کر سکتا ہے اس کے لیے یہ جائز ہے کہ اپنی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے بیماری کے جراثیم کا مقابلہ کرے۔ اپنی کھیتیوں کو بیماری کے کیڑوں اور جراثیم سے بچائے۔ اگر وہ مچھروں سے محفوظ رہنے کے لیے ڈی۔ ڈی۔ ٹی کا استعمال کرتا ہے تو یہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے اگر وہ سرکہ اور دہی پنیر کے بنانے میں ایک قسم کے جراثیم کا دخل ہوتا ہے[1] وہ اگر سبزی اور ترکاری وغیرہ کو (باقی صفحہ ۶۴ پر)

[1] اسی قسم میں وہ جراثیم بھی آتے ہیں جو الکحل تیار کرنے میں اور روٹی کا خمیر اٹھانے میں کارآمد ہوتے ہیں

برہان کا اداریہ

(جناب وحیدالدین خاں)

حال میں جناب مولانا سعید احمد اکبرآبادی ام اے، اڈیٹر برہان (دہلی) کا ایک عجیب وغریب اداریہ دیکھا جو رسالہ کی مئی اور جون ۱۹۶۲ء کی اشاعتوں میں دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ نام کے اعتبار سے تو یہ برہان کا اداریہ ہے مگر حقیقۃً اس کو دلیل اور برہان سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے غصہ کی وجہ سے کسی کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہو۔ اور جو کچھ اس کے منہ میں آئے، بے سوچے سمجھے کہتا چلا جائے ظاہر ہے کہ آدمی جب اس کیفیت میں مبتلا ہو تو وہ لازماً سطحی اور متضاد بیانات دے گا اور ایسی ایسی باتیں کہے گا جس کا کوئی سر ہے نہ پیر۔

اس مضمون کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اسلامی حکومت کے قیام کی جدوجہد ایک لغو حرکت ہے۔ یہ نہ تو کوئی شرعی تقاضا ہے اور نہ عقلاً اس کی کوئی معنویت ثابت ہوتی ہے۔ صاحب مضمون نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے جو قیمتی دلائل دیے ہیں ان کو ہم ایک ایک کرکے بیان نقل کرتے ہیں:۔

۱۔ اسلامی حکومت ایک جذباتی نعرہ:

"قرآن مجید اور اسوۂ نبوی کی تعلیمات کے پیش نظر مسلمانوں کو سب سے زیادہ حقیقت پسند اور واقعیت آگاہ ہونا چاہیے تھا لیکن یہ دیکھ کر بہت افسوس اور دکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں بحیثیت مجموعی یہ صفت اب مفقود ہوتی جارہی ہے اور انھوں نے اپنے مسائل ومعاملات پر حقیقت پسندی کے بجائے جذباتیت کے ساتھ غور کرنے کی خو پیدا کرلی ہے۔" صفحہ ۲۵۸

دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے ——"اسلام حقائق کا مذہب ہے" (۳۲۲) ان الفاظ کو پڑھ کر بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ مضمون نگار مسلمانوں کو ٹھوس اور عاقلانہ روش اختیار کرنے کی تلقین فرمارہے ہیں۔ مگر یہ غلط فہمی اس وقت دور ہوجاتی ہے جب ہم اگلی سطروں کو پڑھتے ہیں:۔

"اس کی تازہ اور دلچسپ مثال یہ ہے کہ الجزائر پر آزادی خودمختاری کی پو پھٹتی نظر آئی تو مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ نے الجزائری مسلمانوں کو مجاہدین فی سبیل اللہ کہا، غازی اور شہید کا لقب دیا اور ان سے توقعات قائم کر لی کہ اب یہ لوگ آزاد ہوتے ہی اسلامی حکومت قائم کریں گے اور اس کے نتیجہ میں یہ ہوگا اور وہ ہوگا۔ لیکن پچھلے دنوں الجزائری حکومت کے ایک نمائندہ نے نئی دہلی میں یہ اعلان کیا کہ الجزائر میں سیکولر جمہوری حکومت قائم کی جائیگی تو یہ سنتے ہی ان سب حضرات پر اوس سی پڑ گئی ہے اور انھیں ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ گویا الجزائر کے فداکاران حریت نے آزادی کی خلعتِ فاخرہ زیب تن کرتے ہی اپنا رخ بجائے کعبہ کے دیر و کلیسا کی طرف کر لیا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ" صفحہ ۲۵۰

اس اقتباس میں اگر یہ بات کہی گئی ہوتی کہ الجزائر کے مسلمانوں سے بعض لوگوں نے محض خوش فہمی میں بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لی تھیں۔ جیسے مسلم لیگ اور اتحاد المسلمین کے نعروں کو سن کر بہت سے سادہ لوح یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ بس اب جلد ہی ہمارے اوپر اسلام کا پرچم لہرانے والا ہے، تو یقیناً یہ تنقید صحیح ہوتی، مگر بات یہ نہیں ہے۔ بلکہ مضمون نگار اس کے برعکس الجزائر کے مسلم لیڈروں کے فیصلوں کو اصولی طور پر صحیح قرار دے رہے ہیں اور ان لوگوں کو اصولی طور پر غلط سمجھتے ہیں جو ان سے اسلام کے مطابق طرزِ عمل کی توقع کر رہے تھے۔ یہاں "جذباتیت" کا مطلب غیر واقعی طور پر امیدیں وابستہ کر لینا نہیں بلکہ سیکولرزم کے اس مقدس دور میں اسلامی حکومت کا خواب دیکھنا ہی ہے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ آج مسلمانوں کو بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کوئی مسلم قوم مسلمان رہتے ہوئے اپنے لیے "سیکولر جمہوری حکومت" کا انتخاب نہیں کر سکتی جس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا اور اس کے فیصلے خدا کی سند کی بنیاد پر نہیں بلکہ محض انسانی رایوں کی گنتی سے ہوا کریں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کو صرف اپنی نماز کا رخ کعبہ کی طرف نہیں کرنا ہے بلکہ اسی کو اپنی حکومت کا قبلہ بھی بنانا ہے۔ لیکن اسے مصلحت پرستی کہا جائے یا زمانے کی مرعوبیت کہ آج اگر ایک آزاد مسلم قوم پر اس حیثیت سے تنقید کی جائے تو خود مسلمان ایسے ناقد کے اوپر اِنَّا لِلّٰہِ پڑھیں گے اور کہیں گے کہ تم کیسے آدمی ہو کہ محض سیکولر جمہوریت اختیار کر لینے کی وجہ سے سمجھتے ہو کہ اس قوم نے اپنا رخ دیر و کلیسا کی طرف کر لیا ہے۔ شاید اب وہ وقت آنے والا ہے جب مسلم قوم میں پیدا ہونے والا ایک آدمی خدا کا انکار کر دے گا اور جب کوئی شخص اس پر تنقید کرے گا کہ تم مسلمان ہو کر خدا کا انکار کرتے ہو تو کوئی بزرگ اٹھ کر فرمائیں گے۔ "تم کیسے آدمی ہو، مسلمان ہونے کے لیے یہ کیا ضروری ہے کہ آدمی خدا کو بھی مانے"۔

۲۔ اسلامی حکومت زمانہ کے تقاضوں کے خلاف:

"یاد رکھنا چاہیے کہ آج کل کا زمانہ پہلے زمانہ سے بالکل مختلف ہے۔ پہلے ایک قوم دوسری قوم کو فتح کرتی تھی، اور اس پر من مانے طریقوں سے، اچھے ہوں یا برے، حکومت کرتی تھی، لیکن آج کوئی ایک مذہبی قوم کسی دوسری قوم کو تلوار کے ذریعہ فتح نہیں کر سکتی۔ یہ دور عوامی تحریکات اور عوامی سرگرمیوں کا ہے اور ان تحریکات میں ملک کے سب عوام جو مذہب، زبان، کلچر اور تہذیب کے اختلاف کے باوجود مل جل کر ملک کو آزاد کرانے کی جدوجہد کرتے ہیں اور تبھی ملک آزاد ہوتے ہیں اور ہو رہے ہیں اور خود الجزائر میں بھی صورت حال یہی ہے۔ غیر مسلموں کا ایک بڑا طبقہ ہے جو وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ پورا تعاون کر رہا ہے۔ اب اگر ان سب کی متفقہ مساعی اور اشتراک عمل سے الجزائر آزاد ہوتا ہے اور الجزائر کے مسلمان ان تمام باتوں کے پیش نظر جن کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ الجزائر کے لیے جمہوریہ گورنمنٹ پسند کرتے ہیں تو اس میں برا ماننے کی یا ان پر لعن طعن کرنے کی کون سی بات ہے۔" صفحہ ۲۶۰

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"مسلمانو! خدا کے لیے عقل و ہوش سے کام لو، زمانہ کی ہوا کا رخ پہچانو، یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ دین کیا ہے، اس کا مقصد کیا ہے، پیغمبرانہ طریق دعوت و تبلیغ کیا تھا۔ ہر زمانہ کے ہتھیار جدا ہوتے ہیں۔ اس زمانے میں اقامت دین کا مقصد کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ جو قوم حقائق پر سنجیدگی سے غور کرنے کی عادت ترک کر کے محض چند نعروں کو اپنا سرمایۂ حیات بنانے پر قناعت کرے، اس کی زندگی کو استحکام و دوام حاصل نہیں ہو سکتا۔" صفحہ ۳۲۶

اس اقتباس میں دین اور پیغمبرانہ طریق کے الفاظ سے دھوکا نہ کھائیے۔ جیسا کہ اگلا اقتباسات واضح کر رہے ہیں، مضمون نگار کے نزدیک "دین" کسی متعین چیز کا نام نہیں ہے بلکہ یہ صرف ایک "مقصد" ہے جو خالص سیکولر نظام میں بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح "پیغمبرانہ طریق" بھی کوئی لگی بندھی چیز نہیں ہے بلکہ محض حالات سے سازگاری کا دوسرا نام ہے۔ صدیوں سے ملت اسلامی اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ دین فکر و عمل کے ایک متعین نظام کا نام ہے اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ قیامت تک اس کے اوپر قائم رہیں اور کبھی بھی زمانے کی کسی پکار کو یہ درجہ نہ دیں کہ اس کی وجہ سے اپنے دین کو چھوڑ بیٹھیں۔ مگر اب دورِ جدید کے ایک بزرگ ہم کو یہ بتا رہے ہیں کہ دین کا یہ تصور غلط ہے کہ ہر زمانے میں اس کی بعینہٖ پیروی کی جائے۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو یہ کرنا چاہیے کہ زمانہ جس چیز کا تقاضا کرے اس کو اختیار کر لیں۔ کیونکہ دوام اور استحکام کا راز اسی میں مضمر ہے۔

گویا مسلمانوں کے لیے فیصلہ کن چیز یہ نہیں ہے کہ ان کا دین کیا کہتا ہے۔ خدا و رسول کا کیا حکم ہے۔ آخرت کا عقیدہ کس بات کا تقاضا کر رہا ہے۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کی ذمہ داریاں کیا ہیں۔ اس کے برعکس انھیں یہ دیکھنا چاہیے کہ زمانے کی ہوا کا رخ کیا ہے اور ہوا کا رخ جدھر جانے کے لیے کہے ادھر چل پڑنا چاہیے اگر یہی "حقیقت پسندی" ہے تو مجھے نہیں معلوم کہ موقع پرستی کس چیز کا نام ہوگا۔

۴۔ اسلامی حکومت ناقابلِ عمل:

"جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں سب ہی ایک عقیدہ اور ایک خیال کے نہیں ہیں۔ ان میں سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی، آزاد خیال بھی ہیں اور قدامت پرست بھی، پختہ کار و صادق بھی ہیں اور صرف نام کے مسلمان بھی۔ ان اختلافات سے قطع نظر، مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایک ہی مسلک و مشرب (مثلاً حنفی) کے علماء چند جدید مسائل پر بھی متفق نہیں ہو سکتے۔ اب اگر جس ملک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، انھوں نے اسلامی حکومت بنا بھی لی تو آخر اس کی شکل و صورت کیا ہوگی۔ وہ سنی ہوگی یا شیعہ۔ اس کے قوانین کی بنیاد قرآن مجید کی کس تفسیر اور حدیث کی کس شرح پر رکھی جائے گی اور آخر میں فیصلہ کیوں کر ہوگا؟ عددی اکثریت سے! تو سنی یا شیعہ (مثلاً) جو فرقہ بھی اقلیت میں رہ جائے گا وہ محسوس کرے گا کہ اس پر ظلم ہو رہا ہے اور اگر ہر فرقہ کو یہ آزادی ہوگی کہ وہ اپنے اپنے مسلک فقہ کے مطابق عمل کرے تو انفرادی زندگی میں تو یہ چیز نبھ جائے گی لیکن اجتماعی مسائل میں اس آزادی سے کیا افراتفری اور بدنظمی نہیں پیدا ہوگی۔" صفحہ ۲۵۹

گویا مسلم اقلیت کے علاقوں ہی میں نہیں بلکہ مسلم اکثریت کے ممالک میں بھی اسلامی حکومت ایک ناقابلِ عمل چیز ہے مگر یہ کہتے ہوئے موصوف کے حافظہ میں یہ بات نہیں رہی کہ ان کی مقدس سیکولر جمہوریہ میں بھی صورت حال بعینہٖ یہی رہتی ہے۔ یعنی وہاں بھی مختلف فرقے اور مختلف گروہ موجود رہتے ہیں جن کے درمیان خود صاحب مضمون کے الفاظ میں "مذہب، زبان، کلچر اور تہذیب کے اختلافات" پائے جاتے ہیں۔ (۲۶۰) ان اختلافات کی وجہ سے ہر ایک کے قانونی تصورات الگ ہیں، ہر ایک کے نظریات جدا ہیں، ہر ایک کچھ ایسی باتیں چاہتا ہے جو دوسرے نہیں چاہتے۔ پھر ان کے درمیان فیصلہ کس طرح ہوتا ہے۔ مختلف فرقے اور مختلف فقہی رایوں کی موجودگی میں اگر اجتماعی فیصلہ ناممکن ہے تو یہی چیز اس وقت ممکن کیسے ہو جاتی ہے جب مختلف فرقوں کی موجودگی میں ایک سیکولر جمہوریہ بنائی جائے اگر اس کا جواب یہ ہو کہ "عددی اکثریت" سے (جیسا کہ فی الواقع ہے) تو آخر یہی طریقہ اسلامی حکومت میں کیوں ناجائز ہے۔

مضمون نگار کا یہ نقطہ نظر بھی کس قدر عجیب ہے کہ اگر کسی ملک میں اسلامی حکومت قائم ہو تو جو فرقہ وہاں برسر اقتدار

ہوگا اس کے سوا دوسرے فرقے محسوس کریں گے کہ ان کے اوپر ظلم ہو رہا ہے۔ حالانکہ ان فرقوں کے درمیان جو اختلاف ہے وہ صرف جزوی مسائل میں ہے۔ جہاں تک بنیادی مسائل کا تعلق ہے سب کے سب یکساں عقیدہ رکھتے ہیں۔ لیکن صاحب مضمون کے مقدس سیکولرزم کا راج قائم ہو جائے، تو اگرچہ جمہوری طریق انتخاب کی وجہ سے عملاً وہاں بھی کسی ایک ایسے فرقے کی حکومت قائم ہوگی جو تعداد میں زیادہ ہو، مگر اس کے باوجود دوسرے تمام فرقے "ظلم" سے بالکل مامون و محفوظ ہو جائیں گے۔ خواہ وہ باہم مختلف خیالات اور متضاد مفادات کیوں نہ رکھتے ہوں ——— کاش مضمون نگار اپنے اس سیکولرزم کا کچھ تعارف بھی کرا دیتے، کیونکہ یہ حسین سیکولرزم ابھی صرف ان کے تخیلات کی دنیا میں آباد ہے، واقعات کی دنیا ابھی تک اس سے آگاہ نہیں ہوئی ہے۔

۴۔ اسلامی حکومت کا تصور اسلامی اخلاق کے خلاف:

"اسلام کے فلسفۂ اخلاق اور اس کی تعلیمات کی روشنی میں غور کیجیے۔ فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ اگر مسلم تاجر دارالاسلام سے دارالحرب میں جائے اور وہاں کی حکومت اس کے ساتھ یہ مراعات کرے کہ چنگی کا محصول روپیہ میں دو آنہ معاف کر دے تو اس کے جواب میں دارالاسلام کی حکومت کا فرض ہے کہ دارالحرب کا کوئی تاجر ادھر آئے تو اس کو روپیہ میں چار آنہ چنگی کا محصول معاف کرے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ نحن احق بمکارم الاخلاق کیا ان احکام سے ثابت نہیں ہوتا کہ اگر غیر مسلم اکثریت کے ملکوں نے سیکولر جمہوریت قائم کی ہے جس کا فائدہ ان ملکوں کی مسلم اقلیت کو پہنچ رہا ہے اور اس حد تک کہ دستوری اعتبار سے ایک مسلمان بھی ان ملکوں کا صدر جمہوریہ اور وزیر اعظم اور کمانڈر انچیف ہو سکتا ہے تو اب اس کے جواب میں مسلم اکثریت کے ملکوں کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے لیے ایک ایسی طرز حکومت اختیار کریں جس کے تحت ان ملکوں کی غیر مسلم اقلیتوں کو بھی وہی مراعات اور وہی حقوق حاصل ہوں جو مسلمان اقلیتوں کو غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں حاصل ہیں یعنی وہاں سیکولر جمہوریت ہو تو یہاں بھی وہی ہو۔" (صفحہ ۲۶)

مندرجہ بالا اقتباس مضمون کی اس خصوصیت کا مکمل اظہار ہے کہ وہ استدلال کی زحمت سے قطعاً آزاد ہے موصوف کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ غیر مسلم اکثریت کے علاقوں میں اگر وہاں کے باشندے سیکولر نظام اختیار کریں تو یہ اس ملک کی مسلم اقلیت پر اتنا بڑا احسان ہے کہ اس کے جواب میں مسلمانوں کو بھی اپنی اکثریت کے علاقوں میں اسی قسم کی سیکولر حکومت کا اعلان کر دینا چاہیے۔ مگر اس کے لیے جو دلیل دی گئی ہے وہ بس ایسی ہے کہ اگر میں زیادہ سے زیادہ رعایت کروں تو اس کو دلیل کے بجائے ایک لطیفہ کہنا زیادہ صحیح سمجھوں گا۔

چنگی میں رعایت کے بارے میں ایک فقہی جزئیہ سے یہ اصول اخذ کرنا کہ مسلمان غیر مسلموں کی رعایت سے اپنے علاقے میں سیکولر نظام اختیار کرلیں اتنا نادر استدلال ہے جس کی داد نہیں دی جاسکتی۔ سیکولر جمہوریت کا نظام جمہور کی حاکمیت کے اصول پر قائم ہوتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ عوام خود اپنی مرضی سے جس چیز کو قانون کا درجہ دے دیں۔ وہ قانون بن جائے۔ خواہ اس کے لیے کتاب الٰہی کی سند حاصل ہو یا نہ ہو۔ یہ صریح طور پر ایک کافرانہ اور مشرکانہ اصول ہے پھر ایسے ایک اصول کو اختیار کرنا مسلمانوں کے لیے کس طرح جائز ہو سکتا ہے جن کا عقیدہ یہ ہو کہ صرف خدا ہی ایک جائز حاکم اور قانون ساز ہے اس کے سوا کوئی ہستی نہیں ہے جس کو وہ باختیار خود اپنی حاکمیت اور قانون سازی کے لیے منتخب کریں۔ بے شک حسن سلوک کا یہ تقاضا ہے کہ ہم بھی اس کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آئیں جس نے ہمارے ساتھ اچھا سلوک کیا ہے۔ مگر اس کا یہ تقاضا کب ہے کہ ہم اپنے خدا سے بغاوت کر دیں۔ میرا غیر مسلم پڑوسی اگر میری خاطر اپنے بچوں کو ریڈیو سیلون تیز آواز کے ساتھ بجانے سے منع کرتا ہے تو یقیناً یہ اس کی شرافت ہے۔ مگر کیا اس شرافت کا یہ کوئی صحیح جواب ہوگا کہ اس کو خوش کرنے کے لیے میں سرے سے اپنا دین و ایمان چھوڑ دوں اور پڑوسی کا جو مذہب ہے اسی کو خود بھی اختیار کرلوں

۵۔ اسلامی حکومت خود بخود قائم ہوتی ہے

> "اسلامی حکومت زمانہ کے مروجہ طور طریقوں سے کام لیکر بنائی نہیں جاتی بلکہ خود بخود بن جاتی ہے۔ اسلام کے تصور حیات میں حکومت مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ وہ طبعی نتیجہ ہے اس نظام زندگی پر عمل کرنے کا جس کا نام اسلام ہے یعنی مسلمان اگر صدق دل سے اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرتے ہیں، امانت و دیانت تقویٰ و طہارت اور اخلاق فاضلہ و مکارم عالیہ کے پیکر ہوتے ہیں تو خود اپنے لیے رحمت اور دوسروں کے لیے ہدایت و برکت کا سرچشمہ اور ذریعہ بنتے ہیں۔ اب بقائے اصلح کے قانون کے مطابق جہاں کہیں اور جب کسی سماج میں بھی رہتے ہیں، معزز اور مکرم ہو کر رہتے ہیں اور اس بنا پر اقتدار اعلیٰ بھی انھیں کے ہاتھ آجاتا ہے۔" ۳۲۲

ان الفاظ میں مضمون نگار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کی تحریک چلانا بے معنی ہے کیونکہ وہ تو جب بننا ہوتی ہے خود بخود بن جاتی ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ خود بخود حکومت بننے کا یہ نظریہ خود بالکل بے معنی ہے۔ اگر موصوف کے نزدیک اس سے پہلے کبھی تاریخ میں اسلامی حکومت بنی ہے تو وہ ہرگز خود بخود نہیں بنی تھی اور نہ آئندہ خود بخود بن سکتی ہے۔ یہ دنیا کش مکش اور جدوجہد کی دنیا ہے۔ یہاں ہر واقعہ کسی کوشش کے نتیجہ میں

میں ظہور میں آتا ہے نہ کہ اپنے آپ واقع ہو جاتا ہے۔ پھر کیا حکومت اسلامی ہی ایک ایسی نرالی چیز ہے جو خود بخود وقوع میں آجائے۔ تاہم اس سے قطع نظر یہاں بھی مضمون نگار کے ایک اور تضاد کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں۔

ایک طرف تو اسلامی حکومت ان کے نزدیک ایسی پُرکشش چیز ہے کہ اس سے آشنا ہوتے ہی لوگ خود سے اس کو اپنے اوپر عائد کر لیتے ہیں اور دوسری طرف مسلمانوں کا "اپنی حکومت کے اسلامی ہونے کا اعلان کرنا" ان کے نزدیک اپنے ملک کی غیر مسلم اقلیتوں کا ذرا خیال نہ کرنے کے ہم معنی ہے۔ (۲۶۰) یا تنا بھیانک واقعہ ہے کہ اگر "اپنی اکثریت کے ملکوں میں مسلمانوں نے اپنی حکومت کو اسلامی قرار دیا" تو اس کا ردعمل یہ ہوگا کہ ساری دنیا میں مسلم اقلیت کے ممالک میں مسلمانوں کو اس کی سخت سزا بھگتنی پڑے گی۔ کیونکہ غیر مسلم اکثریت اپنے علاقہ میں انہیں مظالم کو دہرائے گی جو اسلام کی حکمرانی کی وجہ سے مسلم ممالک میں غیر مسلموں پر ہو رہے ہوں گے۔ (۲۵۹)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:۔

"غور کیجیے! یہ ذہنیت جو آج دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی رسوائی کا سب سے بڑا سبب ہے کس چیز کا نتیجہ ہے؟ اور غیر مسلم اکثریت کے ملکوں کے تیس کروڑ مسلمانوں کو کفر و شرک کے ہاتھوں فروخت کر دینے کا حوصلہ کس نے پیدا کیا؟ صرف مسلم اکثریت کے ملکوں میں اسلامی حکومت قائم کرنے کے جذبۂ بے اختیار نے۔"
(صفحہ ۳۲۶)

میں سمجھ نہیں سکا کہ مضمون نگار کے نزدیک پہلی بات صحیح ہے یا دوسری بات۔ اگر اسلامی حکومت اتنی بڑی رحمت ہے کہ لوگ اس کو خود سے اپنے اوپر عائد کر لیتے ہیں تو دنیا کے کسی حصہ میں اس کے قیام کا غیر مسلموں کے اوپر برا ردعمل نہیں ہونا چاہیے۔ اور اگر اسلامی حکومت ایسی بھیانک چیز ہے کہ اس کا نام سنتے ہی غیر مسلم اپنے ملک کے مسلمانوں کا گلا گھونٹنے پر آمادہ ہو جائیں گے تو پھر ایسی چیز کو کوئی قوم خود بخود کیسے قبول کرے گی۔ مضمون نگار کا یہ تضاد حیرت انگیز ہے کہ وہ ایک ہی مضمون میں ایک جگہ یہ کہہ کر اسلامی حکومت کے لیے تحریک چلانے سے منع کرتے ہیں کہ وہ تو اتنی پُرکشش چیز ہے کہ لوگ اس سے آشنا ہوتے ہی خود بخود اسے قائم کر لیں گے اور دوسری جگہ یہ کہہ کر اس سے روک رہے ہیں کہ اسلامی حکومت قائم کرنے کا نام نہ لو۔ کیونکہ وہ اتنی بڑی مصیبت ہے کہ اس کا ذکر سنتے ہی تمام غیر مسلم مسلمانوں کے اوپر ٹوٹ پڑیں گے —— آدمی جب حق پرستی کو چھوڑ کر کسی دوسری پرستش میں مبتلا ہو جائے تو وہ ایسی ہی الل ٹپ اور متضاد باتیں کرتا ہے۔

۴۔ اسلام کا کوئی منفرد نظام حکومت نہیں:

"حکومت کے معاملہ میں بھی اسلام کی نظر اصل مقصد پر ہے یعنی دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف

کا قیام اور عام انسانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی رفاہیت کا سروسامان۔ اسے ہرگز اس سے بحث نہیں کہ اس حکومت کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے اور ارباب فن کی اصطلاح میں اس کا نام کیا قرار پاتا ہے۔ ان دونوں چیزوں کا تعلق وقتی حالات و مصالح سے ہے۔ جس طرح تمام دنیا کے مریضوں کے لیے ہر حالت میں ایک ہی نسخہ کارگر نہیں ہوسکتا اسی طرح ہر زمانہ اور ہر دور میں تمام انسانوں کے لیے ایک ہی طرز حکومت متعین نہیں کیا جاسکتا۔" صفحہ ۲۲۳

"اسلام میں حکومت کی کوئی شکل متعین نہیں ہے .... جس حکومت کی اساس اسلام کے قانون عدل پر ہو وہ اسلامی ہے اور جس کا حال یہ نہ ہو وہ غیر اسلامی ہے۔ جس طرح تہذیب، کلچر، فنون اور علوم کسی خاص قوم کے اجارہ نہیں ہوتے بلکہ ہر شخص انھیں اختیار کرسکتا ہے، اسی طرح اسلام کا قانون عدل کسی خاص ملک اور قوم کی میراث نہیں ہے[1]، ہر قوم اور ہر ملک اسے اپنا سکتا ہے۔ چنانچہ گاندھی جی نے ہندوستان کی حکومت کے لیے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ حضرت عمر کی حکومت کے طرز پر ہو۔ پس جس طرح حکومت کی مذکورہ بالا قسمیں (شخصی حکومت، جمہوری حکومت وغیرہ) اسلامی اور غیر اسلامی دونوں طرح کی ہوسکتی ہیں، اسی طرح حکومت کی ایک قسم سیکولر ہے اور سیکولر کی تعریف اگر یہ ہے کہ تمام مذاہب آزاد ہوں گے اور ریاست کے ہر شخص کو یکساں شہری حقوق حاصل ہوں گے، تو اس معنی کے اعتبار سے سیکولر کی بھی دو قسمیں ہوسکتی ہیں، ایک اسلامی اور دوسری غیر اسلامی۔ اگر اس سیکولر حکومت میں اسلام کا قانون عدل نافذ ہے تو یہ اسلامی ہے ورنہ نہیں۔" صفحہ (۲۲۳-۲۲۴)

اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی حکومت اپنے دستور میں یہ الفاظ لکھ لے کہ ــــــ "اس کا مقصد امن و امان اور عدل و انصاف کا قیام ہے، اور وہ عام انسانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی رفاہیت کا سروسامان کرنا چاہتی ہے" تو گویا اس نے اسلام کے قانون عدل کو اختیار کرلیا اور اس طرح وہ خود بخود اسلامی حکومت بن گئی۔ خواہ عقیدے اور مسلک کے اعتبار سے وہ ہندوؤں کی حکومت ہو یا عیسائیوں کی، بدھوں کی ہو یا زردشتوں کی، اشتراکیوں کی ہو یا جمہوریت پسندوں کی۔ ان مخصوص "مقاصد" کا اعلان اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ اسلامی

---

[1] واضح ہو کہ یہاں یہ بات نہیں کہی گئی ہے کہ ہر قوم مسلمان ہو کر حلقۂ اسلام میں داخل ہوسکتی ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے قومی مذہب کو باقی رکھتے ہوئے اسلام کے "قانون عدل" کو اختیار کرسکتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک مجوسی مجوسی رہتے ہوئے بھی اسلام کا عامل ہوسکتا ہے۔ مجوسیوں کی حکومت بھی ایسی حکومت ہوسکتی ہے جس کو اسلامی حکومت کہا جائے۔

حکومت پر۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مضمون نگار اگر یہی کہنا تھا تو انھوں نے اسلام کی ترجمانی کی زحمت کیوں گوارا فرمائی ان قیمتی نکات کو وہ ایک خود ساختہ نظریے کی حیثیت سے زیادہ بہتر طور پر پیش کر سکتے تھے۔

یہاں تفصیل کا موقع نہیں۔ مختصراً یہ کہوں گا کہ اسلام میں صرف حقیقتِ "عدل" مقصود نہیں ہے بلکہ اس قانونِ عدل کی تعمیل مقصود ہے جو خدا کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اور یہ بات بھی صرف نظری حیثیت سے ہے۔ ورنہ حق تو یہ ہے کہ خود حقیقتِ عدل بھی خدا کے قانونِ عدل سے الگ کوئی چیز نہیں۔ عدل کا قیام اسی وقت ممکن ہے جبکہ خدا کا قانون عدل زمین پر نافذ ہو اس کے بغیر عدل کا کوئی وجود نہیں۔

۷۔ اسلامی حکومت ماؤف اور خطرناک تصوّر۔

"یاد ہوگا ۱۹۵۳ء میں مغربی پاکستان میں بسلسلۂ تحریک ردِّ قادیانیت شدید قسم کے فسادات ہوگئے تھے جن کی وجہ سے حکومت کو مارشل لا نافذ کرنا پڑا تھا جب یہ سلسلہ ختم ہوگیا تو حکومت نے ان فسادات کے وجوہ و اسباب اور ان سے متعلق دوسرے امور و مسائل کی تحقیق کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس کے صدر جسٹس محمد منیر تھے۔ اس کمیشن نے بڑی محنت اور قابلیت سے ایک ضخیم رپورٹ مرتب کر کے ۱۹۵۴ء میں پیش کی اور وہ اسی سال بڑی تقطیع کے تقریباً چار سو صفحات پر گورنمنٹ پریس لاہور سے چھپ کر شائع ہوگئی تھی۔ یوں تو یہ پوری رپورٹ ہی از اول تا آخر قوم کے اخلاقی انحطاط اور فکر و نظر کی درماندگی و پستی کا ایک نہایت افسوسناک اور عبرت انگیز مرقع ہے لیکن ہمارے موضوعِ گفتگو کی مناسبت سے اس رپورٹ کا ایک باب جس کا عنوان "غیر مسلم ریاستوں کے مسلمانوں پر ردِّ عمل" ہے۔ خاص طور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اس باب سے اندازہ ہوگا کہ جو لوگ بلا سوچے سمجھے محض جذبات کی رَو میں بہہ کر بار بار اسلامی حکومت کا نام لیتے ہیں ان کا ذہن کس درجہ ماؤف اور خطرناک ہے۔

جسٹس محمد منیر نے متعدد علماء سے یہ سوال کیا ہے کہ "جس طرح آپ لوگ پاکستان میں مذہب کی بنیاد پر قائم شدہ ایک اسلامی حکومت چاہتے ہیں۔ اگر اسی طرح بھارت میں ہندو اپنے مذہب کی بنیاد پر حکومت قائم کریں تو آپ ان کو اس کی اجازت دیں گے؟" اس سوال کے جواب میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے کہا۔ "بے شک، مجھ کو اس وقت بھی کوئی اعتراض نہ ہوگا جب کہ اس ہندو گورنمنٹ کے ماتحت مسلمانوں کے ساتھ شودروں اور ملیچھوں کا سا برتاؤ کیا جائے اور منو کے قانون کے ماتحت مسلمانوں کو گورنمنٹ میں حصہ لینے اور دوسرے شہری حقوق سے محروم کر دیا جائے۔" (ص ۲۲۸) جو بات مولانا نے کہی ہے ہم نہ

بعینہٖ یا الفاظ کے کچھ رد و بدل کے ساتھ سید عطاء اللہ شاہ بخاری، میاں طفیل احمد، غازی سراج الدین منیر اور دوسرے اصحاب نے بڑے زور اور قوت کے ساتھ کہا ہے۔" صفحہ ۳۲۵

اس اقتباس میں پہلی غلطی یہ ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا جو جواب نقل کیا گیا ہے وہ مکمل شکل میں نہیں ہے اصل رپورٹ میں محولہ بالا جواب کے ساتھ آخر میں یہ فقرہ بھی موجود ہے۔

"درحقیقت ہندوستان میں اس وقت اسی قسم کی ایک ریاست قائم ہے۔"

رپورٹ آف دی کورٹ آف انکوائری معروف بہ "منیر رپورٹ" (لاہور ۱۹۵۴ء) صفحہ ۲۲۸)

یہ جملہ شامل کرنے کے بعد پورا جواب اپنے مفہوم کے اعتبار سے یہ بنتا ہے کہ عدالت نے اپنے سوال میں اسلامی حکومت کے قیام کی صورت میں جس اندیشہ کا اظہار کیا ہے وہ تو بالفعل موجود ہے۔ پھر اب کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے ملک میں اسلامی حکومت قائم نہ کریں جس کے لیے بحیثیت مسلمان ہم خدا کی طرف سے مکلف ہیں اور جس کے لیے دراصل پاکستان حاصل کیا گیا تھا۔ مگر جواب کی یہ صورت چونکہ مضمون نگار کے اعتراض کو کمزور کر رہی تھی، اس لیے انھوں نے آخری جملہ کو حذف کر دیا

دوسری غلطی یہ ہوئی ہے کہ صاحب مضمون نے یہی جواب دوسرے تمام علماء کی طرف بھی منسوب کر دیا ہے حالانکہ مطبوعہ رپورٹ میں اس سوال کے سلسلے میں جن جوابات کا ذکر ہے ان میں کم از کم ایک جواب یقینی طور پر اس سے مختلف ہے۔ رپورٹ کہتی ہے کہ امیر شریعت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے عدالت نے پوچھا ——— "ہندوستان میں کتنے کروڑ مسلمان بستے ہیں؟" انھوں نے جواب دیا۔ "چار کروڑ۔" اس کے بعد عدالت نے دوسرا سوال کیا ——— "کیا آپ کو کوئی اعتراض ہوگا اگر (ہندوستان کے ان مسلمانوں پر) منو کا قانون نافذ ہو جس کے تحت وہ شہری حقوق سے محروم ہو جائیں اور ان کے ساتھ ملیچھوں اور شدروں کا سا برتاؤ کیا جائے؟" مولانا بخاری نے جواب دیا۔

I am in Pakistan and I cannot advise them
(P. 228)

یعنی میں پاکستان میں ہوں اور میں ہندوستانیوں کو کوئی مشورہ نہیں دے سکتا۔ جواب کے یہ الفاظ میرے نزدیک نسبتاً زیادہ موزوں اور مناسب ہیں۔ اس چھوٹے سے فقرے میں بیک وقت دو باتیں کہہ دی گئی ہیں پہلی بات یہ کہ عدالت کا یہ سوال ہی غلط ہے۔ کیونکہ ہندوستان ایک آزاد اور خود مختار ملک ہے، وہ اپنے رویے کے تعین میں ہماری اجازت اور ہمارے مشوروں کا محتاج نہیں۔ دوسرے یہ کہ جس شخص سے سوال کیا جا رہا ہے اس کے سامنے اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ہندوستان میں کیا ہو رہا ہے بلکہ اصولی طور پر اس کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ وہ خود جن حالات میں ہے ان حالات کے اعتبار سے اس پر خدا کی طرف سے کیا فریضہ عائد ہوتا ہے۔

یہ بات نقل و اقتباس کے پہلو سے ہے ورنہ اصولی حیثیت سے دیکھیے تو زیرِ بحث صورتِ حال میں مسئلہ دراصل یہ تھا ہی نہیں کہ مسلم علاقوں ...... میں بسنے والے مسلمان ان ملکوں کے مسلمانوں کو کس حال میں دیکھنا چاہتے ہیں جہاں وہ اقلیت میں ہیں۔ اگر سوال یہ ہو تو ہر شخص وہی جواب دے گا جو مضمون نگار کے نزدیک اس کا بہتر سے بہتر جواب ہو۔ اس کے برعکس یہاں سوال دراصل یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے نام سے غیر مسلموں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے اس کی بنا پر اگر یہ اندیشہ ہو کہ کسی مسلم اکثریت کے ملک میں اسلامی حکومت کے قیام کا ابتدائی ردِ عمل یہ ہوگا کہ غیر مسلم اکثریت کے علاقے میں بسنے والی مسلم اقلیت کو بے جا مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا تو ایسی حالت میں مسلمان ملک کو کیا کرنا چاہیے۔

اس کا جواب یقیناً ایک ہی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ کسی بھی اندیشے کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ اس کی وجہ سے خدا کے حکم کو چھوڑ دیا جائے۔ محولہ جواب کے الفاظ سے قطع نظر، یہ ایک حقیقت ہے کہ معنوی حیثیت سے ایک مومن اس کے سوا کوئی دوسرا جواب نہیں دے سکتا۔ مسلمان کی ساری مصلحت اسی میں ہے کہ وہ بے چون و چرا خدا کے حکم کو مان لے۔ کسی بھی دوسری مصلحت کا یہ مقام نہیں ہے کہ خدا کے حکم پر اس کو ترجیح دی جائے بلکہ میں تو اس سے آگے بڑھ کر یہ کہوں گا کہ دوسری تمام مصلحتیں چھوٹی مصلحتیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ساری مصلحتوں کا ماخذ خدا کے حکم کی تعمیل میں ہے۔ اگر مسلمان خدا کے تابعدار بن جائیں تو ان کے اندر اور باہر کے سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو ان کا ایک مسئلہ بھی حل نہیں ہو سکتا، خواہ سطحی قسم کے مصلحین کو کسی دوسری تدبیر میں کتنے ہی فائدے نظر آتے ہوں۔

جسٹس منیر نے اپنے سوال نامہ میں جس ملک کے بارے میں وہاں کے علماء سے پوچھا تھا، وہ ایک ایسا ملک ہے جو کفار کے تسلط سے آزاد ہو چکا ہے اور وہاں فیصلہ کا اختیار کلیۃً مسلمانوں کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ ایک ایسے ملک کے بارے میں شریعت کا قطعی فیصلہ ہے کہ وہاں کے تمام انفرادی و اجتماعی معاملات مکمل طور پر شریعت کے قانون کے مطابق طے ہونے چاہییں۔ مسلمان کے لیے مسلمان رہتے ہوئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ وہ اپنی مرضی کو خدا کی اطاعت کے بجائے خدا کی بغاوت کے لیے استعمال کرے، اور ایک ایسی حالت میں جب کہ وہ خدا کی منشاء کے مطابق فیصلہ کر سکتا تھا، وہ بالقصد اس کی منشاء کے خلاف فیصلہ کر ڈالے۔ اور ظاہر ہے کہ تمام معاملاتِ زندگی کا شریعت کے مطابق انجام پانا اسی وقت ممکن ہے جب کہ اسلام کی بنیادوں پر حکومت کا قیام عمل میں آئے۔ مضمون نگار کو جس دین کی تعلیمات میں جنگی مصلحت کی رعایت کا فقہی جزئیہ مل گیا، اسی دین کی تعلیمات میں کیا انھیں

شرعی احکام کی تنفیذ کے لیے نصب امامت کا حکم نہیں ملا۔ حالانکہ اس کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ فقہ تو درکنار کلام و عقائد کی بھی کوئی کتاب اس کے تذکرہ سے خالی نہیں۔ آپ جس کتاب کو اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں یہ لکھا ہوا ملے گا کہ "اپنے اوپر ایک امام مقرر کرنا مسلمانوں کا لازمی فریضہ ہے"[1] اس میں خوارج کے ایک معدوم فرقہ "نجدات" کے سوا کسی کو بھی اختلاف نہیں۔ فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ اہل سنت والجماعۃ اس کو "سمعاً" یعنی شرعی حکم کے طور پر واجب مانتے ہیں اور بعض فرقے مثلاً زیدیہ اور معتزلہ کا قول یہ ہے کہ یہ از روئے عقل واجب ہے۔

۸۔ اسلامی حکومت رسول نے بھی قائم نہیں کی:

"مدینہ میں جب اسلام کی سب سے پہلی اسٹیٹ قائم ہوئی جس کے صدر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے تو اس کی شکل کیا تھی؟ اسے ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی زبانی سنیے جو قانون بین الملکی اور اسلامیات دونوں کے نامور فاضل اور مشہور محقق ہیں"

اس کے بعد مضمون میں ڈاکٹر صاحب کی کتاب سے حسب ذیل اقتباس نقل کیا گیا ہے:-

"یہ مدینہ کی ایک متحدہ ریاست تھی جس میں مسلمانوں، یہودیوں، غیر اہل کتاب عربوں اور عیسائیوں سے آباد خود مختار دیہات شریک تھے۔ اس اسٹیٹ کی اصل ساخت ہی مذہبی رواداری کی متقاضی تھی۔ چنانچہ اس اسٹیٹ کے لیے جو دستور مرتب کیا گیا تھا اس میں رسمی طور پر بھی اس کو تسلیم کیا گیا ہے"

Introduction to Islam, P. 96

اس کے بعد صاحب مضمون فرماتے ہیں ——— "لیکن جب یہودیوں اور ان کے ساتھیوں نے غداری اور معاہدہ کی خلاف ورزی کی تو اب یہ وفاق قائم نہیں رہ سکا اور اسٹیٹ خالص مسلمانوں کی ہو گئی"

ڈاکٹر حمید اللہ کی کتاب اس وقت میرے پاس نہیں ہے کہ اصل مقام پر اس کی پوری عبارت دیکھ کر فیصلہ کیا جا سکے کہ انھوں نے کس ضمن میں یہ بات کہی ہے، تاہم اقتباس کے اصل مصنف کا جو بھی منشا ہو، مگر اس کے مقتبس اور

---

[1] مثال کے طور پر یہاں صرف دو حوالے درج کیے جاتے ہیں:-

نصب الامام عندنا واجب (شرح عقائد نسفی)　　مسلمانوں کے لیے اپنے اوپر امام مقرر کرنا ہمارے نزدیک واجب ہے

لابد للامۃ من امام (شرح مقاصد)　　مسلمانوں کا اپنا ایک امام ہونا ضروری ہے۔

مگر یہ حوالے بھی شاید مضمون نگار کے لیے کافی نہ ہوں۔ کیونکہ استدلال کا جو نادر طریقہ انھوں نے اختیار کیا ہے اس کے مطابق وہ کہہ سکتے ہیں کہ یہاں "امام" سے مراد مسجد کا امام ہے نہ کہ نظام اجتماعی کا امام۔

ترجمہ یقینی طور پر یہاں غلطی پر ہیں۔

مضمون نگار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مدینہ پہنچنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف شہر کے یہود اور دیگر قبائل سے مل کر جو معاہدہ کیا، وہ مدینہ کی مسلم ریاست کا "دستور" تھا، اس دستور کے تحت وہاں ایک "متحدہ ریاست" وجود میں آئی جس میں دستخط کرنے والے تمام قبائل خودمختارانہ طور پر "شریک" تھے۔ یہ مختلف قوموں کی "وفاقی حکومت" تھی نہ کہ اسلام کی علیحدہ شرعی حکومت۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر اصلاً اسی قسم کی مخلوط حکومت کا قیام تھا۔ مگر جب دیگر شرکا اس کو نبھا نہ سکے تو مجبوراً یہ وفاق ٹوٹ گیا اور اس کے بعد اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ ریاست خالص مسلمانوں کی ہو کر رہ جائے گویا اس حکومت کا خاص اسلامی حکومت کی شکل اختیار کرنا بزیل منزل تھا نہ کہ معیاری طور پر یہی مطلوب تھا۔

سب سے پہلے ہم یہ پورا "صحیفہ" یہاں نقل کرتے ہیں۔ چونکہ وہ کافی طویل ہے اس لیے متن کو حذف کر کے صرف اس کا ترجمہ دیا جا رہا ہے۔ البتہ چند خاص مقامات پر عربی الفاظ بھی دے دیے گئے ہیں۔

- خدا کے پیغمبر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا یہ نوشتہ مہاجرین قریش اور اہل یثرب میں سے اسلام لانے والوں اور ان سب لوگوں کے لیے ہوگا جو آئندہ ان کا اتباع کر کے ان میں شامل ہو جائیں اور ان کے ساتھ مل کر جنگ کریں
- یہ لوگ دوسروں سے الگ ایک امت شمار ہوں گے۔ (انہم امۃ واحدۃ من دون الناس)
- مہاجرین قریش حسب سابق اپنے مجرموں کی جانب سے دیت کی ادائگی کے ذمہ دار ہوں گے اور اپنے قیدیوں کو خود ہی فدیہ دے کر چھڑائیں گے تاکہ مسلمانوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف کا ہو۔ (بالمعروف والقسط بین المومنین -)
- بنی عوف، بنی الحارث، بنی ساعدہ، بنی جُشَم، بنی النجار، بنی عمرو، بنی النبیت، اور بنی الاوس (انصار کے قبائل) اپنی اپنی جماعت کے خود ذمہ دار ہوں گے اور بدستور سابق اپنا اپنا خونبہا باہم مل کر ادا کریں گے، اور اپنے قیدیوں کو خود ہی فدیہ دے کر چھڑانے کے ذمہ دار ہوں گے[1]
- مسلمانوں میں اگر کوئی مفلس کسی ایسے جرم کا مرتکب ہو جس پر دیت واجب ہوتی ہے، یا کہیں قید ہو جائے اور فدیہ ادا کرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو دوسرے مسلمانوں پر لازم ہوگا کہ وہ اس شخص کی جانب سے دیت یا فدیہ ادا کر کے اسے چھڑائیں۔

---

[1] اصل معاہدہ میں مذکورہ قبائل کے لیے ہر ایک کے ساتھ بار بار یہی الفاظ آئے ہیں۔ ترجمہ میں اختصار کے پیش نظر ان کو ملا دیا گیا ہے۔

- کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کے آزاد کردہ غلام کو حلیف نہیں بنائے گا۔
- مومنین متقین اپنے درمیان کے ایسے تمام افراد کے مخالف ہوں گے جو فتنہ و فساد برپا کرے اور خلق خدا کو ستائے یا زبردستی کوئی چیز حاصل کرنا چاہے اور سرکشی اختیار کرے ایسے شخص کو سزا دینے میں تمام مسلمان آپس میں متفق رہیں گے۔ خواہ وہ شخص ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔
- کسی مسلمان کو یہ حق نہ ہوگا کہ وہ کسی مسلمان کو کسی کافر (محارب) کے بدلے میں قتل کرے، یا کسی مسلمان کے مقابلے میں کسی محارب کی مدد کرے۔
- خدا کا ذمہ ایک ہی ہے یعنی اگر کسی مسلمان نے کسی کو پناہ دے دی تو اس کی پابندی تمام مسلمانوں کو لازم ہوگی، خواہ پناہ دینے والا ادنیٰ درجہ کا مسلمان ہی کیوں نہو۔ تمام مسلمان دوسروں کے مقابلے میں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
- جن یہود نے ہمارے ساتھ معاہدہ کرلیا ہے، ان کے متعلق مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کو مدد دیں اور مواساۃ کا برتاؤ کریں، ان پر کسی قسم کا ظلم نہ کیا جائے اور نہ ان کے خلاف ان کے دشمن کو مدد دی جائے۔
- مسلمانوں کی صلح ایک ہی ہوگی، جب اللہ کی راہ میں جنگ ہو تو کوئی مسلمان دوسرے مسلمانوں کو چھوڑ کر دشمن سے اس وقت تک علیحدہ صلح نہیں کرے گا جب تک وہ صلح سارے مسلمانوں کے لیے یکساں نہ ہو۔
- ان تمام جماعتوں کو جو ہمارے ساتھ جنگ میں حصہ لیں گی، نوبت بہ نوبت آرام کرنے کے لیے موقع دیا جائے گا۔
- جو مسلمان جہاد فی سبیل اللہ میں شہید ہو جائیں ان کے پس ماندگان کا تکفل تمام مسلمانوں پر واجب ہوگا۔
- بلاشبہہ تمام متقی اور پرہیزگار مسلمان سب سے اچھے اور صحیح طریقے پر ہیں (ان المومنین المتقین علیٰ احسن هدی واقومه)
- کوئی غیر مسلم معاہد قریش کی جان و مال کو کسی طرح کی پناہ نہ دے گا اور نہ کسی غیر مسلم کو کسی مسلمان کے مقابلے میں مدد پہنچائے گا۔
- کوئی شخص اگر کسی مسلمان کو عمداً قتل کردے اور ثبوت موجود ہو تو قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ ہاں اگر مقتول کا وارث دیت لینے پر رضامند ہو جائے تو دیت ادا کرکے گلو خلاصی ہو سکتی ہے۔ تمام مسلمان بلا استثناء اس کی تعمیل کے لیے اٹھیں گے اس کے علاوہ کوئی اور چیز قابل قبول نہ ہوگی۔
- کسی مسلمان کے لیے جس نے اس صحیفہ کو تسلیم کرکے اس کی پابندی کا اقرار کرلیا ہے اور وہ خدا اور یوم آخرت

پر ایمان رکھتا ہو اس کے لیے ہرگز جائز نہیں ہو گا کہ وہ کسی قاتل کی مدد کرے یا اسے پناہ دے۔ جو شخص ایسے آدمی کی مدد کرے یا اس کو پناہ دے۔ قیامت کے دن اس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہو گا اور اس بارے میں اس کا کوئی عذر اور توبہ قبول نہ کیا جائے گا۔

- اہل معاہدہ میں جب کسی چیز کے متعلق آپس میں اختلاف پیدا ہو جائے تو اس کے فیصلہ کے لیے خدا اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے رجوع کیا جائے گا (وانکم مہما اختلفتم فیہ من شیئ فان مردہ الی
- اللہ عز وجل والی محمد صلی اللہ علیہ وسلم)
- اس معاہدے کے بعد یہود پر لازم ہو گا کہ وہ جنگ کی حالت میں جب کہ مسلمان کسی دشمن کے ساتھ بر سرِ پیکار ہوں مسلمانوں کو مالی امداد دیں۔
- بنی عوف کے یہود مومنین کے ساتھ ایک امت (سیاسی وحدت) شمار ہوں گے۔ یہود کے لیے اپنا دین ہو گا اور اہل ایمان کے لیے اپنا دین (وان یہود بنی عوف امۃ مع المومنین للیہود دینہم وللمسلمین دینہم) اسی طرح بنی النجار، بنی الحارث، بنی ساعدہ، بنی جشم، بنی الاوس، بنی ثعلبہ، بنی جفنہ اور بنی الشطیبہ کے یہود بھی ان میں اگر کوئی شخص ظلم یا عہد شکنی کرے گا تو وہ اپنے جرم کی سزا کا مستحق ہو گا۔
- یہود کے مذکورہ بالا قبائل کی ذیلی شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو حاصل ہیں۔
- معاہدہ کرنے والوں میں کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی اجازت کے بغیر فوجی اقدام نہیں کرے گا۔
- کسی زخم یا ضرب کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی۔ جو شخص بھی عہد شکنی کرے گا وہ اس کی سزا کا مستحق ہو گا۔ اور خدا اس کے ساتھ ہے جو اس عہد نامہ کی زیادہ سے زیادہ وفادارانہ تعمیل کرے۔
- اگر مسلمان اور یہود معاہدین کے خلاف کوئی تیسری قوم جنگ کرے تو ان تمام معاہدین کو متفق ہو کر لڑنا ہو گا۔ وہ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کریں گے اور باہم بہی خواہی اور وفا شعاری ہو گی۔
- یہود اپنے مصارف جنگ برداشت کریں گے اور مسلمان اپنے مصارف جنگ۔
- معاہدہ کرنے والے فریقین پر لازم ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ خلوص اور خیر خواہی کا برتاؤ کریں۔ کوئی کسی پر ظلم اور ناانصافی نہ کرے اور مظلوم کو مدد پہنچائے۔
- یہود اس وقت تک مسلمانوں کے ساتھ اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں۔
- یثرب کا جوف (پہاڑ کے درمیان کا میدانی علاقہ) اس معاہدہ میں شریک ہونے والوں کے لیے حرم (مقدس مقام) ہو گا

- پناہ گزیں سے بھی وہی برتاؤ کیا جائے گا جو پناہ دہندہ کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ جب تک وہ نقصان نہ پہنچائے اور عہد شکنی نہ کرے۔
- کسی پناہ گاہ میں وہاں والوں کی اجازت کے بغیر کسی کو پناہ نہیں دی جائے گی۔
- اہل معاہدہ میں اگر کوئی نئی بات پیدا ہو یا اختلاف رونما ہو جس سے نقص امن کا اندیشہ ہو تو اس کے فیصلہ کے لیے خدا اور محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) سے رجوع کیا جائے گا، جو شخص اس صحیفہ کی زیادہ سے زیادہ تعمیل کرے گا، خدا اس کے ساتھ ہو گا۔
- "قریش مکہ اور ان کے مددگار کو کوئی شخص پناہ نہیں دے گا۔
- اگر کوئی یثرب پر حملہ آور ہو گا تو مسلمان اور یہود دونوں فریق مل کر مدافعت کریں گے۔
- اگر مسلمان کسی سے صلح کریں گے تو یہود بھی اس صلح کے پابند ہوں گے اور اگر یہود کسی سے صلح کریں گے تو مسلمانوں پر لازم ہو گا کہ یہود کے ساتھ ایسا ہی تعاون کریں۔ البتہ کسی فریق کی اپنی مذہبی جنگ میں دوسرے فریق پر تعاون کی ذمہ داری عائد نہ ہو گی۔ (الا من حارب فی الدین)
- یثرب پر حملہ کی صورت میں ہر جماعت کو اس حصہ کی مدافعت کرنا ہو گی جو اس کے بالمقابل ہو۔
- قبیلہ اوس کے یہود اور موالی کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس صحیفہ میں شریک ہونے والوں کے لیے مقرر ہیں بشرطیکہ وہ اہل معاہدہ سے وفاداری کا اظہار کریں۔ جو اس صحیفہ کی زیادہ سے زیادہ وفاداری کے ساتھ تعمیل کرے گا خدا اس کا حامی و مددگار رہے۔
- اس معاہدے میں شریک ہونے والے گروہوں میں سے اگر کسی گروہ کو جنگی ضرورت سے مدینے سے باہر جانا پڑے تو وہ امن وحفاظت کا اسی طرح مستحق ہو گا جیسے مدینہ میں رہنے والے لوگ۔ سوا اس کے جو ظلم اور عہد شکنی کا رویہ اختیار کرے۔ اور جو تقویٰ اختیار کرے اور وفاداری کا ثبوت دے۔ اس کے لیے اللہ اور اس کا رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نگہبان ہیں۔

السیرۃ النبویہ لابن ہشام جلد دوم (مصر ۱۹۳۶ء) صفحہ ۱۴۷-۱۵۰

اس نوشتہ کی حیثیت کیا تھی؛ وہ کسی وفاقی حکومت کا دستور تھا یا کچھ اور۔ اس پر ہم فی الحال کوئی گفتگو نہیں کریں گے۔ کیونکہ یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اس وقت میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس کے حوالے سے مضمون نگار جو کچھ ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ مضمون نگار یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کو اپنے مخصوص مذہب کی

بنیاد پر حکومت قائم کرنے پر اصرار نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ دوسرے گروہوں کے ساتھ مل کر ایک مشترکہ نظام قائم کرنا چاہیے جس طرح سیکولر جمہوری نظام میں ہوتا ہے مگر "صحیفہ" اس کے برعکس یہ ظاہر کرتا ہے کہ مدینہ کے مسلمانوں کو اس میں پورے اسلامی حقوق دیے گئے ہیں بلکہ اسلام ہی کو آخری سند کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے اگر مضمون نگار کے نزدیک یہ وفاقی حکومت کا دستور تھا، تو یقیناً آج بھی مسلمان ایسی وفاقی حکومت کو خوش آمدید کہیں گے جہاں انھیں یہ مقام دیا گیا ہو کہ ان کی ایک علیحدہ اور مستقل امت تسلیم کی جائے۔ جہاں مسلمان اپنی قومی روایات کے مطابق اپنے معاملات کا فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں۔ جہاں وہ اپنے مجرمین کو اپنے قانون کے مطابق خود سزا دینے کے لیے عدالتیں قائم کر سکیں، جہاں وہ بیرونی قوموں سے صلح کرنے اور جنگ چھیڑنے کا حق رکھتے ہوں اور ان کے ایسے اقدامات میں ابنائے وطن بھی یکساں طور پر شرکت کے پابند ہوں، جہاں دستوری طور پر یہ تسلیم کیا گیا ہو کہ مسلمان ہدایت کے احسن اور اقوم طریقہ پر ہیں، جہاں از روئے معاہدہ مسلمانوں کی دشمن قوم کو کوئی فرقہ مدد نہ دے سکتا ہو، جہاں مسلمانوں کو اپنے دین پر مکمل طور پر عمل کرنے کا دستوری حق تسلیم کیا گیا ہو، جہاں مسلمانوں کے دشمن کو پناہ نہ دی جا سکتی ہو، جہاں متنازعہ مسائل میں آخری سند خدا و رسول کو قرار دیا گیا ہو اور پوری آبادی شریعت کے فیصلہ کو آخری فیصلہ کی حیثیت سے ماننے پر مجبور ہو ——— کیا مضمون نگار مسلمانوں کے لیے ایسی وفاقی حکومت بنانے کی کوشش کریں گے۔

آخر میں میں کہوں گا کہ یہ مضمون اگر کسی ہندو یا عیسائی کا لکھا ہوا ہوتا تو ہم کہتے کہ وہ غیر قوم کا ہونے کی وجہ سے غلط فہمی میں مبتلا ہے، یا اسلام دشمنی میں ایسی باتیں کہہ رہا ہے۔ مگر جب خود مسلمانوں میں سے ایک شخص اٹھ کر ایسی باتیں کہنا شروع کر دے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو کیا کہا جائے۔ اس قسم کے واقعات دیکھ کر تو اسلامی حکومت کی ضرورت اور شدید معلوم ہونے لگتی ہے کیونکہ اسلامی حکومت کی موجودگی ہی میں یہ ممکن ہے کہ ایسے فتنوں کا واقعی سدباب کیا جا سکے۔

نوٹ۔ یہ مضمون پریس جا چکا تھا کہ برہان کے اداریہ کی تیسری قسط موصول ہوئی۔ انشاء اللہ اگلے مہینے اس کے متعلق اظہار خیال کیا جائے گا۔

اخبار وافکار :

صدر جمہوریہ اور نیشنلزم

"صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر رادھا کرشنن نے اینٹی نکلیر کنونشن میں تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ اب علیحدہ علیحدہ قوموں اور علیحدہ علیحدہ ریاستوں کا زمانہ گیا اب تو دنیا کو عالمی قومیت کی اصطلاح میں سوچنا چاہیے۔ ایک قوم، ایک ریاست کا نظریہ لوٹ کھسوٹ کا ذریعہ بن گیا ہے اسی لیے آچاریہ ونوبا بھاوے نے جے ہند کے بجائے جے جگت کا نعرہ لگانا شروع کر دیا ہے"

جماعت اسلامی ہند بیس بائیس سال سے یہ بات کہتی آ رہی ہے کہ نیشنلزم (قوم پرستی) ایک تباہ کن تنگ نظری ہے اور دنیا میں یہ قوموں کے درمیان مستقل جنگ و جدال کا بہت بڑا عنصر ہے اس لیے قوم پرستی کے بجائے حق پرستی اختیار کرنی چاہیے اور نسل، رنگ، زبان اور وطن کے تنگ دائروں سے نکل کر انسانی مسائل پر غور و فکر کرنا چاہیے، انسان ایک آدم کی اولاد ہے اس لیے ان مذکورہ بنیادوں پر انسانی حقوق کی تعیین اور انسانوں کے درمیان بلند و پست کی تفریق غلط ہے۔ وحدت آدم جماعت اسلامی کی دعوت کا ایک اہم جزو ہے وہ نیشنلزم کے نظریے کی مخالف ہے اور شاید اسی اختلاف کی وجہ سے بھارت کے وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اس پر وطن دشمنی کا انتہائی غلط الزام لگا رہے ہیں۔ صدر جمہوریہ نے جو کچھ کہا ہے وہ دعوت اسلامی ہی کے ایک جزو کی مجمل ترجمانی ہے۔ وہ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ قوم پرستی دنیا کے لیے مفید نہیں ہے اور اب یہ نظریہ آوٹ آف ڈیٹ ہو گیا ہے لیکن یہ یقین کرنا چاہیے کہ صدر جمہوریہ کی وطن پرستی پر اس کے بعد بھی کوئی حرف نہ آئے گا۔ لوک سبھا اور پریس کانفرنسیں تو کھلی جگہیں ہیں، کسی پرائیوٹ مجلس میں بھی وزیر اعظم اور وزیر داخلہ اس پر تنقید کی جرأت نہیں کر سکیں گے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی قوم پرستی سے اختلاف کرنے کی وجہ سے وطن دشمن کیوں ہو گئی؟ ——— اشخاص، افراد اور جماعتوں کے بدل جانے سے اتنا بڑا فرق کس طرح پیدا ہو جاتا ہے؟ ایک شخص کی زبان سے کوئی بات نکلتی ہے اور ہر طرف سے، اے واہ، سبحان اللہ، احسنت آفریں کی صدائیں بلند ہوتی ہیں اور وہی بات ایک دوسرے شخص کی زبان سے نکلتی ہے تو ہر سمت سے طنز و تعریض اور الزامات کے تیر برسنے لگتے ہیں، اس کی وجہ

یہ ہے کہ جب تک لوگ کسی کے منہ سے نکلی ہوئی بات کو محض شاعری سمجھتے ہیں اس پر داد و تحسین کے دونگڑے برساتے ہیں اور جب وہی بات کسی کے منہ سے نکل کر سنجیدہ حقیقی اور عملی نظر آنے لگتی ہے تو اس پر ہو ہنگ شروع کر دیتے ہیں، اسی بات کو دوسرے لفظوں میں قول و عمل کے تضاد سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ صدر جمہوریہ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ بس فرمایا ہی ہے، حکومت کی چرخی جس سمت گھوم رہی ہے اسی سمت گھومتی رہے گی، مخالف سمت کی طرف گردش کرنا تو بڑی بات ہے اس میں ایک لمحے کے لیے کوئی ٹھہراؤ بھی پیدا نہ ہوگا۔

جماعت اسلامی کا بہت بڑا جرم یہ ہے کہ وہ قول و عمل کے تضاد کو ختم کرنا چاہتی ہے۔

پنچ شیل کا انجام

چین اور ہندستان کی سربراہی میں پنچ شیل کا جو غبارہ تیار ہوا تھا اس کی ہوا تو کئی سال پہلے ہی نکل گئی تھی اور اب اس کی دھجیاں بھی فضا میں بکھر گئیں، راقم الحروف نے ماہنامہ زندگی اگست اور ستمبر ۱۹۵۹ء کے شماروں میں پنچ شیل کا تفصیلی جائزہ پیش کیا تھا، یہاں تفصیلی جائزہ نقل کرنے کی ضرورت نہیں، جو اجمالی رائے قائم کی گئی تھی صرف اسی کو نقل کر دینا کافی ہے۔

"پنچ شیل یہ ہیں: (۱) ایک دوسرے کی علاقائی سالمیت و اقتدار کا احترام (۲) ایک دوسرے پر حملہ نہ کرنا۔ (۳) ایک دوسرے کے اندرونی مسائل میں عدم مداخلت (۴) مساوات اور باہمی فائدہ رسانی۔ (۵) پرامن بقائے باہمی۔

"یہ پانچ اصول تو بڑے اچھے ہیں دنیا کے لوگ انہیں مان لیں تو جنگیں بند ہو سکتی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ طاقتور ان اصولوں پر عمل کیوں کرے؟ ایک طرف تو زندگی کے مادہ پرستانہ نظریے پر اتنا زبردست ایمان کہ اس پر تنقید بھی برداشت نہیں ہوتی اور دوسری طرف یہ مطالبے، دونوں میں کہیں سے کوئی جوڑ ہے؟ شاعر نے شاید اسی موقع کے لیے کہا تھا

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ ٭ باز می گوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

ان مطالبوں یا اصولوں کے پورا ہونے کی توقع کرنا سادگی مزاج کے سوا اور کچھ نہیں ہے کیا پہلے ملکوں نے آپس کی جنگوں کو روکنے کے لیے اسی طرح کے اصول وضع نہیں کیے اور ان کی بنیاد پر معاہدے نہیں کیے لیکن نتیجہ اس کے سوا کیا نکلا کہ جب تک اپنی قومی مصلحت تقاضا کرتی رہی وہ اصول اور معاہدے قائم رہے اور جب قومی مصلحت ان کے خلاف نظر آئی تو پھر ان اصولوں اور معاہدوں کو پرزے پرزے کر کے فضا میں بکھیر دیا گیا۔"

ان سطروں پر زیادہ مدت نہ گزری تھی کہ پنچ شیل کی دھجیاں بھی فضا میں بکھر گئیں۔

تنقید و تبصرہ

الرأی السدید مرتبہ مولانا محمد عبدالقیوم صاحب علی گڈھ۔ صفحات ۴۶۔ کتابت طباعت، کاغذ معمولی
قیمت ایک روپیہ۔ ملنے کا پتہ: محمد عبدالجلیل مہتمم دائرہ معارف اسلامیہ لطیفیہ
بالائے قلعہ۔ علی گڑھ۔

اس پمفلٹ کا پورا نام یہ ہے: "الرای السدید فی نصب المجهار لصلوٰۃ الجمعۃ والعیدین"
یعنی لاؤڈ اسپیکر کے نماز جمعہ و عیدین میں استعمال کرنے کے بارے میں شرعی رائے۔

عبادات و دیانات میں نئے آلات کا استعمال، علماء کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے اور اب بھی یہ اختلاف ختم نہیں ہوا ہے۔ رویت ہلال میں تار، ٹیلی فون اور ریڈیو کی خبروں کے اعتبار و عدم اعتبار کا مسئلہ ہو یا نماز میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کرنے کے جواز و عدم جواز کا مسئلہ ہو اب تک کوئی ایک بات طے نہیں ہو سکی ہے لیکن جیسے جیسے ان آلات کی حقیقت سامنے آتی جا رہی ہے، اختلاف کم ہوتا جا رہا ہے۔

آج سے ۲۰ سال پہلے اس مسئلہ پر راقم الحروف نے ایک مشہور عالم و مفتی کا مرتب کردہ رسالہ پڑھا تھا جس میں انھوں نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ عبادات مقصودہ میں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال درست نہیں ہے لیکن جو دلائل دیے گئے تھے ان سے میری تشفی نہیں ہوئی تھی اور ان پر اپنے شبہات میں نے اسی وقت نوٹ کیے تھے اس زمانے سے لیکر آج تک میں اس کے جواز ہی کی طرف مائل رہا ہوں لیکن اس مسئلے پر مجھے خود تحقیق کرنے کا کبھی موقع نہ ملا، زیر تبصرہ رسالے کو پڑھ کر خوشی ہوئی کہ فاضل مصنف نے اس کے جواز پر تشفی بخش دلائل جمع کر دیے ہیں۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے لیے سب سے زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ آواز کی حقیقت اور آلہ مکبر الصوت کی حقیقت، سائنٹفک انداز میں اس طرح واضح کر دی جائے کہ تمام شبہے دور ہو جائیں، اس رسالے میں مسئلے کا یہ پہلو جدید و قدیم معلومات کی روشنی میں تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، نمازوں میں اس آلے کے عدم استعمال پر جو سب سے زیادہ وزنی فقہی دلیل دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ لاؤڈ اسپیکر کی آواز بعینہ امام کی آواز نہیں ہوتی بلکہ یہ آلہ امام کی آواز کو جذب

کرکے اسی کے مثل ایک دوسری آواز پیدا کرتا ہے اور چونکہ یہ آلہ خود نماز میں شریک نہیں ہوتا اس لیے اس کی آواز پر مقتدیوں کا رکوع و سجود درست نہیں ہے کیونکہ تکبیرات امام کی تبلیغ کے لیے ضروری ہے کہ مبلغ یا مکبر خود اس نماز میں شریک ہو، فاضل مصنف نے قدیم و جدید اہل علم کے حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ کسی بھی انسان کی آواز جو کچھ دور پر سنائی دیتی ہے وہ بعینہ وہ آواز نہیں ہوتی جو اس کے منہ سے نکلتی ہے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ منہ سے قریب کی ہوا اسے اپنے اندر جذب کر لیتی ہے اور پھر اسی کے مثل آواز اپنے قریب کی ہوا تک پہنچاتی ہے اور اسی طرح درجہ بدرجہ ہوا کی موجیں اسی کے مثل آواز سننے والے کے کانوں تک پہنچاتی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ بلا واسطہ آلہ امام کی جو آواز مقتدیوں تک پہنچتی ہے وہ بھی اس کی بعینہ آواز نہیں ہوتی بلکہ اس کی آواز کے مثل دوسری آواز ہوتی ہے۔ اس آلے کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ ہوا کی موجوں میں قوت کا اضافہ کرتا اور اسے طاقتور بناتا ہے، فاضل مصنف نے اس کی قدیم مثال میں قبوں اور مسقف کمروں کی صدائے بازگشت کو پیش کیا ہے وہاں بھی یہی ہوتا ہے کہ قبے اور چھتیں ہوا کی لہروں کو منتشر ہونے سے روک کر ان میں طاقت پیدا کر دیتی ہیں اور آواز دور تک سنائی دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ امام کی صدائے بازگشت سن کر مقتدیوں کا رکوع و سجود کسی کے نزدیک نادرست نہیں ہے سبھی اس اقتدا کو صحیح مانتے ہیں۔ آلۂ مکبر الصوت بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں کرتا لہٰذا اس کی آواز پر اقتدا کو نادرست کہنا، درست نہیں ہے، اس حد تک فاضل مصنف نے مسئلے کو واضح کر دیا ہے لیکن تبصرہ نگار عرض کرتا ہے کہ عدم جواز کے بعض قائلین نے علامہ شامی کی نقل کردہ ایک عبارت سے تکبیرات امام کی تبلیغ کے لیے دو شرطیں مستنبط کی ہیں ایک یہ کہ مکبر مکلف ہو دوسری یہ کہ وہ اس نماز میں خود شریک ہو فاضل مصنف کو چاہیے تھا کہ اس استنباط پر بھی بصراحت و وضاحت بحث کرتے اور بتاتے کہ اس عبارت سے فی الواقع کیا بات مستنبط ہوتی ہے اور اس کا تعلق غیر جاندار چیزوں سے ہے بھی یا نہیں؟ اگرچہ رسالے کی بحثوں سے ضمنی طور پر بات سمجھ میں آتی ہے لیکن ضرورت تھی کہ اس پر مستقل ایک فصل لکھی جاتی، ایک بات کی طرف اور اشارہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے صفحہ ۲ پر یہ جو [illegible] ہے کہ ابتدائے اسلام میں جہر پنج وقتہ نمازوں میں شروع ہوا تھا، تو اس کے لیے مصنف نے کوئی دلیل نہیں دی، بلکہ کسی کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا ہے۔ فقہائے احناف یہ بات اپنی کتابوں میں لکھتے تو ہیں لیکن اس کی صراحت کسی حدیث میں نہیں ملتی۔ کسی بات کو صراحۃً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کرنے کے لیے صحیح روایت کی ضرورت

ہے جو اس مسئلے میں شاید موجود نہیں ہے کسی حدیث سے خود استنباط کیے ہوئے مسئلے کو صراحۃً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر دینا صحیح نہیں ہے —

اگرچہ اس رسالے کو شائع ہوئے کئی سال گزر گئے لیکن اب بھی تازہ ہے — رسالے کی قیمت کچھ زیادہ ہے حالاں کہ تکثیر اشاعت کے لیے قیمت کم ہونی چاہیے تھی۔ کتابت و طباعت کی صحت و عمدگی کی طرف بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ امید ہے کہ آئندہ اڈیشن میں ان باتوں کا لحاظ رکھا جائے گا۔ (ع۔ق)

فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضؓ

سلام اللہ صدیقی جونپوری۔ صفحات ۱۵۴ مجلد گرد پوش اور حضرت عمرو بن العاص کی دو تصویروں کے ساتھ، قیمت ۲ روپیہ ۵۰ نئے پیسے

ناشر:- مکتبۂ اسلامی ادب، للہ پورہ (فاطمان) بنارس۔

مصنف اس سے پہلے بھی کئی کتابیں تصنیف کر چکے ہیں، یہ ان کی تازہ تصنیف ہے، حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نامور صحابی رسول ہیں، ان کے سوانح حیات میں ہم مسلمانوں کے لیے بہت سے قابل اخذ نمونے موجود ہیں، ان کے حالات جو تاریخ و سیر اور احادیث میں متفرق مقامات پر بکھرے ہوئے تھے، اس کتاب میں سمیٹ دیے گئے ہیں اس لحاظ سے یہ خدمت قابل قدر ہے۔ حضرت عمرو بن العاص ان صحابہ میں ہیں جنھوں نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ مل کر حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جنگ کی تھی اس لیے شیعوں نے انہیں بھی اپنے طعن و تشنیع کا ہدف بنا لیا ہے۔ مصنف اس سے دامن بچا کر گزر نہیں سکتے تھے اس لیے انھوں نے کتاب کا ایک حصہ ان اعتراضات کے جواب کے لیے وقف کیا ہے اگر اس حصہ میں ان کا قلم بعض مقامات پر اعتدال سے بہت دور نہ جا پڑا ہوتا تو تبصرہ نگار لوگوں کو مطالعہ کا مشورہ دے کر تبصرہ ختم کر دیتا لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہو سکا۔

راقم الحروف کو یقین ہے کہ واقعۂ جمل و صفین اور حادثۂ کربلا سے متعلق معتدل مسلک وہی ہے جو اہل السنۃ والجماعۃ نے اختیار کیا ہے، اس مسلک کو چھوڑ دینے کے بعد کوئی شخص بھی افراط و تفریط سے بچ نہیں سکتا یا تو وہ افراط کی طرف سرک جائے گا یا تفریط کی طرف ڈھلک جائے گا۔ افراط شیعیت ہے اور تفریط ناصبیت۔ مجھے پوری توقع ہے کہ مصنفِ کتاب معتدل مسلک ہی پر یقین رکھتے ہوں گے لیکن انھوں نے اپنی کتاب میں حضرت عمرو بن العاص رضؓ کی مذمت کرنے والوں کے جواب میں جو چند صفحات لکھے ہیں ان میں بعض مقامات پر ایسی تحقیق پیش کی ہے جنھیں دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور حیرت بھی، شاید وہ موجودہ دور کے بعض سنیوں کے غلط عقیدے سے

اس قدر برافروختہ ہوئے کہ خود ان کا قلم بھی اعتدال سے ہٹ گیا۔ میں یہاں مصنف کے خود ساختہ ... کے ساتھ چند باتوں کی نشان دہی کرتا ہوں:

صفحہ ۱۰۶ پر معترضین کے جواب کے لیے "کذابین کی افترا پردازی" کا عنوان قائم کیا گیا ہے اور پھر نمبر ۹۱ مخالفین کی باتیں نقل کرکے جواب لکھا گیا ہے۔ ص۱۳ پر انھوں نے حضرت عمار سے متعلق تقتلہ الفئۃ الباغیۃ والی حدیث کا ترجمہ درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ اہل تشیع اسی حدیث کے پیش نظر حضرت معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو جہنمی کہتے ہیں اور انھیں سے متاثر ہوکر بعض شیعہ صفت اہل سنت بھی ان لوگوں سے بری طرح بد ظن ہیں اور ایک سنی عالم کا تو یہ عقیدہ ہوگیا ہے کہ "معاذ اللہ یہ لوگ کھڑے جہنم میں جائیں گے"۔ اس کے بعد انھوں نے قرآن کی روایتوں سے، اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کرنے والے صحابہ کا جنتی ہونا ثابت کیا ہے۔ پھر لکھا ہے کہ حضرت مغیرہ بن شعبہ اور حضرت عمرو بن العاص ایک طرف مہاجر و مجاہد ہیں اور دوسری طرف اس گروہ کے سربراہ بھی ہیں جس نے حضرت عمار کو شہید کیا۔ ان مقدمات کے بعد وہ سوال کرتے ہیں کہ "اگر اس نازک موقع پر صرف حدیث ہی کو مشعل راہ بنایا جائے تو پھر آیات قرآنی کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے گا"۔ اس کے بعد محدثین کے اصول درایت کے پیش نظر لکھا ہے کہ جو روایت قرآنی آیات کے خلاف ہو وہ ایمان لانے کے لائق نہیں۔ پھر آگے چل کر لکھا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے بغض معاویہ سے متاثر ہوکر اس قسم کی روایتوں پر ایمان لا یا بھی جائے تو پھر ان روایتوں کے متعلق کیا ہوگا جن سے حضرت علی اور ان کے ساتھیوں کی تنقیص لازم آتی ہے (ان حدیثوں پر اظہار خیال میں آگے کروں گا)

راقم الحروف عرض کرتا ہے کہ شاید غیر شعوری طور پر مصنف نے اس حدیث اور اس کو صحیح ماننے والوں کے ساتھ سخت زیادتی کی ہے۔ اگر وہ محققین علمائے اہل سنت کی روش اختیار کرتے تو انھیں اس زیادتی کی ضرورت پیش نہ آتی۔ شیعے صرف اس حدیث کو نہیں بلکہ اور بھی متعدد صحیح احادیث کو اپنے مسلک کی حمایت میں استعمال کرتے ہیں لیکن آج تک کسی اہل علم نے بھی محض شیعوں کے جواب کے لیے ان احادیث کو ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈالا بلکہ ان احادیث کا صحیح محمل پیش کرکے ان کے استدلال کی غلطیاں اور خامیاں واضح کیں۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو مصنف کو یقین کرنا چاہیے کہ پھر شیعوں اور دوسرے گمراہ فرقوں کے جواب میں ہمیں پورے ذخیرۂ احادیث سے ہاتھ دھو لینا چاہیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب اعلیٰ درجہ کی ایسی صحیح احادیث بھی رد کی جاسکتی ہیں جن پر آج تک کسی قابل ذکر محدث نے روایۃً یا درایۃً اعتراض نہیں کیا تو پھر آخر کس حدیث کی آبرو سلامت رہے گی؟ اس

دوسرے کچھ لوگوں نے مشکل احادیث کی تطبیق و توجیہ سے گھبرا کر آسان راہ یہ نکالی ہے کہ ایسی احادیث کا انکار ہی کر دیا جائے وہ محسوس نہیں کرتے کہ یہ راہ آگے بڑھ کر غلام احمد پرویز کی راہ سے مل جاتی ہے۔ حدیث عمار صحت کے اتنے اونچے مقام پر فائز ہے کہ اس جیسی احادیث انگلیوں پر گنی جا سکتی ہیں۔ صرف سند ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ متعدد صحابہ سے مروی ہونے کی جہت سے بھی۔ امام بخاری نے یہ حدیث اپنی صحیح میں دو جگہ روایت کی ہے۔ حافظ ابن حجر نے اس حدیث کے راویوں میں ۱۴۔۱۵ صحابیوں کے نام شمار کر کے آخر میں لکھا ہے۔ وفیہ عن جماعۃ اخرین یطول عدھم (اور اس بارے میں دوسرے لوگوں سے بھی روایت ہے جن کا شمار کرنا موجب طوالت ہے) انھوں نے یہ بھی لکھا ہے:

وفی ھذا الحدیث علم من اعلام	اور اس حدیث میں دلائل نبوت کی ایک دلیل
النبوۃ و فضیلۃ ظاھرۃ لعلی ولعمار	ہے اور علی و عمار کے لیے کھلی ہوئی فضیلت ہے
ورد علی النواصب الزاعمین ان علیا	اور ان ناصبیوں کا رد ہے جو یہ گمان کرتے ہیں
لم یکن مصیبا فی حروبہ (فتح الباری جلد ۱ ص ۳۶۵)	کہ علیؓ اپنی جنگوں میں راہ صواب پر نہ تھے۔

حضرت عمار کی اس حدیث سے یہ بات ہرگز ثابت نہیں ہوتی کہ حضرت معاویہؓ اور ان کے ساتھی نعوذ باللہ جہنمی تھے اس سے جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ صفین کی لڑائی میں حضرت علی حق پر تھے اور ان سے مقابلہ کرنے والے لوگ باغی تھے لیکن یہ بغاوت چونکہ ایک اجتہادی غلطی کا نتیجہ تھی اس لیے وہ معذور تھے اور کسی ملامت کے بھی مستحق نہیں، دعوت الی الجنۃ اور دعوت الی النار کا مفہوم یہ ہے کہ حضرت عمار لوگوں کو خلافت راشدہ کی اطاعت کی طرف دعوت دے رہے تھے اور مخالفین (اجتہادی غلطی کی وجہ سے) اطاعت کے بجائے بغاوت کی طرف دعوت دے رہے تھے۔ خلیفہ برحق کی اطاعت کی طرف دعوت کو دعوت الی الجنۃ اور بغاوت کی طرف دعوت کو دعوت الی النار قرار دینا محض اس جہت سے ہے کہ ہر خیر حصول جنت اور ہر شر دخول نار کا سبب بن سکتا ہے۔ اطاعت امام بڑی نیکی اور بغاوت بڑی برائی ہے اس لیے پہلی دعوت کو دعوت الی الجنۃ اور دوسری کو دعوت الی النار کہا جا سکتا ہے۔ یہ حدیث واقعہ نفس الامر کے لحاظ سے حضرت علی کے خلیفہ برحق ہونے کا ثبوت ہے لیکن [illegible] دعوت الی النار کے صحیح مصداق اس لیے نہیں بنتے کہ وہ اپنی اجتہادی غلطی کی وجہ سے حضرت علی کی خلافت کو منعقد نہیں سمجھ رہے تھے اس لیے وہ لوگ قصد و ارادہ کے ساتھ امام برحق سے بغاوت کے مجرم نہ تھے ——

اگر کوئی سنی عالم ایسا موجود ہے جو اس حدیث کی بنا پر ایک انتہائی [illegible] عقیدے میں گرفتار ہو گیا ہے تو

ہزار بار استغفار کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ اہل سنت کے مسلک سے بھی ہٹ گیا ہے اور اس حدیث کو بھی غلط طور پر استعمال کر رہا ہے۔

علمائے اہل سنت کی اس توجیہ سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث کسی آیت قرآنی کے خلاف نہیں ہے اور نہ آج تک کسی اہل علم نے اسے قرآن کے خلاف کہا ہے۔ اب مصنف خود غور کریں کہ اس حدیث کو صحیح سمجھنے والوں پر بغض معاویہ کا الزام لگا کر انھوں نے کیا خدمت انجام دی ہے؟ یہی کہ تیرہ سو برس تک تمام اہل سنت جن میں ہزاروں ہزار اساطین علم و تقویٰ داخل ہیں۔ بغض معاویہ سے متاثر رہے اس لیے انھوں نے اس حدیث کو قبول کر لیا۔ کاش مصنف جیسے لوگ یہ محسوس کرتے کہ ان کی یہ تحقیقات، شیعیت کو نقصان پہنچائیں گی یا سنیت کا جنازہ نکالی دیں گی؟ شیعوں کو خوش ہونا چاہیے کہ بغض معاویہ ان کا خاصہ نہیں بلکہ تمام سنی علما و محدثین بھی اس سے متاثر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ شیعیت کے تار و پود بکھیرنے والے امام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیزؒ بھی اس اثر سے الگ نہ ہو سکے کیونکہ ان میں سے بھی کسی نے حدیث عمار کو رد نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ مصنف نے اس صحیح ترین حدیث کو رد کرتے ہوئے ان خرابیوں کا احساس نہیں کیا ورنہ وہ اس کی جرأت نہ کرتے اور مجھے زیادہ حیرت مولانا حبیب اللہ ندوی اور مولانا محمد اسحاق پر ہے کہ اس کتاب پر پیش لفظ اور مقدمہ لکھتے ہوئے ان دونوں حضرات نے اس پر تنبیہ نہیں کی۔ کیا یہ دونوں بھی اس حدیث کو بغض معاویہ ہی کا نتیجہ سمجھتے ہیں؟

حدیث عمار کے سلسلے میں مصنف کا تحقیقی جواب تو اوپر گزرا اس کے بعد انھوں نے الزامی جواب دینے کے لیے دو حدیثیں پیش کی ہیں جن سے ان کے خیال میں حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کی تنقیص لازم آتی ہے، حضرت معاویہؓ کی توقیر بڑھتی ہے اور حضرت علی کے مقابل ان کا ہی حق پر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ پہلی حدیث حضرت ابن حوالہ کی ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ میں پہلے وہ ترجمہ پیش کرتا جو مصنف نے کیا ہے۔ پھر حدیث کے الفاظ نقل کرتا، پھر ان ابواب کی دوسری حدیثیں پیش کرتا جن میں ابن حوالہؓ کی وہ حدیث، محدثین نے روایت کی ہے اور تفصیل سے یہ دکھاتا کہ مصنف نے حضرت علیؓ پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے لیکن افسوس کہ تبصرے میں اس تفصیل کی گنجائش نہیں اس لیے چند باتوں کی طرف اشاروں پر اکتفا کرنا پڑ رہا ہے۔

پہلی بات یہ کہ ان کا ترجمہ "عنقریب دینی امور میں ایسا نظام برپا ہوگا کہ تم لوگ الگ الگ گروہوں میں بٹ جاؤ گے" الفاظ حدیث کا غلط ترجمہ ہے۔ دوسری بات یہ کہ انھوں نے اس حدیث کا ایک ٹکڑا حذف کر دیا ہے۔ اور یہ وہ ٹکڑا ہے جو ان کے سارے استدلال کو ختم کر دیتا۔ حدیث کا وہ ٹکڑا یہ ہے:

وَاَمَّا اِذَا اَبَيْتُمْ فَعَلَيْكُمْ بِيَمَنِكُمْ — اور اگر تم شام کے قیام سے انکار کرو تو اس وقت تمہارے لیے ضروری ہے کہ یمن کے قیام کو لازم پکڑ و۔

تیسری اور سب سے ضروری بات یہ کہ اس حدیث کا حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کی جنگ سے ذرہ برابر کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق شام و یمن کی اس فضیلت سے ہے جس کا ظہور خروج دجال کے قریب ہوگا ابو داؤد نے یہ حدیث اور اس جیسی ایک دوسری حدیث باب سکنی الشام میں، صاحب مشکوٰۃ نے اسی طرح کی حدیثیں باب ذکر الیمن والشام و ذکر اویس القرنی میں اور صاحب جمع الفوائد نے فضائل اماکن متعددہ میں درج کی ہیں —— مصنف نے یہ مقدمہ قائم کیا ہے کہ سبائی گروہ کا لیڈر ابن سبا یمن سے کھڑا ہوا اور کوفی گروہ کا لیڈر مالک اشتر عراق سے اور یہی دونوں حضرت علی کے ساتھ تھے لہذا اس حدیث سے حضرت علی اور ان کے ساتھیوں کی تنقیص لازم آتی ہے —— اسے پڑھ کر مصنف کی فن کاری پر بڑی حیرت ہوئی کوئی شبہہ نہیں کہ اس فن کاری میں شیعے بھی ان سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ یہ تو خیر ابو داؤد کی حدیث ہے اور اس میں بھی یمن کی مدح موجود ہے۔ اس کے علاوہ صحیحین میں اَلْاِيْمَانُ يَمَانٍ وَالْحِكْمَةُ يَمَانِيَةٌ کی حدیث روایت کی گئی ہے۔ اب اگر سبائی گروہ یہ استدلال کرے کہ ابن سبا بقول مصنف یمن سے کھڑا ہوا اس لیے وہ ایمان و حکمت کا پتلا تھا تو مصنف کیا جواب دیں گے؟

الزامی جواب کے لیے انھوں نے دوسری حدیث، حضرت حذیفہؓ کی پیش کی ہے تفصیلی بحث سے یہاں بھی معذوری ہے اس لیے چند باتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ انھوں نے قوسین میں اپنی طرف سے (عثمان) لکھ کر ایک ایسا اضافہ کیا ہے جس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ دوسری بات مصنف کا یہ دعویٰ کہ اس حدیث کو محدثین نے مناقب عثمان میں بیان کیا ہے، غلط ہے اور تیسری بات یہ کہ اس حدیث کا تعلق بھی حضرت علی یا حضرت معاویہ سے بالکل نہیں، ترمذی نے اس کو کتاب الفتن کے باب الامر بالمعروف میں اور ابن ماجہ نے اشراط الساعۃ میں روایت کیا ہے اور ان ابواب میں قطعاً اس کا کوئی اشارہ موجود نہیں کہ اس حدیث کا تعلق خلافت راشدہ یا عہد معاویہؓ سے ہو سکتا ہے، بلکہ اس کے خلاف اشارے موجود ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے جس بحث میں یہ حدیث نقل کی ہے اس کا حضرت علی کی منقصت یا حضرت معاویہ کی منقبت سے کوئی تعلق نہیں، يَرِثُ دُنْيَاكُمْ شِرَارُكُمْ (اس وقت تمہاری دنیا کے وارث، تمہارے بدترین لوگ ہوں گے) کے ٹکڑے کو حضرت علی اور ان کے ساتھیوں پر چسپاں کرنا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَوَاضِعِهٖ کی ایک

قبیح مثال اور ایسی جرأت ہے جو شاید کوئی ناصبی بھی نہ کرتا ـــــ اس بحث کے آخر میں مصنف نے جو اصل بات سمجھائی ہے وہ بھی عجیب و غریب ہے انھوں نے لکھا ہے کہ "فضائل کی حدیثوں کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اپنے لڑکے کا چہرا دیکھ کر کہے کہ میرا بیٹا تو آفتاب کی طرح ہے، ماہتاب کی طرح ہے" اس کو چھوڑیئے کہ یہ بات ان کی سابق بحث سے متضاد ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا واقعی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارتوں اور صحابہ کو عطا کی ہوئی فضیلتوں کی حیثیت یہی ہے؟ انھوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے فائدہ کس کو پہنچے گا، سنیوں کو یا شیعوں کو؟ میں اس اصول کی لغویت مثالوں سے واضح کرنا پسند نہیں کرتا ـــ مصنف نے اس طرح کی اور باتیں بھی لکھی ہیں جو عجیب بھی ہیں اور ان کے سابقہ مباحث سے متصادم بھی مگر تبصرے میں سب پر اظہار خیال نہیں کیا جا سکتا، آخر میں پھر یہی عرض کروں گا کہ مشاجرات صحابہ کے مسئلے میں سلامتی کی راہ وہی ہے جو اہلِ سنت نے اختیار کی ہے ورنہ، یہ وہ دلدل ہے کہ انسان جتنا زور لگائے نیچے ہی دھنستا چلا جائے گا۔

مصنف نے اس کتاب میں ترجمے پیش کیے ہیں، میں سب کو جانچ نہیں سکا ہوں، نہ تو حوالے کی تمام کتابیں موجود تھیں اور نہ اتنا وقت تھا، اس لیے اصل عربی عبارتوں کی طرف مراجعہ ضروری ہے۔ کتاب میں زبان و بیان کی بھی بکثرت خامیاں موجود ہیں، امید ہے کہ مصنف دوسرے اڈیشن میں پوری کتاب پر بالعموم اور اس حصے پر بالخصوص نظر ثانی کریں گے۔　　(ع۔ق)

جہادِ اعظم کی طیاری

از صوفی نذیر احمد کاشمیری۔ صفحات ۹۶ قیمت ایک روپیہ ملنے کا پتہ: اسلامی کتاب گھر۔ اردو بازار۔ دلی ۶

محترم صوفی نذیر احمد حماہ اللہ الاحد محتاجِ تعارف نہیں ہیں، ہندستان کے علماء و مشائخ میں جو لوگ امت مسلمہ کی اصلاح اور تبلیغ دین کی تڑپ رکھتے ہیں ان میں محترم صوفی صاحب کی شخصیت میرے نزدیک ایک بلند مقام رکھتی ہے، ان کی تحریروں میں ان کے دل کا سوز گھلا ملا ہوتا ہے اور اختلاف رائے کے باوجود پڑھنے والا ان کے خلوص کا معترف ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریریں پڑھ کر کم سے کم تبصرہ نگار پر ہمیشہ یہی اثر مترتب ہوا ہے۔ زیر تبصرہ رسالہ بھی اچھے تصورات و افکار، اصلاح کی مفید تجاویز اور قیمتی معلومات پر مشتمل ہے۔ ٹائٹل پیج پر عنوان کتاب کے نیچے صوفی صاحب نے اپنے رسالے کا موضوع خود بتا دیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت حالات دنیا نے نوع انسانی کے لیے دو کھلے امکانات پیدا کر دیے ہیں ایک یہ کہ پوری نوع انسانی اپنی موجودہ حیوانیت پر اصرار کرتی رہے اور اس کے

نتیجے میں تباہ و برباد ہو جائے گا اور دوسرا یہ کہ وہ اپنی موجودہ بے دینیوں سے تائب ہو کر صراط مستقیم پر آجائے۔ اس کے بعد خود صوفی صاحب کے الفاظ یہ ہیں:

"میری کوشش پورے شعور و وقوف اور پورے احساس ذمہ داری سے دوسرے امکان کو عملی حقیقت میں بدلنے کے سلسلے میں یہی ہے اور موجودہ رسالہ بھی اسی کی ایک کڑی ہے۔ امت مسلمہ اس جہاد اعظم کے لیے کیونکر طیار ہو؟ اس رسالہ کا یہی موضوع ہے۔"

اس عبارت سے کئی باتیں واضح ہوتی ہیں۔ صوفی صاحب کے سامنے صرف مسلمان نہیں ہیں بلکہ پوری نوع انسانی ہے وہ کسی ایسے تصوف کے قائل نہیں ہیں جو انسان کو دنیا کے حالات سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔ اُن کے نزدیک امت مسلمہ اس بات کی ذمہ دار ہے کہ نوعِ انسانی کو ہلاکت سے بچائے۔ اس جہاد اعظم کی تیاری کس طرح ہو اس کا جواب رسالے میں ہے۔ یہ باتیں جب سامنے آتی ہیں تو ہر سوچنے والا ذہن اس رسالے کو پڑھنے اور سمجھنے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس رسالے کا بڑا حصہ ایسی زبان اور ایسے معلومات پر مشتمل ہے جس کو تبصرہ نگار کے خیال میں کما حقہ وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کی نظر کتاب و سنت پر بھی ہے اور علم تصوف پر بھی۔ راقم الحروف کو صوفی صاحب کی تمام باتوں سے تو اتفاق نہیں ہے لیکن اس جذبے سے پورا اتفاق ہے جو اس رسالے کی ترتیب کا محرک ہے۔ تیاری کا لفظ شاید جناب صوفی صاحب کے نزدیک "ت" کے بجائے "ط" سے صحیح ہے لیکن اس لفظ کو "ط" سے شاید ہی کوئی لکھتا ہو اس لیے تیاری کو طیاری پڑھتے ہوئے اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے۔ (ع۔ق)

صفحہ ۴۶ کا بقیہ اپنی غذا بناتا ہے تو یہ کوئی غلط کام نہیں۔ سبزی اور ترکاری تو اسی لیے ہے کہ انسان اسے اپنے مصرف میں لائے۔ انسان جس طرح جانوروں سے سواری اور باربرداری کا کام لیتا ہے اسی طرح ان کے گوشت کو بھی بطور غذا استعمال کر سکتا ہے۔ گوشت کھانا کوئی غیر فطری بات نہیں ہے اس کے حق میں کائنات کے اندر بے شمار دلائل بکھرے ہوئے ہیں۔

اسلام کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ اس کی تعلیم فطرت کے عین مطابق ہے۔ اس کا کوئی بھی حکم ایسا نہیں ہے جسے ہم غیر سائنٹفک کہہ سکیں۔ اس کے فلسفہ حیات میں کوئی جھول نہیں۔ اس کے متعین کیے ہوئے حدود فطرت کے خلاف نہیں۔ یہ ہماری اپنی کوتاہ نظری ہے کہ ہم اسلام کی تعلیمات میں غور کرنے کے بجائے اپنی بے علمی اور نادانی کا ثبوت فراہم کرنے لگ جاتے ہیں۔ خدا صحیح راہ کی طرف ہم سب کی رہنمائی فرمائے۔

JAMIA MILLIA ISLAMIA DELHI

ماہ نامہ

زندگی
رامپور

ربیع الثانی ۱۳۸۲ھ
ستمبر ۱۹۶۲ء

جلد - ۲۹
شمارہ - ۳

مدیر :- سید احمد قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ   منیجر "زندگی" رام پور۔ یوپی

● زر سالانہ :- صہ ـ ششماہی :- تین روپیہ ـــ فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے

ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

منیجر ہفت روزہ شہاب ۷/۱۱ شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالک :- جماعت اسلامی ہند۔ ایڈیٹر :- سید احمد عروج قادری ۔ پرنٹر پبلشر :- احمد حسین ۔ مطبع :- ناظم پریس بازار نصراللہ خاں رامپور

مقام اشاعت :- دفتر زندگی دکانتی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(سید احمد قادری)

معاملہ کسی عقیدے کا ہو یا کسی عمل کا، بات کسی شے کے بارے میں رائے قائم کرنے کی ہو یا کسی نزاع میں فیصلہ دینے کی، حقیقت پسندی یہ ہے کہ انسان کسی امر میں بھی حق و حقانیت اور دلیل و برہان کا سر رشتہ اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑے، اس کے قول و فعل کی بنیاد مجرد جذبات، محض خیال آرائی، صرف مفاد پرستی یا حالات کی موافقت و عدم موافقت پر نہ ہو بلکہ ٹھوس دلیل، مضبوط برہان اور خالص حق پرستی پر قائم ہو۔ مثال کے طور پر خدا اور آخرت کے اقرار و انکار کے مسئلے میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ ایک ایسے خدا پر ایمان لایا جائے جو تمام صفات حسنہ سے متصف ہے اور ایک ایسی دنیا پر یقین رکھا جائے جو اس دنیا کے بعد آنے والی ہے اور جس میں موجودہ دنیا کے آخری انجام کا ظہور ہوگا، اس ایمان و یقین پر انسان کی عقل، اس کی فطرت، اس کے جذبات اور وسیع و عریض کائنات کا تمام ذرہ ذرہ گواہ ہے۔ یہ عقل و دانش کا پتلا انسان، یہ نیلگوں آسمان، یہ چمکیلا سورج، یہ دمکتا چاند، یہ خاکستری زمین، سر بفلک پہاڑ، یہ موجزن دریا، یہ لہلہاتی کھیتیاں، یہ ہرے بھرے درخت، یہ چوپایوں کے ریوڑ، یہ پرندوں کے جھنڈ، یہ سب کے سب اس بات کے ٹھوس دلائل ہیں کہ خدا ہے اور وہ وحدہٗ لاشریک لہ ہے۔ یہ سب اس بات کے محکم براہین ہیں کہ دنیا دوامی نہیں ہے بلکہ کسی نہ کسی دن اس ہنگامۂ وجود پر موت کا سناٹا چھا کر رہے گا۔ اگر کوئی شخص یا گروہ خدا اور آخرت کا انکار کرتا ہے تو اس کے اس عقیدہ و خیال کے لیے سرے سے کوئی دلیل و برہان موجود نہیں ہے اور وہ حقیقت پسندی سے کوسوں دور ہے۔ کیونکہ خدا اس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے ——— خدا و آخرت پر ایمان و یقین کے عقیدے کو عملی پہلو سے دیکھیے۔ یہ بات بدیہیات میں شمار کی جاتی ہے کہ ہر عقیدے کے کچھ عملی تقاضے ہوتے ہیں جنھیں پورا کیا جانا چاہیے۔ اس معاملے میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ انسان کا عمل اس کے عقیدے سے ہم آہنگ ہو، ان دونوں میں توافق ہو، تضاد نہ ہو، قول و فعل کی عدم مطابقت اور عقیدہ و عمل کا تضاد، حقیقت پسندی نہیں منافقت ہے۔ ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ کے عملی تقاضے کیا ہیں؟ مختصراً ان کا جامع اور کلی تقاضا یہ ہے کہ زندگی

کی پوری عمارت اسی عقیدے کی اساس پر تعمیر ہو اور اگر تعمیر میں رکاوٹیں اور مزاحمتیں موجود ہوں تو انہیں دور کرنے کی سعی کی جائے۔

یورپ میں جب مذہب کے خلاف طوفان آیا اور اس کے نتیجے میں مادیت کا گھنگھور اندھیرا چھایا تو خود حقیقت کی حقیقت بدل گئی، اب حقیقت صرف انہیں چیزوں کو سمجھا جانے لگا جنہیں انسان اپنے حواس خمسہ سے ادراک کرسکے جنہیں دیکھ سکے، سونگھ سکے، چھو سکے اور چکھ سکے مختصر یہ کہ وہ اپنا ایک مادی وجود رکھتی ہوں۔ ایسی تمام حقیقتیں جو پانچ حواس کی گرفت سے ماوراء ہیں بے حقیقت اور وہم سمجھی جانے لگیں، اس کا لازمی نتیجہ یہی نکلنا چاہیے تھا کہ انسان اپنے تمام اعمال وافعال کو مادیت کے دائرے میں محصور کر لے چنانچہ یہی حقیقت فکر ونظر اور حرکت وعمل کے لیے محور و مرکز قرار پائی، اجتماعی زندگی اور نظم حکومت ومملکت کے لیے سکولرزم کو بنیاد بنا یا گیا اور اس دائرے سے عالم غیب کی وہ تمام حقیقتیں نکال باہر کی گئیں جو زبان رسالت ونبوت سے بیان ہوئی تھیں۔ دنیا کو دین سے بالکل الگ کر لیا گیا ـــــ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ کوئی فرد یا گروہ انفرادی زندگی میں اپنے کسی مذہبی عقیدے پر عمل کرے تو خیر اس کی گنجائش ہے کیونکہ اس کی اس "بے وقوفی" سے اجتماعی زندگی کو نقصان نہیں پہنچتا لیکن اگر کوئی گروہ خدا اور آخرت کے عقیدے کو اجتماعی زندگی میں داخل کرنا چاہتا ہے تو اس سے بڑھ کر غیر حقیقت پسند کوئی نہیں اور اگر کچھ لوگ منظم ہو کر اس کے لیے جد وجہد کرنے لگیں تو بلا شبہ وہ پاگل اور مذہبی دیوانے ہیں۔ اس وقت سب سے بڑی حقیقت پسندی یہ ہے کہ اپنے آپ کو سیکولرزم کے چوکھٹے میں فٹ کر لیا جائے، فٹ ہونے کے لیے اگر عقائد واعمال میں تراش وخراش کی ضرورت پڑے اور یقیناً پڑے گی تو یہ بھی کر لینی چاہیے کیونکہ یہ صرف حقیقت پسندی ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ ترقی پسندی بھی اسی کی متقاضی ہے ـــــ یہ صرف یورپ کے مادہ پرستوں کے خیال کی ترجمانی نہیں ہے بلکہ امت مسلمہ کے سیکڑوں تعلیم یافتہ افراد بھی اب یہی خیال رکھتے ہیں۔

ایک ذرا سا اچنبھا اس پر ہوا کہ حقیقت پسندی، سیکولرزم، ترقی پسندی اور اسلامی نظام حکومت کے سلسلے میں مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدیر برہان کے اداریوں (مئی تا جولائی) میں اسی خیال کی گہری چھاپ نظر آئی جس کا ذکر ابھی اوپر گزرا۔ مولانا نے یہ اداریے اپنے علم وفن کو بالائے طاق رکھ کر لکھے ہیں اور بالکل بھول گئے

ہیں کہ وہ صرف ایم اے ہی نہیں ہیں، سندیافتہ عالم دین بھی ہیں۔ان ادارئیوں سے ان کا نام ہٹا کر مثال کے طور پر اگر جناب علی کریم چھاگلا کا نام لکھ دیا جائے تو کوئی فرق واقع نہ ہوگا اور پڑھنے والا اطمینان کے ساتھ انہیں موصوف کی نگارش لطیف سمجھے گا۔اس میں کہیں کہیں جو چند عربی جملے استعمال ہوئے ہیں ان سے اشتباہ کی کوئی وجہ نہیں، اس لیے کہ اتنی صلاحیت چھاگلا صاحب میں بھی موجود ہوگی۔ مثلاً "وان علی الیہود نفقتہم وعلی المسلمین نفقتہم" کے جملے سے اسلامی اسٹیٹ میں معاشی مساوات ثابت کرنے کے لیے کتنی عربی جاننے کی ضرورت ہے؟

اگر مدیر برہان مولانا مودودی اور پاکستان کے دوسرے علماء کو یا نی پی پکر کوس لیتے تو ہمیں تعرض کی ضرورت نہ تھی لیکن معلوم نہیں کن وجوہ و اسباب سے انھوں نے خود اسلام اور اسلامی حکومت کو قلم کے خراد پر چڑھایا اور چھیل چھال کر اس کا ایک ایسا خلاصہ پیش فرمایا کہ ترکی کے انونو، مصر کے ناصر اور پاکستان کے ایوب سامنے آگئے۔ مدیر برہان نے اسلام اور اسلامی حکومت کی جو تعبیر فرمائی ہے وہ اس تعبیر سے دو ہاتھ آگے ہی ہے جو یہ تمام متجددین ہوقت فرما رہے ہیں۔ اسلام کے ان سب سے بڑے "دوستوں" کی ٹیکنک یہ ہے کہ وہ "رجعت پسند" علماء کی تضحیک و تحقیر کا سامان مہیا کرتے ہیں، حالات حاضرہ سے ان کی جہالت ثابت کرتے ہیں، ان کے آپس کے اختلافات کی بھیانک تصویر کھینچتے ہیں۔ پھر اسلام کی مدح و ثنا کرکے اس سے اپنی محبت کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ان تیاریوں کے ساتھ اپنے ترقی پسندانہ نادر نظریات و خیالات کے بیج بوتے ہیں۔ یہی ٹیکنک مدیر برہان نے اختیار کی ہے۔ اس سلسلے میں جس چیز کا انھوں نے سب سے بڑا سہارا لیا ہے وہ جسٹس منیر کی رسوائے پاکستان رپورٹ ہے۔ وہ رپورٹ جس کی واحد غرض یہ تھی کہ علماء کی تضحیک و تحقیر اور اسلامی حکومت کے مطالبے کو ناکام بنانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ مدیر برہان کے سامنے جو مقصد تھا اس کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی دوسری "سند" مفید مطلب نہیں ہو سکتی تھی وہ اتفاق سے خود بھی سندیافتہ عالم دین ہیں اس لیے انہیں خاص طور پر اپنی ترقی پسندی کا مظاہرہ کرنا پڑا بلکہ عنایت کرکے اسلام کو بھی انھوں نے "ترقی پسندی" کی سند عطا فرمائی ہے۔ ان کے خیال میں اسلامی نظم مملکت یا اسلامی حکومت ایک ایسا عجیب و غریب لباس ہے جو ہر قامت پر راست آجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ٹھگنا اور دبلا ہو تو وہ سمٹ اور سکڑ کر اس کے جسم پر چست ہو جاتا ہے اور اگر کوئی شخص لمبا اور موٹا ہو تو کھنچ کر اور پھیل کر اس کے جسم پر بھی درست ہو جاتا ہے۔ بادشاہت ہو، ڈکٹیٹرشپ ہو یا مغربی جمہوریت، اسلامی حکومت سب پر صادق آسکتی ہے بلکہ انھوں نے اب ایک قدم اور آگے بڑھا کر دعویٰ کیا ہے کہ سیکولر اسٹیٹ پر بھی اسلامی حکومت کا لباس فٹ ہو سکتا ہے۔ یہ ایک کسر رہ گئی تھی جسے پورا کرنا ضروری تھا۔ غرض یہ کہ اسلامی حکومت سب کچھ ہے اور سب کچھ

کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ خود کچھ نہیں ہے۔ شاید وہ اپنے قارئین کو اسی نتیجے تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ اسلامی حکومت کی ایک قسم سکولر بھی ہو سکتی ہے۔ اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے انھوں نے فن کاری کا ثبوت دیا ہے۔ پہلے یہ دعویٰ کیا کہ لادینی حکومت کو مستثنیٰ کر کے حکومت کی جتنی قسمیں ہو سکتی ہیں وہ اسلامی حکومت کی بھی ہو سکتی ہیں۔ (برہان جون ۱۹۶۴ء) یہ عبارت پڑھ کر پڑھنے والے نے اطمینان محسوس کیا کہ چلو ایک قسم تو ایسی نکلی جو اسلامی حکومت سے مستثنیٰ ہے، کم سے کم یہ ایک خصوصیت تو اسے حاصل ہوئی لیکن چند سطور کے بعد اس کا اطمینان یہ پڑھ کر ختم ہو گیا کہ سکولر کی بھی دو قسمیں ہو سکتی ہیں۔ اور اس کی ایک قسم اسلامی بھی ہو سکتی ہے۔ بس اب اسلامی حکومت کا قصہ تمام ہوا، اس کے بعد میں متوقع تھا کہ مدیر برہان صراحۃً یہ بھی فرما دیں گے کہ اس وقت بھارت میں جو سکولر اسٹیٹ قائم ہے وہ اسلامی ہی حکومت کی ایک قسم ہے مگر افسوس کہ یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ استثنیٰ کے بعد پھر سکولرزم کی ایک قسم کے اسلامی ہونے میں جو تضاد نظر آتا ہے اسے یوں دور کیا گیا ہے کہ حرف شرط "اگر" کے ساتھ سکولر کی ایک تعریف کی گئی ہے اور اس کے بعد اس کی ایک قسم کو اسلامی قرار دیا گیا ہے۔ یہ سوال کرنے کو جی چاہتا ہے کہ مدیر برہان یا ان جیسے دوسرے افراد سکولر اسٹیٹ کی جو تعریف بھی کریں یہ بات تو ناقابل انکار ہے کہ سکولر اسٹیٹ ایک خالص دنیوی حکومت کو کہتے ہیں جو دنیا اور دین، مذہب اور سیاست کی تفریق و علیحدگی کے نظریے پر مبنی ہے تو پھر سکولر اسٹیٹ اسلامی حکومت کس طرح بن سکتی ہے کیا اسلامی حکومت کی کوئی قسم خالص دنیوی حکومت بھی ہو سکتی ہے؟ انھوں نے حکومت کی ہر قسم کو دو قسموں میں تقسیم کر کے ایک کو اسلامی ثابت کرنے کے لیے جو طریق استدلال اختیار کیا ہے وہ ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ گدھے کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں ایک وہ جو خالص گدھا ہوتا ہے اور ایک وہ جس میں گھوڑے کی نوعیت و خصوصیت پائی جاتی ہے لہٰذا گدھے کی جس قسم میں گھوڑے کی نوعیت پائی جائے اسے گھوڑا بھی کہہ سکتے ہیں، کیا اس طریق استدلال سے واقعی گدھے کی ایک قسم گھوڑا بھی نکل آئے گی؟ قدیم منطق تو اس کا انکار کرتی ہے شاید جدید لاجک اس کا اقرار کرتی ہو۔

یہ چند سطریں محض ضمنی طور پر قلم سے نکل گئیں ورنہ بقول وحید الدین خاں صاحب ان دعاوی کے جواب میں خاموشی ہی بہتر ہے۔ میں اوپر سے یہ دکھاتا آرہا ہوں کہ مدیر برہان نے جسٹس منیر کی رپورٹ کا سہارا لے کر اسلامی حکومت اور علمائے پاکستان پر جو کرم فرمایا ہے اس میں ان کے ذہن سے یہ بات نکل گئی کہ منیر رپورٹ کی غلط بیانیوں اور مغالطوں کا پردہ چاک ہو چکا ہے اور اسلامی حکومت کے بارے میں علماء کے متفقہ جوابات بھی شائع ہوئے ہیں جو تاریخی دستاویز کی شکل اختیار کر چکے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ برہان کے سیکڑوں قارئین نے انہیں پڑھا بھی ہو۔ جن لوگوں نے سب کچھ پڑھا ہے وہ حضرت مدیر کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے؟　　(باقی آیندہ)

صحابۂ کرام — اقامتِ دین کے سپاہی

(سید احمد قادری)

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ قَالَ مَنْ كَانَ مُسْتَنًّا فَلْيَسْتَنَّ بِمَنْ قَدْ مَاتَ فَإِنَّ الْحَيَّ لَا يُؤْمَنُ عَلَيْهِ الْفِتْنَةُ أُولٰئِكَ أَصْحَابُ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا أَفْضَلَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ أَبَرَّهَا قُلُوْبًا وَأَعْمَقَهَا عِلْمًا وَأَقَلَّهَا تَكَلُّفًا اِخْتَارَهُمُ اللّٰهُ لِصُحْبَةِ نَبِيِّهٖ وَلِإِقَامَةِ دِيْنِهٖ فَاعْرِفُوْا لَهُمْ فَضْلَهُمْ وَاتَّبِعُوْهُمْ عَلٰى أَثَرِهِمْ وَتَمَسَّكُوْا بِمَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ أَخْلَاقِهِمْ وَسِيَرِهِمْ فَإِنَّهُمْ كَانُوْا عَلَى الْهُدَى الْمُسْتَقِيْمِ ۔

(مشکوٰۃ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

(ترجمہ) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص کسی شخص کے طریقے کی پیروی کرنی ہی چاہے تو اسے اس کی پیروی کرنی چاہیے جو وفات پاچکا اس لیے کہ زندہ انسان کے بارے میں یہ اطمینان نہیں ہوسکتا کہ وہ فتنے میں مبتلا نہ ہوگا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ اصحاب (جو وفات پاچکے) اس امت کے سب سے زیادہ فضیلت رکھنے والے لوگوں میں تھے۔ اُن کے دل سب سے زیادہ نیک، اُن کا علم سب سے زیادہ گہرا اور اُن کی زندگیاں تکلف سے خالی تھیں۔ اللہ نے انہیں اپنے نبی کی رفاقت اور اپنے دین کی اقامت کے لیے منتخب فرمایا تو اے لوگو! ان کے فضل و شرف کو پہچانو، ان کے نشانِ قدم کی پیروی کرو اور حسبِ استطاعت ان کے اخلاق اور ان کی سیرتوں کو مضبوطی سے تھامو اس لیے کہ وہ ہدایت کے سیدھے رستے پر تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص اور السابقون الاولون کے ممتاز گروہ میں داخل ہیں۔ مجتہدین صحابہ میں بھی ان کا درجہ بہت بلند ہے۔ انھوں نے حضرت عثمان ذی النورین رضی اللہ عنہ کی خلافت راشدہ کے اخیر دور ۳۲ھ میں وفات پائی۔ یہ وقت وہ تھا کہ اسلامی معاشرے میں فتنوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ ایسے

موقع پر انھوں نے تین اہم باتوں کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے (۱) زندہ انسانوں کی غیر مشروط پیروی خطرے سے خالی نہیں ہے ۔ (۲) شرفِ صحبت سے فیضیاب صحابہ کی فضیلت (۳) فریضۂ اقامت دین کی اہمیت ۔

پہلی بات کی تفصیل یہ ہے :۔ چونکہ انبیاء کرام علیہم السلام کے سوا کوئی زندہ انسان نہ معصوم ہے اور نہ فتنوں سے مامون ، اس لیے ان کے علاوہ کسی زندہ انسان کی غیر مشروط پیروی صحیح نہیں ، چاہے وہ ایمان و تقویٰ کے جس درجے پر بھی فائز نظر آئے ، غیر مشروط پیروی صرف انبیاءؑ کی جائز تھی جن کا سلسلہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو گیا ۔

شیطان اور نفس ہر انسان کے پیچھے لگا ہوا ہے اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ جو شخص آج تقویٰ و طہارت کے اونچے درجے پر فائز نظر آ رہا ہے ، کل اس کا حال کیا ہو گا ؟ اگر کوئی شخص کسی انسان کی آنکھ بند کر کے پیروی شروع کر دے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس نے اپنا انجام اپنے امام و مقتدا کے انجام کے ساتھ وابستہ کر دیا ، خدا نخواستہ وہ اغوائے شیطانی کی وجہ سے گمراہی میں مبتلا ہو کر تباہی کے گڑھے میں جا گرے تو اس کے پیچھے اس کا یہ مقتدی بھی اسی گڑھے میں جا گرے گا ۔ حضرت ابن مسعودؓ کے پہلے جملے کا مفہوم یہ ہے کہ پیروی کے لائق تو خدا کے آخری رسول کی سیرت اور آپ کا اسوہ ہے لیکن اگر کوئی کسی دوسرے کی پیروی کرنی ہی چاہے تو اسے ان لوگوں کی پیروی کرنی چاہیے جو ایمان و تقویٰ ، اتباعِ سنت اور ہدایت و استقامت پر وفات پا چکے ہوں ۔

یہاں یہ شبہہ ہو سکتا ہے کہ جب انھوں نے یہ بات کہی تھی اس وقت کتنے ہی مبشر بالجنۃ اور جلیل القدر صحابہؓ موجود تھے تو پھر انھوں نے وفات پانے والوں کی تخصیص کیوں کی ؟ غور کرنے سے اس کی تین وجہیں سمجھ میں آتی ہیں :۔ جو بات انھوں نے پہلے فقرے میں فرمائی ہے اس کا لازمی تقاضا یہی تھا کہ وہ وفات پائے ہوئے صحابہؓ کو پیش کرتے ورنہ پہلا فقرہ بے معنی ہو جاتا ۔ وفات پائے ہوئے صحابہ میں سیدنا ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما داخل تھے اور ان کی نظر میں اسوۂ رسول کے بعد سب سے زیادہ قابل تقلید اسوہ انہیں دونوں کا تھا ۔ تواضع کا تقاضا بھی یہی تھا ورنہ یہ شبہہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے آپ کو بھی مقتدا کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں ۔۔۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے یہ بات اپنے وقت کے لحاظ سے فرمائی تھی لیکن ہمارے لیے خلفاء اربعہ کے علاوہ تمام جلیل القدر اور شرف صحبت سے فیضیاب صحابہ قابلِ اتباع ہیں جن میں خود حضرت ابن مسعود کو ایک امتیازی مقام حاصل ہے ۔

دوسری بات کی تفصیل یہ ہے :۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت کے لیے انھوں نے جن صفات اور جن دو بنیادی وجوہ کا ذکر کیا ہے وہ بہت ہی قابل غور ہیں ۔

صحابہ کرام اس امت کے افضل ترین لوگ کیوں تھے ؟ اس سوال کے جواب میں ان کی تین صفتوں اور دو

بنیادی وجوہ کا ذکر کیا گیا ہے ان پانچ باتوں کی جامعیت کا حال یہ ہے کہ فضیلت صحابہ کے تمام دفاتر اس میں سمٹ آئے ہیں۔ راقم الحروف ان باتوں پر جس قدر غور کرتا ہے اسی قدر حضرت ابن مسعود کی دور رس نگاہ، ان کے دقیقہ سنج ذہن مجلی و مصفی قلب اور حقیقت آشنا دماغ کا قائل ہوتا جاتا ہے۔ ان پانچ باتوں پر تفصیل کے ساتھ بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے لیکن یہاں اختصار کے ساتھ ان کی وضاحت مقصود ہے۔

پہلی صفت یہ ہے کہ وہ امت محمدیہ میں سب سے زیادہ نیک دل لوگ تھے اس کے لیے انھوں نے "ابرّہا قلوباً" کا جملہ استعمال کیا ہے۔ "بر" کا لفظ قرآن وحدیث کی زبان میں ایک وسیع المعنی لفظ ہے یہ مجرد نیکی کے معنی میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ ایسی نیکی کے لیے استعمال ہوتا ہے جو بہت سی نیکیوں کی جامع اور خیرات و حسنات کا جوہر ہوتی ہے۔ انسان کا قلب جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، اس کے جسم میں ایک ایسا مرکز ہے جس کے صلاح و فساد پر تمام جسم کا صلاح و فساد موقوف ہے۔ نیز یہ بات بھی معلوم ہے کہ انسان کا قلب اس کے تمام عقائد و اعمال کی اصل ہوتا ہے۔ صحابۂ کرام کو "ابرّہا قلوباً" کہنے کے معنی یہ ہوئے کہ وہ عقائد کے لحاظ سے سب سے زیادہ ہدایت یافتہ اور اخلاق و کردار کی جہت سے سب سے زیادہ بلند معیار تھے۔

دوسری صفت یہ ہے کہ ان کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا۔ قیادت و رہنمائی اور انسان کی کلی فضیلت کے حصول میں علم کو جو مقام حاصل ہے وہ کسی اہل علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ انسانوں کی دینی قیادت ہو یا خالص دنیوی قیادت، کامیاب قائد و رہنما وہی لوگ ہوتے ہیں جو دوسروں پر اس علم میں فائق ہوں جس کی انہیں ضرورت ہے اس لیے "اعمقہا علماً" کے معنی یہ ہوئے کہ اسلامی قیادت کے لیے اگر کوئی گروہ نمونہ بن سکتا ہے تو وہ صحابۂ کرام کا گروہ ہے کیونکہ ملت اسلامیہ میں کتاب و سنت کا سب سے زیادہ گہرا علم رکھنے والے لوگ وہی تھے۔

تیسری صفت یہ ہے کہ ان کی زندگیوں میں تکلف نہ تھا۔ جن لوگوں کی زندگیاں پر تکلف اور زخارف دنیا کی طرف مائل ہو جاتی ہیں وہ دینی قیادت کے لائق نہیں رہتے۔ سادہ اور بے تکلف زندگی دینی قیادت کے لیے ضروری ہے۔ خلفائے راشدین اور دیگر اعاظم صحابہ نے جس سادگی اور بے تکلفی سے اپنی زندگیاں بسر کی ہیں وہ تاریخ اسلامی کے بے مثال نمونے ہیں۔ حاصل کلام یہ ہے کہ جن لوگوں کی زندگیاں جس قدر اللہ کے آخری رسول کی پاک زندگی سے مشابہ ہوں گی اسی قدر دینی قیادت کامیاب ہوگی اور یہ مطابقت و مشابہت جتنی کم ہوگی اتنی ہی ان کی قیادت ناکام ہوگی۔ —— اس کے بعد حضرت ابن مسعود کے دو جملوں پر غور کیجیے۔ یہ دونوں جملے نہ صرف فضیلت صحابہ کا جوہر و اساس ہیں بلکہ من جانب اللہ ان کے اختیار و انتخاب کا مقصود بھی ہیں۔

زکوٰۃ کا ایک جزئیہ

(سید احمد قادری)

چند ماہ پہلے مجھ سے جناب ش۔ ن عثمانی نے (جو قارئینِ زندگی کے لیے اجنبی نہیں ہیں) سچے گوٹے لچکے وغیرہ کی زکوٰۃ کا مسئلہ پوچھا تھا، میرے جواب کے بعد انھوں نے مزید تصدیق و تحقیق کے لیے اپنا سوال محترم مدیر ماہنامہ تجلی دیوبند کو بھیجا اور اس میں میرے تخلص عروج (جواب روایتی کمبل کی طرح مجھ سے چمٹا ہوا ہے) کی تصریح کے ساتھ میرے جواب کا حوالہ بھی دیا۔ شاید ان کی اس غلطی ہی کا نتیجہ ہے کہ محترم مدیر "تجلی" نے اپنے مفصل جواب میں مجھے ترغیب دی ہے کہ میں اس مسئلے کو ماہنامہ زندگی میں منقح کردوں، اس کے ساتھ انھوں نے سونا چاندی کی مقدارِ نصاب کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا ہے۔ جن الفاظ میں مجھے ترغیب دی گئی ہے وہ مؤثر ثابت ہوئے اور اپنی علمی بے بضاعتی کے باوجود میں اس مسئلے کی طالب علمانہ تنقیح پر آمادہ ہو گیا۔

جس جزئیے کے بارے میں سوال کیا گیا ہے اس کے جواب میں دو طریقے استعمال کیے جا سکتے ہیں ایک یہ کہ کتاب و سنت اور ائمہ فقہ کے مذاہب و دلائل کو سامنے رکھ کر جو رائے مبنی ہو وہ پیش کی جائے اور دوسرا یہ کہ صرف فقہِ حنفی کو سامنے رکھا جائے۔ میں نے سائل کو زبانی بھی اسی دوسرے طریقے پر جواب دیا تھا اور اب اس تحریر میں بھی میرے سامنے یہی دوسرا طریقہ ہو گا، اس طریقے کو اختیار کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ سائل نے خود فقہ حنفی ہی کے مطابق جواب مانگا ہے۔

میں نے اس تحریر کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں فقہ حنفی کے مسلمات کی روشنی میں سائل کا جواب ہے۔ دوسرے حصے میں مولانا عامر عثمانی مدیر تجلی کی تحقیق پر اظہار خیال ہے اور تیسرے حصے میں ہندوستانی وزن کے مطابق مقدار نصاب کے مسئلے پر مختصر گفتگو ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اس سوال کو یہاں نقل کیا جائے جو تجلی جولائی ۶۲ء میں شائع ہوا ہے۔

سوال

اگر کسی خاتون کے پاس سونے کا زیور بقدر نصاب زکوٰۃ نہیں ہے — چاندی بھی زیور کی شکل میں نہیں ہے لیکن دوپٹوں پر کامدانی کے تار اور ٹھپے گوٹے وغیرہ کی صورت میں اندازاً چند تولہ چاندی موجود ہے تو کیا اس زیور اور کامدانی کے تار وغیرہ کو ملا کر یہ دیکھا جائے گا کہ ان کی قیمت ۵۲ تولہ چاندی یا ۷ ½ تولہ سونے کے برابر ہوتی ہے کہ نہیں؟ ظاہر ہے چند تولہ سونے کی قیمت ہی ۵۲ تولہ چاندی کے برابر ہو جائے گی — تو کیا کامدانی کے تار اور گوٹے وغیرہ کے باعث ایسی خاتون پر فقہ حنفی کی رو سے زکوٰۃ فرض ہو جائے گی؟ یہ ملحوظ رہے کہ الگ الگ نہ سونا بقدر نصاب ہے اور نہ تار اور گوٹے کی چاندی۔ یہاں (رام پور) کچھ لوگوں سے پوچھا تو ان کی رائے یہ ہے کہ زکوٰۃ فرض ہو جائے گی۔ مولانا عروج صاحب بھی یہی فرماتے ہیں۔

جواب

میں نے محترم سائل سے زبانی جو بات کہی تھی وہ یہ تھی کہ سچے گوٹے ٹھپے کی زکوٰۃ کے بارے میں کوئی جزئیہ صراحۃً میری نظر سے نہیں گزرا لیکن زکوٰۃ کے باب میں فقہائے احناف جن اصولوں کی پابندی کرتے ہیں ان کے لحاظ سے خاتون پر زکوٰۃ واجب ہوگی، گوٹے ٹھپے کی چاندی کو سونے میں ضم کیا جائے گا۔ اب اس مسئلے کی تنقیح کے وقت میں نے فقہ حنفی کی مستند کتابوں کا پھر مطالعہ کیا اور بحمداللہ مجھے اپنے جواب میں کسی ترمیم کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ سائل نے جو مسئلہ پوچھا ہے اس میں میرے نزدیک فقہ حنفی کے لحاظ سے کوئی پیچیدگی نہیں ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ چاندی سونے کی زکوٰۃ کے مسئلے میں ائمہ احناف نے جو اصول متعین کیا ہے خود اس سے مسئولہ جزئیہ بڑی آسانی کے ساتھ مستنبط ہوتا ہے۔ نیز سونے اور چاندی کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم کرنے کے مسئلے میں جس اصول کو انھوں نے سامنے رکھا ہے اس سے بھی اس جزئیے کا حکم بآسانی معلوم ہو جاتا ہے، علاوہ ازیں پہلے قاعدے اور دوسرے قاعدے کی جو مثالیں ان کتابوں میں دی گئی ہیں انہوں نے بھی اس مسئلے کو بہت آسان کر دیا ہے۔ اس اجمال کے بعد میں نکات ذیل کی تھوڑی سی تفصیل پیش کرتا ہوں:

(۱) نقدین میں وجوب زکوٰۃ کا اصول۔ (۲) نقدین کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم کرنے کا اصول۔ (۳) ان پر جزئیہ مسئولہ کا انطباق۔

نقدین میں وجوب زکوٰۃ کا اصول

علامہ مسعود کاسانی متوفی ۵۸۷ھ کی بدائع الصنائع میں یہ اصول واضح اور صاف عبارت میں ملتا ہے۔ ہم یہاں وہ عبارت نقل کرتے ہیں:

لا یعتبر فی هذا النصاب صفة زائدة علی کونه فضة فتجب الزکوٰة

چاندی کے نصاب میں چاندی ہونے کے سوا کسی صفت زائدہ کا اعتبار نہیں ہے لہٰذا اس میں زکوٰۃ

فیها سواء کانت دراهم مضروبة او نقرة او تبرا او حلیا مصوغا او حلیة سیف او منطقة او لجام او سرج او الکواکب فی المصاحف والاوانی وغیرها اذا کانت تخلص عند الاذابة اذا بلغت مائتی درهم وسواء کان یمسکها للتجارة او للنفقة او للتجمل او لم ینو شیئا

(ج ۲، ص ۱۶)

واجب ہو جاتی ہے عام ازیں کہ وہ ڈھلے ہوئے دراہم ہوں یا اس کے ڈلے اور ٹکڑے ہوں یا خام شکل میں ہو یا اس کے بنے ہوئے زیور ہوں یا تلوار، کمربند، لگام اور زین میں بطور زینت لگی ہوئی ہو یا قرآن شریف، برتن اور دوسری چیزوں میں اس کے بنے ہوئے تار ہوں جبکہ انہیں پگھلا دینے سے چاندی الگ ہو جاتی ہو اور اس کی مقدار دو سو درہم کے ہم وزن ہو جاتی ہو (چاندی میں زکوٰۃ واجب ہوگی) عام ازیں کہ اسے تجارت کے لیے رکھا گیا ہو یا اخراجات کے لیے یا زینت کے لیے یا اسے روک رکھنے میں کوئی نیت موجود نہ ہو۔

اسی کی ہم معنی عبارتیں فقہ حنفی کی دوسری مستند کتابوں میں بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر تنویر الابصار اور اس کی شرح درمختار میں بدائع کی لمبی عبارت کو چند لفظوں میں یوں سمیٹا گیا ہے:-

(فی مضروب کل) منهما (ومعموله ولو تبرا او حلیا مطلقا) مباح الاستعمال او لا ولو للتجمل والنفقة لانهما خلقا اثمانا فیزکیهما کیف کانا

(درمختار باب زکوٰۃ المال)

چاندی اور سونے کے ڈھلے ہوئے سکوں میں اور ان سے بنی ہوئی چیزوں میں اگرچہ وہ ڈھلے ہوئے ٹکڑے ہوں یا زیور مطلقاً یعنی ان کا استعمال مباح ہو یا نہ ہو اور اگرچہ وہ زینت اور خرچ کے لیے ہوں اس لیے کہ چاندی اور سونا خلقۃً اثمان ہیں لہٰذا ان دونوں کی زکوٰۃ ادا کی جائے گی جس شکل میں بھی ہوں۔

صاحب درمختار کی عبارت نے نقدین میں وجوب زکوٰۃ کے حنفی اصول کو ایسے جامع الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ وہ الفاظ قاعدہ کلیہ بن گئے ہیں "لانهما خلقا اثمانا فیزکیهما کیف کانا" (اس لیے کہ وہ دونوں ثمن بنا کر پیدا کیے گئے ہیں لہٰذا صاحب مال ان دونوں کی زکوٰۃ ادا کرے گا یہ دونوں جس شکل میں موجود ہوں) یہ ہے نقدین میں وجوب زکوٰۃ کا وہ عموم جسے میں حنفی اصول سے تعبیر کرتا ہوں۔ بدائع اور درمختار کی عبارتوں سے جو باتیں معلوم ہوتی ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) چاندی اور سونا جس شکل اور جس حال میں بھی موجود ہوں اگر ان میں سے ہر ایک کا نصاب ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۲) اگر قرآن کے نسخوں میں یا برتنوں میں یا اس طرح کی دوسری چیزوں میں، چاندی سونے کے ستارے پھول اور نقش و نگار بنے ہوئے ہوں اور انہیں پگھلانے سے نقدین الگ ہو سکتے ہوں اور ان کی مقدار نصاب تک پہنچ جائے تو زکوٰۃ واجب ہوگی۔

(۳) (حولانِ حول کے سوا) چاندی اور سونے کی زکوٰۃ میں اس طرح کی قیدیں لگی ہوئی نہیں ہیں جس طرح کی جانوروں یا عروض (چاندی سونے کے علاوہ دوسرے سامان) میں لگی ہوئی ہیں مثال کے طور پر جانوروں کی زکوٰۃ کے لیے سن و سال، اسامت، افزائش نسل اور دودھ حاصل کرنے کے ارادہ کی قیدیں لگی ہوئی ہیں، اگر کسی کے پاس تیس عدد گائے کے بچے (ایک سال سے کم کے) موجود ہوں تو تعداد نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ واجب نہ ہوگی جب تک ان میں کم سے کم ایک بڑا جانور موجود نہ ہو اسی طرح اگر کوئی شخص تیس گائیں پال لے اور ان کا خرچ خود برداشت کرے انہیں سال کے اکثر حصے میں چراگاہ چرنے کے لیے نہ بھیجے تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ ہوگی یا کوئی شخص بکریاں محض گوشت کھانے کے لیے پرورش کرے تو تعداد نصاب ہونے کے باوجود زکوٰۃ واجب نہ ہوگی عروض میں بغیر نیت تجارت زکوٰۃ واجب نہ ہوگی لیکن نقدین میں وجوب زکوٰۃ کے لیے اس طرح کی کوئی قید لگی ہوئی نہیں ہے۔ صاحب بدائع کے قول "چاندی کے نصاب میں چاندی سونے کے سوا کسی صفت زائدہ کا اعتبار نہیں" کا مطلب یہی ہے

(۴) چوتھی اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ نقدین میں وجوب زکوٰۃ کے لیے ان کا مستقل حیثیت رکھنا ضروری نہیں ہے یہ اگر کسی چیز میں بالتبع بھی موجود ہوں تو ان پر زکوٰۃ واجب ہوگی مثلاً کتابوں پر چاندی سونے کے ستاروں یا دوسرے نقش و نگار کی مستقل حیثیت نہیں ہوتی اس کے باوجود ان پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے۔

نقدین کو ایک دوسرے کے ساتھ ضم کرنے کا اصول فقہ حنفی کا یہ بھی ایک مسلمہ مسئلہ ہے کہ سونے کو چاندی کے ساتھ اور چاندی کو سونے کے ساتھ ملا کر کوئی ایک نصاب پورا کر لیا جائے گا اور اس طرح ان میں سے جس کا نصاب مکمل ہو جائے گا اس کی زکوٰۃ دینی ہوگی۔

اگر کسی کے پاس سونے چاندی کے کچھ سکے اور ان کے کچھ ٹکڑے یا برتن یا زیورات یا اس طرح کی دوسری چیزیں موجود ہوں تو ان کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر نصاب پورا کرنے میں کوئی اشتباہ نہیں ہے ہاں اشتباہ اس صورت میں ہو سکتا ہے جہاں چاندی یا سونا مغلوب ہو اور اصلاً وہ شے جس میں یہ دونوں موجود ہیں سونے یا چاندی

کی نہ کی جا سکتی ہو ایسی صورت میں فقہاء ان چیزوں کو عروض میں داخل کرتے ہیں تو اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عروض میں سونا یا چاندی موجود ہو تو اس سونے اور چاندی کو دوسرے سونے اور چاندی میں ضم کریں گے یا نہیں اور اگر کریں گے تو اصول کیا ہوگا؟ میں نے جو عنوان قائم کیا ہے اس سے اسی صورت مسئلہ کو واضح کرنا مقصود ہے۔ فقہ حنفی کی کتابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس صورت میں بھی انہیں ضم کیا جائے گا اور اس کا اصول صرف یہ ہے کہ ان چیزوں سے سونے یا چاندی کو الگ کیا جا سکتا ہو یہاں تک کہ اگر ان چیزوں کو گلا کر بھی انہیں الگ کیا جا سکتا ہو تو انہیں دوسرے سونے چاندی سے ملا کر کوئی نصاب پورا کر لیا جائے گا۔ کتب فقہ میں یہ اصول کھوٹے سکوں کی بحث میں ملتا ہے ——— ایسے سکے جن میں چاندی سونا کم اور کھوٹ زیادہ ہو عروض میں داخل ہیں، ان کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں، اگر وہ بازار میں رائج ہیں یا ان کی تجارت مقصود ہے تو قیمت دیکھی جائے گی اگر ان کی قیمت چاندی کے نصاب تک پہنچ جاتی ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی ورنہ نہیں، اور اگر وہ بازار میں رائج نہیں ہیں اور نہ ان کی تجارت مقصود ہے تو ان میں زکوٰۃ واجب ہونے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ان میں خود اتنی چاندی موجود ہے جو دو سو درہم کے ہم وزن ہے تو زکوٰۃ واجب ہوگی دوسری یہ کہ ان میں نصاب سے کم چاندی ہے لیکن صاحب عروض کے پاس الگ سے کچھ سونا یا سامان تجارت موجود ہے اور اس کی قیمت ملانے سے نصاب پورا ہو جاتا ہے تو اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی۔ ان تمام صورتوں سے متعلق عبارتیں نقل کرنا موجب طوالت ہے۔ میں صرف آخری دو صورتوں سے متعلق صاحب فتح القدیر کی عبارت کا ایک ٹکڑا یہاں نقل کرتا ہوں :-

فان کانت بحیث یتخلص منہا	تو اگر وہ کھوٹے سکے اس طرح ہوں کہ ان سے
فضۃ تبلغ نصابا وحدہا او لا	اتنی چاندی الگ ہو سکتی ہے جو تنہا نصاب تک پہنچ
تبلغ لکن عندہ ما یضم الیہا	جائے یا وہ تنہا تو نصاب تک نہ پہنچے لیکن اس کے
فیبلغ نصابا وجب فیہا	پاس ایسی چیز ہے جس کو ملا دینے سے وہ نصاب تک
(ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۵۲۳)	پہنچ جاتی ہے تو اس میں زکوٰۃ واجب ہوگی۔

انطباق اوپر جن اصولوں اور مثالوں کا ذکر کیا گیا ہے ان پر جزئیہ مسئولہ کو منطبق کرنا کوئی مشکل کام نہیں ہے ان سے غیر مشتبہ طور پر یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ سچے گوٹے لچکے وغیرہ میں بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، اگر گوٹے لچکے میں چاندی یا سونا غالب ہے تب تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لیے کہ اصطلاح فقہاء میں ایسا

گوٹا لچکا چاندی یا سونا ہی کہا جائے گا۔ ان میں زکوٰۃ واجب ہوگی اور بیع و فروخت میں بھی وہی اصول جاری ہوگا جو نقدین کی بیع و فروخت میں جاری ہوتا ہے، فقہ کا مشہور مسئلہ ہے غالب الفضۃ والذھب فضۃ وذھب (جس چیز میں چاندی اور سونا غالب ہو اس کا حکم چاندی اور سونے ہی کا ہے) مثال کے طور پر اگر ایک تولہ گوٹے میں دس ماشے چاندی ہو تو اس ایک تولہ گوٹے کا حکم ایک تولہ چاندی کا ہوگا اور اگر دس ماشے سونا ہو تو ایک تولہ سونے کا ہوگا۔ ہاں اگر گوٹے لچکے میں چاندی اور سونا مغلوب ہو یعنی ان کی مقدار کم ہو اور دوسری چیزوں کی مقدار زیادہ ہو تو ایسے گوٹے لچکے عروض میں داخل سمجھے جائیں گے اور ان میں وہی قانون نافذ ہوگا جو اوپر ایسے غیر رائج سکوں کا بیان کیا گیا ہے جن میں چاندی یا سونے کی مقدار کم اور کھوٹ کی مقدار زیادہ ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کسی کے پاس ایک سو اسی تولے کی مقدار میں گوٹا موجود ہے اور ہر تولے میں چار ماشے چاندی ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ اس کے پاس ساٹھ تولے چاندی موجود ہے اور بلا اشتباہ اس پر زکوٰۃ واجب ہے اب دوسری صورت یہ فرض کیجیے کہ کسی کے پاس ایسا گوٹا ساٹھ تولے کی مقدار میں ہے یعنی بیس تولے چاندی موجود ہے تو اس صورت میں تنہا اس مقدار پر تو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی لیکن اگر اس کے پاس الگ سے بھی اتنی چاندی موجود ہے کہ دونوں کو ملا کر نصاب کی مقدار پوری ہو جاتی ہے یا اتنا سونا یا سامان تجارت موجود ہے جس کی قیمت ملا دینے سے چاندی کا نصاب پورا ہو جاتا ہے تو مذکورہ بالا اصولوں کی روشنی میں بلا اشتباہ اس پر بھی زکوٰۃ واجب ہوگی، فقہ حنفی کی رو سے ایسی صورت میں زکوٰۃ واجب نہ ہونے کی کوئی صورت میری سمجھ میں نہیں آتی۔

ایک قابل غور رائے

زکوٰۃ کے باب میں سونے کو چاندی کے ساتھ اور چاندی کو سونے کے ساتھ ملانے کا مسئلہ فقہائے احناف کا متفقہ مسئلہ ہے لیکن دونوں کو ضم کرنے کی کیفیت اور طریقہ کیا ہو اس میں امام اعظم اور صاحبین کے درمیان اختلاف ہے۔ امام اعظم رحمہ اللہ کی رائے یہ ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ بالقیمۃ ضم کریں گے اور صاحبین کی رائے یہ ہے کہ بالاجزاء ضم کیا جائے گا۔ بالقیمۃ ضم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مقدار اور وزن نہیں دیکھا جائے گا بلکہ قیمت کا لحاظ کیا جائے گا اور بالاجزاء ملانے کا مفہوم یہ ہے کہ قیمت نہیں دیکھی جائے گی بلکہ مقدار اور وزن کا لحاظ کیا جائے گا۔ یہ دونوں اصطلاحیں مثال سے واضح ہوں گی۔ فرض کیجیے کسی کے پاس سو درہم اور پانچ مثقال عمدہ قسم کا سونا یا سونے کا زیور موجود ہے جس کی قیمت سو درہم ہوتی ہے اس صورت میں امام صاحب کے نزدیک زکوٰۃ واجب ہوگی کیونکہ بلحاظ قیمت اس کے پاس دو سو درہم پورے ہو گئے جو چاندی کا مکمل نصاب ہے لیکن صاحبین کے نزدیک زکوٰۃ واجب نہ ہوگی اس لیے کہ وزن کے لحاظ سے نصاب پورا

نہیں ہوتا۔ سو درہم چاندی کے نصاب کا نصف ہے اور پانچ مثقال سونے کے نصاب کا ربع ہے لہٰذا اس کے پاس نصاب کا تین ربع ہے مکمل نصاب نہیں ہے۔ صاحبین کے نزدیک ایسی صورت میں نصاب کی تکمیل کے لیے دس مثقال سونا ہونا ضروری ہے اس طرح نصف نصاب چاندی کا اور نصف نصاب سونے کا مل کر ایک نصاب پورا ہوگا اور اب اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی طوالت سے بچنے کے لیے میں اسی ایک مثال پر اکتفا کر رہا ہوں، کیونکہ ان کے اختلاف کو سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے ـــــ اگرچہ فتویٰ امام صاحب ہی کے قول پر ہے لیکن راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ اب اس زمانے میں صاحبین کے قول کو اختیار کر لینا چاہیے۔ وجہ یہ ہے کہ امام صاحب کے زمانے تک سونے اور چاندی کی قیمتوں کے درمیان وہ عظیم تفاوت نہ تھا جو کہ آج پایا جاتا ہے۔ تفاوت عظیم کا عالم یہ ہے کہ آج اگر کسی کے پاس ایک تولہ سونا اور چند تولے چاندی بھی موجود ہو تو سونے کی قیمت کے لحاظ سے نصاب پورا ہو جاتا ہے اور اس پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے اگر صاحبین کے قول کو اختیار کر لیا جائے تو سہولت بھی پیدا ہو جائے گی اور فقہ حنفی سے باہر نکلنے کی ضرورت بھی پیش نہ آئے گی ۔ جس جزئیے پر گفتگو ہو رہی ہے اس کے لحاظ سے میں یہاں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ فرض کیجیے کسی کے پاس گوٹے لچکے میں اٹھارہ تولے چاندی موجود ہے اور الگ سے کچھ سونا بھی ہے تو امام صاحب کے نزدیک وجوب زکوٰۃ کے لیے شاید نصف تولہ یا اس سے بھی کم سونا کافی ہو جائے گا لیکن صاحبین کے نزدیک جب تک اس کے پاس کم سے کم ڈھائی تولہ سونا موجود نہ ہو زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

دوسرا حصّہ

راقم الحروف، محترم مدیر تجلی مولانا عامر عثمانی کی ذہانت کا قائل ہے، اس مسئلے میں بھی انھوں نے ذہانت صرف کی ہے لیکن میں اس سے متفق نہ ہو سکا ویسے زیر بحث مسئلے میں عملی حیثیت سے ہمارے اور ان کے درمیان کوئی بڑا اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ احتیاطاً زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے اور وہ بعض جلیل القدر فقہائے احناف کے اس قول سے واقف ہوں گے کہ عبادات میں احتیاط واجب ہے۔

اوپر میں نے اس مسئلے پر جو بحث کی ہے اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ معاملہ صرف احتیاط کا نہیں ہے بلکہ قانونی جہت سے بھی صورت مسئولہ میں زکوٰۃ واجب ہوگی انہوں نے جو کچھ اس سلسلے میں لکھا ہے اس پر میں اپنے خیالات محض اشارات کے طور پر لکھتا ہوں کیونکہ ان کے لیے مفصل عبارتوں کی ضرورت نہیں ہے ۔

(۱) گوٹے لچکے کی کسی صورت کی تصریح فقہ حنفی میں میری نظر سے نہیں گزری اس لیے بقدر نصاب چاندی کی موجودگی و عدم موجودگی کے درمیان فقہ حنفی کی تصریح کے لحاظ سے فرق کرنا کس طرح صحیح ہوگا فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں تو اس صورت کی بھی تصریح نہیں ہے جس میں خود مدیر محترم زکوٰۃ واجب مان رہے ہیں۔

(۲) اوپر صراحت گزر چکی کہ فقہ حنفی کے لحاظ سے چاندی سونے میں بہر صورت زکوٰۃ واجب ہوتی ہے چاہے ان کی حیثیت مستقل ہو یا نہ ہو جب کتابوں اور برتنوں پر بنے ہوئے چاندی سونے کے پھولوں اور نقش و نگار پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے تو گوٹے لچکے اور کامدانی کے تاروں پر بدرجہ اولیٰ واجب ہوگی کیونکہ ان پر بنے ہوئے نقش و نگار کی تبعیت تو گوٹے لچکے سے بھی زیادہ واضح اور نمایاں ہے۔ گوٹے لچکے اس لباس سے جس میں وہ ٹانکے جاتے ہیں بہرحال اپنا ایک علیحدہ اور مستقل وجود رکھتے ہیں اور نقش و نگار کا علیحدہ سے کوئی وجود نہیں ہوتا۔ یہ بھی معلوم ہے کہ کتابیں اور برتن کتنے ہی قیمتی ہوں اگر تجارت کے لیے نہیں ہیں تو ان پر زکوٰۃ عائد نہیں ہوتی۔ یہ بھی معلوم ہو چکا کہ عروض میں اگر کچھ سونا چاندی موجود ہو تو اس کو ان سے علیحدہ سونا چاندی میں ضم کرکے زکوٰۃ ادا کی جائے گی۔ تلوار، کمربند اور زین کی زینتوں کی مثال اور کتابوں برتنوں پر نقش و نگار کی مثال نے اس بات میں کوئی شبہہ باقی نہیں چھوڑا ہے کہ گوٹے لچکے اور کامدانی کے تاروں پر زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے —— مدیر محترم نے کئی جگہ شے مستقل و غیر مستقل کی جو بحث کی ہے وہ فقہائے احناف کی تصریحات کے خلاف ہے بلکہ باب زکوٰۃ میں تمام ائمہ کے مسالک کے خلاف ہے، سونا چاندی کی زکوٰۃ میں کسی امام نے بھی مستقل اور غیر مستقل کے درمیان فرق نہیں کیا ہے

(۳) مولانا عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کے مجموعۃ الفتاویٰ سے جو حوالہ دیا گیا ہے وہ بہت مجمل ہے اور اس سے کوئی بات واضح نہیں ہوتی۔ ان عروض میں جن میں سونا یا چاندی کی کوئی ایسی مقدار موجود ہو جسے الگ کیا جا سکتا ہے تو اس کا حکم معلوم ہو چکا۔ ہاں ایسے عروض جن میں نقدین کی کوئی مقدار موجود نہ ہو ان پر نیت تجارت کے بغیر زکوٰۃ عائد نہیں ہوگی۔ فقہاء کی اس تصریح کی موجودگی میں مولانا عبدالحی رحؒ کے جواب کا یہی مطلب لینا مناسب ہوگا کہ وہ ان گوٹوں لچکوں کا حکم بیان کر رہے ہیں جن میں نقدین کی کوئی مقدار موجود نہیں یا اتنی کم ہے کہ اسے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

(۴) فقہ حنفی میں دونوں رایوں کی گنجائش کے لیے کوئی دلیل نہیں دی گئی۔ اگر مولانا عبدالحی رحؒ کے جواب کو دلیل بنایا جا رہا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے اگر ان کے جواب کا مطلب وہ لیا جائے جو مدیر محترم نے لیا ہے تو خود وہ جواب معرض بحث میں آجائے گا کیونکہ اس صورت میں وہ فقہائے احناف کی تصریحات کے خلاف ہوگا، گوٹے لچکے

تو اوپر سے ٹانکے جاتے ہیں اور لباس سے بالکل علیحدہ اور ممتاز ہوتے ہیں۔ فقہائے احناف تو ان چیزوں میں بھی زکوٰۃ کو واجب قرار دیتے ہیں جن میں سونا چاندی حل ہو کر یکجان ہو چکے ہیں اور گلائے پگھلائے بغیر انہیں ان سے الگ نہیں کیا جا سکتا، جن ائمہ نے زیورات میں عدم زکوٰۃ کا قول اختیار ہے ان کا قول دلیل کے لحاظ سے بہت کمزور ہے اس لیے ایک ایسے قول سے مسلک حنفی کے خلاف تائید حاصل کرنا کسی جہت سے مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اگر دوسرے ائمہ کا مسلک قوی ہوتا جب بھی یہ بات درست نہ تھی چہ جائیکہ وہ مسلک ہی ضعیف ہے۔

(۵) مدیر محترم نے مردوں کے لیے گوٹے ٹھپے کے استعمال کے مسئلے سے جو مدد لینی چاہی ہے وہ بھی اسی بات کا نتیجہ ہے کہ وہ وجوب زکوٰۃ و عدم وجوب زکوٰۃ میں شیئے مستقل و غیر مستقل کے فرق کو موثر سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ اس مسئلے میں یہ فرق کسی ایک امام کے نزدیک بھی ذرہ برابر موثر نہیں ہے۔ اگر کسی شے کو استعمال کرنے کے جواز و عدم جواز میں مستقل و غیر مستقل کو موثر مان لیا جائے تو اس سے یہ کیسے لازم آجائے گا کہ وجوب زکوٰۃ و عدم وجوب زکوٰۃ میں بھی اسے موثر مان لیا جائے۔ آخر دونوں میں کون سی علت جامعہ پائی جاتی ہے؟ اگر مردوں کے لیے چار انگل سونے یا چاندی کے تار سے منسوج لباس کا استعمال جائز قرار دیا جائے تو اس سے یہ بات کہاں سے نکل آئے گی کہ اس پر زکوٰۃ بھی واجب نہ ہوگی۔ مدیر محترم کا یہ قیاس دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی حالانکہ اگر کسی مرد کے لباس میں گوٹے لچکے یا تاروں کی چاندی کا وزن نصاب تک پہنچ جاتا ہے تو فقہ حنفی تو الگ رہی تمام ائمہ فقہ کے نزدیک اس پر زکوٰۃ واجب ہوگی، اس لیے کہ وجوب و عدم وجوب زکوٰۃ میں بالاصل اور بالتبع کے فرق کو موثر کسی امام نے بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی امام وقت اس فرق کو موثر مان لیتا تو ہزاروں اور لاکھوں تولے چاندی اور سونے سے زکوٰۃ ساقط ہو جاتی میرا خیال ہے کہ مدیر محترم اس فرق کی خطرناکی پر غور کرتے تو کبھی اسے پیش نہ کرتے۔ بہرحال جہاں تک راقم الحروف کا مطالعہ ہے اس مسئلے میں بالاصل اور بالتبع کے فرق کی کوئی دلیل شریعت میں موجود نہیں ہے۔

مقدارِ نصاب مولانا عامر عثمانی نے ہندستانی وزن کے اعتبار سے چاندی سونے کے مشہور نصاب پر جو گفتگو کی ہے وہ ان کی تحقیقی نگاہ کا ایک ثبوت ہے لیکن راقم الحروف ان کے علم میں یہ بات لانا چاہتا ہے کہ مشہور وزن کے خلاف آج سے بہت پہلے ایک دوسری تحقیق پیش کی جا چکی ہے۔ امارت شرعیہ صوبہ بہار اور اس کے ماننے والے عرصہ دراز سے مشہور قول کے خلاف عمل کر رہے ہیں۔ امارت کا عمل تو پہلے سے جاری تھا لیکن اسے مدلل کرنے کے لیے ۱۳۶۱ھ میں نائب امیر شریعت صوبہ بہار مولانا عبدالصمد رحمانی نے ایک

تحقیقی کتاب "کتاب العشر والزکوٰۃ" کے نام سے شائع کی تھی اس کتاب میں دوسرے اہم مسائل کے علاوہ مقدارِ نصاب پر بھی انھوں نے اپنی تحقیق پیش کی ہے میں یہاں ان کی عبارت نقل کرتا ہوں :۔

سب سے کم مقدار تولہ، ماشہ کے حساب سے دو سو درہم کا وزن ۳۶ تولہ ۵ ماشہ ۴ رتی ہے اور وہ اس حساب سے کہ جو درہم زکوٰۃ وغیرہ میں شرعاً معتبر ہے، وہ درہم ہے کہ جو دس درہم لیکر سات مثقال کے برابر ہوں ۔ تمام کتب فقہ میں اس کی تصریح ہے پس دو سو درہم کے ایک سو چالیس مثقال ہوتے ہیں اور مثقال کا وزن سو جو کے برابر ہے ۔ اس کی بھی فقہاء کرام نے تصریح کر دی ہے اور سو جو کا وزن ہندستانی اوزان کے حساب سے تین ماشہ ایک رتی ہے کیونکہ چار جو کی ایک رتی، لہٰذا سو جو کی ۲۵ رتی اور آٹھ رتی کا ایک ماشہ ہوتا ہے اس لیے ۲۵ رتی کا تین ماشہ ایک رتی ہوا پس اس حساب سے ایک سو چالیس مثقال جو دو سو درہم کا ہم وزن ہے، ہندستان کے شماری وزن کے رو سے ۳۶ تولہ پانچ ماشہ چار رتی ہوا اور یہی چاندی کا نصاب ہوا اور اس کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ یعنی دس ماشے ساڑھے سات رتی ہوئی ۔

سونے کے نصاب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں :

سونے کا نصاب بیس مثقال ہے یعنی ہندستانی وزن سے پانچ تولہ دو ماشہ چار رتی سونا یعنی پانچ تولہ ڈھائی ماشہ اس مقدار سے کم سونے پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے اور پانچ تولہ ڈھائی ماشہ کی زکوٰۃ چالیسواں حصہ یعنی ایک ماشہ ساڑھے چار رتی ہوئی ۔ (کتاب العشر والزکوٰۃ صفحہ ۱۳۶)

راقم الحروف کا ذہن اسی تحقیق پر مطمئن ہے اور پوچھنے والوں کو اسی پر عمل کرنے کا مشورہ بھی دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ مشہور قول بھی بتا دیتا ہے اس لیے کہ ابھی اس تحقیق پر تمام علماء کا اتفاق نہیں ہے ۔[1]

اس ذیل میں اتنا اشارہ ضروری ہے کہ فاضل مدیر نے قیراط والے حساب سے نصاب ۳۶ تولے ساڑھے چار ماشے لکھا ہے حالانکہ ۳۶ تولے پانچ ماشے چار رتی نصاب بنتا ہے ممکن ہے بے خیالی میں ۳۶ تولے ساڑھے پانچ ماشے کے بجائے ساڑھے چار ماشے درج ہو گیا ہو ۔

---

[1] غالباً مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کی تحقیق بھی یہی ہے ۔

اعجاز القرآن

(جناب ابوالبقار ندوی)

ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کلام ربانی ہے، اس کا بیان تمام کا تمام کامل یقین، کیونکہ وہ ایسے قادرِ مطلق کا کلام ہے جو عالم الغیب ہے جس کی معجز بیانی اور دل نشینی کے سامنے تمام دوسرے کلام ہیچ ہیں۔ قرآن وہ صحیفۂ سماوی ہے جس نے ببانگ دُہل یہ اعلان کیا ہے کہ کوئی بھی اس جیسا کلام پیش کرے لیکن آج چودہ سو برس ہونے کو ہیں کیا کسی نے اس تحدی کو قبول کیا؟

اس علم کی ابتدا اور ترقی

دورِ عباسی میں جب علوم ادبیہ اور علوم عقلیہ ترقی کی منزلیں طے کر رہے تھے اسی دور ترقی میں ان علوم میں مذہبی حیثیت کے ساتھ علمی ترقی بھی ہوئی۔ اعجاز القرآن اس دور میں ایک معرکۃ الآرا مسئلہ بن گیا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس دور سے پہلے قرآن مجید کے وجوہ اعجاز پر کسی قسم کی علمی بحث نہیں ہوئی تھی لیکن اس دور میں علماء نے قرآن مجید کے وجہِ اعجاز کے بارے میں مختلف رائیں قائم کیں لیکن اہل ادب اور متکلمین نے قرآن مجید کی وجہِ اعجاز اس کی بلاغت و فصاحت کو قرار دیا۔

اسی دور میں ملاحدہ اور زنادقہ کا جو فرقہ پیدا ہو گیا تھا اور خلفائے عباسیہ کی بے تعصبی نے ان کو اظہارِ خیال کی جو آزادی دے رکھی تھی اس سے انھوں نے غلط فائدہ اٹھایا اور قرآن مجید پر ادبی حیثیت سے بہت سے اعتراضات کیے جو متکلمین کے سامنے پیش ہوتے رہتے اور وہ اس کا زبانی جواب دے دیتے تھے مثلاً ایک شخص نے ابوالہذیل (متوفی ۲۳۵ھ) سے کہا کہ میرے دل میں قرآن مجید کے متعلق بعض شبہات ہیں جو کسی طرح رفع نہیں ہوتے۔ مثلاً قرآن مجید کی متعدد آیتیں ایک دوسرے سے متناقض معلوم ہوتی ہیں اور بعض آیتوں میں نحوی غلطیاں بھی ہیں۔ ابوالہذیل نے کہا کہ ہر آیت کا الگ جواب دیا جائے یا تمام شبہات پر اجمالی جواب دیا جائے۔ معترض نے دوسرے پہلو کو اختیار کیا۔ تو ابوالہذیل نے کہا کہ یہ امر مسلم ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم عرب کے معزز اور شریف خاندان سے تھے یہ بھی مسلم ہے کہ آپ کی فصاحت اور زبان دانی پر کسی کو اعتراض نہ تھا اور اس میں بھی شک نہیں کہ اہل عرب نے آپ کو جھٹلانے اور نکتہ چینی کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی اور آپ پر ہر طرح کے اعتراض کیے لیکن کسی نے نہیں کہا کہ آپ زبان دانی سے نا واقف ہیں، یا آپ کی باتوں میں تناقض پایا جاتا ہے، جب [illegible] نے اعتراض نہیں کیا تو آج کون شخص ہے جو اعتراض کر سکتا ہے۔ اور کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اہل ادب نے ان معترضین کا جواب تحریری شکل میں دیا ہے۔ چنانچہ ملاحدہ نے قطرب سے جو ادیب ہونے کے ساتھ ہی متکلم بھی تھا بہت سے سوالات کیے اس نے جوابات میں ایک پوری کتاب لکھ دی۔ غالباً اسی طرح جاحظ کی بھی ایک کتاب کتاب المسائل فی القرآن کے نام سے ہے۔

لیکن قرآن مجید کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کے ثابت کرنے کے لیے صرف اسی قدر کافی نہ تھا کہ بس ملاحدہ کے اعتراضات رفع ہو جائیں بلکہ اس کی ضرورت تھی کہ قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر ایسی کتابیں لکھی جائیں جو ہر پہلو سے اس پر روشنی ڈالیں، اس لیے اس مسئلہ پر تصنیفات کا ایک مستقل سلسلہ شروع ہو گیا اور غالباً سب سے پہلے جاحظ (المتوفی سنہ ۲۵۵ھ) نے جو اپنے وقت کا ایک مسلم ادیب تھا ایک مستقل کتاب لکھی جس کا ذکر باقلانی نے کسی قدر تنقیص کے ساتھ اعجاز القرآن کے دیباچے میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ اس سے پہلے بعض متکلمین نے جو کچھ لکھا ہے اس نے اس پر کوئی اضافہ نہیں کیا جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جاحظ سے پہلے اس موضوع پر تصنیفات کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا لیکن ہم کو ان تصنیفات کے نام کہیں نہیں ملتے۔ مگر اکثر اہل قلم اس بات کی نشان دہی کرتے ہیں کہ سب سے پہلی تصنیف اس فن پر جاحظ ہی کی ہے[1]، اس کے بعد ابو عبداللہ محمد بن یزید الواسطی المتوفی سنہ ۳۰۶ھ نے اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے اور بعد کو شیخ عبدالقادر جرجانی (المتوفی سنہ ۴۷۱ھ) نے اس کی چھوٹی بڑی دو شرحیں لکھیں جن میں بڑی شرح کا نام معتضد رکھا۔ یہ ضرور ہے کہ واسطی نے کوئی نئی چیز نہیں پیدا کی بلکہ جاحظ کی بنائی ہوئی عمارت کو اور مزین کر دیا جیسا کہ علامہ جرجانی نے (دلائل اعجاز میں) واسطی کے خیالات کو بڑی اچھی طرح

---

[1] اعجاز القرآن لمصطفی صادق الرافعی صفحہ ۱۴۹ اور جاحظ نے خود اپنی کتاب الحیوان میں ذکر کیا ہے کہ اس فن پر میری ایک اور کتاب ہے جس میں میں نے قرآن مجید کی بعض آیتوں کو جمع کیا ہے تاکہ مطالعہ کرنے والا اس سے فائدہ اٹھائے کہ قرآن مجید میں ایجاز اور حذف اور استعارات میں کیا بلاغت ہے۔ لیکن اس کتاب کا ابھی تک کوئی علم نہیں ہے۔

جمع کیا ہے۔ اس کے بعد ابوالحسن علی بن عیسیٰ بن علی الرمانی (المتوفی ۳۸۴ھ) نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام النکت فی اعجاز القرآن ہے غرض چوتھی صدی کے ختم ہونے سے پہلے اس موضوع پر ان تینوں کتابوں کے علاوہ اور بھی چند کتابیں لکھی گئیں جن کا ذکر ابن ندیم نے اپنی فہرست میں (جو کہ ۳۷۷ھ میں مکمل ہو چکی تھی) کیا ہے اس نے جاحظ اور محمد بن یزید الواسطی کا نام تو صاف صاف لکھا ہے لیکن رمانی کا نام نہیں لیا بلکہ اس طرح لکھا ہے "کتاب نظم القرآن لابن الاخشید" مگر چونکہ رمانی اخشیدی کے لقب سے مشہور تھا اس لیے اس سے مقصود رمانی ہی ہے۔ ان تینوں کتابوں کے علاوہ اس نے حسن ابن جعفر الرحلی کی ایک کتاب کا ذکر بھی کیا ہے جس کا نام "کتاب البیان عن بعض الشعر مع فصاحۃ القرآن" ہے۔ ابو علی حسن بن علی بن نصر کی ایک کتاب کا ذکر بھی اس نے کیا ہے جس کا نام نظم القرآن ہے ان لوگوں کے بعد تصنیفات کا ایک مستقل سلسلہ اس موضوع پر قائم ہو گیا اور جن لوگوں نے اس موضوع پر کتابیں لکھیں ان کے نام حسب ذیل ہیں

امام سلیمان احمد بن محمد الخطابی (المتوفی ۳۸۸ھ) قاضی ابوبکر محمد باقلانی (المتوفی ۴۰۳ھ) محمد بن یحییٰ ابن سراقہ (المتوفی ۴۱۰ھ) علی بن الحسین الشریف المرتضیٰ (المتوفی ۴۳۶ھ) عبدالواحد بن اسمٰعیل الرمانی (المتوفی ۵۰۲ھ) ابن بابجوک بقال (المتوفی ۵۶۲ھ) قاسم بن فیرہ الشاطبی (المتوفی ۵۹۰ھ) نصیر بن عبداللہ السید المطرزی (المتوفی ۶۱۰ھ)۔ فخر الدین الرازی (المتوفی ۶۰۶ھ) عبدالواحد الزملکانی (المتوفی ۶۵۱ھ) ابن ابی الاصبع القیروانی (المتوفی ۶۵۴ھ) ابراہیم بن احمد، محسن بن الحسین الخزاعی۔ ابن کمال پاشا (المتوفی)

یہ وہ مصنفین ہیں جنھوں نے اس فن پر مستقل کتابیں لکھی ہیں لیکن ان کتابوں کے علاوہ علم تفسیر میں جہاں جہاں آیات تحدی کی تفسیر کی گئی ہے وہاں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً اس پر بحث کی گئی ہے۔ بالخصوص امام رازی نے تفسیر کبیر میں اس مسئلہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے اور بعض علماء کی یہ رائے ہے کہ امام رازی کی کوئی تصنیف اس موضوع پر مستقل کتاب کی شکل میں نہیں ہے بلکہ آیات تحدی کے ذیل میں انھوں نے جو بحث کی ہے اس کو الگ سے کتابی شکل میں منتقل کر دیا گیا ہے اسی طرح زمخشری نے کشاف میں خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر روشنی ڈالی ہے تفسیروں کے علاوہ علم کلام کی کتابوں میں جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور آپ کے معجزات پر بحث کی گئی ہے خصوصیت کے ساتھ اعجاز قرآنی پر بھی بحث کی گئی ہے اسی طرح سیر کی کتابوں میں بھی اس مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

---

[۱] اعجاز القرآن لمصطفی صادق الرافعی صفحہ ۱۵۰

قرآن کا اعجازی مفہوم

(۱) فلیاتوا بحدیث مثلہ — وہ اس جیسی باتیں لے آئیں۔

(۲) قُلْ فَأْتُوا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهِ مُفْتَرَيَاتٍ — آپ ان سے فرمادیں کہ وہ اس طرح کی دس سورتیں ہی بنا کر پیش کر دیں

(۳) وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِنْ مِثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ — اگر تم اس کے بارے میں جو کہ ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے کوئی شک ہے تو اس طرح کی تم ایک سورت ہی پیش کرو اور اپنے حمایتیوں کو بھی بلاؤ

آج ہم اسو برس پورے ہونے کو ہیں مگر اس تحدی کا کسی نے مقابلہ نہ کیا جب کہ عرب میں نزول وحی کی تیس سالہ مدت میں ایک سے ایک بلیغ خطیب و شاعر موجود تھے آخر قرآن میں وہ کیا قوت ہے؟ جس سے وہ عاجز رہے علامہ جرجانی دلائل الاعجاز میں اس کی تشریح ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:"

قرآن نے عربوں کو یہ دعوت دی کہ وہ اس جیسا کلام پیش کریں لیکن وہ یہ دعوت قبول کرنے سے عاجز رہے اور انھوں نے اس کے بجائے تلوار سے لڑنا پسند کیا۔ اگر وہ قرآن کے مثل لانے پر قادر ہوتے تو وہ لڑائی کے بجائے اس دعوت کو قبول کرتے اور یہ ان کے لیے آسان ہوتا۔ یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر قرآن کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی نظیر لانے سے اہل عرب قاصر رہے کیا وہ قرآن کے بلند مضامین ہیں؟ یا الفاظ کی بندش؟ اگر دوسری توجیہ کو مانا جاتا ہے تو پھر ایک سوال اٹھتا ہے کہ آخر الفاظ کی وہ کون سی بندش اور وہ کون سی خصوصیت تھی جس سے وہ عاجز تھے۔ ان سوالات کے یہ جوابات ہوں گے قرآن کے مخالفین نے اس کے الفاظ کی شیرینی اور ان کی حسن ترتیب اور حسن بیان اور آیات کے غیر معمولی آغاز اور اختتام اور الفاظ کی روانی گزشتہ واقعات کے بیان اور بشارت اور خوف کی یاد دہانیوں پر کافی غور کیا اور اس کی ایک ایک سورۃ اور سورۃ کی ایک ایک آیت کو بغور دیکھا مگر وہ حیران رہ گئے کہ ایک لفظ بھی ایسا نہ تھا جو اپنی جگہ غیر موزوں ہو یا جس پر کوئی اعتراض کیا جا سکے یا اس میں حذف و اضافہ کیا جا سکے۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جن کے مقابلہ کی ان میں جرأت نہ ہوئی۔

علامہ جرجانی نے ان جوابات کے بعد بعض آیتیں مثال کے طور پر پیش کی ہیں۔ مثلاً ایک آیت پیش کرتے ہیں

وَقِيلَ يَا أَرْضُ ابْلَعِي مَاءَكِ وَيَا سَمَاءُ أَقْلِعِي وَغِيضَ الْمَاءُ — اور زمین سے کہا گیا کہ تو اپنا پانی جذب کر لے اور اے آسمان رک جا اور پانی کم ہو گیا

قُضِیَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَی الْجُوْدِیِّ   اور حکم کی تعمیل ہو چکی اور کشتی جودی (پہاڑ) پر

وَقِیْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ   رک گئی اور کہا گیا ظالمین کے لیے ہلاکت ہو۔

ان آیات کا حسن ان کے الفاظ کی روانی جملوں کی مخصوص ادا سے ظاہر ہے، موقع اہم ہے اس لیے زمین کو حرف یا سے پکارا گیا ہے اور یا کے بجائے یا ایتہا نہیں استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد ابلعی کو لیجیے یہاں ماء کی نسبت کاف کی طرف ہے جس سے اشارہ زمین کی طرف ہے۔ یہ طرز ادا کتنا انوکھا اور نرالا ہے اور ابلعی الماء کا بے ربط طریقہ نہیں اختیار کیا گیا۔ زمین کے بعد آسمان کو پکارا اور اسے حکم دیا گیا کہ رک جا، اس نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی ———— جس کی خبر بصیغہ مجہول ظاہر کی گئی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمین کا پانی جذب کرنا اور آسمان کا پانی رک جانا خود نہیں ہوا بلکہ حکم کی تعمیل میں ہوا ہے اور اس کے بعد کشتی کے رکنے کی خبر ہے جس سے اس واقعہ کا فائدہ اور انجام بتایا گیا ہے تاکہ جملہ کے آغاز کے ساتھ مطابقت ہو سکے، یہ طرز بیان خود بخود دماغ پر عظمت طاری کرتا ہے۔

علامہ جرجانی اپنی اسی رائے کو ایک جگہ اور تصریح سے لکھتے ہیں:-

"جب عربوں کو مقابلہ کی آواز دی گئی کہ وہ قرآن پاک کے مثل کچھ بنا لائیں اس وقت ان کو قرآن کریم کی ———— وہ مخصوص خوبیاں جو خود وہ اپنی عبارتوں میں نہیں پیدا کر سکتے تھے ضرور معلوم رہی ہوں گی کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اپنے کسی خاص فعل کے کسی خاص پہلو کی جانب اشارہ کیے بغیر دوسرے آدمی سے یہ کہے کہ تم بھی میری طرح یہ کام کیوں نہیں کرتے۔ قرآن کی خوبی محض اس کے الفاظ یا اعراب یا مسجع عبارتوں ہی میں نہیں ہو سکتی کیونکہ یہ بات عربوں کے نزدیک کوئی مشکل بات نہ تھی اس لیے وہ خوبی صرف حسن ترتیب الفاظ ہی ہو سکتی ہے جو ایسے مضامین کو ادا کرتی ہے جو نزول قرآن سے پہلے معدوم تھے۔"

اس بارے میں تمام امت کا اتفاق ہے کہ قرآن معجزہ ہے البتہ اس بارے میں رائے مختلف ہیں کہ وجہ اعجاز کیا ہے؟ اس بارے میں طرح طرح کی موشگافیاں کی گئی ہیں جن کا دائرہ بہت وسیع ہے یہاں کچھ وجوہ اعجاز کا ذکر کیا جاتا ہے۔

۱۔ بعض معتزلہ کے نزدیک قرآن مجید کا نظم کلام وجہ اعجاز ہے اس لیے کہ اہل عرب کا کلام جس طرز اور اسلوب پر ہوا کرتا تھا، قرآن نے اسے چھوڑ کر ایک بدیع اور انوکھا طرز اسلوب اختیار کیا جو عرب میں موجود نہ تھا۔ عرب کے کلام کا تمام تر لٹو ادا شعار تھے۔ کاہنان عرب کا کلام نثر ہوا کرتا تھا مگر اس میں تکلف اور گاڑھا ددتھا۔ قرآن مجید

نے نظم و نثر کے درمیان ایک انوکھا اسلوب اختیار کیا جو بلغائے عرب کے تخیل سے باہر تھا۔ قرآن کی ابتدا اور اس کا اختتام اور اس کے مقاطع اور فواصل کا بیان اور وہ جس طرح ایک ایک آیت کو توڑتا جاتا ہے اور وہ حد اعجاز میں داخل ہے۔

۲۔ معتزلہ کے گروہ سے جاحظ اور تمام اشاعرہ کے نزدیک قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت وجہ اعجاز ہے

لِسَانُ الَّذِی یُلْحِدُوْنَ اِلَیْہِ	کفار جس کی طرف نسبت کرتے ہیں اس کی زبان
اَعْجَمِیٌّ وَّ ھٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ	تو عجمی ہے اور یہ تو عربی زبان ہے جو اپنے مدعائے
(نحل ۱۴)	قلبی کو بخوبی ظاہر کرتی ہے
بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ	یہ قرآن ایک ایسی زبان ہے جو اپنے مدعائے
(شعراء ۱۱)	دلی کو بڑی خوبی سے ظاہر کرتی ہے۔
قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا غَیْرَ ذِیْ عِوَجٍ	قرآن عربی زبان میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے

۳۔ نظام معتزلی اور ابن حزم ظاہری[1] یہ اعتقاد رکھتے ہیں اور امام رازی[2] بھی اسی کو زیادہ صحیح مانتے ہیں کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام بلغائے عرب و عجم کی زبانیں اس کے مقابلے میں گنگ کر دیں اور اس لیے وہ اس کا کوئی جواب نہ لا سکے۔

لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ (اسراء)	جن و انس اس کا جواب نہیں لا سکتے۔
وَلَنْ تَفْعَلُوْا (بقرہ)	یہ کفار ہرگز اس کا جواب نہیں لا سکتے۔

۴۔ بعض متکلمین کے نزدیک وجہ اعجاز قرآن مجید کا اظہار غیب اور پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہیں۔

سَاُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ	ہم عنقریب کفار کے دلوں میں رعب ڈال
کَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ	دیں گے پس تم گردنوں پر سے مارو اور ان کے
الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْھُمْ کُلَّ بَنَانٍ	پور پور کاٹو۔

(۵) بعض علماء کا خیال ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ لوگوں کے دل کے چھپے ہوئے راز کو فاش

---

[1] الملل والنحل ابن حزم جلد سوم باب اعجاز القرآن۔
[2] تفسیر کبیر جلد اول صفحہ ۳۳۵

کر دیتا ہے جو انسانی دسترس سے باہر ہے۔

اِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا ۔ جب تم سے دو گروہوں نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کرلیا۔

بعض علماء نے وجہ اعجاز یہ بتائی ہے کہ انسانوں کے کلام میں بلند و پست کامل و ناقص صحیح و غلط غرض مختلف مراتب ہوتے ہیں لیکن قرآن مجید شروع سے آخر تک بلندی کے اعلیٰ رتبہ پر گامزن ہے اور صحت کے لحاظ سے ایک ہی نوعیت کا ہے۔

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ ۔ اللہ نے اچھی باتیں اتاریں۔

(۷) بعض علماء کی رائے ہے کہ امی کی زبان سے ایسا کلام بلیغ وجہ اعجاز ہے[۱]۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ٥ (العنکبوت ۵) قرآن سے پہلے تم نے اے پیغمبر نہ تو کچھ پڑھا اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھا تھا اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست شک کرسکتے تھے۔

(۸) قرآن مجید کے اعجاز کی ایک وجہ اس کی خارق عادت تاثیر اور قلوب انسانی کی تسخیر بھی ہے۔

وَلَقَدْ جَاءَهُمْ مِنَ الْاَنْبَاءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ حِكْمَةٌ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ (قمر-۱) ان کو (قرآن کے ذریعے سے) اگلی امتوں کے اتنے حالات سنائے جاچکے ہیں جو ان کی تنبیہ کے لیے کافی تھا۔ یہ قرآن دل تک پہنچ جانے والی دانائی ہے لیکن ان کو ڈرانا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

اور تاثیر کی یہی وجہ تھی کہ کفار قرآن مجید کو سحر کہتے تھے۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (احقاف-۱) جب ان کافروں پر ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ لوگ جو سچائی کے آنے کے بعد اس کا انکار کرتے ہیں کہتے ہیں یہ تو کھلا ہوا جادو ہے

قرآن مجید کے اس معجزانہ اثر کے بہت سے ثبوت کتب حدیث اور کتب تواریخ میں موجود ہیں۔ بہت سے لوگ قرآن مجید کی آیتوں کو سن کر حلقہ بگوش اسلام ہوگئے۔ بخاری باب الہجرۃ میں ہے۔ حضرت ابوبکر جب حبشہ کی طرف ہجرت

---

[۱] متکلمین کے یہ مذاہب شرح مواقف، اعجاز القرآن باقلانی، الاتقان سیوطی، الملل والنحل ابن حزم میں مذکور ہیں۔

کرتے جارہے تھے راستہ میں ابن الدغنہ جو عرب کے ایک بڑے قبیلہ کا سردار تھا آپ کے فضائل گنا کر آپ کو واپس منا لایا اور اپنی ضمانت کا اعلان کیا مگر سرداران قریش نے ایک شرط لگائی کہ اپنے گھر میں رہ کر عبادت کریں کیونکہ اس کا خطرہ ہے کہ ہمارے بچے اور عورتیں قرآن سن کر اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائیں۔ حضرت ابوبکر کچھ دنوں تک اس کی پابندی فرماتے رہے آخر نہ رہا گیا اور باہر نکل کر عبادت شروع کر دی۔ کفار کے بچے اور عورتیں ان پر ٹوٹی پڑتی تھیں یہ منظر دیکھ کر کفار گھبرا گئے۔ حضرت بن مظعون[۱] حضرت جبیر بن مطعم[۲] حضرت طفیل بن عمرو الدوسی[۳] حضرت عمر فاروق[۴] حضرت ابو عبیدہ بن حارث[۵] حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد حضرت ارقم بن ابی الارقم وہ لوگ ہیں جن کے دل ایک بار قرآن کی آیتیں سن کر اس طرح پگھل گئے کہ اسی وقت اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر نے جب سورہ کہیعص کی چند آیتیں پڑھ کر سنائیں تو وہ رو پڑا اور اس کی داڑھی تر ہو گئی۔ پھر کہا خدا کی قسم یہ کلام اور توراۃ ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔

صحابہ پر اس کا جو اثر ہوتا تھا، قرآن خود اپنی زبان سے بیان کرتا ہے:۔

تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ	جو اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے بدن
يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ	اس سے کانپ اٹھتے ہیں پھر ان کے بدن اور دل
وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ	نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں

حضرت عبداللہ بن زبیر نے اپنی دادی سے پوچھا کہ صحابہ کرام جب قرآن پڑھتے تھے تو ان کا کیا حال ہوا کرتا تھا، انھوں نے جواب دیا کہ ان کا حال وہی ہوا کرتا تھا جیسا قرآن خود بیان کرتا ہے یعنی ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں اور ان کے بدن خشیت الٰہی سے کانپ اٹھتے تھے اسی اثر پذیری کا نتیجہ تھا کہ قرآن نے صحابہ کرام کے دلوں میں خوف و خشیت کا ایسا جذبہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ ہر وقت اس سے کانپتے

۱؎ مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۳۱۸
۲؎ صحیح بخاری تفسیر سورۂ طور
۳؎ استیعاب تذکرہ طفیل بن عمر والدوسی
۴؎ مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۱۷
۵؎ ۶؎ ۷؎ اسد الغابہ تذکرہ ابوسلمہ بن عبدالاسد
۸؎ مسند ابن حنبل جلد ا صفحہ ۳، ۲

رہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ ہم لوگ عہد نبوت میں خوف کی وجہ سے عورتوں سے ہنسی خوشی کی باتیں نہیں کرتے تھے کہ کہیں اس بارے میں کوئی آیت نہ نازل ہو جائے۔

علامہ خطابی قرآن کے اثر ہی کو اصل وجہ اعجاز قرار دیتے ہیں اور اپنے اس نکتہ آفرینی پر وہ ناز کرتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ "کہ میں قرآن مجید کے وجہ اعجاز پر ایک بات کہتا ہوں جس کو اور لوگوں نے عموماً نظر انداز کر دیا ہے اور وہ اس کا وہ اثر ہے جو قلب و روح پر پڑتا ہے، کیونکہ قرآن کے علاوہ کوئی کلام خواہ وہ نظم ہو یا نثر ہو با وجود خوف و ہیبت پیدا کرنے کے دل میں لذت و حلاوت کی وہ کیفیت نہیں پیدا کرتا جو قرآن پیدا کرتا ہے اور اس وجہ اعجاز کی طرف خود قرآن اشارہ کرتا ہے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر اتارتے تو تم
جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب جاتا اور
مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ	پھٹ جاتا۔[1]

(۹) طویل مضامین اور طویل خیالات بڑی خوبی کے ساتھ مختصر طریقے سے ادا کیے گئے ہیں۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ	قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے۔

(۱۰) قرآن میں علم و حکمت کے ایسے مضامین ہیں جن سے اہل عرب نابلد تھے۔

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ	یہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت کرتا ہے جو سب سے
هِيَ اَقْوَمُ (اسراء-۱)	زیادہ صحیح اور سیدھی ہے
قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ	تمہارے پاس روشنی اور مدعا کو ظاہر کرنے
وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (مائدہ-۳)	والی کتاب آچکی

(۱۱) قرآن مجید میں اگر کچھ بھی کمی اور زیادتی کی جائے تو وہ بڑی آسانی سے تمیز کی جاسکتی ہے۔

لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ	اس قرآن کے پاس نہ آگے سے اور نہ پیچھے سے
يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (فصلت)	باطل آسکتا ہے
وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (حجر)	اور یقیناً ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں
اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (قیامۃ)	ہم پر اس قرآن کا جمع کرنا ہے۔

---

[1] البیان فی اعجاز القرآن للخطابی، مع ڈاکٹر عبدالعلیم صفحہ ۵

متوکل کے دربار میں ایک یہودی داخل ہوا اور اس نے اس کی مجلس میں کچھ اس طرح باتیں کیں جس سے متوکل اس کے علم و فضل کا قائل ہو گیا۔ متوکل نے اسے اسلام کی دعوت دی اور طرح طرح کے انعامات کا وعدہ کیا لیکن وہ برابر اسلام لانے سے انکار کرتا رہا۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ اس کی مجلس میں آیا مگر اب اسلام لا چکا تھا۔ متوکل نے دریافت کیا کہ تم اسلام کیونکر لے آئے اس نے کہا کہ پہلے میں نے تمام مذہب کو چھوڑ دیا اور ان سے آزادی اختیار کی اور ایک ایک مذہب کے خیالات کا مطالعہ شروع کیا اور حق کی تلاش و جستجو میں لگ گیا سب سے پہلے میں نے توراۃ کا مطالعہ شروع کیا اور اس کو بغور مطالعہ کرنے کے بعد میں نے اسے خود لکھا اور توریت میں کمی بیشی کر کے بازار میں فروخت کر آیا لیکن کسی یہودی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا اس کے بعد میں نے انجیل کا مطالعہ شروع کیا اور اس میں بھی کمی و بیشی کر کے بازار میں فروخت کر آیا لیکن کسی نصرانی نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا اس کے بعد میں نے قرآن کا مطالعہ شروع کیا اور میرے سامنے یہ آیت إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ گذری میں نے قرآن میں بھی کمی و زیادتی کی اور اس کو بازار میں فروخت کرنے لگا مسلمانوں نے اسے پڑھا اور ان جگہوں کی نشان دہی کی جہاں میں نے کمی و زیادتی کی تھی اسی وقت میرے قلب میں یہ بات یقین کے ساتھ اتر گئی کہ اسلام ہی مذہب حق ہے۔ میں اسی وقت اسلام لے آیا۔

لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید[1]

(۱۲) بعض علماء کے نزدیک قرآن مجید کا اصلی اعجاز اس کے احکام تعلیمات اور ارشادات ہیں[2]

إِنَّ هٰذَا الْقُرْآنَ يَهْدِي لِلَّتِي هِيَ أَقْوَمُ (اسراء)	یہ قرآن اس تعلیم کی ہدایت دیتا ہے جو سب سے زیادہ صحیح و درست ہے۔
قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ هُوَ أَهْدَىٰ منهما اتبعه (قصص)	آپ کہہ دیں کہ اس سے بڑھ کر کوئی ہدایت والی کتاب لاؤ تو میں اس کی پیروی کروں۔
قَدْ جَاءَكُمْ مِنَ اللّٰهِ نُورٌ وَكِتَابٌ مُبِينٌ ۝ (مائدہ ۲-۷)	تمہارے پاس روشنی اور مدعا کو ظاہر کرنے والی کتاب آچکی

کیا ہدایت اور حکمت کے لحاظ سے کوئی کتاب قرآن کا جواب ہو سکتی ہے؟ اگر نہیں ہو سکتی (اور یقیناً نہیں ہو سکتی)

---

[1] کتاب الفوائد لابن قیم الجوزی صفحہ ۱۵۲

[2] فوز الکبیر شاہ ولی اللہ صاحب و مولانا شبلی مقالات شبلی صفحہ ۲۶۔ اعجاز القرآن

توکیا یہ اوصاف معجزہ نہیں؟ قرآن مجید کو اگر صرف فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ قرار دیا جائے تو ایسا معجزہ ہوگا جو نبوت کا خاصہ نہیں، کیونکہ انشاء پردازی لازمۂ نبوت نہیں لیکن اگر قرآن مجید کو تزکیۂ نفس اور موعظت و حکمت کے لحاظ سے معجزہ کہا جائے تو یہ معجزہ بھی ہوگا اور خاصہ نبوت بھی۔ علامہ سید سلیمان صاحب ندوی سیرت النبی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"توریت قانون و شریعت ہے لیکن اخلاق و موعظت نہیں۔ انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون و شریعت نہیں، زبور مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح کے صحیفہ میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں، مگر استدلال اور فکر کی دعوت نہیں، صحف بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر حقائق حکمت اور اسرار ایمان و عمل سے خالی ہیں۔ دنیا میں ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی، اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور حقائق حکمت و اسرار ایمان و عمل سے معمور بھی۔ اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف و تغیر اور تراجم و تعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں اس کی بقا اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک لفظ ایک حرف ایک نقطہ میں تغیر و تبدل نے راہ نہیں پائی، وہ اپنی زندگی جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش و حروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانے کے صندوق ہیں اور وہ اسی زبان اور ان ہی الفاظ اور ان ہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے جس میں دست قدرت نے اس کو ڈھالا تھا اور جبرئیل امین نے اس کو اتارا تھا اور محمد عربی نے اس کو امت کے ہاتھوں میں سونپا تھا کیا یہ اعجاز نہیں؟"[1]

قرآن کی فصاحت پر اعتراض اور اس کا جواب

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت پر بعض ناقص العقل لوگوں نے مہمل قسم کے اعتراضات بھی کیے ان کا جواب مفسرین نے نہایت تفصیل سے دیا ہے ان اعتراضات کے بعض حصوں کو ہم یہاں نقل کرتے ہیں:۔

(۱) اکلہ الذئب ان کو بھیڑیے نے کھا لیا

یہاں یہ اعتراض ہے کہ ایسے موقعوں پر درندوں کے حملے کے لیے عربی میں افتراس کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے مثلاً عربی میں کہا جاتا ہے۔ افترسہ السبع اور یہ فصیح ہے۔

---

[1] سیرت النبی جلد سوم صفحہ ۲۵۸

(۲) ذَالِكَ كَيْلٌ يَسِيْرٌ یہ بھرتی آسان ہے۔

کیل کی نسبت یسیر کی طرف صحیح نہیں ہے اور فصحاءِ عرب کے یہاں اس طرح کا کوئی استعمال نہیں ملتا ہاں اگر عدد اور کمیت مراد ہو تو اس طرح کا استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں عدد اور کمیت مراد نہیں۔

(۳) انطلق الملا منهم ان امشوا ان میں کے سردار چلے اور کہا کہ چلو اور جمے رہو

واصبروا علی الهتكم اپنے معبودوں پر۔

یہاں پر "المشی" کا استعمال فصاحت و بلاغت کے خلاف ہے اس کے بجائے اگر "امضوا یا انطلقوا" استعمال کیا جاتا تو یہ زیادہ فصیح و بلیغ ہوتا۔

(۴) هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَه مجھ سے میری حکومت برباد ہوئی۔

عربی میں "هَلَكَ" کا استعمال اشخاص اور جان دار کے لیے ہوتا ہے اور امر اور غیر جاندار کے لیے نہیں ہوتا جیسے عربی میں کہتے ہیں۔ هَلَكَ زَيْدٌ۔ اگر عربی میں کوئی هَلَكَ عَنْ فلان عِلْمُہٗ استعمال کرے تو یہ جملہ غلط کہا جائے گا۔

(۵) إِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ اور آدمی مال کی محبت میں بہت پکا ہے۔

عرب کے فصحا ایسے موقعوں پر "انا لحب زید شدید" نہیں استعمال کرتے بلکہ ایسے موقعوں پر انا شدید الحب لزید استعمال کرتے ہیں

(۶) وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فَاعِلُوْنَ اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں

عرب کی زبان کے اعتبار سے یہ جملہ غلط ہے کیوں کہ عرب کہیں بھی فعل زید الزکاۃ استعمال نہیں کرتے بلکہ اس مفہوم کو ادا کرنے کے لیے "ادی زید زکاۃ ماله" استعمال کرتے ہیں اور یہ فصیح ہے۔

ہم اجمالی طور پر ان کے جوابات یہاں درج کرتے ہیں۔

(۱) قرآن نے "اکل" کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ "افتراس" کے معنی صرف "قتل کر دینا" یا "گردن دبا کر قتل کر دینا" ہے اور یہاں یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہنا یہ چاہتی ہے کہ ان کو مسلّم بھیڑیا کھا گیا اس لیے کہ اگر وہ یہ کہتے کہ ان کو بھیڑیے نے پھاڑ ڈالا ہے تو یعقوب علیہ السلام بقیہ چیزوں کی واپسی کا مطالبہ کرتے تا کہ ان کے بیان کی تصدیق کی جا سکے۔ اس مطالبہ کے خوف سے بچتے ہوئے انھوں نے "اکل" کے لفظ کو استعمال کیا تا کہ والد کو بقیہ چیزوں کے مطالبہ کا موقع ہی نہ دیا جائے اور "افتراس" سے ان کا یہ مطلب پورا نہیں ہوتا۔

اور خود "اکل" عربی میں ایسا لفظ ہے جو اپنی وسعت کے اعتبار سے درندوں اور بقیہ حیوانات کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ابن السکیت نے نقل کیا ہے۔ اکل الذئب الشاۃ فما ترک منھا تامورا" عجیر السلولی کا شعر ہے۔

فتی لیس لابن العم کالذئب ان رای بصاحبہ یوما دما فھو اٰکلہ

اور عباس بن مرداس السلمی کا شعر ہے۔

ابا خراشۃ اما کنت ذا نفر فان قومی لم تاکلھم الضبع

عتبہ بن لہب کے لیے جب حضور اکرم نے بد دعا فرمائی اور آپ نے فرمایا" اللھم سلط علیہ کلبا من کلابک" کچھ دنوں کے بعد وہ شام بغرض تجارت روانہ ہوا۔ ایک جگہ قیام کیا۔ اتفاق سے ایک شیر آکر ادگرد گھومنے لگا اس وقت عتبہ نے کہا۔" اکلنی السبع رات کے کسی حصہ میں شیر آیا اور اس کے سر کو چبا گیا۔ بعض عربی بدوؤں کا مشہور مقولہ ہے۔ اکلونی البراغیث۔ یہاں دیکھیے پسو کے ڈنک کو اکل سے تعبیر کیا ہے

(۲) یہاں "کیل" کا ذکر بعیر کے بعد ہی ہے اور یہاں معنی مراد یہ ہیں کہ اگر ہم اپنے بھائی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے تو ہم ایک اونٹ کے بوجھ کے اضافے کے ساتھ لوٹیں گے اس لیے کہ وہاں ہر نفر کے بدلے میں مقررہ غلہ ملتا ہے اور اگر ہم اپنے ساتھ نہ لے گئے تو موجودہ غلہ ہمارے لیے ناکافی ہوگا۔ عربی میں اسماء کی جگہ مصادر کا استعمال ہوا کرتا ہے۔ مثلاً ھذا درھم ضرب الامیر وھذا ثوب نسج الیمن یہاں "ضرب" مضروب کے معنی میں ہے اور اسی طرح "نسج" "نسیج" کے معنی میں آیا ہے لفظ یسیر استعمال کی وسعت کے لحاظ سے ہر سہل موقع کے لیے استعمال ہوا کرتا ہے، ایک شاعر کہتا ہے۔

یعد الغنی من نفسہ کل لیلۃ اصاب غناھا من صدیق یسیر

ابو اسید الدبیری کا شعر ہے

ھما سیدانا یزعمان وانما یسوداننا ان یسرت غنماھما

مفسرین نے "کیل" کی ایک توجیہ یہ بھی کی ہے کہ "کیل" یہاں دام اور قیمت کے معنی میں آیا ہے

(۳) یہاں پر "امشوا وا صبروا" ہی صحیح ہے کیوں کہ یہاں اس لفظ سے ایک لطیف اشارہ بتانا مقصود ہے کہ کفار اپنی قدیم عادت کے مطابق تمام کاموں سے منقطع ہو کر اپنے معبودوں کا رخ کرتے تھے اور یہ معنی امشوا وا صبروا ہی سے ادا ہو سکتے ہیں کیونکہ ان الفاظ میں ثبات اور صبر اعلیٰ درجے پر پایا جاتا ہے

اور وہ اپنے ہمراہیوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اپنی حالت اور معاملہ کا خیال رکھتے ہوئے چلو۔

(۴) بعض جگہ حقیقت کے استعمال کے بجائے استعارہ کا استعمال زیادہ فصیح و بلیغ ہوتا ہے اور اس طرح کی مثالیں قرآن میں کافی ہیں۔ مثلاً ایک جگہ آتا ہے:-

وَآيَةٌ لَهُمُ اللَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ　　اور ان کے لیے رات میں نشانیاں ہیں جس سے ہم دن نکالتے ہیں۔

یہاں پر جس طرح "سلخ" کا استعمال "اخراج" سے زیادہ بلیغ ہے اسی طرح "هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ" هلك ذهب سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے۔ کیونکہ ذهب میں لوٹنے کی امید باقی رہتی ہے۔ "هَلَكَ" میں تمام امیدوں کا انقطاع ہوجاتا ہے اور "هَلَكَ" کا استعمال اسی وقت ہوا کرتا ہے جب آدمی قطعی طور پر ناامید ہوجاتا ہے۔

(۵) یہاں پر "شدید" کے معنی بخیل کے ہیں جیسے کہا جاتا ہے۔ رَجُلٌ شَدِيدٌ ای بخیل — طرفہ کا شعر ہے۔

اری الموت یعتام النفوس ویصطفی　　عقیلة مال الفاحش المتشدد

(۶) زکوٰۃ کو ادا کرنے کے لیے "اداء" ایتاء اور اعطاء" استعمال کرتے ہیں لیکن یہاں ان الفاظ کے نہ لانے کی ایک وجہ ہے کیونکہ یہ الفاظ صرف کام کے وقوع پر دلالت کرتے ہیں اور اس آیت میں صرف یہی مقصود نہیں بلکہ بیان معنی میں مبالغہ اور زیادتی بتانی مقصود ہے تاکہ مومنین صالحین زکوٰۃ کو اس پابندی سے ادا کرتے ہیں کہ یہ فعل ان کی عادت بن گئی ہے اور یہ معنی بقیہ الفاظ سے نہیں ادا ہوسکتے ایسی حالت میں فاعلون ہی زیادہ فصیح و بلیغ ہے بعض مفسرین نے یہاں زکوٰۃ کے معنی بڑھنے والے عمل صالح کے بھی لیے ہیں اس وقت کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا۔

تکرار قرآن پر اعتراض اور اس کا جواب

مخالفین کا یہ اعتراض ہے کہ قرآن میں ایک ہی قصہ کو کئی مرتبہ بیان کیے گئے ہیں حالانکہ اس تکرار سے کیا حاصل، کیونکہ کلام کا لطف تکرار سے جاتا رہتا ہے اور کلام بے مزہ ہوجاتا ہے۔ خصوصاً بعض انبیاء علیہم السلام کے تذکرے بار بار آئے ہیں۔ حضرت آدم، حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ کے تذکرے اکثر جگہ بیان کیے

لہ مندرجہ بالا اعتراضات اور اس کے جوابات کے لیے دیکھیے البیان فی اعجاز القرآن للخطابی از ڈاکٹر عبدالعلیم

4 SEP 1959

کیے گئے ہیں۔ بعض جگہ ایک آیت کو بار بار ذکر گیا ہے جیسے سورۂ رحمٰن میں فَبِاَیِّ اٰلَاءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ
سورۂ قمر میں لَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ ۝

علماء اسلام نے ان کے جوابات بہت مفصل طریقے پر دیے ہیں۔ علامہ کرمانی المتوفی ۵۰۶ھ نے اس کے جواب میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ غرر دُرر میں شریف مرتضیٰ علی الہدیٰ ۴۳۶ھ نے اور فوز الکبیر میں شاہ ولی صاحب نے بھی اس پر مفصل لکھا ہے۔

ایک بات یہ ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ قرآن میں تکررات کی دو نوعیتیں ہیں لفظی تکرار اور معنوی تکرار
(۱) معنوی تکرار ایک ہی مفہوم اور ایک ہی معنی کو مختلف جگہوں میں مختلف انداز سے بار بار دہرایا ہے مثلاً نماز کی تاکید آخرت کا یقین اور ایمان بالرسل۔ قصص میں حضرت موسیٰؑ کا قصہ لیکن ان مفہوموں اور معانی کی ادائگی میں ایک ہی طرح کی عبارتیں نہیں ہیں بلکہ مختلف جگہوں پر مختلف طرز بیان ہے۔
(۲) لفظی تکرار ایک ہی مفہوم کو کسی خاص عبارت اور الفاظ کے ساتھ بار بار ادا کیا ہے مثلاً سورۂ رحمٰن میں فبای آلاء ربکما تکذبان

(۱) قرآن مجید میں جو قصص ہیں دو طرح کے ہیں بعض قصے قرآن مجید کئی مرتبہ دہراتا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم کا قصہ۔ بعض قصے وہ ہیں جو صرف ایک بار ذکر کیے گئے ہیں جیسے ذوالقرنین، اصحاب کہف حضرت یوسف، حضرت یونس وغیرہ۔

جن انبیاء کے قصے بار بار آتے ہیں وہ صرف چار ہیں۔ حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ ان کے قصے کیوں دہرائے گئے اور ان کے دہرانے کی کیا ضرورت؟

انسان کا طبعی اور فطری رجحان اس طرح کا ہے کہ وہ قصوں اور حکایتوں سے بہت جلد متاثر ہوتا ہے جس طرح آج کسی علم کو ذہن نشین کرنے کے لیے دو طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ نفس مضمون (تھیوری) اور عملی (پریکٹیکل) قرآن نے نفس مضمون کو ذہن نشین کرنے کے لیے قصص سے پریکٹیکل کا کام لیا ہے۔

ایک دوسری بڑی وجہ ان قصوں کی تکرار کی یہ ہے کہ جس طرح ایک دلیل مختلف دعووں پر اثر کرتی ہے ایک قصے سے مختلف نتائج بھی نکالے جا سکتے ہیں اور متعدد مواقع پر اس سے استشہاد پیش کیا جاتا ہے۔ ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر بار بار حضرت آدم حضرت ابراہیم حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کا ذکر کیوں ہوتا؟
ہر ملک کے رہنے والوں کا یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے ملک اور اپنے قائدین کے معلومات سے دلچسپی رکھتے

ہیں اور ان کے حالات سننے کے مشتاق رہتے ہیں اور انہیں کی باتیں ماننے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ قرآن عرب میں اترا تھا اور اس کے مخاطب چار تھے۔ عموماً تمام انسان مشرکین عرب، یہود اور نصاریٰ عام انسانوں کی عبرت اور تاثر اور نصیحت کے لیے حضرت آدم کے قصہ کو بار بار ذکر کیا ہے۔ مشرکین عرب باوجود اپنے شرک کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے گرویدہ تھے اور حضرت ابراہیم کی طرف نسبت کرکے فخر کرتے تھے۔ اس لیے ان کی نصیحت اور تاثر کے لیے حضرت ابراہیم کے قصہ کو قرآن نے کئی بار ذکر کیا ہے اور یہودیوں کے تاثر کے لیے حضرت موسیٰ کے حالات کا بار بار ذکر کیا ہے۔ اور نصاریٰ کو متاثر کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ کا ذکر بار بار کیا ہے۔

۱۔ حضرت ابراہیم کا ذکر قرآن میں چھیاسٹھ مرتبہ آیا ہے۔

۲۔ حضرت موسیٰؑ کا ذکر قرآن میں ایک سو پینتیس مرتبہ آیا ہے۔

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کا ذکر قرآن میں چوبیس مرتبہ آیا ہے۔

بنیادی مضامین جس پر اسلام کی بنیاد ہے بار بار آتے ہیں مثلاً ایمان، نماز، روزہ، زکوٰۃ، توحید، صفات خدا، تاکید ذکر خدا، اظہار قدرت خدا، مذمت شرک، قیامت، حشر، جزا و سزا، ذکر موت، دوزخ، جنت، مذمت دنیا، اخلاق و عمل صالح۔

۱۔ مدح توحید اور مذمت شرک کا ذکر قرآن میں تقریباً تین سو پچاس مرتبہ آیا ہے۔

۲۔ ایمان کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً تین سو مرتبہ آیا ہے۔

۳۔ جنت کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً ایک سو پچانوے مرتبہ آیا ہے

۴۔ دوزخ کا ذکر قرآن مجید میں تقریباً دو سو مرتبہ آیا ہے۔

۵۔ نماز کا ذکر اور اس کا حکم قرآن میں سو مرتبہ آیا ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی الفوز الکبیر میں تحریر فرماتے ہیں کہ قرآن مجید میں عقائد اور فرائض دو طرح کے ہیں

۱۔ وہ امور جو محض قانونی اور تشریعی حکم رکھتے ہیں مثلاً طلاق، نکاح، خلع، ظہار، ایلاء، وراثت، سزائے سرقہ، قصاص، شہادت، سزائے زنا وغیرہ جن سے مقصد صرف یہ ہے کہ مخاطب ان باتوں سے صرف واقف ہو جائے

۲۔ وہ امور جو صرف قانونی اور تشریعی ہی نہیں ہوتے بلکہ خدا چاہتا ہے کہ وہ امور انسان کے قلوب میں جاگزیں ہو جائیں اور جوارح اس کے عادی ہو جائیں، خدا اس کو بار بار ذکر کرتا ہے۔ مثلاً ایمان، نماز، یاد خدا، توحید، حشر وغیرہ۔

مولانا روم اپنی مثنوی میں تکرار کا جواب دیتے ہیں، گو یا استدلال شاعرانہ ہے مگر دل کو لگتا ہوا ہم روزانہ دن رات ایک ہی کھانا کھاتے ہیں اور ایک ہی قسم کا پانی پیتے ہیں لیکن ہم کو کبھی اس کی شکایت نہیں ہوتی کہ بار بار ہم ایک ہی کھانا کیوں کھاتے ہیں اور ایک ہی قسم کا پانی کیوں پیتے ہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب ہم کھانا کھاتے ہیں یا پانی پیتے ہیں، تو ہم کو ایک نئی بھوک اور نئی پیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ہر وقت کے کھانے میں اور ہر وقت کے پانی میں ایک نیا لطف اٹھاتے ہیں اور ہم یہ نہیں کہتے یہ کھانا تو وہی ہے اور یہ پانی تو وہی ہے جو ہم بار بار کھا چکے اور بار بار پی چکے ہیں اب اس میں کیا مزہ رہا۔ اس طرح جو لوگ تشنۂ ایمان ہیں اور جن کو سرچشمۂ ایمان کی تلاش ہے ان کو ہر آیت میں ایک نیا لطف اور ایک نئی لذت محسوس ہوتی ہے اور ان کو یہ تکرار بری نہیں معلوم ہوتی ہے۔

۲۔ قرآن مجید میں بے شک لفظی تکرار بھی کئی جگہ ہے اور یہ کوئی عیب کی بات نہیں ہے، کیوں کہ ہر زبان میں اس قسم کی تکرار پائی جاتی ہے جس کو اصطلاح نحو میں تاکید کہتے ہیں۔ روزمرہ کے جملوں میں ہم خود استعمال کرتے ہیں۔ "نہیں نہیں" "دیکھو دیکھو" ان جملوں میں دوسرا لفظ تاکید کا فائدہ دیتا ہے۔ قرآن میں بھی اس طرح کی تاکید پائی جاتی ہے اور جس سے مقصود صرف تاکید ہے مثلاً:۔

(۱) اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی ثُمَّ اَوْلٰی لَكَ فَاَوْلٰی	تمہارے لیے ہلاکت ہو ہلاکت پھر ہلاکت
(۲) كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ۝	ہرگز نہیں تم عنقریب جان لوگے، پھر ہرگز نہیں تم عنقریب جان لوگے۔

عربی اشعار میں بھی اس طرح کی تکرار پائی جاتی ہے۔ خنسا کا شعر ہے

اردت لنفسی بعض الامور　　فاولی لنفسی اولی لـهـا

غرر دُرر میں شریف مرتضی نے اس قسم کی تاکیدی مثالیں فرا سے نقل کی ہیں مثلاً

کائن وکم عندی لهم من صنیعه　　ایادی بنوها علی واوجبوا

دیکھیے اس مصرع میں الفاظ کی کتنی تکرار ہے۔

کم نعمة کانت لکم کم کم وکم

ایک اور عربی شاعر کا شعر ہے۔

نعق الغراب ببین لبنی غدوة　　کم کم وکم لفراق لبنی تنعق

اس قسم کے تاکیدی الفاظ کی تکرار عربی میں بہت پائی جاتی ہے۔

مولانا آزاد بلگرامی لکھتے ہیں۔ عربی کے قصائد اور غزلوں میں ردیفیں نہیں ہوتیں اور نہ عرب میں دیگر اصناف سخن مخمس وغیرہ مستعمل ہیں۔ قرآن مجید نے عرب کے لٹریچر پر بہت سے اصناف سخن کا اضافہ کیا ہے اس لیے سورۂ رحمٰن میں جو ایک ہی آیت بار بار آتی ہے اس کو گویا غزل مردف سمجھنا چاہیے جس میں ایک ہی لفظ ہر لفظ کے شروع میں آتا ہے۔

شریف مرتضیٰ تکرار آیات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں۔" عرب کے اصناف سخن میں ایک قسم یہ بھی ہے کہ قصیدہ میں ایک ہی مصرع کو بار بار کہتے ہیں۔ قرآن مجید گو نثر ہے لیکن اس میں عرب کے تمام اصناف کلام موجود ہیں اس لیے بعض سورتوں میں صنعت تکرار بھی اختیار کی گئی ہے۔ اس صنف کی مثالیں شعرائے عرب کے کلام میں کافی ملتی ہیں۔ مہلہل بن ربیعا ایک مشہور جاہلی شاعر ہے وہ کلیب کے مرثیہ میں لکھتا ہے۔

الا ان لیس عدل من کلیب — اذا خاف المغار من المغیر۔

الا ان لیس عدل من کلیب — اذ اطرد الیتیم من الجزور

اسی طرح بیس مرتبہ ایک ہی قصیدے میں ایک ہی مصرع کو دہراتا ہے۔

دوسری جگہ مہلہل کہتا ہے:۔

ذھب الصلح او تردوا کلیبا — وتحلوا علی الحکومۃ حلا

ذھب الصلح او تردوا کلیبا — او تذوقوا السیوف وردا ونہلا

اس قصیدہ میں یہی مصرع چھ مرتبہ آیا ہے

حارث بن عبادہ جاہلی اپنے بیٹے کے مرثیہ میں کہتا ہے اور ایک ہی مصرع کو چوالیس بار دہرایا ہے

قربا مربط النعامۃ منی — لقحت حرب وائل عن حیال

قربا مربط النعامۃ منی — لیس دون اللقاء من اعتلال

مہلہل اس مرثیے کے جواب میں کہتا ہے اور ایک ہی مصرع کو چالیس دفعہ دُہرایا ہے

قربا مربط المشہر منی — کل شقر او اشقر ذی بال

قربا مربط المشہر منی — لکلیب استاب منی قذال

لیلی خفیلیہ جو امیر معاویہ کے زمانے کی ایک مشہور شاعرہ عورت ہے توبہ کے مرثیہ میں کہتی ہے۔

لنعم الفتی یا توب کنت اذا التفت صدور العوالی واستشال الاسوافل

ونعم الفتی یا توب کنت ولم تکن لتسبق یوما کنت فیه تجاحل

عمرہ بنت نعمان اپنے شوہر کے مرثیے میں کہتی ہے اور ایک ہی مصرع کو بار بار دہراتی ہے۔

وحدثنی اصحابہ ان مالکا اقام ونادی صحبہ برحیل

وحدثنی اصحابہ ان مالکا ضروب بنصل السیف غیر نکول

قرآن مجید میں جو تکرار ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اور بھی کتب سماویہ میں اس طرح کی تکرار پائی جاتی ہے۔ حضرت موسیٰ کا ذکر تورات میں مختلف طریقے پر آتا ہے اور بیسیوں جگہ آیا ہے اور بعض جگہ لفظی تکرار بھی موجود ہے ایک مقام پر ہے۔

تم میرے سبتوں کی محافظت کرو اور میرے مقدس سے ڈرو میں خداوند ہوں، اور تم بھان متی اور جادوگروں پر التفات نہ کرو اور ان کے طالب نہ ہو کہ ان کے سبب سے ناپاک ہو جاؤ گے۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں تو اس کے لیے جس کا سر سپید ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور بوڑھے مرد کو عزت دے اور اپنے خدا سے ڈر میں خدا ہوں اگر کوئی مسافر تیری زمین پر تیرے ساتھ سکونت کرے تو اس کو مت ستا، بلکہ مسافر کو جو تمہارے ساتھ رہتا ہے ایسا جانو جیسے وہ تم میں پیدا ہوا ہے اور پیار کرو جیسا آپ کو کرتا ہے اس لیے کہ تم مصر کی زمین میں پردیسی تھے۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں، تم انصاف کرنے میں پیمائش کرنے میں تولنے میں ناپنے میں بے انصافی نہ کرو چاہیے کہ تمہاری پوری ترازو، پورے پیمانے پوری دس سیریاں ہوں۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں، جو تم کو زمین مصر سے نکال لایا سو تم میری شریعتوں اور ساری عدالتوں کی حفاظت کرو اور ان پر عمل کرو میں خداوند ہوں

(احبار باب ۱۹)

متذکرہ بالا تشریح کے بعد یہ بات صاف ہو گئی کہ تکرارات قرآن کا اعتراض کوئی وقعت نہیں رکھتا، علوم قرآن دراصل ایک بحر ناپید اکنار ہے اور اس قسم کے نکتے اس بحر کے چند حباب ہیں

سبعۃ احرف کی توجیہ و تشریح

اصحاب رواۃ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

انزل القرآن علی سبعۃ احرف — قرآن کا نزول سات حروف پر ہوا ہے

لکل منھا ظھر وبطن ولکل حرف — ہر حرف کے ظاہری اور باطنی معنیٰ ہیں ہر حرف کی

لهن ولعل حد مطلع   ایک حد ہے اور وہ حد معلوم ہے

دنیا کے ہر ملک میں مختلف زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ ہر زبان کے اصول و قواعد جدا جدا ہوا کرتے ہیں
ایک ہی زبان میں قاعدے اور لہجے کا فرق ہوتا ہے آپ اردو پر غور کریں۔ آپ ایک ہی لفظ کے استعمال میں لکھنؤ
کے اسکول اور دہلی کے اسکول میں فرق پائیں گے۔ قرآن عرب میں نازل ہوا اپنے مخاطب کی زبان کو استعمال کیا
اس میں کوئی شک نہیں کہ قرآن قریش کی لغت میں نازل ہوا لیکن اس کا اطلاق ظاہر مکہ سے قیس تک ہوتا ہے۔

اس حدیث کی تشریح میں علماء کی رائیں مختلف ہیں

(۱) اکثر علماء کا خیال ہے کہ سبعۃ احرف سے مراد قریش کی سات لغتیں ہیں اور ان ساتوں لغتوں کے اعتبار سے قرآن کا نزول ہوا ہے۔

(۲) بعض علماء کی رائے ہے کہ پورے عرب میں غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ لغات عرب کی کل سات قسمیں ہیں اور قرآن کا نزول انہیں ساتوں قسموں پر ہوا ہے۔ سبعۃ احرف کے اختلاف کی نوعیت یہ ہے :۔

(الف) ایک ہم معنی لفظ کو دوسرے لفظ سے بدل دینا جیسے "حوت" اور "سمک" قرآن میں جہاں حوت کا لفظ آیا ہے وہاں سمک بھی استعمال کر سکتے ہیں اور جہاں سمک کا لفظ آیا ہے وہاں حوت کا استعمال بھی جائز ہے

(ب) کسی حرف کو کسی دوسرے حرف سے بدل دیں۔ مثلاً تابوت کے بجائے تابوہ پڑھیں۔

(ج) کلمہ میں تقدیم و تاخیر کر دیں۔ جیسے سُلب زین ثوبُہٗ   سلب ثوب زین بھی پڑھ سکتے ہیں
کبھی یہ تقدیم و تاخیر حرف میں بھی کی جاتی ہے جیسے اَفَلَمۡ یَیۡاَسُ،   اَفَلَمۡ یَاۡیَسُ بھی پڑھ سکتے ہیں۔

(د) کہیں کوئی حرف زیادہ کر دیا جائے اور کہیں کوئی حرف کم کر دیا جائے جیسے مَالِیَہۡ سُلۡطَانِیَہۡ
فلاتك فی مریة

(ذ) حرکات کو بدل دیں جیسے فَلَا تَحۡسَبَنَّ یہاں (سین) کو زبر اور زیر دونوں طرح پڑھ سکتے ہیں

(ر) آخر کا اعراب بدل دیا جائے جیسے ما ھذا بشرا۔ ابن مسعود بشراً کو رفع بشرٌ پڑھتے ہیں

(ز) قرات قرآن میں مختلف لہجے اختیار کرنا جو سات تک محدود ہیں۔ قرآن کی دعوت سہولت و آسانی پیدا کرتی ہے اس لیے اس نے اپنے پڑھنے والوں کے لیے بھی یہ سہولت قائم رکھی کہ اگر کوئی عذر کی وجہ سے
یا کوئی بھول کر لفظ بدل کر پڑھ دے اور معانی میں کوئی فرق نہ آئے تو کوئی حرج نہیں ہے بقیہ تمام
آسمانی کتب اس خاصہ قرآنی سے خالی ہیں کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں

(باقی صفحہ ۴۸ پر ملاحظہ ہو)

برہان کا اداریہ

(جناب وحید الدین خانصاحب)

"برہان کا اداریہ" کے عنوان سے پچھلے مہینے میری ایک تحریر شائع ہو چکی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ یہ سلسلہ ختم ہو گیا مگر اب برہان کا جولائی ۱۹۶۲ء کا شمارہ ملا تو معلوم ہوا کہ اس سلسلے کی سب سے بڑی قسط ابھی باقی تھی۔ یہ ایک ایسا نادر مضمون ہے کہ اس کو جب میں نے ختم کیا تو میری زبان پر یہ فقرہ تھا ——— اپنی عمر میں کسی "علمی اور دینی ماہنامہ" میں اتنا غیر علمی اور اتنا غیر دینی مضمون میں نے شاید ہی کبھی پڑھا ہو!

آدمی جب کسی موضوع پر اظہار خیال کرے تو اس کے اندر کم از کم علمی دیانت داری تو ضرور ہونی چاہیے وہ صحیح حوالے دے، جس کی طرف کوئی قول منسوب کرے وہ واقعی اس کا قول ہو، کسی مسئلے میں رائے قائم کرنے کے لیے جس چیز کو بنیاد بنائے، وہ فی الواقع اس مسئلے میں فیصلہ کن حیثیت رکھتی ہو۔ افسوس کہ یہ مضمون ان تمام چیزوں سے بالکل بے نیاز ہے۔ مضمون کا پہلا ٹکڑا ملاحظہ ہو:-

"اسلامی نظام جامد اور غیر متحرک نہیں ہے بلکہ ترقی پسند ہے۔ اور اس میں اس بات کی پوری صلاحیت ہے کہ ہر زمانہ اور ہر دور کے سیاسی، سماجی، اقتصادی، قومی اور بین الاقوامی مسائل و معاملات کا حل اس طرح کرے کہ سماج کے کسی ایک طبقے کو دوسرے طبقے کے ساتھ، کسی ایک فرد کو دوسرے فرد کے ساتھ جبر و ظلم کا موقع نہ ملے اور ہر طبقہ بلا اختلاف رنگ و نسل و مذہب اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے لیے معاشی اور سماجی فلاح و بہبود کا زیادہ سے زیادہ سر و سامان اور انتظام کر سکے۔ یہ نظام چونکہ ترقی پسند ہے اس لیے وہ حقائق سے کبھی چشم پوشی نہیں کرتا۔ اسی بنا پر ہم نے پہلے کہا ہے کہ اگر حالات کا تقاضا ہو تو وہ سیکولر بھی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔"

برہان (دہلی) جولائی ۱۹۶۲ء صفحہ ۲

اس عبارت میں جو بات کہی گئی ہے اس کی حیثیت کیا ہے ؟

۱۔ کیا یہ مضمون نگار کا اپنا دعویٰ ہے ۔

۲۔ کیا یہ اسلام کا نقطۂ نظر ہے ۔

۳۔ کیا اس کو علمائے امت کی تائید حاصل ہے

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے۔ اگر ایسا ہو تو ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں۔ اگر ایک شخص اپنا ایک ذاتی نظریہ گھڑے اور کہے کہ "سیکولرزم اسلام کی ضد نہیں بلکہ عین اسلام کی تعلیم ہے" (صفحہ ۷) تو موجودہ حالات میں وہ اس کے لیے بالکل آزاد ہے۔ ہم اسے ایسے دعووں سے روک نہیں سکتے ۔

اگر دوسری بات ہو تو اس کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ مگر افسوس کہ موصوف نے کوئی دلیل نہیں دی ۔ اس سلسلے میں ان کے جو دلائل ہیں ان پر ہم پچھلی قسط میں گفتگو کر چکے ہیں وہاں ناظرین دیکھ چکے ہیں کہ یہ کس قدر کمزور اور بے بنیاد ہیں۔ اس تیسری قسط میں بھی اسی قسم کے بعض نام نہاد دلائل کو دہرایا گیا ہے۔ ان دلائل کے بارے میں میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ موصوف یا تو اسلام سے بے خبر ہیں یا جان بوجھ کر جاہل عوام کو دھوکا دینا چاہتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ یا تو انتہا درجہ کی نادانی ہے یا انتہا درجے کا فریب کہ صحیفۂ مدینہ کی دفعہ: علی الیھود نفقتھم وعلی المسلمین نفقتھم[1] کو "معاشی مساوات" کے معنی میں لیا جائے (صفحہ ۳) حالانکہ اصل صحیفہ میں یہ فقرہ جس مفہوم میں استعمال ہوا ہے کہ مدینہ پر حملہ کی صورت میں جب یہود اور مسلمان دونوں مل کر اس کی مدافعت کریں گے اس وقت ہر دو فریق اپنے اپنے جنگی اخراجات کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ اس دفعہ کا اس خود ساختہ نظریے سے کیا تعلق کہ مدینہ کی اسلامی ریاست میں تمام شہریوں کے لیے "معاشی مساوات" کا حق تسلیم کیا گیا تھا[2]

---

[1] یہ اس صحیفہ یا کتاب کی ایک دفعہ ہے جس کو مکمل طور پر ہم اس تبصرے کی پچھلی قسط میں نقل کر چکے ہیں

[2] ڈاکٹر حمید اللہ جو مضمون نگار کے نزدیک "قانون بین الممالک اور اسلامیات دونوں کے نامور اور فاضل محقق" ہیں انھوں نے اس دفعہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے :۔

"کسی جنگ کی صورت میں اگر مسلمان اور یہودی اتحاد عمل کریں تو ہر حلیف اپنے مصارف جنگ خود برداشت کرے گا۔"

اسی طرح یہ کوئی دلیل نہیں ہے کہ اسلام کے احکام موجودہ بین الاقوامی حالات اور بین الاقوامی ضابطۂ اخلاق و انین کے ساتھ ٹکراتے ہیں، اور اس لیے وہ جدید تعلیم یافتہ طبقے کے نزدیک ناقابلِ عمل ہیں۔ (صفحہ ۵) یا یہ کہ ں کے مقامی حالات اس طرز کی باتیں کرنے کے لیے سازگار نہیں ہیں (صفحہ ۷) یا یہ کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ل کا کانٹا نکالنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان اپنی روش کو بدلیں (صفحہ ۸) ——— ظاہر ہے کہ یہ سارے ئل صرف اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام ہماری دنیوی تمناؤں کے لیے رکاوٹ بن رہا ہے۔ اس لیے اب ہم س کو چھوڑنا چاہتے ہیں۔ ان دلائل سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اسلام کی اپنی تعلیم بھی یہی ہے کہ بیسویں صدی میں آ ا کر کے سکولرزم کا کلمہ پڑھ لیا جائے۔

پھر کیا یہ تیسری نوعیت کی چیز ہے۔ بے شک موصوف نے اپنی تائید میں کچھ مسلم شخصیتوں کے حوالے دیے یں۔ مگر یہ شخصیتیں جن کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں مسٹر جناح اور جسٹس منیر جیسے لوگ بھی شامل ہیں جو یقیناً دینی معاملات یں کوئی سند نہیں رکھتے۔ اول الذکر شخصیت کو خود صاحب مضمون نے ان الفاظ میں نااہل قرار دے دیا ہے:

"ظاہر ہے مسٹر جناح مذہب کے عالم نہیں تھے۔ اس بنا پر ان کا کوئی قول یا ارشاد مذہبی حکم یا فتوے کی سند نہیں رکھتا" (صفحہ ۴)

ور جسٹس محمد منیر کی اس لحاظ سے نااہلی ثابت کرنے کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں۔ ان کی ۷۰۳ صفحات کی ود پورٹ خود اس کا تحریری ثبوت ہے جس کی اس مضمون میں خاص طور پر نہایت تعریف کی گئی ہے اور بار بار اس کے والے دیے گئے ہیں۔ اس موقع پر میں اس کا صرف ایک فقرہ نقل کروں گا۔ صفحہ ۲۲۲ پر دورِ جدید سے اسلام کا ٹکراؤ بتاتے ہوئے فرماتے ہیں:-

Nothing but a bold re-orientation of Islam to separate the vital from the lifeless can preserve it as a World Idea and convert the Musalman into a citizen of the present and the future world from the archaic in congruity that he is today.

یعنی اسلام کو اب ایک عالمی نظریے کی حیثیت سے باقی رکھنے کی صورت صرف یہ ہے کہ اس کی ایسی جرأت مندانہ بدیلی کی جائے جس میں اس کے زندہ عناصر کو اس کے بے جان اجزاء سے الگ کر لیا گیا ہو۔ صرف اسی صورت میں سلمان دنیا سے اپنی موجودہ عدم مناسبت کو ختم کر کے حال اور مستقبل کے شہری بن سکتے ہیں ——— دوسرے

لفظوں میں یہ کہ دنیا کے حالات اسلام کے جن اجزا کو باقی رکھنے کی اجازت دیتے ہوں، انھیں باقی رکھا جائے اور باقی اجزا کو بے کار قرار دے کر ہمیشہ کے لیے دفن کر دیا جائے۔

بدقسمتی سے دنیا کے کروروں مسلمان ابھی تک کسی شخص کو یہ حیثیت دینے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ وہ خدا کے دین کی اس طرح "تجدید" کرے کہ اپنے خیال کے مطابق وہ اس کے "زندہ" اجزا کو چھانٹ لے اور بقیہ جزو کو "مردہ" قرار دے کر انھیں الگ کر دے۔ اس لیے کم از کم اس وقت تک اس کا کوئی سوال نہیں ہے کہ ایسے مجددین کو اسلام کی ترجمانی کا حق دیا جائے۔

دیگر افراد جو مضمون نگار کے نزدیک ان کے نقطۂ نظر کے مؤید ہیں، ان میں انھوں نے سب سے پہلے مولانا مودودی کا ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

"مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا اسلامی حکومت کا تصور کس قدر رجعت پسندانہ ہے۔ یہ کوئی پوشیدہ حقیقت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود جب ان کے فکر کا تصادم حقائق سے ہوا تو انھیں بھی پاکستان کی تحقیقاتی کورٹ، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے اس کے سامنے یہ اقرار کرنا پڑا کہ "اگر کبھی اس ملک (پاکستان) میں اسلامی حکومت قائم بھی ہوئی تو اس کی شکل صرف سکولر ہی ہو سکتی ہے" (ملاحظہ فرمائیے رپورٹ ص ۲۰۱)

یہ عجیب و غریب حوالہ پڑھ کر مجھے سخت حیرت ہوئی کیونکہ کوئی بھی شخص جو مولانا مودودی سے واقف ہے اور ان کی تصنیفات کا مطالعہ کیا ہے وہ باور نہیں کر سکتا۔ کہ انھوں نے عدالت کے سامنے سکولرزم کی حمایت کی ہوگی چنانچہ جب میں نے منیر رپورٹ کھول کر اصل مقام کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ برہان (جولائی ۱۹۶۲ء) کے صفحہ ۳۰ پر پاکستان کی تحقیقاتی کورٹ کے سامنے "مولانا مودودی کا جو "اقرار" واوین کے اندر نقل کیا گیا ہے وہ سرے سے بالکل بے بنیاد ہے۔ نہ عدالت نے مولانا مودودی سے اس قسم کا کوئی سوال کیا اور نہ مولانا مودودی نے اس سلسلے میں عدالت کے سامنے کوئی جواب دیا۔ مجھے حیرت ہے کہ مضمون نگار رپورٹ کی اصل عبارت کو سمجھ نہ سکے یا انھوں نے جان بوجھ کر اتنی بڑی غلط بیانی کی ہے۔

رپورٹ کی حد تک اصل بات صرف یہ ہے کہ اس کے مرتبین نے صفحہ ۲۰۱ پر اپنا یہ خیال (نہ کہ تحقیقاتی عدالت کے سامنے کوئی سوال و جواب) پیش کیا ہے کہ جو لوگ آج پاکستان میں اسلامی حکومت کے علمبردار ہیں یہی لوگ تقسیم سے پہلے اس کے برعکس خیالات ظاہر کر رہے تھے۔ متعلقہ ٹکڑے کا پورا ترجمہ یہ ہے:۔

"یہ بات ہمارے سامنے بار بار دہرائی گئی ہے کہ پاکستان کا مطالبہ دراصل ایک اسلامی ریاست

کا مطالبہ تھا۔ کچھ اہم لیڈروں کی تقریریں جو پاکستان کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ بلاشبہ اس مفہوم کی طرف جاتی ہیں .... مگر کوئی بھی شخص جس نے پاکستان میں مذہبی ریاست بنانے کی بات کہی تھی وہ اس سے غافل نہیں تھا کہ اس قسم کی کسی ریاست کو کیسی شدید مشکلات پیش آئیں گی حتیٰ کہ ڈاکٹر محمد اقبال جو کہ پہلے مفکر تھے جنھوں نے پہلی بار شمال مغربی ہندستانی مسلم ریاست بننے کے امکان کو محسوس کیا۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے صدارتی خطبے میں کہا تھا۔ الخ

اس کے آگے ڈاکٹر اقبال کا ایک اقتباس نقل کرنے کے بعد وہ اصل عبارت ہے جس پر ہم اس وقت گفتگو کر رہے ہیں:

وہ اہم ترین جماعتیں جو آج پاکستان میں مذہب کی بنیاد پر اپنے تین مطالبات کو منوانے کے لیے شور و غل کر رہی ہیں (تقسیم سے پہلے) یہ سب کی سب اسلامی ریاست کے تصور کے خلاف تھیں حتیٰ کہ جماعت اسلامی کے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا بھی یہ نظریہ تھا کہ نئی بننے والی مسلم ریاست اگر وہ کبھی وجود میں آئی، تو اس کی حکومت کا ڈھانچہ صرف سکولری ہوگا۔" منیر رپورٹ، صفحہ ۲۰۱

ظاہر ہے کہ رپورٹ کا یہ حصہ مولانا مودودی کے بارے میں عدالت کا اپنا ایک بیان ہے جس کو سعید احمد اکبرآبادی صاحب نے مرتبین رپورٹ سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر "تحقیقاتی کورٹ کے سامنے" خود مولانا مودودی کے اپنے "اقرار" کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے۔

اب عدالتی کمیشن کے اصل بیان پر غور کیجیے۔ اس کا دو مطلب ہو سکتا ہے۔ ایک یہ کہ مولانا مودودی بذات خود کبھی اسلامی حکومت کے قیام کا نقطۂ نظر ہی نہیں رکھتے تھے اور پاکستان بننے کے بعد انھوں نے وہاں اس قسم کے مطالبات شروع کر دیے ہیں۔ اگر کسی کا یہ خیال ہو تو اس کی تردید کے لیے صرف اتنا کافی ہے کہ اس کو مشورہ دیا جائے کہ وہ مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کا فائل حاصل کرے اور ۱۹۳۲ء سے لے کر اب تک اس میں مولانا مودودی کی تحریریں دیکھ ڈالے۔ انشاءاللہ اس کی غلط فہمی نہایت آسانی سے دور ہو جائے گی۔

اس کا دوسرا مطلب یہ ہو سکتا ہے اور یہی زیادہ قرین قیاس ہے کہ تقسیم سے پہلے پاکستان کے بارے میں انھوں نے جو خیالات ظاہر کیے تھے وہ یہ تھا کہ پاکستان اگر بنا تو وہاں اسلامی حکومت قائم نہیں ہوگی۔ بلکہ وہ مسلمانوں کا ایک قومی اسٹیٹ ہوگا جیسا کہ دوسرے مسلم اکثریت کے ملکوں میں ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس دوسری بات میں صداقت کا ایک پہلو ضرور ہے مگر منیر رپورٹ میں اس کا حوالہ کلمۃ حق ارید بھا الباطل کا مصداق ہے۔ درحقیقت کمیشن نے نہایت مغالطہ آمیز طریقے پر مولانا مودودی کے ایک خیال کو قائل کی منشا کے خلاف

استعمال کیا ہے۔

اصل یہ ہے کہ مولانا مودودی کے نقطۂ نظر سے کسی کو اتفاق ہو یا اختلاف، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ پچھلے تیس سال سے وہ مسلسل اسلامی ریاست ہی کے قیام کے داعی رہے ہیں۔ کبھی بھی اس کے سوا کسی اور چیز کی طرف انھوں نے مسلمانوں کو نہیں بلایا نہ اپنی جدوجہد کے لیے اس کے سوا کوئی اور مقصد اپنے سامنے رکھا۔ مگر پاکستان کے نام سے مسلم لیگ جو تحریک چلا رہی تھی، اور جس کے متعلق اس کا دعویٰ تھا کہ یہ اسلامی حکومت بنانے کی تحریک ہے، پاکستان حاصل ہوتے ہی وہاں قرآن و سنت کی بنیاد پر ایک اسلامی نظام قائم کیا جائے گا۔ اس سے وہ متفق نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ اسلامی حکومت بنانے کا کوئی صحیح طریقہ نہیں ہے۔ جس طرز پر اور جیسے لوگوں کے ہاتھوں پاکستان کی تحریک چل رہی ہے اس کا نتیجہ تو یہی ہو سکتا ہے کہ پاکستان بننے کے بعد وہاں عام دنیوی طرز کا قومی اسٹیٹ وجود میں آئے۔ دوسرے لفظوں میں ان کی یہ بات مسلم لیگ کے طریق کار پر تنقید تھی نہ کہ کسی مسلم علاقے کے بارے میں اپنی یہ ذاتی رائے کہ وہاں کس قسم کا نظام چلایا جائے۔ وہ خود تو اسلامی حکومت ہی قائم کرنے کے علمبردار تھے۔ مگر مسلم لیگ کے دعووں کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ اس طرح اسلامی حکومت نہیں بنا کرتی۔ رکیشن کی غلطی یہ ہے کہ جو چیز دوسرے پر تنقید کے ضمن میں کہی گئی تھی اس کو اس نے مولانا مودودی کے ذاتی مطلوب کی حیثیت سے پیش کر دیا ہے[1]

اس سلسلے میں جو لوگ غلط فہمی میں ہوں ان کو میں مشورہ دوں گا کہ وہ مولانا مودودی کا رسالہ "اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے" پڑھ لیں۔ یہ ۱۹۴۱ء میں تحریک پاکستان کے پس منظر میں لکھا گیا تھا اور اس نوعیت کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے بالکل کافی ہے۔ مزید تفصیلی واقفیت کے لیے مولانا کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم" کے مطالعہ کا مشورہ دیا جا سکتا ہے۔ ان کتابوں کے مطالعہ سے قاری پر بالکل واضح ہو جائے گا کہ مولانا مودودی تقسیم سے پہلے "اسلامی ریاست کے تصور کے خلاف" نہیں تھے بلکہ مسلم لیگ کے طریق کار کے خلاف تھے۔ وہ خود تو اسلامی حکومت ہی بنانے کے حامی تھے مگر ان کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ جس طرح اس

---

[1] یہ ہے اس واقعہ کی حقیقت جس کو دو ایسے شخصوں نے مل کر تصنیف کیا ہے جن میں سے ایک عدالت کا جج ہے اور دوسرا مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ دینیات کا صدر۔ ہماری سوسائٹی کے ان دو معزز ترین افراد نے ایک بالکل غیر متعلق بات کو خود ساختہ شکل دے کر اس عجیب و غریب حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سکولر نظام قائم کرنے کے حامی ہیں یا کبھی حامی رہے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر مزید تعجب ہوگا کہ اس روایت پر ہمارے پریس نے اس قدر اعتماد کیا کہ ایک اردو اخبار میں مولانا اکبر آبادی کا یہ مضمون نقل کیا گیا ہے اور اس پر جلی قلم سے یہ سرخی دی گئی ہے:
"مولانا مودودی، مسٹر جناح اور ڈاکٹر اقبال سکولرزم کے حامی" (مدینہ ۲۵ مئی ۱۹۶۲ء)

کے لیے تحریک چلا رہی ہے اس طرح اسلامی حکومت وجود میں نہیں آسکتی۔

افسوس کہ مولانا سعید احمد اکبرآبادی نے اتنے بڑے مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے نہایت غیر ذمہ داری کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے مولانا مودودی کا نقطۂ نظر پیش کرنے کے لیے منیر رپورٹ کے حوالے کو کافی سمجھا، حالانکہ ایک تعلیم یافتہ آدمی سے یہ توقع کی جانی چاہیے کہ وہ اس واقعہ کو جانتا ہوگا کہ منیر رپورٹ کی اشاعت کے بعد جماعت اسلامی پاکستان کی طرف سے ایک باقاعدہ کتاب اس کی تردید میں شائع کی جا چکی ہے جس کا نام ہے:۔

An Analysis of the Munir Report.

اس کتاب میں وضاحت کے ساتھ بتایا جا چکا ہے کہ منیر رپورٹ واقعات کی صحیح رپورٹ نہیں ہے بلکہ اس میں مختلف طریقوں سے حقائق کو مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ منیر رپورٹ کا حوالہ دینے سے پہلے مضمون نگار کے لیے لازم تھا کہ وہ اس کتاب کا بھی مطالعہ کر لیتے۔ اس طرح انھیں معلوم ہو جاتا کہ اس "ضخیم رپورٹ" کی حقیقت کیا ہے جو ان کے نزدیک کمیشن نے "بڑی محنت اور قابلیت سے مرتب کی تھی"۔ مثلاً اسی زیر بحث حوالے کے سلسلے میں مذکورہ بالا کتاب کے صفحہ ۸۱ - ۸۰ پر واضح تردید موجود ہے۔ رپورٹ کا اقتباس دینے کے بعد اس کے عین نیچے جو سطریں درج ہیں ان کا ترجمہ یہ ہے:۔

> "یہ ہمارے لیے انکشاف ہے کہ جماعت اسلامی یا مولانا مودودی نے کبھی اسلامی اسٹیٹ کے تصور کی مخالفت بھی کی ہے اس برصغیر کے لاکھوں آدمیوں نے جماعت اسلامی کا لٹریچر پڑھا ہے۔ وہ یقیناً اس دریافت کو جان کر سخت حیرت زدہ ہوں گے۔ ان دو معزز ججوں نے جو بات مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی طرف منسوب کی ہے، بلاشبہ ان میں سے کسی ایک نے کبھی وہ ان کے لٹریچر میں نہ پائی ہوگی۔ اقتباس کا آخری جملہ جو بات کہہ رہا ہے وہ اصل واقعہ کے بالکل خلاف ہے۔
>
> مولانا مودودی کا یہ خیال کہ مجوزہ پاکستان اسلامی ریاست نہیں بن سکتا اس بنا پر نہیں تھا کہ وہ اسلامی ریاست بنانے کے خلاف تھے، اس کے برعکس وہ اس لیے مسلم لیگ سے الگ رہے کہ ایسی فرضیت اور کردار رکھنے والی جماعت جیسی کہ مسلم لیگ ہے، اس سے وہ امید نہیں کر سکتے تھے کہ وہ فی الواقع ایک صحیح اسلامی نظام وجود میں لا سکتی ہے"۔ صفحہ ۸۰

اگر موصوف اس کتاب کو پڑھ لیتے تو شاید ان کے قلم سے ایسی باتیں نہ نکلتیں جنھوں نے ان کے مقالہ کو اہل علم کی نظروں میں نہایت غیر وقیع بنا دیا ہے۔

اسی طرح مضمون میں منیر رپورٹ کے حوالے سے "علماء کے اسلام" کا بہت مذاق اڑایا گیا ہے۔ فرماتے ہیں "تحقیقاتی کورٹ نے (جس کے صدر جسٹس محمد منیر تھے) جب علماء سے یہ سوال کیا کہ اچھا! یہ تو بتائیے کہ اسلامی اسٹیٹ کی تعریف کیا ہے اور آپ کا اس کے متعلق تصور کیا ہے تو بڑے بڑے علماء جن کی ہم دل سے عزت کرتے ہیں اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے" صفحہ ۵

"عالم یہ ہے کہ علمائے اعلام جمع ہیں، زعمائے ملت موجود ہیں اور پھر کوئی ڈھنگ کا بالکل قطعی اور محکم جواب نہیں دیتا اور اس سادہ سے سوال کا جواب جتنے منہ اتنی باتیں کا مصداق ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی نے کچھ کہا اور کسی نے کچھ۔ چند نامور علماء نے تو یہاں تک فرما دیا کہ ہم اس قدر کم وقت میں اس سوال کا جواب کیوں کر دے سکتے ہیں۔ اس کے لیے تو کم از کم ایک ہفتہ کا اور بعض نے کہا دو دن کا وقت ملنا چاہیے۔ یہ پریشان دماغی نتیجہ ہے صرف اس چیز کا کہ اسلامک اسٹیٹ کے متعلق ان حضرات کا ذہن صاف نہیں ہے۔ ان کا جو تصور ہے وہ اس قدر رجعت پسندانہ ہے کہ جب حقائق سے اس کا تصادم ہوتا ہے تو یہ لوگ انتشار ذہنی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں" صفحہ ۶

کاش مضمون نگار ان سطروں کو لکھنے سے پہلے جماعت اسلامی پاکستان کی طرف سے شائع شدہ مندرجہ بالا کتاب دیکھ لیتے تو ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جاتیں اس سے انھیں معلوم ہوتا کہ منیر رپورٹ میں واقعات کو پیش کرنے کا کتنا سخت قابلِ اعتراض طریقہ اختیار کیا گیا ہے اور یہ کہ اسلام اور اسلامی نمائندوں کی باتیں صحیح طور پر نقل نہیں ہوئی ہیں۔ اس کے برعکس دوسرے فریق کے نقطۂ نظر کو پوری تفصیل اور قوت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ نیز یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ علماء کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ اس طرح کے مقصد کے لیے کوئی صحیح طریقہ نہیں کہا جا سکتا۔ اس موقع پر ہم جماعت اسلامی پاکستان کی طرف سے شائع شدہ محولہ بالا کتاب کا ایک ٹکڑا نقل کریں گے:۔

"تحقیقاتی عدالت نے کس ذریعۂ علم سے یہ جانا کہ علماء کا اسلام کیا ہے۔ جب ہم اس سوال کا جواب معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس مقصد سے رپورٹ اور ان شہادتوں کا بغور مطالعہ کرتے ہیں جو اخبارات میں شائع ہو چکی ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ علماء کا اسلام معلوم کرنے کے لیے دو طریقے اختیار کیے گئے تھے:

اول یہ کہ عدالت نے یہ فرض کر لیا کہ وہ تمام لوگ "علماء" ہیں جو اسلامی نظام کے لیے کام کرنے والی کسی جماعت سے کوئی تعلق رکھتے ہیں اور جو عدالت کے سامنے گواہ کی حیثیت سے پیش ہوئے ہیں۔ اس مفروضہ

کی وجہ سے قدرتی طور پر ایسا ہوا کہ ایک طرف اگر مفتی محمد شفیع، مولانا محمد ادریس اور مولانا ابوالحسنات جیسے لوگ علماء تھے تو دوسری طرف ماسٹر تاج الدین انصاری، غازی سراج الدین منیر اور میاں طفیل محمد بھی علماء کی صف میں شامل کر دیے گئے اور جو کچھ بھی ان کی زبان سے نکلا وہ مستند بن گیا۔

دوسرے ان حضرات کا نقطۂ نظر معلوم کرنے کے لیے جو طریقہ اختیار کیا گیا وہ ان سے کیے جانے والے وہ سوالات ہیں جس میں سوال کرنے والی خود عدالت ہے اور اس کو پورا اختیار رہے کہ جو چاہے پوچھے اور جس طرح چاہے پوچھے۔ دوسری طرف گواہوں کا حال یہ ہے کہ وہ سوالات کا جواب دینے کے لیے جن تشریحات کو ضروری سمجھتے ہیں اس کو معلوم کرنے سے وہ روک دیے گئے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ اس قسم کی عدالتی پوچھ گچھ، جو بعض خاص طرح کے معاملات کے لیے تو بالکل موزوں ہو سکتی ہے، کیا وہ علمی اور اصولی قسم کے معاملات کی تحقیق کے لیے بھی مناسب کہی جا سکتی ہے۔ اگر اس کو مناسب اور تشفی بخش کہا جائے تو کیا کسی بھی قانون یا فلسفے یا اقتصادیات کے ماہر کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے خیالات و نظریات کو اس وقت پوری طرح ظاہر کر سکے جب کہ وہ شہادت کے کٹہرے میں کھڑا ہو اور ریسرچ اسکالر عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہوں — خاص طور پر ایسی حالت میں جب کہ جوابات ان حدود کے اندر دینے ضروری ہوں جو سوال کرنے والے نے خود مقرر کیے ہیں۔

تھوڑی دیر کے لیے فرض کیجیے کہ یہ صورت حال بدل گئی ہے۔ علماء عدالت کی کرسی پر پہنچ گئے ہیں اور کچھ لوگ ان کے سامنے اس لیے لا کر شہادت کے کٹہرے میں کھڑے کیے جاتے ہیں تاکہ وہ سیکولرازم، ڈیماکریسی، کمیونزم یا اور کسی ازم یا نظریے کی طرف سے جوابات دیں۔ اس طرح ان کے جوابات سے جو تصویر سامنے آئے گی کیا وہ ان کے ذہن اور ان کے تصورات کی واقعی صحیح نمائندگی کہی جا سکتی ہے۔

ٹھیک یہی طریقہ ہے جو اسلامی نظام کے بارے میں علماء کے خیالات معلوم کرنے کے لیے اختیار کیا گیا اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ ان کے نزدیک وہ کون سی ریاست ہے جس کو وہ اسلامی ریاست کہتے ہیں۔"

An Analysis of the Munir Report,
PP. 145—47

لہ منیر رپورٹ میں اور اس کے حوالے سے مولانا اکبرآبادی کے مضمون میں ڈاکٹر اقبال کو جس رنگ میں پیش کیا گیا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے مگر اختصار کے خیال سے ہم نے اس بحث کو چھوڑ دیا ہے۔

اس کے بعد اس کتاب میں تفصیل سے ان سوالات پر گفتگو کی گئی ہے جو عدالت میں علماء سے کیے گئے تھے اور سعید احمد اکبرآبادی صاحب اور عدالت کے نزدیک علماء اس کا جواب نہ دے سکے۔ میں موصوف کو مشورہ دوں گا کہ وہ اس کو ضرور پڑھ لیں۔ کیونکہ یہاں ان کی پوری تفصیل نقل کرنے کی گنجائش نہیں ہے مجھے یقین ہے کہ جس چیز کو وہ عدالتی رپورٹ میں نہ پا سکے انشاء اللہ وہ اس کتاب میں ضرور اسے پالیں گے۔

یہ برہان کے اداریے کے صرف چند اجزاء کا تعارف ہے۔ اسی طرح یہ مضمون رسالے کے گیارہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے لیکن اوپر میں نے اس کے بعض حصوں کا جو تجزیہ کیا ہے اس کے بعد اگر میں بقیہ مضمون کے بارے میں تبصرہ کر کے ناظرین زندگی کا وقت خراب نہ کروں تو شاید آپ مجھے معذور قرار دیں گے۔ کیونکہ ایسی باتوں کا بہترین جواب یہی ہے کہ ان کے جواب میں خاموشی اختیار کیا جائے۔

صفحہ ۳۰ کا بقیہ: حدیث کے معنی پر غور کرنے کے بعد یہ بات زیادہ واضح معلوم ہوتی ہے کہ حروف سے مراد عرب کے وہ لہجے ہیں جو مختلف جگہوں پر مختلف طریقے پر ادا کیے جاتے تھے۔ قرآن نے اس وسعت کو قائم رکھا کہ ہر شخص اپنے مخصوص لہجے میں قرآن پڑھ سکتا ہے[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کے موقع پر اس مرتبہ روزنامہ دعوت دہلی اپنی تازہ پیشکش

رحمتِ عالم

پیش کر رہا ہے

پچھلے دو سیرت نمبروں کی طرح

اپنے مقالات کے لحاظ سے یہ نمبر بھی اس لائق ہوگا کہ اسے محفوظ رکھا جائے

صفحات ڈھائی سو ——— قیمت سوا دو روپے

ایک کاپی منگوانے والے اصحاب دو روپے ۹۰ پیسے منی آرڈر سے ارسال فرمائیں ——— پانچ کاپیاں منگوانے والوں کو محصول ڈاک معاف۔

اپنی فرمائشیں ۴ اگست تک حوالہ ڈاک کر دیں۔ یہ نمبر محدود تعداد میں چھپوایا جا رہا ہے اس لئے تاخیر سے پہنچنے والی فرمائشوں کی شاید تعمیل نہ ہو سکے۔ یا دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے۔

منیجر "دعوت" دہلی

---

[1] اس حدیث کی تشریح میں ادیب صعدی نے مستقل ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام (ھین النبع علی طرد السبع) ہے۔

نیا پراسپکٹس منسوخ کر دیا گیا

اگر بھارت میں متحدہ قومیت کا یہ مطلب ہوتا کہ یہاں کی متعدد و مختلف مذہبی و تہذیبی اکائیاں اپنے انفرادی وجود کو برقرار رکھیں اور سب مل کر وطنی حیثیت سے ایک ہوں تو حکومت کا رویہ عددی اقلیت رکھنے والی قوموں کے ساتھ وہ نہ ہوتا جو اس وقت ہے۔ اکثریت کی سیاسی و مذہبی پارٹیوں اور حکومت کے مشترک رویے سے متحدہ قومیت کا جو مطلب واضح ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر طرح کے ذرائع و وسائل اختیار کر کے اس ملک میں ایک ایسی قوم سانچے میں ڈھالی جائے جو تہذیبی نقطۂ نظر سے ہندو ہو، ہندو قوم کی سربلندی اور بھارت کی یک جہتی کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کی تمام تہذیبوں کو ایک ہی ہندو تہذیب میں مدغم کر لیا جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ مطلب پردۂ خفا میں چھپا ہوا تھا اور اب ظاہر ہوا ہے۔ ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو تقسیم ہند سے پہلے ہی یہ مطلب سمجھ گئے تھے اور انھوں نے بدلائل اسے مسلمانوں کے سامنے پیش بھی کر دیا تھا اس کے علاوہ مسلم لیگ کے ہنگامے کی ایک بڑی دلیل یہ بھی کہ متحدہ قومیت کے پردے میں ملت اسلامیہ کی انفرادیت کو ختم کرنا مقصود ہے۔ ہاں اب چودہ پندرہ سال کے عملی مظاہرے نے ان بہت سارے لوگوں کی غلط فہمی بھی دور کر دی ہے جو پہلے مطلب پر مطمئن تھے۔ ان عملی مظاہروں میں سب سے بڑا عملی مظاہرہ وہ تعلیمی پالیسی ہے جو یہاں بزور قانون چلائی جا رہی ہے۔ نصاب تعلیم اس بات کا ناقابل انکار ثبوت ہے کہ متحدہ قومیت کا مطلب ہندو قومیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ مسلمان سالہا سال سے چیخ رہے ہیں کہ نصاب تعلیم میں اصلاح کی جائے لیکن عملی حیثیت سے ان کی چیخ و پکار صدا بصحرا کا حکم رکھتی ہے بلکہ اس کا عملی جواب یہ دیا جانے والا تھا کہ نصاب میں جو قابل اعتراض چیزیں نظری طور پر درج تھیں اب ان کی عملی ٹریننگ بھی دی جانے لگے تاکہ بچوں کے سادہ دل و دماغ پر ہندو عقائد اور ہندو تہواروں کا عملی نقش بھی جم جائے۔ ہمارا صوبہ اتر پردیش چونکہ تعلیمی پالیسی میں تمام ہندوستان کا پیشوا بنا ہوا ہے اس لیے ہندو تہواروں کی عملی مشق کی ابتدا بھی یہیں ہونے والی تھی۔ خیریت گزری کہ جناب قاضی عدیل عباسی صاحب سکریٹری دینی تعلیمی کونسل نے پراسپکٹس پڑھا، ذمہ داروں

سے گفتگو کی، پھر ایک مضمون کے ذریعہ مسلمانوں کو اس تازہ خطرے سے آگاہ کیا۔ بحمد اللہ بھارت کے مسلمانوں کی دینی حس ابھی بالکل مٹی نہیں ہے اس لیے ان میں اس کے خلاف حرکت پیدا ہوئی۔ دینی تعلیمی کونسل نے اس خطرے سے بچاؤ کی تدبیروں پر غور و فکر کے لیے اپنا اجتماع لکھنؤ میں منعقد کیا لیکن اس پر غور و فکر سے پہلے ہی اتر پردیش کے وزیر تعلیم نے یہ خوش خبری سنادی کہ نیا پرائمر منسوخ کر دیا گیا ہے اور بیسک اسکولوں کے ذمہ داروں کو ہدایات بھیج دی گئی ہیں۔ "رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت" کہتے ہوئے مسلمانوں نے اس خوشی کا استقبال کیا۔

جب کسی شخص یا قوم پر مصیبتوں کا ہجوم ہو تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک مصیبت کے خاتمے پر بھی وہ غیر معمولی خوشی محسوس کرتی ہے۔ جو لوگ اس خطرے سے بچنے کی براہ راست کوشش کر رہے تھے اگر انھوں نے معمول سے کچھ زیادہ خوشی کا اظہار کیا تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ بعض اخبارات نے "فتح مبین" کے عنوان سے اس پر ایک اداریہ لکھا ہے۔

بلاشبہ شرک کا عملی مظاہرہ بھی گناہ عظیم ہے لیکن دینی تعلیمی کونسل کے ارکان اور دوسرے اہل دانش و بینش افراد مجھ سے زیادہ اس چیز سے واقف ہوں گے کہ عقائد کو اصل کی حیثیت حاصل ہے اور اعمال ان کی فرع ہیں۔ نظری حیثیت سے مسلمان بچوں کے دل و دماغ میں مشرکانہ اوہام و عقائد کا اترنا کم خطرناک نہیں ہے اس لیے نصاب تعلیم کے قابل اعتراض حصوں کو نکلوانے کے لیے بھی اسی سرگرمی سے کام کرنا چاہیے جس سرگرمی سے عملی مظاہرے کو رکوانے کے لیے کیا گیا ہے۔ یہی بات ہے جس کی طرف مولانا ابو اللیث ندوی، امیر جماعت اسلامی ہند نے اپنے ایک بیان میں اشارہ کیا ہے، انھوں نے کہا ہے:

> یہ بات اگرچہ بڑی حد تک خوش آیند ہے کہ حکومت یوپی نے ہندی بیسک ریڈروں میں مسلمانوں کے احتجاج اور انصاف پسند غیر مسلموں کی اس سلسلے میں ہمنوائی کے پیش نظر کچھ تبدیلیاں کر دی ہیں لیکن حکومت کے اس خاص ذہن میں کسی بنیادی تبدیلی کے کچھ آثار اب تک پیدا نہیں ہوئے ہیں جس کی وجہ سے آئے دن مسلمانوں کو سرکاری تعلیم کے سلسلے میں طرح طرح کی شکایات پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ دوسرے اتر پردیش کے نصاب میں کوئی تبدیلی نہیں کی گئی جس کو بنیاد بنا کر نصاب کی وہ نئی ہدایات جاری کی گئی تھیں اور جن پر مسلمانوں نے احتجاج کیا تھا۔ انھوں نے کہا اور اب بھی ہندی بیسک ریڈروں میں تبدیلی کے باوجود ابتدائی درجات سے ہائی اسکول تک کی درسی کتب میں بے شمار غلط اور قابل اعتراض باتیں شامل ہیں۔

مولانا کے بیان کا مطلب یہی ہے کہ اصل آفت اپنی جگہ جوں کی توں باقی ہے صرف اس کی ایک عملی فرع میں تبدیلی پیدا کی

گئی ہے جب تک فساد کا اصل سرچشمہ بند نہ ہو اطمینان حاصل نہیں ہو سکتا۔ دینی تعلیمی کونسل کے ایک دوسرے رکن جناب فدا حسین صاحب نے بھی اسی طرح کا اظہار خیال کیا ہے۔ ان کا جو بیان سیاست جدید کانپور (۲۶ جولائی ۶۲ء) میں شائع ہوا ہے اس سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ نئے پراسپکٹس کی منسوخی سے مطمئن ہو جانا صحیح نہیں ہے۔ دینی تعلیمی کونسل کو اصل نصاب کی اصلاح کے لیے سرگرمی تیز کرنی چاہیے انھوں نے اپنے بیان میں ایسی چیزیں بھی پیش کی ہیں جن پر دینی تعلیمی کونسل کو غور کرنا چاہیے

تراجم واقتباسات　　　　　　　　　　　　　　　　　　　ترجمہ: ش ن عثمانی

روس کے مسلم علاقوں میں سوویت سامراج

قسط (۳)

(۴)
روس میں عام مسلمانوں کا صفایا

مسلم قومی تحریکوں کے کچل دئے جانے کے بعد قدیم سلطنت روس میں بسنے والے مسلمان سوویت تجربہ اور اشتراکیت کی تعمیر اور مسئلہ قومیت کا حل پیش کرنے والی سوویت تجربہ کاری کا "معمول" بن کر رہ گئے اس آزمائشی تجربے کے دوران میں مسلمان قوموں کا حجم ناقابل لحاظ حد تک کم ہوگیا بعض جگہ تو مسلمان قومیں سرے سے ختم ہوگئیں ۱۹۲۶ء کی مردم شماری کی رو سے روس میں ۳۹۶۸۰۰۰ قازق تھے اور ۱۹۳۹ء کے بموجب محض ۳۰۹۸۷۶۴[30] ۱۹۵۹ء کی آخری مردم شماری نے ۳۵۸۱۰۰۰ کی تعداد پیش کی۔ اس مدت کے اندر یعنی ۱۹۲۵ء سے ۱۹۵۹ء تک قازقوں کی گنتی میں معتدبہ حد تک اضافہ ہونا چاہیے تھا۔ یہی لوگ اشتراکی تعمیر اور سوویت روس میں مسئلہ قومیت کو حل کرنے کے لئے سوویت تجربے کے تختۂ مشق تھے۔ آئیے اب ذرا دوسرا تجربہ دیکھا جائے۔ ۱۹۳۹ء کی مردم شماری کی رو سے سوویت روس میں CHECHEN - INGUSH قوم کی تعداد ۵۰۰۰۰۰ تھی۔ ۱۹۵۹ء کی مردم شماری کے حساب سے ۵۲۴۰۰۰۔ اگر حالات کو معمول پر مان لیا جائے تو یہ گنتی ۱۹۵۹ء میں کہیں زیادہ اونچی ہونی چاہیے تھی ان کو بھی اسی ابتلاء کا سامنا کرنا پڑا جس سے قازقوں کو سابقہ پڑا تھا۔ ۱۹۴۴ء میں "CHECHEN-INGUSH" فرقہ کو عمومی پیمانے پر جلاوطن کیا گیا۔ ۱۹۵۷ء سے کچھ "پس ماندگان" کو وطن مالوف پلٹ آنے کی اجازت ملی ہے۔ کاکیشیا کی دوسری مسلم قومیت کراچائی (KARACHAI) کی بھی یہی درگت ہوئی۔

۱۹۲۶ء کی مردم شماری کے مطابق یہ لوگ ۵۵۱۲۰ تھے اور ۱۹۵۹ء کے لحاظ سے ۸۱۰۰۰۔ دوسری ان گنت مثالیں نقل کی جاسکتی ہیں۔ ۱۹۲۶ء میں ترکمان ریاست کے علاقہ مری میں ۹۹۷۴ بلوچ

---

[30] [illegible]

(BELUZHARS) تھے اور ۱۹۵۹ء میں صرف ۷۸۰۰ ۔ اس خانہ بدوش قوم کو متمکن ہونے پر مجبور کیا گیا اور اس کے مویشیوں کو اجتماعی ملکیت بنا دیا گیا ۔ ۱۹۳۱ء میں بے شمار بلوزروں نے خان کریم خاں کی سرکردگی میں روس سے نکل کر ایران میں گھسنے کی کوشش کی ۔ سرحد کے پاس ہی ان کو این کے دی ڈی سرحدی مورچوں کی پولس اور ترکستان ملٹری ڈسٹرکٹ کے فوجی دستوں کا سامنا کرنا پڑا ۔ کچھ بلوزروں کا قلع قمع کر دیا گیا اور کچھ (جن میں خاص طور پر عورتیں، بوڑھے اور بچے تھے) قید ہوئے اور جلاوطنی کے عالم میں تباہ و برباد ہوئے اور بہت قلیل تعداد میں کچھ لوگ کریم خاں کی سرکردگی میں ایران کی سرحد پار کر لینے میں کامیاب ہوئے۔ ایک اور مسلم قوم جس کو سوویت تجربے کی اذیت اٹھانا پڑی ۔ کریمیا کے تاتار تھے ۔ انہیں کریمیا سے ۱۹۴۴ء میں دیس نکالا دیا گیا اور تا حال اپنے وطنی علاقوں میں واپس نہیں آئے ۔ ۱۹۲۶ء میں یہ لوگ ۱۷۸۰۰۰ تھے ۔ ۱۹۵۹ء کی مردم شماری میں ان کا تذکرہ نہیں کیا گیا ۔ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ جو لوگ جاں بر ہوئے وہ کہاں پڑے ہیں؟

سوویت روس میں سب سے بڑی مسلم قوم ازبیک ہیں جو اصلاً موجودہ ازبیک سوویت ریاست میں (۵۰۴۶۰۰۰)[1] اور بعض دوسری وسطی ایشائی جمہوریتوں میں رہتے ہیں ۔ یہ ازبیک جن کی کل تعداد ساٹھ لاکھ چالیس ہزار (۶۰۴۰۰۰۰) افراد پر مشتمل ہے ۔ ریاستہائے متحدہ سوویت روس کی چوتھی عظیم ترین قوم ہے ۔ ان کے بعد تاتاریوں (۴۹۶۹۰۰۰)، قازقوں (۳۵۸۱۰۰۰)، آذربائیجانی (۲۹۲۹۰۰۰) تاجکیوں (۱۳۹۷۰۰۰)، ترکمانیوں (۱۰۰۴۰۰۰)، باشکیریوں (۹۸۳۰۰۰) اور کرغیزیوں (۹۷۴۰۰۰) کا نمبر آتا ہے ۔ شمالی کاکیشیا کی مسلمان قوموں کی تعداد اس سے کہیں کم تر ہے ۔ وہ داغستان کی قوموں کی ۹۴۵۰۰۰ کی کل تعداد پر مشتمل ہیں ۔ ۴۱۸۰۰۰ CHECHEN قوم کے لوگ ہیں ۔ ۲۰۴۰۰۰ KABAR DINIANS ہیں ۔ ۱۰۶۰۰۰ INGUSH ہیں ۔ ۸۰۰۰۰ "ADYGEI" ہیں اور ۴۲۰۰۰ بلکر (BALKARS) ہیں ۔ سوویت روس میں کل ۴۱۰۰۰۰ آسیشیائیوں (OSSETIANS) کے صرف ایک تہائی لوگ مسلمان ہیں جو کوئی ۱۳۶۰۰۰ ہوتے ہیں ۔ سوویت روس کی دوسری مسلمان قومیں یہ ہیں :-

کاراکلپک (KARAKALPAK) جو ازبکستان کی ریاست کاراکلپک میں رہتے ہیں کوئی ۱۷۳۰۰۰ ۔ قاقوز (GAGAUZ) جو خاص طور پر مالڈوین ایس ایس آر میں رہتے ہیں ۱۲۴۰۰۰ ۔ IGURS ای جو کرغیزیا اور قازق ریاستوں میں ہیں :- ۹۵۰۰۰ ۔ کرد جس کے بیشتر لوگ مسلمان ہیں :-

---

[1] پلا ودا ۱۴ فروری ۱۹۶۱ء

۵۹۰۰۰ ۔ دنگان (The Dungans) چینی جو مسلمان ہو گئے ہیں :- ۲۱۰۰۰ جو خاص طور پر قازق ریاست اور وسطی ایشیائی جمہوریتوں میں ملتے ہیں ۔ ایرانی :- ۲۱۰۰۰ ، عرب :- ۸۰۰۰ (ازبک اور تازیک ریاستوں میں) ، افغان :- ۱۹۰۰ (ترکمانستان، تازیکستان اور ازبکستان میں) ، بلوزر (BELUZHAR) :- ۷۸۰۰ ، ابخازی (ABKHAZIAYS) :- ۷۴۰۰ ، اور جارجیائی ادغاری (GEORGIAN ADGHARIANS) اور جارجیائی مسخ (MESKHS)

---

(۵)

مسلمانوں پر معاشی دباؤ

غیر سرمایہ دارانہ ارتقار کی راہ پر چلنے کے تقاضے نے مسلمانوں کی زندگی اور کلچر کو کس حد تک عقوبت میں مبتلا ہونا پڑا ؟ سیاسی میدان میں ۱۹۱۷ء کی قائم شدہ آزاد ریاستوں نے یہ آزادی کھو دی ۔ معاشی میدان میں کرغیز، قازق، ترکمان، بلوزر خاص طور پر تختہ مشق بنے ۔ سوویت مشرق کی قدیم خانہ نشین قومیں (SEDENTARY) قومیں — ازبیگ، تازیک، تاتار، آذربائیجان اور دوسرے لوگ بھی ان اقدامات کے شکار ہوئے جو زراعت میں نام نہاد اشتراکی انقلاب برپا کرنے کی غرض سے عمل میں لائے گئے تھے — مثلاً خوش حال کسانوں کا صفایا — اجتماعی ملکیت کا نفاذ — ایک ہی فصل کی کاشت کرنے کے لقطے پر زراعت کو سمیٹ دینا — (مثلاً ترکستان میں کپاس کے بجائے چاول کی تحدید کی گئی) ۔ — کوئی شخص اس کا تو منکر نہیں ہو سکتا کہ سوویت حکومت نے جن ذرائع وسائل کو سوویت ریاستوں کی تمام قوموں کے استحصال سے حاصل کیا تھا ان کو اس نے ان علاقوں میں کارخانے، پلانٹ، تکنیکل آلات کی نصبی اور کمپنیاں جیسی تعمیر کرنے میں لگایا اس کے باوجود سرکاری سرمایہ اندوزی کی جو صورتیں سوویت یونین میں اس کے کلیت کیشانہ اور منصوبہ بندانہ نظام کے ساتھ پائی جاتی ہیں اس کے پیش نظر ان کاروباری مہموں کی پیداوار سے " ریاست " نہ کہ ان جمہوریتوں کی آبادی فائدہ اٹھاتی ہے — اسی لیے سوویت یونین کے مسلمان بجا طور پر کہتے ہیں کہ سوویت حکومت نے ہمارے دیش کو مالا مال کر دیا اور ہمیں مفلوک الحال بنا چھوڑا ، ٹھیک بھی ہے ۔ وہ نتیجہ جو ان علاقوں کے عوام کی زندگی اور معاشیات میں سوشلسٹ انقلاب کاری اور اس غیر سرمایہ دارانہ ارتقار کی راہ کا نکلا جس کو سوویت عمال حکومت نے دہشت انگیزی اور طاقت کے ذریعہ ان کے سر لاد دیا تھا ۔

اصول عمرانیات کے لحاظ سے سابق سلطنت زار روس کی مسلم آبادی کی بناوٹ میں بڑی بھاری تبدیلیاں ہوئی ہیں جن میں سے بعض کا ذکر اوپر کیا گیا۔ ان تغیرات کا ایک پہلو یونین کی ان جمہوریتوں کے مسلمانوں کی تعداد کا مسلسل گرتے جانا ہے جہاں وہ اس سے پہلے سب سے بڑا گروہ واحد تھے۔ ان جمہوریتوں میں غیر مسلموں کی تعداد میں متوازی اضافہ بھی ہوا ہے۔ یہاں قازق ریاست کی مثال سب سے عمدہ مثال ہے۔ ۱۹۲۶ء کی مردم شماری کے لحاظ سے قازقستان کی مکمل آبادی میں روسیوں کا شمار ۹ ر ۴۳ فی صد تھا۔ قازق کل آبادی کا ۵۷٫۵ فی صد تھے۔ ۱۹۲۶-۳۹ء کا زمانہ اس جمہوریہ میں اجتماعی ملکیت چلانے اور صنعتوں کو پھیلانے کا زمانہ تھا۔ اور اس لیے اس عرصے میں بطور خاص روسیوں کی بڑی تعداد اس علاقے میں در آئی۔ ۱۹۳۹ء میں قازق لوگ اس جمہوریہ کی پوری آبادی کا ۳۸ فی صد حصہ رہ گئے تھے۔ جنگ کے بعد کے دوسرے پنجسالہ منصوبے کے دوران میں جب "صنعتیانے" کا عمل اپنے پورے شباب پر تھا تو یہ داخلہ کی رفتار کچھ اور بڑھ گئی۔ اس کے بعد غیر مزروعہ اور غیر مستعمل زمینوں کے نشوونما کا سلسلہ چلا جس کا آغاز ۱۹۵۴ء میں ہوا۔ ۱۹۵۹ء کی مردم شماری کی روسے قازق کل آبادی کا ۲۹٫۶ فی صد رہ گئے جبکہ غیر مسلم باشندوں کا شمار ۵۲٫۵ ہوتا تھا۔ (روسی یوکرینی، بیلوروسین) جن میں ۴۳٫۱ فی صد روسی شامل ہیں۔[1]

(۶)

مسلم کلچر پر کیا گذری؟

ارتقاء کی غیر سرمایہ دارانہ راہ پر چلنے کے سوویت تجربے اور مسئلۂ قومیت کے سوویت حل نے مسلم قوموں کی اس ایکتا اور کلچر کی بالیدگی پر بہت بڑا اثر ڈالا جس کا مظاہرہ مشترک مذہب اور مشترک روایات کی صورت میں ہوتا تھا۔ مسلم قوموں کی وحدت کے تخیل نے ترکستان میں سوویت اقتدار کے قیام اور اس ملک میں سوشلسٹ انقلاب کے آڑے آنے کا خصوصی کردار ادا کیا۔

ازبیگ، تاژیک، ترکمان، قازق اور کرغیز سب ہی نے اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ اس مزاحمت پر قابو پانے کے لیے جو "بسماکی تحریک" کے نام سے معروف ہوئی سوویت حکومت نے اس مسلم وحدت اور مشترک مسلم کلچر کا توڑ کرنے کے لیے جس کی جڑیں ترکستان، ایدل اُرل اور شمالی کاکیشیا میں پھیلی ہوئی تھیں سوویت روس کے مسلمانوں کی قومی

---

[1] پراودا ۱۲ جنوری ۱۹۵۶ء

علیحدگی سے کام لیا۔ اس پالیسی کو وسطی ایشیا میں نام نہاد "سرکاری قومی امتیاز" کی صورت میں پیش کیا گیا[1]۔ ۱۹۲۴ء میں ترکستان کے مسلم عوام جو اپنی مختلف زبانوں کے باوجود مشترک تاریخ اور کلچر کے رشتے میں صدہا سال سے گتھے ہوئے تھے ثقافتی اور سرحدی طور پر ٹکڑیوں میں بانٹ دیے گئے۔ ہمسایہ مسلم قوموں کی ایکتا کو روکنے کی اس پالیسی کو ایدل اُرل کے تاتاری اور باشکری علاقوں پر استعمال کیا گیا۔ مارچ ۱۹۱۸ء میں تاتار۔ باشکری جمہوریہ اس علاقہ میں قائم ہوئی تھی۔ ۱۹۱۹ء میں سوویت حکومت کے ایک سرکاری اعلان کے ذریعہ اس خود اختیاری باشکری جمہوریہ کو اس سے کاٹ کر الگ کر دیا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں تاتاری داخلی طور پر آزاد جمہوریہ کو بقیہ سرحدوں پر قائم کیا گیا۔ یہی صورت شمالی کاکیشیائی جمہوریہ کے ساتھ کی گئی جو خود بھی ۱۹۱۸ء میں بنی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ جب شمالی کاکیشیا کے کوہستانی لوگ ایک ریاست واحد کی شکل میں متحد ہو گئے تھے تو مشترک تاریخی ماضی اور کاکیشیائی قوم کی دیرینہ روایات نے بہت بڑا کردار ادا کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا کہ شمالی کاکیشیا کی مسلم قوموں میں مسلم وحدت کا تصور اب تک باقی رکھے ہوئے تھیں جیسا کہ اس بات سے ظاہر ہوا کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں امام شامل کے ہاتھوں تمام شمالی کاکیشیائی قوموں پر مشتمل ایک مسلم ریاست کی بنیاد ڈالی گئی تھی۔ شمالی کاکیشیائی قوموں کی اس ایکتا کو تہس نہس کرنے کے لیے سوویت حکومت نے داخلی طور پر آزاد مختلف جمہوریتیں اور ریونٹ بنا کر شمالی کاکیشیائی قوموں کو ایک عظیم تر سرحدی دائرہ بنانے سے روک کر مسلم قوموں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔

قدیم سلطنت روس کے مسلم علاقوں کو جداگانہ نیم آزاد اور یونین کی ذیلی جمہوریتوں میں تقسیم کرنا سوویت قومیت کی پالیسی کا پہلا قدم تھا جس کا مقصد مسلم وحدت کو مٹا دینا تھا لیکن تنہا یہ قدم ناکافی تھا۔ سوویت روس کے مسلمان مشترک مذہب، عربی حروف تہجی، ایک مشترک مذہبی اور فلسفیانہ ادب اور مسلم عربی ثقافت کے ایک مشترک ورثہ کے حامل اب بھی تھے۔

سوویت حکومت کے اگلے اقدامات ان ہی عناصر کو تباہ کرنے کے مقصد سے بروئے کار آئے جو روس کے طول و عرض میں ان مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اور باہر کی دنیا کے مسلمانوں کے ساتھ ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھے۔ اشتراکی انقلاب کاری کے مختلف مرحلوں میں اسلام دشمن جد و جہد نے معبدوں کی اراضی کو قومیانے، دینی درس گاہوں اور مدرسوں کو بند کرنے کی شکل اختیار کی۔ مسلم عوام کو "لیشنسی" طبقہ میں رکھا گیا (وہ لوگ جو شہری حقوق سے محروم ہوں) ان کو گرفتار کیا گیا اور شہر بدر کیا گیا۔ اکثر مسلم زعماء کا صفایا تک کر دیا گیا

[1] "ترکستان بیسویں صدی میں" از: بےمرنا حالی - دار مستد - صفحات: ۲۰۲ - ۱۷۳

اور اسلام کی ساکھ گرانے کے لیے اسلام دشمن پروپیگنڈا منظم طور پر چلا دیا گیا۔

مذہبی عبادت گاہوں کی جاگیروں کی ضبطی سوویت حکومت کے بالکل ابتدائی زمانے میں مسلم علاقوں میں عمل میں آ چکی تھی۔ دینی درس گاہیں اور مدرسے اس کے تقریباً فوراً ہی بعد بند کر دیے گئے۔ بعد ازاں بہت سی مسجدوں کو بند کر دیا گیا۔ روس میں اسلام کے موضوع پر ایک کتاب کے مصنف ونسنٹ مونٹیل (Vencent monteil) نے انقلاب سے پہلے اور انقلاب کے بعد کے روس میں مسجدوں کی تعداد پر اعداد و شمار نقل کیے ہیں[1]۔ ۱۹۱۷ء میں صرف یورپین روس ہی میں ۷ ہزار مسجدیں تھیں۔ ۱۹۴۲ء میں "سوویت وار نیوز" (۱۶ رمئی ۱۹۴۲ء) کی فراہم کردہ اطلاعات کے مطابق روس کے طول و عرض میں ۱۳۱۲ مسجدیں رہ گئیں۔ ازبک سوویت ریاست کی مسجدوں کے جو اعداد و شمار جنرل ٹیوڈر (Gen. Tudent) نے دیے ہیں جنھوں نے ۱۹۵۱ء میں شمالی افریقہ کے مسلمانوں کے ایک وفد کے ساتھ اس علاقے کا دورہ کیا تھا اور وہ اعداد و شمار جو ۱۹۵۲ء کی ماسکو اقتصادی کانفرنس کے پاکستانی وفد کے ایک ممبر مبارک ساغر نے دیے ہیں جو ڈان میں چھپ چکے ہیں ایک دوسرے کی تردید کرتے ہیں[2]۔ مونٹیل کی رائے میں ان اعداد و شمار میں مبالغہ آرائی ہوئی ہے کیونکہ انھوں نے سوویت ماخذ سے کام لیا تھا۔

۱۹۲۹-۳۲ء کے اجتماعی ملکیت کے نفاذ کے دور میں روس کے مسلم علما کے خلاف مہم انتہائی شدت پکڑ گئی اس دور میں ـــــ تاتاری اور باشکری جمہوریتوں میں ـــــ ترکستان اور کاکیشیا میں بیشتر علما کو شہری حقوق سے محروم اور شہر بدر کیا گیا۔ ایزوف دہشت خیزی کے ایام میں (۳۸-۱۹۳۷ء) چند بچے کھچے اشخاص کا یا تو صفایا کر دیا گیا یا ان کو دیس نکالا دے دیا گیا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں حکومت کے اسلام دشمن طریقوں میں کچھ ڈھیل دی گئی۔ ۴۳-۱۹۴۲ء میں مفتیوں کی سرکردگی میں بہت سے روحانی انتظامی ادارے بنائے گئے ـــــ یوفا میں یورپین روس اور سائبیریا کے لیے ـــــ تاشقند میں وسطی ایشیا اور قازقستان کے لیے ـــــ آذربائیجان میں ـــــ داغستان میں شمالی کاکیشیا اور داغستان کے لیے ان انتظامیہ اداروں کی تشکیل اور سوویت روس کی مسلم جمہوریتوں میں مختلف مساجد کے دوبارہ افتتاح کے یہ معنی نہ تھے کہ سوویت حکومت نے مسلم مذہب سے ساز کر لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اسلام دشمن پروپیگنڈہ بند نہیں ہوا۔ اس کو تو سچ پوچھیے تیز کر دیا گیا۔ یہ مفتیوں کی سرپرستی میں چلنے والے انتظامی ادارے ـــــ یہ دھوکے کی ٹٹی بطور خاص اسی

---

[1] ونسنٹ مونٹیل کی کتاب "روس میں عیسائیت اور اسلام"

[2] ڈان۔ کراچی۔ ۱۷ رمئی ۱۹۵۲ء

مقصد کے لیے تھی کہ سوویت روس میں مذہبی آزادی کے پرچار کو تقویت دی جاسکے۔ مفتیوں کا یہ عمل جیسا کہ ان کی تقریروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ سوویت روس ہی پروپگنیڈہ کے مطلب کے لیے اور اپنی خارجہ پالیسی کی حمایت کے واسطے استعمال کیا جاتا تھا۔ جب ۱۹۵۳ء میں اسٹالن مرگیا تو یورپین روس اور سائبیریا کے مسلمانوں کے مفتیوں کو مجبور کیا گیا کہ پارٹی کی مرکزی کمیٹی کو ایک تار بھیجیں جس میں انھوں نے کہا کہ مسلم عقیدے کے لوگ "عبقری رہنما" "معلم دنیا" "محبوب باپ اسٹالن" کی موت پر سوگ مناتے ہیں ـــ جی ہاں وہی اسٹالن جس نے کریمیائی، تاتاری، چیچن انگوشی، کراچائی اور ہزاروں علما، افراد اور ہزاروں مسلمانوں کے صفائے اور جلاوطنی کے فرمان صادر کیے تھے۔

"مسلمان کمیونزم کے شکنجے میں" نامی ایک کتاب میں جو قاہرہ سے چھپی۔ عرب اہل قلم اور استاذ سمیع عشوری نے کہا کہ سوویت حکومت نے جو نوآبادیت کے خلاف ایشیا اور افریقہ کی مسلم قوموں کی کش مکش کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ فی الحقیقت سوویت دیش میں ایک نئی قسم کا نوآبادیاتی راج قائم کر لیا۔ عشوری نے اپنے دلائل کی بنا اس مواد پر رکھی تھی جو سوویت مسلم جمہوریتوں میں زبان، ادب، مذہب اور معاشی نظام کے دائروں میں سرکاری پالیسی کے متعلق سوویت ماخذ سے حاصل کیا گیا تھا اس کے جواب میں ریڈیو تاشقند نے قازقستان اور وسطی ایشیا کی روحانی انتظامیہ کے صدر مفتی ضیاءالدین باباخانوف کا ایک بیان نشر کیا جس میں انھوں نے عشوری پر جھوٹ گھڑنے کا الزام لگایا۔

مسلمانوں کے سامنے اپنے مواعظ میں یہ سوویت مفتی کس چیز کی تلقین کرتے ہیں؟ "تاس" نے اس کا جواب بہم پہنچایا ہے۔ یوفا میں رمضان کی مسلم تقریب کے دوران میں یورپین روس اور سائبیریا کے مسلمانوں کی روحانی انتظامیہ کے نائب صدر قاضی محمد طرزبیف نے ایک وعظ میں خروشچیف کے دورۂ فرانس کا خیر مقدم کیا۔ ان ہی خطوط پر مفتی باباخانوف نے افریشیائی ممالک کے استحکام کی سوویت کمیٹی کی پہلی کانفرنس میں ایک تقریر کی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ نکتہ پیش کیا کہ "وسطی ایشیا اور قازقستان کے مسلمان سوویت روس کے اس اعلانیہ سے خود کو وابستہ کرتے ہیں جس کی وضاحت سوویت حکومت کے سربراہ این۔ ایس خروشچیف نے کی ہے"[1]

بے شمار مثالیں اس امر کی دی جاسکتی ہیں کہ کس طرح سوویت حکومت مسلم روحانی انتظامیہ کی سند کو ملک کے

---

[1] کمیونسٹ تازیکستان۔ اسٹالن آباد۔ ۱۲ اکتوبر ۱۹۶۱ء

اندر اور ملک کے باہر اپنے کاموں کی حمایت میں استعمال کرتی ہے[1]۔ محض اسی لیے مفتیوں کو حرکت وعمل کی اجازت دیتی ہے۔ جب مفتی احسان بابا خانوف (موجودہ مفتی ضیاء الدین بابا خانوف کے باپ) کا انتقال ہوا تو اخبارات نے سوویت حکومت کے لیے ان کی خدمات کا حوالہ دیا لیکن اسلام کے بارے میں ان کے کاموں کے متعلق کچھ کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ تھا ہی نہیں۔

مسلم ضابطۂ قانون (شریعت) کو سرکار کی طرف سے منسوخ کیے جانے سے مفتیوں کے کام میں قابل لحاظ حد تک الجھاؤ اور اٹکاؤ پڑے۔ قبل از انقلاب کے روس میں روس کے ذیلی علاقوں خیفہ اور بخارا کے خوانین راج اور بعد کی بخارا اور خوارزم کی عوامی جمہوریتوں میں یہ ضابطۂ قانون رائج تھا جو ۲۴-۱۹۲۰ء کے دور میں پائی جاتی تھیں۔ شریعت کی بقا کے لیے مسلمانوں کی کاوشوں کی ایک مثال اکتوبر ۱۹۱۷ء میں یوفا کی قومی تاتاری کانگرس کا ایک فرمان ہے جس کا منشا شریعت کی اساس میں ایک خود اختیاری تاتاری قانون کی تخلیق کرنا تھا۔ شریعت کو باقی رکھنے کی جدوجہد کی ایک اور مثال سوویت حکام کے خلاف ردعمل میں ملتی ہے جو ۱۸ نومبر ۱۹۱۸ء کو کوکند کی ترکستانی قومی حکومت ختم کر کے فرغانہ سابق ترکستان کرائی میں کیے گئے تھے۔ سوویت حکام نے فی الفور دینی درس گاہیں اور مدرسے بند کر دیے تھے۔ مساجد کی جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔ شریعت کو منسوخ کر دیا تھا اور مذہب دشمن پروپیگنڈے میں لگ گئے تھے۔ اس علاقے کے مسلمان ان کاموں کو اسلام کی بنیادوں پر دست درازی اور مسلم مذہبی روایات کی خلاف ورزی تصور کرتے تھے۔ بالشویک دشمن تحریک جو اس علاقے میں پھولنی پھلنی شروع ہوئی اور اس کے بعد ترکستان کے طول وعرض میں پھیل گئی۔ اصلاً اس لیے تھی کہ سوویت حکومت کے حملوں سے اسلام کا دفاع کیا جائے۔ بڑی حد تک یہی صورت حال ۱۹۲۰ء میں کرغیزستان اور قازقستان کی بابت ہوئی فرغانہ، سمرقند، تاشقند، کرغیزستان اور قازقستان کی مسلم آبادی کی طرف سے اس مزاحمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۲۲ء میں اسلام کے خلاف سوویت دباؤ رک گیا تا وقتیکہ سوویت حکام نے اپنے پاؤں خوب اچھی طرح نہ جما لیے عارضی طور سے شرعی عدالتیں بحال کر دی گئیں۔ اس کے بعد ان کو ایک بار اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا گیا۔ شریعت کے ساتھ سوویت حکومت کا طرز عمل اس رپورٹ سے بطریق احسن منکشف ہوتا ہے جو ۱۲ جولائی ۱۹۲۶ء

---

[1] جارج وان اسٹاکلبرنگ کا مقالہ "اسلام کے لیے تازہ سوویت پالیسی" مطبوعہ "مذہب — سوویت روس میں" — ادارہ تحقیقات برائے سوویت روس۔ میونخ — سلسلہ (۱) نمبر ۵۹۔ جولائی ۱۹۶۰ء صفحہ ۱۹۵- DOCUMENTATION
DOCUMENT FRANCAISE: ARTICLES EN — نمبر 592 — صفحات ۸-۵

کہ اخبار کمیونسٹ تاجکستان میں نکلی تھی۔ اس میں شریعت کو "دنیا کے غیر منصفانہ ترین مجموعہ قوانین کے نام سے یاد کیا گیا تھا۔ ۱۹۲۷-۲۹ء کے دور میں شریعت کے تقریباً سارے ہی ترجمانوں (قاضیوں) کا صفایا کر دیا گیا تھا۔ اس طرح سوویت حکومت اس قابل ہوگئی کہ مسلم عدل کی بنیاد کی حیثیت سے شریعت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کالعدم کر سکے یہی وجہ ہے کہ موجودہ مفتی جو مختلف روحانی انتظامات کے ذمہ دار ہیں شریعت سے کوئی سروکار نہیں رکھتے شریعت کی اساسیات سوویت روس کی ریاستوں کی واحد مسلم دینی درس گاہ سابق مدرسہ میر عرب بخارا میں پڑھائی نہیں جاتیں[1]۔ چلتے چلتے ہم اس نکتہ کو ملحوظ رکھ سکتے ہیں کہ قبل از انقلاب کے عہد میں ولگا کے علاقے، ترکستان اور سوویت روس کے دوسرے مسلم علاقوں میں ایک ہزار سے اوپر مدرسے تھے

اسلام کے خلاف ایک مزید اقدام یہ تھا کہ عربی حروف تہجی کی جگہ ۱۹۲۶-۲۸ء کے دور میں لاطینی حروف تہجی رکھ دیے گئے۔ ان اقدامات کے لیے جو دلائل دیے گئے ان میں سے کچھ یہ تھے کہ عربی حروف تہجی ترکی زبان کے "مخارج تلفظ" سے تال میل کی اہلیت نہیں رکھتے ــــ یہ کہ عربی رسم الخط جدید طباعتی مطالب کے لیے کسی کام کا نہیں ــــ یہ کہ وہ اسکولوں کی تعلیم میں حائل ہوتا ہے ــــ اور یہ کہ عربی رسم خط کو باقی رکھنا جدید کلچر اور مسلم قوموں کے درمیان ایک سنگ راہ ہے بہت عرصہ سے سوویت تصانیف سوویت مسلم جمہوریتوں میں عربی حروف تہجی کی تنسیخ کے دلائل پیش کیے جا رہے ہیں۔ "SOVETSKAYA — ETNOGRAFIYA" کا ایک مقالہ یہ کہتا ہے کہ "اس حقیقت نے ترکستان میں کہ اسلام کو تنزل و انحطاط تک لانے میں خصوصی کردار ادا کیا کہ ہر سال کے ساتھ ان اشخاص کی گنتی گھٹتی گئی جو عربی زبان، مسلم مذہب اور مسجد کی زبان کے جاننے والے تھے"[2]

۱۹۴۰ء میں لاطینی ا-ب-ت کو ہٹا کر ان کی جگہ روسی سیریلی (RUSSIAN-CYRILLIC) حروف تہجی رکھ دیے گئے ــــ ایک اقدام جس نے ایک طرف سوویت مسلمانوں اور ان کی تہذیب کے درمیان اور دوسری طرف پاکستان، عرب ممالک اور ترکی کے درمیان ایک اس سے بھی بڑی خلیج قائم کر دی (باقی)

---

[1] درگی میرنش۔ نمبر (۱) ۱۹۵۵ء صفحات ۵۳-۵۰
[2] "TURKMENEVEDENIE" نمبر ۵۔ ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۷ ز ہبے مرزائی۔ صفحہ ۲۱۵
[3] "SOVETSKAYA ETNOGRAFIA" نمبر (۲)، ۱۹۵۶ء، صفحہ ۹۲

تصحیح شمارہ گزشتہ صفحہ ۵ سطر ۹ میں بہترین کے بجائے "بھتوں کا" چھپ گیا ہے۔ قارئین اسے درست کر لیں۔ (ادارہ)

صفحہ ۸ کا بقیہ

پہلا جملہ: اختارھم اللہ لصحبۃ نبیہ اللہ تعالے نے انہیں اپنے نبی کی رفاقت کے لیے پسند فرمایا۔ اس فقرے پر اگر برادران شیعہ انصاف کے ساتھ غور کرتے تو صحابہ کرام کے بارے میں ان کا عقیدہ اور رویہ وہی ہوتا جو اہل سنت کا ہے اس کے بعد تو معاذ اللہ قدح صحابہ کا ارتکاب تو دور کی چیز ہے اس کا تصور بھی انہیں تکلیف پہنچاتا۔ یہ بات کہ اللہ نے انہیں اپنے نبی کی صحبت کے لیے چن لیا تھا تاریخ کا ایک ایسا واقعہ ہے جسے جھٹلانے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس ناقابل انکار تاریخی واقعے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اللہ تعالےٰ نے اپنے آخری نبی کی صحبت و رفاقت کے لیے نعوذ باللہ گھٹیا قسم کے لوگ منتخب کیے تھے؟ اس انتہائی مہمل اور غیر معقول بات کو مان لینے کے بعد خدا کی حکمت، اس کے انتخاب اور خود نبی کے شرف و امتیاز پر زد نہیں پڑتی؟

حضرت ابن مسعود کے اس فقرے نے یہ حقیقت پوری طرح واضح کر دی ہے کہ صحابہ کی فضیلت جس اساس پر قائم ہے وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحابیت کا شرف ہے یہ اتنا بڑا شرف ہے کہ ایمان و عمل اور تقویٰ و طہارت کا اونچا سے اونچا مقام بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

دوسرا جملہ:۔ ولاقامۃ دینہ اور اللہ نے انہیں اپنے دین کی اقامت کے لیے منتخب فرمایا یعنی صحابہ کرام کو اللہ نے جس دوسرے مقصد سے منتخب کیا وہ اقامت دین ہے یہ دوسرا مقصد پہلے مقصد کی تکمیل ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ رفاقت نبی کے لیے منتخب فرمانے کا مقصد بھی اقامت دین ہی ہے۔ اس دوسرے ٹکڑے نے خود نبی آخری کے مقصد بعثت کو بھی واضح کر دیا ہے حضور کے مقصد بعثت اور صحابہ کے مقصد وجود میں دوئی کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا جس مقصد کے لیے اللہ نے آپکو مبعوث فرمایا تھا اسی کی نصرت کے لیے اس نے صحابہ کو منتخب فرمایا اسی لیے حضور کی وفات کے بعد صحابہ کا کام ختم نہیں ہوا بلکہ زندگی کے آخری لمحے تک جاری رہا۔ ان دو ٹکڑوں نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ اللہ نے جس مقصد کے لیے صحابہ کو منتخب فرمایا تھا اس کا تعلق صرف مدینے سے نہیں مکے سے بھی ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ میں سب سے زیادہ بلند رتبہ وہی لوگ ہیں جن کو صحبت نبوی کا شرف مکہ میں حاصل ہوا تھا معلوم ہوا کہ مکہ میں بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا مقصد وہی تھا جو مدینہ میں تھا۔ مدینہ پہنچ کر ذرہ برابر اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ ان دو جملوں کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ پوری ملت اسلامیہ کا مقصد وجود وہی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اور آپ کی تبعیت میں صحابہ کرام کا تھا۔ ملت اسلامیہ کو صحابہ کرام ہی کے نقش قدم کی پیروی کرنی چاہیے اس لیے کہ وہ زندگی کے آخری لمحے تک ہدایت کے سیدھے رستے پر چلتے رہے اور اپنے نبی کی پیروی کرتے رہے اگر ملت اسلامیہ صحابہ کرام کو چھوڑ کر کسی دوسرے گروہ کی پیروی کرے گی تو وہ ہدایت کے سیدھے رستے سے دور اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے محروم ہو جائے گی۔

تنقید و تبصرہ

تاریخ اسلام حصہ اوّل

از قلم مولانا السید علی نقی النقوی۔ صفحات ۲۸۱ مجلد مع گرد پوش۔
قیمت دو روپیہ۔ ناشر:۔ امامیہ مشن لکھنؤ

آنریری سکریٹری امامیہ مشن لکھنؤ نے اس کتاب کا جو تعارف لکھا ہے اس میں "ایک صحیح معنی میں اسلامی تاریخ کی ضرورت" کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے لکھا کہ ملت جعفریہ کے افراد شروع سے سیاسی طاقتوں کے ظلم و جور کا نشانہ بنتے رہے اور تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئیں وہ عموماً اسی طبقہ نے لکھیں جو حکومتوں کے زیر سایہ پھل پھول رہا تھا لہٰذا تاریخ اسلامی اپنی اصلی شکل میں سامنے نہ آسکی ——— ادھر سنیوں اور شیعوں میں کچھ نئے محققین اس طرح کے پیدا ہو رہے ہیں جو پورے ذخیرۂ تاریخ اسلامی کو غیر مستند ٹھہرا رہے ہیں۔ ایک سنی محقق اٹھتا ہے اور دعویٰ کرتا ہے کہ تاریخ کی کتابیں شیعی اور سبائی روایات سے پر ہیں اس لیے ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرا شیعی محقق کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ سنیوں نے اپنی حکومتوں کے بل پر تاریخ اسلامی کو مسخ کر دیا ہے اور اس کی اصلی شکل آج تک دنیا نے دیکھی ہی نہیں اور پھر لطف یہ ہے کہ دونوں ہی اپنی تحقیق انیق کی بنیاد جن تاریخی روایات پر رکھتے ہیں وہ یا تو اسی ذخیرۂ تاریخ سے لی ہوئی ہوتی ہیں جسے وہ نامستند ٹھہرا چکے ہیں یا پھر مستشرقین کے مزعومات کو سند ٹھہرا لیتے ہیں، دونوں میں سے کوئی نہیں سوچتا کہ غیر مسلمین کی نظروں سے جب ان کے دعاوی گزریں گے تو وہ تاریخ اسلامی کے بارے میں کیا خیال قائم کریں گے۔ میرا دونوں کو یہ مشورہ ہے کہ وہ اپنے طرز عمل پر نظر ثانی کریں۔

زیر تبصرہ کتاب پڑھنے کے بعد جو پس منظر اور اس کی جو بنیاد سامنے آتی ہے وہ تاریخ کی مخلصانہ تحقیق کے بجائے شیعی عقیدہ و خیال سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ سوء ظن اور ان سے نفرت ہے بالخصوص خوامعیہ سے عداوت اور شیخین کی تنقیص اس کتاب کی نمایاں چیز ہے۔ اس بنیاد پر جو تاریخ مرتب ہوگی اسے صرف شیعی حلقوں میں حسن قبول حاصل ہوگا اور شیعی "علم کلام" اور "فقہ جعفری" پر ایک "شیعی تاریخ اسلام" کا اضافہ ہوگا اور بس۔

زیر تبصرہ کتاب میں متعدد مباحث اور پیراگراف ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر مصنف کے علم اور اسلام کی آفاقیت کے بارے میں ان کے صحیح نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے:

اس عالم ظلمات میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا کے لیے مشعل نور لیکر کھڑے ہوئے آپ نے اپنے پیغام میں شروع ہی سے جب خطاب کیا تو ایہا العرب (اے قوم عرب) نہیں کہا بلکہ ایہا الناس کہا ای انسانو بلکہ پہلی ہی وحی میں خالق نے ان کی زبانی جو احسان یاد دلایا اس میں عرب کا نام نہیں لیا بلکہ انسان کا نام لیا .... اس طرح ان کے پیغام کا پرچم شروع سے قبائلی اور قومی حد بندیوں سے آزاد ہو کر آفاقی سطح پر فضائے انسانیت میں بلند ہوا۔　　　　(صفحہ ۹۸)

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

یہ ایک پورا تمدنی انقلاب، معاشرتی انقلاب، سیاسی انقلاب اور معاشی انقلاب تھا جو ایک مختصر جملہ لا الٰہ الا اللہ میں مضمر تھا جس کی طرف رسول دنیا کو دعوت دے رہے تھے اور عرب، سادہ لوح جاہل یعنی وہی دور وحشت سے گزرنے والا گروہ تھا تو وہ اس جملہ کو بھی ایک سادہ سا جملہ سمجھ کے برداشت کر لیتا مگر عرب باوجود اپنی جہالت کے بڑا نکتہ رس تھا کہ وہ اس سادہ سے جملے کے مضمرات کو بڑی حد تک پہلی ہی آواز پر سمجھ گیا اس لیے وہ اپنے معبودان باطل کے تحفظ کے لیے جو فقط سونے چاندی، پتھر کے بت نہ تھے بلکہ اپنے تشخص و اقتدار، اپنے اوہام و تصورات اور اپنے رسوم و عادات کے بھی اصنام تھے، کھڑا ہو گیا اور ایک اکیلے پیغمبر خدا کے سامنے پوری قوم صف بستہ ہو کر آ گئی۔ ص ۹۹-۱۰۰

کاش مصنف اسی انداز اور اسی آفاقی نقطہ نظر کے مطابق پوری کتاب مرتب کرتے مگر افسوس کہ ایسا نہیں ہے۔ اس کتاب میں جو باتیں قابل تنقید ہیں، ان کی فہرست لمبی ہے محض مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر چند باتوں کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔

صفحہ ۹۳ پر لکھا گیا ہے کہ "برادران یوسف ایمان و اطاعت کے جوہر سے بالکل خالی تھے اور وہ جناب یعقوبؑ کی نبوت پر قطعاً ایمان نہ رکھتے تھے" برادران یوسف پر مصنف کا یہ الزام قطعاً غلط ہے جن آیتوں سے انھوں نے استدلال کیا ہے اس کا انکار نبوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن ہی کی آیتیں بتاتی ہیں کہ وہ مومن تھے لیکن تفصیل کی گنجائش نہیں۔

"بعثت خاتم المرسلین" کی فصل میں مصنف نے لکھا ہے کہ "شروع ہی سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی رسالت و نبوت کا علم تھا اور آپ گویا اس بات کے منتظر تھے کہ کب اللہ کی طرف سے دعویٰ رسالت کا حکم آتا ہے جیسے ہی حکم آیا آپ دعویٰ رسالت پر مامور ہو گئے اسی کا نام بعثت ہے۔ آپ عملی طور پر بدو شعوری سے رسالت و نبوت کی زندگی بسر کر رہے تھے، چالیس سال کے بعد قولی طور پر بھی دعوائے رسالت کا حکم آ گیا یہی وجہ ہے کہ پہلی وحی آنے کے وقت آپ پر کوئی خوف یا دہشت طاری نہیں ہوئی، نہ آپ کو اس وحی کے بارے میں کسی کی تصدیق کی ضرورت پیش آئی جو لوگ اس طرح کی باتیں کہتے ہیں وہ اسلام کے مخالف ہیں تاریخ میں اس طرح کی جو روایتیں نظر آتی ہیں وہ اسی طرح کے مخالفین اسلام کی کارستانی ہے جو مسلمانوں کے لباس میں ان کے اندر گھل مل گئے تھے" مصنف کی ان باتوں کا جواب تو طول عمل ہے میں صرف سورہ شوریٰ کی ایک آیت ان کے سامنے رکھتا ہوں فرمایا گیا ہے:- وَكَذَٰلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا مِّنْ أَمْرِنَا ۚ مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ

وَلَا الْاِیْمَانُ وَلٰکِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ وَاِنَّکَ لَتَهْدِیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵۲)

یہ آیت بتاتی ہے کہ وحی، کتاب اور نبوت و رسالت تو بڑی چیزیں ہیں حضور قبل از نبوت ایمان تک کی تفصیلات سے ناواقف تھے اور یہ بات قرآن کے وحی الٰہی ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے۔ یہ آیت یہ بھی بتاتی ہے کہ ایک ایسے شخص کے پاس غار کی تنہائی میں اچانک کوئی فرشتہ آجائے اور خدا کی طرف سے پیغام رسالت سنائے تو طبعی خوف و دہشت کا پیدا ہو جانا ذرہ برابر بھی بعید از قیاس نہیں۔ اسی کی تائید اگر تاریخ نہیں بلکہ صحیح حدیث سے ہو رہی ہو تو اسے اسلام کے خلاف کہنا جرأت بے جا اور ناواقفیت کے سوا کیا ہے۔ حاشیہ پر ایک عنوان "تقیہ پر عمل" نظر سے گزرا۔ اس عنوان کے تحت یہ بات لکھی گئی ہے کہ آپ نے تین سال تک اسلام کی دعوت مخفی طور پر دی تھی، سمجھ میں نہ آیا کہ اس چیز کا تقیہ سے کیا تعلق ہے؟ کیا ہر مخفی اور رازدارانہ کلام کو تقیہ کہتے ہیں؟ اگر کوئی شخص اپنے مخصوص دوستوں کو مخفی طور پر کوئی دعوت دے تو یہ تقیہ پر عمل ہوگا؟ کیا حضرات شیعہ کے یہاں تقیہ کی یہی حقیقت ہے؟ اصطلاحی حقیقت تو الگ رہی یہ تو اس لفظ کی لغوی حقیقت بھی نہیں ہے۔ یہ تو تاریخ ہی نہیں لغت تک کو اپنے عقیدے کے گرد گردش دینے کی بات ہے ——— خواجہ ابوطالب کے ایمان و عدم ایمان کی بحث خود اہل سنت والجماعت کے اندر موجود ہے لیکن مصنف نے اس بحث کو جس انداز میں لکھا ہے اسے پڑھ کر سخت افسوس ہوتا ہے اس بحث پر مصنف نے متعدد جگہ گفتگو کی ہے اور انہیں خود یاد نہیں رہا کہ وہ پہلے کیا لکھ آئے ہیں اور اب کیا لکھ رہے ہیں۔ عدم ایمان والی احادیث کو موضوع کہنا اور اسے صحیح ماننے والوں کو وضاع، کذاب اور مفتری کہنا تبرائی ذہنیت کا بڑا گھٹیا نمونہ ہے۔ جن چیزوں کے اشارات اور تصریحات خود قرآن میں موجود ہیں انہیں بھی مصنف نے مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً سفر ہجرت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا حضور کے ساتھ ہونا مدح و ثنا کے انداز میں قرآن کے اندر موجود ہے لیکن یہاں بھی مصنف ان کی تنقیص سے چوکے نہیں ہیں اور ایسی باتیں لکھ گئے ہیں جنہیں تاریخیت چھو بھی نہیں گئی ہے انھوں نے لکھا ہے کہ اس سفر میں حضرت ابوبکر کی ہمراہی محض اتفاقیہ تھی۔ مکہ سے باہر نکلتے وقت اتفاقاً حضرت ابوبکر سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے آپ سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو لیکن آپ نے رازداری کے خیال سے اس وقت کے ارادے کی خبر نہیں دی اور کہا کہ بس تم میرے ساتھ چلے چلو۔ شاید تاریخ اسلامی کی یہی وہ اصلی شکل ہے جس کے دیدار سے دنیا اب تک محروم چلی آ رہی تھی اور اب امامیہ مشن لکھنؤ کی کوششوں سے اسے دیکھنا نصیب ہو رہا ہے اگر اس تاریخ کے باقی حصے بھی اسی طرح لکھے گئے تو کسی واقف حال کے لیے اسے صبر کے ساتھ پڑھنا بھی مشکل ہوگا۔ یہ حصہ بھی کچھ کم صبر آزما نہیں ہے۔ (ع۔ق)

ماہنامہ

زندگی رامپور

جلد ۲۹
شمارہ ۴

جمادی الاولیٰ سنہ ۱۳۸۲ھ
اکتوبر سنہ ۱۹۶۲ء

مدیر سید احمد عروج قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر "زندگی" رامپور۔ یوپی

● زر سالانہ :۔ صہ ۔ ششماہی :۔ تین روپیہ ۔ فی پرچہ :۔ پچاس نئے پیسے
ممالک غیر سے :۔ دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

مالک :۔ جماعت اسلامی ہند ۔ اڈیٹر سید احمد عروج قادری ۔ پرنٹر پبلشر :۔ احمد حسن ۔ مطبع :۔ ناظم پریس بازار نصراللہ خاں رامپور
مقام اشاعت :۔ دفتر زندگی دکانتی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی

ہندوستان اس لحاظ سے یقیناً ایک خوش قسمت ملک ہے کہ دوسرے بہت سے ملکوں کے بخلاف اسے جنگ و خوں ریزی کے بغیر ہی آزادی نصیب ہوگئی۔ لیکن اسی کے ساتھ وہ اس لحاظ سے بدقسمت بھی ہے کہ آزادی کے پندرہ سال بعد بھی اس کو ابھی تک اپنے اندرونی خلفشار سے نجات حاصل نہیں ہوسکی ہے، اور آئے دن یہاں زبان، کلچر اور مذہب کے نام پر طرح طرح کے فسادات بھڑکتے اور فتنے اٹھتے رہتے ہیں

ہندوستان کے آزاد ہوتے ہی وحشت و بربریت کا جو آتش فشاں پھٹ پڑا تھا، اور اس کی وجہ سے ملک کو جو بھاری تباہی و بربادی پیش آئی وہ ایک نہایت عبرت انگیز داستان ہے۔ اس تکلیف دہ لیکن پرانی اور گذری ہوئی داستان کا تذکرہ اپنے اندر نہ کوئی خوش گواری رکھتا ہے اور نہ کوئی افادیت لیکن اس بات پر حیرت اور افسوس کیے بغیر نہیں رہا جاسکتا کہ ایسے ہولناک طوفان سے گزرنے کے بعد بھی، جس میں ہزاروں بے گناہ مارے گئے اور لاکھوں انسان برباد ہوئے اور جو بالآخر گاندھی جی جیسی اہم ہستی کی قیمتی جان لے کر ہی فرو ہوا، باشندگانِ ملک کے دلوں میں امن و اماں کی صحیح قدر و قیمت کا احساس پیدا نہیں ہوسکا۔ گاندھی جی کے خونِ ناحق نے یہ اثر تو ضرور دکھلایا کہ فرقہ پرستی کا امنڈتا ہوا سیلاب دفعۃً تھم گیا اور ملک میں امن و سکون کی فضا پیدا ہوگئی، لیکن جیسا کہ بعد کے حالات نے واضح کر دیا یہ کوئی ذہنوں کی بنیادی تبدیلی نہ تھی، بلکہ محض ایک عارضی اثر تھا جسے اس حادثے نے پیدا کر دیا تھا، اور جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ماند پڑتا چلا گیا۔ اور یہ بات کچھ غیر قدرتی بھی نہ تھی۔ کیونکہ کوئی حادثہ، خواہ وہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، ذہنوں میں ہمیشہ تازہ نہیں رہ سکتا، اور نہ اس کے اثرات ہمیشہ قائم رہ سکتے ہیں ادھر فرقہ پرستی کا حال یہ ہے کہ اس موذی بیماری کی جڑیں ہندوستانی معاشرہ کی انتہائی گہرائیوں میں اتری ہوئی

ہوئی ہیں۔ اس لیے تھوڑا ہی وقت گزرنے پایا تھا کہ اس نے پھر سر اٹھانا شروع کر دیا اور اس کے اقبال کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اب بھی اپنی راہ اس نے رکاوٹوں سے خالی ہی پائی۔ کیونکہ اور تو اور حکومت کے ذمہ دار تک بھی اس کی طرف سے بہت کچھ غافل اور بے فکر ہو چلے تھے ان میں سے کچھ تو اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ گاندھی جی کے ساتھ فرقہ پرستی کا بھی جنازہ اٹھ چکا ہے' اور کچھ اس خیال میں تھے کہ فرقہ پرستی اصلاً محض ایک معاشی مسئلہ ہے' اس لیے ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی جو اسکیمیں زیر عمل لائی جارہی ہیں' ان کے نتیجے میں اس کا از خود خاتمہ ہو جائے گا' اور کچھ کا حال تو غالباً یہ ہو چکا تھا کہ ملک کے بدلے ہوئے حالات میں انھوں نے اس فرقہ پرستی سے ایک حد تک ساز بھی کر لی تھی۔ چنانچہ اس کے بعض کھلے ہوئے ظالمانہ مظاہر کے بارے میں ان کا فرمانا یہ تھا کہ یہ بھی دراصل نیشلزم ہی کی قدرے جارحانہ شکلیں ہیں' اس لیے یہ اگر پسندیدہ نہیں تو کچھ زیادہ قابل مذمت بھی نہیں ہیں۔

غرض مختلف اسباب کے تحت فرقہ پرستی کا زور پھر بڑھنے لگا جس کے نتیجے میں فسادات کی رکی ہوئی لہر پھر حرکت میں آگئی اور رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک پہنچی کہ فروری ۱۹۶۱ء میں جبل پور جیسا ہولناک فساد ظہور میں آیا جس نے گاندھی جی کے واقعۂ قتل کے بعد ایک بار پھر پورے ہندستان کے ضمیر کو جھنجھوڑ ڈالا۔ یہاں تک کہ ذمہ داران حکومت کے اندر بھی اپنی غفلتوں اور کوتاہیوں کا اگر نہیں تو حالات کی نزاکتوں کا احساس بہرحال جاگ اٹھا' اور وہ اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ سوچنے پر مجبور ہو گئے۔ چنانچہ فرقہ پرستی کے خلاف آج جو کچھ بھی آوازیں اٹھ رہی اور سرگرمیاں انجام پا رہی ہیں' عملاً ان کا فوری محرک یہ حادثۂ جبل پور ہی تھا۔ یہ حادثہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے اتنا شدید اور ہولناک تھا کہ جب مدھیہ پردیش کے اس وقت کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر کاٹجو شہر جبل پور کے معائنہ کے لیے تشریف لے گئے تو وہ بھی بے ساختہ کہہ اٹھے کہ "شہر شمشان بھومی دکھائی پڑ رہا ہے"۔ اور وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی اس بات کا اعتراف کیا کہ :— "جبل پور میں جو واقعات پیش آئے ہیں وہ انتہائی وحشت ناک ہیں۔ جو کچھ ہوا وہ یکایک' فوری طور پر اور خود بخود نہیں ہوا' بلکہ یہ کارروائی ایک منظم اور سوچے سمجھے منصوبے کا نتیجہ تھی۔ ورنہ یہ فسادات اتنے بڑے پیمانے پر نہیں ہو سکتا تھا"۔ اسی طرح کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی اپنی ایک قرارداد میں اس حادثے پر اظہار تشویش کرتے ہوئے قوم کو متنبہ کیا کہ اس قسم کے فسادات بیماری کی علامت ہیں۔ قوم کو پوری طاقت سے اس کا علاج کرنا چاہیے' کیونکہ اگر ایسی بیماری

کا علاج نہیں کیا جا سکا تو ملکی اتحاد، آزادی اور تعمیر نو کا کام انجام نہیں دیا جا سکتا۔ کچھ اسی طرح کے بیانات ملک کی تقریباً سبھی جماعتوں اور نمایاں شخصیتوں کی طرف سے شائع ہوئے اور ایک بار پھر پورا ملک فرقہ پرستی کے خلاف ہنگامۂ نفرت سے گونج اٹھا۔ لیکن جہاں تک اس کے عملی اثر اور نتیجے کا تعلق ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ یہ ہر طرف سے دتکاری جانے والی فرقہ پرستی عام نگاہوں سے کچھ دیر کے لیے اوجھل ہو رہی، بلکہ کہیں کہیں تو اس نے یہ تماشا بھی کیا کہ خود اپنے کارندوں کو اس ہنگامۂ نفرت کے بپا کرنے والوں میں شامل کر دیا، اور یہ لوگ دوسروں سے بھی زیادہ زور و قوت کے ساتھ اس کے خلاف نعرے لگانے لگے پھر جوں ہی چیخ و پکار کا یہ طوفان ٹھیرا، وہ باہر نکل آئی اور حسب سابق اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ چنانچہ جبل پور کے واقعہ پر ابھی چند ہی ماہ گذرے تھے کہ اس نے علی گڈھ، میرٹھ اور چندوسی وغیرہ کئی مقامات پر قتل و غارتگری کا بازار گرم کر دیا جس میں سرکاری اندازے کے مطابق بھی ۲۵ آدمی قتل کر دیے گئے اور لاکھوں کی جائداد تباہ کر کے رکھ دی گئی، اور اگر غیر سرکاری اندازوں کو دیکھا جائے تو انسانی جان، اور مال کی تباہیاں اس سے کہیں زیادہ تھیں۔ اور وہ تو کہیے خیریت یہ ہوگئی کہ اس موقع پر صوبے کے وزیر اعلیٰ اور وزیر داخلہ نے حالات کو قابو میں لانے کی جلد اور موثر کوشش، کی ورنہ فرقہ پرستی کے تیور تو کچھ ایسے تھے کہ شاید پورے صوبے میں ۱۹۴۷ء کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اور یہ صورت حال کچھ یوپی ہی تک محدود نہ تھی، بلکہ جہاں بھی موقع ملا فرقہ پرستی کے اس خونی دیوتا نے انسانی لاشوں کے تڑپانے اور آبادیاں پھونک کر رکھ دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کچھول ہاٹ، مالدہ اور کوچ بہار وغیرہ کے حالیہ سنگین فسادات اس کی واضح مثالیں ہیں۔

فسادات کے اس زور دار تسلسل کو دیکھتے ہوئے یہ کچھ عجیب بات نہ ہوگی۔ اگر وزیر اعظم ہند پنڈت نہرو اور وزیر داخلہ ہند لال بہادر شاستری، جن پر ملک کے امن و امان کی خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے، حد درجہ پریشان اور متفکر ہوں۔ چنانچہ یہ حضرات کئی بار کچھ ایسے احساسات کا اظہار کر بھی چکے ہیں جن میں ان حالات سے ان کی پریشانی ہی نہیں بلکہ ایک گونہ مایوسی اور دل شکستگی بھی صاف موجود دکھائی دیتی ہے۔ جس وقت علی گڈھ اور میرٹھ وغیرہ میں فسادات ہوئے تھے تو اسی زمانے میں بہار اور ملک کے بعض اور حصوں میں سیلاب بھی آیا ہوا تھا۔ پنڈت نہرو نے اپنی ایک تقریر میں ان واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا:۔

یہ سب باتیں کیوں ہو رہی ہیں جب کہ ہم اپنے کام خلوص کے ساتھ اور ٹھیک طور سے انجام دیے

رہے ہیں؟ ہم سے آخر کیا غلطی ہوتی ہے ؟ ایسا کیوں ہو رہا ہے کہ کچھ چیزیں دفعتہً نمودار ہو کر ہمیں ترقی کی راہ سے کئی قدم پیچھے ڈھکیل دیا کرتی ہیں۔"

اور پھر خود ان سوالات کا جواب اس طرح دیا۔

غالباً ہم ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے۔ اس لیے گیتا کی تعلیم کے مطابق ہمیں اپنا فرض انجام دینا چاہیے۔ اور نتیجہ خدا کے حوالے کر دینا چاہیے۔"

ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹ ہے کہ پنڈت نہرو جس وقت یہ تقریر کر رہے تھے، جذبات سے گلوگیر تھے، اور ان کی آنکھیں بھی پُر نم تھیں۔

اسی طرح انہی فسادات کے موقع پر لال بہادر شاستری نے بھی فرقہ پرست جماعتوں کو مخاطب کرتے ہو فرمایا تھا کہ :۔

"وقت آگیا ہے کہ ہم یہ طے کریں کہ ہندوستان میں اقلیتوں کو ہم باقی رہنے دینا چاہتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہم یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ان کو باقی رکھنا ہے تو یقیناً ان کے ساتھ مساویانہ سلوک ہونا چاہیے۔"

ذمہ داران حکومت کی یہ تقریریں بجائے خود ملک میں فرقہ پرستی کے غیر معمولی زور و اثر کی نہایت واضح اور انتہائی معتبر شہادتیں ہیں۔ غور تو کیجیے کیا یہ کوئی معمولی بات ہے کہ پنڈت نہرو خدا کے منکر ہوتے ہوئے اس موقع پر خدا کا نام لینے پر مجبور ہو جائیں، اور شاستری جی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے گویا خود فرقہ پرستوں ہی کی دہائی دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ پائیں اور جیسے دستور کے فیصلوں کی بالاتری بھی اس معاملہ میں ان کی مدد کرنے سے انکار کر رہی ہو!

یہ تو تھا ملک میں پھیلی ہوئی فرقہ پرستی کا حال۔ اب ایک اچٹتی نظر اس خلفشار پر بھی ڈال لیجیے جسے لسانی اختلافات نے یہاں برپا کر رکھا ہے، اور جس کی بنا پر بھی نہایت خوں ریز واقعات ظہور میں آچکے ہیں۔

آزادی سے پہلے کانگریس زبان کی بنا پر صوبوں کی تشکیل جدید کا اصول باضابطہ تسلیم کر چکی تھی، اس بات کا بھی اعلان کر چکی تھی کہ اسے جوں ہی اقتدار حاصل ہوگا، اپنے اس اصول کے مطابق سب سے پہلے آندھرا اور کرناٹک کے علیحدہ علیحدہ صوبے قائم کرے گی۔ چنانچہ جب ملک آزاد ہو گیا، اور گاندھی جی کے واقعۂ قتل کے بعد فرقہ وارانہ ہنگامے بھی کچھ سرد پڑے تو سب سے پہلا اہم مطالبہ جو کانگریس کو سننے

سے کیا گیا یعنی صوبہ آندھرا کے قیام کا مطالبہ تھا لیکن اس مدت میں لسانی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل کے بارے میں کانگریس کا نقطۂ نظر بہت کچھ بدل چکا تھا، اور اب وہ اسے ملکی اتحاد و استحکام کے حق میں یک گونہ مضر سمجھنے لگی تھی۔ اس کے علاوہ تقسیم وغیرہ کے نتیجے میں ملک کو جو پیچیدہ مسائل درپیش تھے ان کے لحاظ سے بھی وہ ابھی اس مسئلے کا اٹھایا جانا بے وقت اور خلاف مصلحت سمجھتی تھی مگر مطالبہ چونکہ بڑے زور و قوت سے کیا گیا تھا، اور روز بروز سخت سے سخت ہوتا جا رہا تھا، یہاں تک کہ رومولو کے مشہور مرن برت اور پھر اسی سلسلے میں ان کے انتقال کر جانے کے بعد حکومت کے خلاف شدید ہنگامے بھی شروع ہو گئے، اور حالات بد سے بدتر ہونے لگے، اس لیے چار و ناچار اسے اس مطالبے کے آگے جھکنا ہی پڑا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں آندھرا کے علیحدہ صوبے کے قیام کا اعلان کر دیا گیا اور ۱۹۵۳ء میں وہ عملاً وجود میں بھی آگیا۔

قدرتی طور پر اس واقعہ سے دوسرے علاقوں کی تقسیم اور لسانی صوبوں کی تشکیل کی عمومی تحریک کو بڑی قوت حاصل ہوئی، جس کو حکومت نے صوبوں کی از سر نو تشکیل کے لیے ایک کمیشن مقرر کر کے قابو میں لانے کی کوشش کی، اور اس میں شبہہ نہیں کہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئی مگر چونکہ اس کمیشن نے، حکومت کے حسب ہدایت، صوبوں کی تشکیل جدید صرف لسانی بنیادوں پر نہیں کی تھی بلکہ دوسرے مصالح اور عوامل کو بھی سامنے رکھا تھا، اس لیے بعض صوبے ایسے بھی بن گئے جن میں ایک سے زیادہ زبانیں بولنے والے افراد، کثیر تعداد میں آباد تھے۔ ان میں سب سے نمایاں بمبئی کا دو لسانی صوبہ تھا جو مرہٹی اور گجراتی دونوں زبانوں کے علاقوں پر مشتمل تھا، ظاہر ہے کہ لسانی اختلاف اور تعصب جب اور کہیں نچلا نہ بیٹھ سکا تھا تو یہاں کیسے خاموش رہ سکتا تھا۔ چنانچہ دونوں زبانوں کے بولنے والوں نے اپنی اپنی زبانوں کے الگ الگ صوبے بنائے جانے کا شدید مطالبہ کیا، اور ایسی صورت حال پیدا کر دی جس کے سامنے کانگریس گورنمنٹ کو ایک بار پھر پسپائی اختیار کرنی پڑی، اور ۱۹۶۰ء میں اس صوبے کو تقسیم کر کے مہاراشٹرا اور گجرات دو الگ الگ صوبے بنا دیے گئے۔

یہ تو وہ مطالبات تھے جو تسلیم کیے جا چکے ہیں۔ اطمینان کا سانس لیا جا سکتا تھا اگر ان کے بعد زبانوں کی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل اور علاقوں کی تقسیم کا مسئلہ حل ہو گیا ہوتا لیکن صورت واقعہ یہ ہے کہ ابھی یہ مسئلہ اپنی پوری قوت کے ساتھ زندہ ہے، اور اس نے حکومت کے لیے کئی ایک دردِ سر پیدا کر رکھے ہیں۔ ایک طرف تو کچھ علاقوں کے لیے مہاراشٹرا اور میسور میں تنازعہ چل رہا ہے، جسے حل کرنے کے لیے دونوں حکومتوں کے نمائندے کئی بار جمع ہو چکے ہیں، لیکن ابھی تک تصفیہ کی کوئی صورت نکل نہیں سکی ہے۔ دوسری طرف خود مہاراشٹر کے

کچھ علاقوں کو اس سے الگ کر کے دو ریہ نام کے ایک الگ صوبے کے قیام کی تحریک رہ رہ کر سر اٹھاتی رہتی ہے تیسری طرف پنجابی صوبے کے قیام کا ہنگامہ خیز مطالبہ ہے، جس کے لیے پچھلے دنوں کئی ایک مورچے بھی لگ چکے ہیں اور جس کی وجہ سے بارہا صوبے کا امن وامان بھی سخت خطرات سے دوچار ہو چکا ہے اگرچہ اس وقت سکھ لیڈروں کی باہمی جنگ قیادت کے نتیجے میں یہ مسئلہ کچھ پس پشت پڑ گیا ہے، لیکن اس سے یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ اب یہ مسئلہ ختم ہونے جارہا ہے۔ کیونکہ آپس میں لڑنے والے دونوں فریق پنجابی صوبے کے مطالبے پر بالکل متفق ہیں۔ اس بارے میں ان کے درمیان اگر کوئی اختلاف ہے بھی تو اس کا تعلق صرف طریق کار سے ہے۔

پھر اسی مسئلے سے متعلق ایک اور مسئلہ ہریانہ علاقہ کا بھی ہے۔ جو یوں بجائے خود تو کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن پنجابی صوبے کے مسئلے سے اس کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ اس کو جب بھی کسی طرح حل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو کم از کم اس وقت وہ ایک اہم اور پیچیدہ مسئلہ کی شکل ضرور اختیار کرلے گا۔

اسی طرح جو لسانی کش مکش آسام میں پائی جاتی ہے، وہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتی۔ وہاں پچھلے دنوں بنگالی اور آسامی زبانوں کے نام پر جو خونی فسادات ہو چکے ہیں ان کی تلخ یاد ابھی ذہنوں سے فراموش نہ ہوئی ہوگی اگرچہ اس وقت بظاہر وہاں امن ہے، لیکن کشیدگی کی بنیاد بہرحال موجود ہے، اور اس کی موجودگی میں یہ خیال کرنا نری خوش فہمی ہوگی کہ اب وہاں کے امن وامان کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔

لسانی اختلافات کے بعد نسلی اور علاقائی اختلافات کا جائزہ لیجیے۔ ان اختلافات کی شدت اور نوعیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ یہاں ڈراوڈ منترا کاژگم جیسی پارٹی موجود ہے جو ہندستان سے علیحدہ اپنی ایک آزاد ریاست "ڈراوڑستان" کے نام سے قائم کرنا چاہتی ہے اور جسے ہندستان کے دستور اور جھنڈے کو علانیہ، پولس کی نگاہوں کے سامنے آگ لگانے میں بھی کوئی باک نہیں ہے۔ ایسی پارٹی بھی نہ صرف یہ کہ یہاں موجود ہے، بلکہ وہ اپنا اثر اتنا بڑھا چکی ہے کہ گزشتہ الیکشن میں اس کو خاصی نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور ابھی حال میں تروچن گوڈ سے کے ضمنی الیکشن میں اس کے ایک غیر معروف امیدوار نے کانگریس کے ایک پرانے اور مشہور لیڈر کو ہرا کر یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اس کے اثر کو توڑنے کے لیے جو کارروائیاں اس وقت تک کی گئی ہیں وہ زیادہ تر ناکام ہی رہی ہیں۔

ٹھیک یہی پریشان کن حال آسام کے ناگا علاقے میں بھی موجود ہے۔ اگرچہ حکومت نے مصلحت وقت کا

لحاظ کرتے ہوئے ناگالینڈ کے نام سے ایک علیحدہ صوبہ قائم کرنا طے کرلیا ہے اور اس کے مطابق پارلیمنٹ کے حالیہ اجلاس میں دستور میں ترمیم کا بل بھی منظور ہو چکا ہے، لیکن انتہا پسند ناگا لیڈر اس سے مطمئن ہوتے نظر نہیں آتے، اور وہ اپنی آزاد ریاست کے مطالبے پر بدستور جمے ہوئے ہیں۔ بلکہ ان کے مشہور لیڈر فیزو نے تو لندن سے یہ بیان دیا ہے کہ "ہندستان کی پارلیمنٹ کو ناگالینڈ کی اس طرح بات کرنے کا کوئی حق ہی نہیں ہے کہ وہ گویا اس کا اپنا ملک ہے۔ وہ تو سرے سے ہندستانی علاقہ ہی نہیں ہے۔ ناگالینڈ ہندستان کا جزو نہیں بن سکتا۔ ہم آزاد قوم کی طرح باقی رہنا چاہتے ہیں۔ ہم ہندستانی نہیں ہیں۔" (ٹائمز آف انڈیا ۳۰ اگست ۶۲ء)

جنوب اور مشرق میں اگر نسلی اختلاف یہ رنگ دکھا رہا ہے تو شمال میں علاقائی عصبیت کام کر رہی ہے۔ چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ دنوں پہلے یوپی میں ایک تحریک زور شور کے ساتھ اٹھ چکی ہے اور وہ یہ کہ اس کے مغربی علاقوں کو بقیہ صوبے سے علیحدہ کر کے اور ان کے ساتھ قریبی صوبوں کے کچھ علاقوں کو شامل کر کے ایک علیحدہ ریاست بنا دی جائے۔ چنانچہ اس سلسلے میں مغربی یوپی کے ممبران اسمبلی کی ایک خاصی بڑی تعداد کی طرف سے ریاستی تنظیم جدید کمیشن کے سامنے ایک باقاعدہ میمورنڈم بھی پیش کیا گیا تھا جس میں اس مطالبے کی تائید میں تین باتیں خاص طور سے پیش کی گئی تھیں۔ ایک تو یہ کہ طبعی اور جغرافیائی حیثیت سے اتر پردیش کے پہاڑی اور مرتفع علاقوں اور وادی گنگا میں بہت ہی تھوڑا اشتراک پایا جاتا ہے۔ دوسری یہ کہ ریاست کی موجودہ وسعت بے قابو قسم کی ہے جس کا نتیجہ نظم و نسق کی خرابی کی صورت میں برآمد ہو رہا ہے۔ اور تیسری یہ کہ صوبے کی خاص مالیات جو ریاست کے نصف مغربی علاقوں سے حاصل ہوتی ہے اس کا بیشتر حصہ ریاست کے نصف مشرقی علاقوں کی ترقی پر صرف کیا جا رہا ہے اور مغربی علاقے نظر انداز کیے جا رہے ہیں۔ کمیشن نے اپنی رپورٹ میں اس مطالبے اور مسئلہ پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اگرچہ اس کے ارکان کی اکثریت نے اس مطالبے کو رد کر دیا ہے، لیکن ایک ممتاز رکن کے۔ ایم۔ پانیکر نے اس کی پر زور تائید و حمایت بھی کی ہے اور اپنے ایک اختلافی نوٹ کے ذریعہ اس کے حق میں متعدد دلائل پیش کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ یوپی اپنی آبادی کے لحاظ سے ہندوستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے، یعنی تقریباً آندھرا۔ تلنگانہ۔ کرناٹک اور کیرلا کی مجموعی آبادی کے برابر۔ اور پنجاب راجستھان اور مدھیہ پردیش بشمول مہاکوشل، وندھیا پردیش، مدھیہ بھارت اور بھوپال کی مجموعی آبادی سے بھی کچھ زیادہ۔ حالانکہ فیڈریشن کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے یہ ضروری ہے

انسان کا اخلاقی وجود

مکارمِ اخلاق کی تکمیل

قسط (۷)

(سید احمد قادری)

اولاد کے ساتھ حسن سلوک

اولاد پر ماں باپ کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے واجب کیے ہیں اور ان کے ساتھ احسان کی جو تاکید کی ہے اس سے یہ شبہہ نہ ہونا چاہیے کہ ان پر اپنی اولاد کا کوئی حق نہیں ہے اور ان کے ساتھ حسن سلوک کے وہ پابند نہیں ہیں بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے انسانی حقوق میں کوئی حق ایسا نہیں ہے جو یکطرفہ ہو۔ ایسی ذات کہ اس کا حق تمام انسانوں پر واجب ہو اور ان پر کسی کا حق واجب نہ ہو صرف خالق کائنات کی ذات ہے لیکن وہ چونکہ کریموں کا کریم ہے اس لیے بہت سی چیزیں اس نے بطور خود اپنے اوپر ضروری قرار دے لی ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ خود اللہ رب العالمین کا حق بھی یکطرفہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چونکہ اولاد کی محبت ماں باپ کے دلوں میں ڈال دی ہے اس لیے وہ طبعاً بھی محبت و شفقت اور حسن سلوک کا برتاؤ کرتے ہیں لیکن یہاں گفتگو اس حق و احسان کی ہے جسے شریعت نے ضروری قرار دیا ہے۔

قتل اولاد کی ممانعت

بہ زمانۂ جاہلیت اولاد کے بارے میں کئی طرح کے غلط خیالات پائے جاتے تھے۔ مثال کے طور پر ایک خیال یہ پایا جاتا تھا کہ بیٹے خاندان کی عزت و وقار کا سبب ہیں اور بیٹیاں ننگ و عار کا۔ چنانچہ بعض قبیلے اسی ننگ و عار کے اندیشے سے اپنی بیٹیوں کو زندہ دفن کر دیتے تھے دوسرا خیال یہ تھا کہ ماں باپ اپنے آپ کو اولاد کا روزی رساں تصور کرتے تھے اس غلط خیال کی بنا پر انہیں اگر فقر و احتیاج کا اندیشہ ہوتا تھا اولاد کو قتل کر دیتے تھے اور فی الواقع یہ دونوں خیال اس عقیدے کی فرع تھے کہ وہ اپنے آپ کو اولاد کا مالک سمجھتے تھے ان کی اپنی طبیعت کے حکم کے سوا وہاں کسی دوسرے [illegible] طبیعت چاہتی تو اولاد کو سر پر بٹھا لیا اور طبیعت چاہی تو بے دردی سے [illegible]

کی اصل وفرع دونوں کی اصلاح کی، اس نے انہیں تعلیم دی کہ تم اپنی اولاد کے نہ مالک ہو نہ رازق اور عزت و ذلت کا وہ معیار غلط ہے جو تم نے اپنی طبیعت سے گھڑ لیا ہے۔ اللہ تمام کائنات کا خالق بھی ہے، مالک بھی ہے، اور روزی رساں بھی ہے اور اسی کو یہ حق بھی پہنچتا ہے کہ عزت و ذلت کا صحیح معیار تمہیں بتائے۔ اولاد تمہارے پاس خدا کی امانت ہے بلکہ خود تمہاری اپنی جان بھی اسی کی امانت ہے۔ تم نہ اپنی جان کے مالک ہو اور نہ اولاد کی جان تمہاری ملکیت میں ہے۔

وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُم مِّنْ اِمْلَاقٍ ۖ — اور اپنی اولاد کو مفلسی کی وجہ سے قتل نہ کرو

نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (انعام ر ۱۹) — ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔

کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ایک شخص فی الحال مفلس ہوتا تھا اس کے پاس اتنی روزی نہیں ہوتی تھی کہ خود بھی کھائے اور بچوں کو بھی کھلائے۔ اپنے نفس کی محبت اس پر اتنی غالب ہوتی تھی کہ اسے آسودہ کرنے کے لیے وہ اولاد کو قتل کر دیتا تھا۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ایک اور صورت حال کا اس طرح ذکر کیا ہے

وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۖ — اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل نہ کرو۔

نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۚ اِنَّ قَتْلَهُمْ — ہم انہیں بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی۔ بلاشبہ

كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (بنی اسرائیل ر ۴) — ان کا قتل ایک بڑی خطا ہے۔

یہ آئندہ مفلس ہو جانے کے اندیشے سے قتل اولاد کی ممانعت ہے۔ آج کل خاندانی منصوبہ بندی اور ضبط ولادت کی جو تحریکیں چل رہی ہیں وہ اسی اندیشے کا نتیجہ ہیں۔ مولانا مودودی تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں:

> یہ آیت ان معاشی بنیادوں کو قطعی منہدم کر دیتی ہے جن پر قدیم زمانے سے آج تک مختلف ادوار میں ضبط ولادت کی تحریک اٹھتی رہی ہے۔ افلاس کا خوف قدیم زمانے سے آج تک قتل اطفال اور اسقاط حمل کا محرک ہوا کرتا تھا اور آج وہ ایک تیسری تدبیر یعنی منع حمل کی طرف دنیا کو دھکیل رہا ہے لیکن منشور اسلامی کی یہ دفعہ انسان کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ کھانے والوں کو گھٹانے کی تخریبی کوشش چھوڑ کر ان تعمیری مساعی میں اپنی قوتیں اور قابلیتیں صرف کرے جن سے اللہ کے بنائے ہوئے قانون فطرت کے مطابق رزق میں افزائش ہوا کرتی ہے۔ اس دفعہ کی رو سے یہ بات انسان کی بڑی غلطیوں میں سے ایک ہے کہ وہ بار بار معاشی ذرائع کی تنگی کے اندیشے سے افزائش نسل کا سلسلہ روک دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ انسان کو متنبہ کرتی ہے کہ رزق رسانی کا انتظام تیرے ہاتھ میں نہیں ہے،

بلکہ اس خدا کے ہاتھ میں ہے جس نے تجھے زمین پر بسایا ہے جس طرح وہ پہلے آنے والوں کو رزق دیتا رہا ہے بعد کے آنے والوں کو بھی دے گا۔ تاریخ کا تجربہ بھی یہی بتاتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں کھانے والی آبادی جتنی بڑھتی گئی ہے اتنے ہی بلکہ بارہا اس سے بہت زیادہ معاشی ذرائع وسیع ہوتے چلے گئے ہیں لہٰذا خدا کے تخلیقی انتظامات میں انسان کی بے جا دخل اندازیاں حماقت کے سوا کچھ نہیں ہیں۔"

سورۂ انعام اور سورۂ بنی اسرائیل کی آیتوں نے مل کر ہر صورت حال میں قتل اولاد سے روک دیا۔ مسلمانوں کے دل و دماغ میں اللہ کی رزاقیت کا عقیدہ اتنی مضبوطی کے ساتھ جما رہا کہ تیرہ سو برس تک اندیشۂ فقر و افلاس کی بنا پر قتل اولاد کی کوئی تحریک تو کیا اٹھتی شاید اس طرح کے قتل کی دو چار انفرادی مثالیں بھی مشکل ہی سے ملیں گی لیکن آج بعض مسلمان حکومتیں بھی، مغرب کی اندھی تقلید میں ضبط ولادت اور خاندانی منصوبہ بندی کی تحریک کو طاقت کے بل پر نافذ کرنے کی سعی میں مشغول ہیں اور طرفہ تماشا یہ ہے کہ خود شریعت اسلامیہ سے اس کے جواز کی سندیں ڈھونڈی جا رہی ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ مذہب کو آگے بڑھ کر اس میں مدد کرنی چاہیے گویا مذہب کرایہ کا ٹٹو ہے اور اسے ادھر ہی چلنا چاہیے جدھر آپ چلانا چاہتے ہیں۔ اس معاملہ میں سب سے زیادہ رخصت عزل کی حدیث کو استعمال کیا جا رہا ہے۔

رخصتِ عزل سے غلط استدلال جو لوگ رخصت عزل کی احادیث سے برتھ کنٹرول کی تحریک یا خاندانی منصوبہ بندی پر استدلال کرتے ہیں وہ ایک بڑی حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ غذا کی کمی اور ذرائع معاش کی تنگی کے اندیشے کی بنا پر اگر عزل کی رخصت ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ نعوذ باللہ رخصت عزل کی احادیث نے خدا کی رزق رسانی کے عقیدے کو مجروح کر دیا۔ قرآن میں قتل اولاد کی ممانعت جن آیتوں میں ہے اس کی بنیاد ہی اللہ نے نحن نرزقھم وایاکم (ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی دیں گے) پر رکھی ہے اب اگر اندیشۂ فقر و احتیاج کی بنا پر عزل کرنا صحیح ہو تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ خدا کی رزاقیت کا عقیدہ ختم ہوا اور وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی جس پر قتل اولاد کی ممانعت قائم کی گئی تھی۔ اصل میں یہ غلط فہمی اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ رخصت عزل کے پس منظر کو ذہن سے نکال کر گفتگو کی جاتی ہے۔ کوئی ایک حدیث بھی ایسی نہیں ہے جس میں اندیشۂ فقر و احتیاج کی بنا پر پیدائش اولاد کو روکنے کی کراہت بھی اجازت دی گئی ہو اور یہ ممکن کیسے تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی ایسی چیز کی اجازت دیتے جس سے خدا کی

رزق رسانی کے عقیدے پر حرف آتا۔ یہاں میں چند احادیث نقل کرتا ہوں جن سے رخصتِ عزل کا پس منظر واضح ہوگا۔ حضرت ابو سعید خدری سے مروی ہے:

قَالَ غَزَوْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى	ابو سعیدؓ کہتے ہیں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ غَزْوَةَ بَلْمُصْطَلِقِ	علیہ وسلم کے ساتھ بنو المصطلق کے غزوہ میں شرکت کی
فَسَبَيْنَا كَرَائِمَ الْعَرَبِ فَطَالَتْ عَلَيْنَا الْعُزُوْبَةُ	اس غزوے میں ہم نے نفیس لونڈیاں گرفتار کیں تھیں
وَرَغِبْنَا فِي الْفِدَاءِ فَأَرَدْنَا أَنْ نَسْتَمْتِعَ	ان کے دام وصول کرنے کی رغبت تھی ہم نے چاہا
وَنَعْزِلَ فَقُلْنَا نَفْعَلُ وَرَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى	کہ ان سے فائدہ جماع حاصل کریں اور عزل کریں پھر
اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْنَ أَظْهُرِنَا لَا نَسْأَلُهُ	ہم نے سوچا کہ ہمارے درمیان رسول خدا موجود ہیں
فَسَأَلْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ	ان سے پوچھے بغیر ایسا کرنا مناسب نہیں تو ہم نے آپ سے
فَقَالَ لَا عَلَيْكُمْ أَلَّا تَفْعَلُوْا مَا كَتَبَ	سوال کیا۔ آپ نے فرمایا اگر عزل نہ کرو تو تمہارا کچھ نہ
اللّٰهُ خَلْقَ نَسَمَةٍ كَائِنَةٍ إِلَى يَوْمِ	بگڑے گا۔ قیامت تک جتنے انسانوں کی پیدائش اللہ
الْقِيَامَةِ إِلَّا سَتَكُوْنُ (مسلم شریف)	نے لکھدی ہے وہ تو پیدا ہو کر ہی رہیں گے

پس منظر یہ ہوا کہ غزوۂ بنو المصطلق میں کچھ لونڈیاں صحابہ کرام کے حصوں میں آئیں وہ عرصے سے اپنی بیویوں سے الگ تھے اور انہیں عورتوں کی شدید احتیاج تھی وہ ان لونڈیوں سے تمتع چاہتے تھے اور وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ ان کو فروخت کر کے ان کے دام وصول کریں۔ اگر وہ حاملہ ہو جاتیں تو ام ولد (ام ولد اس لونڈی کو کہتے ہیں جس کے بطن سے آقا کا کوئی بچہ پیدا ہو) ہونے کی وجہ سے ان کا بیچنا ممنوع ہو جاتا یا ان کی قیمت فروخت پر اس کا اثر پڑتا اس چیز سے بچنے کے لیے ان کے ذہنوں میں عزل کی تدبیر آئی اور انھوں نے اس کے بارے میں سوال کیا۔ حضور نے اس فعل کو پسند نہیں فرمایا اور اسے اس مقصد کے حصول کے لیے جس کا ذکر کیا گیا ایک بے کار فعل قرار دیا لیکن صراحۃً اس کی ممانعت بھی نہ کی ——— ایک اور حدیث میں ہے۔

"ایک شخص حضور کے پاس آئے انھوں نے کہا میرے پاس ایک لونڈی ہے وہی ہماری خادمہ بھی ہے اور وہی ہمارے لیے پینے کا پانی بھی لاتی ہے میں اس سے وطی کرتا ہوں اور نہیں چاہتا کہ وہ حاملہ ہو تو کیا میں عزل کروں۔ آپ نے فرمایا اگر تو چاہے تو عزل کر۔ لیکن اگر اس سے بچہ پیدا ہونا ہے تو وہ ہو کر رہے گا کچھ دنوں کے بعد وہ پھر آئے اور انھوں نے کہا یا رسول اللہ! وہ حاملہ ہوگئی آپ

نے فرمایا میں نے پہلے ہی کہا تھا کہ جو بچہ مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔"

ایک اور حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے ایام رضاعت میں دودھ پیتے بچے کو نقصان پہنچ جانے کے اندیشے سے عزل کرنے کی اجازت مانگی آپ نے ان کو بھی یہی جواب دیا کہ جس بچے کو پیدا ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا

ان احادیث سے کئی باتیں معلوم ہوئیں۔

(۱) عزل کی عدم ممانعت کا اصل تعلق لونڈیوں سے ہے۔ (۲) اس کا محرک فقر و احتیاج یا کثرت اولاد کی وجہ سے معیار زندگی کے گر جانے کا اندیشہ نہ تھا۔ (۳) آپ نے عدم استقرار حمل کے لیے عزل کی تدبیر کو فعل عبث قرار دیا کیونکہ اس صورت میں ننانوے فی صدی اس کا احتمال باقی رہتا ہے کہ مادۂ تولید کا کوئی جز تو رحم اندر رہ جائے۔ آپ نے بار بار یہ جو فرمایا ہے کہ "جس بچے کی پیدائش اللہ نے لکھ دی ہے وہ ہو کر رہے گا" وہ اسی احتمال کی بنا پر فرمایا ہے اس ٹکڑے کو ایک دوسری حدیث واضح کرتی ہے۔

عن ابی سعید الخدری یقول سئل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن العزل فقال ما من کل الماء یکون الولد واذا اراد اللہ خلق شیء لم یمنعہ شیء

ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ سے عزل کے بارے میں پوچھا گیا آپ نے فرمایا ہر منی سے بچہ نہیں پیدا ہوتا اور جب اللہ کسی شے کو پیدا کرنا چاہے تو کوئی شے مانع نہیں ہوتی۔

یہ ایک اور انداز سے آپ نے عزل کے بے فائدہ ہونے کی وضاحت کی۔ حدیث کا مطلب یہ ہے کہ محض مادۂ تولید کا داخل ہو جانا تخلیق ولد کا اصل سبب نہیں ہے بلکہ ارادۂ الٰہی اس کا اصل سبب ہے۔ کل کا کل مادہ بھی اندر پہنچ جائے اور ارادۂ الٰہی نہ ہو تو بچہ پیدا نہ ہوگا اور اگر ارادۂ الٰہی ہو تو کوئی نہ کوئی قطرہ اندر رہ جائے گا اور اس کو روکنے پر انسان قادر نہ ہوگا اور بچہ پیدا ہو کر رہے گا۔ جن ملکوں میں بر تھ کنٹرول سے شرح پیدائش گر گئی وہاں اس کا سبب صرف عزل کی تدبیر نہیں بلکہ اور دوسری تدبیریں تھیں اس کا سبب مانع حمل دوائیں بلکہ سب سے زیادہ اس کا سبب حمل کے خلاف ان کا استعمال تھا محض عزل کی تدبیر سے شرح پیدائش بہت زیادہ کبھی نہیں گھٹ سکتی اور اب تو شیطان نے آپریشن کی تدبیر بھی سکھا دی ہے بعض عورتوں پر تو مردوں پر یہ ظلم بھی روا رکھا گیا ہے کہ آپریشن کے ذریعہ ان کے رحم ہی کو نکال کر پھینک دیا گیا ہے۔ اگر عرب کے لوگ صرف عزل کی تدبیر پر قانع ہوتے تو ان کے مقصد کو حاصل نہ ہونے دینا وہ حاصل کرنا چاہتے تھے

بنیادی فرق

تدبیرِ عزل اور منعِ حمل کی موجودہ تدابیر کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ اول الذکر میں ننانوے فی صدی استقرارِ حمل کا احتمال باقی رہتا ہے اور موجودہ تدابیر میں اس احتمال کو بالکل ختم کرنے کی سعی کی جاتی ہے اس لیے ان تدابیر کو تدبیرِ عزل پر قیاس کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ نیز یہ کہ فقر و احتیاج یا معیارِ زندگی کے گرجانے کے اندیشے سے عزل کی سرے سے کوئی رخصت موجود نہیں ہے اس لیے بھی خاندانی منصوبہ بندی کو اس پر قیاس کرنا لغو ہے۔

اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے صحابہ کوئی ایسی تدبیر پیش کرتے جس سے استقرارِ حمل کا احتمال بالکل ختم ہو رہا ہوتا تو آپ ہرگز اس کی اجازت نہ دیتے یہ کوئی قیاسی بات نہیں ہے بلکہ اس کی دلیل یہ ہے کہ شریعت میں اختصاء یعنی اپنے آپ کو خصی بنا لینا بالاتفاق حرام ہے اس کے معنی یہ ہوئے کہ اپنی قوتِ رجولیت کو ختم کر لینے کی کوئی رخصت اسلامی شریعت میں موجود نہیں ہے ـــــ اس مسئلے کا ایک پہلو یہ بھی ہے جسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ عزل کی محدود رخصت بھی شریعت کا کوئی اجماعی مسئلہ نہیں ہے بلکہ علمائے امت کے ایک گروہ کے نزدیک عزل مطلقاً ناجائز ہے۔

عورتوں سے معاہدے کی ایک دفعہ

عرب میں چونکہ اولاد کو قتل کرنے کی ظالمانہ رسم جاری تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف انداز میں اس قبیح رسم کے استیصال کے لیے احکام نازل فرمائے۔ سورۂ ممتحنہ میں جب دار الکفر سے دار الاسلام کی طرف ہجرت کرنے والی مسلمان عورتوں سے بیعت (معاہدہ) کا حکم آیا تو اس کی چوتھی دفعہ یہ تھی: وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ (اور اپنی اولاد کو قتل نہ کریں) جب تک وہ بیعت کی اس شرط کو بھی نہ مان لیں ان سے بیعت نہیں کی جا سکتی تھی۔ اور یہ دفعہ بیعت کی تیسری دفعہ وَلَا يَزْنِينَ (اور بدکاری نہ کریں) کے بعد مذکور ہے اس ترتیب سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ کبھی قتلِ اولاد کا سبب زنا بھی ہو سکتا ہے۔ یورپ میں برتھ کنٹرول کی تحریک جو زوروں پر چلائی گئی اس کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ اس کے ذریعہ زنا کی بدکاری آسان ہو جائے چنانچہ اس تحریک کے نتیجے میں یہ بدکاری وہاں آگ کی طرح پھیل گئی۔

قتلِ اولاد کو خوشنما کون بناتا ہے

سورۂ انعام میں ہے۔

وَكَذَٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ قَتْلَ أَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوهُمْ وَلِيَلْبِسُوا عَلَيْهِمْ

اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں

وَ دِیْنَهُمْ ط (انعام ر ۱۶) اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں۔

یہ شرکاء کون تھے جنہوں نے قتل اولاد کو خوشنما بنا دیا تھا؟ کیا پتھر کے بت؟ نہیں! زندہ انسان، خیرخواہان قوم، رہبران ملک، یہ رہبر (جو قوم کو تباہی کے گڑھے کی طرف لے جا رہے ہیں) آج بھی موجود ہیں اور علم و سائنس کی بڑی بڑی سندوں اور قابلیتوں سے آراستہ و پیراستہ ہیں۔ بے آب و گیاہ وادی کی وہ جہالت بھی جہالت ہی تھی جہاں کی زمین زراعت کے لائق نہ تھی اور اناج کے لیے وہ لوگ بالکل دوسروں کے دست نگر تھے لیکن گنگ و جمن کے دوآبے اور پنج آب کے احاطے میں جہاں کی زمینیں لہلہاتی ہوئی کھیتیاں ہیں اور جہاں ہر طرف آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچانے والی ہریالی ہے اور جہاں زراعت کی ترقی کے کثیر مواقع ہیں۔ اس جہالت کو کیا کہا جائے گا؟ ترقی یافتہ حماقت یا ارتقائی جہالت!

قرآن نے اسی سلسلۂ بیان میں قتل اولاد کی حماقت ان الفاظ میں ظاہر کی ہے۔

قَدْ خَسِرَ الَّذِیْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَیْرِ عِلْمٍ وَّ حَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ (انعام ر ۱۶)

بے شک ٹوٹے میں پڑے وہ لوگ جنہوں نے اپنی اولاد کو نادانی سے بغیر سمجھے بوجھے قتل کیا اور اپنے اوپر اللہ کی دی ہوئی روزی کو حرام ٹھہرا لیا اللہ پر بہتان باندھ کر۔

جو لوگ قتل اولاد کے مرتکب ہوتے ہیں وہ آخرت میں تو گھاٹے اور ٹوٹے میں ہوں گے ہی دنیا میں بھی ان کے گھاٹے کی کوئی حد نہیں ہے۔ یہ نقصان صرف اسی شخص کو نہیں پہنچتا جو یہ ظالمانہ حرکت کرتا ہے بلکہ اس کا خمیازہ پوری قوم اور پورے ملک کو بھگتنا پڑتا ہے۔ اللہ اور آخرت پر جس کا ایمان ہو وہ یہ حرکت کبھی نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نسل کشی کو منافقین کی صفت قرار دیا ہے

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِی الْاَرْضِ لِیُفْسِدَ فِیْهَا وَ یُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ وَ اللّٰهُ لَا یُحِبُّ الْفَسَادَ (بقرہ ر ۲۵)

اور وہ جب (تمہارے پاس سے) پلٹتا ہے تو اس کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ زمین میں فساد پھیلائے کھیتیوں کو غارت کرے اور نسل کو تباہ کرے اور اللہ فساد کو ناپسند کرتا ہے۔

یعنی یہ منافق تمہارے پاس آتے ہیں تو چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں اور اپنے ایمان و اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن جب تمہارے پاس سے واپس جاتے ہیں تو ملک میں کھیتوں کی تباہی اور نسل کشی کا فساد پھیلاتے

ہیں ــــ برتھ کنٹرول اور خاندانی منصوبہ بندی بھی فی الواقع نسل کشی کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہ تحریک انہیں لوگوں نے چلائی ہے جن کو نہ خدا پر بھروسہ تھا اور نہ آخرت پر یقین ــــ ایک صحیح حدیث میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے بعد قتل اولاد کو سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے۔

اولاد بھی آزمائش ہے

انسان اس دنیا میں آزمائش ہی کے لیے بھیجا گیا ہے خود اس کی اپنی جان اور جو کچھ بھی اللہ نے اسے دے رکھا ہے سب آزمائش ہے۔ ان آزمائشوں میں دو بڑی آزمائشیں اموال و اولاد ہیں۔ اس آزمائش میں وہی لوگ پورے اترتے ہیں جو افراط و تفریط سے بچ کر اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ اولاد کے معاملے میں افراط یہ ہے کہ اس کی محبت اللہ کی محبت پر غالب آ جائے اور وہ اللہ کی اطاعت میں حارج بننے لگے اور تفریط یہ ہے کہ اس کے ساتھ حسن سلوک کے بجائے ظالمانہ روش اختیار کی جائے اور اس کے حقوق تلف کیے جانے لگیں۔ قرآن نے تاکید و حصر کے صیغے کے ساتھ اموال و اولاد کو فتنہ (آزمائش) کہا ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں اعتدال غائب تھا یا تو تفریط کی حد یہاں تک پہنچی تھی کہ لوگ اولاد کو قتل کرنے سے بھی نہ شرماتے تھے یا افراط کا یہ عالم تھا کہ بیٹوں کی کثرت پر فخر کرتے، ان کی طاقت کے بل پر غرور کرتے بلکہ ان کو تقرب الٰہی کا بھی ذریعہ قرار دیتے۔ اللہ نے بتا دیا کہ ان کی حیثیت آزمائش کی ہے۔ ان کی کثرت تقرب الٰہی کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ اس آزمائش میں پورا اترنا تقرب کا ذریعہ ہو سکتا ہے اگر ایمان اور عمل صالح اس کے ساتھ موجود ہو ــــ سورۂ سبا میں ہے:

وَمَا أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ	تمہارے اموال و اولاد وہ چیز نہیں ہیں جو تمہارا
بِالَّتِي تُقَرِّبُكُمْ عِندَنَا زُلْفَىٰ إِلَّا	درجہ ہمارے پاس قریب کر دیں، قریب تو وہ لوگ ہوں گے
مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ	جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے انھیں کے لیے ان کے
جَزَاءُ الضِّعْفِ بِمَا عَمِلُوا وَهُمْ	عمل کا دو چند بدلہ ہے اور وہی لوگ بہشت کے جھروکوں
فِي الْغُرُفَاتِ آمِنُونَ ۝ (سبا:۳۷)	میں امن و امان کے ساتھ رہیں گے۔

مومنوں کو امانتوں میں خیانت سے روکتے ہوئے فرمایا:

وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ	اور جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد سامان
فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝	آزمائش ہیں اور اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔

آیت کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ جس طرح اموال خدا کی دی ہوئی امانت ہیں اسی طرح اولاد بھی اسی کی عطا کردہ

امانت ہیں، وہ بھی آزمائش ہیں اور یہ بھی آزمائش ہیں اموال کو اگر غلط مصارف میں خرچ کیا جائے یا صحیح مصارف میں خرچ نہ کیا جائے تو یہ خیانت ہوگی۔ یہی معاملہ اولاد کا ہے، ان کو اگر غلط مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنایا جائے نظام باطل کی خدمت کے لیے تیار کیا جائے، جہاد فی سبیل اللہ کے بجائے انہیں طاغوتی جنگوں کی آگ میں جھونکا جائے تو یہ اموال کی خیانت سے بڑی خیانت ہوگی۔ سورۂ تغابن میں بھی اموال و اولاد کو فتنہ کہا گیا ہے اور وہاں بعض اولاد کو دشمن قرار دے کر ان سے بچتے رہنے کی تلقین کی گئی ہے، وہی اولاد دشمن ہوتی ہے جو خدا کی اطاعت میں مانع ہو اور اس کی محبت خدا کی محبت پر غالب آجائے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے:

وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا — اور اگر معاف کر دو اور درگزر کرو اور بخش دو تو

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ (تغابن ر۲) — بلاشبہ اللہ بخشنے والا ہے۔

ایک شخص نے حضرت ابن عباس سے سورۂ تغابن کی ان آیات کے بارے میں سوال کیا تو انھوں نے کہا واقعہ یہ ہوا تھا کہ مکہ میں کچھ لوگ مسلمان ہوئے اور انھوں نے ہجرت کر کے مدینہ آنا چاہا تو ان کی بیویاں اور بچے ان کو چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے اور وہ ان کی محبت کی وجہ سے جلد ہجرت نہ کر سکے، جب وہ مدینہ گئے تو انھوں نے دیکھا کہ جو لوگ پہلے ہجرت کر کے چلے آئے تھے انھوں نے اچھی خاصی حد تک علم دین حاصل کر لیا ہے اور یہ لوگ اپنی بیویوں اور بچوں کی رکاوٹ سے پیچھے رہ گئے ہیں یہ دیکھ کر انہیں غصہ آیا اور انھوں نے ان کو سزا دینی چاہی تب یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ امام ترمذیؒ نے یہ روایت اپنی جامع میں نقل کی ہے اور اسے حسن صحیح کہا ہے۔

آیت اور اس کی تفسیر سے معلوم ہوا کہ ازواج و اولاد کی غلطیوں پر ہر وقت تیغ برہنہ رہنا اور سزا دیے بغیر نہ چھوڑنا مکارم اخلاق کے خلاف ہے جس طرح اولاد پر لازم ہے کہ ماں باپ کو اف تک نہ کہے اسی طرح ماں باپ پر بھی لازم ہے کہ اپنی اولاد سے حسن سلوک کرے اور ان کی غلطیوں سے اس حد تک درگزر کرے جس حد تک شریعت نے اجازت دی ہے۔

ازواج و اولاد کا سب سے بڑا حق خاندان کے سرپرست پر یہ ہے

ازواج و اولاد کا سب سے بڑا حق کہ وہ انہیں خدا کے عذاب سے بچانے کی سعی کرے، اور یہ بات اسی وقت ممکن ہوتی ہے جب انسان اپنے آپ کو اس عذاب سے بچانے کی کوشش کر رہا ہو۔ اگر کسی کا عقیدۂ آخرت دھندلا ہو گیا ہو، اس پر حب دنیا کا میل جم گیا ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس کی سعی و جہد کا بڑا حصہ یا تمام حصہ صرف دنیا کی خوش حالی و ترقی پر مرکوز ہو جائے گا، اپنے لیے اور اپنے خاندان کے لیے اس

خوش حالی کو حاصل کرنے میں وہ اتنا منہمک ہو جائے گا کہ آخرت کی کامیابی دنیا کامیابی سے اسے کوئی بحث باقی نہیں رہے گی یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں اہل وعیال کی یہ ذمہ داری سرپرست پر ڈالی ہے وہاں سب سے پہلے اس کے اپنے نفس کا ذکر کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا ٥ (تحریم ر ۲)

اے مومنو! اپنی جان کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ سے بچاؤ۔

اس میں "انفسکم" کا ٹکڑا پہلے اسی لیے لایا گیا ہے کہ جو شخص خود اپنے آپ کو خدا کے عذاب سے بچانے کی سعی نہ کرے وہ دوسروں کو بچانے کی کیا سعی کرے گا۔ بہرحال اس آیت نے واضح کر دیا کہ اہل وعیال کا سب سے بڑا حق یہ ہے کہ انہیں خدا کا فرماں بردار بنانے کی سعی کی جائے۔ یہ سب سے بڑا حسنِ سلوک ہے جو کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے ساتھ کرسکتا ہے۔ حضور نے بھی فرمایا ہے کہ تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا خاندان کا سرپرست راعی ہوتا ہے اور گھر والے اس کی رعیت ہوتے ہیں اللہ اس سے پوچھے گا کہ تم نے اپنی رعیت کو سیدھی راہ پر چلانے کی کیا کوشش کی تھی۔ اس سلسلے میں سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ والدین خود اسلام کا چلتا پھرتا نمونہ ہوں، اور اپنے اعمال وحرکات سے اسلامی اخلاق کی تعلیم دیں۔ عمل اگر زبانی تعلیم کے برخلاف ہو تو اولاد پر اس کا الٹا اثر مرتب ہوگا۔ اس کے بعد کی کوشش یہ ہے کہ وہ اولاد کی اچھی تعلیم وتربیت کا بندوبست کریں، اور ان کی دینی واخلاقی ضروریات کو دنیوی ضروریات سے زیادہ اہمیت دیں۔

حضرت لقمانؑ کی نصیحت

اولاد کی بہتر تعلیم وتربیت کا سب سے اچھا نمونہ وہ نصیحت ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو کی تھی میں یہاں اس نصیحت کے نکات کو ترتیب سے پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

(۱) يَا بُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللَّهِ إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ٥ (سورہ لقمان)

اے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرا۔ بلاشبہ شرک بڑا ظلم ہے۔

انسان کے جتنے اعمال ہیں، وہ کسی نہ کسی تصورِ حیات کسی نہ کسی خیال وعقیدے کے ماتحت ہوتے ہیں اس لیے عقیدہ کو اصل واساس کی حیثیت حاصل ہے۔ اللہ نے انسان کو سب سے پہلے جس عقیدے کا مکلف کیا ہے وہ عقیدۂ توحید ہے، اس دنیا میں شرک سے بڑا کوئی ظلم نہیں ہے اور توحید سے بڑا کوئی عدل نہیں ہے عقیدۂ توحید

سے بڑا کوئی عدل نہیں ہے۔ عقیدۂ توحید دوسرے تمام اعتقادات وایمانیات کی اصل ہے۔ ایمان کے بغیر بڑا سے بڑا نفع بخش کام خدا کی نظر میں بے وزن ہے اور ایمان کے ساتھ چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی باوزن ہے۔ انسان کے پاس دو قوتیں ہیں۔ قوت علمی ونظری اور قوت عملی۔ قوت نظری کی تکمیل عقیدۂ توحید سے ہوتی ہے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر حضرت لقمان نے جنہیں اللہ تعالیٰ نے حکمت عطا فرمائی تھی۔ اپنی پرحکمت نصیحت کی ابتدا عقیدۂ توحید سے کی۔ شرک سے برأت اور عقیدۂ توحید پر استقامت خدا کا حق ہے اس کے بعد بندوں کے حقوق میں سب سے مقدم حق والدین کا ہے۔ حضرت لقمان کی نصیحت میں والدین کے حق کا ذکر نہ تھا۔ اس کمی کو اللہ تعالیٰ نے خود پورا کر دیا ہے۔ مذکورہ آیت کے بعد دو آیتیں جملۂ معترضہ کے طور پر والدین کے حق کو بیان کرتی ہیں جس کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔

(۲) یَا بُنَیَّ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ فَتَكُنْ فِیْ صَخْرَةٍ اَوْ فِی السَّمٰوٰتِ اَوْ فِی الْاَرْضِ یَاْتِ بِهَا اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَطِیْفٌ خَبِیْرٌ

اے بیٹے اگر کوئی چیز رائی کے دانے کے برابر کسی پتھر میں یا آسمان وزمین کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی ہو تو اللہ اسے لا حاضر کرے گا۔ بتحقیق اللہ چھپی چیزوں کو جانتا ہے اور ہر شے سے خبردار ہے

یہ اللہ تعالیٰ کے کمال علم وقدرت اور عقیدۂ جزا وسزا کی تعلیم ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کو ہر طرح کی کھلی اور چھپی برائیوں سے بچاتا اور سات پردوں میں بھی اسے خدا کا مطیع وفرماں دار رکھتا ہے۔ دنیا بھر کی دیانتدار پولیس اور فوج بھی اپنی تمام طاقتوں کے ساتھ جرائم کا خاتمہ اتنی کامیابی کے ساتھ نہیں کرسکتی جس قدر تنہا یہ عقیدہ ان کا خاتمہ کرتا ہے۔ ایک طرف تو یہ عقیدہ برائیوں سے بچانے کی سب سے کامیاب ترہیب ہے اور دوسری طرف نیک عملی اختیار کرنے کی سب سے موثر ترغیب بھی ہے۔ سات پردوں کے اندر خدا کی بندگی واطاعت کرتے ہوئے بھی مومن مطمئن ہوتا ہے کہ اس کی یہ اطاعت، اس کی یہ نیکیاں ضائع جانے والی نہیں ہیں۔ ایک نگاہ کرم ہے جو دیکھ رہی ہے اور ممکن نہیں کہ اس کا صلہ نہ ملے۔

(۳) یَا بُنَیَّ اَقِمِ الصَّلٰوةَ　　اے بیٹے! نماز قائم کر

قوت نظری کی تکمیل کے بعد قوت عملی کی تکمیل کا حکم دیا۔ جس طرح عقائد کی اصل توحید ہے، اسی طرح عبادات کی اصل نماز ہے۔ اقامت صلوٰۃ کے بغیر دین حق پر استقامت ممکن نہیں۔ اگرچہ نماز باجماعت کا تعلق اجتماعی زندگی کے ساتھ جڑ جاتا ہے لیکن اپنی اصل کے اعتبار سے یہ ایک ایسی نیکی ہے جو خود نماز پڑھنے والے کی ذات کو مکمل کرتی

اور اسے خدا کی کامل بندگی کے لیے تیار کرتی ہے۔ دوسروں سے اس کا تعلق ضمنی ہے۔

(۴) وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ   معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کر

اس نصیحت نے بتایا کہ مومن صرف اپنی ذات کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ دوسروں کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔ خود ہدایت یافتہ ہونا اس وقت تک مکمل نہیں جب تک دوسروں کو ہدایت یافتہ بنانے کی سعی نہ کی جائے۔ اس نصیحت نے یہ بھی بتایا کہ اجتماعی صلاح و فلاح کی ذمہ داری کچھ شریعت محمدی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ خدا کی نازل کردہ تمام شریعتوں میں مومنوں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اجتماعی صلاح و فلاح کی کوشش کریں۔

(۵) وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ   جو تکلیف پہنچے اس پر صبر کر۔ بے شک یہ ایسے
ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ   کام ہیں جن کو انجام دینا ضروری ہے۔

عزم کسی کام کے پختہ ارادے کو کہتے ہیں۔ آیت کا مفہوم یہ ہوا کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان ضروری امور میں ہے جو پختہ ارادے اور ہمت و ثبات کے بغیر انجام نہیں پاتے کیونکہ اس راہ میں اذیتوں اور سختیوں کا پیش آنا علیمی متوقع ہے لہذا اس راہ میں سختیاں آئیں اور مصیبتیں پہنچیں تو ان پر صبر کرنا چاہیے۔

(۶) وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ   لوگوں سے متکبرانہ منہ نہ پھیر
(۷) وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا   اور زمین پر اکڑ کر نہ چل۔
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ   بے شک اللہ کسی اترانے، ڈینگ مارنے والے
فَخُورٍ ○   کو پسند نہیں کرتا۔

لوگوں سے گال پھلانا، حقارت سے گردن ٹیڑھی کرنا، منہ پھیر لینا، زمین پر تبختر اور غرور سے اترا کر چلنا، متکبروں اور مغروروں کے خصائل و علامات ہیں۔ کبریائی اللہ تعالیٰ کی خاص صفت ہے اور اسی کے شایان شان بھی ہے۔ تکبر و غرور اختیار کر کے انسان خدا کی کبریائی کو چیلنج کرتا ہے اس لیے یہ صفت ایمان کی عین ضد ہے، یہی وجہ ہے کہ اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا اور جسے وہ ناپسند کرے اس کے مردود و مخذول ہونے میں کیا شبہ ہے۔ مومن متواضع ہوتا ہے، متکبر نہیں ہوتا۔

(۸) وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ   میانہ روی اختیار کر، معتدل رفتار سے چل
(۹) وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ ۚ إِنَّ   اپنی آواز نیچی کر۔ بے شک سب سے بری آواز

اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ۝ گدھے کی آواز ہے۔

بلاضرورت چیخ کر باتیں کرنا، تہذیب کے خلاف اور تکلیف دہ بھی ہے اور بسا اوقات یہ تکبر کی علامت بھی ہے۔ حلق کی پوری قوت سے آواز نکالنا اگر کمال ہوتا تو گدھے کو سب سے باکمال ماننا پڑتا حالانکہ اس کی آواز تمام جانوروں سے زیادہ کریہہ، بے ڈھنگی اور ناگوار ہوتی ہے۔ عام طور سے متکبر لوگ ان لوگوں کے سامنے جنہیں وہ اپنے سے چھوٹا اور حقیر سمجھتے ہیں، بہت چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔ شاید ان کا احساس یہ ہوتا ہے کہ دیکھو جس طرح میری آواز تمہاری آوازوں سے بلند ہے اسی طرح میں خود تم سے بلند ہوں۔ حضرت لقمان کی یہ نصیحت نہ صرف اولاد کے لیے بہتر تعلیم و تربیت کا خاکہ ہے بلکہ تمام انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے بھی ایک معیاری نقشہ ہے۔ اس نقشے کے مطابق جس کسی کی تعلیم و تربیت ہو، اور اس کی زندگی اسی نقشے کے مطابق پروان چڑھے وہ معاشرے اور انسانیت کے لیے معیاری اور نمونے کا انسان بن جائے گا۔

ایک حدیث میں آتا ہے :۔

مَانَحَلَ وَالِدٌ وَلَدًا مِنْ نُحْلٍ اَفْضَلَ مِنْ اَدَبٍ حَسَنٍ (ترمذی)

کسی باپ نے اپنے ولد کو اچھے ادب سے افضل اور بہتر عطیہ نہیں دیا۔

دوسری حدیث میں ہے :

عَنْ اَنَسٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوْا اَدَبَھُمْ (ابن ماجہ)

حضورؐ نے فرمایا اپنی اولاد کی عزت کرو اور ان کو اچھا ادب سکھاؤ۔

اولاد کے لیے دعا

مومن کا کلی اعتماد اپنی سعی پر نہیں بلکہ خدا کے فضل و کرم پر ہوتا ہے، وہ کسی چیز کے لیے بھی جدوجہد کر رہا ہو اس کی نگاہیں اس کے کرم پر مرکوز اور اس کا دست سوال اپنے مالک کے سامنے پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ اولاد کی اچھی تربیت بہت بڑی نیکی ہے۔ صدقۂ جاریہ ہے، اس کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے۔ اچھی اولاد اور اولاد کی اچھی تربیت کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام کی دعائیں بھی قرآن میں منقول ہیں۔ سورۂ فرقان میں عباد الرحمٰن کی جو صفات گنائی گئی ہیں ان میں ایک صفت یہ ہے :۔

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ

اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں ہماری ازواج اور اولاد کی طرف سے

أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا ۝ آنکھ کی ٹھنڈک عطا کر اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا

آنکھوں کی ٹھنڈک عطا کرنے سے مراد یہ ہے کہ انہیں اپنا مطیع و فرماں بردار بنا۔ ازواج و اولاد جب خدا کی اطاعت میں مومن کے معاون و مددگار رہتے ہیں تو اس کا دل ان سے خوش ہوتا ہے اور انہیں دیکھ کر اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی ہیں اور اگر خدانخواستہ معاملہ برعکس ہو تو پھر وہ سوہان روح بن جاتے ہیں۔

یہ گویا خود خدا کی طرف سے تعلیم ہے کہ تم اپنی بیوی بچوں کے صالح بننے کی دعائیں کرتے رہو۔ ماں باپ کی دعائیں اولاد کے حق میں قبول کی جاتی ہیں اس لیے اولاد کی غلط حرکتوں سے آزردہ ہو کر ان کے لیے بددعا نہ کرنی چاہیے بلکہ ان کی اصلاح اور ہدایت کے لیے خدا کے سامنے دست سوال دراز کرنا چاہیے۔

لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کی مزید تاکید

جس طرح ماں کے لیے حدیثوں میں حسن سلوک کی مزید تاکید آئی ہے اسی طرح لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کی مزید ترغیب و تاکید بھی موجود ہے اس کا ایک سبب تو جاہلیت عرب کا وہ خیال ہے جو لڑکیوں کے بارے میں پایا جاتا تھا۔ اس خیال کی اصلاح کے لیے لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کی مزید تاکید کی گئی اور دوسرا سبب عورتوں کا فطری ضعف اور ان کی ذہنی و جسمانی کمزوریاں ہیں جس کی وجہ سے وہ مدد اور احسان کی زیادہ محتاج ہیں۔

اَنَّ عَائِشَةَ زَوْجَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَدَّثَتْهُ قَالَتْ جَاءَتْنِيْ	عائشہ نے بیان فرمایا کہ میرے پاس ایک عورت اپنی
اِمْرَأَةٌ وَمَعَهَا اِبْنَتَانِ تَسْأَلُنِيْ	دو بیٹیوں کے ساتھ سوال کرتی ہوئی آئی۔ میرے پاس
فَلَمْ تَجِدْ عِنْدِيْ غَيْرَ تَمْرَةٍ وَاحِدَةٍ	ایک کھجور کے سوا کچھ نہ تھا میں نے وہی دے دیا اس نے
فَاَعْطَيْتُهَا فَقَسَمَتْهَا بَيْنَ ابْنَتَيْهَا	اس کو اپنی دونوں بیٹیوں کے درمیان تقسیم کر دیا اور
ثُمَّ قَامَتْ فَخَرَجَتْ فَدَخَلَ النَّبِيُّ	پھر روانہ ہو گئی اس کے بعد حضور آئے تو میں نے واقعہ بیان
صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَحَدَّثْتُهُ فَقَالَ	کیا آپ نے فرمایا جو شخص بھی ان بیٹیوں سے آزمایا
مَنِ ابْتُلِيَ مِنْ هٰذِهِ الْبَنَاتِ شَيْئًا	جائے اور وہ ان سے احسان کرے تو وہ اس کے لیے
فَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ كُنَّ سِتْرًا مِّنَ النَّارِ ۝ (بخاری)	دوزخ سے حجاب بن جائیں گی۔

آپ کی اس تعلیم نے اسلامی معاشرے میں لڑکیوں کے درجے کو بلند کر دیا اور ان کی تحقیر و توہین کے وہ جذبات

ختم ہوگئے جو جاہلیت میں پائے جاتے تھے۔

مغربی جاہلیت

اصل جاہلیت زندگی کا مادی نقطۂ نظر ہے۔ جس تہذیب پر یہ نقطۂ نظر غالب آجاتا ہے وہ جاہلی تہذیب بن جاتی ہے اور پھر انسانیت و حیوانیت میں روح اور جوہر کے لحاظ سے کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ آج یورپ اور امریکہ پر یہی مادی، جاہلی تہذیب چھائی ہوئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہاں کا معاشرہ اخلاقی و روحانی اعتبار سے ہلاکت کے قریب پہنچ چکا ہے۔ والدین اور اولاد میں بس اتنا ہی تعلق باقی ہے جتنا جانوروں اور ان کے بچوں میں ہوتا ہے۔ اولاد کے بالغ ہوتے ہی ان کی ساری ذمہ داری سے والدین اپنے آپ کو فارغ کر لیتے ہیں اور اپنے گھر سے انہیں الگ کر دیتے ہیں اور اگر گھر کے کسی ضرورت سے زائد حصے کو وہ استعمال کریں تو انہیں باضابطہ کرایہ دینا پڑتا ہے اور وہ کرایہ دار کی حیثیت سے وہاں رہتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ ان کی شادی بیاہ سے بھی والدین کو کوئی تعلق نہیں رہتا، اولاد کا جہاں جی چاہے شادی کرے یا نہ کرے والدین کو اس سے کوئی علاقہ نہیں ہے۔ بیٹوں کے ساتھ بھی یہ معاملہ ان پر ظلم ہے لیکن بیٹیوں کے ساتھ یہ رویہ تو فی الواقع انسانی اخلاق کی موت کے مترادف ہے۔ یہاں دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں ان سے اندازہ ہوگا کہ وہاں عائلی نظام کس قدر تباہ اور پراگندہ ہو چکا ہے۔

> لندن میں ایک دوست سے ملاقات ہوئی جن کے والد یہاں ۵ سال سے مقیم ہیں انھوں نے شادی بھی یہاں کی عورت سے کی ہے اور بچے سب انگریزیت میں ہیں۔ بچے گو جوان ہیں گر بیچارے اپنے آپ کو صرف نام کا مسلمان سمجھتے ہیں۔ ان کے والد سے میں نے یہاں کی شادی کے رواج کے متعلق دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ہر لڑکا اپنی بیوی خود تلاش کر کے اپنی مرضی سے شادی کر لیتا ہے اور اس میں والدین کو کوئی دخل نہیں، نہ وہ لوگ شادی کرانے کی یا اس کے انتظام کی کبھی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے اس پر پوچھا لڑکا آخر کہاں جا کر لڑکی کو تلاش کرے کوئی خاندانی یا رشتہ داری جیسی چیز بھی تو آپ کے یہاں نہیں بولے اسکولوں، کالجوں یا باہر بازاروں وغیرہ میں۔ آخر لڑکی کا بھی تو یہی حال ہے وہ بھی کسی لڑکے کی تلاش میں پھرتی رہتی ہے سو یا لڑکا پہلے کسی نامحرم سے دوستی اور اختلاط بڑھائے اس کے بعد اگر دونوں راضی ہوں تو شادی طے پا سکتی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ماں باپ اور بچوں کے مابین یہاں کچھ بہت جوڑ نہیں لڑکا جوان ہوتے ہی اس سے والدین پورا خرچ وصول کرتے ہیں۔ اگر وہ والدین کے ساتھ گھر میں رہتا ہے تو اسے گھر کا کرایہ بھی دینا پڑتا ہے گویا بچے جوان ہوتے ہی اجنبیوں کا سا برتاؤ ہو جاتا ہے جیسے جانور [illegible]

ہوا کرتا ہے۔ (مکتوب فرنگ "صدق" ۱۹ اگست ۱۹۶۰ء)

جاہلیت عرب میں بھی صحیح روحانیت اور اخلاقی زندگی مغلوب تھی لیکن اس جدید جاہلیت نے تو انسانیت کا خاتمہ ہی کر دیا ہے اس کے نزدیک انسان "ترقی یافتہ جانور" کے سوا کچھ نہیں۔ اوپر کا اقتباس کسی تشریح کا محتاج نہیں، آگے کے اقتباس میں دیکھیے کہ یہ حیوانیت سنگ دلی میں کتنی ترقی کر چکی ہے۔

استاذ علی طنطاوی (شام) لکھتے ہیں:-

ان کے یہاں لڑکی جب بالغ ہو جاتی ہے تو اس کا باپ اس کے اخراجات سے اپنا ہاتھ سمیٹ لیتا ہے اور اپنے گھر کا دروازہ اس کے لیے بند کر دیتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ اب جاؤ کھاؤ کماؤ ہمارے یہاں اب تمہارے لیے کچھ نہیں ہے۔ وہ غریب مجبوراً اپنے گھر سے نکل جاتی ہے اور زندگی کی ساری سختیاں اس کے سامنے ہوتی ہیں۔ دربدر کی ٹھوکریں کھاتی پھرتی ہے لیکن والدین کو اس کی کوئی فکر نہیں ہوتی کہ وہ زندگی کس طرح بسر کر رہی ہے۔ محنت کر کے کھاتی کماتی ہے یا جسم بیچ کر اپنا پیٹ بھرتی ہے اور یہ بات صرف امریکہ میں نہیں ہے بلکہ سارے مغربی ممالک کا یہی حال ہے —— میرے استاد یحیی شماع نے آج سے ۳۰ سال قبل جب وہ پیرس میں اپنی تعلیم ختم کر کے آئے تھے مجھ سے بیان کیا کہ وہ اس وقت وہاں اپنے ٹھہرنے کے لیے ایک کمرہ کی تلاش میں ایک مکان پہنچے جہاں ایک کمرہ خالی تھا تو مکان کے دروازے سے ایک لڑکی نکلتی ہوئی انہیں ملی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر یحیی نے مکان کے مالک سے اس کے رونے کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ ہماری لڑکی ہے۔ اب یہ ہم سے الگ رہتی ہے۔ انھوں نے پوچھا یہ کیوں رو رہی ہے؟ اس نے کہا یہ ہمارے یہاں ایک کمرہ کرایہ پر لینے آئی تھی اور ہم نے اس کو دینے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے پوچھا کیوں؟ اس نے کہا کہ یہ اس کمرہ کا کرایہ بیس فرانک (دس آنے کے برابر ایک سکہ) دے رہی ہے اور دوسروں سے ہم کو اس کا کرایہ تیس فرانک مل رہا ہے۔

(ماہنامہ رضوان)

یہ وہ مادہ پرستانہ سنگ دلی ہے کہ گئی گزری حالت میں بھی مشرق کے لوگ اس کا تصور نہیں کر سکتے بلکہ اس طرح کے واقعات سننے کے بعد انہیں شک گزرتا ہے کہ آیا یہ واقعات صحیح بھی ہیں؟ لیکن شک کی کوئی وجہ نہیں انسان کے اعمال اس عقیدے اور اس نقطہ نظر کے نتائج ہوتے ہیں جو وہ زندگی کے بارے میں اختیار کرتا ہے۔ مغرب کے لوگوں نے اپنے آپ کو حیوان مطلق سمجھ لیا ہے اس لیے اس طرح کی سنگ دلی ان سے بعید نہیں ہے۔

مغربی عورت اس صورت حال سے جس قدر پریشان، عاجز اور دل تنگ ہے اس کا نقشہ بھی علی طنطاوی کے مضمون میں موجود ہے۔

مجھ سے شیخ بہجۃ البیطار (شام کے ایک مشہور محقق عالم جو دمشق میں مقیم ہیں) نے بیان کیا کہ انھوں نے امریکہ میں مسلمان عورت کے موضوع پر ایک لکچر دیتے ہوئے کہا کہ ہماری شریعت میں اس کو مالی معاملات میں حق خود مختاری حاصل ہے چنانچہ اس کے مال میں اس کے شوہر حتیٰ کہ اس کے باپ کو بھی کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ اگر عورت تنگ دست و پریشان حال ہو تو اس کے تمام اخراجات کا کفیل اس کے باپ یا بھائی کو ہونا پڑے گا اور اگر اتفاق سے اس کا باپ یا بھائی موجود نہ ہو تو اس کے عزیزوں میں سے کوئی بھی اس کے کھانے کپڑے کا خرچ برداشت کرے گا خواہ اس کا وہ عزیز اس کا چچا زاد بھائی ہو یا کوئی اور — جب تک اس کی شادی نہ ہو جائے یا کہیں کوئی مال و دولت اس کے ہاتھ نہ آجائے وہ برابر اس کی کفالت کرتا رہے گا اور شادی کے بعد پھر اس کا شوہر اس کے تمام اخراجات کا ذمہ دار ہوگا۔ چاہے وہ شوہر ایک غریب مزدور ہی کیوں نہ ہو اور بیوی کروڑ پتی — لکچر ختم ہونے کے بعد ایک امریکن خاتون جو وہاں کی ایک مشہور مادیہ تھی کھڑی ہوئی اور اس نے کہا کہ اگر عورت کو آپ کے مذہب میں یہی حقوق حاصل ہیں جو آپ بیان کر رہے ہیں تو پھر مجھے اپنے یہاں لے چلیے۔ میں وہاں رہ کر صرف چھ مہینے زندگی بسر کروں گی۔ اس کے بعد مجھے قتل کر دیجیے جب بھی مجھے کوئی حسرت نہ ہوگی۔" (یورپ کی مظلوم عورت، ماہنامہ رضوان)

یہ ہے مغربی معاشرے کا حال جس کی بنیادیں انسان کو مجرد حیوان سمجھ کر اٹھائی گئی ہیں۔

اسلامی نقطۂ نظر لڑکیوں کے حقوق کا مختصر بیان شیخ بہجۃ البیطار کی تقریر میں گزر چکا ان حقوق کو ادا کرنے کا اجر و صلہ کیا ہے۔ اس کے لیے ایک حدیث اوپر گزر چکی۔ اس سلسلے کی چند حدیثیں یہاں اور پیش کی جاتی ہیں:-

(ابو سعید) رفعہ من عال ثلاث بنات او ثلاث اخوات او اختین او بنتین فادبہن واحسن الیہن وزوجہن فلہ الجنۃ
(رواہ احمد والترمذی وابو داؤد)

حضرت ابو سعید خدری نے مرفوعاً حدیث بیان کی ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے تین بیٹیاں یا تین بہنیں یا دو بہنیں یا دو لڑکیوں کی کفالت کی ان کو ادب سکھایا ان کے ساتھ احسان کیا اور ان کی شادی کر دی تو اس کے لیے جنت ہے۔

دوسری حدیث میں ہے :-

(انس) رَفَعَہٗ مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَنَا وَهُوَ وَضَمَّ اَصَابِعَهٗ (جمع الفوائد بحوالہ مسلم)

حضورؐ نے فرمایا جس نے دو لڑکیوں کی کفالت کی یہاں تک کہ وہ بالغ ہوگئیں تو قیامت میں، میں اور وہ شخص ساتھ ساتھ ہوں گے۔

کسی مومن کے لیے اس سے بڑی کوئی بشارت نہیں ہو سکتی کہ قیامت میں اسے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت نصیب ہو۔

لڑکوں کو ترجیح نہ دی جائے

اسلام نے جاہلیت کی کسی بری چیز کو جب ختم کیا ہے تو اس طرح ختم کیا ہے کہ اس کے دوبارہ رائج ہونے کا دروازہ بند ہو جائے بیٹیوں کے ساتھ ظلم کی وجہ یہ تھی کہ عرب کے لوگ بیٹوں کو ان پر ترجیح دیتے تھے اور ان کے مقابلے میں بیٹیوں کو ذلیل سمجھتے تھے۔ اسلام نے یہ تعلیم دی کہ والدین اپنی زندگی میں لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح نہ دیں بلکہ لین دین اور حسن سلوک میں دونوں کو برابر رکھیں۔ یہ اس لیے کہ وہ جاہلانہ ذہنیت پھر نہ پیدا ہو۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

مَنْ كَانَتْ لَهٗ اُنْثٰى فَلَمْ يَئِدْهَا وَلَمْ يُهِنْهَا وَلَمْ يُؤْثِرْ وَلَدَهٗ يَعْنِي الذُّكُوْرَ عَلَيْهَا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ (ابوداؤد)

جس کے یہاں لڑکی ہوئی تو اس نے اسے زندہ دفن نہیں کیا، اس کی تحقیر و تذلیل نہ کی اور اپنے بیٹوں کو اس پر ترجیح نہ دی تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔

لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک ان کی شادی کر دینے کے بعد ختم نہیں ہوتا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی کو طلاق دی جاتی ہے یا اس کا شوہر مر جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ پھر مجبور و محتاج ہو جاتی ہے۔ والدین پر لازم ہے کہ اس حال میں وہ اپنے یہاں اس کو پناہ دیں۔

(سراقۃ بن مالک) رفعہ: اَلَا اَدُلُّكَ عَلٰى اَفْضَلِ الصَّدَقَةِ؟ اِبْنَتُكَ مَرْدُوْدَةٌ اِلَيْكَ لَيْسَ لَهَا كَاسِبٌ غَيْرُكَ (ابن ماجہ فی الادب)

سراقہ بن مالک کہتے ہیں: مجھ سے حضورؐ نے فرمایا۔ کیا میں تجھے بہترین صدقہ کی خبر دوں؟ تیری بیٹی جو تیری طرف لوٹا دی جائے اور تیرے سوا کوئی اس کے لیے کمانے والا نہ ہو۔

یعنی طلاق کی وجہ سے یا شوہر کی موت کے سبب سے تیری بیٹی پھر تیرے گھر آ جائے اور اس کا کوئی ذریعہ آمدنی

نہ ہو تو اس بیٹی پر خرچ کرنا اور اس کی کفالت کرنا بہترین صدقہ ہے — یہ ہے وہ روحانی اور اخلاقی نقطۂ نظر جس کی تعلیم اسلام دیتا ہے۔ لیکن یہ کتنی افسوسناک بات ہے کہ مغربی عورتیں اپنے یہاں کی معاشرت سے پریشاں ہیں اور اسلامی معاشرے کو نجات کا سبب سمجھ رہی ہیں اور یہاں بہتیری مسلمان عورتیں مغربی معاشرے پر جان چھڑک رہی ہیں اس کی کئی وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ خود اسلامی معاشرے کی بنیادوں اور اس کی بہترین تعلیمات سے ناواقف ہیں دوسری یہ کہ مغرب کی ظاہری چمک دمک ان کی بصیرت کو اندھا بنا رہی ہے۔ وہ نہیں سمجھ پا رہی ہیں کہ اسلام کی آغوش رحمت کے سوا ان کے لیے کہیں پناہ نہیں ہے۔ تیسری یہ کہ مسلمان خاندانوں کے سرپرست بھی لڑکیوں کے حقوق سے ناواقف ہو گئے ہیں یا جان بوجھ کر جاہلی ذہنیت کا ثبوت دے رہے ہیں۔ ان کے حقوق میں یہ بھی ایک بڑا حق ہے کہ شادی کے وقت ان کی مرضی ضرور معلوم کی جائے۔ ان کی مرضی کے بغیر ان کی شادی نہ کی جائے۔ بہت موقعوں پر والدین اس کی پروا نہیں کرتے جس کا انجام کبھی کبھی بہت برا ہوتا ہے۔

(باقی)

دو سفر

سفر دو ہیں، ایک شخص کا، ایک مقصد کا۔ اشخاص کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنا کام کیے جائیں یہاں تک کہ اپنے آپ کو مقصد کے لیے قربان کر دیں۔ جب انھوں نے اپنے آپ کو مقصد کے لیے قربان کر دیا تو ان کا سفر منزل مقصود تک پہنچ گیا اور کامیاب ہو گئے، اب ان کے لیے یہ سوال باقی نہیں رہتا کہ مقصود حاصل ہوا یا نہیں۔ اس سفر میں سفر سے نہ تھکنا اور آخر تک چلتے رہنا ہی سب سے بڑا مقصود ہے اور اس لیے جس مسافر نے اس مقصود کو پا لیا اس نے اپنا کام پورا کر دیا۔ یہاں راہ اور منزل دو نہیں ہیں ایک ہی ہیں ؎

رہروان را خستگیِ راہ نیست عشق ہم راہ است و ہم خود منزل است

باقی رہا مقصد کا سفر تو بلاشبہ اس کی کامیابی یہ ہے کہ مقصد حاصل ہو جائے لیکن یہ انسان کا کام نہیں، نتیجہ ہوتا ہے، خدا کا کام ہے جو سورج چمکاتا ہے اور بدلیاں بھیجتا ہے اور اس کا قانون یہ ہے کہ اگر رہروانِ مقصد کامیابی کے ساتھ اپنا سفر کرتے رہے تو مقصد کا سفر بھی ایک دن پورا ہو کر رہے گا۔

مولانا ابوالکلام آزاد

(ماخوذ از زندگیِ ملت)

حالات بدل سکتے ہیں

(جناب وحیدالدین خاں صاحب)

ہندستان کے مسلمان اپنی تاریخ کے ایک نہایت تاریک دور سے گزر رہے ہیں لیکن اگر ہمارے اندر ہمت ہو تو اسی تاریک دور کے اندر وہ مواقع موجود ہیں جو ہمارے لیے ایک روشن دور کا آغاز بن سکتے ہیں۔ ایسے مواقع جو اس سے پہلے کبھی نہیں آئے۔ اور جو اس کے بعد بھی شاید کبھی نہیں آئیں گے۔

مسلمانوں کے اوپر اس وقت جو کچھ گزر رہی ہے اس کی زیادہ تفصیل پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی دور کی بات نہیں ہے جس کی میں آپ کو خبر دوں۔ یہ آج ہم میں سے ہر شخص کا ذاتی واقعہ بن چکا ہے۔ ہر وہ شخص جو مسلمان ہو اور اس ملک میں رہتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ "پرامن باہمی وجود" اور "عدم تشدد" کے اس دیس میں کس طرح مسلمانوں کو مٹانے اور ذبح کرنے کی مسلسل کوششیں ہو رہی ہیں۔ قومی یکجہتی (NATIONAL INTEGRATION) کے نام سے مسلمانوں کو نامسلمان بنانے کے ارادے، اکثریت کی طرف سے اقلیت کو لوٹنے اور ہلاک کرنے کے منظم واقعات جن کو غلطی سے "فرقہ وارانہ فسادات" کا نام دیا جاتا ہے، گھر ودیالیہ جلا دینے، بچے بچے سبھی پڑھاؤ کے معصوم نغمات کے سایے میں جبری تبدیلی مذہب کا تعلیمی منصوبہ، تہذیبی یکانگت پیدا کرنے کی کوشش جس کو بجا طور پر ایک شخص نے تہذیبی جارحیت (CULTURAL AGGRESSION) کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ۔۔۔ یہ اور اس قسم کی دوسری چیزیں آج وہ واقعات نہیں ہیں جو صرف مسلم اقلیت کے اخباروں یا ان کے مقررین کی تقریروں میں نظر آتی ہوں۔ بلکہ اگر آپ چل پھر کر دیکھیں تو یہ واقعات خود پکار کر کہیں گے کہ آج اس ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ آپ ایسے مناظر دیکھیں گے جہاں ملک کی عام آبادی سے وصول کیے ہوئے ٹیکس کو نہایت بیدردی کے ساتھ ایک مخصوص طبقہ کے مفاد کے لیے خرچ کیا جا رہا ہوگا۔ آپ کو ایسے واقعات نظر آئیں گے جبکہ ہماری جمہوری ریاست کی پولس اور سرکاری عملہ بالکل غیر جمہوری طور پر ایک فرقہ سے اس کا حق چھیننے اور دوسرے فرقے کو اس کے حق سے زیادہ دینے میں مصروف ہوں گے۔ آپ کو ایسے لوگ ملیں گے

جو بتائیں گے کہ ملک کی معاشی تقسیم میں سے اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے کس طرح انھیں اسلام کو خیر باد کہنا پڑا۔ آپ کی ملاقات ایسے نوجوانوں سے ہوگی جن کے نام تو مسلمانوں کے سے ہوں گے مگر ان کے ذہن میں تعلیم کے نام سے اکثریت کے مذہب اور تہذیب کو بھرنے کی پوری کوشش کی گئی ہوگی حتیٰ کہ آپ ایسی گلیاں اور سڑکیں دیکھیں گے جو اپنے خون کے دھبوں اور جلے ہوئے مکانات کے ساتھ پکاریں گی کہ کس طرح ایک فرقے کے لوگوں کو چن چن کر ہلاک کیا گیا ہے۔

ان حالات کو بدلنے کے لیے مسلمان جو کچھ کر رہے ہیں یا جو کچھ کرنے کے لیے سوچ رہے ہیں وہ عموماً تین قسم کی چیزیں ہیں ——— آئینی مطالبات، عدالتی مرافعہ، انتخابی طاقت کا استعمال۔

آئینی مطالبہ

اس سلسلے کی پہلی چیز آئینی مطالبہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہندستان میں ایک آئینی اور جمہوری حکومت قائم ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے باشندوں کو تمام جائز انسانی حقوق قانونی طور پر دیے گئے ہیں۔ ان حقوق کی خاطر جدو جہد کرنے کے بھی سارے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنے بارے میں جس قسم کی ناانصافیاں دیکھ رہے ہیں ان کے خلاف آئینی جدو جہد کریں، ان کو دور کرنے کے لیے قانونی مطالبات کی مہم چلائیں۔

مگر یہ حل بتانے والے لوگ بھول جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے ساتھ آج جو کچھ ہو رہا ہے وہ اتفاق سے نہیں ہو رہا ہے بلکہ بالقصد کیا جا رہا ہے۔ یہ با اقتدار طبقہ کا سوچا سمجھا ہوا منصوبہ ہے جس کو وہ مختلف طریقوں سے زیر عمل لا رہا ہے۔ موجودہ حالات کے پیش نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ قانونی تحفظ کی یہ سنہری دفعات در اصل ہمارے تحفظ کے لیے نہیں ہیں بلکہ وہ الفاظ کا ایک پردہ ہے جو عدم تحفظ کی واقعی صورت حال کو چھپانے کے لیے تیار کیا گیا ہے ایسی حالت میں آپ کی قانونی مطالبات کی مہم گویا ظالم سے خود اس کے ظلم کے خلاف فریاد کرنا ہے۔ ڈاکو سے یہ درخواست کرنی ہے کہ میرا لوٹا ہوا مال مجھے واپس کر دو۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ اس قسم کی کوئی جدو جہد شروع کریں تو اس میں ایک طرف آپ ہوں گے اور دوسری طرف حکومت۔ یہ ایک زور آور اور دبے ہوئے کا مقابلہ ہوگا حیثیت کے اس اختلاف کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی کسی بڑی سے بڑی کوشش کو بھی حکومت نہایت آسانی سے رد کر سکتی ہے۔ آپ دس سال کی جدو جہد سے مطالبات اور قانونی حقوق کی ایک دیوار کھڑی کریں گے اور حکومت اپنی بھاری بھرکم طاقت کی محض ایک ٹھوکر سے اسے زمین پر گرا دے گی۔ اس سلسلے میں کسی قیاس کی ضرورت نہیں۔ واقعات کی دنیا میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

ایک مثال لیجیے۔ دستورِ ہند کی دفعہ ۳۴۷ کے تحت دیے ہوئے ایک حق کو حاصل کرنے کے لیے اترپردیش میں ایک زبردست جدوجہد کی گئی تھی۔ یہ دفعہ صدر جمہوریہ کو یہ حق دیتی ہے کہ کسی ریاست کی آبادی کا قابلِ لحاظ حصہ اگر ایک زبان بولتا ہو تو وہ ہدایت دے سکتا ہے کہ اس زبان کو ریاست کی علاقائی زبان کی حیثیت سے تسلیم کیا جائے۔ چنانچہ اردو کے حق میں اس رعایت کو حاصل کرنے کے لیے انجمن ترقی اردو ہند نے اترپردیش میں ایک بہت بڑی مہم چلائی اور فروری ۱۹۵۰ء میں ساڑھے بیس لاکھ دستخطوں کے ساتھ جس کا وزن چودہ من تھا، ایک درخواست صدر جمہوریہ کی خدمت میں پیش کی گئی۔ اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ جو کچھ ہم اس ملک میں چاہتے ہیں ان میں یہ سب سے زیادہ جائز قانونی مطالبہ تھا۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہوا۔ اگر یہ چودہ من کا بوجھ کسی غریب خاندان کو دے دیا جاتا تو وہ اس کے مہینوں کے ایندھن کے لیے کافی ہو سکتا تھا، مگر اس زبردست جدوجہد کا اتنا فائدہ بھی قوم کو نہیں ملا اور ساری کوششوں کے باوجود ریاست کے اندر اردو زبان اب بھی اسی مظلومی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے جو اس کارروائی سے پہلے تھی۔ حتیٰ کہ اس درخواست کو پیش کیے ہوئے تقریباً دس سال ہو رہے ہیں اور ابھی تک حکومت کی طرف سے اس کا باضابطہ جواب بھی نہیں دیا گیا۔

عدالتی مرافعہ

دوسری اس سے بڑی چیز جو اس طریقِ کار کے تحت آپ سوچ سکتے ہیں وہ عدالتی مرافعہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان حکومت کے خلاف اپنی شکایتوں کے سلسلے میں عدالتِ بالا میں مقدمہ دائر کریں۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ عدالت سے صرف انھیں چیزوں کے بارے میں فیصلہ لیا جا سکتا ہے جو قانون کی مخصوص اور متعین دفعات کے تحت آتا ہو اور اس بات کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ آپ خود اپنی زندگی میں جس مسئلے کو محسوس کر رہے ہیں، اس کو قانونی طور پر بھی عدالت میں محسوس کرا سکیں گے۔ تاہم اگر کسی قابل بیرسٹر کو بیش قیمت فیس دے کر آپ اس مشکل کو حل کر لیں اور کسی مسئلۂ خاص میں عدالت کا فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے جب بھی اس پر عمل درآمد کا انحصار اس بات پر ہے کہ حکومت بھی اس فیصلے کو دل سے مان لے۔ اگر حکومت اس سے اتفاق نہ کرے تو کسی بھی قسم کا عدالتی فیصلہ صورتِ حال میں تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔

اس سلسلے میں صرف "یوپی روڈ ٹرانسپورٹ ایکٹ ۱۹۵۱ء" کی مثال نصیحت حاصل کرنے کے لیے کافی ہے۔ دس سال پہلے جب اترپردیش کی حکومت نے سڑکوں پر بس چلانے کو نیشنلائز کر لیا جس کے معنی یہ تھے کہ ریاست کی سڑکوں پر بسیں چلانے کا حق صرف ریاستی حکومت کو ہوگا، تو ریاست کے سیکڑوں موٹر کا کام کرنے والے جن

پر اس قانون کی زد پڑتی تھی انھوں نے ہائی کورٹ میں اس قانون کو چیلنج کیا۔ ہائی کورٹ نے ان کی اپیل خارج کر دی اور حکومت کے اقدام کو صحیح قرار دیا۔ اس کے بعد وہ اس معاملے کو سپریم کورٹ میں لے گئے اور وہاں انھوں نے اپنے مقدمہ کی زبردست پیروی کی۔ چنانچہ ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو سپریم کورٹ کی دستوری بنچ نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ دیا کہ یوپی حکومت کا یہ قانون دستور میں دیے ہوئے اختیارات سے باہر ہے۔ سپریم کورٹ نے اس سلسلے کی تمام اپیلیں اور درخواستوں کو منظور کر لیا اور ہائی کورٹ کے فیصلے کو مسترد کر دیا۔ عدالت نے ہدایت کی کہ ریاستی حکومت کو اپیل کرنے والوں اور درخواست دینے والوں کے خلاف یوپی روڈ ٹرانسپورٹ ایکٹ کو نافذ کرنے سے روک دیا جائے۔ مگر اس فیصلے کے باوجود آج ریاست کی سڑکوں پر ہزاروں سرکاری بسیں دوڑ رہی ہیں اور پرائیوٹ موٹریں اپنے مالکوں کے مکانوں کے سامنے پڑی ہوئی زنگ کھا رہی ہیں۔ (نیشنل ہیرالڈ ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۴)

انتخابی طاقت کا استعمال

تیسری چیز جس پر مسلمان اپنے مسائل کے حل کے سلسلے میں بھروسہ کر رہے ہیں وہ انتخابی طاقت کا استعمال ہے۔ اس کی دو خاص صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمان اپنے نمائندے اسمبلیوں میں بھیجکر وہاں اپنی آواز پیدا کریں۔ دوسرے یہ کہ الکشن کے موقع پر اپنے ووٹوں کا سودا کیا جائے۔ یعنی تمام مسلمان ووٹر مل کر اپنا ایک انتخابی شرائط نامہ (MANDATE) تیار کریں جس میں بتایا گیا ہو کہ وہ صرف اس پارٹی کے حق میں اپنی رائیں استعمال کر سکتے ہیں جو کامیاب ہونے کے بعد ان کے فلاں فلاں کام کرنے کا وعدہ کرے۔ اس طرح جو پارٹی ان کی شرائط کو مان لے، مسلمان اس کے نمائندوں کو اپنا ووٹ دیں۔ اس طریقے کو استعمال کر کے مسلمان انتخابی معاہدوں کے ذریعہ ہر پانچ سالہ مدت کے لیے اپنے مقاصد کا تحفظ کر سکتے ہیں۔

بظاہر یہ تجویزیں بڑی دلکش معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن گہرائی سے دیکھیے تو ان کی حقیقت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ ہماری کچھ سیاسی تمناؤں نے خوبصورت الفاظ کا جامہ پہن لیا ہے، واقعات کی دنیا سے صرف نظر کر کے اپنے خیال کی دنیا میں ایک فرضی قلعہ تعمیر کر لیا گیا ہے۔

جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے وہ صرف ان چند انتخابی حلقوں میں کارگر ہو سکتی ہے، جہاں مسلمان اب بھی اکثریت میں ہیں۔ اپنے اکثریتی علاقوں ہی میں مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنا کوئی آدمی کامیاب کر سکیں اور ظاہر ہے کہ ایسے انتخابی حلقے سارے ملک میں صرف چند ہیں۔ پھر جمہوری نظام میں جہاں سارے فیصلے عددی طاقت کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ آپ کے چند نمائندے اگر کامیاب ہو کر اسمبلیوں میں پہنچ بھی جائیں تو وہ کسی فیصلے پر کیونکر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ ایسے لوگ صرف احتجاجی تقریریں کر سکتے ہیں جیسے یوپی اسمبلی میں گاؤکشی بل کے موقع پر

بعض مسلمان ممبروں نے شدید تنقیدیں کی تھیں، مگر ہر وہ شخص جو اخبار پڑھتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس طرح کی جذباتی تقریروں کی حیثیت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ "کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے"۔

انتخابی معاہدے کی صورت بھی ایک دل فریب تخیل سے زیادہ نہیں۔ یہ ایک ایسی تجویز ہے جو بار بار اپنے تجربے میں ناکام ہو چکی ہے۔ ہر بار الکشن کے موقع پر مختلف پارٹیاں جو منشور (MANIFESTO) شائع کرتی ہیں، وہ کیا ہے۔ یہ دراصل ووٹروں کی اپنی تمنائیں ہیں جن کو پارٹیاں اپنے ارادے کی شکل میں ظاہر کرتی ہیں۔ انتخابی مینی فسٹو پارٹی پروگرام سے زیادہ اس مقصد کے پیش نظر تیار کیا جاتا ہے کہ اس میں ووٹروں کے حوصلوں کی ترجمانی ہو سکے۔ تاکہ وہ اس امید کے ساتھ ہمیں ووٹ دیں کہ وہ جو کچھ چاہتے ہیں، وہی کرنے کے لیے ہم اسمبلی میں جا رہے ہیں۔ مینی فسٹو اپنی حقیقت کے اعتبار سے، مینڈیٹ کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ جو کچھ ووٹر چاہتے ہیں وہ مینی فسٹو میں پارٹی خود اپنی زبان سے کہہ دیتی ہے۔ جو چیز آپ اپنی طرف سے پیش کر کے ان سے منظور کرانا چاہتے ہیں وہی وہ خود لکھ کر آپ کو دے دیتے ہیں۔ اس طرح گویا ہر پارٹی جو کسی الکشن میں ووٹروں کو متاثر کر کے کامیاب ہوتی ہے، وہ دراصل اپنے ووٹروں سے ایک غیر تحریری مینڈیٹ پر دستخط کرتی ہے۔ وہ ان سے ایک معاہدہ کرتی ہے پھر کیا ان انتخابی معاہدوں کا کوئی نتیجہ نکلتا ہے۔ کیا ووٹروں سے کیے ہوئے وہ وعدے کبھی پورے ہوتے ہیں۔ جن کی بنیاد پر ووٹروں نے انھیں اپنے ووٹ دیے تھے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ انتخابی وعدے ایک دھوکے کے سوا اور کچھ نہیں ہیں۔ وہ سیاسی بازی گری سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اسی سے آپ قیاس کر سکتے ہیں کہ ووٹروں کی وہ تمنائیں جن کو پارٹیاں یہ حیثیت دیتی ہیں کہ ان کو اپنا ذاتی پروگرام بنا کر پیش کریں۔ جب ان کا یہ حشر ہوتا ہے تو ان تمناؤں کا کیا انجام ہوگا جن کو کہہ سن کر درج فہرست کرایا گیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے انتخابی معاہدوں سے امیدیں باندھے ہوئے ہیں۔ وہ ایک ایسے تجربے کو آزمانا چاہتے ہیں جو بار بار دہرایا گیا ہے اور بار بار ناکام ہوا ہے۔

پھر مسلمانوں سے کیے ہوئے معاہدے تو اور زیادہ ناپائدار ہیں۔ کیونکہ ہم جو تحفظات اور مقاصد اس ملک میں حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ ملک کے جمہوری مزاج اور اکثریتی فرقے کے حوصلوں کے بالکل خلاف ہیں۔ وہ ملک کے سماجی منصوبوں سے براہ راست ٹکرانے والے ہیں۔ پھر کون پارٹی ہوگی جو عملی سیاست میں ان دو طرفہ تقاضوں کو نباہ سکے۔ وہ مسلمانوں کو بھی خوش رکھے اور دوسروں کو بھی خفا نہ ہونے دے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی پارٹی ہم سے ہمارے واقعی حوصلوں کے مطابق کوئی معاہدہ کر بھی لے تو وہ قطعی طور پر سیاسی مصلحت کی بنا

ہوگا جس کو اقتدار حاصل کرنے کے بعد وہ خود ہی دفن کر دے گی جیسا کہ کیرالا کے تجربے میں ہم دیکھ چکے ہیں یہ تمام تدبیریں جن پر مسلمان اپنے مسائل کو حل کرنے کے سلسلے میں اعتماد کر رہے ہیں۔ وہ سب مسئلے کو معبودِ حکومت اور معبودِ عوام کے سامنے پیش کرنے کی صورتیں ہیں۔ مگر آپ کے مسئلے کا حقیقی حل یہ ہے کہ آپ اس کو اپنے معبودِ برحق کے سامنے پیش کریں۔ آپ اس کے لیے اپنے خدا سے درخواست کریں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک کے مسلمان اگر جھوٹے معبودوں کو چھوڑ کر اپنے مالک کی طرف پلٹ آئیں اور اس زمین پر یہ واقعہ ظہور میں آئے کہ آخری رسول کی امت اپنے رب کو پکار کر یہ کہہ رہی ہو کہ "خدایا تیرے بندوں پر ظلم ہو رہا ہے تو ان کی مدد فرما" تو میں اس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں جس نے مصر میں بنی اسرائیل کو فرعون کے عذاب سے بچایا تھا۔ تمہاری دعا کے ختم ہونے سے پہلے یہاں کے زمین و آسمان بدل چکے ہوں گے اور اگلے روز دیکھنے والے دیکھیں گے کہ اس ملک میں ایک نیا انقلاب آچکا ہے جس طرح اس سے پہلے دیکھنے والوں نے بہت سے انقلابات دیکھے ہیں۔

فرعون کے زمانے میں مصر میں بنی اسرائیل کے جو حالات تھے ان کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم آج اس ملک میں ٹھیک انھیں حالات سے دوچار ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی بنی اسرائیل کی مصری زندگی سے بہت ملتی جلتی ہے۔ اس لیے بنی اسرائیل کو اس وقت جو حل بتایا گیا تھا وہی اس وقت ہمارے مسئلے کا بھی حل ہے۔ جب فرعون نے یہ فیصلہ کیا کہ بنی اسرائیل کی نسل سرزمین مصر سے ختم کر دی جائے اور ان پر سخت ترین مظالم ڈھانے شروع کیے تو ان کے پیغمبر نے اس وقت انھیں جو حل بتایا وہ یہ تھا:-

قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ۝ قَالُوا أُوذِينَا مِن قَبْلِ أَن تَأْتِيَنَا وَمِن بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَن يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝

(اعراف-۱۲۹-۱۲۸)

موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور صبر کرو۔ ملک اللہ کا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے۔ اور انجام تو صرف متقیوں کے لیے ہے۔ لوگوں نے کہا۔ تمہارے آنے سے پہلے بھی ہم ستائے جا رہے تھے اور تمہارے آنے کے بعد بھی ستائے جا رہے ہیں۔ پیغمبر نے جواب دیا قریب ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور زمین کا اقتدار تم کو عطا کرے پھر دیکھے کہ تم کیسے عمل کرتے ہو

اس تقریر میں بنی اسرائیل کے قومی مسئلے کا جو حل بتایا گیا ہے وہ دو نکات پر مشتمل ہے۔ استعانت باللہ اور صبر۔ ٹھیک یہی بات سورہ یونس میں بھی کہی گئی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں استعانت باللہ اور صبر کے بجائے اقامتِ صلوٰۃ اور توکل کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ (یونس ۸۴ - ۸۸) یہ دونوں لفظ بظاہر دو قسم کے ہیں مگر وہ حقیقۃً بالکل ایک ہیں۔ استعانت باللہ دراصل نماز کی روح ہے اور صبر و توکل ایک ہی حقیقت کے اظہار کے لیے دو ہم معنی الفاظ ہیں۔ اس دوسرے مقام پر اسی کے ساتھ انھیں یہ بشارت بھی دی گئی ہے کہ اگر تم نے اس پروگرام پر عمل کیا تو یقیناً تمہارے لیے خدا کی طرف سے "رزق طیب" اور "مبوء صدق" کا انتظام کیا جائے گا۔

اب دیکھیے کہ پروگرام کے یہ دونوں اجزا ہم سے کن چیزوں کا تقاضا کرتے ہیں۔

استعانت باللہ

پہلی چیز یہ کہ آپ اپنے معاملے میں خدا کے آگے مدد کے طالب ہوں۔ خدا ہی سب کچھ دینے والا ہے مگر وہ اسی کو دیتا ہے جو اس سے مانگے۔ مادہ پرست لوگ تو یہی سمجھتے ہیں کہ کسی کو ملنا اور کسی سے چھننا یہ سب مادی اسباب کے تحت ہونے والے واقعات ہیں۔ وہ "ظاہرِ حیات" کو اصل حقیقت سمجھے ہوئے ہیں۔ مگر آپ کا ایمان ہے کہ اس دنیا کا اصل حاکم اور کارساز خدا ہے۔ وہی سارے واقعات کو وجود میں لاتا ہے۔ پھر آپ اگر اس سے نہیں مانگیں گے تو اور کس سے مانگیں گے۔ آپ کو تو اپنی ساری مشکلیں اسی کے سامنے پیش کرنا ہے اور اسی سے یہ امید رکھنا ہے کہ وہ آپ کے مسائل کا حل پیدا کرے گا۔

یہاں میں آپ کو ایک واقعہ یاد دلانا چاہتا ہوں۔ بیس سال پہلے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ ہمارے علاقے میں سخت خشک سالی ہوئی۔ برسات کا موسم گزرتا جا رہا تھا مگر بارش کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہفتوں سے پانی کا ایک قطرہ زمین پر نہیں گرا تھا۔ کسان روزانہ صبح اٹھتے ہی آسمان کی طرف دیکھتے تھے۔ مگر بادل کا ایک ٹکڑا بھی کہیں نظر نہ آتا تھا جس سے دل کو تسکین ہو۔ بالآخر یہ تحریک ہوئی کہ استسقاء کی نماز پڑھی جائے۔ اعظم گڑھ سے پندرہ میل کے فاصلے پر ایک میدان میں اطراف کی تمام بستیوں کے مسلمان جمع ہوئے۔ مرحوم مولانا محمد سعید صاحب ندوی جو اس وقت مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر) میں حدیث کے استاد تھے، انھوں نے نماز پڑھائی۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہے۔ ہم لوگ سخت چلچلاتی ہوئی دھوپ میں سفر کرکے وہاں پہنچے تھے اور اس حال میں نماز ادا کی تھی کہ جسم پسینے سے شرابور ہو رہا تھا۔ مگر نماز سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ واپس ہوئے تو راستے ہی

میں بارش شروع ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے درختوں کے نیچے پناہ لی اور کچھ بھیگتے ہوئے اپنے گھروں کو بھاگے۔
یہ کوئی اتفاقی واقعہ نہیں بلکہ ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لیے یہ ایک آنکھوں دیکھی حقیقت ہے۔ کتنی ہی بار ہمارے خدا نے ہم کو یہ منظر دکھایا ہے۔ کہ خشک سالی میں عام مسلمانوں نے جمع ہو کر استسقا کی نماز پڑھی اور اس کے بعد ہی آسمان سے پانی کا سیلاب بہ پڑا۔ اسی تجربے میں اس سوال کا جواب ہے جو آج ہندستان کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ پریشان کیے ہوئے ہے اور وہ جواب یہ ہے کہ اس خدا سے مدد مانگو جو سورج نکالتا ہے اور پانی برساتا ہے، جو تمہاری ایک دعا پر اپنے بادلوں کو لیے ہوئے تمہارے پاس دوڑا چلا آتا ہے۔ تم پکارو تو وہ پھر تمہارے پاس آئے گا۔ تم اس سے مدد مانگو تو وہ تمہاری مشکل کو آسان کر دے گا۔

جیسا کہ میں نے اوپر بتایا "استعانت باللہ" کی جگہ قرآن میں دوسرے مقام پر "اقامت صلوٰۃ" کا لفظ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ استعانت باللہ کی روح پیدا کرنے کا حقیقی ذریعہ [illegible] ہے۔ اس کا ذریعہ نماز ہے نماز کا مطلب کچھ الفاظ اور کچھ رکعتوں کو دہرانا نہیں بلکہ اس کو بطور ایک حقیقت اپنی [illegible] گی میں شامل کرنا ہے، صحیح معنوں میں نمازی بن جانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ خدا سے جڑ جائے۔ وہ ایک ایسی زندگی گزارے جس میں وہ اپنے رب کو پکار رہا ہو، اس کی یاد میں مشغول ہو، اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہوں۔ اس پر خدا کا تصور اتنا چھایا ہوا ہو کہ دنیا کا ہر واقعہ اس کے ذہن میں جا کر خالق کی یاد دلانے والا بن جائے۔ اقامتِ صلوٰۃ دراصل خدا سے تعلق قائم کرنے کی ایک مسلسل کوشش کا نام ہے۔ نمازی بندے سے مراد وہ بندہ ہے جس کے دل میں خدا بس گیا ہو، جس کے لیے خدا ایک ایسی ہستی بن گیا ہو جس سے وہ بے حد ڈرتا ہو، جس سے وہ بے حد محبت کرتا ہو، جس کی نماز اس کی قلبی حالت کا ایک مجسم اظہار ہو۔ جو نماز پڑھے تو اس میں وہ سب کچھ پالے جس کے لیے خدا نے نماز کا طریقہ مقرر کیا ہے۔

یہ اقامتِ صلوٰۃ ہی آدمی کے اندر وہ روح پیدا کرتی ہے کہ جب وہ خدا سے سوال کرے تو اس کا سوال ان کیفیات سے بھرا ہوا ہو جو خدا کے نزدیک حقیقۃً سوال ہے، جس کو واقعی معنوں میں استعانت باللہ کہا جا سکے۔ جو حقیقی معنوں میں نمازی ہے وہی حقیقی معنوں میں سائل بن سکتا ہے۔

خدا سے مانگنا محض ایک بٹن دبانا نہیں ہے بلکہ یہ ایک انتہائی مجبور اور عاجز بندے کا انتہائی قادر اور عالم بالغ علم ہستی سے سوال کرنا ہے۔ اس لیے جب بندہ خدا سے مانگے تو اس کے سوال میں اس صورت واقعی کا پورا اظہار ہونا

چاہیے جس سے مانگ رہا ہے اس کے بارے میں نہایت عظیم تصور اور جو مانگنے والا ہے اس کا اپنے متعلق نہایت عجز اور لاچاری کا احساس۔ جب یہ واقعہ کسی دعا میں پوری طرح شامل ہو گیا ہو، جب سائل بالکل اسی کیفیت میں ڈھل جائے تو اس وقت اس کی زبان سے جو الفاظ نکلتے ہیں ان کو استعانت باللہ کہا جاتا ہے۔

یہ پہلی تدبیر ہے جو مسلمانوں کو اپنے مسئلے کے حل کے سلسلے میں اختیار کرنا ہے۔ حکومت سے "ربط" پیدا کرنے کے بجائے انھیں خدا سے ربط پیدا کرنا ہے۔ پریس سے آواز اٹھانے کے بجائے دل کی خاموش زبان سے خدا تک اپنی آواز پہنچانا ہے۔ دنیا کی عدالتوں سے دادخواہ ہونے کے بجائے خدا کے سامنے گریہ وزاری کرنا ہے۔ بیلٹ بکس کے بے جان فیصلوں میں اپنی تقدیر ڈھونڈنے کے بجائے سال کی ان راتوں میں قسمت آزمائی کرنی ہے جب قضا و قدر کی طرف سے قوموں کے نوشتے لکھے جاتے ہیں (فیہا یفرق کل امر حکیم۔ دخان)

صبر

قبولیت دعا کی دوسری شرط صبر ہے۔ خدا کے دربار سے اسی کو ملتا ہے جو مانگنے کے ساتھ ساتھ صبر کا ثبوت بھی دے رہا ہو۔ صرف لفظی طور پر مانگنا خدا کے یہاں سنا نہیں جاتا۔ اس کی طرف صرف "کلمۂ طیب" ہی اٹھتا ہے اور "عمل صالح" اسے خدا تک لے جاتا ہے۔ جو قول کلمۂ طیب نہ ہو اور جس کے پیچھے عمل صالح موجود نہ ہو وہ ہرگز خدا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اور صبر عمل صالح کی آخری کیفیت ہے جب بندہ سخت ترین حالات کے باوجود اپنے رب کی مرضی پر جما رہتا ہے تو وہ عمل کا انتہائی ثبوت دیتا ہے اور اسی کا نام صبر ہے۔ صبر عملِ صالح کا انتہائی درجہ ہے، اسی لیے وہ قبولیتِ دعا کا بھی انتہائی وقت ہوتا ہے۔

صبر کے معنی ہیں جمنا، تمام مشکلات کے باوجود اپنے مسلک پر ڈٹے رہنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حالات جب آپ کو خدا کے راستے سے ہٹانے کے لیے زور کر رہے ہوں تو آپ اپنی ساری طاقت اس پر قائم رہنے میں لگا دیں، آپ ہر قسم کا نقصان برداشت کر لیں مگر یہ برداشت نہ کریں کہ آپ کا خدا جو ہر آن آپ کو دیکھ رہا ہے وہ آپ کو حق کے راستے سے ہٹا ہوا پائے۔ آپ کی دعا محض کچھ الفاظ کی تکرار نہ ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہو کہ بندہ خدا کی راہ پر قائم رہنے کے لیے اپنا آخری زور صرف کرتے ہوئے اپنے رب کو پکار رہا ہے کہ خدایا تو میری مدد کے لیے آجا۔ کیونکہ میں صرف اپنی طاقتوں کے بل پر ٹھہر نہیں سکتا۔ اگر تو نے مجھ کو سہارا نہ دیا تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔

اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے آپ اس ملک میں جو مہم چلانا چاہتے ہیں اس میں آپ اسی وقت کامیاب ہو سکتے ہیں جب آپ خدا کو بھی اپنے ساتھ لے لیں اور خدا کو ساتھ لینے کی شرط صبر ہے۔ (اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ) خدا کا ساتھ آپ کو اسی وقت مل سکتا ہے جب آپ انتہائی مشکل حالات کے باوجود پورے

صبر کے ساتھ خدا کی مرضی پر جمے رہیں۔ دنیا کی عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ لینے کے لیے محض وکیلانہ پیروی کافی ہوسکتی ہے۔ مگر جو شخص خدا کی تائید حاصل کرنا چاہتا ہو اس کے لیے اپنے مقدمہ میں مخلص ہونا ضروری ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جس چیز کے لیے وہ اٹھا ہے اس کا وہ محض ایک دعوے دار نہ ہو بلکہ اس کو اپنی زندگی کا مقصد بنا چکا ہو وہ ہر حال میں اس سے لپٹا رہنا چاہتا ہو۔ یہ مقصد اس سے جو کچھ کرنے کے لیے کہے وہ اس کو کرے اور وہ جو کچھ اس سے چھوڑنے کے لیے کہے اس کو وہ چھوڑ دے۔ اسلام کی تاریخ سے ہم کو جو سبق ملتا ہے وہ یہی ہے مکی زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کا آخری حد تک ثبوت دے دیا جائے کہ اہل ایمان ہر حال میں خدا کے دین پر قائم رہنا چاہتے ہیں جب یہ ثبوت مکمل ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ حالات کے اندر ایسی تبدیلیاں پیدا کر دیتا ہے جس میں اہل ایمان کو اپنی کامیابی کی راہیں صاف نظر آنے لگتی ہیں اس وقت وہ اقدام کرتے ہیں اور ان راہوں کو استعمال کر کے کامیابی کی منزل تک پہنچ جاتے ہیں۔ اسی دوسرے مرحلے کا نام مدنی زندگی ہے۔

مجھے یہ کہنے کا موقع دیجیے کہ آپ کا مقدمہ ابھی اس پہلو سے بہت کمزور ہے۔ آپ کی پکار صبر کی کیفیت سے خالی ہے۔ ابھی آپ اپنی مہم کو محض کرسی اور میز کی سطح پر چلا رہے ہیں لیکن اگر اسے آپ کامیابی تک پہنچانا چاہتے ہیں تو اس کو عمل اور قربانی کی سطح پر چلانا ہوگا۔ مثال کے طور پر آپ کے سامنے ایک مسئلہ اردو زبان کا ہے۔ اردو آپ کی ملی زندگی کے لیے ضروری ہے اس لیے آپ اس کو زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن ذرا دیکھیے اس معاملہ میں آپ کی قوم کا کیا حال ہے۔ سینما کی کھڑکی پر ہمارے نوجوانوں کی بھیڑ لگی رہتی ہے مگر شبینہ مدارس میں انھیں پڑھنے کے لیے بلائیے تو وہ نہیں آئیں گے۔ سگریٹ اور پان میں بے تکلف پیسے خرچ کریں گے لیکن اگر ان سے کہیے کہ اردو اخبار اور کتابیں خرید کر پڑھو تو اس کے لیے ان کی جیب خالی ہوگی۔

یہ صرف عام لوگوں کا حال نہیں ہے بلکہ آپ کے لیڈر اور آپ کے نمائندہ اشخاص کا حال بھی اس معاملے میں کچھ مختلف نہیں ہے۔ اس سلسلے میں میں یہ عبرت انگیز واقعہ آپ کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ۱۹۵۱ء میں جب یوپی اسمبلی میں کانگرس کی طرف سے یہ تجویز پیش ہوئی کہ ریاست کی سرکاری زبان ہندی ہوگی جو دیوناگری رسم الخط میں لکھی جائے گی۔ تو اس وقت کے ایک مسلم ممبر مولوی عبد الباقی صاحب (اعظمی) نے اصل تجویز پر ان الفاظ میں ایک ترمیم پیش کی کہ —— "اور اردو بھی فارسی رسم الخط کے ساتھ" یہ ترمیم اردو کی بقا کے لیے کتنی اہمیت رکھتی ہے اس کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن کس قدر حیرت کی بات ہے کہ دوسرے تو دوسرے خود آپ کے

نمائندوں کی تائید بھی اسے حاصل نہ ہوسکی۔ حکومت کا یہ فیصلہ آپ کی قومی زندگی کے لیے موت کی حیثیت رکھتا ہے۔
مگر آپ کے نمائندوں نے اپنی سیاسی موت کے اندیشے کو قوم کی موت کے مسئلے پر ترجیح دی۔ اور صاحب تجویز کے خیال کے مطابق انھوں نے صرف اس لیے اس کی تائید نہیں کی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کانگریس خفا ہو کر آئندہ الکشن میں انھیں اپنے ٹکٹ سے محروم کر دے۔ یوپی اسمبلی میں اس وقت مسلمان ممبروں کی مجموعی تعداد ۶۸ تھی۔ لیکن جب رائے شماری ہوئی تو ۶۸ ممبروں میں سے صرف پانچ نے ترمیم کے حق میں ووٹ دیے۔ باقی یا تو غیر حاضر رہے یا پھر انھوں نے کانگریس کی اصل تجویز کے حق میں ووٹ دیے۔ ایک بزرگ نے تقریر میں تو مولوی عبد الباقی صاحب کی ترمیم کی حمایت کی مگر ووٹ ترمیم کے خلاف دیا۔ ایک صاحب غیر جانبدار رہے۔ (سیاست ۲۲ دسمبر ۱۹۵۸ء)

حکومت کی تعلیمی پالیسی کے سلسلے میں آج کل ہمارے یہاں بہت برہمی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ جگہ جگہ جلسے اور احتجاج کیے جا رہے ہیں۔ مگر اس معاملے میں خود مسلمانوں کا کیا حال ہے۔ انگریزی سکولوں اور کالجوں کی مہنگی تعلیم کو وہ نہایت خوشی سے برداشت کر سکتے ہیں لیکن اردو اور عربی کے مدارس میں مفت تعلیم کا انتظام کیجیے جب بھی وہ اپنے بچوں کو وہاں نہیں بھیجیں گے۔ جو لوگ دینی طرز کی درس گاہیں چلا رہے ہیں ان کو اس سلسلے میں نہایت تلخ تجربہ ہوا ہے۔ اولاً تو اس قسم کی درس گاہوں کے لیے بہتر اساتذہ نہیں ملتے۔ کیونکہ دنیا کے بازار میں ان کی صلاحیتوں کی جتنی قیمت مل رہی ہے اتنی قیمت یہ بے چاری دینی درس گاہیں نہیں دے سکتیں۔ مجبوراً کمتر درجے کے اساتذہ کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اس قسم کی درس گاہوں کے لیے طلبہ نہیں ملتے اور جو ملتے ہیں وہ آخر تک نہیں ٹھہرتے۔ یہ مدارس اپنے غیر سرکاری نصاب کی وجہ سے چونکہ منظور شدہ نہیں ہیں اس لیے ان کی تعلیمی سندیں سرکاری طور پر کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے پڑھے ہوئے لوگ کسی ایسی ملازمت کے لیے درخواست نہیں دے سکتے جس کے لیے منظور شدہ تعلیمی ادارے کی ڈگری درکار ہوتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ اپنے بچوں کو ان درس گاہوں میں بھیجتے ہیں وہ ابتدائی درجات کے بعد انھیں واپس بلا کر سرکاری اسکولوں میں داخل کر دیتے ہیں۔ وہ اس کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ ان کا بچہ پڑھ لکھ کر بے قیمت رہے۔ وہ تعلیم کی قیمت چاہتے ہیں۔ خواہ وہ قیمت شیطان ہی کی خدمت کر کے مل رہی ہو۔

اس صورت حال کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی زبانی درخواست کے پیچھے جس عملی تصدیق کی ضرورت ہے وہ آپ کی زندگیوں میں موجود نہیں ہے۔ دنیا کے معمولی فائدوں کے لیے آپ خدا کے احکام کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ اپنی نسلوں کو اسلام پر باقی رکھنے کا اہتمام کرنے سے زیادہ آپ کو اس بات کی فکر ہے کہ دنیا میں ان کا مستقبل

محفوظ ہو جائے اور یہاں کے ساز و سامان میں زیادہ سے زیادہ جتنا حاصل کر سکتے ہیں حاصل کر لیں۔ آپ دوسروں سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ دین کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالیں مگر خود آپ سے خدا کا دین جن باتوں کا تقاضا کر رہا ہے اس سے غافل ہیں۔ حالات کی باگ خدا کے ہاتھ میں ہے اس لیے حکومت سے تعلیمی نظام کو بدلنے کا مطالبہ دراصل خدا سے یہ کہنا ہے کہ وہ آپ کو اس ملک میں اسلام کے مطابق زندگی گزارنے کا موقع دے۔ لیکن آج کے حالات میں آپ کو اسلام کے تقاضوں پر عمل کرنے کے جو مواقع دیے گئے ہیں اس میں اگر آپ اس کا ثبوت نہیں دیتے تو کس بنا پر یہ توقع رکھتے ہیں کہ مستقبل کے بارے میں آپ کی درخواست منظور کی جائے گی۔

آپ مسلمان ہیں۔ آپ وہ گروہ ہیں جس نے خدا کی زمین پر خدا کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کا اقرار کیا ہے۔ ایسے کسی گروہ کے لیے خدا کا قانون یہ ہے کہ اگر وہ اپنے عہد پر قائم رہے تو اس کے لیے زمین کو ہموار کر دیا جاتا ہے اور اطاعت و بندگی کی تمام راہیں اس کے لیے آسان کر دی جاتی ہیں لیکن اگر وہ اپنے عہد کو بھول جائے اور خدا کے عہد سے روگردانی کرے تو اس کو صبر کے امتحان میں ڈال دیا جاتا ہے، اس کو ایسے حالات میں مبتلا کر دیا جاتا ہے جہاں دین پر عمل کرنا پہلے سے زیادہ دشوار ہو۔ اس کی ایک مثال یہود کی تاریخ کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر قرآن کی ساتویں سورہ میں کیا گیا ہے۔

اب سے ڈھائی ہزار برس پہلے جب امت مسلمہ ہونے کی وہ حیثیت یہود کو حاصل تھی جو آخری نبی کی بعثت کے بعد آپ کو دی گئی ہے۔ اس وقت حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں بحر قلزم کی مشرقی شاخ کے کنارے ایک شہر تھا جہاں یہودی آباد تھے۔ اس زمانے میں یہود کے لیے یہ قانون تھا کہ وہ ہفتہ (سبت) کے دن روزہ رکھیں اور اس دن صبح سے شام تک صرف عبادت و ریاضت میں گزاریں۔ دریا کے کنارے ہونے کی وجہ سے ان کی معاشیات کا انحصار زیادہ تر مچھلی کے اوپر تھا۔ وہ اس کو کھاتے تھے اور بیرونی علاقوں میں اس کی تجارت کرتے تھے۔ قانونِ سبت کے مطابق انھیں چاہیے تھا کہ وہ چھ دن تک مچھلیوں کا شکار کرتے اور ساتویں دن اس قسم کے تمام کاموں سے فارغ ہو کر خدا کی عبادت میں گزارتے۔ مگر انھوں نے اس حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کی اور ہفتے کے سارے ہی دنوں میں شکار کرنے لگے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا ہوا کہ مچھلیاں صرف سبت کے دن، جس دن شکار کرنا ممنوع تھا، سطح کے اوپر رہتی تھیں اور بقیہ چھ دنوں میں پانی کی تہہ میں دریا کے نیچے چلی جاتی تھیں۔ گویا پہلے اگر ہفتہ میں ایک دن روزہ رکھنے کا حکم تھا۔ تو اب یہ حکم ہوا کہ پورا ہفتہ روزے میں گزارو۔ کیونکہ قانونِ سبت پر عمل کرنے کی صورت میں جب وہ مچھلیوں کے اوپر آنے والے دن شکار نہیں کر سکتے تھے تو بقیہ دنوں میں کیا پکڑتے [illegible]

لیکن اگر یہود صبر کی روش اختیار کرتے اور ایک ہفتہ بھی انھوں نے ایسا گزارا ہوتا کہ خدا کے حکم پر عمل کرنے کی وجہ سے وہ سات دن بھوکے رہ جاتے تو آپ یقین مانیے کہ جس خدا کے حکم سے مچھلیاں پانی کے نیچے چلی گئی تھیں وہ انہیں حکم دیتا اور مچھلیاں اہل کران کے گھروں میں آجاتیں اور ان کا شکار کرنے کے لیے انھیں دریا جانے کی ضرورت بھی نہ ہوتی۔ مگر اس صورت حال کے پیش آنے کے بعد وہ ممنوع دنوں میں اور زیادہ شکار کرنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ ان کی صورتیں مسخ ہو گئیں اور وہ بندر بنا دیے گئے۔ اَعَاذَنَا اللّٰہُ مِنْہَا

آپ اس وقت جس صورت حال سے دوچار ہیں وہ بھی کچھ اسی نوعیت کا واقعہ ہے۔ مسلمانوں کی مسلسل بے عملی اور بے حسی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر ایک ایسے نظام کو مسلط کر دیا ہے جو ان کے عقیدہ و ایمان کو ان سے چھین رہا ہے جو آپ کی نسلوں کو اسلام سے کاٹ کر کفر و شرک کی گود میں لے جانے والا ہے۔ جس کے نزدیک "مسلمان" ہونا اتنا بڑا جرم ہے جس کی سزا ڈاکہ اور قتل سے بھی زیادہ سخت دی جاتی ہے۔ جس میں اسلام کے تقاضوں پر عمل کرنا اپنی دنیا کو بالکل تباہ و برباد کر لینا ہے۔ اس طرح آپ کو ایک ایسی حالت میں ڈال دیا گیا ہے جب کہ اسلام پر قائم رہنے کے لیے معمولی حالات سے زیادہ سخت جدوجہد کی ضرورت ہے۔ گویا پہلے اگر صرف عمل کا مطالبہ تھا تو اب قربانی کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہ آپ کے صبر کا امتحان ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ معمولی حالات میں آدمی کی جو ذمہ داریاں ہوتی ہیں اس کے مقابلے میں اس وقت کی ذمہ داریاں زیادہ شدید ہوتی ہیں جب کہ آدمی امتحان کے لیے کھڑا کر دیا گیا ہو۔ آج آپ امتحان کی حالت میں ہیں۔ اس لیے بندگی کا ثبوت دینے کے لیے آج آپ کو پہلے سے زیادہ جاں فشانی کی ضرورت ہے۔ آپ کو زبردست قربانیوں کے ذریعہ اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ آپ فی الواقع خدا کے بندے بنکر رہنا چاہتے ہیں۔ آپ سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں مگر بندگی کی راہ کو نہیں چھوڑ سکتے۔ یاد رکھیے ہر رکاوٹ جو دین کی راہ میں آتی ہے وہ اس لیے آتی ہے تاکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزمائے کہ وہ کس حد تک اس کے وفادار ہیں۔ یہ رکاوٹیں درحقیقت آپ کے اندر چھپے ہوئے جذبات کو بیدار کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ حکومت کی اسکیمیں جو آپ کی ملی زندگی کو ختم کرنے کے لیے شروع کی گئی ہیں۔ اکثریت کے مظالم جن کا نشانہ آپ صرف اس لیے ہیں کہ آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہیں۔ یہ سب آپ کو آخری حد تک جھنجھوڑنے کے لیے ہیں۔ یہ آپ کے دینی احساسات کا آخری امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ کے اندر بے قراری کا وہ جذبہ ہے یا نہیں جو اس کی مرضی کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالنے کے لیے ایک مومن کے اندر ہونا چاہیے۔ اگر یہ شدید ترین ضرب بھی آپ کے احساسات کو

بیدار نہ کر سکے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ موت کی نیند سو چکے ہیں اب آپ کے اٹھنے کی کوئی امید نہیں۔

تعلیم کے پہلو سے مسلمانوں کے سامنے آج جو مسئلے پیدا ہو گئے ہیں ان کو لیجئے آپ جانتے ہیں کہ موجودہ زمانے
کی تعلیم صرف علم حاصل کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ دنیوی کامیابی کا سارا انحصار اسی کے اوپر ہے۔ عزت اور
[خو]ش حالی بالکل اسی سے بندھی ہوئی ہے۔ موجودہ تمدنی دور میں تعلیم زندگی کے ہر شعبے اور ترقی کی تمام راہوں
[کے ل]یے ایک لازمی چیز بن گئی ہے۔ ایک طرف تعلیم کی یہ اہمیت ہے اور دوسری طرف یہ واقعہ کہ بچوں کو
[ت]علیم دلانا ان کی اسلامی حیثیت کو ختم کرنے کا ہم معنی بن گیا ہے۔ موجودہ سکولوں میں پڑھنے والے طلبہ کو
[د]یکھ کر اگر آپ مستقبل کے ہندوستانی مسلمان کا اندازہ لگائیں تو بلا شبہہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اکبری دور میں
[اگ]ر چند مسلمان کرشن بھگت بن گئے تھے تو اب ساری قوم کا یہی انجام ہونے والا ہے۔ اس طرح حالات نے آپ کو
[ا]یسے مقام پر لاکھڑا کیا ہے جہاں آپ دو چیزوں کو بیک وقت نہیں لے سکتے۔ اگر آپ عزت اور خوش حالی کو لینا
[چاہتے ہ]یں تو دین کو چھوڑنا پڑے گا اور اگر دین کو لینا چاہیں تو خوش حالی اور ترقی کے سارے خواب بھلا دینے ہوں گے۔

یہی آپ کے امتحان کا پرچہ ہے۔ خدا آج یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ آپ دنیا اور آخرت میں سے کس کو ترجیح دیتے
[ہ]یں یقیناً یہ امتحان بڑا سخت ہے۔ اس میں اپنی دنیا کو اپنے ہاتھوں برباد کرنا ہے۔ مگر خدا کی مدد ہمیشہ ایسے
[ہ]ی حالات میں آتی ہے۔ سخت ترین حالات ہمیشہ اس بات کی علامت ہوتے ہیں کہ فیصلے کا وقت قریب آگیا
ہے۔ اور اگر اہل ایمان آخری حد تک اس بات کا ثبوت دے دیں کہ وہ خدا کی مرضی کے مطابق زندہ رہنا چاہتے
[ہ]یں تو خدا کے فرشتے آکر ان کی راہ کے تمام کانٹے ہٹا دیتے ہیں اور دین پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہیں
[ر]ہتی۔ یہ آپ کے لیے مایوسی اور دل شکنی کا وقت نہیں بلکہ انتہائی امید کا وقت ہے۔ یہ وہ وقت ہے جبکہ آپ زیادہ
[س]ے زیادہ قربانی کر کے زیادہ سے زیادہ خدا کے انعام کے مستحق بن سکتے ہیں مشکل حالات میں صبر کے ساتھ حق پر جمے رہنا —— یہی وہ چیز
[ہ]ے جو خدا کی مدد کو کھینچتی ہے اور اہل ایمان کو کامیابی کے مقام پر پہنچاتی ہے۔ ہندوستان کے موجودہ حالات جن
[میں] قومی حیثیت سے آپ کو اپنی موت نظر آ رہی ہے اسی میں آپ کے لیے زندگی کے اسباب چھپے ہوئے ہیں بشرطیکہ
[آ]پ صبر کا ثبوت دیں۔ بنی اسرائیل کی زندگی کا یہ واقعہ تاریخی الفاظ میں آپ کے لیے مستقبل کی خوش خبری ہے:

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا — اور جو لوگ کمزور سمجھے جا رہے تھے ان کو ہم نے
يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا — مبارک ملک میں اس سرے سے اس سرے تک قبضہ دے دیا
الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ — اور تیرے رب کا نیک قول بنی اسرائیل کے حق میں

الْحُسْنٰی عَلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا	پورا ہوا اس وجہ سے کہ انہوں نے صبر کیا اور ہم نے
وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَ	فرعون اور اسکی قوم کو اس کی تمام صنعت و زراعت
قَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ (اعراف ۱۳۷)	کے ساتھ تباہ کردیا

دوستو! آج زمین کا مالک یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کیا آپ کے اندر ایسے حوصلہ مند لوگ ہیں جو اس بات کا ثبوت دیں کہ وہ اپنے دین و ایمان کو آخری حد تک بچانا چاہتے ہیں خواہ اس کوشش میں وہ ہر دوسری چیز سے محروم ہو جائیں جو دنیا والوں کی نظر میں خوش پوشاک اور خوش مکان بننے کے مقابلے میں خدا کی نظر میں وفادار بننے کی تڑپ رکھتے ہوں، جو معیار زندگی حاصل کرنے سے زیادہ اس بات کے لیے بے چین ہوں کہ آخرت میں ان کا انجام کیا ہوگا۔ آج آپ کا خدا یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کیا آپ کے اندر ایسے لوگ ہیں جو ایک اعلیٰ سرکاری ملازمت کو محض اس لیے چھوڑ دیں کہ وہ ان سے غیر اللہ کی وفاداری کا مطالبہ کرتی ہے۔ کیا آپ کے اندر ایسے لوگ ہیں جو کاروباری منافع کے امکانات سے محض اس لیے اپنے آپ کو محروم کر لیں کہ مسلمان رہتے ہوئے وہ اسے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ کیا آپ کے اندر ایسے لوگ ہیں جو محض ایمان کی خاطر اپنے بچوں کو لادینی اداروں میں نہ بھیجیں خواہ ان کے بچے جاہل رہ جائیں اور خواہ ان کا دنیوی مستقبل برباد ہو جائے۔ آپ کی قوم کے وہ لاکھوں اشخاص جن کی معاشیات اس غلط نظام سے وابستہ ہیں، جو ان کے اندر ترقی اور خوش حالی کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ آج آپ کا خدا دیکھنا چاہتا ہے کہ کیا وہ ان تمام مواقع کو محض اس لیے خیرباد کہہ دیتے ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھانا ان کے ایمانی تقاضوں کے خلاف ہے۔ آج آپ کو اپنے صبر و عزم کا زبردست امتحان دینا ہے۔ آج آپ کی پوری قوم کو اسلام کی خاطر غیر اسلام سے بائی کاٹ کرنا ہے۔ آپ کو اس بات کا ثبوت دینا ہے کہ اپنی زبانوں سے آپ جس چیز کو غلط کہہ رہے ہیں آپ فی الواقع دل سے بھی اس کو غلط سمجھتے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ یہ حل جو تم ہم کو بتا رہے ہو اس میں تو ہمیں اپنی موت نظر آتی ہے۔ یہ تو صریح طور پر اپنی معاشیات کو تباہ کر لینا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ قبل اس کے کہ دشمن ہمیں قتل کرے ہم خود ہی اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لیں۔ مگر اس خدا کی قسم جس کی زمین پر میں کھڑا ہوں اور جس کے آسمان کے نیچے آپ کو مخاطب کر رہا ہوں اگر اس ملک کے مسلمان ایک بار بھی اس کا ثبوت دیدیں کہ وہ خدا کے دین پر قائم رہنے کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں دینے کے لیے تیار ہیں تو صبح کی شام بھی نہیں ہونے پائے گی کہ خدا کے فرشتے خدا کی مدد لے کر آسمان سے اتر پڑیں گے اور آپ کے سارے مسئلے اس طرح حل ہو جائیں گے گویا کہ وہ تھے ہی نہیں۔

خدا کی مدد آج بھی ظاہر ہو سکتی ہے بشرطیکہ ہم اپنی بندگی ظاہر کرنے کے لیے تیار ہوں۔

ستمبر کے اشارات کی تکمیل

(سید احمد قادری)

ستمبر ۶۲ء کے اشارات میں برہان دہلی کے اداریوں پر ایک عمومی تبصرہ کیا گیا تھا جو مکمل نہ ہو سکا
تھا اس ماہ کے اشارات محترم امیر جماعت مولانا ابواللیث صاحب ندوی کے قلم سے ہیں اس لیے میں
نے اپنے لکھے ہوئے اشارات کو مقالات کے حصے میں دے دیا ہے۔ (مدیر زندگی)

پاکستان کا موجودہ دستور بننے سے پہلے، فوجی حکومت کے مقرر کردہ آئین کمیشن نے ۴۰ سوالات کا ایک سوال نامہ شائع کیا تھا۔ مشرقی و مغربی پاکستان کے علماء نے اس سوال نامے کا جو جواب دیا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ اللہ کی کتاب، رسول کی سنت اور خلفائے راشدین کے اسوے نے اسلام اور اسلامی نظریہ خلافت میں ہر تحریف کا دروازہ بند کر دیا ہے اور قیامت تک ایسے علماء موجود رہیں گے جو ٹھیک ٹھیک اس کی ترجمانی کرتے رہیں۔ علماء کے جوابات نے یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ اسلامی حکومت کی بنیادی باتوں میں ان کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

جب کبھی اسلامی حکومت کا نام لیا جاتا اور اس کے قیام کی جدوجہد شروع کی جاتی ہے تو "متجددین عصر" کی طرف سے ہمیشہ علماء اور مسلمانوں کے مذہبی فرقوں کے اختلافات نمایاں کیے جاتے ہیں اور مضحکہ خیز انداز میں سوال کیا جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کس فرقے کے مذہب پر بنے گی؟ اور دوسری بات یہ کہی جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کا نعرہ لگانے والے علماء خود نہیں جانتے کہ اسلامی حکومت کی تعریف کیا ہے؟ منیر رپورٹ کا ڈرامہ بھی انہی دو باتوں کو ثابت کرنے کے لیے کھیلا گیا تھا اور اب یہی ڈرامہ ہند و پاک کے واحد ترقی پسند عالم دین مولانا سعید احمد اکبر آبادی کے خیالات کی بنیاد بن گیا ہے۔ موصوف کے لیے واحد ترقی پسند عالم دین کے الفاظ میں نے طنزاً نہیں لکھے ہیں بلکہ جہاں تک مجھے علم ہے ہند و پاک کا کوئی مستند عالم دین اس کا قائل نہیں ہے کہ مسلمان اکثریت کے ملکوں میں بھی اسلامی حکومت کے بجائے سیکولر اسٹیٹ قائم ہونی چاہیے۔ یہ ترقی پسند صدر شعبۂ دینیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

کے ساتھ مخصوص ہے۔

کمیشن کے سوال نامے کا جواب وہاں کے علماء اور دیگر اہلِ علم کی ایک بڑی تعداد نے دیا تھا۔ میں سب سے پہلے یہاں اس جواب کے چند اقتباسات نقل کروں گا جو مرکزی نظام العلماء کے ۱۳ علماء نے دیا ہے۔ اس جواب کی ترتیب میں پاکستان کے ایک نمایاں عالمِ دین مولانا احمد علی (مرحوم و مغفور) بھی شریک تھے اس وقت وہاں کے اخبارات نے لکھا

"علماء کی ایک دوسری جماعت' مرکزی نظام العلماء کی طرف سے ۱۳ علماء اور دیگر اصحاب نے اس سوال نامے کا جواب مرتب کیا ہے۔ علماء کا یہ اجلاس سید میرک شاہ کی صدارت میں ۱۵ مئی سے ۱۸ مئی تک منعقد ہوا اس اجتماع میں صدر موصوف کے علاوہ مولانا احمد علی (لاہور) بھی شریک تھے۔"

کمیشن کے سوال نمبر ۲ میں پوچھا گیا تھا کہ ان اسباب یا اسی نوعیت کے دوسرے اسباب کے اعادے کے انسداد کے لیے آپ کیا تجویز کرتے ہیں (جن کی بنا پر ۱۹۵۶ء کے دستور کی تنسیخ عمل میں آئی) اس سوال کا جواب متعدد نکات میں دیا گیا ہے میں صرف دو نکتے یہاں نقل کرتا ہوں۔

"(۱) اس تدریجی ناکامی کی نوعیت و اسباب پر نظر ڈالنے سے یہ حقیقت بخوبی روشن ہو جاتی ہے کہ ہمارے ملک کے یقینی ارتقاء اور درخشاں مستقبل کو ہمارے سربراہوں کی بے دینی' اسلام سے ناواقفی اسلامی اصولوں سے بیزاری اور مغرب کی غلط تقلید سے خطرناک دھکا لگا ہے' لہٰذا جب تک دین دار' دیانت دار اور تجربہ کار ہمدردانِ ملت کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور نہ آئے گی اور مغرب کی بجائے مدینہ منورہ کی تعلیمات کو نہ اپنائیں گے اس وقت تک اپنی شایانِ شان مقام حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمارے صدر محترم محمد ایوب خان صاحب کا تازہ بیان کہ ہم کو اسلام کے سوا کسی اور کی کوئی احتیاج نہیں ہے واقع کے لحاظ سے بالکل صحیح ہے

(۲) متذکرہ امور کا اعادہ تب ہی رک سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کیا جائے۔ ہم مسلمان ہو کر مسلمانی سے نہ شرمائیں۔ اللہ تعالیٰ کے قطعی وعدوں کے مطابق اس کی نصرت حاصل کرنے کے لیے اس کے دین کی حمایت کے لیے کمربستہ ہو جائیں اور وعدوں کا ایفاء کرتے ہوئے پاکستان کو حقیقی معنوں میں اسلامی اسٹیٹ بنائیں۔"

سوال نمبر ۲۳ میں پوچھا گیا تھا کہ آپ پارلیمانی طرزِ حکومت کی سفارش کرتے ہیں یا صدارتی طرزِ حکومت کو ترجیح دیتے ہیں' اس سوال کے جواب میں لکھا گیا ہے:۔

"نظام العلماء نہ برطانوی جمہوری پارلیمانی نظام کی حمایت کرتا ہے اور نہ ہی امریکی طرز کے صدارتی حکو

کی بلکہ مدنی طرزِ خلافت کی پیروی کو سرمۂ چشم بصیرت بنانے کی تجویز کرتا ہے جس کے محاسن و کامیابی کی تعریف و توصیف میں پونے چودہ سو سال سے دشمن بھی رطب اللسان ہیں۔ چودھویں صدی میں مسٹر گاندھی کو اپنے وفادار کو نصیحت کرتے ہوئے چار و ناچار یہی کہنا پڑا کہ صدیق و فاروق کے نقش قدم پر چل کر کامیابی حاصل کرو۔

وہ خلافت کیا تھی؟ اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر اس کی منشا اور ہدایات کے عین مطابق حکمرانی کرنے اور ان کو انفرادی، اجتماعی، دنیوی اور اخروی مصالح و مقاصد سے ہمکنار بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں سے اعلیٰ، پاک باز، بے لوث، مخلص اور سب سے فائق بزرگ مقرر کیا جائے جو ان میں سے بہترین افراد کے مشورے سے امورِ مملکت کو سرانجام دے۔ ارکانِ شوریٰ اس کے ممد و معاون ہوں اور وہ اس کے احکام کو نافذ کرنے والا وفادار بندہ ہو۔

اس کے بعد تفصیل سے طریقِ انتخاب اور مجلس شوریٰ اور امیر کی صفات و اختیارات وغیرہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اسلام میں قانون سازی کا حق کسی کو نہیں۔ کتاب و سنت اور فقہی احکام کو نافذ کرنا حکومت کا کام ہے"

یہی بات سوال ۱۹ کے جواب میں لکھی گئی ہے:-

"اسلامی مملکت میں کسی کو قانون سازی کا حق نہیں ہے البتہ انتظامی معاملات میں شریعت کے مطابق صوبائی حاکم اپنا طریقِ کار اپنی مجلس شوریٰ کے مشورے سے تجویز کر سکتا ہے"

سوال ۱۲ میں پوچھا گیا تھا کہ کیا آپ نئے دستور میں ایسی دفعات ضروری سمجھتے ہیں جن کے باعث اسلام کے بنیادی اقدار کو سمجھنے میں مسلمانوں کی رہبری ہو اور وہ ان کا اطلاق زندگی کے بدلتے ہوئے حالات پر کر سکیں۔ اس کے جواب میں لکھا گیا ہے:-

"اسلامی اقدار ٹھوس حقائق ہیں جن کی صحیح تعبیرات وہی ہیں جو اسلام کے اولین مخاطبین اور سلف صالحین نے ہم تک پہنچائی ہیں اس لیے کتاب و سنت کو اسلاف کی تشریحات کی روشنی میں پڑھنا پڑھانا اور اس کی اشاعت لازمی ہے جس کی صورت یہ ہے کہ تمام اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں کتاب و سنت کی تعلیم لازمی ہو۔"

اسلامی اقدار اور ان کی تعبیرات کا مسئلہ انتہائی اہم اور بنیادی ہے اس کی طرف سوال ۱۳ کے جواب میں اشارہ کیا گیا ہے اور مزید تفصیل سوال ۹ کے جواب میں ہے۔ سوال ۲۹ میں پوچھا گیا ہے: "آپ کے پیش نظر اور کون سی تجویزیں ہیں جن سے ایک ایسی جمہوریت قائم ہو سکے جو بدلے ہوئے حالات کی مطابقت کر سکے اور جو انصاف و مساوات ...

رواداری کے اسلامی اصولوں پر مبنی ہو۔"

اس سوال میں آئین کمیشن نے اپنی پوری روح منتقل کر دی ہے۔ آج کے متجددین نے اسلام کا جو خلاصہ نکالا ہے وہ ہے انصاف، مساوات اور رواداری، معلوم نہیں کن حالات میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی نے بھی اپنے اداریوں میں اسلام کا یہی خلاصہ پیش کیا ہے۔ مرکزی نظام العلماء نے سوال ۳۹ کا جواب بھی مفصل دیا ہے اور اس پُر فریب سوال کا پردہ اچھی طرح چاک کیا ہے۔ پورا جواب نقل کرنا موجب طوالت ہے۔ یہاں صرف دو نکتے نقل کیے جاتے ہیں:۔

(۴) اگر نئے حالات امور شرعیہ کے سوا ہیں تو ارباب فکر و نظر کو ہر طرح ان سے تطابق پیدا کرنے اور قوت حاصل کرنے کی امکانی کوشش کرنی جائز بلکہ فرض ہے اس کے لیے حکومت مختلف تحقیقاتی کمیٹیاں اور ادارے مقرر کر سکتی ہے جو بیرونی ممالک سے بھی استفادے کا انتظام کریں لیکن اسلام کے صریح احکام کو بدلتے ہوئے حالات کے سانچے میں ڈھالنا یعنی ان کی ایسی تعبیرات کرنا جو اسلاف اور اسلام کے مخاطبین اولین کے خلاف ہوں ظلم عظیم ہے۔ حوادث و حالات پر اسلام کو قاضی بنایا جائے نہ کہ اسلام کی حجامت بنا کر حالات کے مطابق کیا جائے۔

(۵) پاکستانی حکومت کو اسلامی عدل و انصاف اور مساوات و رواداری پر مبنی ظاہر کرنا پرانا قاعدہ ہے اگر ان باتوں کو سارے اسلام کا ست بنا کر پیش کیا جائے تو غلط ہے۔ اسلام کے ان کے سوا بیسیوں اصول ہیں اور تمام اسلام پر عمل کرنا فرض ہے اُدْخُلُوا فِی السِّلْمِ کَافَّۃً۔ بعض کو لیکر بعض کو ترک کر دینا حرام اور کفر ہے اسی طرح ان الفاظ کے مفہوم سے غلط معانی مراد لینا بھی الحاد ہے۔ اسلامی عدل و مساوات کا یہ عالم ہے کہ امیر المومنین اور یہودی دونوں ایک عدالت میں فریقین کی حیثیت میں پیش ہوتے ہیں لیکن ان الفاظ کی آڑ میں مردوں اور عورتوں کی فطری حدیں توڑ دینا یا وجوب اطاعت میں امیر اور غیر امیر کو برابر قرار دینا جہالت کا نتیجہ ہوگا، اسی طرح اسلامی رواداری کا مقام اتنا اونچا ہے کہ ہر غیر مسلم رعایا (ذمی) کے قتل کے قصاص میں بڑے سے بڑے مسلمان کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ غیر مسلم عورت کی عصمت ریزی سے مسلمانوں کو سنگسار کیا جا سکتا ہے مگر رواداری کی آڑ میں ان کو جج بنانا کلیدی آسامیوں پر مقرر کرنا اور اسلام کے خلاف ان کو تبلیغ کا حق دینا اسلام اور اسلامی احکام کی توہین ہے جیسے پاکستان حکومت کی مخالفت میں رواداری نہیں برتی جا سکتی اسی طرح

اپنی حکومت کے خلاف غلط رواداری کی اجازت نہیں دی جا سکتی ۔

سوال ۱۳ میں پوچھا گیا تھا کہ انتخابات مخلوط ہوں یا جداگانہ' اس کے جواب میں لکھا گیا ہے

چونکہ اسلامی حکومت شرعی احکام پر مبنی ہوگی اس کے بنانے اور چلانے والے صرف مسلمان ہی ہو سکتے ہیں،
بنا بریں مخلوط اور جداگانہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ مملکت کے امیر کا فرض ہوگا کہ وہ غیر مسلم اقلیتوں کے
حقوق کی حفاظت شرعی اصول کے مطابق کرے ۔

مرکزی نظام العلماء کے جوابات کی نقل آفاق لاہور مورخہ ۲ تا ۶ جون ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی تھی ۔

ان ۴۰ علماء کے علاوہ مشرقی پاکستان کے ۲۲ علماء کی طرف سے بھی آئینی کمیشن کے سوالنامے کا جواب دیا گیا تھا ۔ یہ جواب اخبار پاسبان ڈھاکہ مورخہ ۴ و ۵ جون ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا ۔ یہ جوابات' مرکزی نظام العلماء کے جوابات سے مختصر ہیں اس لیے کہ بہت سے سوالوں کے جواب میں دستور ۱۹۵۶ء کا حوالہ دے دیا گیا ہے ۔ اس کے باوجود اسلامی حکومت کی اصل بنیاد ان جوابات میں بھی موجود ہے ۔ سوال ۱۲ کا جواب کئی نکات میں دیا گیا ہے اور نکتہ اول کو اس عبارت پر ختم کیا گیا ہے :-

"ہماری رائے میں جو قرارداد مقاصد ۱۹۴۹ء میں بالاتفاق منظور ہوئے تھے اس کو جمہوریہ پاکستان کے بنیادی اصول قرار دیا جائے ۔

سب کو معلوم ہے کہ قرارداد مقاصد میں اصولی طور پر ان چیزوں کا اقرار کیا گیا تھا جو اسلامی حکومت کی اساس بنتی ہیں اس میں اقرار کیا گیا تھا کہ :-

حاکمیت اللہ کے لیے ہے اور ریاست کا پبلک لا جمہوریت' آزادی' معاشرتی انصاف اور رواداری کے ان اصولوں پر مبنی ہوگا جو اسلام نے مقرر کیے ہیں اور ریاست کا کام یہ ہوگا کہ وہ مسلمانوں کو اس قابل بنائے کہ وہ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی کو قرآن و سنت کی تعلیمات کے مطابق منظم کریں ۔"

سوال ۲۹ کے جواب میں لکھا گیا ہے :-

"ہماری عقیدت کے مطابق کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر زمانے کے ہر قسم کی انفرادی و اجتماعی ضروریات پوری کرنے کے لیے اور ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے کافی ہیں .... اس اجمال کی تفصیل کے لیے ہم معزز اراکین کمیشن کی توجہ ۱۹۵۱ء میں مختلف مکتب نظر کے علمائے کرام کے مرتب کردہ اسلامی مملکت کے بنیادی اصولوں کی طرف مبذول کرتے ہیں جس کی ایک کاپی اس جواب کے ساتھ منسلک ہے ۔"

راقم الحروف نے اسلامی مملکت کے اس متفقہ چارٹر کو اس شمارے کے حصۂ تراجم و اقتباسات میں شائع کر دیا ہے وہاں دیکھ لیا جائے۔

آئین کمیشن کا چالیسواں سوال یہ تھا۔ کیا آپ کوئی اور تجاویز پیش کرنا چاہتے ہیں جو شرائط محولہ سے متعلق ہوں۔ اس سوال کا بھی متعدد نمبروں میں جواب دیا گیا ہے۔ میں صرف دو نمبر یہاں نقل کرتا ہوں۔

اول۔ پاکستان میں کتاب اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی قانون وضع نہ کیا جائے اور قوانین کے مآخذ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو قرار دیا جائے۔

دوم۔ قرآن اور سنت رسول اللہ کے خلاف کوئی قانون یا کوئی انتظامی حکم پاس نہ کیا جائے۔ بصورت دیگر پاکستان کے ہر باشندے کو یہ استحقاق حاصل ہوگا کہ مناسب عدالت میں اس کے خلاف چارہ جوئی کرے

ان دو جوابوں کے علاوہ مغربی پاکستان کے ۱۹ علماء کی ایک اور جماعت نے سوال نامے کا جواب دیا تھا۔ اس جماعت میں مفتی محمد حسن صاحب، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا محمد اسمٰعیل صاحب، مولانا داؤد غزنوی صاحب اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب شریک ہیں۔

ان علماء کے جواب میں سے میں صرف سوال ۱۹ کا جواب یہاں نقل کرتا ہوں:۔

اس سوال کے جواب میں، ہم کمیشن کو اسلامی مملکت کے ان ۲۲ بنیادی اصولوں کی طرف توجہ دلاتے ہیں جو جنوری ۱۹۵۱ء میں ہر مکتب خیال کے علماء نے بالاتفاق مرتب کیے تھے، ان کی ایک کاپی ہمارے اس جواب کے ساتھ منسلک کی جا رہی ہے اس سے کمیشن کو معلوم ہو جائے گا کہ انصاف، مساوات اور رواداری کے اصول فی الحقیقت کیا ہیں اور ان پر ایک جمہوریت کیسے قائم ہو سکتی ہے۔[1]

علماء کے جوابات اور اسلامی مملکت کا متفقہ چارٹر، پڑھنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت کی راہ روکنے والوں کے الزامات کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ بات بھی غلط ہے کہ مذہبی فرقوں کے اختلافات اسلامی حکومت کے قیام میں مانع ہیں اور یہ بات بھی کھلا ہوا جھوٹ ہے کہ علماء خود اسلامی حکومت کی تعریف سے ناواقف ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ۱۹۴۹ء میں مرحوم لیاقت علی خاں کی قیادت میں ریاست پاکستان نے کلمۂ شہادت ادا کیا اور قرارداد مقاصد پاس کی پھر متفقہ ۲۲ اصول جنوری ۱۹۵۱ء میں طے ہوئے۔ دو سال کے بعد ۱۹۵۳ء میں قادیانی تحریک کا بہانہ بنا کر لاہور میں مارشل لا نافذ کیا گیا اور اس کے بعد وہ عدالتی ڈرامہ کھیلا گیا جس کی رپورٹ، منیر رپورٹ

---

[1] علماء پاکستان کے تمام جوابات میں نے خواجہ غلام محمد کوچہ روح اللہ خاں دہلی کی کتاب "پاکستان کی بساطِ سیاست" سے نقل کیے ہیں

کے نام سے موسوم ہے۔ ۱۹۴۷ء سے [illegible] تک مسلسل وہاں کے عوام اسلامی حکومت کا مطالبہ کرتے رہے اور وہاں کے علماء اس کے اصول و مقاصد واضح کرتے رہے اور اپنی قوت کے ساتھ تمام ملک میں اس کی اشاعت ہوئی کہ دیہات میں رہنے والے عوام بھی اس سے واقف ہو گئے، لیکن جب منیر رپورٹ سامنے آئی تو انکشاف ہوا کہ اسلامی حکومت تو بعد کی چیز ہے، علماء یہ بھی نہیں جانتے کہ اسلام کیا ہے؟

جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

کوئی انصاف پسند آدمی منیر رپورٹ کی اس [illegible] کو باور کر سکتا ہے؟ لیکن کس قدر حیرت ہے کہ مدیر بیان اس رپورٹ پر ایمان لے آئے اور جسٹس منیر کے قلم نے اسلام اور اسلامی حکومت کے رخِ روشن پر جو سیاہی پھیری تھی اسے انھوں نے علماء کی طرف منسوب کر دیا اور جہاں تک مولانا مودودی کا تعلق ہے ان کی طرف ایک ایسا جھوٹ منسوب کیا جس کی جرأت جسٹس منیر نے بھی نہ کی تھی۔

یہ چند سطریں صرف یہی دکھانے کے لیے لکھی گئی ہیں کہ اسلامی حکومت کی راہ روکنے کے لیے کم سے کم علمائے پاکستان کے اختلافات اور حالاتِ حاضرہ سے ان کی جہالت کی نمائش اب تاریخی جھوٹ بن چکی ہے، اس کی تکرار سے اگر کسی ذاتی مفاد کا حصول مقصود ہے تو اور بات ہے ورنہ یہ کوئی مفید کام باقی نہیں رہا ہے۔

یکم اکتوبر سے

ہفت روزہ مُنادی بدایوں

زیرِ ادارت

عبداللہ عاطف

افقِ صحافت پر

فی پرچہ:- ۲ آنے پیسے سالانہ:- پانچ روپیہ (صہ)

منیجر:- ہفت روزہ "مُنادی"۔ ناگران بدایوں

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول

جن کو پاکستان کے ہر مکتب خیال اور تمام اسلامی فرقوں کے مشاہیر علماء نے متفقہ طور پر مرتب کیا ہے

شاید تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ مسلمانوں کے تمام بڑے بڑے فرقوں کے اکابر علماء نے بالاتفاق وہ اصول مرتب کیے ہیں جن پر قرآن و سنت کے منشاء کے مطابق ایک اسلامی ریاست کی عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ اس سے پہلے اشخاص اور افراد متفرق طور پر تو بارہا ان مسائل کے متعلق اپنی تحقیقات بیان کرتے رہے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ ایک مجلس میں بیٹھ کر مختلف عقائد و مسالک کے نمائندہ علماء نے خالص علمی بحث و تحقیق کے بعد اسلامی مملکت کے تصور اور اس کے بنیادی اصولوں کے متعلق اس قدر واضح اور مستند بیان تیار کیا ہو، یہ ایک ایسا عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر اب تک کی اسلامی تاریخ میں نہیں ملتی اور توقع کی جا سکتی ہے کہ انشاء اللہ ہماری آئندہ تاریخ کی تشکیل میں اس کا حصہ نہایت اہم ہوگا۔ اب کسی کے لیے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ مسلمان جیسی کچھ بھی حکومت بنا بیٹھیں وہ "اسلامی حکومت" ہے۔ اب کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام ایک دین کی حیثیت سے ریاست اور سیاست کے لیے اپنے کچھ مخصوص اصول رکھتا ہی نہیں ہے۔ اب کسی کے لیے یہ موقع باقی نہیں رہا ہے کہ اپنے خودساختہ بنیادی اصولوں اور دستوری خاکوں پر "اسلامی" لیبل لگا کر جعلی نوٹوں کی طرح انہیں بازار میں چلا سکے۔ اب یہ دعوے کرنے کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ مسلمان فرقوں کے مذہبی نزاعات ایک اسلامی حکومت کے قیام میں مانع ہیں۔ اب اس جاہلانہ بدگمانی کے فروغ پانے کا بھی امکان نہیں رہا ہے کہ دورِ جدید میں ایک ترقی پذیر ریاست کے لیے اسلام کے اصولِ سیاست، موزوں نہیں ہیں۔ اب یہ جھوٹ بھی نہیں چل سکتا کہ ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ علماء پاکستان کے مستند اور متفق علیہ بیان نے ان تمام غلط فہمیوں کا دروازہ بند کر دیا ہے۔

ایک مدت دراز سے اسلامی دستور مملکت کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اسلام کا کوئی دستور مملکت ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو اس کے اصول کیا ہیں اور اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے؟ اور کیا اصول اور عملی تفصیلات میں کوئی چیز بھی ایسی ہے جس پر مختلف اسلامی فرقوں کے علماء متفق ہو سکیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق عام طور پر ایک ذہنی پریشانی پائی جاتی ہے اور اس پریشانی میں ان مختلف دستوری تجویزوں نے اور بھی اضافہ کر دیا ہے جو مختلف حلقوں کی طرف سے اسلام کے نام پر وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں۔ اس کیفیت کو دیکھ کر یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ تمام اسلامی فرقوں کے چیدہ اور معتمد علیہ علماء کی ایک مجلس منعقد کی جائے اور وہ بالاتفاق صرف اسلامی دستور کے بنیادی اصول ہی بیان کرنے پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان اصولوں کے مطابق ایک ایسا دستوری خاکہ بھی مرتب کر دے جو تمام اسلامی فرقوں کے لیے قابل قبول ہو۔

اس غرض کے لیے ایک اجتماع بتاریخ ۱۲-۱۳-۱۴، ۱۵ ربیع الثانی ۱۳۷۰ھ مطابق ۲۱-۲۲-۲۳ اور ۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء بصدارت مولانا سید سلیمان صاحب ندوی کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجتماع میں اسلامی دستور کے جو بنیادی اصول بالاتفاق طے ہوئے ہیں انہیں فائدۂ عام کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔

اسلامی مملکت کے بنیادی اصول

اسلامی مملکت کے دستور میں حسب ذیل اصول کی تصریح لازمی ہے

۱— اصل حاکم تشریعی و تکوینی حیثیت سے اللہ رب العالمین ہے

۲— ملک کا قانون کتاب و سنت پر مبنی ہوگا، اور کوئی ایسا قانون نہ بنایا جا سکے گا، نہ کوئی ایسا انتظامی حکم دیا جا سکے گا جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

تشریحی نوٹ! اگر ملک میں پہلے سے کچھ ایسے قوانین جاری ہوں جو کتاب و سنت کے خلاف ہوں تو اس کی تصریح بھی ضروری ہے کہ وہ بتدریج ایک معینہ مدت کے اندر منسوخ یا شریعت کے مطابق تبدیل کر دیے جائیں گے۔

۳۔ مملکت کسی جغرافیائی، نسلی، لسانی یا کسی اور تصور پر نہیں بلکہ ان اصول و مقاصد پر مبنی ہوگی جن کی اساس اسلام کا پیش کیا ہوا ضابطۂ حیات ہے۔

۴— اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ قرآن و سنت کے بتائے ہوئے معروف کو قائم کرے، منکرات کو مٹائے اور شعائر اسلام کے احیاء و اعلاء اور مسلمہ اسلامی فرقوں کے لیے ان کے اپنے مذہب کے مطابق ضروری اسلامی تعلیم کا انتظام کرے۔

۵ — اسلامی مملکت کا یہ فرض ہوگا کہ وہ مسلمانانِ عالم کے رشتۂ اتحاد و اخوت کو قوی سے قوی تر کرنے کی کوشش کرے اور ریاست کے مسلم باشندوں کے درمیان عصبیتِ جاہلیہ کی بنیادوں پر نسلی، لسانی، علاقائی یا دیگر مادی امتیازات کے ابھرنے کی راہیں مسدود کرکے ملتِ اسلامیہ کی وحدت کے تحفظ و استحکام کا انتظام کرے۔

۶ — مملکت، بلا امتیاز مذہب و نسل وغیرہ تمام ایسے لوگوں کی لابدی انسانی ضروریات، یعنی غذا، لباس، مسکن، معالجہ اور تعلیم کی کفیل ہوگی جو اکتسابِ رزق کے قابل نہ ہوں یا نہ رہے ہوں یا عارضی طور پر بے روزگاری، بیماری یا دوسرے وجوہ سے فی الحال سعیِ اکتساب پر قادر نہ ہوں۔

۷ — باشندگانِ ملک کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شریعتِ اسلامیہ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ یعنی حدود و قانون کے اندر تحفظِ جان و مال و آبرو، آزادیِ مذہب و مسلک، آزادیِ عبادت، آزادیِ ذات، آزادیِ اظہارِ رائے، آزادیِ نقل و حرکت، آزادیِ اجتماع، آزادیِ اکتسابِ رزق، ترقی کے مواقع میں یکسانی اور رفاہی ادارات سے استفادہ کا حق۔

۸ — مذکورہ بالا حقوق میں سے کسی شہری کا کوئی حق اسلامی قانون کی سندِ جواز کے بغیر کسی وقت سلب نہ کیا جائے گا اور کسی جرم کے الزام میں کسی کو بغیر فراہمیِ موقع صفائی و فیصلۂ عدالت کوئی سزا نہ دی جائے گی۔

۹ — مسلمہ اسلامی فرقوں کو حدود و قانون کے اندر پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انہیں اپنے پیروؤں کو اپنے مذہب کی تعلیم دینے کا حق حاصل ہوگا وہ اپنے خیالات کی آزادی کے ساتھ اشاعت کرسکیں گے، ان کے شخصی معاملات کے فیصلے ان کے اپنے فقہی مذاہب کے مطابق ہوں گے اور ایسا انتظام کرنا مناسب ہوگا کہ انہی کے قاضی یہ فیصلے کریں۔

۱۰ — غیر مسلم باشندگانِ مملکت کو حدود و قانون کے اندر مذہب و عبادت، تہذیب و ثقافت اور مذہبی تعلیم کی پوری آزادی حاصل ہوگی اور انہیں اپنے شخصی معاملات کا فیصلہ اپنے مذہبی قانون یا رسم و رواج کے مطابق کرانے کا حق حاصل ہوگا۔

۱۲ — غیر مسلم باشندگانِ مملکت سے حدود شرعیہ کے اندر جو معاہدات کیے گئے ہوں، ان کی پابندی لازمی ہوگی اور حقوقِ شہری کا ذکر دفعہ نمبر ۷ میں کیا گیا ہے ان میں غیر مسلم باشندگانِ ملک اور مسلم باشندگانِ ملک سب برابر کے شریک ہوں گے۔

۱۲۔ رئیس مملکت کا مسلمان ہونا ضروری ہے جس کے تدین، صلاحیت اور اصابت رائے پر جمہور یا ان کے منتخب نمایندوں کو اعتماد ہو۔

۱۳۔ رئیس مملکت ہی نظم مملکت کا اصل ذمہ دار ہوگا البتہ وہ اپنے اختیارات کا کوئی جزو کسی فرد یا جماعت کو تفویض کر سکتا ہے۔

۱۴۔ رئیس مملکت کی حکومت مستبدانہ نہیں بلکہ شورائی ہوگی یعنی وہ ارکان حکومت اور منتخب نمایندگان جمہور سے مشورہ لے کر اپنے فرائض انجام دے گا۔

۱۵۔ رئیس مملکت کو یہ حق حاصل نہ ہوگا کہ وہ دستور کو کلاً یا جزءً معطل کر کے شوریٰ کے بغیر حکومت کرنے لگے۔

۱۶۔ جو جماعت، رئیس مملکت کے انتخاب کی مجاز ہوگی وہی کثرت رائے سے اسے معزول کرنے کی بھی مجاز ہوگی

۱۷۔ رئیس مملکت، شہری حقوق میں عامۃ المسلمین کے برابر ہوگا اور قانونی مواخذہ سے بالاتر نہ ہوگا۔

۱۸۔ ارکان و عمال حکومت اور عام شہریوں کے لیے ایک ہی قانون و ضابطہ ہوگا اور دونوں پر عام عدالتیں ہی اس کو نافذ کریں گی۔

۱۹۔ محکمۂ عدلیہ محکمۂ انتظامیہ سے علیحدہ اور آزاد ہوگا تاکہ عدلیہ اپنے فرائض کی انجام دہی میں ہیئت انتظامیہ سے اثر پذیر نہ ہو۔

۲۰۔ ایسے افکار و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ممنوع ہوگی جو مملکت اسلامی کے اساسی اصول و مبادی کے انہدام کا باعث ہوں۔

۲۱۔ ملک کے مختلف ولایات و اقطاع، مملکت واحدہ کے اجزاء انتظامی متصور ہوں گے۔ ان کی حیثیت نسلی، لسانی یا قبائلی واحدہ جات کی نہیں بلکہ محض انتظامی علاقوں کی ہوگی جنھیں انتظامی سہولتوں کے پیش نظر مرکز کی سیادت کے تابع انتظامی اختیارات سپرد کرنا جائز ہوگا مگر انھیں مرکز سے علیحدگی کا حق حاصل نہ ہوگا

۲۲۔ دستور کی کوئی ایسی تعبیر معتبر نہ ہوگی جو کتاب و سنت کے خلاف ہو۔

ماخوذ از ترجمان القرآن جنوری فروری ۱۹۵۱ء

نوٹ: اس چارٹر پر اکتیس علما کے دستخط ہیں

رسائل و مسائل

الم سے متعلق ایک بے بنیاد دعویٰ

محترمی! السلام علیکم

میں اس جواب کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ہفتہ وار آرگنائزر مورخہ ۶ر اگست ۱۹۶۲ء میں دیا گیا ہے۔ پونا کے کسی مسٹر ایچ۔جی۔میڈ (Mr. H. G. Made) نے درج ذیل سوال کیا:
کیا "آدم" (Adam) کی کوئی تاریخی اہمیت بھی ہے؟ اس سوال کا جواب آرگنائزر نے یہ دیا ہے:
"اس کی روحانی اہمیت نے تاریخ بنائی ہے اس لیے کہ یہ تمام تاریخ کا خلاصہ ہے' بلکہ اگر آپ ہندستان کے باہر کی تاریخ بھی دیکھنی چاہیں تو براہ کرم قرآن کے صفحات الٹیے۔ آپ اسے بالکل ابتدا ہی میں پائیں گے، اور وہ ہے الم (A L M) جو ادم کا محرف ہے مسلم علماء و مشائخ اس کی تشریح پر قادر نہیں ہیں بلکہ وہ تو کہہ دیتے ہیں کہ یہ مقدس اور راز کی چیز ہے جس میں وہ بڑی حد تک صحیح ہیں۔

آپ خیال فرما سکتے ہیں کہ ایک مسلمان اگر اسے پڑھے گا تو کیا سوچے گا' اسے اگر اپنے لفظوں میں ادا کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ بہت بڑی ذلت ہے ان لوگوں کی جو غالباً اپنے مذہب کی بھی تفسیر نہ کرسکے۔" حالانکہ میں بخوبی جانتا ہوں کہ آرگنائزر میں جواب دینے والے کے یہ خیالات تعصب پر مبنی ہیں جسے جہالت کی پیداوار کہنا صحیح ہوگا لیکن جیسا کہ انھوں نے کہا ہے کہ مسلم علماء و مشائخ اس کی تفسیر میں ناکام رہے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ اس کا معقول و مفصل جواب تحریر فرمائیں۔

جواب

یہ آپ نے ٹھیک سمجھا ہے کہ یہ خیالات جاہلانہ تعصب پر مبنی ہیں [illegible] دینے والے کی سب سے پہلی نادانی یہ ہے کہ وہ قرآن کریم کو تاریخ کی ایک ایسی کتاب سمجھتا [illegible] انسان نے تصنیف کیا ہے

حالانکہ قرآن کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ایک کتاب ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری رسول سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اتاری ہے۔ اس خیال سے کہ کسی ناواقف مسلمان کے ذہن میں الجھن پیدا نہ ہو۔ میں ان بے محل خیالات پر روشنی ڈال رہا ہوں۔ آرگنائزر کے جواب کا حاصل یہ ہے:۔

(۱) الم ادم کا محرف ہے۔ (۲) علماء و مشائخ اس کی تشریح نہ کر سکے۔ (۳) مسلم علماء کے لیے یہ انتہائی عیب اور ذلت کی ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تفسیر بھی نہ کر سکے۔ میں اسی ترتیب سے چند باتیں عرض کرتا ہوں

(۱) جواب دینے والے کو شاید یہ بات بھی معلوم نہیں کہ الم کوئی مرکب لفظ نہیں ہے بلکہ تینوں حروف علیحدہ علیحدہ ہیں۔ الف الگ، لام الگ اور میم الگ۔ قرآن کے ایسے حروف کو اصطلاح میں حروف مقطعات کہتے ہیں یعنی ایسے حروف جو علیحدہ علیحدہ ہیں اور ان سے مل کر کوئی لفظ نہیں بنا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا ادم کے حروف بھی اسی طرح الگ الگ ہیں اور ان سے مل کر یہ کوئی مرکب لفظ (word) نہیں بنا ہے بظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے بلکہ ادم ایک لفظ ہے محض حروف نہیں ہیں اس سے معلوم ہوا کہ الم اور ادم میں کوئی مشابہت موجود نہیں ہے ادم ایک لفظ (word) ہے اور الم محض حروف تہجی (Alphabet) ہیں۔ یہاں تک کہ ان دونوں میں صوتی یعنی آواز کی مشابہت بھی نہیں ہے۔ ادم کو ہم اُدم بولتے ہیں اور الم کو الف لام، میم بولتے ہیں۔ اب بتائیے کہ دونوں میں وہ کون سی مشابہت ومماثلت ہے جس کی وجہ سے الم کو ادم کا محرف کہا جائے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایک بے بنیاد اور احمقانہ دعویٰ ہے۔ کسی زبان کے حروف تہجی میں تحریف کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟ اگر کہنے والا قرآن کے کسی لفظ کو ادم کا محرف کہتا تو کم سے کم لفظ ہونے کی مشابہت تو پائی جاتی۔ عربی کے تین حروف تہجی کو ادم کا محرف کہنا تو بالکل بے تکی بات ہے۔

(۲) جواب دینے والا یا تو خود نہیں جانتا یا اپنے پڑھنے والوں کو ناواقف رکھنا چاہتا ہے کہ الم جیسے حروف صرف سورۂ بقرہ کی ابتدا میں نہیں ہیں بلکہ بہت سی سورتوں کی ابتدا میں اس طرح کے حروف مقطعات موجود ہیں۔ کسی سورۃ کی ابتدا میں المّٓر ہے، کہیں المٓصٓ کہیں کھیعص، کہیں طٰہٰ اور کہیں قٓ ہے۔ ایک حرف سے لے کر پانچ حروف تک مختلف سورتوں کی ابتدا میں استعمال کیے گئے ہیں۔

اب کوئی اس سے پوچھے کہ یہ تمام حروف، ادم کا محرف ہیں یا [illegible] دوسرے سنسکرت الفاظ کے محرف ہیں؟ مسلم علماء الم کی تشریح تو اس لیے نہ کر سکے کہ وہ ادم کا محرف ہے تو آخر وہ ان دوسرے حروف کی تشریح کیوں نہ کر سکے۔ جواب دینے والے کو معلوم ہونا چاہیے کہ علماء و مشائخ کی ایک جماعت نے یہ جو لکھا ہے کہ الله

حروف کی مراد اللہ جانتا ہے۔ ہم نہیں جانتے تو یہ صرف الٓمٓ کے لیے نہیں لکھا ہے بلکہ ایسے تمام حروف کے لیے لکھا ہے جو سورتوں کی ابتدا میں ہیں اور جنہیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ جن علماء نے ان حروف کی تشریح نہیں کی اس کی وجہ بے بنیاد وجہ نہیں ہے جو آرگنائزر میں ظاہر کی گئی ہے۔ دوسری بات جواب دینے والے کو یہ معلوم ہونی چاہیے کہ بہت سے مسلم علماء و مشائخ نے ان حروف کی تشریح بھی کی ہے اور اپنے علم کی حد تک ان کی مراد واضح کی ہے

(۳) آرگنائزر میں جواب لکھنے والا اس بات سے بھی ناواقف ہے کہ ان حروف سے کوئی مذہبی حکم نہیں نکلتا۔ کیونکہ کسی زبان میں اس کے حروف تہجی سے کوئی خبر یا کوئی حکم نہیں نکلا کرتا اس کے لیے مرکب الفاظ اور بامعنی جملے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہ لکھنا کہ "علماء و مشائخ کے لیے یہ بڑی ذلت کی بات ہے کہ وہ اپنے مذہب کی بھی تفسیر نہ کر سکے" انتہائی جہالت کی بات ہے۔ مسلمان علماء و مشائخ نے اپنے مذہب کی بے مثال تشریح کی ہے۔ چند الگ الگ حروف کو، کوئی جاہل ہی "مذہب" کہہ سکتا ہے۔

صفحہ ۶۰ کا بقیہ) چوکھٹے میں فٹ نہ ہونا مناسب ہے۔ اسی صفحے کے آخر کا ایک ٹکڑا یہ ہے "تو ختم یہ شور و شر نہیں ہے" غالباً یہاں "ہے" کا لفظ "ہوگا" کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ صفحہ ۱۱۲ کا ایک مصرع یہ ہے: جلالتوں کی صفیں لگیں گی، شقاوتوں سے عتاب ہوگا" یہ پورا مصرع اس بند میں بے جوڑ بھی ہے اور بے معنی بھی۔ اس کے علاوہ عتاب کسی پر ہوتا ہے کسی سے نہیں۔ صفحہ ۱۱۲ "جنوں کی بھوتوں کی طرح" جنوں اور بھوتوں کو اس طرح اکٹھا کرنے سے مصرع بوجھل ہو گیا ہے

تحریک ادب اسلامی کے ایک امام ۔نعیم صدیقی۔۔۔ نے اس نظم کی جو اتنی شاندار پذیرائی فرمائی ہے، مقصدی حیثیت سے اس کا کوئی خاص سبب سمجھ میں نہیں آیا۔ زبان و بیان کی خامیوں کا شکوہ نعیم صدیقی صاحب سے فضول ہے۔۔۔ میں اپنے کو مستثنیٰ کیے بغیر یہ بات کہتا ہوں کہ تنقید کو ہنسی خوشی برداشت کرنے والے لوگ بہت کم ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں میری تنقید جناب احسان دانش اور جناب نعیم صدیقی کو ناگوار نہ ہو لیکن انہیں باور کرانا چاہیے کہ یہ تنقید تنقیص کے لیے نہیں کی گئی ہے۔

ع۔ ق

کے معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوا۔ پوری بحث کے آخر میں "ماحاصل" کے عنوان سے انھوں نے لکھا ہے:

> اس ساری بحث سے یہ بات بالکل عیاں ہو جاتی ہے کہ اللہ کی اطاعت سے انحراف و من مانی سرکشی اور ابلیس کی نافرمانی کے رویے کے علاوہ کوئی دوسرا درخت نہ تھا جس کی طرف جانے سے اللہ نے آدم و حوا کو لا تقربا ھذہ الشجرۃ کہہ کر منع فرمایا تھا۔ صفحہ ۱۷۹

جن مقدمات کے ذریعہ وہ اس حاصل تک پہنچے ہیں اس تبصرے میں ان کی غلطیوں کی نشان دہی بھی نہیں چہ جائیکہ تفصیل سے ان پر لکھنے میں وقت لگایا جائے۔ میں یہاں ان کی توجہ کے لیے صرف ایک بات کی طرف اشارہ کرتا ہوں۔ ھذہ الشجرۃ ان کے نزدیک ایک لاینحل معمہ تھا جسے انھوں نے حل کرنے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ ان کے حل نے ایک دوسرا بڑا معمہ پیدا کر دیا جس کا انھیں دھیان تک نہ آیا۔ قرآن کی آیات، احادیث اور آج تک کے معتمد علیہ مفسرین قرآن کے اقوال کی بنا پر تو حضرت آدم کی نافرمانی یہ تھی کہ انھوں نے اس مخصوص و متعین درخت کا پھل کھا لیا تھا جس سے انھیں روکا گیا تھا۔ آپ کی تحقیق نے اس پر خط تنسیخ کھینچ دیا لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ حضرت آدم و حوا کی نافرمانی کیا تھی؟ انھوں نے کی اطاعت سے کون سا انحراف، کون سی من مانی سرکشی اور ابلیسی نافرمانی کا وہ کون سا رویہ اختیار کیا تھا کہ جس کے نتیجے میں وہ جنت سے رخصت کیے گئے۔ حالانکہ اصل سراغ رسانی اسی کی ہونی چاہیے تھی۔ غور کیجیے آپ کا پیدا کردہ یہ معمہ قابل حل ہے؟ آخر میں بطور مشورہ و خیر خواہی یہ عرض ہے کہ الفاظ قرآن کی نئی تحقیق اور آیات کی مجتہدانہ تشریح کے لیے جو کم سے کم تیاری ضروری ہے اس کے بغیر یہ کام سخت خطرناک ہے۔ غور فرمائیے کہ اگر ہم لوگ خود بھی صرف مصباح اللغات کھول کر الفاظ قرآن کی نئی تحقیق شروع کر دیں تو دوسروں کی اسی طرح کی تحقیقات پر ہمارے اعتراض کا کیا وزن باقی رہے گا۔ اللہ سے اس کی پناہ مانگنی چاہیے کہ قرآن کی تفسیر بالرائے کا جرم صادر ہو — بحیثیت مجموعی یہ تبصرہ قابل قدر اور لائبریریوں میں محفوظ رکھنے کے لائق ہے۔ (ع - ق)

مدیر: نعیم صدیقی۔ فی شمارہ [illegible] [illegible] کا پتہ:۔
ماہنامہ سیارہ لاہور ذیلدار پارک، لاہور۔ [illegible]
آج کی مادی طاقتیں خلا بسیط میں پھیلے ہوئے مادی سیاروں تک پہنچنے [illegible]

کے پیچھے پاگل ہو رہی ہیں [illegible] ہماری سیارے سے [illegible] ہو گی یہ جاننے کے خود اپنے وجود کے گرد
گردش کر رہا ہے وہ یہ سوچنے پر بھی آمادہ نہیں ہیں کہ جس طرح نظام شمسی کا ہر سیارہ اپنا ایک مخصوص مدار
رکھتا ہے اور اسی مخصوص دائرے میں گردش کرتے رہنا اس کی سلامتی کا ضامن ہے۔ اگر وہ اپنی مخصوص راہ
سے ہٹ جائے تو کوئی شے اسے تباہی سے بچا نہیں سکتی۔ اسی طرح انسانی روح کا سیارہ بھی اپنا ایک صحیح ترین
مدار رکھتا ہے اور اگر وہ اسے چھوڑ دے تو تباہ ہو جاتا ہے۔ سیارۂ روح کے لیے وہ مدار ایمان و اخلاق کا
مدار ہے۔ سیاروں کے اس دور میں نعیم صدیقی کے ادبی و علمی سیارے کو دیکھ کر خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ مادہ
پرستوں کے اندھے دلوں میں بصیرت کا نور پیدا کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ اپنے سیارۂ روح کو ایمان و اخلاق
کے مدار کی طرف موڑیں ورنہ تباہ ہو جائیں گے۔ خدا کرے یہ علمی و ادبی سیارہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور
خود ایمان و تقویٰ کے مدار پر گردش کر کے دوسروں کے لیے نمونہ مہیا کرے۔ اب تک یہ اپنی دو گردشیں پوری
کر چکا ہے۔ تبصرہ و تنقید کے لیے پہلا شمارہ سامنے ہے۔ تمام صفحات کے مندرجات پر اظہار خیال آسان نہیں
ہے۔ اسے دیکھ کر اور پڑھ کر بحیثیت مجموعی ذہن پر یہ خوش گوار اثر پڑتا ہے کہ اسے کسی بھی اردو زبان کے معیاری
ماہنامے کے مقابلے میں رکھا جا سکتا ہے۔ چونکہ پورے رسالے پر اظہار خیال دشوار ہے اس لیے میں نے اس کے
لیے جناب احسان دانش کی نظم منتخب کی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسے بڑے اہتمام سے علیحدہ صفحات لگا کر
شائع کیا گیا ہے اور کتبۂ سیارہ اسے اپنی "پہلی حسین و جمیل ادبی پیشکش" کے طور پر چھاپ رہا ہے۔ ممکن ہے میرے
اظہار خیال میں کوئی بات ایسی آ جائے جو شاعر کو نظر ثانی پر آمادہ کرے۔

جناب احسان دانش پاکستان کے ایک مشہور شاعر ہیں اور ان کی شاعری کی عمر پختہ مشقی کی عمر تک پہنچ چکی ہے
یہ نظم ان کی صلاحیت شعری کی دلیل ہے۔ انھوں نے اپنے جذبات کو جو [illegible] اس نظم میں منتقل کرنے کی کوشش کی
ہے اور اس میں وہ بہت کامیاب ہیں۔ [illegible] اقتدار [illegible] میں اس جرأت سے اپنے خیالات کا اظہار
بھی قابل تحسین ہے [illegible] کہ وہ [illegible] نظام حکومت کو [illegible]
۱۵ سال [illegible] انقلاب کی [illegible] انھوں نے [illegible] کی ہے وہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ضروری ہے کہ [illegible] ہمارے [illegible] صوبے کے عوام [illegible]
نقصان پہنچانے والی کوئی چیز نہیں ہو سکتی کہ ایک علاقہ (صوبہ) دوسرے علاقے پر اپنی برتری اور تفوق
کا اظہار کرے۔

یہ بات اگرچہ بڑی حد تک باعث اطمینان قرار دی جا سکتی ہے کہ یوپی کی تقسیم کی یہ تحریک بالآخر [illegible] کچھ وقت سے مخالفت اور مخالفت کی وجہ سے دب کر رہ گئی اور جن ممبران اسمبلی نے کمیشن کے سامنے اپنا میمورنڈم پیش کیا تھا ان میں سے کتنوں ہی نے بعد میں اپنے نام واپس لے لیے تھے۔ لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ اس کے پیچھے بھی جو شکوہ پیدا ہو چکا ہے اور ظاہر کا یہ سکون شخصیتوں اور حالات کے دباؤ کا ہے یا کہ فی الواقع خیالات کی تبدیلی کا نتیجہ ہے۔ جب کہ یوپی اسمبلی میں مشرق اور مغرب کا توازن رہ رہ کر اب بھی اختلافی رہتا ہے۔ دوسری طرف جہاں تک دوسرے علاقوں کا تعلق ہے، پانیکر صاحب کی یہ روایت ابھی آپ سن چکے ہیں کہ اس صوبے کی موجودہ وسعت کے خلاف ہر جگہ شکایات پائی جاتی ہیں اس لیے اس اطمینان کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ تقسیم کی یہ تحریک ہمیشہ کے لیے ختم ہو چکی ہے۔ اس کے برخلاف آئندہ ہر وقت اس کا امکان دکھائی دے رہا ہے کہ اندر اور باہر دونوں طرف سے اس کا مطالبہ ہو اور اس سے ناگوار صورت حال پیدا ہو جائے۔

ملک کی یہ صورت حال جو اوپر کے اجمالی جائزے سے سامنے آئی ہے، تقاضا کرتی ہے کہ اس پر فوری توجہ کی جائے اور اس کی اصلاح کو وقت کی اہم ترین ضرورت قرار دیا جائے۔ کیونکہ اگر ان گوناگوں اختلافات اور نوع بنوع کشاکشوں کے پیدا ہونے کے حقیقی اسباب کا جائزہ لے کر ان کے ازالے کی جلد اور پوری پوری کوشش نہ کی گئی تو نہ صرف یہ کہ ملک کی ترقی کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے گا بلکہ اس کی آزادی اور سلامتی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ یہ کوشش یقیناً ملک کے ہر فرد اور ہر گروہ کا فرض ہے اور بلا کسی شرط کے ہر ایک کو اپنا یہ فرض ادا کرنا چاہیے لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ برسر اقتدار ہونے کی بنا پر اس کی سب سے پہلی اور سب سے زیادہ ذمہ داری کانگریس پر عائد ہوتی ہے اس لیے چاہیے تو یہ تھا کہ حالات کے اس درجہ بگاڑ سے بہت پہلے [illegible] اگر ایسا ہوا ہوتا تو حالات اس ابتری کی حد کو ہرگز نہ پہنچتے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ ایک مسئلے پر خود وزیر اعظم [illegible] انہوں نے ناگا لینڈ پر تقریر کرتے ہوئے صاف لفظوں میں کہا ہے کہ حکومت نے [illegible] سے پوری توجہ نہیں کی اور آزادی کے بعد کے دنوں میں ہم نے جو غلطیاں کی ہیں [illegible]

سطح فسادات سے بچا سکتے تھے۔ یہ یقیناً ایک ایسی عظیم غلطی اور کوتاہی ہے جس پر حکومت کی سختی سے مذمت کی جا سکتی ہے لیکن زیر بحث باب جب کانگریس نے اس فرقہ واری کام کی طرف اپنی توجہ مبذول کی ہے تو اس کا خیر مقدم ہی کیا جانا چاہیے۔

اس سلسلے میں ہم اس بات سے کسی طرح اتفاق نہیں کر سکتے جو کچھ حلقوں کی طرف سے کہی جا رہی ہے یعنی یہ کہ ملک کو انتشار و اختلافات کا کوئی واقعی اور اہم خطرہ درپیش نہیں ہے اور کانگریس نے محض الیکشن جیتنے اور اپنی ناکامیوں پر پردہ ڈالنے یا ملک کی توجہ کو ان کی طرف سے ہٹانے کے لیے یہ ڈھونگ رچایا ہے۔ بدگمانی سے کام لیا جائے تو سب کچھ کہنے کی گنجائش ہے اور ہم خود بھی کانگریس کو ہر معاملہ میں مخلص و نیک نیت نہیں سمجھتے لیکن زیر بحث معاملہ میں کانگریس کے مخالفین کا یہ خیال اسی وقت وقیع سمجھا جا سکتا ہے جب یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ملک میں کوئی انتشار فی الواقع موجود ہی نہیں ہے۔ یا موجود تو ہے لیکن زیادہ قابل توجہ نہیں ہے حالانکہ یہ بات بداہۃً خلاف واقعہ ہے، اور ہم نے اوپر ملک کی واقعی صورت حال کا جو سرسری جائزہ لیا ہے وہ اس خیال کی تردید کے لیے بالکل کافی ہے۔ ہمارے نزدیک نہ یہ بات صحیح ہے کہ ملک کی وحدت خدانخواستہ پارہ پارہ ہوتی جا رہی ہو اور ملک انتشار کے کسی زبردست خطرے کے قریب آ لگا ہے نہ یہ بات کہ ملکی وحدت کو سرے سے کوئی خطرہ ہی نہیں ہے، اور حالات ہر طرح سے اطمینان بخش ہیں۔ صحیح بات اگر ہے تو صرف یہ کہ آزادی کے بعد ملک کے انتشار میں زبردست اضافہ ہوا ہے، اور یہ اضافہ روز افزوں ترقی پر ہے۔

پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ حکومت نے جس انداز میں قومی یکجہتی کے مسئلہ کو ہاتھ میں لیا ہے اسے آسانی کے ساتھ محض ایک سیاسی اسٹنٹ یا کوئی غیر سنجیدہ کوشش قرار دے دیا جائے۔ اس کوشش کی ابتدا تو لامحالہ کچھ زیادہ اچھے اور معقول انداز میں نہیں ہوئی تھی چنانچہ جب یہ مسئلہ سب سے پہلے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی میں زیر بحث آیا تھا تو اس [illegible] فرقہ پرستی کے علاج کے لیے یہ آسان نسخہ تجویز کر دیا تھا کہ تمام فرقہ پرست پارٹیوں پر پابندی لگا دی جائے [illegible] حکومت بھی [illegible] مذکور کی [illegible] اس مسئلہ پر غور کرتے وقت [illegible] کے کچھ ممبروں نے اپنی تقریروں میں [illegible] کیا [illegible] تقریباً بالکل قابل [illegible] [illegible] لیکن [illegible] [illegible]

ماہنامہ
Jamia Millia Islamia

زندگی

رامپور

جمادی الاخریٰ ۱۳۸۲ھ
نومبر ۱۹۶۲ء

جلد ۲۹
شمارہ ۵

مدیر:- سید احمد عروج قادری

● خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ:- منیجر "زندگی" رامپور - یوپی
● زر سالانہ:- صر ششماہی:- تین روپیہ فی پرچہ:- پچاس نئے پیسے
● ممالک غیر سے:- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر
پاکستانی اصحاب مندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں
منیجر ہفت روزہ "شہاب" ۱۱/ج شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

مالک:- جماعت اسلامی - ایڈیٹر:- سید احمد عروج قادری - پرنٹر پبلشر:- احمد حسن - مطبع:- ناظم پریس، بازار نصر اللہ خاں رامپور یوپی
مقام اشاعت:- دفتر زندگی و کانتی رامپور یوپی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

(گزشتہ سے پیوستہ)

مولانا ابواللیث اصلاحی، ندوی

البتہ ان کوششوں کو سنجیدہ یا مخلصانہ قرار دینے کے معنی لازماً یہ نہیں ہیں کہ ہم ان کو ہر پہلو سے صحیح اور مفید سمجھیں چنانچہ ہمیں متعدد پہلوؤں سے ان پر سخت اعتراض ہے۔

سب سے پہلے تو نیشنل انٹگریشن کانفرنس جس شکل میں منعقد ہوئی اور اس کے بعد نیشنل انٹگریشن کونسل کی جس طرح تشکیل عمل میں آئی ہے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

ہمارے نزدیک قومی یک جہتی کے مسئلے کو کامیابی کے ساتھ حل کرنے کے لیے یہ ایک بنیادی ضرورت ہے کہ اس مسئلے کو بھی ایک پارٹی کا مسئلہ نہ بنایا جائے بلکہ جیسا کہ وہ فی الواقع اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہے بھی ایک عام قومی مسئلہ سمجھتے ہوئے اس کے لیے ملک کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں کا اشتراک و تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی جائے چنانچہ اسی بنا پر ہمیں اس سے خوشی ہوئی کہ پنڈت نہرو نے اس مسئلے کو یہی حیثیت دیتے ہوئے نیشنل انٹگریشن کانفرنس طلب کی اور اس میں کانگریس ... علاوہ بھی متعدد پارٹیوں کے نمائندوں اور ملک کی نمایاں شخصیتوں کو شرکت کی دعوت دی لیکن یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ انھوں نے ملک کی کچھ پارٹیوں کو اس مرحلے پر نظر انداز کر دیا تو اس کی وجہ آخر کیا تھی۔ اگر یہ کہا جائے کہ صرف ان سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی گئی تھی جن کی پارلیمنٹ میں نمائندگی ہے تو یہ بات بھی صحیح نہیں قرار دی جا سکتی کیونکہ پارلیمنٹ کی متعدد پارٹیوں کے نمائندے مدعو نہیں کیے گئے تھے۔ اور اگر ان کو نظر انداز کرنے کی وجہ ان کا "فرقہ پرست" ہونا تھا تو اول تو ابھی تک یہی متعین نہیں ہو سکا ہے کہ فرقہ پرستی کس چیز کا نام ہے جیسا کہ مہتہ کمیٹی کی کارروائیوں سے واضح ہوتا ہے تو پھر پہلے سے کچھ پارٹیوں کو فرقہ پرست قرار دے دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے درآں حالیکہ کانفرنس میں کچھ ایسی پارٹیوں کے نمائندے بھی شریک تھے جو عرف عام میں فرقہ پرست جماعتیں ہی سمجھی جاتی

ہیں اور جن کا تعارف پنڈت نہرو بھی بارہا اسی طور سے کرا چکے ہیں۔ دوسرے جب مقصود یہ ہو کہ ایک ایسے مقصد کے لیے جس سے بظاہر کسی کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا حتی الوسع ہر ایک کا اشتراک و تعاون حاصل کر لیا جائے تو کسی پارٹی یا جماعت کو مدعو کرنے میں اس کا مطلق لحاظ نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس کا مسلک اور نظریات کیا ہیں بلکہ اس مقصد کے لیے ان جماعتوں کو مدعو کرنا تو زیادہ ضروری تھا جن کے نظریات اور سرگرمیوں کو بادی النظر میں قومی یک جہتی کے لیے مضر خیال کیا جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے بارے میں ایسا خیال محض شک و بدگمانی کی بنا پر قائم کر لیا گیا ہو اور حقیقت واقعہ یہ نہ ہو یا اگر ہو بھی تو اس اعتماد سے کام لینے کی ضرورت تھی کہ افہام و تفہیم سے ان کو صحیح راہ پر ڈالا جا سکتا ہے۔

اور بعینہٖ یہی بات نیشنل انٹگریشن کونسل کی تشکیل کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ یہاں بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ جن سنگھ اور ہندو مہاسبھا کے نمائندے تو کونسل کے رکن کی حیثیت سے شریک کیے گئے ہیں بلکہ خاص فرقہ پرستی کے مسئلے پر غور کرنے کے لیے جو کمیٹی بنی ہے' اس کے بھی وہ ممبر ہیں لیکن مسلم لیگ یا اکالی پارٹی یا ڈی۔ ایم۔ کے کا کوئی نمائندہ شریک نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ پارلیمنٹ میں ان کے نمائندے موجود ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ پہلے ہی قدم پر اقلیتوں کے دلوں میں شک و بدگمانی کا بیج ڈال دیا گیا ہے جس کا اندازہ مشہور شیڈول کاسٹ لیڈر شری بی۔ شام سندر کے حسب ذیل بیان سے ہو سکتا ہے۔ انھوں نے اپنے ایک کتابچے میں نیشنل انٹگریشن کی کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:۔ "یہاں یہ بات پیش نظر ہونی چاہیے کہ کانفرنس کا دروازہ اقلیتی جماعتوں کے نمائندوں کے لیے بند تھا گویا وہ غیر ملکی یا خود اپنے وطن کے دشمن ہیں۔ یا کم از کم یہ کہ ان کو قومی یک جہتی کے مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ہر اقلیت اتنی سمجھ تو ضرور رکھتی ہے کہ وہ سیکولرزم اور حقیقی قومی یک جہتی ہی کو ہندوستان جیسے ملک میں اپنی مستقل پشت پناہ سمجھے۔ اقلیتیں اس بات سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ علیحدگی پسندی غیر عملی غیر دانشمندانہ اور خود اپنے ہی مفاد کے لیے سخت مضر ہے لیکن ان کے سلسلے میں یہ انتیاز برت کر کے ان کو زبردستی یہ محسوس کرایا گیا ہے کہ وہ علیحدہ ہیں اور یہ کہ جب تک کہ اپنی شکایات کو ختم نہیں کر دیتے ہیں، وہ انتہا پسندانہ رجحانات پھیلانے کے ملزم گردانے جاتے رہیں گے یہ محض ان کو خاموش سرافگندگی پر مجبور کرنے کے لیے کیا گیا ہے جن پر ظلم کیا گیا ہے انہی کو الٹا مجرم گردانا جا رہا ہے انھیں کو گنہگار قرار دیا جا رہا ہے اور پھر قومی اسمبلیوں اور کانفرنسوں میں ان کو داخل ہونے سے روکا جا رہا ہے۔"

بلکہ شیام سندر صاحب کی تلخی تو اس سلسلے میں اتنی بڑھی ہوئی ہے کہ انھوں نے کانفرنس میں ہندو مہاسبھا

اور جن سنگھ کے نمائندوں کو باقاعدہ مدعو کرنے پر اس شبہہ کا اظہار کیا ہے کہ یہ سب کچھ حقیقی مسائل کو پیچھے ڈال دینے اور اقلیتوں کو محسوس کرانے کی شاطرانہ چالیں ہیں کہ اگر وہ اپنی شکایات پر زور دے کر برسراقتدار پارٹی کو پریشان کرتی رہیں تو ان سے انتہا پسند اور زیادہ مشتعل ہوں گے اور مختلف طریقے سے ان کو سزائیں بھگتنی پڑیں گی (قومی یک جہتی اور اقلیتوں کے مسائل صفحہ ۶) اسی طرح مسلم لیگ کے صدر جناب محمد اسمٰعیل صاحب نے بھی پارلیمنٹ کے گزشتہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:۔

اس سوال کے جواب میں وزیر داخلہ نے کہا ہے کہ اگرچہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں کو قومی یک جہتی کانفرنس میں یا اس کی کمیٹیوں میں شریک نہیں کیا گیا ہے مگر دوسری جماعتیں بھی ان کمیٹیوں کے سامنے بطور گواہ پیش ہو سکتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس مسئلے کو ایوان کے باہر طے کیا گیا ہے لیکن اسے مشترکہ طور پر طے کیا جانا چاہیے تھا کئی جماعتیں جن کا اس مسئلے سے گہرا تعلق ہے انھیں کارروائی میں نظرانداز کیا گیا ہے۔ اس کے بعد انھیں ایک کمیٹی کے سامنے حاضر ہونے کی پیش کش کی گئی ہے گویا کمیٹی کے ممبروں کو جج کی حیثیت سے کام کرنا ہے اور دوسری پارٹیوں کے ممبروں کو گواہ یا یوں کہیے کہ مجرم یا ملزم کی حیثیت سے ان کے سامنے پیش ہونا ہے۔ ان پارٹیوں کے ممبروں کو اس بات کا موقع حاصل نہیں ہے کہ وہ ان اعداد و شمار اور ان کی بنیادوں کو جانچ سکیں جن سے کمیٹی اپنے نتائج اخذ کرنا چاہتی ہے۔ یہ بات تمام پارٹیوں کے لیے نامناسب ہے اور اگر تمام متعلقہ پارٹیوں کو اسی نظام اور مشین میں نصب کر لیا جائے جو یہ فریضہ انجام دے رہی ہیں تو اس میں کچھ نقصان نہ ہوگا۔

یہ جذبات اس لحاظ سے خاص طور سے قابل لحاظ ہیں کہ ان سے قومی یک جہتی کے اصل مقصد کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور چونکہ ابھی ایک عرصہ تک یہ کوششیں جاری رہنے والی ہیں۔ خود قومی یک جہتی کونسل کا قیام بھی ایک دیرپا ادارہ ہی کی حیثیت سے وجود میں آیا ہے اور ممکن ہے اس مقصد کے لیے آئندہ کچھ اور نئی کمیٹیاں اور ادارے قائم کرنے کی ضرورت پیش آئے اس لیے بہتر ہوگا کہ اس نقص کی مناسب طور سے اصلاح کر دی جائے بلکہ ہمارے خیال میں اس میں بھی کوئی حرج نہ ہوگا کہ اس طرح کی کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں اقلیتوں کے افراد کو ان کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے جگہ دی جائے اور اسے کافی نہ سمجھ لیا جائے کہ اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد کو ان کے ماہر تعلیم ہونے یا ان کی کسی سیاسی یا سرکاری حیثیت کی بنا پر نامزد کر دیا گیا ہے یہ لوگ پیش نظر مقصد کے لیے اور پہلوؤں سے چاہے کتنے ہی مفید کیوں نہ ثابت ہوں لیکن اقلیتوں کے نقطۂ نظر سے یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ وہ ان کے نمائندے ہونے کے بجائے اور حیثیت میں منتخب ہوئے ہیں اور اس

بنا پر ان کا انتخاب ان کے پورے اطمینان کا موجب نہیں ہو سکتا اس بات میں کوئی شبہہ نہیں کہ قومی یک جہتی کا کوئی ایسا تصور ہندوستان میں عملاً کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کہ جس میں اقلیتوں کے وجود کی گنجائش نہ ہو اور اس وقت تو وہ بہرحال موجود ہی ہیں اس لیے حتی الوسع ان کے جذبات کی رعایت بہت ضروری ہے۔

پھر جو کمیٹیاں کونسل کی طرف سے بنائی گئی ہیں اُن کے طریقہ کار میں بھی کچھ ایسے نقائص موجود ہیں جن کا اثر ہمارے خیال میں لامحالہ ان کی افادیت پر بھی پڑا ہو گا۔ یہ اپنا ذاتی تجربہ ہے کہ اشوک مہتہ کمیٹی میں مجھے قومی یکجہتی اور فرقہ پرستی کے موضوع پر گفتگو اور تبادلۂ خیال کے لیے بلایا گیا تھا لیکن ہمیں بات چیت کے وقت کچھ ایسا محسوس ہوا کہ ہماری حیثیت گواہ سے زیادہ نہیں ہے کمیٹی کے ممبران نے تو نہیں لیکن غالباً وزارت داخلہ کے جو افراد وہاں موجود تھے ان میں سے بعض حضرات نے اپنی علیحدہ گفتگو میں کمیٹی کے روبرو پیش ہونے والے افراد کو گواہ ہی کے لفظ سے یاد فرمایا تھا جس کی مجھے تصحیح کرنی پڑی اور اخباری اطلاعات میں بھی ان کی بات چیت کو گواہی ہی کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا رہا۔ اور گفتگو کے وقت یہ بات تو ہمیں بہ شدت محسوس ہوئی کہ اسے عام مفہوم کے لحاظ سے بہ مشکل ہی بات چیت یا تبادلۂ خیال کہا جا سکتا ہے کیونکہ ارکان کمیٹی اپنا کام صرف اتنا ہی سمجھتے تھے کہ وہ سوالات کریں اور خود اپنے کو کسی سوال کے جواب کا مکلف بالکل نہیں سمجھتے تھے اور نہ کسی جواب پر کوئی باقاعدہ ضرورت سمجھتے تھے کہ اس کے بارے میں طرفین کا پورا نقطۂ نظر سامنے آکر بات کسی مختتم نتیجے پر پہنچ سکے۔

پھر عجب بات یہ ہے کہ جن گواہوں کو تبادلۂ خیالات کے لیے طلب کیا گیا تھا ان کو پہلے سے اس کی ہَوا تک بھی نہیں لگنے دی گئی کہ موضوع گفتگو کیا باتیں ہوں گی بلکہ دریافت کرنے پر بھی وہ باتیں پہلے سے نہیں بتائی گئیں اور عین وقت پر وہ باتیں دریافت کی گئیں جو کمیٹی کے نقطۂ نظر سے خواہ کتنی ہی ضروری کیوں نہ رہی ہوں لیکن قومی یک جہتی یا فرقہ پرستی کے موضوع سے ان کا کوئی ربط بمشکل ہی جوڑا جا سکتا ہے۔ بہرحال کمیٹی کی نگاہ میں تبادلہ خیالات کے اس طریقے کی جو بھی افادیت یا ضرورت رہی ہو۔ یہ عدالتی انداز کی پوچھ گچھ قومی یک جہتی یا فرقہ پرستی جیسے مسائل کی تحقیق کا کوئی موزوں طریقہ نہیں ہے۔ اس سے کہیں بہتر یہ ہوتا کہ جس سے جو کچھ پوچھنا تھا اس کے بارے میں اس کے تحریری جوابات حاصل کر لیے جاتے اور اس کے بعد بھی کوئی وضاحت طلب بات باقی رہ جاتی تو اس پر بعد میں مزید زبانی بات چیت کر لی جاتی۔

طریقہ کار کے ان نقائص سے زیادہ قابل لحاظ اور لائق توجہ انداز فکر کی خامیاں ہیں۔ قومی یکجہتی کے حصول کے لیے

اب تک جو کوششیں یا تدابیر اختیار کی گئی ہیں ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے بڑھتے ہوئے انتہا پسندانہ اور فرقہ پرستانہ رجحانات کی روک تھام کے لیے یا تو قانون کا سہارا ڈھونڈا جا رہا ہے یا ایسی تدابیر کا جن کا اصل مرض کے اسباب سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے ان میں سو فی صدی کامیابی حاصل ہونے کے بعد بھی اصل مرض سے نجات کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔

جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے آسام اور جبل پور کے فسادات ہی حکومت کے خواب غفلت سے بیدار ہونے کے اصل باعث بنے ہیں۔ اس لیے اگر ان کا فوری اثر حکومت پر پڑا تھا کہ وہ حالات کو قانون کے ذریعہ ٹھیک کرنے کی کوشش کرے تو یہ چنداں قابل تعجب بات نہ تھی۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد بھی حکومت کے اس رجحان میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اس مدت میں پارلیمنٹ کے ذریعہ تعزیرات ہند اور قانون نمائندگی عوام کی دفعات میں متعدد ترمیمات کر کے ان کو بہت زیادہ سخت بنایا جا چکا ہے اور درمیان میں فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی لگانے کا خیال جو فسادات آسام و جبل پور کے بعد بڑی شدت سے ابھرا تھا ملتوی کر کے اب پھر اس کا چرچا شروع کر دیا گیا ہے اور کیا عجب اشوک مہتہ کمیٹی کے قیام میں بھی اسی کی تیاری یک گو نہ پیش نظر ہو لیکن کیا واقعۃً ان تدبیروں سے فرقہ پرستی یا تفریق پسندی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ مذکورہ دونوں قوانین کی دفعات میں الیکشن سے پہلے ہی ترمیمات ہو چکی تھیں بلکہ غالباً الیکشن سے پہلے ان کو پاس کرانے میں جلدی بھی اسی خیال سے کی گئی تھی کہ الیکشن کی جد و جہد کو قابو میں رکھا جا سکے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے بعد حالات کچھ سدھرے نہیں ہیں بلکہ ان میں اور ابتری پیدا ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ پنڈت نہرو نے قومی یکجہتی کونسل کے افتتاح کے موقع پر بھی اس کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ

"عام انتخابات کے دوران متعدد ناپسندیدہ رجحانات کا اظہار ہوا ہے اور انتخابی جد و جہد کے دوران متعدد تخریبی عوامل ظہور میں آئے ہیں۔"

قانون کی ضرورت و افادیت بجائے خود مسلم ہے لیکن یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ قانون کسی خرابی کو دور کرنے کا کوئی مؤثر ذریعہ نہیں ہے۔ پھر اس کی جو کچھ بھی افادیت ہے اس کا دار و مدار اس کے صحیح اور بر وقت استعمال پر ہے اور بحالات موجودہ اس کی توقع بہت تھوڑی ہے۔ چنانچہ مذکورہ قوانین ان ترمیمات سے پہلے بھی ان خرابیوں کی روک تھام کے لیے کچھ کم مؤثر نہیں تھے لیکن نتیجہ سامنے ہے۔

بہر حال ان ترمیمات سے اصل مقصد کو تو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ البتہ ان کا یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا

ہے کہ ان کی بنا پر اقلیتوں میں ایک خاص طرح کی تشویش اور حکومت کے ارادوں کے بارے میں سخت بدگمانیاں پیدا ہوگئی ہیں جس کا اظہار پارلیمنٹ میں بھی ان ترمیمات پر غور کے وقت ہو چکا ہے

ترمیمات کے پاس ہوتے وقت پارلیمنٹ کے عمومی احساسات کیا تھے۔ اس کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کی اس رپورٹ سے کیا جا سکتا ہے۔

اس بل کا لسانی اقلیتوں کے اس جائز حق پر کہ وہ اپنی زبانوں کا تحفظ کر سکتی ہیں جو اثر مرتب ہو سکتا ہے اس پر پارلیمنٹ کے ہر حلقہ کی طرف سے قابل لحاظ تشویش کا اظہار کیا گیا

اور اس موقع پر ممبروں نے جو تقریریں کیں ان سے بھی اس تشویش و اضطراب کا اظہار ہوتا ہے۔ اس بل کی ایک خاص دفعہ کی رو سے مذہب، نسل، ذات، فرقہ یا زبان کی بنا پر نفرت و عداوت کے جذبات بڑھانے کو ایک انتخابی جرم قرار دیا گیا ہے چنانچہ متعدد ممبروں نے زبان کو اس فہرست میں شامل کرنے پر نہایت سخت تنقیدیں کیں

مسٹر اناتھ پاورتی (پی ایس پی) نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "زبان کا مسئلہ اتنا سطحی نہیں ہے جتنا حکومت اسے ظاہر کرنا چاہتی ہے۔ اس مسئلے کو حل کرنے میں حکومت کو جو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے اس کو تعزیری قانون کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن علاج مرض سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوگا"

اور مسٹر چکرورتی نے اپنی تقریر میں یہ اندیشہ ظاہر کیا کہ اگر الیکشن میں ایک سیاسی مسئلے کی حیثیت سے زبان پر گفتگو کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا گیا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اس مسئلے پر سڑکوں پر جنگ ہو۔ جس کی تائید کرتے ہوئے مسٹر ہیروری دتا نے مزید یہ بھی کہا کہ قبائلی علاقوں کو اپنی زبانوں کے مسئلے پر الیکشن لڑنے کا بالکل حق ہے۔ اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ زبان کو مذکورہ فہرست سے خارج قرار دینے کے لیے جو باقاعدہ ترمیم پیش ہوئی تھی اور جو بالآخر رد ہوگئی اس کی تائید دو کانگریسی ممبروں، مسٹر مہابیر تیاگی اور مسٹر لابل چودھری نے بھی کی تھی۔

وہ تو کہیے کہ پارلیمنٹ میں فرقہ پرستی کے الزام سے ہر شخص بچنا ہی چاہتا تھا اور خاص طور سے مسلم ممبران ورنہ جس طرح زبان کو اس فہرست میں شامل کرنے پر سخت تنقیدیں ہوئیں، مذہب کو شامل کرنے پر بھی ویسی ہی تنقیدیں ہو سکتی تھیں کیونکہ یہ دفعات زبان ہی کی طرح مذہب کے بھی صحیح مفاد پر غلط طور سے اثر انداز ہو سکتی ہیں اور خاص طور سے وزیر قانون کی یہ توضیح تو کسی طرح تنقید سے بچ ہی نہیں سکتی تھی

کہ "فرقہ وارانہ اور مذہبی پروپیگنڈے کی ممانعت میں عبادت گاہوں کا غلط استعمال بھی داخل ہے لیکن عبادت گاہوں کا نام اس لیے نہیں لیا گیا ہے کہ اس سے حکومت کے ارادوں کے بارے میں خواہ مخواہ تشویش پیدا ہوگی اور اس پر تنقیدیں شروع ہو جائیں گی" کیونکہ اس توضیح کے بعد حکومت کے ارادوں پر کوئی پردہ باقی نہیں رہ گیا تھا اور وہ ارادہ بجا طور سے موجب تشویش ہو سکتا ہے کیونکہ اس سے مساجد و معابد کی آزادی بے جا طور سے مجروح و متاثر ہو سکتی ہے۔ لیکن مذہب مسجد اور مندر کے لیے احتجاج کر کے کون نکّو بننے کے لیے تیار ہو سکتا تھا!

"ٹائمز آف انڈیا نے "ایک جزوی علاج" کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا تھا جس میں اس نے سب سے پہلے تو یہ سوال اٹھایا تھا کہ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف جو پہلے سے موجود تھی اس کی رو سے بھی مختلف گروہوں کے درمیان دشمنی اور عداوت کے جذبات پیدا کرنا یا پیدا کرنے کا ارادہ کرنا جرم تھا۔ اگر گزشتہ چودہ سال میں حکومت اس دفعہ کو کام میں لاتے ہوئے ان شرپسندوں کے ساتھ سختی کا معاملہ نہیں کر سکی جو فرقہ وارانہ، یا نسلی جذبات سے غلط فائدہ اٹھاتے ہیں، تو اس دفعہ میں محض لفظی ترمیمات کر دینے سے صورت حال کی اصلاح کی کس طرح توقع کی جا سکتی ہے اور اس کے بعد دوسری بات ٹائمز نے یہ لکھی تھی کہ اس بل میں جو ترمیمات کی جا رہی ہیں ان کی رو سے جرم کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا ہے پہلے دشمنی یا منافرت کو عملاً ترقی دینا جرم تھا اور اب ہر ایسے کام یا اس کے ارادے کو جرم قرار دیا گیا ہے جس سے مختلف مذہبی، نسلی یا لسانی گروہوں، ذاتوں یا فرقوں کے درمیان اتحاد و توافق باقی رکھنے میں رکاوٹ پیدا ہو سکتی ہو، یا جس سے پبلک امن و امان میں خلل پڑتا ہو یا پڑنے کا اندیشہ ہو۔ ظاہر ہے اس ترمیم سے کسی شخص پر اس دفعہ کی خلاف ورزی کا الزام لگانا اور ثابت کر دینا بہت آسان ہو گیا ہے۔ اس لیے حکمراں گروہ اسے آسانی کے ساتھ غلط مقاصد کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے رہی یہ بات کہ اس الزام کو بہر حال عدالت میں بھی ثابت کرنا ہوگا، تو عدالتیں محض الفاظ پر نظر رکھتی ہیں بالفاظ دیگر اس شق کے غلط استعمال کے خلاف محض حکومتوں کی نیک نیتی ہی تنہا ضمانت ہے ——— اپنے مقالے کے آخر میں ٹائمز نے ایک نہایت عمدہ بات یہ لکھی تھی کہ اس بل کا تعلق، فرقہ پرستی اور ذات پات وغیرہ بیماریوں کے محض ظاہری سطح کی اصلاح سے ہے، اس سے یک جہتی کو کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا ملک کی قومی یک جہتی میں تشدد پسندوں کی سرگرمیاں اصل رکاوٹ نہیں ہیں جن کی تعداد خوش قسمتی سے بہت

تھوڑی ہے۔ بلکہ حقیقی رکاوٹ، فرقہ پرستانہ اور ذات پات کا وہ تعصب ہے جو اپنے کو صرف متشددانہ سرگرمیوں ہی میں نہیں بلکہ سیکڑوں متشددانہ صورتوں میں بھی ظاہر کرتا ہے اور خود کانگرس بھی ذات پات اور فرقہ وغیرہ کے تعصبات کے پاس لحاظ سے بری نہیں ہے اس لیے جب تک کہ وہ خود اپنے کو ان تعصبات سے پاک نہیں کر لیتی، ان بلوں کے بلند بانگ مقاصد کے حصول کی کچھ زیادہ توقع نہیں کی جا سکتی۔

ٹائمز ۱۲ اگست ۱۹۶۱ء

بہرحال ان مخالفتوں کے باوجود یہ دونوں بل بہت عرصہ پہلے قانون بن چکے ہیں لیکن صورت حال جیسی کچھ ہے سامنے ہے

فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی لگانے کا مسئلہ آسام و جبل پور کے لسانی اور فرقہ وارانہ فسادات کے بعد ان کے ردعمل کے طور پر سب سے پہلے کانگریس پارلیمنٹری بورڈ کے زیر غور آیا تھا لیکن ملک کا عمومی ردعمل اس کے خلاف تھا اور خود وزیر اعظم پنڈت نہرو اور وزیر قانون ہند نے بھی مختلف وجوہ کی بنیاد پر جن میں دستوری رکاوٹ کا مسئلہ سب سے اہم تھا اس کی مخالفت کی تھی جس کی بنا پر اس کا ارادہ اسی زمانے میں ترک کر دیا گیا تھا اور اس کے بعد اگر کچھ کانگریسی وزراء یا لیڈر وقتاً فوقتاً اس کا نام لیتے بھی تھے تو بہت گول مول انداز میں جس کا مطلب عام طور سے یہی سمجھا جاتا تھا کہ شاید کچھ جماعتوں کو مرعوب و خوف زدہ رکھنے کے لیے اس کی یاد تازہ رکھنا ضروری خیال کیا جا رہا ہے لیکن ادھر کچھ دنوں سے پھر اس کا چرچا شدومد کے ساتھ شروع کر دیا گیا ہے۔ ابھی حال میں وزیر داخلہ ہند لال بہادر شاستری نے یہ اعلان کیا ہے کہ فرقہ پرست اور علیحدگی پسند جماعتوں پر پابندی عائد کرنے کا مسئلہ سنجیدگی کے ساتھ زیر غور ہے اور اس غرض کے لیے اگر ضرورت ہوئی تو دستور میں بھی ترمیم کی جائے گی اور کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کے شری رگھوناتھ سنگھ نے اس مطلب کی ایک غیر سرکاری قرارداد بھی پارلیمنٹ میں پیش کر دی ہے جو بحث و گفتگو کے لیے منظور ہو چکی ہے لیکن آخری وقت میں پیش ہونے کی وجہ سے پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس کے لیے ملتوی کر دیا گیا ہے۔

ہمیں اس بارے میں تو اب بھی شبہہ ہے کہ حکومت نے فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی لگانے کا قطعی فیصلہ کیا ہے اگر ایسا ہوتا تو غالباً وزیر قانون کے قول کے مطابق سب سے پہلے وہ دستور میں ترمیم کا بل لاتی یا مسٹر رگھوناتھ سنگھ نے جو قرارداد غیر سرکاری حیثیت میں پیش کی ہے وہ سرکاری طور پر پیش ہوتی، البتہ یہ بات ہر طرح قرین قیاس معلوم

ہوئی ہے کہ فی الحال حکومت نے فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی لگانے کے لیے رائے عامہ کو یک گونہ ہموار کرنے یا اس بارے میں رائے عامہ کا اندازہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے تاکہ وہ اس اندازے کے مطابق اپنے آئندہ اقدام کے بارے میں قطعیت کے ساتھ کوئی فیصلہ کر سکے گویا کچھ جماعتوں کو مرعوب و خوف زدہ کرنے کے علاوہ بھی اب کچھ سوچا جا رہا ہے اور مسٹر رگھوناتھ سنگھ کی یہ غیر سرکاری قرارداد اس سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے جس کا نتیجہ چاہے جو کچھ بھی برآمد ہو یہ مطلوبہ غرض تو بہرحال اس سے پوری ہی ہو سکتی ہے اور ضمناً اس سے تخویف کا منشاء بھی حاصل ہو سکتا ہے۔

بہرحال اگر ہمارا یہ خیال صحیح ہے تو اس بات پر افسوس و حیرت ظاہر کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اس غرض کے لیے پارلیمنٹ کو بھی ایک ذریعے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ رائے عامہ کو کسی خاص رخ کی طرف پھیرنے کے لیے حکومت کے پاس بہت کافی اور موثر وسائل و ذرائع موجود ہیں ان سے وہ بخوبی کام لے سکتی ہے یہ کیا ضروری ہے کہ پارلیمنٹ سے اس کے اصل اور حقیقی کام کے علاوہ کسی خاص نہج کے پروپیگنڈے وغیرہ کا کام بھی لیا جائے یہ تو پارلیمنٹ کی شان و وقار کے بھی منافی بات ہے اور کچھ پارٹیاں پارلیمنٹ سے اپنے پروپیگنڈے وغیرہ کا بھی کام لینے کے درپے رہتی ہیں تو کم از کم کانگرس کے لیے تو یہ کسی طرح موزوں نہیں ہو سکتا کہ اس بارے میں وہ بھی ان کی اتباع کرے کیونکہ برسراقتدار ہونے کی بنا پر اس پر پارلیمنٹ کے وقار و احترام کی حفاظت کی خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

اسی طرح ہمیں اس بات پر بھی حیرت ہے کہ شری رگھوناتھ سنگھ کی قرارداد پیش کرنے پر جب کچھ مخالف ممبروں نے یہ اعتراض پیش کیا کہ دستور ہند کی دفعہ ۱۹ میں ہندستانی شہریوں کو انجمن اور یونین بنانے کی گارنٹی دی گئی ہے اور یہ قرارداد ان کے اس حق پر اثر انداز ہوتی ہے اس لیے یہ ایوان اس پر بحث کا مجاز نہیں ہے تو اس اعتراض کو نہایت سرسری طور پر ٹال دیا گیا بلکہ بعض ممبروں نے تو اصل مسئلے سے ہٹ کر معترض پر یہ طنز کرنا بھی ضروری سمجھا اور اس پر ان کو ہر طرف سے داد و تحسین ملی کہ جو لوگ دستور کی بنیاد سیکولرزم اور اتحاد کو نہ مانتے ہوں انہیں دستور کا نام لینے کا کوئی حق نہیں ہے حالانکہ ہمارے خیال میں یہ اعتراض ایسا نہیں تھا کہ اسے اس طرح ٹالنے کی کوشش کی جاتی اور طنز و تعریض سے کام لینا تو ظاہر ہے کسی دستوری اعتراض کے موقع پر ایک بالکل ہی غیر مناسب اور بے محل سی بات تھی کیونکہ پارلیمنٹ کا ہر ممبر دستور کی وفاداری کا حلف پہلے ہی دن لے چکا ہوتا ہے اور بنیادی حقوق اس دستور کا سب سے اہم اور قیمتی جزء ہے اس لیے ان کے سلسلے میں تو معمولی سے معمولی اعتراض بھی خاص

توجہ کا مستحق بن جانا چاہیے بلکہ سچ پوچھیے تو اس پہلو سے تو ہمیں جناب اسپیکر کی وہ دلیل بھی بڑی عجیب معلوم ہو رہی ہے جس کی بنا پر انھوں نے اس اعتراض کو رد فرمایا ہے یعنی یہ کہ "آئینی جواز کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے اور یہ کہ اس قرارداد کو زیر بحث لانے سے فرقہ پرست جماعتوں پر از خود کوئی پابندی عائد نہیں ہو جائے گی۔

دستور کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا اس کا صحیح فیصلہ تو ماہرین آئین ہی کر سکتے ہیں لیکن ہمارے خیال ناقص میں تو یہ بات آتی ہے کہ جب کسی بل کے بارے میں یہ سوال در پیش ہو کہ دستور اس کی اجازت دیتا ہے یا نہیں تو اس وقت تک اس پر بحث و گفتگو ملتوی کر دینی چاہیے جب تک کہ ممبران پارلیمنٹ خود اپنے طور پر اس پر مطمئن نہ ہو جائیں کہ اس سے دستور کی کوئی خلاف ورزی نہیں ہو رہی ہے بلکہ اگر ضرورت پیش آئے تو اس بارے میں عدالت کا مشورہ حاصل کر لینے میں بھی پس و پیش نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر اس پر گفتگو کرنا ایک یہ معنی رکھتا ہے کہ دستور کا احترام کما حقہ ملحوظ نہیں رکھا گیا دوسرے پارلیمنٹ کا قیمتی وقت ایک ایسے مسئلہ پر صرف کیا جا رہا ہے جس کا جواز یا افادیت خود ان کے نزدیک بھی مسلم نہیں ہے اور یہ احتیاط اس وقت زیادہ ضروری ہو جاتی ہے جب کسی قرارداد کے پیش ہونے کے سلسلے میں بنیادی حقوق کے متعلق کوئی سوال در پیش ہو کیونکہ بنیادی حقوق کی حفاظت پارلیمنٹ اور بالخصوص اسپیکر کی اولین ذمہ داری ہے اور وہ اتنے قیمتی ہیں کہ ان کا کوئی ادنیٰ نقصان بھی اس توقع پر گوارا نہیں کیا جانا چاہیے کہ اس کا ازالہ بعد کو عدالتوں کے ذریعہ ہو سکتا ہے اور ہمارے خیال میں جناب اسپیکر کا یہ ارشاد تو سو فی صد صحیح ہے کہ شری رگھو ناتھ سنگھ کی قرارداد کو زیر بحث لانے سے فرقہ پرست جماعتوں پر از خود کوئی پابندی عائد نہیں ہو جائے گی لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس دلیل سے ان لوگوں کا ذہن کس طرح مطمئن ہو سکتا ہے جو اس قرارداد کو پیش ہونے ہی کو دستور کے منافی سمجھتے ہیں۔ بہرحال یہ تو ہم نے اپنے ذہن کی ایک کھٹک کا اظہار کیا ہے ورنہ ظاہر ہے اسپیکر کے فیصلہ کے بعد اب اس پر گفتگو کا کوئی موقع ہی باقی نہیں رہا۔ قرارداد پر بحث و گفتگو کا فیصلہ ہو چکا ہے اور محرک کی طرف سے اس پر کچھ گفتگو ہو بھی چکی ہے اب تو صرف یہ دیکھنا باقی رہ گیا ہے کہ قرارداد کا آخری انجام کیا ہوتا ہے۔ بظاہر ہمیں یہ توقع نہیں کہ خود کانگریسی ممبران پارلیمنٹ بھی اس کی تائید کریں گے کیونکہ ہمارے خیال میں ان کے لیے کم از کم وزیر قانون کے اس مشورے کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگا کہ اس طرح کا کوئی اقدام دستور میں تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں اور ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ یہ حضرات اسپیکر کے اس فیصلے کو جس کی حیثیت محض ایک اصولی فیصلے کی ہے اور بجائے خود صحیح ہے کہ "پارلیمنٹ میں کسی قرارداد پر بحث محض اس لیے ملتوی نہیں کی جا سکتی کہ کوئی اور کمیٹی اس مسئلے پر غور کر رہی ہے" لازماً یہ معنی

پہنا ئیں گے کہ اب انہیں کم از کم مہتہ کمیٹی کے رپورٹ کا انتظار کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے لیکن ان سب باتوں کے باوجود اس بات کا قوی امکان ہے کہ پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس تک اشوک مہتہ کمیٹی کی رپورٹ بھی حکومت کو مل جائے اور اس وقت تک ملک کی فضا کو بھی اس کے لیے کچھ زیادہ تیار کر لیا جائے کہ پارلیمنٹ میں اس طرح کی کوئی قرارداد پاس ہو سکے اس لیے خود حکومت بھی کم از کم یہ معلوم کرنے ہی کے لیے اس کی تائید کرے کہ اس طرح کی کارروائیوں کے بارے میں رائے عامہ بالخصوص قانون کا نقطہ نظر کیا ہے۔ اور پھر اس کی روشنی میں ضرورت پیش آئے تو دستور میں ترمیم کے مسئلے پر غور کرے اور پھر آگے قدم اٹھائے۔

بنابریں ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ اس موقع پر فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی لگانے کے بارے میں اپنے خیالات صفائی سے عرض کر دیں۔

اس سلسلے میں ہمیں سب سے پہلے یہ عرض کرنا ہے کہ فرقہ پرستی ذات پات اور لسانی و جغرافیائی تعصبات وغیرہ کو ہم بھی لعنت اور ملک کی بدقسمتی کی ایک خاص علامت سمجھتے ہیں اور ان سے ملک کو نجات دلانے کے لیے حکومت کو جو فکر و تشویش لاحق ہے اس پر ہم اسے ہر طرح مستحق مبارک باد خیال کرتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہمارا یہ خیال ہے کہ گزشتہ دنوں حالات کے بگاڑ کے جو خاص نمونے سامنے آئے ہیں ان سے متاثر ہو کر اور اس سلسلے میں واقعی خود ذمہ داران حکومت کی طرف سے جو غفلتیں یا کوتاہیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی جلد از جلد تلافی کرنے کے خیال سے کوئی ایسا قدم ہرگز نہیں اٹھانا چاہیے جس سے وقتی طور سے تو یہ لغتیں بظاہر دور ہوتی نظر آئیں لیکن اس سے ان کے مستقبل اور کلی استیصال کا فائدہ حاصل نہ ہو سکے اور کچھ ان سے بھی بڑی لعنتیں سر پر مسلط ہو جائیں۔

کسی ملک کی ترقی اور اس کے امن و امان کے قیام کا دار و مدار بہت کچھ اس پر ہے کہ اس ملک کے آئین کا احترام و وقار باقی رکھا جائے اور اس پہلو سے آئین کا وہ جزو ایک خصوصی اہمیت رکھتا ہے جو بنیادی حقوق سے متعلق ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی حیثیت آئین کی روح کی ہوتی ہے اور ان سے باشندگان ملک کو بھی ایک خاص دلچسپی اور لگاؤ ہوتا ہے اور ملک سے باہر بھی انہی کی بنیاد پر اس ملک کے مہذب و شائستہ ہونے کا عام طور سے فیصلہ کیا جاتا ہے اگر خدانخواستہ حکومت نے اس وقت کے مخصوص حالات کے تحت یا اور کسی وقتی فائدہ و غرض کے لیے بنیادی حقوق پر کوئی دست درازی کی تو دنیا کی مہذب سوسائٹی میں

ہندوستان کی بے عزتی ہوگی وہ تو اپنی جگہ پر ہے خود ملک میں اس سے جمہوری رجحانات کو شدید صدمہ پہنچے گا اور آمریت و فسطائیت کے فروغ و قیام کے لیے راہیں ہموار ہوجائیں گی۔ اول تو بنیادی حقوق میں کسی غیرمعمولی ترمیم ہی سے ان کے احترام کا جذبہ مجروح ہوتا ہے کیونکہ عوام کی نگاہ میں ان کی اہمیت ان کی معنویت سے زیادہ ان کی ظاہری شان و وقار کی رہین منت ہوتی ہے۔ دوسرے اس نوعیت کی ترمیم کہ جماعت اور یونین بنانے کے حق پر بھی غیرمعقول پابندیاں لگ سکیں یہ معنی رکھتی ہے کہ ملک کے باشندوں کا ایک بہت بڑا بنیادی حق خطرے میں ڈال دیا جائے اور پھر کسی بھی جماعت کو یہ اطمینان نہ رہے کہ وہ اپنا کام آئندہ بھی جاری رکھ سکتی ہے۔ مثلاً خود کانگریس کو اس کا خطرہ پیش آسکتا ہے کہ آئندہ ملک میں کوئی ایسی پارٹی برسراقتدار آجائے جو اس کی جماعت سازی کو ملکی مفاد کے خلاف سمجھے اور اس بنا پر اس پر بھی پابندیاں عائد کردے کیونکہ اس بات کی کیا ضمانت ہوسکتی ہے کہ وہی ہمیشہ برسراقتدار رہے گی۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ دستور میں ترمیم کے بغیر فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی نہیں لگائی جاسکتی اس کا اظہار خود وزیر قانون ہند بھی بہت پہلے کرچکے ہیں جس کی تائید دوسرے بہت سے ماہرین قانون نے بھی کی ہے اور ٹائمز آف انڈیا کے لفظوں میں تو یہ ایک ایسی واضح بات ہے کہ اگر وزیر قانون نے کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کو یہ بتایا تھا کہ دستور ہند کی دفعہ ۱۹ سی I کی رو سے کسی پارٹی کو الیکشن وغیرہ میں حصہ لینے سے روکا نہیں جاسکتا تو انھوں نے کوئی انکشاف نہیں کیا تھا۔ پارٹی کو یہ بات کوئی بھی بتا سکتا تھا پس جب صورت حال یہ ہے کہ فرقہ پرست پارٹیوں پر پابندی اس کے بغیر عائد نہیں کی جاسکتی کہ پہلے دستور میں ترمیم کی جائے تو حکومت کو بہرحال اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کی ضرورت ہے کہ فرقہ پرستی وغیرہ کے خاتمے کے لیے لامحالہ دستور میں ترمیم کرانا ضروری ہی ہے یا یہ مدعا دوسرے طریقوں مثلاً معاشرتی و سیاسی شعور و احساس کو بیدار کرکے یا تعزیرات ہند وغیرہ کی موجودہ دفعات ہی کو ٹھیک طور سے زیرعمل لاکر بھی حاصل کیا جاسکتا ہے۔

رہی یہ بات کہ دفعہ ۱۹ کی شق I سی کی رو سے اسٹیٹ کو اس کا حق حاصل ہے کہ اخلاق یا امن و امان کے مفاد کے پیش نظر اس حق کے استعمال پر کچھ "معقول" پابندیاں عائد کردے تو بے شک یہ بات صحیح ہے لیکن ہر شخص فیصلہ کرسکتا ہے کہ کسی پارٹی کو ختم کردینے کو "معقول" پابندی قرار دینا کسی معقولیت پسند آدمی کا کام ہرگز نہیں ہوسکتا اور یہ اس شق کی روح پر صریح ظلم کے مترادف ہے اور یہاں یہ بات بھی واضح رہنا چاہیے کہ دستور

کی موجودہ دفعہ ۱۹ کے تحت حکومت کی کسی عائد کردہ پابندی کی معقولیت کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے نہ کہ برسر اقتدار پارٹی کا۔ البتہ کانگریس اپنی اکثریت کی بنا پر پارلیمنٹ سے ایسی ترمیم پاس کرا سکتی ہے جس کی رو سے معقول پابندیاں عائد کرنے کا آخری حق پارلیمنٹ کو حاصل ہو جائے لیکن اسے یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ یہ ضروری نہیں کہ جو چیز ممکن ہو وہ مناسب بھی ہو۔

دوسری بات ہمیں یہ عرض کرنی ہے کہ اگر اس کے لیے کوئی آئینی جواز پیدا بھی کر لیا جائے کہ فرقہ پرست پارٹیوں پر پابندی عائد کر دی جائے تو اس سے فرقہ پرستی ختم کرنے کا مقصد بھی حاصل ہونے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی۔ فرقہ پرستی چھوت چھات اور ذات پات وغیرہ امراض ہمارے معاشرے میں اپنی گہری جڑیں رکھتے ہیں محض قانونی بندشوں سے ان کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے کچھ اور ثبت تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت ہوگی۔ بحالات موجودہ تو قانونی بندشوں کا نتیجہ بس اتنا ہی ہو سکتا ہے کہ فرقہ پرست عناصر چند خاص جماعتوں میں محدود رہنے کی بجائے دوسری ایسی پارٹیوں کا رخ کریں جن پر فرقہ پرستی کا اطلاق نہ ہو سکے اور اس طرح یہ وبا محدود دائرہ سے نکل کر پورے ملک اور سب ہی پارٹیوں میں عام ہو جائے۔

اور تیسری بات یہ ہے کہ ابھی تک تو ہمارے یہاں یہی بات طے نہیں ہو سکی ہے کہ فرقہ پرستی کس چیز کا نام ہے چنانچہ اشوک مہتہ کمیٹی کو جو سب سے مشکل مسئلہ درپیش ہے وہ غالباً یہی ہے لیکن ہمیں توقع نہیں کہ مختلف حلقوں کی طرف سے اس کی جو تعریفیں کی جا رہی ہیں ان میں سے کسی ایک تعریف پر خود کمیٹی کے ارکان ہی باہم متفق ہو سکیں گے اس پر پورے ملک کی حالت کا قیاس کیا جا سکتا ہے اس لیے فرقہ پرستی کی بنیاد پر پابندی عائد کرنے کا اصول طے کر لیا جائے اور فرقہ پرستی کی تعبیر میں اختلافات بدستور باقی رہ جائیں تو یہ چیز بجائے خود ایک سخت اندرونی اختلاف و کش مکش کا موجب بن جائے گی اور اس سے یک جہتی کے مقصد کو فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچے گا مزید برآں اس سے برسر اقتدار پارٹی کے بارے میں لوگوں کو یہ بدگمانی کرنے کا بھی پورا موقع حاصل ہو جائے گا کہ وہ اپنے اختیارات کو غلط طور سے غلط مقاصد کے لیے بھی استعمال کرے گی اور بحالات موجودہ اکثریت کی جماعتوں سے زیادہ اس کا اندیشہ اقلیتی فرقوں کی جماعتوں بالخصوص مسلم جماعتوں کو ہوگا کیونکہ راجہ جی کے بقول اکثریت تو سیکولرزم جمہوریت کے نام پر اپنی ہر طرح کی فرقہ وارانہ سرگرمیاں جاری رکھنے کے لیے بالکل آزاد ہے لیکن مسلمان اپنی دفاع اور حفاظت کے لیے بھی کچھ کریں تو اسے فرقہ پرستی قرار دیا جاتا ہے۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک بہتر ہوگا کہ حکومت فرقہ پرست جماعتوں پر پابندی کا خیال چھوڑ کر فرقہ پرستی وغیرہ کے ازالے کے لیے ایسی تدابیر اختیار کرنے کی کوشش کرے جو واقعی اس مقصد کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔ (باقی)

مقالات :-

خدا کی کتاب کیسے پڑھی جائے - ؟

(مولانا سید جلال الدین عمری)

قرآن مجید انسانوں کے نام خدا کا آخری پیغام ہے - یہ عام کتابوں سے بالکل مختلف کتاب ہے - ہر دور میں خدائے تعالٰی اپنے خاص بندوں کے ذریعے انسانوں کی راہ نمائی کرتا رہا، پھر ایک وقت آیا جب کہ اس نے انسانوں سے آخری بار خطاب کرنا چاہا - چنانچہ اپنے اسی فیصلے کے تحت اس نے قرآن مجید نازل کیا اور اپنی ہدایت کی تکمیل کر دی۔ اس کتاب کے ذریعے اس نے اپنے بندوں سے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو وہ کہنا چاہتا تھا۔ آپ اس کتاب کو پڑھنا چاہتے ہیں اور خدا کی مرضی معلوم کرنے کے خواہشمند ہیں۔ یقیناً یہ بہت ہی مبارک خواہش ہے۔ بڑا ہی بدنصیب اور محروم ہے وہ شخص جو خدا کی کتاب سے غافل ہے۔ اگر کسی کو دنیا میں وہ سب کچھ مل جائے جو وہ چاہے اور خدا کی کتاب نہ ملے تو واقعہ یہ ہے کہ اس کو کچھ بھی نہیں ملا۔ اللہ تعالٰی جب کسی بندے کو اپنے خاص فضل سے نوازنا چاہتا ہے تو اس کو اپنی کتاب کے پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرماتا ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے کے چند شرائط و آداب ہیں۔ اس سے پورا پورا فائدہ وہی شخص اٹھاتا ہے جو اپنے آپ کو ان شرائط و حدود کا پابند بنالے، ہر وہ شخص جو خدا کی کتاب لے کر بیٹھ جائے وہ اس کا عالم نہیں بن جاتا۔

۱ ـــ خدا کی کتاب کو ہاتھ میں لینے سے پہلے ضروری ہے کہ آپ اپنے ذہن کو جس حد تک ممکن ہے ہر فکر و خیال سے الگ کر لیں۔ جب تک آپ خالی الذہن ہو کر خدا کی کتاب کا مطالعہ نہیں کریں گے، اس کے مطالب آپ کے دل و دماغ میں اتر نہیں سکتے۔ ہر انسان کی ایک ذہنی ساخت ہوتی ہے۔ یہ اس کی بہت بڑی کمزوری ہے کہ جو چیز اس کی ذہنی ساخت سے ہم آہنگ ہوتی ہے اسے تو وہ بغیر کسی ترمیم کے قبول کر لیتا ہے لیکن جو چیز اس کی ذہنی ساخت سے مختلف ہوتی ہے اسے وہ ٹھیک اس شکل میں قبول نہیں کرتا جس شکل میں اسے پیش کیا جا رہا ہے بلکہ اس کو کانٹ چھانٹ کر اپنے ذہنی سانچے میں ڈھال لیتا ہے۔ اس کاٹ چھانٹ کے نتیجے میں اس نظریے کی

اصل حیثیت بالکل ختم ہو جاتی ہے اور وہ بگڑی ہوئی شکل میں اس کے ذہن میں جگہ پاتا ہے۔ اگر ہم کسی خاص ڈھنگ پر سوچنے کے عادی ہو چکے ہیں اور اس سے ہٹ کر سوچنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو خدا کی کتاب کا بھی ہم اسی ڈھنگ سے مطالعہ کریں گے۔ اس طرح خدا کی بات ہمارے ذہنی سانچے میں پہنچنے کے بعد خدا کی بات نہیں رہے گی بلکہ اپنے ذہن کی خود ساختہ بات ہوگی اور غیر شعوری طور پر ہم اس کو خدا کا فرمان سمجھ بیٹھیں گے۔ خدا کی کتاب سے راہنمائی ہم اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ ہم ہر وقت اپنے ذہنی سانچے کو بدلنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر ہم اپنے خیالات کے گنبد سے باہر نکلنا نہیں چاہتے تو ہر طرف اپنے ہی خیالات کی گونج سنائی دے گی، اور خدا کی کتاب سے کبھی ہم خدا کی مرضی معلوم نہیں کر سکیں گے۔ اس بات کو میں دو ایک مثالوں سے واضح کرنے کی کوشش کروں گا۔

ایک شخص جو دنیا کی مادی ترقی سے مرعوب ہے اور اس ترقی میں خود بھی حصہ پانا چاہتا ہے، جب وہ خدا کی کتاب کو دیکھے گا تو اس پہلو سے نہیں دیکھے گا کہ فی نفسہ وہ کیا ہے اور اس سے کیا کہتی ہے، بلکہ اس پہلو سے دیکھے گا کہ اس میں اس کی مادی ترقی کی کیا تدبیریں بتائی گئی ہیں؟ وہ خدا کی کتاب کا مطالعہ کرے گا تو اس کو وہ مادی ترقی کا ایک کامیاب نسخہ معلوم ہوگی۔ جب وہ دیکھے گا کہ اللہ تعالےٰ نے ان لوگوں کو اس دنیا میں اقتدار عطا کیا ہے اور ان کو امن و سکون کی زندگی ملی ہے جنھوں نے اس کتاب کی پیروی کی ہے تو فوراً اعلان کر دے گا کہ خدا کی کتاب کا مقصد انسانوں کو دنیاوی فوز و فلاح کی راہ دکھانا ہے۔ وہ خدا کی کتاب سے اس کا مفہوم متعین کرنے کی کوشش نہیں کرے گا بلکہ اپنا مفہوم اس کے الفاظ میں ڈھونڈنا چاہے گا، وہ خدا کی کتاب سے خدا کی مرضی معلوم کرنے کے بجائے اس میں اپنی 'ذہنی آسودگی' کا سامان ڈھونڈتا پھرے گا۔ اس کو خدا کی کتاب سے زیادہ اپنے ذہن و فکر سے دلچسپی ہوگی۔ بظاہر آپ اس کو خدا کی کتاب پر غور کرتا ہوا دیکھیں گے لیکن حقیقت میں وہ خدا کی کتاب کو سامنے رکھ کر اپنے 'خیالات' پر غور کر رہا ہوگا، وہ اس کی ہر بات کو اپنے منشا کے مطابق گھمانے لگے گا اور جو بات اس کے منشا کے خلاف ہوگی اسے وہ کسی حسین تاویل کے پردے میں چھپا دے گا۔ اگر کسی وقت خدا کی کتاب پکار کر اس سے کہہ دے کہ میرا مقصد ہرگز وہ نہیں ہے جو تو بیان کر رہا ہے تو وہ خدا کی کتاب بند کر دے گا، کیونکہ وہ ایسی کتاب پڑھنا نہیں چاہتا جو اس کے اپنے ذہن و فکر کا ساتھ نہ دے۔ اس کے سامنے آخرت کی کامیابی و ناکامی سے بحث کرنے والی صریح آیتیں آئیں گی لیکن وہ ان کو بلا تکلف دنیا کی کامیابی و ناکامی پر محمول کر دے گا۔ اس کو جنت اور جہنم اسی دنیا میں

نظر آئیں گے۔ وہ ان افراد اور قوموں کو اصحابِ جنت قرار دے گا جو مادی لحاظ سے آگے ہیں اور جو قومیں مادی ترقی کے میدان میں پیچھے ہوں وہ اس کے نزدیک دوزخ کے باشندے ہوں گے۔ دین کی ایسی حقیقتیں جن سے مادی ترقی وابستہ نہ ہو، اس کی نگاہ میں بے وقعت ہوں گی اور وہ ان سے اس طرح گزر جائے گا گویا خدا کی کتاب ان کے ذکر ہی سے خالی ہے۔ جو بات اس کے نزدیک اہم ہے وہی اس کو پورے قرآن میں ابھری ہوئی نظر آئے گی خواہ ضمناً ہی کہیں اس کا ذکر آگیا ہو۔ لیکن جو بات اس کے نزدیک غیر اہم ہے وہ اس کو کبھی اہمیت دینے کے لیے تیار نہ ہوگا خواہ خدا کی کتاب ہزار مرتبہ پورے اہتمام کے ساتھ ہی اسے کیوں نہ بیان کرے۔ اس ذہن کے ساتھ انسان کبھی خدا کی کتاب کے مدعا کو پا نہیں سکتا۔ اس نے اپنے اور خدا کی کتاب کے درمیان 'فکری خواہشات' کے پردے ڈال رکھے ہیں جب تک یہ پردے چاک نہ ہوں، ممکن نہیں کہ حق کی روشنی اس کی فکری دنیا تک پہنچ سکے۔

اب آپ ایک دوسرے شخص کو لیجیے جس کا اندازِ فکر خالص روحانی ہے، جس کی روحانی دلچسپیاں اس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ مادی مسائل کے بارے میں غور و فکر کر سکے۔ اس کے نزدیک کتاب اللہ کی حیثیت 'سیرِ باطن' کے لیے Guide book کی ہوگی۔ وہ کتاب اللہ کے صرف ان اصولوں کو لے گا جو اس کو اپنے احوال و مقامات اور کیفیات سے ہم آہنگ نظر آئیں گے اور ان اصولوں سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہوگی جن میں 'مسائلِ دنیا' سے بحث ہوگی۔ اگر کچھ خدا کے بندے اس کے سامنے خدا کی کتاب سے ان مسائل کا حل پیش کریں گے تو وہ پکار اٹھے گا کہ یہ چیزیں حقیقتِ دین تک پہنچنے کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ وہ اپنی 'روحانی دنیا' کو چھوڑ کر 'مادی دنیا' میں الجھنا پسند نہیں کرے گا۔ اس کو اپنی 'داخلی اصلاح' کی تو ضرور فکر ہوگی لیکن خارج کی دنیا سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہوگی۔ اگر اس سے کہا جائے کہ خدا کی کتاب اس لیے نازل ہوئی ہے کہ انسان خدا کا غلام بن جائے، خدا کی زمین پر خدا کی مرضی پوری ہو، انسان خدا کا وفادار اور خدا کے سوا ہر ایک کا باغی بن جائے، انسانوں پر سے شیطان کی سلطنت ختم ہو اور تنہا خدا کی حکومت قائم ہو جائے، تو وہ اس کو 'تعمیرِ دنیا' کا عنوان دے کر اپنا رخ پھیر لے گا۔ اگر آپ اس کو نشان لگا کر بتائیں کہ دیکھو خدا کی کتاب زندگی کے ہر معاملے میں ہماری راہ نمائی کرتی ہے، وہ استغراق ہی کی تعلیم نہیں دیتی بلکہ 'جہادِ کبیر' کا بھی حکم دیتی ہے۔ وہ ذکر و فکر ہی نہیں سکھاتی بلکہ حکومت کے طور طریق بھی بتاتی ہے۔ وہ نفس کو مارنے اور کچلنے کی ترغیب نہیں دیتی بلکہ اس کا تزکیہ

اور تربیت چاہتی ہے، تو وہ اپنے فکر کی کجی کو دور کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا بلکہ آپ پر روحِ دین سے محروم ہونے کا الزام لگاکر اپنی جگہ مطمئن ہوجائے گا۔ اس کے ہاں شب و روز استغراق، لذت، جذب و مستی اور فکر و شغل جیسی کیفیات کے چرچے ہوتے رہیں گے لیکن اس کی صحبت میں آپ سالہاسال رہیں تو بھی اس کی زبان سے کبھی آپ ان مقاصد کا ذکر نہیں سنیں گے جن کو لے کر خدا کی کتاب آئی ہے۔ اس کو کفر کے غلبہ اور باطل کے فروغ کا کچھ زیادہ غم نہ ہوگا البتہ وہ اس بات سے ضرور گھٹتا رہے گا کہ لوگوں کے اندر وہ مصنوعی کیفیات نہیں ہیں جو خاص محنت کے بعد حاصل ہوتی ہیں اور جن کی خدا کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ایسا شخص خدا کی کتاب کو اس کے صحیح رخ سے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ خدا کی کتاب کو ایک دو مرتبہ نہیں ہزار بار ہی کیوں نہ پڑھے اس پر خدا کی کتاب کا منشا واضح نہیں ہوگا۔ وہ بظاہر خدا کی رضا کا طالب ہے لیکن حقیقت میں وہ ان کیفیات کی پرستش کر رہا ہے جو خود اس کے نفس کی پیدا کردہ ہیں۔ خدا کی کتاب کو سمجھنے کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ انسان خدا کی ہر بات کے سامنے جھکنے کے لیے تیار ہوجائے۔ جو شخص اس کے لیے تیار نہیں ہے خدا کی کتاب اپنے مطالب اس پر کبھی نہیں کھولتی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ۝ (بیشک اس میں نصیحت ہے اس شخص کے لیے جس کے پاس بیدار دل ہو یا جو حضورِ قلب کے ساتھ کان لگاکر سنے)

۲ —— خدا کی کتاب کے پاس آپ طالب ہدایت بنکر جائیے۔ آپ اس کا ایک ایک لفظ سے پوچھیے کہ وہ آپ سے کیا چاہتی ہے اور اس کا جو بھی مطالبہ ہو اسے پورا کرنے کے لیے کھڑے ہوجائیے۔ آپ صحیح اور غلط کا پیمانہ صرف کتاب اللہ کو بنائیے اور ہر اس خیال کو ذہن سے کھرچ کر پھینک دیجیے جو اس کے خلاف ہو۔ آپ اپنی ذات کو پوری طرح خدا کے حوالے کر دیجیے اور اس کے ہر فیصلے کے سامنے، خواہ وہ آپ پر شاق ہی کیوں نہ گزر رہا ہو، جھک جائیے۔ اگر آپ کے اندر اصلاح کی سچی تڑپ ہے تو خدا کی کتاب قدم قدم پر حق و باطل کی نشان دہی کرے گی اور آپ کو اس کے ایک ایک لفظ سے ہدایت ملے گی لیکن اگر آپ اپنی اصلاح کے لیے آمادہ نہیں ہیں تو خدا کی کتاب آپ کو فائدہ پہنچانے سے انکار کر دے گی۔ خدا کی کتاب خدا تک پہنچنے کی راہ بتاتی ہے۔ جو شخص خلوص کے ساتھ اس راہ پر بڑھنا چاہے اس پر اس راہ کے نشیب و فراز کھلتے ہیں، لیکن جو اس عزم ہی سے خالی ہو اس کو اس راہ کی نزاکتیں سمجھ میں نہیں آسکتیں۔ خدا کی کتاب آپ کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا چاہتی ہے لیکن اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ خود آپ کے اندر تاریکی سے نکلنے کا مضبوط ارادہ پایا جائے۔ خدا کی کتاب ایک آئینہ ہے جو آپ کی خوبیاں

اور خامیوں کو بغیر کسی کمی بیشی کے آپ کے سامنے رکھ دیتی ہے، یہ آئینہ اسی وقت آپ کے لیے مفید ہوگا جب کہ آپ آنکھیں کھول کر اس میں اپنا چہرہ دیکھیں اور آئینہ کی راہنمائی کے مطابق اپنی اصلاح کے لیے تیار رہوں لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں پر پردہ ڈال کر اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو آئینہ جو کچھ بتائے گا اس کی آپ کو خبر تک نہ ہوگی۔ خدا کی کتاب انسانوں کا تزکیہ کرتی ہے، لیکن یہ کام اسی وقت ہوگا جب کہ خود انسان پاک ہونا چاہے، اگر وہ گندگی میں ملوث رہنا چاہتا ہے تو خدا کی کتاب کبھی اس کی تطہیر نہیں کرسکتی۔ جو شخص اپنی تربیت کا بے پناہ جذبہ رکھتا ہو، جو اپنے عیوب کو دیکھ سکتا ہو اور دل سے اپنی اصلاح کا طالب ہو وہی خدا کی کتاب سے فائدہ اٹھا سکتا ہے جس کے اندر یہ عزم و ہمت نہیں کہ کتاب اللہ کے فیصلے کو اپنی مرضی پر مقدم کر دے، اس کے لیے اس کتاب میں اصلاح کا کوئی سامان نہیں ہے۔ ایسے انسان بہت کم ہیں جو خدا کی کتاب سے ہدایت پانا چاہتے ہوں۔ انسانوں کی آبادی میں بڑی تعداد ان ہی افراد کی ہے جو اس غرض سے خدا کی کتاب کا مطالعہ کرتے ہیں کہ اسے اپنی کمزوریوں کو چھپانے کے لیے پردہ بنائیں۔ وہ اس میں ہدایت و راہنمائی نہیں ڈھونڈتے بلکہ اپنی گمراہی کے لیے اس سے دلیل اخذ کرنا چاہتے ہیں، وہ خدا کی کتاب کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے بلکہ چاہتے ہیں ان کی بدعملیوں کے باوجود ان کو حاملِ کتاب ہونے کی سند مل جائے۔ ان کو اپنی شخصیت سے اتنی محبت ہوتی ہے کہ وہ خدا کی کتاب کو بھی اس پر تنقید کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ اپنی زندگی کے غلط رخ کو بدلنا نہیں چاہتے بلکہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح خدا کی کتاب اپنے بلند مقام سے اتر کر اس نچلی سطح پر پہنچ جائے جہاں وہ خود پڑے ہوئے ہیں۔ اس ذہن کے ساتھ اگر کوئی شخص سالہا سال تک خدا کی کتاب کا مطالعہ کرتا رہے تو بھی اس کے حصے میں سوائے ناکامی اور خسران کے کچھ نہیں آئے گا۔ جس طرح خدا بے حد غیور ہے اسی طرح خدا کی کتاب بھی بے حد غیور ہے۔ جو شخص اس کے ساتھ مذاق کرنا چاہے وہ اس پر اپنے علم کے دروازے بند کر لیتی ہے۔ ایسا شخص خواہ زندگی بھر اس کے الفاظ دہراتا رہے اس کی گہرائی میں نہیں پہنچ سکتا۔ خدا کی کتاب کے اسرار اسی شخص پر کھلتے ہیں اور وہی اس کے علوم کو پاتا ہے جو خدا کی کتاب کا تابع بن جائے لیکن جو خدا کی کتاب کو اپنی مرضی کے تابع دیکھنا چاہتا ہو خدا کی کتاب اس کو اپنے علوم کا امین نہیں بناتی۔

۳ــــ خدا کی کتاب کو راہنمائی کا مقام دیجیے اور طالب علم بن کر اس کا مطالعہ کیجیے، وہ آپ کو ایسی اعلیٰ حقیقتوں سے باخبر کرے گی جن سے آپ پہلے سے واقف نہیں ہوں گے جو شخص اپنے آپ کو خدا کی کتاب کا محتاج سمجھے اس کو وہ اپنے علوم سے مالامال کر دیتی ہے لیکن جس کے اندر بے نیازی پائی جائے، اس کے سامنے وہ نیازمند

بن کر نہیں پہنچتی۔ خدا کی کتاب آپ کی معلم ہے۔ آپ اس سے طالب علمانہ استفادہ کر سکتے ہیں۔ اگر آپ اس کی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کرتے اور خود معلم بن کر اس کا امتحان لینا چاہتے ہیں تو اس کا فیضان بند ہو جائے گا۔ یہ بات ہرگز نہ بھولیے کہ علم کا پندار انسان کو خدا کی کتاب تک کبھی پہنچنے نہیں دیتا۔ جو شخص غرورِ علم کے ساتھ اسے ہاتھ لگائے اس پر وہ اپنے علم کے دروازے بند کر لیتی ہے۔ بہت سے لوگوں نے خدا کی کتاب کو "اَسَاطِیْرُالْاَوَّلِیْنَ" (ماضی کی داستانیں) سمجھا اور اس کی ہدایت سے محروم ہو گئے، لیکن جن لوگوں نے اسے "ھٰذَا کِتَابُ رَبِّنَا" (اپنے رب کا پیغام) کہہ کر سینے سے لگا لیا وہ اس کے وارث اور امین قرار پائے۔ خدا کی کتاب جس ذات پر نازل ہو رہی تھی اس کو حکم دیا گیا "قُلْ رَّبِّ زِدْنِیْ عِلْمًا" (کہو اے میرے رب میرے علم میں اضافہ فرما۔) اسی سے آپ سوچ سکتے ہیں کہ کوئی دوسرا شخص بغیر طلب کے کتاب اللہ کا علم کیسے پا سکتا ہے۔ قرآن کسی انسان کی تصنیف نہیں ہے کہ آپ اپنے ذہن سے اس کی گہرائی تک پہنچ جائیں بلکہ قرآن خدائی علوم کا سمندر ہے اس کی اعلیٰ حقیقتیں اسی شخص پر کھلتی ہیں جس پر خدا اپنی حقیقتیں کھولنا چاہتا ہے، اور یہ واقعہ ہے کہ خدائے تعالیٰ اپنی کتاب کے مطالب اسی شخص پر کھولتا ہے جس کے اندر سچی طلب ہو اور جو رات دن اس سے چمٹا رہے۔

غرورِ علم صرف اسی واقعہ کا نام نہیں ہے کہ آپ کتاب اللہ کے ساتھ مخالفت کا رویہ اختیار کریں بلکہ اس کتاب کے ساتھ ظاہری محبت کے باوجود آپ اس مرض میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ بسا اوقات یہ مرض روح کے اندر آہستہ آہستہ سرایت کرتا رہتا ہے لیکن آدمی کو اس کا احساس تک نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مرض اپنی جڑیں جما چکا ہے اور آدمی ابھی اس سے بے خبر ہے۔ اگر کسی انسان نے خدا کی کتاب کا صحیح معنیٰ میں مطالعہ کیا ہے تو اس کے اندر اپنی بے بسی کا احساس ابھرنا چاہیے۔ کیونکہ اس نے ایک ایسے علم کی راہ میں قدم رکھا ہے جس کی ہر منزل ایک نئی منزل کی نشان دہی کرتی ہے، اور ہر تحقیق بہت سے تحقیق طلب گوشوں کو سامنے لاتی ہے۔ لیکن عام طور پر دیکھا یہ گیا ہے کہ انسان کے اندر یہ سچا احساس نہیں ابھرتا بلکہ اس کے سر میں یہ سودا سمانے لگتا ہے کہ میں نے قرآن کا بہت مطالعہ کیا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ انسان جب چند دن تک خدا کی کتاب کی تلاوت کرتا ہے اور اس کو اپنی زندگی کی مصروفیات میں شامل کر لیتا ہے تو اپنے آپ کو قرآن کا مستند اور منفرد شارح سمجھنے لگتا ہے اس کو رہ رہ کر یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ دنیا اب تک روحِ قرآن سے ناآشنا رہی ہے۔ لوگوں نے یا تو قرآن پر غور نہیں کیا اور غور کیا بھی تو غیر متعلق بحثوں میں الجھے رہے اور حقیقت تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ وہی باطن میں چھپا ہوا کبر ہے جو اس کو اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی دوسرے

کو فہم قرآن میں اپنا شریک سمجھے کیونکہ اس سے اس کی انفرادیت ختم ہو جائے گی جس کا پرچم لے کر وہ کھڑا ہوا ہے۔ حالانکہ خدا کی کتاب ایسی نہیں ہے کہ انسان چند بار کی تلاوت سے اس کی گہرائی کو پا لے۔ اونچی سطح کے انسانوں نے جب اپنی پوری پوری زندگیاں اس کتاب پر غور وفکر میں کھپا دیں تب ان کو اس کے علم کا تھوڑا سا حصہ ملا ہے۔ جو شخص اس زعم باطل میں مبتلا ہو جائے کہ میں نے قرآنی حقائق کو پا لیا ہے اور اس کے پوشیدہ علوم مجھ پر کھول دیے گئے ہیں، سمجھ لیجیے ابھی اس کو خدا کی کتاب کی ہوا تک نہیں لگی ہے۔ غرورِ علم کے ساتھ جو شخص تلاوتِ کتاب کا مشغلہ جاری رکھے۔ خدائے تعالیٰ اپنے علوم کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں کبھی نہیں دے سکتا۔ یہ تو ممکن ہے کہ ایسا شخص اس خوش فہمی میں پڑا رہے کہ اس پر قرآنی علوم کھول دیے گئے ہیں لیکن ناممکن ہے کہ وہ قرآن کے الفاظ میں چھپے ہوئے معانی کا ادراک کر لے۔ کسی کو کتاب اللہ کا فہم حاصل ہونے کی ایک بڑی علامت یہ بھی ہے کہ اس کے اندر فروتنی پیدا ہو جائے اور وہ پھلوں سے لدی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر جھک جائے۔ جس کا سر غرور سے اونچا ہو اس کے بارے میں سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خدا کی کتاب کا مطالعہ بھی اس غرض سے کرتا ہے کہ اس کے نفس کے گھٹیا جذبات کی تسکین ہو۔ اپنی اصلاح و تربیت اس کے سامنے نہیں ہے۔ خاکساری اور فروتنی سے مراد یہ نہیں ہے کہ لبوں کی مسکراہٹ کے ذریعہ باطن کے گھمنڈ کو چھپایا جائے۔ یہ مصنوعی خاکساری کبرِ نفس سے بھی بدتر ہے۔ خاکساری وہ ہے جو آپ کے دل و دماغ کو خدا کے سامنے جھکا دے اور آپ کی ایک ایک ادا سے نسیم سحری بن کر پھیل جائے۔ یہ کیفیت ایسی نہیں جو الفاظ میں بیان کی جا سکے لیکن اس سے کم از کم وہ لوگ ناواقف نہیں رہ سکتے جن کو اللہ نے بصیرت دی ہے۔

تاریخ میں اس کی مثالیں آپ کو بہت سی ملیں گی کہ ایک شخص اپنی جگہ اس خیالِ خام میں گرفتار رہا کہ وہ قرآن کا عالم ہے، روحِ قرآن کو جذب کر چکا ہے۔ خدا نے اس کو علوم نبوت کا وارث بنایا ہے اور اس کے لیے حقیقت سے پردے ہٹا دیے گئے ہیں لیکن سوائے اس کے کہ وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسروں کو بھی اس نے گمراہ کیا اس کا کوئی کارنامہ آپ کو نہیں ملے گا۔

یہ اس بات کا ایک واقعاتی ثبوت ہے کہ قرآنی علوم کا ہر دعوے دار قرآن کا رازداں نہیں ہوتا، اور نہ یہ احساس کہ میں نے قرآن کا بہت مطالعہ کیا ہے کسی کو قرآن کا عالم بنا دیتا ہے لیکن تاریخ کے اتنے بڑے واقعہ سے سبق حاصل کرنے والے انسان کم ہی نظر آتے ہیں۔

۴۔۔۔ قرآن کا ایک متعین موضوع ہے جسے وہ ہر حال میں اپنے سامنے رکھتا ہے، اور وہ یہ کہ انسان کو فکر و عمل کی کجی سے نکال کر خدا کی راہ دکھائی جائے۔ اس موضوعِ خاص کو آپ سمجھنا چاہتے ہیں تو قرآن میں آپ کے اطمینان کا پورا پورا سامان موجود ہے لیکن اگر آپ کو اس موضوع سے دلچسپی نہیں ہے تو اس کتاب کو دوسرے مقاصد کے لیے استعمال نہ کیجیے، ورنہ آپ اس کی صحیح قدر نہیں پہچان سکیں گے۔ فلسفہ کی کسی کتاب کا مطالعہ اگر آپ اس کو ڈرامہ کی کتاب سمجھ کر شروع کر دیں تو یہ اس پر بہت بڑا ظلم ہوگا اور آپ کو کتاب اور صاحبِ کتاب سے سخت مایوسی ہوگی۔ یا تاریخ کی کوئی کتاب جو اچھے ادبی انداز میں لکھی گئی ہو اسے ادبی نقطۂ نظر آپ پڑھتے ہیں تو شاید آپ کے ذوقِ ادب کی تسکین ہو جائے گی لیکن جس مقصد کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے یقیناً آپ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے۔ اسی طرح خدا کی کتاب کو بھی اگر آپ اس کے موضوع سے ہٹا کر دیکھیں گے تو اپنی ذات پر بھی زیادتی کریں گے اور خدا کی کتاب پر بھی۔ بہت ممکن ہے کہ اس مطالعہ سے آپ کو اپنے کام کی بات نہ ملے اور آپ اپنے وقت کے ضائع ہونے پر افسوس کرتے ہوئے خدا کی کتاب بند کر دیں۔

قرآن میں آپ کو بہت سے علوم ملیں گے، لیکن یہ علوم قرآن کا مقصود نہیں ہیں۔ اسے اصلاً انسان کی ہدایت و ضلالت سے بحث ہے اور اپنی اسی بحث کو مضبوط کرنے کے لیے وہ مختلف علوم سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ قرآن نے اپنی بات کو بہترین انداز اور اعلیٰ ترین اسلوب میں پیش کیا ہے لیکن اس کے باوجود وہ ادب کی کتاب نہیں ہے کہ آپ اس کو محض ادب کی خاطر پڑھیں، قرآن میں احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں لیکن آپ اس کو قانون کی کتاب نہیں کہہ سکتے۔ قرآن نے اپنے دعوے کو ثابت کرنے کے لیے تاریخ سے استدلال کیا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کے واقعات بیان کیے ہیں لیکن وہ اس غرض سے نازل نہیں ہوا کہ آپ کو ماضی کے واقعات سنائے اور آپ کی تاریخی معلومات میں اضافہ کرے، اسی طرح قرآن نے اپنی تائید میں آفاق و انفس سے دلائل پیش کیے ہیں لیکن یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن سائنس یا نفسیات کی کتاب ہے،

حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے قرآنی علوم کو پانچ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

احکام ۔۔۔ اس میں واجب، مباح، مندوب، حرام اور مکروہ ہر قسم کے احکام شامل ہیں خواہ ان کا تعلق عبادت سے ہو یا معاملات سے، معاشرت سے ہو یا سیاست سے۔

گمراہ فرقوں پر تنقید ۔۔۔ اس سلسلے میں قرآن نے یہود و نصاریٰ اور مشرکین و منافقین کے افکار و

اعمال سے بحث کی ہے۔

تذکیر بآلاء اللہ ــــ یعنی اللہ تعالیٰ کے احسانات کا تذکرہ تاکہ انسان ان سے نصیحت حاصل کرے۔ چنانچہ قرآن نے آسمان و زمین کی تخلیق کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی فطری راہنمائی کی ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی کس طرح تکمیل کریں۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے جو کہ ان تمام احسانات کا منبع ہیں۔

تاریخ سے نصیحت ــــ اس مقصد کے لیے قرآن نے ایسے واقعات بیان کیے ہیں جنہیں خدائے تعالیٰ اس غرض سے وجود میں لاتا ہے کہ اپنے فرماں برداروں کو انعام دے اور نافرمانوں پر عذاب کے کوڑے برسائے۔

موت اور اس کے بعد کے احوال کے ذریعہ تذکیر ــــ اس غرض سے حشر و نشر، حساب و میزان اور جنت و جہنم کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

اس کے بعد شاہ صاحب لکھتے ہیں:۔

حق آن است کہ قصد اصلی از نزولِ قرآن تہذیب نفوسِ بشر است و در ہم شکستنِ عقائدِ باطلہ و اعمالِ فاسدۂ ایشاں۔ پس وجودِ عقائدِ باطلہ در مکلفین سببِ نزولِ آیاتِ مخاصمہ است و وجودِ اعمالِ فاسدہ و جریانِ مظالم درمیانِ ایشاں سببِ نزولِ آیاتِ احکام است و متنبہ نہ شدنِ ایشاں بذکرِ آلاءِ اللہ و ایامِ اللہ و وقائعِ موت و ما بعدِ آن سببِ نزولِ آیاتِ تذکیر است۔

(الفوز الکبیر فی اصول التفسیر، باب اول)

صحیح بات یہ ہے کہ نزول قرآن کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے نفس کو سنوارا جائے اور باطل عقائد اور بگڑے ہوئے اعمال کو جڑ پیڑ سے اکھاڑ کر پھینکا جائے۔ پس چونکہ مخاطبین میں غلط عقیدے پائے جاتے تھے اس لیے بحث و حجت والی آیتیں نازل ہوئیں۔ ان کے اعمال میں بگاڑ تھا اور ان کے درمیان ایک دوسرے پر ظلم و زیادتی ہو رہی تھی اس لیے احکام و قوانین نازل ہوئے۔ اسی طرح وہ اللہ کی نعمتوں سے، تاریخ کے واقعات سے اور موت اور موت کے بعد کے احوال سے نصیحت نہیں حاصل کر رہے تھے اس لیے تذکیر کی آیتیں نازل ہوئیں۔

بعض لوگ قرآن سے اس کا اصل مقصد پانے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ وہ اپنے مخصوص علم و فن کی جھلک قرآن میں دیکھ کر اسی کو قرآن کا مقصود سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کو قرآن سے زیادہ اپنے علم و فن سے دلچسپی ہوتی

ہے۔ اور وہ اسی پہلو سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ مطالعہ کا یہ غلط رخ انسان کی توجہ خدا کی کتاب کے اصل مقصد سے پھیر دیتا ہے، اور وہ ضمنی اور ذیلی چیزوں میں گم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مورخ ہو، سائنس داں اور فلسفی ہو لیکن اگر قرآن کا مقصد اس کے سامنے نہیں ہے تو وہ کبھی قرآن کا عالم نہیں بن سکتا۔ قرآن کی حقیقت سے وہ بے خبر ہی رہے گا۔ ایسا شخص قرآن کا نام لے کر دنیا کے سامنے اپنی معلومات پیش کرتا رہے گا اور اس وہم میں پڑا رہے گا کہ وہ قرآنی علوم کی تشریح کر رہا ہے حالانکہ قرآنی علوم اس کی دسترس سے بہت دور ہوں گے۔ چنانچہ دیکھا گیا ہے کہ اگر قرآن میں کہیں مکڑی یا مچھر کا ذکر آگیا ہے تو بعض لوگوں نے اس کی تحقیق و تفصیل میں صفحات کے صفحات سیاہ کر دیے ہیں لیکن وہ بنیادی مسئلہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہی رہا ہے جسے قرآن حل کرنا چاہتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طرح کی کوششوں کا فائدہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوا ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ قرآن جس عظیم مقصد کی طرف دعوت دیتا ہے اور جو اس کے ایک ایک لفظ سے نمایاں ہے، انھوں نے اس مقصد کی طرف توجہ نہیں کی۔ ایک شخص زندگی بھر قرآن کی صرف ونحو اور لغت کو حل کرتا رہے اور قرآن کی غرض وغایت کو سمجھنے کی کوشش نہ کرے تو اس کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ اس نے قرآن کا مطالعہ نہیں کیا ہے بلکہ صرف ونحو اور لغت کا مطالعہ کیا ہے؛ قرآن کو سمجھنے کے لیے اسے دوبارہ از سر نو قرآن پڑھنا چاہیے۔

مطالعہ کے اس غلط طریقے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے فہم قرآن کے متعلق دعوے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایک شخص جو تاریخی معلومات رکھتا ہے، جب وہ قرآن میں تاریخ کا حصہ دیکھتا ہے تو سمجھنے لگتا ہے کہ وہ قرآن کا بہت بڑا عالم ہے کیونکہ وہ قرآن کے اشارات کو سمجھتا ہے اور اس کے واقعات کی تفصیل جانتا ہے حالانکہ وہ قرآن کا عالم نہیں تاریخ کا عالم ہے۔ اس کے پاس سوائے اپنے علم وفن کے قرآنی علوم کا کوئی حصہ نہیں ہے اس کو ماضی کے کچھ واقعات اور حالات تو معلوم ہیں لیکن وہ اس حقیقت سے بے خبر ہے جو قرآن پیش کرتا ہے۔ یہ اندازِ فکر انسان کو اسی حد پر رکنے نہیں دیتا بلکہ وہ سوچنے لگتا ہے کہ تاریخ کا جتنا علم مجھے حاصل ہے اتنا قرآن کے پیش کرنے والے اور اس کے ساتھیوں کو بھی نہیں تھا، لہٰذا میں جس طرح قرآن سمجھتا ہوں اس طرح وہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ یہ محض مفروضہ یا قیاس نہیں ہے بلکہ ہر دور میں اس کے نمونے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو یہ کہنے میں بھی باک نہیں ہوتا کہ قرآن کے بہت سے گوشے اس کے پہلے مخاطبین سے چھپے ہوئے تھے اور آج وہ ہم پر کھلے جا رہے ہیں۔ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ

اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ہ (بہت بڑی بات ہے جو ان کے منہ سے نکل رہی ہے اور وہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں)

۵ ـــــ خدا کی کتاب اچانک ہمارے درمیان نہیں پہنچ گئی ہے، بلکہ اس کو خدا کے رسول کے واسطے سے بھیجا گیا ہے، تاکہ انسانوں کو ان کے رب کی طرف سے جو ہدایت ملی ہے اسے خدا کا رسول کھول کھول کر بیان کردے اور کوئی شخص خدا کی کتاب کو سمجھے بغیر اس کی موافقت یا مخالفت نہ کرے، بلکہ وہ جو بھی روش اختیار کرنا چاہے دن کی روشنی میں اور حق کی وضاحت کے بعد اختیار کرے۔ چنانچہ خدا کے رسول نے قرآن کے مجملات کو واضح کیا، اس کے مقاصد کا تعین کیا، اس کے ایک ایک لفظ پر خود بھی عمل کیا اور اپنے ساتھیوں سے بھی عمل کرایا، اور کتاب اللہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر دنیا کے سامنے پیش کردی۔

خدا کا رسول دنیا سے رخصت ہوا تو خدا کی کتاب صرف ایک مقدس تحریر نہیں تھی، جس کو اس کے عقیدتمند پڑھتے ہوں بلکہ اسے انسانوں کی زندگیوں میں برتا جا چکا تھا، اس کتاب کی راہنمائی میں جس کام کا آغاز ہوا تھا اسی کی راہنمائی میں وہ انجام کو پہنچ چکا تھا، خوف کی حالت میں جو دعوت اٹھی تھی وہ امن کی حالت میں داخل ہو چکی تھی اور خدا کا دین پورا کا پورا عملاً قائم و نافذ ہو چکا تھا۔ اقامت دین کے ان مختلف مراحل میں خدا کی کتاب کا ایک ایک گوشہ نکھر کر سامنے آگیا، اس کے اشارات بھی اس کی تفصیلات کی طرح سمجھے جانے لگے، اس کے ابہام کی توضیح اور اس کے اجمال کی تفصیل ہوگئی اور خدا کے رسول نے اعلان کردیا۔ قَدْ تَرَكْتُكُمْ عَلَى الْبَيْضَاءِ لَيْلُهَا كَنَهَارِهَا وَلَا يَزِيْغُ عَنْهَا بَعْدِيْ اِلَّا هَالِكٌ۔ احمد، ابن ماجہ، حاکم۔ (میں تم کو ایک واضح طریقے پر چھوڑے جا رہا ہوں، جس کی رات بھی اس کے دن کی طرح روشن ہے۔ میرے بعد اس طریقے سے وہی پھرے گا جو ہلاک ہونا چاہے گا)

خدا کے رسول اور آپ کے سچے ساتھیوں کے بعد ہر دور میں کتاب اللہ کے حاملین پائے گئے، جن کی دلچسپیوں کا مرکز یہ کتاب رہی، کتاب اللہ میں فکر و تدبر جن کا محبوب ترین مشغلہ تھا، جنھوں نے اپنی پوری پوری زندگیاں اس کتاب پر غور و فکر میں صرف کردیں، جن کو اس کتاب سے گہرا لگاؤ تھا، جنھوں نے اس کتاب کو ہاتھ میں لیا اور اس کی تلاوت کا حق ادا کردیا۔ بے نظیر صلاحیت رکھنے والے ان انسانوں نے خدا کی کتاب کے مقصد اور اس کی روح کو سمجھنے کے لیے اس کے ایک ایک گوشے پر غور کیا اور اپنی بہترین ذہنی کاوشیں ہمارے سامنے رکھ دیں۔ چنانچہ اس کے احکام و قوانین کی وضاحت کے لیے ہمیں ہر دور میں بہترین قانون داں نظر آتے ہیں، اس کی روح اور حکمت کو سمجھانے کے لیے قابل قدر حکماء اور فلاسفہ ملتے ہیں۔ اس کے ادبی گوشوں کو کھولنے کے لیے چوٹی کے ادیب اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ غرض یہ کہ شاید ہی دنیا کی کوئی کتاب ہو جس پر اتنا وسیع لٹریچر تیار ہوا

کیا گیا ہو جس پر اتنے قابل افراد نے اپنی عمریں کھپائی ہوں، اتنے ذوق و شوق اور محنت سے اس پر غور کیا ہو اور اپنے فکر و تدبر کی قوتیں اس پر مرکوز کر دی ہوں یہی نہیں بلکہ جن لوگوں نے یہ کوشش کی وہ اپنی اس کوشش میں بے حد مخلص تھے جن کو خدا کی کتاب سے حقیقی محبت تھی، جنھوں نے عبادت سمجھ کر اس کتاب کو پڑھا، جو صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ خدا کی کتاب کیا کہتی ہے، جن کو اس سے کوئی بحث نہیں تھی کہ خدا کی کتاب کس کے خلاف کہتی ہے اور کس کی تائید کرتی ہے، بلکہ وہ ہر ایک کو اس کے سامنے پیش کرتے اور جس کے بارے میں وہ جو فیصلہ دے وہی ان کا فیصلہ ہوتا۔ انھوں نے کسی نفسانی غرض کو سامنے رکھ کر اس کتاب کو نہیں دیکھا بلکہ وہ ہدایت کے طالب تھے اور خدا کی کتاب سے خدا کی مرضی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ وہ دوسروں کی اصلاح کے لیے فکر مند ہونے سے پہلے اپنی اصلاح کے لیے دوڑتے تھے، دوسروں پر تنقید کرنے سے پہلے اپنی ذات پر خدا کی کتاب کی تنقید برداشت کرتے تھے، ان صالح جذبات کے ساتھ انھوں نے کتاب اللہ کی تفسیر و تشریح کی، اس کو ہر تحریف سے بچایا اور کسی فتنے کو اس میں داخل ہونے نہ دیا۔ ان پاکیزہ نفوس میں سے جن کو اللہ نے اس کی قوت و طاقت دی کہ اسے عملاً وہ دنیا میں پھیلائیں، وہ اپنے اپنے دائرے میں اسے پھیلاتے رہے۔ اس طرح خدا کی کتاب پہلے دن سے ہر لفظی و معنوی تحریف سے محفوظ رہی اور یقین ہے کہ قیامت تک محفوظ رہے گی۔ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ (بے شک وہ زبردست کتاب ہے۔ باطل نہ تو اس کے آگے سے آسکتا ہے اور نہ اس کے پیچھے سے، یہ اس خدا کی طرف سے اتاری گئی ہے جو حکمت والا ہے اور جس کی ہر طرف سے حمد و ستائش ہو رہی ہے۔)

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَحْمِلُ هٰذَا الْعِلْمَ مِنْ كُلِّ خَلَفٍ عُدُوْلُهٗ يَنْفُوْنَ عَنْهُ تَحْرِيْفَ الْغَالِيْنَ وَانْتِحَالَ الْمُبْطِلِيْنَ وَتَاْوِيْلَ الْجَاهِلِيْنَ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ہر صدی کے ثقہ اور قابل اعتماد افراد اس علم کے حامل ہوں گے جو حد سے بڑھنے والوں کی تحریف، باطل پرستوں کے جھوٹ اور جاہلوں کی تاویل کو مٹاتے رہیں گے
(بیہقی)	(اس طرح یہ علم اپنی صحیح شکل میں ہمیشہ محفوظ رہے گا)

امت کے ان صالح اور منتخب افراد کے ذریعہ قرآن کا فہم پورے تسلسل کے ساتھ ہمیں ملا ہے، قرآن کا یہ فہم ہمارے لیے بہت ہی قابل قدر اور قابل اعتماد ہے۔ بلا شبہہ یہ افراد انسان ہی تھے، فرشتے نہیں تھے، ان سے بھول چوک ہو سکتی ہے اور ہوئی بھی ہے لیکن اس کے باوجود پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے مجموعی

طور پر دین کا جو تصور دیا ہے وہ صحیح ترین تصور ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہمارا قرآنی فکر ان کے فکر سے ہم آہنگ ہو ورنہ ہم صحیح تصورِ دین سے محروم ہو جائیں گے۔ ہماری کوئی قرآنی تحقیق اس تصورِ دین ہی سے ٹکراتی ہے جو غیر منقطع طور پر ہم تک پہنچا ہے، تو سمجھنا چاہیے کہ ہماری عقل نے ٹھوکر کھائی ہے۔ یہ ہمارے دین و ایمان کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے فہمِ قرآن پر خدا کے رسول اور آپ کے صحابہ کے فہم کو ترجیح دیں۔ بہت سے لوگ اپنے 'قرآنی حقائق' اس ادعا کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ وہ قرآن کے سب سے بڑے راز داں ہیں اور دنیا اب تک اسرارِ قرآن سے بے خبر ہے۔ ان کو نہ تو اس کی فکر ہوتی ہے کہ ان کے 'قرآنی حقائق' خود قرآن کے کتنے مسلّمات کو پارہ پارہ کر رہے ہیں اور نہ ان کو اس سے بحث ہوتی ہے کہ اہلِ علم نے کیا سمجھا اور ان کی راہ کیا رہی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی انسان کا اپنے بارے میں یہ بہت بڑا فریب ہے کہ قرآن کی جس حقیقت کو چودہ سال کی لمبی مدت میں کسی عالمِ دین نے نہیں سمجھا، اس حقیقت کو آج اس نے پالیا ہے۔ بعض اوقات دین کی راہ سے بھی شیطان کا حملہ اتنا زبردست ہوتا ہے کہ آدمی دین کی خدمت چھوڑ کر بے دینی کا علمبردار بن جاتا ہے، اور اپنی آخرت سنوارنے کے بجائے اس کے بگاڑنے میں لگ جاتا ہے۔

یہ دور جس میں ہم رہ رہے ہیں الحاد و مادہ پرستی کا دور ہے۔ اس میں قرآن کی تعلیمات اپنی ٹھیک شکل میں لوگوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہیں، وہ ان کی ایسی تعبیر چاہتے ہیں جو ان کے مادہ پرستانہ ذہن سے قریب ہو، جس میں اخلاق و روحانیت بھی مادی اقدار کی حیثیت اختیار کر لیں اور فلاحِ آخرت کا تصور بھی فلاحِ دنیا کا تصور بن جائے۔ اس دورِ الحاد میں دین کا صحیح تصور پیش کرنے کی جرأت وہی شخص کر سکتا ہے جو وقت کے دھارے کے خلاف لڑ سکتا ہو، جو دنیا والوں کے فیصلوں سے بے نیاز ہو اور جسے اپنے مقبول ہونے یا نہ ہونے کی فکر نہ ہو۔ لیکن جس شخص کے اندر یہ ہمت نہیں ہے وہ جب دیکھے گا کہ قرآن کی سیدھی اور سچی باتوں کی دنیا میں کوئی قدر نہیں ہے تو وہ ضروری سمجھے گا کہ ان میں ایسی قطع و برید کر دی جائے کہ وہ لوگوں کے لیے قابلِ قبول بن جائیں اور وہ اس کی راہنمائی میں قرآن کی راہ پر چل پڑیں۔ مشہور صحابیِ رسول حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے اپنے وقت میں فرمایا تھا کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ قرآن کی تعلیم عام ہو جائے گی اور مومن، منافق، عورت، مرد، بچے، بوڑھے، غلام آزاد سب ہی قرآن پڑھنے لگیں گے، لیکن ساتھ ہی قرآن کے نام پر فتنے بھی پھوٹ پڑیں گے،

فَيُوشِكُ قَائِلٌ اَنْ يَقُوْلَ مَا	جلدی وہ وقت آنے والا ہے جب کہنے والا
لِلنَّاسِ لَا يَتَّبِعُوْنِيْ وَقَدْ قَرَأْتُ الْقُرْآنَ	کہے گا کہ آخر کیا بات ہے کہ لوگ میرے پیچھے

مَا هُمْ بِمُتَّبِعِيَّ حَتَّى ابْتَدِعَ لَهُمْ غَيْرَهُ فَإِيَّاكُمْ وَمَا ابْتُدِعَ فَإِنَّ مَا ابْتُدِعَ ضَلَالَةٌ

{ ابوداؤد کتاب السنۃ باب لزوم السنۃ }

نہیں چلتے۔ حالانکہ میں قرآن کا عالم ہوں، اور میں نے قرآن پڑھا ہے۔ بات یہ ہے کہ وہ کبھی میری اتباع نہیں کریں گے، جب تک کہ میں ان کو قرآن کے سوا کوئی اور چیز ایجاد کر کے نہ دوں (جس وقت ایسا ہونے لگے) تو تم اس کی بدعت، سے بچو اس لیے کہ ہر بدعت ضلالت اور گمراہی ہے

یہاں دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں ایک تو یہ کہ حضرت معاذؓ نے جس چیز کو 'بدعت' کہا ہے وہ یہ ہے کہ انسان قرآن کی اصل روح میں تحریف کردے اور اس کے بنیادی منشار کو بدل دے۔ لیکن اگر روحِ قرآن سے آپ کو اتفاق ہے تو 'تفسیری مباحث' میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص کی تحقیق اپنی ساری تفصیلات میں دوسرے کی تحقیق سے مل جائے۔ دین کی بنیادی حقیقتوں کو مانتے ہوئے قرآنی علوم کے ماہرین نے آیات کا مفہوم متعین کرنے میں اختلاف کیا ہے۔ یہ اختلاف جائز ہے اور صحابہ کرام کے اندر اس اختلاف کے نمونے موجود ہیں۔ یہ اختلاف جزئی ہوگا اصولی اور بنیادی نہ ہوگا۔ اس لیے اس سے دین کی حقیقت میں کوئی تبدیلی واقع نہ ہوگی۔

دوسری خاص بات یہ ہے کہ ہر دَور کے کچھ مخصوص حالات ہوتے ہیں۔ قرآن میں ہر مسئلہ کی تفصیل نہیں ہے۔ بیشتر معاملات میں اس نے اصولی ہدایات دی ہیں، جن کی روشنی میں آپ کو اپنے مسائل حل کرنے ہیں۔ ان مسائل کے بارے میں اہلِ علم استنباط کریں گے۔ اور قرآن کا منشار واضح کریں گے۔ اگر آپ قرآن کو ہر زمانے کے لیے راہنما مانتے ہیں تو اس استنباط کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ اس استنباط کے کچھ حدود ہیں۔ ان حدود کے اندر کسی مسئلے میں اہلِ علم کی رائیں ایک سے زیادہ ہو سکتی ہیں اور یہ کوئی معیوب بات نہیں ہے لیکن ضروری ہے کہ یہ استنباط دین کی بنیادی حقیقتوں کو پامال کرنے والا نہ ہو اور استنباط کے جو حدود مقرر ہیں ان سے باہر نہ ہو، جو استنباط اپنے حدود سے باہر ہو وہ قابلِ رد ہے، اسے کبھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔

۶ــــ قرآنی علوم کو پانے کا واحد ذریعہ عربی زبان ہے۔ عربی زبان کی اونچی صلاحیت اور اس کا معیاری ذوق کتاب اللہ کے فہم کے لیے کلید کی حیثیت رکھتا ہے، جو شخص اس زبان کی نزاکتوں کو نہ سمجھے وہ قرآن کی باریکیوں کو نہیں پا سکتا۔ قرآن 'عربی مبین' میں نازل ہوا ہے۔ اس کا ادب اعلیٰ ترین ادب ہے، وہ انتہائی فصیح و بلیغ انداز

میں اپنی بات پیش کرتا ہے۔ اس کے اسلوب میں بلا کی ندرت اور حیرت انگیز جامعیت پائی جاتی ہے۔ ہمارے
سامنے جدید و قدیم عربی ادب کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں لیکن قرآن کی اعجازی شان کہیں نہیں پائی جاتی۔
وہ اپنے طرزِ ادا اور اندازِ بیان کے لحاظ سے ایک ادبی معجزہ ہے۔ اس میں ایسی انفرادی شان پائی جاتی ہے
جو آپ کو کسی بھی اچھے سے اچھے پارۂ ادب میں نہیں مل سکتی۔ انسان بار بار کے مطالعہ اور غور و فکر کے بعد قرآن کے
اسلوبِ خاص اور اس کی مخصوص زبان سے آشنا ہوتا ہے۔ اگر آپ عربی زبان جانتے ہیں اور ساتھ ہی آپ کو
قرآن سے غیر معمولی شغف اور انہماک ہے، تب آپ اس کے گہرے معانی کا ادراک کر سکیں گے جو لوگ عربی زبان
کے ناقص ذوق اور اس سے ادھوری واقفیت کے بعد کتاب اللہ کی تعبیر و تشریح کرنے بیٹھ جاتے ہیں وہ اس
پر بڑی بڑی زیادتیاں کر گزرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو چاہیے کہ اس اونچے منصب پر بیٹھنے سے پہلے وہ اس زبان سے
پوری پوری واقفیت حاصل کریں جس میں قرآن مجید نازل ہوا ہے۔ یہ بہت بڑی ستم ظریفی ہے کہ آدمی جس زبان سے
اچھی طرح واقف نہ ہو اس زبان میں پڑھی جانے والی کتاب پر رائے زنی شروع کر دے۔ اسی طرح جو لوگ قرآن
'عربی مبین' میں نہیں پڑھتے ہیں اور اس کا ترجمہ و تشریح اپنی زبان میں سمجھتے ہیں وہ بھی قرآن کی باریکیوں کو جان نہیں سکتے۔
وہ اس پوزیشن میں کبھی نہیں ہو سکتے کہ قرآن کی کسی حقیقت کے بارے میں اطمینان سے اظہارِ خیال کر سکیں، وہ قرآن
سے اس کا مفہوم پوچھنے کے بجائے ہمیشہ دوسروں سے اس کا مفہوم معلوم کریں گے اور دوسروں ہی کی رائے
ان کے لیے فیصلہ کن ہوگی۔ لطیف قسم کے استدلالات آپ قرآن مجید کے کسی بھی ترجمہ کے ذریعہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ترجمہ
کے الفاظ قرآن کے الفاظ نہیں ہیں بلکہ وہ قرآن کی ایسی ترجمانی کرتے ہیں جس میں مترجم کا فہم بھی شامل ہے۔ اس لیے
وہی استدلال معتبر ہوگا جو قرآن کے الفاظ سے کیا جائے۔ اگر کوئی ترجمہ قرآن کے منشا کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کر بھی
دے تو قرآن کا ادبی اعجاز کبھی اس میں پیدا نہیں ہو سکتا اور یہ واقعہ ہے کہ قرآن کی بہت سی حقیقتیں اس کی
ادبیت میں چھپی ہوئی ہیں۔ اس کے اندازِ بیان اور طرزِ ادا میں ایک خاص تاثیر ہے جو انسان کو اپنی جگہ سے ہلا دیتی
ہے اور نئے نئے معانی کی طرف اسے لے جاتی ہے۔ عربی زبان سے ناواقف انسان یقیناً اس تاثیر سے محروم
ہوگا۔ عربی زبان قرآنی علوم کا دروازہ ہے۔ جو شخص حقیقتاً قرآن پڑھنا چاہتا ہو اس کے لیے عربی زبان سیکھے بغیر
چین نہیں آنا چاہیے۔ یہ بات سوچی نہیں جا سکتی کہ ایک شخص قرآن سمجھنا چاہتا ہو اور اسے عربی زبان کے جاننے
کی کوئی فکر نہ ہو۔ ترجمہ و تشریح دوسروں کی فراہم کردہ عینک ہے اگر آپ قرآن کو اسی عینک سے دیکھ سکتے ہیں تو
آپ کی اپنی کوئی رائے نہ ہوگی، بلکہ آپ کی رائے دوسروں کی رائے پر مبنی ہوگی۔ (باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ ہو)

مولانا آزاد کا ایک غیر مطبوعہ خط!

(عابد رضا بیدار)

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات کے بعد ان کے متعدد غیر مطبوعہ خطوط شائع ہو چکے ہیں ذیل کا خط بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ خط بہت اہم ہے بلکہ ایک لحاظ سے مولانا کے جو دو چار اہم ترین خط ہو سکتے ہیں ان میں سے ہے۔ اس خط میں کئی جگہ مولانا کی مخصوص طرز انشاء کے بڑے دلکش نمونے بھی مل جاتے ہیں۔ "شہاب ثاقب" کی بحث کے دوران میں جو نکات جس لطیف پیرایے میں بیان کیے ہیں یہ حصہ مولانا کی اہم ترین تحریروں میں سمجھا جانا چاہیے مولانا کے بقول "مختصر لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے، اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے"۔ یہ خط سنہ ۱۹۲۰ء کا لکھا ہوا ہے اور اس لحاظ سے مولانا آزاد کے قدیم ترین خطوں میں بھی ہے۔

یہ خط میرے محترم استاد جناب مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب رامپوری کے نام ہے اور ان کے پاس محفوظ ہے۔ مولوی ضیاء اللہ خاں صاحب رامپور صولت پبلک لائبریری کے صدر ہیں۔ یہ لائبریری اپنی پینتالیس، پچاس ہزار کتابوں کے باعث ممتاز ترین مشرقی لائبریریوں میں ایک ہے، مولانا کی عمر نوے کے لگ بھگ ہوگی۔ وہ فرماتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے سنہ ۱۹۱۲ء میں جامع مسجد رامپور میں تقریر کی تھی۔ اس وقت ان کے داڑھی مونچھیں کچھ نہ تھیں۔ اسی تقریر سے مولانا آزاد سے ان کا تعارف ہوا اور اس کے بعد ہی انھوں نے مولانا آزاد کو وہ خط لکھا جس کا جواب یہ ہے۔

سوالات جن کے جواب میں یہ خط لکھا گیا ہے پہلے کو چھوڑ کر (جس میں عربی سیکھنے کے لیے ابتدائی کتابوں کے نام پوچھے تھے، جو مولانا کی نظر میں مناسب ہوں) باقی سب سماوی قسم کے ہیں۔ اس خط کی اشاعت کے لیے میں استاذی المحترم قبلہ ضیاء اللہ خاں صاحب کا شکر گزار ہوں۔

۱۱۔ بالی گنج سرکلر روڈ کلکتہ

۲ اگست ۲۰ء

حبی فی اللہ۔ السلام علیکم۔ خط پہنچا۔ جن تعلیمی مسائل کے متعلق میں نے دہلی میں ذکر کیا تھا وہ حسب ذیل ہیں:

القراءة المرشدین کا ۔ جزء اول سے جزء چہارم تک ۔ مطبوعہ قاہرہ
فوائد الانشاء ۔ اول و ثانی "
ھدایۃ الطالب الی قواعد العربیۃ اول و ثانی "

مبادیات کے لیے یہ سلسلہ مفید ہوگا۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں یہ رسائل بھیج دوں۔ اگر میں یہ بھیج سکتا تو تحفۃً بھیج دیتا لیکن میرے کتب خانہ میں اس کا ایک ایک نسخہ ہے۔ ایک سے زیادہ نسخے موجود نہیں۔ آپ مولوی شرف الدین تاجران کتب عربیہ بھنڈی بازار کو لکھیے وہ بھیج دیں گے۔ میں بھی کتابیں آج کل انھیں کے یہاں سے منگواتا ہوں۔

۲۔ شہاب ثاقب کے "رجوماً للشیاطین" ہونے کی نسبت دو باتیں پیش نظر رکھنی چاہییں۔

اولاً، کائنات ہستی کے جس قدر حوادث و اعمال ہیں ان کے علل و مقاصد کے بارے میں ہماری معلومات ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتیں، یعنی اس حد سے جو ہمارے حواس کے تفحص و تعمق کی آخری حد ہے۔ اس حد سے آگے جو کچھ ہے وہ ہمارے لیے غیر معلوم و مجہول ہے اور جو کچھ غیر معلوم و مجہول ہے، اس کے لیے ہماری صحیح حیثیت یہی ہو سکتی ہے کہ عدم علم کا اعتراف کریں۔ منع و نفی کے مدعی نہیں ہو سکتے۔ میں امید کرتا ہوں بات آپ پر واضح ہو گئی ہوگی، تشریح کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھیے کہ ایک خاص حد تک ہماری نظر و ادراک کے لیے روشنی ہے اس کے بعد تاریکی ہے۔ جہاں سے تاریکی شروع ہوتی ہے، ہماری سیر نظری کے قدم رک جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا ہے؟ کیا کچھ ہے اور کیا کچھ نہیں ہے، اس بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور اس لیے ہماری حیثیت صرف یہ ہے کہ عدم علم کا اعتراف کریں۔ کسی بات کے لیے نہ تو مثبت ہو سکتے ہیں نہ مانع و منکر۔ قدیم و جدید عہد کے تمام اکابر علم و نظر نے صاف لفظوں میں اس کا اقرار کیا ہے۔

اب ایسا ہوتا ہے کہ علم و بیان کا ایک نیا دروازہ کھلتا ہے ایک انسان وحیِ الٰہی کے ساتھ آتا ہے اور کہتا ہے جس حد کے بعد سے تمہارے لیے تاریکی ہے، میرے لیے روشنی ہے، جس حد کے بعد سے تمہارے لیے عدم علم ہے میرے لیے بصیرت و برہان ہے۔ جس حد کے بعد سے تمہارا سرمایۂ یقین ختم ہو جاتا ہے، میری یقینیات شروع ہوتی ہیں۔ ھٰذہٖ سبیلی اَدعوا الی اللّٰہ علی بصیرۃ انا ومَن اتّبعَنی۔ پس ایسی حالت میں ہمارے لیے علم و راستی کی دو ہی راہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر وہ شخص اپنے تمام اقوال و اعمال میں صادق ہے تو اسے قبول کریں، کاذب ہے تو انکار کر دیں لیکن وہ جو کچھ بیان کرتا ہے اسے جھٹلا نہیں سکتے۔ کیونکہ وہ جن حدود کے معاملات بیان کرتا ہے ان کے لیے ہمارا موقف، عدم علم کا ہے اور اس کا دعویٰ علم و بصیرت کا ہے۔ ہم نہ ہاں کے لیے زیادہ سے زیادہ جو کچھ

کہہ سکتے ہیں وہ شک سے زیادہ نہیں ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس کی بنیاد علم یقین ہے۔ ہم شک کی بنا پر علم و یقین کو جھٹلا نہیں سکتے۔

مختصر لفظوں میں جو کچھ کہہ دیا گیا ہے اگر آپ غور کریں گے تو نصف قرآن کی تفسیر ہے۔

ثانیاً، انبیاء کرام اور کتب سماویہ کے تمام بیانات جو ماورائے محسوسات سے تعلق رکھتے ہیں اسی قسم میں داخل ہیں۔ یہ ایک خطرناک غلطی ہے کہ یہ حقیقت فراموش کر دی جائے اور غلط طریقوں سے تطبیق عقل و نقل کی کوشش کی جائے۔ یہاں تطبیق کی گنجائش ہی نہیں اور عقل اپنی حدود سے باہر سرے سے معلومات رکھتی ہی نہیں کہ معارف نقلیہ کے موافق ہوں یا مخالف ہوں، عقل لاعلمی کے سکوت میں ہے، نقل علم و یقین کے ساتھ متکلم ہے۔ پس تعارض کب ہو کہ تطبیق کا سوال پیدا ہو؟

شہاب ثاقب وغیرہ کے متعلق بھی جس قدر امور بطریق صحیح کتاب و سنت سے ثابت ہیں اسی قسم کے معارف میں داخل ہیں۔ بلاشبہ عقل انسانی نے ایک خاص حد تک پہنچ کر یہ بات معلوم کر لی ہے کہ شہاب ثاقب کس طرح ٹوٹتے ہیں اور فضا میں کیا کیا محرکات ان کے سقوط کے لیے پیدا ہوتے ہیں، اس بات کے لیے علم انسانی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے بعد بھی کچھ ہے یا نہیں ہے؟ اور تمام تغیرات و حوادث عالم کی طرح اس حادثے میں بھی ماورائے نظر علم افعال و خواص معنویہ پوشیدہ ہیں یا نہیں؟ پھر اگر وحی الٰہی نے اس بارے میں کچھ بتلایا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ اسے تسلیم کریں کیونکہ اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی علم و یقین موجود ہی نہیں ہے۔

یہ اصل عظیم پیش نظر رکھیے گا تو اس راہ کی تمام مشکلات حل ہو جائیں گی۔ یہ علم کلام متکلمین کا علم کلام نہیں ہے کتاب و سنت کا کلام ہے۔

(۳) باقی رہی یہ بات کہ بعض احادیث میں "نجوم" کی پیدائش کا مقصد بعض خاص امور بیان کیے گئے ہیں اور بقیہ کی نفی کی گئی ہے، تو اس بارے میں بھی ایک اصل پیش نظر رکھنا چاہیے۔ احادیث پر موقوف نہیں، خود قرآن میں بھی جا بجا اس طرح کی تصریحات موجود ہیں جن میں بعض اشیاء و مصنوعات کے مقاصد تخلیق بیان کیے گئے ہیں اور بہ اسلوب بیان بظاہر مفید حصر ہے۔ مثلاً یہی تخلیق نجوم، یا مثلاً چاند کا گھٹنا بڑھنا: ۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وغیر ذلك ۔ تو اگرچہ ان مقامات میں حصر پایا جاتا ہے لیکن وہ علی الاطلاق نہیں ہے، خاص حالات سے مقید ہے اور یہ تقیید خود کتاب و سنت سے معلوم ہو جاتی ہے۔ نزول قرآن کے وقت طرح طرح کے توہمات باطلہ مخالفین میں پھیلے ہوئے تھے، اور اس وقت تک پھیلے ہوئے ہیں۔ جہل و اصنام پرستی کی وجہ سے لوگ خیال کرتے تھے کہ اجرام

دیوتا ہیں اور باشندگان کرۂ ارض کے تمام نتائج و تاثرات کا سر رشتہ ان ہی کے ہاتھ ہے۔ بابل، یونان، مصر اور ہندستان کا فن نجوم (جوتش) ان ہی عقائد باطلہ کا ایک مدون مجموعہ ہے۔ عرب جاہلیہ میں بھی یہ اوہام پھیلے ہوئے تھے۔ پس جہاں کہیں اجرام سماویہ کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ان کی تخلیق کا کوئی ایسا مقصد بیان کر دیا گیا ہے جو زیادہ واضح اور اقرب الی العقول ہے اور ساتھ ہی کہہ دیا گیا ہے کہ اس سے زیادہ جو کچھ سمجھا جاتا ہے بے اصل ہے یعنی جو خرافات لوگوں میں مشہور ہیں ان کی اصلیت نہیں۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ ان کی تخلیق کے حقیقی مقاصد اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ اَھِلّۃ کی نسبت فرمایا۔ ھی مواقیت للناس کیونکہ یہ سب سے زیادہ واضح اور واقع فی النفس بات تھی۔ مقصود یہ تھا کہ تم نے چاند کے گھٹنے بڑھنے اور مہینوں کی چاندرات کی نسبت جس قدر اوہام و خرافات بنا رکھے ہیں ان کی کوئی اصلیت نہیں یہ تو اوقات معلوم کرنے کا سامان ہے اور بس۔

حضرت ابراہیم کی وفات اور کسوف مدینہ والی حدیث پر نظر ڈالیے۔ صرف اتنی بات پر کسوف کا معاملہ ختم کر دیا گیا کہ یہ آیات الٰہیہ میں سے ایک آیت ہے اور تمام تر زور عوام کے بے اصل خیالات کے ازالے پر دیا گیا کیونکہ انبیائے کرام کا مقصود اصلاح عقائد ہوتا ہے نہ کہ خواص و فوائد اجسام کی شرح و تنقیب۔

بہرحال جس حدیث کا آپ نے ذکر کیا ہے اس میں نفی مطلق نہیں مقید ہے۔

(۴) سماء الدنیا سے مقصود بلندی کا وہ نظارہ ہے جو ہمیں اپنی نگاہوں کے سامنے نظر آتا ہے یعنی فضا۔ جسے یونانی اور اب اس کی وجہ سے انگریزی میں (ایٹماسفیر) کہتے ہیں۔ عربی میں سماء کے معنی اوپر کی چیز کے ہیں مثل السائر میں آپ نے پڑھا ہوگا

واحمر کالدیباج اما سماؤہ   فریا و اما ارضہ فمحول

پس سماء الدنیا کے معنی ہوئے زمین کے اوپر کی فضا۔

مولوی افضال الحق[1] صاحب کو اور اگر ملاقات ہو تو ان کے والد بزرگوار کو میرا سلام شوق پہنچا دیں۔ ابوالکلام

---

[1] مولوی افضال الحق صاحب اور ان کے والد مولانا فضل حق صاحب رامپور کے رہنے والے تھے۔ مولانا فضل حق صاحب رامپور کی ایک زمانے میں مشہور عالم علوم مشرقی کی درس گاہ اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے اور بعد میں افضال الحق صاحب بھی اسی کالج میں استاد ہو گئے تھے۔ مولانا فضل حق صاحب منطق اور فلسفہ کے جید عالم تھے اور اپنے عہد کے ہندستان میں ان کا نام سند کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۱ء میں وفات پائی۔ متعدد اہم کتابیں ان کی تصنیفوں میں سے ہیں۔ مولوی افضال الحق صاحب کے والد مولوی فضل حق صاحب تو ان دیو زاد عالموں کے سلسلے کی آخری کڑی تھے جس میں عبدالحق صاحب خیرآبادی، فضل حق صاحب خیرآبادی اور ان سے اوپر شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ ولی اللہ صاحب جیسے لوگ گزر چکے تھے۔ "نیا دور" جولائی ۱۹۶۲ء

JAMIA LIBRARY
Jamia Millia Islamia.
DELHI.

روس کے مسلم علاقوں میں سوویت سامراج

اسلام دشمن پروپیگنڈہ

(آخری قسط)

(ترجمہ۔ ش۔ ن عثمانی)

سوویت روس کی مسلمان قوموں کے ساتھ سوویت پالیسی میں اسلام دشمن پروپیگنڈہ برابر ایک اہم کردار ادا کیے جارہا ہے۔ اس پروپیگنڈے کے حدود کا اندازہ اس مقالے سے کیا جاسکتا ہے جو ۲ رمئی ۱۹۵۸ء کے "پراودا" میں شائع ہوا ہے اور جس میں کہا گیا ہے کہ صرف ترکستان ہی میں ۱۲۰۰ مذہب دشمن انجمنیں ہیں جن کے ۲۷ ہزار ممبر ہیں۔ ۱۹۳۹ء میں ان انجمنوں کے جلسوں میں ڈیڑھ ہزار رپورٹیں سنائی گئیں اور مذہب دشمنی کے موضوع پر ایک ہزار سے زیادہ مباحثے منعقد ہوئے[1] جنگ کے بعد کے زمانے میں سوویت روس میں مذہب دشمن پروپیگنڈے کی جھلک ان اعداد و شمار میں دیکھی جاسکتی ہے جو "کیزل ازبکستان" بابتہ ۱۸ مارچ ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئے ہیں۔ اس اخبار نے اطلاع دی کہ دس ہزار سے زیادہ مذہب دشمن جلسے اور تقریریں ۱۹۵۴ء میں ہوئیں۔ اس تعداد کو ناکافی قرار دیا گیا اور مزید کوشش کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ جی رعبداللہ اوف کی کتاب "اسلام کی ابتدا اور کچھ اس کے مسائل" انتہائی جارحانہ لب ولہجہ والی ایک کتاب ہے جو ۱۹۵۶ء میں آذربائیجان میں "انجمن آذربائیجان برائے اشاعت علومات سیاسی وسائنسی" کی جانب سے چھاپی گئی۔ اس رسالے کے اقتباسات آذربائیجان کے اخبار SOKIN OSKY RAB OCHI بابتہ ۱۷ مارچ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئے۔ مصنف یہاں تک محاکمہ دیتا ہے کہ اسلام نے لوٹ مار اور جبر وتشدد کو سندِ جواز عطا کی اور مسلمانوں میں رہزنی کا شوق پیدا کیا۔ اس رسالے کے نزدیک قرآن "اپنے معتقدین

---

[1] "TORKISTAN IN VERIGETI" از۔ ذکی ولید توغان۔ استنبول۔

کی زندگی میں باطل نظریہ ابھارتا ہے۔ اس کو سماجی مسرت کی جدوجہد میں بے دست وپا کر دیتا ہے۔"[1]

ایک مقالہ جو اسلام دشمن پروپیگنڈہ کی جملہ خصوصیات کی نمائندگی کرتا ہے کسی ایم۔ زینی بیف استاد ریاست کرغیز کا ہے جو اخبار کرغیزیہ بابت ۲ اپریل ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا اور جس کا عنوان یہ تھا۔

"خدا کو نہ مانو —— وہ ایک دھوکا ہے!"

اس اپیل کے راقم کے نزدیک خدا پر ایمان اور ایک مسرور زندگی دو بے جوڑ چیزیں ہیں، اس لیے وہ حسب ذیل الفاظ میں کرغیزیہ کے مسلمانوں سے التجا کرتا ہے۔

"خدا کو نہ مانو —— وہ موجود نہیں۔ وہ ایک دھوکا ہے۔ اس خود فریبی کو ترک کر دو۔ ایک نئی شادماں زندگی کے باشعور معماروں کی صفوں میں جا ملو۔"

اس سے بھی زیادہ مثالیں نقل کر کے یہ بتایا جا سکتا تھا کہ سوویت پروپیگنڈہ مسلمانوں کے اندر مذہب کی جڑ کیسے اکھیڑ رہا ہے[2] یہاں ہم اس بیان کو نقل کر سکتے ہیں جو "سوویت انسائیکلوپیڈیا کلاں" میں لکھا ہے دوسرے اڈیشن کی جلد ۱۸ میں اسلام کے کردار کی یہ تعریف کی گئی ہے:۔

"اسلام نے دوسرے مذاہب کی طرح ہمیشہ استحصال کیش ہاتھوں میں محنت کشوں کی پامالی کے ہتھیار کی حیثیت سے انفعالی کردار ادا کیا ہے۔ اور بدیشی نوآبادیاتی سامراجوں کے ہاتھ میں مشرق کے عوام کی حلقہ بگوشی کے لیے ناجائز مقصد کے واسطے استعمال ہوتا رہا ہے۔"[3] —— یہی انسائیکلوپیڈیا دعویٰ کرتی ہے کہ "قرآن استحصال کیش طبقوں اور تخریبی مسلم پیشوائیت کے ذریعہ پامال محنت کشوں کے واسطے ایک ہتھیار کی شکل میں استعمال کیا جاتا ہے۔" —— مسلم کلچر اور روایات کی طرف سے بے اعتنائی کا انکشاف اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ ازبکستان، تازکستان اور وسطی ایشیا کی دیگر مسلم جمہوریتوں کے مسلمانوں کو خنزیر پالنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ۵ جولائی ۱۹۵۷ء کے ایک ازبک اخبار نے اطلاع دی کہ ازبیک پارٹی کے کارکنان تاشقند کی ایک میٹنگ میں

---

[1] "باکنسکی ریبوچی"۔ باکو۔ ۱۷ مارچ ۱۹۶۰ء

[2] این ٹیوڈورووش کی کتاب "مذہب —— سوویت روس کی ریاستہائے متحدہ میں" کا ایک مقالہ "مذہب کے خلاف ایک تازہ مہم —— سوویت یونین میں" —— ادارۂ تحقیقات برائے سوویت روس۔ میونخ۔ سلسلہ (۱) نمبر ۴۹، ۱۹۶۰ء صفحات ۲۳۲-۲۲۶

[3] سوویت انسائیکلوپیڈیا کلاں (بی۔ ایس۔ ای) دوسرا اڈیشن جلد ۱۸ صفحہ ۵۱۶

ازبیک کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری اول نے حاضرین جلسہ کو یاد دلایا تھا کہ خروشچیف نے جمہوریہ کے رہنماؤں پر تنقید کی تھی کہ وہ مویشیوں کی نسل کشی میں غفلت برت رہے ہیں۔ اس اشارے سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔

اس سے پہلے " ازبیک کے سکریٹری اول نے کہا" ہم خنزیر پالنے کا کام نہیں کرتے تھے۔ اب جمہوریہ میں کوئی ایک قریہ (KALKHOZ) ایسا نہیں جہاں سور پالنے کی چراگاہ نہ ہو" مسلمانوں کے اہم ترین خاص ایام رمضان اور قربان بیرم (عید قربان) تمام سوویت جمہوریاؤں میں کام کے دن ہیں۔ سنہ ۱۹۲۹ء سے سوویت روس کے تمام مسلمانوں کے لیے جمعہ ایک عام کام کا دن ہوگیا ہے اور بالحاظ مذہب و ملت اتوار آرام کا دن ہے۔

سوویت روس میں تعمیر اشتراکیت کے شاخسانے میں مسلمانان روس ان مسلم ریاستوں سے معمولی ثقافتی روابط قائم کرنے سے معذور رہیں جن کی سرحدیں سوویت روس سے ملی ہوئی ہیں۔ تاشقند میں پہلی کل یونین مستشرقین کانفرنس سنہ ۱۹۵۷ء کے موقع پر ازبیک کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری اول نے کہا کہ " سوویت روس میں بسنے والے مسلمان تمام دنیا کے مسلمانوں سے آزادانہ ربط و ضبط قائم کر سکتے ہیں لیکن اس قسم کی بات سچی نہیں۔ سوویت مسلمان کم ہی اس کا موقع پاتے ہیں کہ دوسرے مسلم ممالک کا سفر کر سکیں کم سوویت مسلمانوں کو یہ موقع ملتا ہے کہ مکہ کا حج کر سکیں عہد قبل از انقلاب میں پچاس ہزار سے ساٹھ ہزار تک زائرین ہر سال حج کیا کرتے تھے۔ اب یہ تعداد لگ بھگ بیس یا تیس ہے۔ مسلم آبادی بالخصوص مکہ جانے والے مسلمانوں کی سوویت حکومت کی طرف سے کس حد تک نگرانی کی جاتی ہے۔ اس کا واضح اندازہ جنرل ٹیوبرٹ اور مفتی ضیاء الدین باخانوف کی گفتگو سے لگایا جاسکتا ہے مؤخر الذکر نے ٹیوبرٹ سے کہا کہ سنہ ۱۹۵۶ء میں ان کے والد مفتی وقت کو وسطی ایشیا سے سفر مکہ کی اجازت حاصل کرنے کی دو سو درخواستیں موصول ہوئیں۔ ان میں سے محض ۲۰ منظوری کے لیے ماسکو بھیجی گئیں۔ بقیہ کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ ان کی صحت ایسے سفر کا تعب برداشت نہ کر سکے گی اور یہ کہ ان کے پاس ضروری سازوسامان نہیں[1]

تلخیص

جب سے کمیونسٹوں کے ہاتھ میں اقتدار آیا سوویت روس کی مسلم جمہوریتوں میں اسکولوں اور تعلیم کی درس گاہوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اس طرح سوویت حکومت ان جمہوریتوں میں ایک نیا " اہل الرائے طبقہ " پیدا

---

[1] GENEREL TUBERT OP. CIT. صفحات ۲۸ - ۱۲۷

کرنے کے قابل ہو گئی ہے۔ ان کو اس کا خاص فکر ہے کہ قومی فخر اور احساسات سے کورے افراد کو جنم دے ایسے افراد جو اپنے ملک کے ماضی اور اپنے اسلاف کی دیرینہ روایات سے یکسر بے بہرہ ہوں۔ سوویت مسلم جمہوریتوں کے "اہل الرائے طبقہ" پر قومی ثقافت کے اثرات کو مضمحل کرنے کا ایک طریقہ یہ نعرہ ہے کہ "ہیئت کے لحاظ سے قوم پرستانہ اور روح کے لحاظ سے ایک اشتراکی کلچر" اس نعرہ کا منشاء یہ ہے کہ "قومی کلچر کو قومی ماضی کے ساتھ اس کے بندھنوں کی بنیاد پر کھلی فضا میں نشو و نما پانے کے ہر ہر امکان سے محروم کیا جاتا ہے۔ اس قومی کلچر کی روح جس کی بیخ کنی سوویت اسکول خاص فکرمندی کے ساتھ کرتے ہیں لازماً اشتراکی یعنی کمیونسٹ نظام فکر کے ماتحت ہی رہے گی۔ نوخیز نسلوں پر جس سوویت کلچر کو اوپر سے لادا جا رہا ہے اس کا تذکرہ کرتے ہوئے ایم۔ اے۔ خانو وِش اس کی حسب ذیل تعریف کرتا ہے:۔

> یہ کلچر لوگوں کو بچپن سے عوام کے پیار اور لگن کی تربیت دیتا ہے۔ عوام کے لیے ۔۔۔ سوویت مادر وطن کے لیے سب بالشویک پارٹی کے لیے ۔۔۔ اور لینن و اسٹالن کے کارہائے نمایاں کے لیے [1]

اس قسم کے کلچر کے لیے سوویت یونین کی تمام قوموں کو متحد کرنے کی یہ مہم اسٹالن کے بعد کے عہد میں کچھ اور تیز کر دی گئی۔ سوویت دیش کے مسلمانوں کے قومی کلچر کو "روسیانے" کا یہ عمل مسلم اشتراکی کلچر کی تخلیق کا اہم ترین عنصر ہے۔ یہ "روسیانے" کا عمل عربی فارسی اصطلاحات کی جگہ روسی زبان سے گھڑ گھڑ کر اپنانے کی شکل میں ۔۔۔ مسلم قوم کی تاریخ مسخ کرنے کی شکل میں۔ زار روس کے ذریعہ مسلم سرحدوں کی فتوحات کے ترقی پسندانہ کردار کو تسلیم کرنے کی شکل میں اور علیٰ ہذا القیاس اپنا مظاہرہ کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ان جمہوریتوں میں روسی زبان کی تعلیم بڑے پیمانے پر دی جاتی ہے۔ یہی رجحان سوویت دیس کی مسلم قوموں کے اشتراکی کلچر کے نشو و نما میں روسی کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں پایا جاتا ہے۔ سوویت کمیونسٹ حکومت قومی ذہین طبقہ کے ان افراد کا قلع قمع کرنے میں جٹی ہوئی ہے جو قومی خطوط پر برابر سوچے جا رہے ہیں۔ یعنی　نام نہاد "بورژوائی قوم پرست لوگ"۔

صف اول کے ازبیک سیاسی رہنما ایف کوزیف کا ۱۹۳۸ء میں قتل ۔۔۔ ۱۹۳۳ء - ۱۹۳۲ء میں ان لوگوں کی عام گرفتاریاں اور دیس نکالے جن پر قوم پرستی کا الزام تھا۔ ترکستان میں "داغستانیت" نام کی قومی تحریک کے متعلق سوویت مذمت آمیز لٹریچر ۔۔۔ قومی اہل الرائے طبقہ کے خلاف چلنے والی مہم کے نمونے ہیں۔ یہ تحریک جو ترکستان

---

[1] لٹریری انسائیکلوپیڈیا۔ ماسکو (روسی زبان میں) ۱۹۳۸ء۔ جلد ۱۱۔ صفحات ۹۲-۴۴۴۔ بی ایس ای) ۱۹۵۲ء ایڈیشن جلد ۱۴۔ صفحہ ۱۹۹۔

میں ثقافتی اور قومی اصطلاحات کے لیے کوشاں تھی۔" انقلاب دشمن" کی حیثیت سے خلاف قانون قرار دی گئی۔ تاتاری سیاسی شخصیت سلطان غالییف کا دردناک انجام ایک دوسرا نمونہ ہے جن کو ۱۹۳۰ء میں قوم پرستی کے جرم میں سزا دی گئی اور جو جلا وطنی میں تباہ ہوئے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ تعمیر اشتراکیت کا سوویت تجربہ فروری اور اکتوبر ۱۹۱۷ء کے بعد قائم شدہ سوویت دیس کی مسلم جمہوریتوں کی قومی آزادی کے خلاف تھے ـــــ قوم پرستانہ ذہن رکھنے والے ذہین طبقے کے استیصال مسلم اتحاد اور دوسرے ممالک کے ساتھ رشتۂ اخوت کے انقطاع تک جا پہنچا۔ اسی سوویت تجربے نے مسلمانوں کو ان کے قومی مسلم کلچر کے نشو و نما سے محروم کیا اور نئی پود کو مسلم مذہب اور مسلم روایات سے دور کر دیا۔ اس کے نتیجے میں ان مسلم جمہوریتوں میں غیر مسلموں کی تعداد بڑھی جو بالکل زمانۂ حال تک خالص مسلم آبادی کی حامل تھیں۔ جیسا کہ زراعت کو اجتماعی ملکیت میں ڈھالنے ـــــ وسطی ایشیا کے خانہ بدوش طبقوں کو بزور و جبر سکونت گزیں بنانے اور معاشی طور پر ملک کے بچھڑے ہوئے علاقے میں صنعتوں کے جال پھیلانے اور کمیونزم کے مفاد اور مقامی آزادی کے زیاں کے لیے قومی جمہوریتوں کا استحصال کرنے سے منکشف ہوتا ہے۔ سوویت مسلمانوں اور سوویت دیس کی دوسری قوموں کی فلاح و بہبود پر اس کا منفی اثر پڑا ہے۔ اس لیے تعمیر اشتراکیت کا وہ سوویت تجربہ جس کا نعرہ افریشیائی ممالک کے مفاد کے لیے اتنے زور و شور سے لگایا جا رہا ہے ہم اس کی بابت لکھتے ہوئے اس کی حسب ذیل تعریف کر سکتے ہیں۔

" اشتراکیت کی تعمیر کے لیے یہ نام نہاد سوویت تجربہ درحقیقت کمیونسٹ تاناشاہی اور نوآبادیاتی سامراج کا تجربہ ہے۔ اس تجربے کے صید زبوں سوویت یونین کے مسلمان رہے ہیں۔"

(انگریزی ماہنامہ وائس آف اسلام۔ کراچی بابت دسمبر ۱۹۶۱ء سے ترجمہ کیا گیا)

بقیہ (ص ۲۹) اگر آپ قرآن کے بارے میں براہ راست کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ قرآن کے الفاظ میں اس کی حقیقت کا مطالعہ کریں اور اس کی بلندیوں کو پانے کی کوشش کریں۔ وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ۝ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ ۝ الشعراء۔ (اس میں شک نہیں کہ قرآن مجید رب العٰلمین کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ بالکل واضح عربی زبان میں جس کو روح الامین لے کر تمہارے قلب پر نازل ہوئے ہیں تاکہ تم (بھی) ڈرانے والوں (پیغمبروں) میں سے ہو جاؤ۔)

مسلمان ملکوں کا حال

"پچھلے دنوں لندن یونیورسٹی کے مشرقی اور افریقی علوم کے اسکول کے ایک مسلمان عراقی طالب العلم نے خودکشی کرلی اس لیے کہ اسے امتحان میں ناکام ہوجانے کا خوف تھا "

اگرچہ اس خبر میں اتنی ندرت ضرور موجود ہے کہ خودکشی امتحان میں ناکامی کے بعد نہیں کی گئی ہے بلکہ محض اس کے خوف سے کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود یہ خبر اس لائق نہ تھی کہ میں اسے یہاں پیش کرتا لیکن اس کا پس منظر معلومات فزا بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ اس لیے یہاں پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس خودکشی کا پس منظر یہ ہے کہ عراق کے ڈکٹیٹر جنرل قاسم نے ایک نادر ترین حکم یہ صادر فرمایا ہے کہ " جو طالب العلم حکومت کے وظیفے پر اعلیٰ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھیجا جائے، وہ اگر اپنے امتحان میں دو دفعہ فیل ہوا تو اس کا وظیفہ بند اسے فوراً عراق واپس بلا لیا جائے گا اور اس کی تعلیم پر حکومت نے جتنا خرچ کیا ہے اسے حکومت کو دینا ہوگا، اگر اس کے پاس پیسے نہ ہوں تو اس کے باپ اور دوسرے رشتہ داروں کو رقم فراہم کرنی ہوگی۔ اگر وہ اتنے امیر نہ ہوں کہ تیس چالیس ہزار روپیہ فراہم کر سکیں تو ان کی ساری جائداد منقولہ و غیر منقولہ بحق سرکار ضبط "

اس طالب العلم کی خودکشی کے بعد بھی حکومت عراق ٹس سے مس نہ ہوئی لیکن لندن یونیورسٹی کے ذمہ دار تلملا گئے۔" یونیورسٹی نے حکومت عراق کو دھمکی دی ہے کہ اگر وہ اس قانون میں تبدیلی نہیں کرتی تو لندن یونیورسٹی میں کسی عراقی کو داخلہ نہیں دیا جائے گا کیونکہ اساتذہ عراقی لڑکوں کو اس خیال سے پاس کر دیا کریں گے کہ ان کے والدین اور وہ لڑکے خود شدید مشکلات کے شکار نہ ہوجائیں۔ جنرل قاسم کے اس ہٹلری حکم میں اتنی بات تو ٹھیک ہے کہ حکومت کے وظیفے پر جو طلبہ حصول علم کے لیے باہر بھیجے جاتے ہیں، ان میں کا کوئی اگر دو سال فیل ہوجائے تو اسے واپس بلا لینا چاہیے کیونکہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ذہنی صلاحیت اس لائق نہیں ہے کہ اس پر پبلک رقم مزید برباد کی جائے لیکن اس کے بعد اس حکم کے جو اجزا ہیں وہ سخت ظالمانہ ہیں اور شاید تمام دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔

یہ بات عجیب ہے کہ طالب العلم کی ناکامی کی سزا اس کے خاندان کو دی جائے حالانکہ سزا کے مستحق حکومت کے وہ کارندے ہو سکتے ہیں جنھوں نے ایک ایسے نااہل طالب العلم کا انتخاب کیا' ہوتا یہ ہے کہ سعی و سفارش کے ذریعہ یا رشوت لے کر حکومت کے وظیفے ایسے طلبہ کو دیے جاتے ہیں جو علمی و ذہنی صلاحیت میں دوسرے اہل طلبہ سے پیچھے ہوتے ہیں' لیکن اس وقت کی دنیا کا یہ عجیب انصاف ہے کہ اصل مجرموں کو چھوڑ کر ان لوگوں کو سزا دیتی ہے جو بے جرم ہوتے ہیں۔

اس خبر کی تفصیلات میں ہمارے لیے متعدد عبرتیں جمع ہو گئی ہیں:۔ (۱) عراق کے مسلمان عوام خود ایک مسلمان کی ڈکٹیٹر شپ میں عذاب الیم کا مزا چکھ رہے ہیں۔ (۲) ایک مسلمان بھی جب وحی الٰہی کو پس پشت ڈال کر صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرتا ہے تو اس سے انتہائی ظالمانہ اور احمقانہ حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ (۳) غیر ملکی انگریز اور عیسائی اساتذہ کو مسلمان طلبہ اور ان کے رشتہ داروں کی فکر ہے لیکن مسلمان حکومت کو اس کی کوئی فکر نہیں (۴) یہاں ایک یہ سوال بھی ذہن میں ابھرتا ہے کہ کیا ڈکٹیٹر شپ اور اسلامی خلافت دونوں ایک جگہ جمع ہو سکتی ہیں اس سوال کا جواب اثبات میں دینا غلط ہے کیونکہ جس شخص کو ڈکٹیٹر کہتے ہیں اس میں دو باتوں کا ہونا ضروری ہے ایک یہ کہ وہ تمام متنازعہ امور کے فیصلے کے لیے آخری اتھارٹی ہو یعنی کسی ملک کی حاکمیت اس کی ذات میں مرتکز ہو اور دوسری یہ کہ وہ اپنی عقل و فہم کے سوا کسی اور چیز کا پابند نہ ہو۔ خلیفۃ المسلمین کو نہ پہلی بات حاصل ہوتی ہے اور نہ دوسری۔ اسلامی خلافت میں حاکمیت صرف اللہ تعالیٰ کی ہوتی ہے اور خلیفہ کتاب و سنت کا پابند ہوتا ہے' وہ اسلامی حکومت کے دائرے میں خود بھی خدا کا اسی طرح ایک بندۂ محکوم ہوتا ہے جس طرح دوسرے بندگانِ خدا' کتاب و سنت کے مسلّم و منصوص احکام کی پابندی اس کے لیے بھی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی دوسروں کے لیے اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی حکومت کا سربراہ کسی طرح ڈکٹیٹر ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اسلامی حکومت کی ایک قسم ڈکٹیٹر شپ بھی ہو سکتی ہے وہ یا تو خود ناواقف ہیں یا ناواقفوں کو فریب دینا چاہتے ہیں۔

عراق و مصر کے حالات کو سامنے رکھ کر ایک خیال یاد آتا ہے کہ اگر اس وقت ہندستان کے کسی مسلمان کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ ہندستان میں رہے یا عراق و مصر جا کر آباد ہو جائے تو وہ کہاں رہنے کو ترجیح دے گا؟

لندن میں یوم الجزائر

کچھ عرصہ گزرا انگلستان کی الجزائر کمیٹی نے یوم الجزائر منایا تھا' تقریباً ایک لاکھ ہینڈبل لندن میں

میں تقسیم کیے گئے ہر فرقہ اور ہر مذہب کی تنظیموں کا تعاون حاصل کیا گیا اور اس بات کی سر توڑ کوشش کی گئی کہ الجزائری مہاجرین کے لیے خاطر خواہ رقم جمع کی جائے۔ لیکن یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی ٹریفیلگر اسکوائر میں جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ کو برطانیہ کی تینوں سیاسی جماعتوں کے نمائندوں نے خطاب کیا، لیکن حاضری دو تین سو سے زیادہ نہ تھی۔ یہ مجمع بھی مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ دن بھر کارکن ہاتھوں میں ڈبے لیے چوراہوں پر کھڑے رہے لیکن انگریز عوام مذاق اڑا کر قریب سے گزر گئے۔ کتنوں نے صاف کہا کہ اگر مدد کرنی ہو تو وہ عیسائی فرانسیسیوں کی کریں گے، مسلمان الجزائریوں کی کیوں کریں؟ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اتنے پیسے بھی جمع نہ ہوئے کہ مہم کے اخراجات پورے کیے جا سکیں۔"

یہ ہے اس شہر کا حال جو اس دور ارتقار کا ایک نمائندہ شہر سمجھا جاتا ہے اور جہاں کا نظام حکومت آزادی، مساوات اور انصاف کے زریں اصولوں پر قائم کیا گیا ہے لیکن اس چھوٹے سے واقعہ سے بھی یہ بات ظاہر ہو رہی ہے کہ مغربی ملکوں میں ان الفاظ کا حقیقی مفہوم کیا ہے؟ بعض انگریز عوام کی یہ صاف گوئی کہ ہم الجزائر کے عیسائی فرانسیسیوں کو چھوڑ کر مسلمان الجزائریوں کی مدد کیوں کریں؟ قابل غور ہے۔

اس جواب کا محرک کیا ہے؟ کیا واقعی اس کا محرک کوئی مذہبی تعلیم یا مذہبی جذبہ ہے؟ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیم کو چھوڑیے، موجودہ محرف بائبل میں کیا اس طرح کی کوئی تعلیم پائی جاتی ہے کہ غیر عیسائی مظلوموں کے مقابلہ میں عیسائی ظالموں کی مدد کی جائے؟ اگر ایسا نہیں ہے تو پھر وہ اصل محرک کیا ہے جسے مذہب کے پردے میں چھپانے کی کوشش کی گئی ہے؟ دراصل اس کا محرک سیاسی ہے اور اس سیاست کی بنیاد ہے قوم پرستی و وطن پرستی جس طرح ایک انگلستانی انگلستان کے مفاد کے مقابلے میں کسی دوسرے ملک کی پاس داری نہیں کر سکتا اسی طرح کوئی یورپین یورپی مفاد کے مقابلہ میں کسی ایشیائی یا افریقی ملک کی تائید نہیں کر سکتا۔ الا یہ کہ اس تائید سے خود اس کے اپنے ملک کو کوئی فائدہ پہنچنے کی توقع ہو۔ اس خبر میں ایک پہلو اور قابل غور ہے۔ اس کی کیا وجہ کہ برطانیہ کی تینوں سیاسی جماعتوں کے نمائندے جلسے میں تقریریں کرتے اور الجزائر کے مظلوموں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں لیکن عوام کا رویہ وہ ہوتا ہے جس کا اوپر ذکر گزرا۔ کیا وہاں کے عوام نے اپنے سیاسی لیڈروں سے اتنا زبردست اختلاف کیا کہ نہ جلسے میں شریک ہوئے اور نہ اس مقصد سے ہمدردی کا اظہار کیا جس کے لیے وہ جلسہ بلایا گیا تھا یا ان لیڈروں کی وہ تقریریں ہی محض سیاسی اور نمائشی تھیں؟ دوسری ہی بات زیادہ صحیح معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں اپنے ملک میں بھی اس طرح کی سیاسی اور نمائشی تقریروں کا تجربہ ہے۔ اس قابل نفرت قوم پرستی کا علاج کیا ہے؟ جو اپنی قوم پرستی بلبلے رہا اور بے لاگ حق پرستی؟

ونوبا جی کے ایک بیان پر تبصرہ

جناب سید منظور الحسن ہاشمی

بیان کا خلاصہ

اچاریہ ونوبا بھاوے جب پاکستان کا دورہ ختم کر کے ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوئے تو اخباری نمائندوں نے ان سے مختلف قسم کے سوالات کیے۔ ان سوالات میں ایک سوال یہ بھی تھا۔ کہ وہ کمیونزم کی مخالفت کیوں کرتے ہیں کیا اس لیے کہ کمیونزم مذہب کا دشمن ہے؟ صاحب موصوف نے جواب دیا کہ چند الفاظ میں کمیونزم کے بارے میں اظہار خیال کرنا بہت مشکل ہے۔ ہمارا انداز فکر یک طرفہ نہ ہونا چاہیے بلکہ ہم انسانیت کے نقطہ نظر سے سوچا کریں۔ موصوف نے فرمایا کہ کمیونزم کا نظریہ بین الاقوامی ہے اور یہ پہلو لائق تحسین ہے لیکن جب اس کے نظریے نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تو یہ اپنے آپ شکست کھا گیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایک طرح کا اجتماع الضدین ہے نہ کہ عمل امتزاج۔ کمیونزم کی زبان میں اگر کہا جائے تو یہ نظریہ ایک ردعمل تھا انفرادیت کے خلاف اور ان حالات کے خلاف جو کارل مارکس کے زمانے میں موجود تھے۔

موصوف نے فرمایا کہ افراد میں اور سوسائٹی میں محبت اور رحم کے جذبے کے ساتھ عمل امتزاج کے ذریعہ انقلاب لانا چاہیے۔

کمیونزم کی مذہب دشمنی کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف نے فرمایا کہ انھیں اتنے بہت سے مذہبوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ وہ مذہب ہیں جو لوگوں کو بجائے متحد کرنے کے ان میں افتراق پیدا کرتے ہیں۔ بس میرا کہنا یہ ہے کہ مذہب اور سیاست کو اپنی جگہ خالی کرنی پڑے گی اور پھر سائنس اور روحانیت ان کی جگہ آ کر لے گی۔

میں خدا کی طرف سے بہت زیادہ فکر مند نہیں ہوں۔ کیونکہ کمیونسٹ خدا کو تسلیم نہیں کرتے لیکن خدا ہم کو تسلیم کرتا ہے۔ وہ ہم سب سے محبت کرتا ہے یہاں تک کہ کمیونسٹوں سے بھی اسے محبت ہے۔ وہ خدا اس قابل ہے کہ اپنی فکر آپ کرے گا۔

تبصرہ

بھاوے جی کا مندرجہ بالا بیان پڑھنے کے بعد جو اہم باتیں ہمارے سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) بھاوے جی مذہبوں کی بہتات سے بیزار ہیں۔

(۲) دنیائے انسانیت میں جو کچھ بھی افتراق انھیں نظر آتا ہے اس کا سبب وہ مذہب کے وجود کو قرار دیتے ہیں۔

(۳) وہ کمیونزم کے حامی نہیں ہیں اور یہ مخالفت صرف اس بنیاد پر ہے کہ اس نے دنیائے انسانیت کو دو

حصوں میں بانٹ دیا ہے اور یہ انفرادیت کے خلاف ایک ردِعمل ہے ۔

۴۔ ان کا خیال ہے کہ بہت جلد مذہب اور سیاست کو میدان سے ہٹنا پڑے گا ۔ اور ان کی جگہ سائنس اور روحانیت لے لے گی ۔

۵۔ وہ خدا کے قائل ہیں مگر ایسے خدا کے جو انسانوں سے صرف محبت کرنا جانتا ہو مگر انھیں زندگی بسر کرنے کے اصول نہ دے سکتا ہو ۔

۶۔ وہ ایک ایسے خدا کے قائل ہیں جو اپنے باغیوں سے بھی محبت کرتا ہے ۔

۷۔ وہ دنیا میں انقلاب لانے کے متمنی ہیں مگر یہ انقلاب صرف دو اخلاقی قدروں کے بل بوتے پر آسکتا ہے محبت اور رحم

۸۔ محبت اور رحم کا جذبہ کس طرح پیدا کیا جاسکتا ہے ۔ فی الوقت عملی اسکیم ان کے پاس یہ ہے کہ بھو دان تحریک چلائی جائے یعنی زمین والوں سے زمین کا عطیہ لیکر زمین سے محروم غریب انسانوں میں اسے تقسیم کیا جائے ۔

بھاوے جی کے مندرجۂ بالا بیان کے یہ آٹھ پہلو علیحدہ علیحدہ تجزیہ چاہتے ہیں اور ضرورت ہے کہ ہر پہلو پر زیادہ وضاحت کے ساتھ بحث کی جائے ۔

پہلی بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بھاوے جی مذہب کی کثرت سے متنفر ہیں ۔ مذہب کی کثرت سے بیزاری واقعی حق شناسی کی دلیل ہوسکتی ہے ۔ دنیا کے بہت سے مناقشات، دنگا فساد، سازشیں اور بغاوتیں، مذہب کی کثرت اور مذہبی تنگ نظری اور تعصب کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتی رہی ہیں ۔ ایک انصاف پسند اور حقیقت شناس انسان کو برملا یہ بات کہنی چاہیے کہ دنیا کو صرف ایک ہی مذہب کی ضرورت ہے جو انسان کو انسان بنا سکے ۔ ان کے اندر ایسی اخلاقی خصوصیات پیدا کرسکے جو انھیں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنا اور ہمدردی کرنا سکھائے ۔ اس کے معاشرتی معاشی اور سیاسی اصول دنیا میں سکھ اور چین کی فضا پیدا کرسکیں لیکن افسوس یہ ہے کہ بھاوے جی نے مذہبوں کی کثرت سے بیزاری کا اعلان کرکے حقیقت پسندی کا اظہار کر تو دیا لیکن اس کثرت کو مٹا کر خلا کو پر کرنے والی جس چیز کو پیش کیا ہے وہ روحانیت اور سائنس کا امتزاج ہے جسے وہ اپنے مذہب کا نام نہیں دینا چاہتے غالباً اس کا نام بھاوے ازم یا بھاویت ہی ہوگا جو آگے چل کر کچھ دنوں بعد دنیا کی اصطلاحوں میں ایک نئی اصطلاح کا اضافہ کردے گا ۔

دوسری بات جو ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کے جھگڑے صرف مذہب کی پیداوار ہیں اس جگہ بھاوے جی کے نظریے دنیا کے فسادات اور لڑائی جھگڑوں کا تجزیہ کرنے میں اگرچہ بہت زیادہ دھوکا نہیں کھایا

لیکن حیرت ہے کہ ان کی نظر لوٹ مار اور غارت گری کے واقعات تک پہنچ کر رک گئی۔ انھوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ فساد مچانے والے مذہب کے نام پر اور خدا کے نام پر فساد مچا رہے ہیں لیکن انھوں نے یہ نہیں دیکھا کہ فساد برپا کرنے والے واقعی اپنے مذہب کے سچے اصولوں پر کاربند نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق مفسدوں کے اس گروہ سے ہے جو مذہب کا نام لینا تو چاہتے ہیں مگر مذہب کے سچے اصولوں سے ناآشنا ہیں اور اگر آشنا بھی ہیں تو ان پر عمل پیرا ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ افسوس ہے کہ ہندستان کے ایک بڑے مفکر نے اس انداز میں اظہار خیال کر کے بلندیٔ فکر کا کوئی اچھا ثبوت نہیں دیا۔

بھاوے جی کے بیان کا تیسرا پہلو بھی موصوف کی گہری نظر اور حقیقت شناسی کی طرف دلالت کرنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ کمیونزم سے وہ اس لیے بیزار نہیں ہیں کہ اس نے خدا کا انکار کر دیا ہے بلکہ اس لیے متنفر ہیں کہ اس نے دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ دنیا کا دو حصوں میں بٹ جانا بالکل فطری بات ہے۔ اگر کمیونزم واقعی خدائی قانون بھی ہوتا تب بھی دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی نظر آتی۔ ایک حصہ حق پر ہوتا اور دوسرا حصہ باطل کی طرفداری کرتا۔ خود ونوبا جی کا نظریہ اگر کسی طرح دنیا میں چل پڑے تو آخری شکل یہی ہوگی کہ ایک حصہ موافق ہوگا دوسرا مخالف ہوگا۔

بھاوے جی اگر واقعی ایک خدا کے قائل ہیں تو انھیں بلا کسی تذبذب کے اس حقیقت کا اظہار کرنے میں کسی قسم کا عار یا تکلف محسوس نہ کرنا چاہیے کہ کمیونزم کی خدا دشمنی ہی خدا پرستوں کے لیے اس سے اختلاف کا سبب بن گئی ہے۔

آگے چل کر چوتھا پہلو جو ہمارے سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ بہت جلد مذہب اور سیاست کو جگہ خالی کرنی ہوگی۔ حیرت ہے کہ بھاوے جی نے نہ جانے کن تخیلات کی دنیا میں کھو کر ایک ایسی بات کہہ دی جس کا حقیقت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اگر بھاوے جی کا یہ مطلب ہے کہ دنیا سے جھوٹے مذاہب کا یک لخت خاتمہ ہو جائے گا یا ہو جانا چاہیے تو یہ بات واقعی بڑی وزنی ہوتی لیکن موصوف کا یہ کہنا کہ دنیا کو اب کسی مذہب کی ضرورت نہیں ہے بہت ہی تعجب انگیز ہے۔ مزید یہ کہ اب دنیا مذہب اور سیاست سے کنارہ کش ہو کر سائنس اور روحانیت کی علمبردار بن جائے گی، یہ بھی انتہائی مضحکہ خیز خیال ہے۔ سائنس کی ترقی سے کون انکار کر سکتا ہے۔ سائنس یقیناً ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے اور آئندہ بھی طے کرتی رہے گی لیکن یہ سمجھنا کہ سائنس کے اصول مذہب کے اصولوں سے ٹکرائیں گے یا مذہب سائنس کی ترقی میں حائل ہوگا صحیح نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں جھوٹے مذاہب جو توہمات اور خرافات پر مبنی ہوں جو پہاڑوں کو اور دریاؤں کو، ذی روح کو اور غیر ذی روح کو، چاند اور ستاروں کو اپنا خدا تسلیم کرتے ہیں

وہ مذاہب سائنس کے انکشافات کے آگے واقعی دم توڑ رہے ہیں اور آئندہ بالکل ختم ہو جائیں گے لیکن ان حالات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ دنیا میں کوئی مذہب باقی ہی نہ رہے گا کوئی صحیح نتیجہ نہ ہوگا۔ خدا کی کائنات جب تک موجود ہے اس میں خدا کا قانون برابر چلتا رہے گا اور اس کی حقانیت سائنس کے انکشافات سے کبھی متصادم نہ ہوگی بلکہ حقیقت شناس نگاہیں کارخانۂ قدرت کی حیرت انگیز پیچیدگیوں کو دیکھ کر اس کی عظمت اور عظیم الشان حکمت کی معترف ہوتی جائیں گی۔

۵۔ بھاوے جی کے بیان کا پانچواں نقطۂ نظر انتہائی گمراہ کن ہے۔ موصوف خدا کو مانتے ہیں لیکن صرف ایسے خدا کو جو انسانوں سے محبت کرنا جانتا ہو مگر ان کی رہنمائی کے لیے کوئی قانون اور کوئی ضابطۂ حیات دینا نہ جانتا ہو۔ دنیا کی تاریخ کا اگر بھاوے جی گہری نظر سے مطالعہ کرتے تو یہ حقیقت کھل کر موصوف کے سامنے آجاتی کہ دنیا میں جتنی بھی تحریکیں چلی ہیں اور جتنے بھی دستور نافذ ہوئے ہیں اگر ان کی تشکیل انسانی دماغ نے کی ہے تو وہ نافذ ہونے کے بعد بہت جلد صفحۂ ہستی سے مٹ گئے اور اگر مٹے نہیں تو ان کی ہیئت ہمیشہ بدلتی رہی اور انھیں کبھی سکون نصیب نہ ہوا۔ اس کے برخلاف ایسی تحریکیں اور ایسے دستور جو خدا کے بھیجے ہوئے قوانین کی بنا پر تشکیل پاتے رہے ہیں ان میں انصاف پسندی اور حق شناسی اور انسانی محبت کا جذبہ زیادہ کارفرما رہا ہے۔ ان تحریکوں کے چلانے والے اور ان دستوروں کو نافذ کرنے والے جب تک خدائی ہدایات پر گامزن رہے ان کی معیشت اور ان کی سیاست، ان کی معاشرتی اور روحانی زندگی ایک بہترین قسم کا سماجی ڈھانچہ تیار کرنے میں کامیاب رہی۔

بھاوے جی ایک بار پھر غور فرمائیں کہ اگر خدا دنیا کے انتظامات سے بے نیاز ہو کر انسانوں کے نفسانی خواہشات پر اسے چھوڑ دے تو کیا واقعی دنیا کا نظم ٹھیک طور پر چل سکتا ہے؟

آگے چل کر بھاوے جی نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ خدا تمام انسانوں سے محبت کرتا ہے یہاں تک کہ کمیونسٹ خدا کے باغی اور منکر ہیں وہ بھی اس محبت سے محروم نہیں ہیں۔ بھاوے جی نے محبت سے مراد اگر اللہ کی وہ رحمت لی ہے جس کے جلوے ہر طرف دکھائی دے رہے ہیں تو یہ ایک ایسی حقیقت انھوں نے بیان کی ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا یہ اس کی رحمت ہی ہے کہ ہوا کی آکسیجن، سورج کی روشنی اور حرارت، بادلوں کی آب رسانی زمین کی روئیدگی، دھاتوں کے طبعی اور کیمیاوی خواص سب کے لیے عام ہیں ان سے تمام انسان فائدہ اٹھاتے ہیں خواہ وہ خدا کے ماننے والے ہوں یا اس سے منکر اور باغی ہوں، خواہ وہ اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارتے ہوں یا اس کے قانون کے خلاف چلتے ہوں۔ اللہ کی حکومت میں اللہ کی رحمت عام ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی سلطنت

میں رہنے والے کمیونسٹ بھی اس کی رحمتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اگرچہ ان کا نظریۂ کائنات خدا کے وجود کا قطعی طور پر منکر ہے لیکن اگر بھاوے جی کی مراد محبت سے، محبت ہی ہے جیسے ایک ماں کو اپنے بچوں سے اور ایک بادشاہ کو اپنی فرماں بردار رعایا سے ہوتی ہے تو یہ بات کہہ کر بھاوے جی نے خدا کی انصاف پسندی پر معاذاللہ بہت بڑا الزام لگایا ہے۔ خدا کے باغی خدا سے بغاوت کر کے خدا کی مرضی کے خلاف دنیا میں سب کچھ کرتے پھریں اور وہ بجائے سزا کے محبت کے مستحق قرار دیے جائیں یہ عجیب قسم کی منطق ہے جو بظاہر معصیت میں ڈوبی ہوئی دنیا کو بڑی دل کش نظر آتی ہے مگر تاریخ گواہ ہے کہ یہ نظریہ انتہائی خطرناک قسم کے اثرات رکھتا ہے یہی وہ نظریہ ہے جس نے عیسائی خانقاہوں کو معصیت کا اڈہ بنا دیا۔ یہی وہ نظریہ ہے جو ہر اسلامی سلطنت کی تباہی کا سبب بنتا رہا ہے۔ یہی وہ نظریہ ہے جو آج بھی چند مخصوص قسم کے مذہبی گروہوں کو جنت کا ٹھیکہ دار بنائے ہوئے ہے اور یہی وہ نظریہ ہے جو لادینی تحریکوں کو وجود میں لانے کا باعث بنا۔ ونوباجی اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان کا نظریہ دنیا میں محبت اور سکون کی زندگی پیدا کرے گا تو یہ بات غیر فطری ہونے کی وجہ سے کبھی کامیاب نہ ہو سکے گی

ساتواں نقطہ نگاہ یہ کہ دنیا میں انقلاب محبت اور رحم کے ذریعہ آسکتا ہے بظاہر بڑا دل کش اور دل آویز معلوم ہوتا ہے لیکن انسانی فطرت کتنی ہی نیک سہی لیکن اس میں جرائم کی طرف مائل ہونے والا رجحان بھی پوشیدہ ہے یہ رجحان محبت اور رحم کے جذبات کے ساتھ ایک حد تک روکا جا سکتا ہے لیکن کبھی کبھی اس بات کی بھی ضرورت پڑتی ہے کہ کہنہ مشق چوروں کے ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ سماج میں بے حیائی اور بدکاری کی سڑاند پیدا کرنے والے افراد کو پتھر مار کر ہلاک کیا جائے۔ ہٹلری منصوبے کو روکنے کے لیے اگر مسٹر چرچل داہنے رخسار کے ساتھ ساتھ بایاں رخسار بھی پیش کر دیتے تو آج لندن کے پارلیمنٹ ہاؤس پر نازی پرچم لہراتا ہوتا۔ آج اگر چین کے معاملے میں اسی قسم کا مشورہ دیا جائے تو کیا واقعی پیکنگ کے جارحانہ اقدامات رک جائیں گے۔ اس لیے ضروری ہے کہ انسانوں کے دل و دماغ پر اللہ تعالیٰ کی شان رحیمی کے تصور کے ساتھ ساتھ اس کی جباریت اور قہاریت کا تصور بھی پوری طرح مرتسم کر دیا جائے۔

بھاوے جی کی سادہ زندگی غریب انسانوں کے ساتھ ان کی محبت، اس بڑھاپے میں ان کا پیدل سفر، ان کی معمولی غذائیں اور پھر محنت جانفشانی واقعی دنیا کی تاریخ میں ان کے لیے ایک اونچا مقام پیدا کر دیں گی۔ مگر بہتر یہ ہوتا کہ وہ ساری کوشش اس خدا کے نظام کو نافذ کرنے میں صرف کرتے جس کو وہ مانتے ہیں اور

جس سے ان کو محبت ہے۔ زمین والوں سے زمین کے عطیے لینا اور غریب انسانوں میں تقسیم کر دینا حقیقت میں بڑا عمدہ کام ہے مگر اس جد و جہد کے ذریعے جس انقلاب کا وہ تصور کر رہے ہیں وہ قطعی طور پر ناممکن معلوم ہوتا ہے۔ یہ کاوشیں اس خوبصورت عمارت کی طرح ہیں جو کمزور بنیادوں پر بننے کے بعد بہت جلد منہدم ہو جائے گی۔ بھاوے جی سے ہماری درخواست ہے کہ وہ خدا کی بھیجی کتاب قرآن پاک کا پھر ایک بار گہرا مطالعہ کریں اور غور فرمائیں کہ الٰہی نظام اور انسان کے بنائے ہوئے نظام میں کتنا بڑا فرق ہے۔

اس تبصرے کے اختتام پر چند باتیں کچھ اپنے بارے میں بھی سوچ لی جائیں تو نامناسب نہ ہوگا تاکہ اندازہ ہو سکے کہ تحریک اسلامی کے علمبرداروں میں کس حد تک تحریکیت موجود ہے اور اگر تحریکیت واقعی سرد پڑ رہی ہے تو اس میں حرارت پیدا کرنے کی کون سی تدبیر اختیار کی جائے۔

کسی کی کاوشوں پر تبصرہ کر دینا اور اس کی سرگرمیوں کو نقش بر آب قرار دینا بہت آسان ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے ایمان اور ایقان کا عملی مظاہرہ کر کے یہ دکھائیں کہ دنیا کے مسائل اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کس طرح حل ہو سکتے ہیں۔ دوسری تحریکوں کے علمبردار جنگلوں اور بیابانوں کے دشوار گزار راستے طے کریں لو دھوپ کے تھپیڑوں کا اور بارش کے طوفانوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں۔ فاقے کی نوبت آئے تو ملتھے پر شکن نہ پڑے۔ موت کا سامنا ہو تو مسکرا کر آگے بڑھیں اور اپنی متاعِ حیات قربان کر دیں۔ لیکن وہ لوگ جو تحریک اسلامی کے علمبردار ہیں جو قرآن کی حیات افروز تعلیمات اپنے سینوں میں لیے ہوئے ہیں وہ لوگ جو حضور سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی عالمگیر قیادت پر فخر کرتے ہیں وہ آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ طوفانوں کا تصور کر کے سہم جائیں۔ شکم پروری کا احساس انھیں آگے بڑھنے سے روک دے۔

کاش ہم پھر ایک بار اپنے بارے میں سوچیں کہ ہم کیا ہیں اور ہمیں کیا ہونا چاہیے۔

ہفت روزہ **طلوع** بمبئی

کا نمبر بین الاقوامی سیاست

- جو ایک اہم تاریخی دستاویز ہے
- جو بین الاقوامی سیاست کا گہرا تجزیہ پیش کرتا ہے
- جو ابھرتی ہوئی خدا پرستانہ سیاست کا تعارف کراتا ہے۔

صفحات ۲۷۲۔ قیمت فی جلد دو روپے ۵۷ نئے پیسے۔ ۱۲ روپے سالانہ چندہ دے کر خاص نمبر مفت حاصل کیا جا سکتا ہے ــــ دفتر ہفت روزہ طلوع ۳۱ مولانا آزاد روڈ بمبئی ۸
پاکستانی خریدار اپنی رقم ماہنامہ "عفت" اچھرہ لاہور کو روانہ کر کے ہمیں مطلع کریں۔

رسائل و مسائل

عَلَيْهُ اللّٰهَ کی توجیہ

سوال

سورۂ فتح کی آیت نمبر ۱۰ کا ایک ٹکڑا یہ ہے :- وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ غالباً پورے قرآن میں اسی ایک مقام پر علیہ کی ہا کو ضمہ ہے باقی ہر جگہ اس کی ہا مکسور ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ عرصہ سے اس سلسلے میں ذہنی الجھن ہے۔ امید ہے کہ آپ اسے دور کرنے کی کوشش کریں گے۔

جواب

علیہ کے ضمہ کی توجیہ سے پہلے چند باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے

اس سوال کا تعلق قرآن کریم کی قرأت اور نحوی قواعد سے ہے' اس سے معنی میں کوئی فرق نہیں پڑتا اس لیے ذہنی الجھن کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مستند تفسیروں میں اس پر سرے سے کوئی اشارہ تک موجود نہیں ہے۔ دوسری یہ بات آپ کے علم میں آنی چاہیے کہ جمہور قرار کی قرأت میں یہاں بھی علیہ کی ہا کو حسب قاعدہ کسرہ ہی ہے۔ ضمہ صرف حفصؒ کی قرأت میں ہے اور قرآن پر اعراب لگانے میں اسی کو اختیار کر لیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس جگہ بھی علیہ کو زیر کے ساتھ پڑھنا صحیح اور درست ہے۔ ہا کو ضمہ کے ساتھ پڑھنا ضروری اور واجب نہیں ہے۔ ہاں اولیٰ اور انسب ضرور ہے۔

اب صرف اس بات کی توجیہ و توضیح ہونی چاہیے کہ اعراب لگانے میں جمہور قرار کی قرأت کو ترک کر کے یہاں قرأت حفص کو ترجیح کیوں دی گئی ہے۔ علامہ آلوسی نے اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھا ہے کہ میں نے وقت کے بڑے بڑے علمار سے علیہ کے ضمہ کی وجہ پوچھی لیکن کسی نے تشفی بخش جواب نہیں دیا۔ انھوں نے بطور خود اس کی توجیہ

میں چند اشارات کیے ہیں۔ راقم الحروف جو کچھ لکھے گا وہ متعدد تفسیروں کے اشارات کی توضیح ہوگی۔
قرأت اور نحوی قاعدوں کی بحث بڑی خشک علمی وفنی بحث ہوتی ہے لیکن آپ کے سوال کے پیش نظر اس کے بغیر چارہ نہیں۔ میں اختصار کے ساتھ وضاحت کی کوشش کروں گا۔

اس سلسلے میں سب سے پہلی بات جو ذہن نشین رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ پورے قرآن میں علیہ کے بعد اسم جلالۃ اللہ غالباً صرف اسی جگہ ہے اور یہی خصوصیت ہے جس کی بنا پر یہاں علیہ کی ہا پر ضمہ لگایا گیا ہے۔ اب اصل بحث ملاحظہ ہو۔

عربی زبان میں واحد مذکر غائب کی ضمیر کے لیے اصلاً ھو کا لفظ وضع کیا گیا ہے، یہ ضمیر منفصل ہے، چونکہ ہر جگہ ضمیر منفصل کا استعمال باعثِ طوالت ہوتا اس لیے اس کو لفظ کے ساتھ جوڑ کر استعمال کرنے کے قواعد بھی بنائے گئے، آپ کسی حرف یا کسی اسم کے ساتھ ایک ضمیر متصل دیکھتے ہیں جیسے لَہٗ اور فعلُہٗ یہ درحقیقت وہی ھو کی ضمیر واحد مذکر غائب ہے جس کے واو کو حذف کرکے کسی حرف یا اسم کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ واو کو حذف کرنے کے بعد جو حرف باقی رہتا ہے اس پر ضمہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنی اصل کے لحاظ سے اس ضمیر پر پیش ہی ہوتا ہے زیر نہیں ہوتا۔
اگر اس اصل کو باقی رکھا جائے تو علیہ کی ہا پر ضمہ ہی ہونا چاہیے لیکن ایک دوسرے نحوی قاعدے کی بنا پر اس اصل میں تبدیلی پیدا کر دی گئی ہے وہ نحوی قاعدہ یہ ہے کہ جب ہا سے پہلے کا حرف مکسور ہو یا اس سے پہلے حرف یا ہو تو ہا کو بھی کسرہ دیا جائے گا جیسے بِہٖ اور اِلَیْہِ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حرف مکسور کے بعد یا حرف یا کے بعد ضمہ ثقیل ہوتا ہے۔ زبان کے اس ثقل اور بوجھ کو ہٹانے اور لفظ کو رواں کرنے کے لیے اس کو زیر دیتے ہیں۔ آیت زیر بحث میں اسی قاعدے کی وجہ سے جمہور قرا علیہ کی ہا کو مکسور پڑھتے ہیں لیکن امام القرا حفصؒ نے یہاں[1] اس تبدیلی کو ترک کرکے ہا کی اصل حرکت پیش کو باقی رکھا ہے۔ اس کی چند وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ ہا کو اللہ کے لام میں ملا کر پڑھنے سے ثقل باقی نہیں رہتا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ہا کو پیش کے ساتھ پڑھنے میں اسم جلالہ "اللہ" کی تفخیم کا فائدہ ہوتا ہے اور اسم ذات کی قرأت میں تفخیم اس کی ترقیق سے بہتر ہے۔ اسم ذات اللہ کی قرأت میں تفخیم اور ترقیق کا قاعدہ یہ ہے کہ جب اس اسم سے پہلے زبر یا پیش ہو تو اسے تفخیم کے ساتھ پڑھا جائے اور جب زیر ہو تو ترقیق کے ساتھ پڑھا جائے۔ (تفخیم اور ترقیق کے ساتھ پڑھنے میں کیا فرق ہوتا ہے اس کو کسی قاری سے سن کر سمجھ لیا

---

[1] ایک اور مقام پر بھی انھوں نے ہا کے اصلی ضمہ کو باقی رکھا ہے۔ سورۂ کہف میں وہ وَمَآ اَنْسٰنِیْہُ میں ہا کو ضمہ کے ساتھ پڑھتے ہیں اور جمہور قرا کسرہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

جائے) علیکما اللہ کے ہار پر ضمہ کی یہی دوسری وجہ سب سے بڑی وجہ ہے اور اسی کی طرف امام بغوی اور دیگر مفسرین نے اشارہ کیا ہے تیسری وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں عہد کا ذکر ہے اور ہار کو اپنی اصل پر باقی رکھنے میں عہد کو اپنی حالت پر باقی رکھنے کا اشارہ نکلتا ہے یعنی جس طرح ہا کے پیش میں تبدیلی پیدا نہ کی گئی اسی طرح اللہ سے باندھے ہوئے عہد میں کوئی تبدیلی پیدا نہ کرنی چاہیے۔ اس نکتے کی طرف علامہ آلوسی نے اشارہ کیا ہے۔

یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر اس آیت میں علیہ کی ہا کو پیش کے ساتھ پڑھا جاتا ہے اور انہیں وجوہ سے اعراب لگانے میں ضمہ کو ترجیح دی گئی ہے۔ واللہ اعلم۔

تنگ دلی یا عالی ظرفی

سوال

حضرت حمزہؓ کے قاتل کے متعلق لکھا ہے کہ جب وہ مسلمان ہو کر دربار رسالت میں حاضر ہوئے تو آپ نے دریافت کیا تم وہی وحشی ہو؟ تمہیں نے حمزہ کو قتل کیا تھا؟ عرض کی، ہاں، اس پر حضور نے فرمایا کیا تم اپنا چہرہ چھپا سکتے ہو؟ ان کو اسی وقت باہر آنا پڑا اور پھر تمام عمر سامنے نہ جا سکے ـــــ اس سے دل میں کھٹک پیدا ہوتی ہے، جب وہ مسلمان ہو گئے تو حضور کا دل اسی طرح کشادہ ہونا چاہیے جیسا کہ دوسرے صحابہ کے لیے تھا اس میں تنگ دلی محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے صحابہ کے قاتل اور بھی تھے مگر آپ نے یہ امتیاز کسی کے قاتل کے ساتھ نہیں برتا پھر آخر ان کے ساتھ کیوں؟ یہ مانا کہ حضور کو آپ سے محبت تھی مگر محبت کا مطلب یہ نہیں کہ امتیاز برتا جائے۔ پھر ایک نبی۔ کیا کوئی ایسا شخص اپنے کو غیر محسوس نہیں کرے گا۔ یہ چند شبہات ہیں مجھے امید ہے کہ آپ میری رہنمائی فرمائیں گے۔

جواب

اس واقعہ سے آپ کے دل میں جو شبہات پیدا ہوئے اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس واقعہ سے متعلق تمام روایتیں آپ کے مطالعہ سے نہیں گزریں اور دوسری یہ کہ آپ کی نگاہوں سے انبیاء کرام علیہم السلام کی بشری اور شخصی حیثیت اوجھل ہو گئی ـــــ میں اختصار کے ساتھ پہلے حضرت حمزہ کی شہادت، حضرت وحشی کے اسلام اور حضور کے اظہار غم کی تفصیل پیش کرتا ہوں

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے قاتل کا نام وحشی بن حرب تھا اور وہ جبیر بن مطعم کے غلام تھے۔ غزوۂ بدر میں حضرت حمزہ نے طعیمہ بن عدی بن خیار (جو جبیر بن مطعم کا چچا تھا) کو قتل کیا تھا۔ جبیر نے وحشی سے کہا اگر تم حمزہ کو قتل کردو تو پھر آزاد ہو۔ وحشی کا اپنا بیان ہے کہ احد کی لڑائی میں میری شرکت کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں حمزہ کو قتل کروں۔ میں اس جنگ میں نہ خود قتل ہونا چاہتا تھا اور نہ مسلمانوں سے مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ گویا انھیں کفر واسلام کی کش مکش سے کوئی بحث نہ تھی۔ صرف اپنی ذات سے بحث تھی۔ اس خود غرضی کے ساتھ وہ اُحد کی لڑائی میں شریک ہوئے اور چھپ کر انھوں نے اپنا مخصوص ہتھیار، حربہ (ایک چھوٹا نیزہ) دور سے حضرت حمزہ پر پھینک مارا اور وہ شہید ہوگئے۔ ان کو شہید کرنے کے صلے میں وحشی کو آزادی ملی۔ وہ مکہ فتح ہونے کے بعد بھی مسلمان نہ ہوئے اور طائف بھاگ گئے۔ پھر جب طائف میں بھی اسلام پھیل گیا تو اپنی جان بچانے کے لئے شام یا کہیں اور بھاگ جانے کا ارادہ کیا۔ ان کے اس ارادے سے واقف ہوکر ایک شخص نے کہا، تم پر افسوس بخدا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کلمہ شہادت پڑھ لینے کے بعد کسی کو قتل نہیں کرتے۔ چنانچہ وہ طائف کے ایک وفد کے ساتھ مدینہ گئے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو وحشی کے آنے کی خبر دی گئی تو آپ نے فرمایا: "اسے چھوڑ دو۔ کیونکہ ایک شخص کا اسلام بھی میرے نزدیک ایک ہزار کافر کے قتل سے زیادہ پسندیدہ ہے۔ پھر جب وہ حضور کے سامنے گئے تو ان کے درمیان یہ بات چیت ہوئی۔ آپ نے پوچھا کیا تم وحشی ہو؟ میں نے کہا، ہاں۔ آپ نے پوچھا کیا تمہیں نے حمزہ کو قتل کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ہاں واقعہ یہی ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے حضرت حمزہ کو قتل کرنے کی کیفیت پوچھی اور انھوں نے ان کے قتل کرنے کی وہی داستان سنائی جو اوپر گزری۔ اس کے بعد وہ جملہ آتا ہے جس کی وجہ سے آپ کو شبہہ پیدا ہوا ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ آپ نے فرمایا۔ "کیا تم میری نظروں سے اپنا چہرہ ہٹا سکتے ہو؟ اس کے بعد ان کا اپنا بیان یہ ہے کہ میں باہر نکل آیا۔ بخاری شریف میں یہ نہیں ہے کہ پھر وہ حضور کی وفات تک آپ کے سامنے نہ گئے، ہاں دوسری کتابوں میں دو جملے اور آئے ہیں ایک کا ترجمہ یہ ہے کہ "میں خود اپنے کو آپ کی نظر سے بچائے رکھتا تھا" اور دوسرے جملے کا ترجمہ یہ ہے کہ "اپنی وفات تک آپ نے مجھے نہیں دیکھا" طبرانی کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے ان سے فرمایا تھا کہ:-

"جاؤ، پہلے تم لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے اب اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔"

بخاری کی روایت میں حضرت وحشی کا بیان ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوگئی اور مسیلمہ کذاب

مسلمانوں سے لڑنے کو نکلا تو میں نے کہا۔ میں ضرور مسیلمہ کے مقابلے میں جاؤں گا۔ شاید میں اسے قتل کرسکوں تو یہ حمزہؓ کے قتل کا بدلہ ہوگا۔ چنانچہ وہ اس کے مقابلے میں گئے اور جس طرح انھوں نے حربہ پھینک کر حضرت حمزہ کو شہید کیا تھا اسی طرح حربہ پھینک کر مسیلمہ کو قتل کیا۔ یہ ہے مختصراً اس واقعہ کی روداد۔ کیا اسے پڑھ کر بھی کسی کے دل میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تنگ دلی کا شبہہ پیدا ہوسکتا ہے؟ وحشی نے اسلام قبول کرنے سے پہلے انتہائی ادنیٰ درجے کے کردار کا ثبوت دیا تھا۔ ان کا کردار اس وقت ان انتہائی خود غرض قاتلوں سے مختلف نہ تھا جو کسی سے چند ٹکے لے کر ایسے شخص کو قتل کر دیتے ہیں جس سے ان کی کسی طرح کی دشمنی نہیں ہوتی۔ وہ صرف اپنی ذاتی غرض کے لیے بڑے سے بڑے اجتماعی نقصان کی پروا نہیں کرتے۔ انھوں نے ایک ایسے شخص کو دھوکے سے مار گرایا جو اسلامی جماعت کے ستونوں میں سے ایک ستون تھا جس سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق صرف رسول اور امتی ہی کا نہ تھا بلکہ نسب اور رشتے کا بھی تھا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلامی محبت کے ساتھ ایک اور محبت، اسلامی تعلق کے ساتھ ایک اور تعلق موجود تھا اور وہ مزید محبت نسبی رشتے کی طبعی محبت تھی، ایک ایسی شخصیت کے ایسے قاتل کے مقابلے میں آپ نے جس عالی ظرفی کا ثبوت دیا وہ صرف ان لوگوں سے ظہور میں آتی ہے جنھوں نے اپنی تمام محبتوں کو اللہ کی محبت میں گم کر دیا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے ان کے آنے کی خبر سنتے ہی فرمایا تھا: "اسے چھوڑ دو کیونکہ ایک شخص کا اسلام بھی میرے نزدیک ایک ہزار کافر کو قتل کرنے سے زیادہ پسندیدہ ہے۔"

ایک ایسی شخصیت کے قتل کی دل ہلا دینے والی داستان سنکر آپ کا صرف اتنا ارشاد کہ کیا تم اپنے آپ کو میری نظروں سے ہٹا سکتے ہو؟ پہاڑ جیسے صبر و تحمل کے بغیر ممکن نہیں۔ پھر یہ بھی دیکھیے کہ اوپر کے بیانات میں کہیں یہ بات موجود نہیں ہے کہ آپ نے ہمیشہ کے لیے ان سے اپنی نظروں سے دور رہنے کی خواہش کا اظہار کیا ہو۔ یہ خود حضرت وحشی کی اپنی ندامت تھی جس نے انھیں آپ کے سامنے جانے نہ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت وحشی کی پوری زندگی میں کہیں اس کا نشان نہیں ملتا کہ انھوں نے کبھی بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس جملے یا آپ کے کسی رویے کی شکایت کی ہو بلکہ خود ان کے اپنے بیان سے یہ بات ثابت ہے کہ اس جملے نے ان کو فائدہ پہنچایا۔ اسی کا اثر تھا جو انہیں اسلام کے شدید ترین دشمن کے مقابلے میں لے گیا اور ان کے ہاتھوں اس کے قتل کا کارنامہ انجام پایا ——— جب خود صاحب معاملہ کو اس جملے میں کوئی تنگ دلی محسوس نہ ہوئی بلکہ انھوں نے اسے اپنی زندگی کے لیے مشعل راہ بنا لیا تو ہمیں یا آپ کو آخر کس بنیاد پر تنگ دلی محسوس ہوتی ہے۔

آپ نے لکھا ہے:۔ "دوسرے صحابہ کے قاتل اور بھی تھے۔ مگر آپ نے یہ امتیاز کسی قاتل کے ساتھ نہیں برتا۔"

اولاً اوپر کی تفصیل سے معلوم ہوا کہ یہ جملہ قاتل حمزہ کے ساتھ کوئی ناروا امتیاز نہ تھا بلکہ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ طبعی غم کا ایک وقتی اظہار تھا جس نے حضرت وحشی کو نقصان پہنچانے کے بجائے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا۔ اکثر و بیشتر ایسا ہوتا رہتا ہے کہ جب ہمیں اپنے کسی عزیز سے بھی کوئی سخت تکلیف پہنچتی ہے تو ہم وقتی تاثر کے ماتحت کہتے ہیں۔ میری نظروں سے اپنا چہرہ ہٹاؤ، میری نگاہوں سے دور ہو جاؤ۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم اس سے ترکِ تعلق کر رہے ہیں یا ہمیشہ کے لیے اسے اپنے سے الگ کر رہے ہیں بلکہ مقصد صرف اظہار رنج و غم ہوتا ہے۔ ثانیاً آپ نے اس پر غور نہیں کیا کہ اس واقعہ کے سوا اس طرح کا کوئی دوسرا واقعہ کب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش ہوا، آخر کس صحابی کے کسی متعین قاتل نے آپ کے سامنے آکر داستان قتل سنائی اور آپ نے اظہار غم نہیں کیا، ایسا کوئی دوسرا واقعہ سرے سے گزرا ہی نہیں ہے اس لیے یہ شبہہ بالکل بے اصل ہے ـــــ اب تک جو باتیں عرض کی گئیں۔ میرا خیال ہے کہ وہی آپ کے شبہات کے ازالے کے لیے کافی ہیں لیکن میں شبہے کی دوسری وجہ کی طرف بھی محض ایک اشارہ کرتا ہوں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ آپ کی نگاہوں سے انبیاء کرام کی بشریت اوجھل ہو گئی۔ بشر ہونے کی وجہ سے انبیاء کرام پر بھی وہ طبعی جذبات غم اور جذبات مسرت طاری ہوتے تھے جو عام انسانوں پر طاری ہوتے ہیں۔ جس طرح ہم اور آپ اپنے کسی عزیز قریب کی موت یا قتل پر غیر رشتہ داروں کے مقابلے میں زیادہ غم و الم محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح انبیاء کرام بھی محسوس کرتے تھے اور جس طرح ہم پر اپنے مسلمان رشتہ داروں کے حقوق دوسروں کے مقابلے میں زیادہ ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء پر بھی ان کے حقوق زیادہ ہوتے تھے۔ اس لیے اگر حضور نے حضرت حمزہ کی شہادت پر زیادہ تکلیف محسوس کی تو یہ آپ کی بشریت کا ثبوت ہے اس سے آپ کی شانِ نبوت پر کوئی حرف نہیں آتا۔

اللہ کی کُنہِ ذات انسانی ادراک سے بلند ہے

سوال

ایک دن جبکہ میں دعوت اسلامی کے سلسلے میں اپنے خیالات ظاہر کر رہا تھا کہ ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا جب کوئی چیز بغیر کسی خالق اور موجد کے وجود میں نہیں آتی تو یہ بتائیے کہ خدا کا وجود کہاں سے آیا؟ خدا کا خالق کون ہے؟ میں نے یہ سوال سنکر ہاں ہوں کہہ کر خاموشی اختیار کی۔ بحمداللہ مجھے خود اس

بارے میں کوئی شبہ نہیں۔ میرے نزدیک سورۂ اخلاص اس سوال کا جواب ہے مگر سوال کرنے والے کو کیا جواب دیا جائے۔ کئی دن کی بے چینی کے بعد میں نے آپ سے خواہش ظاہر کی ہے۔ آخر ہم لوگ اس سوال کا کیا جواب دیں۔ آپ مناسب سمجھیں تو زندگی میں جواب شائع فرما دیں۔

جواب

آپ سے جو سوال کیا گیا ہے، اس نے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر ایک اور شہادت پیش کی ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قیامت تک پیش آنے والے بہت سے واقعات کی پیشین گوئی فرمائی ہے۔ ان میں سے ایک وہ ہے جس کا تعلق سائل کے سوال سے ہے۔ میں اس سے متعلق چند حدیثوں کا ترجمہ یہاں درج کرتا ہوں:۔

"حضرت انس رضی اللہ عنہ، حضورؐ سے روایت کرتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ اللہ فرماتا ہے۔ ہماری امت کے لوگ کہتے رہیں گے کہ اس چیز کو کس نے پیدا کیا، اس چیز کو کس نے پیدا کیا۔ یہاں تک کہ وہ کہیں گے کہ اللہ کو کس نے پیدا کیا؟"

اسی مفہوم کی کئی حدیثیں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہیں۔ ان میں اس وسوسے کا علاج بھی مذکور ہے۔ ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے:۔

لوگ ایک دوسرے سے سوال کرتے رہیں گے یہاں تک کہ کہا جائے گا: تمام مخلوقات کو اللہ نے پیدا کیا تو پھر اللہ کو کس نے پیدا کیا۔ جو شخص اس وسوسے میں مبتلا ہو اسے (تجدید ایمان کرتے ہوئے) کہنا چاہیے

اٰمَنْتُ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ (میں اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لایا)

بعض حدیثوں میں اس کا علاج یہ بتایا گیا ہے کہ اگر ایسا وسوسہ ہو تو شیطان کے شر سے پناہ مانگنی چاہیے اور بعض میں ہے کہ سورۂ اخلاص میں اس کا علاج ہے۔ ان حدیثوں سے معلوم ہوا کہ یہ سوال شیطانی وسوسہ اندازی کا اثر ہے۔ انسان کا وہ ازلی دشمن، اس طرح بھی ایمان کے خزانے پر ڈاکہ ڈالنا چاہتا ہے اس لیے اس کا علاج یہی ہے کہ مومن اپنے ایمان کو تازہ کرے اور شیطان رجیم کے شر سے اللہ کی پناہ ڈھونڈے۔ نظروں سے غائب دشمن سے وہی بچا سکتا ہے۔

اگر سائل مسلمان ہوں، جیسا کہ آپ کے انداز کلام سے معلوم ہوتا ہے تو انہیں یہ حدیثیں سنا دیجیے، ایک ایسے مسلمان کے لیے جو صدق دل سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھتا ہو یہ جان لینا کافی ہے کہ اس معاملے میں اللہ نے یہ فرمایا ہے اور اس کے رسول نے یہ فرمایا ہے۔ یہ جانتے ہی وہ سر تسلیم خم کر دیتا ہے اور اپنے عقیدہ

عمل کو درست کر لیتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سوال کا جو حل بتایا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ انسان اس سوال پر غور و فکر کرنا چھوڑ دے اس لیے کہ اس پر غور و فکر کے نتیجے میں وہ حیرانی کے سوا اور کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ چنانچہ بعض حدیثوں میں صراحت کے ساتھ یہ کہا گیا ہے کہ اگر کسی کو اس طرح کا وسوسہ ستائے تو وہ استعاذہ کرے اور اس پر غور و فکر کرنے سے رک جائے — آپ سائل پر واضح کیجیے کہ اللہ نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ بے حد و نہایت نہیں ہے بلکہ اس کی ایک مقررہ حد ہے جس سے آگے وہ خود نہیں بڑھ سکتی۔ اگر انسان کی عقل خود ہی تمام مسائل کو حل کر سکتی تو پھر نبوت و رسالت اور وحیِ الٰہی کی ضرورت ہی کیا ہوتی — میرے نزدیک اصولی طور پر اس سوال کا جواب یہی ہے لیکن مزید اطمینان کے لیے اس مسئلے کے ایک اور پہلو کی طرف اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ یہ بات تو آپ سے سوال کرنے والے صاحب تسلیم کرتے ہوں گے کہ وہ خود موجود ہیں اور یہ لمبی چوڑی دنیا بھی ان کی نگاہوں کے سامنے موجود ہے۔ اب اگر پیدا کرنے والے کا سوال کسی حد پر جا کر نہ رکے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ابھی انسان اور دنیا سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ کیونکہ جب تک کسی آخری پیدا کرنے والے کا وجود طے نہ ہو جائے یہ دنیا موجود کیسے ہو جائے گی۔ میں اس سلسلے میں خود انسان کو مثال میں پیش کرتا ہوں۔

سب جانتے ہیں کہ ہزاروں برس سے انسان، ماں اور باپ کے ملاپ سے پیدا ہو رہے ہیں۔ فرض کیجیے، میں زید سے پوچھتا ہوں کہ اس کے ماں باپ کون ہیں اور اس سوال کو آگے بڑھاتا ہوا آدمؑ تک پہنچتا ہوں اور سوال کرتا ہوں کہ بتاؤ حضرت آدمؑ کے باپ اور ماں کون تھے؟ کیا دنیا میں کوئی شخص اس کا قائل ہے کہ آدمؑ کے بھی کوئی باپ اور ماں ہے؟ اگر باپ اور ماں کے سوال کو آدم پر ختم نہ کیا جائے تو کسی آدمی کا وجود ہی ممکن نہیں۔ ہم آدم تک پہنچ کر باپ اور ماں کے سلسلے کو ختم کرنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح ہم عقلاً مجبور ہیں کہ اس پوری کائنات کی تخلیق کے سلسلے کو ایک ایسے وجود پر ختم کریں جس کا خالق کوئی نہ ہو۔ وہ خود سب کا خالق ہو۔ وہ سب کا خالق کیسے ہے اور کیوں ہے؟ یہ ایک ایسا سوال ہے جو ہماری عقل کی حد سے باہر ہے اس لیے کہ اس کیسے اور کیوں کو جان لینے کے معنی یہ ہیں کہ ہم اللہ کی کنہِ ذات کو جان لیں، حالانکہ اس کی ذات اس سے بلند ہے کہ ہماری عقل میں سما سکے۔ اسی مضمون کو اکبر الٰہ آبادی نے ایک مصرع میں یوں کہا ہے:

جو سمجھ میں آگیا پھر وہ خدا کیوں کر ہوا

خون دینے کا مسئلہ

سوال

علمائے ازہر (مصر) کا وہ فتویٰ آپ کی نظر سے ضرور گزرا ہو گا جس میں کہا گیا ہے کہ ایک اشتراکی کے جسم میں کسی مسلمان کا خون زندگی کو بچانے کے لیے نہیں دیا جا سکتا۔ مندرجہ بالا فتوے پر ہمارے چند رفقاء متردد ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی حیثیت کیا ہے؟ ماہنامہ زندگی میں اس پر روشنی ڈال کر اس خلجان کو دور کرنے کی کوشش کیجیے۔

جواب

میں نے علمائے ازہر کا فتویٰ اخباروں میں پڑھا تو تھا لیکن یہ یاد نہیں کہ ان کے فتوے کی دلیل کیا تھی؟ ان کے فتوے سے قطع نظر نفس مسئلے کے دو جزو ہیں۔ ایک یہ کہ جان بچانے کے لیے انسان کا خون کسی دوسرے انسان کے جسم میں داخل کرنا شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور دوسرا یہ کہ کوئی مسلمان کسی غیر مسلم کی جان بچانے کے لیے اپنا خون دے سکتا ہے یا نہیں؟ پہلے جزو کو فقہاء تداوی بالمحرمات والنجاسات کے ذیل میں بیان کرتے ہیں یعنی حرام اور نجس چیزوں کو دوا کے طور پر استعمال کرنا صحیح ہے یا نہیں؟ میں نے اس مسئلے میں اطمینان حاصل کرنے کے لیے از سر نو احادیث اور کتب فقہ کا مطالعہ کیا۔ دوا شراب یا دوسری حرام چیزیں استعمال کرنے کے مسئلے میں فقہاء و محدثین نے جو بحثیں کی ہیں انہیں پڑھنے کے بعد راقم الحروف نے جو رائے قائم کی ہے وہ یہ ہے:۔

(۱) عام حالات میں کسی حرام اور نجس چیز کو دواءً استعمال کرنا بھی جائز نہیں ہے اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کو دوا میں استعمال کرنے کی خصوصی ممانعت فرمائی ہے اور عمومی طور پر تمام حرام چیزوں سے علاج کی بھی نہی فرمائی ہے آپ کا ارشاد ہے: لَا تَدَاوَوْا بِحَرَامٍ (کسی حرام چیز سے علاج معالجہ نہ کرو۔)

(۲) حالتِ اضطرار میں یعنی جب کسی کی جان بچانے کا معاملہ پیش آجائے اور کسی حلال اور پاک ذریعے سے جان بچنے کی توقع نہ رہے تو حرام اور نجس چیزوں کا بقدرِ ضرورت استعمال جائز ہے اس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ جان بچانے کے لیے اللہ نے قرآن حکیم میں حرام چیزوں کو بطورِ غذا استعمال کرنے کی رخصت عطا فرمائی ہے تو ان چیزوں کو بطورِ دوا استعمال کرنے کی رخصت بھی اس سے نکلتی ہے اس کے علاوہ دو حدیثوں سے بھی اس کی رخصت نکلتی ہے ایک تو وہ مشہور واقعہ ہے جس میں آپ نے قبیلہ عرینہ کے چند افراد کو پیٹ کی بیماری میں اونٹوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا تھا

دوسری حدیث وہ ہے جس میں کھجلی کی بیماری سے صحت یابی کے لیے حضور ؐ نے حضرت زبیر و عبدالرحمٰن بن عوف کو ریشم پہننے کی اجازت دی تھی۔ زیر بحث مسئلہ بھی اسی رخصت کے تحت داخل ہے۔

مسئلے کے دوسرے جزو کا تعلق مرحمۃ و مواساۃ کے عام حکم سے جڑا ہوا ہے۔ عام حالات میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی مرحمۃ و مواساۃ کا مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے اس لیے کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ کسی اشتراکی یا کسی کافر کی جان بچانے کے لیے کوئی مسلمان اپنا خون کیوں نہیں دے سکتا؟ انسانی اخوت و ہمدردی کے میدان میں بھی مسلمان کو دوسروں سے آگے ہی ہونا چاہیے کیونکہ دوسرے تو صرف دنیا ہی کی بھلائی اور اجر کے لیے ہمدردی کے کام کرتے ہیں اور مسلمان اجر آخرت کا بھی امیدوار ہوتا ہے۔

"صاحب حال" کی کمی

میرے ایک دوست جماعت کے ہمدرد تھے اب کچھ سست پڑتے جا رہے ہیں۔ ان کا ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ جماعت میں "صاحب قال" بہت ہیں لیکن "صاحب حال" کی بہت کمی ہے۔ صاحب تقوی قسم کے لوگ تو شاید ہی ہوں۔ جب میں نے صاحب حال لوگوں کی تعریف اور معیار تقوی کے متعلق دریافت کیا تو وہ اس کے سوا کچھ نہ بتا سکے کہ یہ چیز بیان نہیں کی جا سکتی۔ بلکہ صرف محسوس کی جا سکتی ہے۔

جواب

جب آپ کے دوست یہ نہیں بتاتے کہ صاحب حال لوگ کیسے ہوتے ہیں اور تقوی کا معیار کیا ہے تو پھر ہمارے پاس انھیں مطمئن کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ بات بالکل صاف ہے کہ تقوی اور "حال" کے بارے میں ان کے ذہن میں کوئی تصور ضرور موجود ہے جس کی روشنی میں وہ جماعت کے اندر اس کی بہت کمی پاتے ہیں۔ انھیں اس تصور کو سامنے لانا چاہیے۔ تقوی اور متقین کے ذکر سے قرآن کریم بھرا ہوا ہے اس میں ان کی صفات واضح طور پر بتائی گئی ہیں اس کے علاوہ تقوی کے مدارج بھی متفاوت ہیں۔ اگر کسی کے ذہن میں متقین کی وہی صفات موجود ہیں جو قرآن میں پائی جاتی ہیں تو وہ آسانی سے نشان دہی کر سکتا ہے کہ فلاں شخص یا فلاں افراد میں وہ صفات موجود نہیں ہیں یا کم ہیں اور اگر قرآنی صفات کے علاوہ کچھ دوسری صفات اس نے ذہن میں رکھ لی ہیں جب بھی بتا سکتا ہے کہ فلاں باتیں جماعت کے افراد میں نہیں ہیں یا کم ہیں۔ محض یہ کہہ دینا کہ یہ چیز محسوس کی جا سکتی ہے بتائی نہیں جا سکتی عجیب بات ہے۔ فی الواقع اس چیز کو الجھن یا اعتراض سے تعبیر کرنا ہی صحیح نہیں۔ آپ اپنے دوست سے پھر پوچھیے اگر وہ نہ بتائیں تو دعا کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ دعا اس بات کی کہ ہمارے اندر وہ تقویٰ پیدا ہو جو اللہ کو مطلوب ہے اور دعا اس بات کی بھی کہ اللہ تعالیٰ آپ کے دوست کی بے چینی کو حقیقی لطف سے بدل دے۔

سید احمد قادری

تنقید و تبصرہ

چراغ راہ آزادی نمبر

ادارت:- خورشید احمد، محمود فاروقی۔ صفحات ۲۴۴۔ قیمت عہ
پچاس نئے پیسے۔ ملنے کا پتہ:- دفتر ماہنامہ چراغ راہ ۲۲۳ اسٹریچن روڈ کراچی

ماہنامہ چراغِ راہ کراچی، تحریک اسلامی اور تحریک ادب اسلامی دونوں کے لیے اسم بامسمّٰی ہے اور اپنی ایک روشن تاریخ رکھتا ہے۔ ڈیڑھ سال کی جبری بندش کے بعد تقریباً ڈھائی سو صفحات کا آزادی نمبر لے کر پھر شائع ہوا ہے۔ خورشید صاحب نے "بندش سے رہائی تک" کی داستان قلمبند کر دی ہے۔ یہ داستان بڑی عبرت انگیز ہے۔ نظریہ پاکستان نمبر کی اشاعت اس وقت کی فوجی حکومت کے "ناصیۂ عدل" پر غیظ و غضب کی شکن بن گئی اور اس نے اس کے ڈیکلریشن کی توثیق سے انکار کر دیا۔ ابھی عدالتوں نے کچھ نہ کچھ اپنا بھرم قائم رکھا ہے۔ اس لیے وہاں کی عدالتِ عالیہ نے حکومت کے فیصلے کو منسوخ قرار دے کر ڈیکلریشن کی توثیق کر دی۔ —— حسب معمول یہ نمبر بھی قیمتی مندرجات سے آراستہ ہے۔ اس نمبر کے ایک مقالہ "فرائضی تحریک" نے مجھے چونکا دیا۔ اس لیے کہ میں اس تحریک سے واقف نہ تھا لیکن پورا مقالہ پڑھ جانے کے بعد تعجب ہوا کہ ایک ایسی غیر معروف تحریک کا تعارف کراتے ہوئے مقالہ نگار نے حوالے دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ اگر واقعی یہ تحریک وہی کچھ تھی جو مقالہ نگار نے دکھائی ہے تو انہیں [illegible] تاریخی حوالوں سے اس پر روشنی ڈالنا چاہیے۔ "جنگ آزادی کی اہم شخصیات" کے زیر عنوان مولانا ابوالکلام آزاد کا ذکر جس انداز سے کیا گیا ہے [illegible] اچھا تھا [illegible] یہ مقالہ بھی بہت نامناسب ہے [illegible] یہ نمبر لائبریریوں میں محفوظ رکھنے کے لائق ہے۔ [illegible]

اقبال کا نظریۂ اخلاق

از سعید احمد رفیق ایم اے۔ پروفیسر گورنمنٹ کالج [illegible]
کتابت و طباعت اوسط۔ قیمت [illegible]

علامہ اقبال پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا [illegible]

خواص اہل علم میں بھی ایک بلند مقام رکھتی تھی وہ اپنے ذہن رسا، عقل و فہم اور قدیم و جدید علوم کے گہرے مطالعہ کی وجہ سے فکر و فن کی کوہ پیکر شخصیت بن گئے تھے۔ انھوں نے اپنے اس مطالعے کو اپنی نظم و نثر میں پھیلا دیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ ان کی شاعری ایک ایسا کوہ نور بن گئی ہے جس کے ہزار پہلو ہیں اور ہر پہلو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں فاضل مرتب نے اصلاً ان کا نظریہ اخلاق پیش کیا ہے اور ضمناً ان کے دوسرے نظریات پر بھی روشنی ڈالی ہے اس لیے ان کی یہ مختصر کتاب اقبال کو سمجھنے کا ایک اچھا وسیلہ بن گئی ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے مجموعی حیثیت سے اقبال کو صحیح سمجھا ہے اور سلجھے ہوئے انداز میں اپنے نتائج فکر پیش کیے ہیں۔ وہ اقبال کو سمجھنے میں غلطی سے کس طرح بچے اس کا سبب انہیں کے الفاظ میں دیکھیے:۔

> "کسی مفکر کے افکار و نظریات کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس کے ایک ایک نظریہ پر جداگانہ حیثیت سے نظر ڈالنے کے علاوہ اس کے تمام نظریات اور افکار کا بحیثیت مجموعی بھی مطالعہ کریں۔ ایک نظریہ کو دوسرے نظریات کی روشنی میں سمجھیں اور ان تمام خیالات اور افکار کو ایک منظم اور مربوط شکل دینے کی کوشش کریں۔ بصورت دیگر ان نظریات میں ہمیں کہیں ابہام نظر آئیگا اور کہیں تضاد۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ کسی شخص کو اس کے پورے نظام فکر سے اختلاف ہو۔ بہر حال منطقی طور پر یہ ناممکن ہے کہ ایک منظم اور مربوط نظام فکر کے کچھ اجزاء قابل قبول ہوں اور دوسرے شرف قبولیت پانے سے محروم ۔ ایک مربوط نظام فکر ایک ایسی عمارت ہے کہ اس کی کسی ایک اینٹ کو بھی اس کی جگہ سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔ ہٹانا تو درکنار جنبش بھی نہیں دی جاسکتی۔ اور اگر ایسا کرنے کی ناکام کوشش کی جائے تو وہ تمام عمارت ملبہ کا ایک ڈھیر بنکر رہ جاتی ہے" (ص ۲)

فاضل مرتب کی یہ عبارت بہت ہی قابل قدر ہے اور کسی منظم و مربوط نظام فکر و عمل کے فہم اور اس کے اخذ و ترک کے بارے میں منصفانہ اور صحیح نقطۂ نظر پیش کرتی ہے۔ کاش اسلام اور سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نظام فکر و عمل کو سمجھنے اور اس کے اخذ و ترک میں بھی یہی نقطۂ نظر اختیار کیا جاتا۔ اقبال کے نظام فکر کا ربط و نظم حضور ہی کے نظام فکر و عمل کا خوشہ چین ہے لیکن افسوس کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد اسلامی نظریۂ حیات اور اس کے نظام فکر و عمل کے فہم اور اخذ و ترک میں اس نقطۂ نظر کی پیروی نہیں کر رہی ہے بلکہ اس عمارت کی بہت سی اینٹوں کو اپنی جگہوں سے ہٹا کر اسے ملبہ کا ایک ڈھیر بنائے دے رہی ہے۔ اقبال کو سمجھنے سمجھانے میں بھی کتنے ہی لوگ ہیں جو اس نقطۂ نظر کو ترک کر کے اپنے ساتھ ساتھ انہیں بھی فکری و نظری

متضاد وادیوں میں بھٹکانے کی سعی کرتے رہتے ہیں۔ فاضل مرتب نے چونکہ صمیم لفظ نظر اختیار کیا ہے اس لیے اقبال کے بارے میں وہ الجھاؤ اور ژولیدگیٔ فکر سے محفوظ رہے ہیں لیکن اس ملک میں جہاں سے یہ کتاب شائع ہوئی ہے اسلامی مسائل میں اجتہاد و تجدید کی ترنگ چھائی ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ اجتہاد و تجدید وہی تقلید فرنگ ہے جس کے خلاف اقبال بار بار متنبہ کرتے رہے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ یہ ترنگ مصطفےٰ کمال کی ترنگ تک ترقی کرے جس کے بارے میں اقبال نے لکھا تھا۔

ترک را آہنگ نو در چنگ نیست   تازہ اش جز کہنۂ افرنگ نیست

سینۂ او را دمے دیگر نبود   در ضمیرش عالمے دیگر نبود

اس کتاب میں متعدد مقامات پر اقبال کی نثر کے ایسے پیراگراف نقل کیے گئے ہیں جو ایمان میں تازگی پیدا کرتے ہیں

"اسلام دوسرے مذاہب کی طرح ایک مذہب نہیں بلکہ ایک دین ہے۔ ایک نظام زندگی ہے۔ معاشرے کے قیام اور استحکام کے اصولوں کا مجموعی نام ہے۔ اس معاشرے کے وجود کا انحصار رسول اقدس کی ذات مبارک پر ہے اور یہی وہ ہستی کامل ہے جس نے منتشر افراد کے بے ربط گروہ کو ایک منظم ملت بنا دیا۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین کے خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت کے رسول کریم کی شخصیت کا مرہون منت ہے۔" (صفحہ ۱۹۵)

خالص اسلامی عقائد سے متعلق ایک مبحث اس کتاب میں واضح نہیں ہو سکا ہے۔ حیات بعد الممات کے متعلق اقبال کا عقیدہ یقیناً وہی ہوگا جس کی تعلیم کتاب و سنت نے دی ہے لیکن اس کتاب میں یہ بحث تشنہ اور مبہم رہ گئی ہے مثال کے طور پر اقبال کی یہ عبارت:۔

"حیات بعد الموت ممکن الوقوع ہے نہ کہ لازمی اور ضروری۔ اس ممکن الوقوع شے کو حقیقت میں تبدیل کرنے کے لیے فرد کو جد و جہد کرنی پڑتی ہے۔ بغیر جد و جہد اور عمل کے نہ خودی کا استحکام ممکن ہے اور نہ حیات بعد الموت۔" (صفحہ ۲۱۳)

یہ عبارت الجھن پیدا کرتی ہے اور پوری بحث پڑھ کر بھی یہ الجھن دور نہیں ہوتی۔ ضرورت ہے کہ فاضل مرتب اس پر وضاحت سے لکھیں ـــــ اس کتاب کے تمام مندرجات سے تبصرہ نگار کو اتفاق نہیں ہے لیکن یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ کتاب اقبال کو صحیح طور پر سمجھنے کی ایک راہ پیدا کرتی ہے اور بہر حال مفید ہے۔

الاتقان فی علوم القرآن حصہ اول (اردو)

ترجمہ مولانا محمد حلیم انصاری، تصحیح و نظرثانی مولانا محمد عبدالحلیم چشتی، صفحات ۔ کاغذ، کتابت، طباعت عمدہ ۔ مجلد مع گرد پوش ۔ قیمت بارہ روپے ۔ ناشر: نور محمد کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی

الاتقان فی علوم القرآن ۔ علامہ سیوطیؒ کی مشہور و معروف کتاب ہے ۔ زیر تبصرہ کتاب اس کے نصف کا ترجمہ ہے ۔ اصل کتاب کے ترجمہ سے پہلے مولانا عبدالحلیم چشتی فاضل دارالعلوم دیوبند کا ایک رسالہ "علوم قرآن اور الاتقان" کے عنوان سے شامل کتاب ہے ۔ یہ رسالہ بڑے سائز کے ۶۴ صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور قیمتی معلومات سے بھرا ہوا ہے ۔ اس رسالے میں کیا کچھ ہے اس کی اجمالی فہرست خود صاحب رسالہ کے الفاظ میں یہ ہے ۔

> تعارف کتاب سے قبل ہمیں اس امر پر روشنی ڈالنی ہے کہ علوم قرآن پر کام کا آغاز کب سے ہوا، تفسیر کا فن کیوں کر مدون ہوا اور اس کو کتابی شکل میں سب سے پہلے کس نے مرتب کیا، انواع علوم قرآن پر مستقل تصانیف کا سلسلہ کب سے شروع ہوا اور کن کن نامور ائمہ فن نے ان پر جداگانہ اور مستقل تصانیف کا سلسلہ کب سے شروع کیا ؟ انواع علوم پر بحیثیت مجموعی بحث کا آغاز کس عہد میں ہوا اور پھر عہد بعہد اس پر جن علماء نے قلم اٹھایا ان کو نام بنام گنایا اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ فن متاخرین کے زمانے میں کس طرح عروج کو پہنچا ۔ ہندستان میں کن کن علماء نے اس فن پر طبع آزمائی کی اور ان کے کام کی نوعیت کیا ہے ۔

اگرچہ ہر عنوان پر سیر حاصل گفتگو نہیں ہے کیونکہ یہ رسالہ محض الاتقان کے تعارف کے لیے لکھا گیا ہے ۔ اس کے باوجود اجمالی طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ بھی معلومات افزا ہے ۔ الاتقان جو علوم قرآن کا خزانہ ہے اس پر تبصرے کا یہ موقع نہیں ۔ تبصرہ نگار پوری کتاب پڑھ بھی نہیں سکا ہے ۔ اصل عربی سے ملا کر ترجمہ دیکھنے کی نوبت بھی نہیں آئی لیکن اندازہ یہ ہے کہ ترجمہ صحیح ہوگا ۔ ترجمہ پڑھتے ہوئے کہیں طبیعت میں کھٹک پیدا نہیں ہوئی ۔

رسولِ عربیؐ

تالیف: مولانا فرید الوحیدی صاحب فاضل دیوبند ۔ ایم ۔ اے علیگ ۔ ایڈیٹر علیگ ۔ شائع کردہ: قومی کتاب گھر ۔ دیوبند ضلع سہارنپور ۔ ٹائٹل دیدہ زیب ۔ کاغذ عمدہ صفحات ۱۱۲

سیرت رسول پاکؐ پر یہ کتاب مولانا فرید الوحیدی صاحب نے بچوں کے لیے تیار کی ہے ۔ کتاب کا ہندی ایڈیشن جناب کے پیش نظر ہے ۔ ہندی ترجمہ جناب کو فرید دانی صاحب مدیر کانتی رامپور نے کیا ہے ۔ کتاب کی بابت

سادہ اور آسان ہے۔ کتاب کو زیادہ دلچسپ بنانے کے لیے چند نظمیں بھی اس میں شامل کر دی گئی ہیں۔
سیرت رسول پاک سے متعلق حالات اور واقعات کو تینتیس ۳۳ مختلف عنوانات کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ یہ
گویا اس کتاب کے تینتیس اسباق ہیں جو بچوں کو یاد کرنے ہیں۔ اسباق کو ذہن نشین کرانے کے لیے ہر سبق کے
آخر میں بچوں سے کچھ سوالات بھی کیے گئے ہیں۔ بچوں کی سہولت کے پیش نظر ہر سبق کے شروع میں سبق کے مشکل
الفاظ بھی دے دیے گئے ہیں۔ اس چھوٹی سی کتاب میں مؤلف نے بہت ساری معلومات جمع کر دی ہیں۔
بچوں کے علاوہ دوسرے کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی ان شاء اللہ تعالیٰ یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

زیر نظر کتاب میں بعض قابلِ اصلاح باتیں بھی نظر آئیں جن کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مولانا نے
فتح مکہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"پیارے بچو! تمھیں یاد ہو گا کہ ایک دن حضورؐ اسی مکہ سے رات کو چھپ کر نکلے تھے۔ راستہ
میں تین دن چھپے رہے۔ دشمنوں نے آپؐ کے قتل کی سازش کر رکھی تھی۔ آج اسی مکہ میں آپؐ فخر کے
ساتھ داخل ہو رہے تھے۔"

یہ فخر کے ساتھ داخل ہونے کی بات کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتی۔ مکہ میں آپ کا داخلہ تو آپؐ کی زندگی
کے ان اہم واقعات میں سے ہے جن میں آپؐ نے بدرجۂ اتم اپنی عبدیت کا اظہار فرمایا ہے۔ مکہ میں داخلہ کے
وقت آپ پر خشوع وخضوع کی کیفیت طاری تھی۔ جس اونٹ پر آپؐ سوار تھے اس پر اس قدر آپ جھکے ہوئے
تھے کہ روئے مبارک اونٹ کی پیٹھ سے لگ لگ جاتا تھا۔ صفحہ ۹۰ پر لکھا ہے:-

"زکوٰۃ حقیقت میں حکومت کا ٹیکس ہے یہی ٹیکس غیر مسلموں سے جزیہ کے نام سے لیا جاتا ہے
اور مسلمانوں سے زکوٰۃ کے نام سے۔"

زکوٰۃ کی حیثیت ٹیکس یا جزیہ کی ہرگز نہیں ہے۔ زکوٰۃ اور ٹیکس میں بنیادی فرق ہے جسے سمجھنے کی ضرورت ہے
بعض روایات کے نقل کرنے میں مؤلف موصوف نے احتیاط سے کام نہیں لیا۔ کتاب میں بعض جگہ زبان
اور ادب کی خامیاں بھی نظر آئیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مترجم نے ان خامیوں کی طرف توجہ نہیں کی صرف ترجمہ
کر دینے پر اکتفا کیا ورنہ ان خامیوں کو بآسانی دور کیا جا سکتا تھا۔ ترجمہ میں بھی بعض فروگزاشتیں ہوئی ہیں۔ آئندہ
اڈیشن میں صحت کی طرف خاص طور پر توجہ دی جائے۔ پروف بھی احتیاط سے دیکھا جائے۔ حضورؐ کے اخلاق وعادات
اور آپؐ کی تعلیمات سے متعلق اسباق تشنہ ہیں۔ انھیں از سرِ نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ (محمد فاروق)

فتوح الغیب (اردو) صفحات ۱۹۴- کاغذ کتابت طباعت اوسط - قیمت مجلد مع گرد پوش دو روپے ۵۰ نئے پیسے - ناشر - اللجنۃ العلمیہ - چنچل گوڑہ حیدرآباد ۲۴ اے پی

سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے مقالات کا مجموعہ فتوح الغیب فارسی اور اردو ترجموں کے ساتھ متعدد بار شائع ہو چکا ہے - شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے کثیر الاطراف علمی احسانات میں ایک احسان یہ بھی ہے کہ ہندستان میں سب سے پہلے انھوں نے اس مجموعے کو اپنے فارسی ترجمہ و تشریح سے مزین کر کے اہل علم کے درمیان پھیلایا - انہیں کے مرتب کردہ مجموعے سے پھر اردو ترجمے تیار ہوئے - اب سے پہلے کے ترجمے تقریباً آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکے ہیں اس لیے ان ترجموں کو سامنے رکھ کر یہ نیا ترجمہ شائع کیا گیا ہے مگر اب بھی یہ اپ ٹو ڈیٹ نہیں کہا جا سکتا۔

تبصرہ نگار کی رائے یہ ہے کہ اس طرح کی کتابیں لفظی ترجمے کے ساتھ شائع کرنا مناسب نہیں ہے اگر ترجمانی کا طریقہ اختیار نہ کیا جائے تو کم از کم ترجمے کو سلیس، با محاورہ اور مطلب خیز ضرور ہونا چاہیے - اس کے بغیر کتاب کی افادیت بہت محدود ہو جاتی ہے - کچھ پرانے قسم کے لوگ لفظی ترجمے پڑھ کر ان سے مطلب اخذ کرنے کی زحمت برداشت کر لیں تو کر لیں لیکن نئی روشنی کے لوگ یہ زحمت برداشت کرنے کو تیار نہیں ہیں - ویسے اس نئے ترجمے سے مطلب اخذ کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوتی اور یہ مشورہ دیا جا سکتا ہے کہ اس نئے زمانے کے لوگ بھی اس سے استفادہ کریں - یہ کتاب انشاء اللہ ان کے لیے مفید ہوگی۔

اصل کتاب سے پہلے "التماس" کے عنوان سے مولانا شبلی یزدانی کی ایک تحریر ہے - اس میں انھوں نے ایک جگہ یہ سوال اٹھایا ہے کہ اللہ و رسول سے محبت، اولیائے کرام سے اظہار عقیدت و احترام اور اس کے شاندار مظاہروں کے باوجود مسلمان روز بروز کیوں ذلیل ہوتے جا رہے ہیں ؟ اس سوال کا انھوں نے جو جواب دیا ہے، وہ قابل غور ہے - کتاب و سنت کے احکام اور بزرگوں کی نصیحتوں پر عمل نہ کرنے کی ایک تمثیل انھوں نے پیش کی ہے، لکھتے ہیں :

"ہمارا حال بالکل ایک ایسے سپہ سالار کا ہے جس کو ایک بادشاہ وقت نے کسی جنگی مہم پر روانہ کرتے ہوئے اصول و آئین جنگ و صلح سے متعلق تحریری ہدایات بھی دیے تھے کہ کن حالات میں کیا طریق اختیار کیا جائے - سپہ سالار نے میدان جنگ میں پڑاؤ ڈالا اور خود اپنے آراستہ خیمے میں بیٹھ کر ہر روز بادشاہ کے ہدایت نامہ کو بڑے ادب و احترام سے پڑھتا رہا ، ادھر دشمن کی فوج برابر نقل و حرکت میں مصروف اور آگے بڑھتی آ رہی تھی لیکن عقیدت مند سپہ سالار بادشاہ سے اپنی محبت و احترام کے

انہماک میں مصروف تھیں جنگ کی تیاریوں میں مشغول تھا ، ایسے سپہ سالار اور اس کی فوج کا انجام کیا ہوا

ہوگا محتاج بیان نہیں کیا ہماری جمعیت ہندی کا حال اس سے کچھ مختلف ہے ؟

یہ تمثیل خصوصیت کے ساتھ بزرگوں کی عقیدت کا ڈھونگ رچانے والوں کے لیے قابل غور ہے ——

ع-ق

۱ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ

۲۸۔ جنوری ۱۹۶۳ء ۸۔ ماگھ شک ۸۴

اسلامی ڈائری
کا
ایک صفحہ

کل صفحات ۳۵۲ — خوبصورت پلاسٹک کور

آفسٹ کی اعلیٰ طباعت

قیمت ۳۵ — ۱

تاجرانہ نرخ بذریعہ خط و کتابت طے کریں

شائع کردہ ۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند ۔ دہلی

مسلمانو! تم پر روزے فرض کر دیے گئے ہیں ق

JAMIA ... LIBRARY
Jamia Millia Islamia
DELHI

رجب المرجب ۱۳۸۲ھ
دسمبر ۱۹۶۲ء

جلد :- ۲۹
شمارہ :- ۶

زندگی رامپور

مدیر :- سید احمد قادری

• خط و کتابت و ارسال زر کا پتہ — منیجر زندگی رامپور۔ یوپی

• زر سالانہ :- صہ ر ششماہی :- تین روپیہ ۔ فی پرچہ :- پچاس نئے پیسے

• ممالک غیر سے :- دس شلنگ بشکل پوسٹل آرڈر

پاکستانی اصحاب بمندرجہ ذیل پتہ پر رقوم بھیجیں اور رسید ہمیں ارسال فرمائیں

منیجر ہفت روزہ شہاب ۱۱/c شاہ عالم مارکیٹ لاہور

مالکہ:- جماعت اسلامی ہند۔ اڈیٹر:- سید احمد عروج قادری ۔ پرنٹر پبلشر:- احمد حسن ۔ مطبع:- ناظم پریس بازار نصر اللہ خاں رامپور ۔ مقام اشاعت

دفتر زندگی رکاتی رامپور۔ یوپی

اشارات

(گذشتہ سے پیوستہ)

مولینا ابواللیث اصلاحی ندوی

دیگر تدابیر قانون کے ذریعے حالات کی اصلاح کی جو کوششیں عمل میں لائی جارہی ہیں اور ان کا جو کچھ نتیجہ برآمد ہو سکتا ہے اس کا حال معلوم کر لینے کے بعد ان دیگر تدابیر پر بھی کچھ غور کرنے کی ضرورت ہے جو انٹگریشن کونسل یا اسی ضمن کی دیگر مجالس اور کمیٹیوں وغیرہ کی طرف سے پیش کی جارہی ہیں۔

بظاہر یہ بات بڑی خوش آیند معلوم ہوتی ہے کہ انٹگریشن کے مسئلے نے اس وقت ملک میں اتنی اہمیت اختیار کرلی ہے کہ اس وقت ہر چہار طرف اسی کا چرچا ہے اور اسی کے لیے تدابیر پر تدابیر پیش ہو رہی ہیں لیکن سچ پوچھیے تو اس پر ہمیں اطمینان سے زیادہ تشویش محسوس ہو رہی ہے کیونکہ اندیشہ یہ ہے کہ یہ مسئلہ ہر خاص وعام کا تختۂ مشق بن کر اپنی اہمیت شاید زیادہ دنوں تک برقرار نہ رکھ سکے گا اور تدابیر اور حلوں کی کثرت سے پریشان ہو کر لوگ پھر اپنے اپنے دھندوں میں لگ جائیں گے اور یک جہتی کا خواب تشنۂ تعبیر ہی رہ جائے گا۔

اس مسئلے پر اظہار خیال کرنے میں جو لوگ پیش پیش نظر آرہے ہیں ان میں اکثریت تو ایسے ہی لوگوں کی ہے جن کا مقصد بظاہر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ اس مسئلے سے ان کی دلچسپی کا بھی اظہار ہو جائے اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو یک جہتی سے زیادہ اپنے کچھ مخصوص اغراض عزیز ہیں۔ اسی لیے ملک میں یک جہتی کے حصول کے لیے جو جوش و جذبہ پیدا ہو گیا ہے اسے وہ یک جہتی ہی کے نام پر اپنے انھیں اغراض کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ مثلاً کچھ لوگ جن کو مذہب سے نفرت ہے یا اس کو وہ اپنے مقاصد کے حصول میں مانع پا رہے ہیں ان کی کوشش یہ ہے کہ وہ اسے فرقہ پرستی کا اصل منبع ثابت کر کے اس کو ختم یا بے دست و پا بنا دیں یا کچھ لوگ جو ایک مخصوص تہذیب اور کلچر کو پورے ملک پر مسلط کرنے کے خواہشمند ہیں، وہ کمیونزم

اور نیشنلزم کی اصطلاحات کو کچھ ایسے معنی پہنا دینے کے درپے ہیں کہ کسی کے لیے اس تہذیب اور کلچر کو اپنائے بغیر چارہ نہ رہے۔ اور جو تھوڑی تعداد ایسے لوگوں کی باقی رہ جاتی ہے جو مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرتے اور خلوص کے ساتھ اسے حل کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے غور و فکر کا عام انداز بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ مرض کی ظاہری علامات ہی کو گویا وہ اصل مرض سمجھ رہے ہیں اس لیے اس کے حقیقی اسباب کی تحقیق و تشخیص اور پھر ان کے ازالے کی فکر و تدبیر کے بجائے وہ اپنی تمام تر توجہ بس ان علامات کے ازالہ و تدارک کی طرف مبذول کیے ہوئے ہیں۔ یا پھر وہ ایسی ہی تدابیر پر اکتفا کرنا چاہتے ہیں جن سے چاہے انھیں تھوڑا اطمینان تو حاصل ہو جائے کہ دوا اور علاج سے وہ غافل نہیں ہیں لیکن اصل مرض جوں کا توں باقی رہ جائے

عہدنامہ کی مہم

انٹگریشن کانفرنس میں انٹگریشن کا ایک نسخہ یہ تجویز کیا گیا تھا کہ ہر بالغ شہری سے اس بات کا عہد لیا جائے کہ وہ مہذب سماج کے اس عالمی اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ تمام مسائل پُر امن طور پر حل ہونے چاہئیں اور وہ ملک کے دوسرے شہریوں کے ساتھ اپنے جھگڑے طے کرنے کے لیے کبھی تشدد کا استعمال نہیں کرے گا۔ یہ تجویز یقیناً اس لحاظ سے اپنے اندر بڑی افادیت رکھتی ہے کہ انسانی زندگی میں عہد و پیماں کو بھی بہرحال ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور اس کا کم سے کم یہ فائدہ تو ضرور ہی مرتب ہو سکتا ہے کہ پبلک کے ذہن و دماغ پر اس مسئلے کی اہمیت کا تھوڑا بہت نقش قائم ہو جائے خصوصاً ایسی صورت میں کہ یہ کام اس اہتمام کے ساتھ انجام دیا جا رہا ہے کہ پورے ملک میں اس کے لیے ایک خاص ہفتہ منایا گیا ہے جس میں وزرا اور حکام نے بھی نمایاں طور سے حصہ لیا ہے بلکہ اس کے اصل کرتا دھرتا ہی یہی لوگ رہے ہیں اور اس ہفتے کے لیے ہفتہ بھی وہ تجویز ہوا ہے جس میں گاندھی جی کے یوم پیدائش کی تقریب ہر سال منائی جاتی رہی ہے اس اہتمام و تدبیر کے ساتھ جو ہفتہ منایا جائے ظاہر ہے اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ہی مرتب ہوگا لیکن یہاں اصل قابل غور سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ ان عوامل کو ختم کرنے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتا ہے جو موجودہ صورت حال کے اصل ذمہ دار ہیں

عہدنامہ کی اسی مہم کے سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ بات دیکھنے کی ہے کہ اس کا فیصلہ نیشنل انٹگریشن کانفرنس کے موقع پر کیا گیا تھا جس کو اب سال بھر سے بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ لیکن اس پر عمل درآمد کی نوبت اب آئی ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ اصل فیصلہ ہی میں اس تاخیر کی گنجائش رہی ہو کیونکہ کانفرنس کے آٹھ نو ماہ بعد انٹگریشن کونسل کے اجتماع کے موقع پر گزشتہ فیصلوں کے جائزہ کی جو رپورٹ پیش کی گئی تھی اس میں اعتراف

کوتاہی ہی کے انداز میں اس فیصلے پر کچھ عمل درآمد نہ ہوسکنے کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس کوتاہی یا عمل درآمد میں اس تاخیر کی اصلاً وجہ کیا ہوئی۔ اس بارے میں رپورٹ میں کچھ نہیں کہا گیا تھا لیکن بظاہر اس کی بڑی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کام کے لیے پبلک کی طرف سے جس پذیرائی اور رجوش و ہماہمی کی ضرورت ہے اس کی طرف سے کارکن کچھ زیادہ پُرامید نہیں تھے اور خود گاندھی جینتی کے ساتھ اس مہم کا جوڑ لگانے سے بھی اسی بات کا پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کے کسی سہارے کے بغیر اس کی کامیابی پہلے ہی سے بہت کچھ مشتبہ سمجھی جاتی رہی ہے، تو دیکھنے کی بات ہے کہ جب یہ حال اس وقت ہے جب کہ ملک میں یک جہتی کے لیے اچھا خاصا جوش و جذبہ پیدا کر دیا گیا ہے اور ایک نئی بات ہونے کی بنا پر اس کے ساتھ دل چسپی کی ایک فطری وجہ بھی موجود ہے تو اس کی کیا توقع ہوسکتی ہے کہ آئندہ اس کے سلسلے میں وہ دل چسپی بھی باقی رہ سکے گی جو اس سال دیکھنے میں آئی ہے۔ بظاہر تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ اگر گاندھی جنتی کی تقریب یا ایسے ہی کسی اور سہارے سے اس مہم کو جاری و زندہ رکھا بھی جا سکا تو گاندھی جنتی ہی کی طرح اس کی حیثیت بھی محض ایک رسم ہی کی ہوکر رہ جائے گی اور محض ایک رسم کے پورے ہو جانے کے سوا اس سے اور کوئی خاص فائدہ حاصل نہ ہوسکے گا۔

اصل یہ ہے کہ اس مہم کو کامیاب بنانے کے لیے صرف اتنی بات کافی نہیں ہے کہ اسے بڑی شان اور اہتمام کے ساتھ یا کسی بڑی شخصیت سے اس کا رشتہ جوڑ کر منایا جا رہا ہے اور اس میں بڑی بڑی شخصیتیں حصہ لے رہی ہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے دلوں میں بھی اس کے لیے کوئی کشش موجود ہو اور وہ دل سے اسے کامیاب بنانا چاہیں اور یہ وہ چیز ہے جو کسی مصنوعی طریقے سے حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ وہ اس پر موقوف ہے کہ یا تو ذہن و دماغ کی اس طرح تربیت کی جائے کہ لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو اہمیت دینا چھوڑ دیں یا پھر ان کے ذہن و دماغ کے مطابق ان کے سکون کا کوئی حل نکال کر ان کی موجودہ بے چینیوں کو دور کر دیا جائے، اس کے بغیر اس طرح کی کوئی مہم نہ کامیابی کے ساتھ چل سکتی ہے اور نہ اس سے کوئی خاص فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے

دوسری بات یہ ہے کہ کسی بھی عہد و پیماں کا اگر کوئی فائدہ مرتب ہوسکتا ہے تو اس صورت میں جب اس کے ساتھ خلوصِ نیت بھی شامل ہو لیکن بدقسمتی کی بات یہ ہے کہ عوام میں تو خیر اپنا عہد و پیماں کا کچھ پاس و لحاظ ابھی باقی بھی ہے مگر جہاں تک تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص ہمارے لیڈروں کا تعلق ہے، افسوس ہے کہ

اس بارے میں ان کے ساتھ حسن ظن کی بہت کم گنجائش ہے۔ لیڈروں کا حال یہ ہے کہ وہ ہر طرح کا عہد کرنے کے لیے تو ہر آن تیار رہتے ہیں لیکن ان کا کوئی عہد اس لیے نہیں ہوتا کہ اسے پورا بھی کرنا ہے۔ یہ ہمارے لیڈر ہی تو ہیں جو ملک کی موجودہ صورت حال کے اصل ذمہ دار ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ذات پات اور نسل و نسب کا امتیاز یک جہتی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ہے چنانچہ دستور میں بھی اسے غلط ٹھیرایا گیا ہے۔ اور ہمارے لیڈر آئے دن اس کی مذمت میں رطب اللسان رہا کرتے ہیں لیکن ہندوستانی معاشرے کی اس برائی کو باقی اور زندہ رکھنے میں ہمارے سیاسی لیڈروں کا جو حصہ ہے وہ کسی پر مخفی نہیں ہے۔ انٹگریشن کانفرنس کے موقع پر ہمارے موجودہ صدر جمہوریہ نے صاف صاف فرمایا تھا کہ "ذات پات ایک بڑی معاشرتی برائی کی حیثیت سے تو ختم ہو رہی ہے لیکن اب وہ ایک نئے سیاسی رنگ میں زندہ ہو رہی ہے کیونکہ ذات پات کی وفاداریوں کو الیکشن جیتنے اور ملازمتوں میں زیادہ حصہ حاصل کرنے کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے" اس سلسلے میں انھوں نے نہایت پُر درد لہجے میں مزید یہ بھی فرمایا تھا کہ "اگر ملک کے بڑے لیڈر اس قابل نہیں ہیں کہ جن باتوں کی وہ تبلیغ کرتے ہیں ان کو زیر عمل بھی لائیں تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہم کتنے خطرناک راستے پر گامزن ہیں" اور اسی طرح کی باتیں موجودہ نائب صدر نے بھی اس موقع پر ارشاد فرمائی تھیں؛ انھوں نے مولانا آزاد کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ان کو بھی پارلیمنٹ کے انتخاب کے لیے ہمیشہ کسی ایسے علاقے سے کھڑا کیا جاتا رہا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو حالانکہ اگر ان کو کسی ہندو اکثریت کے علاقے سے کھڑا کیا جاتا اور وہ شکست بھی کھا جاتے تو ان کی شکست سے قومی یک جہتی کو بہت بڑی فتح نصیب ہوتی"

اور لیڈروں کی اس حالت کا اندازہ کرنے کے لیے دور جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے اس کا اندازہ تو اس سے ہی بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ انٹگریشن کانفرنس میں انھوں نے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ایسی باتیں کہی تھیں جن کے دسویں حصہ پر بھی اگر وہ خود عمل پیرا ہوئے ہوتے تو ملک کا نقشہ بہت کچھ بدل چکا ہوتا۔ لیکن حالت میں اب تک کوئی تبدیلی رونما نہیں ہو سکی ہے کیونکہ کانفرنس سے نکلتے ہی انھوں نے اپنے سارے قول و اقرار فراموش کر دیے اور یہی وہ حضرات ہیں جو اس وقت عہد نامہ کی مہم کے اصل روح رواں بنے ہوئے ہیں بلکہ یہ پورا ہنگامہ ہی انھیں کے دم قدم کا رہینِ منت ہے۔

کوڈ آف کنڈکٹ عہد نامہ کی اس مہم پر انٹگریشن کانفرنس کی اس تجویز کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ پریس طلبہ اساتذہ اور سیاسی پارٹیوں وغیرہ کے لیے کچھ کوڈ آف کنڈکٹ ہونے

چاہئیں جن کی پابندی کرنے کا وہ عہد کریں۔ اس تجویز کے مطابق سیاسی پارٹیوں نے الیکشن سے پہلے ہی اپنے لیے ایک کوڈ آف کنڈکٹ طے کیا تھا لیکن اس پر انھوں نے کس حد تک عمل درآمد کیا ہے اس کا حال سب کو معلوم ہے۔ خود پنڈت نہرو کونسل کے اجتماع میں اس پر اظہار افسوس کر چکے ہیں چنانچہ کونسل کو بھی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ اس تجویز کی توثیق کرتے ہوئے ان پارٹیوں سے اس تجویز کو "واقعی اور مخلصانہ طور" سے زیر عمل لانے کی اپیل کرے۔ اور جہاں تک پریس کے کوڈ آف کنڈکٹ کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اگر پریس یک جہتی کے قیام و فروغ کے لیے دل سے آمادہ ہو جائے تو حالات کی بہت کچھ اور بہت جلد اصلاح ہو سکتی ہے لیکن ابھی تو یہی بات طے نہیں ہو سکی ہے کہ یہ کوڈ کیا ہو اور کون اسے تیار کرے۔ کونسل نے اپنے طور سے اس کے ایک مسودہ پر غور کیا تھا جس کے بارے میں اس نے "قابل قبول" ہونے کا بھی فیصلہ کر دیا ہے لیکن اس کے ساتھ دوراندیشی سے کام لیتے ہوئے اس نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ کسی کوڈ کی افادیت اس پر موقوف ہے کہ پریس اپنی خوشی سے اسے منظور کرے چنانچہ اس کے مطابق حکومت سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسی کمیٹی بنائے جو پریس کے مختلف حلقوں کے صلاح و مشورے سے کوئی کوڈ تیار کرے اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ پریس کمیشن سب سے پہلے یہ طے کر چکا ہے کہ پریس کے حقوق اور ذمہ داریوں سے متعلق کوئی کوڈ تیار کرنا ابتدائی طور سے اس کونسل کے دائرۂ کار میں داخل ہونا چاہیے جس کی تشکیل کی اس نے سفارش کی ہے البتہ اس نے چند خاص ایسے اصولوں کی بھی نشان دہی کی ہے جن کو ان کے خیال کے مطابق صحافی طور طریق کے بارے میں کسی کوڈ میں مناسب جگہ ملنی چاہیے اور یہ اصول اپنے مفہوم و منشا کے لحاظ سے بہرحال کونسل کے منظور کردہ کوڈ سے بہت کچھ مختلف ہیں۔ گویا مجوزہ کمیٹی کے بعد بھی اس فیصلہ کے باقاعدہ طے ہونے میں ابھی دو باتیں خاص طور سے حائل ہیں۔ ایک پریس کی آزادی کا مسئلہ اور دوسرے فی نفسہ کوڈ کی تفصیلات کا معاملہ۔ اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ان مراحل کے طے ہونے میں ابھی کتنا وقت لگے گا اور قابل اطمینان طور پر طے بھی ہو سکیں گے یا نہیں؟ لیکن اگر یہ خوش اسلوبی کے ساتھ طے بھی ہو جائیں جن کی بہرحال ہمیں امید کرنی چاہیے تو بھی یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ پریس کسی طے شدہ کوڈ کی عملاً کہاں تک پابندی کر سکے گا۔ کوڈ میں ظاہر ہے وہی باتیں رکھی جائیں گی جو قومی یک جہتی کے لیے مفید اور ضروری ہوں لیکن وہ کون سی ایسی باتیں ہوں گی جن سے اہل صحافت خود پہلے سے واقف نہیں ہیں بس اگر اس واقفیت کے باوجود ان کی طرف سے آئے دن ان کی خلاف ورزی ہوتی رہی جس کی بنا پر ان کے لیے کوڈ کی ضرورت

محسوس کی جا رہی ہے تو آئندہ کس طرح اس کی طرف سے اطمینان کیا جا سکتا ہے اور یہاں یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ یہ خلاف ورزیاں ہمیشہ اس لیے نہیں ہوتی ہیں کہ ہماری صحافت کا اخلاقی معیار کچھ زیادہ اونچا نہیں ہے بلکہ اس میں بہت کچھ دخل اس بات کو بھی ہے کہ یک جہتی کے مفہوم اور اس کے پیدا کرنے کے وسائل و تدابیر کے بارے میں یہاں نقطۂ نگاہ کے شدید اختلافات پائے جاتے ہیں اس لیے بہت سی خلاف ورزیوں کو اداۓ فرض اور حق پسندی کا عین تقاضا سمجھا جا رہا ہے اس لیے اس پر شرم و ندامت محسوس کرنے کی بجائے فخر و مسرت محسوس کی جاتی ہے بلکہ اس کے لیے قید و بند کو بھی دعوت دی جاتی ہے اسی لیے جب تک اس مشکل کا کوئی حل نہ نکالا جائے گا محض کوئی کوڈ طے کر ڈالنے سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہو سکتا۔ رہا طلبا و تعلیمی اداروں کے بارے میں کوڈ کا سوال تو اس کا معاملہ بھی ابھی ایک کمیٹی بنا دینے سے آگے نہیں بڑھا ہے اور یہاں بھی مشکل یہی درپیش ہے کہ یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں کے طلبہ و اساتذہ اپنی مرضی ہی سے کوئی کوڈ منظور کریں تو اس کا کوئی فائدہ مرتب ہو سکتا ہے لیکن ابھی تک یہ واضح نہیں ہو سکا ہے کہ یہ لوگ اپنی آزادی میں کوئی بیرونی مداخلت گوارا کرنے کے کس حد تک روادار ہو سکتے ہیں اور اگر بہ تقاضائے وقت یا بمجبوری مصالح وہ اسے بطیب خاطر قبول کرنے پر آمادہ بھی ہو گئے تو اس کے بعد بھی بہرحال یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ عملاً کس حد تک اسے برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے بجائے خود مختلف انتہا پسندانہ رجحانات کے خاص مرکز بنے ہوئے ہیں جن کے زہریلے اثرات سے پورا ملک متاثر ہو رہا ہے اور کتنے ایسے بھاری مسائل ہیں جن کا خاص تعلق تعلیمی اداروں ہی سے ہے مگر ان کے بارے میں اب تک کی تمام کوششوں کے باوجود اختلاف ابھی پوری شدت کے ساتھ قائم ہے۔ مثلاً ایک یہی مسئلہ کہ ذریعۂ تعلیم انگریزی ہو یا ہندی یا مقامی زبانیں۔ پس یہ توقع کس طرح قائم کی جا سکتی ہے کہ کسی کوڈ پر دستخط کر دینے کے بعد بھی یہ مسائل طلبہ و اساتذہ کے ذہن و دماغ پر اثر انداز نہیں ہو سکیں گے اور کوئی عہد کر لینے کے بعد وہ واقعی ایمانداری کے ساتھ اسے پورا ہی کریں گے درآں حالیکہ جو لوگ بڑے سمجھے جاتے ہیں وہ عام طور سے اپنے قول و قرار کی پابندی کا کوئی اچھا نمونہ ان کے سامنے پیش نہیں کر رہے ہیں بلکہ اس لحاظ سے پورے ملک ہی کا حال ابتر ہو چکا ہے۔

قومی ترانہ

یک جہتی کی تدابیر میں ایک خاص تدبیر جو جذباتی ہم آہنگی کمیٹی کی طرف سے پیش کی گئی ہے یہ ہے کہ ملک کے تمام اسکولوں میں قومی ترانہ مل جل کر گایا جائے۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے کہ ایسے

ذہن کو کسی خاص وقت پر موڑنے اور ان کے اندر کچھ خاص طرح کے تصورات جاگزیں کرنے کے لیے بھی ایک مفید تدبیر ہو سکتی ہے اور بظاہر تو اس قومی ترانے میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس پر مذہبی نقطۂ نظر سے کسی فرقے کو اعتراض ہو کیونکہ ہر شخص ملک سے ایک فطری محبت رکھتا ہے اور اس ترانے میں پورے ملک کی فلاح و بہبود کے لیے خدا ہی سے دعا کی گئی ہے لیکن اس کا کیا حل ہے کہ طلبہ کے ذہن و دماغ پر ترانوں کے ذریعے جو اثر قائم ہو سکتا ہے خود اسکول میں اور اسکول کے باہر بھی پورے ماحول میں ان کو ہر آن ایسی چیزیں دیکھنی اور سننی پڑتی ہیں جن سے وہ نقش کوئی مستقل اور دیرپا شکل اختیار نہیں کر پاتا۔ آپ نے پڑھا ہوگا ابھی حال ہی میں مسٹر لال بہادر شاستری نے اپنی ایک تقریر میں نہایت افسوس کے ساتھ اس واقعہ کا تذکرہ فرمایا ہے کہ انھوں نے ایک اسٹیٹ میں اپنے دورے کے موقعے پر یہ دیکھا کہ وہاں قومی ترانے کی جگہ ایک ایسا ترانہ گایا جا رہا ہے جس میں ایک مخصوص علاقے کے گن گائے گئے ہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ نیشنل انٹگریشن کے گزشتہ اجلاس کے موقعہ پر کارگزاریوں کی جو رپورٹ پیش کی گئی تھی اس میں ان تمام ریاستوں کے بارے میں جہاں علاقائی عصبیتوں کا زور شور رہے یہ خوش کن اطلاع درج ہے کہ ان میں قومی ترانہ رائج ہو چکا ہے۔ پس جب تک اس پورے ماحول کو بدلنے کی کچھ ٹھوس تدابیر اختیار نہیں کی جائیں گی اس طرح کی تدبیروں کا اثر نقش برآب سے زیادہ ثابت نہ ہوگا۔

قومی تیوہار قومی یک جہتی کے لیے بعض حلقوں کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی ہے اور غالباً اشوک مہتہ کمیٹی کے کچھ ممبروں کے ذہنوں میں بھی اس کو بڑی اہمیت ہے جیسا کہ ان کے بعض براہ راست سوالات سے جو مجھ سے کیے گئے تھے واضح ہوتا ہے کہ مختلف ملت و مذہب سے تعلق رکھنے والے لوگ ہولی، دیوالی دسہرہ اور عید وغیرہ تیوہار مل جل کر منائیں۔ اس بات سے شاید کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ ہندوستان کی موجودہ مصیبتوں میں اس کو بڑا دخل ہے کہ گوناگوں اسباب کے تحت یہاں کے مختلف مذاہب و ملتوں سے تعلق رکھنے والوں میں سخت بُعد اور بیگانگی پیدا ہو گئی ہے جسے بہرحال ختم ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر ملک میں وہ فضا پیدا نہیں ہو سکتی جو اس کی ترقی و استحکام کے لیے ضروری ہے چنانچہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم نے اس ضرورت کو شروع ہی سے اپنے پیش نظر رکھا ہے اور اس کو باقاعدہ اپنے پروگرام کا ایک جزو بنا کر اس کے لیے برابر کوشش کرتے رہے ہیں لیکن اس کے باوجود ہمارا خیال یہ ہے کہ پیش نظر مقصد کے لیے مذکورہ بالا تدبیر نہ صرف یہ کہ غیر ضروری اور بے سود ہے بلکہ اس سے الٹے اس مقصد کو نقصان پہنچنے کا شدید اندیشہ ہے سب سے پہلے تو یہ بات ہمیں اپنے ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اتحاد و یک جہتی کی اصل ضرورت اس بات

کی ہے کہ اس کے لیے خود لوگوں کے دلوں میں خواہش و جذبہ پیدا ہو نہ یہ کہ لوگوں کو کسی جبر کے تحت اس پر آمادہ کیا جائے اس طرح اتحاد و یکجہتی کا ایک سطحی مظاہرہ تو ضرور ہو جائے گا لیکن اس کی کوئی واقعی قدر و قیمت نہ ہوگی اور دلوں کے اندر خواہش و جذبہ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جن وجوہ سے ان کے درمیان ایک دوسرے سے بُعد اور بیگانگی پیدا ہوتی ہے ان کا دقتِ نظر کے ساتھ جائزہ لیا جائے اور ان کو دور کرنے کے لیے مخلصانہ کوششیں عمل میں لائی جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ مختلف مذاہب کے ماننے والوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں ہے کہ لوگوں کو اپنے مذہبی احساسات کے برخلاف کچھ کرنے پر کسی طرح کے جبر و دباؤ سے کام لینا چاہیے کیونکہ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ برآمد نہ ہوگا کہ ان کے دلوں میں اس کے خلاف جذبات بھڑکیں جو اصل مقصد کے لیے نہایت تباہ کن ہوگا یا پھر وہ دباؤ کے تحت بے دلی کے ساتھ ان میں محض ظاہر داری کے طور پر حصہ لیں جو ان کے اخلاق و کردار کے لیے سخت مہلک ثابت ہوگا کیونکہ اس سے ان میں تصنع، ریاکاری اور منافقت پیدا ہوگی اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اس طرح رفتہ رفتہ ان کا رشتہ خود اپنے مذہب سے بھی کمزور اور مضمحل ہو جائے گا اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جو تیوہار منائے جاتے ہیں ان میں بیشتر ایسے ہی ہیں جو اپنی اپنی جگہ پر کسی مخصوص مذہب کے ماننے والوں کے اپنے مخصوص تیوہار سمجھے جاتے ہیں اور ان کا ان کے اپنے مذہب اور مذہبی روایات سے بھی ایک خاص تعلق ہوتا ہے یا بہرحال سمجھا جاتا ہے، اس لیے ایسے تیوہاروں کو قومی تیوہاروں کی حیثیت دے کر ان میں سب کو شریک کرنے کی کوشش کرنا قومی یکجہتی کے نقطۂ نظر سے بھی ایک غلط اور نامناسب بات ہوگی۔ اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ کئی قومی تقریبات ایسی ہیں جن کو سب مل جل کر منا رہے ہیں مثلاً یوم جمہوریہ اور یوم آزادی وغیرہ اور یہ تقریبات تمام مذاہب کے ماننے والوں میں یکجہتی اور یکسانیت کے جذبات پیدا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مزید برآں تیوہاروں کے موقع پر ایک دوسرے کی خوشی میں شرکت کی بہت سی مناسب شکلیں بھی ہو سکتی ہیں جو بہرحال اختیار کی جا سکتی ہیں اور اس سے بھی باہمی میل ملاپ کا مطلوبہ فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

میں یہاں اس بات کی طرف بھی سرسری اشارہ کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مذہب کے بارے میں یہ بدگمانی کہ وہ انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا اور ان میں میل جول اور یگانگت پیدا کرنے میں مانع ہے مذہب سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ [illegible] ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور خیر سگالی [illegible] کے پیدا [illegible] کے جذبات پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ مذہب ہی ہے بشرطیکہ مذہب اپنی

صحیح شکل میں اختیار کیا جائے اور اسے سیاسی اغراض اور دنیوی مفاد کے حصول کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ چنانچہ آج بھی جب کہ مذاہب کی اصل تعلیمات کا اثر لوگوں کی زندگیوں میں بہت کم باقی رہ گیا ہے اور عام طور سے ان کے نام پر وہ سب کچھ کیا جا رہا ہے جن کا ان کی اصل تعلیمات سے کوئی جوڑ نہیں ہے اور جس کی بنا پر نہ صرف مذہب کے نام لیوا بلکہ خود مذہب بھی لوگوں کی نگاہوں میں اپنا وقار کھو چکے ہیں۔ یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ جن لوگوں میں کسی درجے میں بھی خدا پرستی اور اپنے مذہب کا احترام باقی ہے ان کی زندگیاں باہمی میل ملاپ اور صلح و آشتی کے لحاظ سے بھی ان لوگوں کی زندگیوں سے بہت مختلف اور بسا غنیمت ہیں جو مذہب سے یا تو کوئی تعلق نہیں رکھتے یا اس سے ان کا تعلق محض ظاہر دارانہ یا کسی مفاد کے تحت ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے قومی یک جہتی کے لیے ایسے لوگ جس درجہ مفید ہو سکتے ہیں اس کی توقع ہمارے عام سیاست دانوں سے جو اس وقت یک جہتی کا نعرہ بلند کرنے میں سب سے پیش پیش ہیں، نہیں کی جا سکتی بلکہ "صحیح بات تو یہ ہے کہ جیسا کہ اچاریہ کرپلانی نے اشوک مہتہ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا تھا کہ "ملک میں جو فرقہ داریت پائی جاتی ہے۔ وہ کچھ مذہب کی پیداوار نہیں ہے بلکہ ملک کے سیاست داں اور تعلیم یافتہ طبقہ ہی اس کا اصل ذمہ دار ہے۔ یہ شہروں سے اٹھتی ہے اور پھر دیہاتوں میں پھیل جاتی ہے اس لیے عوام نہیں بلکہ تعلیم یافتہ طبقہ بالخصوص سیاست دانوں کو اپنی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔"

ناچ گانا

اوپر ہی کی تجویز سے ملتی جلتی ایک تجویز جو ملک میں یک جہتی قائم کرنے کے لیے بہت مفید سمجھی گئی ہے یہ ہے کہ مختلف ریاستوں کے درمیان ناچ گانوں اور ڈراموں وغیرہ کا تبادلہ ہو اور ان کی تقریبات مل جل کر منائی جائیں۔ ہم حیران ہیں کہ ہمارے عقلاء ملک میں یک جہتی کے مسئلے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اس پر وہ کس طرح مطمئن ہو گئے ہیں کہ تفریق و انتشار کے وہ اسباب جو اس صورت حال کے موجب ہوئے ہیں جس کی ایک معمولی سی تصویر آپ اس مضمون کے شروع میں پڑھ چکے ہیں، اس طرح کی سطحی تدبیروں سے دفع ہو سکیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ناچ گانوں میں بڑی کشش ہے اور اس کی محفلوں میں شریک ہو کر لوگ کچھ دیر کے لیے ایک دوسرے سے نفرت اور رنجش و عداوت سب کچھ بھلا بیٹھتے ہیں حتیٰ کہ اس کی خاطر لوگ مذہب و اخلاق کی عائد کردہ پابندیوں کو بھی نظر انداز کر جاتے ہیں لیکن ناچ گانے کا یہ اثر بہر حال عارضی ہی ہوتا ہے اور اس کا نشہ اترتے ہی لوگ پھر اپنی اصل حالت کی طرف لوٹ آتے ہیں۔ یوں تو ہندوستان میں ناچ گانے کا رواج زمانۂ قدیم ہی سے چلا آ رہا ہے اور ہندو مسلمان دونوں مل جل کر اس سے دلچسپی لیتے رہے ہیں لیکن تقسیم کے بعد تو حکومت نے خاص اپنی سرپرستی میں ناچ گانے کو

بہت زیادہ فروغ بخشا ہے یہاں تک کہ یوم جمہوریہ کے موقع پر بڑے اہتمام کے ساتھ مختلف صوبوں کی جھانکیاں بھی پیش کی جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور آل انڈیا ریڈیو سے بھی مختلف صوبوں کے گانے باجوں سے لوگوں کے ذوق کی تسکین کا پورا سامان کیا جاتا ہے۔ یہ تو فضول سینما کی فلمیں، ناچ گانوں کی منڈلیاں وغیرہ بھی اسی خدمت کی انجام دہی میں برابر لگی ہوئی ہیں لیکن اس کے باوجود دلوں کے بُعد میں کسی کمی کے بجائے اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ اس سے اس تجویز کی افادیت اور معقولیت کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے لیکن اس معاملے کا ایک اور پہلو بھی ایسا ہے جس کی طرف اس موقع پر توجہ دلانا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ تجویز اپنے عارضی اور وقتی فائدوں کے لحاظ سے قومی یک جہتی کے لیے چاہے جو کچھ بھی قدر و قیمت رکھتی ہو لیکن ملک میں ناچ گانوں کو اس طرح فروغ دینا درحقیقت تباہی و بربادی کو دعوت دینے کے ہم معنی ہے۔ حکیم مشرق ڈاکٹر اقبال نے کہا ہے ؎

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

اور قوموں کی تاریخ گواہ ہے کہ ان کا یہ فرمانا خلافِ حقیقت نہیں ہے۔

جنوب کی زبانیں شمال میں

کانگریس ورکنگ کمیٹی نے قومی یک جہتی کے لیے جو کمیٹی مسز اندرا گاندھی کے زیر صدارت قائم کی تھی اس نے اپنی تجویزوں میں اس بات پر بھی زور دیا ہے کہ شمالی ہند میں ٹامل زبان کی کلاسیں جاری کی جائیں اور اگر ضرورت پڑے تو جنوبی ہند کی دوسری زبانیں بھی شمالی ہند میں رائج کی جائیں۔ اس تجویز سے بھی کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا ہے کہ ہمارے رہنمایانِ قوم اصل مرض کے علاج کے بجائے محض ظاہری لیپ پوت سے کام لینا چاہتے ہیں۔ زبان کے سلسلے میں جنوبی ہند کے لوگوں کی اصل شکایت یہ نہیں ہے کہ شمال کے لوگ وہاں کی زبانیں پڑھتے پڑھاتے نہیں ہیں کہ اس کا کوئی انتظام ہو جانے سے ان کے مطمئن ہو جانے کی توقع کی جائے بلکہ یہ ہے کہ شمالی ہند کی زبان ہندی کو پورے ملک پر مسلط کر کے مقامی زبانوں کو نقصان پہنچانے اور ان زبانوں کے بولنے والوں کو آل انڈیا ملازمتوں میں ان کے مناسب حصے سے محروم کر دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اپنے اسی شک اور بدگمانی کی بنا پر وہاں کی متعدد مؤثر شخصیتیں مذکورہ بالا تجویز کے بارے میں بھی یہ رائے ظاہر کر چکی ہیں کہ یہ محض اہلِ جنوب کو بیوقوف بنانے کی ایک تدبیر ہے۔ پھر یہ تجویز عملی نقطۂ نظر سے بھی کچھ قابلِ اطمینان قرار نہیں دی جاسکتی اول تو اس میں ہی شک ہے

کہ جن زبان کی ضرورت لوگوں کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں محسوس نہ ہو رہی ہو ان کے حصول کے لیے ان میں کوئی خاص آمادگی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کچھ ملازمتوں کی نوعیت اس وقت بھی کل ہند ملازمتوں کی ہے اور آئندہ کچھ مزید ملازمتوں کو بھی یہی حیثیت دینے کی تجاویز زیر غور ہیں لیکن بہر صورت ان کا دائرہ محدود ہی ہوگا اس لیے وہ طلبہ کے اندر ان زبانوں کے لیے عمومی دلچسپی پیدا کرنے کی موجب نہیں بن سکتیں درآں حالیکہ ابھی تک انگریزی ہی سرکاری زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور آئندہ بھی اسی کو ایک غیر معین مدت کے لیے برقرار رکھنے کا مسئلہ تقریباً طے شدہ ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ یکجہتی کی ضرورت کا احساس ان کے حصول کا محرک ہوگا تو طلبہ سے جن کو اس سے زیادہ فکر محض اپنی معاش اور ملازمت کی ہوتی ہے اور جو بالعموم اپنے قریبی ماحول ہی میں میسر آ سکتی ہیں یہ توقع رکھنا کہ محض یکجہتی کے مقصد کے لیے وہ ان زبانوں کو چھوڑ کر جن کی ان کو اپنے ماحول میں زیادہ ضرورت ہو سکتی ہے جنوب کی کوئی زبان پڑھنے پر بآسانی آمادہ ہو سکتے ہیں اور دوسرے اگر بالفرض اس کی توقع کی بھی جا سکے تو یہ بات بجائے خود سخت دشوار ہے کہ شمال کے لوگ جنوب کی کم از کم چار اہم زبانیں (ٹامل، ٹیلیگو، ملیالم کنڑی) میں سے کسی ایک کی شُد بُد سے واقف ہو سکیں، کسی وسیع پیمانے پر انتظام کیا جا سکے۔ چنانچہ یوپی جیسے بڑے صوبے کی حکومت نے سہ لسانی فارمولے کے تحت اپنے یہاں ان میں سے صرف ایک زبان ٹامل کی تعلیم کا انتظام کرنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا لیکن جیسا کہ معلوم ہے اساتذہ وغیرہ کی فراہمی کی دشواریوں کی بنا پر اسے مجبوراً اس کا ارادہ سر دست ترک کر دینا پڑا ہے۔

مشترکہ رسم الخط قومی یکجہتی کے حصول کا ایک نسخہ یہ بھی تجویز کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے لیے ایک مشترکہ رسم الخط اختیار کیا جائے۔ چنانچہ وزرائے اعلیٰ اپنی کانفرنس منعقدہ اگست ۱۹۶۱ء میں اس بارے میں ایک قرارداد بھی منظور کر چکے ہیں کہ تمام ہندوستانی زبانوں کے لیے ایک مشترکہ رسم الخط کا اختیار کرنا نہ صرف یہ کہ پسندیدہ ہے بلکہ یہ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ایک رشتہ کا بھی کام دے گا اور اس طرح وہ قومی یکجہتی پیدا کرنے میں بہت معین ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی طے کی گئی ہے کہ "موجودہ حالات میں اس طرح کا رسم الخط صرف دیوناگری رسم الخط ہی ہو سکتا ہے"۔ لیکن چونکہ کانفرنس کو اس بارے میں تردد تھا کہ مستقبل قریب میں کوئی مشترک رسم الخط اختیار کیا جا سکتا ہے اس لیے فی الحال اس بارے میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے کے بجائے صرف یہ طے کرنے پر اکتفا کیا ہے کہ "اس مقصد کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے"۔

ہمارے خیال میں موجودہ حالات میں جبکہ لسانی تعصبات علیٰ حالہٖ قائم ہیں اور زبانوں کا مسئلہ بھی ابھی اس طرح طے نہیں کیا جاسکا ہے کہ اس سے سب لوگ مطمئن ہوچکے ہوں اس طرح کی کسی بحث کو چھیڑنا ہی مزید مشکلات کو دعوت دینے کے مترادف ہے۔ لوگوں میں اپنی مقامی و مادری زبانوں کے ساتھ جو لگاؤ اور دلچسپی ہے وہ ظاہر ہی ہے اور مقامی و مادری زبانوں کی اہمیت کو خود انٹگریشن کونسل نے بھی بڑی حد تک تسلیم کرلیا ہے اور یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ کسی بھی زبان کی انفرادیت باقی رکھنے کے لیے اس کا رسم الخط ایک بنیادی ضرورت کی حیثیت رکھتا ہے اس لیے بحالات موجودہ اس تجویز کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ برآمد نہیں ہوسکتا کہ لوگوں کے اس شک و بدگمانی میں مزید اضافہ ہو کہ یہ بھی مقامی زبانوں کی اہمیت و حیثیت کو مجروح کرنے اور پورے ملک پر ہندی کو مسلط کرنے کی ایک خاص تدبیر ہے جیسا کہ مختلف زبانوں کے نمائندوں کی طرف سے اس کا اظہار بھی ہوچکا ہے اس لیے ہمارا خیال یہ ہے کہ اس موقع پر اس طرح کی کسی بحث کو چھیڑنے کے بجائے اپنی توجہ اس شک و بدگمانی کو دور کرنے کی طرف مائل کی جائے جو ہندی کے حامیوں کے غلط طرز عمل کی بنا پر علاقائی زبانوں کے بولنے والوں کے دلوں میں گھر کر چکا ہے اور پھر ایسی تدابیر سوچی اور اختیار کی جائیں جن سے لوگوں کے ذہن و دماغ میں یہ وسعت پیدا ہوسکے کہ وہ عمومی ملکی مفاد اور اس کی پاسداری کو علاقائی اور لسانی مفادات پر ترجیح دے سکیں۔ اس سلسلے میں ہم نے جو کچھ سوچا ہے اسے ہم آگے کی بحثوں میں عرض کریں گے البتہ یہاں اس بات کی طرف اشارہ کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنی مقامی زبانوں اور رسم الخطوں کے ساتھ لوگوں میں اس وقت غیر معمولی دلچسپی اور لگاؤ پایا جاتا ہے اس کو کم کرنے کا ذریعہ یہ نہیں ہے کہ انہیں ان کے آئندہ بقا و تحفظ کی طرف سے غیر مطمئن بنا دیا جائے بلکہ ان کی طرف سے انہیں مطمئن کردینا ہی اس کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ خواہ اس مقصد کے لیے حکومتوں کو اپنے خزانوں پر کچھ غیر معمولی بار ہی کیوں نہ ڈالنا پڑے۔

ملک میں یک جہتی قائم کرنے کے لیے مختلف حلقوں کی طرف سے جو تدابیر پیش کی گئی ہیں ان میں اہم ترتجاویز یہی ہیں جو اوپر زیر بحث آچکی ہیں۔ آپ خود فیصلہ فرما سکتے ہیں کہ یہ تدابیر پیش نظر مقصد کے لیے کہاں تک مفید ہوسکتی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے ملک کی یک جہتی کا مسئلہ بہت سنجیدہ غور و فکر کا طالب ہے کیونکہ ملک میں جو تشویشناک صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس کے اسباب نہایت گہرے ہیں اس لیے جب تک ان کا صحیح جائزہ لیکر انہیں دور کرنے کی کوشش نہیں کی جائے گی مطلوبہ غرض پوری نہ ہوسکے گی۔ ہاں اگر دفع الوقتی مقصود ہو یا اپنے اور دوسروں کو یہ اطمینان دلانا ہو کہ ملک کی یک جہتی کے لیے کچھ نہ کچھ کیا جارہا ہے تو ان تدبیروں کو زیر عمل لانے کی کافی گنجائش ہے۔

یک جہتی کے لیے غور و فکر اور کوشش کا صحیح اندازہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس پر انشاء اللہ ہم آگے گفتگو کریں گے اسی ضمن میں بعض ان تدابیر پر بھی گفتگو ہو سکے گی جو انٹگریشن کے مسئلے پر غور کرنے والوں کی طرف سے پیش ہوئی ہیں اور واقعی وہ اپنے اندر خاصی افادیت بھی رکھتی ہیں، مثلاً تعلیم کو اس کا ذریعہ بنانا، یا لسانی اختلافات کو رفع کرنے کے لیے وہ تدبیر جس کی سفارش انٹگریشن کونسل نے اپنے اجلاس منعقدہ جون ۱۹۶۲ء میں کی تھی۔

تَصْحِیْح

نومبر ۱۹۶۲ء کے شمارے میں محترم امیر جماعت کے جو اشارات شائع ہوئے تھے، ان میں ایک ضروری عبارت شائع ہونے سے رہ گئی۔ صفحہ ۸ پر لائن سے اوپر "لیکن، مذہب، مسجد اور مندر کے لیے احتجاج کر کے کون نکو بننے کے لیے تیار ہو سکتا تھا" کے فقرے کے بعد درج ذیل عبارت چھوٹ گئی تھی، قارئین زندگی وہاں اس کا اضافہ کر لیں۔ (ادارہ)

"اسی طرح تعزیرات ہند میں ترمیمات کے بل پر بھی لوک سبھا اور راجیہ سبھا میں سخت تشویش اور اضطراب کا اظہار کیا گیا۔ مسٹر ایم۔ ایس گروپد سوامی (پی۔ ایس۔ پی) نے کہا "بل میں زبان کو بھی ایک بنیاد قرار دیا گیا ہے، اس سے یہ شبہ اور اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ اسے ان صورتوں میں بھی مخالف پارٹیوں کے خلاف استعمال کیا جائے گا جب شکایات بالکل جائز ہوں" راجیہ سبھا کے پرانے اور نہایت سنجیدہ ممبر مسٹر کنزرو نے کہا کہ "اگر حکومت کا خیال یہ ہے کہ اس بل کو پاس کر کے وہ پبلک کی کوئی خدمت کر رہی ہے تو وہ سخت غلطی پر ہے۔" انھوں نے بل کی متعدد خامیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جن کا اثر اظہار خیال کی آزادی وغیرہ پر پڑ سکتا ہے کہا کہ "جنگ کے زمانے میں جو ڈیفنس آف انڈیا رولز بنائے گئے تھے ان میں بھی اس طرح کی سخت دفعات شامل نہ تھیں۔" انھوں نے مزید کہا کہ "اس بل سے تفریق پسندانہ رجحانات ختم نہیں ہو سکتے اس کا دار و مدار مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی راستی اور ایمان داری پر ہے۔"

مسٹر بی ڈی کھوبار اگیڈے نے بل کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ "اس نازک وقت میں یہ مخالف پارٹیوں کو ختم کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔" مسٹر اے ڈی بانی نے کہا "مسئلہ کو صرف قانون کے ذریعہ ختم کرنے کی کوشش کافی نہیں ہے۔ اس کا کوئی سیاسی حل سوچنا چاہیے۔"

اور یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ پارلیمنٹ سے باہر بھی ان ترمیمات پر کافی تشویش و اضطراب کا اظہار کیا گیا۔

ایڈیٹوریل نوٹ

محترم امیر جماعت اسلامی ہند قومی اتحاد و یک جہتی کے جس اہم موضوع پر اشارات لکھ رہے تھے وہ ابھی ناتمام ہیں، لیکن چینی جارحیت کے خلاف اس وقت پورا ملک متحد ہوچکا ہے اور یہی وجہ ہے کہ حکومت نے اس مقصد سے جو کمیٹی بنائی تھی اس نے بھی اپنا کام بند کر دیا ہے۔ بنا بریں اب یہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موضوع کا بقیہ حصہ روک دیا جائے اس لیے قارئین زندگی اس کا انتظار نہ فرمائیں۔ اس وقت ہم سب کو مل کر دو ضروری کاموں کی طرف اپنی توجہ صرف کرنی چاہیے۔ ایک یہ کہ خدا، دین، اخلاق اور روحانی اقدار کے منکر حملہ آوروں سے بھارت کی سرزمین کو پاک کیا جائے، اور دوسرا یہ کہ خود باشندگانِ ملک کے اخلاق و کردار اور ان کے حوصلوں کو بلند کرنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں۔

دنیا پرست حکومتوں اور ملکوں کے معاہدات کی شکست و ریخت کوئی عجیب بات نہیں کیونکہ ان کی بنیاد صرف دنیوی مفاد اور قوم و ملک کی صرف مادی ترقی ہوتی ہے۔ اگر کیے ہوئے عہد و پیمان سے اس مفاد اور اس ترقی پر زد پڑ رہی ہو تو پوری بے شرمی کے ساتھ اسے توڑ دیا جاتا ہے، اس لحاظ سے چین کا ہندستان کی سرحدوں پر حملہ اپنے اندر کوئی خاص ندرت نہیں رکھتا بلکہ یہ حملہ اس نظام کی عین فطرت کے مطابق ہے جو آج چین پر چھایا ہوا ہے۔ اس معاملے میں اشتراکی نظام سرمایہ دارانہ نظام کا ایک ایسا شاگرد ہے جس نے اب استاد کی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ چین کے کمیونسٹ نظام نے اپنی استادی کی تازہ مثال پیش کی ہے۔ جنگ عظیم ثانی میں مغربی حکومتیں بھی دوست ملکوں پر اچانک حملہ کرچکی ہیں، لیکن چین کی بے مروتی و بے حیائی ان سے بھی آگے بڑھ گئی ہے۔ پنچ شیل کی زبردست حمایتی اور "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے لگانے والی حکومت، اوپر کا خول اتار کر اژدہے کی طرح بھارت کی سرحدوں پر پھنکار رہی ہے ـــــ اب یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے کہ ہمارے با اختیار لیڈروں نے چین کی مکارانہ سیاست سے بری طرح مات کھائی ہے بلکہ اب تو وقت اس کا ہے کہ اس خونخوار اژدہے کا سر کچل دیا جائے۔

یہ بھی مغربی سیاست کا ایک بھیانک رُخ ہے کہ اعلان جنگ نہ چین نے کیا ہے، نہ بھارت نے بلکہ دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات بھی اپنی جگہ برقرار ہیں اور باضابطہ جنگ بھی ہو رہی ہے۔ کم سے کم اسلامی سیاست ـــ مسلمانوں کی سیاست نہیں ـــ اس طریقۂ کار سے ناآشنا ہے۔ قرآن تو صاف صاف حکم دیتا ہے کہ "اگر کبھی تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو اس کے معاہدے کو علانیہ اس کے آگے پھینک دو، یقیناً اللہ خائنوں کو پسند نہیں کرتا" اور یہاں صورت حال یہ ہے کہ ہنگامی صورت حال تک کا اعلان ہوگیا لیکن دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات اب بھی قائم

ہیں، دنیا کی موجودہ ڈپلومیسی میں یہ چیز اس لیے جائز سمجھی جاتی ہے کہ اس کی بنیاد کسی اخلاقی قدر پر قائم نہیں ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ وقت ہندستان کے لیے بڑا نازک ہے لیکن اگر وہ چاہے تو چین کے اس حملے سے سبق بھی لے سکتا ہے، چین کو دیر سویر بھارت سے نکلنا پڑے گا اگر وہ بھارت کے کسی حصے پر قبضے کا خواب دیکھ رہا ہے تو یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوگا، اس حملے سے اگر بھارت کے با اختیار لیڈروں پر اشتراکی نظام کی حقیقت کھل گئی تو یہ جنگ بھارت کے لیے مفید ثابت ہوگی۔

اس وقت حکومت ہند کے لیے جتنی یہ بات ضروری ہے کہ اپنے تمام ذرائع و وسائل اختیار کرکے چینی جارحیت کا منہ پھیر دے اتنی ہی یہ بات بھی ضروری ہے کہ اپنی پوری مشینری کو اخلاقی اقدار کے پھیلانے میں لگا دے اور چینی جارحیت کے ساتھ ساتھ خالص مادیت کے بھوت کو بھی مضمحل کر دے، کیونکہ یہ روحانیت سے خالی مادیت ہی ہے جو بے رحم جارحیت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہندستان ایک مذہبی ملک ہے اور سچی مذہبیت ہی میں اس کی نجات ہے۔

ہندوستان کے مسلمان بہترین اخلاقی اقدار کے امین ہیں اس لیے انہیں اس میدان میں خصوصیت کے ساتھ اپنا رول ادا کرنا چاہیے۔ ملک کی ترقی، تحفظ اور دشمن کے حملے سے اس کے دفاع میں کردار کی بلندی بہت بڑا عنصر ہے اس سے غفلت کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ اس ذیل میں برادران وطن کے سامنے یہ بات رکھنی ہے کہ اس نازک وقت میں بھی اگر وہ عام مسلمانوں پر بے اعتمادی کا اظہار کرتے رہیں گے تو ان کے اس طرز عمل سے ملک کو فائدہ نہیں پہنچے گا۔

فریضۂ اقامتِ دین

فقہ کی روشنی میں

مولانا عبدالعلیم اصلاحی

اسلام ایک کامل اور ہمہ گیر دین ہے۔ یہ سمجھنا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرے سے باہر ہے یا کسی شعبۂ زندگی میں اس کی تعلیم ناقص ہے، نصوص شرعیہ سے انکار کے مترادف ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ
وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ
لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔

آج میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا
تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو
بحیثیت دین پسند کر لیا

اس کا مطالبہ پورے دین کو اختیار کرنا ہے۔ ادنے پونے کی سودا بازی ناقابلِ قبول اور باعثِ ہلاکت ہے۔

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ
وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَاءُ مَنْ يَّفْعَلُ
ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا
وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

تو کیا تم کتاب کے کچھ حصہ پر ایمان لاتے ہو
اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو۔ پس یہ تم میں سے جو بھی
کریں گے ان کا بدلہ دنیا میں صرف رسوائی ہے
اور روزِ قیامت شدید ترین عذاب میں دھکیلے جائیں
گے اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔

قرآن اور سنت اور ان کی بنیاد پر علمائے اسلام نے فقہ کے نام سے جو ایک جامع قانون مرتب کر دیا ہے اس کا آپ مطالعہ کریں اور دیکھیں، انسانی زندگی کا وہ کون سا شعبہ ہے جس کے متعلق اصولِ قانون اور قانونی نظائر موجود نہیں ہیں۔

علامہ ابن نجیم نے امورِ دین کو جن مختلف شعبوں میں تقسیم کیا ہے ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہر دور میں اسلام کو کامل نظامِ زندگی سمجھا گیا ہے۔

* جن کو امورِ دین اعتقادات، عبادات، معاملات، حدود و تعزیرات اور آداب سے متعلق ہیں۔

اعتقادات کی پانچ قسمیں ہیں۔ ایمان باللہ۔ ایمان بالملائکہ۔ ایمان بالرسل۔ ایمان بالکتب۔ ایمان بالیوم الآخر۔ عبادات بھی پانچ ہیں۔ نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، جہاد۔ معاملات بھی پانچ ہیں۔ مالی معاوضات، مناکحات، مخاصمات، امانات، ترکہ و میراث۔ حدود اور تعزیرات بھی اصلاً پانچ چیزوں سے متعلق ہیں۔ قتل نفس، سلب مال، ہتک ستر، ہتک عزت، قطع نسل۔ آداب چار ہیں۔ اخلاق، شمائل حسنہ، سیاسات، معاشرتی مسائل

"البحر الرائق، کتاب الطہارۃ"

صاحب ہدایہ کتاب البیوع میں لکھتے ہیں :۔ لان البیع انشاء تصرف والانشاء یعرف بالشرع۔ یعنی بیع ایک تصرف کا پیدا کرنا ہے۔ اور تصرف کا پیدا کرنا شریعت سے معلوم کیا جاتا ہے۔ اس فقرہ میں دراصل ایک اصول بنا یا گیا ہے کہ اللہ کی اس زمین پر تصرف کے لیے شریعت کی اجازت ضروری ہے یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے احکام کی ایسی تقسیم کی ہے جو انسان کی پوری زندگی کو محیط ہے اور کوئی حرکت، کوئی فعل، کوئی حادثہ اور واقعہ اس سے باہر نہیں ہو سکتا۔ ان کے نزدیک احکام کی دو قسمیں ہیں عزیمت اور رخصت، عزیمت اصل ہے اور وقتی عوارض کی بنا پر جو حکم لگایا جاتا ہے اسے رخصت کہتے ہیں۔ عزیمت کی اقسام فرض، واجب، سنت، نفل، حرام، مکروہ اور مباح ہیں۔ آج تک مسائل اور معاملات کی کوئی ایسی قسم نہیں معلوم ہو سکی اور نہ قیامت تک وقوع پذیر ہو سکتی ہے جس کے بارے میں کہا جائے کہ شرعی احکام کے تحت نہیں آتی۔

اوپر ہم نے فقہی تصریحات نقل کی ہیں ان کے ہوتے ہوئے جو لوگ زندگی کے بہت سے شعبوں کو دین سے خارج بتاتے ہیں اور کہتے ہیں۔ فلاں معاشی مسئلہ ہے۔ یہ حکومت کی باتیں ہیں۔ یہ دنیاوی معاملہ ہے دین کو ان سے کیا بحث، ایسے لوگ درحقیقت یا تو مرعوبیت اور ہوی پرستی کے شکار ہیں یا پھر دینی شعور سے نابلد ہیں۔

اللہ تعالیٰ حاکم علی الاطلاق ہے

شریعت اسلامی جب ہر شعبۂ زندگی کے لیے اپنا ایک مخصوص حکم اور قانون رکھتی ہے اور ناقص نہیں ہے تو لازماً وہ ہرگز اس بات کی روادار نہیں ہو سکتی کہ کوئی اس کے حدود سے ذرہ برابر تجاوز کرے اور غیر خدا کی حاکمیت تسلیم کرے خواہ وہ انسان کا اپنا نفس ہو یا کوئی غیر الٰہی حکومت یا کسی ملک کے جمہور اور عوام، قانون کی ہمہ گیری سے قانون ساز کی ہمہ گیری از خود ثابت ہوتی ہے چنانچہ اسلام کے نزدیک حاکم اعلیٰ صرف ایک ہے۔

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ	حکم صرف اللہ کے لیے ہے
فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ	حکم اللہ ہی کے لیے ہے جو بالا دست اور بڑا ہے

لَا طَاعَۃَ لِمَخْلُوْقٍ فِیْ مَعْصِیَۃِ الْخَالِقِ

خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں ہے۔

فقہ میں بھی اس کی صراحت موجود ہے۔

وَالَّذِیْ یُعْلَمُ مِنَ التوضیح فی ضبطھا ان الحکم مفتقر الی الحاکم والمحکوم علیہ والمحکوم بہ فالحاکم ھو اللہ تعالیٰ والمحکوم علیہ ھو المکلف والمحکوم بہ فعل المکلف (نور الانوار ص ۲۶۶)

قواعد کے ضبط میں توضیح سے جو چیز معلوم ہوتی ہے وہ یہ کہ حکم محتاج ہے حاکم، محکوم علیہ اور محکوم بہ کا، پس حاکم اللہ تعالیٰ ہے اور محکوم علیہ مکلف اور محکوم بہ مکلف کا عمل ہے۔

توضیح میں مزید وضاحت ہے۔

القسم الثانی من الکتاب فی الحکم ویفتقر الی الحاکم وھو اللہ تعالیٰ لا العقل علی ما مر فی باب الامر (ص ۲۰۲) لا حکم الا من اللہ تعالیٰ بالاجماع الائمۃ لا کما فی کتب بعض المشائخ ان ھذا عندنا وعند المعتزلۃ الحاکم العقل فان ھذا مما لا یجتری علیہ احد ممن یدعی الاسلام [illegible]

کتاب میں سے قسم ثانی حکم کے بارے میں ہے اور حکم محتاج ہے حاکم کا اور وہ اللہ تعالیٰ ہے نہ کہ عقل جیسا کہ باب الامر میں گزر چکا۔ حکم صرف اللہ کا ہے اس پر ائمہ کا اجماع ہے نہ کہ جیسا بعض مشائخ کی کتابوں میں ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک حاکم عقل ہے کیونکہ یہ ایسی بات ہے جس کی جرأت کوئی مدعی اسلام نہیں کر سکتا

معلوم ہوا کہ جس طرح اللہ کے علاوہ کوئی شخص، کوئی خاندان، کوئی گروہ اور کوئی قوم حکم کرنے کی مجاز نہیں ہے اسی طرح مجرد عقل اور تجربہ کی بنیاد پر بھی کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا اور خدا کی حاکمیت علی الاطلاق کا یہ کہکر انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت ساری چیزیں عقل اور تجربہ سے بھی ثابت ہوتی ہیں اسی لیے فقہاء کو اس کی ضرورت پڑی کہ صریح لفظوں میں عقل کی حاکمیت کا انکار کر دیا جائے لیکن قابل رنج بات یہ ہے کہ اس وضاحت کی ضرورت پہلے غیر مسلم فلسفیوں کے مقابل میں پڑی تھی اور آج علمبرداران اسلام کے مقابل میں ہے۔

اصول شریعت

حاکم اعلیٰ اللہ کے تفصیلی احکام اور قوانین معلوم کرنے کے لئے صرف چار ذرائع ہیں کتاب، سنت، اجماع، قیاس، کتاب تو اس لیے کہ وہ صریح طور پر حاکم اعلیٰ

کا کلام ہے اور سنت اس لیے کہ رسول یعنی اس کے نمائندہ کی قولی اور عملی تعلیم کا نام سنت ہے اور اجماع اس لیے کہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ ہے رہا قیاس اور اس کی دوسری شاخیں استحسان، استصحاب وغیرہ تو ان کی اپنی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے بلکہ کچھ خاص شرائط اور قیود کے ساتھ کتاب وسنت کے مخفی احکام معلوم کرنے کے ذریعہ بنتے ہیں بجائے خود ان سے کوئی حکم ثابت نہیں ہوتا۔

ان چار ذرائع سے جو حکم بھی معلوم ہوگا وہ شریعت کا قانون ہوگا اور ان طریقوں کو چھوڑ کر جو قانون اور ضابطہ بھی بنایا جائے وہ اللہ کی تشریعی حاکمیت سے انکار کی دلیل ہے

دین کی ہمہ گیری کا تقاضا

مذکورہ تینوں مسلمات، اسلام کا ہمہ گیر ہونا، اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور شریعت کے اصول اربعہ کو تسلیم کرنے کا تقاضا ہے کہ انسان کا سراپا دین میں گم ہو جائے اور تمام مسائل زندگی کی اساس دین قرار پائے۔ انسان مدنی الطبع ہے اس کو ہر دور میں اجتماعی نظم کی ضرورت رہی ہے جو سب کو کنٹرول کر سکے۔ انتشار اور انارکی اجتماعیت کی ضد ہے اس انتشار اور انارکی کو دور کرنے اور اجتماعی نظم قائم کرنے ہی کا نام ہماری زبان میں حکومت ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کیوں دین کی بنیاد پر نہ ہو۔ کس دلیل کی بنا پر انسانی زندگی کے اس اہم شعبہ کو خدائی حاکمیت سے آزاد کیا جائے کیا حکومتی عمل خدا کی بنائی ہوئی دنیا کے علاوہ کسی دوسری دنیا میں ہوتا ہے یہ زمین اس کی، آسمان اس کا، ساری مخلوق اس کی تو پھر کس بنیاد پر اس کے حکم کے بغیر تصرف کرنا روا ہو سکتا ہے کیا اس کی کوئی سند پیش کی جا سکتی ہے کہ اس نے اپنے اقتدار اور اختیار کو محدود کر دیا ہے خدا کے پیغمبروں نے اس کی حاکمیت کے لیے کوئی لائن کھینچ دی ہے کہ یہ خدائی حکومت کی سرحد ہے اور یہ قیصر کی۔

عقل کا تقاضا، شرعی مسلمات، اسوۂ انبیاء اور خلفاء راشدین کی اتباع کا مطالبہ ہے کہ حکومتی عمل بھی اسلام کے زیر سایہ ہو اور خدائی ہدایت کے تحت ہو نہ کہ اس سے آزاد۔

ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے۔ شریعت کے کچھ احکام ہر ہر فرد سے متعلق ہیں اور ایک معتد بہ تعداد ایسے احکام کی ہے جن کی مخاطب پوری امت ہے۔ مثلاً قرآن میں صریح طور سے چور کے بارے میں حکم ہے اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹو۔ یہ ایک کھلا ہوا حکم ہے جس کا مخاطب کسی فرد یا طبقہ کو نہیں بنایا گیا بلکہ تمام مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے لیکن اس حکم کی تعمیل ہر ہر شخص الگ الگ نہیں کر سکتا اور نہ بیک وقت پوری امت کے ہاتھوں اس کی تعمیل ہو سکتی ہے۔ پھر تعمیل کیسے ہو اس کا

صرف ایک جواب ہے وہ یہ کہ پوری امت جسدِ واحد بن جائے اس کا ایک قائد اور سربراہ اس کا اپنا ایک اجتماعی نظم ہو اور اس کے ذریعہ اجتماعی احکام کی تنفیذ عمل میں آئے۔ امت میں انتشار اور انار کی ہو تو شریعت کے بہت سارے احکام کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔ اسی بنا پر اسلام میں اجتماعیت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ ارشاد باری ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (اللہ تعالیٰ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور آپس میں تفرقہ میں نہ پڑو)

حضور نے فرمایا۔ من شذ عن الجماعۃ شذ فی النار۔ جو جماعت سے الگ ہوا وہ آگ میں گیا۔ عَلَيْكُمْ بِالْجَمَاعَةِ فَإِنَّمَا يَأْكُلُ الذِّئْبُ مِنَ الْغَنَمِ الْقَاصِيَة۔ تم پر جماعت لازم ہے اس لیے بھیڑیا انہیں بکریوں کو کھاتا ہے جو گلہ سے بچھڑ جاتی ہیں۔

عہدِ رسالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات خود اللہ کی جانب سے پوری امت کی راہبر اور رہنما تھی اور وہ سب احکام جو اجتماعیت سے تعلق رکھتے تھے آپ کے ہاتھوں انجام پاتے اور آپ کے وصال کے بعد صحابہ کرام نے اس ذمہ داری کو کما حقہٗ ادا کیا اور رسول خدا کی امت انتشار کی شکار نہیں ہوئی۔

اجتماعیت کے اسی نظام کو اسلام کی اصطلاح میں خلافت، وامارت سے تعبیر کیا گیا اور اسی خلافت کو ہم اسلامی حکومت یا حکومت الٰہیہ کہتے ہیں یہ حکومت مختلف ناموں سے ہر دور میں مسلمان کا مطمح نظر اور اس کے نزدیک حکومت کا سب سے اعلیٰ معیار رہی ہے اور اس کو یہ یقین رہا ہے کہ اس کا قیام ایک فریضہ ہونے کے ساتھ دنیا سے شر و فساد مٹا کر امن قائم کرنے کی واحد تدبیر ہے

اسلامی حکومت اوپر کی گفتگو سے اسلامی حکومت کی تعریف خود متعین ہو جاتی ہے لیکن مزید توضیح کے لیے میں یہاں ابن خلدون اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعریفیں نقل کرتا ہوں ابن خلدون نے خلافت کی جو تعریف کی ہے اس کا مفہوم یہ ہے :-

"خلافت کے لغوی معنے جانشینی اور اس کا اصطلاحی مفہوم آں حضرت صلعم کے جانشین کی حیثیت سے مطلق دین اور دنیاوی امور میں فرماں روائی کا حق تھا خلیفہ کی شخصیت شرعی نقطہ نظر سے دینی اور دنیاوی معاملات میں فرماں روائی کی حامل تھی یہ فرماں روائی شریعت کے دستور اور قوانین کی پابند تھی۔ خلافت کا حقیقی مقصد ناموس اسلام کا تحفظ اور شرعی نقطہ نگاہ سے حکومت کے نظم و نسق کی تنظیم اور اس کا قیام تھا۔ مقدمہ ص ۱۹۶

شاہ ولی اللہ صاحب نے خلافت کی تعریف یوں کی ہے :-

هي الرياسة العامة في التصدي	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں علوم
لاقامة الدين باحياء العلوم الدينية	دینیہ کے زندہ کرنے اور ارکان اسلام کو قائم
واقامة اركان الاسلام والقيام	کرنے اور جہاد اور متعلقات جہاد جیسے لشکروں کو
بالجهاد وما يتعلق به من ترتيب	تربیت دینے، مجاہدین کو وظائف دینے مال غنیمت
الجيوش والفرض للمقاتلة و	کو تقسیم کرنے اور عہدۂ قضا کے فرائض انجام
اعطاءهم من الفئ والقيام بالقضاء	دینے اور حدود کو قائم کرنے اور مظالم کو رفع
واقامة الحدود ودفع المظالم و	کرنے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے
الامر بالمعروف والنهي عن المنكر	ذریعہ اقامت دین کا اہتمام کرنے والی ریاست
نيابة	عامہ کو خلافت کہتے ہیں۔

یہ دو اقتباس اسلامی حکومت کی تعریف متعین کرنے کے لیے بالکل کافی ہیں۔ اسلامی حکومت کے مقاصد اور دائرۂ کار کو غیر مبہم الفاظ میں بیان واضح کر دیا گیا ہے اب جو لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں حکومت کا کوئی خاص تصور اور خاکہ نہیں ہے ان سے پوچھا جائے کہ اگر یہ خاص تصور نہیں تو کیا ہے۔ کسی خاص ہیئت کا متعین نہ ہونا اور بات ہے اور مقاصد، دائرۂ کار اور آئیڈیالوجی کا متعین نہ ہونا دوسری بات ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی حکومت علمی اور نظری، عملی اور واقعاتی ہر لحاظ سے ایک جانی پہچانی چیز ہے تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ خلفائے راشدین نے جس نوعیت کی حکومت بنائی وہ حکومت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے اور اسی کا نام اسلامی حکومت ہے لیکن حقائق کو جھٹلانے پر اگر کوئی تل جائے تو اس کا علاج ہی کیا ہے۔

اقامتِ خلافت کی دینی حیثیت

اسلامی حکومت کی تعریف متعین ہو جانے کے بعد فوراً یہ سوال آتا ہے کہ اس کو برپا کرنے کی دینی حیثیت کیا ہے؟ فرض ہے، نفل ہے، مباح ہے، آخر کیا ہے۔

شریعت اسلامی کا یہ ایک کلیہ اور طے شدہ اصول ہے کہ فرائض اور واجبات کی ادائیگی جن چیزوں پر موقوف ہوتی ہے وہ بھی فرض اور واجب ہو جاتی ہیں۔ مثلاً وضو کی فرضیت کے ساتھ ساتھ پانی کے حصول کی کوشش بھی بقدر استطاعت فرض ہے اگر کوئی شخص وضو نہ کرنے کی وجہ یہ بتائے کہ میں مسجد میں گیا لیکن

وہاں پانی موجود نہ تھا تو اس کا یہ عذر کسی طرح بھی وضو کی فرضیت ساقط نہیں کر سکتا کیونکہ اس پر کنوئیں سے پانی نکالنا یا کسی سے طلب کرنا بھی ویسے ہی فرض ہے جیسے وضو فرض ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ پانی کے حصول کے لیے جو ذرائع اور وسائل اکٹھا کرنے ضروری ہیں ان سب کا مہیا کرنا بھی حسب استطاعت فرض ہے۔ اسی بنا پر کسی مسافر کے لیے بھی طلب اور جستجو سے پہلے جائز نہیں کہ وضو کے بجائے تیمم کرے بشرطیکہ آس پاس پانی ملنے کی توقع ہو یا اس کے کسی ساتھی کے پاس موجود ہو

الا تری ان تحصیل اسباب	کیا تم نہیں جانتے کہ واجب کے ذرائع
الواجب واجب وتحصیل اسباب	کا حاصل کرنا واجب اور حرام کے ذرائع کا
الحرام حرام بالاجماع (مسلم الثبوت ص۳۴)	حاصل کرنا حرام ہے بالاجماع۔

اس اصول[1] کو جان لینے کے بعد آپ قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی میں مندرج احکام پر ایک نگاہ ڈالیے

---

[1] اصول شرع کا یہ ایک اہم مسئلہ ہے اس لیے مکمل شکل میں اسے پیش کرنا چاہیے ورنہ غلط فہمی کا امکان ہے ــــ جس واجب کے اسباب وشروط کی تحصیل واجب ہوتی ہے اس میں علمائے اصول فقہ نے دو قیدیں لگائی ہیں ایک یہ کہ وہ واجب مطلق ہو، شارع کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو، دوسری یہ کہ وہ سبب وشرط مکلف کے مقدور میں ہو۔ ان دو قیدوں میں سے کوئی ایک قید بھی اگر غائب ہو جائے تو پھر سبب وشرط کی تحصیل واجب نہ ہوگی۔ پہلی قید کی شرعی مثال وجوب زکوٰۃ کا مسئلہ ہے۔ چاندی سونے میں وجوب زکوٰۃ کا سبب، ایک مکمل نصاب کی ملکیت ہے اور شرط حولان حول ہے لیکن کسی مسلمان پر نہ اس سبب کی تحصیل واجب ہے اور نہ اس شرط کی۔ یعنی کسی مسلمان پر نہ تو یہ واجب ہے کہ وہ جدوجہد کر کے صاحب نصاب بنے اور نہ کسی صاحب نصاب پر یہ واجب ہے کہ زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے وہ سال بھر تک بہر حال نصاب کو محفوظ رکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وجوب زکوٰۃ کا حکم مطلق نہیں ہے بلکہ شریعت کی طرف سے ایک مقید حکم ہے۔ شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ "اگر کوئی مسلمان صاحب نصاب ہوا اور سال بھر تک اس کے پاس نصاب محفوظ رہے تو اس پر اس نصاب کی زکوٰۃ واجب ہے" اس طرح کے مقید حکم وطلب میں کسی شخص پر شریعت کی طرف سے سبب وشرط کی تحصیل کا فریضہ عائد نہیں ہوتا بلکہ جب سبب وشرط پائے جائیں تو اس حکم پر عمل واجب ہوتا ہے۔ دوسری قید کی مثال نماز کے اوقات ہیں جن کو اسباب کی حیثیت حاصل ہے لیکن ان اسباب کی تحصیل کسی پر واجب نہیں اس لیے کہ وہ انسان کے بس سے باہر ہیں۔ ایسا واجب جو شریعت کی طرف سے کسی سبب یا شرط کے ساتھ مقید نہ ہو بلکہ مطلق ہو (باقی اگلے صفحہ پر)

اور دیکھیے کتنے فرائض اور واجبات کی ادائیگی کا دار و مدار اسلامی حکومت کا قیام قرار پاتا ہے۔ بطور مثال چند احکام ملاحظہ ہوں۔

جہاد، قطعِ ید، حدِ قذف، حدِ زنا، حدِ خمر اور معاملات میں اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ کرنا۔ یہ قرآن کے قطعی احکام ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ان پر آج عمل نہیں ہو رہا ہے ہر مسلمان قرآن میں پڑھتا ہے۔ مدرسوں میں ان پر بحثیں ہوتی ہیں۔ تکرار ہوتی ہے مقررین اور مصنفین

حاشیہ کا بقیہ) لیکن جس کا وجود یا صحت ادا کسی سبب یا شرط پر موقوف ہو تو ایسے سبب یا شرط کی تحصیل واجب ہے مثلاً شارع کسی مسلمان کو مکلف کرے کہ "اپنا غلام آزاد کر" تو اس واجب کا وجود یعنی اس غلام کی آزادی ایک سبب پر موقوف ہے اور وہ ہے لفظ اَعْتَقْتُ کا نطق، یعنی جب تک کوئی شخص یہ نہ کہے کہ "میں نے اس غلام کو آزاد کیا" اس وقت تک غلام آزاد نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا اس سبب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی یا شارع نے کسی کو مکلف گردانا کہ "علم حاصل کر" ظاہر ہے کہ اس واجب کا حصول چند اسباب پر موقوف ہے تو ان اسباب کی تحصیل اس پر واجب ہوگی اس لیے کہ ان اسباب کی تحصیل کے بغیر عام حالات میں علم حاصل نہیں ہوتا۔

صحت ادا کی مثال نماز میں وضو کی شرط ہے۔ اچھی طرح ذہن نشین کرنا چاہیے کہ وضو وجوب صلوٰۃ کی شرط نہیں ہے بلکہ صحت ادا کی ہے یعنی بات یہ نہیں ہے کہ جب تمہیں وضو ہو تو تم پر نماز واجب ہے بلکہ یہ ہے کہ نماز جو تم پر واجب ہے وہ وضو کے بغیر ادا نہیں ہوتی لہٰذا جس شخص پر نماز واجب ہو اس پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے۔ وجوب زکوٰۃ کی شرط اور صحت ادائے صلوٰۃ کی شرط میں بنیادی فرق ہے جس کو سمجھ لینا چاہیے۔ اسباب و شروط کی تحصیل کے وجوب و عدم وجوب کی تفصیل نہ جاننے کی وجہ سے بعض ذہین لوگوں کو بھی دھوکا ہو جاتا ہے —— اب ان تفصیلات کو سامنے رکھ کر غور کیجیے کہ مثال کے طور پر، چور کا ہاتھ کاٹ دینے اور زانی کو کوڑے مارنے کی جو مطلق تکلیف مسلمان کو دی گئی ہے اس کا وجود یا صحتِ ادا حکومت کی شرط پر موقوف ہے یا نہیں؟ اگر ہے اور یقیناً ہے تو اس شرط کی تحصیل بھی یقیناً واجب ہوگی بالفرض کوئی شخص دعویٰ کرتا ہے کہ قطعِ ید وغیرہ کا وجوب مطلق نہیں ہے بلکہ مقید ہے تو اسے اس کا ثبوت دینا چاہیے۔

علمائے حق اس پر متفق ہیں کہ نصب امام یا اسلامی حکومت کا قیام ان احکام کی ادائیگی کے لیے موقوف علیہ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی ان احکام کے وجوب میں بھی بات یہ نہیں ہے کہ اگر خلیفہ موجود ہو اور حکومت قائم ہو تو ان پر عمل کرو بلکہ بات یہ ہے کہ یہ احکام جو تم پر واجب ہیں وہ نصب خلیفہ اور حکومت کے بغیر ادا نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا ان احکام پر عمل کرنے کے لیے تم پر اس شرط کی تحصیل واجب ہے۔ (مدیر)

اُن کی باریکیاں بیان کرتے ہیں ان کے فوائد اور ان کے اندر پوشیدہ حکمتوں پر سننے اور پڑھنے والے مسرور ہوتے ہیں مگر جب عمل کا سوال آتا ہے تو جواب نفی میں ہوتا ہے اور بڑی آسانی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ اس کے کے لیے حکومت ضروری ہے اور آج حکومت اسلامی نہیں ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ جب یہ احکام اسلامی حکومت پر موقوف ہیں تو پھر شرط موقوف علیہ کی تحصیل ہم پر واجب ہے۔ اوپر کی مثالوں میں سے ایک کی ذرا تفصیل ہم پیش کرتے ہیں تاکہ ہمارا مقصود اچھی طرح واضح ہوسکے۔ ہدایہ کے محشی لکھتے ہیں۔

واما وصف القضاء ففرض كفاية فلو امتنع الكل اثموا وقد امره الله تعالىٰ نبيه صلى الله عليه وسلم بقوله "وان احكم بينهم بما انزل الله اليك" وبعث صلى الله عليه وسلم عليا قاضيًا الى اليمن و معاذا وعليه اجماع المسلمين	رہا قضا کا حکم تو وہ فرض کفایہ ہے اگر سب لوگ رک جائیں تو گنہگار ہوں گے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ لوگوں کے درمیان اللہ کی نازل کی ہوئی ہدایت کے مطابق فیصلہ کرو اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی اور حضرت معاذ کو یمن کی طرف قاضی بنا کر بھیجا اور اس پر مسلمانوں کا اجماع ہے۔

کتاب المبسوط میں کتاب القاضی کی ابتدا ان الفاظ میں کی گئی ہے۔

اعلم بان القضاء بالحق من اقوى الفرائض بعد الايمان بالله تعالىٰ وهو من اشرف العبادات لاجله اثبت الله تعالىٰ لآدم عليه السلام اسم الخلافة فقال جل جلاله "اِنّي جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً" واثبت ذالك لداؤد عليه السلام فقال عز وجل "يَا دَاؤدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ" وبه امر كل نبي مرسل حتى خاتم الانبياء عليهم الصلوٰة والسلام۔ قال الله تعالىٰ	جان لو حق کے ساتھ فیصلہ کرنا ایمان باللہ کے بعد قوی ترین فرائض اور افضل ترین عبادات میں سے ہے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کے لیے خلیفہ کا نام تجویز فرمایا اور ارشاد ہوا۔ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔ یہی چیز کو داؤد علیہ السلام کے لیے قائم رکھا اور فرمایا اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا اور اسی بات کا ہر نبی حتی کہ خاتم الانبیاء کو بھی حکم دیا اور ارشاد ہوا ہم نے تورات اتاری اس میں ہدایت اور نور ہے جس کے مطابق انبیاء فیصلہ کرتے ہیں

انا انزلنا التورٰۃ فیہا ھدی ونور ۔ اور نیز ارشاد ہے اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے
یحکم بہا النبیون وقال تعالیٰ ان احکم مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو اور ان کی
بینہم بما انزل اللہ الیک ولا تتبع اھواءھم خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اس کے بعد صاحب مبسوط نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام حضرت عمر کے ایک خط سے یہ فقرہ نقل کیا ہے اما بعد فان القضاء فریضۃ محکمۃ وسنۃ متبعۃ یعنی قضا ایک محکم فریضہ ہے اور قابل اتباع سنت ہے اور سنت کی تشریح اس طرح کی ہے سنۃ متبعۃ ای طریقۃ مسلوکۃ فی الدین یجب اتباعھا علیٰ کل حال یعنی سنت دین میں ایک ایسا لائق پیروی طریق ہے جس کی اتباع ہر حال میں واجب ہے۔

یہ ہے وہ فریضہ جو تمام انبیاء علیہم السلام پر عائد کیا گیا اور آخر میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس کا حکم دیا گیا اور بڑی شدومد کے ساتھ جس کا اندازہ ان آیات سے ہوتا ہے۔

مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ — جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں
فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ — کیا وہ ظالم ہے۔
مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ — جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کیا
فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ — وہ فاسق ہے۔
مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ — جس نے اللہ کی ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں
فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۝ — کیا وہ کافر ہے۔

مسئلہ کی اہمیت کا اندازہ فرمائیے اور بتائیے اس فریضہ کی ادائیگی کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ ہاں یہ واضح رہے کہ غیر اسلامی حکومتوں میں جو جج اور عدالتیں ہوتی ہیں ان کے ذریعہ یہ فرض ہرگز ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ قاضی کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ بما انزل اللہ کے مطابق فیصلہ کرے۔ اور دوسری شرط یہ کہ وہ مسلمان ہو یہاں یہ بات بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ صرف نکاح، طلاق اور میراث ہی کے معاملات میں شرعی قاضی کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ بلا استثناء سارے معاملات زندگی میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلہ لینے کے علاوہ ایک مومن کے لیے کوئی دوسری راہ نہیں ہے اب سوال یہ ہے کہ ان شرائط و قیود کے ساتھ مقید عدالتیں دنیا کی کس حکومت نے مسلمانوں کو مہیا کر دی ہیں یا دے سکتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس فرض کفایہ کی ادائیگی اور دیگر بے شمار فرائض سے سبکدوشی اسلامی حکومت کے بغیر ناممکن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بااختیار امام اور خلیفہ کا مقرر

کرنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ عقائد کی مشہور کتاب شرح عقائد نسفی میں صاحب کتاب لکھتے ہیں:۔

ثم الاجماع على ان نصب الامام واجب والمذهب انه يجب على الخلق سمعاً لقوله عليه السلام من مات ولم يعرف امام زمانه فقد مات ميتة جاهلية ولان الامة قد جعلوا اهم المهمات بعد وفات النبي صلى الله عليه وسلم نصب الامام حتى قدموه على الدفن وكذا بعد موت كل امام ولان كثيرا من الواجبات الشرعية يتوقف عليه كما اشار اليه بقوله والمسلمون لابد لهم من امام يقوم بتنفيذ احكامهم واقامة حدودهم وسد ثغورهم وتجهيز جيوشهم واخذ صدقاتهم وقهر المتغلبة والمتلصصة وقطاع الطريق واقامة الجمع والاعياد وقطع المنازعات الواقعة بين العباد وقبول الشهادات القائمة على الحقوق وتزويج الصغار والصغائر الذين لا اولياء لهم وقسمة الغنائم

(ص ۱۰۹)

پھر اس بات پر اجماع ہے کہ امام کا مقرر کرنا واجب ہے اور اہل حق کا مذہب یہ ہے کہ مخلوق پر واجب ہے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول کی بنا پر کہ جو مر گیا اور اپنے زمانے کے امیر کو نہیں پہچانا وہ جاہلیت کی موت مرا اور اس لیے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد امت نے سب سے اہم کام امام کے تعین کو قرار دیا یہاں تک کہ دفن پر مقدم رکھا اور ایسے ہی ہر امام کی وفات کے بعد ہوا اور اس لیے بھی کہ بہت سے شرعی واجبات اس پر موقوف ہیں جیسا کہ ماتن نے اشارہ کیا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا امام ضروری ہے جو ان کے احکام کو جاری اور ان کے حدود کی اقامت اور ان کے سرحدوں کی حفاظت اور ان کے لشکروں کی تیاری اور باغیوں، چوروں، ڈاکوؤں کو مغلوب اور جمعہ وعید کی اقامت اور لوگوں کے درمیان پیدا شدہ قضیوں کا فیصلہ اور حقوق پر ثابت ہونے والی شہادتوں کو قبول اور لا وارث بچوں اور بچیوں کی شادی اور مال غنیمت کی تقسیم کرنے کی ذمہ داری اٹھائے۔

علامہ ابن حزم لکھتے ہیں:۔

اتفق جميع اهل السنة وجميع المرجئة وجميع الشيعة وجميع الخوارج

تمام اہل سنت، مرجئہ، شیعہ اور باستثناء نجدات تمام خوارج امامت کے وجوب پر متفق ہیں

على وجوب الامامة وان الامة يجب عليها الانقياد لامام عادل يقيم فيهم احكام الله ويسوسهم باحكام الشريعة التي اتى بها رسول الله صلعم حاشا النجدات من الخوارج

اور اس بات پر بھی کہ امت پر ایک ایسے امام عادل کی اطاعت واجب ہے جو اللہ کے احکام قائم کرے اور لوگوں کا نظم اس شریعت کے احکام کے مطابق چلائے جو اللہ کے رسول لائے ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب ازالۃ الخفاء میں لکھتے ہیں:۔

واجب بالکفایۃ است بر مسلمین الی یوم القیامۃ نصب الخلیفۃ مستجمع شروط بچند وجہ یکے آنکہ صحابہ رضوان اللہ علیہم بہ نصب خلیفہ وتعیین او پیش از دفن آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم متوجہ شدند پس اگر از شرع وجوب نصب خلیفہ ادراک نمی کردند بریں امر خطیر مقدم نمی ساختند وایں وجہ اثبات دلیل شرعی از آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم می نماید بر وجہ اجمال۔

ایسے خلیفہ کو مقرر کرنا جو جامع شرائط ہو روز قیامت تک مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے چند وجوہ کی بنا پر پہلی وجہ یہ کہ صحابہ کرام نے خلیفہ کے نصب اور تعیین کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تدفین پر مقدم رکھا۔ اگر انھوں نے خلیفہ کی تعیین کے وجوب کو شریعت سے ادراک نہ کیا ہوتا تو اس اہم کام پر اسے مقدم نہ کرتے۔ یہ صورت اجمالی طور پر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے دلیل شرعی کا اثبات کرتی ہے۔

ان معتبر حاملین شریعت نے امام اور خلیفہ کے تعین کو فرض کفایہ بتایا اور دعویٰ کر رہے ہیں کہ اس بارے میں امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ فریضہ کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص یا کسی خاص مقام کے ساتھ مقید بھی نہیں ہے اس لیے مخصوص حالات یا مخصوص ممالک ومقامات اور موہوم خطرات کی بنا پر اس فرض کفایہ کی فرضیت اور اس کے ایک مسلّم حقیقت ہونے سے انکار کرنا ایک جرم سے کم نہیں۔ ایک مومن کے لیے صحیح روش یہی ہو سکتی ہے کہ اپنی وسعت کے مطابق اس کے لیے کوشش کرے اور اگر کوئی اپنے اندر ہمت اور سکت نہیں پاتا تو کم از کم جو بات ہو سکتی ہے وہ یہ کہ کوشش کرنے والوں کے لیے اللہ سے دعا کرے۔ رہے وہ لوگ جو اقتدار وقت کی خوشامد اور ذاتی فائدوں کے لیے اسلامی حکومت کا نام لینے والوں کے سروں پر کلہاڑی مارنے پر آمادہ ہیں۔ انھیں خدا سے ڈرنا چاہیے۔ یہ عجیب بات ہے کہ کچھ لوگ اسلام کا دعویٰ کرتے ہوئے لادینی حکومتوں کے قیام کی تائید کر سکتے ہیں لیکن تحریک اقامت دین کی تائید نہیں کر سکتے بلکہ اس کے

مقابلے کے لیے محاذ بنا سکتے اور کوشش کرنے والوں کو غیر مسلمین کے سامنے ملعون کر سکتے ہیں۔ ع

ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا

ایک غلط فہمی کا ازالہ

کہا جاتا ہے کہ اسلام میں حکومت مقصود نہیں ہے اس لیے اسلامی حکومت کو نصب العین نہیں بنایا جا سکتا لیکن ہم نہیں سمجھ سکے کہ کسی چیز کو قابل رد اور قابلِ اجتناب قرار دینے کے لیے مقصود اور نامقصود کی بحث کیوں چھیڑی گئی۔ کسی چیز پر حکم لگانے کے لیے فقہ میں جو اصطلاحیں ہیں انھیں کیوں نہیں استعمال کیا گیا نامقصود کے بجائے حرام، مکروہ، ناجائز کہنا زیادہ مناسب تھا یہ سیدھا طریقہ چھوڑنے کی وجہ یا تو لفظ غیر مقصود کی فقہی اصطلاح سے ناواقفیت ہے یا لوگوں کو فریب دینے کی کوشش۔ فقہ کی اصطلاح میں کسی شے کے غیر مقصود ہونے کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ وہ چیز غیر اہم اور لائق اجتناب ہے۔ فقہاء نے عبادات کی دو قسمیں کی ہیں مقصودہ اور غیر مقصودہ۔ مثلاً نماز عبادت مقصودہ ہے اور وضو، سترِ عورت، استقبالِ قبلہ، اذان غیر مقصودہ ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وضو فرض ہے۔ ستر عورت، استقبال قبلہ نماز کے لیے شرط ہیں اور اذان کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ اگر کوئی بستی بالکلیہ اذان کو ترک کر دے تو اس سے قتال کیا جائے گا۔ اب ایک شخص کہے کہ یہ ساری چیزیں دین میں مقصود نہیں ہیں اس لیے نعوذ باللہ غیر اہم اور ناقابلِ اہتمام ہیں تو اس شخص پر آپ کیا حکم لگائیں گے۔

فقہاء نے امور دین کو پانچ اقسام پر تقسیم کیا ہے۔ اعتقادات، عبادات، معاملات، آداب، حدود اور تعزیرات، اس تقسیم کی بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا۔ کہ اصطلاح فقہ کی رو سے دین کا کم از کم ۳/۵ حصہ مقصود نہیں ہے۔ مثلاً قتال فی سبیل اللہ افضل ترین عبادت ہے لیکن اس کے باوجود خود مقصد نہیں ہے بلکہ ایک مقصد کا وسیلہ ہے۔ اسی طرح شریعت کے حدود ہاتھ کاٹنا، کوڑے لگانا، سنگسار کرنا بھی اصلاً خود مقصود نہیں ہیں لیکن ان کی اہمیت و وجوب کا حال یہ ہے کہ ان کا انکار یا ترک تو دور کی بات ہے ان سے غفلت یا مجرمین کی پاسداری اور رعایت بھی جرم عظیم ہے۔

وَلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَ الْيَوْمِ الْآخِرِ	ان دونوں زانی مرد اور عورت پر تم کو اللہ کے دین میں رحم نہ آئے اگر تمہیں اللہ اور قیامت پر ایمان ہے۔

چنانچہ اس طرح کے سارے احکام فقہاء کی زبان میں مقصود الفعل اور مطلوب التحصیل لغیرہ ہیں یعنی جن کا کرنا

مقصود ہے جن کی تحصیل کسی غیر شئے کے لیے مطلوب ہے۔

بعض عبادتیں خود مقصود بالذات ہوتی ہیں مثلاً نماز روزہ اور بعض عبادتیں کسی دوسری عبادت کا ذریعہ اور شرط بنتی اور وسیلہ کا کام دیتی ہیں مثلاً وضو نماز کے لیے شرط ہے۔ محض اسی فرق کو ظاہر کرنے کے لیے مقصود اور غیر مقصود کی اصطلاح وضع کی گئی ہے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ غیر مقصود احکام غیر اہم ہیں بلکہ تعمیل و ادائیگی کے لحاظ سے یہ عبادات مقصودہ پر مقدم ہیں۔

یہاں کوئی کہہ سکتا ہے کہ حکومت الٰہیہ کو غیر مقصود کہنے کی غرض یہ ہے کہ شریعت میں مومن کا مقصد وجود صرف رضائے الٰہی ہے۔ حکومت اصل مقصود نہیں۔ ہم کو تسلیم ہے اور کسی مومن کو بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ مومن کا مقصد وجود رضائے الٰہی کا حصول ہے لیکن اس سے یہ کب لازم آتا ہے کہ ہم اقامت دین کی جدوجہد کے مکلف نہیں ہیں۔ عبادات مقصودہ کا اصل مقصد بھی رضائے الٰہی کا حصول ہی ہے، تو کیا نعوذ باللہ ہم ان کے مکلف نہیں ہیں اور آزاد ہیں کہ جس طرح جی چاہے رضائے الٰہی حاصل کریں۔ اسلامی حکومت کی اصل غرض تو یہی ہے کہ تمام عبادات اور تمام احکام ٹھیک اس طرح ادا کیے جائیں جس طرح اللہ و رسول نے ہمیں سکھائے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو بھی قابل غور ہے۔ مومن کا مقصود اصلی رضائے الٰہی ہے۔ لاریب فیہ۔ مگر جو اس کے ذرائع و شرائط ہیں انھیں اگر نامقصود کہہ کر الگ کر دیا جائے تو شریعت کے ایک بہت بڑے اصول کا بطلان لازم آتا ہے وہ یہ کہ عقائد میں یہ بات شامل ہے کہ تکلیف مالایطاق جائز نہیں —— لیکن اس طریقۂ استدلال سے یہ اصول ٹوٹ جاتا ہے۔ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے اجتماعی احکام پر عمل کرنا یا عمل کرنے کی سعی کرنا بھی ضروری ہے۔

مثال کے طور پر شریعت کی حدود و تعزیرات کی تنفیذ اور کتاب و سنت کے مطابق مقدمات و مخاصمات کے فیصلے بھی ضروری ہیں اور ان کی شرط اور وسیلہ حکومت اسلامی کا قیام ہے۔ اب اگر کہا جائے کہ حکومت اسلامی کی بات مت کرو۔ کیونکہ یہ مقصود نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ رضائے الٰہی کی تحصیل کا مکلف بنانا تکلیف مالایطاق کے سوا کچھ بھی نہیں ہوگا۔

یہی وجہ ہے کہ شریعت میں انسان کو کسی چیز کا مکلف بنانے کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اس کے حصول کے لیے جو اسباب و ذرائع اور جو شرطیں ضروری ہیں ان کے حاصل کرنے کی وہ کوشش کرے۔ اگر وہ کوشش کرتا ہے اور

بالفرض منزل تک پہنچنے سے قبل ہی دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو وہ کامیاب ہے۔ گویا کوشش ہی اس کی منزل تھی لیکن اگر وہ کوشش بھی نہیں کرتا اور مر جاتا ہے تو پھر رضائے الٰہی کا انمول موتی کس طرح اسے مل سکتا ہے؟

اب ایک دوسرے پہلو سے غور کیجیے اب تک جو گفتگو ہوئی وہ بندے کے لحاظ سے تھی کہ بندے کا مقصود حیات کیا ہے؟ سوال یہ ہے کہ شریعت وضع کرنے اور انبیاء و رسل کا سلسلہ قائم کرنے سے خداوند عالم کا کیا مقصود ہے وہ تو بے نیاز ہے۔ اس کو کسی چیز کی احتیاج نہیں۔ نہ وہ بندوں سے کچھ چاہتا ہے اور نہ بندے اسے کچھ دے سکتے ہیں اس لیے خالق کائنات کا مقصود صرف یہی ہو سکتا ہے کہ بندے بلا کسی تفریق و استثناء اس کے ہر حکم کی تعمیل کریں اور دنیا و آخرت میں اس کی رحمتوں کے مستحق بنیں۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ○ مَآ أُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ أُرِيْدُ أَنْ يُّطْعِمُوْنِ ○ (الذاریات۔ ۳۶)	میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں میں ان سے کوئی رزق نہیں چاہتا اور نہ میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھلائیں

اس سلسلے میں علامہ شاطبی نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے۔

شریعت وضع کرنے سے شارع کا مقصود یہ ہے کہ بندے کا قصد شارع کے قصد کے موافق ہو اور اس کا عمل شارع کی منشاء کے خلاف نہ ہو اس لیے کہ شریعت بندوں کے مصالح کے مطابق اتاری گئی ہے اور اس لیے بھی کہ انسان اللہ کی عبادت کے واسطے پیدا کیا گیا ہے اور عبادات کا حاصل یہ ہے کہ شارع کی منشا پوری کر کے دنیا اور آخرت دونوں جہان میں رحمت خداوندی کا استحقاق پیدا کیا جائے اور اس لیے کہ بھی کہ شارع کا مقصد شریعت سے ضروریات، یعنی دین، عقل، نسل، نفس، مال کی حفاظت کرنی ہے اور شریعت کے ان مصالح کو بروئے کار لانے میں انسان اللہ کا خلیفہ ہے اور خلافت کی کم از کم حد یہ ہے کہ وہ اپنے اوپر قائم کرے اور پھر دوسروں پر۔ اسی بنا پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :-

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ	تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے متعلق پوچھا جائے گا۔

قرآن میں آیا ہے :-

آمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَأَنْفِقُوْا	اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اس

وَمَّا جَعَلَكُمْ مُسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ (حدید)	میں سے خرچ کرو جس میں اللہ نے تم کو خلیفہ بنایا ہے
اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً	میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔
لَیَسْتَخْلِفَنَّکُمْ فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُ	وہ زمین میں تم کو خلیفہ بنائے گا تاکہ دیکھے
کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ٥	کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔
جَعَلَکُمْ خَلَائِفَ فِی الْاَرْضِ	اس نے زمین میں تم لوگوں کو خلیفہ بنایا اور
وَرَفَعَ بَعْضَکُمْ بَعْضًا لِیَبْلُوَکُمْ فِیْ	تمہارے بعض کو بعض پر فوقیت دی تاکہ تمہیں آزمائے
مَا اٰتَاکُمْ	دی ہوئی چیزوں میں۔

یہ خلافت عام ہے ایک فرد کی انفرادی ذمہ داری سے لیکر ایک امیر ایک خلیفہ وقت کی ذمہ داریوں تک کو شامل ہے جیسا کہ حدیث میں تفسیر کر دی گئی ہے۔

اَلْاَمِیْرُ رَاعٍ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی	امیر نگراں ہے اور مرد نگراں ہے اپنے گھر
اَھْلِ بَیْتِهٖ وَالْمَرْاَۃُ رَاعِیَةٌ عَلٰی	والوں پر اور عورت نگراں ہے اپنے شوہر کے گھر
بَیْتِ زَوْجِھَا وَوَلَدِہٖ فَکُلُّکُمْ رَاعٍ	اور اس کی اولاد پر پس تم میں کا ہر ایک نگراں ہے
وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِهٖ	اور ہر ایک سے پوچھ ہوگی اس کی رعیت کے متعلق

جب انسان خلیفہ ہے تو لامحالہ اس سے مطلوب اس کے علاوہ کیا ہوگا کہ حاکم اصلی کے احکام جاری کرے اور اس کے مقاصد پورا کرے۔ (موافقات، جلد ۲ صفہ ۲۳)

علامہ شاطبی نے جو پہلو یہاں نمایاں کیا ہے اس کی رو سے احکام شرعیہ میں سے بعض کو مقصود اور بعض کو نامقصود قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے اگر بندے کا مطلوب رضائے الٰہی ہے تو اللہ کی اس کی طاعت عبادت اور خلافت مطلوب ہے اس لیے مومن جب تک نیابت الٰہی کے فرض کو انجام نہیں دیتا اس کا مقصد وجود پورا نہیں ہوتا اور وہ منشائے الٰہی کی تعمیل سے قاصر رہ جاتا ہے۔

اسلام کی دعوت

(مولانا سید جلال الدین عمری)

یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے اور انسان حالتِ امتحان میں ہے۔ یہاں اسے آزمایا جا رہا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کون خدا کا فرماں بردار ہے اور کون نافرمان۔ انسان کفر اور اسلام کے درمیان کھڑا ہے۔ اسلام خدا پرستی کی دعوت دیتا ہے اور کفر خدا سے بغاوت کا دوسرا نام ہے۔ اسے ان ہی دو راہوں میں سے ایک راہ اختیار کرنی ہے۔ تیسری کوئی راہ اس کے لیے نہیں ہے۔ انسان کو اتنے بڑے امتحان میں ڈالنے سے پہلے خدا نے اپنے رسولوں کے ذریعے اسے بتا دیا ہے کہ اس کے لیے صحیح طریقہ کیا ہے اور غلط طریقہ کیا؟ وہ کامیاب کیسے ہو سکتا ہے اور اس کی ناکامی کے اسباب کیا ہیں؟ تاکہ جو خدا کو خوش کرنا چاہے خوش کر سکے اور جو تباہ ہونا چاہے تباہ ہو جائے۔ إِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدَىٰ وَإِنَّ لَنَا لَلْآخِرَةَ وَالْأُولَىٰ (یقیناً راہ دکھانا ہمارے ذمے ہے اور ہمارے ہی ہاتھ میں ہے دنیا و آخرت)

خدا کے رسول اگر نہ آتے تو انسان ہدایت سے محروم ہوتا۔ وہ اپنے خدا سے شکایت کرتا کہ خدایا! تو نے مجھے پیدا کیا اور اس حال میں چھوڑ دیا کہ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تیری رضا کیسے چاہوں، تو میں تیری رضا کیسے چاہتا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ تو کن کاموں سے خوش ہوتا ہے اور کن کاموں سے ناخوش، تو میں تجھے کیسے خوش کرتا۔ میں جب کامیابی کی راہ نہیں پا سکا، تو، تو ہی بتا کہ ناکامی سے کیسے بچتا؟ لیکن اب یہ عذر خدا کے ہاں نہیں سنا جائے گا۔ کیونکہ خدا کے رسول آ چکے اور حق واضح ہو چکا۔

رُسُلًا مُّبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ لِئَلَّا	خدا نے انسانوں کے پاس اپنے رسول بھیجے جو
يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ	ان کو جنت کی خوشخبری دیتے اور جہنم سے ڈراتے
الرُّسُلِ۔	تھے تاکہ رسولوں کے آ جانے کے بعد خدا جو فیصلہ کرے
(النساء۔ ۱۶۵)	اس کے خلاف انسانوں کے پاس کوئی حجت نہ ہو۔

رسولوں کو خدا کی طرف سے ایسے دلائل ملتے ہیں جن کے ذریعے وہ انسانوں پر اتمام حجت کر دیتے ہیں۔ ایک شخص

ان کے پیغام کے ساتھ مخالفت کی روش تو اختیار کر سکتا ہے لیکن دلیل کے میدان میں اسے شکست نہیں دے سکتا۔ وہ اس حد تک حق کو ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کے مخالفین کے دل بھی اس کے حق ہونے کی گواہی دینے لگتے ہیں۔ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ ظُلْمًا وَعُلُوًّا (النمل: ۱۴) (انھوں نے محض ظلم اور سرکشی کی بنیاد پر دلائل رسالت کا انکار کیا حالانکہ ان کے دل یقین کے ساتھ کہہ رہے تھے کہ وہ حق ہیں)

خدا کے آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ آپ نے دنیا پر یہ حقیقت پوری طرح کھول دی کہ انسان خدا کا بندہ اور غلام ہے اور بندگی ہی میں اس کی ابدی نجات ہے۔ جو خدا پرست ہوگا وہ کامیاب ہوگا اور جو خدا سے بغاوت کرے گا وہ ناکام ہوگا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے جا چکے لیکن آپ کا پیغام ابھی باقی ہے اور قیامت تک باقی رہے گا۔ جو لوگ اس پیغام کو قبول کر چکے ہیں ان کی ذمہ داری ہے کہ اسے دنیا کے سامنے پیش کریں۔ ہدایت پانے کے بعد انسان کا فرض ہو جاتا ہے کہ دوسروں کو راہ دکھائے۔ اگر وہ اس فرض کو ادا کر رہے ہیں تو خدا کے محبوب ہیں اور اگر اسے بھلا دیا ہے تو خدا کے غضب سے کوئی چیز انہیں نہیں بچا سکتی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا تھا:۔ يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ (مائدہ: ۶۷) (اے رسول جو کچھ آپ کے رب کی طرف سے آپ پر نازل کیا گیا ہے اسے آپ دوسروں تک پہنچا دیجیے اگر آپ نے ایسا نہیں کیا تو اپنا حق رسالت ادا نہیں کیا۔) چنانچہ جو دین آپ کو خدا کی طرف سے ملا تھا اسے بغیر کسی کمی بیشی کے آپ نے امت کے حوالے کر دیا اب یہ امت اس دین کی حامل ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اسے دوسروں تک پہنچائے۔ تبلیغ دین کا بار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس امت پر ڈال دیا گیا ہے اسے وہ کام انجام دینا ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے انجام دیا تھا آپ نے جس طرح اس امت کے سامنے حق کی گواہی دی تھی اسی طرح اس امت کو دوسروں کے سامنے حق کی گواہی دینی ہے۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (البقرۃ: ۱۴۳)	اور اسی طرح ہم نے تم کو امت وسط (عدل و انصاف پر قائم رہنے والی امت) بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر حق کے شاہد بنو اور خدا کا رسول تم پر شاہد بنے

اس امت کے بارے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں " اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِي الْأَرْضِ " بخاری مسلم (تم زمین میں خدا کے گواہ ہو) یہ امت خدا کی طرف سے شاہد بنا کر بھیجی گئی ہے، وہ خدا کے دین کی امین ہے کیا اس وقت حق صرف اسی کے پاس ہے۔ دنیا کو تنہا وہی بتا سکتی ہے کہ کون سی راہ خدا تک پہنچانے والی ہے اور کون سی راہ خدا سے دور کرنے والی ہے۔ وہ جس چیز کو حق کہے وہ حق ہے اور جس چیز کے باطل ہونے کی گواہی دے وہ باطل ہے۔ سوائے اس امت کے کسی گروہ کے پاس اس وقت خدا کا دین نہیں ہے۔ اَللّٰهُمَّ إِنْ تُهْلِكْ هٰذِهِ الْعِصَابَةَ مِنْ أَهْلِ الْإِسْلَامِ لَا تُعْبَدُ فِي الْأَرْضِ۔ مسلم (اے اللہ اگر اہل اسلام کا یہ گروہ ختم ہو جائے تو پھر زمین میں تیری پرستش نہ ہوگی)

حجۃ الوداع کے موقع پر تکمیل دین کا اعلان ہو چکا تھا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت سے ان الفاظ میں خطاب کر رہے تھے " لَعَلِّي لَا أَلْقَاكُمْ بَعْدَ عَامِي هٰذَا " (شاید اس سال کے بعد تم سے میری ملاقات نہ ہو سکے) آپ نے سوال کیا " أَلَا هَلْ بَلَّغْتُ " (بتاؤ کیا میں نے تم تک خدا کا دین پہنچا دیا ہے؟) لوگوں نے بیک آواز جواب دیا ہاں! آپ نے دین ہم تک پہنچا دیا ہے۔ آپ نے فرمایا۔ أَنْتُمْ تُسْأَلُونَ عَنِّي فَمَا أَنْتُمْ قَائِلُونَ (کل قیامت کے روز تم سے میرے بارے میں پوچھا جائے گا کہ میں نے تم تک دین کے پہنچانے میں کوئی کوتاہی تو نہیں کی؟ اس وقت تم کیا جواب دو گے؟ لوگوں نے کہا۔ نَشْهَدُ أَنَّكَ قَدْ بَلَّغْتَ وَأَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ " (ہم شہادت دیں گے کہ آپ نے حق تبلیغ ادا کر دیا۔ دین پوری طرح پہنچا دیا اور ہمارے ساتھ انتہائی خیر خواہی کی) آپ نے اپنی انگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور تین مرتبہ فرمایا " اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ " (خدایا تو گواہ رہ تیرے بندے اقرار کر رہے ہیں کہ جو دین تو نے مجھے دیا تھا وہ میں نے ان تک پہنچا دیا ہے) اس کے بعد آپ نے مجمع سے کہا۔ " أَلَا فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ " (جو یہاں موجود ہے وہ اسے سنا دے جو موجود نہیں ہے) حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔

فَوَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ إِنَّهَا لَوَصِيَّتُهُ إِلَى أُمَّتِهِ (بخاری)

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے یہ اپنی امت کے لیے آپ کی وصیت تھی

ربیع بن انس (تابعی) فرماتے ہیں:۔

حَقٌّ عَلَى مَنِ اتَّبَعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنْ يَدْعُوَ كَالَّذِي دَعَا

جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرے اس پر یہ حق عائد ہوتا ہے کہ جس طرح رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی دعوت دی اسی طرح

وأن ينذر بالذي أنذر — یہ بھی دعوت دے اور جس کتاب کے ذریعہ آپ نے لوگوں کو خدا کے عذاب سے ڈرایا تھا اس کتاب کے ذریعہ یہ بھی خدا کے عذاب سے ڈرائے

ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۱۲۶

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو دین آپ کو ملا ہے اسے دوسروں تک پہنچانا آپ کا فرض ہے۔ آپ خدا کے نزدیک صرف اسی وقت اپنی ذمہ داری سے سبک دوش ہوں گے جب کہ آپ دنیا سے اس حال میں جائیں کہ خدا کے بندوں تک خدا کا پیغام پہنچا چکے ہوں۔ اس وقت حق صرف آپ کے پاس ہے، اگر آپ نے حق کی شہادت نہ دی تو دنیا ہمیشہ کے لیے حق سے محروم ہو جائے گی اور ڈر ہے کہ اس محرومی کا وبال کہیں آپ کو نہ اٹھانا پڑے۔ آج آپ اپنے جرم کی سنگینی کا احساس کریں یا نہ کریں لیکن کل خدا کی طرف سے آپ پر انسانیت کو تباہ کرنے کا جرم عائد ہوگا۔ قیامت کے روز خدائے تعالیٰ آپ کے بارے میں دنیا والوں سے پوچھے گا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس حق تھا اور جو میری ہدایت کے حامل تھے۔ کیا انھوں نے اس حق سے تمہیں بھی آگاہ کیا تھا؟ آپ کی غفلت کی وجہ سے دنیا والے یہی جواب دیں گے خدایا تیرے دین کے حامل سوئے ہوئے تھے اور ہمیں گمراہی میں چھوڑ رکھا تھا۔ انھوں نے ہمارے ساتھ خیر خواہی نہیں کی اور تیرا دین ہم تک نہیں پہنچایا۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ کے بارے میں ان کا یہ جواب سچا جواب ہوگا اور آپ خدا کے سامنے اپنے جرم کو چھپا نہیں سکیں گے۔ پھر بتایئے وہ کون سی چیز ہے جو خدا کی گرفت سے آپ کو بچا سکے گی؟ آپ خدا کی گرفت سے اسی وقت محفوظ ہوں گے جب کہ دنیا خدا کے سامنے اس بات کی گواہی دے کہ آپ نے دین ان تک اس طرح پہنچایا ہے جس طرح اسے پہنچانا چاہیے۔

شہادت حق کا یہ کام بڑا ہی صبر آزما کام ہے۔ یہ بہت ہی دشوار گزار گھاٹی ہے جسے ہر شخص آسانی سے پار نہیں کر سکتا۔ یہ دو ایک دن میں ختم ہونے والا عمل نہیں ہے بلکہ اسے زندگی کی آخری سانس تک انجام دینا ہے۔ جس وقت آپ کو حق ملے اسی وقت اس کا دوسروں تک پہنچانا آپ پر فرض ہو جاتا ہے اور جب تک اس زمین پر ایک بھی خدا کا باغی موجود ہے یہ فرض آپ سے ساقط نہیں ہو سکتا۔ کوئی شخص آپ کی بات مانے یا نہ مانے لیکن آپ کو اپنی بات اسے سنانی ہے۔ شہادت حق کی ذمہ داری ہر حال میں آپ کے ساتھ لگی ہوئی ہے وہ محض اس وجہ سے ختم نہیں ہو جاتی کہ لوگ حق کے منکر ہیں۔ حق کے پہنچانے کے لیے یہ شرط نہیں ہے کہ سننے والا فوراً اس پر ایمان لے آئے بلکہ اتنی بات کافی ہے کہ آپ کے پاس حق ہے اور دنیا اس سے غافل اور منحرف ہے۔ آپ کا کام یہ ہے کہ ہر انسان تک پہنچیں اور اسے خدا کا پیغام سنائیں۔ آپ کی بات سننے کے بعد یہ اس کی مرضی ہے کہ چاہے خدا کی

اطاعت کرے یا اس سے بغاوت کرے۔ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (اگر وہ منہ پھیرتے ہیں تو پھیرنے دو تمہارا کام یہ ہے کہ حق ان تک پہنچا دو اور اللہ خود ہی اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے)

شہادت حق کا کام صحیح معنی میں اسی وقت انجام پا سکتا ہے جب کہ آپ اسے اپنا فرض سمجھ کر انجام دیں اور نتیجہ سے بالکل بے نیاز ہوں۔ آپ اس کام میں مسلسل لگے رہیں اور شب و روز لگے رہیں، قطع نظر اس سے کہ حالات سازگار ہیں یا ناسازگار، دنیا کی طرف سے اس کا استقبال ہوتا ہے، یا اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ اگر آپ اس شرط کے ساتھ یہ کام انجام دینا چاہتے ہیں کہ دنیا کی طرف سے خوش آمدید کہا جائے تو کبھی بھی اس کام کو انجام نہیں دے سکتے۔ اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو دیکھا۔ جو لوگ دوسروں کو دیکھ کر اپنے بارے میں فیصلہ کرتے ہیں وہ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ اس شخص کے حصے میں محرومی لکھ دی گئی ہے جو دوسروں کی غفلت کو اپنی بے عملی کا بہانہ بنائے اور اپنے فرائض کو بھول جائے۔ اگر آپ حق پر ہیں تو اس کی کیوں پروا کرتے ہیں کہ دنیا آپ کی دوست ہے یا دشمن۔ دنیا اگر آپ کا ساتھ نہیں دیتی تو اسے چھوڑ دیجیے اور نئی دنیا آپ پیدا کیجیے۔ آپ حق کے ساتھی ہیں، آپ کو حق سے ایک لمحہ کے لیے بھی دست بردار نہیں ہونا چاہیے خواہ آپ کی مخالفت میں آسمان سے بجلیاں گر پڑیں اور زمین سے لاوا ابلنے لگے۔

اللہ تعالیٰ اپنے وفادار بندوں سے شہادت حق کا کام لینا چاہتا ہے۔ اگر آپ انسانوں کے سامنے پوری طرح حق کی شہادت دے چکے ہیں تو قطعی طور پر خدا کے وفادار ہیں، خواہ اس دنیا میں ایک بھی انسان آپ کا ساتھ نہ دے۔ خدائے تعالیٰ چاہتا ہے کہ انسانوں پر دین حق واضح ہو جائے تاکہ دلیل کی دنیا میں خدا سے بغاوت کی کوئی معقول وجہ باقی نہ رہے۔ آپ پر اس دین کی دعوت فرض ہے، لوگوں کو دین کی راہ پر لگانا فرض نہیں ہے۔ اگر آپ نے دین کی طرف دعوت دینے میں کوتاہی نہیں کی ہے اور حق واضح کر چکے ہیں تو آپ اپنے فرض سے بالکل سبکدوش ہو گئے۔ اب آپ خدا کے نزدیک بری الذمہ ہیں۔ آپ سے خدا کے ہاں یہ سوال ہرگز نہ ہوگا کہ آپ نے کتنے انسانوں کے ذہن بدلے اور کتنے انسانوں کو مومن و مسلم بنایا۔ آپ کی کامیابی کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ آپ دین کی راہ میں اپنی پوری قوت صرف کر دیں۔ آپ کی کامیابی قطعاً اس بات کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی دوسرا شخص آپ کی دعوت کو قبول کر لے۔ خدائے تعالیٰ کا مطالبہ آپ سے صرف یہ ہے کہ آپ وہ سب کچھ اس کے دین کے لیے وقف کر دیں جو آپ کے اختیار میں ہے۔ جو چیز آپ کے اختیار میں نہیں اس کا آپ سے ہرگز مطالبہ نہیں ہے۔ آپ کو اس دنیا میں تنہا اپنی ذات پر اختیار ہے، آپ خدا کے حکم کے مطابق اسے بدل سکتے ہیں لہٰذا اسے بدل دیجیے۔ خدا کی

رضا کی طلب میں اپنی ذات کو کھپا سکتے ہیں اس لیے اسے کھپا دیجیے۔ آپ کے پاس جو دل و دماغ، فکر و عمل اور مال و دولت ہے اسے خدا کی راہ میں لٹا سکتے ہیں، لہٰذا اسے لٹا دیجیے۔ آپ جس چیز کے بھی مالک ہیں اس کو خدا کے دین کے لیے صرف کرنے میں آپ نے کوتاہی کی تو یقیناً آپ سے بازپرس ہوگی لیکن اپنی ذات کے سوا کسی دوسرے کو حق کی طرف موڑنا آپ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ آپ کے بس میں نہیں ہے کہ کسی ایک فرد کو بھی بدل دیں اس لیے خدائے تعالیٰ کی طرف سے اس کی ذمہ داری بھی آپ پر نہیں ڈالی گئی ہے۔ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۤءُ بقرہ: ۲۷۲ (ان کی ہدایت کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔)

بہت سے لوگ جو دعوت کا کام کرتے ہیں اپنی صحیح حیثیت نہیں سمجھتے۔ وہ محض داعی ہیں لیکن اپنے آپ کو دوسروں کی ہدایت کا ذمہ دار تصور کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی خوفناک اور مہلک غلطی ہے۔ ایسے لوگ زیادہ دیر تک اپنی دعوتی جدوجہد جاری نہیں رکھ سکتے اور بہت جلد ان پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ایک شخص پورے اخلاص کے ساتھ دعوت کا آغاز کرتا ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ مدتِ دراز کی کوشش کے باوجود مخاطب کا سینہ اس کی دعوت کے لیے کھل نہیں رہا ہے، حق کی وضاحت کے باوجود وہ جمود و انکار کے مقام پر جما ہوا ہے، خیرخواہی کے جواب میں مخالفت پر کمربستہ ہے، تو وہ سوچنے لگتا ہے کہ کیا میری مدت العمر کی کوشش رائگاں جائے گی، کیا حق کا بول بالا نہ ہوگا اور باطل کی حکمرانی ختم نہ ہوگی؟ یہ احساس اس کی کمر توڑ دیتا ہے اور وہ ہمت ہار کر بیٹھ جاتا ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اسے صرف اس بات کا حکم دیا تھا کہ وہ جس دین کو دینِ حق مان رہا ہے اسے دوسروں تک پہنچا دے لیکن اس نے اپنے آپ کو اس بات پر مامور سمجھ لیا کہ لوگوں کو دینِ حق کا متبع بنا دے۔ حالانکہ لوگوں کے دلوں کو دین کی طرف پھیرنا کسی پیغمبر کے بس میں بھی نہیں ہے۔ اِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۤءُ۔ قصص: ۵۶ (اے پیغمبر تم جسے چاہو راہِ ہدایت پر نہیں لگا سکتے۔ البتہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔)

جو شخص اس وجہ سے دل شکستہ ہو جائے اور اپنی دعوتی جدوجہد ختم کر دے کہ حق سنا نہیں جاتا اور دنیا اس کی طرف متوجہ نہیں ہے تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ تم نے ایک ایسا بوجھ اٹھا رکھا ہے جس کے اٹھانے کا خدا نے تمہیں حکم نہیں دیا تھا۔ تم ایک ایسے غم میں مبتلا ہو جس کا علاج تمہارے پاس نہیں ہے۔ یہ کام تمہارا نہیں ہے کہ لوگوں کو حق کی راہ پر لگا دو بلکہ یہ خدا کا کام ہے جس کے ہاتھ میں ہدایت و ضلالت ہے۔ یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ جو کام اپنا ہے اسے تو انسان بھول جائے اور جو کام خدا کا ہے اسے اپنا کام سمجھ بیٹھے۔

وَإِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُهُمْ
فَإِنِ اسْتَطَعْتَ أَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا
فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ
فَتَأْتِيَهُمْ بِآيَةٍ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ
مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ (الانعام: ۳۵)

اور اگر تم پر ان کا حق سے اعراض کرنا بھاری
گزر رہا ہے تو تم سے ہو سکے تو زمین میں کوئی سرنگ
ڈھونڈ نکالو یا سیڑھی لگا کر آسمان پر پہنچ جاؤ اور
ان کے پاس کوئی ایسی نشانی لے آؤ کہ وہ حق کا انکار
نہ کر سکیں حقیقت یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ان
کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ لہٰذا تم جاہل نہ بنو۔

آپ دین کے داعی ہیں، آپ کا کام دعوت و تبلیغ ہے، اگر آپ حقِ تبلیغ ادا کر چکے تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے کیونکہ آپ نے اپنا فرض پورا کر دیا، آپ کی دعوت کو سننے کے بعد آپ کا مخاطب اسے رد کر دیتا ہے تو یہ اس کا قصور ہے، آپ سے اس کے بارے میں باز پرس نہ ہوگی۔ ہمارے سامنے پیغمبروں کی مثال ہے، اگر داعیِ حق کی کامیابی کا پیمانہ یہ ہے کہ مخاطب اس کی دعوت کو قبول کر لے تو بیشتر پیغمبر آپ کو ناکام نظر آئیں گے، وہ انتہائی دل سوزی اور خیر خواہی کے ساتھ زندگی بھر دین کی طرف بلاتے رہے لیکن اس کے باوجود ایسا بہت ہوا ہے کہ وہ اپنے قریب ترین افراد کو نہیں بدل سکے۔ حضرت نوحؑ کی تبلیغی جد و جہد ساڑھے نو سال جاری رہی لیکن ان کا اپنا لڑکا "غیر صالح" ہی رہا۔ حضرت ابراہیمؑ کی دعوت اخلاص اپنے باپ کو "اتباعِ حق" پر آمادہ نہ کر سکی اور بالآخر حضرت ابراہیمؑ کو "سلام علیک" کہہ کر اپنے باپ سے کنارہ کش ہونا پڑا، حضرت لوطؑ نے اپنی بیوی پر تبلیغ کی لیکن یہ تبلیغ اس کے حق میں بے سود ثابت ہوئی اور خدا کا عذاب آیا تو اس فیصلہ کے ساتھ آیا: إِنَّا مُنَجُّوكَ وَأَهْلَكَ إِلَّا امْرَأَتَكَ كَانَتْ مِنَ الْغَابِرِينَ ۝ العنکبوت: ۳۳ (ہم تم کو اور تمہارے گھر والوں کو بچا لیں گے سوائے تمہاری بیوی کے) چنانچہ جو لوگ بستی میں رہ گئے وہ ان ہی میں رہی اور خدا کا عذاب آ گیا۔ خدا کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم ابو طالب کے زیر سایہ پرورش پاتے ہیں، وہ آپ کو اپنی اولاد سے زیادہ عزیز سمجھتے ہیں۔ آپ کی خاطر ہر طرح کی مصیبت برداشت کرتے ہیں اور دنیا سے لڑ جاتے ہیں، پہاڑ کی گھاٹی میں قید ہونا پسند کرتے ہیں لیکن اپنے بیٹے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو دشمن کے حوالے کرنا نہیں چاہتے۔ اس محبت کے باوجود حضورؐ کی دعوتی جد و جہد پر دس سال کی مدت گزر جاتی ہے اور وہ اس کا ساتھ نہیں دیتے حتیٰ کہ جس وقت ابو طالب بستر مرگ پر تھے حضورؐ ان کے قریب تشریف لے گئے اور فرمایا: "ای عم قل لا إله إلا الله كلمة أحاج لك بها عند الله" (بخاری) (چچا جان! کہہ دیجیے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، اس کلمہ کی بنیاد پر میں

خدا کے ہاں آپ کی نجات کے لیے کوشش کروں گا۔) یہ وہ جملہ تھا جس سے دل کو پگھل جانا چاہیے تھا، لیکن ابو طالب نے اسے قبول نہیں کیا اور دینِ آبا پر جان دینا پسند کیا، یہی نہیں، پیغمبروں کی تاریخ میں اس کی مثالیں بھی ملتی ہیں کہ ان کی کوشش کے نتیجے میں ان کو ایک بھی "رجل رشید" نہیں ملا لیکن اس کے باوجود کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ ناکام تھے؟ انھوں نے دین کی راہ میں پوری قوت صرف کر دی اس لیے وہ خدا کے ہاں پورے اجر کے مستحق ہو گئے۔

حق کی دعوت جب کبھی اٹھے تو ضروری نہیں کہ دنیا سے لازماً باطل کا خاتمہ ہو جائے اور حق کی حکومت قائم ہو جائے، یہاں حق کو مظلوم بھی دیکھا گیا ہے اور اسے فتح و کامرانی بھی حاصل ہوئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر شخص نے اپنی ایک راہ متعین کر رکھی ہے جس پر وہ دوڑا چلا جا رہا ہے، وہ اس کی محبت میں اس قدر گرفتار ہے کہ کسی قیمت پر اسے چھوڑنا نہیں چاہتا، لیکن حق ان ہی باہمت نفوس کے حصے میں آتا ہے جو غلطی واضح ہونے کے بعد اپنی روش بدل سکتے ہوں، جو باطل کے ساتھ چمٹے رہنے کا فیصلہ نہ کر چکے ہوں بلکہ قبولِ حق کے لیے ہر آن آمادہ ہوں۔ حق اس شخص کو ملتا ہے جو حق کا طالب ہے، جس کے اندر حق کی پیاس ہی نہیں اس کے لیے حق کی دعوت بے کار ہے، حق کی آواز اس کے کان کے پردوں سے ٹکرا کر لوٹ آئے گی لیکن اس کے دل میں نہیں اترے گی، حق کا اجالا چاروں طرف پھیلا ہوگا لیکن اس کی آنکھیں بند ہوں گی، دنیا حق پر چل رہی ہوگی لیکن وہ راہِ حق نہ دیکھ سکے گا، اس نے حق کو سمجھنے کے مواقع رد کر دیا ہے اس لیے قبولِ حق کی راہیں اس کے لیے بند ہو گئی ہیں۔ ایسی صورت میں قرآن کی ہدایت ہے کہ آپ خدا کی ذات پر بھروسہ کریں اور اس سے مدد کے طالب ہوں، لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیں اور اپنے کام میں لگے رہیں، لوگوں کا انکار اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ آپ خدانخواستہ غلطی پر ہیں اور آپ کو اپنی راہ چھوڑ دینی چاہیے بلکہ جب آپ دیکھ رہے ہیں کہ حق آپ کے ساتھ ہے اور لوگ محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو آپ کے اس یقین میں اور اضافہ ہونا چاہیے کہ آپ کا موقف صحیح ہے اور آپ کے مخالفین کمزور مقام پر کھڑے ہیں۔ آپ کے پاس دلائل کی قوت ہے اور وہ دلائل کے لحاظ سے تہی دست و بے مایہ ہیں۔ یہ کتنی بڑی دولت ہے جو آپ کو حاصل ہے اور جس سے آپ کے حریف محروم ہیں۔

فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّكَ عَلَى	پس تم اللہ کی ذات پر بھروسہ کرو کیونکہ
الْحَقِّ الْمُبِينِ ۝ إِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتَىٰ	تم کھلے حق پر ہو، یقیناً تم مردوں کو نہیں سنا سکتے اور
وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَاءَ إِذَا وَلَّوْا	نہ بہروں کو اپنی پکار سنا سکتے ہو جب کہ وہ پیٹھ پھیر کر

مُدْبِرِيْنَ ۝ وَمَا اَنْتَ بِهٰدِی الْعُمْیِ عَنْ ضَلٰلَتِهِمْ اِنْ تُسْمِعُ اِلَّا مَنْ یُّؤْمِنُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ (النمل: ۸۰-۸۱)

رُخ جائیں۔ اسی طرح تم اندھوں کو ان کی گمراہی سے نکال کر راہ نہیں دکھا سکتے۔ تم تو ان ہی لوگوں کو اپنی بات سنا سکتے ہو جو ہماری آیتوں پر یقین رکھتے ہیں اور جو مسلم ہیں۔

بہت سے لوگ دعوت کی کامیابی اور داعی کی کامیابی میں فرق نہیں کرتے۔ دعوت کی کامیابی یہ ہے کہ مخالف قوتیں اس کی راہ سے ہٹ جائیں اور وہ دنیا پر چھا جائے، لیکن داعی کی کامیابی یہ ہے کہ وہ دعوت کے لیے اپنا سب کچھ لگا دے۔ داعی اگر اس کوشش میں اپنے آپ کو فنا کر دے کہ جس دعوت کو وہ لے کر اٹھا ہے وہ کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے تو یقیناً وہ کامیاب ہے، خواہ اس کوشش کے نتیجہ میں دعوت کامیاب ہو یا ناکام۔ اسی طرح داعیِ حق کی کوشش ہوگی کہ حق غالب اور باطل مغلوب ہو، خدا کی قائم کردہ عدالت کے مطابق تمام معاملات کے فیصلے ہوں اور دنیا کی جھوٹی عدالتیں ختم ہوں، وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھے گا جب تک کہ خدا کا دین ساری دنیا پر چھا نہ جائے اور مخالف ادیان مٹ نہ جائیں۔ داعی نے اگر اپنی اس کوشش اور تڑپ میں کوتاہی نہیں کی ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ کامیاب ہے، اب اس کی کامیابی کے لیے مزید کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ داعیِ حق کو اپنی دعوت کی راہ میں مختلف مراحل سے گزرنا پڑتا ہے، وہ کبھی دوسروں تک اپنی دعوت پہنچاتا ہے کبھی مخالفین کے ظلم سہتا ہے، کبھی حق پرستوں کی تنظیم کرتا ہے اور کبھی فتح و نصرت کا تخت بچھاتا ہے۔ دعوت کے اس آخری مرحلے کے آنے سے پہلے داعی اگر ختم ہو جائے تو یقیناً دعوت کا کام ابھی باقی ہے، اسے اور مراحل طے کرنے ہیں، لیکن داعی کا کام ختم ہو گیا، دعوت کے جس مقام پر اس نے جان دی ہے وہی اس کی منزل ہے، اس کا ہر مرحلہ کامیابی کا مرحلہ ہے، وہ جہاں بھی مارا جائے کامیاب ہے۔

مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۝ (الاحزاب: ۲۳)

ایمان والوں میں کتنے مرد ایسے ہیں جنھوں نے اپنے اس عہد کو سچ کر دکھایا جو خدا سے کیا تھا۔ ان میں سے بعض اپنا عہد پورا کر چکے اور بعض انتظار کر رہے ہیں اور وہ اپنے اس عہد سے بالکل نہیں بدلے۔

داعی کی کامیابی اور دعوت کی کامیابی دو الگ الگ چیزیں ہیں، ہو سکتا ہے کہ داعی خدا کی طرف دعوت دیتے دیتے ختم ہو جائے اور نوعِ انسانی کا ایک فرد بھی اس کا ساتھ نہ دے، اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ نظامِ باطل

کو تم کہ کے خدا کی زمین پر خدا کی حکومت قائم کر دے، دونوں صورتوں میں وہ کامیاب ہے۔ داعی کی کامیابی قطعاً اس بات پر موقوف نہیں ہے کہ حق عملاً غالب اور باطل مغلوب ہو جائے، کیونکہ اس کا تعلق داعی سے نہیں ہے بلکہ اس بات سے ہے کہ جن لوگوں کو دعوت دی جا رہی ہے وہ اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں، اگر وہ حق کو قبول کرتے ہیں تو حق غالب ہوگا اور اگر اسے رد کر دیتے ہیں تو غالب نہ ہوگا۔ ظاہر ہے ایک ایسا واقعہ جس کا تعلق داعی سے نہیں ہے وہ اپنی کامیابی میں اس کا محتاج نہیں ہو سکتا۔ داعی کے پیغام کو اگر ساری دنیا مل کر بالاتفاق رد کر دیتی ہے تو بھی اس پر یہ جرم ہرگز عائد نہ ہوگا۔ کہ تمہاری بات کیوں رد کر دی گئی، کیونکہ یہ داعی کی کوتاہی نہیں بلکہ اس کے مخاطبین کی کوتاہی ہے، اور خدا کے دربار میں کوئی بھی شخص کسی دوسرے کے جرم میں پکڑا نہیں جاتا۔

قرآن کہتا ہے کہ حق کو غالب اور باطل کو مغلوب کرنا داعی کے اختیار میں نہیں بلکہ اللہ کے اختیار میں ہے اس لیے اسے اللہ کے حوالے کر دو، وہ جب چاہے گا اپنے دین کو سربلند کرے گا، لیکن نتائج سے مایوس ہو کر تم اپنی جدوجہد نہ چھوڑ دو کہ یہ سب سے بڑی ناکامی ہے۔

فَإِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَإِنَّا مِنْهُم مُّنتَقِمُونَ	پس یا تو ہم تمہیں اس دنیا سے اٹھالیں اور ان
أَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِي وَعَدْنَاهُمْ	مخالفین سے انتقام لیں یا ہم اس پر بھی قادر ہیں
فَإِنَّا عَلَيْهِم مُّقْتَدِرُونَ ۝ فَاسْتَمْسِكْ	کہ ان سے جو وعدہ کر رہے ہیں اسے تمہیں دکھادیں
بِالَّذِي أُوحِيَ إِلَيْكَ إِنَّكَ عَلَىٰ	(تو تم اس کی فکر نہ کرو کہ حق و باطل کا فیصلہ کیوں نہیں
صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝	ہو جاتا) اور جو وحی تمہاری طرف بھیجی جا رہی ہے
(زخرف: ۴۳، ۴۱)	اس پر مضبوطی سے جم جاؤ یقیناً تم سیدھے راستہ پر ہو

انسان اس دنیا میں اپنے عمل کے نتائج دیکھنے کا آرزومند ہے، نتائج سے بے نیاز ہو کر کسی کام کو انجام دینا آسان نہیں، اس کے لیے بڑی ہمت اور صبر کی ضرورت ہے، اور دعوت حق کا کام باہمت اور صابر انسانوں ہی کے کرنے کا ہے، اس کٹھن راہ کو ہر مسافر طے نہیں کر سکتا۔ اس پر وہی شخص چل سکتا ہے جو قدموں کے زخمی ہونے اور دست و بازو کے شل ہونے کی شکایت نہ کرے، جو راہ کی ٹھوکروں سے گھبرا کر اپنی راہ نہ چھوڑ دے بلکہ ہر ٹھوکر سے اپنے اندر نئی توانائی محسوس کرے، جو مخالفت کے طوفان میں پیچھے نہ ہٹے بلکہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما رہے، دشمن کو دیکھ کر جس کا ایمان متزلزل نہ ہو بلکہ ہر آزمائش کو اپنی کامیابی کا ذریعہ سمجھے۔ الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝ (آل عمران: ۱۷۲)

(جو زخم کھانے کے بعد بھی خدا اور اس کے رسول کی آواز پر حاضر ہو گئے ان میں جو نیک اور متقی ہیں ان کے لیے بڑا اجر)

جب آپ پیغمبروں کا کام کرنے اٹھے ہیں، تو آپ کو بھی لازماً ان مراحل سے گزرنا پڑے گا جن مراحل سے پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کو گزرنا پڑا، ان کی قوموں نے انہیں دشمن سمجھا اور ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا جو دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ انہیں بے دین قرار دیا گیا اور وہ گھر سے بے گھر کیے گئے، حتیٰ کہ ایک وقت وہ بھی آیا جب کہ انھوں نے تختۂ دار پر پہنچ کر حق کی گواہی دی اور کلمۂ حق کہتے ہوئے آگ کے شعلوں کے درمیان سے گزر گئے، حالانکہ ان کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ خدا پرستی کے قائل تھے اور دنیا کو اس کی طرف دعوت دیتے تھے۔ اَلَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ الحج: ۴۰ (جو اپنے گھروں سے ناحق نکال دیے گئے محض اس وجہ سے کہ وہ خدا کو اپنا رب اور آقا کہتے ہیں۔)

آج بھی حالات یقیناً ماضی سے مختلف نہیں ہیں، دشمن بہت قوی ہے اور آپ بہت کمزور ہیں۔ خدا بیزاری ہر طرف چھائی ہوئی ہے اور دنیا خدا کو بھلا چکی ہے۔ رسمی دینداری تو نظر آتی ہے لیکن حقیقی دین داری مفقود ہے خدا کا نام لینے سے اچھے اچھے گھبراتے ہیں۔ اگر آپ خدا کا نام لیتے ہیں تو اپنے ماحول میں اجنبی بن جاتے ہیں۔ آپ کی باتیں دنیا والوں کو نرالی معلوم ہوتی ہیں وہ آپ کو اپنے دور کا آدمی نہیں سمجھتے۔ آپ اپنی دین داری کی وجہ سے ان کو وقت کی رفتار سے بہت پیچھے معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود آپ کی داعیانہ ذمہ داری ختم نہیں ہوجاتی ان ہی تاریک حالات میں آپ کو اپنا کام انجام دینا ہے، کیونکہ آپ نہیں جانتے کہ اس مخالف ماحول میں آپ کی باتیں سننے کے لیے کس کا دل کھلا ہوا ہے، کون آپ کی پکار پر لبیک کہنے کے لیے تیار ہے، اور کس کے اندر قبولِ حق کی صلاحیت ہے؟ اگر یہ صالح نفوس آپ کی غفلت کی وجہ سے حق سے محروم ہو گئے تو کل قیامت کے دن آپ پر یہ جرم عائد ہوگا کہ آپ نے اپنا فرض ادا کرنے میں کوتاہی کی اور آپ کو اپنی اس کوتاہی کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ دنیا دوست اور دشمن کو چہرہ دیکھ کر پہچان لیتی ہے، لیکن آپ ایسے دوستوں کی تلاش میں نکلے ہیں جن کے چہروں پر دوستی کی کوئی علامت نہیں ہے۔ اگر آپ شب و روز اپنے کام میں لگے رہیں اور اپنا پیغام لے کر ہر انسان تک پہنچنے کی کوشش کریں جس تک آپ پہنچ سکتے ہیں، تو آپ کو وہ انسان ملیں گے جن کی آپ کو تلاش ہے۔ اس طرح کے چند انسان بھی آپ کو مل گئے تو یقین جانیے کہ وہ آپ کے لیے دنیا کی ساری نعمتوں سے زیادہ قیمتی ہیں، وہ انسانیت کے لعل ہیں جو آپ کے ہاتھ لگ گئے ہیں۔ فَوَاللّٰهِ لَاَنْ یَّهْدِیَ اللّٰهُ بِكَ رَجُلًا وَّاحِدًا خَیْرٌ لَّكَ مِنْ اَنْ یَّكُوْنَ لَكَ حُمْرُ النَّعَمِ۔ بخاری (قسم خدا کی اگر تمہارے ذریعہ خدائے تعالیٰ کسی ایک

شخص کو راہ دکھادے تو یہ تمہارے حق میں سرخ اونٹوں سے بھی بہتر ہے۔)

جس دعوت کو آپ نے حق سمجھ کر قبول کیا ہے اسے بہرحال دوسروں تک پہنچانا ہے۔ حق کو ماننے کے بعد کوئی چیز اس کے اظہار میں مانع نہیں ہونی چاہیے۔ آپ خدا کے دین کے داعی ہیں۔ اس لیے آپ کی پوری زندگی داعی کی حیثیت سے بسر ہونی چاہیے۔ آپ کی دعوت سننے کے لیے جب تک دنیا میں انسان موجود ہیں آپ ان کو خدا پرستی کی دعوت دیں گے، خواہ اس میں آپ کا سب کچھ چھن جائے اور آپ پر مظلومیت کا عالم چھا جائے، حتّٰی کہ آپ کے جسم و جان کا وہ رشتہ بھی کٹ جائے جس کا کٹنا دنیا کے ہر شخص کو ناگوار گزرتا ہے۔ جب وہ وقت آئے کہ آپ آزادی سے محروم کر دیے جائیں۔ آپ کو حق کہنے کی اجازت نہ ہو، اور آپ کے اور خدا کی مخلوق کے درمیان قید و بند کی دیواریں حائل ہو جائیں تو آپ کے سامنے یوسف علیہ السلام کا اُسوہ ہے، جو بتاتا ہے کہ حصارِ قید بھی دعوت حق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ آپ کو اسی اُسوہ پر عمل کرنا پڑے گا۔ حضرت یوسف علیہ السلام سے ان کی آزادی چھین لی گئی اور قید کر دیا گیا تو قید خانہ کی فضا دعوتِ حق سے گونجنے لگی، اگر آزاد انسانوں تک ان کی آواز نہیں پہنچ سکتی تھی تو مجرم قیدیوں کو انھوں نے اپنا پیغام سنانا شروع کر دیا۔

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَأَرْبَابٌ	اے قید خانہ کے ساتھیو! بتاؤ کیا بہت سے
مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللهُ الْوَاحِدُ	متفرق رب بہتر ہیں یا وہ خدا جو اکیلا ہے اور جو
الْقَهَّارُ ٥ مَا تَعْبُدُونَ مِن دُونِهِ	سب پر غلبہ رکھتا ہے، اس خدا کو چھوڑ کر تم جن کی
إِلَّا أَسْمَاءً سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم	بندگی کرتے ہو وہ تو محض چند نام ہیں جو تم نے اور
مَّا أَنزَلَ اللهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِنِ	تمہارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے
الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوا	حق میں کوئی سند نہیں بھیجی، حکومت تو صرف خدا کے
إِلَّا إِيَّاهُ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَ	لیے ہے اس کا حکم ہے کہ تم اس کے سوا کسی کی بندگی
لَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ٥	نہ کرو، یہی سیدھا طریقہ ہے لیکن بیشتر لوگ جانتے
(یوسف: ۳۹، ۴۰)	نہیں ہیں۔

آپ کے سامنے بہت بڑا مقصد ہے، آپ اس زمین پر خدا کی حکومت دیکھنا چاہتے ہیں، اتنے بڑے مقصد کو آپ اسی وقت حاصل کر سکتے ہیں جب کہ آپ اپنا تمام سرمایہ حیات اس کے لیے لگا دیں اور اپنے لیے کچھ باقی نہ چھوڑیں جس دن آپ کی کوشش اپنی آخری حد کو پہنچ جائے گی یقین ہے کہ اسی دن یہ مایوس کن حالات بدل جائیں گے اور حق کی

کامیابی کے علامات نمودار ہونے لگیں گے۔ گرمی جب حد سے بڑھ جاتی ہے اور زمین تپنے لگتی ہے تو بارش ہوتی ہے۔ رات کی تاریکی جب اپنے شباب کو پہنچ جاتی ہے تو صبح کے آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ اگر حالات سخت ہیں تو اس سے مایوس اور ہراساں ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات کی سختی ہمیشہ اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ اب انقلاب آنے والا ہے اور حالات بدلنے والے ہیں۔ ایسا بہت ہوا ہے اور اب بھی ہو سکتا ہے کہ انتہائی ناسازگار حالات میں حق کی آواز بلند ہوئی اور حالات کے خلاف لڑتے ہوئے کامیابی کے مقام تک پہنچ گئی، مخالفت کے طوفان اٹھے اور گذر گئے لیکن اس کو مٹا نہ سکے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ یوسفؑ مصر قید خانے کی تاریک کوٹھری سے تخت حکومت پر پہنچا دیے گئے۔ قوم موسیٰ اپنے ضعف اور بے بسی کے بعد ارضِ مقدس کی وارث بنائی گئی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق کی مظلومیت نے مکہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن دس ہی سال کے بعد حق کی کامیابی کا رجز پڑھتے ہوئے آپ مکہ میں داخل ہوئے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ اَنْجَزَ وَعْدَہٗ وَنَصَرَ عَبْدَہٗ وَھَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَہٗ مسلم (خدائے واحد کے سوا کوئی معبود نہیں، اس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی مدد کی اور تنہا باطل کے تمام لشکروں کو شکست دی۔)

یہ حق کی تاریخ کی مثالیں ہیں، اگر آپ کے اندر حالات سے لڑنے کا عزم ہے تو یہ مثالیں آج بھی دوہرائی جا سکتی ہیں۔ یہاں کامیابی اربابِ عزیمت کے لیے لکھی جا چکی ہے۔ اگر آپ یہ فیصلہ کر چکے ہیں کہ حق کے لیے جینا اور مرنا ہے اور حق کے لیے آپ اپنا سب کچھ لٹا سکتے ہیں تو وہ دن دور نہیں جب کہ آپ خدا کی زمین پر اپنی آنکھوں سے وہ تابناک منظر بھی دیکھ لیں جو دیکھنا چاہتے ہیں وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ الصف: ۱۳ (اللہ تعالیٰ جنت کے سوا ایک دوسری چیز بھی تمہیں دے گا جسے تم چاہتے ہو اور وہ ہے اللہ کی مدد اور فتح قریب؟ اور تم اہل ایمان کو خوشخبری سنا دو) یاد رکھیے، یہ دنیا عمل کی دنیا ہے، یہاں کوئی بھی نتیجہ عمل کے بعد ہی ظاہر ہوتا ہے۔ بغیر عمل کے آپ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتے۔ اگر آپ نے عمل چھوڑ دیا اور بے دست و پا بن کر بیٹھ گئے تو گویا نتیجہ کا دروازہ بند کر دیا۔ کوشش اور جدوجہد کے بعد تو حق کامیاب ہو سکتا ہے لیکن بغیر کوشش کے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ راہِ حق میں جب آپ کی کوشش اپنی تمام شرائط پوری کر دے گی تو قوانین دنیا کے تحت اپنے نتائج بھی ضرور پیدا کرے گی۔ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جن کے نتائج فوراً ظاہر ہو جاتے ہیں لیکن بعض کام اپنے نتائج کے ظہور کے لیے ایک لمبی مدت چاہتے ہیں۔ ایسے کام کے انجام دینے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی کا حوصلہ انتہائی بلند ہو، وہ جلد بازی نہ کرے اور صبر و ثبات کی روش اختیار کرے۔ اگر آپ دعوتِ حق کا آغاز کر چکے ہیں تو ساتھ ہی اس کی کامیابی کا یقین

بھی پہنچ چکے ہیں، اپنا خونِ جگر اس پر چھڑک دیجیے، یقین ہے کہ یہ بیج ضائع نہ جائے گا، دیر یا سویر اپنا پھل ضرور لائے گا اور آپ اس کے اجر سے محروم نہ رہیں گے۔ فَلْيُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يَشْرُونَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ وَمَنْ يُقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيُقْتَلْ أَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيهِ أَجْرًا عَظِيمًا۔ (النساء: ۷۴) جن لوگوں نے اپنی دنیا کی زندگی کو آخرت کے عوض فروخت کر دیا ہے، انہیں خدا کی راہ میں لڑنا چاہیے، جو شخص خدا کی راہ میں لڑے، وہ مارا جائے یا غلبہ پائے ہم اس کو ضرور اجرِ عظیم دیں گے۔

افادات ابن قیمؒ

اشیاء کے درمیان فرق و امتیاز

قصد و نیت اور جذبہ و محرک کے اختلاف سے ایک ہی چیز کبھی محمود اور کبھی مذموم بن جاتی ہے۔ اسی طرح بہت سی بظاہر متماثل و متشابہ چیزیں منشا و محرک کے بدل جانے سے اچھی یا بری ہو جاتی ہیں۔ ایسی چیزوں کے درمیان فرق و امتیاز کی صلاحیت پیدا کرنا ضروری ہے۔ علمائے امت نے اشیاء کے درمیان فرق و امتیاز پیدا کرنے کے لیے دیدہ وری اور دیدہ ریزی کے ساتھ بہت سی مثالیں پیش کی ہیں تاکہ کوئی شخص بظاہر متشابہ و متماثل چیزوں سے دھوکا نہ کھا سکے۔ حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب الروح میں اس طرح کی متعدد مثالیں جمع کی ہیں۔ ہم ذیل میں ان افادات کا سلیس ترجمہ پیش کرتے ہیں۔ (ایڈیٹر)

ریاست و امامت کی طلب

دعوت الی اللہ کے لیے امارت و امامت کی طلب اور لذائذ دنیا کے حصول کے لیے ریاست و سیادت کی طلب میں وہی فرق ہے جو اوامرِ الٰہی کی تعظیم اور اس کے لیے مخلصانہ جدوجہد اور نفس کی تعظیم اور اس کی خواہشات کے حصول کی سعی و کوشش کے درمیان ہے۔ اللہ کا مخلص، اس کی عظمت و محبت سے سرشار اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اس کے رب کی اطاعت کی جائے، اس کی معصیت و نافرمانی کا استیصال کر دیا جائے، صرف اسی کا کلمہ سربلند ہو اور اس کا دین تمام ادیان باطلہ پر غالب ہو جائے، خدا کے بندے اس کے اوامر پر عامل اور اس کے نواہی سے محترز و مجتنب ہوں۔ ایسا شخص خدا کا بھی مخلص ہے کہ وہ صرف اسی کی بندگی کرنا چاہتا ہے اور خلقِ خدا کا بھی خیر خواہ ہے کہ وہ اسے خدا کی طرف دعوت دے رہا ہے۔ وہ امارت و امامت سے محبت ہی نہیں کرتا بلکہ اپنے رب سے دعا کرتا ہے کہ وہ اسے پرہیزگاروں کا امام بنا دے تاکہ آئندہ آنے والے متقی اس کی پیروی کریں جس طرح خود اس نے اگلے متقیوں کی پیروی کی ہے۔ خدا کی طرف دعوت دینے والے اس شخص کے دل میں صرف اس بات کی محبت پیدا ہوتی ہے کہ وہ متقیوں کی نگاہوں میں باوقار ان کا محبوب اور

ان کے درمیان مقتدا و رہنما بن جائے تو یہ اس کے لیے کوئی معیوب شے نہیں بلکہ قابل تعریف جذبہ ہے اس لیے کہ اس کا اصل محرک یہ ہے کہ لوگ اس کے واسطے سے رسول کی اقتدا اور ان کی پیروی اختیار کریں۔ جس شخص کو اس بات سے لگاؤ ہوگا کہ صرف خدا ہی کی اطاعت کی جائے اور صرف وہی معبود ہو وہ یقیناً ان ذرائع و وسائل سے بھی محبت کرے گا جو توحید کے قیام میں معین و مددگار ثابت ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے اپنے ان بندوں کے ذکر میں جنھیں اس نے عباد الرحمٰن کے لقب سے شرف بخشا ہے ان کے بہترین اوصاف و اعمال گنائے ہیں اور ان کے اوصاف کو جس وصف پر ختم کیا ہے وہ یہ ہے :-

وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ (فرقان ر ۶)

اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد کی طرف سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنادے

اس آیت میں انھوں نے جو دعا کی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے ازواج و ذریات کی طاعت و عبادت سے ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک بخشے اور عبادت و اطاعت میں متبعین کو پیرو و مقتدی بنا کر ان کے دلوں کو مسرور کرے۔ مقتدا اور مقتدی، امام اور متبع دونوں اللہ کی عبادت و اطاعت میں ایک دوسرے کے معاون ہوتے ہیں۔ امامت دینی کیلئے یہ دعا بھی دراصل دعوت الی اللہ میں معاونت کی طلب ہے۔ اس امامت دینی کی اساس صبر و یقین ہے۔ جیسا کہ اللہ نے ایک جگہ فرمایا ہے :-

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ (السجدہ ر ۳)

اور ہم نے ان میں سے امام مقرر کیے جو ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے رہے جب تک وہ صبر اور ہماری آیات پر یقین کرتے رہے۔

اس دعا میں یہ سوال بھی موجود ہے کہ اللہ انہیں ہدایت دے، توفیق بخشے اور ان پر ظاہراً و باطناً ان علوم نافعہ اور اعمال صالحہ کے دروازے کھولے جن کے بغیر امامت دینی مکمل نہیں ہوتی ـــــ غور کرو، کس طرح اللہ نے ان آیات میں (سورۂ فرقان کے آخری رکوع کی آیتیں) ان کو اپنے اسم الرحمٰن کی طرف منسوب کیا ہے تاکہ خلق خدا کو یہ معلوم ہو جائے کہ انہیں جو کچھ ملا وہ محض اللہ کے فضل و کرم اور جود و سخا سے ملا، اس پر بھی غور کرو کہ اللہ نے اس سورہ میں اپنے ان بندوں کی جزا میں جنت کے منازل عالیہ کا ذکر کیا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ امامت دینیہ وہ سب سے بڑا رتبہ ہے جو دنیا میں کسی بندے کو ملتا ہے اس سب سے بڑے رتبے کی جزا جنت کی بلند منزل ہی ہو سکتی تھی۔ ایک طرف امامت و قیادت

کی یہ طلب ہے اور دوسری طرف ریاست وسیادت کی وہ طلب ہے جو دنیا کے عیش و آرام اور اس کی لذتوں کے حصول کا ذریعہ بنتی ہے۔

دنیا کی اس سیادت و ریاست کے طلبگار یہ چاہتے ہیں کہ زمین میں انہیں علو و سربلندی حاصل ہو، لوگوں کے دل ان کی طرف مائل ہوں تاکہ وہ ان کے وسیلے سے اپنی تمام اغراض حاصل کریں۔ وہ ان کو اپنا مغلوب و مقہور بنا لیں تاکہ حصول عیش و لذت میں کوئی مانع نہ رہے۔ ایسی حکومت کی طلب اور اس کے لیے سعی و کوشش میں جو مفاسد ہیں انہیں خدا کے سوا کون جان سکتا ہے۔ حق سے بغاوت، حسد، سرکشی، کینہ، ظلم، فتنہ اور حمیت نفس اس کے چند مفاسد ہیں۔ اس حکومت میں اسے عزت ملتی ہے جو خدا کی نظر میں حقیر ہوتا ہے اور اس شخص کو ذلت و حقارت سے دوچار ہونا پڑتا ہے جو خدا کے نزدیک مکرم اور ذی عزت ہوتا ہے۔ دنیا کی ریاست اس کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ یہی مفاسد اس کے حصول کے ذرائع و وسائل بنتے ہیں ان کے بغیر اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ اس ریاست کے رؤسا اور اہل حکومت کے حکام ان مفاسد سے بالکل اندھے بن جاتے ہیں۔ جب موت ان کی آنکھیں بند کر دے گی تب ان پر یہ راز کھلے گا کہ وہ دنیا میں کیا کرتے رہے ہیں خصوصیت کے ساتھ یہ حقیقت اس وقت ان پر کھلے گی جب وہ میدان قیامت میں چیونٹیوں کی صورت میں اٹھائے جائیں گے اور اہل محشر انہیں اپنے قدموں سے روند کر ذلیل کریں گے امامت و سیادت کی طلب و محبت یہ بھی ہے اور وہ بھی لیکن دونوں کے درمیان آسمان و زمین کا فرق ہے۔

امید اور تمنائے خام

رجا (امید) اور تمنی (تمنائے خام) میں فرق یہ ہے کہ امید انسان کو بے کار اور معطل نہیں کرتی اور تمنائے محض اسے معطل اور بے کار کر دیتی ہے۔ امیدوار میدان عمل میں پوری طرح سرگرم ہو کر کامیابی کے لیے خدا کی رحمت پر نگاہیں جمائے رکھتا ہے اور تمنائے خام کا مریض کرتا کچھ نہیں اور چاہتا سب کچھ ہے۔ اللہ فرماتا ہے:۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ (۲:۲۱۸)

بے شک جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں جہاد کیا، وہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں

اللہ تعالے نے صرف ان لوگوں کو اپنی رحمت کا امیدوار قرار دیا ہے جن کی صفات اوپر کی آیت میں بیان کی گئی ہیں، اس نے ان لوگوں کے علاوہ تمام دوسرے لوگوں سے بساط امید لپیٹ دی ہے۔ وہ لوگ جو نفس اور شیطان کے فریب خوردہ ہیں وہ تو اپنے عمل سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ گویا خدا کے اوامر کو ضائع کرنے والے، اس کے نواہی کا ارتکاب کرنے والے، اس کی نامرضیات پر چلنے والے اور اس کی مرضیات سے بچنے والے ہی اللہ کی رحمت کے امیدوار

یں نفس اور شیطان اگر کسی کی عقل اس طرح الٹ دے تو یہ کوئی نئی اور تعجب انگیز بات نہ ہوگی۔ معلوم ہوا کہ
امید اس بندے کے دل میں متمکن ہوتی ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان سے مملو ہو۔ ایسا شخص اللہ کے وعدۂ جنت
جنت کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا ہے اور کوشش کرتے ہوئے مشتاقانہ اس کی طرف مائل و متوجہ رہتا ہے۔ امید
صحیح کی علامت یہ ہے کہ امیدوار اس بات سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں اپنی بدعملی کی وجہ سے جنت سے محروم نہ کر دیا
جائے اس لیے وہ ہر ایسی چیز کو ترک کر دیتا ہے جو اس کے اور جنت کے درمیان حائل ہو سکتی ہو۔ میں ایک مثال سے
اس حقیقت کو واضح کرتا ہوں۔

ایک شخص نے کسی شریف خاندان میں کسی نیک کردار و با اخلاق عورت کے لیے پیغام نکاح بھیجا۔ اس کا
پیغام قبول کر لیا گیا۔ اس کا پیغام قبول کر کے اسے اطلاع دی گئی کہ کل شام کو وہ فلاں مقام پر حاضر ہو تاکہ اسے
خاندان کے اکابر و اشراف دیکھ لیں اور عقد نکاح کی تقریب انجام دے دی جائے۔ یہ خوشخبری سنکر اس نے تیاری
شروع کی۔ بال بنوائے، اپنے کو اچھی طرح پاک صاف کیا، بہترین لباس پہنا اور اپنے آپ کو آراستہ و مزین کر کے
گھر سے نکلا۔ راستے بھر اپنے آپ کو ہر طرح کی گندگی اور میل کچیل سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔ یہاں تک کہ غبار
اور دھوئیں سے بھی بچنے کی سعی کرتا رہا تاکہ اس کے جسم و لباس پر ذرہ برابر بھی کوئی ایسی چیز اثر انداز نہ ہو سکے۔ اس
طرح پاک صاف اور سجا سجایا جب وہ منزل مقصود کے دروازے تک پہنچا تو گھر کے مالک نے اسے مرحبا کہی، قالین
اور تکیوں کے صدر میں اسے بٹھایا۔ بیسیوں نگاہوں نے اسے غور سے دیکھا اور ہر طرف سے اس کی عزت و تکریم کی گئی۔

ایک دوسرا شخص اسی طرح کی صورت حال میں گھر سے تو مزین ہو کر نکلا لیکن راستے میں مزبلوں اور گندگیوں کے
ڈھیر پر بیٹھا پھر اس پر لیٹ گیا، لوٹ پوٹ کیا، یہاں تک کہ اس کے بال اس کا چہرا اور اس کے کپڑے میلے اور گندے
ہو گئے، وہ اس حال میں دلہن کے گھر پہنچا اور پہلے وعدے کی بنیاد پر اس گھر میں داخل ہونا چاہا۔ یہ دیکھتے ہی گھر کا دربان
ڈنڈا لے کر دوڑا۔ اس پر چلایا دھکے دے کر دروازے سے نکالا اور تعاقب کر کے اس گھر کے راستے سے بھی اسے
بھگا دیا اور وہ نہایت حسرت زدہ اور دل شکستہ واپس آیا۔

پہلا حال امیدوار کا ہے اور دوسرا فریب خوردۂ آرزو کا ـــــ ایک اور مثال سے اسے سمجھو۔

ایک بادشاہ ہے جو تمام انسانوں سے زیادہ غیور، معاملے کا اچھا اور امانت و دیانت میں پکا ہے۔ اس کے یہاں
کسی شخص کا حق مارا نہیں جاتا۔ وہ خود پردے کے پیچھے رہتا ہے اسے کوئی شخص نہیں دیکھتا لیکن اس کا مال اور سامان
تجارت، اس کے لونڈی، غلام اور اس کے خدام ہر طرف گھر ہیں لوگوں کے سامنے ہوتے ہیں اور انہیں کے واسطے سے معاملات

ملے ہوتے ہیں۔ دو شخص معاملے کے لیے داخل ہوتے ہیں ان میں کا ایک شخص پوری سچائی اور امانت داری کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ اسے جس سامان کا آرڈر دیا جاتا ہے وہ محنت اور جستجو کرکے بہترین سامان خریدتا ہے اور اگر وہ سامان خود اسے اپنے ہاتھ سے بنانا ہو تو وہ اس میں پوری مہارت صرف کرتا ہے ظاہراً و باطناً ہر طرح اسے مکمل کرتا ہے۔ بادشاہ کا سفیر اشیاء کے بارے میں ان کی مقدار، ہیئت، شکل، نفاست کی جو شرائط و تفصیلات بتاتا ہے وہ ان سب پر عمل کرتا ہے دھوکا اور فریب سے کام نہیں لیتا۔

دوسرا شخص بالکل اس کے برعکس معاملہ کرتا ہے۔ جان بوجھ کر خراب قسم کے مال سپلائی کرتا ہے، موقع ملنے پر خیانت اور بددیانتی سے بھی نہیں چوکتا، مالک چونکہ پردے کے پیچھے ہے اس لیے اس کے گھر میں بھی چوری کرنے سے باز نہیں آتا۔ ایک مدت تک دونوں اسی طرح کام کرتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد اعلان ہوتا ہے کہ بادشاہ، ایک مقرر دن، تمام معاملے کرنے والوں کا حساب لینے اور ان کے حقوق ادا کرنے کے لیے پردے سے باہر آئے گا۔ اب خود سوچو کہ وہ ان دو شخصوں کے ساتھ کیا برتاؤ کرے گا۔ ان دونوں مثالوں پر اچھی طرح غور کرو اس لیے کہ واقعہ ان دونوں کے مطابق ہے حقیقی امیدوار وہی ہے جو جنت کو نصب العین بنائے اور اس کے حصول کے لیے پوری کوشش کرے وہ ہر ایسی چیز سے علیحدہ ہو جائے جو اس مقصد کے حصول میں روک بنتی ہو عربی لغت بھی رجاء کی اس حقیقت کے موافق ہے، رجاء کے لغوی معنی کنارے کے ہیں، اسی لیے کوئیں کے کنارے کو رجا کہتے ہیں آسمان کے کناروں کو ارجاء کہتے ہیں لہٰذا امید نفس امارہ اور اس کی خواہشات سے کنارے ہو جانے کا نام ہے۔ جب تک اس سے علیحدگی نہ ہو امید کا چراغ نہیں جلتا۔ جنت کی طرف میلان اور اس سے محروم رہ جانے کا خوف، نفس مطمئنہ کی شان ہے۔ قلب کی بصیرت جب کھل جاتی ہے تو آخرت اس کے سامنے آجاتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ فرماں برداروں کے لیے جنت لہلہا رہی ہے اور نافرمانوں کے لیے دوزخ بھڑک رہا ہے۔ وہ فرماں برداری اختیار کرکے جنت کا امیدوار بنتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ نافرمانی کے انجام سے ڈرتا بھی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر امیدوار خائف اور ہر خائف امیدوار ہوتا ہے۔ یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ حقیقی امیدوار اس بات سے ڈرتا رہتا ہے کہ کہیں وہ نعمتیں چھن نہ جائیں جنہیں وہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور حقیقی خائف اس بات کا امیدوار ہوتا ہے کہ اللہ کا کرم آخرت کا عذاب اس سے دور کردے گا جس سے وہ بچنا چاہتا ہے۔

اَمَانی (فضول آرزوئیں) کا حال یہ ہے کہ وہ مفلس کا راس المال بن گئے ہیں جنہیں انھوں نے امیدوں کے سانچوں میں ڈھال کر باہر نکالا ہے۔ ان فضول آرزوؤں کا مصدر و مخزن ایسا قلب ہوتا ہے جس پر نفسانی وسوسے ہجوم کر آئے ہیں

اور وہ ان کے [illegible] سے سیاہ ہو چکا ہو۔ ایسا شخص جب کوئی برا کام کرتا ہے تو اس کے بعد نفس اسے یہ سبز باغ دکھاتا ہے کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے وہ تجھے بخش دے گا اور گناہ سے تجھے کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ نفس کے اس وسوسے کو وہ "امید" کا نام دیتا ہے حالانکہ یہ باطل آرزوئیں جنہیں نفس جاہل و نادان قلب میں ڈالتا ہے اور وہ جہالت و نادانی کی وجہ سے نفس کے مطالبات پورے کرنے ہی میں آرام پاتا ہے۔ یہی حقیقت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے

لَیْسَ بِاَمَانِیِّکُمْ وَلَآ اَمَانِیِّ اَهْلِ الْکِتٰبِ مَنْ یَّعْمَلْ سُوْٓءًا یُّجْزَ بِهٖ وَلَا یَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِیًّا وَّلَا نَصِیْرًا (نساء : ر ۱۸)	انجام کار نہ تمہاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہل کتاب کی، جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا اس کا بدلہ پائے گا اور خدا کے مقابلے میں وہ کسی کو اپنا حامی اور مددگار نہ پائے گا۔

جب بندہ حق کی دوستی اور اس کی مدد ترک کر دیتا ہے تو اللہ بھی اس کی دوستی اور مدد ترک کر دیتا ہے پھر نفس اور شیطان اس کے دوست اور ولی و کارساز بن جاتے ہیں۔ وہ شخص نفس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کی دوستی کے بدلے میں اسے نفس و شیطان کی دوستی اور اس کی مدد کے بدلے میں نفس اور خواہشات نفس کی مدد حاصل ہوتی ہے اور امید کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ باقی نہیں رہتی۔ جب نفس تم سے کہے کہ میں مقام رجا پر فائز ہوں تو اس سے دلیل و برہان کا مطالبہ کرو۔ "امید" دلیل کے بغیر محض تمنائے خام ہے۔ وہ شخص نرا احمق و عاجز ہے جو عمل خیر نہیں کرتا اور جھوٹی آرزو کو "امید" کا نام دیتا ہے۔

خشوعِ ایمان و خشوعِ نفاق

خشوعِ ایمان وہ خشوع ہے جو خدا کی عظمت و جلال اور اپنی حقارت و عاجزی کے احساس سے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اس کے بعد اس سے اعضاء و جوارح بھی متاثر ہوتے ہیں۔ بندہ ایک طرف اللہ کی بے شمار نعمتوں کو دیکھتا ہے اور دوسری طرف اپنی خطاؤں، گناہوں اور لغزشوں پر نظر ڈالتا ہے۔ اس مقابلے کے نتیجے میں، اس کا قلب شکستہ، خدا کے سامنے جھک جاتا ہے اور اس پر شرمندگی و ندامت، خوف و دہشت اور خدا کی عظمت و محبت چھا جاتی ہے۔

خشوعِ نفاق وہ خشوع ہے جو بہ تکلف صرف اعضاء و جوارح پر طاری کیا جاتا ہے۔ دل اس سے بے خبر ہوتا ہے۔ بعض صحابہ فرمایا کرتے تھے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ خُشُوْعِ النِّفَاقِ (میں خشوعِ نفاق سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں)، ان سے پوچھا گیا: "خشوعِ نفاق کیا چیز ہے؟" [illegible] نے جواب دیا: "خشوعِ نفاق یہ ہے کہ جسم تو خاشع نظر

جو شخص حقیقی معنی میں خاشع ہوتا ہے اس کی خواہشات نفسانی کی آگ بجھ جاتی ہے، اس کا سینہ اس آگ کے دھوئیں سے صاف ہو جاتا ہے اور اس میں عظمت خداوندی کا نور چمک اٹھتا ہے وہ ذکر اللہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور اللہ کی یاد اس کے قلب کو مطمئن بنا دیتی ہے خشوع ایمان کی علامت یہ ہے کہ خاشع اللہ کے سامنے اس کی عظمت و جلالت اور اپنی ذلت و مسکنت سے سرشار ہو کر ایسا سجدہ کرتا ہے جس سے اس وقت تک سر نہیں اٹھاتا جب تک اپنے رب سے ملاقات نہ کر لے اور خشوع نفاق محض تکلف و تصنع ہے جس میں انسان بظاہر بڑا خاشع نظر آتا ہے لیکن باطن میں اس کا نفس جوان، تر و تازہ اور اپنی بڑائی کے احساس سے معمور رہتا ہے۔ نوع بہ نوع خواہشات اور طرح طرح کے برے ارادے سر اٹھائے ہوتے ہیں اور اس کے دونوں پہلوؤں میں ایک طرف وادی کا سانپ اور دوسری طرف جنگل کا شیر منتظر ہوتا ہے کہ کب اسے اپنا شکار بنا لے۔

نصیحت اور غیبت

تم سے اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی صحبت اختیار کرنے، اس سے معاملہ کرنے اور تعلقات قائم کرنے کے بارے میں مشورہ کرے اور تم اس کے عیوب بیان کر دو تو یہ نصیحت ہے کیونکہ نصیحت میں قصد و ارادہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان کو کسی بدعتی یا کسی فتنہ پرور یا فریبی یا مفسد و شریر کی برائی اور اس کی شرارت سے بچایا جائے۔ فاطمہ بنت قیس (مشہور صحابیہ) نے جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے نکاح کے بارے میں مشورہ لیا تو آپ نے فرمایا "معاویہ تو مفلس ہیں اور ابوجہم اپنی بیویوں کو بہت پیٹتے ہیں۔ اس کی دوسری مثال یہ ہے کہ ایک بار دو اشخاص ایک ساتھ سفر کرنے لگے تو حضور نے ان میں سے ایک صاحب سے فرمایا: جب تم اپنے ساتھی کے وطن پہنچ جاؤ تو ان سے بچتے رہنا ـــــ اس سے معلوم ہوا کہ غیبت اگر اللہ و رسول اور مسلمانوں کی نصیحت کے طور پر کی جائے تو یہ اللہ کی بارگاہ میں تقرب کا ذریعہ اور ایک نیکی ہے۔ اور اگر غیبت اپنے مسلمان بھائی کی مذمت اور آبرو ریزی کے طور پر کی جائے تاکہ لوگوں کی نگاہوں میں اسے حقیر بنا دیا جائے تو یہ ایک سخت مرض ہے، ذخیرۂ حسنات کا ایک شعلہ ہے جو نیکیوں کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھا لیتی ہے (معلوم ہوا کہ پیٹھ پیچھے کسی کے عیوب کا اظہار دونوں صورتوں میں ہے لیکن جذبہ و محرک کے اختلاف کی وجہ سے وہ ایک صورت میں محمود اور دوسری صورت میں مذموم ہے۔)

ہدیہ اور رشوت

ہدیہ اور رشوت بظاہر ایک دوسرے سے مشابہ ہیں لیکن ان دونوں کے درمیان بھی فرق قصد و ارادے سے پیدا ہوتا ہے۔ رشوت دینے والے کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ رشوت کے ذریعہ کسی حق کو باطل کرے یا کسی باطل کو حق ثابت کرے، اس طرح وہ یا تو خود ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے یا کسی

باقی صفحہ ۶۹ پر

ہندوستان کیسے متحد ہو؟

(مولانا جلال الدین عمری)

ہندستان کیسے متحد ہو؟ —— یہ ایک اہم سوال ہے، جو ملک کے ہر سوچنے سمجھنے والے انسان کے سامنے آج پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ کوئی بھی شخص جو ملکی حالات پر نظر رکھتا ہو، اس واقعہ سے انکار نہیں کر سکتا کہ اس وقت ہمارا ملک سخت انتشار کی زد میں ہے۔ ہر طرف گروہی، لسانی اور تہذیبی جھگڑے موجود ہیں اور ملک کا ایک حصہ دوسرے حصے سے ٹکرانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔ اگر ان جھگڑوں سے ملک کو نجات نہ ملے تو ڈر ہے کہ کہیں یہ ملک مختلف ٹکڑوں میں بٹ نہ جائے۔ پھر یہ کہ اس وقت ہمارے ملک پر جنگ کے بادل منڈلا رہے ہیں اور کسی نہ کسی درجے میں ہم حالتِ جنگ میں ہیں۔ اس لیے ہمیں اتحاد و اتفاق کی اور زیادہ ضرورت ہے۔ ملک کے ذمہ دار اس حالت کو ختم کرنا چاہتے ہیں اور پوری کوشش کر رہے ہیں کہ افتراق و انتشار ختم ہو اور ملک متحد و متفق ہو جائے۔ اسی سلسلے میں ۲ر اکتوبر ۱۹۶۲ء سے قومی یکجہتی ہفتہ منایا گیا۔ اس موقع پر ہمارے ملک کے سب سے بڑے آئینی ذمہ دار ڈاکٹر رادھا کرشنن صدر جمہوریہ ہند نے آل انڈیا ریڈیو سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے کہا کہ "قدرت نے اپنے پہاڑوں اور سمندروں کے ذریعہ ہندستان کو متحد کر دیا ہے۔ اس کا کلچر جو ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے اس رشتہ کے اتحاد کا ضامن ہے۔ تاریخ کے عروج و زوال اور تحریک آزادی نے واضح طور پر ہندستان کے اتحاد کی ضرورت کو ثابت کر دیا ہے۔

صدر جمہوریہ نے عوام کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے باہمی اختلافات پر امن طور پر اور رواداری کے جذبے کے ساتھ حل کریں۔ اس طرح وہ ہندستان کو مستحکم اور عالمی امن و ترقی کے لیے ایک زبردست طاقت بنا دیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے علاحدگی پسندی کے رجحانات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ان رجحانات کا مقابلہ کرنے کے لیے ہم ماضی کی روایات اور گاندھی جی کی تعلیمات کو تازہ کر کے یہ تہیہ کر چکے ہیں کہ ہم اپنے باہمی اختلافات کو طاقت کے ذریعہ نہیں بلکہ جمہوری طریقوں سے طے کریں گے۔"

صدر جمہوریہ نے کہا کہ طاقت کے استعمال سے تشدد کی فضا پیدا ہوتی ہے، جس سے اخلاقی حالت پست ہوتی ہے اور ہماری فطرت میں درندگی پیدا ہوتی ہے، اس لیے ہم عدم تشدد کے اصولوں پر اپنے عقیدے کا پھر اعادہ کرتے ہیں۔
صدر جمہوریہ نے عوام سے اپیل کی کہ وہ نفرت، بدخواہی اور خوف کو اپنے دل سے نکال پھینکیں، وہ اندرونی طور پر اپنے میں حق و صداقت کا جذبہ پیدا کریں اور اپنے ذاتی نفس کی اصلاح کریں، خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، دوسروں کی عزت کرنا مہذب برتاؤ کے مبادیات میں سے ہے۔"

ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا کہ "سماج دشمن عناصر اپنے ساتھیوں کی طرف اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے ہیں، ان کی روک تھام ضروری ہے اور اگر ضرورت ہو تو طاقت کے ذریعہ ان پر قابو پانا ہوگا۔ یہ طریق کار ہمارے اصول کے خلاف ہوگا لیکن بادلِ ناخواستہ اسے قبول ہی کرنا ہوگا۔ (قومی آواز ۴ر اکتوبر ۱۹۶۲ء)

صدر جمہوریہ ہند اونچے درجے کے مفکر اور فلسفی ہیں، لیکن اس کے باوجود انھوں نے قومی اتحاد کا بہت ہی سطحی نسخہ پیش کیا ہے۔ ہر قوم ایک نصب العین چاہتی ہے، بغیر نصب العین کے وہ زندہ نہیں رہ سکتی، نصب العین ہی اسے باہم جوڑے رکھتا ہے اور وہ اس کے لیے متحد ہو کر کوشش کرتی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے ملک کے پاس کوئی ایسا نصب العین نہیں ہے جو اس کو انتشار سے بچا سکے۔ ایک ایسا ملک جس میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں، مختلف سماجی رجحانات اور تہذیبی عوامل کام کر رہے ہیں۔ آپ اسے محض اس بنیاد پر متحد دیکھنا چاہتے ہیں کہ وہ چند مخصوص پہاڑوں اور سمندروں کے بیچ میں واقع ہے۔ یقیناً جغرافیائی حد بندیوں کی انسانوں کے نزدیک اہمیت ہے لیکن کوئی بھی گروہ اس کی خاطر اپنی انفرادیت ختم نہیں کر سکتا۔ جب آپ کسی گروہ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ایک خاص خطۂ زمین میں رہتا ہے اس لیے اسے اپنی انفرادیت سے دست کش ہو جانا چاہیے تو اس سے خودکشی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کسی گروہ کی انفرادیت کا ختم ہونا اس کی موت ہے، اس لیے کوئی بھی گروہ جس کے اندر زندگی کی علامت موجود ہے، خودکشی کے لیے تیار نہ ہوگا۔ وہ آخری دم تک اپنی انفرادیت کو باقی رکھنے کی کوشش کرے گا۔

آپ فرماتے ہیں اس ملک کا کلچر ایک ہے اور اس کے ماضی کی روایات ایک ہیں اور یہ کلچر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے لیکن اس بات کو ملک کے مختلف طبقات تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ یہاں جتنی قومیں آباد ہیں ان کی اپنی جداگانہ روایات اور اپنا مخصوص کلچر ہے، جس سے وہ کسی بھی قیمت پر دست بردار ہونا نہیں چاہتیں اور اس کے خلاف ہر کوشش کو جارحیت سمجھتی ہیں۔ آپ روایات و کلچر کے اتحاد کے نام پر اختلاف کو مٹانا چاہتے ہیں اور وہ اندیشہ محسوس کرتی ہیں کہ اس طرح ہماری روایات کو ختم کیا جا رہا ہے اور ہمیں اپنے ماضی سے

نے کی کوشش کی جارہی ہے حقیقت یہ ہے کہ جب تک آپ اس ملک کو ایک ایسا مقصد نہیں دیں گے جس کے حصول
لیے وہ اپنے اختلافات بھول جائے اس وقت تک اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا اگر بعض ہنگامی حالات
ت یہاں کی قومیں کسی وقت متحد ہو بھی جائیں تو ان کے درمیان حقیقی اتحاد کبھی وجود میں نہیں آسکتا۔
ملکی اختلافات کو مٹانے کے لیے صدر جمہوریہ ہند نے اپنی تقریر میں بعض اعلیٰ اخلاقی اصول کی تلقین بھی کی ہے۔
ن اصولوں کی قدر کرتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ یہ اصول کیسے پیدا ہوں اور انسان میں اخلاقی بلندی کہاں سے آئے
ملک سے انتشار کو ختم کرنے اور اتحاد و اتفاق پیدا کرنے کے لیے ہمارے ملک کے ذمہ دار حضرات وقتاً
مختلف تدابیر پیش کرتے رہتے ہیں اور بعض اوقات ان پر عمل بھی ہوتا ہے لیکن ان تدابیر کو دیکھنے کے بعد خیال
ہے کہ شاید ہمارے ملک کے ذمہ دار ابھی مرض کی صحیح تشخیص نہیں کر سکے ہیں، وہ عطائیوں کی طرح محض چٹکلوں کے
یہ ایک بہت ہی گہرے مرض کا علاج کرنا چاہتے ہیں۔ میں اس کی چند مثالیں یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں۔
۱۔ قومی یک جہتی کانفرنس نے اپنے ۱۹۶۱ء کے اجلاس میں طے کیا تھا کہ ہندوستان کے ہر شہری سے عہد لیا
ئے گا کہ وہ تمام باہمی اختلافات کو مہذب سماج کے اصولوں کی بنیاد پر پر امن طریقے سے تشدد اختیار کیے
حل کرے گا۔ چنانچہ ۲ راکتوبر ۱۹۶۲ء سے اس عہد نامہ پر دستخط لینے کی ملک گیر مہم شروع کی گئی ہے، اس
نامہ کی لاکھوں کاپیاں تمام علاقائی زبانوں میں چھپوا کر ریاستوں کو بھیجی گئی ہیں۔ (قومی آواز ۴ راکتوبر ۱۹۶۲ء)
۲۔ کیرالا اسمبلی میں ہریجن فلاح کے ریاستی وزیر کے کن ہم بونے ۱۰ راکتوبر کو کیرالا اسمبلی میں انکشاف کیا کہ مختلف
ں کے درمیان شادی کو رواج دینے کی اسکیم کے تحت اس طرح کی شادیاں کرنے والوں کو سرکاری طور پر ۵۰۰ روپیے کی
مداد دی جاتی ہے۔ بشرطیکہ فریقین اقوام مندرجہ فہرست یا مندرجہ فہرست قبائل سے تعلق رکھتے ہوں۔ انھوں نے
س امداد کے علاوہ ایسے جوڑوں سے پیدا ہونے والے بچوں کی تعلیم وغیرہ کے لیے بھی رعایتیں دی جاتی ہیں۔"
(قومی آواز ۱۳ راکتوبر ۱۹۶۲ء)
۳۔ ۱۸ راکتوبر کی خبر ہے کہ حکومت میسور تعلیمی اداروں سے چھوت چھات کو ختم کرنے کے لیے ایک اسکیم اپنانے جارہی
اس اسکیم کی رو سے اونچی ذات کے طالب علموں کو ہریجنوں کے ہوسٹل میں مفت قیام کرنے کی سہولتیں دی جائیں گی
اسکیم کو سب سے پہلے بنگلور کی لڑکیوں کے ہوسٹل میں جاری کیا جائے گا۔" (دعوت ۲۱ راکتوبر ۱۹۶۲ء)
۴۔ ۷ راکتوبر ۱۹۶۲ء کو کرناٹک سنگیت سبھا کی سلور جبلی کی تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر
ھا کرشنن نے موسیقی کو یک جہتی لانے والی طاقت سے تعبیر کیا۔ آپ نے کہا "ترسیل کے جو ذرائع ہمارے پاس ہیں ان

ہیں موسیقی ایک بین الاقوامی ذریعہ رابطہ ہے۔ موسیقی مختلف نسل کے لوگوں اور مختلف نظریات رکھنے والوں کو ایسی سطح پہ لے آتی ہے جہاں یہ اختلافات پس پشت پڑ جاتے ہیں "

اسی موقعہ پر تقریر کرتے ہوئے مرکزی وزیر نشر و اشاعت مسٹر بی گوپال ریڈی نے کہا کہ موسیقی تار نفس میں مضراب کا کام دیتی ہے اور زبان کی قیود سے بالاتر رہتی ہے۔ زبان لوگوں میں دیواریں حائل کرتی ہے تو موسیقی ان دیواروں کو گراتی ہے اور لوگوں کو اتحاد کے دھاگہ میں پروتی ہے۔

جب کبھی میں اس طرح کے بیانات دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں کہ کتنا عظیم مقصد ہے جو ہمارے ارباب حکومت کے سامنے ہے اور کتنی گھٹیا تدبیریں ہیں جو اس مقصد کے حصول کے لیے اختیار کی جارہی ہیں؟ کیا کسی شخص کو پر امن شہری بنانے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ کاغذ کے ایک پرزے پر اس سے عدم تشدد کا عہد لے لیا جائے؟ یہ تدبیر اگر کارگر ہو سکتی ہے تو ہماری مرکزی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے ممبروں کو اس کا بہترین نمونہ ہونا چاہیے۔ پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کا ہر ممبر اس بات کا شعوری طور پر عہد کرتا ہے کہ وہ دستور کا وفادار رہے گا اور اس کی پابندی کرے گا، لیکن ان میں سے کتنے ہیں جو اس عہد کا پاس ولحاظ رکھتے ہیں؟ اسی طرح ہماری پولیس آئین و دستور کی محافظ ہے، وہ حکومت سے غیر تحریری معاہدہ کرتی ہے کہ وہ ہر حال میں دستور کی پابند رہے گی اور دوسروں سے پابندی کرائے گی لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر کوئی گروہ دستور شکنی کا سب سے زیادہ ارتکاب کرتا ہے تو وہ پولیس کا گروہ ہے جب قوم کے اونچے طبقات عہد شکنی کر سکتے ہیں تو عوام سے کیا توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پابند عہد ہوں گے۔

یہی حال دوسری تدابیر کا بھی ہے۔ کیا طلبہ کے محض ایک ساتھ مل بیٹھنے سے دلوں میں اتحاد و محبت پیدا ہو جائے گی؟ کیا مختلف فرقوں کے درمیان شادی بیاہ سے آپس کی دوری اور نفرت ختم ہو سکتی ہے؟ تجربہ بتاتا ہے کہ جب دل ملے ہوئے ہوں تو دو اجنبی ایک دوسرے کے لیے روادار ہوتے ہیں اور ان میں الفت و محبت پائی جاتی ہے لیکن جہاں دلوں میں بیزاری اور نفرت موجود ہو وہاں ایک خاندان کے دو افراد بھی ساتھ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے جب تک نفرت و عداوت کے اسباب موجود ہیں اس طرح کی تدبیریں بے سود ہیں۔ ان اسباب کو ختم کیے بغیر کسی عارضی تدبیر کے ذریعہ ان کو دبا بھی دیا جائے تو اس عارضی ردے کے ہٹتے ہی اصل اسباب پوری شدت کے ساتھ ابھر آئیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ حکومت کے لالچ کی وجہ سے مختلف فرقوں کے طلبہ ایک ساتھ رہنے لگیں اور اس سے آگے یہ بھی ممکن ہے کہ ان کے درمیان شادی بیاہ کے رشتے بھی وجود میں آجائیں لیکن ڈر ہے کہ حقیقی محبت کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ تعلقات کسی برے نتیجے تک نہ پہنچا دیں۔

سب سے زیادہ دلچسپ بات تو وہ ہے جو صدر جمہوریہ ہند اور مرکزی وزیر اطلاعات نے کہی ہے۔ ان کے نزدیک موسیقی اتحاد کا ذریعہ ہے۔ کتنی غلط بات ہے جو ان حضرات نے کہی ہے۔ موسیقی ذہنی عیاشی کی علامت ہے جسے ثقافت کا نام دیدیا گیا ہے۔ اس سے اخلاقی بگاڑ پیدا ہوتا ہے اور انسان میں تعیش کے رجحانات پرورش پاتے ہیں۔ اس کے برخلاف قومی اتحاد کے لیے ایثار و قربانی کی ضرورت ہے۔ جو چیز اخلاقی پستی پیدا کرے وہ اخلاقی بلندی کا ذریعہ کیسے بن سکتی ہے۔ اگر موسیقی اور ناچ گانا اتحاد کا ذریعہ بن سکتا ہے تو یقیناً سینما گھر قومی اتحاد کے کالج ہیں۔ جب یہ "کالج" ہمارے ملک کے چھوٹے بڑے شہر میں پھیلے ہوئے ہیں تو کیا وجہ ہے کہ یہاں بجائے اتحاد کے افتراق و انتشار پھیل رہا ہے؟

انسان اسی سے سبق حاصل کرتا ہے۔ اگر ہندوستان اس کے لیے تیار ہے تو اس کے سامنے عرب کی مثال ہے۔ آج سے کئی سو سال پہلے عرب میں اس سے زیادہ سخت انتشار تھا جتنا اس وقت ہمارے ملک میں ہے، وہ سچ مچ ہلاکت کے دہانے پر کھڑا تھا، مختلف قبیلے جن کے درمیان لمبی لمبی خوں ریز جنگیں رہیں اور جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ایک ہو گئے
میان مختلف قبائل سے مل کر ایک ایسا خاندان وجود میں آیا جس کا ہر فرد دوسرے کا بھائی تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ
تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ
وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا
وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ
أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم
بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا
حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَأَنقَذَكُم مِّنْهَا
كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ
لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○ (آل عمران ۱۰۲، ۱۰۳)

اے ایمان والو اللہ سے اس طرح ڈرو جس طرح ڈرنا
چاہیے اور تمہاری موت اسلام ہی کی حالت میں آئے۔ سب
مل کر خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور افتراق و اختلاف
میں نہ پڑ جاؤ اور اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے
کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا اور اس
کے فضل سے تم بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے
گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اللہ نے اس سے تمہیں بچا لیا
اس طرح اللہ تعالیٰ تم سے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے شاید
کہ تم راہ پاؤ۔

ان آیتوں میں اس عظیم انقلاب کے تین اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ ایمان، تقویٰ اور اسلام
ایمان یہ ہے کہ انسان اس حقیقت کو مان لے کہ خدائے تعالیٰ اس کائنات کا خالق و مالک ہے اور تمام چیزیں اس کی مخلوق اور محکوم ہیں۔ انسان خدا کا بندہ ہے، اس کو صرف خدا کی بندگی کرنی چاہیے وہی اس کا معبود اور حاکم ہے اس کے سوا کسی دوسرے کی بندگی کا اسے کوئی حق نہیں ہے۔
تقویٰ دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ جب دل میں خدا کے خوف کے سوا کسی کا خوف اور سوائے خدا کی محبت کے کسی کی محبت نہ ہو، جب انسان پر خدا کو خوش کرنے اور اس کی ناراضی سے بچنے کی فکر چھا جائے، اور جب انسان ! اپنے آپ کو خدا کا غلام سمجھے اور غلام ہی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کے لیے تیار ہو جائے تو یہ تقویٰ ہے۔
تقویٰ جب صحیح معنی میں دل میں موجود ہوگا تو وہ لازماً انسان کی زندگی میں بھی نمایاں ہوگا، اسی کو اسلام کہتے ہیں جس تقویٰ کا اعمال حیات میں ظہور نہ ہو وہ تقویٰ ہی نہیں ہے۔ اسلام اور تقویٰ دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو رخ ہیں۔ تقویٰ باطنی کیفیت ہے اور اسلام اس کے ظاہر کا نام ہے۔ یہ تقویٰ اور اسلام کسی خاص عمل میں یا کسی خاص دور میں مطلوب نہیں ہیں بلکہ نہیں اس وقت تک باقی رہنا چاہیے جب تک انسان کے اندر عمل کی قوت باقی ہے اور جسم و جان کا رشتہ کٹ نہیں گیا ہے
اس کے بعد کہا گیا کہ خدا کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو۔ خدا کی رسی سے مراد اس کی کتاب ہے۔ خدا تمام انسانوں کا حاکم

اور خدا کی کتاب اس کا قانون ہے۔ ایمان تقویٰ اور اسلام یہ تینوں چیزیں خدا کی کتاب ہی سے مل سکتی ہیں۔ خدا کا حکم ہے کہ انسان اس کی کتاب کو اپنے لیے رہنما بنائیں اور اس کے پیچھے چلیں اس کے نتیجہ میں ان کو دو چیزیں ملیں گی۔ اتحاد و اتفاق اور آخرت کی کامیابی۔

خدا کو ماننے کے بعد انسان کے اندر یہ یقین ابھرتا ہے کہ تمام انسان خدا کے بندے اور اس کے غلام ہیں وہ ایک کنبہ کے افراد ہیں جن کو مل کر خدا کی غلامی کا کام انجام دینا ہے۔ وہ ایک ہیں اور ایک ہی کام کے لیے پیدا کیے گئے ہیں خدا کی نگاہ میں نہ کوئی رذیل ہے نہ شریف، سب کی حیثیت ایک ہے۔ انسانوں کے درمیان زبان و رنگ اور قوم و وطن کے جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ غیر حقیقی اختلافات ہیں، جو بعض چھوٹے چھوٹے اسباب کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ قیامت کے دن انسان کی قسمت کا فیصلہ ان حقیر اسباب کی بنیاد پر نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے اعمال کی بنیاد پر ہوگا۔ وہاں سربلند وہ ہے جس کے اعمال اچھے ہیں، جو مومن و مسلم ہے اور جس کے اندر تقویٰ پایا جاتا ہے۔ جو ان خصوصیات سے محروم ہے اسے خدا کے عذاب سے نہ کوئی عہدہ و منصب بچا سکتا ہے اور نہ حسب و نسب۔ اس کے لیے ذلت ہی ذلت ہے۔ یہ یقین بلندی و پستی کے تمام جھوٹے امتیازات کو ختم کر دیتا ہے اور انسان اپنے اپنے اختلافات کو بھول کر ایک صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں ہمارے ملک کے مختلف گروہوں اور فرقوں کو اس بنیاد پر جوڑا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے اتحاد کی اور کوئی صورت نہیں ہے۔ کیا ہمارا ملک اس کے لیے آمادہ ہوگا؟ شاید مستقبل بہت جلد اس سوال کا جواب دینے والا ہے۔

صفحہ ۳۹۵ کا بقیہ) کو ناحق نقصان پہنچاتا ہے یہی وہ راشی ہے جس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لعنت بھیجی ہے۔ اب اگر کسی شخص نے اپنے اوپر سے ظلم رفع کرنے کے لیے رشوت دی ہے تو لعنت کا مستحق صرف وہ شخص ہوگا جس نے رشوت لی ہے ایسی حالت میں رشوت دینے والا ملعون نہ ہوگا۔ رہا ہدیہ پیش کرنے والا تو اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اس شخص سے تعلقات بڑھیں، اس کی محبت حاصل ہو یا اس کے ساتھ حسن سلوک کیا جائے جسے وہ ہدیہ پیش کر رہا ہے۔ اس نیت اور قصد نے ہدیہ اور رشوت میں بہت بڑا فرق پیدا کر دیا۔

چین کی جارحیت کے سلسلے میں

مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند کا فیصلہ

دہلی ۳۰ اکتوبر۔ چین کے جارحانہ حملوں سے ملک کے لیے جو نازک صورت حال پیدا ہوگئی ہے اس پر غور و خوض کرنے لیے مولینا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے فوری ارکان شوریٰ کا ایک فوری اجلاس طلب کیا تھا جس میں امیر جماعت کے علاوہ حسب ذیل ارکان شریک ہوئے۔ جناب عبد الحی صاحب۔ مولینا محمد عزیر صاحب۔ جناب افضل حسین صاحب۔ مولانا سید احمد علی صاحب۔ جناب محمد یوسف صاحب قیم جماعت۔ جناب سید حامد حسین صاحب۔ جناب محمد یوسف صدیقی صاحب۔ محمد مسلم صاحب مجلس شوریٰ نے اپنی نشست کے بعد حسب ذیل اخباری بیان جاری کیا ہے

۱۔ چین کے جارحانہ حملہ کی مذمت اور اہل ملک بالخصوص مسلمانوں کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں مولانا ابو اللیث صاحب امیر جماعت اسلامی ہند نے جو بیان دیا تھا اسے مجلس بروقت اور مناسب خیال کرتی ہے۔

مجلس کی رائے میں امیر جماعت کا یہ فیصلہ بھی ضروری تھا کہ جماعت کے جو حلقہ وار و منطقہ وار اجتماعات ملک کے مختلف حصوں میں نومبر و دسمبر ۶۲ء کے مہینوں میں حسب معمول ہونے والے تھے، ان کو سردست ملتوی کر دیا جائے تاکہ پبلک بالعموم اور ہمارے رفقاء بالخصوص اپنی توجہات ان ذمہ داریوں کی طرف مبذول کر سکیں جو اس نازک صورت حال میں ان پر عائد ہوتی ہیں۔

جارحیت کی مذمت

۲۔ چین کا حملہ ایک کھلی ہوئی جارحیت ہے جس کی ہر انصاف پسند شخص کو مذمت کرنی چاہیے اور مجلس کو اس بات پر خاص طور سے نہایت افسوس ہے کہ ہندستان سرحدی جھگڑوں کو بات چیت کے ذریعہ طے کرنے کی جو پیہم کوشش کرتا رہا ہے، چین نے اس کی کوئی قدر نہیں کی اور ہندوستان کی امن پسندی سے غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے بڑے پیمانے پر حملہ کر دیا جس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ جھگڑوں کو طاقت کے ذریعہ حل کرنا چاہتا ہے۔

۳۔ مجلس کو اس پر اطمینان ہوا کہ حکومت اس جارحیت کا مقابلہ کرنے اور اپنے غصب شدہ علاقوں کو ہر قیمت پر واپس لینے کے لیے پوری طرح آمادہ ہے اور اس کے لیے ہر طرح کی ضروری کارروائیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔ مجلس کے نزدیک اس کام میں حکومت کی مدد کرنا ہر ہندستانی کا ایک ضروری فریضہ ہے اور مجلس کو یقین ہے کہ جہاں تک مسلمانان ہند کا تعلق ہے وہ بھی اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے کیونکہ ملک کا ایک جزو ہونے کے علاوہ مسلمانوں کے لیے اس معاملہ کا ایک خاص قابل لحاظ پہلو یہ بھی ہے کہ چین جارح ہونے کے ساتھ ایک ایسے نظام کا علمبردار بھی ہے جس میں جمہوریت، اخلاقی و روحانی اقدار کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے انہیں اپنی سرحدوں پر چینی پیشقدمی کو خاص طور سے ایک بہت بڑا خطرہ سمجھنا چاہیے۔

اخلاقی اوصاف پیدا کیجیے

۴۔ مجلس کو اس بات پر یقین ہے کہ کسی بھی حملہ کی مدافعت کے لیے صرف مادی وسائل و ذرائع کافی نہیں ہوتے بلکہ ان سے کہیں زیادہ ضرورت ہمت، پامردی، صبر و استقلال، اتفاق و یک جہتی، جذبہ اور لگن وغیرہ جیسے اخلاقی اوصاف کی ہوتی ہے۔ جہاں تک مادی وسائل و ذرائع کا

تعلق ہے اگرچہ ہمارا احساس یہ ہے کہ چین جیسے طاقتور ملک کے حملوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جن تیاریوں کی ضرورت تھی غالباً چین کے ساتھ دوستی برقرار رکھنے کی خواہش یا اس کے صحیح عزائم کا بر وقت اندازہ نہ کرنے کی بنا پر وہ پوری طرح انجام نہیں پا سکی مگر اب جبکہ اس کی تلافی کا حکومت تہیہ کر چکی ہے تو اس طرف سے اطمینان کیا جا سکتا ہے کہ جلد ہی یہ کمی پوری ہو سکے گی۔ لیکن جہاں تک اس دوسری ضرورت کا تعلق ہے مجلس کو افسوس ہے کہ پہلے بھی اس کے سلسلے میں بہت زیادہ غفلت سے کام لیا گیا ہے اور اب بھی اس کے پورا کرنے کی طرف کوئی خاص توجہ مبذول نہیں کی جا رہی ہے۔

ڈیفنس آف انڈیا کا نفاذ موجودہ صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے خواہ کتنا ہی ضروری کیوں نہ ہو توقع نہیں کی جا سکتی کہ تنہا اس سے ان خرابیوں کی روک تھام کی جا سکتی ہے جو غیر معمولی حالات میں عموماً ابھر آتی ہیں اور نہ اس سے قوم میں وہ جذبات ابھر سکتے ہیں جو جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ اس لیے مجلس اپنا فرض سمجھتی ہے کہ اس موقع پر اس دوسری ضرورت کی طرف حکومت اور قوم کی توجہات کو خاص طور سے مبذول کرائے اور جو جماعتیں اور افراد اخلاقی اصلاح اور تعمیر سیرت کے کاموں میں پہلے سے حصہ لے رہے ہیں مجلس ان سے اس نازک موقع پر اپنی کوششوں کو تیز تر کر دینے اور اس مقصد کے لیے ایک دوسرے سے زیادہ سے زیادہ اشتراک تعاون کرنے کی اپیل کرتی ہے

رفقائے جماعت کو ہدایات :۔

۵۔ رفقائے جماعت کے لیے مجلس حسب ذیل باتیں طے کرتی ہے :۔

ا۔ یہ صورت حال افسوسناک ہے کہ ملک کا تجارت پیشہ طبقہ کسی قومی مصیبت کے وقت بھی ناجائز نفع اندوزی کے جذبے کو قابو میں نہیں رکھ پاتا۔ اور بڑی آسانی سے اس سے بے جا فائدہ اٹھانے کے درپے ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر ایسے لوگوں سے انفرادی یا بشکل وفود ملاقاتیں کر کے انہیں اس ناجائز حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔

ب۔ حق و انصاف کو ملحوظ نہ رکھنے کی بنا پر آئے دن محنت کش طبقہ اور کارخانہ داروں کے درمیان کشمکش ہوتی رہتی ہے جس کا پیداوار اور قومی آمدنی پر نہایت تباہ کن اثر پڑتا ہے اور ظاہر ہے کہ موجودہ حالات میں جبکہ ملک ہر طرح کی پیداوار کا بہت زیادہ ضرورتمند ہے اس طرح کی کشمکش کا پیدا ہونا کہیں زیادہ تباہ کن ہو سکتا ہے اس لیے ہمارے رفقاء کو چاہیے کہ اس طرح کی کشمکش اور بے اطمینانی کی صورتیں نہ پیدا ہونے دیں۔

ج۔ کسی غیر معمولی صورت حال پیدا ہو جانے پر بے بنیاد افواہیں بھی پھیلنا شروع ہو جاتی ہیں جن کے نہایت سنگین نتائج برآمد ہوتے ہیں ہمارے رفقاء کو اس کی روک تھام کی طرف بھی پوری توجہ کرنی چاہیے۔

د۔ ملک کے تحفظ و دفاع کے لیے حکومت اپنے وسائل کے علاوہ پوری قوم کے مالی تعاون کی بھی ضرورتمند ہے اس لیے اس میں حتی الوسع ہر شخص کو ہاتھ بٹانا چاہیے اس وقت مختلف جماعتوں اور اداروں کی طرف سے دفاعی اغراض کے لیے الگ الگ چندے اکٹھا کیے جا رہے ہیں بہتر یہ ہے کہ رفقاء اس ضمن میں جو مالی تعاون کریں اسے براہ راست حکومت کے قائم کردہ مقامی فنڈوں میں جمع کریں۔

ھ۔ شہری امن و امان کے قیام اور وقتی حادثات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ملک میں حکومت اور پبلک کی طرف سے مختلف طرح کی کمیٹیاں قائم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ قائم بھی ہو رہی ہیں۔ اس طرح کی کمیٹیوں میں بھی ہمارے رفقاء حصہ لیکر اپنا فرض ادا کرنے کی کوشش کریں۔

و۔ ملک اس وقت جس مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے انسانی تدبیریں اس وقت تک بیکار رہیں جب تک خدائے قادر مطلق کی مدد ہمارے شامل حال نہ ہو۔ اس لیے تدابیر کے ساتھ ساتھ خدا سے اپنا تعلق جوڑنا بھی نہایت ضروری ہے رفقاء خود بھی اس کی طرف توجہ کریں اور دوسروں کو بھی توجہ دلائیں۔

ز۔ مذکورہ بالا امور کی انجام دہی کے لیے دوسری جماعتوں کے ساتھ اشتراک، انفرادی و اجتماعی ملاقاتیں اور حسب ضرورت چھوٹے بڑے اجتماعات بھی منعقد کیے جا سکتے ہیں۔

فہرست مندرجات ماہنامہ "زندگی"

از جولائی ۶۲ء تا دسمبر ۱۹۶۲ء

اشارات

نمبر شمار	لکھنے والے	موضوع بحث کا مختصر تعارف	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	جسٹس دھون کے ایک فیصلہ پر تبصرہ	۲۹	۱	جولائی ۶۲ء
		مخالفتوں کے ہجوم میں انبیاء کرام کا اسوہ	"	۲	اگست ۶۲ء
		مدیر برہان کے اداریوں پر عمومی تبصرہ	"	۳	ستمبر ۶۲ء
۲	مولانا ابو اللیث صاحب ندوی	قومی اتحاد و یکجہتی پر اظہار خیال	۲۹	۴	اکتوبر ۶۲ء
		"	۲۹	۵	نومبر ۶۲ء
		"	۲۹	۶	دسمبر ۶۲ء

احادیث و آثار

	شارح	مضمون احادیث	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	سید احمد قادری	امامت صالحہ کی اہمیت	۲۹	۲	اگست ۶۲ء
		صحابہ کرام — اقامت دین کے سپاہی	"	۳	ستمبر ۶۲ء
۲	مولانا محمد یوسف اصلاحی	خدا کا حق	۲۹	۱	جولائی ۶۲ء

مقالات

	لکھنے والے	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	مولانا ابو البقاء ندوی	اعجاز القرآن	۲۹	۳	ستمبر ۶۲ء
۲	مولانا جلال الدین عمری	ابن آدم کی معراج	۲۹	۱	جولائی ۶۲ء
	"	اسلام کا حاصل	"	۲	اگست ۶۲ء
	"	خدا کی کتاب کیسے پڑھی جائے	"	۵	نومبر ۶۲ء

تراجم واقتباسات

اخبار و افکار

نمبر شمار	لکھنے والے	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	ادارہ	صدر جمہوریہ اور نیشنلزم	۲۹	۲	اگست ۶۲ء
		پنج شیل کا انجام	〃	〃	〃
		نیا پیپاسکیٹس منسوخ کر دیا گیا	〃	۳	ستمبر ۶۲ء
		مسلمان ملکوں کا حال	〃	۵	نومبر ۶۲ء
۲	مولانا جلال الدین عمری	ہندستان کیسے متحد ہو	۲۹	۶	دسمبر ۶۲ء
۳	جناب سید منظور الحسن ہاشمی	بھاوے جی کے ایک بیان پر تبصرہ	۲۹	۵	نومبر ۶۲ء

رسائل و مسائل

نمبر شمار	جواب دینے والے	خطوط و سوالات کا موضوع	جلد	شمارہ	مہینہ
۱	مدیر	الٓمٓ سے متعلق ایک بے بنیاد دعویٰ	۲۹	۴	اکتوبر ۶۲ء
		علیہ اللہ کی توجیہ	〃	۵	نومبر ۶۲ء
		تنگ دلی یا عالی ظرفی	〃	〃	〃
		اللہ کی کنہِ ذات، انسانی ادراک سے بلند ہے	〃	〃	〃
		خون دینے کا مسئلہ	〃	〃	〃
		صاحب حال کی کمی	〃	〃	〃

رودادیں

نمبر شمار	لکھنے والے	عنوانات	جلد	شمارہ	مہینہ
	جناب محمد یوسف صاحب امیر جماعت اسلامی ہند	روداد اجتماع امرائے حلقہ جات منعقدہ اپریل ۶۲ء	۲۹	۱	جولائی ۶۲ء